کتاب نما

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندوستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ۔ اردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

گول مال — شفیقہ فرحت

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱۸/=

فی الفور — یوسف ناظم

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۳۰/=

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۱۸/=

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیّدین — مرتبہ: ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

ممتاز ماہرِ تعلیمات خواجہ غلام السیدین کے علمی ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔ ۰/=

توفیق الحکیم — ناول نگاری کا جائزہ — ڈاکٹر بدرالدین الحا

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق ا کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ /=

نئی مطبوعات

شمس الرحمٰن فاروقی مشرقی شعر اور نثر کی روشنی میں (تنقید)
محمود سالم ۶۰/-

زخموں کے کئی نام (شعری مجموعہ) صدیپ تبرمی
ترجمہ شاہد خلیل ۹۰/-

دریا رواں رہے (شاعری) حیات لکھنوی ۲۵/-

فراق گورکھپوری ذہنی خاکوں میں ادب نما مطرب نظامی ۳۶/-

قومی تعمیر کی دستاویز ڈاکٹر عبدالاحد ۴۰/-

وقت کی اہمیت علامہ یوسف القرضاوی ۱۶/-

ندی شمول احمد ۵۰/-

بیت بازی عرفان خلیل ۱۶/-

مولانا مودودی کے خطوط سید امین الحسن رضوی ۱۰/-

دیوان غالب دیوناگری ایڈیشن
ترتیب ثاقب صدیقی، امیس احمد

سانحہ عظیم ترتیب محمد اعتبار الحسن

پسندیدہ واقعات مولانا اشرف علی تھانوی ۳۰/-

ہندتو، دعوت سہ روزہ نمبر ادارہ مرکزی مکتبہ اسلامی ۸/-

مختصر تاریخ اسلام مختلف شعبہ جات، مولانا اسلم سعید [illegible]

نور مراکش (نئے ایڈیشن) تاریخی ناول صادق حسین صدیقی

بنت حلب	،	،،	،،	،، ۹۰/-
عربی دوشیزہ	،	،،	،،	،، ۱۰۰/-
ساعقہ	،	،،	،،	،، ۱۰/-
فتح کابل	،	،،	،،	،، ۷۰/-
جوشش جہاد	،	،،	،،	،، ۷۰/-
سیدہ خاپانہ	،	،،	،،	،، ۸۰/-
نازنین عرب	،	،،	،،	،، ۹/-

سرورق: سید ظفر ہاشمی

اولیاء کرام کے حالات زندگی مختصر نام ۸/-
عربی اردو، انگریزی اول چال پروفیسر محمد صدیقی ۱۲/-
تحفۃ النکاح اردو ادارہ ۶/-
ذہن جدید شمارہ نمبر ۱۳ مجلہ زبیر رضوی ۱۴/-
گناہوں کا بدلہ دنیا میں مولانا اشرف علی تھانوی ۲/-

قلندر بخش جرأت (خطبہ)

جمیل جالبی

اردو کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک نہایت اہم خطبہ جو موصوف نے ۸/ نومبر ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے سیمنار میں پیش کیا تھا۔ قیمت -/۱۰ روپے

سوغات

پانچویں کتاب شائع ہو گئی

محمود ایاز

صفحات: ۵۵۲ قیمت: اسّی روپیہ

پیامی قواعد اردو

قواعد جیسے خشک مضمون کو سیکھنے، سمجھانے اور برتنے کے لیے نہایت آسان زبان میں ترتیب دی ہوئی یہ قواعد اساتذہ اور طلبہ کے لیے نہایت مفید ہے۔ قیمت ۵/ روپے، طلبہ ایڈیشن ۳/-

Khuda Bakhsh Lectures

INDIAN AND ISLAMIC

(English)

by

• Dr. Md. Zubayr Siddiqi • Prof. Jamal Khwaja
• Prof. S. Vahiduddin • Dr. Hashim Amir Ali
• Mr. B. N. Pande • Mr. Ali Ashraf
• Prof. Mohibbul Hasan • Mr. Badrud-Din Tyabji
• Dr. Bruce B. Lawrence • Prof. S. H. Askari
• Dr. Z. A. Desai • Dr. A. Rauf Crollius
• Prof. A. A. Al-Fayum & Mr. A. J. Kidwai

مہمان مدیر
سید ظفر ہاشمی
شاہ عالم ہاؤسنگ سوسائٹی
[illegible] احمد آباد [illegible] گجرات

اشاریہ

رکھیو احباب مجھے تلخ نوائی سے معاف

موجودہ ہندوستان میں اُردو کی حالت زار کا مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر جائزہ لیا جائے اور وہ بات خدا کو حاضر و ناظر جان کر صاف صاف کہہ دی جائے جو ہر ایک کے دل میں ہے تو نتیجہ عام خیال سے بالکل مختلف نکلے گا۔ اُردو کے بارے میں ہمارے سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی شخصیتیں جس قسم کے بیانات دیتی رہتی ہیں وہ عموماً مصلحت کے مارے ہوتے ہیں۔ حقیقت سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اُنیسویں صدی اور بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں یہ بات سچ تھی کہ اُردو ہندوستان کے ایک بڑے طبقے کی زبان تھی۔ اس طبقے میں مسلمان بھی تھے ہندو بھی تھے اور سکھ بھی تھے۔ سبھی اُردو پڑھتے تھے لکھتے تھے اور بولتے تھے۔ مولوی کریم بخش ہوں یا رام اوتار تیواری یا کرتار سنگھ یا پریم کمار نارنگ سب اُردو جانتے تھے اور سبھوں کے بچے مدرسوں اور اسکولوں میں اُردو پڑھتے تھے۔ اُردو پورے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ اُس سے پہلو تہی کر جانا ناممکن تھا۔ اسی فضا نے ہر فرقے میں اُردو کے جید عالموں، شاعروں اور ادیبوں کو پیدا کیا۔ اُن دنوں اُردو گلیوں اور بازاروں میں، دفتروں اور دکانوں میں، میلوں اور ٹھیلوں میں گھروں اور محلوں میں، محفلوں اور تقریبوں میں، محلوں اور جھونپڑوں میں اطلاق پھرتی تھی۔ یہ واحد زبان تھی جسے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی نمائندگی کا فخر حاصل تھا۔ جس کا کوئی مذہب نہ تھا۔ جو کسی ایک علاقے تک محدود نہ تھی اور یہی ایک زبان تھی جس کا مزاج صحیح معنوں میں سیکولر تھا اور ہندوستان کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔

لیکن آزادی کے بعد ہندوستان کا نقشہ ہی نہیں بدلا گئی دوسری تبدیلیاں بھی آئیں۔ اُن میں ایک اہم تبدیلی یہ بھی تھی کہ اُردو کو دیس نکالا مل گیا اور یہ سمجھ لیا گیا کہ ہندوستان کے وہ مسلمان جو ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے وہ اپنے ساتھ اُردو بھی لیتے گئے۔ اس لیے اُردو اب ہندوستان میں باقی نہیں رہی۔ تقسیم کے حادثے نے جس نفرت اور خلیج کو جنم دیا اُس کا اثر اُردو پر [illegible] پڑا۔ [illegible] ہندو [illegible] نے ہندی اپنائی، [illegible] ہندی [illegible]

دوسرے صوبے مقامی زبانوں کے خول میں سمٹ گئے اور ریاستیں اپنی اپنی دیکھ کے مصداق بھی اپنی اپنی زبانیں لے کر بیٹھ گئے اور اردو کو سب بھول گئے۔ اُردو گلیوں اور بازاروں سے دفتروں اور دکانوں سے، میلوں اور ٹھیلوں سے، اسکولوں اور کالجوں سے بھاگ کر لٹتی لٹاتی بے آبرو ہوتی مسجدوں اور دینی مدرسوں میں پناہ گزیں ہو گئی کیونکہ اس کا اپنا کوئی صوبہ نہ تھا کشمیر تھا لیکن ہائے کشمیر تیرا بھی کیا مقدر ہے۔

یہی حقیقت ہے باقی سب مصلحت، مطلب پرستی دھوکہ فریب اور جھوٹ ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے حوالے سے اُردو کے مقام کا تعین آج نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت اُردو رام اوتار تیواری بھی پڑھتے تھے۔ کرتار سنگھ بھی پڑھتے تھے اور پریم کمار نارنگ بھی۔ اس لئے اُردو اُن سب کی زبان تھی۔ گلے گلے تھی۔ وہ سب اُردو کے پرستار تھے۔ دل و جان سے چاہنے والے لوگ تھے۔ اُن کی شخصیت پر اُردو کی گہری چھاپ تھی اور اُن کے گھروں میں اُن کی محفلوں میں اُردو کی گھن گرج تھی۔ اس وقت یقیناً اُردو کا کسی خاص مذہب یا فرقے سے تعلق نہ تھا۔ اس وقت اگر ہم فخر کرتے تھے کہ اُردو ہماری مشترکہ تہذیب کی نمائندہ ہے۔ ہماری گنگا جمنی تہذیب کا مظہر ہے، ہماری ملی جلی روایت کا ایک حصہ ہے، ہم سب کی وراثت ہے اور ہمارے وجود کا ایک حصہ ہے، اُسے مذہب یا فرقے میں بانٹا نہیں جاسکتا، اس پر سب کا حق ہے اُسی طرح جس طرح اس دھرتی پہ سب کا حق ہے۔ تو یہ بات غلط نہ تھی۔ لیکن کب تک پدرم سلطان بود کا نعرہ لگایا جائے گا، کب تک خوابوں کے جزیرے میں مست خرامی جاری رہے گی۔ کب تک تاریخ کے سنہرے اوراق سے جھانک جھانک کر خوبصورت چہرے پر نثار ہوتے رہیں گے اور کب تک اس حقیقت سے آنکھیں بند رکھیں گے کہ ہندستان میں اُردو اب سب کی زبان نہیں رہی اور یہ صرف مسلمانوں کی زبان بن گئی ہے۔

لیڈروں کی بات چھوڑیے کہ وہ حق بات کبھی نہیں کہتے۔ ان ادیبوں کو بھی چھوڑیے جو اکیڈمیوں اور سرکاری اداروں میں گھسے بیٹھے ہیں۔ اور طرح طرح کی سرکاری مراعات، انعامات اور اعزازات حاصل کر رہے ہیں ان کتب سازوں کو بھی چھوڑیے جو کتابوں پہ کتابیں لکھ لکھ کر اپنے لمبے ہاتھوں سے سرکاری اداروں میں بھاری قیمتوں پر ڈھکیل دیتے ہیں جہاں پڑی وہ سڑتی ہیں۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو اُردو کو آج بھی ایسی زبان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جو سب کی زبان ہے اور جس کا تعلق کسی خاص فرقے سے نہیں ہے تاکہ اُن کے نام نہاد سیکولرزم کا بھرم قائم رہے اور وہ اُس کے طفیل سرکاری مراعات، اعزازات اور انعامات سے شرفیاب ہوتے رہیں۔ لیکن اُن لوگوں سے پوچھیے جو تھرڈ کلاس ہوٹلوں اور چائے خانوں میں تہمد باندھ کر بنچوں اور کرسیوں پر اکڑوں بیٹھتے ہیں اور اُن کے ہاتھوں میں اُردو کا اخبار یا رسالہ ہوتا ہے۔ جو جھونپڑوں میں رہتے ہیں جن کے طاقوں پر قرآن شریف بڑے سلیقے سے جزدان میں لپیٹا رکھا ہوتا ہے اور ٹوٹی ہوئی میز پر ایک طرف اے آر۔ خاتون، واجدہ تبسم، علامہ راشد الخیری، صادقہ نواب اور مولانا عبدالحلیم شرر کے ناول ہوتے ہیں اور دوسری طرف آسان نماز، بہشتی زیور اور

ہوتا ہے جس میں اسلام دھرا ہوتا ہے جیسے چراغ کی اخلاق روشنی تلے بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے ان لوگوں سے پوچھیے تو وہ یہی کہیں گے کہ اردو اُن کی زبان ہے۔ اسی لیے وہ لوگ اپنے بچوں کو اُردو اسکولوں میں بھیجتے ہیں تاکہ وہ اپنی زبان سیکھ سکیں اور اس کے ذریعہ وہ اپنے مذہب اور اپنی ثقافت سے واقف ہو سکیں۔ اُردو ان کے لیے لسانیات کا پٹارہ نہیں اور نہ ہی ساختیات کا کموڈ جس پر بیٹھ کر وہ اندرونی بخارات اور خرافات سے فارغ ہو سکیں نہ انھیں تنقید کے اُگالدان میں دلچسپی ہے اور نہ ہی تجریدیت کی ماری دوسری شعری و نثری تحریروں میں۔ انھیں اس اُردو میں دلچسپی ہے جو اُن کے بچے پڑھتے ہیں۔ اس اُردو میں دلچسپی ہے جس میں آسان نماز ہے، پیغمبروں اور رسولوں کے احکامات ہیں۔ بزرگوں کے ملفوظات اور مخطوطات ہیں، درویشوں اور فقیروں کی حکایتیں ہیں۔ اُن کہانیوں اور ناولوں میں دلچسپی ہے جن سے اُن کے اخلاق سدھرتے ہیں، ذہنی سکون ملتا ہے اور زندہ رہنے کی اُمنگ تیز ہوتی ہے۔ اُن نظموں اور غزلوں میں دلچسپی ہے جس کی نغمگی سے اُن کے دلوں میں گرماہٹ پیدا ہوتی ہے اور چہروں پر سُرخی اور آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے۔ اُردو انھیں لوگوں کی زبان ہے۔ لیکن افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اُردو پڑھتے یہ لوگ ہیں اور فیصلے وہ کرتے ہیں جن کے بچے انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور جن کے ڈرائنگ روموں میں کھلی میز پر انگریزی کے رسالے اور کتابیں ہوتی ہیں اور ڈھکی شیلف میں ساختیات لسانیات اور تنقید کی کتابیں بڑے سلیقے سے رکھی رہتی ہیں اور قرآن شریف اور بہشتی زیور (اگر وہ مکان ان کتابوں کا ہے تو) اس بکس میں بند رہتا ہے جو اُن کی محترمہ جہیز میں لائی تھیں۔ یہ کون ہوتے ہیں کہنے والے کہ اُردو سب کی زبان ہے۔ اُردو اُن کی زبان بھلا کیسے ہو سکتی ہے جبکہ ان کے بچے اُردو کی الف 'ب' سے ناواقف ہیں، اُردو کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، اُردو پڑھنے والے بچوں کو کمتر اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ اس قوم کو ذلیل اور گرا ہوا سمجھتے ہیں جو اُردو بولتی لکھتی اور پڑھتی ہے۔ جو اُردو اسکولوں کا مذاق اُڑاتے ہیں ——— ایک مرتبہ ہمارے ایک ملاقاتی نے اپنا صاف ستھرا کھایا پیا گدرایا ہاتھ ہوا میں لہرا کر بڑے جوش میں کہا۔ "ان جھونپڑے والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو اُردو پڑھائیں۔" ہم نے پوچھا کیوں بھیا۔ کیوں یہ جھونپڑے والے ہی کیوں آپ کیوں نہیں؟ بولے "اس لیے کہ یہ لوگ اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں نہیں بھیج سکتے۔ تو کم از کم اُردو اسکولوں ہی میں تو بھیجیں۔"

یہی ذہنیت ہر اُس شخص کی ہے جو مڈل کلاس سے لے کر اَپر موسٹ کلاس سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ سب یہی چاہتے ہیں کہ اردو نچلے طبقے کے لوگ پڑھیں اور وہ اُن کے لیے کموڈ اور اُگالدان بنائیں۔ لیکن ان نچلے طبقے کے لوگوں کو کموڈ اور اُگالدان کی ضرورت نہیں یہ لوگ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سپٹک بیت الخلا میں، جھاڑیوں کی اوٹ میں یا اسم [illegible] کے قدموں میں اپنے نجاسات نکالتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں تھوک دیتے ہیں۔ میں مسلمانوں کی بات کر رہا ہوں، اور یہی مڈل کلاس سے لے کر اَپر اور اَپر موسٹ کلاس اُردو کو

زبان کہتے ہوئے شرماتا ہے۔ کس بل بوتے پر کہے کہ اُردو اُسس کی زبان ہے۔ مخصوص حالات کے دھارے میں بہ کر اتفاقاً اُردو تو اُسس نے سیکھ لی ہے۔ بڑا ادیب بھی بن گیا ہے۔ بڑا ادب بھی پیدا کر رہا ہے اور اکثر بڑوں پیدا کر رہا ہے لیکن اب وہ نہیں چاہتا کہ اُسس کی نئی نسل بھی اس معتوب زبان سے رشتہ استوار کرے۔ اسی خجالت سے بچنے کے لیے یہ طبقہ غیر مسلموں کو بھی ساتھ رکھتا ہے اور دونوں مل کر نعرہ بُلند کرتے ہیں کہ اردو کسی ایک فرقے کی زبان نہیں۔ اگر وہ یہ کہہ دے کہ اُردو اب ہندستان میں صرف مسلمانوں کی زبان ہے تو وہ مراعات، انعامات اور اعزازات جو انھیں سرکار سے مل رہے ہیں ختم ہو جائیں گے۔ انھیں اسی کام پر لگایا گیا ہے کہ وہ اُردو کے ساتھ منافقت کرتے رہیں۔ یہ وہ ایجنٹ ہیں جنھیں اُردو دشمن حکومتوں نے اُردو قوم میں پلانٹ کیا ہے۔

رہ گئے ہمارے غیر مُسلم احباب تو میں اُن کے متعلق قدرِ بہتر رائے رکھتا ہوں لیکن نہایت احترام کے ساتھ ایک سوال پوچھتا ہوں کہ کس بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ آج ۱۹۹۴ء میں اُردو اُن کی بھی زبان ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں وہ کیا پیش کرنا چاہتے ہیں صرف اتنا ہی نہ کہ وہ خود ادیب و شاعر ہیں۔ ادب اور شاعری کے طفیل نام اور پیسہ کما رہے ہیں اردو محفلوں میں بڑی ادا سے اردو بولتے ہیں اور مشاعروں اور سیمناروں میں سُنے دھار شعر سناتے ہیں اور دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں اور کتابیں لکھ لکھ کر سرکار کے کھاتے میں ڈالتے رہتے ہیں یہ معتزز حضرات اُسس زمانے کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جب ہندستان تقسیم نہیں ہوا تھا اور اردو نے ہجرت نہیں کی تھی۔ لیکن ان لوگوں نے کبھی اسس بات پر غور کیا کہ اُن کے اپنے گھروں میں اردو کا کیا مقام ہے۔ وہ اپنی نئی نسل میں اُردو کو منتقل کرنے کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ اُن کی اسس پود کا اُردو کے ساتھ کیسا رویّہ ہے اور سب سے بچّی اور کھری بات تو یہ ہے کہ وہ مردم شماری یا دوسرے سرکاری یا غیر سرکاری کاغذات یا اندراجات میں مادری زبان کے کالم میں کیا لکھواتے ہیں۔ اُردو ؟

یہی وہ سچ ہے جو تمام جھوٹ کا پردہ فاش کرتا ہے اور میں اپنے غیر مسلم احباب کو رعایت اسس بات پر دیتا ہوں کہ وہ جتنا بھی کرتے ہیں اردو پر احسان ہی کرتے ہیں۔ ان کا مذہب اردو میں نہیں ہے۔ اُن کی ثقافت پر اب اردو کا قطعی اثر نہیں، ان کے رسم و رواج پر اب اردو اثر انداز نہیں اور ان کا سماج مجموعی طور پر اردو کو ملک بدر کر چکا ہے۔ ان حالات میں اگر وہ اردو میں اب بھی دلچسپی رکھتے ہیں تو بلاشبہ وہ احسان ہی کرتے ہیں اُن کی اردو میں یہ دلچسپی ملک کے بٹوارے سے قبل کا ہنگ اوور ہے جس سے وہ جیتے جی چھٹکارا نہیں پا سکتے لیکن اردو صرف اُن کی شخصیت کے ساتھ چپکی ہوئی ہے اور صرف ان کے ذہنوں اور سوچوں میں بسی ہوئی ہے اسس سے پرے کچھ بھی نہیں۔ خود فریبی کا نقاب اٹھا کر دیکھیے تو صاف نظر آنے لگا کہ اُردو گھرائی ڈری سہمی نچلے طبقے کے مسلمانوں کی پناہ میں پڑی ہوئی ہے اور مولانا عبدالحلیم شرر کی ناولیں، بہشتی زیور اور شاہنامہ اسلام پڑھنے والا مسلمانوں کا یہ طبقہ اسس کے آنسو پونچھ رہا

ہے اور اپنی بچی کو سفید قمیص اور شلوار پہنا کر اردو میڈیم کے اسکولوں میں پیدل بھیج رہا ہے اور
اسی وقت کونونٹ کی ٹیلی بس کموڈ اور اگالدان بنانے والے اداروں کے بچوں کو بٹھا کر دھواں چھوڑتی
سرسراتی ہوئی نکل رہی ہے۔
تو سوال صرف یہ ہے کہ اُردو پڑھتا کون ہے؟ میں یہ سوال اُن سبھوں سے پوچھتا ہوں جو
اپنے چہرے پر خول چڑھائے دل کی آواز دبائے منہ سے بولتے اور قلم سے لکھتے ہیں۔ ان کے
اندر ایک اور آدمی جو بیٹھا ہوا ہے وہ کیا کہتا ہے۔ اُس سے پوچھیے تو وہ یہی کہے گا کہ اُردو
صرف مسلمان پڑھتے ہیں کہ اردو اُن کی مادری زبان ہے۔ اس زبان میں اُن کا مذہب ہے۔
ثقافت ہے۔ اس زبان سے اُن کی انفرادیت قائم ہے۔ یہ زبان اُن کی شناخت ہے۔ وہ
اگالدان اور کموڈی ادب کے لیے یا روٹی خریدنے کے لیے اردو نہیں پڑھتے۔ وہ مولانا عبدالحلیم
شرر اور صادق سردھنوی کی ناولوں کے لیے پڑھتے ہیں، آسان نماز اور بہشتی زیور کے لیے
پڑھتے ہیں بزرگوں کے ملفوظات اور مخطوطات کے لیے پڑھتے ہیں غالب اور میر کی غزلوں
کے لیے پڑھتے ہیں۔ ہمارے بڑے ادیب اور نقّاد غالب اور میر کو قوس میں رکھ کر باقی
سب پر زبردست قہقہہ لگادیں گے لیکن جس وقت وہ قہقہہ لگاتے ہوں گے ان کے اندر کا
وہ دوسرا آدمی انھیں چیخ چیخ دکھاتا ہوگا اس لیے کہ وہ خود کو دھوکہ دے رہے ہوں گے۔
ہندستان کے اُردو اسکولوں کا سروے کیجیے، ان طالب علموں کا سروے کیجیے جو اُونچے
درجات میں اُردو مضمون لیتے ہیں تو صرف ایک بات سامنے آئے گی کہ ان میں ۹۹ فیصد مسلمان
ہیں۔ ہاں ایک فیصد دوسرے لوگ بھی ہوں گے لیکن یہ لوگ شوق یا مصلحت کا شکار ہوں گے
اس سے آگے کچھ نہیں — ایک قدم اور آگے بڑھیے ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے فارم میں
مادری زبان کے خانے میں جھانکیے ۹۹، ۹۹ فیصد مسلمان ہوں گے۔ پھر اس بات کا کھلے عام
اعتراف کرنے میں کیا چیز مانع ہے کہ موجودہ ہندستان میں اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے
تمام ہندستانی مسلمانوں کی زبان اردو ہے یہ میں نہیں کہتا۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ آج اگر کوئی
یہ کہتا ہے کہ اردو میری مادری زبان ہے اور سرکاری کاغذات اور اندراجات میں بھی
وہ یہی کہتا ہے تو وہ یقیناً مسلمان ہی ہوگا۔ یہ بات الگ ہے کہ کوئی زبان کسی کی ذاتی ملکیت
نہیں ہوتی۔ اُردو بھی نہیں ہے۔ اُسے سیکھنے پڑھنے، لکھنے اور بولنے کی آزادی ہر ایک کو ہے
اسی طرح جس طرح مجھے انگریزی لکھنے پڑھنے اور بولنے کی آزادی ہے اور میں اس آزادی
کا فائدہ بھی اُٹھاتا ہوں۔ میں اچھی انگریزی جانتا ہوں لکھتا ہوں بولتا ہوں لیکن انگریزی میری
مادری زبان نہیں۔ اسی طرح کسی غیر مسلم کو اُردو سے محبت ہو سکتی ہے عقیدت ہو سکتی ہے، دلچسپی
ہو سکتی ہے اور اس کا اُسے پورا حق بھی ہے۔ ایک غیر مسلم بڑا ادیب، عظیم شاعر اور اُردو کا
جیّد عالم ہوتا ہے لیکن وہ اُردو کو اپنی مادری زبان نہیں کہتا کیوں؟ اس لیے کہ مادری زبان
تو اس کی کچھ اور ہے جو اس کے گھر والے بولتے ہیں لکھتے اور پڑھتے ہیں جو اس کے
سیکھ رہے ہیں اور جس زبان میں وہ اپنے سماج سے لین دین کرتا ہے۔

کیا میں غلط کہتا ہوں؟

کیا یہ غلط ہے کہ جب اقلیت کی زبان کا ذکر چھڑتا ہے تو ہمارے اور آپ کے ذہنوں میں اُردو اور صرف اُردو آتی ہے؟ جب اُردو کی فریب گذیدہ ترقی و تحفظ کا حوالہ دیا جاتا ہے تو کس قوم کو خوش کرنے کی سازش کارفرما ہوتی ہے؟ اُس وقت کیا سازشی ذہنوں میں صرف مسلمان قوم نہیں ہوتی؟ اُردو کے نام پر ہندستان میں فسادات کیوں ہوتے ہیں؟ میں دوران سفر ٹرین اور بس میں اُردو پڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہوں تو بغیر کسی شبہ و ثبوت کے لوگ مجھے مسلمان سمجھ لیتے ہیں ایسا کیوں ہے ؟ میں ہی کیا محترم رام پرکاش کپور تیواری صاحب بھی اگر اُردو پڑھتے ہوئے پکڑے جائیں اور بظاہر ان کے چہرے بُشرے سے اُن کی ذات کا کوئی واضح ثبوت نہ ملے تو لوگ انھیں بھی مسلمان مان لیں گے بعد میں بھلے ہی وہ صفائی پیش کرکے باعزت بری ہو جائیں لیکن پہلا تاثر تو یہی ہوگا۔

تو جب اُردو اتنی گہرائی اتنی شدت اور اس قدر واضح طور پر مسلمانوں سے منسوب ہو گئی ہے تو اس بات کا اعلان کرنے میں کیا قباحت ہے کہ ہندستان میں اردو اب صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس اعلان سے کئی فائدے ہوں گے جن کی تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں مختصراً یوں سمجھیے کہ دستور میں دی گئی اقلیتی زبان کی ترقی و تحفظ کی گارنٹی واضح ہو جائے گی۔ اردو اداروں پر اقلیتی فرقے کا حق زیادہ ہوگا۔ مردم شماری میں سرکاری کارندے مادری زبان کے خانے میں غلط اندراج نہ کر سکیں گے۔ اُردو کو ختم کرنے کی سازشیں کہاں کہاں کام کر رہی ہے۔ ذرا غور کریں۔ ہندی علاقے میں غریب اور جاہل مسلمانوں کی مادری زبان مردم شماری کرنے والے متعصب کارندے اگر ہندی لکھ دیں تو زیادہ تعجب کی بات نہیں کیونکہ غریب اور جاہل مسلمان آسان اُردو بولتے ہیں جس پر ہندی کا گمان ہو سکتا ہے۔ (گو کہ یہ گمان بھی سراسر لغو ہے) لیکن گجرات، مہاراشٹر، آندھرا پردیش، کرناٹک، کیرالا، تامل ناڈو، اڑیسہ اور بنگال کے وہ مسلمان جو ہندستانی زبان بولتے ہیں اُس کو ہندی کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ اُن کی زبان یا تو صوبے کی زبان ہوگی یا پھر اُردو۔ ہندی تو کسی طرح نہیں ہو سکتی اور کیوں ہوگی۔ لیکن ان لوگوں کی زبان کو ہندی کہا جاتا ہے اور اس طرح اعداد و شمار غلط پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر یہ اعلان ہو جائے کہ وہ مسلمان جو اپنے گھروں میں اُردو ہندستانی بولتے ہیں اُن کی زبان اردو ہی کہلائے گی تو مردم شماری کا فارم بھرنے والا متعصب بابو صحیح اندراج کرنے پر مجبور ہوگا اور جس طرح کریم الدین احمد کے فارم میں مذہب کے خانے میں اسلام کے علاوہ کچھ نہیں لکھ سکتا اسی طرح مادری زبان کے خانے میں اُردو کے علاوہ کوئی دوسری زبان لکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دینے سے اُن کے اندر اپنی زبان کے تحفظ کا جذبہ شدت اختیار کرے گا اور وہ سرکار سے ہٹ کر اُردو کی ترقی و تحفظ کے نئے ذاتی راستے تلاش کریں گے۔ کم از کم اُردو کا کوئی وارث تو ہوگا۔ ابھی تو یہ لاوارث ہے بلکہ ہر ایک کی داشتہ ہے جس سے حسب استطاعت لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں یہ جنجھوڑتے ہیں اور جھنجھوڑ کر

[illegible] لیتے ہیں۔

اُردو کو کچھ صوبوں میں دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ بھی لوگ کرتے ہیں۔ دوسری
سرکاری زبان سے مراد کیا ہے یہ بات واضح نہیں کم از کم مجھے تو نہیں معلوم۔ اگر دوسری سرکاری
زبان سے مراد یہ ہے کہ منسٹروں اور افسروں کے نام کی تختیاں اُردو میں بھی لگ جائیں اور
آرڈر سرکلر، نوٹس، قرار داد وغیرہ اُردو میں بھی جاری کیے جائیں، سرکاری دفتروں میں درخواستیں
اُردو میں بھی دی جاسکیں ریلوے ٹائم ٹیبل اور منی آرڈر فارم اُردو میں بھی شائع ہوں تو یہ
صورت میرے خیال سے نہایت مضحکہ خیز ہوگی۔ اس لیے کہ اگر کسی اُردو کے مجاہد نے اپنے
فیکٹری کے لائسنس کی درخواست اردو میں دے دی تو صدیاں گزر جائیں گی اسے کوئی جواب نہ
ملے گا۔ اس لیے کہ وہ حضرات جو فیصلہ کریں گے اُردو نہیں جانتے۔ اب افسروں کو سمجھانے کے
لیے ایک اُردو جاننے والا مترجم رکھا جائے گا جو درخواست کا ترجمہ کرکے صاحب کو پیش کرے گا
صاحب آرڈر اُردو میں نہیں کسی اور زبان میں دیں گے۔ جس کا ترجمہ کیا جائے گا اور یہ ترجمہ
صحیح ہوگا کہ غلط صاحب کس طرح جانیں گے اور وہ فیکٹری کس طرح سائن کریں گے۔ اگر مترجم صاحب
نے کتابت کی غلطی کردی تو 'ہاں'، 'نا' بھی ہو سکتا ہے۔

تو صاحب کوئی ایسا مجاہد نہیں ہے، میں بھی نہیں آپ بھی نہیں، جو اُردو کی خاطر فیکٹری
قربان کر جائے کاروبار بھینٹ پر چڑھا دے، روزی روٹی داؤ پر لگا دے۔ مجاہد بھی اگر ہوگا تو
وہ اپنے کام کے لیے درخواست اُسی زبان میں دے گا جو صاحب جانتے ہیں اس صورت
میں مترجم کے پاس کوئی کام نہ ہوگا اور اُسے ڈیچ میں لگا دیا جائے گا۔ قصہ مختصر۔ ارے صاحب
جب اتنا زبردست ڈنڈا برسنے اور اربوں روپے خرچنے پر بھی غیر ہندی صوبوں کے سرکاری
دفتروں میں پچاس سال کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی ہندی کا ایک سکہ نہ چل سکا تو اُردو
کا کیا چلے گا خاک ــــ رہ گئیں منسٹروں اور افسروں کے نام کی تختیاں تو لوگ دفتروں میں
تختیاں پڑھنے نہیں جاتے کام کرانے جاتے ہیں اور اگر کام نہ ہو تو تختی ہو یا تختہ سب بے کار ہے
اور یہ منی آرڈر فارم اُردو میں بھر کر بھیجا جائے گا تو اس وقت پہنچے گا جب [illegible] آپ
کی منّی ماشاء اللہ شادی کے لائق ہو جائے گی یا پھر سرے سے لاپتا ہی ہو جائے گا۔

کوئی شخص اپنی روزمرہ کی خوشی کو کاروبار کو، مراسم اور تعلقات کو، روزی روٹی کو کسی
زبان کے لیے قربان نہیں کر سکتا۔ وہ اُسی زبان کو اختیار کرے گا جس کے ذریعہ اس کی عام
ضرورتیں آسانی کے ساتھ پوری ہو جائیں اور اس کی [illegible] رہے۔ اگر ہندی، انگریزی یا دوسری
علاقائی زبانوں میں کارروائی کرنے سے ہمارا کام آسانی سے ہو جاتا ہے اور ان زبانوں کو پڑھنے
سے ہمارے بچے ڈاکٹر، انجینئر، آئی اے ایس یا عام سرکاری ملازم ہو جاتے ہیں تو ہم وہی زبان
اختیار کریں گے اور یہ بات دوپہر کے سورج کی طرح روشن اور سمندر کی طرح گہری
ہے کہ اُردو ہندوستان کے کسی صوبے میں اصل معنوں میں سرکاری زبان اب نہیں بن سکتی
اسے موجودہ سرکاری زبانیں دوسری تیسری چوتھی یا کوئی بھی سرکاری زبان بننے

کوئی بھی زبان اپنا وقار اور اپنا مقام کم کرنا نہ چاہے گی۔ ہاں ایک صورت ہے۔ ان صوبوں میں جہاں اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ ہو رہا ہے تمام سرکاری ملازمتوں میں اُردو جاننا ضروری قرار دے دیا جائے۔ پھر دیکھیے ایک جھٹکے میں سارا مسئلہ حل ہو جائے گا اور بغیر کسی دوسرے قدم کے اُردو سرکاری زبان بھی بن جائے گی اور روٹی روزی سے جڑ بھی جائے گی بلکہ چپک جائے گی۔ کیا اُردو والے یہ مطالبہ کرنے کی ہمت کر سکتے ہیں؟ کیا موجودہ نظام اس کی اجازت دے گا؟ کیا اکثریت اسے قبول کرے گی؟ ظاہر ہے ناممکن! اس کے علاوہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی جو بھی صورت ہوگی ناقص ہوگی، کاؤنٹر پروڈکٹو ہوگی، صرف تماشا ہوگا، دکھاوا ہوگا۔ اس سے اُردو کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ اُلٹے اس کے ساتھ نفرت بڑھے گی۔ اگر ہم اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ ترک کر دیں تو اُردو کے ساتھ دوسری زبانوں کی خیر سگالی کا راستہ ہموار ہو جائے گا اور کٹر سے کٹر اردو دشمن کا رویہ بھی نرم پڑ جائے گا۔

اس لیے ہمیں اُردو کو اب عوامی زبان کی حیثیت سے ہی پروان چڑھانا ہوگا۔ اس کی ترقی ترویج و تحفظ محض ادبی مذہبی اور ثقافتی ضروریات کے پیش نظر کرنا ہوگا۔ اسے ادب مذہب اور ثقافت ہی کے اندر رکھنا ہوگا اور اس کے سیکھنے کا مقصد ادبی ثقافتی اور مذہبی سرگرمیوں سے لطف اندوز ہونا ہی ہوگا۔ اُردو کو پیٹ سے نہیں ذہن و رُوح سے جوڑنا ہوگا۔ پیٹ کا رشتہ آپ دوسری زبانوں سے استوار کریں۔ یہی وقت کا تقاضا ہے۔ اُردو صرف اپنے لیے سیکھیں، اپنی انفرادیت کے لیے سیکھیں، اپنی ثقافت اور اپنے مذہب کے لیے سیکھیں اور سیکھنے کے لیے دستور کے مطابق جو حق اقلیتی زبان کو دیا گیا ہے اس کا مطالبہ بھی کریں اسے حاصل کریں۔ اس کے لیے لڑتے بھی رہیں اور ساتھ ہی ساتھ مدرسوں اور مسجدوں میں عربی کے ساتھ ساتھ اُردو پڑھانے کا انتظام بھی کریں۔ اس کام کے لیے دوسرے ادارے بھی قائم کریں یہ سوچ کر کہ یہ جنگ ہماری ہے اور ہمیں خود ہی لڑنا ہے۔

سرکار کے پیچھے کاسۂ گدائی لیے کب تک بھاگتے رہیں گے؟ پچاس سال سے بھاگ رہے ہیں کیا ملا؟ سوائے محرومی، ناکامی، احساسِ شکستگی، ذلت اور رسوائی کے اور کیا ملا میرے بھائی۔

[illegible]
وزیر آغا

انشائیہ اور اردو انشائیہ نگاری

انشائیہ کیا ہے؟ ہمارے ہاں پچھلے تیس برس سے اور مغرب میں کم و بیش پچھلے تین سو برس سے یہ بحث جاری ہے کہ انشائیہ کیا ہے مگر تا حال انشائیہ کی کوئی ایسی تعریف DEFINITION سامنے نہیں آسکی جو اسکے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کر سکے۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ غلط نتیجہ اخذ کیا کہ انشائیہ بحیثیت صنف ادب ناقص ہے کیونکہ اس کی حدود متعین نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا دیگر اصناف ادب کی حدود کا تعین ممکن ہو سکا ہے؟ کیا ہم غزل یا افسانے کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کیا ہیں؟ دوسرے لفظوں میں کیا ہم ان کی کوئی ایسی تعریف وضع کر سکتے ہیں جو حتمی ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم بیشتر اشیاء اور مظاہر کو ہم پہچانتے ہیں مگر ان کو بیان نہیں کر پاتے مثلاً میں آپ سے پوچھوں کہ نیلاہٹ کیا ہے تو آپ اسکا کیا جواب دیں گے؟ کہ میں اسے پہچانتا ہوں اور بآسانی اسے نشان زد کر سکتا ہوں مگر سوال یہ ہے کہ کیا آپ اسے بیان بھی کر سکتے ہیں؟ جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ سو اصل بات یہ ہے کہ کیا آپ نے خیال، شے یا مظہر کو پہچان لیا ہے؟ نیکی، سچائی، حسن ان میں سے کسی کی بھی حتمی تعریف ممکن نہیں لیکن پہچان بہرحال ممکن ہے۔ میں اپنے احباب سے یہ بات بار بار کہتا رہا ہوں کہ جس طرح آپ غزل کے ہزاروں اشعار میں سے صحیح غزلیہ شعر کو پہچان کر دکھا اٹھتے ہیں کہ غزل کا شعر ہو گیا اسی طرح آپ تربیت، ریاضت اور بار بار مطالعہ سے انشائیہ کو طنزیہ، مزاحیہ، فلسفیانہ، سائنسی یا دیگر وضع کے مضامین سے بآسانی الگ کر سکتے ہیں۔

اس دنیا میں ہر شے دوسری اشیاء سے جڑی ہوئی ہے اور یہ خیال ہزاروں دیگر خیالات کی ڈور سے بندھا ہوا ہے لہٰذا جب آپ شے یا خیال کے بارے میں کچھ لکھنے بیٹھتے ہیں تو اردگرد کے ہزاروں پیش پا افتادہ خیالات اور پٹی پٹائی باتیں آپ کی تحریر میں شامل ہو جاتی ہیں یوں آپ کی اور [illegible] سوچ کے راستے میں ایک قسم کی رکاوٹ یا Blockage نمودار ہو جاتا ہے جب تک اس رکاوٹ کو دور نہ کیا جائے آپ پر موضوع کے ان چھوٹے پہلو منکشف نہیں ہو سکتے۔ انشائیہ نگار کا اصل کام یہی ہے کہ وہ موضوع پر خود کو اس طور مرتکز کر لیتا ہے کہ اردگرد کے موضوعات کی مداخلت بے جا نہیں ہونے [illegible] پھر وہ موضوع کے ساتھ اس طرح کھیلنے لگتا ہے جیسے وہ پہلی بار اس سے آشنا ہوا ہو۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو بچے کا انداز نظر بھی انشائیہ نگار ایسا ہے کیونکہ وہ بھی اردگرد کی اشیاء اور مظاہر کو پہلی بار دیکھ رہا ہوتا ہے اس [illegible] کے ساتھ [illegible] مظاہر کی تازگی کا ادراک کرتا ہے جب کہ انشائیہ نگار [illegible]

سے مخفی ہوتی ہیں یا ان دو باتوں کے چھلکے کو اتارتا ہے پھر اس کے ان چھوٹے پہلوؤں تک رسائی حاصل کر کے بچے ہی کی طرح حیرت زدہ ہوتا ہے یوں گویا وہ اپنے تخلیقی باطن کو برانگیخت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

آج سے کم و بیش بیس برس پہلے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام تھا ZEN AND THE ART OF MOTOR CYCLE MAINTENANCE مصنف کا نام تھا رابرٹ۔ ایم۔ پرسگ۔ سننے میں آیا ہے کہ یہ بیسویں صدی کی چند اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اسی کتاب میں ایک جگہ یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ کسی امریکی پروفیسر نے اپنی کلاس کی ایک طالبہ سے امریکہ پر مضمون لکھنے کو کہا چند روز کے بعد وہ طالبہ پروفیسر موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ وہ مضمون نہیں لکھ سکی کیونکہ اسے امریکہ کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں سوجھی جو پہلے سے معلوم نہ ہو۔ تب پروفیسر موصوف نے اس طالبہ سے کہا اچھا اگر یہ بات ہے تو تم اپنے موضوع کی طنابیں کھینچو اور امریکہ کے بجائے اپنے شہر پر مضمون لکھ لاؤ۔ چند روز کے بعد وہ طالبہ آئی اور کہا کہ ابکی بار بھی اسے کوئی نئی بات نہیں سوجھی۔ اس پر پروفیسر صاحب جزبز ہوئے اور طنزاً کہا اگر تم اپنے شہر پر بھی مضمون نہیں لکھ سکتیں تو شہر کے اوپیرا ہاؤس کے صدر دروازے کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرو اور اس کے بائیں جانب کی اینٹوں کو موضوع بناؤ۔ یہ کہہ کر پروفیسر موصوف مسکرائے اور بات آئی گئی ہو گئی تاہم چند ہی روز کے بعد وہ طالبہ پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل ایک مضمون لکھ لائی۔ کہا کہ میں نے چند سطریں پہلی اینٹ پر مزید چند سطریں دوسری اینٹ پر لکھنے کے بعد جب تیسری اینٹ پر لکھنے کا آغاز کیا تو گویا دریا کا بند ٹوٹ گیا اور ان چھوٹے خیالات کے ایک سیل رواں نے آگے بڑھ کر مجھے شرابور کر دیا۔ دیکھا جائے تو اس طالبہ نے وہی طریق اختیار کیا تھا جو ایک انشائیہ نگار کرتا ہے۔ انشائیہ نگار بھی شے یا خیال کو اس کے ماحول سے کاٹ کر مقصود بالذات قرار دیتا ہے اور یوں قطرے میں دجلہ دریافت کرتا ہے۔ اس کام کے لیے وہ پٹے ہوئے اور پامال طریق کار کو ترک کر کے ایک نیا زاویہ نگاہ اختیار کرتا ہے۔ مثلاً وہ شے یا موضوع کے چھپے ہوئے پہلوؤں کو جاننے کے لیے یا اپنی جگہ سے سرک کر اسے دوسری جانب سے دیکھتا ہے یا پھر شے یا خیال کو اسکی متعین جگہ سے ہٹا کر اس کے عقبی دیار پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ دونوں باتوں کا ایک ہی مقصد ہے یعنی موضوع کے ان دیکھے پہلوؤں تک رسائی۔ اس نکتے کو بیان کرنے کے لیے میں نے انشائیہ پر لکھے گئے اپنے مضامین میں متعدد مثالوں سے کام لیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ میں نے لکھا ہے کہ فرض کیجیے آپ دریا کے ایک کنارے سے اسکے دوسرے کنارے کو سال ہا سال سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں لہٰذا یہ ایک مستقل نوعیت کی تصویر آپ کے ذہن پر مرتسم ہو چکی ہے اب آپ کسی روز دوسرے کنارے پر جا نکلیں اور وہاں سے پہلے کنارے کو دیکھیں یا دوسرے کنارے ہی کو دیکھیں تو آپ کو ایک بالکل نیا منظر دکھائی دے گا۔ اسی طرح بچپن میں لڑکے بالے اکثر اوقات جھک کر اپنی ٹانگوں میں سے ماحول کو دیکھتے اور خوش ہوتے ہیں کہ انہیں ہر روز کا دیکھا بھالا بالکل بدلا ہوا دکھائی دینے لگا ہے۔ عام زندگی میں دیکھیے کہ جب آپ کسی میدان کو ہموار سطح سے دیکھتے ہیں تو آپ کو اسکا محض ایک بعد DIMENSION نظر آتا ہے لیکن اگر آپ قریبی پہاڑ پر سے اسی میدان پر نگاہ دوڑائیں تو آپ کو ایک اور ہی منظر دکھائی دے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ آپ اپنی مقررہ جگہ سے سرک

۱۱۔ آندھی فطرت کی جاروب کش ہے اس کا کام تیزی اور پھرتی سے کوہ و صحرا، شہر و دیہات اور
باغ و راغ کو ہر طرح کے خس و خاشاک سے پاک و صاف کرنا ہے ہمارے شہروں
کے میونسپل کمشنروں کو آندھی کے طریق کار سے سبق لینا چاہیے۔

۱۲۔ آندھی کی برکتیں اَن گنت ہیں۔ آندھی کے تھپیڑے، تصنع اور فریب کے
سارے پردوں کو چاک کرکے رکھ دیتے ہیں۔ سبک سارانِ ساحل کو شاید یہ
بات پسند نہ آئے لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ شخصیت کی تکمیل
آندھیوں کے بے رحم تھپیڑوں ہی کی رہین منت ہے اور جس شخص کی زندگی
میں کبھی آندھی نہیں آئی اس کی حالت قابل رحم اور اس کی ذہنی پختگی محل نظر ہے۔

آپ نے دیکھا کہ کس طرح انشائیہ نگار نے ہمیں تصویر کا دوسرا رخ دکھا کر آندھی کی معنیاتی توسیع
کا اہتمام کیا ہے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اس کے لیے مزاح یا طنز شجر ممنوعہ نہیں ہے۔ اس نے انشائیہ
میں بقدرِ ضرورت ان کو بھی برتا ہے مگر اس طور کہ نتیجے میں تبسم زیر لب نے جنم لیا ہے نہ کہ خندہ بیباک
نے۔ مجموعی اعتبار سے دیکھیں تو انشائیہ کا کام موضوع پر سے متعین معانی کے میلے کچیلے پرتوں کو نوچ
کر الگ کرنا تھا تاکہ نئے مفاہیم کی آمد کا راستہ ہموار ہو سکے۔ انشائیہ "آندھی" میں یہ کام انجام دینے کی کوشش
صاف نظر آتی ہے۔

اس سلسلے میں انشائیہ کو طنزیہ اور مزاحیہ سے ممیز کرنا بھی ضروری ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں
طنز نگار ہمیشہ بلندی پر سے نشیب پر ایک نظر ڈالتا ہے جہاں اسے ناہمواریاں ہی ناہمواریاں نظر آتی ہیں۔
دراصل نشیب بجائے خود ایک ناہمواری یا گڑھا ہے جو زمین کی ہموار سطح سے منقطع ہونے کے
باعث وجود میں آئی ہے۔ سو طنز نگار اس ناہمواری کو خندۂ استہزا میں اڑاتا ہے تاکہ سطح دوبارہ ہموار ہو جائے
طنز نگار کے ہاں احساس تفاخر نمایاں اور ایذا رسانی کا جذبہ غالب ہوتا ہے وہ جس چیز سے نفرت کرتا
ہے اسے بیخ و بن سے اکھیڑ دینا چاہتا ہے تاکہ معاشرہ از سر نو صحت مند ہو سکے۔ دوسری طرف مزاح نگار
نشیب میں خود کودا کرتا ہے یعنی خود ایک ناہمواری بن کر دوسروں کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے
کہ وہ اس پر ہنسیں۔ جس مضمون میں طنزیہ انداز غالب اور ہنسی کے ذریعے اصلاح احوال مطلوب ہو،
اسے ہم طنزیہ مضمون کہیں گے، دوسری طرف جس مضمون میں مزاحیہ انداز نمایاں اور آسودگی بہم پہنچانا
مقصود نظر آتا ہو مزاحیہ مضمون کا نام دیں گے۔ انشائیہ ان دونوں سے مختلف چیز ہے۔ اس کا مقصد نہ تو
اصلاح احوال ہے اور نہ وہ قہقہہ اگلوا کر اور یوں اندر کی خاص اسٹیم کو خارج کرکے آپ کو آسودگی یا
مہیا کرنے کا متمنی ہے۔ انشائیہ اسلوب کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ انشائیہ میں انشا کا
عنصر بجائے خود اس بات پر دال ہے کہ انشائیہ اسلوب کی تازگی پر زور دینا چاہتا ہے اور اس کام کے
لیے وہ مزاح اور اس کے امثال کے علاوہ تشبیہ، استعارہ نیز اس سارے مواد کو بقدر ضرورت استعمال کرتا
ہے جو اعلیٰ ادبی نثر کا امتیازی وصف ہے چنانچہ آپ دیکھیں کہ انگلستان میں انگریزی زبان کی لطیف
ترین کروٹوں اور کیفیتوں سے طلبہ کو آشنا کرنے کے لیے لائٹ ایسے یا انشائیہ کو بطور خاص نصاب
میں شامل کرنے کی روش عام ہے۔ آج سے چند برس پہلے ہمارے ہاں۔ ایف۔ اے۔ کے کورس

میں انشائیے بھی شامل کر دیے گئے تھے جو ایک بہت اچھی بات تھی مگر وجہ وہ اس روایت کو مستحکم
ہونے سے روک دیا گیا اور نصاب سے انشائیے حذف کر دیے گئے۔ اب جامعہ پشاور نے
انشائیہ کو ایم اے کی جماعتوں کے نصاب میں شامل کر کے ایک ایسی عمدہ مثال قائم کی ہے جو دوسری
یونیورسٹیوں کے لیے بھی قابل تقلید ہے۔ اس جملۂ معترضہ کے لیے معذرت خواہ ہوں مگر میں اس
بات پر بہرحال زور دوں گا کہ انشائیہ وہ واحد نثری صنف ہے جو زبان کی صلاحیت کا امتحان بھی
ہے اور زبان کے ارتقا کا باعث بھی۔ یہ تو ہوئی اسلوب کی بات۔ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین سے
انشائیہ اسلوب کے علاوہ اپنے رویے کی بنا پر بھی مختلف ہے کیونکہ جہاں طنزیہ مضمون ایک
nce of correction بن کر ابھرتا ہے اور مزاحیہ مضمون اعصابی تسکین بند لیو جیسی مہیا کرتا ہے
وہاں انشائیہ شاعری اور افسانے کی طرح جمالیاتی حظ بہم پہنچاتا ہے۔ شاعری یا افسانے کے
ذریعے ایسا کرنا آسان ہے کیونکہ ان میں سے اول الذکر جذبات اور محسوسات سے [illegible] کا
سہارا لیتا ہے جب کہ مؤخر الذکر کہانی کے عنصر ارتقا کو بروئے کار لاتا ہے مگر انشائیہ نہ تو شاعری ہے
اور نہ افسانہ وہ تو محض افسانوی نثر کو ادبی درجہ عطا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ دوسرے لفظوں میں
انشائیہ کا کام مضمون کے پیکر کو شعر اور افسانے کے پیکر کا ہم پلہ بنانا ہے اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں
ہے۔ اس ضمن میں مختلف انشائیوں سے یہ چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جو اپنے اندر چکا چوند پیدا
کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یعنی قاری کو معانی کی ایک عام سطح سے معانی کی بلند تر سطح کی
طرف جست بھرنے پر اکساتے ہیں۔

> سردی طبقہ نسواں سے تعلق رکھتی ہے اس لیے اس کا سارا نظام مادری ہے۔
> اس میں وہی شفقت، خود سپردگی اور ملائمت ہے جو عام طور پر خواتین میں
> پائی جاتی ہے اس کے برعکس گرما کا سارا نظام پدری ہے یہ باپ کی طرح قدم
> قدم پر آپ کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے آپ جب ذرا اس کے وجود سے
> صرف نظر کرتے ہیں تو یہ آپ کو ڈانٹ پلاتا ہے اور کبھی کبھی ایسا سلوک کرتا ہے
> کہ سردی کا سارا تلطف اور مادرانہ شفقت یاد آجاتی ہے۔
>
> "سردی"

> شور ایک تیز ابلی طوفان کی طرح ہے جو سیلاب کی طرح آتا ہے اور پر امن گرد و
> پیش کو لپیٹ میں لے لیتا ہے اس کے برعکس خاموشی اگر بتی کی خوشبو کی طرح
> ہے جو خود جلتی ہے لیکن دوسروں کو معطر کر دیتی ہے۔
>
> "شور"

> ہمارا یہ کرۂ ارض ایک طویل عریض پلیٹ فارم ہی تو ہے جسے بنی نوع انسان نے
> انوکھے رنگوں، رسیلی زبانوں، خوبصورت نسلوں اور دلکش ثقافتوں سے مزین
> کیا ہوا ہے زمین پر [illegible]
> [illegible]

دراصل ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر قدم جمانے ہی کا عمل ہے مگر
دیکھا جائے تو ہمارے جسم، روح کے لیے، دماغ خیالات کے لیے اور لب، بولوں
کے لیے پلیٹ فارم ہی کا درجہ رکھتے ہیں جہاں وہ کچھ دیر قیام کرتے ہیں پھر
رخصت ہو جاتے ہیں۔

" غزل نے قصیدے کی پسلی سے جنم لیا ہے۔ پسلی سے پیدا ہونا اپنے اندر
گہری معنویت رکھتا ہے نہ جانے کب سے غزل بے چاری قصیدے کی قید
میں تھی بالکل جیسے داستان کی نرم و نازک شہزادی ہیبت ناک دیو کے طلسم
میں گرفتار ہو گئی تھی مگر یہ قید و بند والی بات بھی شاید درست نہیں کیونکہ غزل
تو قصیدے کا اٹوٹ انگ تھی اسکی لاتعداد پسلیوں میں سے ایک پسلی تھی مگر
پھر ایک روز یہ پسلی قصیدے کے ڈھانچے سے الگ ہو گئی اس نے سوچا
بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ہر وقت زمیں بوس ہوتے چلے جاؤ۔"

"غزل"

" ایک اچھی گاڑی ہر لحظہ ڈرائیور سے ہم کلام ہوتی ہے کیونکہ اس پر جو کچھ گزر رہا
ہوتا ہے اس پر جو کچھ گزرنے والا ہوتا ہے وہ سب کچھ باآواز بلند بتا رہی ہوتی
ہے صرف اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے جتنے ناز نخرے ہم نئی گاڑیوں کے اٹھاتے
ہیں اگر پرانی گاڑیوں کے اٹھانے لگیں تو وہ مسلسل سڑک پر رہیں ورکشاپ
نئی گاڑیوں کا نخرہ ہے اور پرانی گاڑیوں کی مجبوری نئی گاڑی تو خود ہم پر سوار ہوتی
ہے جبکہ پرانی گاڑی پر ہم خود سوار ہوتے ہیں۔"

"نئی پرانی گاڑیاں"

" انسان کتنا بھولا بھالا ہے اتنا بھی علم نہیں کہ یہ سارا جہان [illegible] اور یہ ساری
خلق خدا اسی صدائے بازگشت کا ایک روپ ہے جو صدائے کُن کی صورت
نمودار ہوئی تھی لیکن جو آہنگ بے آواز ہے البتہ کسی روز یہ صدائے بازگشت
صور اسرافیل بن کر پھٹے گی تو پھر شاید اسکے وجود کی خبر ہو سکے اس کا مطلب
یہ ہوا کہ ہماری چار دن کی زندگی فقط "کن" اور "صور" کے درمیانی وقفے کا نام
ہے۔ کیا واقعی؟

"صدائے بازگشت"

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انشائیہ کا مسلک آزادہ روی ہے وہ شاہراہ پر سفر کرنا
کم ہی پسند کرتا ہے بلکہ بار بار شاہراہ کو ترک کرکے چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر سفر کرتا دکھائی دیتا ہے،
بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اپنے عمل سے خود ہی ایک نئی پگڈنڈی تراشتا ہے شاہراہ پر چلنے والوں کی نظر
میں پگڈنڈی اختیار کرنا وقت کا ضیاع ہے کیونکہ ایسا کرنے سے تو زندگی کے عظیم مقصد سے ہٹ

کہ معمولی معمولی باتوں پر مرکوز ہو جاتی ہے مگر انشائیہ نگار کا کہنا ہے کہ اس کائنات میں اکبر اور اصغر MACRO اور MICRO میں حدِ فاصل قائم کرنا ایک بے معنی بات ہے کیونکہ یہاں جُزو بھی اتنا ہی بے کراں ہے جتنا کُل اور معمولی شے کو بھی کسی دوسرے زاویے سے دیکھیں تو وہ غیر معمولی دکھائی دیتی ہے۔ ہم انسانوں نے بھی اپنے تحفظ کے لیے ہر طرف قاعدوں، اصولوں، عقیدوں اور نظریوں کی دیواریں ابھار رکھی ہیں۔ ان کی اہمیت سے انکار نہیں ہے مگر انشائیہ نگار کا کہنا ہے کہ اگر آپ ان دیواروں میں روزن نہیں بنائیں گے تو تازہ ہوا کی کمی کے باعث آپ کا سانس رکنے لگے گا۔ دیکھا جائے تو انشائیہ بجائے خود ایک روزن ہے جس سے لگ کر آپ نہ صرف باہر کی تازہ ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ جس کے ذریعے آپ باہر کی وسیع و بے کنار دنیا سے بھی متعارف ہوتے ہیں۔ کسی شئے کو دیکھنا اسے اوڑھ لینے کے مترادف ہے سو جب انشائیہ نگار روزن میں سے باہر کی دنیا کو دیکھتا ہے تو گویا اُسے اوڑھ لیتا ہے یوں وہ اپنے بندی خانے سے آزادی پاتا ہے۔ وہ نہ صرف خود آزاد ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو آزادی حاصل کرنے کا راستہ بھی دکھاتا ہے اگر کوئی صنفِ ادب جمود و بند سے رہائی کا ایسا اچھا انتظام کر سکے تو اس سے زیادہ جاندار صنف اور کیا ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ انشائیہ ایک ایسا روزن ہے جس کا رُخ باہر کے علاوہ اندر کی طرف بھی ہے لہٰذا انشائیہ نہ صرف کائنات اکبر کی سیاحت کرنے میں کامیاب ہے بلکہ کائنات اصغر کی غواصی پر بھی قادر ہے۔ دونوں صورتوں میں اسے شئے، شخصیت، اور شاہراہ کی قید سے رہائی ملتی ہے۔

اوپر میں نے انشائیہ کو طنزیہ مزاحیہ مضامین سے ممیز کرنے کی کوشش کی ہے اب میں چند الفاظ میں انشائیہ اور عام مضمون کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ عام مضمون سے میری مراد تنقید، تاریخ، سائنس یا سیاست کے موضوع پر لکھا گیا مضمون نہیں بلکہ عام سے غیر رسمی اور بظاہر غیر اہم موضوعات پر قلم بند کی گئی تحریر ہے۔ طنزیہ یا مزاحیہ مضمون کو انشائیہ سے الگ کر کے دکھانا نسبتاً آسان تھا مگر غیر رسمی موضوع پر لکھے گئے مضمون کو انشائیہ سے الگ کر کے دکھانا قدرے مشکل ہے کیونکہ دونوں کا میدان ایک ہے تاہم اندازِ نظر کا فرق اتنا زیادہ ہے کہ دونوں کو ایک ہی زمرے میں شامل کرنا ممکن نہیں ہے۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے جو مضامین لکھے ان کے موضوعات تو تقریباً اسی وضع کے تھے جو انشائیہ نگار کو مرغوب ہے مگر مزاجاً یہ مضامین ESSAY کے تحت شمار ہو سکتے ہیں نہ کہ (LIGHT ESSAY) کے تحت جن میں موضوع کو منطقی طور پر نہیں بلکہ تخلیقی طور پر ابھارا جاتا ہے۔ میں اس سلسلے میں ایک ہی موضوع پر لکھے گئے ایک ESSAY اور ایک (LIGHT ESSAY) کے چند اقتباسات پیش کر کے اپنی بات کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

منشی پریم چند نے "زمانہ" (دسمبر ۱۹۰۹ء) کے شمارے میں "گالیاں" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انواع و اقسام کی گالیوں کی فہرست پیش کر کے دشنام طرازی کی عادت کی مذمت کی تھی۔ اس مضمون سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"اس سے بڑھ کر ہمارے قومی کمینہ پن اور نامردی کا ثبوت نہیں مل سکتا کہ جن گالیوں کو سن کر ہمارے خون میں جوش آجانا چاہیے ان گالیوں کو ہم دودھ کی طرح پی جاتے ہیں۔ یہ بھی قومی زبان کی ایک برکت ہے۔ قومی پستی دلوں کی غیرت اور خودداری کا احساس مٹا کر آدمیوں کو بے غیرت اور بے شرم بنا دیتی ہے۔"

"غصہ میں ہم گالی بکیں، دل لگی میں ہم گالی بکیں، گالیاں بک کر زور لیاقت ہم دکھائیں گیت میں گالی ہم گائیں، زندگی کا کوئی کام اس سے خالی نہیں۔"

"حق تو یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے رہنماؤں نے اس وبا عام کی بیخ کنی کرنے کے لیے سرگرم کوشش نہیں کی۔ اس امر کے اعادہ کی ضرورت نہیں کہ گالیوں کا اثر ہمارے اخلاق پر بہت خراب پڑتا ہے۔ گالیاں ہمارے نفس کو مشتعل کرتی ہیں اور خودداری اور پاس عزت کا احساس دلوں سے کم کرتی ہیں جو ہم کو دوسری قوموں کی نگاہوں میں وقیع بنانے کے لیے ضروری ہے"

غور کیجیے کہ منشی پریم چند کے اس مضمون میں سرسید کی آواز کتنی صاف اور واضح سنائی دے رہی ہے۔ پریم چند نے موضوع کا انتہائی سنجیدگی سے منطقی انداز میں جائزہ لیا ہے اور موضوع کے بارے میں وہ سارے حقائق پیش کر دیے ہیں جو ہمیں پہلے سے معلوم ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ گالیوں کی بیخ کنی کے لیے ایک پنج سالہ قومی منصوبہ کی بھی سفارش کر دی ہے۔ یہ تمام باتیں انشائیہ کے مزاج اور اسپرٹ کے منافی ہیں۔

منشی پریم چند نے یہ مضمون [illegible]ء میں لکھا تھا اس کے تقریباً ستر برس بعد اسی موضوع پر غلام جیلانی اصغر نے ایک انشائیہ لکھا اس انشائیہ سے میں چند اقتباسات پیش کرتا ہوں تاکہ مضمون اور انشائیہ کا فرق واضح ہو سکے۔

"گالی دینے کا یہ فائدہ ہے کہ آدمی گالی دے کر فارغ ہو جاتا ہے اور ذہنی طور پر ایک خوشگوار آسودگی محسوس کرتا ہے۔ اعصاب کا کھنچاؤ دور ہو جاتا ہے اور دل کی گہرائیوں میں بہجت اور سرور کا عالم ہوتا ہے۔ پنجاب میں جو آپ کو ہشاش بشاش، مونچھیں، پُر وقار، پیٹ اور بڑھکیں مارتے ہوئے چہرے نظر آتے ہیں تو دراصل اس کی وجہ منہ نہار کی وہ گالی ہے جس پر تمام وید اور حکیم زور دیتے ہیں"

"گالی جتنی سقیم اور کمزور ہوگی گالی دینے والے کی شخصیت اتنی ہی گھٹی گھٹی ہوگی۔ گالی جتنی پُر وقار اور پُر زور ہوگی شخصیت میں اتنا ہی وقار اور کشادگی ہوگی۔ چھوٹا آدمی ڈرتے ڈرتے چھوٹی سی گالی دیتا ہے اور پھر فوراً اپنی ذات کے ڈربے میں چھپ جاتا ہے۔ لیکن بڑا آدمی موٹی سی گالی کی کمند پھینک کر اسے ڈربے سے باہر کھینچ لاتا ہے۔"

"گالی دینے سے جمہوریت کو فروغ ملتا ہے۔ آمریت صرف اسی دور میں پنپ سکتی ہے جب گالیوں پر قدغن لگا دی جائے۔ اسی لیے ایک اچھے نظام میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر ہائیڈ پارک کی گنجائش رکھتا ہے"

مگر ایک آزاد طبع انشائیہ نگار کے ہاتھوں میں آیا تو اسلوبِ اظہار کے ساتھ ساتھ اسلوب خیال بھی تبدیل ہو گیا۔ منشی پریم چند اپنے موقف کے سلسلے میں بے حد سنجیدہ ہیں ان کی جگہ کوئی مزاح نگار ہوتا تو انتہائی غیر سنجیدہ ہو جاتا مگر انشائیہ نگار کا کام یہ ہے کہ وہ سنجیدگی اور غیر سنجیدگی کی ملتی ہوئی سرحد پر چہل قدمی کرتا ہے، گویا پل صراط پر چلنے کا انداز ہے وہ موضوع کے ساتھ گویا کھیلتا ہے، ایک ہی وقت میں موضوع کی ناہمواری کو بھی نشان زد کرتا ہے اور اسکے گہرے مفاہیم کو بھی۔ غلام جیلانی اصغر نے اپنے انشائیہ "گالی دینا" میں یہی انداز اختیار کیا ہے چنانچہ جب ہم انشائیہ پڑھ چکتے ہیں تو گالیوں کی قابلِ مذمت بالائی سطح اور اس کے مضحک نظام کے ساتھ ساتھ ہم پر اسکے گہرے مطالب اور نئے پرت بھی عیاں ہونے لگتے ہیں یوں ہم گالی کے روشن پہلوؤں تک رسائی پاکر اپنے پیش پا افتادہ روایتی اصلاحی اور اخلاقی اندازِ نظر پر غور کرنے لگتے ہیں۔ انشائیہ ہنسنے ہنسانے کے عمل یا پند و نصائح کے کاروبار سے آگے کی چیز ہے جو انسانی فکر و عمل کو ایک نئے زاویئے سے دیکھتی ہے اور نتیجتاً ہمیں آگاہی کے ارفع مدارج تک لے جانے میں کامیاب ہوتی ہے۔

اردو میں مضمون نگاری کا آغاز کرنے والوں میں سر سید احمد خاں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے مگر خود سر سید اس سلسلے میں مغرب کی مضمون نگاری سے متاثر تھے سر سید کے زمانے کی مغربی ادبیات میں مضمون نگاری نے تین واضح صورتیں اختیار کر رکھی تھیں ایک صورت تو علمی اور سائنسی یا اصلاحی مضامین کی تھی دوسری طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کی اور تیسری لائٹ ایسے کی جس میں مضمون نگار نے غیر افسانوی نثر کو ادب کی سطح تفویض کر دی تھی سر سید نے ان میں سے علمی اور اصلاحی طرز کو اردو میں رائج کیا اور جہاں غیر رسمی موضوعات پر اظہار خیال کیا وہاں بھی زیادہ تر منطقی انداز ہی کو اپنایا لہٰذا انہیں ہم اردو میں لائٹ ایسے یعنی انشائیہ کا موجد یا علم بردار نہیں کہہ سکتے تاہم اردو نثر کے فروغ کے سلسلے میں سر سید کی عطا سے انکار ممکن نہیں ہے، آج اگر اردو نثر نے اپنے اندر علمی سائنسی اور تنقیدی نظریات کو پیش کرنے کی صلاحیت پیدا کر لی ہے تو یہ سر سید کی اولین مساعی ہی کا نتیجہ ہے، دوسری طرف طنزیہ مزاحیہ مضامین کو اردو میں رواج دینے کے ضمن میں زیادہ اہمیت اودھ پنچ اور اسکے معاونین کو حاصل ہے گو اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ان لوگوں نے زیادہ پھکڑ پن اور ہجویانہ انداز ہی کو فروغ دیا بعد ازاں اردو میں طنز اور مزاح ایک مثالی انداز میں نمودار ہوئے اور یہ سلسلہ ہمیں فرحت اللہ بیگ، فلک پیما، رشید احمد صدیقی، پطرس، کنہیا لال کپور اور امتیاز علی تاج سے گزر مشتاق احمد یوسفی تک صاف دکھائی دیتا ہے، مضمون نگاری کی ان دونوں صورتوں کے بین بین خالص انشائیہ کی روش تھی جسے بعض ادباء نے غیر شعوری طور پر اپنانے کی کوشش تو کی مگر شاید ابھی ذریعۂ اظہار یعنی اردو نثر اس سطح پر نہیں پہنچ پائی تھی کہ انشائیہ کے لطیف نکات کو گرفت میں لے سکتی، یا شاید خود لکھنے والوں کے ہاں ابھی انشائیہ کا مزاج واضح نہ تھا کہ انہوں نے اپنے مضامین میں یہاں وہاں انشائی نکتے تو پیدا کیے مگر کوئی مکمل انشائیہ لکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا اس سلسلے میں بہت سے نام گنوائے گئے ہیں یہاں تک کہ بعض کرم فرماؤں نے قاری کو بھی نہیں بخشا اور اس کی کئی دستی تحریروں کو بھی انشائیہ کا تشخص دیا ہے، دیگر جن لکھنے والوں کے نام لیے گئے ہیں ان میں محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد دہلوی، الطاف حسین حالی، مولوی ذکاء اللہ دہلوی، رتن ناتھ سرشار، وحید الدین

سلیم احمد، عظیم شرر اور ان کے بعد نیاز فتح پوری، شیخ عبد القادر، مہدی افادی، ناصر علی دہلوی، سجاد انصاری، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، ابو الکلام آزاد اور بعض دیگر اکابرین کو خاص اہمیت حاصل ہے مگر دیکھا جائے تو ان لکھنے والوں میں بھی ناصر علی دہلوی، سجاد انصاری، خواجہ حسن نظامی اور ابو الکلام آزاد ہی وہ ادیب تھے جن کے ہاں انشائیہ کے مخصوص مزاج اور اسلوب کی طرف پیش قدمی کے شواہد ملتے ہیں، یہ وہ لوگ تھے جو انشائیہ نگار بنتے بنتے رہ گئے، وجوہ وہی تھیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا۔

ایک بات کا ذکر کر دوں، یہ ادبا جن کا جھکاؤ لائٹ ایسے کی طرف تھا انہیں اس بات کی خبر نہیں تھی کہ وہ غیر شعوری طور پر کس سنہری چڑیا کو زیر دام لانے کے متمنی ہیں اسی طرح پاکستان کے وجود میں آنے سے ذرا قبل کرشن چندر، فلک پیما اور رشید احمد صدیقی ابھرے جن کے ہاں بھی انشائیہ نویسی کا رجحان شعوری سطح پر موجود نہیں تھا گو ان کے مضامین میں انشائی عناصر یقیناً موجود تھے اسی زمانے میں اختر اورینوی وہ پہلا ادیب تھا جس نے لوگوں کو شعوری طور پر لائٹ ایسے کے مزاج سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔ اختر اورینوی نے علی اکبر قاصد کے مضامین کے مجموعے کا جو دیباچہ تحریر کیا اس میں پہلی بار نہ صرف لائٹ ایسے کے مقتضیات کے بارے میں کھل کر لکھا بلکہ "لائٹ ایسے" کے لیے انشائیہ کا لفظ استعمال کیا مگر جن مضامین (یعنی علی اکبر قاصد کے مضامین) پر اس نے لفظ انشائیہ چسپاں کرنے کی کوشش کی وہ عام سے مزاحیہ مضامین تھے جن کا انشائیہ سے کوئی تعلق نہیں تھا لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اختر اورینوی انشائیہ کے مقتضیات کو پیش کرنے پر تو قادر تھا لیکن انشائیہ کو پہچاننے میں کامیاب نہ ہو سکا اس لیے اس کا تجویز کردہ لفظ انشائیہ بھی اس زمانے میں مقبول نہ ہو سکا۔

تقسیم کے فوراً بعد (بالخصوص پاکستان میں) انشائیہ نویسی کا رجحان اپنے واضح خد و خال کے ساتھ نمودار ہوا اس زمانے میں نظیر آغا، داؤد رہبر، جاوید صدیقی، ممتاز مفتی اور امجد حسین کے ایسے مضامین سامنے آئے جن میں سے بعض انشائیہ کے اولین نمونے تھے گو ان ادبا کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ صنف انشائیہ میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ دراصل یہ لوگ اپنی ترنگ میں اشیا، تجربات اور تعقلات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے مگر اس کے نتیجے میں ان کے ہاں جو تحریریں جنم لے رہی تھیں وہ مغرب کی مقبول صنف ادب یعنی "لائٹ ایسے" یا انشائیہ کے زمرے میں شامل تھیں خود راقم الحروف کو اس بات کا اعتراف ہے کہ نظیر آغا کے نام سے اس کا جو پہلا انشائیہ ادبی دنیا میں چھپا تھا وہ بطور انشائیہ لکھا ہی نہیں گیا تھا البتہ اس کے تین چار برس بعد قیوم نظر کے ایما پر اس نے شعوری طور پر ایک انشائیہ بعنوان "گرمی" لکھا اور یہیں سے پاکستان میں انشائیہ نگاری کی ایک باقاعدہ تحریک کا آغاز ہو گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گو راقم الحروف کو اس بات کا علم تھا کہ وہ لائٹ ایسے لکھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کے لیے کوئی موزوں متبادل اردو لفظ اسے سوجھا نہیں تھا چنانچہ آغاز کار میں "ایسے"، "لائٹ ایسے"، "لطف پارہ" وغیرہ الفاظ اور تراکیب رائج کرنے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ انہیں دنوں ہندوستان میں فکاہی مضامین کے لیے بعض ادبا نے انشائیہ کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا، راقم الحروف نے "ادب لطیف" کی معاونت سے اس لفظ کو "لائٹ ایسے" کے لیے استعمال کرنے کا آغاز کیا اور خوش قسمتی یہ ہوئی کہ نہ صرف اردو انشائیہ کی تحریک کامیاب ہوئی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ لفظ انشائیہ بھی مقبول

ہو گیا۔

اردو انشائیہ نگاروں کی پہلی کھیپ میں مشکور حسین یاد، مشتاق قمر، جمیل آذر اور غلام جیلانی اصغر تھے ان میں مشکور حسین یاد انشائیہ شناس تو تھے مگر ایک تو وہ اصلاحی رویے کی قدیم روایت سے تابع تھے دوسرے ان کے ہاں منطقی انداز نسبتاً نمایاں تھا مگر دوسرے انشائیہ نگاروں بالخصوص مشتاق قمر مرحوم، جمیل آذر، غلام جیلانی اصغر، انور سدید، کامل القادری، اکبر حمیدی، اور سلیم آغا قزلباش اور ارشد میر نے جو انشائیے لکھے وہ لائٹ ایسے کے معیار پر پورا اترتے تھے ان کے بعد لکھنے والوں کی ایک اور کھیپ سامنے آگئی جس میں شہزاد احمد، رام لعل نابھوی، محمد اسد اللہ، جمیل قریشی، حامد برگی، انجم نیازی، بشیر سیفی، حسرت کاسگنجوی، جان کاشمیری، شمیم ترمذی، محمد اقبال انجم، خالد پرویز صدیقی، حنیف باوا، خیر الدین انصاری، محمد یونس بٹ، رشید احمد گوریجہ، مشتاق احمد، محمد ہمایوں، ناصر عباس نیر اور دیگر بہت سے انشائیہ نگار تھے جنہوں نے اس صنف ادب میں طبع آزمائی کی اور کر رہے ہیں آج اردو انشائیہ اپنے عروج پر ہے اور ہر چند کہ اس تحریک کو اردو ادب کا جزو بدن بنے ابھی چالیس برس سے زیادہ کا عرصہ نہیں ہوا تاہم اس قلیل مدت میں بھی اسکے طفیل متعدد ایسے اعلیٰ پائے کے فن پارے وجود میں آئے جنہیں ہم کامل اعتماد کے ساتھ مغرب کے بہترین لائٹ ایسیز کے مقابلے میں پیش کرسکتے ہیں اردو انشائیہ کی کامیابی کا ایک اہم ثبوت یہ بھی ہے کہ انشائیہ کی صنف کے خلاف بالخصوص ایک اخباری مہم چلائی گئی ہے جو اب اردو کے بعض سرکاری جریدوں میں بھی نظر آنے لگی ہے کسی بھی صنف ادب کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگانا چاہیے کہ اس کے خلاف ردعمل کی شدت کس قدر ہے انشائیہ اور اردو انشائیہ نے جو شدید ردعمل پیدا کیا ہے وہ اب سامنے کی بات ہے تاہم اس ردعمل میں مضمر بغض یا نفرت کی زیریں لہر کا احساس ابھی زیادہ لوگوں کو نہیں ہے مگر وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہے جب ردعمل کا شخصی پہلو قاری پر عیاں ہو جائیگا۔ جب ایسا ہوا تو اردو انشائیہ کے فروغ کے راستے میں آخری رکاوٹ بھی باقی نہیں رہے گی۔

(اصناف ادب کانفرنس پشاور یونیورسٹی میں پڑھا گیا)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری
سی ۲۴۔ ۱۳۔ ڈی
گلشن اقبال کراچی

مولانا عارف ہسوی، مولانا حسرت موہانی کے اوّلین سوانح نگار

عارف ہسوی کو جیسا کہ نام سے ظاہر ہے "ہسوہ" سے آبائی نسبت ہے۔ "ہسوہ" ضلع فتح پور (یو۔پی) کا ایک مشہور تاریخی قصبہ ہے شہر فتح پور جی۔ٹی۔ روڈ پر الہ آباد و کانپور کے اضلاع کے وسط میں گنگا اور جمنا کے درمیان واقع ہے۔ شہر فتح پور سے الہ آباد کی طرف چلیے تو جی۔ٹی روڈ سے ملحق دائیں طرف قصبہ ہسوہ کی آبادی نظر آتی ہے۔ شہر فتح پور سے اس کا فاصلہ سات میل کے قریب ہے "ہسوہ" اپنی مردم خیزی اور علماء و بزرگانِ دین کا مرکز ہونے کے سبب علمی و ادبی حلقوں میں خاصا معروف ہے اسی لیے ضلع فتح پور اور آگرہ (اکبر آباد) کی تحصیل فتح پور سیکری میں تمیز کرنے کے لیے اس کے نام کے بعد عموماً "ہسوہ" لکھ دیا جاتا ہے۔

"ہسوہ" پہلے "ہنسوہ" کہلاتا تھا اور پرانی کتابوں میں عموماً یہی املا ملتا ہے ۱۹۰۶ء کا فتح پور ڈسٹرکٹ گزیٹیر میرے سامنے ہے اور اس میں "ہنسوہ" کی وجہ تسمیہ یہ بتائی گئی ہے کہ قنوج کے راجہ جے چند کے خاندان کے جس راجہ کو شکست دے کر قطب الدین ایبک کے سپہ سالار نے اس قصبے پر قبضہ کیا تھا اس کا نام ہنس راج تھا اور غالباً اسی نام کے تعلق سے اس کو ہنسوہ کہا جاتا تھا لیکن بعد کو مذاقِ سلیم نے اس نام میں نون غنہ کی ثقالت کو محسوس کیا اور عام بول چال میں اسے ہسوہ کہا جانے لگا اور اس سے متعلق حضرات نے اپنے نام کے ساتھ ہسوی لکھنا شروع کر دیا چنانچہ عارف ہسوی کے نام اور نسبت کی بھی یہی صورت ہے۔

فتح پور کے جن قصبات میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان میں ہسوہ کو تصوف و سلوک اور علم و فن کے حوالے سے ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ بات یہ ہے کہ ہسوہ نے ایک دو نہیں متعدد علمائے دین، صوفیائے کرام اور ادیب و شاعر پیدا کیے ان میں سے اکثر نے برِصغیر پاک

وہند کی ثقافتی و اسلامی تاریخ میں نام پایا اور اپنے بعد بھی اس روایت کو برقرار رکھنے والوں کا ایک وسیع حلقۂ یادگار چھوڑ گئے ہسوہ کے ان بزرگوں میں مولانا شاہ ابوالقاسم ہسوی، سید سراج الدین ہسوی، شاہ غلام علی ہسوی، سید عبدالقادر ہسوی، مولوی شاہ عبدالعزیز اور مولانا عبدالسلام ہسوی وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں

مولانا عبدالسلام ہسوی کا تاریخی نام ریاض الحسن تھا ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں رحلت فرمائی۔ علوم اسلامی میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے شریعت کے سختی سے پابند اور تصوف میں سلسلہ نقشبندی سے منسلک تھے ان کا حلقۂ اثر بھی نہایت وسیع تھا پاک وہند کے متعدد ممتاز صوفیہ و علما اور ادبا و شعرا مثلاً سید شاہ نعیم الدین محمد محسن کاکوروی، حافظ محمد ناظر کاکوروی، حاجی واحد علی وحید، حکیم سید عبدالحی، مولانا سکندر علی خاں، مولوی رحمت علی، میر شاہ قدرت علی، مولانا عبدالغفور بلندوی وغیرہ مولانا عبدالسلام کے حلقۂ ارادت و تلمذ کے ارکانِ خاص میں سے ہیں۔ حکیم سید عبدالحی مصنف "گل رعنا" اور صاحب نزہت الخواطر، مولانا عبدالسلام کے حقیقی بھانجے تھے ہمارے عہد کے نامور اسلامی مفکر اور اسکالر مولانا ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) انہی مولوی عبدالحی کے فرزند رشید ہیں گویا ہسوہ کے اس دینی خانوادوں نے علم وفن کی شمع ہنوز جلا رکھی ہے اور اسکے ارکان ندوۃ العلماء سے مستفیض ہونے کے سبب عموماً اپنے نام کے ساتھ ندوی لکھتے ہیں مولانا عارف ہسوی کا تعلق بھی اسی قصبہ ہسوہ اور ہسوہ کے اسی حلقۂ علما و صوفیہ سے ہے جس کی چند ممتاز شخصیتوں کا ذکر ابھی اوپر آیا ہے۔

مولانا عارف ہسوی کے والد کا نام عبدالخالق تھا جو ایک صوفی منش بزرگ تھے عارف ہسوی کے والد ماجد کے بارے میں مولانا امداد صابری نے لکھا ہے کہ وہ۔

"مولانا شاہ عبدالسلام ہسوی سے بیعت تھے اور ان کے خلیفہ بھی تھے آخر عمر میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی استفادہ کیا تھا تصوف کا اس قدر غلبہ تھا کہ اسی رعایت سے انہوں نے عارف سے پہلے بھی جو دو تین بچے ہوئے ان کا نام یکے بعد دیگرے عارف رکھا مگر کسی نے زندگی نہ پائی چنانچہ جب عارف صاحب پیدا ہوئے تو ان کی والدہ کو خیال پیدا ہوا کہ یہ نام منحوس ہے اس لیے اس بچے کا نام یہ نہیں رکھوں گی مگر ان کے والد مستحکم عقیدے کے بزرگ تھے انہوں نے اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور ان کا نام بھی متوفی بھائیوں کے نام پر عارف ہی رکھا خدا نے ان کو زندگی بخشی "

عبدالخالق کے تین بیٹے تھے پہلی بیوی سے بیٹے کا نام یوسف حسین تھا پہلی بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی کی دوسری بیوی سے دو بیٹے ہوئے عارف حسین اور حافظ ابراہیم حسین ... ابراہیم حسین کے دو بیٹے یعنی عارف حسین کے حقیقی

بھتیجے حیات ہیں بڑے بیٹے محمد مصطفےٰ ہندستان اور چھوٹے بیٹے احمد حسن کراچی میں ہیں احمد حسن صاحب نے مجھے بتایا کہ:

"مولانا عارف حسن ہسوی میرے حقیقی تایا تھے عارف حسن نے شادی کی تھی مگر اولاد کوئی نہ تھی عارف ہسوی کی وفات کے بعد ان کی بیوی بہت دنوں تک حیات رہیں اور ہندستان کی کانگرس حکومت سے جب تک وہ حیات رہیں وظیفہ ملتا رہا بیگم عارف حسن اپنے خاندان اور عرفِ عام میں ثمۃ بی بی کے نام سے مشہور تھیں انتقال ہسوہ میں ہوا اور وہیں مدفون ہیں"

مولانا عارف کی تاریخ پیدائش اور تعلیمی درسگاہوں کا پتا نہ چل سکا لیکن فتح پور میں ان کا دوستانہ تعلق چوں کہ نیاز فتح پوری اور مولانا حسرت موہانی سے رہا اس لیے یقین ہے کہ حسرت و نیاز کی طرح انہوں نے بھی مدرسہ اسلامیہ فتح پور ہی میں تعلیم پائی ہوگی اس لیے کہ اس وقت اس مدرسے کے سوا فتح پور میں کوئی اور قابلِ ذکر درسگاہ نہ تھی حسرت موہانی اور نیاز فتح پوری سے عارف ہسوی کے گہرے روابط یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ان دونوں کے ہم عصر کہے جا سکتے ہیں اگرچہ عمر میں ان دونوں سے چھوٹے تھے مولانا امداد صابری کا بیان ہے کہ: ۔

"عارف صاحب نوجوانی میں غالباً ۱۹۱۱ء کے وسط میں دہلی آ گئے تھے نوجوانی سے مراد زیادہ سے زیادہ بیس تیس سال تک کی عمر ہو سکتی ہے اس اعتبار سے عارف ہسوی ۱۸۸۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہونگے اور ان کی ابتدائی تعلیم اسی طور پر ہوئی ہوگی جس کا اس زمانے کے پڑھے لکھے گھرانوں میں رواج تھا چنانچہ انھیں بھی اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح زبان و ادب، صحافت، سیاست اور شاعری سے دل چسپی رہی سیاست و صحافت میں انھوں نے خصوصیت سے دل چسپی لی اور دونوں میں اپنا امتیازی نشان بنایا نیاز فتح پوری نے ایک جگہ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ

"عارف صاحب کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ تھا فارسی اور اردو کے اشعار خوب سمجھتے تھے اور نقد و تبصرہ کی ماہرانہ قابلیت بھی ان میں تھی"

یقیناً مولانا عارف ہسوی ایک خوش فکر شاعر بھی تھے اور آخر تک شعر کہتے رہے لیکن ان کا کلام یکجا نہ ہو سکا بیشتر چیزیں ضائع ہو گئیں بقیہ اس زمانے کے مختلف رسائل میں بکھری پڑی ہیں۔ شاہ دلگیر اکبر آبادی کے رسالے "نقاد" بابت ستمبر ۱۹۱۴ء میں ان کی ایک غزل شائع ہوئی ہے یہ امداد صابری کی تاریخ "صحافت اردو" جلد پنجم میں بھی نقل ہوئی ہے اس کے ساتھ انھوں نے ایک اور غزل بھی نمونتاً درج کی ہے دونوں غزلیں عاشقانہ ہیں اور روایتی طرزِ سخن سے تعلق رکھتی ہیں پھر بھی زبان و بیان کی پاکیزگی اور عشقیہ جذبات کی چاشنی سے خالی نہیں ہیں بطور نمونہ دونوں کے مقطعے اس جگہ درج کیے جاتے ہیں

جیب حال تھا اللہ بخشے عارف کو
جیا غریب وہ جب تک بس اشکبار رہا

عارف خستہ کی حالت دیکھ کر
ان کے بھی آنسو بھر آئے رو دیے

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا عارف ہسوی کا اصل میدان شاعری نہیں بلکہ سیاست و صحافت تھا صحافت و سیاست دونوں میں انھوں نے حریتِ قلم و استقامتِ فکر و نظر کے سبب نام پایا اور برصغیر پاک و ہند کے مجاہدین آزادی کے صفِ اول میں اپنا نام لکھوایا البتہ ان کے ذوقِ ادبی نے انھیں سیاست و صحافت کے ساتھ ساتھ ادبیات سے بھی کسی نہ کسی طور پر منسلک رکھا اس اِنسلاک کا سب سے ممتاز اور اہم نشان وہ ہے جس میں اپنے دور کے نامور شاعر اور ادیب مولانا حسرت موہانی کی زندگی کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے میری مراد مولانا عارف ہسوی کی تصنیف "حالاتِ حسرت" سے ہے "حالاتِ حسرت" دراصل مولانا حسرت موہانی کی پہلی مستند سوانح حیات ہے یہ ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹-۱۹۱۸ء میں اس وقت مطبوعہ صورت میں منظرِ عام پر آئی ہے جب کہ مولانا حسرت اور مولانا عارف دونوں کو جوان العمر کہا جا سکتا ہے بلکہ اس سے پہلے جولائی ۱۹۱۷ء کے نقاد میں عارف کا ایک طویل تبصرہ بھی مولانا حسرت کی شاعری کے بارے میں "دیوانِ حسرت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا

عارف ہسوی کا مولانا حسرت کے حالاتِ زندگی اور فکر و فن سے ان کا شغف ظاہر کرتا ہے کہ انھیں اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ مولانا حسرت کی درویشانہ و مجاہدانہ زندگی سے بھی بہت گہرا تعلق تھا تعلق کیوں نہ ہوتا عارف ہسوی بھی حسرت کی طرح عمر بھر برطانوی سامراج کے باغی اور برصغیر کی آزادی کے جانباز سپاہی تھے زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند کی سختیوں میں گزرا اور زندگی عسرت و مشقت میں بسر ہوئی لیکن کبھی کسی عالم میں قناعت و صبر و توکل اور دیانت و صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہمیشہ وہی کہا اور وہی کیا جسے سچ جانا گویا فکر و کردار کے اعتبار سے وہ دوسرے حسرت موہانی تھے یا مولانا حسرت موہانی کی شخصیت میں خود کو دیکھتے تھے اور اس کی تقلید و تائید میں زندگی بسر کرتے تھے تب ہی تو انھوں نے عین جوانی میں ضروری جانا کہ مولانا جیسے حریت پسند اور بے باک مجاہد آزادی کے حالاتِ زندگی قلم بند کیے جائیں اور انھیں برصغیر کے نوجوانوں کے سامنے رکھ کر ان کی غیرتِ ملی اور حمیتِ قومی کو ابھارا جائے ان میں حصولِ آزادی کی امنگ پیدا کی جائے اور ان کے سامنے کردار و عمل کا ایک نمونہ رکھ کر انھیں حق و صداقت کی راہ پر گامزن کرنے کی کوشش کی جائے یقیناً عارف ہسوی اس کوشش میں کامیاب ہوئے اس لیے کہ حالاتِ حسرت کی اشاعت کے بعد حسرت کی ایک ایسی تصویر منظرِ عام پر

ی جس سے لوگ نا آشنا تھے۔
"حالاتِ حسرت" ۲۲×۲۹ کی سائز پر اکیس سطری مسطر میں ساٹھ صفحات کی
رسی کتاب ہے لیکن مولانا حسرت کی ابتدائی سیاسی زندگی کے باب میں مستند دستاویز
ی حیثیت رکھتی ہے اس کتاب کا حوالہ "مولانا حسرت" کے بارے میں لکھی جانے والی بعض
ب و مقالات میں ملتا ہے کہیں صرف کتاب کے نام کے ساتھ اور کہیں کتاب کے مصنف
لانا عارف ہسوی کے نام کے ساتھ لیکن واقعاتی صورت یہ ہے کہ اصل مطبوعہ کتاب میں
یں بھی عارف ہسوی کا نام بحیثیت مصنف یا مولف درج نہیں ہے۔ کتاب کے ٹائٹل
سے صرف یہ پتا چلتا ہے کہ یہ صدر دفتر "اعانت نظربندانِ اسلام" دہلی کی طرف سے شائع
دئی ہے اور یہ سلسلۂ حالات نظربندانِ اسلام کی تیسری کتاب ہے اس میں حسرت کی
اعری یا علمی و ادبی خدمات کی تفصیلات کے بجائے صرف مولانا حسرت کی سوانح عمری و
ام اسیری کے مفصل حالات درج ہیں ان حالات کو کتابی صورت میں سلسلہ "حالاتِ
نظربندانِ اسلام" کے تحت شائع کرنے کے لیے ایک باقاعدہ کمیٹی قائم تھی اس کمیٹی کے
رکانِ خاص میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمن کے نام شامل تھے اور معاونین"
عین کے نام امدادی رقوم بھیجتے تھے چنانچہ "حالاتِ حسرت" کو ایک مدت تک سلسلہ
نظربندانِ اسلام کی کمیٹی کی مرتبہ سمجھا گیا اور اس کا مصنف پردۂ گمنامی میں رہا۔ بقول ڈاکٹر
احمد لاری یہ انکشاف کہ "حالاتِ حسرت" دراصل مولانا عارف ہسوی کی تصنیف ہے
س وقت ہوا جب الناظر پریس لکھنؤ سے پہلی بار مولانا حسرت کے دیوان کا حصہ
ششم، ہفتم اور ہشتم شائع ہوا اور اس میں "حالاتِ حسرت" کا اشتہار "حالاتِ حسرت"، مولفہ
عارف ہسوی کے نام سے شائع ہوا

"حالاتِ حسرت" اگرچہ ضخامت و قامت میں مختصر ہے لیکن "ہرچہ بقامت کہتر بقیمت
بہتر" کے مصداق ہے اس کی اولین اہمیت تو یہ ہے کہ یہ مولانا حسرت کی زندگی کے بارے
میں پہلی کتاب ہے اور ان کے بارے میں تحقیقی و تنقیدی قلم اٹھانے والوں کے لیے
اساسی ماخوذ کی حیثیت رکھتی ہے یہ ماخذ ہر طرح معتبر و مستند ہے اس لیے کہ یہ ایک
ایسے صاحبِ قلم کی فکر و نظر کا حاصل ہے جو مولانا حسرت کو بہت قریب سے ذاتی
طور پر جانتا تھا اور انھیں کے سیاسی قبیلے کا آدمی تھا سفر و حضر سے لے کر قید و بند کی
صعوبتوں تک مولانا حسرت کا مددگار و دمساز تھا چنانچہ اس نے جو لکھا ہے وہ شنیدہ
نہیں بلکہ دیدہ و چشیدہ ہے اور اسی لیے ہر اعتبار سے یقین و استناد کے لائق ہے

حسرت کی سیاسی زندگی کے بارے میں اس کتاب سے پہلے خود مولانا حسرت
کی بعض تحریریں تو ملتی ہیں لیکن عارف ہسوی کے سوا حسرت کی حیات میں اس
طرح کی بے لاگ تحریر کسی اور کے قلم سے نہیں ملتی اس سے پہلے زمانہ کا نپور بابت
دسمبر ۱۹۰۸ء میں فانی خاں (سجاد حیدر یلدرم) کا ایک مضمون حسرت موہانی ایک قدردان

کی نظر سے "یقیناً شائع ہوا تھا لیکن یہ مضمون حسرت کی سیاسی زندگی سے متعلق نہیں بلکہ ان کے شعری و ادبی تحریروں پر تنقید و تبصرہ سے متعلق ہے۔ سیاسی حالات پر کچھ لکھنے سے گریز کا سبب یہ تھا کہ وہ زمانہ برطانوی سامراج کے سخت جبر و استبداد کا زمانہ تھا اور بہت کم لوگوں میں یہ جرأت تھی کہ وہ حسرت کے سیاسی خیالات و باغیانہ زندگی کی داد دیتے بلکہ اصل صورت یہ تھی کہ لوگ حکومت کے خوف سے مولانا حسرت سے ملتے ہوئے بھی کتراتے تھے اور اس میں بڑے بڑے صاحبان ثروت و اقتدار بھی شامل تھے چنانچہ عارف ہسوی کی کتاب کی اشاعت سے صرف یہ نہیں ہوا کہ مولانا حسرت کے حالاتِ اسیری سامنے آگئے بلکہ اس سے یہ بھی ہوا کہ اردو صحافت و ادب میں حریت قلم اور آزادانہ اظہارِ خیال کی روایت کو قوت ملی اور حکومت کا جو خوف دلوں میں بیٹھ گیا تھا وہ کم ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا حسرت کی زندگی ان کے طرزِ فکر اور ان کے باغیانہ خیالات کی داد مولانا عارف ہسوی جیسے حکومت کے باغی، بے باک اور حریت پسند اہل قلم دے سکتے تھے مولانا عارف ہسوی کی سیاسی و صحافتی زندگی پر نگاہ ڈالیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں شخصیوں میں مولانا حسرت موہانی کے قدم سے قدم ملا کر چلنے والے آدمی تھے اور ان کا ذہن برطانوی سامراج کے خلاف بغاوت کی آگ میں اسی طرح جل رہا تھا جس طرح حسرت موہانی کا۔ چنانچہ مولانا حسرت نے اپنے رسالے اردوئے معلیٰ میں برطانوی حکومت کے خلاف جس نوع کی بے باک و حق پرست صحافت کا آغاز کر رکھا تھا مولانا عارف ہسوی نے اسے شروع سے آخر تک برقرار رکھا نتیجتاً مولانا حسرت ہی کی طرح ان کی زندگی کا بیشتر حصہ بھی اسیری میں بسر ہوا۔

مولانا عارف کے معاصرین مثلاً واحدی، امداد صابری اور ضیاء الدین احمد برنی وغیرہ کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ مولانا ہسوی نے ۱۲-۱۹۱۳ء میں ہفتہ وار رسالہ "خطیب" سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا "خطیب" کا سیاسی کالم عارف ہسوی کے ذمے ہوتا تھا اسی زمانے میں وہ اخبار ہمدرد اور اخبار کانگریس وغیرہ سے بھی جزوی وقتی طور سے وابستہ رہے لیکن اخبارات جرائد کے مدیروں اور مالکوں کی مسلسل گزارشوں کے باوجود عارف کے قلم کی شدت میں کمی نہیں آئی اور آخرکار وہ ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیان دہلی سے نکلنے والے وہ سارے اخبار جن سے عارف وابستہ رہے ایک ایک کر کے بند ہو گئے ۱۹۲۰ء میں "حریت" نامی ایک اخبار دہلی سے نکلا اس کی ادارت عارف ہسوی کو سونپی گئی یہ واقعی حریت پسند اخبار تھا اور عارف ہسوی جیسا حریت پسند مدیر اس کو ملا ہوا تھا بہت مقبول ہوا لیکن حکومت اسے برداشت نہ کر سکی اور چند مہینوں کے اندر ہی حریت کو بند کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ بعد ازاں اخبار "استقلال" ۱۹۲۱ء میں مولانا

ہوئی بلکہ تحریر انگریزی حکومت کے حق میں تلوار کی دھار بنی رہی

مولانا عارف کی سیاسی تحریریں انگریزی سامراج کے خلاف باغیانہ خیالات سے لبالب ہوتی تھیں اور اخبار کے حریت پسند قارئین ان کا کالم بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے ہر چند کہ ان کے بیشتر کالم اور مضامین ان کے نام کے بغیر شائع ہوتے تھے لیکن اپنے اسلوب سے ان کی تحریریں پہچان لی جاتی تھیں "عظمتِ رفتہ" کے مصنف اور مولانا عارف ہسوی کے بہت قریبی دوست ضیاء الدین احمد برنی کا بیان ہے کہ

"عارف بہت لکھاڑ تھے لیکن ان کی تحریریں زیادہ تر بجانب ایڈیٹر ہوتی تھیں البتہ خصوصی مقامات پر ان کا نام چھپتا تھا ان کی تحریروں میں شگفتگی تھی اور وہ کافی زور دار ہوتی تھیں"

عارف کے ہمدرد و معاون بلکہ ایک طرح سے عارف کے سرپرست مُلّا واحدی نے اپنی کتاب "میرے زمانے کی دلّی" (حصہ اول) میں عارف کے بارے میں کئی ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جن سے عارف کا طرزِ تحریر، اندازِ فکر، سرشتِ مزاج اور اخلاق و اطوار سب پر بہت کار آمد روشنی پڑتی ہے صرف ایک واقعہ مُلّا واحدی کی زبان سے سنتے چلیں ان کا بیان ہے

"عارف حسن صاحب نہایت اچھے شاعر اور ادیب تھے میرا ہفتہ وار رسالہ "خطیب" ۱۹۱۱ء میں جاری ہوا تھا اس کی بنا آزاد صاحب قلمی امداد کیا کرتے تھے عارف صاحب نے اسکے سیاسی مضامین کا باب اپنے ذمہ لے لیا عارف صاحب بے حد تیز اور سخت لکھتے تھے میں تیزی اور سختی کو سمو دیتا تھا مہینوں ایسا ہوتا رہا کہ وہ لکھتے رہے اور میں خاموشی سے ان کے مضامین کی کٹائی کرتا رہا"

میری خاموشی اور کچھ نہ لکھنے سے متاثر ہو کر ایک دن عارف صاحب نے فرمایا "افسوس ہے کہ آپ پر ایک نیا بار پڑ گیا ہے مگر میں کیا کروں مجبور ہوں اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ مضامین کے کاٹنے چھانٹنے کی مجھے ہرگز شکایت نہیں ہے میری بھڑاس بہر حال نکل جاتی ہے لیکن آپ کی تکلیف کے خیال سے اپنی مجبوری کا اظہار کر رہا ہوں"

میں نے کہا میں آپ کے لیے انقلاب کے نام سے ایک نیا ہفتہ وار اخبار جاری کیے دیتا ہوں آپ اس میں دل کھول کر بھڑاس نکالیے انقلاب پر بحیثیت ایڈیٹر آپ کا نام لکھا جائے گا آپ کے بھائی ابراہیم حسن اس کے پبلشر بن جائیں اور حافظ عزیز حسن بقائی اسکے پرنٹر بقائی صاحب بھی انگریزوں سے لڑنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ چنانچہ انقلاب کا دفتر اور چھاپہ خانہ الگ قائم کیا گیا اور انقلاب کے ذریعے عارف صاحب نے آزادی سے لکھنے کا کمال دکھایا اور اردو اخبار نویسی میں انقلاب پیدا کر دیا۔

"انقلاب تین مہینے زندہ رہ سکا جلیاں والا باغ کی گولیوں نے اسکی جان بھی لے لی انقلاب کے پچاس فیصد خریدار پنجاب میں تھے حکومت پنجاب نے اسکا داخلہ ممنوع قرار دے دیا اور اسے ادھ مرا کر ڈالا۔

عارف صاحب اب اخباری دنیا میں متعارف ہو چکے تھے دلی کانگرس کمیٹی نے اخبار "کانگرس" کی ادارت ان کو دے دی پھر مولانا محمد علی کے روزنامے ہمدرد کے ایڈیٹر ہو گئے اور لکھنا اور جیل جانا ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔"

مولانا عارف ہسوی کی اس باغیانہ سیاست و صحافت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا حسرت موہانی کی طرح عارف کی زندگی کا بھی زیادہ حصہ جیل میں بسر ہوا ابتدا میں حسرت موہانی بھی مولانا عارف کی طرح کٹر کانگریسی تھے اور کانگرس کے انتہا پسند گروپ سے تعلق رکھتے تھے لیکن ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد اور ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء میں کانگرس کے بعض فیصلوں کے سبب حسرت نے کانگریس سے اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا اور آخر کار کٹر مسلم لیگی ہو گئے تھے چنانچہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انھوں نے ۴۶-۱۹۴۵ء میں متحدہ ہندستان کے اس انتخاب میں حصہ لیا جو دو قومی نظریے کی بنیاد پر منعقد ہوا

مولانا حسرت دہلی کی مرکزی اور لکھنؤ کی صوبائی اسمبلی دونوں کے ممبر منتخب ہو گئے اور آخری سانس تک ہندستان ہی میں رہے لیکن حسرت کے برعکس مولانا عارف ہسوی عمر بھر کانگریسی رہے ہرچند کہ ۱۹۲۸ء میں موتی لال نہرو رپورٹ کے بعد جب مولانا محمد علی جوہر نے بددل ہو کر کانگریس کو خیرباد کہا تو مولانا عارف ہسوی نے اس کا بہت گہرا اثر لیا تھا اور انھیں پورا احساس ہو گیا تھا کہ اب کانگریس میں مسلمانوں کی کوئی وقعت نہیں رہی اور جو مسلمان کانگریس سے ہنوز وابستہ ہیں وہ تو عام مسلمانوں کی نظروں سے ایسا گر چکے ہیں کہ بعض انتہا پسند انھیں ملت اسلامیہ سے بھی خارج سمجھتے ہیں۔ ایں ہمہ عارف ہسوی کے پائے استقلال کو لغزش نہیں ہوئی وہ مرتے دم تک کانگریس میں رہے اور انتہائی خراب و خستہ حالات میں بھی اپنا تن من دھن کانگریس کے لیے وقف کیے رہے وفاداری بشرط استواری اسی کا نام ہے اور غالب نے ایسے ہی وفا شعاروں کے بارے میں حکم لگایا ہے کہ

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

مولانا عارف ہسوی نے اپنی سیاسی و صحافتی زندگی کا آغاز کلکتہ کے ہفت روزہ اخبار "خطیب" سے کیا تھا جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس کے بعد وہ "انقلاب" "ہمدرد" "کانگریس" "حریت" "استقلال" "ہند" اور "رعیت" وغیرہ سے وابستہ رہے کسی کے ایڈیٹر، کسی کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کسی کے کالم نگار کبھی نام کے ساتھ اور کبھی بغیر نام کے لیکن جیسا کہ

ہے وہ آخر تک وابستہ رہے وہ "مولوی" تھا "مولوی" کے مالک اور ایڈیٹر اگرچہ منشی عبدالمجید
ہے لیکن اس کی ایڈیٹری کے فرائض عملاً مولانا عارف ہسوی کے ذمّے تھے۔ بقول امداد صابری
س وقت تک عارف صاحب زندہ رہے وہ بشمول "مولوی" ممن پرچوں سے مولانا
سلک رہے ان سب کو انگریز کا دشمن قوم وملّت کا خیر خواہ اور وطن پرست بنائے رکھا۔
بہ ظاہر تھا برطانوی حکومت نے مولانا حسرت موہانی کی طرح مولانا عارف ہسوی کو بھی
ہمیشہ عتاب میں رکھا اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ بقول مُلّا واحدی انگریزوں کے
خلاف لکھنا اور جیل جانا بس یہی عارف ہسوی کی زندگی تھی جیل بھی ایسی ویسی نہیں
بلکہ اس نحیف جُثّہ آدمی نے عمر بھر جیلوں میں رسّیاں بٹیں چکّیاں پیسیں اور تنگ وتاریک
کوٹھریوں کے فرش کو فرشِ استراحت جانا۔

مولانا عارف کے سال پیدائش کو اگر ۱۸۸۵ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان مان لیا
جائے تو انھوں نے زیادہ سے زیادہ پچاس سال کی عمر پائی ہوگی تقریباً پچیس سال کی عمر میں وہ نیاز
فتح پوری کے بیوی بچوں کو پہنچانے کی غرض سے دلّی پہنچے مُلّا واحدی نے اپنے مکان کا
ایک کمرہ انھیں رہنے کو دے دیا اور اپنے ہفت روزہ اخبار "خطیب" کا سیاسی کالم ان کے
سپرد کر دیا عارف جیسے قناعت پسند سیاسی آدمی کو اس کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت
بھی نہ تھی بس دہلی کے ہو رہے آخری عمر کے دو چار برسوں کو چھوڑ کر ساری زندگی مُلّا واحدی
کے دیے ہوئے ایک کمرے میں گزاری قلم کے مزدور بنے رہے اور جو کچھ میسر آیا اسی میں بسر کر لی۔

مولانا عارف ہسوی کے حلقۂ احباب میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا
حسرت موہانی، حکیم اجمل خاں، منشی عبدالمجید، مُلّا واحدی، ڈاکٹر انصاری، خواجہ حسن نظامی،
مولانا احمد سعید، مسٹر آصف علی، مولانا امداد صابری، بھیّا احسان الحق، علامہ راشد الخیری، سردار سنگھ
مفتون، حکیم مجیب الدین بقائی، مولانا نیاز فتح پوری اور اس طرح کے نہ جانے کتنے سیاسی رہنما
ادیب وشاعر، اخبار نویس اور اہل قلم شامل تھے کانگریس کا سارا انتہا پسند گروپ جس میں
ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے عارف ہسوی کے دوستوں میں تھا دوسرے سیاسی وسماجی
اور ثقافتی وعلمی وادبی جماعتوں کے ارکان سے بھی ان کے مخلصانہ روابط تھے۔ البتہ مُلّا واحدی
منشی عبدالمجید، مولانا حسرت اور علامہ نیاز فتح پوری سے تعلق کی نوعیت قدرے مختلف اور عمومی
دوستی سے بلند تر تھی۔

مُلّا واحدی کو عارف ہسوی کے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ عارف کے سرپرست
ومحسن کی حیثیت بھی حاصل تھی ہر چند کہ مُلّا واحدی نے اپنی طرف سے کبھی اس کا اظہار نہیں
کیا پھر بھی عارف ہسوی کے حالاتِ زندگی ظاہر کرتے ہیں کہ مُلّا واحدی نے ان کے ساتھ عمر بھر
جو حسنِ سلوک روا رکھا وہ مثالی اور غیر معمولی تھا سچ یہ ہے کہ فتح پور کو چھوڑ کر دہلی میں مستقل قیام
کرنے اور اپنے سیاسی اور صحافتی ذوق وشوق کو سیراب کرنے کا موقع عارف ہسوی کو مُلّا واحدی
کی بدولت ہی میسر آیا۔ مُلّا واحدی کے مکان کا ایک کمرہ دہلی میں عارف ہسوی کا مستقل مسکن ہوا

اور ملّا واحدی کے ہفت روزہ اخبار "خطیب" ہی سے انھوں نے اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز کیا "خطیب" بند ہوگیا تو ملّا واحدی ہی نے اخبار "انقلاب" جاری کرکے عارف ہسوی کو اس کا مختارِ کل بنا دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ عارف ہسوی کو خراب سے خراب حالات میں بھی تنہا نہیں چھوڑا۔ ہر طرح ان کی دلجوئی و پذیرائی کی اور عارف کے دمِ واپسیں تک انکے ہمدم و دمساز بنے رہے۔

ملّا واحدی اور ان کے گھر سے عارف ہسوی کا کیسی اپنائیت اور کیسی یگانگت کا تعلق تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے اس واقعے کو خود ملّا واحدی اور بعض دوسروں نے بھی بیان کیا ہے لیکن مختصراً مولانا امداد صابری کے لفظوں میں سن لیجیے:-

"واحدی صاحب کی بیٹی زاہدہ کی پیدائش عارف صاحب کے سامنے دہلی میں ہوئی تھی۔ عارف صاحب کے کوئی اولاد نہ تھی وہ اس سے اپنی بیٹی کی طرح محبت کرتے تھے اور زاہدہ بھی ان سے ایسی ہل گئی تھی کہ ان کی گود سے نہ اترتی تھیں۔ واحدی صاحب کو انھوں نے آگرہ جیل سے لکھا کہ زاہدہ کے دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے واحدی صاحب قاری عباس حسین کے ساتھ زاہدہ کو لے کر آگرہ جیل پہنچے ملاقات ہوئی تو عارف صاحب پاندان آگے رکھے پلنگ پر براجمان تھے عارف کے ساتھیوں نے سنا کہ عارف صاحب کی منہ بولی بیٹی آئی ہے تو پانچ چار گھنٹے کے اندر اتنے کھلونے اور اتنے پھل اسکے سامنے لاکر ڈال دیے کہ ان کا دہلی لانا خاصا بوجھ ہوگیا"

یہ واقعہ صرف ملّا واحدی اور عارف ہسوی کے تعلق کو نہیں بلکہ عارف ہسوی کے اس حسنِ اخلاق پر بھی روشنی ڈالتا ہے جو وہ جیل کے ساتھیوں کے ساتھ برتتے تھے بات یہ ہے کہ عارف ہسوی صرف برطانوی سامراج کے خلاف ہر طرح کے احتجاج و تشدد کو روا رکھتے تھے ورنہ عام زندگی میں مروت اور شرافت اور خوش خلقی و رواداری کا پیکر تھے چنانچہ عارف ہسوی اپنے انھیں اخلاقی اوصاف کی بنا پر سیاسی قیدیوں میں صد درجہ مقبول تھے اور انکی بے لوث کم گوئی اور بردباری کے سبب دوسرے مفتی کفایت اللہ مانے جاتے تھے بلکہ عارف ہسوی کو پیسے کی احتیاج یا روزمرہ کی زندگی کی ضروریات مفتی کفایت اللہ سے بھی کم تھیں اس لیے کہ وہ اکیلے تھے جب تک جیل میں رہے گورنمنٹ کے خرچ پر گزر کرتے رہے باہر نکلے تو قلم کے مزدور بن گئے اور بس اتنا کما لیا کہ عزتِ نفس کے ساتھ سفید پوشی برقرار رہ سکے۔

"مولوی" کے ایڈیٹر اور مالک منشی عبدالحمید سے بھی عارف کے تعلقات نہایت [illegible] اور برادرانہ تھے۔ ذکر آچکا ہے کہ عارف ہسوی جس پرچے سے آخر تک منسلک رہے وہ منشی عبدالحمید کا "مولوی" [illegible]

منشی عبدالمجید کے گھر ہیں بھی رہے کینسر کے علاج کے سلسلے میں منشی عبدالمجید ہی کے گھر سے ڈاکٹر جوشی کے اسپتال میں داخل کیے گئے تھے لیکن اسپتال سے منشی عبدالمجید کے گھر نہ جانے اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق گلا واعدی کے گھر واپس آئے اور اسی کمرے میں صاحب فراش رہے جس میں فتح پور سے دلی آکر پہلے روز قیام کیا تھا۔
مولانا حسرت اور مولانا نیاز فتح پوری سے عارف ہسوی کے تعلقات میں فتح پور اور فتح پور کے مدرسہ اسلامیہ کی نسبتیں بھی شامل تھیں اس لیے کہ حسرت اور نیاز دونوں فتح پور میں زیر تعلیم رہ چکے تھے اور دونوں سے اہل فتح پور کی پرانی رشتہ داریاں قائم تھیں لیکن مولانا حسرت سے عارف کو جو تعلق خاطر تھا وہ قرابت ور شتے داری سے زیادہ حسرت کی باغیانہ طبیعت اور انگریزوں کے خلاف ان کی بے باکانہ تحریروں کی بنا پر تھا یہ حسرت سے گہرے جذباتی لگاؤ ہی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے مولانا حسرت کی سوانح عمری بھی اس وقت مرتب کی اور منظر عام پر لے آئے جب کہ دوسرے حسرت سے ملتے ہوئے بھی کتراتے تھے مولانا نیاز فتح پوری سے عارف کی قربت کا سبب نیاز کی علمیت، ادبیت کے ساتھ ہم وطنیت بھی تھی چنانچہ نیاز فتح پوری سے عارف کے تعلقات شروع ہی سے گھریلو تھے نیاز جب پہلی بار دہلی گئے تو بعد کو ان کے بیوی بچوں کو لے کر عارف صاحب ہی دہلی گئے تھے۔
بقول امداد صابری نیاز فتح پوری سے عارف کو جیسا والہانہ لگاؤ تھا ویسا شاید ہی کسی کو ہو خود نیاز صاحب کا بیان ہے کہ

> "میرے قیام فتح پور کے زمانے میں عارف ہسوی صاحب ہسوے میں کم رہتے تھے میرے ساتھ فتح پور میں زیادہ رہتے تھے اس وقت وہ اپنی شاعرانہ زندگی کے قنوطی دور سے گزر رہے تھے درد، میر ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے پان کھانا اور میر کے ایک ایک شعر پر گھنٹوں رونا ان کے دو مشغلے تھے میرا فتح پور چھوڑ کر دہلی آجانا ان پر بہت شاق تھا۔"

بظاہر عارف ہسوی کی زندگی حسرت و غربت میں بسر ہوئی لیکن غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مزاج اور ذوق و شوق کے مطابق نہایت کامیاب زندگی گزاری وہ جہاں رہے اور جس حال میں بھی رہے خوش رہے اپنے عزم و ارادہ اور اور اپنے سیاسی خیالات کی ترجمانی میں جری اور بے باک رہے چنانچہ کچھ لوگ ان کے بعض اقدامات کو انتہا پسندی اور شدت کا نتیجہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن ان کی نیت پر شبہ نہیں کر سکتے وہ بلاشبہ اپنے دور کی ایک محترم و اہم شخصیت تھے اور زندگی کے ہر شعبے کے لوگ ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے کانگریس کے انتہا پسند گروپ کے وہ سرغنہ تھے اور یہ بھی ان کی مخلصانہ قومی خدمات ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ کانگریس میں ایک معمولی رکن کی حیثیت سے شریک ہو کر دہلی کی صوبائی کانگریس کمیٹی کے صدر

کے منصب تک پہنچے۔

جیساکہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ مشکل سے مولانا عارف کی عمر پچاس رہی ہوگی کہ اچانک انھیں کینسر کے موذی مرض نے آپکڑا پہلے پٹنہ کے کینسر اسپتال میں داخل ہوئے پھر دہلی ہی میں مقامی طور پر علاج معالجہ شروع ہوا اور آپریشن کیا گیا کچھ دنوں کے لیے طبیعت بحال ہوگئی لیکن جلد ہی زخم دوبارہ عود کر آیا دہلی کے مشہور ڈاکٹر جوشی کے اسپتال میں داخل رہے لیکن "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کے مصداق ان کا حال روز بروز خراب ہوتا گیا آخر کار مُلّا واحدی کے مکان والے کمرے میں واپس آئے اور وہیں ۱۲ر جنوری ۱۹۳۶ء کو شام پانچ بجے داعیٔ اجل کو لبیک کہا مولانا محمد کفایت اللہ نے جنازے کی نماز پڑھائی دہلی کے ہندو مسلمان ممتاز شہریوں نے جنازے میں شرکت کی رات کو ساڑھے دس بجے کوٹلہ فیروز شاہ کے قبرستان کے قریب مدفون ہوئے مشہور اہلِ قلم ل۔ احمد نے ان کی قبر کا کتبہ تیار کیا" رہے نام اللہ کا۔

میں نے مولانا عارف کو نہیں دیکھا ان کو دیکھنے کے لیے تصویر کی تلاش ہوئی مشکل سے ایک تصویر ضیاء الدین احمد برنی کی کتاب "عظمتِ رفتہ" میں نظر آئی یہ جیل میں اتاری گئی تصویر ہے اور قیدیوں کے لباس میں ہے بغل میں گوبر ڈھونے کی ٹوکری ہے تصویر میں صاف لفظوں میں "گوبر کی مشقت" درج ہے مجھے یہ دیکھ کر مولانا حسرت کا مشہور شعر یاد آیا اور میں نے ادنیٰ تغیر کے ساتھ عارف کے نام سے اس شعر کو یوں پڑھا

ہے مشقِ سخن جاری گوبر کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے عارف کی طبیعت بھی

حسرت و عارف ہم وزن الفاظ ہیں اور شعر میں آپ جہاں چاہیں حسرت کی جگہ عارف اور عارف کی جگہ حسرت استعمال کر سکتے ہیں۔

کتابیات

(۱) تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ڈاکٹر محمد ایوب قادری کراچی ۱۹۶۱ء
(۲) تاریخ صحافت اردو (جلد پنجم) امداد صابری جمال پریس دہلی ۱۹۸۳ء
(۳) حالاتِ حسرت مولانا عارف ہسوی جی اینڈ سنس پریس دہلی ۱۹۱۸ء
(۴) حسرت موہانی۔ پرنسپل عبدالشکور انوار بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۵۲ء
(۵) حسرت موہانی (انگریزی) ڈاکٹر حامد حسن قادری ادارہ ادبیات دہلی ۱۹۸۵ء
(۶) حسرت موہانی حیات اور کارنامے ڈاکٹر احمد لاری نامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۳ء
(۷) عظمتِ رفتہ ضیاء الدین احمد برنی اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۱ء
(۸) سید الاحرار (مولانا حسرت) سید اشتیاق اظہر اردو اکیڈمی بہاول پور ۱۹۷۸ء

(۹) میرے زمانے کی دلّی ملّا واحدی مشہور پریس کراچی ۱۹۵۸ء
(۱۰) نگار حسرت موہانی نمبر (لکھنؤ) مرتبہ نیاز فتح پوری نگار پریس لکھنؤ ۱۹۵۲ء
(۱۱) نگار پاکستان حسرت موہانی نمبر مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی ۷۵ ۱۹ء
(۱۲) نگار پاکستان نیاز فتح پوری نمبر مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی ۱۹۶۳ء
(۱۳) اردو ادب (علی گڑھ) مرتبہ آل احمد سرور انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۵۱ء
(۱۴) کلیاتِ حسرت موہانی (مقدمہ جمال میاں) کتاب منزل لاہور ۱۹۵۹ء
(۱۵) مکتوبات رئیس الاحرار (مولانا جوہر) کراچی ۱۹۷۸ء
(۱۶) ماہنامہ "نقاد" آگرہ جون، جولائی ۱۹۱۷ء

ڈاکٹر سید حامد حسین
ای ۱۵/۱ پروفیسرز کالونی
بھوپال ۴۶۲۰۰۲

جوش کی شاعری میں رزمیہ شدّت

(ایک انشائیہ)

اردو شاعری میں نَے نواز تو بہتیرے ہیں لیکن نقارہ زن صرف ایک ہے اور اسکا نام ہے شبیر حسن خاں جوش صحنِ شاعری میں آپ کو قطار اندر قطار ایسے فنکار نظر آئیں گے جو نیت باندھے کھڑے ہیں پیچھے اردو شاعری کی مقدس روایت کے واسطے دو مصرعے فرضِ تعریف دمثین غزل کے لیکن اپنے آہنگ کے تاندے سے چونکا دینے کی صلاحیت صرف جوش کے اندر ہے۔ جوش باغی ہے کیونکہ اس نے روایت کے مضبوط حصار کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کافر ہے کیونکہ اس نے اردو شاعری کے قبلے کو پھیرنے کی سعی کی ہے وہ مجرم ہے کیونکہ اس میں مردّ مروّتوں سے روگردانی کا حوصلہ ہے۔ وہ رند تو ہے، لیکن رندِ خراباتی نہیں، رندِ صف شکن ہے اس کی شورشِ طبع کا شکار صرف اپنا چاک گریباں نہیں پوری استعداد شعار کائنات ہے وہ مروّتوں اور سرگوشیوں کا شاعر نہیں اسکا شیوہ تو دنداں شکنی ہے اور اس کے لہجے میں للکار کا خروش ہے۔ سنسکرت بوطیقا میں نو (۹) رس مذکور ہیں اردو کی شعری جمالیات میں یہ شمار لے دے کر پھونے دو تک پہنچتا ہے ایک پورا رس متین۔ سنجیدہ فکر و احساس کا جس کی پذیرائی گداز دل کرتا ہے اور جس کی معراج معرفتِ حق ہے آدھا رس لب و رخسار کے ذکر کا ہے یا پھر خالِ ہندو اور محرم آب رواں کے بیان کا اور جو باڈ بچادہ خوباں سے چھیڑ اور تبازی بازی بارلیش قاضی تہم بازی کی نذر ہے اردو شاعری کا بیشتر سرمایہ فسانۂ بزم ہے رزم ہے تو برائے بیت کیونکہ بزم کے قافلے کی ضرورت کو پورا کرتا ہے حلقۂ ناقدین میں یہ قول گردش کرتا ہے کہ مرثیے میں رزمیے کی پذیرائی ہے لیکن وہ صنف جو منقبت کی شاخ سے پھوٹے اس میں گستاخانہ جسارت کا اندراج پھیلنے کی توقع کجا۔

جوش اردو میں پہلا ایسا شاعر ہے جس نے رزمیہ رس کو ایک مستقل لہجے کی حیثیت سے اختیار کیا جس نے اپنے پُر اعتماد قدموں کی دھمک سے اپنا آہنگ مرتب کیا اور جس نے شعر کو اونچے سُروں کی نغمگی سے روشناس کیا ہے۔ اس کے لیے جوش نے اپنی جمالیات اور صوتیات کی خود تشکیل کی ہے ظاہر ہے کہ یہ نظام روایتی نظامِ شعر سے جدا تھا اور اختلاف ماہیت کے ساتھ ساتھ اختلاف رائے کو جنم دینے والا تھا۔ لہٰذا جوش کی شعری فنکاری نے تنقیدی نشانہ بازی کو دعوت دی اور آج بھی نشانہ بازوں کے کاروبار مشق کے لیے سامان مہیا کرتی ہے

ں نے صنفِ غزل کا حلقہ بگوش ہونے سے جس طرح انکار کیا وہ بجائے خود ایک بے چین ذہن کی
فرمائی تھی جوش نے جہاں یہ محسوس کیا کہ تنگنائے غزل میں فرسودہ مضامین کی دلدل حائل راہ
تی ہے وہیں اس کو اس بات کا بھی شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ غزل کی جرعہ جرعہ ساقی
ی بند بلانوش کو سوائے ناآسودگی کے کچھ اور نہیں دے سکتی لہٰذا جوش نے بقدر ظرف اپنے پیمانے
وبنانے کے جتن کیے۔

جوش فکرِ بلاخیز اور اظہارِ قیامت انگیز کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری کی بنیادی حقیقت ایک سیل
ہنگ ہے جس کا ایک کنارہ تجرباتِ زندگی اور دوسرا فکرِ حیات ہے۔ یہ کنارے جامد و ساکت لگیں یا نہ لگیں
ڑی حقیقت ہے تو یہی سیلابِ صوت و نغمہ ہے۔ جوش کی نمائندہ منظومات میں کسی آبشار جیسی تندی
ور توانائی ہے۔ ان کی طاقت کا سرچشمہ لفظوں کا تواتر اور تراکیب کا تسلسل ہے جو بے پناہ تیزی کیساتھ
یک کے پیچھے ایک، ایک کے اوپر ایک وارد ہو کر ایک صوتی سرعت کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ معترضین جوش کی
شاعری میں افراط و اطناب کی شکایت کرتے ہیں لیکن یہی جوش کا خزانۂ توانائی ہے کیونکہ کوزے کے لڑھک
جانے سے پھسلن تو بن جاتی ہے سیلاب نہیں بنتا سیلاب تو کثرت و وفور سے ہی پیدا ہوتا ہے اور یہی کثرت و
فور سبب بنتا ہے اُس طاقت کا جو گرد و پیش کی ہر شے کو سمیٹ کرلے جاتی ہے جوش کی شاعری کا
مل جوہر اور اس کی اصل طاقت بھی یہی کثرت و وفور ہے۔

لفظ معنی کا پیراہن ہے لیکن لفظ صوت و آہنگ بھی ہے شعر صرف جلوہ گاہِ معنی ہی نہیں ہوتا
اس میں نغمہ کے لیے لے بھی ہوتی ہے اور بہت بار نغمے کے ساتھ پیر ہی تھاپ نہیں دیتا سر بھی بیخودی
میں جنبش کرنے لگتا ہے اور جوش کے یہاں بھی اکثر یہی ہوتا ہے جوش نے لفظوں کی ساحری کی ہے اس
کے لیے بیشتر لفظ محض معنی کی بار برداری کا فرض ادا نہیں کرتے بلکہ سُر میں گم ہو کر نغمے کی جان بن جاتے
ہیں لفظوں کے عام سوداگروں کی طرح جوش الفاظ کی قدر و قیمت بازارِ معنی کے نرخ سے متعین نہیں
کرتے انھیں لفظوں کے بے جان تنکوں کے اندر سے دل و دماغ کو مسحور کرنے والے نغمے برآمد کرنے
کا حیرت انگیز فن آتا ہے لفظوں کے ساتھ جوش کا معاملہ منطقی کا نہیں مغنی کا ہے اُنکے کلام کا تشخص
نحوی ترکیب سے مرتب نہیں ہوتا بلکہ اس کی شناخت لفظوں کی ایک تخلیقی تنظیم سے تشکیل
پاتی ہے جملے کی گرہ بندی کے لیے ضروری "ہیں" "ہے" "تھا" اور "تھے" جو ماہرینِ لسانیات
کے مذاقِ صحت کو تسکین پہنچاتے ہیں جوش کے لیے سدِّ راہ کا حکم رکھتے ہیں مصرعے پر مصرعے گزر
جاتے ہیں اور نحوی کو انتہا سے کلام کا سراغ نہیں ملتا۔ آبشار کی رو میں بھی بھلا کسی نے گرہ لگائی
ہے۔

لیکن اشعارِ جوش محض سیلِ صوت کا نمونہ ہی پیش نہیں کرتے وہ صرف غوغائے پراگندہ نہیں
وہ تو صدائے فرزانہ ہیں ان میں نہ صرف زیر و آہنگ ہے بلکہ توازنِ صوت و معنی کے کئی جلوے بھی
پنہاں نظر آتے ہیں۔ کہیں ان کی شاعری تکرارِ صوت کا انداز اختیار کرتی ہے:

سوز سیلاب سنسنی ہمرم
پیچ پیچ، بھاوں جاوں، چیل، جلبار

مستی

پہنا، ڈگی، لتسام، لام، لڑائی
ہول، ہیجان، ہانک، ہاتھا پائی
کھل بلی، کاؤں کاؤں کھٹ منڈل
دھول دھپّا، دھکڑا پکڑو، دھتکار
تہلکہ، تو تڑاق، تف، تکرار

کہیں مقابلے کا یہ منظر ہے۔

اِدھر یہ قول ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی
اُدھر اب تک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی
اِدھر تکمیل دیں کا ہو چکا ہے دعویٰ محکم
اُدھر ایماں تھا جیسا خام اب تک خام ہے ساقی
اِدھر شدّت کے ساتھ اعلانِ "اتمام حجّت" کا
اُدھر ہر سانس اب تک زہر کا ایک جام ہے ساقی

کہیں اُن متوازن تراکیب کا جلوہ ہے جو بجائے خود جمع تضاد کا نمونہ ہیں۔

ہر کرن اک ابر، ہر تعبیر اک ژولیدہ خواب
ہر سحر اک دیوِ شب، ہر جلوہ ایک بکر حجاب
ہر حرف الماس، ہر زنجیر تارِ عنکبوت
ہر کلید اک قفل، ہر جھنکار ایک جولاں سکوت

جوش کی لفظی صناعی ان کے اس مغنیانہ شعور کا فیضان ہے جسسے یہ پتا ہے کہ ایک ایک حرف سے روحِ نغمہ کس طرح کشید کی جا سکتی ہے۔ اس کمال کے ساتھ ساتھ الفاظ پر جوش کی خلاقانہ قدرت نے ایک ایسی کیفیت کو جنم دیا ہے جو سحرِ سامری اور صورِ اسرافیل کے مشترک عمل کی صورت میں تصور کی جا سکتی ہے۔ کونسا نغمہ ہے جسکا ساز جوشِ طرحدار کی زنبیل میں موجود نہیں جوشِ مسیحا نفس کی جنبشِ لب پر لفظوں کے پرے کے پرے اترتے ہیں تو لگتا ہے کہ شاید صحنِ شاعری ان کے لیے تنگ پڑنے لگے جوش کی شاعری الفاظ و تراکیب کا ایک ہوش رُبا صنم کدہ ہے۔ جوش ایک ایسا فرہادِ معنی ہے جو جسارتِ تخیل کے تیشے سے بے دھڑک اپنی تراکیب خود تراش لیتا ہے اس کی اقلیم میں ثقالت یا غرابت وجہِ پشیمانی نہیں اس کے لیے اصل جواز تو نغمہ ہے روایت یا رواج منطق یا مصلحتِ زمانہ نہیں۔

پتا نہیں یہ جوش کے پٹھان اجداد کی شورش پسند جینس (GENES) کا کرشمہ ہے یا اس مئے ناب کا جس کے رنگ نے جوش کے لہو کی سرخی کو دو آتشہ کیا ہے کہ جوش نے مصلحتِ زمانہ کو چیلنج کرنے میں ایک خاص لذت محسوس کی ہے اسی نے اسکے لہجے میں ایک ایسی جارحانہ شدت پیدا کی ہے جس کی مثال اردو شاعری میں کہیں نہیں ملتی۔ سودا کی ہجو یہ شدت کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے لیکن جوش نے گالی دینے کے بدنام کاروبار کو جس خلاقانہ اختراع پسندی کے جوہر سے آراستہ

ہے اس کی مثال کم ہی نظر آتی ہے۔ یہ جوش کی شاعری کا محض ایک ضمنی پہلو لیکن یہ رزمیہ تندی
شدت سے جوش کی فطری مناسبت کو ظاہر کرتا ہے۔

یہاں اس امر کی جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ جوش کی انفرادیت ان کے اس رزمیہ لہجے سے
ب ہوتی ہے جو اردو کی شعری روایت میں ایک نئے عنصر کے اضافے کی حیثیت رکھتا ہے اس
نے ایک نئے قسم کے شعری آہنگ کو جنم دیا ہے اور اسی کی مناسبت سے جوش نے جس
م کی لفظیات کو برتا وہ روایتی پیمانوں سے کبھی کبھی عدم مطابقت رکھتا معلوم ہوتا ہے لیکن جوش
شعری نظام میں اس کا جواز موجود ہے۔

اس مختصر جائزے میں بہر حال جوش کی اس شاعری کو زیر غور نہیں لایا گیا جس میں جوش
مناظر قدرت، فطرت کا بیان کیا ہے یا جس میں گرد و پیش کی زندگی اور کرداروں کو اپنی توجہ کا
ز بنایا ہے۔ یہ شاعری بھی جوش کے شعری کمال کا ایک اہم حصہ ہے اور جوش کی شعری انفرادیت
عین اسکو زیر غور لائے بغیر نا ممکن ہے۔

انور سدید

۱۹۹۳ء کے رفتگاں کے ساتھ چند لمحے

بالآخر ۱۹۹۳ء کا ہنگامہ خیز اور پُر آشوب سال بھی غروب ہوگیا اور ۱۹۹۴ء کا نیا سورج اپنے ساتھ نئی آرزوؤں اور تازہ تمناؤں کو لے کر طلوع ہوگیا۔ ۱۹۹۳ء سال گذشتہ ہوگیا ہے، متاعِ تاریخ بن گیا ہے۔ ۱۹۹۴ء زمانۂ حال ہے اور اب لمحہ بہ لمحہ ہمارے سامنے نئے منظر ابھار رہا ہے۔ ۱۹۹۳ء کے سال نے جو زخم ہمارے دلوں پر لگائے تھے ان سے خون حالیہ برس کے دوران بھی رستا رہے گا اور وہ متعدد ادیب یاد آتے رہیں گے جن کے شجرِ حیات پر موت نے اپنی درانتی چلا دی، ان ادیبوں نے اپنی زندگی میں فکر و نظر کے چراغ جلائے تھے، دہر کے اندھیروں کو خرد نگار روشنی عطا کی تھی، اور اب زیرِ لحد چلے گئے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ان کے افکار کی روشنی مٹی کی ردا سے چھن چھن کر آ رہی ہے اور ہماری جانب سفر کر رہی ہے۔ ہمارے عہد کو منور کرتی جاتی ہے۔ یہ روشنی ان کتابوں میں بھی ضیا بار ہے جو ہمارے مرحوم ادبا اپنی معنوی اولاد کے طور پر اس دنیا میں چھوڑ گئے ہیں، یہ کتابیں اب ہمارا ہی نہیں مستقبل کا بھی قیمتی اثاثہ ہیں۔

اس دنیا سے ۱۹۹۳ء کے دوران رخصت ہو جانے والے ادیبوں میں چند ایک میرے دوست تھے، میرے ہمدرد تھے، میرے غم گسار تھے۔ متعدد ادیبوں کو میں نے دیکھا نہیں تھا لیکن میں ان کے قدموں کی چاپ اپنے دل کے قریب سے سنتا تھا۔ ان کی تخلیقات پڑھتا تو انھیں اپنے خیال کے آنگن میں چہل قدمی کرتے ہوئے محسوس کرتا۔ کبھی کسی اخبار یا رسالے میں ان کی تصویر چھپ جاتی تو ان سے ملاقات کر کے خوشی محسوس ہوتی۔ یہ خوشی اب بھی محسوس ہوتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ دائم خیال دل کو مسوستا ہے کہ اب ان سے مصافحہ یا معانقہ کرنے کے مواقع مجھے اس دنیا میں نہیں مل سکیں گے ..... اب تو میری اپنی عمر کی نقدی ختم ہو رہی ہے اور میں جو سانس اس زمین پر لے رہا ہوں میری زندگی کا "بونس" (BONUS) ہیں۔ مجھے ان سب سے عدم میں ملاقات کے مواقع کچھ زیادہ دور نظر نہیں آتے۔ آج ۱۹۹۴ء کے آغاز پر میرے دل میں ان کی یاد جاگ رہی ہے تو کیا یہ بے وجہ ہے! —— نہیں۔ —— یقیناً نہیں ... ان کی یاد مجھے اس لیے آ رہی ہے کہ ان کی رحلت سے یہ جہاں پہلے

سے زیادہ مفلس ہوگیا ہے۔ میں ان سے ملنے کے لیے بے تاب ہوں کیونکہ مجھے ان جیسا ادیب،
ن جیسا انسان یہاں نظر نہیں آتا۔

۱۹۹۴ء کی یہ پہلی "تحریر" یکم جنوری کو لکھی جا رہی ہے۔ اور میں اسے ۱۹۹۳ء کے
دوران رخصت ہو جانے والے ادیبوں کے نام معنون کرتا ہوں۔

اس وقت میرے سامنے سب سے پہلے طفیل ہوشیارپوری کا چہرہ ابھر رہا ہے۔ ان سے
آخری ملاقات نعت کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی۔ وہ خاصے ضعیف ہو چکے تھے لیکن
آواز میں کھنک موجود تھی، اور نعت ترنم سے پڑھتے تھے تو آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ چھڑی ہلاتے
ہوئے محفل میں پہنچ گئے۔ کہنے لگے، "انور سدید! نعت کی محفل سے میں کبھی غیر حاضر نہیں
ہوا۔ جس طرح ہوا اور جیسے ہو، پہنچ جاتا ہوں۔ نعت لکھتے ہوئے میں خلوت میں حضوری کا کیف
حاصل کرتا ہوں، نعت پڑھتے ہوئے یہ سرور مجھے جلوت میں ملتا ہے۔ میں خیال ہی خیال میں مدینے پہنچ
جاتا ہوں، روضۂ رسولؐ کی جالی تھام لیتا ہوں، یہاں "شرطے" مجھے پرے نہیں دھکیلتے۔ دھکیل
ہی نہیں سکتے۔" یہ کہتے کہتے طفیل ہوشیارپوری پر بے خودی کی کیفیت طاری ہوگئی، ان کی
آواز بھرا گئی۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر میرے پڑوسی تھے، ہم نے اپنے ٹیلی فون نمبروں کا تبادلہ تک
نہیں کیا تھا۔ جب بات کرنے کو جی چاہتا، کپڑے بدلے بغیر گھر سے نکلتے اور حفیظ الرحمن احسن
کے گھر کی چوکھنڈی پر کھڑے ہو کر ادب کے مسائل سلجھانے لگتے۔ بحث الجھ جاتی تو ہم اگلے دن
دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر کے رخصت ہو جاتے۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر، آخری دور میں اپنی
دل کی علالت کو سمیٹ کر گوجرانوالہ چلے گئے تھے۔ اچانک ایک دن دیکھا کہ ایمبولینس سے
ان کی میت اُتاری جا رہی تھی۔ اسی شام وہ زیرِ زمین چلے گئے۔ میں نے ان کی کتابیں
الگ گوشے میں ترتیب دے دی ہیں، انھیں ملنے کو جی کرتا ہے تو ان کی کوئی کتاب اٹھا
لیتا ہوں۔ وہ اپنی زندگی میں بھی میرے ادبی کاموں میں معاون تھے۔ وہ اب بھی میرے
ادبی منصوبوں میں معاونت سے گریز نہیں کرتے۔

ایاغ عیسیٰ خیلوی ـــــ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ وہ ادب سے زیادہ
ادیبوں کی خدمت کرتے تھے۔ حلقہ اربابِ ذوق کے ارکان کی دو ڈائرکٹریاں انھوں نے
شائع کیں، فخر سے پوچھتے "یہ کام کسی اور ادیب نے کیا ہے۔" میں کہتا، "آپ
صاحبِ کتاب ہو گئے ہیں" یہ سن کر ایاغ عیسیٰ خیلوی کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھتا۔
افسانہ نگار ہرچرن چاولہ اپنے وطن داؤد خیل جانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی نے
ساتھ چلنے کا وعدہ کیا لیکن آخری وقت پر طرح دے گئے۔ ایاغ عیسیٰ خیلوی نے سنا تو
کہا "چاولہ جی، آپ کے ساتھ میانوالی چلنے کی سعادت میں حاصل کروں گا۔" چنانچہ انھیں
وطن یاترا کرا لائے۔ اس دورے کی تصویریں ہرچرن چاولہ نے مجھے اوسلو سے بھیجی
تھیں لیکن اس وقت ملیں جب ایاغ نے رختِ حیات سمیٹ لیا تھا۔ ان کی

وفات کی خبر کسی اخبار میں نہیں چھپی۔

رشید اختر ندوی سے میری [illegible] "[illegible]" سے ہوئی تھی، وہ میرے بچپن کے کتابی دوست تھے۔ صحافت سے ناول نگاری کی طرف آئے اور پھر پاکستان کی تاریخ لکھنے لگے۔ مزنگ کی مال روڈ پر میں نے اپنا تعارف کرایا کہ میں ان کا قاری ہوں۔ ان کے صاحبزادے سید جاوید اختر، کا دوست ہوں۔ سن کر خوش ہوئے۔ پشت تھپکی اور مجھے شاباشں دی کہ شاعری کی بجائے میں نثر نگاری کرتا تھا۔

الطاف پرواز کی آخری غزل اظہر جاوید نے اپنے رسالہ "تخلیق" میں شائع کی تھی تسلیم احمد تصوّر نے مجھ سے کہا کہ الطاف پرواز سے ایک غزل سیاہ تار کر" میں لکھوا کر انھیں دوں۔ وہ اسے کلام شاعر بقلم شاعر" کے حصّے میں ادبی صفحے پر شائع کریں گے۔ "تخلیق" میں ان کے ایک خط نے بڑا ہنگامہ بپا کیا تھا۔ اظہر جاوید نے کہا تم بحث کو آگے بڑھاؤ۔ ادب کی رونق بھی اب ہنگاموں پر موقوف ہے۔" لیکن میرے خط لکھنے سے قبل ہی الطاف پرواز کو سناؤنی آگئی اور وہ ایک اداس شام کو عالم بالا کو پرواز کر گئے۔

عزیز تمنائی کو اب پاکستان میں بہت سے لوگ بھول چکے ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد مدیر" ادبی دنیا" کو ان کی رسیلی نظمیں جنوبی ہند سے موصول ہوئیں اور یہ "ادبی دنیا" میں بے حد نمایاں شائع کی جاتی تھیں۔ لیکن پھر وہ اچانک ادب کے مطلع سے غائب ہو گئے، ایک طویل غیر حاضری کے بعد وہ پھر ادب کے مرغزار میں وارد ہو گئے تھے۔ ان کی نظمیں رسائل میں نظر آنے لگی تھیں۔ لیکن اب وہ شعلۂ مستعجل تھے۔

واصف علی واصف کے بارے میں کیا لکھوں؟ اشفاق احمد جب ان کے سامنے سر جھکائے مؤدب بیٹھے ہوتے اور بانو قدسیہ حاضرین میں ٹھنڈائی تقسیم کر رہی ہوتیں تو واصف صاحب اس لوبھی دنیا میں ولی نظر آتے۔ میرے پاس دنیا سے روٹھا ہوا کوئی شکستہ دل آدمی آتا تو میں اسے واصف صاحب کے پاس بھیجتا۔ وہ اس کے اندر کی بند کھڑکی کھول دیتے۔ ٹوٹا ہوا دل جڑ جاتا۔ ایمان کی شمع روشن ہو جاتی۔ کم کلامی کو زبان مل جاتی۔ لاہور میں اب واصف علی واصف جیسا دنیا دار صوفی نظر نہیں آتا۔ لے دے کے نظر اشفاق پر جاتی ہے۔ اب وہ بھی بیمار رہنے لگے ہیں۔ خدا انھیں صحت اور طویل زندگی دے۔

ڈاکٹر غیاث اقبال نے اردو ادب کا چراغ تامل ناڈو میں روشن کر رکھا تھا۔ وہ ادب کے بے حد سنجیدہ قاری تھے۔ اپنے گہرے مطالعے کو مقالے کا روپ دیتے تو موضوع جگمگا اٹھتا۔ ان کا سینہ منوّر تھا۔ چنانچہ فن پارے کی داد یوں دیتے جیسے کرنیں بکھیر رہے ہوں۔ ان کی وفات پر اب تک یقین نہیں آتا۔ کیسے آسکتا ہے؟

ریاض انور کا طلوع ملتان سے ہوا۔ غروب لاہور۔ وہ مغربی پاکستان کے ایک ایسے شاعر تھے جس نے مشرقی پاکستان کو اپنے دل میں بسا رکھا تھا۔ ان کی وفات پر احسن احمد اشک نے نوحہ لکھا تھا لیکن یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو بنگلہ دیش سے احسن احمد اشک کی وفات کی

بر بھی آگئی ہے۔ میرا ایقان ہے کہ وہ عدم میں ریاض انور سے ملاقات کر رہے ہوں گے۔ ریاض انور نعیمی اپنی شاعری کی دوسری کتاب دکھا رہے ہوں گے، جو وفات سے کچھ عرصہ قبل چھپ گئی تھی۔ اہلِ لاہور کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی پاکستان میں آمد کی خبر ریاض انور سے ملا کرتی تھی۔ وہ ان کے بچپن کے دوست تھے۔

وفا براہی بظاہر غزل کے قادر الکلام اور نکتہ فن شاعر تھے لیکن ان کی انسان دوستی چیزے دیگر تھی۔ "تجدید" کی مدیرہ عذرا اصغر کی بیٹی شبیہ طراز کی شادی کراچی میں ہوئی۔ خدا جانے کہاں سے ان کے سمدھیوں کا پتا ڈھونڈا۔ رخصتی کے دن وفا براہی صاحب بغل میں تحفہ تھامے موجود تھے۔ عذرا اصغر سے اپنا تعارف "تجدید" کے ایک قلمی معاون کی حیثیت میں کرایا۔ شبیہ طراز کو اپنی دعاؤں سے رخصت کیا۔ عذرا اصغر لاہور آئیں تو وفا براہی کا ذکر دیر تک کرتی رہیں۔

حبیب جالب اپنی زندگی میں خود نگر تھے۔ سماجی زندگی میں وہ عوام کی آواز تھے اس عوامی آواز کی حمایت انھوں نے زندگی کے آخری لمحے تک کی۔ میری ان سے صرف ایک ملاقات سرگودہا میں ہوئی تھی۔ مجھے طمانیت یہ ہے کہ میں نے ان کی شاعری پر جو مقالہ ان کی زندگی میں لکھا تھا وہ ان کی نظر سے گزر چکا تھا اور انھوں نے اسے پسند کیا تھا۔ اب وہ ادیبوں کی بستی اقبال ٹاؤن میں آسودۂ خاک ہیں لیکن اس بستی میں کوئی شخص ان کی قبر کا تعویذ تلاش نہیں کر سکتا۔ ادیب ان کے میلے الحمرا آرٹ کونسل میں لگاتے ہیں۔

پلورینا چاولہ کو آنجہانی لکھتے ہوئے دل دکھتا ہے۔ ان کا بچپن سرگودہا میں گزرا۔ جوانی دلی میں بسر ہوئی، بڑھاپا ناروے کے شہر اوسلو میں کاٹ رہی تھیں۔ لاہور آئیں تو انھوں نے اپنی خوبصورت نظمیں "حلقۂ اربابِ ذوق" میں سنائیں، ایک سفرنامہ ڈاکٹر وزیر آغا کے "اوراق" میں لکھا۔ وہ افسانہ نگار ہرچرن چاولہ کی دھرم پتنی تھیں، لیکن خود بھی شگفتہ تھیں۔ چھٹی گزارنے کے لیے دلی آئیں تو اچانک روح پرواز کر گئی، میری بیوی ان کے دیے ہوئے ایک تحفے کو زیبِ تن کرتی ہیں تو رونے لگتی ہیں۔

ایک اور ادیب جس کی رحلت کو دل اب تک تسلیم نہیں کرتا وہ شمیم احمد ہیں۔ انجمن ترقی اردو کراچی کے ایک جلسے میں ان سے ایک تقریباتی ملاقات ہوئی لیکن میں نے ان کی دھمک ادبی دنیا میں ہمیشہ سنی، وہ دشمن سے دشمنوں جیسا سلوک کرتے اور ادبی کوتاہیوں پر کسی کو معاف نہ کرتے۔ وہ اس ملک کے شاید واحد ادیب تھے جن کے نزدیک ادبی قدریں انسانی تعلقات پر فوقیت رکھتی تھیں۔ ان قدروں کے تحفظ کے لیے وہ اپنے بڑے بھائی سلیم احمد، ڈاکٹر جمیل جالبی اور حسن عسکری سے بھی ادبی لڑائی لڑ لیتے تھے۔ لیکن وار سامنے سے کرتے اور دلیل کی تلوار کو کبھی نیام میں نہ ڈالتے۔ انسانی ہمدردی کا سوال پیدا ہوتا تو اس کا جواب ان کے دل سے آتا جو محبتوں کا خزینہ تھا۔ کوتاہ قد ادیبوں کو ان سے ہمیشہ کد رہی۔ ایسا غیرت مند اور غیور ادیب اللہ ادب کو شاید دیر تک نصیب

نہ ہو۔ ان کی وفات پر "فنون" نے لکھا کہ وہ سلیم احمد کے "برادرِ خورد" تھے۔ انتہا درجے کے شدت پسند نقاد تھے ـــــ قاسمی صاحب کے لیے شمیم احمد کا قلم واقعی "شدت پسند" تھا لیکن انھیں "برادرِ خورد" لکھ کر "فنون" نے حساب برابر کر لیا ہے۔

مالک رام کی رحلت سے حالیہ دور کے غالب شناسوں کا میرِ مجلس اس دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ مجھے ان کے ساتھ دہلی میں دو مرتبہ ادبی پریذیڈیم میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ یہ اعزاز ان کا حق اور ادبی جلسوں کا وقار تھا۔ میرے جیسے "خورد" کو یہ مقام پاکستان کے مندوب کی حیثیت میں ملا۔ مالک رام تحقیق و تنقید میں غلطی یا سہو کی نشان زدگی پہ برہم نہیں ہوتے تھے۔ فرماتے "غلطی وہی کرے گا جو کام کرے گا" ـــــ اور غلطی کی اصلاح پر ہمیشہ مائل رہتے۔ میں ان کا آسودہ اور مطمئن چہرہ اپنے دل کے آئینے میں دیکھ رہا ہوں ـــ مجھے ان کی وفات کی خبر محمد عالم مختار حق صاحب نے دی تو میں نے ٹیلی فون پر محسوس کیا جیسے وہ رو رہے ہیں۔ وہ ان کے نادیدہ دوست تھے، خط و کتابت کا سلسلہ آخری دنوں تک قائم رہا۔

ڈاکٹر محمد باقر بھی تحقیق کے قبیلے کے آدمی تھے۔ ان کا حافظہ زندگی کے آخری لمحے تک تازہ رہا۔ ماضی کا ذکر یوں کرتے جیسے کتاب کے اوراق پڑھ رہے ہوں۔ بڑی کوتاہی ہوئی کہ ان کی باتیں ٹیپ نہیں کی گئیں ـــ چند برس قبل دوسری شادی کر لی تھی۔ لوگوں نے انگشت نمائی کی لیکن ڈاکٹر صاحب بے حد مطمئن تھے کہ ان کی نگہداشت اچھی طرح کی جا رہی تھی۔ ممتاز افسانہ نگار فرخندہ لودھی بتاتی ہیں کہ بیگم ڈاکٹر محمد باقر انھیں ایک مثالی شوہر قرار دیتی ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی اب ان کے ذکر پر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

غلام ربانی تاباں ترقی پسند تحریک کے سائے میں پروان چڑھے اور عمر بھر "وفاداری بشرطِ استواری" کی مثال قائم کی۔ خوبی کی بات یہ کہ جب بہت سے ترقی پسند غزل کے بدلے ہوئے مضامین قبول کر رہے تھے تو غلام ربانی تاباں نے اپنی انسان دوستی کے اظہار کے لیے لفظیات تبدیل کرنے کی ضرورت کو چنداں اہمیت نہ دی اور فکرِ تازہ کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا۔

سیف الدین سیف ان شاعروں میں سے تھے جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے عروج کے دور میں اپنی پہچان اپنی شاعری سے مستحکم کر لی تھی۔ اس دور میں انھوں نے مقبول شاعروں کے رسیلے میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کی خودی اور خودداری کے بیسیوں قصے اظہر جاوید کو یاد ہیں اور اب کرامت بخاری سناتے ہیں، میکلوڈ روڈ پر ان کا ہوٹل شاعروں نے ادھار کی چائے میں غرق کر دیا تو وہ فلمی دنیا میں چلے گئے۔ لیکن فلمی گیت کو ادبی شاعری پر غالب نہ آنے دیا۔ ان کی غزل آج بھی دل میں کسک پیدا کرتی ہے۔

گوپال متل اور عامی سعید ـــــ دونوں سے آخری ملاقات دلی میں ہوئی۔ گوپال متل نے صحافت کی گود میں شاعروں کی طرح آنکھ کھولی اور آخری لمحے تک صحرا میں اذان دیتے رہے۔ بھارت کے ترقی پسند انھیں اپنا "دشمن" اسی طرح سمجھتے تھے جس طرح پاکستان کے ترقی پسند "زندگی" میں چھپنے والے مضامین پر ڈاکٹر وحید قریشی کو سمجھتے تھے [illegible]

ے افق پر رسالہ "اوراق" نے روشن کیا تھا۔ وہ اس میدان میں اس وقت آئے جب
ن کی زندگی کی شمع ٹمٹما رہی تھی۔ اور وہ اس شمع کی لو کو طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھ کر روشن
رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ناشروں کے احسانات اٹھانے کے بجائے انھوں نے اپنے مزاحیہ
مضامین کی کتاب اپنے قلم سے کتابت کی، اپنے خرچ سے چھاپی اور پھر مفت تقسیم کر دی۔

خلیل رامپوری نے بھکر جیسے دور افتادہ مقام پر جدید اردو غزل کا چراغ روشن کیا۔
ہ شکیب جلالی اور حیا رام پوری کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ سیف زلفی انھیں ایسا شاعر
قرار دیتے تھے جس میں دنیا داری کی رمق موجود نہیں تھی، بھکر میں ٹیکسٹائل ملز کا مشاعرہ
ہوتا تو قاسمی صاحب سے صدارت کراتے اور شاعروں کی خدمت میں اچھا "نذرانۂ شعر"
پیش کرائے۔ میانوالی کے صحراؤں کی وسعت ان کی شاعری میں سما گئی تھی۔

قمر ہاشمی کی طویل نظمیہ شاعری میں گونج بھی تھی اور گرج بھی، انھوں نے بعض مفکرین عالم
پر کامیاب نظمیں لکھی تھیں، وہ موضوع کو ہاتھ لگاتے تو اشعار کا آبشار ان پر پھوار بکھیرنے
لگتا، وہ سچے انقلابی تھے، اس لیے شہرت سے محروم رہے۔ اور اپنی عظمت کی شناسائی اپنی
ذات تک محدود رکھی، اس پر بے جا تعریف کی ایک کرن تک نہیں پڑنے دی۔

قمر انبالوی بنیادی طور پر ناول نگار تھے لیکن زندگی کا آسرا صحافت تھی۔ لاہور کے
بیشتر صحافیوں کو انھوں نے اخبار "مغربی پاکستان" کے گہوارے میں تربیت دی تھی، کچھ
عرصے تک ترقی پسند تحریک کے نعروں کی زد میں آ گئے لیکن عمر کے آخری حصے میں ایک ایسی عمدہ
طویل نعت لکھ گئے کہ ان کے لیے توشۂ آخرت سمجھی جا سکتی ہے۔ قمر انبالوی کے ناول اب بھی
تجارتی ناشروں کے لیے سونے کی کان ثابت ہو رہے ہیں۔ نامور صحافی ہونے کے باوجود
اخبارات میں ان کا نام قمر انبالوی چھپتا رہا۔

ستار طاہر ایک ایسے ادیب تھے جنھیں ملتے اور پڑھتے وقت میرے ذہن کی فریکوئنسی
ہمیشہ مخالف سمت میں چلنے لگتی تھی۔ وہ نظریاتی طور پر لیفٹ کے آدمی تھے، مجھے اپنی اسلام
پسندی پر ناز تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ ادارہ "قومی ڈائجسٹ" میں آ گئے تو ترقی پسندوں
کو اس پر کوئی حیرت نہ ہوئی۔ انھوں نے کڑے وقت میں ستار طاہر کا ساتھ نہیں دیا تھا۔
ہر چند مجیب الرحمٰن ساقی کو اڈیٹر کی ضرورت نہ تھی لیکن انھوں نے کہا، "ستار طاہر! آ جاؤ، دونوں
مل کر آدھی آدھی روٹی کھا لیں گے"۔۔۔ ستار طاہر اس بات کا ذکر اکثر کرتے اور دفتر "قومی
ڈائجسٹ" آتے تو اپنے نظریات کرشن نگر میں چھوڑ آتے تھے۔ ہم دونوں دفتر میں ایک
دوسرے کے معاون تھے لیکن ہم نے اپنی اپنی "فریکوئنسی" قائم رکھی اور "تخلیق" کے صفحات
پر لڑائی میں کسی کو "ریفری" نہیں بنایا۔ عید الفطر کے دن وہ اس دنیا سے اچانک چلے گئے
تو احساس ہوا کہ ستار طاہر کیسا آزاد مرد تھا۔ حق مغفرت کرے۔ ان کی باہمت بیگم نگہت
ستار طاہر ان کی یاد کو زندہ رکھنے کی سعی کر رہی ہیں۔

ڈاکٹر احسن زیدی پر موت چیل کی طرح جھپٹی اور آناً فاناً لے اڑی، مجھے یوں لگا جیسے

موت میرا گھر بھول گئی ہے اور غلطی سے احسن زیدی کے گھر چلی گئی ہے۔ زیدی صاحب نے تو ابھی عدم کا پاسپورٹ بھی نہیں بنوایا تھا۔ "ورق ورق آئینہ" ان کی شاعری کی پہلی کتاب تھی۔ "دریا دریا غم" اب ان کی وفات کے بعد شائع ہوگی۔ ڈاکٹریٹ کا مقالہ انھوں نے اردو میں منقبت نگاری کے موضوع پر لکھا تھا۔ فیصل آباد کی ادبی کہکشاں ان کے بغیر سوگوار سوگوار سی لگتی ہے۔

تنویر سپرا مزدور شاعر تھے۔ یعنی شاعری کے لیے مزدوری کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے انھیں احساس دلایا کہ وہ مزدوروں کے شاعر ہیں۔ بس اس دن کے بعد وہ کھردرے لفظ لکھنے لگے۔ ان کی شاعری کا انداز بدل گیا۔ لیکن شاعری نہ ان کی شہرت کا وسیلہ تھا اور نہ تنویر سپرا نے اس سے مشاعروں کی دولت سمیٹی ــــ انھوں نے آخری لمحے تک رزقِ حلال کمایا، رزقِ حلال کھایا۔ مفلسی میں لپٹے رہے، غربت میں زندگی بسر کی۔ دکھ یہ ہے کہ جوانی میں فوت ہوگئے۔ موت کے بعد ان کی قبر پر ترقی پسند دیے روشن کر رہے ہیں ــ بلند آواز سے کہہ رہے ہیں ؎

"آج کی شب جب دیے جلاؤ اونچی رکھنا لو"

غافل کرنالی کا انتقال لیہ میں ہوا۔ قناعت، استغنا اور صبر ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ جس کی حفاظت کے لیے وہ زندگی بھر مشکلات کے آگے سینہ سپر رہے۔ ان کا اپنا کلام رسائل میں بکھرا ہوا ہے۔ مختلف شعرا کی نظموں کی ایک مؤلفہ کتاب ان کی یادگار ہے۔

فیض لدھیانوی کا مکتوب گرامی اور ان کی وفات کی خبر بیک وقت آئی، دل دھک سے رہ گیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے ۸۰ برس اپنی غیور غربت کے ساتھ بسر کیے تھے۔ اور پیدل چل کر زندگی گزار دی، فیض لدھیانوی میرے والد کے دوستوں میں سے تھے۔ میں بڑا ہوا تو وہ میرے بھی دوست بن گئے۔ میں انھیں یاد کر رہا تھا کہ ان کے زندہ ہونے کی خبر آگئی۔ ان کی زندگی کی خبر پڑھ کر دل کی دھڑکن پھر چل پڑی۔ دل سے دعا نکلی ــــ فیض صاحب! آپ زندہ رہیں ہزار سال۔

۱۹۹۳ء ختم ہوگیا ہے۔ اب دوستوں کی یادیں ۱۹۹۴ء سے آگے سفر کریں گی۔ یہ سفر رواں دواں رہے گا ــ یادوں کا سلسلہ لیکن رکا ہے؟ بالخصوص ان دوستوں کی یادوں کا جن کے ساتھ مجھے زندگی کا باقی ماندہ "بونس" صرف کرنا ہے ــ اچھا دوستو! ــــ یار زندہ صحبت باقی ــــ یار زندہ صحبت باقی ــــ صحبت باقی ــ صحبت باقی۔

کتاب نما کے قارئین توجہ فرمائیں۔

خط و کتابت کرتے وقت یا زرِ سالانہ بھجواتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

بشر نواز
محلہ گھاٹی اورنگ آباد

مخمور سعیدی کی غزل

زندگی کی طرح ادب بھی نامیاتی مظہر ہے۔ اس میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ادب میں تبدیلی تشویش کا باعث نہیں البتہ اس کا ٹھہراؤ اور یکساں صورت حال اس کی صحت اور زندگی کے تعلق سے مختلف شبہات کو جنم دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس طرح زندگی ہزار تبدیلیوں کے بعد بھی اپنی اصل سے جدا نہیں ہوتی اسی طرح کسی زبان کا ادب اپنے تہذیبی اور لسانی محور سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ ادب میں وقت اور حالات کی مناسبت سے تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی ان کا دائرۂ عمل زبان کے معاشرتی تہذیبی، لسانی اور تاریخی حدود کے اندر ہی واقع ہوگا کہ زبان ایک مخصوص تہذیب کا مظہر ہوتی ہے اور ادب اس کے بہترین عناصر کی ایسی ترتیب و تزئین سے وجود میں آتا ہے جس کے پیچھے صدیوں کا تجربہ کارفرما ہوتا ہے۔ روایت کی تشکیل و استحکام میں صرف لکھنے والے ہی حصہ نہیں لیتے بلکہ زبان کے بولنے اور سمجھنے والوں کا تصور بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان میں کچھ ہیئتیں اور کچھ طرز اظہار غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور باقی سرمایہ نقادوں کے کاروبار چلانے یا دانشوروں کی انا کو تسکین پہنچانے کے کام آتا ہے۔

ہمارے ہاں جب سے تنقید کا بول بالا ہوا ہے تبھی سے عام پسندیدگی اور تنقیدی ترجیحات میں ایک خلیج سی حائل ہوتی ہے جس کی وجہ سے نام نہاد ادبی فن پاروں سے عام کیا اچھا خاصا باذوق قاری بھی دور ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری طرف عام قاری کی پسند کا "ادب" ادبی اعتبار حاصل کرنے میں بجا طور پر ناکام نظر آتا ہے۔ یہ صورت حال یوں تو پورے ادبی منظر نامے پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے اپنے وجود کا احساس دلا دیتی ہے لیکن اس کا بھرپور مظاہرہ ہمارے مشاعروں میں ہوتا ہے جہاں ادبی شاعر اور مشاعروں کے شاعر واضح طور پر الگ الگ قطبین پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہر معاملے کی طرح مشاعروں کے معاملے میں بھی کچھ مستثنیات ہیں اور مخمور سعیدی انھیں میں شامل ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ آج کل کسی اچھے شاعر کا رشتہ مشاعرے سے جوڑنا اُسے ناراض کرنے کے لیے کافی ہے لیکن میں اس ادارے کی اہمیت کا بھی قائل ہوں اور اس بات سے

بھی واقف ہوں کہ مشاعرے اپنے صحیح معنی میں، ہماری روایت کے امین، ذہنی تربیت کا وسیلہ اور شاعر و سامع کے درمیان رابطے کا سب سے موثر ذریعہ رہے ہیں اور آج بھی بن سکتے ہیں۔ چنانچہ میرے نزدیک شاعر اور مشاعرے یا یوں کہہ لیجیے کہ شاعر اور سامع کے آپسی رشتے کی تلاش دراصل شاعر اور اردو کی وسیع تر روایت اور اس کے بنیادی مزاج کے رابطوں کی تلاش ہے۔ یہاں اس مسلمہ کلیہ کو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ کوئی فن پارہ نہ اپنے تہذیبی اور لسانی سیاق و سباق سے الگ کوئی وجود رکھتا ہے نہ معنویت۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ فن پارے یا فنکار کی قدر و قیمت کا تعین کرتے وقت اُسے اس کی زبان و تہذیب کے تسلسل سے رکھ کر دیکھا جائے۔

مخمور سعیدی اُن گنے چُنے شعرا میں ہیں جن کے شعور و فکر میں روایت رچی بسی ہے۔ کتابی نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کمزور لمحوں میں بھی زبان و بیان کی بے راہ روی کا شکار نہیں ہوتے اور نئے سے نئے موضوع کو بھی کلاسیکی رکھ رکھاؤ کے ساتھ برتنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ مخمور کے ہاں بے محابہ تجربہ نہیں، تھما تھما سا، سوچتا ہوا انداز نمایاں ہے۔ ان کا اچھا شعر بھی قاری یا سامع کو اپنے ساتھ بہا نہیں لے جاتا رک کر سوچنے اور محسوس کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اُن کا شعری رویّہ بنیادی طور پر صفائی، وضاحت اور الفاظ کے برمحل استعمال سے تشکیل پاتا ہے چنانچہ اُن کا شعری ابہام اور اغلاق سے پاک ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ایلیٹ کا کہنا ہے "ہر شاعر کو کچھ پانے کے لیے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے" مخمور کے بھی معنوی مختلف الجہتی اور استعاراتی طرزِ اظہار کی قیمت پر "شفافیت" کی صفت حاصل کرنی پڑی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے ہاں شعر کی مختلف جہتیں نہیں نکلتیں یا اُن کے جہانِ فکر میں استعارے کا گزر ہی نہیں ہے کہنا صرف یہ ہے کہ مخمور کے شعری رویّے کی بنیاد استعارہ سازی پر نہیں جذبہ و فکر کے راست اظہار پر ہے۔ وہ ذیلی طور پر تشبیہ، استعارے اور کنائے وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں البتہ کچھ غزلیں ایسی ضرور ہیں جن کی ردیفیں استعارے کا کام دیتی ہیں۔

بادباں تیرا بنے تیز ہوا کی چادر
کشتی موجِ رواں پر ہو سفر پانی میں
کشتیاں ڈوبنے والوں کی تجسس میں نہ جائیں
رہ گیا کون خدا جانے کدھر پانی میں

اُن کی طرف بھی ابرِ رواں دیکھتا تو جائے
اس سبزہ زار میں بھی ہیں سوکھے ہوئے درخت
پت جھڑ کے ہاتھ نوچ رہے ہیں بدن کی کھال
اترا لباسِ سبز، برہنہ ہوئے درخت

(یہاں پانی زندگی اور درخت افراد کا استعارہ محسوس ہوتے ہیں) مخمور کی کئی غزلوں میں اسما ردیف یا جز و ردیف ہیں لیکن اساتذہ یا خیال بند شعرا کی طرح ان کے اشعار ردیف کے تلازموں کے بل پر

ترتیب نہیں پاتے بلکہ شاعر کا خیال یا جذبہ ان اسما کو کسی کلی یا جزوی حقیقت کا اشاریہ بنا دیتا ہے اور اس طرح ہر شعر میں ردیف ایک نئی معنویت پیدا کرتی ہے۔ ردیف کو استعارے کی سطح تک لے جانے کا عمل شاعر کی جدید حیثیت کی دین ہے۔ (علامت، استعارہ، کنایہ اور رمز آج کا مزاج ہے) اور اُس کا ایسا حرف جس میں نہ کوئی جھول ہو نہ وہ محض ردیف بن کر رہ جائے۔ شاعر کے فنی شعور اور قدرتِ کلام کی دلیل ہے۔ گذشتہ کچھ برسوں میں ہمارے ہاں نئی شعری زبان، نئی بوطیقا اور قواعد کی تشکیل نو کا کچھ اتنا چرچا ہوا کہ کچھ لوگ زبان کے صحیح استعمال اور مشرقی شعریات کا نام لیتے ہوئے بھی شرمانے لگے ہیں۔ ان حالات میں کسی شاعر کا اپنی تہذیبی اور ادبی اقدار سے نہ صرف وابستہ رہنا بلکہ اُنھیں ایک نئی معنویت سے روشناس کروانا ایک طرف تو اُس کی خود اعتمادی کی دلیل ہے اور دوسری طرف اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ وہ اپنے ورثے کی قوت اور کمزوری سے پوری طرح واقف ہے۔ اس واقفیت نے مخمور میں وہ انتخابی صلاحیت پیدا کر دی جس کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے چنانچہ وہ نہ ادب اور معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کی طرف آنکھیں بند کر کے قدیم کے حصار میں اپنے آپ کو قید رکھتے ہیں نہ تنکے کی طرح اپنے آپ کو نئی ہواؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں بلکہ اُن کے ہاں قدیم و جدید میں موضوع اور طرزِ اظہار میں اور لفظ و معنیٰ میں اُس ربط و توازن کی جستجو ملتی ہے جو اچھے ادب کا لازمہ ہے۔ کلاسیکی ادب میں لفظ اہم بھی ہوتا ہے، قابلِ احترام بھی اور فنکار کے اندرون کے اظہار کا وسیلہ بھی اس لیے ہر اُس لکھنے والے کا ہاں، جس کا رشتہ کلاسیک سے ملتا ہو نہ لفظوں سے غیر ضروری چھیڑ چھاڑ ملے گی نہ اُن کا اسراف وہ الفاظ کو نہ اپنا محکوم سمجھے گا نہ حاکم، یہاں فنکار اور لفظ کا رشتہ لازم و ملزوم کا سا ہوتا ہے۔ لفظ کو اپنی معنویت پانے کے لیے فنکار کی اور فنکار کو اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے لفظ کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے دونوں میں ایک قسم کی اپنائیت اور باہمی احترام کا تعلق ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلاسیکی مزاج کے لکھنے والے لفظ کو دیگر لوازمات اظہار، مثلاً تشبیہ، استعارہ، کنایہ، پیکر یا علامت پر ترجیح دیتے ہیں۔ میں یہاں صرف ترجیحات کی کر رہا ہوں یعنی اس نوع کے فنکار یقیناً دیگر لوازماتِ شعر استعمال کرتے ہیں لیکن صرف اس وقت جب لفظ کی ہیئتی یا معنوی مجبوری کی وجہ اُن کا ساتھ نہ دے سکیں بہ صورتِ دیگر وہ لفظ ہی کے ذریعے وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جو اُنھیں کہنا ہوتا ہے۔ مختصر لفظوں میں ان فنکاروں کے ہاں لفظ اپنے حقیقی اور ٹھوس معنیٰ میں استعمال ہو کر اُن اشیا، کیفیات اور خیالات پر دلالت کرتے ہیں جن کے لیے وہ وضع ہوئے ہوں — مخمور سعیدی کے ہاں لفظ کی یہی صورت ابھرتی ہے اور اُنھیں دیگر فنی اظہارات سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ مخمور کی کامیابی یہ ہے کہ اُن کا شعر اس کمی کا احساس نہیں ہونے دیتا اور اپنے پڑھنے اور سننے والے سے راست ربط قائم کر لیتا ہے۔

صرف اک تجھے کھو کر تھا میں کس قدر تنہا
آ لگی گلے دنیا مجھ کو دیکھ کر تنہا

وابستہ اُن کے ساتھ ہماری بھی یاد تھی
کچھ واقعے جو بھولی ہوئی داستاں ہوئے
زندگی تیرے لیے کتنے ہی ہوا ہوں گے
تو چلی آئی ہے ہم خانہ خرابوں میں کہاں
جانبِ کوچہ و بازار نہ دیکھا جائے
غور سے شہر کا کردار نہ دیکھا جائے
سرخیاں خون میں ڈوبی ہیں سب اخباروں کی
آج کے دن کوئی اخبار نہ دیکھا جائے

مخمور کے ہاں اُن کی اپنی ذات موضوع بنتی ہے اور اُسی کے حوالے سے وہ اپنے اطراف و اکناف پر نظر ڈالتے ہیں اور چوں کہ وہ اپنی ذات کے خول میں بند نہیں ہیں اس لیے ان کی ذات ایک ایسے آئینے کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے جس میں ان کا پورا ماحول اور معاشرہ منعکس ہوتا ہے اور چوں کہ آئینے کا زاویہ شاعر کا اپنا منتخب کردہ ہے اس لیے انعکاس کے بھی وہی پہلو اُبھرتے ہیں جو اس کے اپنے دائرۂ عمل میں ہوں۔ ممکن ہے کہ اِس کی وجہ سے کچھ تحدیدات بھی آگئی ہوں لیکن کس فنکار کے ہاں تحدیدات کا گزر نہیں؟ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ فنکار اپنے منتخب کردہ دائرۂ عمل میں کس حد تک کامیاب یا ناکام رہا ہے۔

مخمور سعیدی نے اپنے لیے جو دائرۂ عمل منتخب کیا ہے وہ غیر مشروط ذہن اور اُس کے بڑی حد تک کلاسیکل اظہار سے عبارت ہے۔ غیر مشروط ذہن کی وجہ سے انھوں نے ہر تبدیلی کو کھلے دل سے قبول کرنا سیکھا اور کلاسیکل اظہار انھیں غیر مبہم، نپا تلا اور حسبِ حال طرزِ اظہار سکھایا چنانچہ اُن کے ہاں موجودہ مسائل کا بیان بھی ملتا ہے۔ ماضی کے نقوش بھی نمایاں نظر آتے ہیں اور اُن کی ذات میں بپا تلاطم کی چھوٹی بڑی موجوں کی جلوہ گری بھی۔ یہ بات الگ ہے کہ اُن کی شاعری کا مرکزی کردار خود ان کی ذات ہے اور وہ اِسی توسط سے باہر کی دنیا سے ربط قائم کرتے ہیں گویا وہ روداد جہاں، حدیثِ دل کے وسیلے سے سناتے ہیں اور اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ سنائی جانے والی بات، سنانے کے انداز اور لب و لہجہ کے اُتار چڑھاؤ میں ایسا توازن برقرار رکھیں کہ اُن کی بات سننے والے تک پہنچ بھی جائے اور اُسے متاثر بھی کرسکے، یہی توازن اور موضوع و اظہار کی ہم آہنگی اُن کا اسلوب متعین کرتی ہے۔ اپنی سہولت کے لیے میں متوازن اسلوب کا نام دوں گا۔ اِس اسلوب کی شناخت نہ محض پیکر و علامت شماری سے ہوسکتی ہے نہ صرف الفاظ اور ان کے تلازموں کی گنتی سے۔ یہ اسلوب نہ اپنی بوالعجبی سے پہلی نظر ہی اپنے الگ ہونے کا احساس دلاتا ہے نہ کلشیز کے خودرو جنگل کا حصّہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کی شناخت کے لیے اس صاحب نظری کی ضرورت ہے جو ادب اور خصوصاً اپنے ادب کے باشعور مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔

مخمور سعیدی ان معدودے چند عصری شعرا میں شامل ہیں جن کی غزل میں کلاسیکیت کا

نگار بھی ہے اور اپنے دور کی دھڑکنیں بھی اُن کی غزل ہم عصر شعرا کی غزلوں سے یوں مختلف ہے کہ اس میں روایت کے چراغ روشن ہیں اور روایتی غزل سے یوں الگ ہے کہ اس میں لفظ اپنے مسلّمہ اور رسمی تلازموں سے آزاد ہو کر ایک خود مکتفی اور مختار مظہر کا مرتبہ پاتا ہے اور مقررہ معنیٰ دیتا ہے جن کے لیے شاعر نے اُسے برتا ہو۔ لفظوں پر یہ حاکمانہ قدرت مخمور کو اپنے معاصرین سے مختلف بھی بناتی ہے اور انھیں آج کے مقبول وسائل اظہار کی دست نگری سے بچا بھی لے جاتی ہے۔ اِس منزل تک پہنچنے میں یقیناً مخمور کو کچھ کھونا بھی پڑا ہے لیکن فن پارے سے لطف اندوزی میں یہ نہیں دیکھا جانا چاہیے کہ اس میں کیا نہیں ہے یہ دیکھنا چاہیے کہ جو ہے اس کا معیار و مرتبہ کیا ہے۔ رخصت ہونے سے قبل کچھ شعر اس توقع کے ساتھ پیش کروں گا کہ اُنھیں اِسی روشنی میں دیکھا جائے گا۔

خود اپنا لہو پینا مرنے کے لیے جینا
اے ہم نفسو تم نے کیا روگ یہ پالا ہے

تلخیٔ مرگ رگ و پے میں اترتی جائے
زندگی تو نے یہ کیا زہر پلایا ہے مجھے

منظر تری بستی کے سب دشمن جاں نکلے
راتیں بھی مری قاتل دن بھی مجھے ڈستا ہے

نقش ٹھہر جاتا کہیں تو نقش بن کر
وہ اک عکس رواں منظر بہ منظر

تیری قربت میں تو چپ سی ہمیں لگ جاتی ہے
تجھ سے کچھ بات کریں دور بٹھا کر تجھ کو

آج آیا نہیں وہ کل بھی کہاں آیا تھا
تم اگر راہ تکو گے یہی اکثر ہو گا

مدعا مرا اِن الفاظ کے دفتر میں نہ ڈھونڈ
وہی اک بات جو میں کہہ نہ سکا میری تھی

پھینک آئے گی کنارے پہ یہی موج رواں
اور کچھ دیر اسی موج کا پیچھا کر لو

ہاتھوں پہ جھیلنا ہیں سب وار دشمنوں کے
تلوار کیا کہ ہم تو رکھتے نہیں سپر بھی

میری دہلیز تک آتی ہے پلٹ جاتی ہے
سرگراں کیوں ترے قدموں کی صدا ہے مجھ سے

ر مہدی
/ا - روی درشن
ر روڈ - باندرہ (ویسٹ)
ی ۵۰

جوشؔ کی یاد میں

وفا شعار ہیں، سرکش ہیں، خوار ہیں ہم لوگ!
زمانہ ساز کے سینے میں خار ہیں ہم لوگ!

جلا کے رکھیں گے بازارِ سرفروشاں تک
مثالِ برق سرِ کوہسار ہیں ہم لوگ!

تڑپ تڑپ کے رہیں گے تمام شہروں میں
ہنسو نہ ہم پہ "غریب الدیار ہیں ہم لوگ"!

کہاں کے ہم سفراں اور کیسی منزل ہے؟
ہوا کے دوش پہ کب سے سوار ہیں ہم لوگ؟

ہمارے واسطے کون و مکاں میں کام نہیں
کہ لفظ و معنی کے پروردگار ہیں ہم لوگ!

کل اپنے آپ کو پہچان بھی نہ پائیں گے
نشاطِ شب کا اُترتا خمار ہیں ہم لوگ!

تباہ ہو کے کہاں چپ رہے تنا، باقر
غموں سے چور ہیں، سینہ فگار ہیں ہم لوگ!

غزل

خالد محمود
شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۲۵

رنگ و رامش، زمزمے، گلہائے تر ہوتے ہوئے
دل اکیلا اور راستے ہم سفر ہوتے ہوئے

آنسوؤں سے سرد ہو جاتی ہے ہر سینے کی آگ
میرا دل آتش کدہ ہے چشمِ تر ہوتے ہوئے

حوصلہ ٹوٹا تو وہ عبرت کا منظر آگیا
اُڑ نہیں پائے پرندے بال و پر ہوتے ہوئے

دل کی دنیا میں اندھیرا ہو تو کچھ روشن نہیں
آنکھ، چشمِ سنگ ہے شمس و قمر ہوتے ہوئے

پھولنے پھلنے سے ہر ڈالی نہیں جھکتی کہ آپ
سرو کی مانند ہیں، شاخِ ثمر ہوتے ہوئے

چشم آگے ایک چہرا، پاؤں گو چکر میں ہیں
دربدر ہوتا نہیں دل، دربدر ہوتے ہوئے

ہر کس و ناکس پہ کر لیتا ہے فوراً اعتبار
بے خبر کتنا ہے خالد، باخبر ہوتے ہوئے

شاہد ماہلی۔

قلم میں جنبشِ انکار آئے
خدایا جرأتِ اظہار آئے

حصارِ خامشی بھی ٹوٹ جائے
بتوں میں قوتِ گفتار آئے

نہ آئے نفرتوں کا شائبہ بھی
جو آئے گل رخوں پر پیار آئے

اِدھر تو ہے اندھیرا ہی اندھیرا
اجالے سب پسِ دیوار آئے

یہ کیسی جنگ تھی دشتِ بلا میں
یتیم و بیوہ و بیمار آئے

شکستہ پا بہ سر شہرِ انا میں
لٹا کر نخوت و پندار آئے

کہیں یہ قافلہ شہرِ ہوس کا
کہیں تو خیمۂ ایثار آئے

نہیں کچھ درد کا شاہد مداوا
کوئی بھی مونس و غم خوار آئے

نعیمہ ضیاء الدین
جرمنی

حنیف ترین سنبھلی
سعودی عربیہ

میرے بازو سے عمل ہی کے قریں ہے امکاں
حوصلوں آؤ ابھی زیرِ نگیں ہے امکان

تو جہاں بھی ہو، ترے ساتھ وہیں ہے امکان
اور پھر تیری رفاقت کا امیں ہے امکان

وہ ہر اک شے میں ہے، تو آنکھ ذرا کھول کے دیکھ
گو تری سوچ سے بالائے بریں ہے امکان

دل کے جس پیڑ کی ٹہنی سے اڑے ہیں پنچھی
پھر وہیں ان کے بسیرے کا نہیں ہے امکاں

غیر ممکن کو بھی ممکن نہ بنا آیا ہو
سایۂ وقت میں کیوں خندہ جبیں ہے امکان

تلخیٔ زیست سے جینے کا مزہ اور بڑھا
تیری سنگت سے کہ رنگین و حسیں ہے امکاں

ایک پیغام ہے جن کے لیے شعروں میں حنیف
وہ سمجھ جائیں تو پھر رنج میں ہے امکان

بے شعور گلیوں میں دادِ سرفروشانہ
آبروئے دل آخر لٹ گئی ناجانانہ

بے غرض محبت اور بے طلب وفاداری
تم تو سب گنوا کے بھی ہو گئے ہو بیگانہ

بے ضمیر چہروں میں شائقینِ شیشہ گر
دست و سر بریدہ ہوں کہ ہے یہ رسمِ سلطانہ

کانچ اس قدر نازک مے ہو آتشیں ایسی
ضربِ وقت سے ٹوٹے زندگی کا پیمانہ

ساقیا بگڑتا کیا ہم سے تشنہ کاموں پر
ہیں فقط رفیقِ شب اپنے مے و میخانہ

صدقِ شوق کا دعویٰ کیا سراغ پائیں ہم
جل کے مٹ ہی جائیں گے شمع ہو کہ پروانہ

ظفر مرزاپوری
میدان گلی ۔ واسلیگنج ۔ مرزاپور

غزل

کام آتی ہے ہراک دور میں فنکار کی آگ
وقت کو راہ دکھاتی ہے قلمکار کی آگ

جس نے موسیٰؑ کو روانہ کیا فرعون کی سمت
چاہتا ہے یہ زمانہ وہی کہسار کی آگ

شمس تبریز کہو یا کہو منصور مگر
بڑھ کے میں نے ہی بجھائی رسن و دار کی آگ

مہرباں ہو کے کسی کھیت پہ برسی ہے کبھی
آگ شہروں میں لگا دیتی ہے اخبار کی آگ

سرد ماحول میں رہ کے بھی نہ ٹھنڈی ہوگی
ذہنِ شاعر میں رہا کرتی ہے افکار کی آگ

یوں جلاتی ہے کوئی زخم دکھا بھی نہ سکو
صورتِ گل نظر آتی ہے ظفرؔ پیار کی آگ

عنبر احمد قرار
احمد سیلر ہائی اسکول ۔ ڈی ۔ ٹی بورڈ
ناگپاڑہ ۔ بمبئی ۔

غزل
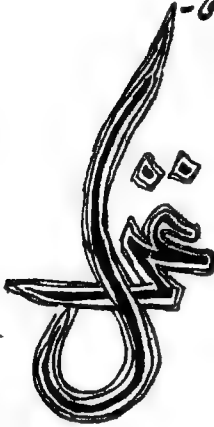
موم کی دیوار پر مت لکھو پریشانی مجھے
بڑھ کے دشواری دیا کرتی ہے آسانی مجھے

جب سے آنکھیں کھل گئیں لطف تماشا کھو گیا
اب اٹھانے سے رہی جنگل میں حیرانی مجھے

اے فرشتو! میں ہوا کے سامنے مجبور ہوں
ڈھونڈ ہی لے گی کسی صورت پشیمانی مجھے

دھوپ کے سر پر ذرا سی چھاؤں بھی کچھ کم نہیں
پیاس کی تصویر ہوں بہا گیا پانی مجھے

ریت کے جادو نے آنکھوں میں سمندر بھر د[illegible]
کیا ڈبو دے گی مرے گھر کی بیابانی مج[illegible]

مخلصانہ قہقہوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا
[illegible]

شائق عدیل
علی گڑھ

غزل

زر ہا تھا سمندر سراب کے اندر

بچھڑ کے خود سے ملا جب میں خواب کے اندر

رگیں کھینچیں تو بدن خواب کی طرح ٹوٹا

ملا کا زخم بھرا تھا حباب کے اندر

عجب جنون مری انگلیوں میں جاگا ہے

رخون ڈھونڈ رہی ہیں گلاب کے اندر

ماہ و سال کے کب تک حساب لکھ کے رکھوں

سیر ہماری صدی ہے عذاب کے اندر

کو فیض ملا تو لبوں پہ مہر لگی

رات یوں بھی ملی ہے سراب کے اندر

نثار جے راجپوری
شعبۂ کامرس۔ شبلی نیشنل پی جی کالج
اعظم گڑھ۔ یو۔پی۔

غزل

لے کر کچھ نہ جائیں گے تیری یہ جاگیر
کچھ نہ کچھ دے جائیں گے سادھو سنت فقیر

باغوں میں جاؤں جدھر کھلے ہیں سارے پھول
پیڑ نہ کوئی آم کا چاروں اور ببول

ساون آیا جھومتا چلے ہوا چہو اور
راکھ ہوئے انگار سب دکھیا ہوئی چکور

ایک ہی ماں کی کوکھ سے اک کالا اک گور
ایک ہے صوفی اولیا دوجا ہے اک چور

کھوہ کے اندر بیٹھ کر گیان کے دیپ جلائے
بوند جو ٹھہرے سیپ میں موتی وہ کہلائے

جس کو تو اتم کرے اس کو کون مٹائے
پیڑ کھڑا ساگون کا دیمک پاس نہ جائے

ننھا بچہ سے دکھ کھاتا پھرے تھپیڑ
روئے بیٹھا موڑ پر برگد تھا اک پیڑ

حنا انجم
بلرام پور۔ یوپی

معراج رعنا
چوکھنڈی۔ سہسرام (بہار)

آنکھوں میں مری اسورج کی اک قوس پڑی تھی
اور نیند کی دیوی تھی کہ چوکھٹ پہ کھڑی تھی

وہ آکے منا جائے تو احسان ہو اُس کا
ویسے یہ حقیقت ہے کہ میں حق پہ لڑی تھی

دنیا تھی اِدھر اور اُدھر پیار تھا اُس کا
سہمی ہوئی میں بیچ میں دو نوں کے کھڑی تھی

ہاتھوں میں لرزتا ہوا ماضی کا تھا البم
پلکوں پہ مری یادوں کے موتی کی لڑی تھی

ویسے تو میں بیتاب تھی خود ملنے کو اُس سے
کچھ بات ہی ایسی تھی کہ میں جس پہ اڑی تھی

ہنس ہنس کے وہ سامانِ سفر باندھ رہا تھا
رو بھی نہ سکی میں کہ قیامت کی گھڑی تھی

جھک کر ہی ملی اُس سے حنا جب بھی ملی میں
سوچا نہ کہیں بھی کسی پہلو سے بڑی تھی

ہاتھ میں لے کر الجھے ریشم میں کھ چپ ہوں وہ بھی گم
گونج رہی ہے سورج کی سرگم میں بھی چپ ہوں وہ بھی گم

شاید ٹوٹنے والی ہیں زنجیریں دل کے رشتوں کی
ہونٹ مقفل آنکھیں پُرنم میں بھی چپ ہوں وہ بھی گم

مہکی سڑکیں رات کا منظر وہم نشے میں سرد ہوا
بول رہا ہے تنہا موسم میں بھی چپ ہوں وہ بھی گم

فرش پہ بکھری پھولوں کی خوشبو بر رہے سر کے کھڑکی کے
چاندکی کرنیں مدھم مدھم میں بھی چپ ہوں وہ بھی گم

سبز رتوں کی راکھ کو مل کر رعنا بھیگی پلکوں پر
دیکھ کے چلتے [illegible]

انور شفیق اعظمی
سرائے میر۔ اعظم گڑھ۔ یوپی

غزل

ایسا تم زینہار مت کرنا
شوق کو بے مہار مت کرنا

وہ یہاں اب کبھی نہ آئے گا
اس کا اب انتظار مت کرنا

راز کو راز ہی صدا رکھنا
راز کو آشکار مت کرنا

حد تو حد ہے کسی بھی شے کی ہو
تم اس حد کو پار مت کرنا

شاعری ایک شوق ہے انور
اس کا تم کاروبار مت کرنا

احترام اسلام
الہ آباد۔

تقسیم

سیدھی اٹھائی جانے والی دیواریں
جب گھیرتی ہیں
کسی قطعۂ زمین کو
تو
آدمی کو حاصل ہوتا ہے ایک گھر
اور جب
یہی دیواریں
کھڑی کی جاتی ہیں گھر کے اندر
تو
سامنے آتا ہے بٹوارا
مسدود ہو جاتا ہے راستہ
جسم سیاہ پڑ جاتا ہے
فطرت سے مفت ملنے والی روشنی کا
پڑ جاتی ہیں بیڑیاں
شعور باقی ہواؤں کے پیروں میں
جنم لیتے ہیں تنگ دائرے
جن میں آباد ہو جاتا ہے
بیناکی چھینتا اندھیرا
پالتو جاتی ہے
بدبو پھیلاتی سیلن
اور آدمی کا گھر
بن جاتا ہے پناہ گاہ
لاتعداد جراثیم کی

فاروق شکیل
ورگل پورہ۔ حیدر آباد

تم میرا انتخاب تمہارا میں انتخاب
تم بھی ہو لاجواب تو میں بھی ہوں لاجواب

فرصت اُس آدمی کو کہاں ہے گناہ کی
روٹی جس آدمی کو ہو مشکل سے دستیاب

یوں دل میں تیرے درد کو ہم نے سجا رکھا
محراب میں ہو جیسے مقدس کوئی کتاب

اب کیا کسی سے کوئی وفا کی رکھے اُمید
ہر کوئی کر رہا ہے وفاؤں سے اجتناب

کن کن خرابیوں کا کروں ذکر میں شکیل
القصہ مختصر کہ زمانہ ہی ہے خراب

ڈاکٹر اختر بستوی
لیکچرر شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی۔

میں بھی گویا شہر میں اک پیکرِ تشہیر ہوں
جلتے بجھتے قمقموں کی خوشنما تحریر ہوں

ہوں میں اپنی ذات کے گھیرے میں پابندِ مقام
آسکوں اس سے اگر باہر تو عالمگیر ہوں

میری سیرابی کی قیمت ہے مرا اپنا لہو
تشنۂ نظارۂ عریانیٔ شمشیر ہوں

بن گیا ہوں یوں ضمیرِ وقت پر اک بوجھ سا
جیسے میں آفاق کے دل کی کوئی تقصیر ہوں

مجھ سے یہ ٹوٹے ہوئے ذرّے کی قوّت نے کہا
خاک ہو کر بھی زمانے کے لیے اکسیر ہوں

نالۂ اقبالؔ سمجھے ہیں مجھے اہلِ ادب
میں اگر اخترؔ جو سچ پوچھو تو آہِ میرؔ ہوں

کتھا نما

سیتا رام گپتا
۱۱۹۹-۸۵- ویجے پورہ - دہلی

دعوت نامہ

دیکھ کر عمدہ
سنہرے چھپے حروف
حسین لفافے پر
رہ گیا دنگ
اور کھول کر دعوت نامہ
لگا پلٹنے اس کے رنگ برنگے اوراق
دفعتاً آئی اندر سے ایک آواز
بن کر آہ!
کاش!
اس دعوت نامے کے پنوں پر
لکھا جاتا ایک حصہ
میری آپ بیتی کا
اذیت نامہ میرا
یا اس کے چمکیلے کاغذوں سے
بن پاتی میری بٹیا کے لیے
ایک کتاب اور کاپی
جس سے وہ بھی
پڑھ لکھ پاتی آج
اور سمجھ پاتی
ان چمکیلے حرفوں کو
دعوت نامے کے
یا پھر
اس سے بندھی زری کی ڈوری
باندھ ایک لڑی میں سکتی
محبت کی لڑی میں
مجھ سے تم کو
تم سے اس کو
اس سے ہم کو
دو پھر نہیں ضرورت پڑتی
بھجوانے کی پوتھی پتری
پریم ڈور سے / بندھا بندھا سا
کھنچا کھنچا میں / آتا چلا تمہارے پاس

فضیل علوی
بزریہ شیخانہ - قنوج

غزل

وہ جو ڈوبا تھا مجھ میں جہاں تلک
رہ گیا صرف داستاں تلک

بات میری یہاں سنے گا کون
لوگ سنتے نہیں اذان تلک

کس قدر پُل صراط گزرے ہیں
آسمانوں سے اک مکان تلک

ڈالتے ہیں کمند جگنو پر
شور کرتے ہیں آسمان تلک

بعد میں جو بھی ہو خدا جانے
خیریت ہے مرے بیان تلک

قیع اللہ خان راز اناوی
رہ پیر دل خاں۔ اناوا۔ یو۔ پی

تا بہ کے ذکرِ حادثات چلے
زندگی کی کبھی تو بات چلے

تختۂ دار میری منزل ہے
دیکھیے کون میرے ساتھ چلے

منزلِ آگہی نظر آئی
جس طرف بھی جنوں صفات چلے

دشمنی پر ہی لوگ آمادہ ہیں
کس سے اب دوستی کی بات چلے

اہلِ محفل پہ بار خاطر ہو
راز ایسی نہ کوئی بات چلے

فصیح اللہ خان نقیب
اصغر حسین جونیر کالج۔ اکولہ۔

ابھر کے آتا نہیں صاف خدّ و خال کوئی
پنپ رہا ہے مرے ذہن میں خیال کوئی

ہر ایک صبح کی آخر کو شام ہوتی ہے
ہر ایک عروج کی تقدیر ہے زوال کوئی

شعاعِ مہر کی زد میں ہے قطرۂ شبنم
تری نظیر کوئی ہے مری مثال کوئی

تری نگہ کا سزاوار کوئی سر تا سر
تری نگاہ کا مقروض بال بال کوئی

کبھی کسی نے چھوا بھی نہ ہو تو مانیں ہم
نقیب ڈھونڈ کے ایسی زمیں نکال کوئی

مجتبیٰ حسین

اشوک واجپئی : ادیب و فنکار عہدیدار

> اب اردو اور ہندی والے اپنے اپنے رسم الخط کو برقرار رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کریں

اشوک واجپئی ہندی کے مایہ ناز نقاد اور ادیب ہونے کے علاوہ آئی اے ایس افسر بھی
ہیں۔ اور ان دنوں مرکزی وزارتِ فروغِ انسانی وسائل کے ڈپارٹمنٹ آف کلچر میں جوائنٹ سکریٹری
کے عہدہ پر فائز ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے اردو کی ایک ادبی محفل میں ہم نے ان کا تعارف کراتے ہوئے
کہا تھا کہ ان دنوں جس طرح ہماری سرکار چل رہی ہے اس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے
کہ اسے بھگوان ہی چلا رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہماری سرکار میں گنے چنے چند ایسے عہدیدار بھی ہیں
جو اس سرکار کو چلانے میں بھگوان کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ گویا اشوک واجپئی صرف انسان کے بلکہ بھگوان کے
بھی کام آتے ہیں۔ ان سے ہمارا غائبانہ تعارف تو برسوں پرانا ہے کیونکہ پچھلے ۳۰ برسوں سے وہ
بھی لکھ رہے ہیں اور ہم بھی لکھ رہے ہیں لیکن ان سے شخصی ملاقات چھ سات برس پہلے اس وقت
ہوئی تھی جب وہ بھوپال میں سکریٹری کلچر اور وہاں کے شہرۂ آفاق "بھارت بھون" کے سکریٹری
اور ٹرسٹی تھے۔ حکومت مدھیہ پردیش کے سب سے بڑے سالانہ انعام "اقبال سمان" (مالیتی
ایک لاکھ روپے) کے انعام کا فیصلہ کرنے کے لیے انھوں نے ہمیں جیوری کے ایک رکن کی حیثیت
سے بلایا تھا۔ "جیوری" کے دیگر ارکان میں اختر الایمان، غلام ربانی تاباں مرحوم وغیرہ بھی
شامل تھے۔ اس سال کا یہ انعام عصمت چغتائی کو دیا گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ عصمت آپا آخر وقت
تک ہم سے ناراض رہیں کہ "تم ہوتے کون ہو مجھے انعام دینے والے؟ اور وہ بھی اس عمر میں جب
کہ مجھے کسی انعام کی حاجت نہیں رہی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے کبھی تنہائی میں اپنے آپ سے یہی
سوال کیا تھا لیکن اس سوال کا جواب تو اصل میں اشوک واجپئی کو دینا چاہیے تھا۔ اس کا
جواب نہ انھوں نے ہمیں دیا اور نہ ہی عصمت آپا کو۔ اب تو خیر عصمت آپا ہی نہیں رہیں۔
بھوپال میں اشوک واجپئی کا دفتر بھی دیکھا جس میں فائلیں کم اور کتابیں زیادہ تھیں۔ ایک
رات کو یوں بھی ہوا کہ بھوپال کی سیر کرتے کرتے کھانے میں دیر ہونے لگی تو وہ سڑک کے کنارے
واقع ایک ایسے ہوٹل میں ہمارے ساتھ چلے گئے جسے پنجابی میں ڈھابہ کہتے ہیں۔ اشوک واجپئی

اپنے رویوں میں آئی اے ایس بالکل نہیں لگتے۔ وہ پہلے ادیب اور شاعر ہیں بعد میں اے آئی ایس افسر ہیں۔ حالانکہ ہمارے ہاں عموماً یہ ترتیب الٹی ہوتی ہے۔ آدمی پہلے آئی اے ایس افسر بنتا ہے اور اس کے بعد ادیب اور شاعر بنتا ہے کیونکہ آئی اے ایس افسر بن جانے کے بعد کچھ بھی بن جانا بہت آسان ہوتا ہے تاوقتیکہ افسر وظیفہ پر سبکدوش نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بہت سے افسر ادیب اپنی ملازمت اور ادب دونوں سے ساتھ ہی ساتھ ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ بھوپال کا "بھارت بھون" جو کلچر اور آرٹ کا نہ صرف ہندستان کا بلکہ ایشیا کا سب سے بڑا مرکز ہے وہ اشوک واجپئی کے ذہن کی پیداوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسا مرکز ہم نے دنیا میں کہیں نہیں دیکھا وہی اس کے بانی ہیں۔

اشوک واجپئی کے بارے میں کچھ لکھنے کی ترغیب ہمیں اس وقت اس لیے ملی کہ ایک محفل میں وہ غالب کے شعر سنانے پر اتر آئے تو غالب کا آدھے سے زیادہ دیوان سنا دیا۔ اور وہ بھی صحیح تلفظ کے ساتھ۔ پھر ایک محفل میں میر تقی میر کا ذکر چلا تو "کلیات میر" کا آدھا کلام تو نہیں سنایا تاہم میر کی بے شمار غزلیں سنا دیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اشوک واجپئی اردو رسم الخط بالکل نہیں جانتے۔ اردو ادب کا سارا مطالعہ انھوں نے دیوناگری رسم الخط میں کیا ہے۔ وہ اردو کے سچے بہی خواہ اور ہمدرد ہیں۔ چنانچہ اکثر محفلوں میں وہ اردو کی عظمت کو یوں منواتے رہیں جیسے وہ بنیادی طور پر اردو کے ادیب اور شاعر ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ انیسویں صدی کی اردو شاعری میں جو "عصری آگہی" تھی وہ اس وقت کے ہندستان کی کسی بھی زبان میں موجود نہیں تھی۔ غالب بلحاظ زبان انیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اس وقت ہندستان کی کسی بھی زبان میں کوئی بھی شاعر اس کا ہم پلہ نہیں تھا۔ انھیں حیرت ہوتی ہے کہ میر تقی میر، غالب اور نظیر اکبرآبادی نے اردو ادب میں MODERNISM کی جو روایت چھوڑی تھی وہ بیسویں صدی میں آکر اچانک کیوں غائب ہو گئی۔ اردو کے ہاتھوں میں عصری آگہی کی جو مشعل تھی اس کا شعلہ نہ جانے کیسے بجھ گیا۔

اشوک واجپئی زبانوں، مذاہب اور تہذیبوں کا ایک الگ زاویۂ نگاہ سے جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام ہندستان کے لیے ایک ایسے عظیم تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے جس نے اس ملک کی تہذیب، ثقافت، طرز تعمیر اور رہن سہن کو اپنے ڈھنگ سے مالا مال کیا۔ اگرچہ اردو اسلام کی زبان نہیں ہے لیکن اگر ہندستان میں اسلام نہ آتا تو اردو بھی پیدا نہ ہوتی۔ مسلمان فاتح اردو بولتے ہوئے اس ملک میں نہیں آئے تھے وہ تو فارسی بولتے تھے لیکن ان کے آنے سے وہ عوامل پیدا ہوئے جو ایک نئی زبان کی ولادت کا سبب بن گئے۔ اگرچہ ابتدا میں حکمران فارسی کا ہی استعمال کرتے رہے لیکن رفتہ رفتہ اردو زبان وسیلۂ اظہار کا ایک ایسا طاقتور حربہ بن گئی کہ فارسی پس پشت چلی گئی۔ انیسویں صدی میں ہندستان میں فارسی کی دو ہزار کتابیں شائع ہوئیں۔ جب کہ اس عرصہ میں ایران میں بھی اتنی کتابیں شائع نہ ہوئی تھیں۔ یاد رہے کہ اس عرصہ میں اردو زبان میں میر تقی

اور غالب جیسے شعرا کے دیوان بھی شائع ہوئے۔

بعض دفعہ ہمیں اشوک واجپئی کی باتوں پر ہنسی بھی آتی ہے کیوں کہ ان کا پکا عقیدہ ہے کہ اس شاعری تک سماج میں تبدیلی کو لانے کا واحد ذریعہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آدمی کی تقدیر کو بدلنے کے لیے جو ادارے بنائے گئے تھے، چاہے وہ سیاسی ہوں یا سماجی، ثقافتی ہوں یا سماجی وہ سب بکھرتے جا رہے ہیں۔ ان اداروں کی وساطت سے جو آدمی اب بن کر نکل رہا ہے وہ پورا آدمی نہیں ہے۔ آدمی بہت سے معاملوں میں اکیلا ہوتا جا رہا ہے۔ ان حالات میں قلم اور ادب کا نیا رول پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ ادب اس کے اکیلے پن کو دور صرف نہ کر سکتا ہے بلکہ اس میں ایک ایسا اکیلا پن پیدا بھی کر سکتا ہے جو اس کا اپنا ہو اور جس میں وہ مطمئن رہ سکے۔ اگر چہ ادب اب بہت بڑی طاقت نہیں رہا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہماری آج کی انسانیت چھوٹی موٹی سچائیوں سے مل کر ہی پیدا ہو رہی ہے۔ اب کسی بڑی سچائی کی تلاش عبث ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک دن شاعری ہی سماجی تبدیلی کا اہم ذریعہ بنے گی کیوں کہ بعض جذبے جن کا اظہار ہم نثر میں نہیں کر سکتے وہ شاعری میں ہی اظہار کی راہ پاتے ہیں۔ ان کے اسی ایقان کے باعث انھوں نے ۱۹۸۸ء میں بھوپال میں ایشیا کے سارے ملکوں کے شاعروں کا ایک فیسٹول منعقد کیا تھا جس میں دنیا بھر کے ممتاز شاعروں نے شرکت کی تھی۔ اس مسئلہ پر ہم نے اشوک واجپئی سے بحث کرنے سے گریز کیا ہے کیوں کہ شاعری اور شاعروں دونوں کے بارے میں ہم اپنے نجی خیالات ان تک نہیں پہنچانا چاہتے۔

اردو ہندی کے رشتہ کے تعلق سے ان کا کہنا ہے کہ اردو اور ہندی میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ۵۰ اور ۶۰ کی دہائیوں میں ایک دور ایسا آیا تھا جب ہندی میں ادب کی زبان کو جان بوجھ کر مشکل بنایا جا رہا تھا لیکن اب یہ بات نہیں رہی۔ اردو ادب کا بیشتر سرمایہ اب دیوناگری رسم الخط میں منتقل ہو چکا ہے۔ اردو کی لفظیات سے بیشتر ہندی والے واقف ہیں اور اپنی تحریروں میں ان کا استعمال کرتے ہیں جب کہ اردو والے ادیبوں اور شاعروں نے ہندی ادب سے کسی حد تک فاصلہ برقرار رکھا ہے۔ کہنے لگے "۱۹۷۵ء میں آپ کے حیدرآباد کے عالم خوندمیری قاہرہ میں مجھے ملے تھے جب وہ غالب پر بات کرنے لگے تو انھیں حیرت ہوئی کہ میں غالب کے سارے شعروں سے واقف تھا لیکن جب میں نے اپنی چیزیں انھیں سنائیں تو کئی جگہوں پر انھیں میری آسان ہندی کو سمجھنے میں دشواری پیش آئی۔ اصل میں اردو اور ہندی میں زیادہ تال میل کی ضرورت ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ ہندی زبان کی یہ بدبختی تھی کہ اسے سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ اس پر لوگ ہندی کی زبان کے معاملہ میں ٹانگ اڑا رہا ہے۔ حکومت نے ہزاروں ہندی افسروں کا تقرر کر رکھا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس زبان کو بچانے کی ذمہ داری ان کی ہے۔ ہندی بولنے والے لاکھوں سے تعلق رکھنے والے سیاست داں بھی ہندی زبان کے معاملہ میں کچھ نہ کچھ کہنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ بنگال کے وزیر اعلیٰ جیوتی باسو یا کسی اور علاقائی زبان کی ریاست کے

۔۔۔علاقے کبھی یہ نہیں جا پاکر ان کی زبان کیسی ہونی چاہیے۔ زبان خود بخود بنتی ہے افسوس ۔۔۔ سیاست دانوں کے کہنے سے نہیں بنتی۔ اس طرح ہندی خود ایک آزمائش کی لڑائی لڑ رہی ہے ۔۔۔ آج کے عصری ہندی ادب کی لڑائی یہ ہے کہ وہ اپنے ہی معاشرہ سے لڑائی لڑ رہا ہے۔ ۔۔۔ ہندی بولنے والے علاقوں میں فرقہ واریت اور بنیاد پرستی کا زہر تیزی سے پھیل رہا ہے، ۔۔۔ ہندی ادب نے اس کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے۔ ہندی ادیب لگاتار فرقہ پرستی کے خلاف ۔۔۔ لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ نام ضرور ہیں جو "ہندوتوا" کی لہر سے متاثر نظر آتے ہیں جیسے وِدیا ۔۔۔ اس مشرا اور نرمل ورما۔ لیکن ہندی ادیبوں کی اکثریت اس خطرناک رجحان کے خلاف سینہ سپر ۔۔۔ ہوگئی ہے یہ بہت بڑی بات ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندی اور اردو دونوں ہی زبانیں اپنے اپنے رسم الخط ۔۔۔ برقرار رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کریں۔ اردو کی لڑائی اکیلے نہیں لڑی جا سکتی بلکہ سب کو مل کر اس کے لیے لڑنا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندستان کی ساری زبانوں کی لڑائی انگریزی سے ہے لیکن ہم اس بات کو بھول کر آپس میں لڑتے چلے جا رہے ہیں۔ اشوک واجپئی جب یہ کہتے ہیں تو ہمیں ہنسی سی آجاتی ہے کیونکہ موصوف نے خود انگریزی زبان و ادب میں دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج سے ایم اے کیا تھا لیکن ایک بات ہم نے ضرور محسوس کی کہ جب تک مجبوری نہ ہو وہ انگریزی نہیں بولتے۔ ہندی یا ہندستانی سے ہی کام چلاتے ہیں۔ اشوک واجپئی جیسے دل و دماغ والے ادیبوں، شاعروں اور افسروں کی موجودگی ہی ملک کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ ●

شفیقہ فرحت

قلم کا سفر

دسمبر ۹۲ء کے آخر میں وزیر اعظم نے لٹے پٹے زخم خوردہ شہر بھوپال آنے کا ارادہ کیا اور پھر ٹھٹھک گئے۔ غالباً یہ سوچ کر کہ کہیں تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا' والا معاملہ نہ ہو۔ یہ طنزیہ اسی فیصلے کا ردّ عمل ہے اور ہمارے شہیدوں کی پہلی برسی کے موقع پر آپ کی نذر۔

پردھان منتری کی خدمت میں ہمارا یہ دوسرا خط ہے۔ جواب ہمیں پہلے کا بھی نہیں ملا تھا اور اس کا بھی نہیں ملے گا۔ کہ خطوں کے جواب دینا آؤٹ ڈیٹڈ رسم ہو گئی ہے۔ اب تو صرف دور درشن والے مسکرا مسکرا کر خط پڑھتے ہیں اور ہنس ہنس کے جواب دیتے ہیں۔ (چاہے بات اس میں رونے ہی کی کیوں نہ لکھی گئی ہو۔ !) کہ ان کی تو ایک ایک ادا کی قیمت ہے۔ !

خیر۔

ہم پھر جواب کی بات کریں۔ نہیں حضورؐ جواب ہم طلب نہیں کریں گے کہ ہم اس وقت ان سے یا کسی سے کوئی سوال نہیں کر رہے۔ یہ راگ ہم پھر چھیڑیں گے اور اس راگ کو جو نام آپ چاہیں دے دیں۔ راگ درباری راگ سرکاری، راگ عوامی۔

ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ظلِّ الٰہی۔ ہمارا آپ کا بادشاہ خدا کا سایہ ہی کہلاتا تھا۔ اب بادشاہت تو گئی سات سمندر پار گوروں کے ساتھ مگر خدا اتنا بھی ظالم نہیں کہ ہمیں بالکل ہی 'بے سایہ' کر دے۔ کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی قسم کا تنبو (سوراخوں بھرا ہی سہی۔ !) تو ہمارے نصیب میں ہوگا ہی۔

اور پردھان منتری دیش کے بادشاہ سے کیا کم ہیں۔ (صدرِ جمہوریہ سے معذرت کے ساتھ۔!) سو ہم انھیں کو ظلِ الٰہی جانتے لیتے ہیں۔
تو ظلِ الٰہی ہم تو اس وقت صرف اتنا سا کرم آپ سے چاہتے ہیں کہ آپ اس خط کو پڑھ لیں۔
خیر۔ آپ تو کیا پڑھیں گے۔ ویسے ماہر آپ ہر زبان کے ہیں۔ کیا اردو، کیا انگریزی، کیا ہندی، کیا تیلگو — اور کیا دلوں، دماغوں کی آنکھوں کی —! مگر آپ کے پاس بے زبانوں کی زبان کے لیے وقت کہاں۔
آپ نہ پڑھیں۔ آپ کا اتنا لمبا چوڑا عملہ پڑھ لے۔ اگر وہ بھی آپ ہی کی طرح مصروف ہے اور اسے بھی وقت کی کمی کی شکایت ہے تو C.B.I. ہی پڑھ لے۔
کہ وہ تو اسی کام کے لیے تعینات ہے۔
لیکن شاید وہ بھی نہ پڑھے کہ ہمارے یہاں کا دستور یہی ہے کہ جو جس کام کی تنخواہ پاتا ہے، وہ وہی کام نہیں کرتا۔
C.B.I. کی مجبوری کو ہم بھی سمجھتے ہیں۔ اس کے ذمے تو بم گولوں، ملکوں اور اربوں کھربوں کے گھپلوں کی انکوائری ہے — پھر ہر روز کا ایک اغوا اور ہر دوسرے دن کا ایک اہم قتل — یہ الگ —
یہ سارے اُلجھاوے تو وہ سلجھا ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا انھیں تو Pendora's Box کی طرح سے بند ہی رہنے دینا چاہیے۔ اور "سب ٹھیک ہے" کی رپورٹ بھیج دینا چاہیے۔ لیکن کبھی کبھی کوئی چھوٹا موٹا کام بھی کر ہی لینا چاہیے۔ اپنے زندہ ہونے کے ثبوت کے طور پر — تو اسی کے نتیجے میں ہمارا یہ بے ضرر سا کھلا خط ہی پڑھ لے اور موقع ملے تو ظلِ الٰہی یا ان کے حوالی موالیوں تک ہمارا پیغام پہنچا دے۔
ہاں صاحب ہمارا خط — کھلا ... اس کا مضمون کچھ اس طرح ہوگا۔
کہ مانیہ پردھان منتری جی نے ہمارے شہر نہ آنے کا فیصلہ کیا ہے یا شاید کرنے والے ہیں۔ (اڑتی اڑتی خبر زبانی طیور کی) تو اس سلسلے میں ہماری اور ہم جیسے لاکھوں بے کس، بے بس اور مجبور لوگوں کی التجا ہے کہ وہ خدارا اپنے اس فیصلے پر قایم رہیں اور کسی ہائی کمان لو کمان کے بہکاوے میں نہ آئیں۔
چند لمحے ہم فضول اور غیر اہم شہریوں کے درمیان گزار کر آپ کیا کرلیں گے۔ نہ ہمارا بھلا نہ آپ کا۔
نہ کسی زخم کا مرہم حضور کے پاس ہے نہ کسی درد کی دوا۔

اور درد کی دوا ابن مریم کے پاس تک تو تھی نہیں۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
مرے درد کی دوا کرے کوئی

(غالب)

دیگر احوال یہ ہے کہ اب تو زخم بھی مندمل ہو گئے کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ خدا اور مانیہ پر دھان منتری سے بھی۔

آپ کی آمد کہیں نئے زخموں کو اپنے ساتھ نہ لے آئے کہ حضور کے جلو میں تو ایک جلوس ہوتا ہے۔

کون کون اور کیا کیا اس جلوس میں کہاں کہاں سے شامل ہو جائے۔ اس کی کسے خبر۔

یوں آپ آئیں۔ — دیدہ و دل فرش راہ
بلکہ ہم تو آپ کے ایسے عاشق ہیں کہ

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

خط ہمارا یہیں ختم نہیں ہوتا۔ یہ تو پہلی قسط ہے — ہم تو آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ہی شہر نہیں بلکہ آپ تو کہیں بھی جانے کی زحمت نہ کریں۔ جسے غرض ہوگی آپ کے درِ دولت پہ حاضری دے گا۔

خیر کامیابی یا باریابی تو اسے وہاں بھی حاصل نہیں ہوگی اور وہ بقول غالب "خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک" کی تصویر تفسیر بن کے رہ جائے گا۔ پھر بھی سوال یہی ہے کہ آپ کیوں جائیں۔ پیاسا کنوئیں کے پاس جاتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس نہیں۔

اب یہ کون جانتا ہے کہ کنواں کتنا بھرا ہے اور کتنا خشک۔ بہرحال کنواں تو ہے۔ جس میں ہم اپنے تمام دکھ ڈال سکتے ہیں، اور حضور آپ اور آپ کی پوری کابینہ سیکڑوں ہزاروں اسکیموں کے ڈول ڈالتے جائیے اور ہمارے دکھ نکال نکال کے ان کی پردرشنی لگائیے۔ کسی پرگتی میدان میں۔ کہ حل ان کا ممکن نہیں۔ کم از کم اس صدی اور اس جنم میں تو نہیں۔ گو صدی بھی مختصر ہے اور جنم بھی۔

طنز و مزاح

پرویز ید اللہ مہدی
بی۔۲۶۔ چوتھا منزلہ
بہرام۔ باندرہ (ایسٹ) بمبئی ۵۱

بمبئی میں بھوپال

ملاوٹ کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی نے بمبئی میں، انسان اور اشیاء کو تو ملوّث کیا ہی، آب و ہوا کو بھی نہیں بخشا، اسے بھی آلودہ کر کے اس کا "فالودہ" بنا کے چھوڑا۔ اس وقت ہمیں برسوں پرانی ایک بات یاد آرہی ہے۔ تب تک بمبئی ہمارے لیے اور ہم بمبئی کے لیے دور کا ڈھول تھے۔ لہٰذا وطن مالوف حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں چین کی جنسی اور سکون کا اکتارا بجایا کرتے تھے اور جب ہر دو ساز بجاتے بجاتے بور ہو جاتے تو ادبی و شعری محفلوں میں بحیثیت سامع شریک ہوا کرتے، بڑھ چڑھ کر داد دیتے مصرع اٹھاتے کہ اس زمانے میں مصرع اٹھانا سامعین کے فرائض میں شامل ہوا کرتا تھا بلکہ اگر شاعر پسند نہ آتے تو دیگر شرکائے محفل کے تعاون سے، اسے بھی مشاعرے سے اٹھا دینے کی چھوٹ حاصل ہوا کرتی تھی۔ بہر حال ان دنوں اردو ادب میں جدیدیت کی لہر نئی نئی ابھری تھی، یعنی سوسنح کو چونچ میں لیے ہوئے مرغ نے ادب میں نیا نیا داخلہ لیا تھا اور داخلہ لیتے ہی ان جدید مرغوں نے اگلے وقتوں کی روایتی شاعری کے مرغ قبلہ نما" کے ٹھونگیں مارنی شروع کر دی تھیں۔ اتفاق سے ہم جس مخصوص ادبی محفل کی روداد آپ کو سنانے جا رہے ہیں اس میں ایک جدید شاعر نے اپنی ایک انتہائی جدید نظم سنائی، جس کا عنوان تھا۔ "ہوا حاملہ ہو گئی" عنوان سن کر دیگر سامعین کرام کے ساتھ ہم پر بھی سکتہ طاری ہو گیا کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق صرف جاندار دل ہی میں حاملہ ہونے کی سکت اور صلاحیت پائی جاتی ہے، لیکن شاعر موصوف نے بہ یک جنبش قلم ہوا کو حاملہ کر دیا تھا۔ جدید شاعروں سے چونکہ کچھ بھی بعید نہیں اس لیے محفل پر چھایا ہوا سکتہ چند ہی لمحوں میں خود بخود رفع ہو گیا اور اس کی جگہ ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا۔ اور قہقہوں کے ساتھ شاعر جدّت طراز پر چاروں طرف سے طنز کی بوچھار شروع ہو گئی۔ ایک جہاندیدہ قسم کے بزرگ راست شاعر کی ذاتیات پر حملہ آور ہوئے "میاں صاحبزادے، صورت شکل سے تو تم ماشاء اللہ عاقل و بالغ دکھائی دیتے ہو۔ لیکن باتیں، لاحول ولا قوۃ نابالغوں کی سی کر رہے ہو۔ ارے میاں ہوا ابھی کیا باشو خاں کی بھینس، الّو میاں کی بکری یا منّی بائی کی کتیا ہے جو ادھر ادھر جھنک جھنکا کر منہ کالا کروا کے حاملہ ہو کے چلی آئی۔

قصہ مختصر یہ کہ طرح طرح کے طعنوں سے بے چارے شاعر کی شاعری و شخصیت معاذاللہ چھلنی چھلنی کر کے محفل سے "ہوٹ آؤٹ" کر دیا گیا۔ لیکن افسوس آج برسوں بعد اہلِ نفل کے اس رویے پر ہمیں شرمندگی اور ندامت کا احساس ہو رہا ہے۔ کیوں کہ بمبئی کی ملاوٹی ہوا میں سانس لینے کے بعد ہم پر یہ عقدہ پوری طرح کھل چکا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے طفیل ہوا بھی شرطیہ حاملہ ہو سکتی ہے۔ گویا شاعر جدت پسند نے از راہ تفنن اپنے زورِ قلم سے ہوا کو حاملہ کرنے کی کوشش ہرگز نہیں کی تھی، حاملہ ہوا سے دراصل ان کی مراد تھی آلودہ ہوا۔ ملاوٹی ہوا۔ یعنی شاعر دور اندیش نے بڑے ہی علامتی انداز میں ابہام کے سہارے فضائی آلودگی کی طرف ایک لطیف اشارہ کیا تھا، ایک بھرپور طنز کیا تھا۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے، فضائی آلودگی نے صرف آب و ہوا اور فضا ہی کو مسموم نہیں کیا، بلکہ کتنے ہی قدیم مثلوں کو قلم زد اور کلیات کو رد کر دیا ہے۔ یہاں ہم صرف ایک ہی مثال پیش کرتے ہیں۔ آپ نے اگلے وقتوں کے مشہور شاعر پنڈت برج نرائن چکبست دہلوی کا یہ شعر ضرور پڑھا یا سنا ہوگا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

ماضی بعید میں زندگی اور موت کا یہ سائنٹفک تجزیہ یقیناً درست ہوا کرتا تھا کیونکہ تب ماحول ہر قسم کی فضائی آلودگی سے یکسر پاک صاف [illegible] تھا اس لیے وقت آنے پر ہی زندگی کے بنیادی عناصر کے ظہورِ ترتیب [illegible] عمل بھل کا عمل کارفرما ہوتا اور موت کا ہاتھ ان اجزا کو پریشان کر کے آدمی کو چین کی نیند سلا دیا کرتا لیکن دورِ حاضر کی فضائی آلودگی نے شعر مذکور کو یوں غلط ثابت [illegible] فضائی آلودگی زندگی کے بنیادی عناصر [illegible] ظہورِ ترتیب کو وقت سے [illegible] بے ترتیب کر کے آدمی کے اعضائے رئیسہ و غریبہ کو اس قدر پریشان کر [illegible] کہ وہ [illegible] سے پہلے ہی دم توڑ دیتا ہے گویا پہلے جو کام حضرت ملک الموت بلا شرکت غیرے تن تنہا انجام دیا کرتے تھے اس میں فضائی آلودگی غیر محسوس طور پر ساجھے دار ہو گئی ہے بلکہ بمبئی میں تو صورت حال یہ ہے کہ فرشتۂ اجل جب بھی کسی کو لقمۂ اجل کرنے کی نیت سے تشریف لاتے ہیں فضائی آلودگی کی مہربانی سے اُسے پہلے ہی زندہ بدست مردہ، کی حالت میں پاتے ہیں اور مرے ہوئے کو دوبارہ مارتے ہوئے یقیناً نھیں بھی افسوس ہوتا ہوگا۔ چنانچہ پہلے تو وہ قریب المرگ شخص کی حالت زار پر زار و قطار روتے ہوں گے پھر بڑے پیار سے متوفی کی روح کی اُنگلی تھامے ہوئے اس جہانِ غیر فانی کی طرف نکل جاتے ہوں گے جو ہر قسم کی دنیاوی کثافتوں، آلائش [illegible]

صاحبو! ہم نہ تو کوئی پیتھالوجیکل لیبارٹری ، ہیں بول و براز ، کے معائنے پر معمور ہیں اور نہ کوئی کسی خاتون کا قارورہ ، دیکھ کر یہ بتا سکتے ہیں کہ حامل ہذا ، حاملہ ہے یا غیر حاملہ ۔ اس کے باوجود ہماری بات کا یقین کیجیے کہ بمبئی میں صنف نازک و دیگر ماداؤں کے علاوہ ہوا بھی حاملہ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے البتہ ہوا کے ساتھ بالجبر سلوک کرنے والے عناصر کی فہرست خاصی طویل ہے اس میں ملوں ، کارخانوں ، فیکٹریوں سے خارج ہونے والے کیمیاوی اجزا دھویں ، دھول ، پٹرول اور مختلف قسم کی زہریلی گیسوں اور مادّوں کو سرفہرست سمجھیے ۔ ہوا کے ساتھ منہ کالا کرنے والے مذکورہ عناصر نے مہانگروں کو جب سے فضائی آلودگی کا بھینکر روگ لگایا ہے ۔ قسم قسم کے امراض کیساتھ طرح طرح کے لطیفہ نما واقعات بھی رونما ہونے لگے ہیں ابھی کچھ روز پہلے کی بات ہے ہمارے پڑوس میں ایک عجیب و غریب تماشا ہوا ۔ ایک شام کا ذکر ہے ہمارے قریب ترین پڑوسی طاہر بھائی ڈبہ باٹلی والا ، بازو پر امام ضامن باندھے اس طرح باچشم نم اپنے اہل خانہ سے فرداً فرداً گلے مل رہے تھے جیسے محاذِ جنگ پر بغیر کسی ہتھیار کے محض امام ضامن کے بل پر جا رہے ہوں ۔ یہ دل خراش وداعی منظر دیکھ کر ہم پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ، اس سے پہلے کہ ہم منہ سے کچھ پھوٹتے طاہر بھائی پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے ہم سے بغل گیر ہو گئے اور رقت آمیز لہجے میں بولے ۔ "ہم بھی سالا آدمی ہے ۔ کبھی تم کو کچھ الٹا سلٹا بول دیا ہوں گا کوئی بھول چوک ، کوئی مسٹیک اپن سے ہو گئی ہوگی ۔ معاف کر دینے کا ۔ کیا ۔ ؟ کائے کو بولے تو وہ تمہارا اردو بھاشا کا ساعر بھائی بولا ہے نا ۔

کیا بھروسہ ہے جیندگانی کا
آدمی بلبل کے مافک ہے پانی کا

کیا " !

کوئی اور موقع ہوتا تو ہم یقیناً مذکورہ شعر میں پھڑپھڑاتی ہوئی پانی کی بلبل پر مفصل تبصرہ کر کے موصوف کی غلط فہمی دور کرتے یہ سمجھاتے ہوئے کہ طاہر بھائی اس شعر میں شاعر نے بلبل کا نہیں 'بلبلے' کا ذکر کیا ہے اور بلبلہ ، بلبل کا مذکر نہیں صرف بلبلہ ہوتا ہے ۔ لیکن وقت کی نزاکت اس تشریح کی متقاضی نہیں تھی لہذا راست مطلب کی بات پر آ گئے ۔ یعنی ان سے استفسار کیا ۔ کیا بات ہے طاہر بھائی ؟ اس طرح زرہ بکتر پہن کر خدانخواستہ کہیں لام پر تو نہیں جا رہے ہیں ۔ ؟ " ٹھنڈی سانس بھر کر بولے ۔ "اس سے جاستی ڈینجر جگہ جا رہا ہے اپن ۔ کائے کو بولے تو لام پہ پھر بھی آدمی کے بچنے کا تھوڑا بہت چانس ہوتا ، جدھر اپن جا رہا ہے ادھر سارا آدمی لوگ کا نیٹا دھار نکی سمجھو ۔ کیا ۔ !

ہم نے حیرت سے کہا " گویا آپ جان بوجھ کر موت کے منہ میں جا رہے ہیں " ۔ موصوف نے اثبات میں سر ہلایا ، ہم نے بے بسی سے کہا ۔ خیر جیسی آپ کی مرضی ویسے جاتے جاتے اتنا تو بتاتے جائیے کہ موت کی جس وادی کی طرف آپ

درج کر رہے ہیں اس کا نام کیا ہے ۔ ؟

ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے بولے ۔ چھوٹا بھوپال ۔!!

ہم نے گڑبڑا کر کہا ۔ چھوٹے بھوپال۔ یعنی کہ یہ تو میرے لیے ایک نیا انکشاف ہے ۔ طاہر بھائی جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے تا حال میں نے چھوٹے ناگپور بلکہ چھوٹا سونا پور کا نام تو سنا ہے لیکن چھوٹا بھوپال اب سے پہلے نہ جغرافیہ کے کسی نقشے میں دیکھنے کا اتفاق ہوا نہ کسی کی زبان سے سننے کا۔ یہ چھوٹا بھوپال آخر کہاں کس صوبے کس پرانت میں واقع ہے ؟ تحقیر آمیز لہجے میں بولے ۔ تم لینے کو لیکک بولتا اتی ہمبئی کے اوپر رہ ہفتہ اخبار میں الٹا سلٹا لکھتا اور تم کو سالا چھوٹا بھوپال کدھر ہے یہ بھی نہیں معلوم ، ارے بھائی یہ سالا چھوٹا بھوپال کدھر دور نئیں ، اپن کی ہمبئی میں ہی بسا ہے ۔ کیا ۔!!"

ہم نے غیر یقینی لہجے میں کہا ۔" بمبئی میں بھوپال ۔ یہ آپ کیا بے پر کی ہانک رہے ہیں ۔ بمبئی میں بھوپال کی نمائندگی کرنے والے بے شمار بھوپالی حضرات تو مل جائیں گے جیسے اسد بھوپالی ، شکیلہ بانو بھوپالی ، سورمہ بھوپالی وغیرہ وغیرہ لیکن بمبئی میں سالم بھوپال کا ملنا ناممکن ۔!!

طاہر بھائی منہ بنا کر بولے ۔" ہماری بات کا بسواس کرو بھائی ، ہم کوئی بے فضول بات نہیں بولتا ۔ کیا ۔ ابھی اصل بات تم کو بتاتا ہے ۔ جب سے سالا بڑے بھوپال میں گیس کا ٹریجڈی ہوا ہے ، بمبئی کا چالس ٹکا آدمی لوگ چمبور کے ایریا کو چھوٹا بھوپال کر کے بولنے لگا ہے ، کائے کو بولے تو ادھر بھی سالا بڑا بڑا ڈینجر فیکٹری گیاس کا تیل کا ریفائنری الف شکتی بھنڈارا اتی جگہ کے اوپر پھیلا ہوا ہے ۔ جس میں سے سالا ڈریٹیم گیس نکلتا رہتا ، چوبیس کلاک اتنے ایریا میں گیاس کا باس ، مارتا رہتا ۔ کیا ۔!! چھوٹے بھوپال کی جغرافیائی نشاندہی اور اس کی وجہ تسمیہ کی مکمل تفصیل سننے کے بعد ہم نے متحیر لہجے میں کہا ۔ تعجب ہے ! اتنا سب کچھ اس ایریا کے بارے میں جاننے کے باوجود آپ اس زہریلے علاقے کا قصد کر رہے ہیں ! آخر وہ کون سی مجبوری ہے جو آپ کو خودکشی کے راستے پر کشاں کشاں لیے جا رہی ہے "۔!!

آہ بھر کر بولے ۔" سالا اس مجبوری کا نام ہے ، ساری خدائی ایک طرف ، جورو کا بھائی ایک طرف ۔ کیا ۔ اپن کا سالا چھوٹا بھوپال مطلب چمبور میں رہتا ہے ، اور سالا جدھر بھی ہوئے ، جنت میں کہ جہنم میں ، اس سے ملنے کے واسطے جانا ہی پڑتا نئیں تو سالی گھر والی گھر کو جہنم بنا دیتی ، اور اپن سالا مجبوری میں ایک جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم میں جاتا ۔ کیا ۔" اتنا کہہ کر طاہر بھائی ڈبہ باٹلی والا باحسرت و یاس رخصت ہو گئے لیکن جاتے جاتے ہماری آنکھیں البتہ کھول گئے اور جب اپنی کھلی آنکھوں سے بمبئی کے مختلف صنعتی مقامات کا جائزہ لیا تو عقدہ کھلا کہ ایک چمبور ہی پر کیا موقوف بھوپال کے زہریلی گیس کے اخراج والے سانحہ کے بعد سے بمبئی میں بے شمار چھوٹے

چھوٹے بھوپال ظہور میں آگئے ہیں، اور زہر کے یہ سوداگر سائنس اور ٹکنالوجی کے نام پر ترقی کی آڑ میں پتا نہیں کب تک یوں انسانی زندگیوں کے ساتھ کھلواڑ کرتے رہیں گے۔ اپنے لیے سونے چاندی کا محل بناتے اور غریب عوام کے لیے چھوٹے چھوٹے بھوپال بساتے اور اجاڑتے رہیں گے۔

محمد رفیع انصاری
۱۵۰ درگاہ روڈ۔ بھیونڈی۔

پاکستان ــــ اردو شعرا کی نظر میں

ہندستان اور پاکستان کے آپسی تعلقات گاہے گاہے نازک موڑ پر آجاتے ہیں۔ اور جب جب ایسا ہوتا ہے دونوں ملکوں کے بہی خواہ شدید صدمے سے دوچار ہوتے ہیں۔ برصغیر کی تقسیم بلاشبہہ ایک المیہ ثابت ہوئی اور اس المناک واقعے کے بعد سے یہ دونوں ملک ہندستان اور پاکستان ایک دوسرے کے دوست نہیں رہے۔ کھیل کا میدان ہو یا میدانِ جنگ یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا جذبہ رکھتے ہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ دونوں جانب ایسے لوگ بھی ہمیشہ سے موجود رہے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ دونوں ملکوں کے عوام کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ ایک دوسرے کو شک و شبہہ کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ اپنے مسائل غیر ملکی امداد کی بجائے باہمی تعاون سے حل کرنے کی کوشش کریں اور اپنی قلیل آمدنی کا بیشتر حصہ عسکری قوت بڑھانے اور غیر ممالک سے مہلک ہتھیار خریدنے کی بجائے ملک کی ترقی کے کاموں پر خرچ کریں۔

ہندستانی شعرا میں باہمی دوستی اور مفاہمت کا یہ جذبہ شدید تر ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک وہ اسی جذبے کا اظہار اپنے شعروں کے ذریعے کرتے رہے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کی نظم "احباب پاکستان کے نام" اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جس میں شاعر نے پاکستانی دوستوں کو بڑی محبت اور خلوص سے مخاطب کیا ہے۔

اک نیا ماحول اک تازہ سماں پیدا کریں
دوستو، آؤ محبت کی زباں پیدا کریں

تا ابد کے بے کلی احساس پر طاری رہے
ایک ماحولِ وفائے دوستاں پیدا کریں

دوستو جس میں رہیں [illegible] کو بھی [illegible]
پھر وہی سرمایۂ دردِ نہاں پیدا کریں

جو کبھی بارود کی اس کے قریب آنے نہ پائے
ایک ایسا عالم امن و اماں پیدا کریں

کل لکھی تھی ہم نے اوروں کے لہو سے داستاں
اپنے خونِ دل سے اب اک داستاں پیدا کریں
کہہ رہا ہے ہم سے یہ مستقبل برصغیر
ہند و پاک اِک اتحادِ جسم و جاں پیدا کریں

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تقسیم برصغیر کے وقت سے کچھ ایسے کانٹے بو دیے گئے ہیں جو اچھے تعلقات کے نوخیز پودوں کو جھلسا کر رکھ دیتے ہیں۔ پھر روشنی اندھیرے میں بدلنے لگتی ہے اور پھر دونوں طرف کے ظلمت پسند اس تاریکی کو اور گہرا کر دیتے ہیں۔ ہمارے شاعروں نے اس سچائی کے اعتراف میں بھی پس و پیش نہیں کیا کہ صرف جغرافیائی لحاظ سے نہیں بلکہ تاریخی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے ہمارے رشتے ہزاروں سال پرانے ہیں۔ اور نقشے پہ صرف ایک لکیر کھینچ دینے سے ہزاروں برس کے تاریخی عوامل پر خطِ تنسیخ نہیں کھینچی جا سکتی۔ لہٰذا ہمارا بھلا اسی میں ہے کہ ہم مل جل کر اچھے پڑوسیوں کی طرح رہیں اور اپنے معاشی وسائل کو غریبی، بے کاری اور جہالت کو دور کرنے میں لگا دیں۔ سردار جعفری نے یہی بات اپنی نظم "کون دشمن ہے" میں بڑے دردانگیز لہجے میں کہی ہے۔

ہمارے پاس ہے کیا دردِ مشترک کے سوا
مزہ تو جب تھا کہ مل کر علاجِ جاں کرتے
خود اپنے ہاتھ سے تعمیرِ گلستاں کرتے
ہمارے درد میں تم اور تمھارے درد میں ہم
شریک ہوتے تو پھر جشنِ آشیاں کرتے
ہمارے بیچ میں حائل ہیں آگ کے دریا
تمھارے اور ہمارے لہو کے ساگر ہیں
بہت بلند سیہ نفرتوں کی دیواریں
ہم ان کو ایک نظر میں گرا بھی سکتے ہیں
تمام ظلم کی باتیں بھلا بھی سکتے ہیں
تمھیں پھر اپنے گلے سے لگا بھی سکتے ہیں
مگر یہ شرط ہے تیغوں کو توڑنا ہوگا۔
لہو بھرا ہوا دامن نچوڑنا ہوگا
پھر اس کے بعد نہ تم غیر ہو نہ غیر ہیں ہم
تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبحِ بنارس کی روشنی لے کر

اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے!

ہند و پاک کے درمیان تین خوفناک جنگیں ہو چکی ہیں۔ پہلی جنگ ۱۹۴۷ء اور دوسری ۱۹۶۵ء میں اور تیسری ۱۹۷۱ء میں۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے چند ہی مہینے بعد قبائلی حملہ آور کشمیر میں داخل کر دیے گئے۔ اور اس کی پاداش میں دونوں ملکوں کے بیچ پہلی جنگ ہوئی۔ بہرحال اقوام متحدہ کی مداخلت پر جنگ بندی عمل میں آئی۔ صلح ہوئی اور دونوں طرف کے صلح جوؤں اور امن پسندوں نے راحت کا سانس لیا۔ اس موقع پر تلوک چند محروم نے ایک نظم "پیام صلح" کہی جس میں انھوں نے ہند و پاک کے حکمرانوں، مدبروں، صحافیوں اور عوام الناس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ؎

کام لیں اب ذرا تحمل سے — دونوں ملکوں کے صاحب تدبیر
دل سے تخریب کا خیال ہو دور — اور ہو جائیں مائل تعمیر
اہلِ اخبار ہوں وفا آموز — قاطع دوستی نہ ہو تحریر
عامۃ الناس ہوں ادھر نہ ادھر — کسی عنوان اشتعال پذیر
پیشوایانِ ملک و ملت کی — ہو مودّت فروز ہر تقریر
ہے تقاضا یہی شرافت کا — دونوں ملکوں کی اس میں ہے توقیر

رہیں آباد ہند و پاکستان
تیری رحمت سے اے خدائے قدیر

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد جب ایک نسل جوان ہو گئی تو دونوں ملکوں کے مابین ایک اور معرکہ ہوا۔ یہ رَن کچھ کا معرکہ تھا جو ۱۹۶۵ء میں ہوا۔ برطانوی وزیر اعظم کی مداخلت پر دونوں ممالک معاہدے پر دستخط کے لیے آمادہ ہوئے لیکن ابھی اس معاہدے کی روشنائی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کشمیر میں ایک بار پھر جنگ چھڑ گئی۔ سترہ سال بعد ہونے والی ہند و پاک کے درمیان یہ دوسری بڑی جنگ تھی جو سترہ دنوں تک لڑی گئی اور جس کا خاتمہ "معاہدۂ تاشقند" کی صورت میں ہوا۔ ہند و پاک جنگ کی طرح اس معاہدے کو بھی بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اردو کے کئی ممتاز شعرا نے تاشقند کے معاہدے پر نظمیں لکھیں اور دونوں ملکوں میں امن و امان قائم رہنے کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ ایسی ہی ایک نظم "روحِ تاشقند" ہے۔ رفعت سروش کی اس نظم کے چار مصرعے ملاحظہ ہوں۔

ہند و پاکستان کارواں ایک ہے — کارواں دو اور منزل ایک ہے

تقسیم ملک کی فتنہ انگیز اور ہندوپاک جنگوں کی ستم انگیزی دیکھیے کہ نہ صرف دوست سے دوست جدا ہوئے، بھائی سے بھائی بچھڑے بلکہ ماں بیٹے سے اور بیٹا ماں سے ایسے الگ کر دیے گئے کہ پھر چاہتے ہوئے بھی دونوں کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ندا فاضلی کی نظم "پاسپورٹ آفیسر" ایسے ہی ایک بچھڑے ہوئے ماں بیٹے کی دردبھری کہانی ہے۔ ندا فاضلی اپنے ناول "دیواروں کے بیچ" میں اس نظم کے متعلق رقم طراز ہیں "یہ نظم ماں کی بیماری کے دوران پاسپورٹ نہ ملنے پر کہی گئی۔ ماں کی بیماری اور ہندوپاک جنگ کا وقت ایک ہونے کی وجہ سے ماں بیٹے کا رشتہ حکومت کی نظر میں مشتبہ ٹھہرا۔"

کراچی ایک ماں ہے
بمبئی بچھڑا ہوا بیٹا

یہ رشتہ
پیار کا پاکیزہ رشتہ ہے
جسے اب تک
نہ کوئی توڑ پایا ہے
نہ کوئی توڑ پائے گا
غلط ہے ریڈیو
جھوٹی ہیں سب اخبار کی خبریں
نہ میری ماں
کبھی تلوار اٹھائے رن میں آئی ہے
نہ میں نے
اپنی ماں کے سامنے بندوق اٹھائی ہے
یہ کیسا شور و ہنگامہ ہے
یہ کس کی لڑائی ہے۔

۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے عوام نے جمہور کی سلطانی کا مطالبہ کیا تو ہم نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا۔ ہمارے ملک میں ایک کروڑ افراد کو پناہ دی گئی جو فوجی حکمرانوں کے ذریعہ بدترین قسم کے مظالم کا شکار ہوئے تھے پناہ گزینوں کا بہت بڑا بوجھ ہمیں برداشت کرنا پڑا۔ ہماری ہمدردیاں بنگلہ دیش کے عوام کی جائز جدوجہد کے ساتھ تھیں لیکن افسوس پاک کے فوجی حکمرانوں نے فوجی کاروائی کو ہی اس مسئلہ کا حل جانا۔ چنانچہ ایک اور جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک 'بنگلہ دیش' وجود میں آیا۔ یہ ایک بہت

ٔا تاریخی واقعہ ہے۔ جس پر اردو میں کئی نظمیں کہی گئیں۔ ان نظموں میں کہیں الراست اور کہیں براہِ راست پاکستانی حکمرانوں اور جنگ پسندوں کو خطاب کیا یا۔ ان بے شمار نظموں میں کیفی اعظمی کی نظم 'فرد' کو بڑی شہرت ملی۔

یہ پڑوسی جو محبت کا چلن بھول گئے
ان میں بھائی بھی ہیں، بیٹے بھی ہیں احباب بھی ہیں
جانتے ہیں کہ سبھی کچھ نہیں ہتھیار مگر
ہم سے لڑ مرنے کو تیار بھی بےتاب بھی ہیں
ہم نے چاہا تھا رہیں ساتھ دل وجاں کی طرح
وہ مگر اس کو سیاست ہی سیاست سمجھے
ہم نے چاہا تھا کہ الگ ہو کے بھی نزدیک رہیں
وہ مگر اس کو کوئی تازہ شرارت سمجھے
ہم نے چاہا تھا لڑائی نہ چھڑے جنگ نہ ہو
وہ سمجھ بیٹھے کہ کمزور ہیں لاچار ہیں ہم
ہم نے چاہا تھا محبت سے چکالیں جھگڑے
وہ سمجھ بیٹھے کہ مفلوج ہیں بےکار ہیں ہم
ہم اہنسا کے پجاری سہی دیوانے سہی
جنگ ہوتی ہے فقط جنگ کے اعلان کے بعد
ہاتھ بھی ان سے ملے دل بھی ملے نظریں بھی
اب یہ ارمان ہے سب فتح کے ارمان کے بعد
ساتھیو، دوستو،
ہم آج کے ارجن ہی تو ہیں.

ہندو پاکستان کے درمیان کھینچی گئی غیر قدرتی لکیر کو منافرت اور کدورت سے مستحکم کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر تین جنگوں کا نتیجہ کیا نکلا ہے؟ تباہی اور بربادی۔ ہندو پاکستان کی سرحدیں وہی ہیں۔ ایک انچ زمین بھی کسی کے قبضے میں نہیں آسکی ہے۔ لیکن ہزاروں ماؤں کی گود سونی اور مانگ کے سیندور مٹ گئے ہیں۔ کیا ہندو پاکستان میں کبھی دوستی نہیں ہو سکتی؟ کیا مسائل کو پُرامن طریقے سے حل نہیں کیا جاسکتا؟ اسی امید وبیم کی کیفیت سے دوچار اہلِ قلم اور اہلِ دانش 'صبحِ فردا' کے منتظر کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ بقول سردار جعفری ؎

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے

اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد خون کی اشکوں کی آہوں کی شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اگائی تھیں
یہاں محبوب آنکھوں کے ستارے تلملائے تھے
یہاں معشوق چہرے آنسوؤں میں جھلملائے تھے
یہاں بیٹوں سے ماں، پیاری بہن بھائی سے بچھڑی تھی
یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میدان میں نکلتی ہے
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا

۱۹۷۱ء کی جنگ کاش آخری جنگ ثابت ہو۔ کاش ہندو پاکستان کے سارے مسائل شملہ سمجھوتے کی روشنی میں حل ہو جائیں۔ یہی ہمارا مطمح نظر ہے اور یہی ہمارے شعراء کی تمنا بھی۔ شملہ کانفرنس کے موقع پر۔ یوسف ناظم کی نظم روشنی کے یہ اشعار پرچمِ امن کے جگمگاتے ہوئے ستارے ہیں ؎

زیست صحراؤں میں ہر سمت پکار آئی ہے
ظلمتِ شب میں کوئی اس کا بھی ہمدم آئے
آگ کے شعلے تو دنیا میں بہت پہنچے ہیں
اب تمنا ہے کوئی تحفۂ شبنم آئے
ذہن کے طاق میں خوشیوں کے دیے جل اٹھے
امن کا جب بھی کہیں ذکر ہوا بات چلی

۱۹۹۲ء میں مکتبہ جامعہ کی
ی مطبوعات اور نئے اڈیشن

ی مطبوعات

سرا خودی (فراموش شدہ اڈیشن) شائستہ خاں ۷۵/-
لام ربانی تاباں کتاب نما کا خصوصی شمارہ اجمل اجملی ۷۵/-
ابد علی خاں (کتاب نما کا خصوصی شمارہ) مجتبیٰ حسین ۴۵/-
راجہ احمد فاروقی۔ مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم ۴۵/-
لی سردار جعفری مرتبہ: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ۴۵/-
ختر سعید خاں مرتبہ: ڈاکٹر سید حامد حسین ۵۷/-
ثار احمد فاروقی مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم ۵۱/-
زمائش کی گھڑی (مضامین) سید حامد ۵۴/-
مارا گفتگو کیا ہے (تنقید) شمس الرحمٰن فاروقی ۷۵/-
ں سمندر ہوں (شعری مجموعہ) فرحان سالم ۳۰/-
ینی جھینی بینی چدریا (ناول) عبدل بسم اللہ ۷۵/-
حرا نورد کے خطوط (طویل افسانے) مرزا ادیب ۷۵/-
ستک اس دروازے پر (علمی) ڈاکٹر وزیر آغا ۶۵/-
پنے دل کی حفاظت کیجیے۔ ڈاکٹر لیفٹیننٹ کرنل کے ایل چوپڑا ۲۵/-
سرسید یادگاری خطبات (پروفیسر مونس رضا، پروفیسر مسعود حسین
مرتبہ: خواجہ محمد شاہد ۱۰/-
چہرہ در چہرہ (خاکے) مجتبیٰ حسین ۵۱/-
تفہیم (تحقیق) رشید حسن خاں ۷۵/-
تعلیم و تعلم (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۷۵/-
اردو شاعری کی گیارہ آوازیں۔ پروفیسر عبد القوی دسنوی ۷۵/-
تاریخ الامت ششم (تاریخ اسلام) مولانا اسلم جیراجپوری ۲۷/-
" ہفتم " " ۱۸/-
کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے سید نقی حسین جعفری ۵۱/-

EXPERIMENTS IN ENGINEERING CHEMISTRY
(for undergraduate engineering students)

Dr. Masood Alam 51/-

شناس و شناخت۔ انور صدیقی ۶۰/-

نئے اڈیشن

آزمائش (ڈراما) پروفیسر محمد مجیب ۶/-
تاریخ الامت دوم مولانا اسلم جیراجپوری ۲۱/-
ورک بک آسان اردو شکیل اختر فاروقی ۲۷/-
مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ رشید حسن خاں ۲۷/-
انتخاب قلی قطب شاہ ۲۶/-
دانہ و دام راجندر سنگھ بیدی ۲۷/-
دروازے کھول دو کرشن چندر ۶/۵۰
بانگ درا اقبال ۹/-
بال جبریل " ۷/-
شعور ادب (کالج کے طلبہ کے لیے) ادارہ ۲۱/-
واردات پریم چند ۲۱/-
ایک چادر میلی سی راجندر سنگھ بیدی ۱۸/-
انتخاب اکبر مرتبہ: صدیق الرحمٰن قدوائی ۱۲/-
انتخاب ناسخ مرتبہ: رشید حسن خاں ۵۱/-
انتخاب ولی مرتبہ: ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ۲۰/-
انتخاب سودا مرتبہ: رشید حسن خاں ۷۵/-
نیرنگ خیال مرتبہ: مالک رام ۱۵/-
قصہ حاتم طائی مرتبہ: اطہر پرویز ۷۵/-
مجالس النسا مرتبہ: صالحہ عابد حسین ۲۴/-
اردو کیسے لکھیں رشید حسن خاں ۱۲/-
ہمارا دین اول سید شہاب الدین دسنوی ۸/۵۰
" دوم " ۸/۵۰
تاریخ الامت اول مولانا اسلم جیراجپوری ۱۸/-

مکتبہ پیام تعلیم کی نئی کتابیں

بہ پہاڑی ہم ثریا فرغ ۴/۵۰
رسالہ دینیات اول ۳/-
" دوم ۴/-
" سوم ۵/-
" چہارم ۵/-
" پنجم ۶/-

ب نما

کتاب	مصنف	قیمت
ول پاک کے اخلاق	خلیل احمد حامدی	۲/:
فر کے قہقہے	آصف فرخی	۵/:
زوں کی کہانیاں	〃	۴/۵۰
ادی اماں کی کہانیاں	〃	۴/:
ضرت آدم علیہ السلام	منورہ نوری خلق	۲/:
ضرت یحییٰ علیہ السلام	〃	۳/:
م بنے کمانڈو	منیر احمد راشد	۵/:
خواجہ غلام السیدین	ذکیہ ظہیر	۵/:
میر امن دلی والے	اسلم فرخی	۲/۵۰
میرزا ادیب	طاہر مسعود	۲/۵۰
تین بندوقچی	مسعود احمد برکاتی	۱۰/:
نقوش سیرت اوّل	حکیم محمد سعید	۵/:
〃 دوم	〃	۵/:
〃 سوم	〃	۵/:
〃 چہارم	〃	۵/:
〃 پنجم	〃	۵/:
انشا اور تلفظ	رشید حسن خاں	۹/:
پھلجھڑیاں	سطوت رسول	
چارلی چیپلن	ریحان احمد عباسی	

مکتبہ پیام تعلیم کے نئے اڈیشن

کتاب	مصنف	قیمت
پیامی قواعد اردو (کلاں)	ادارہ	۶/:
〃 (خورد)	〃	۳/:
پراسرار غار	ادارہ	۶/:
بھوتوں کا جہاز	شمیم حنفی	۴/۵۰
جنگو کی بلی	عبدالواحد سندھی	۳/:
آؤ ڈراما کریں	پروفیسر محمد مجیب	۴/:
بچوں سے ذکر مصطفیٰ	عبداللہ ولی بخش قادری	۴/:
دریا کی رانی	اشرف صبوحی	۳/:
رنگوں کی بستی	سہیل انور	۵/:
لال مرغی	عبدالواحد سندھی	۲/:

کتاب	مصنف	قیمت
حاجی بابا کی ڈائری	ظ. انصاری	۴/۵۰
شیر اور بکری	کشور ناہید	۴/۵۰
ہمارے رسول	خواجہ عبدالحئی	۶/:
ہمارے نبی	سید نواب علی رضوی	۴/:
خلفاء اربعہ	خواجہ عبدالحئی	۹/:
جادو کی ہنڈیا	کشور ناہید	۶/:
چاند کی بیٹی	〃	۶/:
کوے کا خواب	(ادارہ)	۴/۵۰
ابو علی کا جوتا	〃	۶/:
عرب دیس کی عوامی کہانیاں	انور خاں	۴/۵۰
کھلونا نگر	(ادارہ)	۸/۵۰
سمندری طوفان اور تین لڑکے	〃	۶/:
شہنشاہ نے کہا میں مفلس ہوں	〃	۶/:
ننھا منو	خورشید سلطان	۳/:
ننھا جبرو	ریحان احمد عباسی	۳/۵۰
جوہر قابل	مسعود احمد برکاتی	۲/۵۰
چور پکڑو	〃	۳/۵۰
قطب الدین بختیار کاکیؒ	مشیر الحق	۳/:
سیرت پاک مختصر مختصر	احمد خاں خلیل	۳/:
حضرت حمزہؓ	احتشام علی رحیم آبادی	۳/:
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۲/:
چالاک بلی	(ادارہ)	۴/۵۰
بھیڑیے کا گانا	〃	۴/۵۰
دم کٹی لومڑی	(ادارہ)	۴/۵۰
بی مینڈکی اور کوا	عبدالواحد سندھی	۳/۵۰
ایک دیس، ایک خون	صالحہ عابد حسین	۳/۵۰
نبیوں کے قصے	خواجہ عبدالحئی	۴/۵۰
اس نے کیا کر نہ جانا	آصفہ مجیب	۳/۵۰
ٹوٹے کھلونے	سطوت رسول	۶/۵۰
بھیڑیے کے بچے	ترجمہ قرۃ العین حیدر	۳/:
جادو کا چھلا	اشرف صبوحی	۲/:

[illegible] ہر دن سے پہلے ایک نظم ہے۔ اس طرح ۱۲۴ صفحات کی اس کتاب میں
دو لوگوں کی تقسیم سادی ہے۔ ہر دن یعنی ہر باب میں صرف دو کردار ہیں ایک "میں"
دوسرا "تو"۔ اور یہی دونوں کردار ہر روز مختلف مسائل پر گفتگو کرتے ہیں، دونوں
کی گفتگو کا انداز برادرانہ اور دوستانہ ہونے کے ساتھ ساتھ کہیں فلسفیانہ اور کہیں
صوفیانہ ہے مگر زبان سمجھنے سمجھانے والی ہے۔ معنی و مفہوم کے چھوٹے بڑے دریا پار
کرنے کے لیے جگہ جگہ مثالوں کے پُل تعمیر ہیں، جن کے ذریعے کرداروں کے مافی الضمیر
تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔ مکالمے معنی خیز اور دلچسپ ہیں، پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں
اور وہ حمد و نظمیں جو اس کتاب میں شامل ہیں (اور ثنویت کی ترتیب کے اعتبار
سے جن کے عنوانات دستک، عجیب ہے یہ سلسلہ، ازل سے ابد تک، سمندر اگر میرے
اندر گرے، نشر گاہ، مراجعت، نا موجود کے سجاری دہر، بیکراں وسعتوں میں تنہا،
جب آنکھ کھلی میری، ہیں) مکالموں کے ساتھ ہی اپنے اسرار منکشف کرتی ہیں ایسا
محسوس ہوتا ہے جیسے دونوں (نظمیں اور مکالمے) ایک دوسرے کے تراشیدہ ہیں۔
یہ کتاب بھی مکتبہ جامعہ نے حسب معمول سلیقے سے چھاپی ہے۔

امراؤ جان ادا
ایک خصوصی مطالعہ

سنہ اشاعت :- ۱۹۹۱ء

مصنف :- ڈاکٹر شاہد جمیل
ناشر :- خود مصنف
مبصر :- کلام حیدری - قیمت ۲۵/-
ملنے کا پتا :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

اس کتاب میں نو (۹) باب ہیں اور باب کے علاوہ 'بلا عنوان' اور 'کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا' کے عنوان سے بالترتیب جناب ڈاکٹر وہاب اشرفی اور خود مصنف نے کچھ متعلق اور کچھ غیر متعلق باتیں کتاب کے سلسلے میں کہی ہیں وہاب اشرفی صاحب رائے دینے میں کافی محتاط ہیں مثلاً!

"مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ شاہد فکشن (FICTION) کے اچھے محقق اور نقاد بن سکتے ہیں"

"میں 'امراؤ جان ادا' کو ان کی تنقیدی کاوش کی پہلی منزل سمجھتا ہوں یعنی نوجوان ادیب اپنی شناخت کے لیے وسیع تر PERSPECTIVE کی چیز جلد ہی پیش کرے گا۔ مجھے اس کا انتظار ہے۔"

لیکن ان جملوں سے پہلے وہاب اشرفی صاحب نے "داد سخن" میں بڑی فیاضی سے کام لیا ہے جیسے "[illegible] میں سمجھتا ہوں کہ کوئی [illegible] سنجیدگی سے پڑھنے والوں

کو [illegible] کردے تو یہ بات خود ایک اہم ادبی کام ہے"
"شاہ عین کے مطالعات پر بحث کرتے ہیں اور تفہیم
کے لیے راہ ہموار کرنے جاتے ہیں۔"

س قدر بڑھ چڑھ کر وہاب اشرفی صاحب نے محسوس کیا کہ وہ دادِ سخن شناسی کی بجائے
ادِ سخن ناشناسی کے مرتکب ہو رہے ہیں اس لیے انھوں نے وہ لکھا جو میں سب
سے پہلے نقل کر چکا ہوں۔

"کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں" عنوان کے تحت مصنف نے سولہ نام لیے جنھوں نے کسی
نہ کسی طرح اُن کی مدد اس کتاب کے سلسلے میں کی ہے علاوہ "متعدد احباب" اور
"والدین و بیوی"۔

۱۷۶ صفحات کی یہ کتاب اردو کے ایسے ناول سے متعلق ہے جو وقت گزرنے کے
ساتھ ساتھ زیادہ پرکشش اور اہم ہوتا جا رہا ہے۔ مختلف ابواب کے تحت تقسیم
کرکے مصنف نے اس ناول کو ناول PLACE کیا ہے کہ اس ناول کی تاریخی اہمیت
اور ادبی حیثیت دونوں پر اچھی خاصی روشنی پڑ جاتی ہے۔ اردو ناول کے ارتقا پر مختصراً
ہی سہی نظر ڈالی گئی ہے۔ 'امراؤ جان ادا' کے پہلے کے ناولوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔
اس ناول سے پہلے طوائف کے کردار پر بحث کی گئی ہے۔ رسوا کے طبع زاد پانچ ناولوں
کا جائزہ لیا گیا ہے اور پھر آٹھویں باب میں (صفحہ ۸۶ سے ۱۴۹ تک) خاصی اچھی اور
معنی خیز بحث کی گئی ہے یہ مرزا رسوا پر اچھی کتاب ہے۔

آئینۂ عقیدت

شاعر :- عطا عابدی
مبصر :- پروفیسر اویس احمد دوراں
قیمت :- ۲/۵۰ روپے
ناشر : رفتار نو پبلیکیشنز کوریش نگر نور الحسن لین دربھنگہ

حمد و نعت اردو شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔ شعرائے متقدمین کے دواوین کی ابتدا
حمد، نعت، منقبت اور سلام سے ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب یہ رسم پہلے کی طرح رائج نہیں ہے۔ عہد
عہد کے شعراء کی توجہ اس موضوع کی طرف گویا نہیں کے برابر ہے۔ پھر بھی کچھ شعراء ایسے ہیں جو
کبھی اپنے خالق کی حمد و ثنا شعر میں کر کے اپنی عبودیت کا اظہار و اقرار کرتے رہتے ہیں۔ نعت لکھ کر
اپنے پاکیزہ جذبات اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں جو ان کے دل میں خدا کے برگزیدہ رسول حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے موجزن ہیں۔ اس قسم کے اعلا و ارفع اور مطہر و مقدس جذبات قابل
قدر ہیں۔ ہم ان کا احترام کرتے ہیں لیکن ان جذبات کو شعری پیکر میں ڈھالنے کا سلیقہ موثر و مستحسن
ہونا چاہیے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک کردار کو شعری آہنگ میں پیش کرتے
وقت شاعر کو پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہیے۔ کم ہی شعرا نے خیر البشر کی کردار نگاری کے اعلا و ارفع
موضوع کو اس ترفع کے ساتھ برتا ہے جس کا وہ متقاضی ہے۔ ●

عطا عابدی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے حمد و نعت لکھ کر اپنے عقیدت بھرے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اپنی شاعرانہ بساط کے مطابق حمد و نعت کے موضوع کو برتنے کی کوشش کی ہے۔

"آئینۂ عقیدت" کی پذیرائی ضروری ہے تاکہ شاعر کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ آئندہ بھی معبود و عبد کے رشتہ کی عکاسی زیادہ مؤثر انداز سے کر سکے۔ ہادیِ اسلام کے منور کردار کا عکس زیادہ معتبر آہنگ شعری کے ساتھ پیش کر سکے۔

نور الہدیٰ

شاعر:- شیخ منظور محی الدین عیش میرٹھی۔
قیمت:- ۴۰/- روپے
ملنے کا پتا:- بیتیا منظور محی الدین عیش میرٹھی
۵۵ کوٹھی خان بہادر صاحب لال کرتی میرٹھ
مبصر: راجندر بہادر موج

سرورِ کائنات، سرکارِ دوعالم، خاتم النبیین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جزوِ ایمان ہے اور اہلِ ایمان کے لیے جناب عیش میرٹھی کا یہ مجموعہ نعت خیر البشر بعنوان "نور الہدیٰ" صحیفہ کی شکل میں ایک متبرک ہدیہ ہے جس کا مطالعہ کارِ ثواب ہے۔ اسّی صفحات کا یہ مجموعہ نعت، منقبت اور سلام پر مشتمل ہے اور نورِ ہدایت ہے۔

بلغ العلا بکمالہٖ ، کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ ، صلوا علیہ و آلہٖ

مندرجہ بالا چار مصرعوں سے کتاب کی ابتدا کی گئی ہے۔

لگتا ہے، عیش صاحب نے اپنی تصنیف کا نام معنویت کا سہارا لے کر رکھا ہے۔ قرآن شریف کی ایک آیت ہے کہ اگر تم مجھ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میرے رسول سے محبت کرو اور دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ میرے رسول کا اتباع میرا اتباع ہے۔ اس لیے محبوبِ خدا کی مدح سرائی خالقِ کائنات کی عبادت اور عقیدت ایک ضروری فریضہ ہے۔

علاوہ نعتوں کے حضرت ابوبکر صدیق رض خلیفہ اوّل کی شان میں مثنوی۔ حضرت امام حسین رض کی شان میں مثنوی اور حضرت عباس رض شہید کربلا و حضرت فاطمہ زہرا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قصائد بھی کہے ہیں جو نہ صرف محبت اور عقیدت کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ عیش صاحب کی تاریخ اسلام کی عمیق واقفیت کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ اس مختصر مجموعہ میں سمندر کو کوزہ میں ضم کر دیا گیا ہے۔

عیش صاحب کہنہ مشق کلاسیکی انداز کے شاعر ہیں ان کے کلام میں پختگی ہے اور فنی پابندیوں کا مکمل احترام ہے۔ چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:-

حمد

ترا عکس شیشہ میں یوں نہیں کہ دعویٰ کوئی بھی نہ آ سکے
ہے وجود ترا لطیف تر کوئی آئینہ نہ دکھا سکے

نعت

جس کو فرماتے خدائے پاک خود خُلقِ عظیم
ایسا ارفع ایسا اعلا آپ کا کردار ہے
حبیبِ پاک کو یکتا بنا کر خلق میں بھیجا
نیا انداز ہے واللہ کثرت میں وحدت کا
شبِ اسریٰ اٹھا جب میم کا پردہ تو یہ دیکھا
مقامِ قاب قوسین اک مقام ہے قربت کا

رابطہ اتنا تو ہو جائے مرے قلب نظر میں
جس سمت نظر جائے نظر آئے مدینہ
خدا کی بات ہے سرکارِ احمد کی زبانی ہے
عقیدت کے پرستاروں نے ان کی بات مانی ہے

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ غریب نواز کی بارگاہ میں جو نذرانہ پیش کیا ہے معتبر جذبۂ عقیدت کا مظہر ہے :-

بگڑی ہوئی قسمت بن جائے گر ایک اشارہ ہو جائے
ہیں آپ بڑی سرکار شہا سلطان الہند غریب نواز
خواجۂ ہند اور معین الدین، شمعِ رہ ہدیٰ غریب نواز
غیر جس نے بنا دیے اپنے، پھر وہی اک ادا غریب نواز

مثنوی در منقبت حضرت ابوبکر صدیق رضہ کا شعر :-

کیا قربانِ حکمِ شاہِ ذیشاں　　　　گرہستی تک اپنا سارا ساماں

یہ شعر غزوہ تبوک کی نشاندہی کرتا ہے جب کہ خلیفہ اوّل نے بطور چندہ اپنا سب کچھ نذر کر دیا تھا۔

قصیدہ در منقبت حضرت عباسؓ شہید کربلا کا شعر :-

کہ جس نے بھائی کو آقا تمام عمر کہا　　　　رہے وہ مرتبہ دانِ امام عالی مقام

مجموعہ ہذا نعت گوئی کے ادب میں گراں قدر اضافہ ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔

اشاریہ ایوان اردو دہلی

(مئی ۸۷ء تا اپریل ۹۳ء)

مرتب :- فاروق انصاری
مبصر :- شعیب رضا فاطمی
قیمت :- ۸۰/- اسّی روپے
ناشر :- شاہین ایڈورٹائزرس
۴۳۲- مٹیا محل جامع مسجد - دہلی ۶

اردو میں اشاریہ سازی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اب تک جن رسائل کے

اشاریے مرتب ہوتے ہیں۔ وہ بھی ریسرچ کے طالب علموں کی نظر سے اوجھل ہیں، اگر ان کی اشاعت ہو جاتی تو یقیناً ریسرچ کے طالب علموں کے لیے وہ مشعل راہ ضرور بن سکتے ہیں۔ خاص طور سے ریسرچ اسکالرز کے لیے وضاحتی اشاریے کی کافی اہمیت ہے جس کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا گیا۔

اشاریہ سازی یقیناً تخلیقی عمل نہیں لیکن مشکل امر ضرور ہے۔ موجودہ دور میں حکومت کی طرف سے لائبریریاں، اکیڈمیاں ہونے کے باوجود بھی محققین کو بہت سی صعوبتوں کو جھیلنا پڑتا ہے۔ تاہم رسائل کے اشاریے اگر موجود ہوں تو ریسرچ اسکالرز کی پریشانی کچھ حد تک دور ہو جاتی، کیونکہ اشاریے کو دیکھ کر وہ یہ پتا لگا سکتا ہے کہ اُس کے مطلب کی چیز موجود ہے یا نہیں اور وہ ورق گردانی کرنے سے بچ جائے گا۔ راقم الحروف بھی دہلی کے ادبی رسائل پر کام کر رہا ہے اس لیے اشاریے کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔

اشاریہ ایوانِ اردو مئی ۸۷ء سے اپریل ۹۲ء تک مرتب کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے وضاحتی اشاریہ بنانے کی سعی کی اور کچھ حد تک کامیاب بھی ہوئے مگر سرورق پر اُس کا حوالہ نہیں دیا جس کے باعث قاری کو اشاریہ کے بنا مطالعہ کیے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ یہ اشاریہ وضاحتی ہے۔ اشاریے کو سائنٹفک بنیادوں پر مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً تخلیقات کو مصنف کے نام سے حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا ہے جس سے کسی بھی ادیب یا شاعر کی تخلیق کو تلاش کرنے میں آسانی ہوگی۔ مضامین کا مختصر خلاصہ پیش کیا گیا ہے اور اُن مضامین سے متعلق معترضین حضرات کے خطوط و مکتوبات کی بھی فہرست میں شامل کیا ہے جو کہ موضوع سے متعلق کسی خامی کی نشاندہی کرتے ہیں یا پھر معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

اشاریہ ایوانِ اردو میں تکنیک کے اعتبار سے کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ کتابت بہت عمدہ اور صاف ہے۔ اشاریہ ایوان اردو کی اشاریہ سازی کے اس کام کے لیے فاروق انصاری قابلِ ستائش ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے دوران اپنے قیمتی وقت کو صرف کر کے اس کو مرتب کیا جس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی وہ ایسے نیک کام انجام دیتے رہیں گے۔ ●

خطوط

راجرن رستوگی ۔ اقبال سٹڈیز سینٹر، گوہاٹی ۔

ہوش مندی و کار آگہانہ ادارت نے
کتاب نما،، کو ہند و پاک میں وقیع و موقر نام و
قام کا حامل بنا دیا ہے ساکتوبر ۹۳ء کے شمارے
ں مشرقی ساختیات اور لسانیاتی فکر کی آخری
سط شائع ہوئی ہے ۔ پروفیسر نارنگ کو اردو
دبیات میں یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے ایک
نفرد مقام حاصل ہو چکا ہے ۔ تحریر بلا بڑی
ہودمندو خرد افروز ہے ۔ پروفیسر انیس الرحمٰن
"جمود خرام نما" بہت پسند آیا۔

جہاں تک اردو عروض کا تعلق ہے،
لوئی کہہ سکے اردو عروض جامد و ساکت ہو کر
ہ گیا ہے ۔ عالمی عروضیات جو موسیقیات اور
فسیات سے بھی فیض یاب نیز بشریات سے
وشنی حاصل کرتی تنظیم بن کر ابھری ہے مگر اردو
یں " ذہن کن " مصطلحات ہی کے تیشوں کو
ستعمال کر کے عروض دانی کا مظاہرہ کیا
جاتا ہے ۔ زار صاحب اور کمال صاحب دونوں
، زعم خود عروض داں ہیں اور بس، اچھے شاعر
تو ہیں ہی نہیں ۔

● نثار احمد نثار، بیگم پور ۔ سستی پور ۔ بہار،

"اشاریہ" کے تحت مہمان مدیر
جناب ابوالفیض سحر کا مضمون کڑی محنت اور
وسیع مطالعہ کا ثبوت ہے ۔ یہ سچ ہے کہ ہر
فن پارہ جو تخلیق ادب کے نام پر تخلیق کیا گیا ہو
ضروری نہیں کہ واقعی فن پارہ ہی ہو" لیکن اسے
کوئی نام تو دیا جا سکتا ہے ۔ "جیون" یقیناً ایک
کامیاب افسانہ بن کر منظر عام پر آسکتا تھا
لیکن مترجم نے افسانے میں افسانہ پن اور شعر
کہنے کی کوشش پر زیادہ زور دیا ۔

● شبیہ عباس جارچوی، ملیر توسیعی کالونی ۔ کراچی ۔ ۳۷

نومبر کے شمارے کی خاص تحریر مہمان مدیر
محترم ابوالفیض سحر صاحب کا تحریر کردہ اشاریہ
بعنوان "تنقید بھی ایک تخلیقی عمل ہے ۔ ایک
نقطۂ نظر" ہے ۔ اس مضمون سے سنجیدہ ادب
کے قاری کو بہت سے سوالوں کا جواب مل جاتا
ہے اور یہ بہت فکر انگیز ہے ۔ کتاب نما
کے طفیل بہت عرصے بعد اس قدر معلوماتی
مضمون پڑھنے کو ملا ۔ ہندی سے ترجمہ کی ہوئی
کہانی "جیون" ایک عمدہ کہانی ہے ۔

● ڈاکٹر حمید اختر سردھنوی ۔ میرٹھ ۔

نومبر ۹۳ء کا "کتاب نما" نظر نواز ہوا ۔
مہمان مدیر ابوالفیض سحر کے اشاریہ کے علاوہ
جناب ڈاکٹر عصمت جاوید کا مقالہ "قافیے کی
ماہیت" ، فن عروض کے ایک جز قافیے پر تفصیلی
مضمون ہے ۔ جو ایک شعر و شاعری کا شوق رکھنے
والے قاری کی معلومات میں اضافہ کا باعث
بنے گا ۔

اس بار محترم قیوم خضر صاحب نے "سلائی
کی تہ سے اُجالے کا نمود" لکھ کر اس شمارے کی
قیمت ہی نہیں عظمت بھی بڑھا دی ہے ۔
وہ اس تاریخی مضمون کو صفحۂ قرطاس پر لانے
کے لیے داد و تحسین کے مستحق ہیں ۔ خدا انہیں
عزم و ہمت عطا کرے کہ وہ تاریخی خانوں سے

جہاں تک ہو کر جواہر پارے روشنی میں لائیں تاکہ ملت کے نوجوان طالب علم کو اپنے اسلاف کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی رہے۔ ایک نظر ایوان غزل کی طرف بھی جناب منور رانا کی غزل اس شمارے کی کامیاب غزل ہے۔ بطور نمونہ ایک شعر:

؎ کیسے کیسے لوگ دستاروں کے مالک ہو گئے
بک رہی تھی شہر میں تھوڑی سی سستی ایک دن

● وقار عسکری۔ جھریا۔ (دھنباد)

تازہ کتاب نما میں "انیس الرحمن صاحب کا اشاریہ "جمود خرام نما" دعوت فکر دیتا ہے۔ فاروقی کا مضمون کافی تحقیقی اور فکر انگیز ہے۔

● نعمان شوق ملکی محلہ، آگرہ۔

"حمد" کی اشاعت کے لیے شکریہ! میرا مطلع یوں ہے جو غلط چھپ گیا ہے ؎

سوتے جاگتے ان آنکھوں نے تیرا نام لیا
شام و سحر ہر دم چڑیوں نے تیرا نام لیا

اس کے علاوہ تیسرے شعر میں "میں" کی جگہ "آئے تو" پانچویں اور ساتویں شعر میں "ایک دن" "اور" "ہو تو" زاید چھپ گیا ہے۔ ازراہِ کرم اگلے شمارہ میں یہ غلط نامہ شائع کر دیں۔

اس شمارہ میں منور رانا کی نہایت خوبصورت غزل آپ نے شائع کی ہے اس کے لیے آپ اور شاعر دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں عبدل بسم اللہ کا افسانہ ذہن کو کافی متاثر کرتا ہے۔ قمر الاسلام جیلانی نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔

● غوث محمد غوثی، سرائے رحمن علی گڑھ۔

یہ جو عروضی بحث ڈاکٹر کمال احمد صدیقی شمس الرحمن فاروقی اور زاہد علائی صاحب کے وسیلے سے چل رہی ہے یقیناً ان حضرات کی یہ بحث عروض کے شائق حضرات کے لیے مفید ہے اور ہوگی کیونکہ تینوں حضرات قابلِ قدر ہیں۔ یہ سلسلہ اچھا ہے تا دیر قائم رہے۔

● رحمت امروہوی۔ احمد آباد۔

آپ نے اکتوبر کے "کتاب نما" میں جناب کمال احمد صدیقی کی "ہجو در مذمت نظام حاضر" شائع کر کے اور اس پر ادارے کا نوٹ دے کر ایک اور بحث کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس سلسلے میں مختصراً عرض ہے کہ ہر عروض داں شاعر بھی ہو کوئی ضروری نہیں ہے (اچھا شاعر تو الگ بات رہی) ایسے لوگ صرف ایک انگلی پر گنے جا سکتے ہیں جو ماہر عروض بھی ہیں اور اچھے شاعر بھی ۔۔۔۔۔ اس سلسلے میں پہلا نام جناب عنوان چشتی کا لیا جا سکتا ہے وہی اس پر صحیح اور مضبوط رائے دے سکتے ہیں مجھے تو "ہجو در مذمت نظام حاضر" میں کہیں بھی شاعری کی جھلک یا چاشنی نظر نہیں آئی۔

● م۔ ق۔ سلیم، سائبان ۴۶۹-۲-۱۹ بیرون فتح دروازہ، حیدرآباد ۲۰۲۔ ۵

"کتاب نما" کے اشاریے لاجواب ہوتے ہیں۔ اس بار سعید الظفر چغتائی صاحب نے سائنسی دور میں ادب کی افادیت پر مختصر مگر اچھا اشاریہ لکھا۔ آپ ادب کے ساتھ سائنس کے لوگوں کو بھی اس طرف مائل کر رہے ہیں۔ عموماً سائنس والے ادب سے دور بھاگتے ہیں جو وقت سب سے بڑا انقاد اور محبت ہے۔ ظفر صاحب کا یہ جملہ چبھتا ہے اور آج کے ادب کی بھرپور عکاسی بھی۔ لکھنا تو ہر کسی کو آتا ہے۔ مگر لکھے وہ جس کو زبان و بیان پر عبور ہو، کتاب نما ۳۴ ویں سال میں داخل ہو رہا ہے خدا کرے کہ کتاب نما ہمیشہ نمایاں ہو

غالب انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات

مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کی مطبوعات!

کتاب	مصنف	قیمت
اقبال آئینہ خانے میں	پروفیسر آفاق احمد	۴۰/-
سورج نما	محمد علی تاج	۱۲/-
خاموش آواز	جاں نثار اختر	۲۵/-
فکر و شعور	کوثر چاندپوری	۱۳/۵۰
کلام حامد	حامد سعید خاں	۱۲/-
لو آج ہم بھی	شفیقہ فرحت	۱۲/-
شعاع فکر	وکیل بھوپالی	۱۳/-
نشاط فکر	فاضل انصاری	۱۱/-
صدف	خلیق برہانپوری	۱۲/۵۰
مدھیہ پردیش میں اردو ادب کے ۲۵ سال	اردو اکیڈمی	۶۰/-
شب رنگ	ڈاکٹر اختر نظمی	۱۳/-
نقوش ذکی	ذکی وارثی	۱۷/-
تحقیق اور حاصل تحقیق	ڈاکٹر سید حامد حسین	۱۴/-
اشعار نادر اشہر	منشی پربھولال گوڑ اشہر	۱۸/-
دیوان غالب (نسخہ حمیدیہ)	منشی محمد انوار الحق	۳۲/-
کاغذ	وحید پرواز	۱۵/-
جادو نگری	کوثر جہاں	۱۴/-
شخصیات	سید محمود الحسینی	۱۹/-
افغان بت کدہ	شرق ماہری	۱۵/-
چراغ رہگذر	اما شنکر شاداں گوالیاری	۱۵/-
انوکھا مقابلہ	قاضی انصار	۹/-
شبد	صادق اندوری	۱۵/-
سحر نما	عشرت قادری	۱۵/-
دیوان	منیر بھوپالی	۱۵/-
لمحوں کا سفر	ڈاکٹر رضیہ حامد	۱۷/-
لمعات سہا	مولانا سہا مجددی	۱۸/-
یادوں کے چراغ	اقبال جعفری	۱۵/-

کتاب	مصنف	قیمت
نگاہ	اختر سعید خاں	۲۰/-
ہندی ڈرامے کا ارتقاء	ابراہیم یوسف	۲۱/-
کلام صابر	تفضل حسین صابر	۱۷/-
متاع دیدۂ تر	نصیر پرواز	۱۵/-
سوئے غزل	پنالال شریواستو نور	۱۷/-
اب میں کیا کروں	مصطفےٰ تاج	۱۷/-
ذائقۂ سنگ	سرفراز دانش	۱۵/-
برکت اللہ بھوپالی	قاضی وجدی الحسینی	۲۸/-
بازیافت	فرحت جہاں	۱۵/-
حرف حرف آئینہ	مختار شمیم	۱۴/-
نگارشات	سید قمر الحسن	۱۵/-
خرم	وسیم بانو قدوائی	۲۵/-
ترکش	شکیل گوالیاری	۱۵/-
نذرانۂ عقیدت (با تصویر)	فضل تابش، محمد رئیس	۱۰۰/-
کیوں	خالد غنی	۱۷/-
لفظوں کا سفر	کامل بہزادی	۱۸/-
جاگتی راتوں کی فصل	مرتضیٰ علی شاد	۲۲/-
ایثار	وامق اندوری	۱۷/-
موج رواں	اویس کاوش	۱۹/-
سخن معتبر	ناطق مالوی	۲۰/-
متاع قلم	شمیم اشرفی مالوی	۱۷/-
ٹوٹا پَر	ظہیر پرویز	۱۶/-
گل صحرا	حبیب الرحمٰن راہی بالاگھاٹی	۱۸/-
برکت اللہ بھوپالی (دیوناگری)	قاضی وجدی الحسینی	۶۰/-
میثاق	قاضی حسن رضا	۲۲/۵۰
ایاغ شاد	لالہ تپا پرشاد شاد میرٹھی	۳۰/-
جھروکا	ترتیب و حاشی منور ہرورما، اظہر راہی، حیدر عباس رضوی اور فضل تابش	۵/-
پر شور خاموشی	پروفیسر آفاق احمد	۲۲/-

سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی سنسکرتی بھون بھوپال

ادبی تہذیبی خبریں

جناب عابد علی خاں صاحب پر ڈاکومنٹری فلم

ممتاز صحافی اور اردو کی برگزیدہ شخصیت
ناب عابد علی خاں صاحب مدیر "سیاست"
ی حیات اور کارناموں پر ایک دستاویزی فلم
یار کی جارہی ہے۔ اس فلم کی شروعات سے
ور پر شری کرشنا کانت عزت مآب گورنر
ندھرا پردیش کے تاثرات فلمائے گئے اس
رح شوٹنگ کا آغاز کردیا گیا ہے۔

دوردرشن کے لیے تیار کی جانے
الی اس دستاویزی فلم کے ہدایت کار
عظم خلیق ہیں جب کہ تحریر ڈاکٹر بیگ احساس
ی ہے

مدھیہ پردیش اردو اکادمی میں کامیاب ادبی نشست

ادیبوں اور شاعروں نے بڑی تعداد میں شرکت کی

بھوپال ۱۲ر نومبر مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی
ملاقات کے نام سے ہونے والی نشست
یں بولتے ہوئے ترقی اردو بیورو کے وائس
یرمین مسٹر عزیز قریشی نے کہا کہ آج پوری
انسانیت تباہی کے ایک ڈھیر پر کھڑی
ہوئی ہے سیاسی رہنماؤں کی ناکامی کے بعد
ادیب شاعر اور قلمکار ہی اپنے قلم کی طاقت
اور خیالات کی گرمی سے انسانیت کو اس
تباہی سے بچا سکتے ہیں۔

اس جلسے میں ممتاز شاعر اور ادیب
مسٹر رفعت سروش نے اپنا کلام سنایا اور
اپنے ادبی سفر اور نظریات پر روشنی ڈالی یہاں
شعرا میں شاہد میر پالی اور وقار فاطمی نے اپنی
غزلیں سنائیں۔ جب کہ پروفیسر فضل تابش
نے رفعت سروش کی شاعری پر مقالہ پڑھا
اکادمی کے سکریٹری پروفیسر آفاق احمد نے شہر
کے ادبا و شعرا اور دانشوروں کی بڑی تعداد
میں شرکت کو حوصلہ افزا قرار دیا۔ جب کہ جلسے
کی نظامت کے فرائض ملکہ نسیم نے انجام دیے۔

رام لعل کو ساھتیہ اکاڈمی ایوارڈ

نئی دہلی۔ ۳۰ر جنوری (اپنے نمائندے سے)
اردو کے ممتاز افسانہ نگار مسٹر رام لعل کو ان کے
افسانوی مجموعے "پکھیرو" پر ۱۹۹۳ء کے ساہتیہ
اکادمی ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ مسٹر
رام لعل گزشتہ چار دہائیوں سے لگاتار اردو
زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں ان کی
کئی کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہو چکی ہیں۔

اردو نے مجھے عزت دی ہے

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے نئے سکریٹری
پروفیسر آفاق احمد کا باضابطہ طور پر کل ایک مدھیہ

[illegible] مشاعروں کا اہتمام کریں گے۔ اس طرح سالانہ تقریباً پون لاکھ روپے کی رقم اردو کے [illegible] کے لیے صرف ہو سکے گی۔

پروفیسر آفاق احمد نے کہا کہ اردو کے لیے جو کچھ کرنے کی میرے دل میں تمنا ہے اسے دیکھتے ہوئے اس رقم کو میں ایک معمولی نذرانہ تصور کرتا ہوں۔ اردو نے مجھے پہچان عطا کی ہے اور عزت دی ہے۔ اس سلسلے میں میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اردو کی ہر خدمت رضاکارانہ طور پر سرانجام دوں گا۔ آپ نے کہا کہ اس رقم سے اردو اکادمی کے سرمایہ میں اضافہ ہوگا اور اس کی کارکردگی مزید بہتر ہو سکے گی۔ (نامہ نگار)

اردو میں پہلا سائنسی ماہنامہ

نئی دہلی۔ ۹ دسمبر دہلی سے بہت جلد اردو کا ایک سائنسی اور معلوماتی ماہنامہ شائع ہونے والا ہے۔ انجمن کے روح رواں ڈاکٹر محمد اسلم پرویز جو ذاکر حسین کالج میں سائنس کے استاد ہیں کا کہنا ہے کہ اس سائنسی ماہنامے سے اردو صحافت میں ایک تعمیری پہلو کا اضافہ ہوگا اور ساتھ ہی اردو والوں میں سائنسی مزاج اور سائنسی سوچ کو فروغ دینے میں بھی مدد ملے گی۔ انھوں نے بتایا کہ سائنس اور ماحولیات پر اردو میں لکھنے کی روایت ڈالنے کے لیے قلمکاروں کو معاوضہ بھی دیا جائے گا۔

شہاب سہسرامی کی یاد میں مشاعرہ

نسیم سہسرامی کے والد ماجد حکیم حضرت سید شہاب الدین وارثی شہاب سہسرامی کی پہلی برسی پر حضرت ضیاء الدین درگاہ "پیرو" بھوجپور بہار میں ۸ نومبر ۹۳ء کو بعد نماز عشاء ایک محفل مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ جس میں مقامی شعرا کے علاوہ بیرونی شعرا نے شرکت کی۔

اردو کے مقبول شاعر وقار فاطمی کا انتقال

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے مقبول شاعر جناب وقار فاطمی کا حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے بھوپال میں انتقال ہو گیا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون"۔ مرحوم انسانیت کی صالح اقدار و روایات اور شریفانہ خصائل کے سچے امین تھے۔ ایثار و محبت ان کا شیوہ اور خوش اخلاقی، خوش گفتاری، اور خوش مزاجی رویہ تھا۔ ان اوصاف نے ان کی شخصیت کو نہایت پرکشش، مقبول و محبوب اور ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ سرونج ان کا وطن تھا لیکن عرصۂ دراز سے بھوپال میں مقیم تھے اور مرکزی سرکار کے ایک تعلیمی ادارے میں غیر تدریسی عہدے پر فائز تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بچے (ایک بیٹی "پیکر" عمر ۱۲ سال ایک بیٹا "حاشر" عمر دس سال) ہیں جو بھوپال میں زیر تعلیم ہیں۔ مرحوم کی ضعیف ماں اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ سرونج میں رہتی ہیں۔

مکتبہ جامعہ اس سانحۂ ارتحال پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ خدا سے دعا گو ہے کہ مرحوم کو

اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر اخلاق اثر کے اعزاز میں جلسہ

۳۰ دسمبر۔ کربلا کا واقعہ ایک کشمکش تھا اور ہر مسلمان کی باطنی و خارجی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کشمکش کا ایک حصّہ ہے۔ حلال و حرام کی تمیز، نفس کی بے راہ روی سے جنگ، یہ سب ایک کشمکش سے ارتباط ہیں۔ اور ڈراما نگار کشمکش حیات کو ایک بہترین صورت میں ڈھالتا ہے۔ مشہور نقاد اور ڈراما نگار ڈاکٹر اخلاق اثر (صدر شعبۂ اردو ہمیدیہ کالج بھوپال) بحیثیت مہمان خصوصی 'انجمن ترقی اردو' (ہند) شاخ میسور کے زیرِ اہتمام ایک اعزازی اجلاس سے خطاب فرما رہے تھے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ قرآن مجید کو ہم ترجمے کے ساتھ پڑھ کر یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارا صحیح عقیدہ کیسا ہونا چاہیے۔ آیا اللہ تبارک و تعالیٰ نے صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا اعادہ کیوں کیا ہے۔ اور میں ذاتی طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ ہر زبان کی ترویج اس کی حرف شناسی میں پوشیدہ ہے۔

معتمد اعزازی جناب سید منظور احمد نے استقبالیہ تقریر میں کہا کہ جہاں شہر بھوپال کو مذہب میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے وہیں اس شہر کے ادبی کارنامے بھی گرانقدر ہیں۔ موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ ڈاکٹر اخلاق اثر سے میری ملاقات دلی بھوپال اور بیشتر مقامات پر ہوئی اور میں شخصی طور پر اس دورِ الحاد میں آپ کی دینداری سے متاثر ہوں۔

جناب محمد فاروق نشتر (مزاح نگار) نے اس جلسے کی صدارت کی اور صدارتی خطاب میں کہا کہ جس طرح اسلام کی راہ میں بدترین و نام نہاد مسلمان روڑہ بنے ہوئے ہیں اسی طرح اردو کی ترقی و ترویج میں اردو کے وہ متکبر و نام نہاد ادبی شخصیات روڑہ ہیں جو اردو ادب کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ڈاکٹر اخلاق اثر صاحب ایک آئیڈیل ثابت ہوئے ہیں جو چھ کتابوں کے مصنف ہونے کے باوجود انکسار و عجز کا پیکر ہیں۔ اس اجلاس کی کارروائی کا آغاز حافظ قاری عالی جناب محمد علی کی قرات کلام پاک سے ہوا۔ مولانا خلیل کرناٹکی (صدر مدرس مرکز کتابت میسور) نے مہمان خصوصی کی گل پوشی کی اور جناب سلیم تمنائی (صدر ادارہ) نے بڑے متاثر کن الفاظ میں ہدیہ تشکر پیش کیا۔

ممتاز اردو شاعر کرشن مراری سہگل کا انتقال

نئی دہلی۔ نامور بزرگ اردو شاعر جناب کرشن مراری سہگل کا ۱۵ نومبر ۹۳ء کو دل کے اچانک دورے سے انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۷۰ سال کی تھی۔ وہ تین شعری مجموعے اور ایک نثری تصنیف شائع کر چکے تھے وہ غزل اور نظم دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ اور نثر نگاری میں بھی صاحبِ کمال تھے۔ ان کی پیدائش ۳۰ جولائی ۱۹۲۳ء کو پاکستان کے ضلع

جہلم میں ہوئی اور انھوں نے دیال سنگھ کالج لاہور سے ریاضی کے مضمون میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے زمانے میں وہ ہجرت کرکے دہلی آگئے یہاں پہلے ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۶ء آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کی اور پھر ایک امتحان پاس کرنے کے بعد انڈین ریونیو سروس میں داخل ہوگئے

ادارہ کتاب نما سہگل صاحب کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے

اردو ادبی سرکل کے ذریعے مشتاق احمد نوری کو خراج تحسین

اردو ادبی سرکل "قلعہ گھاٹ" دربھنگہ میں مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو ایک نشست زیر صدارت بزرگ شاعر و ادیب حسن امام درد ہوئی۔ جس کی نظامت ڈاکٹر امام اعظم نے فرمائی۔ اس نشست میں معروف افسانہ نگار مشتاق احمد نوری سکریٹری بہار اردو اکاڈمی کی کارگزاریوں کو سراہا گیا۔ اور اس بات پر مسرت کا اظہار کیا گیا کہ بہت دنوں کے بعد کسی ادیب و فن کار کو سکریٹری کے عہدے پر فائز کیا گیا ہے۔ اس نشست میں شہر کی معروف شخصیتیں ڈاکٹر شاکر خلیق، محمد سالم، ڈاکٹر منظر مہدی، ڈاکٹر منصور عمر، ڈاکٹر وزیر الحق انصاری، ڈاکٹر امتیاز احمد صبا، ڈاکٹر الیس احمد، پروفیسر شاہد احمد یحییٰ، ادریس پرویز، ایڈووکیٹ احمد اعظم، حسن امام فاروقی، عبدالحفیظ، ڈاکٹر محمد نعمت اللہ آزاد، انصار الحق، محترمہ زہرہ شمائل، عبدالمعبود آمر وغیرہ شریک ہوئیں صدر محترم کے شکریہ کے ساتھ اس نشست کا اختتام ہوا

مراٹھی ماہنامہ "جیون شکشن" کا اردو ایڈیشن

ڈائرکٹر تعلیمات حکومت مہاراشٹر کی زیر نگرانی مراٹھی ماہنامہ "جیون شکشن" برسوں سے تعلیمی میدان میں نمایاں خدمات انجام دے رہا ہے۔ مہاراشٹر میں اردو مدارس کی تعداد کو دیکھتے ہوئے ڈائرکٹر تعلیمات نے اس رسالے کا اردو ایڈیشن شائع کیا ہے۔ فی الحال اردو ایڈیشن ششماہی ہے۔ اردو دوستوں کی دلچسپی اس رسالے کو "سہ ماہی" یا ماہانہ بنا سکتی ہے۔ زیر نظر شمارے میں عزت مآب جناب سلیم ذکریا وزیر تعلیم و اوقاف حکومت مہاراشٹر اور ڈائرکٹر تعلیمات و مدیر اعلیٰ شری سریش ساڑگاونکر کے تاثرات شامل ہیں۔

سولہ روپے زر سالانہ بھیج کر رسالہ مندرجہ ذیل پتے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مدیر "جیون شکشن" اردو۔ ایس۔ سی ای۔ آر۔ ٹی۔ سداشیو پیٹھ پونہ نمبر ۳۰

علیم صبا نویدی کے اعزاز میں جلسہ

ہندو پاک کے مشہور شاعر، افسانہ نگار، ادیب اور محقق جناب علیم صبا نویدی کے اعزاز میں ایک تہنیتی اجلاس باہتمام دارالعلوم لطیفیہ ویلور ضلع شمالی آرکاٹ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۹۳ء کو دوپہر تین بجے منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت مولانا مولوی سید عثمان پاشا صاحب قادری پرنسپل دارالعلوم لطیفیہ نے کی۔ مولانا راہی فدائی صاحب نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ اس

اجلاس میں ڈاکٹر عابد معز نے علیم صاحب کو "امتیاز میر" ایوارڈ عطا ہونے کے تعلق سے کہا کہ یہ انعام علیم صاحب کے لیے نہیں بلکہ سارے تمل ناڈ کے لیے ایک اعزاز ہے۔ ڈاکٹر سجاد حیدر، "آکاش دیپ" جناب برتر مدراسی، محمد یعقوب اسلم صاحب نے آپ کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا۔ جناب اکرام کاوش نے ڈرامائی انداز میں ایک جامع تعارف نامہ پیش کرتے ہو کہا کہ علیم صبا نویدی کی شخصیت اور فن ہمارے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں آخر میں جناب علیم صبا نویدی نے اپنے تاثراتی کلمات سے نوازتے ہوئے منتظمین دارالعلوم لطیفیہ اور جناب سید عثمان پاشا قادری پرنسپل اور جناب سید شاہ ہلال احمد صاحب قادری وائس پرنسپل دارالعلوم لطیفیہ اور اساتذہ وطلبہ کے خلوص اور محبت کا شکریہ ادا کیا۔ یہ شاندار جلسہ سہ پہر ٹھیک پانچ بجے مولانا بشیر الحق قریشی کے ہدیۂ تشکر کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

تعاون درکار ہے

میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی سے "دہلی کے ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ آزادی کے بعد" کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ تصنیف کر رہا ہوں۔ قارئین "کتاب نما" سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل رسائل کی فائلیں مہیا کرانے میں میرے ساتھ تعاون کریں۔

رسائل کے نام، عصری ادب، عصری آگہی شاہراہ، محور، فنکار، تناظر، اردو سے معلیٰ گہوارہ، سو برس، صبح، تحریر، اردو دنیا، افکار جن حضرات کے پاس مذکورہ رسائل، رسالے کی فائلیں، شمارے، شمارہ ہوں براہ کرم اس پتے پر مطلع کرنے کی زحمت کریں۔

شعیب رضا وارثی ۱۴۲، کاویری
ہاسٹل جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی ۶۷

شجاع کے نئے مجموعے

"رشکِ فارسی" کا اجراء

مختلف مکاتبِ فکر سے وابستہ ادیبوں نے "رشک فارسی" کے اجرا پر اپنی تقاریر میں اتفاق کیا کہ شجاع خاور اس دور کے ایک بڑے شاعر ثابت ہو رہے ہیں۔

غزل کے پختہ کار اور صاحب طرز شاعر شجاع خاور کے تازہ مجموعۂ غزلیات "رشک فارسی" اور ہندی رسم الخط میں شائع کیے گئے ان کے ایک ضخیم انتخاب "بات" کے مشترکہ اجرا کی تقریب دہلی کے سپرو ہاوس میں بتاریخ ۲۰ دسمبر ۱۹۹۲ء منعقد ہوئی۔ "رشک فارسی" کا اجرا ہندی کے نامور شاعر پروفیسر کیدار ناتھ سنگھ نے کیا اور "بات" کے اجرا کی رسم انگریزی کے ممتاز صحافی وحقوق انسانی کے علمبردار کلدیپ نائر نے انجام دی۔ جلسے کی نظامت کے آغاز میں صحافی شاعر فرحت احساس نے اردو ہندی کے ادیبوں کی باہم موجودگی کے لحاظ سے کہا کہ تخلیقی قلمکاروں کے احساسات کے سرچشمے مشترک بھی ہوتے ہیں۔

اظہار خیال کا آغاز کرتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ شجاع ابتک

سابقہ شعری تخلیقات کے سبب پہلے ہی اردو شاعری میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم اور مستحکم کر چکے ہیں۔ شجاع خاور کی غزل کے ذریعے غزل کا ایک نیا رُخ اور نئی فکر ہم تک پہنچی ہے۔ اور اس لحاظ سے "رشکِ فارسی" اردو شاعری میں ایک تاریخی حیثیت کا شعری مجموعہ ہے۔

جوگندر پال نے شجاع کی غزل میں سادہ زبان اور گہری فکر کی باہم موجودگی کی صراحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ شاعر گہری فکری اور فلسفیانہ باتیں گویا سیٹیاں بجانے کے انداز میں کہہ جاتا ہے۔ اور یہ اسکے فن کا کمال اور امتیاز ہے۔ شجاع کی غزل کے مکالماتی رنگ سے کبھی کبھی عبدالحمید عدم کی یاد آجاتی ہے مگر عدم کے مکالماتی رنگ میں وہ گہرائی نہیں جو شجاع خاور کے شعروں میں جا بجا ہے۔ محمود ہاشمی نے شجاع سے اپنے دیرینہ ذاتی تعلق کا ذکر کیا اور کہا کہ پچیس سال قبل طویل نظم "دوسرا شجر" کی اشاعت کے زمانے سے وہ شجاع کے شعری سفر کا خاموشی سے مطالعہ کرتے رہے ہیں اور اب تازہ مجموعہ "رشکِ فارسی" پڑھ کر یہی لگا کہ سابقہ مجموعے "مصرعِ ثانی" کے بعد وہ پامال نہیں ہوئے۔ ناصر کاظمی اور احمد مشتاق کے علاوہ کوئی بڑا نام غزل میں گذشتہ چالیس پچاس سال سے نہیں ابھرا تھا۔ اور اب شجاع خاور ہمارے ایک بڑے شاعر کے طور پر ابھرے ہیں۔ محمود ہاشمی نے کہا کہ زبان کی سطح پر شجاع کا شعر زمین پر ہوتا ہے اور اسکی فکر آسمان پر۔ ہندی کے نامور شاعر کیدار ناتھ سنگھ نے خود کو اردو شاعری کے مداحوں میں شمار کرتے ہوئے کہا کہ یقیناً اسی لحاظ سے "رشکِ فارسی" کے اجرا کی رسم ادا کرنے کے لیے انھیں دعوت دی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ انھوں نے شجاع خاور کا نام سُن رکھا تھا مگر ان کی شاعری کچھ ہی روز پہلے پڑھی ہے۔ ان کی شاعری میں گہری حسیت اور بہت گہری سوچ ہے۔ ہندی میں شائع انتخاب "بات" کے عنوان کی داد دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ شجاع کی شاعری میں "بات" بولتی ہے۔ اور وہ خود اسکی اوٹ میں کھڑے رہتے ہیں۔ صدرِ جلسہ کلدیپ نائر نے بتایا کہ انھوں نے ایک زمانے میں اردو صحافت کی تھی اور شعر بھی کہے تھے مگر اس وقت حسرت موہانی کو شعر سنائے تو انھوں نے شعر گوئی ترک کرنے کا مشورہ دیا انھوں نے کہا کہ شجاع کو تھوڑا پڑھ کر بھی یہ واضح ہو گیا ہے کہ وہ اپنی سوچ اور انداز کے اعتبار سے ادب میں ایک اکیلے مسافر کی طرح ہیں جو اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ شجاع کی تخلیقی جرأت اور اپنے اندازِ نظر پر یقین کی شدت ہم سب کے لیے ایک مثال ہے۔ شجاع کی شعر گوئی کا آغاز ۱۹۷۱ء میں ہوا۔ ان کے شعری سفر کے تیئسویں سال کے حوالے سے منعقد کیے گئے جلسے کے اختتام پر انھوں نے اپنا کلام سنایا اس کے بعد شجاع کی کچھ غزلیں مشہور گلوکار منظیر علی خاں وجیر بھیت کور نے گائیں۔ جلسے کا انعقاد انڈین گلڈ آف اردو آتھرز اور غزل آباد کلچرل سوسائٹی کے تعاون سے ہوا۔ سامعین میں دہلی کے اردو و ہندی کے ادیب و شعرا اور صحافی کثیر تعداد میں شامل تھے۔ •

نقد ملفوظات

پروفیسر نثار احمد فاروقی

تصوّفِ اسلامی اور ہندوستانی صوفیائے کرام کے حالات و ملفوظات پر چند تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ

قیمت /۶۵ روپے

صوری و معنوی خوبیوں سے مزین

صحت مند روایت و انفرادیت کا حسین امتزاج

حنیف کیفی کا شعری مجموعہ

چراغِ نیم شب

/۴۰

مولانا ابوالکلام آزاد کا

(مکمل عکسی فائل کی اشاعت)

ایڈیٹر: عبدالرزاق ملیح آبادی

تقدیم اول: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

تقدیم ثانی: پروفیسر عبدالقوی دسنوی

قیمت: =/100

فریدؒ و فردِ فریدؒ

ڈاکٹر اسلم فرخی

شیخ کبیر شیخ فرید الدین مسعودؒ اور شیخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کے روحانی سفر کی رُوداد۔

قیمت /۲۷ روپے

محبوب الالباب
فی
تعریف الکتب والکتاب

خدا بخش خاں

اوّلین فہرست توضیحی کتب خانہ خدا بخش

قیمت -/۱۲۵

ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت

منشی رام پرشاد ماتھر

اپنے زمانے کی مقبول ترین کتاب، تمام ہندو تیوہاروں کا دلچسپ اور مختصر ذکر، ہندوؤں اور غیر ہندوؤں کے لیے انتہائی مفید کتاب۔

[illegible]

ہندوؤں کے اوتار

لالہ بال کشن بترہ ابرؔ

بھگوان کے کئی اوتار ہیں لیکن ان میں سے دس مکھیہ ہیں۔ اس کتاب میں انھیں دس اوتاروں کے مستند حالات درج ہیں۔

قیمت -/۲۰ روپے

دیدہ و شنیدہ

(خود نوشت)

سید شہاب الدین دسنوی

ممتاز ادیب اور ماہر تعلیم سید شہاب الدین دسنوی کی یہ خود نوشت صرف ان کی سوانح ہی نہیں ایک دور کی تاریخ بھی ہے۔

قیمت /۳۵ روپے

دیگر اداروں کی مطبوعات

ہندوؤں کے تیوہار — پاکشن بتزہ آبر

اس کتاب میں اہل ہنود کے تمام تیوہار و برت درج ہیں جن سے ہندو قوم کی دھارمک زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔ قیمت /۴۰ روپے

اردو رسائل (۱۹۹۲ء میں)

۱۹۹۲ء میں اردو میں کون کون سے رسالے شائع ہو رہے ہیں اس مجموعے میں ان رسائل کے سرورق کا عکس مع مشملات شائع کر دی گئی ہیں اس سے رسالے کے تیور اور طور سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے قیمت /۱۰۰ روپے

کرنل محبوب احمد

کرنل محبوب، آزاد ہند فوج کے ایسے بہادر نوجوان کا نام ہے جسے ہندستان کی جنگ آزادی میں، نیتاجی سبھاش چندر بوس کی قیادت میں لڑنے کا فخر حاصل رہا۔ آزاد ہندی فوج اور نیتاجی کی معتبر ترین واقعات اس کتاب میں ملیں گے۔ قیمت /۲۵ روپے

پٹنہ کے کتبے — تعبیح الدین بلخی (م ۱۹۶۲ء)

اس کتاب کے اندر جتنے کتبات کی نقلیں پیش کی گئی ہیں ان میں سے بہت سے کتبوں کا اب وجود ہی نہیں رہا۔ تحقیق، جستجو کا اہم کارنامہ۔
قیمت /۵۰ روپے

چند اہم اخبارات و رسائل — قاضی عبدالودود

یہ اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو قاضی صاحب مرحوم نے وقتاً فوقتاً اردو کے بعض اہم رسائل اور اخبار کے بارے میں لکھے۔ قیمت /۳۰ رو

ہندوؤں کے اوتار — لالہ پاکشن بتزہ آ

بھگوان کے کئی اوتار ہیں لیکن ان میں سے دس مکھ ہیں، اس کتاب میں انھیں دس اوتاروں کے حالات درج ہیں۔ قیمت /۲۰ روپے

جامع الشواہد — مولانا ابوالکلام آزاد تقدیم

اس کتاب کی کہانی گنجلک بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۱۹ء میں کتابی رسالہ صورت میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع اس اڈیشن کا ایک نسخہ مولانا آزاد کا اصلاح ہے۔ اس لیے مرتب نے اصل مطبوعہ متن ساتھ اصلاح شدہ متن بھی شائع کر دیا۔
قیمت /۴۰ رو

طلسم ہوشربا

طلسم ہوشربا اصلاً سات بلکہ آٹھ جلدوں مشتمل ہے (جلد ۵ کے دو حصے ہیں) اور دو جلدیں بقیہ طلسم ہوشربا۔ اس طرح کل دس جلدیں ہوتی ہیں۔ خدا بخش لائبریری نے طلسم پر لکھے ہوئے اہم ترین مضامین کا ایک مجموعہ "مقدمہ طلسم ہوشربا" بھی شائع کر دیا ہے طرح طلسم ہوشربا کو پڑھنے اور اس کی خوبیوں کو سمجھنے کے لیے ۱۱ جلدیں ہو جاتی ہیں۔

طلسم ہوشربا اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم اوّل دوم، ششم، ہفتم۔ فی جلد =/۱۰۰ روپے اور مقدمہ طلسم ہوشربا کی قیمت =/۲۰ روپے ہے۔

ملنے کا پتا

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی

رسالہ ہندستانی الہ آباد (۱۹۳۱-۱۹۴۸) سے انتخاب

اردو ادب

اس مجموعے میں ظفر الاحسن لاری، عبدالسلام ندوی، ماب اکبر آبادی، گنپت سہائے سریواستو، رفیق حسین، ملکوت دیال ورما، سید مبارز الدین احمد رفعت، ایشں پرشاد وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔

قیمت /۵۰ روپے

اردو لغت

اس مجموعے میں سید مسعود حسن رضوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، عبدالباری آسی، محمد اجمل خاں، سلیم جعفر، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور نعیم الرحمٰن کے اہم مضامین شامل ہیں۔ قیمت /۱ روپے

چند ادبی مشاہیر کی تحریریں

میر، سرشار، جلال، اقبال، اصغر گونڈوی، محمود شیرانی، ٹیگور، سروجنی نائیڈو پر لکھے ہوئے مضامین ہندی زبان ادیبوں میں سے اکثر کے لکھے ہوئے مضامین اس گلدستے میں شامل ہیں۔ قیمت /۷۰ روپے

اردو ہندی ہندستانی

یہ مجموعہ ہے اظہر علی، سید ابوالقاسم، سید انصاری، محمد اجمل خاں، کرشن پرشاد کول، تارا چند وغیرہ کے اہم ترین مضامین کا۔ قیمت /۴م روپے

ہندی ادبیات

اس مجموعے میں انوار الحسن نیر کاکوری، طاہر حسن علوی، اقبال ورما، سید رشید الحسن، کشتہ قادری اور محمد ضیاء الدین کے مضامین شامل ہیں۔

قیمت /۴ روپے

تاریخ

اس مجموعے میں آغا مہدی حسین، بینی پرشاد، بنارسی پرشاد سکسینہ، سید مقبول احمد صدیقی، محمد تقی احمد، پریاگ دیال، شوکت تھانوی، پروفیسر عبدالباسط، حکیم شمس اللہ قادری، اور ایچ اے آر گب کے مضامین شامل ہیں۔ قیمت /۴۰ روپے

سائنس

اس مجموعے میں شبیر احمد غوری، رفعت حسین صدیقی، صدر الدین ظلیم، امداد حسین خاں، اقبال احمد، محمد امین عباسی، راغب بدایونی، جعفر حسن، احمد ذکی الدین اور پروفیسر منہاج الدین کے اہم ترین مضامین شامل ہیں۔ قیمت /۶۰ روپے

خدا بخش لائبریری "جرنل" اڈیٹر عابد رضا بیدار (۵۰...)

خدا بخش لائبریری کا یہ جرنل نہایت اہم ترین مضامین کا مجموعہ ہے اس میں امیر خسرو پر بھی مضمون ہے اور سکّوں کے اشعار پر بھی۔ مخطوطات شناسی پر بھی اور بابری مسجد اور رام جنم بھومی پر بھی۔ مسلمان اور سائنس پر بھی اور مسٹر جناح پر بھی۔

قیمت /۱۵ روپے

ہندستان اپنے حصار میں ایم جے اکبر

مترجم۔ مسعود الحق

ایم جے اکبر کی معرکۃ الآرا کتاب جس نے انگریزی میں شائع ہوتے ہی ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس کتاب میں ہندستان کی سیاست کے تاریک گوشوں کو اُبھارا گیا ہے۔ ایک اہم دستاویز۔

قیمت /۱۰۰ روپے

دیگر اداروں کی مطبوعات

ادب

اقبال اور مغربی	ڈاکٹر اخلاق اثر	۵۰/-
اقبال اشناقی	ڈاکٹر حاتم رامپوری	۳۰/-
اسرار اقبال	حسین مہدی رضوی	۲۵/-
اصطلاحات جمالیات	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	۲۵/-
اردو اسالیب نثر	ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین	۸۰/-
اوراقِ بصیرت افروز	ڈاکٹر آمنہ خاتون	۱۱/۲۵
اردو نثر کے سرچشمے	امیر حسن نورانی	۲۰/-
احوال و افکار و آثار عماد الملک غازی الدین خاں نظام	ڈاکٹر محمد قمر الدین	۵۰/-
ادبی مطالعے	راج بہادر گوڑ	۱۲/-
اردو شعریات	مرتب پروفیسر آل احمد سرور	۴۰/-
آواز اور آدمی	ڈاکٹر مغنی تبسم	۳۰/-
اسلامی فن تعمیر پر ایک نظر	ڈاکٹر غلام معین الدین	۴/-
اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	فاطمہ پروین	۱۸/-
انشائیے پچیس	جاوید وششٹ	۴/-
اردو ادب اور بنگالی کلچر	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۱۲/-
اردو افسانے کے ابتدائی نقوش	فیاض رفعت	۴۰/-
اردو انشائیہ کا ابلاغ میر ناصر علی	ڈاکٹر آدم شیخ	۲۵/-
اردو انشائیہ سفر ملیں اور رہنما	ڈاکٹر آدم شیخ	۲۵/-
اردوئے قدیم	حکیم سید شمس اللہ قادری	۱۳/-
بھوجپوری ادب کا تعارف	ڈاکٹر فضل امام	۴/-
پاکستانی ادب اور کلچر کا مسئلہ	شاہد ماہلی	۲۵/-
پانچ افسانے اور انشائیہ	شاہ مقبول احمد	۱۰/-
تفتہ اور غالب	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین	۲۵/-
تاو تے چنگ	لاؤتس	۹/-
تعمیر بغداد عہد عباسیہ میں	غلام معین الدین	۲۰/-
جلیل مانکپوری حیات و فن	ڈاکٹر سید اشتیاق ذکی انصاری	۸۰/-
جواہرات انیس سوم	مرزا امیر علی جونپوری	۲۵/-
خطبات آزادی		۱۸/
دیوز رد	اندریئ امیکن	۹/۵۰
ذکر رفتگاں	محمد ایوب واقف	۴۰/-
ریختہ ولی	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۵/-
ریاستِ بھوپال اور اقبال	ماسٹر اختر	۴۵/-
سیر المنازل	ڈاکٹر نعیم احمد	۴۰/-
سخنورانِ غزل	معین الدین حسن کاکوری	۲۵/-
شرح انتخاب نثر اوّل	پروفیسر نظام احمد قریشی	۱۰/-
شمیم کرہانی حیات شخصیت اور شاعری	ڈاکٹر سید خواجہ علی انجم	۴۰/-
شعور و ادراک	محمد ایوب واقف	۸۰/-
عرض ہند	ڈاکٹر محمد حسن	۲۰/-
عرفانِ نظر	ڈاکٹر یوسف سرمست	۱۲/-
عروض مع بیاض	قیصر حیدری دہلوی	۳۰/-
عوامی ذرائع ترسیل	اشفاق محمد خاں	۲۱/-
" "	" "	۸۰/-
غالب نما	سید مرتضیٰ حسین بلگرامی	۲/۵۰
غالب اور بنگال	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۱۰/-
غالب کی دلی	سید ضمیر حسن دہلوی	۱۵/-
فسانۂ عبرت	مرتبہ ذکی کاکوروی	۸/-
فکر پیما	عصمت جاوید	۱۲/-
فن خطاطی اور مخطوطہ شناسی	ڈاکٹر افضل الحق	۱۶/-
قومی یکجہتی اور نصابی کتابیں	اکبر رحمانی	۳۰/-
کاشف الحقائق ایک مطالعہ	ڈاکٹر وہاب اشرفی	۱۶/-
کلام حیدری بحیثیت افسانہ نگار	ڈاکٹر اسلام عشرت	۲۸/-
مقالات محمود	میر محمود حسین ایم۔ اے	۵/-
محمد اقبال	مترجم کبیر احمد جائسی	۱۸/-
میر ضمیر تحقیقی مطالعہ	ڈاکٹر اکبر حیدر کاشمیری	۸/-
مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات	مرزا محمد ہادی رسوا	۳/۵۰

...مہمانی	وحشی محمود آبادی	۱/۷۵
...علی اور نبی کا صدقہ	ڈاکٹر جاوید وششٹ	۲۵/-
...تفکر	شبتر امام	۵۰/-
...بستی میرے لوگ	شبتر امام	۵۰/-
...ن سمپرا ایک شخص اور شاعر	ڈاکٹر خالد سجاد	۴۰/-
...العزیز نظام الدین ممنون	ڈاکٹر انشاد الحسن خاں مشتاق	۲/-
...حسین آزاد کی تنقید نگاری	محمد خالد اقبال صدیقی	۳۰/-
...ہدین امن	ڈی، کے، گردش	۱/۵۰
...امیر	کلام حیدری	۱۲/-
...شاد کانپوری	ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب	۳/-
...ارشادات حمایت	کرنل مرزا حمایت علی بیگ	۳/-
...اشی عرف سپر سیٹھی	سید مرتضیٰ رضوی	۸/-
...دینتی	شکسلا موج	۳۰/-
جوانوں کا گیت	چانگ مو	۱۵/-
...ندستان کدھر	پروفیسر آل احمد سرور	۲/-
...دایام	ضیاء الحسن علوی	۱/۵۰

ناول

...غری زمین	مظہر الزماں خاں	۳۰/-
...زادی	چمن نہل	۴۰/-
...کبھی سویرا ہے	ارشاد امروہوی	۳۲/-
...جنور یادوں کا	انور کریم قدوائی	۲۵/-
...ب دھرتی جاگی اول	سیتا آل شوبوشوف	۶/۷۵
...ہزا و سزا	رمیش چندر شرما	۲۰/-
...ڈ ویر دھان	مترجم سراج رہبر	۱۲/-
...شتے نئے پرانے	مقصود ابراہیم بیکوف	۱۲/۵۰
...زری	زبیدہ سلطانہ	۲۰/-
شیشے کا لہو	شاکر جرول	۲۰/-
شیشہ و سنگ	رونق دکنی سیابی	۶/۵۰
ضبط کی دیوار	سلیم اختر	۹/-
ناظر شیدون کا اول	" "	۱۲/-

فرار کو ترسے	انیس مرزا	۲۰/-
کنگن	عصمت آرا	۱۵/-
کاندید	مترجم سجاد ظہیر	۱۵/-
موت کا کھیل	جیمس ہیڈلی چیز	۱۴/-
منزل	غلام محمد زیدی	۲/-
مسافر	شنکر سروپ بھٹناگر	۱۲/-
محل خانہ	مولوی سید علی سجاد	۳۲/-
نارائن راؤ	اڈیوی باپی راجو	۲۰/-
وہ بات	رفعت نواز	۸/-

شاعری

آتش خاموش	مضطرب نظامی	۵/-
آکاش	راجیندر بہادر موج	۳۰/-
آنگن آنگن	ظفر حبیب	۱۲/-
انتخاب کلام جرأت	ایم حبیب خاں	۸/-
آتیش	نسیم اروی	۲/۵۰
آئینہ غزل	ساجد صدیقی لکھنوی	۶/-
انحراف	یعقوب راہی	۸/-
ارمان نبیؐ	مولوی بشارت علی	۱/۷۵
اثاثہ	سید مہدی حسین واقف	۲۹/-
ایک ہی رنگ لہو کا	شرر فتحپوری	۱۵/-
آواز کی پرچھائیاں	کرشن ادیب	۱۵/-
الہامات مست	دینا ناتھ مست کشمیری	۲۵/-
بکھرے پھول	مرتضیٰ فہیم	۸/-
بحر بیکراں	اختر بستوی	۵/-
برگ سبز	طالب چکوالی	۴/-
برگ سر سبز	نامی انصاری	۱۰/-
باغ تازہ	نقوی مصطفیٰ آبادی	۱۰/-
پرچھائیوں کا جلوس	جگن ناتھ پرساد داس	۱۰/-
تردید	محبوب راہی	۴۰/-
جنگل	صلاح الدین پرویز	۲۵/-

کتاب	مصنف	قیمت
[illegible]	ایاز بگرامی	۴/-
[illegible]	ذکی کاکوروی	۲۵/-
[illegible]	ہیرالال ہیرا	۲۰/-
حرف شوق	محمد منظور احمد	۳/۵۰
[illegible] نم	وحید النساء	۱۵/-
[illegible]ب	ساغر عاشق ہرگانوی	۲۵/-
سورج کی آنکھ	کیف احمد صدیقی	۱۰/-
سرود وقت	محمد فضل الرحمن	۲/-
شہر سراب	انیس انصاری	۱۵/-
صحرا صحرا اجنبی	رؤف خلش	۲۵/-
غبار رنگ	اندر سروپ دت ناداں	۳/-
کائنات روشنی	روشن بنارسی	۲۵/-
گلہائے رنگ رنگ	عطا کاکوی	۴/-
لہو کا لمس	مہر گیرا	۲۰/-
لاشریک	ف، س، اعجاز	۵۰/-
مثنوی خسرو شیریں نظامی	” ” ”	۱۵/-
میلاد اکبر	خواجہ محمد اکبر وارثی	۶/-
ماسوا	ظہیر صدیقی	۱۰/-
موسموں کا وطن	تسنیم فاروقی	۵/-
مرأتِ تعشق	حضرت تعشق	۲/-
مہابھارت کا اردو منظوم	قمر جلال آبادی	۳/-
میں اور تو	مظفر احمد لاری	۲/۵۰
متاع احساس	راز بالاپوری	۲۵/-
نوائے حیات	سیّدہ فرحت	۲۰/-
نور فردا	عتیق احمد عتیق	۳/-
نیلم کے پنکھ	مترجم ڈاکٹر غیاث صدیقی	۷/۵۰
نوائے اردو	معروف شریفی	۵/-
نغمۂ ناقوس	جوہر دیوبندی	۳۰/-
یادوں کے گلاب	سلطان عباسی	۱۰/-
یادوں کی مہک	نسیم بیگم نسیم	۴۰/-

ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

اپنے دل کی حفاظت کیجیے

ڈاکٹر لیفٹیننٹ کرنل کے۔ ایل۔ چوپڑا
ایف۔ آر۔ سی۔ پی

ترجمہ: نذیر الدین مینائی

خدا نہ کرے کسی کو دل کا دورہ پڑے۔ اور پھر کچھ نہیں احتیاطی تدابیر تو کر ہی سکتے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر کے۔ ایل۔ چوپڑا نے دل کا فعل۔ دل کا دورہ۔ قلبی انجو گرافی بائی پاس سرجری سبھی کچھ بیان کر دیا ہے۔ کتاب بالضرور ضرور مطالعہ کیجیے۔

25/=

دوسرا اور پانچواں سرسید یادگاری خطبہ

سرسیّد اور روایت کی تجدید
پروفیسر یونس رضا

سرسیّد اور اردو یونیورسٹی
پروفیسر مسعود حسین خاں

مرتّبہ خواجہ محمد شاہد

سرسیّد یادگاری خطبات کا سلسلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی نے ۱۹۸۰ء میں شروع کیا تھا۔ اب تک چار ممتاز دانشوروں کے خطبات شائع کیے جا چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ قیمت ۱۰/ روپے

حرفِ نیم کش

اردو کے ذہین طنز نگار عظیم اختر کی پہلی پیشکش جس میں ہمارے معاشرے کے ایسے کرداروں کو ہدفِ طنز بنایا ہے، جو بگلا بھگت بن کر اجلی قبا میں کالے کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ عصرِ رواں کی ادبی دستاویز۔ قیمت ۲۵ روپے

آج سے ۷۰ سال پہلے مکتبہ جامعہ ایک معمولی دکان کی حیثیت سے قائم کیا گیا تھا لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ آج یہ اردو کا ایک بڑا اشاعتی مرکز ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس ۷۰ سال کے طویل عرصے میں مکتبے نے دنیا کے سرد و گرم کا مقابلہ کیا اور ہر عہد اور ہر دَور میں ادب کی شمع کو نہ صرف فروزاں رکھا بلکہ اس کو مشعلِ راہ بھی بنایا۔ اُردو زبان کی خدمت اور ملک کو آنے والی ضرورتوں کے مطابق بنانے کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند قومی احساس کی بیداری ہمارا نصب العین رہا ہے اور ہمیں اس منزل تک پہنچنے کے لیے دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ہم نے اب تک پانچ ہزار سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں جو ہر طبقے میں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

آج جب کہ قلمی اور ادبی کاموں کی راہ میں دشواریاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ مکتبے نے ایک نئی قوت اور تازہ عزم کے ساتھ کام شروع کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جس طرح پہلے بھی ہم نے مشکلات کا صرف سامنا ہی نہیں کیا بلکہ ان کے درمیان راہیں ڈھونڈ نکالیں۔ اسی طرح آج بھی ان چٹانوں پر تیشہ زنی کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے اور پہلے کی طرح ہمارا ہاتھ بٹائیں گے

جنوری ۱۹۹۲ء

یادداشت

* براہ کرم خط وکتابت کرتے وقت اپنا نام اور پتا صاف صاف تحریر فرمایے۔
* ڈاک خانے اور مقام کا نام انگریزی میں لکھ سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔
* اپنے آرڈر کے ساتھ کم از کم چوتھائی رقم پیشگی ضرور بھجوایے۔ آرڈر کی تعمیل کرتے وقت یہ رقم بل میں سے کم کر دی جائے گی۔
* اس مختصر فہرست کتب میں اگر آپ کی مطلوبہ کتاب موجود نہ ہو تب بھی براہ کرم آپ ہمیں خط ضرور بھیجیے۔ ہم مطلوبہ کتاب فراہم کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔
* مصارف ڈاک وریل وغیرہ حسب قاعدہ خریدار کو ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنی سہولت کے پیش نظر آرڈر میں اس کی وضاحت ضرور کر دیجیے کہ کتابیں ڈاک سے بھیجی جائیں یا ریل سے۔
* کتابیں بذریعہ سواری گاڑی منگوانے کی صورت میں قریبی ریلوے اسٹیشن کا نام ضرور لکھ دیجیے۔
* کاغذ کی گرانی کی وجہ سے تقریباً ہر ادارے نے اپنی کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے اس لیے آرڈر کی تعمیل کے وقت وہی قیمت چارج کی جائے گی جو اس وقت مقرر ہو گی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے دفاتر

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025
ٹیلی فون 630191

شاخیں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006
ٹیلی فون 3260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی 400003
ٹیلی فون 3763857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یونی ورسٹی مارکیٹ۔
علی گڑھ 202002

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نزدیک ڈاک خانہ جامعہ نگر
نئی دہلی 110025

مطبع

لبرٹی آرٹ پریس، ۱۵۲۸ پٹودی ہاؤس
دریا گنج نئی دہلی 110002
ٹیلی فون نمبر 3276018

لبرٹی آرٹ پریس دپروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج نئی دلی 110002 میں چھپوا کر شائع کیا

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی اہم کتابیں

انداز گفتگو کیا ہے

شمس الرحمٰن فاروقی

س کتاب میں شامل اکثر مضامین گفتگو کا موضوع رہے
یں اور اسی بنا پر ان کے ذریعے کچھ پرانے
سائل پر نئی گفتگو کا آغاز ہوا۔ اس کے تمام مضامین
یں شاعروں اور شاعری کو ہی معرض بحث میں
لایا گیا ہے۔

ایک نہایت اہم مضامین کا مجموعہ

قیمت -/۷۵ روپے

دستک اس دروازے پر

وزیر آغا

اس کتاب میں موجودیت کا فلسفہ ہے اور اس
سلسلے میں مغرب کے فلسفے، تصوّف، اردو
ادب کی مختلف تحریکوں کا بیان ہے۔ عارفانہ
تجربے اور تخلیقی تجربے کا یہ فرق ہی اس کتاب
کا موضوع ہے۔

قیمت =/۱۵ روپے

آزمائش کی گھڑی

سیّد حامد

بابری مسجد کیا ٹوٹی، مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے۔
مسجد تو اب جڑ نہیں سکتی کہ ظالموں نے اُسے زمین
بوس کر دیا لیکن دل تو جوڑے جا سکتے ہیں، حوصلے کو تو
بحال کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت یہی کام کرنے
کا ہے۔ حوصلہ پست ہو گیا تو بچا کیا۔ آج کے
حالات پر ممتاز دانشور سیّد حامد کے عالمانہ
مضامین کا مجموعہ۔

قیمت -/۴۵ روپے

جھینی جھینی بینی چدریا

عبدالبسم اللہ

مترجم۔ وسیم حیدر ہاشمی

سویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور کیڈیا ایوارڈ یافتہ یہ
ناول بنارس کے انصار بھائیوں کی تہذیب و تمدّن
کی ایک روشن تصویر ہے۔ جس کو ناول نگار نے
دس سال بنکروں کے بیچ رہ کر انھی کی زبان اور
کلچر پر قلم بند کیا ہے۔

قیمت -/۷۵ روپے

صحرانورد کے خطوط

مرزا ادیب

صحرانورد کے خطوط، آج سے کم و بیش تیس برس
پہلے شائع ہوئی تھی۔ اب تک اس کے بارہ اڈیشن
شائع ہو چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کے کسی
افسانوی مجموعے کو اس قدر مقبولیت حاصل نہیں
ہوئی جتنی صحرانورد کے خطوط کو۔

قیمت -/۷۵ روپے

میں سمندر ہوں

(شعری مجموعہ)

فرحان سالم

شعری مجموعوں کی بھیڑ میں، سب سے الگ،

منفرد اور اردو کے تاروں کو چھیڑنے والا شعری مجموعہ
قیمت -/۳۰ روپے

اسرار خودی
(فراموش شدہ اڈیشن)

ترتیب - شائستہ خاں

علامہ اقبال کی "اسرار خودی" کے پہلے اڈیشن میں چند اشعار بطریق انتساب درج تھے جو دوسرے اڈیشن میں حذف کر دیے گئے۔ دوسرے اڈیشن میں گیارہ اشعار پیشکش سے نکال کر تمہید میں منتقل کر دیے گئے۔ کون سے اشعار حذف کیے اور وہ کہاں گئے؟ اور وہ اشعار کون سے تھے؟ یہ آپ کو اس کتاب کے عکسی اڈیشن سے معلوم ہوگا۔

قیمت -/۷۵ روپے

مسلمانوں کا تعلیمی نظام

ضیاء الحسن فاروقی

اس کتاب میں "مسلمانوں کے تعلیمی نظام سے متعلق چار اہم مضامین ہیں جس میں قیام مدارس کی تحریک، بغداد کا مدرسہ نظامیہ اور مسلمانوں کا نظام تعلیمی (عہد وسطیٰ کے ہندستان میں) خاصی معلومات فراہم کرتے ہیں۔

قیمت -/۴۵ روپے

جامِ جہاں نما
اردو صحافت کی ابتداء

گربچن چندن

ہندستان میں اردو صحافت کے آغاز کے بارے میں نئی دریافتوں کی حامل یہ کتاب پہلی بار ان حقائق کو پیش کرتی ہے جو اب تک نیشنل آرکائیوز آف انڈیا اور برٹش لائبریری کے شعبے مشرقی میں مستور تھے۔ مصنف نے اوریجنل ریکارڈ کے مشاہدے کے بعد مسلّمہ نظریات کا بیباک جائزہ لیا ہے اور اردو کے اس اوّلین مطبوعہ اخبار کے حقیقی موقف، کردار اور مرتبے کی صراحت کی ہے۔ مزید اس حصّے کی نشاندہی کی ہے جو ۱۹ ویں صدی میں ہندستانی اردو صحافت کی پیش رفت میں جامِ جہاں نما نے ڈالا۔

قیمت -/۷۵ روپے

حموربی اور بابلی تہذیب و تمدّن

مالک رام

دنیا کے علم و فن، آئین و قوانین، حکومت کے نظم و نسق، مذہب، معاشرت، غرض زندگی کے ہر شعبے کی تشکیل و ترقی اور ترویج میں بابل کا جو مقام رہا ہے اس کی تفصیل آپ کو اس کتاب میں ملے گی۔ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی اہم ترین دستاویز۔

قیمت -/۷۵ روپے

اپنے دل کی حفاظت کیجیے

ڈاکٹر لیفٹیننٹ کرنل کے۔ ایل۔ چوپڑا
ایف۔ آر۔ سی۔ پی

ترجمہ: نذیرالدین مینائی

خدا نہ کرے کسی کو دل کا دورہ پڑے۔ اور کچھ نہیں احتیاطی تدابیر تو کر ہی سکتے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر کے۔ ایل۔ چوپڑا نے دل کا فعل دل کا دورہ۔ قلبی انجو گرافی بائی پاس سرجری سبھی کچھ بیان کر دیا ہے۔ کتاب باتصویر ہے ضرور مطالعہ کیجیے۔

قیمت -/۲۵ روپے

شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان

تالیف: مولانا حکیم محمود احمد برکاتی

اس کتاب میں برکاتی صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہ رح اور ان کے خاندان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ نیز ان کی تصانیف، تلامذہ، مریدین شاہ ولی اللہ کا تعارف بھی ہے۔

قیمت -/۴۵ روپے

تذکرہ ماہ و سال

مالک رام

اس مجموعے میں اردو کے بیشتر ادیب، شاعر، نقاد، کالم نگار، صحافی اور دوسرے اہم عمائد (جنھوں نے اردو ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے) کی تاریخ ولادت اور جو ہماری بدقسمتی سے انتقال کر چکے ہیں ان میں سے اکثر کی تاریخ وفات بھی درج ہے۔ کسی بھی اہم ادیب پر مضمون لکھتے وقت اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

افکار اقبال

محمد عبدالسلام خاں

اس اہم کتاب میں علامہ اقبال کے حالات زندگی، ان کے اردو اور فارسی کلام پر سیر حاصل بحث، ان کے مذہبی اور سیاسی افکار، اور کچھ ایسے اہم واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جو اب تک اندھیرے میں تھے۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

تحقیق نامہ

مشفق خواجہ

مشفق خواجہ اردو کے وہ واحد محقق ہیں جو ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی اہمیت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی خلا کو پُر کرتے ہوں۔ زیر نظر مجموعہ میں ایسے ہی اہم ترین مضامین شامل ہیں۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

مرضیات

حکیم نعیم الدین زبیری

بیماریوں کے اصولی اسباب اور ان کی وجہ سے افعال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعے یعنی ماہیت الامراض (پیتھالوجی) پر جامع اور آسان بحث۔ طلبہ کے علاوہ اطبا کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔

قیمت -/۵۱ روپے

تاثر نہ کہ تنقید

صدیق الرحمٰن قدوائی

تنقید، ادب کی ایک اہم شاخ ہے مگر اس کا ضرورت سے زیادہ چرچا بھی اچھا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص "نقاد" ہو جائے۔ ادب کو تنقید کے سوا بھی مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے جن کا انحصار پڑھنے والوں کے انفرادی مزاجوں پر ہے۔ یہ تصنیف ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔

قیمت -/۵۱ روپے

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے

(عہد حاضر کے ۱۹ اہم ادیبوں کے انٹرویو)

طاہر مسعود

قیمت -/۶۶ رو۔

گوشے میں قفس کے
(طنزیہ ومزاحیہ مضامین)

دلیپ سنگھ

دلیپ سنگھ کا نام اب طنزیہ مزاحیہ ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ "گوشے میں قفس کے" آپ کے طنزیہ مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ دلچسپ انسان کے نہایت دلچسپ مضامین کا مجموعہ

قیمت -/۴۵ روپے

ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (ناول)
کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کا بھوپال گیس ٹریجڈی کے موضوع پر نیا ناول۔ انسانی رشتوں کے بننے، استوار ہونے اور ٹوٹنے کی دردانگیز داستان، جو ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔

قیمت -/۴۰ روپے

سحر کے پہلے اور بعد
میرزا سعید الظفر چغتائی

یہ ایک قصبے کی سماجی اور سیاسی تناظر میں لکھی ہوئی کہانی ہے جس میں مصنف کے بچپن کی گلیاں سعدی کے گلستاں کی طرح حسین و نوجوان نظر آ رہی ہیں۔ دلچسپ جگ بیتی۔

قیمت -/۵۱ روپے

تحریریں
اسلم پرویز

اردو کے جانے مانے ادیب اور نقاد ڈاکٹر اسلم پرویز کے اہم مضامین کا تازہ ترین مجموعہ۔

قیمت -/۵۱ روپے

سفر (ناول) رابعہ تبسم

رابعہ تبسم کا ایک اچھوتا رومانی ناول۔ روزانہ زندگی میں پیش آنے والی خوشیوں اور غموں کا سنگم۔ یہ انتہائی رنگین بھی ہے اور سنگین بھی۔

قیمت -/۲۷ روپے

خواب اور خلش (شعری مجموعہ)
آل احمد سرور

شاعری ذات سے کائنات تک کا سفر ہے یہ خوابوں کے ذریعے حقائق کی توسیع کا نام ہے۔ بڑی شاعری تجربے سے مدد لیتی ہے مگر وہ روایت اور تجربے میں ایک توازن رکھتی ہے۔ آل احمد سرور کی شاعری صرف الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ اس میں معانی کا ایک سمندر ہے جس کی تہہ میں پہنچ کر ہی موتی نکالے جا سکتے ہیں۔

قیمت -/۶۶ روپے

اقبال کے اردو کلام کے مجموعے

بانگِ درا قیمت -/۹ روپے

بالِ جبریل قیمت -/۶ روپے

ضربِ کلیم مع ارمغان حجاز (اردو نظمیں) قیمت -/۶ روپے

اردو کے طلبہ کے لیے سستی کتابوں کا نیا سلسلہ

غبارِ منزل (شعری مجموعہ) غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں نظموں اور قطعات کا تازہ مجموعہ جس میں "سازِ لرزاں"، "ذوقِ سفر" اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شامل ہے۔

قیمت -/۴۵ روپے

پیامی قواعد اُردو

قواعد جیسے خشک مضمون کو سمجھنے، سمجھانے اور برتنے کے لیے نہایت آسان زبان میں ترتیب دی ہوئی یہ قواعد اساتذہ اور طلبہ کے لیے نہایت مفید ہے۔

قیمت ۵/- روپے طلبہ اڈیشن ۲/۵۰

فریدؒ و فردِ فریدؒ

ڈاکٹر اسلم فرخی

شیخ کبیر شیخ فرید الدین مسعودؒ اور شیخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے روحانی سفر کی رُوداد۔

قیمت ۲۷/- روپے

پہچان اور پرکھ

پروفیسر آل احمد سرور

اس مجموعے میں پروفیسر آل احمد سرور کے جو مضامین شامل ہیں ان کا تعلق زیادہ تر شاعروں اور شاعری کی خصوصیات سے ہے میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، حسرتؔ، فانیؔ، جوشؔ، اور فراقؔ کی شخصیات اور شاعری پر بھرپور مضامین کا اہم مجموعہ

قیمت ۵۱/- روپے

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم

ڈاکٹر سلامت اللہ

اس کتاب میں مسلمانوں کی تعلیم کے جن مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے وہ مصنف کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے اس کے تاریخی اور حالیہ شواہد موجود ہیں۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ کی اہم ترین تصنیف۔

قیمت ۵۱/- روپے

اقبال کا نظریۂ خودی

عبدالمغنی

اس کتاب میں نظریۂ خودی کو مرکزی نقطہ فرض کر کے اقبال کے پورے نظامِ فکر کی تلاش کی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی شاعری کی حقیقی جہت واضح ہو اور دوسری طرف آج کی انسانیت کو اپنے ارتقا کی صحیح سمت دریافت کرنے میں سہولت ہو۔

قیمت ۱۵۰/- روپے

پت جھڑ کی آواز

قرۃ العین حیدر

برصغیر کی ممتاز ترین افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کی اہم کہانیوں کا مجموعہ۔ یہ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور زندگی کی صحیح عکاسی بھی کرتی ہیں۔

نیا اڈیشن قیمت ۷۵/- روپے

جدید افسانہ اور اس کے مسائل

وارث علوی

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔

قیمت ۳۶/- روپے

قلندر بخش جرأت (خطبہ)

جمیل جالبی

اردو کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک نہایت اہم خطبہ جو موصوف نے ۸/ نومبر ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے سمینار میں پیش کیا تھا۔

قیمت ۱۰/- روپے

کتاب نما کے چند خصوصی شمارے

علی سردار جعفری

(شخصیت اور ادبی خدمات)

ترتیب ـــــ رفیعہ شبنم عابدی

سردار جعفری کی شخصیت میں بیک وقت کئی شخصیتیں سانس لے رہی ہیں۔ وہ کون سا میدان ہے جہاں سردار جعفری اپنے فکر و نظر کی جولانیاں دکھاتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ صحافت ہو یا ادب، فلم ہو یا ٹی وی ریڈیو ہو یا اسٹیج، خطابت ہو یا شاعری! ان کی مکمل شخصیت کا بھرپور جائزہ۔

قیمت ۴۵/- روپے

پروفیسر مسعود حسین خاں

(علمی، لسانی اور ادبی خدمات)

مرتبہ ـــــ ایم حبیب خاں

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں اردو کے ممتاز ادیب، ماہر لسانیات اور محقق جناب مسعود حسین خاں کی خدمات کے اعتراف میں اردو کے ۱۲ ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا مجموعہ۔

قیمت ۴۵/- روپے

خواجہ احمد فاروقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ـــــ ڈاکٹر خلیق انجم

اردو کے نامور ادیب، ممتاز نقاد، انتظامی امور کے ماہر، سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی (جن کے عہد میں شعبۂ اردو، اپنے کارہائے نمایاں کے لیے پورے ہندستان میں مشہور تھا) کی علمی، ادبی خدمات کا اعتراف نہ صرف ان کے شاگردوں نے بلکہ ممتاز ادیبوں نے بھی کیا ہے۔

قیمت ۴۵/- روپے

عابد علی خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ـــــ مجتبیٰ حسین

عابد علی خاں مرحوم ایک انجمن کا نام ہی نہیں ایک تحریک کا نام بھی تھا۔ اس خصوصی شمارے میں ملک کے ممتاز ادیبوں نے مرحوم کی علمی، ادبی، سماجی اور صحافتی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔

قیمت ۴۵/- روپے

ڈاکٹر اجمل اجملی

(حیات اور ادبی خدمات)

مرتبین ـــــ ڈاکٹر علی احمد فاطمی، رضا انور

اردو، ہندی کے ممتاز ادیبوں کی اہم نگارشات کا مجموعہ، جس میں ڈاکٹر اجمل اجملی کی ادبی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ہے۔

قیمت ۴۵/- روپے

پروفیسر آل احمد سرور

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتب ـــــ ڈاکٹر خلیق انجم

پروفیسر آل احمد سرور، اردو کے ایک مشفق اور مقتدر استاد بھی ہیں اور صاحب طرز انشا پرداز بھی۔ ادب کے اعلا نقاد بھی ہیں اور زبان کے نباض بھی۔

قیمت ۴۵/- روپے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ________ خلیق انجم

فرمان فتح پوری کا خاکہ جن رنگوں سے بنا ہے وہ طرح دار، دلکش، دلربا، تابناک اور پایدار ہیں۔ کتاب نما نے اس خصوصی شمارے میں انھیں رنگوں کی جھلک پیش کی ہے۔ اردو کے بلند پایہ ادیب، نقاد، مدیر کی خدمت میں اردو کے ممتاز ادیبوں کا خراج عقیدت۔

قیمت -/۲۵ روپے

اختر سعید خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ________ ڈاکٹر سید حامد حسین

اختر سعید خاں نے جہاں غزل کی روایت کا احترام سیکھا وہیں شعر کے تخلیقی منصب کی پاسداری بھی سیکھی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انھیں زندگی کا ایک واضح شعور بخشا۔ اردو کے ممتاز غزل گو شاعر کی شخصیت اور فن پر ایک اہم شمارہ۔

قیمت -/۵۱ روپے

خلیق انجم

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ایم حبیب خاں

ڈاکٹر خلیق انجم کی شخصیت، ادبی اور لسانی خدمات پر اردو کے ممتاز نقادوں اور ادیبوں کے مضامین کا مجموعہ۔

حضرت مولانا مفتی حفیظ الرحمن واصف

دہلوی کی کتابیں

کفایت المفتی:۔ مفتی اعظم مولانا کفایت اللہؒ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو مولانا واصفؒ نے جمع کر کے مرتب و مبوّب فرمایا۔ نو جلدوں میں مکمل۔ جلد اوّل -/۷۱ روپے۔ دوم -/۶۰ روپے سوم -/۶۳ روپے۔ پنجم -/۵۸ روپے۔ ششم -/۵۸ روپے۔ ہفتم -/۵۴ روپے۔ ہشتم -/۶۳ روپے۔ جلد چہارم و نہم کے نئے اڈیشن طبع ہونے ہیں۔

اردو مصدر نامہ۔ قیمت -/۴۵ روپے

ادبی بھول بھلیاں۔ اردو زبان کے قواعد و املا قیمت -/۲۴ روپے

زرِ گل۔ نظموں کا مجموعہ۔ قیمت -/۲۱ روپے

تذکرہ سائل۔ نواب سائل دہلوی کے حالات اور نمونۂ کلام۔ قیمت -/۲۱ روپے

سہ لسانی مصدر نامہ۔ اردو مصادر کا فارسی اور عربی ترجمہ۔ قیمت ۵۰/۴ روپے

جونک

(افسانے)

پروانہ صاحب صحافی بھی ہیں اور طنز و مزاح نگار بھی، خاکہ نگار بھی اور افسانہ نگار بھی۔ زیر نظر کتاب آپ کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔

مطبوعاتِ مکتبہ جامعہ ایک نظر میں

ادب، تنقید، انشاء

کتاب	مصنف	قیمت
حمورابی اور بابلی تہذیب وتمدن	مالک رام	۷۵/-
جامِ جہاں نما	گربچن چندن	۷۵/-
اردو ناول میں عورت کا تصور	فہمیدہ کبیر	۴۵/-
اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن)	شائستہ کبیر	۷۵/-
تاثر نہ کہ تنقید	صدیق الرحمٰن قدوائی	۵۱/-
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے	طاہر مسعود	۶۶/-
تحریریں	ڈاکٹر اسلم پرویز	۵۱/-
انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا	۳۵/-
افکارِ اقبال	عبدالسلام خاں	۱۲۵/-
تذکرۂ ماہ وسال	مالک رام	۱۲۵/-
تحقیق نامہ	مشفق خواجہ	۱۲۵/-
سحر کے پہلے اور بعد	سعید الظفر چغتائی	۵۱/-
پہچان اور پرکھ	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/-
اقبال کا نظریہ خودی	عبدالمغنی	۱۵۰/-
قلندر بخش جرأت	جمیل جالبی	۱۰/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	وارث علوی	۳۶/-
تاریخِ اودھ	قاسم علی نیشاپوری	۲۷/-
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	ظ انصاری	۳۲/-
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۶۰/-
کچھ مولانا آزاد کے بارے میں	مالک رام	۵۱/۰۰
لسان الصدق	مولانا ابوالکلام آزاد	۶۵/۰۰
اردو میں کلاسیکی تنقید	پروفیسر عنوان چشتی	۴۸/-
تفہیم وتنقید	پروفیسر حامدی کاشمیری	۴۸/-
نذرِ مختار	مرتبہ: مالک رام	۱۰۱/-
تحقیقی مضامین	مالک رام	۶۰/-
خسرو نامہ	مجیب رضوی	۲۱/-

کتاب	مصنف	قیمت
نغمۃ السرور	مرتبہ: شمس الرحمٰن فاروقی	۷۵/-
جائزے	مرتبہ: مظفر حنفی	۴۵/-
نقدِ بجنوری	صدیقہ بیگم	۲۵/-
ادبی سماجیات	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/-
الفاظ کا مزاج	غلام ربانی	۲۳/-
تقریر وتعبیر	محمد ہدایت اللہ	۱۵/-
اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	زیرِ طبع
افسانہ کی حمایت میں	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۷/۵۰
علامتوں کا زوال	انتظار حسین	۳۶/-
تذکرۂ معاصرین دوم	مرتبہ: مالک رام	۱۴/-
" سوم	"	۲۲/-
" چہارم	"	۴۰/-
لغت نویسی کے مسائل	مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ	۳۵/-
معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	۳۰/-
اردو کی تہذیبی معنویت	پروفیسر علی محمد خسرو	۶/-
تحلیلِ نفسی کے پیچ وخم	ڈاکٹر سلامت اللہ	۳۵/-
اثبات ونفی	شمس الرحمٰن فاروقی	۴۰/-
نقدِ حرف	پروفیسر ممتاز حسین	۴۸/-
اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۳۵/-
انشائیات	ڈاکٹر عابد حسین	زیرِ طبع
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	۱۲/-
فکر وریاض	علی جواد زیدی	۱۲/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	۱۱/-
کچھ نثر میں بھی	آنند نارائن مُلّا	۱۶/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ: عبداللطیف اعظمی	۱۲/-
حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۷/۵۰
مسالک ومنازل	ضیاء احمد بدایونی	۲۲/-
قدیم دلی کالج	مرتبہ: مالک رام	۴/۵۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۱۶/-
کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	۲۴/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	۵/۵۰

جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — ۴/-
نظر اور نظریے — آل احمد سرور — ۲۴/-
تنقید کیا ہے۔ — 〃 — ۲۷/-
باتیں کچھ سُریلی سی — داؤد رہبر — ۳۶/-
اردو اسپیز — مرتبہ: سید ظہیر الدین مدنی — ۲۷/-
روحِ تہذیب — خواجہ غلام السیدین — ۴/۵۰
نئی شعری روایت — پروفیسر شمیم حنفی — (زیرِ طبع)
دراسات — ڈاکٹر نثار احمد فاروقی — ۱۵/-
دبستانِ آتش — شاہ عبدالسلام — ۱۶/-

تعلیم

مسلمانوں کا تعلیمی نظام — ضیاء الحسن فاروقی — ۴۵/-
ہندستانی مسلمانوں کی تعلیم — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۵/-
مشقی تدریس، کیوں اور کیسے — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۴۵/-
معاشیات کے اصول — عزیز احمد قاسمی — ۲۱/-
آسان اردو ورک بک — شکیل اختر فاروقی — ۲۴/-
تعلیم و تربیت اور والدین — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۵۱/-
تعلیم اور رہنمائی — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۳۵/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں — معین الدین — ۶۴/-
تعلیم اور اس کے وسائل۔ — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۳۶/-
آسان اردو (ہندی کے ذریعے) — شکیل اختر فاروقی — ۱۲/-
تعلیم، نظریہ اور عمل۔ — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۳۶/-
تعلیم، فلسفہ اور سماج۔ — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۲۷/-
بنیادی استاد کے لیے۔ — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۱۲/-
ہم کیسے پڑھائیں۔ — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۳۳/-
تعلیمی خطبات۔ — ڈاکٹر ذاکر حسین — ۳۶/-
سرسید کی تعلیمی تحریک۔ — اختر الواسع — ۲۵/-
اردو کیسے لکھیں — رشید حسن خاں — ۱۰/۵۰
بچوں کا آرٹ — عبید الحق — ۲۴/-

تذکرہ، سوانح، شخصیتیں

اپنی ہواؤں کی خوشبو — کشمیری لال ذاکر — ۳۰/-
دلّی کی چند عجیب ہستیاں — اشرف صبوحی — ۵۱/-
چند تصویرِ بتاں — مولانا عبدالسلام قدوائی — ۴۵/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب — پروفیسر آل احمد سرور — ۸/-
صاحب جی، سلطان جی — ڈاکٹر اسلم فرخی — ۲۰/-
ہندستانی مسلمان آئینہ ایام میں — ڈاکٹر عابد حسین — ۷۵/-
شہیدِ جستجو۔ — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — ۷۵/-
مولانا آزاد کی کہانی۔ — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی — ۱۸/-
نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیاؒ) — ڈاکٹر اسلم فرخی — ۱۵/-
حیاتِ جامیؒ۔ — مولانا اسلم جیراجپوری — ۱۲/-
نقشِ ذاکر۔ — مرتبہ عبدالحق خاں — ۵۱/-
مالک رام ایک مطالعہ۔ — مرتبہ علی جواد زیدی — ۵۰/-
مشفق خواجہ ایک مطالعہ۔ — مرتبہ خلیق انجم — ۳۰/-
عبداللطیف اعظمی حیات و خدمات۔ — مرتبہ انور صدیقی — ۱۸/-
یادوں کا اجالا بھگوان سنگھ۔ — مترجم شمیم حنفی — ۴۰/-
مجیب صاحب احوال و افکار — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — ۹۰/-
حیاتِ عابد (خود نوشت ڈاکٹر عابد حسین) — ڈاکٹر صغریٰ مہدی۔ — ۴۵/-
سلسلۂ روز و شب (خود نوشت) — صالحہ عابد حسین — ۶۵/-
وجد شاعر اور شخص۔ — مرتبہ یوسف ناظم — ۲۵/-
غبارِ کارواں۔ — بیگم انیس قدوائی — ۲۷/-
فراق شخص و شاعر۔ — مرتبہ شمیم حنفی — (زیرِ طبع)
حیاتِ حافظ۔ — اسلم جیراجپوری — ۱۵/-
افکارِ رومی۔ — مولانا عبدالسلام خاں — ۴۰/-
بزمِ رفتگاں — صباح الدین عبدالرحمٰن — (زیرِ طبع)
امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری۔ — پروفیسر ممتاز حسین — (زیرِ طبع)

مکالماتِ افلاطون۔ مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین ۲۶/-
غلام ربانی تاباں، حیات اور شاعری۔ شفیق النساء بیگم ۱۰/-
اب جن کے دیکھنے کو۔ بیگم انیس قدوائی ۱۲/۵۰
پریم چند۔ ہنس راج رہبر (زیر طبع)
شاد عارفی شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر مظفر حنفی ۲۴/-
حیاتِ اسماعیل، حیات و خدمات ڈاکٹر سیفی پریمی ۱۸/-
مفتی صدر الدین آزردہ۔ عبدالرحمن پرواز اصلاحی ۱۲/-
میر انیس سے تعارف۔ صالحہ عابد حسین ۷/-
ہمارے ذاکر صاحب۔ رشید احمد صدیقی ۲۵/-
اشخاص و افکار۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۷/۵۰
میر انیس۔ سفارش حسین رضوی ۴/-
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت۔ مرتبہ عبداللطیف اعظمی ۹/۵۰
حسرت کی شاعری۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۷/۵۰
گنجہائے گرانمایہ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ۳۲/-
کیا خوب آدمی تھا۔ مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۲/-
قدسیہ زیدی۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۲۵/-
انشار۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۴/-
ذاکر صاحب اپنے لفظ و معنی میں۔ مرتبہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۴۹
روسی ادب اوّل، دوم پروفیسر محمد مجیب ۶۰/-

طنزیات، مزاحیات

طنزیات و مضحکات۔ رشید احمد صدیقی ۹/-
گوشے میں قفس کے دلیپ سنگھ ۴۵/-
فی الحقیقت یوسف ناظم ۲۵/-
فی الفور۔ یوسف ناظم ۳۰/-
گول مال۔ شفیقہ فرحت ۱۸/-
فی الحال۔ یوسف ناظم ۱۸/-
رانگ نمبر۔ شفیقہ فرحت ۱۶/-
بالکلیات۔ یوسف ناظم ۱۸/-
برکت ایک چھینک کی۔ وجاہت علی سندیلوی ۱۵/-
ذکر خیر۔ یوسف ناظم ۲۱/-
بے پر کی۔ حسرت آوارہ ۱۰/-
خنداں۔ رشید احمد صدیقی ۳۶/-
شگوفہ زار۔ خواجہ عبدالغفور ۱۴/-
دیوارِ قہقہہ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا ۱۵/-
آشفتہ بیانی میری۔ رشید احمد صدیقی ۱۵/-

طب۔ ایلوپیتھی

مرضیات حکیم نعیم الدین زبیری ۵۱/-
اپنے دل کی حفاظت کیجیے۔ ترجمہ۔ نذیر الدین مینائی ۲۵/-
ذیابیطس۔ ڈاکٹر محمد شعیب اختر ۱۰/-

سفرنامے، رپورتاژ

کولمبس کے دیس میں۔ جگن ناتھ آزاد ۴۵/-
پشکن کے دیس میں۔ جگن ناتھ آزاد ۲۵/-
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز۔ بیگم صالحہ عابد حسین ۱۸/-
باتیں لاہور کی۔ سوم آنند ۱۶/-
رہ نوردِ شوق۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۴/۵۰
یادوں کے سائے عتیق صدیقی ۱۲/-

شعری مجموعے

اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن) شائستہ خاں ۷/۵۰
بانگِ درا اقبال ۹/-

بالِ جبریل اقبال ۶/-
ضربِ کلیم مع ارمغانِ حجاز " ۶/-
خواب اور خلش آل احمد سرور ۲۲/-
غبارِ منزل غلام ربانی تاباں ۲۵/-
انیس ۳۳ غیر مطبوعہ مرثیے ۹۰/-
پرانی بات ہے۔ زبیر رضوی ۳۰/-
سازِ سخن۔ ادا جعفری ۴۵/-
غزل نما (غزلیات کا انتخاب) مرتبہ ادا جعفری ۷۵/-
دائروں میں پھیلی لکیر۔ کشور ناہید ۳۰/-
آنکھ میں سمندر۔ زاہد ڈار ۲۰/-
آنکھ اور خواب کے درمیان۔ ندا فاضلی ۲۱/-
رات کے مسافر۔ مرتبہ انور سجاد ۲۸/-
گدازِ شب۔ معین احسن جذبی ۴۰/-
ایک خواب اور۔ علی سردار جعفری ۴۰/-
حرف حرف روشنی۔ حمایت علی شاعر ۳۵/-
لفظوں کا آسمان (اڑیا نظمیں) مترجم کرامت علی کرامت ۲۰/-
دو ہے۔ جمیل الدین عالی ۱۲/-
کلیاتِ عرش ملسیانی مرتبہ مالک رام ۷۵/-
رادار۔ ساقی فاروقی ۲۰/-
پتھر کی زبان۔ فہمیدہ ریاض ۱۵/-
شام کا پہلا تارا۔ زہرا نگاہ ۲۱/-
مثنوی نہ سپہر۔ (امیر خسرو) مترجم محمد رفیق عابد زاہدی ۲۸/-
لہو پکارتا ہے۔ علی سردار جعفری (زیرِ طبع)
شامِ شہرِ یاراں۔ فیض احمد فیض مجلد ۱۰/- ۶/-
جستہ جستہ۔ خورشید الاسلام ۱۸/-
گل افشانیٔ گفتار۔ نشور واحدی ۵/-
کربِ آگہی۔ آنند نرائن ملا ۱۰/۵۰
نوائے آوارہ۔ غلام ربانی تاباں ۸/۵۰
اردو گیت۔ ڈاکٹر قیصر جہاں (زیرِ طبع)
پچھلے پہر۔ جاں نثار اختر ۱۵/-
انتخابِ حالی (نیا اڈیشن) مولفہ سید مسعود شش حسین رضوی ۱۵/-

شہرِ آشوب۔ مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد ۸/۵۰
ذوقِ سفر۔ غلام ربانی تاباں ۵/-
کو بہ کو۔ سلمان جاں نثار اختر ۷/-
آتشِ گل جگر مرادآبادی ۲۵/-
دیوارِ قہقہہ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا ۱۵/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

مسلمانوں کا تعلیمی نظام ضیاء الحسن فاروقی ۹/۵۰
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان۔ محمود احمد برکاتی۔ ۴۵/-
فرید و فردِ فریدؒ اسلم فرخی ۲۷/-
اسلام میں راسخ الاعتقادی بیچ کی راہ — ضیاء الحسن فاروقی ۸/-
اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سرسید احمد کا مرتبہ — سید مقبول احمد ۸/-
فقہ اسلامی اور دورِ جدید کے مسائل۔ مولانا مجیب اللہ ندوی۔ ۱۶/-
نقدِ ملفوظات نثار احمد فاروقی ۴۵/-
خطباتِ عیدین مولانا تقی امینی ۲۱/-
تاریخ اودھ قاسم علی نیشاپوری ۲۷/-
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست پروفیسر مشیر الحق ۹/-
ہمارے دینی علوم مولانا اسلم جیراجپوری ۱۶/-
قدیم ہندستان کی سیکولر روایت۔ ڈاکٹر مجیب اشرف ۱۲/-
ترجمۂ قرآن۔ منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش — پروفیسر مشیر الحق ۸/-
مسلمانانِ ہند سے وقت کے مطالبات۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی ۹/-
دنیا کے بڑے مذہب۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۸۵/-
ہندستان میں اسلامی علوم و ادبیات۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۲۰/-
ہندستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک۔ شمس الرحمٰن محسنی ۵۰/-
رسولِ اکرمؐ اور یہودِ حجاز۔ سید برکات احمد ۴۰/-
محجوب الارث۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۴/-
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۴۰/-
اسلام دورِ حاضر میں۔ مترجم پروفیسر مشیر الحق ۲۶/-

اسلامیات ۔ مالک رام ۲۷/-
عمرو بن عاصؓ ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۹/-
حضرت جنید بغدادیؒ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۹/۵۰
روح القرآن ۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ۳۰/-
عشق اور بھگتی ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۹/-

عورت اور اسلامی تعلیم ۔ مالک رام ۳۰/-
مسلمان اور وقت کے تقاضے ۔ عبدالسلام قدوائی ۸/-
عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا ۔ محمود الحسن ۱۵/-
سماجی تبدیلیاں ۔ مترجم قاضی عبیدالرحمٰن ۲/-
مذہب اور جدید ذہن پروفیسر مشیر الحق (زیر طبع)
ہندستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں ۔ ڈاکٹر سالم قدوائی ۱۴/-
دین الٰہی اور اس کا پس منظر ۔ مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی ۱۲/-
کتاب و سنت کے جواہر پارے ۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۴/۵۰
خواتین کربلا کلام انیس کے آئینے میں ۔ صالحہ عابد حسین ۱۴/-
مسلمان اور سیکولر ہندستان ۔ پروفیسر مشیر الحق ۷/-
اسلامی عقائد و مسائل مذہب ۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۹/۵۰
اسلام کی اخلاقی تعلیمات و امام غزالی مترجم ڈاکٹر رشید الوحیدی ۲۵/-
تاریخ الامت سیرت رسولؐ حصہ اول ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۱۸/-
" خلافت راشدہ " دوم " ۲۱/-
" خلافت بنی امیہ " سوم " ۱۲/-
" عباسیہ " چہارم " ۱۵/-
" عباسیہ بغداد " پنجم " ۲۷/-
" عباسیہ مصر " ششم " ۲۷/-
" ہفتم تا ہشتم " (زیر طبع)
فکر اسلامی کی تشکیل جدید ۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۳۰/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد سائز) ۔ قاری محمد اسماعیل ۲/-
" " کلاں سائز ۴/-
اسلام اور بدلتی دنیا ۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۲۱/-
بکھرے ورق سینتی کمار چیٹرجی ۴/-
تاریخ انگلینڈ (۱۹۰۱/۱۴۸۵) سید محمد عزیز الدین حسین ۹/-

ناول

نوٹوں کی تلاش ایاز سیوہاروی ۶۰/-
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی کشمیری لال ذاکر ۴۸/-
سفر رابعہ تبسم ۲۷/-
سمندری خزانہ ماریہ رحمٰن ۲۷/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو ڈاکٹر صغرا مہدی ۲۴/-
مٹی سے ہیرا سید مقبول احمد ۱۰/-
تذکرہ انتظار حسین ۵۴/-
ریت کی دیواریں رفعت سروش ۲۱/-
بنجر بادل ۔ کشمیری لال ذاکر ۲۴/-
فرار ۔ ظفر پیامی ۴۰/-
ڈوبتے سورج کی کتھا ۔ کشمیری لال ذاکر ۳۶/-
لمحوں میں بکھری زندگی ۔ کشمیری لال ذاکر ۱۸/-
مہکتی بہاریں ۔ کوثر چاندپوری ۱۸/-
راگ بھوپالی ۔ صغریٰ مہدی ۱۵/-
دھرتی سدا سہاگن ۔ کشمیری لال ذاکر ۷/۵۰
کھجوراہو کی ایک رات ۔ کشمیری لال ذاکر (زیر طبع)
میں واپس آؤں گا ہاورڈ فاسٹ مترجم محمد انس ۲۵/-
پُروائی ۔ صغریٰ مہدی ۹/۵۰
گوری سوئے سیج پر صالحہ عابد حسین (زیر طبع)
انگوٹھے کا نشان ۔ کشمیری لال ذاکر ۷/-
ایک ہم دو دل ۔ خالدہ رحمٰن ۱۰/-
اشک غزل ۔ حبیبہ بانو ۱۰/-
اپنی اپنی صلیب ۔ صالحہ عابد حسین ۶۰/-
پرائی دھرتی اپنے لوگ ۔ جتندر بلو ۱۲/-
ایک مٹھی ہندستان ۔ سید ضمیم اشرف ۹/-

ایک چادر میلی سی ۔ راجندر سنگھ بیدی ۱۵/-
آلپس کے گیت ۔ مترجم قرۃ العین حیدر ۳/-
پیار کا موسم ۔ مہندر ناتھ ۴/۵۰
چنار کا پتا ۔ سلطان آصف فیضی ۳/-
پابہ جولاں ۔ صغریٰ مہدی (زیر طبع)
زندگی کی لہر ۔ (ساؤمنگ) مترجم محمد خلیق ۴/-
کالا شہر گورے لوگ ۔ احسان الحق (زیر طبع)
بیوہ ۔ منشی پریم چند ۱۲/-
گئودان (نیا اڈیشن) " ۷۵/-
میدانِ عمل ۔ (نیا اڈیشن) منشی پریم چند ۷۵/-
پودوکیہ ۔ ترجمہ قرۃ العین حیدر ۲/-
شکستِ ناتمام ۔ زہرہ سیدین ۲/-
ابھی دور ۔ صالحہ عابد حسین زیر طبع
پراسرار مقدمہ کافکا مترجم رحم علی الہاشمی ۱۲/۵۰
ماں کی کھیتی ترجمہ قرۃ العین حیدر ۲/۵۰

کھرکی ۔ پرکاش پنڈت ۱۲/-
ریت سمندر اور جھاگ ۔ ہرچرن چاولہ ۱۲/۷۵
تیوری ۔ امر سنگھ ۱۴/۷۵
قلی نمبر ۳۹۹ ۔ وجاہت علی سندیلوی ۱۴/۷۵
دانہ و دام ۔ راجندر سنگھ بیدی ۱۸/-
اپنے پرائے ۔ اوم پرکاش بجاج ۹/-
نئی دھرتی نئے انسان خواجہ احمد عباس ۱۲/-
درد و درماں صالحہ عابد حسین زیر طبع
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے راجندر سنگھ بیدی ۲۶/-
واردات ۔ پریم چند ۲۷/-
اردو اسیز مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ۲۵/-
دس افسانے ۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۴/۵۰
راستے اور کھڑکیاں ۔ انور خاں ۹/-
جو میرے وہ راجا کے نہیں ۔ صغریٰ مہدی ۱۰/-
اپنے دکھ مجھے دیدو ۔ راجندر سنگھ بیدی ۲۱/-

افسانے

ڈرامے

پت جھڑ کی آواز قرۃ العین حیدر ۷۵/-
آوازوں کا میوزیم ساگر سرحدی ۲۵/-
سدا بہار چاندنی ۔ رام لعل ۳۰/-
دل دریا ۔ شرون کمار ۲۵/-
تین چہرے تین آوازیں ۔ صالحہ عابد حسین ۱۸/-
دردِ دل ستارہ جعفری ۱۸/-
مکتی بودھ راجندر سنگھ بیدی ۲۵/۵۰
نیلی ساری خواجہ احمد عباس ۱۳/-
گرہن ۔ راجندر سنگھ بیدی ۱۰/-
کوکھ جلی ۔ " " ۱۸/-

الجھاوے ابراہیم یوسف ۱/-
زندگی کی طرف ۔ پروفیسر شمیم حنفی ۲۶/-
زوال کا عروج ۔ مترجم: انور عظیم ۲۶/-
مجھے گھر یاد آتا ہے ۔ پروفیسر شمیم حنفی ۹/-
اینٹی گونی ۔ سوفوکلیز مترجم قیصر زیدی ۹/-
تماشہ جنگی پروفیسر محمد مجیب ۱/-
حبہ خاتون ۔ پروفیسر محمد مجیب ۱/-
تاریخ کے آنچل میں ۔ رفعت سروش ۸/-
اداس موڑ ۔ ابراہیم یوسف ۱۲/-
انٹنی اور کلیوپٹرا ولیم شیکسپیر ۱۶/۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
مٹی کا بلاوا ۔	شمیم حنفی	۱۲/-
سات کھیل ۔	راجندر سنگھ بیدی	۱۴/۵۰
غالب کون ۔	سید محمد مہدی	۸/۵۰
خیال کی دستک ۔	ساگر سرحدی	۱۲/۷۵
دیا بجھ گیا ۔	کرتار سنگھ دگل	۶/-
پہلے آپ ۔ (مزاحیہ ڈراما)	افتخار عالم	۲/۵۰
آذر کا خواب ۔	قدسیہ زیدی	۸/۵۰
آزمائش ۔	پروفیسر محمد مجیب	۴/۵۰
انجام ۔	پروفیسر محمد مجیب	۲/-
کھیتی	"	۴/۵۰
ہیروئن کی تلاش ۔	"	۵/۵۰
پردۂ غفلت ۔	ڈاکٹر سید عابد حسین	۹/-
دروازے کھول دو	کرشن چندر	۶/۵۰
آئینۂ ایام ۔ جے بی پریسٹلے	مترجم خلیق احمد	۴/۵۰
نقشِ آخر ۔	اشتیاق حسین قریشی	۲/۲۵
ریڈیو ڈرامے کا فن	ڈاکٹر اخلاق اثر	۱۸/-
ریڈیو ڈرامے کی اصناف	"	۲۰/-
نشریات اور آل انڈیا ریڈیو	"	۱۰/-
فاؤسٹ (گوئٹے)	مترجم: ڈاکٹر عابد حسین	۲۵/۵۰

اقبالیات

کتاب	مصنف	قیمت
افکارِ اقبال ۔	محمد عبدالسلام خان	۱۲۵/-
اقبال کا نظریۂ خودی	عبدالمغنی	۱۵۰/-
اقبال جادوگر ہندی نژاد	عتیق صدیقی	۱۴/-
اقبالیات کی تلاش	عبدالقوی دسنوی	۳۵/-
فلسفۂ اقبال (خطبات کی روشنی میں)	سید وحید الدین	۳۶/-
اقبال اور دہلی ۔	عبدالقوی دسنوی	۹/۵۰
نقدِ اقبال ۔	میکش اکبرآبادی	۲۵/۵۰
نقشِ اقبال ۔	اسلوب احمد انصاری	۲۴/-

غالبیات

کتاب	مصنف	قیمت
ذکرِ غالب	مالک رام	(زیر طبع)
گفتارِ غالب	مالک رام	۴۸/-
غالب اور صفیر بلگرامی ۔	مشفق خواجہ	۳۹/-
تلامذۂ غالب ۔	مالک رام	۷۵/-
فسانۂ غالب ۔	مالک رام	۱۶/۵۰
غالب اور شاہانِ تیموریہ ۔	ڈاکٹر خلیق انجم	۹/۵۰

معیاری سیریز

کتاب	مصنف	قیمت
موازنۂ انیس و دبیر ۔	مرتبہ رشید حسن خاں	۲۴/-
نیرنگِ خیال ۔	مالک رام	۱۵/-
یادگارِ غالب اردو ۔	"	۲۰/-
" فارسی ۔	"	۹/-
انتخاب مضامین سرسید	انور صدیقی	۱۶/-
حیاتِ سعدی ۔	مرتبہ رشید حسن خاں (زیر طبع)	۳۴/-
فسانۂ آزاد (تلخیص)	" ڈاکٹر قمر رئیس	۶۵/-
فردوسِ بریں ۔	" عبدالحلیم شرر	۱۶/-
انتخاب مضامین شبلی	مرتبہ رشید حسن خاں	۷۵/-
انتخاب ناسخ	مرتبہ " "	(زیر طبع)
مثنوی بحر المحبت	مرتبہ عبدالماجد دریابادی	۵/۵۰
شریف زادہ ۔	" ڈاکٹر قمر رئیس	۲۰/-
امراؤ جان ادا	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	۲۸/-
فسانۂ مبتلا ۔	" صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۰/-
توبۃ النصوح ۔	" مالک رام	۳۶/-

باغ و بہار۔ ” رشید حسن خاں۔ ۴۴/-
ابن الوقت۔ ” ڈاکٹر خلیق انجم ۴۲/-
مجالس النساء۔ ” صالحہ عابد حسین (زیر طبع)
گذشتہ لکھنؤ ” رشید حسن خاں ۷۵/-
قصہ حاتم طائی۔ ” اطہر پرویز (زیر طبع)
انتخاب ولی مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی ۱۲/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن ۱۰/-
” مراثی انیس و دبیر۔ رشید حسن خاں ۳۶/-
” نظیر اکبرآبادی۔ ” ” ۳۶/-
” اکبر الہ آبادی۔ صدیق الرحمٰن قدوائی ۱۸/-
” کلامِ میر۔ ڈاکٹر محمد حسن (زیر طبع)
دیوان درد رشید حسن خاں ۲۰/-
انتخاب سودا ” (زیر طبع)
” قلی قطب شاہ۔ محمد اکبر الدین صدیقی (زیر طبع)
” ذوق۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۲۴/-
مثنوی سحر البیان۔ رشید حسن خاں ۲۱/-
مثنوی گلزار نسیم۔ ” ۱۶/-
افاداتِ سلیم۔ ڈاکٹر خلیق انجم ۲۱/-
مقدمہ شعر و شاعری۔ مرتبہ رشید حسن خاں ۲۰/-

جیبی کتابیں

ایک خواب اور۔ علی سردار جعفری ۱۰/-
آتش گل۔ جگر مرادآبادی ۱۰/-
پچھلے پہر۔ جاں نثار اختر ۶/-
رومانی غزلیں۔ ثمینہ حجاب ۶/-
انتخاب اکبر الہ آبادی۔ صدیق الرحمٰن قدوائی ۱۰/-
ساتواں آنگن۔ صالحہ عابد حسین ۸/-
دھوپ۔ رابعہ تبسم ۵/-

گھر۔ ماریہ رحمٰن ۸/-
واپسی کا سفر۔ عبداللہ حسین ۵/-
راگ بھوپالی۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۷/-
نشیب۔ عبداللہ حسین ۵/-
موت کا بازار۔ آفتاب ہلالی ۸/-

کتاب نما کے خصوصی شمارے

خواجہ احمد فاروقی مرتبہ: خلیق انجم ۴۵/-
عابد علی خاں ” مجتبیٰ حسین ۴۵/-
پروفیسر مسعود حسین خاں ” ایم حبیب خاں ۴۵/-
ڈاکٹر اجمل اجملی مرتبہ علی احمد فاطمی / عذرا مجیب ۴۵/-
فرمان فتح پوری نمبر مرتبہ خلیق انجم ۲۵/-
سردار جعفری نمبر مرتبہ ڈاکٹر نبیجہ شبنم عابدی ۵/-
صالحہ عابد حسین نمبر مرتبہ: عزیز قریشی ۴۵/-
نئی نظم کا سفر مرتبہ: خلیل الرحمٰن اعظمی ۱۵/-

مشرقی علوم وابستہ پر تحقیق۔ حامد حسین ۲/-
پریم چند نمبر۔ عبدالقوی دسنوی ۸/۵۰
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۱۶/-
مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر۔ ادارہ ۱/۵۰
مرزا سلامت علی دبیر نمبر۔ مرتبہ عبدالقوی دسنوی ۷/۵۰
جوش ملسیانی نمبر ساحر ہوشیارپوری ۵/۵۰
خواتین افسانہ نگار نمبر ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۴/۵۰
عرش ملسیانی نمبر۔ مالک رام ۱۲/۵۰
سکندر علی وجد نمبر۔ یوسف ناظم ۲۵/-
قدسیہ زیدی نمبر۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۲۵/-
فراق نمبر۔ شمیم حنفی زیر طبع
لغت نویسی کے مسائل نمبر پروفیسر گوپی چند نارنگ ۲۵/-
عبداللطیف اعظمی نمبر۔ ادارہ ۱۸/-
مشفق خواجہ نمبر۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۲۰/-
جائزے۔ مرتبہ مظفر حنفی ۴۵/-

سائنسی موضوعات پر
مکتبہ پیام تعلیم کی فخریہ پیش کش
کمپیوٹر کیا ہے
قیمت ۸/-
یہ کیسا بخار ہے؟
قیمت ۴/۵۰
سائنس کی دنیا
فریدالدین احمد
قیمت 8/-
گندا پانی
قیمت ۴/۵۰
کیوں اور کیسے
محمد ابراہیم شاہ
قیمت 6/-
آپ کا جسم
علی ناصر زیدی
قیمت ۶/-
عجائب گھر
قاسم صدیقی
قیمت 10/-

ننھے منّے بچّوں
کے لیے
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں
بتاشے
نرسری کے بچّوں کے لیے آسان
زبان میں دلچسپ نظمیں قیمت ۶/۵۰
جاں نثار دوست
بچّوں کے لیے باتصویر کہانی
قیمت ۵/- روپے
جادو کی ہنڈیا
5/-
بھیڑیے کا گانا
6/50
شیر اور بکری
7/50
کوّے کا خواب
7/-
دُم کٹی لومڑی
6/50
کس نے بجائی بانسری
قیمت 7/50
چلاک بلّی
6/50
چاند کی بیٹی
5/-

مکتبہ پیام تعلیم کی کم قیمت پر
دیدہ زیب اور عمدہ کتابیں
بکرے کی تعریف میں
یوسف ناظم
6
پادری کی روح
قیمت 4/50
ٹھوڑی تارا ماتھے چاند
اشرف صبوحی
4/=
بڑھیا کی بھینس
قیمت 4/=
قصرِ صحرا۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی
اول تا سوم
قیمت مکمل سیٹ 25/
غذائیں دوائیں
قیمت 8/=

j

جھیل کا راز
قیمت 6/-
ٹھگ نے ٹھگا ٹھگ کو
البصار عبدالعلی
قیمت 4/50
خوب
صورت
گیٹ اپ
کے
ساتھ
مکتبہ
پیامِ
تعلیم
کی
دیدہ
زیب
کتابیں
پیار کا پنچھی
فرخندہ لودھی
قیمت 9/-
چوں چوں بیگم
شفیقہ فرحت
قیمت 4/-
گلی ڈنڈے کے تین
حیرت
انگیز
سفر
قیمت 6/-
گدھا کہانی
میرزا ادیب
قیمت 9/-
تانبیل خاں
حسین حسّان جامعی
قیمت 3/-

بچوں کے لیے —— مذہب

رسالہ دینیات اول ۳/-
رسالہ دینیات دوم ۴/-
رسالہ دینیات سوم ۵/-
رسالہ دینیات چہارم ۵/-
رسالہ دینیات پنجم ۶/-
بزرگانِ دین — محمود علی خاں جامعی ۴/-
اُمت کی مائیں — حسین حسنی ۴/۵۰
اچھی باتیں — سعدالدین انصاری ۲/۵۰
خوب سیرت اوّل — حکیم محمد سعید ۶/-
خوب سیرت دوم " " ۴/۵۰
سلطان جیؒ — اسلم فرخی ۴/-
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں — فضل قدیر ندوی ۴/۵۰
رحمان کا مہمان — رفیع الزماں زبیری ۶/-
کمسن صحابی " ۵/-
اسلام کے جاں نثار " ۴/-
سیرتِ پاک مختصر مختصر — احمد خاں خلیل ۳/-
نور کے پھول — حکیم محمد سعید ۹/-
سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم " ۴/۵۰
حضرت حمزہؓ — احتشام علی رحیم آبادی ۳/-
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ " " ۳/-
حضرت ابوہریرہؓ " " ۴/-
حضرت محبوبِ الٰہیؒ — مشیر الحق ۳/-
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ " ۴/-
حضرت فریدالدین گنج شکرؒ " ۳/-
حضرت معین الدین چشتیؒ " ۳/-
حضرت ابوبکر صدیقؓ " ۶/-
حضرت طلحہؓ " ۳/-

حضرت سلمان فارسی " ۱/۵۰
حضرت ابوذر غفاریؓ " ۳/-
حضرت عبداللہ بن عمرؓ " ۳/-
" عبداللہ بن عباسؓ " ۳/-
نیک بیٹیاں " ۳/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ حصہ اوّل — عبدالواحد سندھی ۷/۵۰
" حصہ دوم " ۶/-
قرآن پاک کیا ہے — عبدالواحد سندھی ۴/-
اسلام کیسے شروع ہوا؟ ۷/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار 'اوّل' 'دوم' ۶/- ۶/-
اسلام کے مشہور امیر البحر " ۹/-
رسولِ پاکؐ " ۶/-
دس جنتی — الیاس احمد مجیبی ۵/۵۰
سرکار کا دربار " " ۶/۵۰
چار یار — الیاس مجیبی ۷/۵۰
آں حضرتؐ (اردو) — الیاس مجیبی ۳/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی) " ۴/-
اللہ کا گھر — خلیل احمد جامعی ۴/۵۰
اللہ کے خلیل " " ۳/۵۰
رسولِ پاک کے اخلاق " " ۴/-
اللہ کے صفی " " ۲/۵۰
ہمارا دین حصہ اوّل — سید شہاب الدین دسنوی ۸/۵۰
" 'دوم' " " " ۷/۵۰
" 'سوم' " " " ۸/۵۰
تحسین القرآن۔ تالیف، عدیمہ سیدنا طاہر سیف الدین (زیرِ طبع)
منہاج القرآن " " ۴/۵۰
ائمۂ اربعہ — مولانا ابوالعرفان ندوی (زیرِ طبع)
ارکانِ اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری ۳/۵۰
عقائدِ اسلام " " ۳/۵۰
خلفائے اربعہ — خواجہ عبدالحی فاروقی ۹/-
نبیوں کے قصے " " ۶/۵۰

مسلمان بیبیاں۔ اعجاز الحق قدوسی 6/-
ہمارے نبیؐ۔ (اردو) سید نواب علی رضوی 3/50
" (ہندی) " " " (زیر طبع)
سرکارِ دوعالم۔ محمد حسین حسّان 9/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد) 2/-
" " (کلاں) 4/50

نظمیں

مولانا اسماعیل میرٹھی حکیم نعیم الدین زبیری 21/-
بتاشے (نرسری گیت۔ باتصویر) 6/50
مہکتی کلیاں۔ خضر برنی (زیر طبع)
ٹوٹے کھلونے۔ سطوت رسول 5/-
سہانے ترانے۔ شان الحق حقی 4/50
بچوں کے افسر۔ افسر میرٹھی 6/-
بچوں کے اقبال۔ مرتبہ: اطہر پرویز 6/50

سائنس، طب اور عام معلومات

یہ بخار کیسا ہے (ادارہ) 4/50
آپ کا جسم علی ناصر زیدی 6/-
گندا پانی (ادارہ) 4/50

ذرّے کی کہانی مہدی جعفر 21/-
عجائب گھر قاسم صدیقی 10/-
علاج میرا دشمن " 6/-
پرواز کی کہانی علی ناصر زیدی 6/-
غذا کی کہانی " 3/-
رنگوں کی بستی سہیل انور 5/-
غذائیں اور دوائیں (ادارہ) 8/-
صحت کے ۹۹ نکتے مسعود احمد برکاتی 3/-
صحت کی الف بے " 5/-
سنہرے اصول حکیم محمد سعید 4/-
پرندوں سے جانوروں تک شاہ عظیم 4/50
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں زہرہ مشیر 4/50
دہلی مجاہد حسین زیدی 2/50
انوکھا عجائب خانہ (۳ حصّے) محمد حسین حسان فی حصہ 1/50
سماجی زندگی (ادارہ) (سوم) 4/90
تاریخ ہند کی کہانیاں (دوم، چہارم) 7/75
ان ٹھک جان بیگم قدسیہ زیدی (زیر طبع)
بھن بھن بانو " "
جال باز سپاہی " "
جنت کے پھل عبدالواسع عصری "
موم کا محل پروفیسر محمد انس "
بڑدادا کی کہانی محمد عبدالغفور "
چٹانوں کی کہانیاں محمد امین "

غیر ملکی زبانوں کی دلچسپ کہانیاں

سُرخ موت آصف فرخی 4/50

دنیا کی عجیب و غریب کہانیاں آصف فرخی ۷/۵۰
انمول کہانیاں ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ۴/۵۰
پتھر کی گڑیا ثروت صولت ۷/۵۰
ریل کے بچے احمد خاں خلیل ۴/-
افریشیا کی کہانیاں فضلِ حق قریشی ۷/۵۰
۸۰ دن میں دنیا کا چکر علی اسد ۳/-
ہزاروں خواہشیں مسعود احمد برکاتی ۹/-
مونٹی کرسٹو کا نواب مسعود احمد برکاتی ۹/-
گلی ور کے تین حیرت انگیز سفر احمد خاں خلیل ۶/-

کہانیاں، ناول، ڈرامے

ننھے منّے بچوں کے لیے

بتاشے (نرسری کے گیت باتصویر) ۶/۵۰
جاں نثار دوست (باتصویر کہانیاں) ۵/-
شیر اور بکری 〃 ۷/۵۰
چاند کی بیٹی 〃 ۵/-
بھیڑیے کا گانا 〃 ۶/۵۰
جادو کی ہنڈیا 〃 ۵/-
چالاک بلّی 〃 ۶/۵۰
دم کٹی لومڑی 〃 ۶/۵۰
کوّے کا خواب 〃 ۷/-
گدھے نے بجائی بانسری کشور ناہید ۷/۵۰

سوانح

ڈاکٹر سیّد عابد حسین صغرا مہدی ۴/-
صالحہ عابد حسین 〃 ۴/-
مولوی عبدالحق ڈاکٹر خلیق انجم ۴/۵۰
بچوں کے مرزا غالب ڈاکٹر اسلم فرخی ۴/-

بچوں کے محمد حسین آزاد ڈاکٹر اسلم فرخی ۴/-
〃 ڈپٹی نذیر احمد 〃 〃 ۴/-
بچوں کے رنگا رنگ خسرو ۴/-
سلطان سلطان جیؒ 〃 〃 ۴/۵۰
مولانا شبلی نعمانی 〃 〃 ۴/۵۰
مولانا اسمٰعیل میرٹھی حکیم نعیم الدین زبیری ۴/-
ہمارے عظیم سائنسداں حکیم محمد سعید ۸/-
چند مشہور طبیب اور سائنس داں (ادارہ) ۹/-
مولانا آزاد کی کہانی ظفر احمد نظامی ۱۸/-
بچوں کے ذاکر صاحب مرتبہ عبداللہ ولی بخش قادری ۷/-
اندرا گاندھی کی کہانی شمیم حنفی ۶/-
بچوں کے چار بزرگ دوست صالحہ عابد حسین ۳/۵۰
امیر خسرو (ادارہ) ۳/۵۰
جوہر قابل مسعود احمد برکاتی ۳/-
شفیع الدین نیّر اطہر پرویز ۷/۵۰
گاندھی بابا کی کہانی بیگم قدسیہ زیدی ۱۰/-
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں یوسف ناظم ۳/-
میر انیس محمد حسین حسّان ۲/-

قواعد محاورے کہاوتیں اور لغات

پیامی قواعد اردو طلبہ اڈیشن ۳/-
〃 〃 کلاں ۶/-
پیامی اردو انگریزی ڈکشنری ۱۶/-
پیامی بیسک انگلش اردو ڈکشنری ۱۲/-
ہمارے محاورے سیفی پریمی ۱۲/۵۰
کہاوت اور کہانی 〃 ۸/-
مختصر اردو لغت ۶۵/-
فرہنگ عامرہ ۶۰/-
فیروز اللغات درمیانی ۱۵/-

ڑے بچوں کے لیے دلچسپ کہانیاں

کتاب	مصنف	قیمت
ب تھامر غاکلکڑ دں	قمر علی عباسی	۶/-
یوں کی کہانیاں	اشرف صبوحی	۶/-
مندر کا بادشاہ ہارگیا	ڈاکٹر شریف الحسن	۴/-
وں چوں بیگم	شفیقہ فرحت	۴/-
ماسٹر شامت	اشرف صبوحی	۶/-
تھوڑی سی تارا ما تھے چاند	اشرف صبوحی	۴/-
پکڑے گئے	(ادارہ)	۷/۵۰
درویش کا تحفہ	افشاں بیگم	۹/-
ورا سے فرار	رفیع الزماں زبیری	۷/۵۰
بکرے کی تعریف میں	یوسف ناظم	۶/-
جھیل کا راز	ثریا فرخ	۶/-
قصر صحرا اول	مرزا عظیم بیگ چغتائی	۷/-
قصر صحرا دوم	" "	۱۰/-
قصر صحرا سوم	" "	۸/-
عمول کی تباہی	ظفر محمود	۷/۵۰
پیار کا پنچھی	فرخندہ لودھی	۴/-
ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش	(ادارہ)	۷/۵۰
پادری کی روح	(ادارہ)	۴/-
ٹھگ نے ٹھگا ٹھگ کو	ابصار عبدالعلی	۴/۵۰
گدھا کہانی	میرزا ادیب	۹/-
خفیہ سرنگ	ثریا فرخ	۶/-
بڑھیا کی بھینس	(ادارہ)	۴/-
تیس مار خاں	شاہد علی خاں	۴/۸۰
چالاک خرگوش کی واپسی	معراج	۱۵/-
موٹلی کرسٹ کا نواب	مسعود احمد برکاتی	۹/-
غریب لکڑہارے کی کہانی	(ادارہ)	۶/-
نرودلی کا آدم خور	"	۶/-
ہمت کے کرشمے	"	۶/-
خلائی مسافر	"	۶/-
ابو خاں کی بکری	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱۵/-
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی	(کہانیاں)	۹/-
نرالے گویے	اشرف صبوحی	۴/-
باتونی کچھوا	" "	۴/-
جادو کا چھلا	" "	۳/-
جادو کی سارنگی	" "	۳/-
بدر شہزادی	" "	۶/-
سمندری طوفان اور تین لڑکے	(مختلف کہانیاں)	۹/-
ننھا سیاح	محمد زکریا سائل	۷/-
زیور	(مختلف کہانیاں)	۹/-
شہنشاہ نے کہا...	(مختلف کہانیاں)	۶/-
سام پر کیا گزری	سید اظفر مہدی	۳/۵۰
جنگل کی بلی	عبدالاحد سندھی	۳/-
چالاک خرگوش کے کارنامے	معراج	۷/۵۰
چور پکڑو	مسعود احمد برکاتی	۳/-
بہادر علی۔	قمر علی عباسی	۸/۵۰
خالی ہاتھ۔	ابصار عبدالعلی	۹/-
کھلونا نگر۔	ادارہ	۴/-
حاجی بابا کی ڈائری۔	ظ۔ انصاری	/۵۰
قصہ اژدھا پکڑنے کا۔	ادارہ	۵/-
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی۔	"	۹/-
ابو علی کا جوتا۔	"	۵/-
ننھا سراغ رساں۔	ادارہ۔	۵/-
پُر اسرار غار۔	"	۵/-
ظالم ڈاکو۔	ریاض احمد خاں	۹/-

کتاب	مصنف	قیمت
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں۔	انور خاں	۶/۵۰
دلی کی شادی۔	اشرف صبوحی	۴/-
رحمت شہزادہ۔	" "	۲/۵۰
اندھے کا بیٹا۔	شعیب اعظمی	۳/۵۰
پانچ جاسوس۔	امۃ الرحمٰن محسنی	۸/۵۰
جنگل کی ایک رات۔	ریحان احمد عباسی	۶/-
اچھی کہانیاں۔	مرتبہ: ہمدرد فاؤنڈیشن	۳/-
ہرن کا دل۔	اشرف صبوحی	۲/-
دریا کی رانی۔	" "	۲/-
گوہر شہزادی۔	" "	۳/-
شریر شیرا۔	" "	۲/۵۰
پری رانی۔	صالحہ خاتون	۳/-
خطرناک سفر۔	ریاض احمد خاں	۲/۵۰
ننھا جبرو۔	ریحان احمد عباسی	۲/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں۔	یوسف ناظم	۴/۵۰
بابا ناسمجھ۔	رشید الوحیدی	۳/-
علامہ وصمصامہ۔	" "	۵/-
پہاڑ کی چوٹی پر۔	ببرزا ادیب	۷/-
شرارت۔	محمد حسین حسان	۴/-
ننھا فرشتہ۔	فہمیدہ عتیق	۶/-
ایک کھلا راز۔	مسعود احمد برکاتی	۳/۵
مچھیرا اور اس کی بیوی۔	عبدالواحد سندھی	۳/۵۰
بھوتوں کا جہاز۔	شمیم حنفی	۹/۵۰
ہار کی تلاش۔	ریاض احمد خاں	۴/-
خرگوش کی چال۔	بیگم آصفہ مجیب	۴/-
آؤ ڈراما کریں۔	محمد مجیب	۴/-
خرگوش کا سپنا۔	کرشن چندر	۹/-
دادا نہرو۔	منور لکھنوی	۶/-
نیلا ہیرا۔	مظفر حنفی	۶/۵۰
ایک چوری تیل میں۔	عبدالواحد سندھی	(زیر طبع)
شیر خاں۔	قرۃ العین حیدر	۳/-
بھیڑیے کے بچے۔	" "	۳/-
لومڑی کے بچے۔	" "	۳/-
میاں ڈھینچو کے بچے۔	" "	۲/۵۰
بہادر۔	" "	۲/۵۰
ہرن کے بچے۔	" "	۴/۵۰
اس نے کیا کرنہ جانا۔	آصفہ مجیب	۳/-
کٹا ہوا ہاتھ۔	شمیم حنفی	۷/۵۰
میگھ نگر کا راجا۔	ریاض احمد خاں	(زیر طبع)
جی دارا اور ننھا فرشتہ۔	"	(زیر طبع)
سرکس۔	ڈین گیسپر	۱/۵۰
بندر اور نائی۔	عبدالواحد سندھی	۴/۵۰
لومڑی کا گھر۔	"	۳/۵۰
جادو کا گھر۔	"	۳/۵۰
بی مینڈکی اور کوا۔	"	۳/-
تاک دنا دن تا کے سے۔		۳/۵۰
روٹی کس نے پکائی۔	عبدالواحد سندھی	۲/۵۰
پھر میں چگوں کیا خاک۔	"	۳/۵۰
پانچ بونے۔	"	۳/۵۰
چیونٹی رانی۔	"	۳/۵۰
بچوں کی کہانیاں۔	"	۳/۵۰
پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا۔	"	۳/۵۰
پکڑ دُم کٹے کو۔	"	۳/۵۰
مدو رانا پردیس چلے۔	"	۳/۵۰
ہیتو جیتو۔	"	۲/۵۰
سُرخ جوتے۔	بیگم قدسیہ زیدی	۳/۵۰
ریڈیو فیچر۔	جگن ناتھ آزاد	(زیر طبع)
پلک نہ مارو۔	یوسف ناظم	۶/-
ایک دیس ایک خون۔	صالحہ عابد حسین	۳/-
جادو کے کھیل۔	اطہر پرویز	(زیر طبع)
انعامی مقابلہ۔	حسین حسان	۳/۲۵
دعوتِ علاج۔	"	(زیر طبع)

جیت کس کی؟ ” ۲/۵۰

چینی کی گڑیا۔ ” (زیر طبع)

بہادر سیاح۔ ” ۴/-

چچا غالب۔ مرتبہ: ” (زیر طبع)

تا نبیل خاں۔ محمد حسین حسان ندوی ۳/-

جن حسن عبدالرحمٰن (حصہ اول)
ترجمہ قرۃ العین حیدر۔ ۵/-

چوری کی عادت۔ عبدالغفار مدھولی ۳/۵۰

غیر ذمہ دار لڑکا۔ ” (زیر طبع)

جب اور اب۔ آصف مجیب (زیر طبع)

سندر چنار۔ صالحہ عابد حسین ۱/۵۰

گلابو چوہیا اور غبارے۔ قدسیہ زیدی ۱/۵۰

گلابو چوہیا اور پری زاد۔ ” ۲/-

ستاروں کی سیر۔ کرشن چندر (زیر طبع)

لال مرغی۔ عبدالواحد سندھی ۳/-

تین اناڑی۔ عصمت چغتائی ۹/-

خربوزہ شہزادہ کا سر بن گیا۔ کوثر بانو (زیر طبع)

چیا رہتا کا آدم خور شیر۔ محمد حسین ۱/۵۰

ننھا ٹٹو۔ خورشید سلطان ۳/-

چنبیلی۔ محمد حسین حسان ۱/۲۰

شہزادہ اور ٹھگ۔ ادارہ (زیر طبع)

تعلیم بالغاں کے سلسلے کی کتابیں

کفن دفن۔ ” ” ” ” ۱/-

حیات اللہ انصاری۔ ” ” ” ” ۱/-

چیچک۔ مشتاق احمد ۱/-

آستین کا سانپ۔ محمد حسین حسان ۱/-

چاند۔ ” ” ۱/-

دیمک۔ ” ” ۱/-

کتنی زمین۔ ” ” /-

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

مارچ ۱۹۹۴ جلد ۳۴ شمارہ ۳

فی پرچہ	6/=
سالانہ	55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	320/=

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 630191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات 'نقد و تبصرہ' کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں

طنز و مزاح

افسانہ

جائزے

نئی مطبوعات

زبان کیا ہے (لسانیات) جلیل صدیقی ۱۰۰/-

مولانا احسن مارہروی آثار و افکار۔ (تحقیق) ڈاکٹر صابر خاں جلیسری ۱۵۰/-

اسلوب تنقید (نیا ایڈیشن) پروفیسر عبد المغنی ۹۰/-

آواز دوست (خطوط) ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۲۵/-

عورت مرد (مضامین) کشور ناہید ۱۵۰/-

اردو اور سیکولرزم (〃) اقبال خاں ۹۵/-

گلہے گاہے باز خواں (تنقید) ڈاکٹر عابد پشاوری ۱۱۵/-

گیان سنگھ شاطر (سوانحی ناول) گیان سنگھ شاطر ۲۰۰/-

قرآنی گائیڈ (طب) پیر عبد الرحیم جلیل ۴۰/-

کامیاب حفظان صحت مسعود حفیظ رضا می ۵۰/-

علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ (تحریک) مظہر حسین ۱۰۰/-

سب سے چھوٹا غم (افسانے، نیا ایڈیشن) عابد سہیل ۵۰/-

البیرونی قیام الدین ۵۱/-

استاد رجب علی خاں (سوانح) عتیق حنفی ۶۰/-

نقش کٹورا (ناولٹ) ملا عبد الغنی ۸۰/-

القرآن المنظوم جلد اول پارہ ۱ تا پارہ ۱۰ (قرآن پاک کا منظوم ترجمہ) علامہ کبیر کوثر ۲۰۰/-

مسلم پرسنل لا (شریعت اسلام) لفظی منظوم ترجمہ علامہ کبیر کوثر ۱۵۱/-

شمس المعارف الکبریٰ (نیا ایڈیشن) مولانا اقبال الدین احمد ۱۲۰/-

مشاہیر شعرا اردو کی فارسی شاعری۔ ڈاکٹر انیس الدین ۱۰/-

دستک (سہ ماہی) مجلہ عنبر شمیم ۲۰/

سرورق م۔م راجندر

جہاں مدیر
م۔ م۔ راجندر
۷۸۔ چتر اوہار۔ دہلی ۹۲

اشاریہ

یکسانیت کے نفسیاتی نتائج

حیاتِ انسانی تغیّر و تبدل سے عبارت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خدا کی تخلیق کردہ ساری کائنات ہی متحرک اور تغیّر پذیر ہے اگرچہ اس کے کچھ عناصر ہمیں بظاہر ساکت اور جامد معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے گرد و پیش یہ مسلسل حرکت اور تبدیلی ہی انسانی زندگی کو ایک مخصوص تنوع اور دلچسپی عطا کرتی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسانی مخلوق اور یہ وسیع کائنات یکسانیت سے قطعی طور پر مبرّا ہے۔ اس کے برعکس، یکسانیت زندگی کے ہر پہلو اور کائنات کے چپّے چپّے میں مضمر بلکہ ہویدا ہے۔ کچھ مخصوص حالات میں، ہم یکسانیت کو زیادہ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔

ایک سے حالات، ایک سا ماحول اور منظر ایک سے محسوسات یکسانیت کے ذیل میں آتے ہیں مگر ایسی صورتِ حال تو ہر لمحے موجود رہتی ہے اور محض اس بنا پر ان کیفیات پر یکسانیت کا لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ یکسانیت کے لیے ایک خاص مدّت اور معیار کی شرط لازمی ہے۔ یہ مدت یا عرصہ کسی مخصوص حال، ماحول یا منظر اور احساس کے لیے اُس سے زیادہ بلکہ کہیں زیادہ ہونا چاہیے جو عام طور پر اس سے وابستہ ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر کسی بھی ماحول، منظر اور احساس میں مناسب وقت کے گزران کے باوجود تبدیلی نہیں آتی تو وہ یکسانیت کا حامل ہو جائے گا اور ایسی یکسانیت انسان کی سوچ اور عمل پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

مگر یکسانیت اور اکتاہٹ یا بوریت میں تمیز کرنا ضروری ہے۔ اکتاہٹ یکسانیت کا نتیجہ تو ہو سکتی ہے مگر اس کی اپنی کوئی بنیادی ہستی نہیں ہوتی۔ دراصل اکتاہٹ ایک کیفیت ہے جو کسی انسان پر یکسانیت کے علاوہ مسلسل حرکت یا تبدیلی اور خوشنما مناظر کی کثرت سے بھی طاری ہو سکتی ہے۔ اس وجہ سے ہم اس نتیجے پر بھی پہنچتے ہیں کہ یکسانیت کسی بھی ایسی صورتِ حال کی پیداوار ہو سکتی ہے جو تواتر اور تسلسل کی حامل ہو اور اس کا تعلق غم اور نشاط یا دوسرے غیر محسوس جذبات سے ہرگز نہیں ہے۔

قدیم فلاسفروں میں افلاطون اور سقراط نے کافی تفصیل سے یکسانیت اور اس کے نفسیاتی اثرات کے موضوع پر لکھا ہے۔ سترھویں صدی کے عربی فلاسفر اور علم نجوم کے

ماہر النامر نے بھی اس موضوع پر متعدد نسخے تحریر کیے ہیں مگر افلاطون اور سقراط نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور جس انداز سے ہر متعلقہ بات کی وضاحت کی ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ افلاطون نے یکسانیت کے بطن سے پیدا ہونے والی اکتاہٹ اور بیزاری کا ذکر بطور خاص کیا ہے۔ سقراط نے یکسانیت کی کیفیت کو غیر معمولی اہمیت تو نہیں دی یعنی اس پر کوئی خصوصی مضمون یا کتاب تو نہیں لکھی لیکن شاعری اور ادب کے تعلق سے یکسانیت کی خامیوں اور تخلیقی کاوشوں پر اس کے مضر اثرات کا بڑا گہرا مشاہدہ اور تجزیہ پیش کیا ہے۔

انسان ایک غیر معمولی قوتِ متخیلہ کا مالک ہے۔ اس سرزمین پر رازقِ مطلق نے یہ قوت بلکہ اس کا عشرِ عشیر بھی کسی دوسری جاندار مخلوق کو نہیں دی۔ افلاطون نے اس ضمن میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ کہی ہے کہ اعصاب تو انسانوں اور جانوروں دونوں میں مشترک ہیں اور کئی جانوروں میں اعصاب انسان کے اعصاب سے بھی زیادہ زود حس اور قوی ہیں مگر جہاں یکسانیت حیوانات کے اعصاب کو آسودگی بخشتی ہے اور جذبۂ محافظت عطا کرتی ہے وہاں انسان مسلسل یکسانیت سے پہلے اکتائے گا اور بعد ازاں اسے ایک عجیب سی بیزاری جکڑ لے گی۔ افلاطون نے مزید یہ کہا ہے کہ اگرچہ اکتاہٹ بے ضرر ہوتی ہے لیکن جذبۂ بیزاری خاصا مضر ہوتا ہے اور یکسانیت کے حملے کے بہت بعد بھی انسان کے ذہن میں مریضانہ کیفیت پیدا کر سکتا ہے۔ النامر نے تو یکسانیت سے پیدا شدہ بیزاری کو دیوانگی کی پہلی منزل بھی قرار دیا ہے اور یہ تنبیہہ کی ہے کہ اگر ایسے شخص کی مسلسل یکسانیت کا ازالہ نہ کیا گیا تو وہ پہلے لکنت اور بعد ازاں مالیخولیا کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یکسانیت کے ایسے اثرات کا تعلق علمِ طب سے ہے مگر النامر کے بعد کے فلاسفروں میں سے کسی نے بھی، اگرچہ ان میں سے کئی طب کے ماہر بھی تھے، النامر کے ان نتائج سے اتفاق نہیں کیا۔

البتہ اس معاملے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ جہاں تک انسان پر یکسانیت کے نفسیاتی نتائج کا تعلق ہے وہ بسا اوقات خوشگوار نہیں ہو سکتے۔ مسلسل اکتاہٹ اور بیزاری اعصاب کو یقیناً متاثر کریں گی اور نتیجے کے طور پر ہمارے فکر و عمل میں بھی وہ توازن اور پائیداری نہیں رہے گی۔ یہ اثرات کس حد تک مضر ہوں گے اس کا انحصار یکسانیت کی نوعیت اور معیار کے تعلق سے اس کی شدت پر ہوگا یا اس شخص کے اعصاب کی قوت یا کمزوری اور اس کی افتادِ طبع پر۔

یکسانیت انسان کی زندگی اور اس کی سرگرمی کے ہر خطے اور شعبے میں بتدریج نمودار ہوتی رہتی ہے۔ جہاں قدرت میں یکسانیت از خود بدلتی اور پھر ظہور پذیر ہوتی رہتی ہے اور اکثر اوقات ایک خوشگوار اثر چھوڑتی ہے، وہاں انسان کی اپنی زندگی سے پیدا شدہ یکسا نیت خاصی دیرپا اور ناخوشگوار ہوتی ہے۔ ارسطو نے اپنی کئی تصنیفات میں ادبی یکسانیت کا ذکر طوالت سے کیا ہے۔ جہاں تک شعری تخلیق اور انسان کی دیگر تخلیقی کاوشوں کا تعلق ہے ارسطو کا تنقیدی تجزیہ اور اس کے طے کردہ نقد و نظر کے قوانین اور اصول ہیں فنِ تنقید کی ایسی

استوار بنیاد بلکہ میزان پیدا کرتے ہیں جو آج کے پُرپیچ و خم دور میں بھی جہاں اقدار حیرت انگیز تیزی سے بدلتی ہیں اسی طرح مشعل راہ ہے۔ ارسطو نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ادب میں بھی یکسانیت ناگزیر ہے کیونکہ اس کا تعلق براہ راست حکومت اور وقت کی سیاست اور عوام کی سماجی اقتصادی حالت سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ادبی یکسانیت کافی دیرپا ہوتی ہے اور اکثر کئی دہائیوں پر محیط ہوتی ہے۔ ادبی یکسانیت کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے کیونکہ یہ اجتماعیت کی حامل ہوتی ہے اور فکر و تخیل کی راہیں مسدود کر کے ایک ایسے جمود کو جنم دیتی ہے جس میں ادبی نشو و نما بڑی حد تک رک جاتی ہے۔

ارسطو کے تجزیے کی روشنی میں جب ہم آفاقی سطح پر ادب پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ایسی کئی مثالیں سامنے آجاتی ہیں۔ انیسویں صدی کا روسی ادب چیخوف اور دوستوفسکی جیسے عظیم فنکاروں کے باوجود یکسانیت کا حامل ہے۔ یہی صورت حال ہمیں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے یورپین اور بالخصوص فرانسیسی ادب میں بھی ملتی ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد برصغیر کے ادب میں بھی، بشمولیت اردو ادب، یہی یکسانیت کارفرما رہی اور ہم دو تین دہوں تک ادب میں جمود کا ذکر کرتے رہے۔ مگر یاد رکھیے موضوعات کی یکسانیت ادب میں جمود کے لیے ذمے دار نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جب تخلیقی عمل میں ایک ٹھہراؤ آجائے اور فکر و فن کے سوتے خشک ہوتے محسوس ہوں تو صرف اس وقت جمود کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس بات کے پیش نظر انیسویں صدی کا روسی ادب جس کا میں نے ذکر کیا موضوع کی یکسانیت کے باوجود، یعنی ایک تاناشاہی نظام میں پستے ہوئے عوام کی تصویر کشی، ہر اعتبار سے ایک عظیم ادب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ روسی ادب کی غیر معمولی عظمت انیسویں صدی کے روسی ادب پر ہی قائم ہے اور گورکی اور طالسطائی بھی اسی عظیم ادبی تحریک کے لافانی سربراہ ہیں۔

مختصراً یکسانیت تمام کائنات کا جس کا انسان ایک حصّہ ہے، ایک اہم عنصر ہے۔ اس کے نتائج خوشگوار بھی ہو سکتے ہیں اور ناخوشگوار بھی۔ ادبی یکسانیت کی اپنی ایک جداگانہ اور اجتماعی حیثیت ہے اور یکسانیت کی طوالت ادبی جمود کی خالق ہو سکتی ہے مگر محض موضوع کی یکسانیت ادب کو کمزور نہیں کر سکتی۔ انفرادی طور پر انسان پر یکسانیت کے نفسیاتی نتائج کا انحصار یکسانیت کی نوعیت، اس کی مدت اور خود انسان کی اعصابی قوت پر ہوگا۔

بچوں کے لیے مذہبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
حضرت یحییٰ علیہ السلام)	منورہ نوری خلیق	۳/=
حضرت آدم علیہ السلام۔	منورہ نوری خلیق	۹/-
رسالہ دینیات اول	محمد نعیم الدین زبیری	۳/
رسالہ دینیات دوم	"	۲/
رسالہ دینیات سوم	"	۵/
رسالہ دینیات چہارم	"	۵/
رسالہ دینیات پنجم	"	۶/
بزرگانِ دین	محمود علی خاں جامعی	۴/
امت کی مائیں	حسین حسنی	۲/۵۰
اچھی باتیں	سعد الدین انصاری	۲/۵۰
خوب سیرت اول	حکیم محمد سعید	۶/
خوب سیرت دوم	"	۲/۵۰
سلطان جی	اسلم فرخی	۲/
رسول اللہ کی صاحبزادیاں	فضل تقدیر ندوی	۲/۵۰
رحمان کا مہمان	رفیع الزماں زبیری	۶/
کمسن صحابی	"	۵/
اسلام کے جاں نثار	"	۴/
سیرت پاک مختصر مختصر	احمد خاں خلیل	۳/
نور کے پھول	حکیم محمد سعید	۹/
سب سے بڑے انسان۔ رسول اللہ	"	۲/۵۰
حضرت حمزہ رض	احتشام علی رحیم آبادی	۳/
حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رض	"	۳/
حضرت ابوہریرہ رض	"	۲/
حضرت محبوب الٰہی رح	مشیر الحق	۳/
حضرت قطب الدین بختیار کاکی رح	"	۲/
حضرت فرید الدین گنج شکر رح	"	۳/
حضرت معین الدین چشتی رح	"	۳/
حضرت ابوبکر صدیق رض	"	۶/
حضرت طلحہ رض	"	۲/
حضرت سلمان فارسی رض	"	۲/۵۰
حضرت ابوذر غفاری رض	"	۳/
حضرت [illegible]		
حضرت عبداللہ بن عباس	مشیر الحق	۳/
نیک بیٹیاں	"	۲/۵۰
اسلام کیسے پھیلا حصہ اول	عبدالواحد سندھی	۴/۵۰
" حصہ دوم	"	۶/
قرآن پاک کیا ہے؟	"	۲/
اسلام کیسے شروع ہوا؟	"	۴/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار اول دوم	" فی حصہ	۶/=
اسلام کے مشہور امیر البحر	"	۹/
رسول پاک	"	۶/
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۵/۵۰
سرکار کا دربار	"	۶/۵۰
چار یار	"	۴/۵۰
آں حضرت (اردو)	"	۳/۵۰
حضرت محمد (ہندی)	"	۰/۴۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۲/۵۰
اللہ کے خلیل	"	۳/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	"	۲/
اللہ کے صفی	"	۲/۵۰
ہمارا دین حصہ اول	سید شہاب الدین دسنوی	۸/۵۰
" دوم	"	۴/۵۰
" سوم	"	۸/۵۰
منہاج القرآن	حکیم سیدنا طاہر سیف الدین	۲/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۳/۵۰
عقائد اسلام	"	۲/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحی فاروقی	۹/
نبیوں کے قصے	"	۶/۵۰
ہمارے رسول	"	۶/
پیارے رسول	سلطانہ آصف فیضی	۲/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاء	ادارہ	۲/
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۶/
ہمارے نبی	سید نواب علی رضوی	۳/۵۰
سرکار دو عالم	محمد حسین حسان	۹/

باقر مہدی
ای/۱ - ردی درشن
کارٹر روڈ - باندرہ (ویسٹ)
بمبئی ۵۰

یگانہ کی یاد میں

(یگانہ کی اڑتیسویں برسی کے موقع پر)

کیا سمجھتے ہو کہ یہ عالم ہرا ہو جائے گا
اس زمیں کا ذرّہ ذرّہ بے بہا ہو جائے گا

ڈر زمانے سے یہ سارا شہر شعلہ بن چکا
سوچ ظالم تیرا سب سے سامنا ہو جائے گا

خوش نوا طائر ذرا چھپ کے افق کے پار جا
ایک شاہیں تاک میں ہے تو فنا ہو جائے گا

گھومتے پھرتے تھے گلیوں میں کھنڈر یادوں کا تھا
جانتے تھے اپنا سایا ہی خفا ہو جائے گا

مندمل برسوں میں ہوتا ہے شکستہ دل مگر
اتفاقاً تم ملے تو حادثہ ہو جائے گا

حکمرانوں کی اطاعت زیب دیتی ہے کسے
دیکھتے ہی دیکھتے آمر "خدا" ہو جائے گا

نغمہ گر آتے رہے باقر مگر چپ ہی رہا
کیا خبر تھی وہ مغنّی بے نوا ہو جائے گا

ابراہیم یوسف
۱۱۱۔ نیم روڈ اما می گیٹ
بھوپال

اردو ڈراما۔ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۴ء تک

جائزہ نمبر ۱

۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۰ء تک کے ڈراموں اور مضامین کا جائزہ لیا جا چکا ہے (مطبوعہ کتاب نما دہلی فروری ۱۹۹۲ء) ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۴ء کے درمیان کا عرصہ اردو ڈرامے کے لیے بہت امید افزا رہا کہ اس دوران چند اہم ڈراموں کے مجموعے اور موضوعاتی کتابیں منظر عام پر آئیں ان کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس جائزے کے غیر معمولی طویل ہو جانے کے خوف سے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں صرف مجموعوں اور موضوعاتی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ان ڈراموں اور مضامین کا جائزہ لیا جائے گا جو اس دوران مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس جائزے میں ممکن ہے کہ مجموعے شامل ہونے سے رہ گئے ہوں اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ میری دسترس سے باہر رہے۔ اگر اب وہ دستیاب ہو گئے تو انھیں دوسرے حصے میں شامل کر لیا جائے گا۔ ۸۴ء سے ۹۰ء کے درمیان شائع ہونے والے کچھ ڈرامے اب دستیاب ہو گئے ہیں۔ انھیں بھی دوسرے حصے میں شامل کر لیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

۱۔ دوسرا کمرہ : زاہدہ زیدی ۱۹۹۰ء

"دوسرا کمرہ" زاہدہ زیدی کے پانچ ڈراموں کا مجموعہ ہے جسے خود مصنفہ نے اپنے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ یہ پانچوں ڈرامے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ان میں چار ڈرامے اردو کے مقتدر رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اور پانچواں سب سے طویل ڈراما "اور جنگل جلتا رہا" کسی رسالے میں شائع نہیں ہوا۔ زاہدہ زیدی نے ابتدا میں ایک کارآمد پیش لفظ اور پھر ہر ایک ڈرامے کے ساتھ پروڈکشن نوٹ لکھ کر ڈرامے کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی ہے۔ پانچوں ڈرامے اردو کی روایتی تکنیک سے انحراف کرتے ہوئے مغرب میں چلنے والی مختلف تحریکوں سے متاثر

ہوکر لکھے گئے ہیں۔ اس مجموعے کے پہلے ڈرامے "چٹان" کی تکنیک کے بارے میں محترمہ نے فرمایا ہے کہ اس ڈرامے میں "پیرانڈیلو کی ڈراما در ڈراما کی تکنیک کا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ اس میں سٹرنڈبرگ STINDBURG کی ڈریم تکنیک DREAM TECHNIQUE اور ابسرڈ ڈراما ABSURD DRAMA کے عناصر موجود ہیں" ڈراما علامتی ہے۔ کرداروں میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ ڈرامے کے کردار زندگی کو دلکش اور خوبصورت بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ڈرامے کے اختصار کے باعث ڈراما کچھ ادھورا سا رہ گیا ہے۔ اور وہ بھرپور تاثر پیدا نہ کرسکا جو مصنفہ کا مقصد تھا۔ دوسرا ڈراما "دلِ ناصبور دارم" کو مصنفہ نے علامتی ڈراما کہا ہے جس میں بقول مصنفہ "داخلی تجربات اور محاکات کو خارجی ایکشن اور حسیاتی منظرنامے کی مدد سے پیش کیا گیا ہے۔" راز اور ہمراز ایک ہی شخص کے دو روپ ہیں۔ ایک کی داخلی کیفیات کو دوسرا خارجی ایکشن سے پیش کرتا ہے۔ دوسرے کردار، منظر اور پس منظر کی اشیا سب علامتی ہیں۔ راز ایک عورت بالفاظ دیگر حسن کی آمد کا انتظار کر رہا جو نہیں آتا۔ اور آخرکار راز اور ہمراز اسٹیج سے رخصت ہوجاتے ہیں کہ روُمی اور صبوحی اسٹیج پر بہت مختصر عرصے کے لیے نمودار ہوتی ہیں۔ وہ بھی انتظار کے کرب میں مبتلا ہیں۔ ڈرامے پر بیکیٹ کے ڈرامے "گودو کے انتظار میں" کی بے طرح چھاپ ہے۔ یہ سوال الگ ہے کہ بیکٹ کے ڈرامے کی گہرائی یا معنویت اس میں ہے یا نہیں۔ بہرحال منظرنامے اور پیش کش نے انسانی زندگی کے اس المیہ کو ایک خوبصورت تخلیق بنا دیا ہے۔ تیسرا ڈرامہ "دوسرا کرہ" ہے جس میں بقول مصنفہ "ابسرڈ ڈراما کے نقوش کافی نمایاں ہیں" اس ڈرامے میں جنسی ناآسودگی سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کیفیات کو پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے کمرے میں ننگی لاشوں کا نظر آنا اور شبانہ کا خواب، ناآسودہ جنسی جذبات اور ان سے پیدا ہونے والی ابنارمل نفسیات کی واضح علامتیں ہیں۔ موضوع صاف اور واضح ہے۔ لیکن ابسرڈ ڈرامے کی تکنیک کی پیش کش میں تھوڑا الجھاؤ ضرور پیدا ہوا ہے۔ جو عام قاری کے لیے الجھن کا سبب بن سکتا ہے۔ چوتھا ڈراما "وہ صبح کبھی تو آئے گی" ایک حقیقت پسندانہ ڈراما ہے جس میں مونتاژ کی تکنیک کا خوبصورتی اور کامیابی سے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ایک مجبور اور بے کس عورت کی زندگی کا المیہ ہے۔ جو سسرال میں ظلم و ستم اور مار پیٹ کا شکار ہوتی ہے، چیختی چلاتی ہے مگر اپنے ماحول سے بغاوت نہیں کرتی۔ مونتاژ کی تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے عمل میں شدت پیدا کی گئی ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سماج پر زبردست طنز ہیں کہ وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ضرور ہے مگر محسوس نہیں کرتا۔ ڈرامے کے اختتام پر ایک خیال پیدا ہوا جس کا یہاں اظہار بے محل نہ ہوگا۔ زاہدہ زیدی نے رفعت سروش کے ڈانس ڈرامے (اسے ڈراما ماننے میں تامل ہے) عورت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "آخر آپ کی بنائی ہوئی عورت کی اس تصویر میں مدر ٹریسا، لکشمی بائی، رضیہ سلطان، جہاں آرا، حضرت محل

سروجنی نائیڈو، ارونا آصف علی، ہاجرہ بیگم، بے نظیر بھٹو، عصمت چغتائی، امریتا پریتم
شبانہ اعظمی اور زاہدہ زیدی جیسی عورتوں کے خدوخال کیوں مفقود ہیں" سوال یہ ہے کہ
زاہدہ زیدی نے اس عورت سے بغاوت کیوں نہ کرائی جب کہ ڈرامے میں اسکے مواقع
موجود تھے کہ وہ ان میں سے کسی کا روپ دھار لیتی۔ اور "جنگل جلتا رہا" اس مجموعے
کا پانچواں اور آخری ایک طویل ڈراما جو نو سین اور تقریباً سو صفحات پر محیط ہے۔ یہ
ایک زمیندار خاندان کی داستان ہے۔ زمینداری ختم ہو چکی ہے جو کچھ بچا ہوا ہے وہ بزرگ
خاتون خیر النساء کے قبضے میں ہے جو بستر مرگ پر ہیں۔ جو کچھ بچا ہوا ہے اسے ان کی
بہو ایک طرح سے بہ جبر حاصل کر لیتی ہے۔ جنگل خاندان کی علامت ہے اور خیر النساء
بقول مصنفہ پرانی تہذیب کی نمائندہ۔ جو دم توڑ رہی ہے۔ اس دعوے کو قبول کرنے میں
کوئی امر مانع نہیں۔ خاندان کے کچھ لوگوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور زندگی
کی جدوجہد میں شامل ہو گئے ہیں۔ کچھ شعر و شاعری اور آرٹ کی دنیا میں مگن ہیں۔ اگرچہ
ڈرامے میں تہذیبی جھلکیاں موجود ہیں مگر ڈرامائیت کا فقدان بری طرح کھٹکتا ہے۔
موضوع کسی افسانہ یا ناول کے لیے زیادہ مناسب تھا۔

زاہدہ زیدی صاحبہ کے ان ڈراموں کے مطالعے کے دوران کچھ سوالات بار بار
ذہن میں ابھرے کہ کیا یہ جدید ڈراما اردو کی سرزمین میں جڑ پکڑ سکے گا۔ اور کیا ہمارے مزاجوں
سے ہم آہنگ ہے؟ کیا مستقبل میں پروڈکشن کے مقابلے میں اسکرپٹ ثانوی حیثیت
حاصل کرے گا۔ اور کیا اس جدید ڈرامے کا حشر جدید افسانے کی طرح ہونے والا تو نہیں
ہے۔ ڈاکٹر شمیم حنفی نے دوسرے کرے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "کلچر کے یہ دونوں
منطقے (اجتماعی کلچر اور سیاسی کلچر) جس انحطاط اور ابتذال کی زد پر ہیں اس کے پیش
نظر ڈرامے کی صنف موجودہ انسانی صورت حال پر تبصرے کی انوکھی تخلیقی سطح فراہم
کرتی ہے۔ ہمیں امید کرنی چاہیے کہ زاہدہ زیدی کے نئے ڈرامے اس سطح کے بھی ترجمان
ہونگے" شمیم حنفی کا یہ مطالبہ غیر واجب نہیں ہے۔ محترمہ کو اس پر بھی سنجیدگی سے غور کرنا
چاہیے کہ اس امپورٹیڈ مال کی خاطر اپنے کلچر اور روایات کی قربانی کہاں تک مناسب ہے

۲۔ دوسرا کنارا: غلام جیلانی ۱۹۹۰ء

اس میں غلام جیلانی صاحب کے آٹھ ڈرامے شامل ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ
فرمایئے راقم الحروف کا تبصرہ مطبوعہ کتاب نما دہلی بابت ماہ جنوری ۱۹۹۳ء

۳۔ الجھاوے: ابراہیم یوسف ۱۹۹۰ء
اس مجموعے میں تین کل وقتی ڈرامے "اپنی اپنی راہیں" (یہ ڈراما تین نسلیں

ایک ڈور کے عنوان سے ماہنامہ بگنڈنڈی امرتسر میں شائع ہوا تھا۔ معمولی تبدیلیوں کے بعد "اپنی اپنی راہیں" کے نام سے اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے) دوسرا "بادلوں کا سایہ" اور "بھاوے" شامل ہیں ان پر کسی قسم کا تبصرہ کرنا راقم الحروف کا کام نہیں۔

۴۔ ڈگر پنگھٹ کی: رفعت سروش

"ڈگر پنگھٹ کی" میں چھ ڈرامے شامل ہیں۔ دو اسٹیج اور چار ریڈیو۔ پہلا ڈراما "ڈگر پنگھٹ کی" جو بیس پچیس کرداروں اور دس سین پر مشتمل ہے۔ ڈرامے میں امیر خسرو کی شخصیت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ منگولوں کی قید سے رہائی، عوام میں ان کی مقبولیت، درباروں سے تعلق، نظام الدین اولیاؒ سے ان کی عقیدت نئے راگ راگنیوں اور آلاتِ موسیقی کی ایجاد اور اقتدار کے لیے بادشاہوں کے قتل وخون کے کھیل سے بیزاری وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس سے امیر خسرو کی شخصیت تو ابھر کر سامنے آجاتی ہے مگر ڈرامے کے لیے جس کشمکش کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس میں مفقود ہے۔ ایک دو جگہ داخلی کیفیت کی معمولی جھلک نظر آتی ہے مگر وہ ڈرامے کی تعمیر پر کوئی اثر نہیں ڈالتی ہے۔ دوسرا ڈراما ہے "مصوّر" جس میں پانچ کردار اور چھے سین ہیں جو دو شہروں میرٹھ اور بمبئی میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ڈرامے کا موضوع ایک فنکار کی محرومیوں اور اسکے فن کا استحصال ہے۔ بیوی روزمرہ کی ضرورتیں حاصل نہ ہونے سے بیزار ہو کر میکے چلی جاتی ہے۔ مصوّر قسمت آزمانے کے لیے بمبئی جاتا ہے۔ مگر وہاں کے تجارتی ماحول میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پاتا اور اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو سونگھنے کی خواہش لیے واپس آجاتا ہے۔ بیوی کی عدم موجودگی سے گھر میں ویرانی اور دل میں کسک محسوس کرتا ہے۔ آخر میں عالمی مقابلے میں اسے پہلا انعام مل جاتا ہے اور بیوی اس کے پاس آجاتی ہے اس موضوع پر اردو میں متعدد ڈرامے لکھے جا چکے ہیں۔ رفعت سروش کے اس ڈرامے کے متعلق یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وطن کی مٹی کی خوشبو سے اسے جوڑ کر نیاپن پیدا کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ مجموعے کے باقی چار ڈرامے ریڈیو والے ہیں۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ رفعت سروش نے ان کی جنس تبدیل کر کے اسٹیج ڈرامے کی عصمت داغدار کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

۵۔ صحرائے اعظم: زاہدہ زیدی اگست ۱۹۹۱ء

صحرائے اعظم زاہدہ زیدی کا غالباً اردو کا پہلا ڈراما ہے جو خلیجی جنگ کے پس منظر میں بے حد جذباتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ جذباتی انداز

ہوتے ہوئے بھی مصنفہ نے دلائل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ جو ڈرامے کا اضافی وصف ہے۔ طاقت میں انصاف ہے کا جو ننگا ناچ اس جنگ میں پیش کیا گیا اس کی مثال شاید ہی مہذب دور کی تاریخ میں مل سکے۔ زاہدہ زیدی نے اس بربریت کو علامتی انداز میں بہت چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ بیکٹ کے ڈرامے "گودو کے انتظار میں" کے معروف کردار گو گو اور دمر ڈرامے میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے بھی ڈرامے کے ایکشن سے علاحدہ رہتے ہیں جس سے مصنفہ کی فن پر گرفت کا پتا چلتا ہے۔ ڈرامے کے تمام کردار علامتی ہیں لیکن قاری کو انھیں سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر محمد حسن کو جو غلط فہمی ہوئی ہے وہ مغربی طاقتوں کو جو نام دیے گئے ہیں ان کی وجہ سے ہوئی ہے۔ شاہ مائز، شاہ مرژگاں وغیرہ واضح طور پر مغربی طاقتوں کے نمائندہ ہیں۔ کیوں کہ بندر بانٹ میں حصے داری کے دعوے دار ہیں۔ پھر بھی محترمہ اگر چاروں مغربی طاقتوں کے ناموں کا انتخاب اس طرح کرتیں کہ علاحدہ علاحدہ ان کی شناخت ہو جاتی تو مناسب تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن کو یہ بھی شکایت ہے کہ مکالمے طویل ہو گئے ہیں۔ مصنفہ اس سے متفق نہیں وہ صرف شاہ کیکٹس کی تقریر کو طویل تسلیم کرتی ہیں۔ یہ تقریر پہلے کہی ہوئی باتوں کا اعادہ ہے اس لیے تکرار کے نقص سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہیں کہیں مکالمے ضرور طویل ہو گئے ہیں۔ زاہدہ زیدی نے یو۔ این۔ او کے رول کو کہ وہ کس طرح امریکا کی سینیٹ بن کر رہ گئی ہے کس طرح عرب حکمراں خادم امریکا ہو گئے تھے اور روس کس طرح مجبور ہو گیا تھا بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ زاہدہ زیدی نے اردو ادیبوں کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کر دیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اگر وہ دو چار سین میں بہرام (صدام حسین) کو بھی پیش کر دیتیں جس میں اسکے عزم و حوصلے کو پیش کیا جاتا تو زیادہ ڈرامائی کیفیت پیدا ہو سکتی تھی اور ڈرامے میں جو ایک سپاٹ پن کا احساس ہوتا ہے وہ نہ ہوتا۔

۴۔ سرحد کوئی نہیں : ساجدہ زیدی دسمبر ۱۹۹۱ء

"سرحد کوئی نہیں" ساجدہ زیدی کے تین ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں ایک منظوم اور دو نثری ڈرامے شامل ہیں۔ "سرحد کوئی نہیں" منظوم ڈراما ہے۔ اردو میں منظوم ڈراموں کی روایت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ ایسے میں طویل منظوم ڈراما لکھنا بڑی جرأت کا کام ہے اور وہ بھی ایسی صورت میں جب کہ اردو کے قاری کا حلقہ سکڑتا جا رہا ہے اور قاری معیاری اور اعلیٰ ادب کے مقابلے میں لائٹ لٹریچر کو وقت گزاری کا ذریعہ سمجھنے لگا ہے۔ "سرحد کوئی نہیں" اپنی گہرائی اور تہہ داری کے باعث مختلف زاویہ نگاہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک زاویہ نگاہ وہ ہے جو جناب سید المظفر چغتائی اور جناب

سید محمد مہدی نے اپنایا ہے کہ "ساجدہ زیدی نے اس ڈرامے میں زندگی کو ایک خاص فلسفیانہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے" (سید محمد مہدی) یا "ساجدہ زیدی کا یہ ادب پارہ عظمت نسواں کا نقیب ہے" "ہماری تہذیبی روایت کے مطابق جو بار امانت آسمان اور پہاڑ نہ اٹھا سکے اور انسان نے اٹھا لیا۔ آج اس ڈرامے کی سبک موسیقی میں صاف سنائی دے رہا ہے کہ دراصل عورت نے اٹھایا تھا اور وہی اسے آج تک اٹھائے ہوئے ہے" (سعید الظفر) ان زاویوں سے بھی اس ڈرامے کو دیکھا، سمجھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ مگر خود مصنفہ نے حرف آغاز میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سرحد کوئی نہیں" ایک ایسا ڈراما ہے جس میں میں نے داخلی کیفیات و جذبات سے پیدا ہونے والے ڈرامے کے مبہم ترین پہلوؤں اور تاریک گوشوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ داخلی ڈرامے کی بے پناہ قوت کو اجاگر کرنے کے لیے خارجی حالات و واقعات کو کم کرتے کرتے تقریباً نظر انداز کر دیا ہے" اور سچ پوچھا جائے تو یہ ڈراما خارجی حالات کی بھیڑ کا متحمل ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ جس طرح ڈرامے میں خارجی حالات کی بھیڑ نہیں ہے اسی طرح کرداروں کی بھیڑ بھی نہیں ہے صرف دو کردار ہیں جو چار مختلف حالات میں زندگی کو برتتے اور داخلی کیفیات کے عمل اور ردعمل سے دوچار ہوتے ہیں۔ پہلے ایکٹ میں گوتم اور زہرا کی ملاقات ہوتی ہے۔ یہ ایک جذباتی سین ہے۔ دونوں کے جذبات میں ہلچل مچی ہوئی ہے اور ایک دوسرے کے قریب آنا چاہتے ہیں مگر زہرا ابھی سماجی اور اخلاقی بندھنوں کی اسیر ہے اور کہتی ہے۔

زہرا:- "یہ زندگی ایسی رہ گزر ہے کہ جس میں ہر ہر قدم کسی محتسب کے لطف و کرم کا ڈر ہے۔"

لیکن آخرکار زہرا کے اندیشے اور دلائل مرد اور عورت کے ازلی رشتے کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور زہرا خود سپردگی کرکے لذت وصل سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ پورے سین میں زہرا کی داخلی کیفیات کو پیش کیا گیا ہے۔ سماجی اور اخلاقی بندھنوں اور ابلتے ہوئے جذبات کا ٹکراؤ ہے۔ جو اس کے اندر طوفان مچا رہا ہے جو خود سپردگی کے بعد تھمتا ہے۔ زہرا کے جذبات کو بہت خوبصورت انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے ایکٹ میں ایک دوسرے سے دور ہیں اور ایک دوسرے کی یاد اور تصور میں کھوئے ہوئے ہیں۔ گوتم کی خود کلامی پر کالی داس کے "میگھ دوت" کے واضح اثرات ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

گوتم:- (فطرت سے ہم آغوش ہے۔ پورے ایکٹ کے دوران فطرت ہی اس کی مخاطب ہے)

صبا! جب اس دیس سے گزرنا۔
تو دھیرے دھیرے قدم اٹھانا۔

کہ ہانس کے جنگلی مدھ بھرے ہاتھوں سے
کسی کے خوابوں کی نرم پریاں نہ جاگ جائیں

اور

اگر وہ آنکھیں (وہ پریت رس سے بھرے پیالے) طویل تنہائیوں کی باہوں
میں جاگتی ہوں تو ان سے کہنا.....
کسی کی آنکھوں کی نیند آوارہ ہے، کہیں دشتِ آرزو میں۔
کسی کے دل کا قرار کھو گیا ہے مسرت کی جستجو میں۔ وغیرہ وغیرہ

اس حصہ اور میگھ دوت کے اس حصے میں کوئی فرق نہیں ہے جب کالی داس میگھ کو اجین نگری پر سے گزرنے کی ہدایات دیتا ہے۔ تیسرے ایکٹ میں ڈراما اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے جب گوتم اور زہرا سال سوا سال کے بعد دوبارہ ملتے ہیں۔ زہرا مجسم آرزو ہے اور محبت ہی کو زندگی سمجھتی ہے لیکن گوتم زندگی کے پیچ و خم اور تلخ حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کر رہا ہے اور ان سے نبرد آزما ہونے کا ارادہ کر رہا ہے۔ اس ایکٹ کے شروع میں یہ ڈرامائی کنایہ موجود ہے کہ ملن کے بعد بچھڑنا مقدر ہو چکا ہے کیوں کہ جب زہرا کہتی ہے۔

زہرا:۔ میرے تصور کا میری ہر کامنا کا پہلا افق تمھیں ہو تو گوتم جواب دیتا ہے۔

گوتم:۔ افق کس نے چھوا ہے اب تک؟

اس ایکٹ میں زہرا تین مختلف روپوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ پہلا روپ وہ ہے جس میں وہ قربانی کا مجسمہ ہے اور گوتم کے تمام رنج و غم اپنے ہونٹوں میں جذب کر لینا چاہتی ہے گوتم کی ساری مجبوریوں کو اپنے وجود سے جلا دینا چاہتی ہے اور اسکی راہوں کے تمام خاروں کو اپنی پلکوں سے چن لینا چاہتی ہے۔ دوسرے روپ میں وہ گوتم کے عمل سے مایوسی کا شکار ہوتی ہے اور تیسرے میں اسے اپنے عورت ہونے کا احساس ہوتا ہے اور وہ کہہ اٹھتی ہے۔

زہرا:۔ میں بنت حوا ہوں،

میں نے روز ازل سے اب تک
گناہِ آدم کو اپنی آغوش میں چھپایا ہے
میں انھیں پردہ داریوں کے کرم سے
کارِ جہاں کی رمز آشنا بنی ہوں۔

اس احساس کے ساتھ ہی زہرا کا جذباتی ہیجان پُرسکون ہو جاتا ہے۔ گوتم چلا جاتا ہے۔ طوالت کے خوف سے زہرا کی تین حالتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ ویسے یہ ایکٹ اس کا متقاضی ہے کہ اس پر تفصیلی بحث کی جائے۔ اس ایکٹ کے بارے میں جناب سید الطاف کے اس خیال سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "تیسرے ایکٹ کے دوران کبھی سارتر کی دہشت اور کبھی ہومر کی اوڈیسی کے طلسماتی جزیرے کا خیال آتا ہے" چوتھے

ایکٹ میں ڈھائی سال کے بعد زہرا اور گوتم پھر ملتے ہیں مگر اب زہرا مصوری اور شاعری کی دنیا میں کھو چکی ہے اور گوتم سے ملاقات اب اسکے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی اور نہ اسکے اندر کوئی جذباتی ہیجان پیدا کرتی ہے۔ بقول جناب سعید الظفر "زہرا القان کی اس منزل پر نظر آتی ہے جہاں نہ خوف کی گنجائش رہ جاتی ہے نہ امید کی۔ زہرا امید و بیم کے مرحلے سے تلاش نجات کی راہوں پر گامزن نظر آتی ہے" یہ ایکٹ اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ جب مرد زندگی کی جد و جہد ہیچ و خم اور تلخیوں سے اکتا جاتا ہے تو سکون عورت کی قربت میں تلاش کرتا ہے۔ ساجدہ زیدی نے اس ڈرامے میں عورت کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسے پوری عظمت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈراما اسقدر خوبصورت ہے کہ اسے پڑھ کر ہی لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔ پچھلی چند دہائیوں میں لکھے گئے ڈراموں میں یہ ایک اعلیٰ اور ارفع مقام رکھتا ہے۔ "حسرت تعمیر" اس مجموعے کا ایک اور ڈراما ہے جو بقول مصنفہ فی البدیہہ ڈراما ہے۔ مصنفہ جب انگلینڈ میں صفدر جعفری کے یہاں مقیم تھیں تو اکثر برصغیر کے تارکین وطن کے حالات، نفسیات اور غیر مانوس سماج میں ایڈجسٹ کرنے کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی تھی سی گفتگو سے اس فی البدیہہ ڈرامے کا خیال پیدا ہوا اور مصنفہ اور صفدر جعفری نے فی البدیہہ مکالمے بول کر ٹیپ ریکارڈ پر محفوظ کر لیے۔ یہی مکالمے یہ فی البدیہہ ڈراما ہے۔ قصہ ایک میاں بیوی کا ہے جو اس نئے سماج کو قبول کرنے کا ملمع خود پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ بیوی چار دیگر لوگوں سے تعلقات پیدا کرتی ہے جس میں جنسی تعلقات بھی ہیں اور وہ اپنے ان تجربات کو اپنے شوہر سے بھی بیان کر دیتی ہے۔ شوہر خود کو کھلی سوسائٹی کا فرد ثابت کرنے کے لیئے مرد کی نفسیات کے خلاف اسے بہت لائٹلی لیتا ہے۔ بیوی نئے نئے تجربات کرتی ہے مگر ایک موڑ پر آکر وہ یہ ضرور محسوس کرتی ہے کہ اسکی زندگی اپنے فرض میں زیادہ پُرسکون تھی۔ شوہر کتنا ہی ملمع چڑھا کر خود کو آزاد خیال کیوں نہ ثابت کر رہا ہو لاشعور میں ہندستانی ذہنیت موجود ہے اور ایک روز بیوی کے تجربات سے بیزار ہو کر اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ ڈراما چار ایکٹ میں ہے ہر ایکٹ میں بیوی کے ایک نئے تجربے اور اس کے نفسیاتی عمل اور رد عمل کو پیش کیا گیا ہے۔ چاروں ایکٹوں میں ربط صرف کرداروں سے قائم ہے ورنہ چاروں ایکٹ چار تجربات کو پیش کرتے ہیں جن کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ مجموعے کا تیسرا ڈراما ہے "مجھے ڈرائیونگ سکھا دو" اس ڈرامے میں کچھ مسائل ہلکے پھلکے انداز میں ابھرتے تو ہیں لیکن اگر یہ ڈراما "سرحد کوئی نہیں" جیسے معیاری ڈرامے کے ساتھ شامل نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔

۷: کبھی ایسا بھی ہوتا ہے: شکیل شاہ جہاں ۱۹۹۱ء

شکیل شاہ جہاں کے اس مجموعے میں پانچ ڈرامے شامل ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ

ہو راقم الحروف کا تبصرہ مطبوعہ کتاب نما دہلی بابت ماہ جنوری ۱۹۹۳ء

۸:۔ فرعون: رشید انجم ۱۹۹۲ء

فرعون ایک طویل ڈراما ہے جسمیں تیس مناظر ہیں اور ۲۰۶ صفحات پر محیط ہے اور سو سے زیادہ کردار ہیں۔ بظاہر اس میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے مگر بباطن یہ ظالم اور مظلوم کی کشمکش ہے۔ ڈرامے میں حضرت موسیٰؑ کا وہ انقلابی کردار پیش کیا گیا ہے جس میں وہ اپنی قوم کو غلامی سے آزاد کرانے کے لیے فرعون سے ٹکر لیتے ہیں۔ ڈرامے میں مصری قوم کے عقائد اور قبیح رسوم کو بھی پیش کیا گیا ہے جیسے سگی بہن سے شادی۔ مقروض کی لاش کو بطور ضمانت رکھ لینا' بردہ فروشی اور جادو پر ایمان وغیرہ۔ فرعون کا لڑکا ان رسومات کا مخالف ہے اور اسرائیلی قوم کی آزادی کا حامی ہے اور اپنے فرعون ہونے کے دعوے کو بھی چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ایک اسرائیلی لڑکی منیزہ سے محبت ضرور کرتا ہے مگر وہ اسے طاقت کے ذریعے حاصل کرنا نہیں چاہتا بلکہ اسے منیزہ کی پسند اور ناپسند پر چھوڑ دیتا ہے۔ پلاٹ ایک انگریزی ناول سے ماخوذ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول کے ہر باب کو مکالموں کے ذریعے پیش کر دیا گیا ہے اس لیے اس میں ڈرامائیت کم اور ناولیت زیادہ ہے۔ اگر رشید انجم صاحب اسکے کنواس کو مختصر کر کے ڈرامائیت پیدا کرتے تو زیادہ مناسب تھا۔

۹:۔ نئے موسم کا پہلا دن: ظہیر انور ۱۹۹۳ء

ظہیر انور کے ڈراموں کے مجموعے "نئے موسم کا پہلا دن" میں چار ڈرامے شامل ہیں۔ ان چاروں ڈراموں کی پیش کش میں روایتی انداز سے انحراف کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کے پہلے ڈرامے "آخری موڑ" پر بیکٹ کے ڈرامے "گودو کے انتظار میں" کی واضح پرچھائیاں موجود ہیں۔ ڈرامے میں دو اہم کردار ہیں۔ ایک لنگڑا اور ایک اندھا۔ یہ دونوں آج کے سماج کی علامت ہیں جو اندھا اور لنگڑا ہو چکا ہے۔ اور یہ لنگڑا اور اندھا سماج جس راستے پر چل رہا ہے اسکے آگے اندھیرا اور گہری کھائی ہے۔ اگر راستہ نہ بدلا گیا تو اندھیری کھائی میں گر جانا یقینی ہے۔ اندھا جس گاؤں یا دوار کو چھوڑ کر آیا ہے جب وہ اس کی طرف مڑ کر دیکھتا ہے تو اسے خلوص، محبت اور ہمدردی سے بھرپور دنیا نظر آتی ہے لیکن لنگڑا جب آگے دیکھتا ہے تو اسے بڑا دل خراش منظر نظر آتا ہے جہاں خود غرضی ہے، بے ایمانی ہے، ہوس پرستی ہے اور بے انصافی ہے۔ خاندان بکھر چکے ہیں، بیٹے کے لیے باپ اجنبی ہو چکا ہے۔ آج کے سماج کے یہ زبردست ایسے ہیں اور سماج اس آخری موڑ پر کھڑا ہے جو اسے تباہی کے غار کی طرف لے جا رہا ہے۔ فکر و خیال کی تہذیب بدلیسی

تکنیک میں لکھے گئے اس ڈرامے کو بڑی معنویت بخش دی ہے۔ مجموعے کا ایک اور ڈراما ہے "نئے موسم کا پہلا دن" جو مجموعے کا نام بھی ہے۔ اس ڈرامے کا مقصد آج کے مسائل زدہ انسان کی بدلتی ہوئی نفسیات کو پیش کرنا ہے جو مسائل سے جوجھتے ہوئے اپنی داخلی اور خارجی کشمکش کے باعث اپنی شناخت کھو چکا ہے اور اس کا اصل چہرہ پہچان پانا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ نفس اور ہم نفس ایک ہی شخص کے داخلی اور خارجی روپ ہیں جو آپس میں متصادم ہیں۔ اس تصادم نے انسان کو اس جگہ لا کر کھڑا کر دیا جہاں کسی مسئلہ پر آخری فیصلہ دشوار ہے۔ اور انسان اندر ہی اندر گھٹن کا شکار ہو رہا ہے اور اس کی شخصیت مختلف خانوں میں بٹ کر ٹوٹ پھوٹ رہی ہے۔ نفس اور ہم نفس کو اگر سوسائٹی کی علامت قرار دیں تو واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ سوسائٹی خارجی طور پر ہی نہیں داخلی طور پر بھی اسقدر زہر آلود ہو چکی ہے کہ اسکا صحیح چہرہ پہچانا نہیں جاسکتا۔ ڈرامے میں ماں کا ایک مکالمہ ملاحظہ ہو، یہ ایک طویل مکالمہ ہے صرف ضروری اجزا پیش کیے جا رہے ہیں۔

ماں:۔ (سفید ساڑی میں) نہیں بیٹا نہیں، تم اپنے گرد غلاظتوں کی پوری دنیا پاؤ گے...... ہواؤں میں زہر، پانی میں خرابی، غذا میں ملاوٹ، عورت اور مرد میں ملاوٹ، ہر طرف نسل کشی ہو گی اور سہل پسندی ہو گی، بیٹا تم پہنچنا تو دیکھو گے کہ دُور دُور تک لوگ آباد ہیں پر ان پر انسان ہونے کا گمان نہیں ہو گا۔ تم دیکھو گے کہ روشنیاں ہیں پر چہرے کسی کے صاف نہیں ہیں۔ تم ہزار رنگوں کی کھائی میں اچانک گرو گے اور خود کو بھی فنا کر دو گے۔ تم اپنی تلاش نہ کر پاؤ گے۔ عجیب لمحہ ہو گا وہ۔ تاریخ کا سیاہ دن ...... تمھیں آگے چل کر گرم لاوے ملیں گے اور پاؤں کے چھالے تمھیں کسی پل بھی چین نہیں لینے دیں گے۔

تو یہ ہے مستقبل کی سوسائٹی کی تصویر۔ اور انسان کا مستقبل۔ آخر میں نفس اور ہم نفس اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ وہ مل جل کر ایک خوبصورت دنیا کی تعمیر کریں گے۔ ابسورڈ تکنیک میں لکھے گئے اس ڈرامے میں زوال آمدہ سماج و انسان کی داخلی کیفیات کی بڑی خوبصورتی سے تصویر کشی کی گئی ہے۔ تیسرا ڈراما ہے "فیصلے آسمانوں کے" عنوان سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ قضا و قدر کا کوئی مسئلہ ہو گا لیکن ایسا ہے نہیں بلکہ ڈرامے کا بنیادی مسئلہ اہل اقتدار کا ہے کہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے مخالفین کو کس طرح ختم کرتے ہیں کہ وہ سر نہ اٹھا سکیں۔ کہیں سازشیں کی جاتی ہیں اور کہیں طاقت کا استعمال۔ اقتدار حاصل کرنے کے لیے بیٹا باپ کے خلاف سازش کر کے بھی شرمندہ نہیں ہوتا۔ پورا ڈراما علامتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ صاحب اقتدار کے آس پاس جو جنگل ہے وہ عوام کی علامت ہے۔ اس جنگل میں کچھ درخت زہر آلود ہو گئے ہیں۔ گویا وہ صاحب اقتدار کے خلاف زہر پھیلا رہے ہیں ان کو صاف کرنے کی تدبیریں سوچی جاتی ہیں کہ کہیں وہ

پورے جنگل کو مسموم نہ کردیں۔ جھنڈ و سکر یٹری علامت ہیں مشیروں اور چمچوں کی اور محافظ علامت ہیں اس طاقت کی جن کے ذریعے صاحب اقتدار اپنے اقتدار کی حفاظت کرتا ہے۔ آخر میں عوام شخصی اقتدار ختم کر کے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ اقتدار کا مسئلہ شخصی حکومتوں میں نہیں جمہوری حکومتوں میں اس سے زیادہ سنگین بن گیا ہے جو اس دور کا بڑا المیہ ہے۔ چوتھا ڈراما ہے "نقارہ" یہ ڈراما ۱۰ راکتوبر ۱۹۹۲ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں کھیلا جا چکا ہے۔ یہ ایک طرح سے یک کرداری ڈراما ہے۔ ریحان ثاقب اپنی عمر کے پیش نظر محسوس کرتا ہے کہ اب اسکا دنیا میں رہنا بے مقصد ہے۔ اب وہ دنیا میں تنہا ہے، بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اولاد اپنی دنیا علاحدہ بسا چکی ہے۔ ریحان ثاقب کو اپنی جوانی اور بچپن کی یادیں آتی ہیں جو اب ایک خواب معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اپنی بے مصرف زندگی کو ختم کر دینا چاہتا ہے اور ڈاکٹر سے درخواست کرتا ہے کہ اسے ایسی دوا دی جائے کہ اسکی زندگی ختم ہو جائے لیکن ڈاکٹر یہ کہہ کر انکار کر دیتا ہے کہ اسکا کام جان بچانا ہے جان لینا نہیں۔ پورا ڈراما ریحان ثاقب کی بآواز بلند سوچ پر چلتا ہے۔ اس کی بآواز بلند سوچ کو کبھی کبھی بیرونی آوازیں یا روشنی کی تبدیلی توڑتی ہے۔ ریحان ثاقب شروع سے آخر تک اسٹیج پر موجود رہتا ہے جس سے عمل و حرکت کی گنجائش محدود ہو گئی ہے۔ نیز یہ کہ ریحان ثاقب کی سوچ زندگی کا منفی پہلو پیش کرتی ہے مثبت نہیں۔ ظہیر انور کے ان ڈراموں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ بدیسی تکنیک کا ضرور استعمال کیا گیا ہے مگر ان کا ذہن اور سوچنے کا انداز دیسی ہے۔

۱۰:۔ شعلۂ آگہی: رفعت سروش ۱۹۹۳ء

شعلۂ آگہی میں گیارہ ڈرامے شامل ہیں۔ جن میں چار کو ڈانس ڈرامے، تین کو منظوم ڈرامے اور باقی چار کو ریڈیائی منظوم ڈرامے کہا گیا ہے۔ اکثر ڈرامے رفعت سروش کے دیگر مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں جنھیں یہاں یکجا کر دیا گیا ہے۔ ڈانس ڈرامے اردو میں ایک مسئلہ ہیں کیونکہ اردو میں ڈانس ڈرامے کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح اوپیرا میں موسیقی کا تسلسل نہیں ٹوٹتا ڈانس ڈرامے میں رقص کا تسلسل نہیں ٹوٹتا۔ رفعت سروش کے یہ ڈانس ڈرامے اس صفت سے محروم ہیں۔ رفعت سروش کے ڈرامے "عورت" میں یہ صفت موجود ہے مگر اس کے ساتھ یہ دقت ہے کہ کہانی سے محروم ہے اور صرف بیانیہ نظم معلوم ہوتی ہے۔ باقی تین ڈانس ڈراما کہے جانے والے ڈرامے اوپیرا سے زیادہ قریب ہیں جن میں رقص شامل کر دیا گیا ہے۔ رفعت سروش کے دیگر ڈراموں میں وقت اور تاریخ بار بار کرداروں کی شکل میں آتے ہیں۔ ان کے علاوہ فرقہ پرستی، جہالت، بے روزگاری، رشوت خوری اور روشنی وغیرہ بھی بحیثیت کردار نمودار ہوتے ہیں جن کی پیشکش پروڈیوسر کے لیے مسئلہ بن سکتی ہے۔ "اسی دیوار کے سائے میں" کو ریڈیائی منظوم ڈراما کہا گیا ہے لیکن اسے اسٹیج

پر بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ موضوع کے اعتبار سے اچھا ڈراما ہے۔ بہرحال رفعت سروش
کے ڈراموں کا اس مجموعے کے ذریعے ایک ہی جگہ مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔
۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۴ء کے درمیان ڈرامے سے متعلق دو اہم کتابیں منظر عام پر آئیں۔
ایک "اوپیرا نگاری" مرتبہ ڈاکٹر رضیہ حامد اور دوسری ڈاکٹر شاہد حسین کی "روایت اور اردو ڈراما"

۱۱۔ اوپیرا نگاری: مرتبہ ڈاکٹر رضیہ حامد ۱۹۹۱ء

ڈاکٹر رضیہ حامد نے سہ ماہی "فکر و آگہی دہلی" کا اوپیرا نمبر شائع کیا تھا۔ پھر اس میں چند مضامین کا اضافہ کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جو ایک مستحسن اقدام ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ اوپیرا مغرب سے ہندستان آیا ہے۔ مگر ابراہیم یوسف نے اپنے مضمون اوپیرا نگاری میں اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہندستان کے لوک ناٹکوں، راس لیلا، رام لیلا وغیرہ میں اوپیرا کے عناصر موجود ہیں۔ وہ مغربی اوپیرا سے اس لیے مختلف ہیں کہ ان کی جڑیں ہندستان کی مٹی میں پیوست ہیں۔ ان کی اپنی روایات ہیں اپنی تکنیک ہے اور یہ اوپیرا کامیابی سے اسٹیج ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ابراہیم یوسف نے سلام مچھلی شہری، ساغر نظامی، شہاب جعفری اور رفعت سروش کے چند اوپیراز سے تفصیلی بحث کی ہے۔ نظام صدیقی نے "ہندستانی ڈراما کی مرکزی روایت میں اوپیرا کا تخلیقیت پسند مطالعہ" میں جمالیاتی پہلو، اس کے عناصر ترکیبی وغیرہ سے بحث کی ہے۔ مغرب میں اوپیرا نگاری کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ہندستان کی تمام اہم زبانوں میں اوپیرا نگاری کا جائزہ بھی لیا ہے۔ جو مضمون کا اضافی وصف ہے۔ جناب نظام صدیقی کی ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ کیا جانا ضروری ہے۔ انھوں نے صولت عالمگیری کو منظوم ڈراما لکھا ہے جبکہ یہ اردو کا پہلا نثری ڈراما ہے اور اس میں ایک مکالمہ بھی منظوم نہیں۔ بہرحال مضمون قابل توجہ اور وقیع ہے۔ ڈاکٹر عزیز اندوری نے سلام مچھلی شہری کے اوپیرا "زیب النساء" اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے رفعت سروش کے اوپیرا "جہاں آرا" سے بے حد کارآمد بحث کی ہے۔ پروفیسر نارنگ نے "جہاں آرا" کے دو معاشقوں کا "برنیر" کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ ایک میں شاہجہاں اس دیگ میں پانی گرم کراتا ہے جس میں جہاں آرا کا عاشق چھپا ہوا ہے دوسرے عاشق کو زہر آلود پان دیتا ہے اور اس کے کھانے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ پروفیسر ان دونوں واقعات کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ برنیر ایک نہایت متعصب شخص تھا جس نے مغل شہنشاہوں اور شہزادیوں کو بدنام کرنے کے لیے بہت سی باتیں گھڑ کر لکھ دی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دیگ میں ابالے جانے کا واقعہ زیب النساء اور عاقل خاں سے منسوب ہے جسے سلام مچھلی شہری نے اپنے اوپیرا "زیب النساء" میں پیش کیا ہے۔ اگر پروفیسر نارنگ ان واقعات پر اپنی مہر لگانے سے پہلے ان کی صداقت کی تصدیق بھی کر لیتے تو مناسب تھا۔ قیصر قلندر نے رفعت سروش ہی کے ایک اور اوپیرا "جبہ خاتون"

پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور" حبہ خاتون کی زندگی کے حالات بھی بیان کر رہے ہیں۔ ادیبہ نگاری اردو کے ڈرامائی ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۲۔ عوامی روایات اور اردو ڈراما: ڈاکٹر محمد شاہد حسین ۱۹۹۲ء

"عوامی روایات اور اردو ڈراما" میں ڈاکٹر شاہد حسین نے واجد علی شاہ کے رقص ڈرامے "رادھا کنہیا کا قصہ" اندر سبھاؤں اور پارسی تھیٹر (جسے پارسیوں کا اردو تھیٹر کہنا زیادہ مناسب ہے) کے ڈراموں کی ساخت، کرداروں، موسیقی اور پیش کش پر تفصیلی بحث کر کے ان کے اندر ہندستان کے لوک ناٹکوں جیسے رام لیلا، راس لیلا اور نوٹنکی کے ان عناصر کی نشاندہی کی ہے جو اردو میں داخل ہوئے ہیں اور آج بھی اثر انداز ہو رہے ہیں۔ خاص طور پر اردو ڈرامے کی موسیقی لوک ناٹکوں کی موسیقی سے بہت متاثر ہے۔ اس کتاب میں طویل اقتباسات سے ایک بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن ان اقتباسات سے ان کے دعووں کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ اردو ڈرامے سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے کارآمد اور دلچسپی کا سبب ہے۔

کرامت علی کرامت
رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار
کٹک ۱ اڑیسہ

غزل

حاوی خرد جہاں ہو وہاں تو نظر نہ ڈھونڈ
اندھی گلی میں سلسلۂ رہ گزر نہ ڈھونڈ

نکلا جو ہے سفر پہ، کوئی ہم سفر نہ ڈھونڈ
ٹھوکر سے راستہ تو بنا، راہبر نہ ڈھونڈ

خوابوں کی بوند بوند میں چھلکا ہے ماہتاب
بہتر ہے تو فروغِ چراغِ سحر نہ ڈھونڈ

جذبات کی زباں سے ہے دل کا معاملہ
ترسیل کے لیے تو کوئی نامہ بر نہ ڈھونڈ

پھیلا کے اپنی باہیں یہ کہتا ہے آسماں
اڑنے کا حوصلہ ہے تو پھر بال و پر نہ ڈھونڈ

ملتا نہیں ہے درد میں اب جوہرِ خلوص
اس دورِ پُر فتن میں غمِ معتبر نہ ڈھونڈ

کیوں گھُل رہا ہے اپنے عزیزوں کی یاد میں
ویرانیٔ حیات میں تو اپنا گھر نہ ڈھونڈ

مر مر کے جینا تیرا مقدر ہے، یاد رکھ
رنج و الم کی قید سے ہرگز مفر نہ ڈھونڈ

سایوں کی جستجو میں قدم تیرے تھک گئے
صحرائے آرزو میں کرامتؔ شجر نہ ڈھونڈ

ستیہ پال آنند
پوسٹ بکس نمبر ۸۵۴۱۷
الریاض ۱۱۴۹۱

مرتا نہیں ہوں

اس سے پہلے کہ میں کہہ سکوں
میں بھی ہوں ـــــ
میں بھی تھا!
پومپیائی میں لاوا کے نیچے
جو کچھ سو رہا تھا
وہ میں تھا
ہڑپہ کے ٹیلوں میں خوابیدہ میں ہی تو تھا
وقت کل کا
جو گزرا بھی ہے اور گزرا نہیں ہے ابھی
میں ہی تھا
مصر کے بادشاہوں کی قبروں میں
پوشیدہ صدیوں تلک!
میں ہی "انکا" کی تہذیب تھا

میں ہی یونان تھا، روم تھا
پاٹلی پتر تھا کل تلک
آج پٹنہ ہوں
دلی ہوں، وارانسی ہوں
میں گاندھارا تھا اور قندھار ہوں
میں اجنتا بھی ہوں
اور نیویارک کا اسکائی سکریپر بھی ہوں

کل بھی تھا
آج بھی ہوں
کہ قائم ہوں
دائم ہوں
مرتا نہیں ہوں!!

اللہ حمزہ چودھری
سنوڈیہرا، ہزاری باغ

شہر آشوب

کیا حال مرے شہر کا اب پوچھو، ہو کا کا
باقی ہے اگر کچھ تو ہے بس نام خدا کا

باقی ہے کسے جرأتِ گفتار کہ بولے
بےتاب کسے کھینچے جو اس شہر کا خاکا

معدوم ہوا جاتا ہے تہذیب کا ہر نقش
کس کی نظرِ شوم اثر نے اسے تاکا

اڑتے ہیں شب و روز وہاں آج بگولے
ہوتا تھا جہاں رقص کبھی بادِ صبا کا

بجتی تھی جہاں امن کی شہنائی شب و روز
دن رات وہاں ہوتا ہے اب بم کا دھماکا

شیشے کا نگر اور برستے ہوئے پتھر
ہوتا ہے بہر گام چھناکے پہ چھناکا

وہ قعرِ مذلت میں زبوں حال پڑے ہیں
اڑتی تھی بلندی پہ کبھی جن کی پتاکا

ہے پرسشِ اعمال کا دل میں نہ ذرا خوف
ڈر ہے نہ کسی شخص کو اب روزِ جزا کا

ہے ڈاڑھی کا ہے وہ شوق کہ بھولی ہیں نمازیں
حیلہ رمضاں میں ہے مرض اور دوا کا

مجروح ہوا جاتا ہے رشتوں کا تقدس
عنقا ہوا ایثار مٹا نام وفا کا

بیٹے ہوئے خود رائے بھتیجے ہوئے سرکش
ہے باپ کی کچھ قدر نہ اب پاس چچا کا

کیا پردہ کہ اب پردۂ شرعی بھی نہیں ہے
دوپٹہ ہے آزادیِ نسواں کی پتاکا

کیا دن تھے کہ تھی شرم و حیا زیورِ کردار
اب شرم کا ہے نام، نشاں ہے نہ حیا کا

غارت گری و قتل ہے معمول شب و روز
ہے شام و سحر سانحہ بالجبر زنا کا

اپنے بھی ہوئے جاتے ہیں اب غیروں سے بدتر
وہ وقت ہوا ہو گیا جب غیر تھا کاکا

سوکھے کی کہیں مار، کہیں باڑھ کا خطرہ
اک خوفِ مسلسل ہے وباؤں کی بلا کا

بےکاریِ اولاد سے دل گیر ہیں والد
اخترؔ ہیں مسائل تو ہے حل سوچ کا ناکا

مجتبیٰ حسین

ایک ملاقات ـــ دیمکوں کی ملکہ سے

ایک زمانہ تھا جب میرا زیادہ تر وقت لائبریریوں میں گزرتا تھا لیکن جب میں نے دیکھا کہ سماج میں جہلا ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں اور اونچی اونچی کرسیوں پر قبضہ جما چکے ہیں تو میں نے سوچا کہ لعنت ہے ایسے علم پر جس سے علم کی پیاس تو بھلے ہی بجھ جائے لیکن پیٹ کی آگ نہ بجھنے پائے۔ ملک کی یونیورسٹیوں پر غصہ بھی آیا کہ اگر وہ علم کو پھیلانے کے بجائے جہالت کو ہی عام کرنے کا بیڑا اٹھا لیتیں تو آج ملک نہ جانے کتنی ترقی کر لیتا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے لائبریریوں کو خیر باد کہا اور پھر کبھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بس... باہر آ کر جہالت کے گُر سیکھنے کی کوشش کرتا، یہاں تک کہ سیاست دانوں کی صحبتوں سے بھی فیض یاب ہوا کہ یہ ہستیاں جہالت کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔ لیکن یہ گُر نہ آیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ علم کی دولت آدمی کے پاس ایک بار آجاتی ہے تو پھر کبھی نہیں جاتی۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اپنے اندر یہ جو علم کا افلاس ہے اسے کسی طرح باہر نکالوں اور اس کی جگہ جہالت کی دولت سے اپنے سارے وجود کو مالا مال کر دوں مگر یہ کام نہ ہو سکا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک عرصہ تک علم سے لگاتار اور مسلسل دور رہنے کی وجہ سے میں نے تھوڑی بہت ترقی ضرور کر لی۔

مگر پچھلے دنوں بات کچھ یوں ہوئی کہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں اسے اچانک ایک ضروری کام یاد آگیا۔ اس نے کہا کہ وہ دو گھنٹوں میں واپس آجائے گا تب تک میں یہیں کہیں اس کا انتظار کروں۔ سامنے ایک پارک تھا۔ سوچا کہ یہاں وقت گزار لوں لیکن اس عمر میں نوجوانوں کی مصروفیتوں اور ناخوشگوار حرکتوں میں مخل ہونا پسند نہ آیا۔ سامنے ایک ہوٹل تھا جس میں نہایت اونچی آواز میں موسیقی کو بجا کر گاہکوں کو ہوٹل کے اندر آنے سے روکا جا رہا تھا۔ اب وہ پرانی لائبریری ہی برابر میں رہ گئی تھی جس میں، میں اپنے زمانہ جاہلیت میں نہایت پابندی سے جایا کرتا تھا۔ خیال آیا کہ چلو آج لائبریری میں چل کر دیکھتے ہیں کہ کس حال میں ہیں یارانِ وطن۔

افسوس ہوا کہ اب بھی وہاں کچھ لوگ علم کی دولت کو سمیٹنے میں مصروف تھے، چونکہ علم کی دولت چُرائی نہیں جا سکتی، اسی لیے ایک صاحب ضروری علم حاصل کرنے کے بعد اپنے سارے گھوڑے بیچ کر کتاب پر سر رکھ کر سو رہے تھے۔ چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔

بہت دنوں بعد لسان العصر حضرت شیکسپیر، مصورِ فطرت علامہ ورڈ سورتھ، شمس العلماء تھامس ہارڈی، مصورِ غم جان کیٹس وغیرہ کی کتابوں کا دیدار کرنے کا موقع ملا۔ میں نے سوچا کہ ان کتابوں میں اب میرے لیے کیا رکھا ہے، کیوں نہ اردو کتابوں کی ورق گردانی کی جائے۔ چنانچہ جب میں لائبریری کے اردو سکشن میں داخل ہوا تو یوں لگا جیسے میں کسی بھوت بنگلہ میں داخل ہوگیا ہوں۔ میں خوفزدہ سا ہوگیا، لیکن ڈرتے ڈرتے میں نے گرد میں اٹی ہوئی "کلیاتِ میر" کھولی تو دیکھا کہ اس میں سے ایک موٹی تازی دیمک بھاگنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں اسے مارنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک دیمک نے کہا "خبردار! جو مجھے ہاتھ لگایا تو۔ میں دیمکوں کی ملکہ ہوں۔ باادب باملاحظہ ہوشیار۔ ابھی ابھی محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" کا خاتمہ کرکے یہاں پہنچی ہوں۔ جس نے آبِ حیات پی رکھا ہو اسے تم کیا مارو گے۔ قاتل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم"۔

دیمک کے منہ سے اردو مصرع کو سن کر میں بھونچکا سا رہ گیا۔ میں نے حیرت سے کہا "تم تو بہت اچھی اُردو بول لیتی ہو بلکہ اردو شعروں پر بھی ہاتھ صاف کر لیتی ہو"۔

بولی "اب تو اردو ادب ہی میرا اوڑھنا بچھونا اور کھانا پینا بن گیا ہے"۔

پوچھا "کیا اردو زبان تمھیں بہت پسند ہے"؟

بولی "پسند ناپسند کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ زندگی میں سب سے بڑی اہمیت آرام اور سکون کی ہوتی ہے، جو مجھے یہاں مل جاتا ہے۔ تم جس سماج میں رہتے ہو وہاں آرام، سکون اور شانتی کا دور تک کہیں کوئی پتا نہیں ہے۔ امن و امان کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہو۔ اب اگر میں یہاں آرام سے رہنے لگی ہوں تو تمھیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے"۔

میں نے پوچھا "لیکن تمھیں یہاں سکون کس طرح مل جاتا ہے"؟

بولی "ان کتابوں کو پڑھنے کے لیے اب یہاں کوئی آتا ہی نہیں ہے، مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ ساری کتابیں میرے لیے فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کا درجہ رکھتی ہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ تم جو اب یہاں آئے ہو تو تم بھی کتابیں پڑھنے کے لیے نہیں آئے ہو۔ کہیں تم خود مصنّف تو نہیں ہو"؟

میں نے حیرت سے پوچھا "تم نے کیسے پہچانا کہ میں مصنّف ہوں"؟

بولی "میں تمھیں جانتی ہوں۔ ایک رسالہ کی ورق نوشی کرتے ہوئے میں نے تمھاری تصویر دیکھی تھی بلکہ تھوڑی سی تصویر کھائی بھی تھی۔ ایک دم بد ذائقہ اور کڑوی کسیلی نکلی، حالانکہ وہ تمھاری نوجوانی کی تصویر تھی۔ پھر بھی اتنی کڑوی کہ کئی دنوں تک منہ کا مزہ خراب رہا۔ میں تو بڑی مشکل سے صرف تمھاری آنکھیں ہی کھا سکی تھی، کیونکہ تمھارے چہرے میں کھانے کے لیے ہے ہی کیا۔ تم اردو کے مصنّفوں میں یہی خرابی ہے کہ تصویریں ہمیشہ اپنی نوجوانی کی چھپواتے ہو اور تحریریں بچوں کی سی لکھتے ہو۔ اور ہاں خوب یاد آیا، تم نے سرسیّد احمد خاں کو داڑھی کے بغیر دیکھا ہے۔ نہیں دیکھا تو "آثار الصنادید" کی وہ جلد دیکھ لو جو سامنے پڑی ہے۔ ایک دن خیال آیا کہ سرسیّد داڑھی اور اپنی مخصوص ٹوپی کے بغیر کیسے لگتے ہوں گے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے بڑے جتن کے ساتھ سرسیّد احمد خاں کی ساری داڑھی نہایت احتیاط سے کھالی۔ پھر ٹوپی کا صفایا کیا۔ اب جو سرسیّد احمد خاں کی

تصویر دیکھی تو معاملہ وہی تھا۔ قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا" اور یہ تصویر میرے آرٹ کا ایک نادر نمونہ ہے۔ مجھے تصویروں میں مسکراہٹیں بہت پسند آتی ہیں۔ مونالیزا کی مسکراہٹ تو اتنی کھائی کہ اکثر بار بد ہضمی ہوگئی۔ زمانے کو اس کی مسکراہٹ آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ مجھے اس کا ذائقہ سمجھ میں نہیں آیا۔ عجیب کھٹ میٹھا سا ذائقہ ہے۔ کھاتے جاؤ تو بس کھاتے ہی چلے جاؤ۔ بھلے ہی پیٹ بھر جائے لیکن نیت نہیں بھرتی۔"

میں نے کہا "تم تو آرٹ کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی ہو۔"

بولی "جب آدمی کا پیٹ بھرا ہو تو وہ آرٹ اور کلچر کی طرف راغب ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ کیڑوں مکوڑوں کا پیٹ بھر جائے تو وہ بھی یہی کرتے ہیں۔ تب احساس ہوا کہ انسانوں اور کیڑوں مکوڑوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ خیر اب تو تم لوگ بھی اپنی زندگی حشرات الارض کی طرح گذارنے لگے ہو۔"

میں نے کہا "اب جبکہ تم نے خاصے اردو ادب کو چاٹ لیا ہے تو یہ بتاؤ یہ تمھیں کیسے لگتا ہے۔"

بولی "شروع شروع میں یہ میرے پلّے نہیں پڑا تھا۔ بڑا ریاض کیا۔ متقدّمین کے دیوان چاٹے۔ مشکل یہ ہوئی کہ میں نے سب سے پہلے "دیوانِ غالب" پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی۔ خاک سمجھ میں نہ آیا۔ لہٰذا مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی آسان اور زود ہضم نظمیں پہلے نوشِ جان کیں۔ پھر وہ کیا کہتے ہیں، آپ کے مظفر والے شاعر وہی جو پانی پت رہتے تھے مگر وہاں کی جنگوں میں شریک نہیں تھے۔ ارے اپنے وہی مولانا حالی۔ ان کی نصیحت آمیز شاعری پڑھی۔ شاعری کم کرتے تھے نصیحت زیادہ کرتے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ تم لوگوں نے ان کی نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ اگر کیا ہوتا تو آج تمھارے گلے میں بھی روایات کا ایک بوسیدہ سا مفلر ہوتا۔ اب تو خیر سے سارا ہی اردو ادب میری مٹھی میں ہے۔ سب کو چاٹ چکی ہوں۔ ایک بار غلطی سے جوشؔ ملیح آبادی کی ایک رباعی چاٹ لی۔ طبیعت میں ایسا بھونچال آیا کہ سارا وجود آپے سے باہر ہونے لگا۔ اس کے اثر کو زائل کرنے کے لیے چار و ناچار جاں نثار اختر کی گھر آنگن والی شاعری چاٹنی پڑی۔ ویسے تو میں نے دنیا کی کم و بیش ساری ہی زبانوں کی کتابیں چاٹ لی ہیں لیکن اردو شاعروں میں ہی یہ وصف دیکھا کہ اپنے معشوق کو کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ کوئی معشوق کے گیسو سنوارنا چاہتا ہے تو کوئی انھیں بکھیر دینا چاہتا ہے۔ کوئی وصل کا طالب ہے تو کوئی ہجر کی لذّتوں سے سرشار رہنا چاہتا ہے۔ کوئی معشوق کو کوٹھے پر بلانے کا قائل ہے تو کوئی اس کا دیدار بھی یوں کرنا چاہتا ہے جیسے چوری کر رہا ہو۔ تم لوگ آخر معشوق سے چاہتے کیا ہو۔ اسے ہزار طرح پریشان کیوں کرتے ہو۔ اردو شاعری میں معشوق، خود شاعر سے کہیں زیادہ مصروف نظر آتا ہے۔ یہ بات کسی اور زبان کے معشوق میں نظر نہیں آتی۔ اردو شاعروں کا عشق بھی عجیب و غریب ہے۔ عشق کرنا ہو تو سیدھے سیدھے عشق کرو۔ بھائی کس نے کہا ہے تم سے کہ معشوق کی یاد آئے تو آسمان کی طرف دیکھ کر تارے گنتے رہو۔ اس کی یاد نے زور مارا تو اپنا گریبان پھاڑنے کے لیے بیٹھ

جاؤ۔ معلوم ہے کہ کپڑا کتنا مہنگا ہوگیا ہے۔ سیدھے سیدھے معشوق کے پاس جاتے کیوں نہیں۔ اپنے دل کا مدعا بیان کیوں نہیں کرتے۔ عاشق بزدل اور ڈرپوک ہو تو ایسے ہی چونچلے کرکے اپنے دل کو بہلاتا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "اردو ادب پر تو تمھاری گہری نظر ہے"۔

بولی "اب جو کوئی اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہی نہیں تو سوچا کہ کیوں نہ میں ہی نظر رکھ لوں"۔

پوچھا "داغ دہلوی کے کلام کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے"؟

بولی "ان کا کلام گانے کے چکر میں اچھی خاصی بیبیاں طوائفیں بن گئیں۔ مجھے تو طبلہ اور سارنگی کے بغیر ان کا کلام سمجھ میں ہی نہیں آتا"۔

"اور ہمارے فانی بدایونی؟"

بولی "ان کے غم پر بے پناہ ہنسی آتی ہے۔ عجیب مضحکہ خیز غم ہے۔"

اور مولانا آزاد؟"

بولی "زندگی بھر ٹھاٹ سے عربی لکھتے رہے اور لوگ اُسے اردو سمجھ کر پڑھتے رہے۔ عربی کے کسی ادیب کو اردو میں شاید ہی اتنی شہرت ملی ہو"۔

میں نے کہا "یہ بتاؤ تمھیں اردو کی کتابیں کیسی لگتی ہیں؟"

بولی "تمھارا جو ادب لیتھوگرافی کے ذریعہ چھپا ہے اسے کھاؤ تو یوں لگتا ہے جیسے باسی روٹی کے ٹکڑے چبا رہی ہوں۔ پھر جگہ جگہ کتابت کی غلطیاں کباب میں ہڈی کی طرح چلی آتی ہیں۔ لیکن جو کتابیں اردو اکیڈیمیوں کے جزوی مالی تعاون کے ذریعہ چھپنے لگی ہیں وہ بہت لذیذ ہوتی ہیں۔ میں تو جزوی امداد کی چاٹ میں کل کتاب کو ہی کھا جاتی ہوں۔ ان میں ادب ہو یا نہ ہو کھانے میں لذیذ ہوتی ہیں کیونکہ مفت خوری میں جو مزہ ہے وہ محنت کی کمائی میں کہاں۔ اعزازی زندگی گزارنے کی شان ہی جداگانہ ہوتی ہے۔ ہاں ایک بات اور، اردو کا مصنف اور شاعر اپنی کتابوں کے دیباچوں میں بات بات پر اس قدر شکریے کیوں ادا کرتا ہے۔ پبلشر اور سرپرستوں وغیرہ کا شکریہ تو خیر پھر بھی برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن اردو کا مصنف اس سائکل رکشا والے کا بھی شکریہ ادا کرنے پر مجبور نظر آتا ہے جس میں بیٹھ کر وہ کتاب کی پروف ریڈنگ کرنے جاتا تھا اس کا شکریہ ادا کرنے سے تو یہی لگتا ہے کہ مصنف سائکل رکشا والے کو کرایہ بھی ادا نہیں کرتا، تبھی تو اتنا گڑگڑا کر اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر ممنون ہوتا رہتا ہے۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ ایک شاعر نے اپنے مجموعہ کلام کی اشاعت کے لیے چمڑے کے ایک بیوپاری کا یوں شکریہ ادا کیا تھا جیسے چمڑے کا یہ بیوپاری نہ ہوتا تو اردو ادب دربدر ٹھوکریں کھاتا پھرتا اور وہ بھی ننگے پاؤں۔ بھیا، چمڑے کا کاروبار اور چمڑی کا کاروبار دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ تم اپنی شاعری میں چمڑی کا کاروبار کرتے ہو۔ پھر چمڑے کے بیوپاری کو اس کی ساری خباثتوں کے ساتھ ادب میں کیوں لے آتے ہو"۔

میں نے کہا "کیا تم یہ چاہتی ہو کہ اردو کے ادیب اور شاعر کسی کا شکریہ نہ ادا کریں"۔

بولی "شکریہ ادا کرنا اچھی بات ہے لیکن اصل میں جس کا شکریہ ادا ہونا چاہیے اُس کا تو ادا کرو۔"

"میں نے پوچھا مثلاً کس کا؟"

شرما کر بولی "مجھے کہتے ہوئے لاج سی آتی ہے۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو تو اب میرے سوائے کسی اور کا شکریہ ادا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ بالآخر اب میں ہی ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہوں ورنہ اُنھیں پوچھتا کون ہے۔"

دیمک کی ملکہ کی بات بالکل سچی تھی۔ میں نے گھبرا کر کہا "تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ اگلی بار اگر میری کوئی کتاب چھپی تو اس میں تمھارا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔"

ہنس کر بولی "اتنی ساری بات چیت کے بعد بھی تم اپنی کتاب چھپواؤ گے۔ بڑے بے شرم اور ڈھیٹ آدمی ہو۔ مرضی تمھاری۔ ویسے میرا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اگر کتاب ہی میرے نام معنون کردو تو کیسا رہے گا۔"

یہ کہہ کر دیمکوں کی ملکہ "کلیاتِ میر" کی گہرائیوں میں کہیں گُم ہوگئی اور میں لائبریری سے باہر نکل آیا۔

غزل

مرزا نعیم اللہ بیگ
۱/۷۹ - ہاشمی خانہ، فتح گڑھ۔
(یو پی)

ان کا اعجازِ مسیحائی نمایاں نہ ہوا
دردِ دل، دردِ جگر کا کبھی درماں نہ ہوا

فیض تو عام تھا مجھ پہ مگر احساں نہ ہوا
کیا خبر کیوں میرا پُر گوشۂ داماں نہ ہوا

حسرتوں کا دلِ بے تاب میں بے حد تھا ہجوم
اشکِ غم کوئی کبھی اپنا تہِ داماں نہ ہوا

عمر بھر گو رہے وہ میری رگِ جاں کے قریب
دل میں بیدار کبھی دید کا ارماں نہ ہوا

عشق کے میں نے ادا دل سے کیے تھے ارماں
وائے قسمت کہ عطا ساغرِ عرفاں نہ ہوا

دشت و کُہسار نے وحشت کا مری ساتھ دیا
راہِ الفت میں کبھی خارِ مُغیلاں نہ ہوا

دورِ حاضر کی سیاست ارے توبہ توبہ
رہنما کوئی کبھی مشفقِ انساں نہ ہوا

میری حُبّ الوطنی پر تو قصیدے کہے لیکن زائرؔ
کوئی فن کار شریکِ غمِ دوراں نہ ہوا

غزل

عبدالقوی ضیاء
961 AUGER ST
SUDBURY ONT
P3A 4A7

دل ہے آئینہ، نظر آئینہ
ایک صورت ہے، بھر آئینہ

کس کو آغوش میں لینے کے لیے
خود میں ہے گرمِ سفر آئینہ

اُس کے چہرے کو جو دیکھا تو رہا
دیر تک آئینہ گر، آئینہ

کوئی دل خاک ہوا ہے شاید
گرد آلود ہے ہر آئینہ

صاف گوئی کا ہے دعوا سب کو
کس نے دیکھا ہے مگر آئینہ

ختم ہو وقفۂ حیرت تو کھلے
ہے کدھر عکس، کدھر آئینہ

عکس کتنے ہی نمایاں ہوں ضیاؔ
سنگ بن جائے اگر آئینہ

مقبول حسن لاری
محلہ، بلاقی پور، گورکھپور، یوپی

پھر کس نے درِ زنداں سے پکارا ہے مجھے
پھر مرے دل نے بغاوت پہ ابھارا ہے مجھے

جب سے رکھا ہے قدم راہِ وفا میں میں نے
تلخیِ زہرِ ہلاہل بھی گوارا ہے مجھے

جس نے روشن کیا تاریک فضاؤں میں چراغ
اس چمکتے ہوئے لمحے کا سہارا ہے مجھے

ایک مانوس سی آواز سنی ہے میں نے
موجِ گردابِ بلا! کس نے پکارا ہے مجھے

خود وہی میری حفاظت بھی کرے گا مقبولؔ
جس نے سنسان جزیرے پہ اتارا ہے مجھے

شریف قریشی
بھوسہ منڈی، فتح گڑھ، ضلع فرخ آباد

آج کا دن بھی یوں گزار آئے
گلیوں گلیوں تجھے پکار آئے

جستجو رائیگاں گئی، لیکن
دل سے اک بوجھ تو اتار آئے

لوگ ہر غم، جہاں بھلا بیٹھے
ہم وہاں سے بھی سوگوار آئے

دن کے ساتھی دعا کو ہاتھ اٹھا
ہجر کی رات سازگار آئے

ہم تہلتے ہیں اس چمن سے شریفؔ
اب خزاں آئے یا بہار آئے

غنی اعجاز
مومن پورہ۔ اکولہ

ہم کہ اک شعلہ صفت راہی تھے جن راہوں کے بیچ
منزلیں گردِ سفر تھیں ان گذرگاہوں کے بیچ

شدّتِ درد و الم اور ضبط کی پابندیاں
کتنی چیخیں گھٹ رہی تھیں دم بدم آہوں کے بیچ

کوئی صورت میری ناکامی کی تھی پیشِ نظر
روز و شب اک سوچ تھی میرے بھی خواہوں کے بیچ

سلطنت کے دائروں کو وسعتیں دینے کی بات
چپکے چپکے چل رہی تھی ہر جگہ شاہوں کے بیچ

گردشیں طے کر گئیں سب دوریوں کے فاصلے
آ گئے کتنے زمانے وقت کی باہوں کے بیچ

پروین کمار اشک
کرشنا اسٹریٹ۔ پٹھان کوٹ

سانس چلتا رہے اکر دعا! شکر کر!
وقت ٹلتا رہے اکر دعا! شکر کر!

تیرا مجرم ضمیر اس کی درگاہ میں
تو ملتا رہے کر دعا! شکر کر!

خواہ چھونے نہ دے چاند ہو سامنے
دل مچلتا رہے کر دعا! شکر کر!

اس کی رحمت رہے رات کی کوکھ سے
دن نکلتا رہے کر دعا! شکر کر!

صبر والا شجر درد کی دھوپ میں
اور پھلتا رہے کر دعا! شکر کر!

جھوٹ کی آندھیوں میں مرا حق چراغ
اشک جلتا رہے کر دعا! شکر کر!

شگفتہ طلعت سیما
شبلی ہاؤس۔ کلکتہ

مطالبہ

اپنے ماحول پہ چھائے تھے جو خونیں بادل
ان کے سینے پہ اب اک چاک نظر آتا ہے
اور اس چاک کے پیچھے مرا مقصودِ نظر
مشعلِ نور لیے ہاتھوں میں مسکاتا ہے

اس سے پہلے بھی کئی لوگ یہاں اُٹھے تھے
ان شرر بار فضاؤں کو بدلنے کے لیے
اِس سے پہلے بھی پیمبروں کی طرح اہلِ خرد
وقت کے ناگ کو آئے تھے کچلنے کے لیے

پھر بھی سنولائی رہی چرخ پہ تاروں کی جبیں
چاند کے چہرے پہ بہتے رہے جلتے آنسو
زندگی لٹتی رہی اہرمنی ہاتھوں سے
اور ہر سمت رہی جلتی ہوئی لاشوں کی بو

اپنی نظروں میں ہے ماضی کا فسانہ اب تک
ہر تبسم پہ فضاؤں سے شرارے برسے
یوں تو بجھنے کے لیے رات کئی بار ڈھلی
پر ہر اک صبح کو جلووں کے لیے ہم ترسے

پھیر لیں تلخ حقائق سے نگاہیں کیوں کر
نارِ نمرود پہ ہم کیوں نہ رہیں چیں بہ جبیں
آگ میں پھول کھلانے کا ہو دعویٰ جس کو
آج اس ملک میں ایسا کوئی خوش فہم نہیں

اب بھی بے رنگ ہر اک صبح نظر آتی ہے
جلوۂ روحِ عمل کی ہے ضرورت اب تک
سامنے آ تو گیا ہے نیا محمل لیکن
اس کی آغوش کو لیلیٰ کی ہے حاجت اب تک

ساحر افغانی
۴۹۔ چپاپورہ۔ جاؤرا، ایم پی

کشمکش

سلگتی بھوک
سسکتی ہوئی
یہ
بیماری
نہ تابِ ضبط ہے کوئی
نہ حوصلہ باقی
ہیں چند سکّے بشکلِ عذاب
ہاتھوں میں
شدید جنگ ہے
اس وقت دو تقاضوں میں
دوا خریدیں
یا
بچوں کے واسطے روٹی

۱۹۹۳ میں مکتبہ جامعہ کی نئی مطبوعات

اسرار خودی (فرہنگ شرح اور ایڈیشن) شائستہ خاں ۷۵/-
غلام ربانی تاباں کتاب نما کا خصوصی شمارہ اجمل اجملی ۷۵/-
عابد علی خاں (کتاب نما کا خصوصی شمارہ) مجتبیٰ حسین ۴۵/-
خواجہ احمد فاروقی۔ مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم ۴۵/-
علی سردار جعفری مرتبہ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ۴۵/-
اختر سعید خاں مرتبہ ڈاکٹر سید حامد حسین ۵۰/-
نثار احمد فاروقی مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۵۱/-
آتش رفتہ کی گرمی (مضامین) سید حامد ۵۴/-
انداز گفتگو کیا ہے (تنقید) شمس الرحمٰن فاروقی ۷۵/-
میں سمندر ہوں (شعری مجموعہ) فرحان سالم ۴۰/-
جھینی جھینی بینی چدریا (ناول) عبد بسم اللہ ۷۵/-
صحرا نورد کے خطوط (طویل افسانے) مرزا ادیب ۷۵/-
دستک اس دروازے پر (علمی) ڈاکٹر وزیر آغا ۶۵/-
اپنے دل کی حفاظت کیجیے ڈاکٹر لیفٹیننٹ کرنل کے ایل چوپڑا ۲۵/-
سرسید یادگاری خطبات (پروفیسر مونس رضا، پروفیسر مسعود حسین)
مرتبہ: خواجہ محمد شاہد ۱۰/-
چہرہ در چہرہ (خاکے) مجتبیٰ حسین ۵۷/-
تفہیم (تحقیق) رشید حسن خاں ۷۵/-
تعلیم و تعلم (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۷۵/-
اردو شاعری کی گیارہ آوازیں۔ پروفیسر عبد القوی دسنوی ۷۵/-
تاریخ الامت ششم (تاریخ اسلام) مولانا اسلم جیراجپوری ۲۷/-
" ہفتم " " ۱۸/-
کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے سید نقی حسین جعفری ۵۱/-

EXPERIMENTS IN ENGINEERING CHEMISTRY
(for undergraduate engineering students)
Dr. Masood Alam 51/-

شناس و شناخت۔ انور صدیقی ۶۰/-

مکتبہ پیام تعلیم کی نئی کتابیں

پہاڑی کا ہم ثریا فرخ ۱۱/۵۰
رسالہ دینیات اوّل ۳/-
" دوم ۴/-
" سوم ۵/-
" چہارم ۵/-
" پنجم ۶/-
رسول پاک کے اخلاق خلیل احمد جامعی ۶/-
سفر کے قصے آصف فرخی ۸/-
چیزوں کی کہانیاں " ۷/۵۰
دادی اماں کی کہانیاں " ۶/-
حضرت آدم علیہ السلام منورہ نوری خلیق ۴/-
حضرت یحییٰ علیہ السلام " ۳/-
ہم سب کا ننھو منیر احمد راشد ۸/-
خواجہ غلام السیدین ذکیہ ظہیر ۸/-
میر امن دلی والے اسلم فرخی ۱۱/۵۰
میرزا ادیب طاہر مسعود ۱۲/۵۰
تین بندوقچی مسعود احمد برکاتی ۱۰/-
نقوش سیرت اوّل حکیم محمد سعید ۸/-
" دوم " ۵/-
" سوم " ۵/-
" چہارم " ۵/-
" پنجم " ۵/-
انشا اور تلفظ رشید حسن خاں ۹/-
پھلجھڑیاں سطوت رسول ۶/-
چارلی چیپلن ریحان احمد عباسی ۹/-
بچوں کے مولانا حسرت موہانی ڈاکٹر اسلم فرخی ۱۴/-
گیارہ بہنیں اور ایک شہزادی ڈاکٹر سید حامد حسین ۱۲/-

مقصود الٰہی شیخ

دِل نہ دریا، سمندر خالی

تیسرے دن اسے مٹھی بھر قرار نصیب ہوا۔ تھوڑا سا سکون میسّر آیا۔ طبیعت ٹھہر سی گئی۔ وہ تین روز تک جلتا رہا تھا۔ اذیتوں میں ڈوبا یہ سوچ سوچ کر مرتا رہا تھا کہ آخر وہ مرا کیوں نہیں ہے۔ دل بند ہو جانا چاہیے تھا۔ دم گھٹ جانا چاہیے تھا۔ یوں بار بار پل صراط سے گزرنا یا اس جہنم کا ایندھن بننا جس میں سات دوزخوں کے انگارے جمع کر کے اسے جھونک دیا جائے۔ یہ تو اس کا مقسوم نہیں تھا۔ وہ ایسی قابلِ نفرت تقدیر لے کر تو پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس بات کا اسے یقین تھا۔ یہ سب قسمت کا لکھا نہیں ہو سکتا۔ پھر کیوں؟ آخر کیوں؟ حقیقت اتنی بدشکل، بدنما، اور بھدّی بن کر سامنے آتی تھی۔ شروع سے لگتا چلے شروع سے، اس کی تقدیر میں لہروں کے جھوکے ہی مرقوم تھے۔ اس کے نصیب میں زمانے بھر کے کانٹے کس نے بوئے تھے؟ دیکھو تو، سنو تو، گنو تو — وہ گن چکا تھا۔ ایک ایک کر کے گنے تھے — پورے سولہ ہزار — اس کی رگ و پے میں چبھے ہوئے کانٹوں کی گنتی اتنی بنتی تھی —

وہ تین دن سے ایک ایک کانٹا چن رہا تھا۔ بڑی بے رحمی سے ایک ایک نوکیلا خار بدن کے گوشے گوشے سے نوچ رہا تھا۔ کئی کانٹوں کی نوکیں اکھڑتے ہوئے اس کی انگلیوں کی گرفت میں کپکپاہٹ سی آجاتی تو انتہائی باریک نوک کا سرا ٹوٹ کر وہیں پیوست رہ جاتا۔ جہاں چبھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے لگتا جیسے یہ ٹوٹی نوکیں اپنی جگہ دبی دبی گل سی گئی ہیں۔ یہ بدل کر پھر اور بن جائیں گی۔ مگر ان سے چھٹکارا نہ ملے گا۔ وہ لذتِ حزن کی اس منزل پر پہنچ گیا تھا جہاں درد، درد نہیں رہتا۔ بدن سے تو وہ ایک ایک کانٹا چن رہا تھا مگر آنکھوں میں جو سوئیاں گھر بنا چکی تھیں۔ ان سے نجات کا کوئی پہلو اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

اس نے کتنے آدرش کچل کر بڑے بھائی سے قرض مانگا تھا۔ اس کے ایک مانگنے کے فعل نے کس طرح اس کی روح کو داغ داغ کر کے لہولہان

کر دیا۔ ہر زخم سے خون رِس رہا تھا۔ لہو بہہ رہا تھا۔ نظر نہ آنے والے سرخ رنگ اُبلے پھوٹ رہے تھے۔ وہ کرب سے کراہا، وہ تکلیف سے بلبلایا۔ وہ درد سے تڑپا۔ وہ اذیت سے دریدہ ہوکر تار تار ہوا مگر نہ تو یہ بود ا رشتہ ٹوٹا اور نہ ہی اس کا دم نکلا۔

وہ حیران تھا کہ اس کے جسم میں ہنوز دم تھا۔ وہ کتنا سخت جان تھا! اس پردیس میں وہ یہ صدمہ سہہ گیا۔ جس طرح اس کی ذات کے ساتھ اس کا نام چپکا ہوا تھا، بالکل ویسے ہی اس کے ساتھ یہ رشتہ جڑا ہوا تھا کہ وہ چھوٹا بھائی ہے۔ یہ مقدروں کی بات ہے ــــ اذیتوں کے لامتناہی سلسلے اور دکھ کی لامحدود فصیل نہ پھلانگ سکے۔ کے بعد بھی وہ محسوس کر رہا تھا، اس میں ابھی دم ہے۔ کیا ہوا وہ یوسف نہ ہوا، وہ مصر کے بازار میں نہ بکا۔ کنویں میں نہ گرایا گیا۔ اگر ــــ

اگر ــــ

اگر ــــ واقعی اسے سولہ ہزار نہیں، سولہ لاکھ کانٹے پڑ گئے ہوتے تو کیا وہ ان کو ایک ایک کرکے نہ چنتا۔

جینے کے لیے یہ سب تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

جیسے کایا چھٹ گئی، بادل پھٹ گئے۔ اس کے دل سے، اس کے دماغ سے کانٹوں کی چبھن محو ہوتے لگی، کسی چور کی طرح جلدی سے دروازہ کھول کر نکلی۔

تب،

پل کی پل،

دل نے چٹکی برابر قرار پکڑا ــــ وہ سنبھل سا گیا۔

پھر ــــ ،

یہی قرار ــــ بڑھتے بڑھتے مٹھی بھر ہوگیا!!

اس کے منہ میں لعاب کے جمع ہونے سے تلخی غائب ہونے لگی اور شکر گھلنے لگی۔ وہ مجسم رحم بن گیا۔ بھائی سے گلہ خوشی کی لوزات بن گیا۔ اسے کیا غم، وہ آزاد ہے۔ وہ کتنا مہان ہے۔ جو اس کے لیے کچھ نہ کر پائے، وہ ان کے لیے کچھ کر سکتا ہے۔ وہ چھوٹا تو ہے چھوٹا نہیں!! جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے، بھائیوں کی محبت کاغذ کی ناؤ نکلی۔ کاغذ کی ناؤ کو ڈوبنا ہی تھا۔ سو، ہزار قدم نہ سہی سولہ چپو سہی ــــ ڈوبنے والے تو کنارے پر ڈوب جاتے ہیں۔ ایک بلبلہ نہیں اٹھتا۔ وہ بھی تو اسی دنیا کے باسی ہوتے ہیں، یہ تو سات سمندر پار کر آیا تھا، اوروں سے زیادہ حوصلہ رکھتا تھا۔

ہاں،

اس نے سوچا،

اب میرا وہاں کون ہے ؟

بھائی، دیکھ لیے، بہن دیکھ لی۔ ان کے ٹھنگار دیکھ لیے۔ ان کے غرور، بڑائی میں ملفوف چھوٹائی، ان کے اُلجھاوے، ان کے برتاوے دیکھے، اور کیا دیکھنا تھا۔

رہ گئے ـــ اماں ابا ـــ اب ان کی ہڈیاں بھی باقی نہ ہوں گی۔ ورنہ ـــ

وہ سوچ میں پڑ گیا، سوچ گہری ہوئی، درد بلی ہوئی، پھر کڑوی کڑوی ہو گئی۔

ورنہ، وہ ان کی قبریں اکھاڑ لاتا۔ ان کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے لیے ہی تو وہ وطن جاتا رہا ہے۔ اماں کے مرنے پر کسی نے اطلاع تک نہ دی تھی۔ پردیس میں یہ غم اسے بہت دکھی کر گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کا یہ زخم ابدی بن گیا۔ خدایا کسی کو چھوٹا نہ بنا۔ یہ چھوٹائی، غربت کی ہو یا اخوت کی، اس جیسے لوگوں کی ازل سے دشمنی چلی آ رہی ہے۔ خلوص، سلوک، اور پیار یک طرفہ ہوتا ہے۔ پلٹ کر پوچھنے کی روایت پر کوئی نہیں چلتا ـــ"

ابا کا آخری وقت، رخصت، دائمی رخصت کا وہ منظر اس کی آنکھوں میں محفوظ تھا۔ ابا نے دو چار سانس لیے، وہ بھی کھینچ کر نہیں، اتنے ہلکے ہلکے کہ منہ تک نہ کھلا۔ اسے تو جب پتا چلا کہ بہن نے بلند آواز میں انا للہ کہا، ابا کی آنکھیں ہاتھ رکھ کر بند کیں اور رونے لگی ـــ ان کے ابا کی بڑی عزت تھی، جدھر سے گزر جاتے 'حاجی صاحب سلام'، 'حاجی صاحب سلام' کی صدائیں آنے لگتیں۔ اسے اپنے ابا سے زیادہ محبت نہ تھی۔ کبھی اچھے لگتے کبھی بالکل اچھے نہ لگتے۔ لوگ کہتے اس کے ابا بڑے خوب صورت ہیں۔ لوگ کیا رشتے دار، جو ہر کسی پر ناک بھوں چڑھاتے تھے وہ بھی ابا کی تعریف کرتے۔ ان کے عزیزوں میں یوں تو کئی بڑے بڑے افسر وغیرہ تھے۔ مگر ایک انکم ٹیکس کمشنر زیادہ آتے جاتے تھے۔ شاعر تھے۔ مشاعروں میں جانے سے اخباروں میں آتے اور خاصے مشہور بھی تھے۔ ان کی ایک بیٹی دو ایک فلموں میں پلے بیک دے چکی تھی۔ اپنے ڈیڈی کو سگریٹ سلگا کر وہی دیا کرتی تھی۔ ہر جگہ، ہر محفل میں!! وہ بھی کہا کرتی "تایا جی بڑھاپے میں اتنے شکیل وجمیل نظر آتے ہیں تو جوانی میں تو بہت ہی زیادہ خوب صورت ہوں گے ـــ!!!

اس نے تو ابا کو سدا سے، سر سے پیر تک روئی کے گالے ایسا ہی دیکھا تھا۔

اماں کی شکل وصورت واجبی تھی۔ نقش موٹے موٹے تھے۔ رنگ بھی کلونس بھرا تھا۔ غیر برادری کی تھی ۔ غریب خاندان کی ہوں گی۔ وہ سب کے لیے بس تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ اماں کا اپنا رویہ تھا جو بنھ رہی تھی مگر کسی کو ان کی پرواہ نہ تھی۔ ویسے تو بھابھی بھی رنج کے بدصورت تھیں مگر مجال ہے کوئی

ان کو فالتو سمجھتا۔ ایک تو وہ برادری کی تھیں، دوسرے امیر گھرانے سے تھیں لیکن اسے اماں شاید ہی کبھی بڑی لگی ہوں۔ وہ اماں سے قریب تھا۔ وہ خاصا بڑا ہو گیا تب بھی، جب تک اماں اس کے منہ میں نوالہ نہ ڈالتیں اس کا پیٹ نہ بھرتا ــــ وہ پندرہ سولہ سال کا ہو گیا، اس وقت تک اماں ہی آخری نوالہ بنا کر اسے دیتی تھیں۔ سب مذاق اڑاتے۔ پھر اماں ادھر ادھر دیکھ کر اسے نوالہ دیا کرتیں ــــ اور جب اماں فوت ہوئیں تو وہ پردیس آچکا تھا۔ کسی نے بروقت اطلاع بھی نہ دی۔ اماں کے گزرنے کی اطلاع کافی دنوں بعد ملی۔ رو دھو کر چپ بیٹھ گیا۔ اس زمانے میں جانا آنا مشکل تھا۔ وہ کئی برسوں تک گھر نہ جا سکا۔ پھر جب گیا تو وہ سب اماں کو بھول بھال چکے تھے۔ ابا اکیلے رہتے تھے۔ وہ چند دن ابا کے پاس ٹھہرا۔ کوئی ملنے ملانے نہ آیا۔ ابا نے بھی کہا، وہ چھوٹا ہے، اسی کو بڑوں سے ملنے جانا چاہیے۔ وہ گیا بھائیوں سے ملا۔ ان سے لڑا، بہن سے شکایت کی کہ اماں کی بیماری کی اطلاع تک نہ دی۔ مرنے پر بلایا تک نہیں۔ وہ دکھ اور درد سے گلا کیا۔ جواب میں بے اعتنائی اور تعجب کا اظہار ہوا۔ بہن نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ اتنے دن ہو گئے، بھول بھال سکے۔ اماں خاصی بیمار رہیں۔ بھئی سب نے خدمتیں کیں، دیکھا بھالا۔ اگر تمھیں خبر بھی کرتے تو تم اتنی دور بیٹھے بھلا کیا کرتے؟ بہن کا مطلب تھا آخری وقت ٹال نہ سکتے تھے۔ انھوں نے کہا "سب نے سوچا تھا تمھیں بڑا دکھ ہوگا۔ جنازے پر بھی پہنچ نہ سکو گے۔ تمھیں اماں سے بڑا پیار تھا۔ وہ تمھیں یاد بھی کرتی تھیں۔" لیکن انھوں نے باتوں باتوں میں سنایا تھا کہ اماں کو زیادہ پیار بڑے بھیا سے تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہر کوئی کہتا "تم پر نظر پڑتے ہی اماں یاد آجاتی ہیں" دراصل وہ اماں پر گیا تھا۔ بچپن ہی سے اسے احساس دلایا گیا تھا کہ وہ اماں پر ہے۔ اور اماں تو ابا کی طرح خوب صورت نہ تھیں۔ اس لیے وہ بھی کسی مغالطے میں نہ پڑے، اب اسے کسی نے یہ تو جتلایا نہ تھا کہ وہ بھی اماں کی طرح غیر برادری کا لگتا ہے۔ مگر سلوک وہ نہیں تھا جو آپس میں دوسرے بہن بھائیوں کا تھا۔ بڑے بھیا نے تو ایک مرتبہ اماں کو معمولی خاندان کی ان پڑھ خاتون کہہ دیا تھا۔ وہ جانے کس حوالے سے بات کر رہے تھے۔ مگر اس سے برداشت نہ ہوا، بھائی سے لڑ پڑا، زبان درازی کی، ہفتوں ان سے بولا تک نہیں۔ اسے اماں ابا دونوں سے ہی پیار تھا۔ پھر جب وہ پردیس آگیا تو دونوں کی یاد میں رویا کرتا۔ یہ تصفیہ نہ ہو سکا کہ اسے اماں زیادہ پسند ہیں یا ابا؟ ابا سے زیادہ قربت نہ تھی۔ مگر اماں کی خوبیاں وہ خوب گنوا سکتا تھا۔ اماں صلح پسند تھیں۔ لڑائی بھلا

ینا۔ دل صاف کرلینا کسی کو بُرا نہ کہنا، مگر تھیں بڑی خوددار، قوت برداشت
بھی بہت تھی۔ میاں کو برداشت کیا تو کیا، رشتے داروں اور اولاد کا بُرا سلوک
بھی سہہ جاتیں۔ غصّہ پینے کی عادت تھی۔ پلٹ کر جواب نہ دیتیں۔ لیکن خودداری
کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی بھی زبردست تھی۔ کبھی احساسِ کمتری میں
بتلا نہ دکھائی دیں۔ کسی نے تنگ کیا تو کہا "نادانو! معاف کیا —" جیسے وہ
نہیں جانتے وہ کس پایے کی کس مرتبے کی عورت ہیں!!

شاید یہ پردیس کی تاثیر تھی اسے اماں ابا ہی یاد نہ آتے تھے بلکہ وہ پھر سے
بہن بھائیوں سے محبت کرنے لگا تھا۔ ان کی اولادوں کو چاہنے لگا۔ اسے لگتا
وہ بھی اسی کی اولادیں ہیں۔ ایک ایک کو خط لکھتا۔ تحفے بھیجتا۔ کھلونے بھیجتا۔
یہ دن وے ٹریفک شاید جاری ہی رہتا کہ ایک روز احساس ہوا اس کے اپنے
بچے بڑے ہوگئے ہیں۔ اب وہ کزنوں کے بارے میں سوال پوچھتے ہیں۔ بیوی
نے بھی پھٹکارا۔ اوروں کو کچھ بھیجنے کی توفیق نہ ہو گی۔ کسی نے کبھی اپنی یا
بچوں کی تصویریں تک بھیجنا گوارا نہ کیا۔ — مت کہا کرو میرے بچوں کو خط لکھنے
کے لیے۔ کس کو لکھیں خط، کوئی جواب نہیں دیتا۔ ان بچاروں کو کیا پتا کون
کس کا ہے، کیسا ہے؟ جن کی شکل تک نگاہوں میں نہ ہو۔ ان کی محبت میرے
بچوں پر خواہ مخواہ مسلط کرتے ہو۔ واہ بھئی واہ!! اس نے سوچا ٹھیک تو ہے۔
بچے سب کے برابر ہوتے ہیں۔ یکساں سلوک اور برتاؤ ہونا چاہیے۔ پھر یہ ریت
بندھی کہ جو کوئی اسے اور اس کے بچوں کو یاد کرے گا یعنی کچھ بھیجے گا۔ اسی
کو یہ بھی جواب دیا کریں گے۔

وہ، جو اب بچوں کا باپ تھا۔ عمر میں اپنے بہن بھائیوں سے چھوٹا تھا۔
سب سے چھوٹا، اس کا دل اس معنوں میں ذرا سا تھا کہ پل کی پل میں
پگھل جاتا۔ بھئی وہ سب تو بڑے ہیں۔ ان کا ادب لازم ہے۔ ایک بار امریکہ
سے طوفان شروع ہوا تو یورپ تک تباہی پھیلاتا چلا۔ اخباروں میں اینڈریو ہری
کین کے چرچے رہے۔ وطن کے اخباروں میں بھی خبریں چھپی ہوں گی۔ اس کے
اپنے گھر کی چھت اڑ گئی تھی۔ یہاں تو نظام ہی اور ہے۔ بھلا اس نے وطن کس
کو لکھنا تھا، کوئی امداد تو منگوانی مقصود نہ تھی۔ ایک روز بیٹھے بٹھائے برمنگھم
سے ٹیلی فون آیا کوئی گرائیں بریڈ فورڈ آ رہا تھا اور اس سے ملنا چاہتا
تھا۔ آؤ جی آیاں نوں —!! وہ صاحب آئے تو گھر والوں کی طرف سے کچھ
پونڈ دے گئے کہ آپ کے بڑے بھائی نے ان کو لکھا تھا کہ تین ہزار روپوں کے
برابر پونڈ میرے بھائی کو دے آؤ۔ وہاں تین ہزار، آج بھی تین ہزار ہوں گے
مگر پونڈ کتنے ہوں گے؟ لیکن اس کے پیچھے جو جذبہ تھا وہ محبتوں سے گندھا

ہوا تھا۔ اس نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ "بھی سب یہیں سے اُدھر بھیجتے ہیں، میرے گھر والوں نے تو بن مانگے بھیج دیا۔ رفتہ رفتہ روپوں اور پونڈ کا ذکر گفتگو سے نکلتا گیا۔ بس کہتا گیا۔ "ہزاروں بھیجے ہیں۔" "دیکھو تو مرگ ہو، خوشی ہو یہاں سے جاؤ۔ خرچ کرو۔ میرے گھر والوں کی محبت دیکھو کر اخبار میں خبریں پڑھ کر میری مدد کو پہنچ گئے — !! جن لوگوں کو خوشی غمی کے علاوہ مقدمے بازی کے لیے قرض اتارنے کے لیے یہاں سے رقمیں بھیجنا پڑتی تھیں۔ خطوط کے جواب تک کے لیے ترسنا پڑتا تھا، وہ بھی اس کی باتیں سن کر حیرت سے تکا کرتے۔ بیوی بھی چپ سی ہو گئی۔

بیوی جب کی چپ ہوئی اس وقت بولی جب ڈائرکٹ ڈائلنگ سسٹم شروع ہوا۔ اس نے تو کبھی میکے میں ٹیلی فون کیا نہیں تھا۔ یہی اٹھتے بیٹھتے اپنے گھر والوں سے نمبر ملایا کرتا۔ ٹیلی فون کے یہ لمبے لمبے بل بنتے کہ ہوش اڑ جاتے۔ ادھر والے تو یوں ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتے جیسے — جتنی دیر لگائیں گے اتنا ہی ثواب ملے گا۔ کس قدر سست رفتار لوگ ہیں اپنے وطن کے، حالانکہ وہاں بھی خوشی کا بے پایاں اظہار ہوتا تھا۔ دنوں آئے گئے کو سنایا جاتا کہ انگلستان سے ٹیلی فون آتا ہے تو ۴۵ منٹ سے کم بات نہیں ہوتی۔

پھر زندگی میں ٹھہراو سا آگیا۔ بچے یونی ورسٹیوں میں گئے تو خط و کتابت کم ہوگئی۔ مصروفیتیں بڑھ گئیں۔ لیکن وہاں کا حال تو وہاں والے جانیں، یا خدا جانے، یہاں دلوں میں محبت پہلے سے کسی طرح کم نہ ہوئی تھی۔ اب تو بیوی بھی وطن جانے کے لیے ترسا کرتی۔ بچوں کو پاکستان جانے کی زیادہ لگن نہ تھی۔ ایک بار گئے تو دوبارہ جانے کے لیے آمادہ ہی نہ ہوتے تھے۔ بڑی بیٹی نے کہا تھا کہ آپ کا دل وہاں جانے کو چاہتا ہے کہ وہ آپ کا وطن ہے۔ آپ کو اچھا لگتا ہے۔ کبھی آپ نے سوچا یہ ہمارا وطن ہے۔ ہمیں یہیں رہنا اچھا لگتا ہے۔ آخر ہم یہیں پیدا ہوئے ہیں۔ پلے بڑھے۔ چھٹیاں ہوتی ہیں، کہیں آنے جانے کی بجائے جب آپ ادھر کا پروگرام بناتے ہیں تو سچی ہمیں اچھا نہیں لگتا — !!

اب کے کئی سال بعد وہ اکیلا وطن آیا تو اسے بہت اچھا لگا۔

بہت سی تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ خود اس کے گھر میں جو اب اس سے زیادہ اس کے بھائی بہن کا گھر تھا اور کئی گھرانوں پر پھیل چکا تھا، بہت کچھ بدل گیا تھا۔ بہن بیوہ ہو چکی تھیں۔ ان کے بچے اپنے اپنے گھروں میں آباد تھے۔ بڑے بھائی ریٹائر ہو چکے تھے۔ دوسرے بھیا سینیٹ کے ممبر بن چکے تھے۔ ان کا شمار تو اب وطن کے بڑے لوگوں میں ہونے لگا تھا۔ ساری عمر

کلرکی کرتے رہے تھے۔ دانتوں سے پائیاں پکڑانے کی عادت تھی مگر اب کاروبار وسیع تھا۔ فراغت تھی۔ شہرت اور عروج پر تھے۔ تین تین کاریں تھیں۔ پہلے ہی دن ایک کار اس کے حوالے کر دی گئی۔ بھابی بھی وارے صدقے ہو رہی تھیں۔ یہ اس کی پسند کی بھابھی تھیں۔ یہ بھی کیا رشتہ ہوتا ہے۔ تقدس اور رومان دونوں آمیز ہو کر بڑے مضبوط رشتے میں یک جان ہو جاتے ہیں لیکن اپنی عادتوں سے یہ بھابھی دور ہی رہتی تھیں۔ اب کے ملیں تو جان پڑا، یہی تو اس کے خوابوں کی تعبیر والی بھوجائی تھیں۔ بھائی کے شانہ بشانہ سیاست میں، کاروبار میں، دلچسپی لیتی بھابھی نے جب اس پر توجہ دی تو پچھلے تمام گلے جاتے رہے۔ اسے لگتا سارے ملک کا نظام اس کے بھائی اور بھابھی چلا رہے ہیں۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں لیے لیے پھرتے، بڑے بڑوں سے تعارف کرایا۔ یہی ترغیب دی کہ آؤ یہاں آکر بزنس شروع کر دو۔ وطن کا بھی تم پر حق ہے۔ اپنی صلاحیتوں سے یہاں اچھی کاروباری روایتوں کو فروغ دو۔

وہ اتنا خوش تھا اتنا خوش جیسے نیا جنم لیا ہو۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ یوں محسوس ہونے لگا اس کا دل لگ جائے گا۔ شاید وہ پھر سے یہیں بس جائے۔ بیوی بچوں کو یہیں بلا لے۔ یہ کوئی ناممکن اور ان ہونی بات تو نہ ہوتی مگر ان ہونی بات یہ ہوئی کہ ایک روز سو کر اٹھا تو لگا اماں اس کے آگے پیچھے ہیں۔ بڑا اداس ہوا، بڑا نادم ہوا۔ وہ وطن اماں اباجی کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے آیا کرتا تھا۔ اب یہاں اس کے لیے کیا رکھا تھا؟ سب اپنے اپنے گھروں کے ہو گئے۔ اس کا کوئی گھر نہ رہا تھا۔ ذرا بھائی نے لفٹ کرائی تو یہ سب کچھ بھول بھال گیا!! سخت ندامتوں سے گھرا قبرستان نکل گیا۔ کتنے ہی برس پہلے وہ آیا تھا تب ان قبروں کو درست کرا گیا تھا۔ اس کے بعد کوئی فاتحہ پڑھنے تک نہ آیا ہو گا۔ سخت خستہ حالت میں تھی۔ اماں کی قبر آدھی دھنس گئی تھی۔ وہ سرہانے بیٹھا روتا رہا۔ اپنے کو کوستا رہا۔ پھر قبرستان کے رکھوالے بابا کے ساتھ مل کر اماں ابا دونوں کی قبروں کو صحیح شکل صورت دی۔ لیپا پوتا اور گھر آیا۔ اپنے کانوں سے وہ سنا جو اسے نہیں سننا تھا۔ بھابھی کی کوئی ملنے والی آئی بیٹھی تھی۔ بھابھی ان سے کہہ رہی تھیں "لوگ باگ ولایت سے یوں منہ اٹھائے چلے آتے ہیں جیسے یہاں سب فرصت میں بیٹھے ہیں۔ اس نے سوچا کہ میرے آنے سے جو کھڑکا ہوا تو بھابھی کو معلوم تو ہو گیا ہو گا کہ کوئی آیا ہے لیکن یہ پیاری بھابھی پہلے سے بدلی بدلی تھیں اور پہلے سے زیادہ نڈر اور بے باک بھی ہو گئی تھیں۔ انھیں اس کی کب پروا تھی کہ وہ کچھ کہہ رہی ہوں تو کوئی سن

لے گا۔ سن لے گا تو ان کا کیا بگاڑ لے گا ۔۔ وہ اپنی دوست سے کہہ رہی تھیں۔
"میں نے بچوں سے کہہ دیا ہے۔ فرصت ہو، فرصت ملے تو آنا، ورنہ کون سا
قرآن حدیث میں لکھا ہے کہ کرایہ بھاڑا خرچ کر کے آؤ اور چاچے سے ملو۔
چاچا خود جا کر مل آئے نا ۔۔"

اس کا دل بیٹھ گیا۔ اسے اپنی اوقات اور حیثیت یاد آگئی۔ وہ اپنا گھر، بیوی
بچے چھوڑ کر یہاں ایسے بیٹھا تھا جیسے یہی اس کا گھر ہے۔!! اس کا قرار چھن
گیا۔ کیا یہ سب ملمع تھا؟ شاید اسی لیے اماں کی روح پھڑ پھڑا، پھڑپھڑا کر اس
کے پھیرے لے رہی تھی۔ اس پر تصدق ہو رہی تھی۔ اس نے رات کھانے کی
میز پر اعلان کیا "کل چلا جاؤں گا۔" اس نے بھابھی کی طرف دیکھا، وہاں اتنا
سا بھی ردِ عمل نہ تھا جتنا مُنہ پر سے مکھی اڑاتے سے ہوتا ہے۔ خود ہی اس
نے وجہ بتائی جیسے جینپ مٹا رہا ہو۔ "بی بی بیمار ہے۔ بھائی بولے "کیا
کوئی ٹیلی فون میری غیر موجودگی میں آیا؟ کیسے پتا چلا" اس نے جواب دیا "اماں
ابا کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے گیا تھا۔ واپسی پر راستے میں بڑا ڈاک خانہ آیا، وہاں
سے بات کی تھی۔۔" بھائی ناراض ہو گئے۔ "یہ کیا غیریت ہے؟ ہزاروں کا بل
آتا ہے۔ اڑوس پڑوس کے لوگ آکر ہمارے ہاں سے ٹیلی فون کرتے ہیں
اور میرا بھائی ۔۔ چھوٹا بھائی اپنے گھر باہر سے ٹیلی فون کرتا ہے ۔۔ واہ!!
بھئی تمھارا سے کیا فرق پڑتا۔ ہمارے سامنے کرو تو ہم بھی اپنے بھتیجے بھتیجیوں
سے بات کر لیا کریں۔ کیوں بیگم؟" اور بیگم مُنہ پھیر، ہاتھ بڑھا کر اپنی پلیٹ میں
کھانا پروسنے میں محو تھیں۔ اسے لگا بھابھی سچی ہیں۔ بھائی منافقت سے
کام لے رہے ہیں حالانکہ وہ اپنی جگہ سچے تھے۔ ان کی طرف سے ہزاروں کا
جس طرح ذکر آیا تھا وہ کوئی اور تصویر دکھا رہا تھا اور بھابھی کی اپنی دوست
سے گفتگو کے دوران جو انکشاف ہوا اس میں یہ صداقتوں بھری سچائی تھی کہ
اتنے دنوں میں اُن کے بچوں میں سے کوئی آکر اس سے نہ ملا تھا۔ یہ وہ بچے
تھے جن کو اس نے گودوں میں کھلایا تھا۔ ان کے پیار کے نام اسی نے
رکھے تھے اور بچے ابھی تک گھر میں انھیں ناموں سے پکارے جاتے تھے۔
کسی نے کسی ایک نے تو محسوس نہ لیا کہ ان کا چچا آیا ہے جس سے چڈی
لے لے کر وہ اسے تھکا دیتے تھے!!

اوروں کے مقابلے میں اسے اپنے منجھلے بھائی سے ہمدردی اور محبت
دونوں ہی جذبے مقابلتاً زیادہ محسوس ہوتے تھے کہ یہ اوروں کی نسبت
زیادہ خوش حال نہ تھے۔ کلرکی سے آغاز کیا تو قلم گھس گھس کر سپرنٹنڈنٹ بنے
تھے۔ ہاں جب وہ پردیس گیا تو ان کی ترقی رکی ہوئی تھی۔ اس بیچ میں کتنے انقلاب

ئے۔ پاکستان اور ہندوستان کی دو جنگوں میں تلے اوپر ترقیوں کے بعد انتہا تک پہنچے، پھر بھائی ریٹائر ہوئے۔ بزنس شروع کیا۔ سینیٹ کے ممبر بنے۔ سچ ہے خوراک سے عقل اور پوشاک سے روپ آتا ہے۔ اب یہاں بھائی بھابھی پر روپ بھی تھا اور عقل کی فراوانی بھی تھی۔ روپے کی ریل پیل تو تھی کہ اسے آتے ہی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ـــــ یہ بے دریغ خرچ اور خاطر مدارات ـــــ کیلیہ سب ـــــ، اس کے دماغ میں ایک کمینہ سا خیال چمکا ـــــ کیا یہ سب ہوٹلوں کے چکر، سیر و تفریح، اونچے احباب سے تعارف و ملاقاتیں، زیر تعمیر مکانات کے بارے میں مشورے، کاروبار میں شراکت کی دعوت۔ کیا یہ سب اُسے دکھانے، اسے مرعوب کرنے کے لیے تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر بھائی کی طرف دیکھا۔ بھابی کی طرف دیکھا۔ بھائی کتنے سیدھے سادے ہیں۔ وہ جو محاورہ ہے کہ ہر کامیاب شخص کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے، یہ میری حسین بھابی وہی عورت تو نہیں، جس نے بھائی کو کامیاب بنایا ہے۔ لیکن وہ جو کچھ سچ کہہ رہی تھیں اور جو بھائی تھوڑی دیر پہلے تک کہہ رہے تھے، اس تضاد کے پیچھے کیا ہے؟

کھانے سے فارغ ہوئے تو گرم گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کے اعصاب کا اکڑاؤ کسی قدر کم ہوا۔ کچھ راحت محسوس ہوئی۔ اس نے کمینہ سا خیال جھٹک دیا۔ وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگا کہ جب بھائی بھابھی اس کے یہاں گئے تھے تو وہ بچھ بچھ گیا تھا۔ وہ، اس کی بیوی اور بچے پھولے نہیں سمارہے تھے۔ تو کیا وہ سب دکھاوا اور دکھاوٹ تھی۔ منافقت تھی یا انھیں متاثر کرنے کی کوشش؟ میل ملاپ میں جب آدمی ہمت سے بڑھ کر، خاطر تواضع کرتا ہے تو اس میں خلوص ہوتا ہے۔ خوش کرنے کا جذبہ ہوتا ہے؛ یہ کیا واہیات بات اس نے سوچی تھی؟ ایسا تو اس سمے بھی نہیں سوچتے جب روز روز کی ملاقات ہو۔ دہلیز سے دہلیز ملی ہو۔ کون ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر بیٹھتا ہے ـــــ تاہم اس کا دل صبح سے اچاٹ تھا۔ سوچ کا رخ اماں کے سائے کے احساس سے ہٹا۔ قبرستان میں قبروں کی حالت دیکھ کر کڑھا پھر اوپر سے بھابھی کی باتوں نے مسوس کر رکھ دیا۔ آخر روپے پیسے کی اتنی ریل پیل تھی تو کیا بھائی اماں ابا کی قبروں کی مرمت زندگی میں ایک بار بھی نہیں کرا سکتے تھے؟ ایک روز جا کر فاتحہ نہ پڑھی؟

وہ رات اس نے بے چینی سے سوتے جاگتے گزاری ـــــ!!

وہ دو روز اور زبردستی رکنے پر رکا لیکن اس حقیقت کے باوجود کہ بھائی نے تو دو تین بار ٹیلیفون کر کے بی بی کی خیریت دریافت کی تھی۔ اس کی بیوی

سے حالات معلوم کیے تھے۔ تسلی دی تھی وہ مزید رکنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس کی بیوی دونوں سے تذکرہ کرچکی تھی کہ آج کل کاروبار مندے کا شکار ہو چکا ہے۔ وصولیاں اٹکی ہوئی ہیں۔ ادائیگیوں کے تقاضے بڑھتے جارہے ہیں۔ بچے امتحانوں (موک ایگزام) میں مصروف ہیں۔ پارٹنر دلچسپی نہیں لے رہا۔ کاروبار یہ نزاکتیں اور دشواریاں بھائی سمجھتے تھے۔ کہنے لگے۔ اچھا جاؤ لیکن معاملات درست کرکے جلدی آنا۔ دل نہیں بھرا۔ تاثر تو یہ تھا کہ ابھی ٹھہروگے۔ اطمینان سے کئی باتیں کرنی تھیں۔ کئی پروگرام بنانے تھے۔ بہت سے باہمی مشورے کرنے تھے۔ بھابی نے بھی جس پیار محبت سے رخصت کیا وہ بھول گیا کہ اس کو ان کی کسی بات سے رنج پہنچا تھا۔

تین ہفتے یوں خوش گوار گزرے تھے جیسے وہ کسی نہایت آرام دہ، نرم نرم بستر میں سہانے خواب دیکھتا رہا ہو۔ واپس لندن آکر بیوی بچوں کو مزے لے کر ذرا ذرا سی تفصیل سناتا رہا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ انھیں احساس دلادے کہ وہ جو کچھ رائے بھی اپنے کزنوں کے بارے میں رکھتے ہیں وہ ٹھیک نہیں۔ تعصب پر مبنی ہے۔ لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ وہاں تو سمندر سے گہری محبتوں کے خزانے ان کے منتظر ہیں۔ تھکی ٹوٹی بیوی بھی پوری دلچسپی سے یہ سب سنا کرتی۔ پردیس میں رہنے والے شاید محبت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ یا اپنے مسائل سے فرار کے لیے انھیں ایسے تذکرے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ پر جب وہ دونوں علاحدہ اور تنہا ہوتے تو کاروباری مسائل کے دباؤ میں آکر گھبرا گھبرا اٹھتے۔ دس سال میں دوسری مرتبہ ری سیشن نے چھاپا مارا تھا۔ پہلی بار تو ایشیائیوں نے ان جالوں کی طرح اتنا زیادہ بوجھ محسوس بھی نہ کیا تھا مگر اب کے تو ہر کسی کے لب پر یہی رونا تھا۔ ہر کوئی مہنگائی، مال کی ناپیدی اور مندے کا مارا۔ شکوے شکایت سے لدا پھندا خود رحمی میں مبتلا تھا۔ لگتا تھا بے روزگاری اور کڑکی نے خاص طور پر ایشیائیوں کو ہی نشانہ بنایا ہوا ہے۔

ایک روز اس کا ایک گرائیں وطن جانے سے پہلے ملنے آیا۔ تو اس نے ایک رقعہ مانگا۔ بھائی کے نام ایک خط تاکہ وہ اپنے اثر رسوخ سے اس کی خرید کردہ زمین پر حق شفعہ کا جو جھوٹا مقدمہ چل رہا ہے اسے نمٹانے میں مدد کریں۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ وہ خوش ہو گیا۔ خط دے کر گرائیں کو ٹوک لا۔ ضرورت ہو تو بھائی کو کچھ رقم دینے کے لیے بھی لکھ دوں؟ وہ بولا "دراصل جو کچھ بھیجنا تھا۔ بینک میں بھیج چکا ہوں۔ یہ لالچ پہلی بار کیا ہے۔ اب تو ہر کوئی یہی سوچتا ہے کہ بلیک سے رقم بھیجی جائے تو اتنے ہزار زائد ملیں

گئے __ ۔ لیکن اس نے جاتے جاتے جیب سے چار سو پونڈ نکالے اور اس کے حوالے کر دیے کہ وہاں ضرورت تو پڑے گی ۔ بھائی کو لکھ دینا یا بلیک سے بھجوا دینا۔ یہ اسے غیبی امداد سمجھا چار سو پونڈ لے کر بل میں ڈال دیے۔ ان دنوں "کیش فلو" بہت ہی کم ہو رہا تھا۔ اس کو سوجھ آئی اگر بھائی سے دو زیادہ نہیں تین ماہ کے لیے دو چار ہزار پونڈ قرض لے لے تو وہ جس گرداب میں پھنس چکا ہے اس سے نکل آئے گا۔ ادائیگیاں ہو جائیں گی۔ دباؤ کم ہوگا تھوڑا چین ملے گا۔ وصولیاں تو یہاں ہو ہی جاتی ہیں۔ آج کل سارا زور وصولیوں پر ہی تھا۔ ہر طرف کاروبار کی صورت یہی ہو رہی تھی۔ کہ لوگ ادائیگی دبائے بیٹھے ہیں۔ اسی وقت رقم بھیجتے ہیں جب کوئی عذر نہیں چلتا۔ کوئی چارا نہیں رہتا۔ شام کو بچے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو اس نے بیوی سے کہا لو بے فکر ہو جاؤ۔ بھائی کو لکھنے کی دیر ہے۔ اپنی پریشانی کا دور، انشاء اللہ دور ہو جائے گا۔ بیوی نے کہا زیادہ مانگنے سے پہلے یہ جو چار سو لیے ہیں ان کے لیے لکھ دو تاکہ کسی گرائیں کے سامنے شرمندگی نہ ہو۔ بات معقول تھی۔ وہ کون سا بلیک کا دھندا کرتا تھا۔ صبر نہ کر سکا فوراً ٹیلی فون کھڑکایا خوش قسمتی سے بھائی نے اٹھایا وہ سونے جا رہے تھے۔ بھابھی پڑوس میں کسی کے یہاں رسم حنا میں شرکت کرنے گئی تھیں۔ خیر و عافیت کے بعد اس نے بے تکلفی سے کہا۔ بھائی آپ کو معلوم ہے آتے ہی کاروبار کو سنبھالنے میں لگ گیا۔ صرف ایک لاکھ روپوں کی ضرورت ہے۔ وہ بھی تین مہینے کے لیے قرض کی صورت میں۔ فی الحال فتو پورے کا رفیق میرا رقعہ لے کر آئے گا اسے سولہ ہزار روپے دے دیجیے گا۔ بھائی نے فوراً جواب نہ دیا تو یہ الجھن میں پڑ گیا۔ پوچھا، "کوئی دقت ہو تو رہنے دیجیے۔ میں جانتا ہوں۔ بعض وقت کاروباریوں سے چھوٹی رقم نکالنی مشکل ہوتی ہے۔" ادھر سے جواب ملا۔ "نہیں یہ بات نہیں۔ میرا اصول ہے کہ کسی کو دو ماہ سے زیادہ قرض نہیں دیتا اور بڑی رقم تو بالکل نہیں دیتا۔ ویسے فکر نہ کرو۔ بندوبست ہو جائے گا۔ تم بھابھی سے ذکر نہ کرنا۔"

یہ فکر کیسے نہ کرتا۔ بڑی الجھن میں پڑ گیا۔ چہرے کے ردِ عمل سے بیوی پوری بات سمجھ گئی۔ دینے کو تو وہ تسلی دلاسا دے رہی تھی۔ لیکن وہ بھی پچھتاوں میں پڑ گئی تھی۔ بولی، "آپ جتنی جلدی خوش فہمی میں پڑتے ہیں اس سے بھی جلدی مایوسی کا شکار ہوتے ہیں۔" جب ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو بولا "لعنت بھیجو خوش فہمی اور غلط فہمی پر میں ابھی ٹیلی فون کرتا ہوں اور بھائی کو منع کرتا ہوں۔ رفیق کے پیسے جیسے تیسے بھجوا دوں گا۔ مجھے نہیں لینا کچھ بھائی

سے " وہ جل بھی رہا تھا۔ بیوی نے سہارا دیتے ہوئے کہا " جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب چاپ چاپ بیٹھیے۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔ آخر آپ اس مرتبہ اس قدر بے حوصلہ کیوں ہو رہے ہیں ؟" " دیکھو بیوی " اس نے کہا " کوئی بڑا بول سامنے آ رہا ہے۔ کبھی قرض نہیں لیا۔ گھر والوں سے کبھی بھول کر کوئی بپتا نہیں کہی۔ یہ اتنی چھوٹی سی رقم کے لیے بھائی نے کیا کہہ دیا۔ میں تو یہیں ڈوب مروں ۔" وہ وحشت میں گھبرا گھبرا کر بول رہا تھا۔ یہ تو پردیس ہے۔ یہاں بھائی کی طرح بلڈنگیں نہیں کھڑی کیں۔ مگر چلن ایسا رہا ساکھ ایسی ہے کہ کسی سے ہزار بارہ سو کھڑے کھڑے مانگ لوں تو انکار نہ ہوگا۔ تن تنہا یہ دنیا بسائی ہے۔ مگر وہ تو میرے بھائی ہیں۔ لین دین نہ ہوا ہو مگر عادت خصلت سے تو ضرور واقف ہوں گے۔ انھوں نے ایک لاکھ روپوں کا اعتبار نہ کیا۔ چھوٹا سا کاروبار ہے پر دھاک ہے۔ آندھیاں آئیں مگر چراغ جلتا رہا۔ پلٹ کر گھر والوں کی طرف نہیں دیکھا۔ کسی سے مدد نہیں مانگی۔ کسی کو کبھی زحمت نہیں دی۔ سبھوں کے کام آیا ہوں۔ کسی کا کچھ مارا نہیں۔ " وہ بس بولے چلا جا رہا تھا۔ جذبات میں ڈوب رہا تھا اور بیوی ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اسے خطرہ تھا دل کی تکلیف عود نہ کر آئے۔ اس لیے کہا " آپ صبر اور حوصلے سے کام لیں۔ اچانک ٹیلی فون کیا تھا پتا نہیں بھائی جان بات سمجھے یا نہیں۔ وہ تو سونے جا رہے ہوں گے۔ یہاں سے وقت چار پانچ گھنٹے آگے ہی ہوتا ہے۔ " " تم چپ کرو جی " اس نے بیوی کو ڈانٹا " اب تو میں چند ملنے والوں سے چار \ سو پکڑ کر اپنا کام چلا ہی لوں گا۔ یہ پریشانی اب نہیں رہی۔ مجھے تو یہ غم ہے کہ بھائی کی نظر میں میری اتنی بھی وقعت نہیں۔ پھر وہ تو داری اور نثار ہو رہے تھے تو اس کا کیا مقصد تھا؟ " وہ یوں ہی بولے چلے جا رہا تھا کہ نیند کا جھونکا آ گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر ہوا ہوگا کہ بیوی نے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ " بھابھی کا ٹیلی فون آیا ہے۔ "

پہلے تو وہ سمجھا بھابھی شاید یہ کہیں گی کہ تم مجھے بتاؤ کتنی رقم چاہیے مگر انھوں نے تو اس کے تن سے روح تک کھینچ لی۔ انھوں نے بڑی غیر جذباتی انداز میں کہا " میں تمھیں صاف بتا دوں۔ یہ جو تم نے کسی کو رقم دینے کو کہا تو ہم کسی ایسے ویسے چکر میں پڑنے کے قائل نہیں۔ مہربانی کر کے وہ اپنے فتو حلورے والے کو کہنا ہمارے یہاں نہ آئے۔ مجھے امید ہے تم کوئی دوسرا بندوبست کر لو گے۔ " ٹیلی فون بند ہو گیا مگر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بھائی نے دھم سے گھونسہ اس کے سینے پر کھینچ مارا تھا۔ اس کی ضرب کون سی ہلکی تھی۔ کہ رہی سہی کسر بھابھی نے پوری کر دی۔ وہ کیا سمجھتے ہیں میں ان

رقم کھا جاتا، واپس نہ کرتا۔ کیا اتنا گیا گزرا ہوں۔ لاکھوں کے مالک بنتے ہیں۔ فرض کرو میں کھا بھی جاتا تو کون سے کنگلے ہو جاتے۔ ساری عمر میں پہلی بار کچھ طلب کیا تو ٹھینگا دکھا دیا۔ سب کچھ دکھاوا تھا۔ دکھاوا تھا۔" اس نے دیکھا بیوی وہاں نہ تھی۔ اسے ایک دم اپنی بیوی پر غصہ آ گیا۔ جب اس کی رائے نہیں تھی منع کر رہی تھی تو اور زور ڈال کر روک دیا ہوتا۔۔۔ بیوی کچن سے چائے کا ایک کپ بنا کر لے آئی۔ کہنے لگی: "دیکھیے جو ہونا تھا وہ ہوا۔ کم از کم بات صاف ہو گئی۔ اب خدارا اس قصے کو طول نہ دیجیے۔ صبح آپ کو بہت سے کام کرنے ہیں اب سو جائیے۔۔۔" بھلا اسے چین کہاں تھا۔ اس نے ٹیلی فون اٹھا کر گود میں رکھا اور خاندان کے ایک ایک فرد کو ٹیلی فون کھڑکا دیا۔ اس نے بڑی اداکاری اور میٹھی بولی میں سب کو کہا "میں شام سے بھائی کو ٹیلی فون کر رہا ہوں۔ شاید لائن خراب ہے۔ بھئی صبح سویرے تکلیف کر کے جانا اور بھائی جان سے کہنا میں نے کسی صاحب کو مروتاً ایک رقعہ دیا ہے کہ سولہ ہزار کی ادائیگی کر دی جائے۔ مگر یہ رقعہ مصلحتاً دیا ہے۔ بھائی صاحب سے کہنا رقعہ لے کر پھاڑ دیں۔ رقم نہ دیں۔" بھلا کس کا رقعہ کس نے جا کر رقم طلب کرنی تھی وہ تو جب ضرورت پڑتی پھر اسے لکھا جاتا۔ تب اس نے رقعہ بھیجنا تھا۔ بیوی نے تڑپ کر ٹیلی فون چھین لیا۔ "غضب خدا کا، چار سو تو تم نے ان کالوں پر ہی خرچ کر دیا ہوگا۔"

"اب تم میرے ساتھ ماتھا نہ لگاؤ"۔ تم کیا جانو میرا کیا حال ہو رہا ہے۔ اس صدمے سے میرا ہارٹ فیل ہو جاتا تو کیا تمھارا اتنا پیسا میرے فیونرل پر نہ اٹھ جاتا؟ سولہ ہزار، سولہ ہزار، یعنی چار سو پونڈ۔ اتنا اعتبار نہ کیا بھائی نے؟۔ بتاؤ وہ جو نوازشات ہو رہی تھیں۔ مجھ پر زندگی میں پہلی بار مہربانیاں دکھائی جا رہی تھیں۔ محض اپنی شان دکھانا مقصود تھی؟ مجھے اپنی امارت سے مرعوب کر رہے تھے؟ کس لیے؟ کس لیے؟ میں تو سمجھا تھا ایک ایک دعوت پر ہزاروں خرچ کر دینے والا بھائی۔ وطن واپس بلانے والا بھائی۔ میرے دکھوں کا مداوا بن جائے گا۔ میری مالی پریشانیاں دور کرے گا۔ آخر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ کیا مجھے وہ اٹھائی گیرا سمجھتے ہیں۔ اتنا اعتبار نہ کیا۔ کیا میں ان کا کھا جاتا؟

—— پھر وہ بستر سے اٹھا۔

سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر برسوں پہلے بھائی کا لایا ہوا تحفہ پاکستانی اونیکس کا گلدان دھرا تھا۔ وہ اٹھا کر سر سے اونچا لے گیا اور چھوڑ دیا۔ زور کا دھماکہ ہوا۔ بچے اپنے کمروں سے گاؤن پہنے نکل آئے۔ وہ کھڑا ایک ایک سے کہہ رہا تھا

اٹھاؤ یہ کرچیاں گنو۔ گنو تو ان کو! پوری سولہ ہزار نکلیں گی۔ بیوی نے بچوں کو کچھ ایسا تسلی آمیز اشارہ کیا کہ وہ حیران مگر چپ چاپ اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ تم اگر میری بیوی ہو تو ابھی گنو گنو اور اٹھاؤ یہ کرچیاں کسی ڈبے میں جمع کرو اور صبح مجھے بتائے بغیر بھائی کو پارسل بھیج دو۔ ساتھ خط لکھنا۔

پلیز
گن لیجیے
سولہ ہزار ہیں پوری سولہ ہزار
کرچیاں
چاہے تو روپے سمجھ لیجیے۔
ویسے یہ ایک پردیسی بھائی کے دل کے ٹکڑے ہیں۔

وہ دن گن رہا تھا۔ پہلے دن ٹوٹا گلدان جہاں پڑا تھا پڑا رہا۔ دوسرے دن وہ کرچیاں بیوی نے اٹھا کر ایک ڈبے میں ڈال دیں۔ اس نے سوچا تیسرے دن بھی بیوی نے پارسل نہ بھیجا تو وہ خود یہ کام کرے گا۔ بھائی کو معلوم ہونا چاہیے کہ دوسروں کو جھوٹا تاثر دینا نہیں دینا چاہیے۔ میرا ان کا میل ملاپ ہی غیروں والا تھا۔ ان کو زندگی میں پہلی بار بھائی بن کر ملنے اور پھر اپنا بخشا ہوا جھوٹا اعتماد لوں واپس لینے کا کوئی اختیار نہ تھا۔

تیسرے دن،
تیسرے دن صبح صبح ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔
آپریٹر نے کہا پاکستان سے کال ہے۔
اس کا دل اچھل کر گلے میں آ اٹکا!
الٰہی خیر، الٰہی خیر!!

دو چار لمحوں میں کئی قیامتیں گزر گئی ہوں گی۔ لائن کٹ گئی۔ پریشانی اور تجسس سوا ہو گیا۔ کئی منٹوں بعد دوبارہ گھنٹی بجی۔ فوراً ہی بھائی کی آواز آئی۔

"میں اور تمھاری بھابھی حج پر جا رہے ہیں۔"
"بھئی کہا سنا معاف کرنا"

اس نے اپنا سانس اندر کھینچا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ لگا اندر ہی اندر کایا پلٹ گئی۔ آواز پر قابو پا کر دھیرے سے بولا "بھائی میرے لیے بھی دعا کیجیے گا۔" یہ کہتے کہتے آنسو جو جانے کہاں چھپے بیٹھے تھے۔ پلکوں سے چھلک کر چپ چاپ انجانی منزلوں کی طرف چل پڑے۔

دل میں کندہ شکایتوں کے انبار ڈھلنے لگے۔ دل کے پاش پاش — سولہ ہزار ٹکڑے — سولہ ہزار نہ رہے گھٹتے گھٹتے ان کی تعداد دو ہندسوں تک محدود ہو گئی۔ دو ہندسے نہیں۔ دو لفظوں میں سمٹ گئی۔

"معاف کیا، معاف کیا"

"بسلامت روی و باز آئی" (خیر سے جائیے، خیر سے واپس آئیے)

کڑواہٹیں دور ہو گئیں۔ منہ میں مٹھاس گھل گئی۔ دل دھیرے دھیرے قرار پکڑنے لگا۔ سکون کا احساس پیدا ہوا۔ اسے لگا اس کی مٹھی صبر و قرار کی دولت سے بھری ہے۔!! ●●

شمشاد حسین
پروفیسر شعبۂ نفسیات و ڈائرکٹر
انسٹیٹیوٹ آف کرسپنڈنس کورسیس
پٹنہ یونیورسٹی۔ پٹنہ

خوابوں کی حقیقت

ہماری زندگی میں خوابوں کی بڑی اہمیت ہے اور ہم ان کی تعبیر میں بہت دلچسپی دکھاتے ہیں خوابوں سے متعلق کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ خواب صرف خواب ہیں اور انسانی زندگی میں ان کا کوئی دخل نہیں۔ خواب حقیقت سے دور ہوتے ہیں لیکن ایسا سوچنا بالکل ہی غلط ہے۔ خواب کے پیچھے کچھ راز نہاں ہیں اور در پردہ کوئی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے اگر اس کا دلچسپ مطالعہ کریں تو اس کا تعلق انسان کی خواہشات، احساسات، کشمکش اور رنج والم وغیرہ سے ہے اور اگر ہم اس کی اہمیت کو نہ سمجھیں تو یہ صرف ایک افسانہ ہے۔ اگر ہم خواب کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کریں تو خواب دلچسپی کا باعث ہیں۔ اور ان کی دلچسپ کہانیاں ہیں اور ان کے پیچھے کچھ اسباب ہیں خوابوں کی نوعیت پر جب بحث چھڑتی ہے تو بہت سارے سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خواب جسمانی اور مادی حالات کی وجہ سے سامنے آتے ہیں جیسے اگر ٹھنڈے میں انسان سو گیا ہو تو دیکھتا ہے کہ وہ برف کے پہاڑ پر چل رہا ہے اسی طرح اگر باہر بہت گرمی ہے تو دیکھتا ہے وہ ریگستان پر کسی تلاش میں بھاگ رہا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خواب ہمارے ماضی کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو کچھ کا کہنا ہے کہ وہ حال یا مستقبل کو بتاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خواب میں انسان کے شعور کا ہاتھ ہے تو کچھ کا کہنا ہے کہ ان کے پیچھے لاشعور کا ہاتھ ہے خوابوں کی دلچسپ کہانی پر اگر ہم غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ کہانی خاص طور سے اس وقت شروع ہوتی ہے جب مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ نے اپنی دلچسپ کتاب INTERPRETATION OF DREAM لکھ کر لوگوں کے ذہن کو جھنجھوڑ دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ خواب انسان کی نیند کی حفاظت کرتے ہیں نہ کہ اس میں رکاوٹ ڈالتے ہیں انسان جب سو جاتا ہے تب وہ باہری دنیا سے تو بے خبر ہو جاتا ہے لیکن اس کے اندر کے جذبات اور احساسات اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور اسے پریشان کرتے ہیں لیکن جب وہ خواب دیکھنے لگتا ہے تو وہ اس میں ہی الجھ کر رہ جاتا ہے اور چین سے سوتا ہے اس لیے باہری اور اندرونی دونوں محرکات سے چھٹکارا پا لیتا ہے اور نیند کا لطف اٹھاتا ہے اسی لیے فرائڈ نے خواب کو نیند کا محافظ کہا ہے نہ کہ وہ نیند میں دخل انداز ہوتا ہے فرائڈ کے نظریہ پر اگر غور کریں تب یہ پتہ چلتا ہے کہ خوابوں کے پیچھے کتنے راز پوشیدہ ہیں جن کا انکشاف ضروری ہے فرائڈ نے خوابوں کی تشریح انسانی ذہن میں دبی ہوئی خواہشات کے بنا پر کیا اور ان کے پیچھے لاشعور کا ہاتھ بتایا۔ انسان کی روزمرہ کی زندگی میں بہت ساری ایسی خواہشیں ابھرتی ہیں جن کی تکمیل نہیں ہو پاتی کیونکہ سماج اس کی اجازت نہیں دیتا یا پھر وہ اس کے اندر بہت ساری کشمکش پیدا کر دیتی ہیں اس لیے انسان لاشعوری طور پر ان کو دبا دیتا ہے اور ان کے وجود سے ہی انکار

کرتا ہے۔ لیکن دبی ہوئی خواہشات مردہ ہو کر لاشعور میں نہیں رہتیں بلکہ ہمیشہ اپنی تشفی کے لیے بے چین رہتی ہیں اور کئی راستوں سے اپنا اظہار کرتی ہیں ایسے اظہار کا ایک طریقہ خواب دیکھنا ہے۔ خواب میں ہم ان ہی خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں جنہیں ہم اپنے ماضی میں دبا دیتے ہیں۔ ایسی خواہشیں اپنی تکمیل کے لیے بہت سارے راستے اپناتی ہیں کبھی تو ایک بچہ جسے پیسہ نہیں ملا ہو وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ روپیوں کی بارش ہو رہی ہے یا پھر جسے کھلونا نہیں حاصل ہو وہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ کھلونے کے ڈھیر پر سویا ہوا ہے۔ ایک بھوکا انسان خواب میں یہ دیکھتا ہے کہ اس کے چار طرف صرف کھانا ہی کھانا ہے۔ اس طرح کے خوابوں میں ہم اپنی ان خواہشات کی تشفی کرتے ہیں جن کی تکمیل ہم نہیں کر پاتے لیکن پھر بھی خواہشات کی تکمیل کا راستہ اتنا آسان اور سیدھا نہیں۔ ایسے خواب تو عام طور پر بچے ہی دیکھتے ہیں بڑوں کے ساتھ یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہے اس لیے فرائڈ نے جنسی خواہشات کی تکمیل (WISH-FULFILMENT) کے اصول میں بڑی گہرائی سے اس بات کا مطالعہ کیا ہے پہلے تو ہم یہ سمجھ لیں کہ فرائڈ نے خواہشات کی تکمیل کا جب ذکر کیا تو خاص طور پر جنسی خواہشات (SEXUAL URGES) کی بات کی اور طفلانہ خواہشات کا بھی ذکر کیا اور ماضی پر زور دیتے ہوئے دبی ہوئی جنسی خواہشات کا خوابوں میں اہم مقام بتایا فرائڈ نے خوابوں میں دو طرح کے اجزا کا ذکر کیا ہے خوابوں میں جو حادثات ہمارے سامنے آتے ہیں انہیں عیاں اجزا کا نام دیا لیکن ان کے پیچھے چھپے لاشعوری اجزا کو پوشیدہ اجزا کہا۔ آئیے اس سلسلہ میں ہم کچھ دلچسپ باتوں کا ذکر کریں اور تب دیکھیں کہ خوابوں کی کہانیاں کتنی دلچسپ ہیں جب انسان سو جاتا ہے اور شعور سے دور ہو جاتا ہے تب لاشعور میں دبی خواہشات باہر آنا چاہتی ہیں لیکن وہ اپنی اصلی شکل میں شعور میں نہیں آسکتیں اس لیے اپنی شکل بدل کر آتی ہیں اور ایسا کرتے وقت وہ کئی طریقے اپناتی ہیں جیسے بہت ساری دبی خواہشات ایک ساتھ مل جاتی ہیں اور انسان مجموعی طور پر انکی تشفی خوابوں میں کرتا ہے جیسے خوابوں میں ہم کبھی ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جس کا لباس کسی ایک شخص کا ہے ٹوپی کسی اور کی ہے چلنے کا انداز کسی دوسرے کا ہے تو بولنے کا ڈھنگ کسی اور کا ہے گویا خواہشات کا تعلق جن الگ الگ اشخاص سے تھا ان کا ایک مختصر خاکہ سامنے آتا ہے جسے انجماد (condesation) کہتے ہیں۔ اس طرح لاشعور کی خواہشات کے اظہار کا ایک اور دلچسپ راستہ ہے جسکے ذریعہ تشفی کا مرکز بدل جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم روز مرہ کی زندگی میں کسی کو پیار کرنا چاہتے ہیں لیکن سماجی اصول اس کی اجازت نہیں دیتے اور ہم اس خواہش کو دبا دیتے ہیں اور وہ لاشعور میں چلی جاتی ہے۔ لیکن خواب میں اس کا اظہار ہو جاتا ہے۔ بھلے ہی پیار کا مرکز کوئی دوسرا شخص بن جائے اور ہمارے جذبات کی تسلی ہو جائے۔ یہاں پر ناسخ کا ایک شعر ذہن میں آتا ہے

> ہاتھ آئی زلفِ جاناں مل گئی تعبیرِ خواب
> رات جو فرقت میں ہم نے سر تنبھوڑا سانپ کا

یہ شعر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شعرا نے بھی خواب میں اشاریت کا ذکر کیا ہے اور اس کی اہمیت کو مانا ہے۔ فرائڈ نے تعبیر میں آفاقی اشاریت (UNIVERSAL SYMBOLS) کی بات کی ہے اور کہا ہے کہ ہم خواب میں جن اشیا کو دیکھتے ہیں وہ کسی خاص خواہش کی نشان دہی کرتی ہیں جیسے خواب میں اگر ہم ایک راجا اور ایک رانی کو دیکھتے ہیں تب وہ والدین کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس طرح کسی نوکیلی چیز یا خلا کو دیکھتے ہیں تب وہ جنسی اشیاء یا فعل کا اظہار ہیں۔ جنسی خواہشات سے متعلق فرائڈ نے ایسی باتیں کہیں

[illegible]

کا اصول بہت مشہور ہوا اور اس کی اہمیت کو لوگوں نے سمجھا۔ آئیے خوابوں کے ایک اور دلچسپ پہلو پر نظر ڈالیں۔ فرائڈ پر تنقید کرنے والے یہ سوال اٹھانے لگے کہ اگر خوابوں میں صرف دبی ہوئی جنسی خواہشات کی تشفی ہوتی ہے تو پھر ہم ایسے خواب کیوں دیکھتے ہیں جنہیں دیکھ کر ہم ڈر جاتے ہیں اور ڈر کر اٹھ جاتے ہیں۔ اس کی تشریح فرائڈ نے بہت ہی دلچسپ طریقے سے کی۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان میں جب احساسِ گناہ جاگتا ہے اور اسے اپنی غلطی پر پچھتاوہ ہونے لگتا ہے تب وہ اپنے ضمیر کی آواز سنتا ہے اور لاشعوری طور پر اس میں اپنے کیے پر سزا پانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اسی لیے وہ ایسے خواب دیکھتا ہے جس میں کوئی اسے مار رہا ہو، گلا دبا رہا ہو یا دوسری اذیت دے رہا ہو۔ ضمیر کی دھتکار پر ہی انسان سزا پاکر بھی اپنی خواہش کی تکمیل کرتا ہے۔ اسی لیے خوابوں کے پیچھے بھی دبی ہوئی خواہشات کا ہاتھ ہے جنہیں اپنی تکمیل چاہیے کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں جو انسان کے اندر بے چینی اور ڈر پیدا کر دیتے ہیں جنہیں دیکھ کر وہ بہت گھبرا جاتا ہے اور ڈر کر اٹھ جاتا ہے اس کی تشریح کرتے وقت فرائڈ نے صرف اتنا کہا کہ ایسے خواب اس لیے نمودار ہوتے ہیں کہ ڈر اور فکر پیدا کرنے والی خواہشات لاشعور سے شعور میں بغیر شکل تبدیل کیے ہوئے سامنے آ جاتی ہیں اور انسان میں ڈر پیدا کر دیتی ہیں جسکی وجہ سے وہ چونک کر اٹھ جاتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خواب جو بے معنیٰ نظر آتے ہیں وہ کتنے با معنی، پیچیدہ اور دلچسپ ہیں فرائڈ کے دلچسپ نظریات نے خوابوں کی کہانی کو ایک نیا موڑ دے دیا اور اس میں لوگوں کی دلچسپی کو بڑھا دیا اور وہ ان کی اہمیت کو قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن خود فرائڈ کے دو شاگرد یونگ اور ایڈلر نے ہی فرائڈ کی تنقید کی اور خوابوں کی تشریح دوسرے نظریے سے کی۔ ان لوگوں نے فرائڈ کے نظریے کو بہت اہم مقام نہیں دیا اور ساتھ ہی کچھ نئی باتیں کہیں جنہوں نے خوابوں کی دلچسپ کہانیوں کو اور آگے بڑھا دیا۔
ماہرِ نفسیات ایڈلر کا خیال تھا کہ خوابوں کو صرف دبی ہوئی جنسی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ ایک انسان کا رجحان حال کے مسئلہ کی جانب کیا ہے اس پر بھی خواب روشنی ڈالتے ہیں۔ ساتھ ہی خوابوں میں ہم اکثر اس کام کو دُہراتے ہیں یا اس کا ریہرسل کرتے ہیں جس کو ہم کچھ ہی دنوں میں کرنے والے ہیں۔ خواب انسان کے جینے کے ڈھنگ اور طور طریقے (STYLE OF LIFE) کی طرف اشارہ کرتے ہیں جیسے ایک انسان جس کے ذہن میں شک کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اس نے شادی کے قبل ایک خواب دیکھا کہ وہ دو ممالک کی سرحد کے درمیان کھڑا ہے اور دونوں کے درمیان اس کا دم گھٹ رہا ہے خواب اس انسان کی ذہنی فطرت اور رجحان پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شادی کے بندش سے وہ شخص اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اسے احساسِ قید کا شکار ہونا پڑا اور وہ اتنی بڑی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں تھا اس لیے وہ ایسا خواب دیکھتا ہے جو کہ اس کی ذہنیت کشمکش اور الجھن کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

فرائڈ کے شاگرد یونگ نے خوابوں کی تشریح کرتے وقت ان کو ایک اور نیا موڑ دیا اور کہا کہ خوابوں میں صرف دبی ہوئی جنسی خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے ایسا سوچنا غلط ہے کیوں کہ خواب ایک عام ذہنی عمل ہے جس میں انسان کی ذاتی یا اجتماعی خواہشات کا اظہار ہوتا ہے۔ ساتھ ہی خوابوں میں جنسی خواہشات

کی تکمیل کے علاوہ دوسری خواہشات کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ یونگ کا یہ بھی کہنا ہے کہ خوابوں میں جو اشارے سامنے آتے ہیں وہ آفاقی نہیں ہوتے وہ ذاتی بھی ہو سکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں ہم جو خواب دیکھتے ہیں ان کا تعلق صرف ہمارے ماضی سے نہیں بلکہ حال اور مستقبل سے بھی ہوتا ہے آئیے اب ہم خواب کی ایک مثال لیں اور اس کی تشریح فرائڈ یونگ اور ایڈلر تینوں کے نظریہ کو سامنے رکھ کر کریں۔ ایک نوجوان جو بیکاری کا شکار تھا اس نے خواب دیکھا کہ وہ دو عورتوں کے ساتھ ایک زینے پر چڑھ رہا ہے اور دونوں کے بازو پر ہاتھ رکھے ہوا ہے۔ جب وہ اوپر پہنچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عورت کے ایک بچہ پیدا ہوا ہے خواب تو بہت معمولی تھا لیکن اس کی تعبیر الگ الگ ہو سکتی ہے۔ فرائڈ کے مطابق اس نوجوان کا سیڑھی پر چڑھنا اس کے جنسی عمل کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دو عورتیں جنسی اشیاء کو بتا رہی ہیں یونگ کے مطابق سیڑھی پر چڑھنا اسکی ترقی کی طرف ایک اشارہ ہے اور نئے بچے کی پیدائش اسکے روشن مستقبل کو بتا رہی ہے ایڈلر کے نظریہ کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اس خواب کی تعبیر ایک الگ ڈھنگ سے کر سکتے ہیں زینے پر دونوں عورتوں کا سہارا لیکر چڑھنا اس کے رجحان کی جانب ایک اشارہ ہے اور اس کے کام کرنے کے طریقہ کو بتاتا ہے۔ ترقی کی راہ پر اس لیے گامزن نہیں تھا کیوں کہ اس میں خود اعتمادی کی کمی تھی اور اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ ایسی کتنی مثالیں ہیں جو خوابوں میں انسان کی دلچسپی کو قائم رکھتی ہیں۔ خوابوں کے اس مختصر مطالعہ میں ہم نے یہ دیکھا کہ ہمارے خواب کتنے اہم ہوتے ہیں اور اگر ان کی تشریح مختلف نظریات سے کی جائے تو اکی کہانی کا یہ دلچسپ سلسلہ آگے ہی بڑھتا جائے اور یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں کون سا نظریہ مکمل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مختلف نظریات کا مطالعہ اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ خواب بامعنی اور بامقصد ہوتے ہیں اور ان کی تعبیر بہت سوچ سمجھ کر نکالنی چاہیے جس کے لیے خواب دیکھنے والے کے تجربات، احساسات، خواہشات، شخصیت اور مختلف ماحول کو مدنظر رکھنا چاہیے

ڈاکٹر نورالاسلام صدیقی
لیکچرر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۲۵

خسرو کے کلام میں تاریخی شہادتیں

ہندستان میں فارسی کے چند ممتاز ترین شاعروں میں خسرو کا شمار ہوتا ہے یہ شعرا برصغیر ہند و پاک میں فارسی زبان و ادب کی دنیا میں اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہماری مراد یہاں حضرت امیر خسرو، فیضی، بیدل، غالب اور اقبال سے ہے جو ہندی النسل ہزاروں فارسی شعرا میں اپنی لطافتِ بیان، ندرتِ ادا، جدتِ مضامین اور کلام میں پختگی کے باعث ممتاز اور نمایاں ہیں لیکن خسرو اپنی مابہ الامتیاز خصوصیات کے سبب اونچی عظمت کے مالک ہیں اور ایک بڑے شاعر ہیں ایرانی نقادانِ سخن اور دانشوروں نے انھیں فارسی کے درجہ اول کے شاعروں میں شمار کیا ہے اور اپنی تاریخی کتابوں میں انھیں برصغیر میں مقیم سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔

امیر خسرو کا خاندان تیرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں چنگیزی فتنوں، یورشوں اور ان کی بربریت و سفاکیت سے عاجز و پریشان ہو کر ترکستان سے ہجرت کر کے ہندستان آیا۔ ان کے والد سیف الدین محمود نے اتر پردیش کی ایک تحصیل پٹیالی (مومن آباد) ضلع ایٹہ میں بود و باش اختیار کی۔ اس وقت تک ہندستان میں سلطنت قائم ہو چکی تھی اور تختِ دہلی پر سلطان التتمش جلوہ افروز تھا امیر سیف الدین محمود نے سلطان کے دربار میں رسائی حاصل کر لی اور اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور ذاتی مہارتوں کے باعث مقربِ بارگاہِ سلطان بن گیا اور سلطان کے امیروں میں شامل ہو گیا بقول برنی شاہی دربار سے انھیں بارہ سو تنکہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔

التتمش کے امیروں میں ایک مشہور و معروف اور با اثر امیر عماد الملک تھے جو ایک جامع کمالات بزرگ تھے اور جن کا ولی اللہوں میں شمار ہوتا تھا وہ حکومت کے چھوٹے بڑے کاموں میں دخیل بھی تھے سیف الدین محمود کی شادی اس ولی صفت بزرگ کی دخترِ نیک اختر سے ہو گئی جو علم و فضل اور باطنی عفت و پاکی سے ہمکنار تھی خسرو

نے سلطان التمش کے بیٹے ناصر الدین محمود کے زمانۂ حکومت (۱۲۴۵ء/۱۲۶۵ء) میں ۶۵۱ھ (۱۲۵۳ء) میں اِس جہانِ رنگ و بُو کا پہلا جلوہ دیکھا۔ سات برس کی عمر تک والدین اور بھائیوں کی زیرِ نگرانی تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے لیکن جب حیاتِ مستعار کی آٹھویں منزل میں قدم رکھا تو ایک المناک حادثہ پیش آیا یعنی ایک جنگی مہم ۱۲۶۰ء میں ان کے والد بزرگوار اللہ کو پیارے ہو گئے۔ خسرو کو جب اس حادثے کی اطلاع ملی تو فوراً یہ شعر ان کی زبان پر جاری ہوا

سیف از سرم گذشت و دلِ من دو نیم شد
دریائے ما رواں شد و دُرِّ یتیم ماند

سایۂ پدری سے محروم ہونے کے بعد انھیں نانا عماد الملک کی سرپرستی حاصل ہوئی جنھوں نے نواسے کی تعلیم کا باضابطہ انتظام کیا۔ بیس برس کی عمر تک خسرو نے تمام درسی علوم و فنون سے فراغت حاصل کر لی اور ان کا شمار فضلائے روزگار میں ہونے لگا۔ خسرو کو فارسی اور عربی کے علاوہ ہندی، سنسکرت اور ترکی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ شعر گوئی کی طرف قدرت نے روزِ ازل ہی سے ان کی طبیعت کو مائل کر رکھا تھا۔ شبلی نعمانی لکھتے ہیں :-

> جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے ان کو مکتب میں بٹھایا اور خوش نویسی کی مشق کے لیے سعد الدین خطاط کو مقرر کیا، لیکن امیر خسرو کو پڑھنے لکھنے کے بجائے شعر گوئی کی دُھن رہتی تھی اور چونکہ موزوں ناموزوں کہہ سکتے تھے کہتے تھے اور وصلیوں پر اسی کی مشق کیا کرتے تھے خواجہ واصل کوتوال کے نائب تھے اور کبھی کبھی سعد الدین خطاط کو خطوط وغیرہ لکھوانے کے لیے بلا لیا کرتے تھے ایک دن بلایا تو امیر خسرو بھی ساتھ گئے خواجہ واصل کے مکان پر خواجہ عزیز الدین بھی تشریف رکھتے تھے سعد الدین نے خواجہ صاحب سے کہا یہ لڑکا ابھی سے ہکمہ غوں غاں کرتا ہے معلوم نہیں کہ موزوں بھی کہتا ہے یا نہیں؟ آپ ذرا اس کے کلام کو سن لیجیے خواجہ عزیز کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض تھی۔ امیر خسرو کو دی کہ کوئی شعر پڑھو امیر نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا۔ چونکہ آواز میں قدرتی تاثیر تھی لوگوں پر اثر ہوا سب کی آنکھیں بھر آئیں اور سب نے بے اختیار تحسین کی ان کے استاد نے کہا شعر گوئی کا امتحان لیجیے خواجہ عزیز الدین نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ ان کو ملا کر شعر کہو مو، بیضہ، تیر، خربزہ امیر نے برجستہ کہا
>
> ہر موی کہ در دو زلفِ آں صنم است   صد بیضۂ عنبریں بر آں موی صنم است

چوں تیر مداں راست دلش رازیرا چوں خربزہ دندانش درونِ شکم است

خسرو نے بلبن کے زمانے ۱۲۶۵ء - ۱۲۸۶ء سے محمد بن تغلق کے عہد ۱۳۲۴ء - ۱۳۵۱ء تک کم و بیش گیارہ بادشاہوں کا دَور دیکھا اور ساتؔ بادشاہوں کے دربار سے وابستہ رہے وہ تاحیات درباری شاعر رہے۔ امیر خسرو اپنے دَور میں علم مَوسیقی کے یکتائے روزگار اُستاد، علم نجوم کے ماہر اور صاحب النساب داز ہے۔ ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی میں رقمطراز ہیں۔

سلطان علاؤالدین خلجی کے دور میں ایسے بہت سے بے مثال شاعر تھے جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے اور نہ آج تک پیدا ہوئے ان سب میں امیر خسرو اپنے خیالات کی جدت اور شعروں کی کثرت کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں نظم و نثر کے اساتذہ صرف کسی ایک صنفِ سخن میں کمال رکھتے ہیں ایسا باکمال جو تمام اصنافِ سخن پر قدرت رکھتا ہو نہ کبھی پیدا ہوا اور نہ شاید قیامت تک پیدا ہوگا مَوسیقی اور گانے میں بھی ان کا جواب نہیں تھا خدا نے ان کو ایک فنکار اور مہذب انسان کی تمام صفات سے نوازا تھا۔

فارسی دنیائے شعر و شاعری میں ایسا کوئی ایک شاعر بھی دیکھنے میں نہ آیا جو مختلف النوع اصنافِ سخن میں یکساں مہارت رکھتا ہو فردوسی، انوری اور سعدی میں سے ہر ایک اپنے اپنے فکر و فن میں ایک دوسرے سے جدا ہے فردوسی مثنوی کے میدان کا ہیرو ہے انوری قصیدہ گوئی میں ممتاز و ممیز۔ اور سعدی صنف غزل کا بادشا تسلیم کیا جاتا ہے از روئے انصاف فردوسی کو قصیدہ اور غزل میں، انوری کو غزل اور مثنوی میں سعدی کو مثنوی اور قصیدے میں کوئی امتیاز حاصل نہیں لیکن امیر خسرو کی جامع شخصیت ایسی بار آور ہے کہ قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں پر رشک آتا ہے یعنی وہ قصیدہ، مثنوی اور غزل میں سے ہر ایک میں یکتائے روزگار ہے اور کوئی اسکا ہمسر نظر نہیں آتا۔ شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

ہندستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجے کا جامع کمالات (انسان) نہیں پیدا ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کیے ہونگے صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوئی ہے فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے بادشاہ ہیں لیکن ان کی حدودِ حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی۔ فردوسی مثنوی سے نہیں بڑھ سکتا سعدی قصیدے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے انوری مثنوی اور غزل کو نہیں چھو سکتا حافظ، عرفی

---

[1] شعر العجم حصہ دوم صفحہ ۹۸ - ۹۷

[2] شاہزادہ محمد سلطان، معز الدین کیقباد، جلال الدین، فیروز شاہ، علاؤالدین خلجی، قطب الدین مبارک شاہ، غیاث الدین تغلق، محمد بن تغلق

نظیری غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے لیکن امیر خسرو کی جہاں گیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تضمین، مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہوسکتا۔[1]

ان حقائق کے پیشِ نظر امیر خسرو کی ایک جامع شخصیت بحیثیت بحرالعلوم ہمارے سامنے آتی ہے وہ شعر و ادب کے علاوہ علم موسیقی کے ایک بے مثال استاد تھے صوفی مشرب تھے اور شیخ نظام الدین اولیاؒ کے ہر دلعزیز مرید بھی تھے سلاطینِ عہدِ سلطنت کے درباری شاعر تھے اور ان کی مدح سرائی کے علاوہ اس عہد کے بیشتر واقعات جو ان سلاطین کی جنگی مہموں، تاریخی شہادتوں اور ہندستانی رسم و رواج پر مشتمل ہیں اور اس زمانے کی تاریخ کا جزو لاینفک ہیں انتہائی جامعیت کے ساتھ نظم کیا خسرو نے غزلوں کے پانچ دواوین[2] اور اپنی پنج گنج[3] کے علاوہ پانچ تاریخی مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں 'قران السعدین'، مفتاح الفتوح'، دولرانی خضر خاں نہ سپہر اور تغلق نامہ شامل ہیں ان میں ہر ایک مثنوی اپنی جگہ تاریخی حقائق کا گنجینہ ہے اور اس عہد کے تاریخی شواہد پر ایک جامع تصنیف ہے۔

قران السعدین:

قران السعدین امیر خسرو کی مثنویوں میں سب سے پہلی مثنوی ہے اس میں سلطان معزالدین کیقباد اور اس کے باپ سلطان ناصرالدین بغرا خاں کی ملاقات کا تاریخی واقعہ پیش کیا گیا ہے خسرو نے اسے سلطان کی خواہش پر ۶۸۸ھ ۱۲۸۹ء میں نظم کیا اور مضمون کی مناسبت سے اس کا عنوان قران السعدین رکھا خسرو نے یہ مثنوی چھ ماہ کی مدت میں مکمل کی اور اس میں تقریباً ۳۹۴۴ اشعار ہیں۔

لفظ قران کے معنی اتصال یا ملاپ کے ہیں مگر علم نجوم کی اصطلاح میں آفتاب کے سوا باقی سیاروں میں سے دو سیاروں کا یکجا نظر آنا ان کا قران کہلاتا ہے اور مشتری و زہرہ کو اہل تنجیم سعد اکبر و سعد اصغر سمجھتے ہیں اس لیے ان دونوں کے قِران کو "قران السعدین" کہتے ہیں۔ شاعر نے دو بادشاہوں کی ملاقات کو جو کہ ملک و ملت کے لیے موجب سعادت تھی تشبیہاً

---

[1] شعر العجم حصہ دوم صفحہ ۱۱۸ - ۱۱۹

[2] غزلوں کے پانچ دواوین 'تحفۃ الصغر'، وسط الحیٰوۃ'، غرۃ الکمال'، بقیہ نقیہ'، نہایۃ الکمال ہیں۔

[3] خسرو کی پنج گنج خمسہ نظامی کے جواب میں ہیں اور وہ ہیں مطلع الانوار، شیریں خسرو مجنوں لیلیٰ، آئینہ سکندری ہشت بہشت۔

قران السعدین سے موسوم کیا

کیقباد سلطان غیاث الدین بلبن کا پوتا اور ناصر الدین بغرا خاں (حاکم بنگال) کا بیٹا تھا بلبن نے اپنے بڑے بیٹے اور ولیعہد سلطان محمد کی شہادت پر اس کے چھوٹے بیٹے کیخسرو کو ولیعہد نامزد کیا تھا لیکن اسی دوران بلبن کی وفات ہو گئی اور ارکان سلطنت نے کیخسرو کے بجائے کیقباد کو سلطان معز الدین کیقباد کے نام سے تخت پر بٹھا دیا یہ شہزادہ ناتجربے کار تھا عمر بھی سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی لہٰذا تخت نشین ہوتے ہی وہ عیش و طرب میں گرفتار ہو گیا اس کی بدمستیوں کی خبر جب ناصر الدین بغرا خاں کو پہنچی تو اسے بڑا صدمہ اور ملال ہوا اس نے بیٹے کی اصلاح کی ہر ممکن کوشش کی لیکن سب بے سود ثابت ہوئی بالآخر اس سے ملاقات کا ارادہ کیا اور طے پایا کہ دونوں کی ملاقات اودھ میں ہو گی چنانچہ اودھ میں سرجو ندی کے ایک کنارے بغرا خاں اور دوسری طرف کیقباد اپنے اپنے لشکر کے ساتھ خیمہ زن ہو گئے۔ باپ بیٹے کی ملاقات ہوئی، غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا، باپ نے بیٹے کو بہت سی نصیحتیں کیں اور چند یوم بعد دونوں اپنے اپنے علاقوں (لکھنؤ اور دہلی) کو واپس لوٹ گئے امیر خسرو دربار کے شاعر تھے وہ اس مہم میں شاہی لشکر کے ساتھ تھے اور سارے واقعات کا بغور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا انہوں نے دہلی آکر کیقباد کی فرمائش پر ان سارے واقعات کو بڑی جامعیت سے ترتیب دیا اس ملاقات میں باپ نے بیٹے کو جو نصیحت کی اسے خسرو نے کس فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے ملاحظہ ہو۔

کامی پسر از ملک و جوانی مناز　　　ناز بدو کن کہ شد ادبی نیاز
گرچہ سیاست ز تو شد دستیاب　　　دست ضعیفاں بسیاست متاب
خشم بہر جرم میاور بہ کس　　　ز آتش سوزندہ نگہدار خس
چوں بگناہ معترف آید کسی　　　عفو نکوتر ز سیاست بسی
چشم رعایت ز رعیت مگیر　　　تا بود ت ملک عمارت پذیر
شاخ درختی کہ بود سایہ دار　　　سایہ نشیں را بود از وی مدار
چوں تو شدی سایۂ یزدان پاک　　　سایہ فشاں باش بریں مشت خاک
عدل بود مایۂ امن و اماں　　　پیش کن ایں مایہ زمیں تا زماں
دولت جاوید نبرد است کس　　　نام نکو دولت جاوید بس
ہر نفس از عمر غنیمت شمر　　　یاد کن از ملک وزان دگر
کاول شان چرخ بہ بالا کشید　　　واخر شان خاک بہ خارا کشید
قصۂ ضحاک حمیدوں بخواں　　　نامۂ جمشید و فریدوں بخواں
نیک و بد از دفتر ایشاں بجوئی　　　نیک بہ خاطر کن و بد را بشوی
پیشہ نکوئی کن و از بد مترس　　　از بد کس نی، ز بد خود بترس
خود از مکافات و جزا ہر زماں　　　ہر چہ کنی نیز، ہبابی ہماں

ترسِ خداوندِ جہاں کن بدل — تا ز خداوند نمانی خجل
کارچناں کن کہ بہنگام کار — از دریرزداں نشوی شرمسار

ان تاریخی واقعات کے علاوہ خسرو نے اس مثنوی میں دہلی کی تعریف مسجد قوت الاسلام کی خصوصیات، قطب مینار کے محاسن، حوض شمسی کی تعریف و توصیف، قصرِ نو اور شہرِ نو کے احوال و کوائف بھی انتہائی جامعیت سے قلمبند کیے ہیں۔

مفتاح الفتوح

مفتاح الفتوح کو تاج الفتوح بھی لکھا گیا ہے، یہ مثنوی خلجی عہد میں ۶۹۰ھ ۱۲۹۱ء میں لکھی گئی امیر خسرو درباری شاعر تھے اور سلطان جلال الدین خلجی کے مصحف دار اور ندیم تھے وہ ان کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا اور ان پر بڑا مہربان تھا خسرو نے اسکے زمانے میں ہونے والے سارے واقعات کی نشاندہی کی ہے اور اس میں سلطان کی جملہ فتوحات کو پیش کیا ہے مثنوی اس طرح ترتیب دی گئی ہے کہ سلطان جلال الدین خلجی کے عہدِ حکومت ۱۲۹۰ء-۱۲۹۵ء کی پوری عکاسی ہوتی ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ مثنوی اس عہد کے سیاسی و تاریخی احوال و کوائف کی آئینہ دار ہے۔

دولرانی خضر خاں

یہ مثنوی عشق و محبت کی ایک داستان پر مشتمل ہے، اس میں سلطان علاؤالدین خلجی کے بڑے بیٹے خضر خاں اور گجرات کے راجہ کرن کی بیٹی "دول دیبی" کے عشق و محبت کی داستان نظم کی گئی ہے، عشق و محبت کی یہ داستان تاریخی نقطۂ نظر سے اہم ہے کیوں کہ بہت سے تاریخی گوشے اس سے روشن ہوتے ہیں، امیر خسرو نے سلطان علاؤالدین خلجی کے عہدِ سلطنت ۱۲۹۵ء - ۱۳۱۶ء میں شہزادہ خضر خاں کی فرمائش پر مثنوی مذکور کو ۷۱۵ھ ۱۳۱۵ء میں ترتیب دیا تھا، داستان کا خلاصہ مختصراً اس طرح ہے۔

دول دیبی گجرات سے اپنی ماں کملا دیبی سے ملنے آئی سلطان اس سے شہزادہ خضر خاں کی شادی کرنا چاہتا تھا کملا دیبی جو اس کی حرم سرا تھی اسے یہ رشتہ منظور تھا لیکن خضر خاں کی ماں کو رشتہ منظور نہ تھا کیوں کہ وہ اپنی بھتیجی سے اس کی شادی کرنا چاہتی تھی نوعمری کا زمانہ تھا اور دونوں آپس میں عرصے تک اخلاص و محبت سے کھیلتے کودتے رہے جب خضر خاں کی ماں نے یہ محسوس کیا کہ دونوں کے اخلاص عشق میں بدل گئے ہیں تو سلطان سے کہہ کر دونوں میں مفارقت کرادی لیکن اسکے باوجود دونوں میں نامۂ و پیام کے سلسلے جاری رہے خضر خاں کی مرضی کے خلاف اسکی شادی ماموں زاد بہن سے کردی گئی لیکن ادھر

عشق کا یہ حال تھا کہ شہزادہ دَوَل دیبی کے عشق میں گھلتا گیا اور اس کا حال بد سے بدتر ہوتا گیا آخرکار سلطان نے اسکا نکاح دَوَل دیبی سے بھی کرا دیا۔ اور خضر خاں سے ناراض رہنے لگا اسے طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں لیکن دَوَل دیبی اپنے خاوند کی ہر مصیبت میں اسکے ساتھ رہی اور اس کے ہر دکھ تکلیف کو خوشی خوشی جھیلتی گئی یہاں تک کہ سلطان علاؤ الدّین کے بعد قطب الدّین مبارک شاہ خلجی کے حکم سے خضر خاں گوالیار میں قتل کر دیا گیا ۷۱۸ھ ۱۳۱۸ء تو دَوَل دیبی بھی اسکے دوش بدوش زخمی ہوئی اور قتل ہو کر خاوند کے ساتھ دفن ہوئی اس پورے قصّے کو امیر خسرو نے انتہائی جاذب، دل نشیں اور انوکھے انداز میں پیش کیا ہے درج ذیل چند اشعار میں اس نے دونوں کے درمیان اخلاص و محبت اور کھیل کود کے واقعات کی کس خوبی سے منظر کشی کی ہے ملاحظہ ہو۔

به بازی بود شانِ عشقی که یک دم   نبودندی جدا در بازی از هم
نه بد چوں عشق در بازی مجازی   شد آں بازی در آخر عشق بازی
چوں طفلانی که باهم لعب سازند   بهم گه طاق وگاهی جفت بازند
نهانی باختندی آں دو مشتاق   از طاق ابرواں هم جفت و هم طاق
بهر بازیگهی چوں خرد سالاں   دویدی خرد شیری با غزالاں
شدی هر سو که آں خورشید پایه   صنم رفتی بدنبالش چو سایه
نبودی زو جدا درگاه بیگاه   چو نور از آفتاب و پرتو از ماه

نہہ سپہر

خسرو کی تاریخی مثنویوں میں یہ چوتھی مثنوی ہے جسے شاعر نے قطب الدّین مبارک شاہ خلجی کی خواہش پر ۷۱۸ھ ۱۳۱۸ء میں نظم کیا تھا اس میں سلطان قطب الدّین مبارک شاہ کی سلطنت اور اس کے دور کے احوال بیان کیے گئے ہیں یہ مثنوی نو ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب الگ الگ بحروں میں ہے اسی مناسبت سے اسکا نام نہہ سپہر ہے۔

مثنوی میں سلطان کی بنوائی ہوئی عمارتوں کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اس کی فتوحات، اس زمانے میں مذہبی عقائد اور رسوم اور لوگوں کے اخلاق کا بھی تذکرہ ہے مزید برآں دہلی کی تعریف، ہندستان کی آب و ہوا یہاں کے پھلوں پھولوں، یہاں کے پرندوں اور یہاں کے موسم کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی قطب الدّین مبارک شاہ کے زمانے کی مکمل تاریخ کہی جا سکتی ہے ہندستان کے فضائل و محاسن پر خسرو کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

اثباتِ ملک ہند کہ جنّت بہ جنّت است   حجّت ہمہ بہ قاعدہ ملک استوار
ترجیح اہل ہند بر اہل عجم ہمہ   در زیرکی و دانش و در دلہای ہوشیار

ترجیح ملک ہند بعقل از ہوای خوش	بر روم و بر عراق و خراسان برف بار
اثبات آں کہ جانوری ایں دیار است	حتی قریب عقل کہ انسان کنی شمار

تغلق نامہ

تغلق نامہ امیر خسرو کی تاریخی مثنویوں میں سب سے آخری تصنیف ہے۔ امیر خسرو نے اسے سلطان غیاث الدین تغلق کی فرمائش پر ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء میں نظم کیا تھا۔ مثنوی مذکورہ میں ایسی بے شمار تاریخی شہادتیں ملتی ہیں جس کا کسی تاریخی کتاب میں ذکر نہیں ملتا مثلاً قطب الدین مبارک شاہ کا قتل خسرو خاں کی چند روزہ بادشاہت اور غیاث الدین تغلق کی فتوحات وغیرہ۔ یہ مثنوی ایک جامع تصنیف ہے اور تاریخی نقطہ نظر سے بڑی اہم ہے اس کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ خسرو خاں اور اس کے بھائی کی گرفتاری اور اس کے قتل کا ذکر جس صحت اور تفصیل سے اس مثنوی میں لکھا گیا ہے کسی دوسری تاریخ میں موجود نہیں۔

غیاث الدین تغلق نے خسرو خاں کو شکست دے کر دہلی کی سلطنت حاصل کی تھی اور تخت دہلی پر یکم شعبان ۷۲۰ھ بروز شنبہ جلوس کیا تھا اس کے تخت سلطنت پر جلوس ہونے کے موقع پر امیر خسرو نے جو اشعار قلمبند کیے ہیں ان میں سے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں

مبارک روز شنبہ گاہ پیشیں	کہ ہنگامی ست با انوار بیش ایں
جہاں از چشمۂ خود روی شستہ	کہ دم سبحہ سجادہ جستہ
موذن قامت خود بر کشیدہ	جماعت صف بہ مسجد بر کشیدہ
ممالک گیر سلطان جہاں بخت	دراں ساعت برآمد بر سر تخت
سر بر آراست ماہ آفتابش	غیاث دین و دنیا شد خطابش
ملائک جملہ گفتندش ہمانگہ	دعای خلد الرحمٰن ملکہ

امیر خسرو کی یہ مثنوی دست بردِ زمانے سے محفوظ نہ رہ سکی لہٰذا شروع اور آخر کے چند اوراق ضائع ہو گئے جسے عہد جہاں گیری میں بادشاہ کے حکم پر درباری شاعر حیاتی کاشی نے پورے کیے تغلق نامہ میں حیاتی کاشی کے اشعار کی کل تعداد "۱۷۹" ہے

امیر خسرو نے ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۵ء کو داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے پیر و مرشد شیخ نظام الدین اولیاؔ کی پائنتی میں مدفون ہوئے خسرو نے اپنے پیچھے بے شمار تصانیف چھوڑیں جن میں ان کی مذکورہ بالا مثنویاں تاریخی اعتبار سے اہم ہیں اور ہندستان میں عہدِ وسطیٰ کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہیں۔

سہ منتخب التواریخ (ملا عبدالقادر بدایونی) میں ۷۲۵ھ درج ہے۔

پاکستانی مطبوعات

مندرجہ ذیل کتب صرف ایک ایک یا دو،
کی تعداد میں ہیں جن کا آرڈر پہلے آجائے گا
ں کی تعمیل کر دی جائے گی۔ (ادارہ)

دو رسم الخط کے بنیادی مباحث (لسانیات)
ڈاکٹر سہیل بخاری ۳۰/
ول نفسیات اوّل (نفسیات) پروفیسر عبدالحمٰی علوی ۵۰/
" دوم " " ۷۵/
ریس اردو (تعلیم) ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۴۸/
نتخبات اخبار اردو (تحقیق) ڈاکٹر معین الدین عقیل ۹۴/
انی مقالات حصہ اول (تحقیق) سید قدرت نقوی ۵۰/
" دوم " " ۵۲/
سوم " ڈاکٹر سہیل بخاری ۸۵/
دو زبان میں ترجمے کے مسائل (تعلیم) اعجاز راہی ۴۵/
جمے کا فن (تعلیم) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ۳۵/
نتخبات اردو نامہ (تحقیق) ڈاکٹر معین الدین عقیل ۷۵/
ردو میں فنی تدوین (تحقیق) ڈاکٹر ایم ایس ناز ۱۵۰/
ایوان اقبال اول (اقبالیات) ڈاکٹر جاوید اقبال ۱۱۵/
" سوم " " ۱۰۰/
" چہارم " " ۱۲۵/
ردو میں نعت گوئی (مذہبیات) ڈاکٹر ریاض مجید ۱۷۵/
شارحین غالب کا تنقیدی مطالعہ اول (غالبیات)
ڈاکٹر محمد ایوب شاہد ۱۲۵/
" " دوم " ۹۰/
بلاغ عام کے نظریات (ذرائع ترسیل) ڈاکٹر محمد شمس الدین ۳۰/
مغرب سے نثری تراجم (تعلیم) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ۱۴۰/
فرہنگ اثر (مجلد) جلد سوم اثر لکھنوی ۱۴۰/
" " چہارم " " ۷۵/

فرہنگ عامرہ (لغت) محمد عبداللہ خاں خویشگی ۱۴۰/
تصویری صحافت (جرنلزم) مہدی حسن ۳۶/
ریڈیائی صحافت " سجاد حیدر ۳۶/
اقبال بنام شاد (اقبالیات) محمد عبداللہ قریشی ۵۰/
مکتوب نگاری ڈاکٹر مسکین علی حجازی ۳۶/
لسانیات پاکستان (لسانیات) ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی ۷۵/
کتابیات تراجم اول ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ۷۵/
" دوم " " ۵۵/
روداد سیمینار اصول تحقیق (تحقیق) اعجاز راہی ۲۵/
تاریخ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (سیرت) ایم۔ ڈی فاروقی ۲۰/
پیام مشرق (اقبالیات) ۲۵۰/
میزان اقبال (اقبالیات) پروفیسر محمد منور ۱۰۰/
اردو میں بچوں کا ادب ڈاکٹر محمود الرحمٰن ۵۰/
اردو مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) نور احمد شاد ۴۵/
زبان و بیان (لسانی مقالات) وارث سرہندی ۳۵/
ہندی اردو لغت (لغت) راجا راجیشور راؤ اصغر ۹۰/
اردو نثر میں سیرت رسولؐ (سیرت) ڈاکٹر انور محمود خالد ۱۷۵/
نقد اقبال حیات اقبال (اقبالیات) ڈاکٹر تحسین فراقی ۲۰۰/
پیام مشرق (اقبالیات) ڈاکٹر عبدالوہاب عزام ۲۱/
تعلیم کا مسئلہ (تعلیم) ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ۲۴/
قرآن اور سنت کی روشنی میں۔ خلا کا اسلامی تصور
عبدالقادر وارثی ۱۲۵/
سید عابد علی عابد ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ ۱۵۰/
اقبال کا سیاسی سفر (اقبالیات) محمد حمزہ فاروقی ۱۷۵/
اقبال اور عالمی ادب " ڈاکٹر عبدالمغنی ۱۴۰/
سنسکرت اردو لغت (لغت) ڈاکٹر محمد انصار اللہ ۲۰/
لسانی رابطہ پروفیسر پریشان خٹک ۳۵/
اردو سندھی کے لسانی روابط۔ شرف الدین اصلاحی ۷۲/
منتخبات اردو نامہ اول ڈاکٹر معین الدین عقیل ۷۵/
مختصر قانونی اصطلاحات مولوی فیروز الدین ۱۲/
غیر ملکیوں کے لیے اردو ڈاکٹر عابدہ سلطانہ ۱۲/

محمد جمال پاشا (مرحوم) (غیر مطبوعہ)

سید مسیح الحسن رضوی

سید مسیح الحسن رضوی اگر اخباری چکّی میں نہ پستے تو اردو ادب کے چیخوف یا موپساں ہوتے۔ اخبار میں ہونے کے بجائے ان کا اپنا اخبار ہوتا تو اردو ادب اردو صحافت میں ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ کی شاندار روایت کا اضافہ ہو جاتا۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اردو افسانے کو تہذیبی اقدار اور سماجی شعور کی جو بلندیاں عطا کی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اگر یہ سیماب صفت اور پارہ مزاج نہ ہوتے تو آج نہ جانے کہاں ہوتے اور کیا ہوتے۔ زندگی نام ہے ہار جیت اور مفاہمت کا۔ قدم قدم پر سمجھوتوں کا، اپنے آپ کو مارنے اور اپنی خودی کی نفی کا مگر انھوں نے یقین جانیے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی سود و زیاں کی پروا نہ کی اور اپنی خودداری پر آنچ نہ آنے دی۔

آتش خور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی شخصیت کی نمو اپنی آگ میں جلتے رہنے میں ہے یہاں تک کہ وہ لافانی ہو جاتا ہے اور دیوتاؤں کی سرزمین کی جانب پرواز کرتا ہے۔ ایک ایسا ابدی سفر جس میں واپسی کی کوئی منزل نہیں مگر بلندیوں کی تمام منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔ اگر اسی روشنی میں مسیح الحسن صاحب کو دیکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی شخصیت کی نمو بھی اپنے فن کی آگ میں تپ کر نکھرتے رہنے میں ہے۔ اسی وجہ سے ادب کے معاملے میں وہ کسی منزل پر مفاہمت کے قائل نہیں۔ ادیب بہت بڑا ہو یا بہت چھوٹا اس کی ہر اچھی چیز کے وہ مداح اور ہر ادیب کی چھوٹی چیزوں سے منکر۔ ان کے اکثر فیصلے اسی لیے کھلتے ہیں مگر کچھ عرصہ بعد ان فیصلوں کا کھرا پن روز روشن کی طرح عیاں ہونے لگتا ہے۔

پچھلی چوتھائی صدی کے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ اوپر سے اخروٹ اور بادام کی طرح سخت اور اندر سے اتنے ہی نرم بلکہ ملائم اور دل گداختہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں خدا، گھر کے باہر کتّے اور گھر میں بیوی کے علاوہ وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتے مگر اس کے باوجود رحمت پروردگار کے بعد تعریف صرف بیوی ہی کی کرتے ہیں۔ شریف آدمی کی واحد پہچان قدما نے یہی بتائی ہے۔ کہ وہ بیوی سے ڈرتا ہو۔ بیوی سے وہی لوگ زیادہ ڈرتے ہیں جو بے حد پڑھے اور کڑھے ہوں۔ اس معیار شرافت کا نام ڈرنا نہیں "خیال رکھنا" ہے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون کس کا زیادہ خیال رکھتا ہے ان کا حال تو اب تک یہ ہے کہ ریزگاری مٹھی میں نکال کر کہتے ہیں۔ "ارے بھائی دیکھنا تو کتنے پیسے ہیں؟ ذرا اُن میں سے بارہ آنے تو نکال

دیناہ ان کو یہ یاد نہیں رہتا کہ جو خط لکھا تھا وہ کیا ہوا۔ بعد میں گھر سے اس کے پوسٹ کردا دیے جانے کی تصدیق ہوتی ہے۔

ان حضرت کو بھی اس شے سے ازلی بیر ہے جس سے نیاز فتح پوری مرحوم کو تھا یعنی "بود" ادھر کوئی بود یا فراڈ آدمی انھوں نے دیکھا اور ہو گئی حالت قابلِ رحم۔ یا تو یہ اسے چلتا کر دیں گے یا کسی اور کے سر تھوپ دیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ ایسی خبر لے ڈالیں کہ کبھی لوٹ کر ان کی جانب رخ تک نہ کرے۔ "چوتھی بہن" کے مصنف کے افسانے لکھنے کا اسٹائل گستاخی معاف مرغی کے انڈا دینے سے بہت ملتا جلتا ہے اور وہ بھی فارم کی نہیں دیسی یعنی ایک معرکے کا دھواں دھار افسانہ لکھ لیا اور ہو گئے کڑک۔ اب ہر افسانہ نگار ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے مگر یہ اگلا افسانہ لکھنے میں نہیں آتے۔ لکھیں بھی کیسے؟ ابھی شیشۂ دل سے کوئی پتھر جو نہیں ٹکرایا۔ پرانی تہذیب و ثقافت کی کوئی گگر جو نہیں ٹوٹی۔ جیسے ہی ان کی دنیا کو ٹھیس پہنچی اور لیجیے ایک نہیں دو افسانے علاؤالدین کے چراغ کے دیو کی طرح ہاتھ باندھے حاضر ہو گئے۔ کھٹ سے لکھ بھی لیا اور تراش خراش کر کے پالش بھی کر ڈالی پھر کڑک۔ افسانے تو افسانے افسانوں کا مجموعہ "چوتھی بہن" چھپنے کے بعد سے اب تک بلا مبالغہ دو مجموعوں بھر افسانے جمع ہو گئے پر اگلا مجموعہ باوجود بے حد اصرار کے ابھی تک نہیں چھپوایا۔

افسانہ لکھنے، چھپنے میں تاخیر ہو یا مجموعہ چھپوانے میں دیر لگے۔ سب کی وجہ وہی ایک ہے یعنی آدمی بے حد نوک پلک کے اور چنے چنائے ہیں۔ کیا مجال کہ ان کے چہرے یا لباس پہ ایک شکن آپ کو مل جائے۔ اسی طرح ان کا فن بھی زندگی میں سمویا ہوا ہے اور ساری تاخیر اسی نوک پلک کی وجہ سے ہوتی ہے ورنہ لکھ تو وہ بائیں ہاتھ سے بھی سکتے ہیں مگر غالباً یہ ان کی شان اور مزاج کے خلاف ہے۔

یہ حضرت پیلی بھیت کے سید ہیں مغربی اضلاع کے لوگ جتنے ٹیڑھے اور کھرے ہوتے ہیں وہ ساری ٹلپلھ اور کھرا پن ان میں کوٹ کوٹ کر موجود ہے جب بھی کوئی تعریف کرے کہ ارے صاحب! آپ کا کیا کہنا آپ تو لکھنؤ کے ہیں! تو یہ فوراً اسے ٹوک دیں گے اور بہت ٹوٹ کر پیلی بھیت کو یاد کریں گے پیلی بھیت یہ برسوں سے نہیں گئے مگر اس کی مٹی کا سوندھا پن آج بھی آپ کو ان کی باتوں کی تراوٹ میں ملے گا۔ مسیح صاحب جن لوگوں کے بے حد قائل ہیں ان میں منٹو، حیات اللہ انصاری، اور اختر انصاری بھی ہیں۔ اس مثلث کے بارے میں ان کی جو رائے ۱۹۵۰ء میں تھی وہی ۷۵ء میں بھی ہے۔

مجھے ان کی جو بات سب سے زیادہ پسند ہے وہ ہے زندگی اور ادب پر دور دور تک نظر جو بات اشارتاً بھی کہہ دیں وہ ہمیشہ بعد میں ایسا کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ بسا اوقات حیرت میں پڑ جاتا ہوں۔ بدلتے ہوئے ادبی مذاق کے بارے میں ہمیشہ ان کا اصرار رہتا ہے کہ "جو بھی نئی تحریک آئے خواہ وہ جدیدیت ہو یا کوئی اور بجائے اس کا مذاق اڑانے کے اسے سمجھنے کی کوشش

ڈاکٹر اے۔ایچ فرید
شعبۂ انگریزی، زیڈ۔اے اسلامیہ کالج
سیوان۔ ۸۴۱۲۲۶

ذکر اس پری وش کا

"چائے نہیں پلاؤ گے ہم علی گڑھ کے ہو" یہ آخری الفاظ پاشا بھائی نے اپنے ایک ساتھی ڈاکٹر عظیم سے کہے تھے۔ جو اس وقت ہم لوگوں کے ساتھ تھے۔ پھر چائے اور سگریٹ کے مزے لینے لگے۔ خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ اور ہم لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ کچھ دنوں کے لیے کالج بھی بند ہو گیا۔ دو چار روز کے بعد اچانک خبر ملی کہ پٹنہ میں حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔ سن کر گہرا صدمہ پہنچا۔ ان کی موت میرے لیے ذاتی نقصان اور حادثۂ جانکاہ سے کم نہ تھی کیوں کہ ہم لوگوں کے روابط کچھ زیادہ ہی دوستانہ اور بے تکلفانہ تھے۔

درمیانہ قد، آنکھوں پہ سیاہ عینک، گورا چٹا رنگ، اور لبوں پہ تبسم ـــ یہ تھے اردو ادب کے مشہور و معروف طنز و مزاح نگار پروفیسر احمد جمال پاشا جنھیں ہم پیار سے جمال بھائی اور پاشا بھائی کہتے تھے۔ بالکل بے ضرر، جو دل میں وہی زبان پر، بہت ہی سادہ طبیعت اور پُر خلوص آدمی۔ فوراً ہی گھل مل جاتے اور مخاطب کو یہ احساس ہرگز نہ ہونے دیتے کہ وہ ایک پایے کے ادیب ہیں۔ ان کی دوستی کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ باپ بیٹا، چھوٹا بڑا، امیر غریب ہر کوئی ان کے اخلاق کے دائرے میں مقید ہو کر رہ جاتا۔ جو ایک بار ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ خالص لکھنوی انداز میں گفتگو کرتے۔ گرچہ ایک عرصہ سے سیوان میں سکونت پذیر تھے۔ بھوجپوری یا بہاری لہجہ مرحوم کو چھو کر بھی نہ گزرا تھا۔ بھوجپوری بولنے پر مجھے اکثر ٹوکتے "اماں! زبان خراب ہو جائے گی۔" لکھنوی ماحول ان کی شخصیت کا حصہ بن گیا تھا۔ گالیاں بھی بڑی محبت سے دیتے۔ لوگ ان کی گالیوں کے عادی تھے۔ لیکن بزرگوں کے سامنے بہت محتاط رہتے اور ایسا لگتا کہ وہ کیا ان کی سات پشتیں بھی اس سے واقف نہ تھیں۔

محفلوں کی جان تھے۔ لطیفے سناتے کبھی نہ تھکتے، سننے والے بھلے ہی تھک جائیں۔ ان کی صحبت میں وقت گزرنے کا احساس بالکل نہ ہوتا۔ ہمیشہ ہنساتے رہتے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ کالج کے کچھ اساتذہ کے ساتھ ان کے گھر پر میں بھی موجود تھا۔ شام کا

وقت تھا۔ چائے اور سگریٹ کے دوران ان کی گُل افشانیٔ گفتار سے محفل زعفران زار تھی۔
لطیفوں کے بعد پروفیسر قیصر سیوانی نے ان سے کچھ اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ جھٹ
میز کے نیچے ہاتھ بڑھایا اور ایک پرانی بیاض نکالی۔ پھر کیا تھا لگے دوستوں سے بے ساختہ
داد وصول لینے۔ اشعار ایسے کہ حضرت چرکین کی روح بھی انھیں دُعائیں دیتی نہ تھکتی۔
میں نے عرض کیا "حضور! یہ شاعرانہ ذوق کب سے ؟"

کہنے لگے "اماں! لکھنؤ یونی ورسٹی کے ایک رجسٹرار تھے رفیع صاحب۔ نہایت سنجیدہ
اور قابل۔ انھیں کے فاضلانہ اشعار ہیں۔" پاشا بھائی کی نظروں میں ہر وہ شخص بقراط اور
سقراط سے زیادہ قابل تھا جو چرکین سے متاثر ہوتا۔ داد و تحسین کا سلسلہ جاری تھا کہ
جناب کمال صبا جو اس وقت سیوان میں ڈی۔ ای۔ او تھے اچانک وارد ہوئے۔ وہ بزرگ
اور کچھ مذہبی رجحان کے آدمی ہیں۔ ان کے آنے کی خبر ملتے ہی "بیاض رفیع" کو چھپایا اور
فوراً تصوف کی ایک کتاب اپنے سامنے رکھ لی۔ صبا صاحب نے پوچھا "میں حارج تو نہیں
ہوا ؟" کہنے لگے "نہیں حضرت! آپ نہایت مناسب وقت پر تشریف لائے ابھی تصوف
ہی کی باتیں ہو رہی تھیں۔"

ایسی کتنی ہی پُر لطف یادیں اور دل چسپ واقعات مرحوم سے وابستہ ہیں۔ اب تو
بہت سی باتیں ذہن سے محو ہو چکی ہیں۔ میں اور ڈاکٹر طیب حسین پیرزٹ اکثر ان سے گھر
ملنے جاتے۔ کبھی کبھی گھر پر ہوتے ہوئے بھی کہلا دیتے "نہیں ہیں" جب ہم لوگ واپس
ہونے کو ہوتے تو یہی چھت پر اچانک سیٹیاں بجاتے نمودار ہوتے اور بڑی
محبت سے بٹھا کر گھنٹوں باتیں کرتے۔ اپنے احباب پر کتابوں کی چوری کا الزام اکثر
عائد کر دیتے جس سے بعض اوقات آپس میں تھوڑی دیر کے لیے خفگی بھی ہو جاتی لیکن
فوراً معافی بھی مانگ لیتے۔ کتابیں خوب خریدتے لیکن انھیں چُرانے کا بھی کوئی موقع ہاتھ
سے جانے نہ دیتے جس کی کتابیں چُراتے کچھ دنوں کے بعد اسی کے سامنے اپنی چوری
کا اعتراف بھی کر لیتے۔

شادیوں کی دعوتیں بڑے خلوص سے قبول کرتے اور بہت مستعدی سے
شامل بھی ہوتے۔ ساتھ میں بطور ہتھیار اپنے عزیزوں اور دوستوں کی شادی پر
"نثری سہرا" ضرور پڑھتے۔ دُلھن کو بکری اور دولھا کو بکرا سے تعبیر کرتے۔ داد کے
ساتھ پانچ اور دس پیسوں کے سکّے" زبردستی وصولتے۔ میں نے انھیں اپنی شادی کی
دعوت دی تو "نثری سہرا" لے کر حاضر ہوئے۔ پڑھا بھی اور کافی داد بھی وصول کی۔ میں
نے بہت اصرار کیا "پاشا بھائی! یہ سہرا مجھے دو۔" کہنے لگے "اماں! دے دوں گا اتنی جلدی
کیا ہے ؟" وہ سہرا تو نہ دیا لیکن میرے دادا جان کی بیاض پار کر دی جس کی اطلاع
انھوں نے خود ہی ایک سال کے بعد دی۔ "فیروز! تمھارے دادا بہت اچھے شاعر ہیں"
میں نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا ؟" مسکرا کر بولے "تمھاری شادی

کے موقع پر گیا تھا تو ان کی بیاض چرا لایا۔"

مرحوم کو اولاد نہ ہونے کا شدید احساس تھا۔ دورانِ گفتگو اکثر اداس ہو جاتے اور کہتے "خدا نے مجھے کسی چیز کی کمی نہیں دی لیکن ایک اولاد سے محروم رکھا" میں کہتا "پاشا بھائی! علاج کرائیے" تو جواب دیتے۔ "یار بہت علاج کرائے لیکن اللہ میاں کی مرضی...." ان کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں اور میں گفتگو کا رُخ دوسری طرف موڑ دیتا۔

انھیں اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں چھپنے کا بھی شوق تھا۔ اکثر طیب صاحب سے کہتے۔ "پنڈت! حرامی پن چھوڑو اور میرے مضامین کا ہندی ترجمہ کرو" طیب صاحب نے ان کے مزاحیہ مضمون "چمچہ کانفرنس" کا ہندی ترجمہ چھپوایا جو بے حد مقبول ہوا۔ پاشا صاحب بنیادی طور پر مزاح نگار تھے۔ لیکن ان کی مزاح نگاری صرف کتابوں اور پرچوں کے صفحات تک ہی محدود نہ تھی۔ ذاتی زندگی میں بھی وہ اپنے اس حربے کا استعمال نہایت حاضر جوابی سے کرتے۔ ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے ان سے غیر حاضر ہونے پر جواب طلب کیا۔ "پاشا صاحب! آپ نے حاضری نہیں بنائی؟ آپ کو نہیں معلوم کہ حاضری رجسٹر پر دستخط کرنا لازمی ہے؟" برجستگی سے جواب دیا "حضور! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ اس پابندی کا اطلاق مجھ پر اور لیڈی ٹیچرس پر نہیں ہوتا۔"

ہم لوگ اکثر ان سے دعوتیں کھاتے۔ جب مٹھائیاں کھانے کو دل کرتا ان کے یہاں جا پہنچتے۔ "پاشا بھائی! مٹھائی کھلاؤ" کہتے "کیوں بیٹا! صبح صبح میرے ساتھ یہ حرامی پن کیوں؟" ہم لوگ کہتے "آپ سے بڑا ادیب سیوان میں اور کون ہے؟" بہت خوش ہوتے اور فوراً مٹھائیوں کے لیے کسی کو بازار دوڑاتے۔ ہم لوگوں کو کھلاتے اور خود بھی کھاتے۔ میں ان کو اکثر تنگ کرتا۔ ایک دفعہ حسب دستور گالیوں کی بوچھار کر رہے تھے کہ اچانک ان کی بیگم پروفیسر سرور جمال وہاں پہنچ گئیں۔ پوچھا۔ آپ لوگ کیا باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ "پاشا بھائی فرما رہے تھے کہ پڑھے لکھے مہذب ہوتے ہیں۔ اور انھیں شریفانہ انداز میں گفتگو کرنی چاہیے۔ کیوں پاشا بھائی؟" زچ ہو کر بولے "اور کیا! اور کیا! یہ تو حیوان اور انسان کا بنیادی فرق ہے" دوسری صبح کالج میں دھر دبوچا۔ "بیٹا! تم تو کل بے عزت کر دیتے۔ اماں میاں بیوی کا رشتہ بہت نازک ہوتا ہے آیندہ احتیاط رکھنا۔ یہ لونڈا پن نہیں چلے گا۔" پھر کیا تھا میں اس دن سے ان کو بلیک میل کرنے لگا۔ اکثر کہتا۔ "پاشا بھائی! مٹھائی کھلاؤ ورنہ بھابھی کو آپ کے مہذب انداز گفتگو کی اطلاع ہو جائے گی۔ فوراً کہتے "ارے! نہیں نہیں ایسا بھی کیا چلو کھلاتا ہوں۔

شروع شروع میں ان کی انگریزی بالکل علامہ جمیل مظہری کی انگریزی جیسی تھی۔ علامہ کو ہمیشہ اس بات پر تعجب ہوتا کہ Forty لکھنے پر Four کا 'U' کہاں غائب ہو جاتا ہے؟۔ اکثر عالم بے یقینی میں احباب سے اس مسئلہ پر بحث کرتے وقت خفا ہو جاتے۔ پاشا بھائی نے اپنی محنت اور لگن سے حیرت انگیز طور پر آگے چل کر اس قدر انگریزی زبان

پر قدرت حاصل کر لی تھی کہ انگریزی کی کئی کتابوں کا نہایت ہی کامیاب اردو ترجمہ کیا۔ پڑھنے لکھنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے اور ہر عملی مدد بھی۔ آج کتنے ہی طلبہ ان کی وجہ سے ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ لوگ اکثر ان سے ادبی موضوعات پر مشورہ لینے آتے۔ اگر مقابل کوئی بے تکلف شناسا یا دوست ہوتا تو پھر اس کی جان پہ بن آتی۔ ایک دفعہ ایک صاحب حاضر ہوئے وہ بہت کوشش کے باوجود تک بندی سے آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ لہٰذا شاعری کے میدان میں ناکام ہونے کے بعد نثر نگاری کی طرف حملہ آور ہوئے۔ ہاتھوں میں ایک بوسیدہ پلندہ لیے نازل ہوئے۔ میں اور پنڈت جی بھی وہیں موجود تھے۔ چائے پینے کے بعد انھوں نے بہت مودبانہ انداز میں پاشا صاحب کے سامنے ایک مضمون بغرض تصحیح پیش کیا۔ ہر غلطی پر مرحوم ان کے بے دریغ گالیاں دیتے رہے۔ "سالے یہ باپ کے گھر سے لائے ہو؟ اماں یہ مذکر نہیں مونث ہے۔ تمھارے باپ نے بھی کبھی اردو پڑھی ہے؟" وہ ان کی ہر گالی پر آداب بجالاتے اور ہم لوگ بیٹھے محظوظ ہوتے رہے۔ اتفاق سے دوسرا پیراگراف ہر طرح کی غلطی سے پاک تھا۔ وہ غریب بہت خوش ہوا کہ اب گالیاں نہیں سننا پڑیں گی۔ لیکن قلم روکتے ہی پاشا بھائی نے فرمایا۔ "واہ بیٹا! بڑے حرامی ہو گئے ہیں آپ، پورے کا پورا پیراگراف صحیح لکھ ڈالا۔"

اب کبھی ان کے گھر جاتا ہوں تو وہی کوٹھی نشاط افزا جہاں ہم قہقہے لگاتے تھے بالکل اُداس نظر آتی ہے۔ ان کے لگائے ہوئے کیکٹس آج بھی موجود ہیں۔ حسرت بھری نگاہیں پاشا بھائی کو ڈھونڈتی ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چند ہی لمحوں میں اپنے کوٹھے پر سیٹیاں بجاتے نمودار ہوں گے۔ ان کے لگائے ہوئے کیکٹس کے کانٹے بے اختیار دامن پکڑنے کو میری طرف دوڑتے محسوس ہوتے ہیں۔ اور میں دل میں اُٹھے درد کو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہوں۔ ؎

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

بقیہ صفحہ ۶۶ کا

کرو، جو کچھ کام کا ملے اس سے اپنا دامن بھر لو باقی چلنے دو۔" اس بات پر حیرت اس وقت ہوئی تھی جب احتشام صاحب نے جدیدیت کے بارے میں کسی کے مذاق سے پوچھنے پر سنجیدگی سے کہا تھا کہ "ابھی میں اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

ویسے حیرت مجھے ان کی بہت سی باتوں پر ہوتی ہے جو ہمیشہ آخر میں خوشی میں بدل جاتی ہے اس لیے ان کی شخصیت میرے لیے ہمیشہ بے حد خوشگوار رہی ہے اور رہے گی۔

کتاب نما کے خطوط

● ڈاکٹر اخلاق اثر، صادق منزل چوک امام باڑہ بھوپال

دسمبر ۱۹۸۳ء کے کتاب نما میں پروفیسر محمد حسن کی نظم "اپنے قاتلوں کے نام" تاریخی و تہذیبی شعور اشاریت و ایمائیت کے ساتھ ساتھ انداز فکر اور احتجاجی لے کے لحاظ سے بہت خوب ہے شاید نظم ہی کا پیکران کاٹ دار اشعار کے لیے موزوں ترین ہے۔

اسی شمارے میں جناب گوند رشک صاحب کا خیال کہ "خوش فہمی اور بات ہے مگر بھارت میں اردو کا مستقبل تابناک نہیں۔ یہ ایک زندہ حقیقت ہے" بہت سے حساس اور اپنی زبان سے محبت کرنے والوں کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے جس کی ایک بہترین مثال ہے، مجتبیٰ حسین کا طنزیہ "اردو کی شیروانی صندوق سے باہر نکل آئی"۔ اگر حالات تبدیل نہ ہوئے تو ڈر ہے کہ اردو کا یہی انجام ہوگا۔ یہ بھی ایک ستم ہے کہ اردو کا ایک طبقہ جس کو اردو سے زیادہ عہدوں سے پیار ہے اس نے نعرہ لگایا کہ "ان لوگوں کو بے نقاب کرنے کی ضرورت ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کا مستقبل ہندوستان میں محفوظ نہیں" اور اصحاب سیاست کو باور کرا دیا کہ سب ٹھیک ہے اور رسمی طور پر بھی اردو کی شیروانی کو صندوق سے باہر نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اس پس منظر میں پروفیسر محمد حسن کی نظم اور مجتبیٰ حسین کے طنزیہ کی اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ کتاب نما کو اپنے قارئین کے مسائل اور مصائب سے ہمدردی ہے۔

● جمال اویسی، محلہ فیض اللہ خاں دربھنگہ بہار

جدیدیت کے خاتمہ کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ جہاں اداریہ کے تحت ایک تجزیاتی مضمون شائع کریں جس میں ترقی پسند ادب اور اس کے بعد جدید ادب کے فائدے اور نقصان کا حساب لگایا جاسکے۔ تجربات کی زد میں آئے جدید ادب کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کا احاطہ ضروری ہوگیا ہے۔ شاعری میں اینٹی غزل کالی غزل، پہلی غزل، کشمیری غزل، آزاد غزل وغیرہ نے جدیدیت کے عروج کے زمانے میں ہی خود کو پیش کیا۔ فکشن میں اینٹی کہانی کے علاوہ بلا ماجرہ کہانی اور کردار کے بغیر قصّے کے جالے بننے کی کوشش، ان سب کا فائدہ اور نقصان۔ اردو ادب کے لیے ضروری ہے۔ نئی نسل کی چاہتیں ادب میں کس جہت پر ہیں؟ وہ کس قسم کی تخلیق پیدا کرنا چاہتی ہے وغیرہ وغیرہ، امید ہے آپ نے بھی ایسا کچھ ضرور سوچا ہوگا۔)

● اختر بستوی شعبۂ اردو۔ گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور یوپی

شکر گزار ہوں کہ اس میں آپ نے میری غزل شائع کی ہے۔ لیکن اس کے مقطعے کا مصرع ثانی غلط چھپ گیا ہے۔ مذکورہ مصرع یوں چھپا ہے:

میں اگر اختر جو سچ پوچھو تو آہ میر ہوں

جبکہ صحیح مصرع یہ ہے:۔

میں مگر اختر جو سچ پوچھو تو آہ میر ہوں

"مگر" کی جگہ مصرعے میں "اگر" کر دینے کی اصلاح آپ کی تو ہو نہیں سکتی۔ یقیناً یہ کرم کاتب صاحب ہی نے فرمایا ہوگا۔ بظاہر یہ بہت ہی چھوٹی سی غلطی ہے لیکن اس سے مصرع جاہلانہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ "اگر" اور "جو" دونوں الفاظ ایک ساتھ نہیں استعمال کیے جاسکتے، کیونکہ یہاں

ر" سے بھی وہ ما عنی ہیں جو "آگرہ" کے ہیں۔ یہ
" گل روغن کا تیل" جیسی بات ہو جائے گی
شیدا بگھونوی، ڈاکخانہ شاہ پور بگھونی، سمستی پور
"علمی روایت کی تلاش" میں ڈاکٹر سید تقی حسین
عفری کا خصوصی اشاریہ کا جاندار ہے۔
اسلم طارق

جنوری کے شمارہ میں مہمان مدیر ڈاکٹر سید
ی حسین جعفری صاحب کا اشاریہ، ڈاکٹر آغا سہیل
ماحب کا "میرا ہمدم میرا دوست"، ڈاکٹر کمال
مد صدیقی کا "عروض معروض" اور ڈاکٹر ادم پرکاش
زوال آزار علامی کا "عروض دانی فاروقی" وغیرہ
مضامین دلکش و معیاری ہیں اور معلومات فراہم
کرتے ہیں۔

حصۂ منظومات میں وسیم مینائی، شمس فرخ آبادی
وہر زاہری، اکبر حمیدی اور شاہد اختر کی غزلیں
پسند آئیں۔

ڈاکٹر حمید اختر سردھنوی، اسلام آباد میرٹھ یوپی

جنوری ۸۴ء کا کتاب نما پڑھا۔ جناب ڈاکٹر
سید تقی حسین جعفری کا مقالہ "ہندستان کے عہد
وسطیٰ کی میراث" دل میں اترتا چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب
کا مقالہ تاریخی پس منظر میں لکھا گیا ہے جو ان کی
علمی قابلیت اور دور بین نگاہوں کا پتا دیتا ہے
انھوں نے مسلمانوں کی پستی اور زوال کے اسباب
کی نشاندہی کی ہے کہ جب بھی کوئی قوم دوسری
ترقی یافتہ اقوام کے علوم و فنون کو کسی تعصب
یا کوتاہ نظری کی بنا پر اپنے یہاں درآمد کرنا چھوڑ
دیتی ہے تو زوال اس کا مقدر بن جاتا ہے
آج دنیا کے نقشے پر چالیس سے زیادہ مسلم حکومتیں
ہونے کے باوجود سائنسی میدان میں کوئی کارہائے
نمایاں نہیں دکھا سکی بلکہ ترقی یافتہ ملکوں کے سامنے
عاجز ہی نظر آتی ہیں جبکہ سیال سوتا ان کے پیروں

کے نیچے بہہ رہا ہے۔ بہرحال موصوف ایک دانشور
ہیں جو تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر آغا
سہیل نے رام لعل پر مضمون لکھ کر اپنی محبت اور
خلوص کا ثبوت دیا ہے جو ایک اچھے ادیب کا حق
ہوتا ہے۔

فروری ۸۴ء کا کتاب نما میں مہمان مدیر جناب
سید ظفر ہاشمی کا مقالہ "رکھیو احباب مجھے تلخ نوائی
سے معاف" میں۔ اردو کی حالت زار کا بہتر طور
پر تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں
کہیں اردو کے "نام نہاد ٹھیکیداروں یا درباری
وظیفہ خواروں کے لیے کرخت لہجہ استعمال
ہو گیا ہے۔ مگر تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق
پینتالیس سال کی صبر آزما جد و جہد کے بعد شاید
کسی محبان اردو کے لیے یہ واجب ہو گیا تھا۔
ہاشمی صاحب نے اردو کی کسمپرسی کے گہرے مطالعے
کے بعد بڑی دور رس باتیں لکھی ہیں جو لفظ لفظ
دل میں اترتی چلی گئیں، یوں بھی سچائی کڑوی ہوتی
ہے مگر حق بات کہنے والے دار و رسن کے
درمیان نہیں جھجکتے ــــــ ڈاکٹر وزیر آغا نے
اپنے مقالے میں صنف انشائیہ سے متعلق بڑی اچھی
بحث کی ہے جس سے اردو قاری کو انشائیہ
کے سمجھنے میں کافی مدد ملے گی ــــــ شفیقہ فرحت
نے قلم کا سفر میں طنزیہ تحریر کو بڑے تیکھے انداز
میں پیش کیا ہے جس کے لیے انھیں داد دینے
کو جی چاہتا ہے۔

اب ایک نظر ایوان غزل کی طرف بھی۔ باقر
مہدی نے جوش کی یاد کے تحت جو غزل کہی ہے
وہ شمارے کی پختہ غزل کہی جا سکتی ہے منجملہ
اس شمارے کے تمام مشمولات بہتر ہیں آخر میں
فضیل علوی کا یہ شعر گنگناتے چلیں۔

بات میری یہاں سنے گا کون

● مرزا نعیم احمد بیگ ناز ۸۸/۱ [illegible] - نج گرہ

«سڑک بولتی ہے» ایک انفرادی مضمون ہے جس میں علاوہ افسانہ نگاری کے ہر شعبۂ حیات کو جناب زبیر ایم خان نے مکمل طور پر اجاگر کر کے عوام کو اپنی زندگی اور حالات کو سدھارنے کا بے مثل سبق دیا ہے۔ کاش ہم کو اس پر عمل کرنے کی توفیق حاصل ہو۔

● نفیس تقی سرونج، ایم پی

جہاں مدیر جناب ابوالفیض سحر کا اشاریہ اور ڈاکٹر عصمت جاوید صاحب کا مضمون «قافیے کی ماہیت» اپنی افادیت کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہیں۔ عصمت جاوید صاحب نے قافیہ شناسی پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ آج کل اکثر شعرا کے یہاں قافیے کے متعلق فنی کمزوریاں دیکھنے میں آتی ہیں۔

منظومات میں اسلم فرخی، کرامت بخاری (پاکستان) شعیب شمس (انڈمان) شاہد میر وغیرہ کی تخلیقات اچھی لگیں۔ جناب قیوم خضر کا مضمون «تاریکی کی تہہ سے اجالے کی نمود» شاندار مقصد کے تحت لکھا گیا تاریخی خاکہ دل کی گہرائیوں تک اثر کرتا ہے۔ موصوف کی طرز تحریر میں بلا کا زور بیان ہے۔ ہماری قوم ناکامی، مایوسی اور محرومی کے مرض میں مبتلا ہے اس مضمون میں اسی درد کو اجاگر کیا گیا ہے کاش ہم غفلت کی نیند سے بیدار ہونے کی کوشش کریں۔

● احمد صغیر صدیقی ۲۰/۴ عالیر کالونی۔ کراچی

کتاب نما سے ایک ربط جو پیدا ہوا ہے اور آپ کی محبت سے قائم ہے میں اسے اپنی طرف سے مضبوط رکھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرنا چاہتا۔ افسوس اس میں منظومات کا معیار اچھا نہیں ہے۔ صورت ہندستان کے کئی زیادہ ضخیم جریدوں سے کسی طرح کم نہیں۔ اسے آپ کی تھوڑی سی توجہ اور چاہیے۔ بہت بڑے بڑے حروف میں بطور عنوان غزل نہ لکھوائیں اسی طرح خطوط میں مکتوب نگاروں کے نام اگر خط کے اوپر ذرا جلی خط سے لکھے جائیں تو بہتر تاثر پڑے گا۔ دیکھیے نا یہ سب چیزیں «لے آوٹ» وغیرہ بھی جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان ہوتے ہیں۔ بس ذرا سی توجہ چاہیے ہوگی آپ کی۔ پرچے کا لے آوٹ LAY-OUT تھوڑا بدلے تو یہ ایک دم نیا محسوس ہو سکتا ہے آپ کے چھپنے والے مضامین کا ہمیشہ قدر دان رہا ہوں۔ خوب ہوتے ہیں۔ افسانے اور فکاہیے بھی لطف دیتے ہیں لیکن منظومات بڑا بدمزہ کرتی ہیں۔ بہ طور ہمت افزائی میں بہت سے نئے نام ان دونوں شماروں میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ چلیے ان کا معاملہ اور رہے یہ جو حضرات پوری پوری عمر سے شاعری فرما رہے ہیں رونا تو ان کی نگارشات پر آتا ہے۔ ان کی غزلوں میں تازگی اور حرارت دور دور تک نہیں ملتی۔ تو پھر کیا ضروری ہے کہ شاعری کے نام پر قافیہ پیمائی کی جائے۔ خیال تو کوئی نیا رہا نہیں ہے خیر اسلوب بھی نہیں ملتا ان کے ہاں۔

آج کل — دونوں طرف یعنی یہاں بھی اور وہاں بھی۔ صورت حال یہ ہے کہ کوئی کالی غزل کہے چلا رہا ہے کوئی پیلی غزل — کوئی زمین کی ہانک رہا ہے کوئی آسمان کی۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ اسے دھڑا دھڑ چھاپا جا رہا ہے پورے پورے صفحات پر۔ وہ پرچہ جو خود کو کسی آسمانی صحیفے جیسے سمجھتا ہے وہاں بھی اندر یہی کچھ ہے اور اس پرچے میں بھی جو کہتا ہے کہ

"ہمارے ہاں کچھ بھیجنا چھپنے کے لیے تو ذرا سوچ کے"۔ بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا میری درخواست صرف اتنی ہے کہ کتاب نما کے اس حصے کے معیار پر تھوڑی سی نظر ثانی کریں۔ تھوڑی سی چیزیں ہوں مگر اچھی ہوں تو کیا کہنے۔ اس دعا کے ساتھ لکھنا بند کر رہا ہوں کہ یہ خط خدا کرے آپ تک پہنچ جائے۔

● رہبر جونپوری ۴۴۴ / این ۳ اے سیکٹر گوند پورہ بھوپال

عروض سے متعلق قبلہ زار علامی اور محترم کمال احمد صدیقی کی بحث ادبی اور فنی بحث سے بڑھ کر ذاتیات کے قریب پہنچ چکی ہے۔ بہتر ہوا کہ آپ نے اس سلسلے کو اس شمارہ سے ختم کر دیا۔

● مسرور حسین سرور۔ ہاتھی خانہ۔ فتح گڑھ یو پی

جنوری کے شمارے کے سبھی مضامین پسند آئے بالخصوص مجتبیٰ حسین کا خاکہ "جسٹس جپال سنگھ" اور زیڈ ایم خان کا طنزیہ مضمون "سڑک بولتی ہے" البتہ نظم والے حصے نے زیادہ متاثر نہیں کیا۔

ان دنوں جو بھی اردو جانتا ہے اس کی عمر ہر حالت میں پچاس برس سے اوپر ہوتی ہے۔ مجتبیٰ حسین کا یہ جملہ صرف طنز اور تلخ حقیقت ہی نہیں بلکہ اردو جیسی ہر دلعزیز زبان کا المیہ بھی ہے آپ نے بنگو کے مجسمے کی نمائش ہی نہیں کی بلکہ بنگو کی یاد کا ایک مجسمہ کھڑا کر دیا۔ اس جملہ میں تو فن اپنی بلندیوں پر نظر آتا ہے اس کامیاب خاکہ کی تخلیق کے لیے مجتبیٰ حسین کو مبارک باد۔

زیڈ ایم خان نے اپنے طنزیہ مضمون میں سڑک کو علامت بنا کر اس کی نصیحت آمیز گفتگو سے ہماری حمیت اور ہمارے اندر کے انسان کو جھنجھوڑا ہے۔ یہ مضمون اپنے اندر ایک بیکراں وسعت لیے ہوئے ہے اسلوب اس قدر کامیاب کہ قاری کی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے۔ تحریر میں کہیں کہیں پہ رومانی پنچ بھی دیکھے ہیں۔ لیکن اس رومانی تحریر میں بھی مقصد بہت کارفرما ہے فحش نگاری نہیں۔ زیڈ ایم خان صاحب کو اس بہتر تخلیق کے لیے مبارک باد۔

● پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی۔ حبیب منزل میرس روڈ علی گڑھ

کتاب نما کے فروری ۱۹۹۴ء کے اشاریے کا اختتام "محرومی، ناکامی، احساس شکستگی، ذلت اور رسوائی" جیسے الفاظ پر ہوتا ہے اور مجھے یہ کہنے کے لیے معاف کیا جائے کہ اشاریہ پڑھ کر فاضل مہمان مدیر کے احساس شکست اور محرومی و ناکامی ہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ قابل اعتراض بات یہ ہے کہ فاضل مہمان مدیر نے یہ پہلے ہی سے فرض کر لیا ہے کہ جو کوئی ان کی رائے سے متفق نہیں ہے وہ لازماً "سرکار کی مراعات اعزازات اور انعامات سے شرف یاب" ہونے کی خاطر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح کی سوچ بجائے خود احساس شکست اور محرومی و ناکامی کی پیداوار ہوتی ہے۔

یہ تو بالکل صحیح ہے کہ ملک کی تقسیم کے نتیجے میں پیدا شدہ صورت حال نے (آزادی نے نہیں) اردو کو جتنا عظیم نقصان پہنچایا ہے شاید ہی کسی اور کو پہنچایا ہو، اور یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ دور حاضر میں اردو کے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں میں بہت کم ایسے ہوں گے جنھوں نے اپنی اولاد کو اردو کی تعلیم دلائی ہو لیکن جیسا کہ خود فاضل مہمان مدیر نے تسلیم کیا ہے ایسے اردو داں مسلمان بھی کم نہیں ہیں جو اپنے

پچھلوں کو اسی شوق فضول میں مبتلا کرنا فضول بحث سمجھتے ہیں۔ پھر اسی میں مذہب درمیان میں کیسے آگیا بلکہ یہ تو خالص مصلحت بینی کی بات ہوئی اور اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم کہیں زیادہ مصلحت بین واقع ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ صرف وہ مسلمان اپنے بچوں کو اردو پڑھاتے ہیں جن کی مطالعے کا دائرہ فلاں فلاں مصنفین و شعراء اور فلاں فلاں کتابوں (زیادہ تر مذہبی نوعیت کی) تک محدود ہے اس لیے اردو کو ایک مخصوص دائرے میں سمیٹ لیا جائے۔ یہاں فاضل مدیر نے بات ادب، مذہب اور ثقافت کی کہی ہے۔ یہ دائرہ بندی سمجھ میں نہیں آئی۔ ادب سے لطف اندوز ہونے کی خاطر کسی زبان کو حاصل کرنے کا مطلب یہ کیسے ہوگیا کہ اس کا رشتہ روزی روٹی سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ ثقافت کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں سب ہی کچھ شامل ہے۔ رہی بات مذہب کی، اردو علیحدہ رہی، عربی کو بھی خالص مذہبی زبان قرار دینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ بات طویل ہو جائے گی ورنہ اس بارے میں بہت کچھ عرض کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر اگر اردو کو فاضل مہمان مدیر کے مشورے کے مطابق عربی کے ساتھ پڑھایا جائے تو آج ہندستان میں عربی داں مسلمانوں کی تعداد ان کے خیال میں کتنی ہے۔ (یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ قرآن مجید پڑھ لینے کو عربی دانی کے مترادف قرار دیتے ہوں) یہی حشر اردو کا بھی ہوگا۔

انھوں نے جو صغرا کبرا قائم کیے ہیں ان سے تفصیلی بحث ایک جداگانہ مضمون کا مطالبہ کرتی ہے اس لیے بس اسی قدر عرض کرنا کافی ہے کہ یہ محض مفروضات ہیں جن کا حقائق سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اردو کے ساتھ جو ناانصافی سرکاری سطح پر ہوتی رہی ہے اور آج بھی ہو رہی ہے اور اسی کی بنا پر بہت سے والدین اور سرپرست (غیر مسلم زیادہ مسلمان کم) اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم سے جس طرح محروم رکھ رہے ہیں اس کے باوجود اردو آج بھی بلاشبہ ہماری مشترک زبان ہے۔ کسی کے کہنے سے، چاہے وہ کہنے والا بھاجپا اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ سے تعلق رکھتا ہو یا اسلام کا نام لیوا ہو، یہ حقیقت بدلی نہیں جا سکتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم کسی کے طعن و تشنیع یا جھلاہٹ کے باعث اس حقیقت کے اعتراف اور اس پر اصرار سے باز آجائیں۔ اردو کے جو غیر مسلم ادیب اور شاعر آج اس دنیا میں نہیں ہیں انھیں تو چھوڑیے جو خدا کے فضل سے اب بھی بقید حیات ہیں انھیں اس طرح کے اشاریے پڑھ کر کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔

آخری بات یہ کہ اردو کے لیے بعض ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کے مطالبے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اور مطالبہ نہیں کیا جا سکتا ہے یا نہیں کیا جا رہا ہے۔ ہمارا ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ اسکول کی آٹھویں جماعت تک اردو کی تعلیم ہر ایک کے لیے لازمی قرار دے دی جائے۔ اس طرح کے مطالبے کے لیے ہندستان جیسے جمہوری ملک میں کسی غیر معمولی ہمت و جرأت کی ضرورت بالکل نہیں ہے اور بہت سی خامیوں کے باوجود آج بھی ایک ہندستانی ہونے کا سب سے بڑا انعام یہی ہے کہ ہم اپنے حق کے لیے بلا روک ٹوک آواز اٹھا سکتے ہیں۔ ہاں فرقہ وارانہ طاقتیں اس راہ میں ضرور روڑے

اٹکانے کی کوشش کرتی ہیں اور جس تحریر پر اس وقت گفتگو ہو رہی ہے اس طرح کی تحریروں سے ان طاقتوں کو کمک پہنچتی ہے اور سیکولر مزاج کے غیر مسلموں کی ہمت شکنی ہوتی ہے۔

● ڈاکٹر سید محمد رافق زماں شیعہ فرکس مارواڑی کالج بھاگلپور
فروری ۹۴ء کے شمارے میں اشاریہ رکھیو احباب مجھے تلخ نوائی سے معاف، پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار اکثر میں نے اپنے حلقۂ احباب میں کیا ہے اور ہوبہو اسی قسم کے مشاہدات اور ذاتی تجربات میرے بھی ہیں۔ مضمون نہایت ہی عمدہ ہے۔ اس کو کتابچہ کی شکل میں اردو داں طبقہ میں مفت تقسیم کروا دینا چاہیے۔ اردو کے بارے میں اتنی کھری کھری باتیں بہت کم لوگ کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ کوئی ادیبوں کی خفگی سے ڈرتے ہیں، کوئی اکادمی کے اراکین کی ناراضگی سے خائف اور کوئی سرکار کی نگاہ میں سرخرو رہنے کی خاطر اظہار حقیقت کی جسارت نہیں کرتے۔ گرچہ مضمون اظہار حقیقت پر مبنی ہے مگر کہیں کہیں تلخی کی شدت ہے اور ممکن ہے سب لوگ اس میں پیش کیے گئے لائحہ عمل سے متفق نہ ہوں۔ پھر بھی تمام باتوں پر خلوص کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں مدیر سید ظفر ہاشمی لائق مبارکباد ہیں کہ منافقت کے اس دور میں اتنی صاف گوئی کی جرأت کی اور کامیاب مضمون لکھا "قلم کا سفر" بھی طنز کا ایک کامیاب نمونہ ہے۔ شفیقہ فرحت نے بڑی کامیابی کے ساتھ اقتدار اعلا کو نشانہ بنایا ہے۔ آپ نے ایسی جرأت مندانہ تخلیقات کو شائع کر کے عزم و ہمت کا ثبوت پیش کیا ہے "بمبئی میں بھوپال" بھی پرویز اللہ مہدی کا ایک کامیاب طنزیہ ہے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی
(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتب ڈاکٹر خلیق انجم
معاون ایم حبیب خاں
قیمت ۱۵/ روپے صفحات ۱۰۴
ناشر:- ماہنامہ کتاب نما، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
تبصرہ نگار:- مظفر حسین غزالی

زیر نظر رسالہ کتاب نما کا خصوصی شمارہ ہے جو پروفیسر نثار احمد فاروقی کی شخصیت اور ادبی خدمات کے موضوع پر مشتمل ہے۔ اس رسالے کو ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے مہمان مدیر کی حیثیت سے مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں پروفیسر نثار احمد فاروقی کی قدآور شخصیت پر مرتب کرنے کا حق وہی ادا کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ نثار صاحب سے بہت زیادہ واقف ہیں ان کی پوری زندگی خلیق انجم صاحب کے سامنے ہے اور وہ فاروقی صاحب کے علمی کاموں سے واقفیت بھی رکھتے ہیں اور ان کی قدر بھی کرتے ہیں۔ ان کی کوشش سے یہ اہم کام بہت وقت پر سامنے آگیا۔ نئے محققین کے لیے ایک ماخذ فراہم ہوگیا۔ جس کے استفادے سے تحقیق کے بہت سے نئے گوشوں کے بارے میں فاروقی صاحب کی شخصیت سے رہنمائی مل سکتی ہے اور تحقیق کرنے کے لیے ہمت افزائی بھی۔

مختلف اہم شخصیتوں پر خصوصی شمارے مرتب کرانے کی کتاب نما کی روایت بہت پرانی ہے۔ اس سلسلے کے نمبروں میں بہت سے نمبر ادبی حلقوں میں خوب داد حاصل کر چکے ہیں اور کئی تو مثال بن چکے ہیں۔ اس روایت کے تحت پروفیسر نثار احمد فاروقی اور غلام ربانی تاباں صاحب پر دو اہم نمبر ابھی حال ہی میں سامنے آئے ہیں امید ہے ان کی بھی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوگی۔

زیر تبصرہ شمارے میں خلیق انجم کے اداریہ اور سید مظفر حسین برنی کے تاثرات کے علاوہ تیرہ مضامین بالترتیب دراسات کا مصنف، علم کی کان، تحقیق کا مرد میدان، بنگلے میں بھی زلف ان کی بناکی، کچھ دیکھا، کچھ ان دیکھا سورج، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور فارسی ادب، نثار احمد فاروقی میری سے غالب آشنائی تک، پروفیسر نثار احمد فاروقی سے ایک گفتگو، پروفیسر نثار احمد

فاروقی، میرے مشاہدات، نثار احمد فاروقی بحیثیت تنقید نگار، نثار احمد فاروقی۔ ایک نقاد اور محقق کی حیثیت سے، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور نقد آزاد، پروفیسر نثار احمد فاروقی چند یادیں، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کا خاندانی پس منظر، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی شخصیت اور علمی مرتبہ، نثار احمد فاروقی ایک بے لوث نقاد، اشاریہ تصنیفات، تالیفات، تراجم و نگارشات پروفیسر نثار احمد فاروقی اور فاروقی جلال شامل ہیں۔

ان مضامین کے درمیان دس خطوط و تاثراتی مضامین کے اقتباسات الگ سے بزرگ اور استاد ادیبوں کے شامل کیے گئے ہیں۔ ان خطوط و تاثراتی اقتباسات میں پروفیسر نثار احمد فاروقی کے علمی مرتبے اور گراں قدر ادبی خدمات کو سراہا گیا ہے۔ ان خطوط و تاثرات پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، محمد اسحاق بھٹی ماہنامہ المعارف، پروفیسر رشید احمد صدیقی، خلیل الرحمن اعظمی، عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر ریاض الاسلام کراچی، گوردیال سنگھ مجذوب اور پیر محمد اجمل فاروقی فریدی کے نام اہم ہیں۔ ان خطوط و تاثرات سے نثار صاحب کی علمی خدمات کے بارے میں بہت سی اہم باتیں سامنے آگئی ہیں۔

اوپر بیان کیے گئے سترہ مضامین میں سے کئی مضامین میں ایک جیسی باتیں آ گئی ہیں۔ مثلاً کئی حضرات نے اپنے مضامین میں پروفیسر فاروقی کے تحقیقی مقالے کا جو انگریزی میں لکھا گیا تھا تعریفی و توصیفی الفاظ میں تذکرہ کیا ہے بہتر تو یہ ہوتا کہ وہ حضرات ان کے مقالے کے کچھ اہم اجزا اپنے مضمون میں پیش کرتے تاکہ ان کے مقالے کی اہمیت کا ایک نئے قاری کو بخوبی اندازہ ہوتا۔ دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ اس کتاب میں پروفیسر فاروقی کے اسلوب، اور عربی ادب میں ان کی خدمات کے موضوعات پر بھی مضامین شامل ہونے چاہیے تھے۔ مجموعی طور پر یہ رسالہ پڑھنے اور اپنی ذاتی لائبریری میں رکھنے کے قابل ہے۔ توقع ہے یہ ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیا جائے گا۔ کیونکہ اس میں فاروقی صاحب کی علمی خدمات کے علاوہ ان کی خودساز شخصیت کی دلچسپ اور حوصلہ افزا کہانی بھی موجود ہے۔

اردو زبان کا آغاز، مختلف نظریے اور حقائق

مصنف :- ڈاکٹر عمرا صدیقی، ریڈر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ

صفحات :- ۲۴۰

قیمت :- ۲۲۵/- روپے

مبصر :- کوثر حسین مظہری۔ ریسرچ فیلو شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

زبان کے آغاز و ارتقا کی چھان بین، الفاظ کی زوبہ تو تشکیل وغیرہ ایسے گوشے ہیں جن پر کھل کر بحث کرنے اور خامہ فرسائی کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر خورشید عمرا نے اپنی محنت اور کاوش سے لسانیات کے اس متنازعہ فیہ موضوع پر کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء اور مولد و مسکن سے متعلق آج بھی اختلاف ہیں۔ محترمہ اپنے مقالہ کے ابتدائیہ میں لکھتی ہیں:

"ہم نے کثرت میں وحدت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک ایسا نظریہ پیش کیا

اس کتاب کے اختتامیہ میں وہ لکھتی ہیں:

"اردو کی پیدائش کا زمانہ ۱۰۰۰ سے ۱۱۹۳ء تک مقرر کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ مغربی ہندی کی حدود بھی وہی ہیں جو مدھیہ دیش کے ہیں اس لیے ہمارا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اردو کا جنم مدھیہ دیش میں ہوا۔"

حالانکہ مدھیہ پردیش میں اردو کی پیدائش کا ذکر شوکت سبزواری نے اپنی کتاب "داستان زبان اردو" میں کر دیا ہے بلکہ ۱۰۰۰ تا ۱۱۹۳ء کا زمانہ بھی انہی کا قائم کردہ ہے۔ اسی عہد میں مغربی ہندی پانچ بولیوں بالترتیب برج بھاشا، بندیلی، قنوجی، ہریانی اور کھڑی بولی میں منقسم ہوئی تھی۔

مقالہ میں پہلے انھوں نے مختلف ماہرین لسانیات کے نظریوں سے بحث کی ہے اور پھر "مختلف نظریے" کے عنوان سے پانچ ماہرین کے نظریات کا مختصر ترین جائزہ لیا پیش کیا ہے۔ یہاں پر شدید تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ نظریہ پیش کرتے ہوئے شروع میں صرف آدھے آدھے صفحہ کا استعمال ہوا ہے جس کی وجہ سے کاغذ کا بے جا نقصان ہوا ہے۔ کتاب کی طباعت خوب صورت اور دیدہ زیب ہے۔ اس کتاب کو "بورڈ آف اسٹڈیز ان اردو"، جموں یونی ورسٹی نے ایم۔اے (اردو) کے نصاب میں شامل کر لیا ہے۔ جس سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک اضافی حیثیت رکھتی ہے۔ قیمت بہت زیادہ ہے۔

اردو انٹرویوز

مصنف :- محمد خالد عابدی

صفحات :- ۱۲۸ ۔ قیمت :- ۵۰/ روپے

ناشر :- محمد خالد عابدی۔ دل آرام ہاؤس ۲ ۵ ہوا محل روڈ بھوپال

تبصرہ نگار :- سید مسعود الحسن

جناب خالد عابدی صاحب اردو کے ایک جانے پہچانے محقق اور ادیب ہیں ایک طویل عرصے سے آل انڈیا ریڈیو بھوپال کے اردو نشریات کے شعبے سے وابستہ ہیں اور اردو پروگراموں کے معیار کو بلند کرنے کے لیے بھوپال کے اردو حلقوں میں اردو کے ایک مخلص اور سرگرم خادم کی حیثیت سے بخوبی جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ اب تک عابدی صاحب کی مختلف موضوعات پر چھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب عابدی صاحب کے مراسلاتی انٹرویوؤں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں ۱۵ مراسلاتی انٹرویو ہیں جو مشہور قلمی اور ادبی شخصیتوں پر مشتمل ہیں، جن کے نام اس طرح ہیں۔

احسن رضوی داناپوری، اظہر افسر، اسلم واحدی، پریم وار برٹنی، بیج ناتھ زار، جرم محمد آبادی، جمیل شیدائی، خواجہ عبدالغفور، رام لال نابھوی، رضا مظہری، ستیہ پال کاشش سنگر، شمیم جے پوری، ضیا فتح پوری، قیصر عثمانی اور نریندر لوتھر۔

اردو میں انٹرویو نگاری کا فن ایک نیا فن ہے اور پھر مراسلاتی انٹرویو تو اور بھی مشکل فن ہے کیونکہ جیسے طرح خطوط نگاری کو نصف ملاقات کہا جاتا ہے اسی طرح مراسلاتی انٹرویوز کا فن بھی

نصف ملاقات ہی ہے، اور یہ بات بغیر کسی تکلف کے کہی جاسکتی ہے کہ اس صنفِ ادب میں خالد عابدی صاحب کی کوششیں بنیاد کا پتھر کہی جائیں گی۔ مراسلاتی انٹرویو نگاری اور رو برو انٹرویو میں جو فرق ہے وہ فن انٹرویو نگاری اور خطوط نگاری کے فنی فرق سے بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے اور مراسلاتی انٹرویو میں جو کمی ہے اسے انٹرویو نگار کی فن کاری ہی پورا کرسکتی ہے۔ انٹرویو نگار کا کام ہے کہ وہ ایسے سوالات مرتب کرے جن سے صاحب ملاقات کی شخصیت، میلانات اور رجحانات کے ان دریچوں سے پردے اٹھ جائیں جو اس شخصیت کے چاہنے والے جاننا چاہتے ہیں اور جن سے وہ شخصیت پوری طرح روشن ہو کر قاری کے سامنے آسکے۔ مراسلاتی انٹرویو کی تمام کمیوں کے باوجود اس کے ذریعے صاحب انٹرویو کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جو عام طور سے رو برو انٹرویو میں انٹرویو نگار پوچھنے سے کتراتا ہے یا نظر انداز کر دیتا ہے۔ عابدی صاحب نے مراسلاتی آدھی ملاقات کی ان کمیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے مذکورہ شخصیات کی زندگی اور کارناموں کے ان گوشوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جو عام طور سے منظر عام پر نہیں آتے ہیں اس طرح اردو ادب کے ایک عام قاری طالب علم اور تاریخ نگار کے لیے معلومات کا ایک ایسا خزانہ جمع کر دیا ہے جو ان ادبی اور علمی شخصیات کی سوانح مرتب کرنے میں بہت اہمیت رکھتا ہے، دوسرے ان حضرات کے اردو زبان کے مسائل اور اداروں پر بے لاگ تبصرے بھی سامنے آگئے ہیں جس سے ان شخصیات کے خیالات اور محسوسات سے پردہ اٹھتا ہے اور براہ راست واقفیت ہوتی ہے موجودہ مجموعہ میں جناب رام لال نابھوی، جناب ستیہ پرکاش سنگر، رعنا مظہری اور احسن دانا پوری کے انٹرویو خصوصی طور سے اس بات کا بہترین مظہر ہیں۔

اردو میں آج کل جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان میں عام طور سے زبان و بیان کا خصوصی خیال نہیں رکھا جاتا خاص طور سے ان اخباری انٹرویوؤں میں جو عام طور سے اردو کے اخبارات اور رسائل میں چھپتے رہتے ہیں لیکن زیرِ تبصرہ کتاب میں مصنف نے پوری کوشش کی ہے کہ زبان و بیان نہ سوالات میں متاثر ہوں اور نہ جوابات میں۔ شاید اس کی وجہ انٹرویو کا مراسلاتی ہونا سمجھا جائے لیکن اصل یہ ہے کہ عابدی صاحب کو اس کا غیر معمولی احساس ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ انٹرویو زبان و بیان کے نقطۂ نظر سے ادبی اور علمی زبان کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی زبان عام فہم اور سادہ ہے جسے ایک طالب علم اور اردو کا ایک عام قاری بھی سمجھ سکتا ہے۔ زبان و بیان کا یہ انداز اردو میں انٹرویو نگاری کے فن میں ادبی زبان کی اہمیت کی بھی نشاندہی کرتا ہے اور اسے بخوبی اجاگر بھی کرتا ہے۔

مراسلاتی ملاقاتوں کا یہ مجموعہ اور بہتر ثابت ہوسکتا ہے اگر اس میں ان تمام شخصیات کے فوٹو اور ایک مختصر سوانحی خاکہ بھی درج کر دیا جاتا تاکہ وہ قاری جو ان میں سے کسی شخصیت سے ناواقف ہیں پوری طرح واقف ہو جاتے۔

اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ

مرتب :- طاہر مسعود
ناشر :- مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۹۳ - این بیڈن روڈ - سمن آباد - لاہور
قیمت :- ۱۵/- روپے
تبصرہ نگار :- گربچن چندن

اردو صحافت کے مورخوں اور محققوں کو اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ اس کے ارتقائی دور کے متعلق انھیں شافی یا کافی معلومات نہیں ملتیں۔ اس شکایت کی صداقت سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن اسے گرہ باندھ کر ہمت چھوڑ دینے سے مشکل حل نہیں ہو سکتی۔ بہتری کوشش کیے جانے میں ہے۔ تلاش کرنے والوں کو جو کچھ مل جاتا ہے وہ بھی بیسود اور بے فیض نہیں ہوتا۔

"اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ" کے عنوان سے حال ہی میں شائع ہونے والی طاہر مسعود کی تالیف اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اس میں مولف نے ۱۹۰۴ء میں شائع شدہ مولوی محبوب عالم کی "فہرست اخبارات ہند" کو نئی ترتیب، مقدمہ اور حواشی کے ساتھ مرتب کیا اور اس عمل میں حقیقتاً اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ پیش کر دی ہے۔

مولوی محبوب عالم اپنے دور کے ایک کامیاب اخبار "پیسہ اخبار" کے بانی مدیر اور ذہین ناشر تھے۔ انھوں نے فہرست "تجارتی اغراض کے لیے مرتب اور شائع کی تاکہ اخبار خریدنے والوں اور ان میں اشتہار دینے والوں کو اخبار کا نام، مقام، پتا اور قیمت معلوم ہو سکے۔ اس میں اردو کے علاوہ ملک میں چھپنے والے دوسری زبانوں کے اخباروں کے نام و پتے بھی درج کیے گئے تھے۔ یہ اپنے زمانے کی ایک بہت مفید چیز تھی کیوں کہ بقول مولف اس سے قبل اردو میں ایسی کوئی فہرست ہندستان میں نہیں ملتی تھی۔ اس فہرست میں اندراجات کی کل تعداد ۴۴۰ ہے جن میں اردو اخبارات کی تعداد ۱۴۸ ہے۔ دیگر زبانوں میں انگریزی، ہندی، بنگالی، عربی، فارسی، گجراتی، مراٹھی اور تلگو شامل ہیں۔

لیکن آج اس فہرست کی اہمیت بہت محدود اور صرف تاریخی دستاویز کی ہے۔ اس میں کسی اخبار کی تاریخ یا واقعات رقم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ مولوی محبوب عالم کو اپنے زمانے کی صحافت کے احوال اور ان سے پیدا ہونے والی مشکلات کا گہرا احساس تھا۔ فہرست کے دیباچے میں انھوں نے اس کا برملا اعتراف کیا تھا۔

اخبارات کی تعداد اور موجودگی کے کوائف کی دشواری کا اعتراف کرنے کے علاوہ انھوں نے مندرج اخبارات کے سنہ اجرا اور ان کے مالک یا منیجر کے نام بھی نہیں دیے تھے۔

بڑی حد تک تشنہ ہونے کے باوجود یہ فہرست بہرکیف ایک اہم کاوش تھی۔ اس سے ۱۹ ویں صدی کے اخبارات کے متعلق مزید معلومات پر تحقیق کرنے کا ایک میدان میسر آ جاتا ہے لیکن غالباً اس فہرست کی کوئی جلد ہندستان کے کسی کتب خانے میں دستیاب نہیں۔

اب اس کی اوّلین اشاعت کے نوّے سال بعد پاکستان کے ایک نوجوان محقق طاہر مسعود نے اس میدان میں نہایت قابلِ قدر طبع آزمائی کی ہے۔ موصوف کراچی یونی ورسٹی کے شعبۂ ابلاغیات میں معاون پروفیسر اور اس کے تحقیقی مجلّہ "جرنلسٹ" کے اڈیٹر ہیں۔ انھوں نے اپنی "نادر تاریخ" میں قدیم "فہرست" میں درج اخبارات کے متعلق ممکنہ حاصل ہونے والی تمام معلومات کو حواشی کے ذیل میں یکجا کیا ہے اور مزید جن اخبارات کے مالکوں اور اڈیٹروں کے حالات دستیاب ہوئے انھیں بھی اجمالاً درج کر دیا ہے۔

ان کے علاوہ انھوں نے ۱۹ویں صدی کی اردو صحافت پر ۳۰ صفحات کا ایک مقدمہ رقم کیا ہے جس میں اس صدی کے مختلف ادوار کی خصوصیات، مسائل اور دیسی صحافیوں کے احساسات کا جائزہ پیش کیا ہے۔

طاہر مسعود نے دکھایا ہے کہ ایک پرانی کتاب کو کس طرح مرتب کیا جانا چاہیے۔ اپنی تحقیق اور محنت سے انھوں اسے سراسر ایک نیا جنم دیا ہے۔ اور جنل فہرست میں اخبارات کے سنِ اجرا خال خال ہی دیے گئے تھے اور جو چند دیے گئے تھے ان میں سے بھی کئی تصدیق طلب تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کتابت یا طباعت کی غلطیوں کا شکار ہو گئے ہوں۔ طاہر مسعود نے اپنی تحقیق سے ان کے اسقام کی اصلاح کی ہے۔ اور اس سارے عمل میں اصل فہرست کی ضخامت کو تقریباً چار گنا کر دیا ہے۔ اگر منشی محبوب عالم آج زندہ ہوتے تو وہ اپنی فہرست کے جدید مرتب کے ہاتھ اور قلم کو چوم چوم مرتے۔

یہ مقدمہ بیشتر حق پسند ہے لیکن کہیں کہیں مروجہ غلط نظریوں اور قیاسوں کا غماز ہے۔ مثلاً اردو کے اوّلین اخبار۔ جامِ جہاں نما کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ سرکاری چھتری تلے نکلا تھا۔ راقم السطور کی کتاب "جامِ جہاں نما، اردو صحافت کی ابتدا" (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ ۱۹۹۲ء) میں اس کے اوّلین چھے ماہ کے شماروں پر اس وقت کے چیف سکریٹری ولیم بٹرورتھ بیلے کے مفصل تبصرے سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ یہ ایک آزاد اور خود دار اخبار تھا۔

مولّف نے بجا طور کہا ہے کہ اردو صحافت کی صورت گری کے لحاظ سے ۱۹ویں صدی، جس میں اس کا جنم ہوا، کلیدی اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے اس کے تدریجی ارتقا کے مطالعہ و تجزیہ کے لیے اس صدی کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ دورِ اوّل ۱۸۲۲ء تا ۱۸۵۷ء اور دورِ ثانی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء کے عرصے پر محیط ہے۔

یہ تقسیم قدرے فراخ اور ڈھیلی ہے۔ دوسرے دور کو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک کے ۴۳ سال کے سارے عرصے پر بکھیر دینا خلافِ واقعات ہے۔ یہ درست ہے کہ مغل اقتدار کے چھن جانے اور بعض انگریزی صحافیوں کے لبرل خیالات کے تعلق سے زمانۂ آغاز میں کچھ اردو اخباروں میں حرّیت پسندی کی جو لہریں ابھری تھیں اور ۱۸۵۷ء کی عظیم بغاوت میں بھی معاون ہوئی تھیں، وہ غیر ملکی حکومت کے ہاتھوں اس بغاوت کے جابرانہ انسداد کے فوراً بعد معطل ہو گئیں بلکہ اردو کے بہت سے اخبار بند ہی ہو گئے اور اس کے بعد حکومت کی ستایش اور خوشامد کی

ابھرتی چلیں۔ غیر سیاسی گلدستوں کے شعر و سخن کا رواج تیز ہوا اور طنز و مزاح سے قارئین کی تفریحِ طبع کا
سامان ہونے لگا لیکن جلد ہی ہمارے صحافیوں کا حریت پسند مزاج ابھر آیا اور طنز و مزاح ہی کے
پردے میں حریت آفریں صحافت کی سرگوشیاں ہونے لگیں۔ اس مدھم اور مخفی حرارت کو ۱۸۸۵ء
میں انڈین نیشنل کانگرس کے قیام نے تیز اور حوصلہ مند کیا۔ ملک کے ممتاز اہلِ فکر و دانش کی اس
پہلی منظم کل ہند جماعت نے سیاست اور قومیت کے ایک نئے احساس اور شعور کو بیدار کیا۔ اس
صدی کی عظیم ہستی سر سید احمد خاں کے سخن و قلم نے ۱۸۸۵ء سے قبل ہی اس احساس کو جگانے
کے لیے قابلِ قدر کام کیا تھا۔ مؤلف نے اس کی کئی مؤثر مثالیں پیش کی ہیں اور بتایا ہے کہ کس
طرح انھوں نے اینگلو انڈین پریس کی سامراجی تحریروں اور متعصبانہ رویے کی تکذیب کی لیکن
جب یہ جماعت قائم ہو گئی تو انھوں نے اسے لائقِ رکنیت تسلیم نہ کیا۔ اس سے ملک کی صحافت
میں ایک نئی بحث اور تکرار شروع ہو گئی جس نے ۱۹ ویں صدی ہی میں اردو صحافت کے تیسرے
دور کو جنم دیا۔ اس تیسرے دور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایسا کرنے سے اردو صحافت
کے ارتقا کا صحیح سلسلہ قائم نہیں ہو گا۔ امرِ واقع یہ ہے کہ اس تیسرے دور کی حرارت سے
۱۹ ویں صدی کی صحافت کا آخری دہا روشن ہوا جس کے اثر سے بیسویں صدی کا آغاز سرشار ہوا اور
اس نے اپنی باشعور انقلابی کروٹ لی۔

بہرحال مقدمے میں انڈین نیشنل کانگرس کے قیام بعد اردو اخبارات کے ردِ عمل پر معلومات
کی قلت کے باوجود، پاکستان کے اکثر مورخوں کے برعکس کتاب میں قدیم ہندستان کا ذکر حتی الامکان
معروضی انداز میں کیا گیا ہے اور اسے دو قومی نظریے پر منطبق کرنے کی کوئی بھونڈی کوشش نہیں کی گئی۔
چنانچہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو "قومی آزادی کی جنگ" تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اس جنگ میں اردو
اخباروں کے کردار کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

۱۹ ویں صدی کے پہلے دور کے جائزے میں جو نکات پیش کیے گئے ہیں وہ بصیرت
افروز اور بلیغ ہیں اور مؤلف کا یہ نظریہ برحق ہے کہ جدید و قدیم تہذیبوں کی اوّلین آویزش کا
یہ منظرنامہ اردو صحافت کو ۱۹ ویں صدی کے وسط کے ہندستان کا آئینہ خانہ بنا دیتا ہے۔ جس
میں قومی تاریخ کا ایک پورا دور جھلملاتا نظر آتا ہے۔

دورِ ثانی کا جائزہ بھی متذکرہ فروگذاشت سے قطع نظر حقیقی اور پُر مغز ہے بالخصوص لوگوں میں
اخبار بینی کے ذوق پر پیش کردہ معلومات اور ان پر سر سید احمد خاں کے مشاہدات بہت عبرت انگیز
ہیں۔ ان مشاہدات کے سیاق میں خواندگی اور تعلیم کے لیے ان کی جہادی مہم کی اہمیت نہایت
واضح ہوتی ہے۔ اخبارات کی کتابت، طباعت اور تقسیم پر بھی بڑی دلچسپ معلومات فراہم کی
گئی ہیں۔

کہیں کہیں کچھ نکات قابلِ گرفت ہیں۔ مثلاً "مذاق" رام پور کو پہلا ظریفانہ اخبار قرار دیا
گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ ۱۸۸۵ء میں طلوع ہوا۔ اس کے بارے میں نادر علی خاں نے اپنی
"اردو صحافت کی تاریخ" میں تفصیل سے بتایا ہے کہ یہ اخبار ۲ جنوری ۱۸۸۵ء کو نکلا لیکن اختر شاہنشاہی

میں کاتب کی غلطی سے اس کا سنہ ۱۸۸۸ء چھپ گیا اور اس کے تمام مورخ اس غلطی کو دہراتے رہے۔

اسی طرح منشی سراج الدین احمد کے زمیندار میں شائع شدہ پنجابی نظم (مطلع: پگڑی سنبھال جٹا) لکھنے والے شاعر کا نام چودھری شہاب الدین دیا گیا ہے جو دراصل "جھنگ سیال" کے اڈیٹر بانکے دیال کی تخلیق تھی۔

کتاب کے بعض حواشی کی نمبر شماری میں بھی کئی مقامات پر انتشار ہے جس کی آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔

بہر حال کتاب ۱۹ویں صدی کے اردو اخبارات کی ہستی اور خصوصیات کی اچھی عکاس ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اخبار عموماً ایک شخص نکالتا تھا جو مہتمم کہلاتا تھا اور اکثر وہی اڈیٹر بھی ہوتا تھا۔ خبر لکھنے کا فن سادہ، اہم فنی امور سے تہی اور کسی حد تک بے اصول تھا۔ خبریں عام طور پر ترجمہ کرکے چھاپی جاتی تھیں۔ ان کی زبان ثقہ اور آج کے معیار کے حوالے سے غیر اخباری تھی۔ اس کے باوجود یہ اخبار اپنے زمانے کے سیاسی، اقتصادی، سماجی اور تعلیمی حالات کی بڑی اہم دستاویزیں ہیں۔ دوسرے دور میں سوامی شردھانند اور سر سید احمد خاں کی اصلاحی اور تعلیمی تحریکوں نے اخبارات کی زبان اور کردار میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی۔ بیشتر اخبار لاہور، دہلی، لکھنؤ، آگرہ، علی گڑھ اور میرٹھ سے شائع ہوتے تھے۔ ملک میں ناخواندگی اور غربت کی وجہ سے شہروں و قصبوں میں مشکل سے پانچ فیصد لوگ اخبار پڑھنے کے اہل تھے۔ ناشرین لوگوں میں اخبار مفت پڑھنے کی عادت سے نالاں رہتے تھے۔ بعض لوگ جو اپنے نام اخبار جاری کرالیتے تھے اس کا چندہ ادا نہیں کرتے تھے۔ صحافت کو سہارا دینے والا اہم ترین عامل سرکاری یا نیم سرکاری اعانت تھی۔ یہ عامل آزادی صحافت کی راہ کا پتھر بھی تھا۔ اخبار کی اشاعت برقرار رکھنے کے لیے بلحاظ آمدنی خریداروں سے چندہ وصول کرنے کے مختلف درجے مقرر کیے جاتے تھے۔ بازار سے چھوٹی موٹی اشیا بالخصوص پوشیدہ امراض کی ادویہ کے اشتہار مل جاتے تھے لیکن اشتہار بازی صنعت نہیں بنی تھی۔ وسائل کی کمیابی اور سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے اخباروں کو وقت پر شائع کرنا دشوار تھا۔ نامہ نگاروں کو اخبار تنخواہ دینے کی بجائے مفت اخبار مہیا کرنے کی پیش کش کرتے تھے۔ اخبارات میں باہمی چشمک، عداوت اور مسابقت عام تھی۔ اردو اخبارات کو اینگلو انڈین اخبارات کی، جن پر انگریزوں کا غلبہ و تسلط تھا، بدترین مخالفت کا سامنا تھا۔ حکومت ان اخبارات کی سرپرستی کرتی تھی۔ اس رویے سے اردو مدیروں میں سرکاری نظام سے بیزاری اور بے باکی پیدا ہوئی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد ہندو مسلم سیاست کی گرم بازاری ہوئی اور ۱۹ویں صدی کے اوا خر میں سیاسی اور شہری حقوق کے نئے ذہن اور قومیت کے جذبے نے اردو صحافت کی روایات اور تقاضے ہی بدل دیے۔

مجموعی طور پر ۳۹۲ صفحات کی یہ کتاب ۱۹ویں صدی کے اردو اخباروں اور صحافیوں پر معلومات کا اچھا ذخیرہ ہے جس سے اردو صحافت کے طلبہ اور محققین کی دیرینہ ضرورت پوری ہوتی ہے۔

سہانی بارش

شاعر:- سرور حسین سرور
ناشر:- نامی پریس لکھنؤ
سنہ اشاعت:- دسمبر ۱۹۹۱ء
قیمت:- ۲۵/- روپے
مبصر:- ڈاکٹر سلمان عباسی
ملنے کا پتا:- ۸۹/۱، ہاتھی خانہ۔ فتح گڑھ ۲۰۹۶۰۱

"سہانی بارش" سرور حسین سرور کی شاعرانہ کاوشوں کا نقش اوّل ہے۔ جسے نامی پریس لکھنؤ سے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع کیا گیا ہے۔ سرور کی شاعری بہ حیثیت مجموعی غزلوں پر مشتمل ہے۔ حالانکہ جدید نظم، گیت اور دوہوں کو بھی بطور تجربہ انھوں نے اپنایا ہے۔ لیکن شاعر کا اصل ذہن غزلیات میں ہی کارفرما ہے۔ سرور کی شاعری کی اہم صفت عصری تقاضوں سے انصاف کے ساتھ کلاسیکی ادبی قواعد و ضوابط سے وابستگی ہے۔ انھوں نے جدّت کی رو میں بہ کر غزل کا دامن داغدار نہیں ہونے دیا ہے۔ ان کے یہاں زندگی کے پُرپیچ سفر سے گزرتے ہوئے جو مشاہدات و تجربات اخذ کیے گئے ہیں شعر کی صورت بڑی خوبصورتی سے اختیار کر گئے ہیں۔

جب تبسّم سے لپٹ جائے گی آنکھوں کی نمی — سُرخیِ اخبار دیکھیں گے خبر دیکھے گا کون
غم یہ نہیں کہ صحن میں دیوار اٹھ گئی — غم ہے تو یہ کہ خون کے رشتے بکھر گئے
زلف و عارض کے قصّے کو اب چھوڑیے — اور عنواں بھی ہیں شاعری کے لیے

دوسری اہم خصوصیت ان کی رومان پروری ہے جو بھرے عبارت ہے۔

ان کو تنہائی ڈس رہی ہوگی — میری تنہائی انجمن سی ہے
ایک رشتے نے محبت کا مری ساتھ دیا — اور سب رشتے محبت کی قسم ٹوٹ گئے
بدلتا ہی نہیں ہے، غم کا موسم — بہاریں جاودانی ہو گئی ہیں

سرور کے کلام میں جو مجموعی تاثر ابھرتا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عصری تقاضوں کی تکمیل میں غزل کی شائستگی اور نفاست کو مجروح کر دیا گیا ہو۔ جذبے، مشاہدے اور تجربے کا برملا اظہار برجستگی اور خوبصورتی کیا گیا ہے۔

کیا خاک روشنی سے توقع کرے کوئی — سورج ہی خود پہنتا ہے جب رات کا لباس
میں بزرگوں کی نصیحت پہ عمل پیرا ہوں — یہی گرتی ہوئی دیوار ہے تکیہ میرا
غموں کی فصل تو کاٹی ہے عمر بھر ہم نے — ہمارے زخم بھی آسودۂ بہار کرو
موسمِ گل کی روداد کہتا ہوا — شاخ پر ایک پتّہ ہرا رہ گیا

سرور کی زبان فارسیت سے پاک ہے۔ زبان سادہ و آسان ہوتے ہوتے بھی پُر مغز مضامین کے اظہار میں مجبوری کا شکار نظر نہیں آتی۔ شاعر نے فن عروض کا بھی بدرجۂ اتم خاص خیال رکھا ہے۔ مجموعوں کی بھیڑ میں کہ آئے دن پچاسوں شعری مجموعے نظر سے گزرتے

یا "سہانی بارش" نہ صرف توجہ کھینچتا ہے بلکہ قاری کو پڑھنے اور سوچنے کی طرف راغب کرتا ہے۔ اس زمانے میں یہی بہت بڑی بات ہے۔

ورک بک ریاضی (پہلی کتاب)

ماحولیاتی مطالعہ (پہلی کتاب)

ہمارے ملک میں دینی تعلیم کے مدرسوں کی روایت خاصی قدیم ہے۔ یہ مدرسے ان بچوں کی تعلیمی ضرورت کو کسی حد تک پورا کرتے ہیں جو بوجوہ اسکول کی تعلیم سے محروم رہ گئے۔ دینی تعلیم کے ان مدارس میں تعلیم اگر ایک طرف روایتی اور بے ترتیب ہے تو دوسری جانب موجودہ زندگی کے تقاضوں سے بے گانہ بھی ہے اسی لیے ان مدارس کے تعلیمی پروگرام پر نظر ثانی کی سخت ضرورت ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف سوشل اسٹڈیز اینڈ کمیونی کیشن کی جانب سے دینی مدارس کے طلبہ کے لیے "ورک بک ریاضی" اور "ماحولیاتی مطالعہ" (پہلی کتاب) کی طباعت واشاعت اور دینی مدارس کے نصاب میں اس کی شمولیت ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

گذشتہ دو تین دہوں سے سرکاری اور رضا کارانہ ادارے دینی تعلیم کے مسائل سے خاطر خواہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ بڑی مسرت کا مقام ہے کہ انسٹی ٹیوٹ آف سوشل اسٹڈیز اور کمیونی کیشن نے دینی مدارس کے تعلیمی پروگرام کی اصلاح کے لیے ایک پرکشش پروجیکٹ تیار کیا۔ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند نے اس کی منظوری دی اور مالی معاونت عطا کی اور اب یہ پروگرام منتخب دینی مدارس میں زیر تجربہ ہے۔ اسی پروجیکٹ کے تحت مذکورہ بالا دونوں ورک بک تیار کی گئی ہیں۔ اس اشاعتی پروجیکٹ کا ایک انوکھا پہلو یہ بھی ہے کہ ورک بک کی تیاری خود اساتذہ نے کی ہے۔ درحقیقت یہ ایک حوصلہ افزا صورت حال ہے کہ رضا کارانہ طور پر کام کرنے کے لیے اساتذہ کی ایک ٹیم تیار ہو گئی ہے۔ زیر نظر دونوں ورک بک انھیں اساتذہ کرام کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ورک بک میں شامل منتخب موضوعات انسان، فطرت اور سماج سے متعلق طلبہ اور طالبات میں بصیرت پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ موضوعات طلبہ کے گردوپیش کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ طلبہ ان کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان تجربات سے بخوبی مانوس بھی ہیں۔ اس اعتبار سے کتابی تجربے اور حقیقی تجربے میں بڑی ہم آہنگی ہے۔

موضوعات کی ترتیب و تنظیم میں کافی سلیقہ برتا گیا ہے۔ ایسے سوالات مرتب

کیے گئے ہیں جن سے خیالات کی نشوونما ہوتی ہے جگہ جگہ توضیحات بھی ورک بک میں شامل ہیں۔ دونوں ورک بک کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ "شغلہ" اور "مشارکت" طرزِ تدریس و تعلم کی جانب یہ ایک موثر قدم ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ کے لیے یہ دونوں ورک بک دلچسپ اور مفید ثابت ہوں گی اور ان کے ذریعے نہ صرف طلبہ کی معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ ان میں ماحولیاتی مسائل سے متعلق آگہی بھی پیدا ہوگی۔ ان خوبیوں کے باعث دینی مدارس کے طلبہ کے لیے "ورک بک رسالتی۔ پہلی کتاب اور یہ پہلی کتاب" ماحولیاتی مطالعہ" کی طباعت واشاعت ایک فال نیک ہے۔

شاعر: پروین کمار اشک
مبصر: اقبال مسعود
ناشر: سمبکشا پرکاشن ۱۸۱ گرفنا اسٹریٹ پٹھان کوٹ
قیمت: پچاس روپے

چاندنی کے خطوط

پروین کمار اشک کی آواز اردو ادب میں ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح محسوس ہوتی ہے چاندنی کے خطوط ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ زبان سادہ اور اظہار میں بے ساختگی نمایاں ہے ان کی غزلوں کی زمین نئی اور اشعار متنوع اور عام فضا میں مختلف بھی ہیں اور تازہ بھی۔

۱۱۲ صفحات کی کتاب میں ۹۴ غزلیں ہیں جن میں تین آزاد غزلیں بھی شامل ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ آزاد غزل کیا ہوتی ہے اس کی ادبی حیثیت کیا ہے اور آیا غزل کے ساتھ اس طرح کی دست درازی کرنا بھی چاہیے یا نہیں۔ پروین کمار اشک نے اس نام سے جو کچھ پیش کیا ہے اس میں شاعری ہے غزل ہو یا نہ ہو۔ اس کے علاوہ ۹۴ غزلیں باقاعدہ پابند اور مرصع ہیں۔ ان میں ایک بچے کا تمیز اور معصومیت ہے۔

راہ میں پہلے سمندر آئے گا — میرے پیچھے پھر ترا گھر آئے گا
میں ترا بے خواب بچہ ماں بتا میرے لیے — کوئی لوری کیوں نہیں کوئی کہانی کیوں نہیں
بے نتیجہ سے امتحاں میں گم — میرا گھر ہے میرے مکاں میں گم

نہ مسجدوں کی طرف ہیں نہ مندروں کی طرف
مری دعائیں ہیں بھٹکتے ہوئے گھروں کی طرف

یہ اور متعدد اشعار کے مجموعے کا نام ہے چاندنی کے خطوط۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اشک کے لیے لکھا ہے کہ "اشک کے اشعار کی تازگی حسن، خلوص اور رچاؤ کو دیکھتے ہوئے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر اس کا شعلۂ تخلیق کسی وجہ سے بجھ نہ گیا تو وہ آگے چل اردو غزل کو ایک نئے ذائقے اور نئے انداز سے متعارف کرانے میں کامیاب ہوگا۔"

ادبی تہذیبی خبریں

مظفّر سعید افروز کو "مُحبِ قوم" ایوارڈ

ناگپور: (بذریعہ ڈاک) ہفت روزہ "تاج" کے ایڈیٹر اور مشہور سوشل ورکر جناب مظفر سعید افروز صاحب کو ان کی علمی، ادبی اور سماجی خدمات کے عوض "محبِ قوم" ایوارڈ سے نوازا گیا۔

یہ ایوارڈ "تمثیل آرٹ گروپ" کی جانب سے کامٹی (ناگپور) میں ایک شاندار تقریب میں پیش کیا گیا۔ اس موقع پر معروف ڈراما نگار شکیل شاہ جہاں کا مشہور مزاحیہ ڈراما "ہم سا کوئی نہیں" بمبئی اور ناگپور کے فنکاروں نے پیش کیا۔

شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام جشنِ علی سردار جعفری و سمینار

اس تہنیتی جلسے کی صدارت ممتاز اسکالر ڈاکٹر رفیق ذکریا نے کی۔ ڈاکٹر رفیق ذکریا نے خطبۂ صدارت میں کہا کہ جعفری صاحب نے اردو زبان و ادب کی خدمت تو کی ہی ہے انھوں نے اپنے دوستوں کو بھی بہت دیا ہے لیکن ان کے دوستوں نے انھیں شاید ہی کچھ دیا ہو۔ آپ نے کہا کہ سردار جعفری کی شخصیت اور ان کے ادب پر بات کرتے وقت ہمیں سیاست پر بات کرنی پڑتی ہے سردار کی شخصیت کو اپنے وقت کی سیاست سے کاٹ کر نہیں سمجھا جا سکتا۔

ابتدا میں شعبہ اردو بمبئی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر عبدالستار دلوی نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے علی سردار جعفری کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا اور کہا کہ آج ہم خوش نصیب ہیں کہ جعفری صاحب ہمارے درمیان موجود ہیں۔ جعفری صاحب نے پوری ایک نسل کو متاثر کیا ہے۔

مشہور محقق اور شاعر جناب علی جواد زیدی نے جعفری صاحب سے اپنے دیرینہ مراسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آزادی سے قبل اپنی انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے ہم دونوں گرفتار ہو کر ایک ہی جیل میں رہے تھے۔ آپ نے اس موقع پر کہی ہوئی اپنی ایک نظم سنائی۔

بمبئی ہائی کورٹ کے جسٹس مجیب الدین قاضی نے اپنی تقریر میں "پیغمبرانِ سخن" کے مندرجات کا ذکر کرتے ہوئے جعفری صاحب کی شعر گوئی کے ساتھ ان کی شعر فہمی کا بھی ذکر کیا۔ جناب اقبال مسعود نے جعفری صاحب کے ٹی۔ وی۔ پروگرام پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے کہا کہ "محفلِ یاراں" کے ٹیپ تمام تعلیم گاہوں میں اور لائبریریوں میں محفوظ رکھنے چاہییں۔

سندھی کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ادیب جناب ارجن میر چندانی شاد نے کہا کہ جعفری صاحب نے سندھی کے ادیبوں کو بھی بے حد متاثر کیا ہے۔ کیونکہ ترقی پسند تحریک کے اثرات اردو کے بعد سب سے

یادہ سندھی ادب پر مرتب ہو چکے ہیں۔ اس
ریب میں شرکت کے لیے جناب محمد اسداللہ
رمنی سے بطور خاص بمبئی تشریف لائے
ے۔ آپ نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں نے
عفری صاحب کے ساتھ یورپ کے کئی
مالک، روس اور امریکہ کا سفر کیا ہے۔ میں نے
یکھا کہ جعفری صاحب بڑے سے بڑے بین الاقوامی
دیب سے برابری کی سطح پر ملتے ہیں۔
کنڑ کے ادیب جناب بی رسندی
نے بھی جعفری صاحب کی ادبی خدمات کا
بہترین الفاظ میں اعتراف کیا۔
جشن علی سردار جعفری کا دوسرا حصہ
سیمی نار پر مشتمل تھا۔ سیمی نار کی صدارت
جناب علی جواد زیدی صاحب نے کی۔ پہلا
مقالہ پروفیسر سید محمد عقیل کا تھا جو ان کی غیر
موجودگی میں پڑھا گیا۔ مقالے میں "نئی دنیا
کو سلام" کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا تھا۔
دوسرا مقالہ رانچی یونیورسٹی کے پروفیسر
جناب اشرفی کا تھا جس کا عنوان تھا "لہو
پکارتا ہے": ایک مطالعہ۔ تیسرا مقالہ ڈاکٹر علی
احمد فاطمی نے "سردار جعفری اور ترقی پسندی"
کے عنوان پر پیش کیا۔ سیمینار کا آخری مقالہ شعبۂ
اردو بمبئی یونیورسٹی کے جناب معین الدین
جینا بڑے کا تھا جس کا عنوان تھا علی سردار جعفری
منزل کے حوالے سے۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر
یونس اگاسکر نے کی۔ شہر کی علمی و ادبی شخصیتوں
طلبہ، طالبات اور اساتذہ کی کثیر تعداد نے اس
جشن میں شرکت کی۔

گزارش

مکرمی! میں تحقیقی مقالہ بغرض پی۔ ایچ۔ ڈی
بعنوان "اقبالیات کی وضاحتی کتابیات"
جناب ڈاکٹر رئیس انور ریڈر شعبۂ اردو
ایل۔ این۔ متھلا یونیورسٹی دربھنگہ بہار کے
زیر نگرانی لکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے
علامہ اقبال پر تحریر کردہ کتابوں، مجموعۂ مضامین
اور رسائل کے "اقبال نمبر" کی وضاحتی فہرست
مطلوب ہے۔ آپ، اہل قلم اور بالخصوص
اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں سے
گزارش ہے کہ میری مدد کریں۔ آپ کے
تعاون کے لیے شکر گزار رہوں گا۔
ایم۔ اے۔ مشتاق مقام وڈاکخانہ سکری
ضلع مدھوبنی بہار۔ پن ۸۴۷۲۳۹

انڈو پاک اردو پبلشرز کونسل کا قیام
دوروزہ ناشرین کانفرنس کا نتیجہ

نئی دہلی۔ ۱۲ر فروری (اپنے نمائندے سے)
اردو ادیبوں اور ناشرین کے مسائل پر
منعقدہ دوروزہ ہند پاکستان کانفرنس میں
ایک "انڈو پاک اردو پبلشرز کونسل" کے
قیام پر اتفاق کیا گیا جس میں دونوں ملکوں
کے سات سات نمائندے شامل کیے
گئے ہیں۔ یہ کونسل دونوں ملکوں میں اردو
کتابوں، رسالوں اور اخبارات کے مفادات
کی حفاظت کرنے کا کام کرے گی اور اس
سلسلے میں دونوں ممالک میں اجلاس کا اہتمام
کرے گی۔ ہندوستان میں اسکا دفتر اردو گھر
نئی دہلی اور پاکستان میں نونہال ادب ہمدرد
فاؤنڈیشن کراچی میں رہے گا۔
ہندوستانی نمائندوں میں انجمن ترقی اردو

ہند کے سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم (کنوینر) شمس الرحمٰن فاروقی، یونس دہلوی، ایس ایم ظفر، شاہد علی خاں، عمران احمد اور ابوالحسن شامل ہیں۔ جبکہ پاکستان میں رفیع الزماں زبیری (کنوینر) شمس قریشی، عزیز خالد، شکیل الرحمٰن جاوید طفیل، سلیم ملک اور خالد شریف اس کونسل کے نمائندے نامزد کیے گئے ہیں۔

گیتوں اور دوہوں کے عالمی انتخاب کی اشاعت

راجستھان اردو اکادمی جے پور (انڈیا) ۱۹۹۴ء میں گیتوں اور دوہوں کا عالمی انتخاب شائع کر رہی ہے۔ ہند و پاک اور دوسرے ممالک کے شعرائے کرام سے درخواست ہے کہ وہ اپنے منتخب کردہ پانچ گیت، بیس دوہے مختصر سوانحی خاکہ اور پاسپورٹ سائز تصویر برائے اشاعت جلد از جلد مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کرنے کی زحمت فرمائیں۔

انعام الحق چیرمین راجستھان اردو اکادمی ۲۔ سبھاش مارگ سی اسکیم جے پور ۳۰۲۰۰۱ (بھارت)

تعاون کی درخواست ہے

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا شعبہ اردو اپنے طالب علموں کے لیے شعبے کی لائبریری کو وسعت دے رہا ہے۔ دلی خواہش ہے کہ اس لائبریری میں جدید و قدیم ادب اور مشاہیر ادب سے متعلق زیادہ سے زیادہ کتب و رسائل جمع ہوں تاکہ مختلف درجات کے طلبہ و طالبات اور شعبے کے اساتذہ ہمہ وقت استفادہ کر سکیں اس سلسلے میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے، اگر آپ اپنے ذاتی کتب خانے یا ادارے کی جانب سے کتابوں کا تحفہ عطا فرمائیں تو اردو طلبا و طالبات کی اس معاونت کے لیے ہم آپ کے شکر گزار رہیں گے۔

آپ کی ارسال کردہ کتب شعبے کی لائبریری میں آپ ہی کے نام سے محفوظ رہیں گی اور آپ کو اس عطیے کی رسید بھی دی جائے گی۔ کتابیں زیادہ ہوں تو آپ کوئی تاریخ اور وقت مقرر فرما دیں شعبے کا کوئی نمائندہ آپ کی بتائی ہوئی جگہ سے یہ کتابیں حاصل کرے گا۔

پروفیسر عنوان چشتی صدر شعبہ اردو اور ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لنگویجز جامعہ ملیہ اسلامیہ
ڈاکٹر خالد محمود نگراں کتب خانہ شعبۂ اردو۔ " "
ڈاکٹر شبیر رسول نائب نگراں کتب خانہ شعبۂ اردو " "

سید عروج زیدیؒ صاحب کی برسی

بدایوں (بذریعہ ڈاک) ۴ فروری ۱۹۹۴ء کو بوقت شام عارف پرویز کی قیام گاہ پر برسی کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں ایک شعری نشست کا بھی انعقاد ہوا جس کی صدارت جناب رونق بدایونی نے اور نظامت کے فرائض قاضی الیاس رشید صاحب نے انجام دیے۔ سب سے پہلے سید عروج زیدیؒ صاحب کی ایک نعت جناب نفیس بدایونی نے پڑھی پھر اس کے بعد جناب خالد ندیم صاحب نے ایک مضمون سید عروج زیدیؒ

صاحب پر پڑھا جسے بہت سراہا گیا شعرا حضرات نے قطعات پیش کیے جن شعرا نے شرکت فرمائی ان کے اسمائے گرامی ہیں۔ بہار بدایونی۔ قمر بدایونی۔ مکتوب بدایونی، نریندر کمار ناز، جگدیش چندر شرما چندر شیخ پوری کیف عارف، نیّر بدایونی شجر شیخ پوری۔ انور قاسمی۔ راز قادری مہدی بدایونی۔ شاد جیلانی۔ شیخ پوری پرویز قاضی الیاس رشید انجمی صاحب اور قبلہ حضرت رونق بدایونی صاحب۔ نشست کے اختتام پر فاتحہ خوانی کا اہتمام کیا گیا نسیم قریشی کو بھی ایک منٹ کی خاموشی سے خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

جشنِ جمہوریت کے موقع پر عظیم الشان مشاعرہ

بریلی ۲۶ جنوری ۱۹۹۴ء ہر سال کی طرح اس سال بھی جشنِ جمہوریت کے موقع پر جناب افضل بجنوری کی جانب سے محلہ بان خانہ میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت بزرگ شاعر خلیل بریلوی نے کی اور نظامت کے فرائض جناب افضل بجنوری نے انجام دیے۔

مشاعرے میں جن شعرا حضرات نے شرکت کی ان کے نام نامی اس طرح ہیں۔ جناب انور چغتائی۔ جناب وسیم مینائی شاہجہاں پوری۔ جناب شیخ سرحدی۔ جناب دل بریلوی۔ جناب جاوید نسیمی۔ جناب کمل نجیب آبادی۔ جناب فرقان احمد فرزام جناب رئیس بدھولوی۔ جناب نکہت انولوی جناب قیصر یزدانی۔ مشو ناتھ بسمل، نجری بھنڈاری۔ شاداں افغانی۔ ذہین نیازی ستیش چندر سکسینہ۔ نور عالم تنویر سنبھلی۔ کیلاش چندر چپل۔ رشید اختر جوی۔ تسلیم بریلوی اشوک شکھودھر مزمہ مایا کھنہ راجے۔ نظر بریلوی نے اپنا کلام پیش کیا۔

مجلس عاملہ حلقہ ادب بہار
دسمبر ۱۹۹۳ء تا نومبر ۱۹۹۶ء

حلقہ ادب بہار کی نئی مجلس عاملہ کی تشکیل ا

صدر:-

نائبین صدر: جناب ہارون رشید۔ جناب سید انیس الرحمٰن۔ جناب قیوم خضر

جنرل سکریٹری: جناب فخر الدین عارفی

سکریٹریز:- ڈاکٹر جاوید حیات۔ جناب مظہر عالم مخدومی۔ جناب محمد نسیم احمد۔

مجلس ادب کے زیر اہتمام شعری محفل

غالب اکیڈمی میں محب الحق منظر کے اعزا میں ایک شعری محفل کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر عقیل احمد نے محب الحق منظ کا تعارف پیش کیا۔ اس موقع پر جن شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان کے اسمائے گرامی ہیں جناب اسرار جامعی شعیب رضا۔ وحید عادل۔ عطا عابدی۔ طا

شین، حامد سنبھلی، شمس رمزی، نیلوفر گس ابرار کرت پوری، ڈاکٹر حسین ماجد حسین صدیقی، انیس احمد انیس، سراج اجملی اور سلطان نظامی

ابرار کرت پوری، نیلوفر گس اور سلطان نظامی کے کلام کو سامعین نے بے حد پسند کیا۔ محفل کی نظامت طارق حسینی نے کی اور صدارت کے فرائض ممتاز شاعر، معروف ناقد، ماہر عروض پروفیسر عنوان چشتی نے انجام دیے۔ آخر میں سکریٹری غالب اکیڈمی جناب زہین نقوی صاحب نے اظہار تشکر پیش کیا

عالمی اردو شخصیات

عالمی اردو کانفرنس کی جانب سے عصر حاضر میں دنیا کے گوشے گوشے میں موجود اردو ادیبوں، شاعروں، دانش وروں محققوں، نقادوں صحافیوں، اساتذہ اور اردو کی ترقی کے لیے سرگرم عمل محبان اردو کی ایک جامع انسائکلو پیڈیا بعنوان "عالمی اردو شخصیات" شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ عظیم اشاعتی منصوبہ، دنیا سے اردو کی اہم عصری شخصیات سے عالمی رابطے اور ان کی لسانی، ادبی، علمی و تہذیبی خدمات سے آنے والی نسلوں کی آگاہی کے لیے ادارہ عالمی اردو کانفرنس نے اپنے وسیع ذرائع کے ساتھ تیار کیا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد بین الاقوامی سطح پر اردو زبان کی آفاقیت اور مقبولیت کا دستاویزی ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اس اردو انسائکلو پیڈیا کو دنیا بھر کی لائبریریوں میں محفوظ کیا جائے گا۔ یہ سلسلہ کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہوگا۔

اگر آپ اپنے قلم اور ذہن و فن سے کسی بھی طرح اردو زبان، ادب اور تہذیب کی نمایاں خدمت میں مصروف ہیں تو آپ سے التماس ہے کہ اپنا مختصر سوانحی خاکہ بہ شمع کوائف تصنیفات، تالیفات و دیگر علمی کاموں کی تفصیلات دو عدد سیاہ سفید پاسپورٹ سائز فوٹو، مکمل پتا و ٹیلی فون نمبر (اگر ہے) جلد از جلد ارسال فرمائیں تاکہ جون ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آنے والی جلد اول میں شامل کیا جا سکے۔

براہ کرم اس میں تاخیر نہ کریں۔ کیونکہ آپ کے مرتبے اور مقام کے مطابق اگر نام نامی شامل نہ ہو سکا تو آنجناب کو شکایت ہوگی لیکن اسکے لیے ادارہ عالمی اردو کانفرنس قصور وار نہ ہوگا۔ شکریہ!

پتہ: عالمی اردو کانفرنس، ۱۶۴۰، راوز ایونیو نئی دہلی ۲

ہم بہت دکھی ہیں

منیر سیفی کو صدمہ۔

منیر سیفی کے والد حضرت سید امیر الدین (سیفی) کا ۲۸ر دسمبر ۹۳ء کو آبائی وطن سہسرام میں ۷۸ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

صاحبِ طرز ادیب، افسانہ نگار اور صحافی کلام حیدری نہیں رہے

گیا: اردو کے ممتاز ادیب، صحافی کلام حیدری کا ۱۴ر فروری ۹۴ء کو مختصر علالت کے بعد گیا میں انتقال ہو گیا۔ موصوف کی تحریروں کے

ہمیشہ بڑی توجہ سے پڑھا جاتا تھا۔ ان کی تخلیقات ماہنامہ "آہنگ" اور ہفت روزہ "مورچہ" میں برسوں ادبی ذہنوں کی آبیاری کرتے رہے۔

جاوید وششٹ کا انتقال

اردو کے مشہور شاعر اور ادیب جاوید وششٹ کا ان کے آبائی وطن فتح پور بلوچ۔ ہریانہ۔ میں انتقال ہوگیا۔ موصوف دلّی کالج میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے تھے۔ عمر کا بیشتر حصہ اردو کی خدمت میں گزارا۔

شکیلہ اختر کا انتقال

پٹنہ! ۱۲؍فروری ۹۴ء کو شکیلہ اختر (بیوہ اختر اورینوی) جو مشہور افسانہ نگار تھیں، ۷۷ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ موصوفہ کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں "آنکھ مچولی" بہت مشہور ہوا۔

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کا انتقال

لکھنؤ! اردو کے ہردلعزیز استاد، ممتاز ادیب اور اردو تحریک کے سرگرم مجاہد ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کا مختصر علالت کے بعد ۱۲؍فروری کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم نے اپنے آپ کو اردو کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالحیٔ کا انتقال

نئی دہلی! دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ریڈر ڈاکٹر عبدالحی کا ۱۰؍فروری ۹۴ء کو مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ مرحوم طلبہ اور اساتذہ میں بے حد مقبول تھے۔

ادارہ کتاب نما مرحومین کی مغفرت کے لیے دعاگو ہے۔

اردو کتابوں کی رسم اجرا

۱۵؍جنوری ۱۹۹۴ء! جناب رگھونندن لال بھاٹیا وزیر مملکت برائے امور خارجہ نے بھگوان داس اعجاز کے دوہوں کے نئے مجموعے "گنگا جمنا" کی رسم رونمائی فرمائی۔ صدارت کے فرائض ممتاز صحافی جمنا داس اختر نے ادا کئے۔ مقررین میں پروفیسر محمد حسن بیرسٹر جگدیش چندر مترا۔ اظہار اثر۔ سوامی شیاما نند جی سرسوتی۔ دلیپ بادل۔ کرشن موہن شامل تھے۔ سامعین میں ایک رکن دبے گپتا جو مصوری بھی کرتے ہیں، نے تقریب سے متاثر ہوکر اسٹیج پر موجود اکابر کی قلمی تصویر بنائی جس پر انھیں بے حد داد ملی۔ نظامت سید ذہین نقوی نے کی۔ حلقہ تشنگانِ ادب کے سکریٹری جناب سلطان سیماب پوری نے شکریہ ادا کیا۔

۱۴؍جنوری ۱۹۹۴ء! مشہور طنز و مزاح نگار یوسف ناظم کی ۵۰ سالہ ادبی خدمات کے سلسلے میں بمبئی میں ایک شاندار جشن منایا گیا۔ اس موقع پر موصوف کے مزاحیہ مضامین "فی البدیہہ" کی رسم اجرا ممتاز شاعر، ادیب، نقاد علی سردار جعفری نے ادا کی۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شائع کی ہے۔

جنوری ۱۹۹۰ء : ماہنامہ کتاب نما کے خصوصی
اسے " پروفیسر نثار احمد فاروقی کی شخصیت "
رسم اجرا پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے غالب اکیڈمی
ادا کی ۔ صدارت جناب شمس الرحمان
وقی نے کی ۔ اس خصوصی شمارے کے مدیر
کٹر خلیق انجم اور معاون مدیر ایم حبیب
ں ہیں

فروری ۱۹۹۰ء : ماہنامہ کتاب نما کے خصوصی
مارہ " غلام ربانی تاباں ، شخصیت اور ادبی
دمات " کی رسم اجرا محترمہ سیدہ خورشید عالم
ں کے ہاتھوں غالب اکیڈمی میں ہوئی ۔
س خصوصی شمارے کو ڈاکٹر اجمل اجملی
کٹر صغرا مہدی اور عذرا رضوی نے مرتب کیا
ہے ۔ یہ جلسہ بزم تاباں کے زیر اہتمام منعقد
وا ۔ بزم تاباں کے صدر جناب عبداللہ ولی
نش قادری اور سکریٹری سید جمال الدین ہیں

فروری ۱۹۹۰ء : صالحہ عابد حسین کی مرتب کردہ
اکٹر سید عابد حسین کے مکتوبات کا مجموعہ
آواز دوست " کو ادب پبلی کیشنز نے
شائع کیا ۔ اس کا رسم اجرا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے
بانی رکن جناب سید مجتبیٰ حسین زیدی کے
ست مبارک سے عمل میں آیا ۔ صدارت
روفیسر گوپی چند نارنگ نے کی ۔ تعارف
اکٹر صغرا مہدی نے پیش کیا اور نظامت
کے فرائض ڈاکٹر سیدہ سیدین نے ادا کیے
شکریے کی رسم ڈاکٹر سید جمال الدین نے ادا
ی ۔ یہ جلسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کانفرنس ہال میں
منعقد ہوا تھا ۔

۹ فروری ۱۹۹۰ء : اردو کے مشہور ادیب

اور ماہر تعلیم ڈاکٹر محمد اکرام خاں کی نئی کتاب
" تعلیم و تعلم " کی رسم اجرا کرناٹک کے گورنر
عالی جناب خورشید عالم خاں کے دست
مبارک سے عمل میں آئی ۔ صدارت پروفیسر
ضیاء الحسن فاروقی نے فرمائی ۔ تعارف
پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے نہایت
خوبصورت الفاظ میں پیش کیا ۔

۱۰ فروری ۱۹۹۰ء : مشہور ادیب اور صحافی
ریاض احمد خاں کی شکاریات پر اہم کتاب
" آدم خور شیر " کی رسم اجرا الصادق ہال بمبئی
میں حاجی بشیر موسیٰ پٹیل کے دست مبارک
سے ہوئی ۔ مقررین میں مشہور طنز و مزاح
نگار یوسف ناظم ، دہلی کانگریس کمیٹی کے
چیرمین مصباح عالم ۔ سید ظہیر عباس ، اردو ٹائمز
کے جناب انجم رومانی اور اخبار عالم کے ایڈیٹر
جناب خلیل زاہد شامل تھے ۔

عصر جدید اور تعلیم (پندرہ روزہ)

تعلیم کے موضوع پر ملک بھر میں پہلا پرچہ جو برابر
شائع ہو رہا ہے ۔ اس میں تعلیمی مضامین ،
مدرسوں ، انجمنوں اور تعلیمی اداروں کی خبریں تعلیم
کے موضوع پر کتابوں پر تبصرے ، حکومت کی
تعلیمی پالیسیوں اور تعلیمی اداروں کے بارے میں
عدالتوں کے فیصلوں کے علاوہ بھی بہت کچھ شامل ہوتا ہے
طلبہ ، اسکولوں و مدارس کے ذمہ داروں اور
عام لوگوں کے لیے یکساں مفید ۔ اسکولوں کی لائبریریوں
میں منگانے کے قابل ۔ قیمت فی شمارہ ۱/ روپے
سالانہ زر تعاون ۲۵ روپے

رابطہ کا پتہ ۔ ۱۰۱ ۔ ایف جوگا بائی ایکسٹنشن جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

فارم IV حسب قاعدہ 8
بابت کتاب نما° نئی دہلی ۲۵

۱۔ مقام اشاعت: جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
۲۔ وقفۂ اشاعت: ماہنامہ
۳۔ پرنٹر کا نام: سید وسیم کوثر ہندستانی پتا: جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
۴۔ پبلشر کا نام: " "
۵۔ اڈیٹر کا نام: شاہد علی خاں " "
مالکان کا نام اور پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

چیرمین: ڈاکٹر سید ظہور قاسم اے۔ ۵، ڈیفنس کالونی نئی دہلی
۱۔ ڈائرکٹر: نواب اقبال محمد خاں۔ کف پریڈ کولابہ بمبئی ۵
۲۔ " سید مجتبیٰ حسین زیدی۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
۳۔ " ضیاء الحسن فاروقی۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
۴۔ " بشیر الدین احمد وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵
۵۔ " خواجہ محمد شاہد۔ ڈی ۱۱/۲۔ قدوائی نگر ویسٹ، نئی دہلی۔
۶۔ " صدیق الرحمٰن قدوائی۔ باغ شفیق، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

کمپنی کے سرمایے کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصے دار جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔ اسلامی یتیم خانہ کینڈی سی فیس بمبئی ۷

میں سید وسیم کوثر تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔   دستخط
۲ر مارچ ۱۹۹۴ء   سید وسیم کوثر

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانبدارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

اپریل ۱۹۹۴ء جلد ۳۴ شمارہ ۴

فی پرچہ	6/=
سالانہ	55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	320/=

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 630191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹوڈی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں/غزلیں

طنز و مزاح

جائزے

نئی مطبوعات

محمد اور قرآن — ڈاکٹر رفیق زکریا — ۲۰/:
عبارت کیسے لکھیں — رشید حسن خاں — ۱۵/:
محاورات ہند — سبحان بخش — ۵۱/:
اجنبی فاصلے (افسانے) — انور عظیم — ۲۰/:
بچوں کے حسرت موہانی — اسلم فرخی — ۴/:
گیارہ ہنس اور ایک شہزادی (بچوں کیلیے) ڈاکٹر سید حامد حسین — ۴/۰۰
حبیب جالب۔ شخصیت اور شاعری۔ مرتبہ سندر کشور وکرم — ۱۵۰/:
سب سے چھوٹا غم (افسانے) عابد سہیل — ۵۰/:
دردِ نہاں (شعری مجموعہ)۔ ملک تاسے — ۷۰/:
ناگپور میں اردو (تذکرہ) ڈاکٹر شرف الدین ساحل — ۵۰/:
ہندوستانی وفاق۔ تبدیلی کا ایک نقشہ۔ پروفیسر رشید الدین خاں — ۶۰/:
تجلیات (نعتیہ کلام) حمد تا منظر — ۶۰/:
شہادت نامہ (منظوم) ہوش نعمانی — ہدیہ ۵/:
غزل آشنا (غزلیں اردو اور دیوناگری میں) مترسنگھ آشنا — ۶۰/:
فسانہ کہیں جسے (افسانے) رفعت نواز — ۴۰/:
اپنا وطن (وطنی نظمیں) سیدہ نسیم چشتی — ۱۲۵/:
فکر اقبال کے سرچشمے (تحقیق) ڈاکٹر آفاق فاخری — ۱۰۰/:
تکمیل (عزیز قیسی نمبر) مدیر مظہر سلیم — ۳۰/:
یادوں کا سفر (خاکے) قیصر عثمانی — ۳۰/:
یادوں کے سایے (فلمی ہستیوں کے خاکے) قیصر عثمانی — ۵۰/:
ٹوٹے وطن (شعری مجموعہ) رام لال ورما ہندی
شرارِ سخن — // — ناوک حمزہ پوری — ۲۵/:
فصاحت جنگ جلیل مانک پوری (شخصیت اور ادبی کارنامے)
علی احمد جلیلی — ۱۱۰/:
تاریخ حیدرآباد شہر (تاریخ) ڈاکٹر حمید الدین شرفی — ۱۵/:
قلم کے موتی (شعری مجموعہ) متین اچلپوری — ۱۵/:
کشت فیض (تحقیق) ڈاکٹر سید واصف احمد — ۶۰/:

سرورق ——— موہن چراغی

سیمائے سخن (تحقیق) ڈاکٹر متین احمد — /:
ایرانی تصوف — // — کبیر احمد جائسی — /:
تنہائیاں (شعری مجموعہ) ڈاکٹر سید عباس متقی — /:
دھوپ (افسانے) نعیم زبیری — /:
سنگ آستین (شعری مجموعہ) بدر الدین انصاری — /:
تذکرہ کلام حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی (تذکرہ)
طالب الہاشمی — /:
امراض اور ان کی حقیقت (طب) محمد ہشام صدیقی — /:
قرآنی آیات اور سائنسی حقائق (مذہب) مترجم محمد فیروز شاہ
لسانیات اور دکنی ادبیات (لسانی مضامین) شہناز نبی — /:
(عربی ادب) ARABIC LANGUAGE
M.R.K. NADVI — ۵۰/:
رشک فارسی (شعری مجموعہ) شجاع خاور — /:
بکھرے بکھرے خواب — // — گلشن کھنہ — /:
ابلاغ و ترسیل — پروفیسر محمد یوسف خورشیدی — /:
آشادیپ (ناول) ست پرکاش شنکر
انتخاب قصائد سید سروی (کلام) کشور جہاں زیدی — /:
الٹا درخت بچوں کے لیے (ناول) کرشن چندر — /:
گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو (افسانے) — // — /:
زندگی کے موڑ پر (طویل افسانے) — // — /:
اللہ والوں کے قصے بچوں کیلئے۔ شیخ وحید الدین ضیاء
شکست (ناول) کرشن چندر
ککڑی — غیر مطبوعہ افسانے — // — :
عربی اردو انگریزی بول چال — مخدوم صابری
رسول اللہ کی پیشن گوئیاں (مذہب) مولانا عاشق الٰہی
مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے (ہندی اڈیشن) — /
قبر کی ایک رات (مذہب) — /
میری نماز (اردو اڈیشن) (مذہب) — //
قبر کی پہلی رات (مذہب) — ادریس
قیمتی باتیں — // — صوفی محمد اسمٰعیل
کشمیری الفاظ کے سرچشمے (لسانیات) نذیر احمد ملک

ن مدیر
ہن چراغی
ر روزنامہ "قومی آواز"
در شاہ ظفر مارگ نئی دہلی ۲

اشاریہ

کاش ہم سنبھل جاتے؟

یہ طے کرنا کہ جہاں مدیر کو کیا لکھنا چاہیے اور کن جذبات کا اظہار کرنا چاہیے نہایت مشکل ہے۔ کتاب نما کے لیے اداریہ لکھنا اور بھی مشکل ہے کیونکہ روزنامہ تو ہے نہیں کہ روزمرہ کے مسائل تبصرہ کیا جائے۔ اس لیے اس اداریہ کے لیے جس موضوع کا انتخاب میں نے کیا ہے وہ ایک وایتی موضوع نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرا نظریہ غلط ہو یا اس سے کسی کو اتفاق نہ ہو، لیکن وہیں محسوس کر رہا ہوں، جو میں دیکھ رہا ہوں، جو بات میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی ہے سے کتاب نما کے ذریعہ آپ تک پہنچا رہا ہوں۔

ذہن ماؤف ہے اس لیے نہیں کہ ہم میں سوچنے سمجھنے کی حس مر چکی ہے اور ہم پاگل ہو گئے یں۔ ذہن ماؤف ہے اس لیے کہ ہم نے اپنے ضمیر کو لوریاں سنا سنا کر سلا دیا ہے اور ہم ندگی سے بہت دور بھاگ گئے ہیں۔ ہم تبصرہ کرتے ہیں تو ایسے مسائل پر جن کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہیں اور اگر کبھی انتہائے شوق سے گھبرا کر کسی اہم سوال پر سوچنے کی کوشش بھی ریں گے تو اس سوچ پر تعصب، نفرت اور خود غرضی کا سایہ ضرور ہوگا۔ اگر یہ حقیقت نہ ہوتی ہم میں سے کتنے لوگوں نے ظلم و تشدد، جانبدارانہ فیصلوں، اونچی گردنوں کو سرمایہ کے بل پر جھکنے پر مجبور کرنے اور اچھے انسانوں پر دھونس جما کر انھیں راستہ سے ہٹانے کی کوشش کے خلاف بغاوت کی ہے۔ ہم اگر محسوس بھی کرتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہے پھر بھی ہم خاموش رہتے ہیں کیونکہ ہم سب نے اپنے ذہنی دریچے بند کر دیے ہیں اس لالچ میں کہ ممکن ہے کہ بند ذہنی دریچے کسی حاکم کو پسند آئے اور وہ انعام دے دے۔ ہم میں سے آج تک کس نے بغاوت کی ان بڑے لوگوں کے خلاف جو محض راجیہ سبھا کی قومی اسمبلی کی رکنیت غیر ملکی دورہ اور سرکاری خرچہ پر عیش و عشرت کے لیے پوری قوم کو موقع پرستی اور چاپلوسی کی قربان گاہ پر قربان کر دیتے ہیں۔ ہم میں سے آج تک کس نے بغاوت کی ان چند لوگوں کے خلاف جو خوش رنگ خوبصورت لفافوں میں زہر سرِ عام فروخت کر رہے ہیں۔ ہم میں سے آج تک کس نے بغاوت کی ان لوگوں کے خلاف جو اپنے مفادات کے لیے غربت، افلاس، جہالت، بیماری اور بھوک کے انباروں پہ اپنی دکانیں سجاتے رہے ہیں اور سجا رہے ہیں۔

اوت ممکن تھی۔ چند لوگوں کو کنارے لگانا آسان تھا لیکن کیا کیا جائے کہ ذہن ماؤف ہے
ر ہم اندر کے انسان کو جاگنے ہی نہیں دیتے۔ گل پوش وادی کشمیر کو ہی زیر بحث لائیں۔ ہم میں
سے کتنے لوگوں نے سچ بولنے کی جرأت کی ہے۔ مسلمان ہے تو مسلمان کی طرح سوچ رہا ہے، ہندو
ہے تو ہندو کی طرح سوچ رہا ہے اور بچارا کشمیری اسی سوچ پر قربان ہو رہا ہے۔ کشمیر میں
نگ جاری ہے۔ بے شک یہ جنگ پاکستان نے شروع کی ہے اور پاکستان نے اس جنگ میں
ہلا وار کشمیر کی تہذیب، اس کی روایات، اس کے بھائی چارہ کی طویل تاریخ پر کیا اور بجھ گئی وہ
روشنی کی کرن جو مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۷ء میں کشمیر میں دیکھی تھی۔ کشمیری پنڈت وہاں سے بھاگا
ر یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ کشمیری مسلمانوں نے اسلام کے نام پر اپنے ہم وطنوں کو بھگا دیا۔ ہم
ں جرأت ہوتی تو کہتے کہ کشمیری مسلمان ملزم نہیں۔ مجرم ہے تو پاکستان جس نے ہندوؤں کو نکال
ر یہ ثابت کر دیا کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ کیا کسی نے جرأت سے کام لے کر یہ بات
ہی۔ کہہ بھی نہیں سکتے کیونکہ ہماری سوچ پر تعصب اور نفرت کا سایہ ہے۔ کشمیری پنڈت کو دکھ
ہے کہ اس کا گھر چھن گیا۔ اس کی جڑیں کٹ گئیں۔ وہ غصہ میں آکر ہر کشمیری مسلمان کو اس کے
لیے ذمہ دار ٹھہرا سکتا ہے لیکن جو لوگ اپنے آپ کو قومی شعور کا محافظ سمجھتے ہیں وہ کھل کر کیوں
نہیں کہتے کہ کشمیری مسلمان کو گالی مت دو۔ وہ تو آج بھی وہاں ہی کھڑا ہے جہاں ۱۹۴۷ء میں
کھڑا تھا۔ بے نقاب کرو پاکستانی حکمرانوں کو جنھوں نے کشمیری نوجوانوں کے ذہنوں میں نفرت اور
تعصب کے بیج بوئے۔ جنگ ہے اور جنگ میں خون بہے گا ہی چاہے دہشت گرد کا بہہ
جائے یا فوجی جوان کا۔ دہشت گرد گولی چلائے کوئی نہ کوئی اس کی زد میں آئے گا ہی۔ فوجی
جوابی حملہ کرے تو اس حملہ کی زد میں کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔ ہم کیوں یکطرفہ بات کرتے ہیں
کہ فوجی ظالم ہے۔ وحشی ہے۔ کیا ہم نے آج تک کبھی بھی اس ظلم پر زبان کھولی جو دہشت گرد
نہتے بے گناہ لوگوں پر ڈھا رہے ہیں۔ دہشت گردوں کے ہاتھوں کسی کا قتل ہو تو ہم اس لیے
خاموش رہتے ہیں کہ مقتول مخبر ہوگا۔ فوجی کے ہاتھوں کوئی ہلاک ہو جائے تو زور زور سے
رونے لگتے ہیں کہ یہ انتقامی کارروائی ہے حالانکہ ہم سب محسوس کر رہے ہیں کہ دہشت گرد
زیادتی کر رہے ہیں لیکن چونکہ ہر کوئی رَو کے ساتھ بہہ رہا ہے اس لیے ہم بھی بہہ رہے ہیں۔

بابری مسجد کو ایک سازش کے تحت توڑ دیا گیا اور اس پر ہم سب نے رونا رویا۔
سینہ کوبی کی لیکن کیا ہم میں سے کسی نے ان لوگوں کے خلاف بغاوت کی جنھوں نے بابری
مسجد کے نام پر دکانیں کھول دیں۔ جنھوں نے بھگوان رام کے نام کی لوٹ مچا دی۔ کر بھی نہیں سکتے
کیونکہ ذہن ماؤف ہے۔

قلم پابند ہے اس لیے نہیں کہ اس پر پہرے بٹھا دیے گئے ہیں۔ قلم پابند ہے اس
لیے نہیں کہ یہاں تحریر کی آزادی نہیں ہے۔ قلم پابند ہے کیونکہ ہم بے ایمان ہیں۔ موقع پرست ہیں
اور ہم میں سچ کہنے اور سچ لکھنے کی جرأت نہیں ہے۔ اخبارات ہی کو لیجیے۔ صحافیوں کے کردار
کو جانچ لیجیے۔ صاف ظاہر ہوگا کہ قلم کسی نہ کسی کا پابند ہے۔ صحافی ہے تو اپنے آپ کو نائب خدا

سمجھتا ہے۔ صحافی ہے تو اپنے علاوہ ہر ایک کو بے ایمان، دلال اور کمتر سمجھتا ہے۔ اپنے آپ کو
سماج کا حصہ نہ سمجھ کر سماج سے بالاتر سمجھ کر خصوصی رعایت حاصل کرنے کے لیے دوڑتا رہتا ہے
کیا ہم میں سے کسی نے کسی صحافی سے پوچھا کہ تمھاری ترجیحات میں کیا شامل ہے۔ کیا اس
ملک میں صرف فسادات ہوتے ہیں۔ گولیاں چلتی ہیں۔ ڈاکے پڑتے ہیں۔ عصمتیں لوٹی جاتی ہیں۔ کیا
اس ملک کے عوام کے سامنے صرف رام مندر، بابری مسجد، طلاق اور پرسنل لا کا ہی مسئلہ ہے
یا پھر مسائل ہیں کہ ہم زندگی کی معمولی معمولی ضرورتوں کے لیے بھی تڑپتے رہتے ہیں۔ ہم اپنے بچوں
کا اپنے سامنے بچپن لٹتے دیکھتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں ضرورتوں کے انباروں پر میاں بیوی
کے رشتے لوٹتے رہتے ہیں کیا ہمارے اخبارات اور ہمارے صحافیوں کی نظر اس کی طرف جاتی
ہے۔ پھولن دیوی پر ظلم ہوا ہوگا۔ اس ظلم کے خلاف لڑنا چاہیے لیکن ۱۹ افراد کو لائن میں کھڑا کر کے
گولیوں سے بھون دینے کا حق بھی کسی کو نہیں ہے۔ وہ رہا ہوئیں تو طوفان آیا۔ اخباری دفتروں
میں انقلاب آیا۔ فوٹو گرافروں نے کیمرے سنبھال لیے۔ رپورٹروں نے اڈیٹروں کو چتاونی دی کہ
زبردست اہم خبر کے لیے صفحہ اوّل پر جگہ رکھی جائے۔ اس روز اس ہندستان میں معلوم نہیں
کتنے لوگ حادثوں میں ہلاک ہوئے۔ کتنے لوگ بھوکے سو گئے۔ کتنوں نے اپنی بیویوں کے
زیور نیلام کر کے اپنے بچوں کو خوش رکھا لیکن ہماری نظر کب اس طرف گئی تھی کہ اس روز ساری
نظریں تو پھولن دیوی کا پیچھا کر رہی تھیں۔ یہ ایک مثال ہے ہمارے اخبارات اور صحافیوں
کی بیمار ذہنیت کی اور ان ہی اخبارات پر بھروسا کر کے ہم آپس میں لڑتے بھی ہیں۔ ایک دوسرے
کو کاٹتے بھی ہیں۔ ایک دوسرے کو لوٹتے بھی ہیں۔ بیمار ذہنیت کی ایک اور مثال۔ آج سے
چند برس قبل میرے چیف سب نے مجھے ایک تشویش ناک اطلاع دی کہ صاحب کیا کریں آج
نہ تو پنجاب میں کوئی مرا ہے اور نہ ہی کوئی حادثہ ہوا ہے۔ آج تو قتل کی بھی کوئی بڑی خبر نہیں ہے
صفحہ اول کیسے تیار ہوگا۔ واقعی تشویش ناک بات تھی۔ کیونکہ ہم تو موت کے سوداگر ہیں۔ موت
کا ننگا ناچ نہ ہو تو دیوالیہ ہو جائیں گے۔ ہمارے صحافی SCOOP خور ہیں چاہے ایسے SCOOP
سے آگ ہی کیوں نہ لگ جائے۔ فساد ہی کیوں نہ ہو۔ ہرشد مہتہ نے وزیر اعظم پر الزام لگایا کہ
انھوں نے ایک کروڑ کی رشوت لی۔ یہ میرا کام نہیں کہ میں وزیر اعظم کا دفاع کروں۔ الزام ان پر
لگا ہے خود ان کو اس الزام کو ٹھوس دلائل سے جھٹلانا ہوگا ان پر الزام ثابت بھی نہیں ہوا تھا
لیکن اخبارات کے لیے چارہ مل گیا۔ ہرشد مہتہ دیکھتے ہی دیکھتے ہیرو بن گیا۔ ہر صحافی ان کے
دروازے پر ناک رگڑنے لگا۔ صاحب ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں۔ ہمارے اخبار کے لیے
بھی کوئی سندیش دیجیے حالانکہ ہر کوئی جانتا تھا کہ ہرشد مہتہ پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ
اس نے پوری قومی معیشت کے ڈھانچے کو گرانے کا منصوبہ بنا دیا تھا لیکن یہ سب بھول کر
ہرشد مہتہ کے الزام پر یہاں کے عوام میں کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوا، ہم نے طوفان برپا کرنے کی
کوششیں جاری رکھیں اور کئی روز تک اخبارات اور میگزینوں کے لیے ہندستان اور ہندستانی
مر گئے، زندہ رہا تو صرف ہرشد مہتہ۔ اسی لیے میرا ماننا ہے کہ تحریر کی آزادی کے باوجود

پابند ہے کسی تاجر کا۔ کسی سرمایہ دار کا۔ کسی دلال کا۔ کسی وطن دشمن کا اور کسی موت کے سوداگر کا۔

زبان گنگ ہے اس لیے نہیں کہ ہونٹ سلوا دیے گئے ہیں۔ زبان گنگ ہے اس لیے نہیں کہ بولنے کی آزادی نہیں ہے۔ زبان گنگ ہے اس لیے نہیں کہ خاموش رہنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ زبان گنگ ہے کیونکہ جھوٹ کہتے کہتے سچ بولنے کی عادت چھن گئی ہے۔ چاپلوسی کرتے کرتے زبان اتنی موٹی ہو گئی ہے کہ محسوس کرنے کی حس ختم ہو چکا ہے۔ زبان گنگ ہے کیونکہ زبان درازی نے ہمیں اپنے لوگوں سے بہت دور پھینک دیا ہے۔ زبان گنگ ہے کیونکہ کثرت استعمال نے اس کی اہمیت ختم کر دی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیوں آج ہر طرف خاموشی نظر آ رہی ہے ایسی خاموشی کہ قبرستان بھی شرما جائے۔ میرے کہنے کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ ہمارے یہاں شعلہ بیان مقرر نہیں ہیں۔ زبان دراز جہارتھی نہیں ہیں لیکن المیہ یہ کہ شعلہ بیان مقرر آگ اگلتے ہیں اور بستیوں کو بھسم کر دیتے ہیں۔ زبان دراز پہلوان زبان کھولتے ہیں تو ہم کو خون اگلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ زبان گنگ نہ ہوتی تو آج ہم میں احساسِ عدم تحفظ نہ ہوتا۔ ہم کو مردہ باد اور زندہ باد کہنے پر اکسایا نہ جاتا۔ ہم سے ہماری زندگی نہ چھین لی جاتی۔ یہ زبان جو بولتی ہے جھوٹ بولتی ہے۔ زہر اگلتی ہے اور اس قوم کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور اس تراج جیسے حالات میں موہن چراغی بھی اتنا ہی مجرم ہے جتنے باقی لوگ۔ مجھے مصلحتوں نے خاموش کیا لیکن دوسروں کو کچھ حاصل کرنے کی ہوس نے خاموش رہنے پر مجبور کیا۔

کاش یہاں کے عوام ہم جیسے سب لوگوں کو ٹھکرا دیتے اور اعلان کرتے کہ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں۔ ہمیں تمہاری بیساکھیوں کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمیں خوش رنگ خوش نما لفافوں میں زہر کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمیں لپ اسٹک اور پاؤڈر لگائی بوڑھی ذہنیت کی بھی ضرورت نہیں۔ ہم خوبصورتی کی تلاش میں بدصورت بن گئے ہیں۔ اب ہم خود فیصلہ کریں گے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔ کاش ہمارے عوام خود شِو کی طرح زہر پی کر امرت بانٹنے کے آداب سیکھ جاتے اور جب یہ عمل شروع ہو گا تو بند ذہنی دریچے کھل جائیں گے۔ کشادہ ذہن تاریک تنگ راہوں کو ہموار کریں گے اور آزاد قلم وہ سب کچھ قلم بند کرے گا جو ایک آزاد جمہوری ملک کے عوام چاہتے ہیں۔ اب تو میں مایوس ہوں کیونکہ عمر ڈھل رہی ہے لیکن کل سے مایوس نہیں ہوں کیونکہ آج بھی تاریکی میں روشنی کی کرن نظر آ رہی ہے۔ خدا کرے میری اور آپ کی نظرِ بد اس کرن پر گہن نہ لگائے۔

قارئین کتاب نما کی خدمت میں

مہمان اداریے کا سلسلہ ہم نے دسمبر ۱۹۸۲ء سے شروع کیا تھا اللہ کا شکر ہے کہ یہ سلسلہ اردو کے ممتاز بزرگ ادیبوں کے تعاون سے آج تک جاری ہے اب ہم چاہتے ہیں کہ قارئین کتاب نما کو بزرگ ادیبوں کے خیالات کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے ادیبوں کے خیالات سے بھی آگاہ کریں۔ لہٰذا آیندہ ماہ نئی نسل کے ایک ذہین ادیب کا اشاریہ ملاحظہ فرمائیں (ادارہ)

ابوالکلام قاسمی
پروفیسر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ادب میں سہل نگاری کی اہمیت

ادب میں سہل نگاری یا سادگی کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو سے قبل 'ادب' اور 'سہل نگاری' کے الفاظ کی وضاحت ضروری ہے۔ ادب ہم ہر لکھی اور چھپی ہوئی تحریر کو بھی کہتے ہیں اور اس تخلیقی او تنقیدی تحریر کو بھی جس کا دائرہ کار شعری اور افسانوی ادب سے لے کر اس ادب کی قدر و قیمت کے تعین کی غرض سے لکھی جانے والی تنقیدی تحریروں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس ادبی دائرہ کار سے خالصتاً علمی، سائنسی اور معلوماتی قسم کی تحریروں کو باہر رکھا جاسکتا ہے۔ جہاں تک سہل نگاری کے مفہوم کا تعلق ہے، تو ہم اس لفظ کو مشکل پسندی، پیچیدگی اور الجھاؤ جیسے الفاظ کے متضاد کے طور پر بولتے اور سمجھتے ہیں۔ سہل نگاری اس اعتبار سے سادگی کے مترادف ہے۔ اس لیے اب اگر ہم ادب میں سادگی یا سادہ اسلوب کی نوعیت پر غور کرنا چاہیں تو پہلا سوال یہ سامنے آئے گا کہ سادگی کا تعین لکھنے والے کے طرزِ فکر اور وسیلۂ اظہار سے ہوتا ہے یا ادب کو سننے اور پڑھنے والے کی علمی، فکری اور تہذیبی تربیت اور عادت سے؟ اس سلسلے میں ادبی تخلیق کار کے فکر و اظہار کا حوالہ بحث کو طول دینے کا باعث ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ تخلیق کار کا ذہنی پس منظر، اس کا اندازِ فکر اور وسیلۂ اظہار پر اس کی گرفت سے متعلق پیچ در پیچ مسائل سے گزرے بغیر کسی بھی تخلیق کار کی ادبی تخلیق کے سادہ یا پیچیدہ اسلوب پر کارآمد گفتگو ممکن نہیں۔ تاہم یہ مسئلہ ادب میں کچھ اس قدر بنیادی نوعیت کا ہے کہ اس کا حوالہ دیے بغیر ادب میں سادگی یا سہل نگاری کے اہم ہونے یا غیر اہم ہونے کی بات کی ہی نہیں جاسکتی۔ معاملہ خواہ انسان کا ہو یا کائنات کی دوسری مخلوقات کا، مفکرین کا ایک بڑا طبقہ اس بات پر متفق ہے کہ کائنات میں خام مواد کی حیثیت سے ہر چیز پہلے سادہ اور غیر پیچیدہ شکل میں سامنے آتی ہے اور پھر وہ اپنے ارتقائی مراحل میں سادگی سے پیچیدگی کی طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ اس سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قدیم زمانے کا انسان اپنے مزاج، افتادِ طبع اور طرزِ فکر کے اعتبار سے کیوں کر سادگی کی نمائندگی کرتا تھا۔ اسی حوالے سے اس حقیقت کا انکشاف بھی ہوتا ہے کہ زمانے کے ارتقا کے ساتھ ساتھ بنی نوعِ انسان کا اندازِ فکر کیوں کر تہ داری اور پیچیدگی کی طرف مائل ہوتا جارہا ہے۔ کم و بیش یہی حال بچپن سے لے کر جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک عمر اور عقل کی پختگی کے ہمراہ ہر انسان کے مزاج اور فکر میں ایک خاص طرح کی تہ داری اور مشکل پسندی کا بھی ہے۔ اگر ہم انسان اور زمانے کے مزاج کی اس مخصوص صفت کے پس منظر میں ادب کے حوالے سے سادگی یا سہل نگاری کے

مسئلے کو سمجھنا چاہیں تو ہم دیکھیں گے کہ انیسویں صدی تک سادگی کو کبھی فطرت سے ہم آہنگی کے ہم معنیٰ سمجھا جاتا تھا اور کبھی دل سے نکلنے والی بات کے براہ راست دل پر اثر انداز ہونے کے پس منظر میں دیکھا جاتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تخلیق کار کے موضوع، مواد اور زبان و بیان پر اس کی قدرت کو پہلے بھی زیر بحث لایا جاتا تھا مگر صداقت، خلوص، رومانیت اور فطرت سے ہم آہنگی جیسے بنیادی تصورات ادب پر اس قدر حاوی تھے کہ ان تمام تصورات کا لب لباب سہل نگاری اور اسلوب کی سادگی کے علاوہ کسی اور مقصد پر منتج نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس رویے کا نتیجہ یہ تھا کہ بیسویں صدی سے پہلے پہلے تخلیق کار، تخلیق اور قاری کے مابین کچھ ایسے سمجھوتے موجود تھے یا فرض کر لیے گئے تھے کہ نہ تو تخلیق کار کے مدعا اور ادبی تخلیق میں کوئی تفاوت محسوس کی جاتی تھی اور نہ تخلیق اور قاری یا سامع کے درمیان کسی طرح کے فکری، لسانی یا اسلوبیاتی خلیج کا تصور حائل سمجھا جاتا تھا۔

بیسویں صدی میں ادب کے بعض فکری خوابوں اور ادبی تخلیق کے وجود میں آنے اور قاری تک اس کی ترسیل پر نت نئے زاویوں سے غور و فکر کے نتیجے میں ادبی تخلیق میں براہ راست اور بالواسطہ اظہار کے مسئلے نے بہت زیادہ اہمیت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں استعارے کے مسئلے کو اہمیت حاصل ہوئی اور استعارہ یا علامت کے استعمال سے پیدا ہونے والے ابہام کو زیر بحث لایا گیا۔ مزید برآں یہ کہ ابہام کی مختلف قسمیں اور قول محال، تناو، لفظ کے جدلیاتی استعمال اور معنوی تلازمات جیسی ساری بحثیں اسی صدی کی ابتدائی چند دہائیوں میں سامنے آئیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے مباحث نے ادب میں سہل نگاری یا مشکل پسندی کے مسئلے کو بالکل نیا سیاق و سباق دے دیا اور اب سادگی یا اشکال و ابہام کی باتیں صرف اسلوب یا زبان و بیان پر فیصلہ صادر کرنے تک محدود نہیں رہ گئیں بلکہ ان باتوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اور ادب کے ان مسائل کو سمجھے بغیر سادگی یا پیچیدگی کی نوعیت کا سمجھنا بھی آسان نہیں رہ گیا۔

لیکن اگر ہم ان ادبی مسائل کو زمانی سیاق و سباق میں نہ دیکھ کر ادب کے لفظ کو زیادہ وسیع معنوں میں سمجھنے کی کوشش کریں تو ادب کا اطلاق صرف تخلیقی ادب پر نہ ہو کر تخلیقی اور غیر تخلیقی ادب کی مختلف اصناف کو اپنے دائرے میں سمیٹتا نظر آئے گا۔ ایسی صورت میں سہل نگاری اور سادگی کا مسئلہ بھی زیادہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے اور مشکل اور غیر واضح اسلوب کا تعین بھی چنداں دشوار نہ رہ جائے گا۔ سادگی، خیال اور فکر کی بھی ہو سکتی ہے، زبان و بیان کی بھی اور مواد اور اسلوب کی اس مکمل ہم آہنگی کو بھی ہم سادگی کا نام دے سکتے ہیں جس کے باعث خیال اور بیان کی دوئی، ادبی اظہار کی اکائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں نہ تو ہم زبان و بیان کو فکر و خیال سے الگ کر کے دیکھتے ہیں اور نہ خیال کی قدر و قیمت کے لیے زبان اور اسلوب سے الگ کر کے کوئی معیار متعین کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر ہم اردو میں تنقیدی سطح پر ابھرنے والی اس بحث کو سامنے رکھیں جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں شاعری کی تفہیم کے حوالے سے عام تھی تو بات زیادہ واضح ہو سکتی ہے۔ یہ بحث یوں تو کسی نہ کسی طور محمد حسین آزاد

شبلی اور امداد امام اثر کی تحریروں میں بھی ملتی ہے مگر الطاف حسین حالی کی بات اس اعتبار سے زیادہ اہم ہے کہ انھوں نے شاعری کی تین اہم خوبیوں میں سے ایک خوبی 'سادگی' کو بھی بتایا تھا۔ حالی نے اس ضمن میں سادگی کے مسئلے پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور کلام کی سادگی کو فوقیت اور رکاکت سے الگ کر کے دیکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس کلام کو بھی سادہ کہا جائے گا جو عوام کی فہم سے قدرے بلند ہو مگر اعلا اوسط درجے کے آدمیوں کے نزدیک سادہ اور سہل ہو۔ حالی اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"ہمارے نزدیک کلام کی سادگی کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو اور الفاظ جہاں تک ممکن ہو محاورہ اور روزمرہ کی بول چال کے قریب ہوں۔ جس قدر شعر کی ترکیب معمولی بول چال سے بعید ہوگی، اسی قدر سادگی کے زیور سے معطل سمجھی جائے گی۔"

سادگی کی یہ تعبیر ہے تو الطاف حسین حالی کی اپنی مگر سادگی، اصلیت اور جوش کا تصور حالی نے دراصل ملٹن کے یہاں سے لیا تھا۔ اس ضمن میں حالی نے ایک یورپین محقق کا بھی ذکر کیا ہے مگر اس کا نام نہیں لکھا۔ لیکن اب یہ بات تقریباً پایۂ تصدیق کو پہنچ چکی ہے کہ اس یورپین محقق سے حالی کی مراد کولرج کے علاوہ کسی اور سے نہ تھی۔ کولرج نے ملٹن کے تصورات پر گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے سادگی کے مسئلے کی مزید وضاحت کی ہے۔ اس لیے حالی کے اس تصور کو ہمیں ملٹن، کولرج اور حالی، تینوں کے تصورات کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ حالی کے تصور شعر کے ان تین بنیادی عناصر کی مزید وضاحت کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی سے مدد لی جا سکتی ہے۔ انھوں نے حالی کے اس تصور کو شعری منطق اور شاعرانہ استدلال پر مبنی قرار دیا ہے، وہ ملٹن اور کولرج کے خیالات کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح رقم طراز ہیں :

"ملٹن تو کہہ رہا ہے کہ شاعری کے مقدمات اور استدلال غیر پیچیدہ ہوتے ہیں اور کولرج ہمیں بتا رہا ہے کہ سائنس اور شعر میں فرق ہے تو یہ ہے کہ شاعری میں سادگی ہوتی ہے۔ اس کا دوسرا بیان پہلے بیان سے بالکل غیر متعلق ہے لیکن چونکہ اس کا کہنا ہے کہ موزونیت شعر کی فطری حالت ہے، لہٰذا تصنع اور مریضانہ بدعت سے اس کی مراد دراصل یہ ہے کہ شعر کے آہنگ میں کوئی بھونڈا پن کوئی جدت برائے جدت نہ ہونی چاہیے۔"

اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی ملٹن کے تصور سادگی کا تعلق طرز ادا یا اسلوب کی پیچیدگی سے نہیں بلکہ استدلال، دعوا اور دلیل کی بھدگی سے بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "سادہ (SIMPLE) استدلال وہ ہے جس میں عناصر کی کثرت نہ ہو، کوئی الجھاو نہ ہو" مغرب کی انیسویں صدی میں رائج تصور سادگی اور اس کے اثر سے حالی کی سادگی کا معاملہ صرف شاعری کی منطق اور اس کے استدلال طریق کار سے وابستہ ہے۔ جب کہ مجموعی طور پر ادب میں سادگی یا سادہ اسلوب کا معاملہ خاصا مختلف ہے۔ شاعری کا تخلیقی عمل جن پیچیدہ نفسیاتی اور ثقافتی محرکات

دعوامل پر مبنی ہوتا ہے ان کے ذکر میں سہل نگاری کی نوعیت اپنے آپ تبدیل ہو جاتی ہے
شاعری کے علاوہ ناول، افسانہ، تنقید اور دوسرے بہت سے غیر تخلیقی ادبی نمونوں میں،
سو ہم پورے طور پر سادگی اور سہل پسندی کے معنی میں زیر بحث لاسکتے ہیں، اس نقط
سے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ تحریر میں سلاست، روانی اور سادگی کیوں کر پیدا ہوتی ہے
جن عناصر کے فقدان کی وجہ سے کسی بھی لکھنے والے کا اسلوب پیچیدہ اور الجھا ہوا محسوس ہو
لگتا ہے ان عناصر کی نشاندہی کیوں کر ممکن ہے ؟

تنقید اور بعض دوسری نثری اصناف کا بنیادی مقصد چونکہ مافی الضمیر کی ترسیل ہو
اس لیے جب تک تنقید لکھنے والا ادبی تصورات کے بارے میں اپنے خیالات کو لکھنے سے
واضح طور پر مرتب نہ کرے گا۔ اس وقت تک زبان و بیان پر قدرت بھی اس کے فکری ا
کو دور نہیں کر سکتی۔ تنقید کی طرح فکشن اور دوسری نثری اصناف بھی فصاحت فکر کا م
کرتی ہیں۔ ناول اور افسانے میں تو پلاٹ اور کردار کی مدد سے واقعات کا تسلسل بہت س
واضح باتوں کو بھی وضاحت اور ربط کے رشتے سے ہم آہنگ کرتا رہتا ہے۔ اس لیے
میں سادگی اور مشکل پسندی زیادہ زیر بحث نہیں آتی۔ البتہ سوانح، خود نوشت سوانح، مکتو
سفر نامہ، خاکہ، تبصرہ اور ادبی مسائل پر لکھے ہوئے مضامین میں سادگی کی نوعیت کسی نہ کسی
تنقید ہی جیسی ہوتی ہے۔ ان تمام وسائل اظہار میں نہ استعارے کی بحث سامنے آتی ہے اور
کہیں سہل نگاری کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ ان اصناف نثر میں نہ تو تخلیقی عمل کی پیچیدگی کا سہار
جاسکتا ہے، اور نہ اس ضمن میں ابہام کو مستحسن قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس لیے سادگی کی بحث
نثری اصناف کے لیے نہ صرف یہ کہ بہت موزوں ہے بلکہ آج کے پڑھنے والے کا ایک اہم
بھی ہے۔ اردو میں کچھ تو مغرب سے درآمد کئے ہوئے تصورات کے سبب اور کچھ ادب و تنق
اعلا درجے کی ادبی سرگرمی سمجھنے کے باعث تنقیدی تحریروں کا اسلوب روز بروز الجھا
مشکل پسندی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے ادب میں سہل نگاری کی اہمیت ایک بار پھر
بحث میں آنے لگی ہے اور اردو کا سنجیدہ قاری بھی یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ ادبی تحریریں
ہمارے علاوہ کسی اور مخلوق کے لیے لکھی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال ایک طرح کی اک
اور بیزاری کا زائیدہ ہے۔ اگر تنقید لکھنے والا ادبی تصورات کو اپنی شخصیت اور روایت کا حصہ
پر قادر ہے اور پھر اس کے پاس ایسی زبان اور بیان پر ایسی قدرت بھی ہے جو اس
مافی الضمیر کو زیادہ رواں، سلیس اور قابل فہم انداز میں سامنے لا سکے تو کوئی وجہ نہیں کہ تنقید
اسلوب الجھاو کا شکار ہو جائے۔ تنقید اور بعض دوسری مذکورہ اصناف نثر کا مقصد بنیادی
پر قاری تک رسائی حاصل کرنا اس لیے بھی ہے کہ یہ تمام اصناف ایک طرف تخلیق کار
قاری کے درمیان افہام و تفہیم کی راہ استوار کرتی ہیں تو دوسری طرف اپنے تجربے م
دوسرے کو شریک کرنا چاہتی ہیں۔ اس لیے شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سادگی اور سلا
کے بغیر افہام و تفہیم کی راہیں آسانی سے استوار نہیں ہوتیں۔

رفعت سروش
۲- بی پاکٹ، سی سدھارتھ ایکسٹینشن
نئی دہلی ۱۴

سردار جعفری

یہ برق و شرر، شورشِ طوفاں کی صدی ہے   گزرا ہے تغیر سے ہر اک گوشۂ عالم
سردار نے اس دور سے یوں آنکھ ملائی   لہجے میں یقیں، ضربِ عمل، عزمِ مصمّم
باطل کے مقابل ہو تو تاریخ نے دیکھا   سردار کے ہاتھوں میں بغاوت کا ہے پرچم
جب پیار کی بات آئے تو انداز نرالا   شعلوں کے سمندر میں رواں کشتیٔ شبنم

اسّی برس اس شان سے اس دور میں جینا
انسان کی معراج ہے اے شورشِ عالم

سردار سے ملیے تو لطافت کا ہے پیکر   الفاظ میں اخلاص کا پرتو سا نظر آئے
سردار کو پڑھیے تو گماں ہوتا ہے ایسا   ہم علم و معانی کے سمندر میں اُتر آئے
سردار کو سنیے تو خطابت کا کرشمہ   شعلوں کے لپکنے کا سا انداز نظر آئے

سردار سردار بھی پہنچے تو بہ صد فخر
ہنستے ہوئے ہر مرحلۂ غم سے گزر آئے

انسان کو جینا ہے تضادوں کے جہاں میں   ہر موڑ پہ رنگ اپنا بدلتی ہے سیاست
اے ہم نفسو مصلحتِ وقت کو سمجھو   کہتی ہے یہ سردار کی آنکھوں کی ذہانت
ہر مدرسۂ فکر کا نقاد ہے سردار   حق یہ ہے کہ فطرت میں نہیں ہے عصبیت

سردار کے ہے زیرِ نگیں لفظ کی اقلیم
سردار ہے اس دور کی اک زندہ علامت

(یہ نظم سردار جعفری کے اسّیویں جشنِ ولادت ۵ جنوری ۹۴ء کو بمبئی (خلافت ہاؤس) میں پڑھی گئی)

عبدالاحد ساز
زکریا مینار۔ چوتھا منزلہ
۱۴۹۔ یوسف مہر علی روڈ بمبئی ۳

آج دستِ جنوں میں ہے شمعِ خرد[1]

(عمر کی نویں دہائی کے آغاز پر ـــــ محترم علی سردار جعفری کی نذر)

یہ زندگی کا رجز، یہ لمحوں کے بے کراں سلسلوں کا نغمہ
یہ جذب و فکر و شعور کی چلمنوں سے چھنتے ہوئے زمانوں کی شاعری ہے
قلم سے نکلے ہوئے ستارے
اندھیرے کاغذ کے آسماں پر کرن کرن نور لکھ رہے ہیں
لبوں سے پھوٹے ہوئے شرارے
شکستہ روحوں کی انجمن میں نئی توانائیوں کا دستور لکھ رہے ہیں

یہ علم و دانش کے طاق و محراب سے مزین جمیل نظموں کی درس گاہیں
نشیب ذلت کی وادیوں میں بھٹکنے والوں کے واسطے سربلند اشعار کی پناہیں
سفینۂ دل، خیال کا موجزن سمندر۔ نگاہ کے بادباں کی سمت آشنائی
مشاہدوں، تجربوں کے طوفاں میں نظریوں کی رہنمائی

حروف اندر حروف جذب و جنوں کی تہذیب پل رہی ہے
کہیں پہ ذوقِ جمال پیکر تراشتا ہے
کہیں پہ سوز و گداز کی شمع جل رہی ہے
کہیں ہنر کے بدن میں افکار کی توانائی ڈھل رہی ہے
فصاحتیں ہونٹ چومتی ہیں
روانیاں گنگنا رہی ہیں
لطافتیں لفظ کی فضا میں طلسم معنی جگا رہی ہیں

بدلتے موسم کی ساری سفاکیوں میں کشتِ سخن ہری ہے
یہ سوزِ تخلیق کا ترانہ، خروشِ پیہم کی شاعری ہے

ہمیں مبارک۔ ہمارا یہ عہد خوش مقدر
کہ ہم کو اپنے ہی شہر میں اب بھی ہے میسّر
حیات و قوت کا وہ رجز خواں
جو آج 'ہم سب'، کے درمیاں ہے
جو اپنی باتوں میں اک دبستاں
جو اپنے قدموں میں کارواں ہے
جو اپنے لفظوں میں ایک عہدِ طلب کی پُرشوق داستاں ہے

ہنوز "دستِ جنوں میں شمعِ خرد" اٹھائے
بساطِ فن پر رواں دواں ہے

---

[1] نظم کا عنوان جعفری صاحب کی نظم "سرِطور"، کا مصرع ہے۔

رفیعہ شبنم عابدی
صدر شعبۂ اردو، مہاراشٹر کالج، بمبئی ۸

ایک پورٹریٹ

(یہ نظم ۵ جنوری ۱۹۹۴ء کو مہاراشٹر اردو اکیڈمی، خلاف ہاؤس ٹریننگ کالج اور دیگر علمی و ادبی اداروں کی جانب سے منعقدہ جشنِ علی سردار جعفری کے موقع پر سنائی گئی۔)

وقار، عزم، متانت، کشادگیٔ نظر
دلِ گداختہ، جاں سوزیٔ دماغ و جگر
شگفتگیٔ زباں، سادگیٔ طرزِ بیاں
خیال و فکر کی گہرائی اور گیرائی
حسین رنگِ طبیعت، بلند ذوقِ جمال
نپی تلی ہوئی تنقید، پُر اثر تقریر
بس اک لطافتِ احساس اک بغاوتِ ذہن
بس اک جلالتِ گفتار، ایک حرفِ وفا
بس ایک شانِ مجاہد، بس ایک قطرۂ خوں
بس ایک جرأتِ رندانہ، اک جراحتِ دل
وہ تمکنت کہ جو یکسر غرور سے عاری
وہ خامشی جو زبانِ عدو پہ ہو بھاری
وہ گرمیٔ سخن و کاوشِ قلم کہ جسے
بقول "غالبِ خستہ" کہیں "نوائے سروش"
کبھی جو تیشہ بدست اور کبھی چمن بردوش
فضا میں سارے عناصر جو ہو گئے یک جا
تو پھر مصورِ ہستی نے کھینچ دی تصویر

جبیں
شکن بہ شکن، تہ بہ تہ، کراں بہ کراں
اُبھرتے ڈوبتے حالات کے سمندر میں
بڑے سکون، بڑے صبر و ضبط کی مظہر

درازِ گیسو
کہ ہیں کوچہ ہائے شہرِ سخن
کہ جن میں راہروانِ معانی و الفاظ
کسی بھی سمت چلیں، پر بھٹک نہیں سکتے
پہنچ ہی جاتے ہیں سب منزلِ مطالب پر

وہ رنگِ رُخ ہے
کہ ہو جیسے عارفوں کی سحر
کہ جس میں کوئی دُھندلکا، نہ تیرگی کوئی
ہر ایک سمت اُجالا، ہر ایک پل روشن
سیاہ آنکھوں کے گوشوں سے پھوٹتی ہے کرن
طلوع ہوتے ہوئے آفتابِ دانش کی

کہ جس سے سنگ و خزف کسبِ نور کرتے ہیں

وہ ہاتھ جن کی لکیروں میں سانس لیتے ہیں
ہزار مانی و بہزاد سیکڑوں آذر
وہ ہاتھ قابلِ تعظیم، لائقِ تکریم

بلند قد،
نہیں، اِک روشنی کا ہے مینار
جو بھولے بھٹکے مسافر کا رہنما بن کر
کھڑا ہے بحرِ حوادث کی تیز موجوں میں
کبھی ہوا، کبھی سورج، کبھی گھٹا بن کر

وہ ٹھہرا ٹھہرا سا اندازِ گفتگو، گویا
سبک روی سے کوئی آبشار بہتا ہو
بس ایک موجِ تبسم لبوں پہ رقص کناں

وہ گونجتی ہوئی آوازِ "محفلِ یاراں"
کہ جس میں عقل و فراست کے سیکڑوں دفتر
چھپے ہوئے ہیں کسی پردہ دار کی صورت
کہ جس میں سیکڑوں پیغامِ زندگی ہیں نہاں

جب ایسا بن گیا شہکار موئے خامہ سے
تو پھر مصورِ ہستی سے بھی رہا نہ گیا
اور اُس نے بھر دیے اِک شانِ خالقیت سے
انیس و میر کے، اقبال اور جوش کے رنگ
خود اپنے ہاتھ سے اس انقلاب پیکر میں
پھر ایک سُرخ سمندر میں اس کو ڈال دیا

عدم کی سیپ سے نکلا جو یہ دُرِ شہوار
تو کاروانِ معانی کا بن گیا سردار

راجیندر بہادر موج
موج مارگ فتح گڑھ، یوپی

غزل

دانائیاں اگر ہیں جنوں زائیاں بھی ہیں
کتنی حسین عشق کی رسوائیاں بھی ہیں

جور و جفا کے ساتھ شکیبائیاں بھی ہیں
مایوسیوں میں حوصلہ افزائیاں بھی ہیں

بے اعتنائیاں بھی ہیں گیرائیاں بھی ہیں
کیسی عجیب حسن کی رعنائیاں بھی ہیں

اکثر ملن کے بعد ہی تنہائیاں بھی ہیں
ہے شمع گر تو شمع کی پرچھائیاں بھی ہیں

جب وہ نہیں تو سونی ہے بزمِ جمال بھی
سچ مچ اُداس انجمن آرائیاں بھی ہیں

پھیلے تو کائنات ہے سمٹے تو ایک دل
اتنی مزاجِ عشق میں پہنائیاں بھی ہیں

طوفانِ بحرِ عشق کی اے موج فکر کیا
طوفان سے تو اپنی شناسائیاں بھی ہیں

ڈاکٹر مظفر حنفی
پروفیسر اقبال چیئر و صدر شعبۂ اردو
کلکتہ یونی ورسٹی، کلکتہ ۷۳

دریا کے پاس اور بہانہ تو ہے نہیں
کہتا ہے چل کے تیرا ٹھکانہ تو ہے نہیں

اب کہہ دیا تو بات نبھائیں گے عمر بھر
حالانکہ دوستی کا زمانہ تو ہے نہیں

لاوا سا گھومتا ہے سدا اندرونِ ذات
آتش فشانِ غم کا دہانہ تو ہے نہیں

دیوانہ ہے جو اس سے توقع رکھے کوئی
آخر وہ رہنما ہے دِوانہ تو ہے نہیں

ہم جادۂ حادثہ سے بہت دُور آ گئے
زخمی کی چیخ کوئی ترانہ تو ہے نہیں

تھوڑی سی روشنی ہے اُسے جو بھی لُوٹ لے
جگنو میاں کے پاس خزانہ تو ہے نہیں

چُبھ جائیں جانے کس کو مظفرؔ ہمارے شعر
ہر چند کوئی خاص نشانہ تو ہے نہیں

یوسف ناظم
۱۹/الہلال، ۱۳/باندرہ ری کلیمیشن، بمبئی ۵۰

مقتل

مسجد ابراہیم کے سانحے کے پس منظر میں

خونِ آدم بہے سڑکوں پہ رنگینی ہے
آج کے دور کی قسمت ہی فلسطینی ہے

مرگِ انبوہ کا منصوبہ بنایا جس نے
اُس کے چہرے پہ تو مسکینی ہی مسکینی ہے

عین سجدے میں تھے اللہ کے بندے جس دم
زندگی ان کی جو چھینی بھی تو کب چھینی ہے

جن کے ہاتھوں ہوئے یہ قتل انھی سے خوش ہیں
ان کے لہجے میں عجب طرح کی شیرینی ہے

اس مرض کے لیے طب میں نہیں نسخہ کوئی
عارضہ ان کا فقط جذبۂ خود بینی ہے

خامشی جرم کا اقبال ہے اُن کے نزدیک
سچ کہے کوئی تو یہ جُرم کی سنگینی ہے

اُن کے گلدان میں ہے مجلسِ اقوام بھی
اُن کی فرہنگ میں یہ شغل بھی گلچینی ہے

کتنے گرجے ہیں منادر ہیں مساجد ہیں یہاں
چند لمحوں کے سوا پھر وہی لادینی ہے

ظفر رضوی
SEATTLE
U.S.A

DONER

عجب کچھ لوگ ہوتے ہیں جو سب کچھ بانٹ لیتے ہیں
کبھی دل دیں کسی کو اور کبھی اپنا جگر دے دیں
کسی کو روشنی دے کر نگاہِ پُراثر دے دیں

عجب کچھ لوگ ہوتے ہیں
کبھی چُپکے سے تنہا میں بھی یونہی سوچ لیتا ہوں
اگر میں بھی کسی کو اپنی ساری روشنی دے دوں
میں اپنی زندگی میں رات لے آؤں مگر اس کو
بطورِ تحفۂ جاناں نئی تابندگی دے دوں

کبھی چپکے سے تنہا میں بھی یونہی سوچ لیتا ہوں
اگر دے دوں میں اپنی روشنی تو میری یہ آنکھیں
نہ جانے کس کے چہرے پر لگیں پیوند ہو جائیں
عتابِ رفتگی کو بھول کر منظر نئے دیکھیں
جنہیں کچھ خوابِ نو اور خواب کی تعبیرِ نو دیکھیں
کبھی چپکے سے تنہا میں بھی یونہی ......

یہ لین و دین کا گر سلسلہ بڑھتا چلا جائے
نئی دنیا نظر آئے نیا منظر نکھر آئے
پسِ مورت نئی صورت پسِ صورت نئی مورت
مرے ماضی کا شاید پھر نیا پہلو نظر آئے
کبھی چپکے سے تنہا ......

نئے منظر نئے سپنے نئے درد و طرب سارے
بذاتِ خود بہت بے معنیٰ و مہمل سے لگتے ہیں
مگر فکر و نظر شانہ بہ شانہ ہوں تو حرفِ نو
افق پر زندگی کے نت نئے معنی سجاتے ہیں
کبھی چپکے سے تنہا .....

یہ لین و دین کا گر سلسلہ بڑھتا رہے یونہی
نئے پیوند کی صورت رخ تو پھر مری آنکھیں
نہ جانے کب تلک چمکیں نہ جانے کب تلک ادھر ہیں

نسیم سحر
پوسٹ بکس ۵۹۲۵ جدہ ۲۱۴۳۲

پچھتاوا

ہوا کے خواب دیکھے
دل میں اُمیدیں بہت رکھیں
گھروں کے سارے دروازے ہٹائے ہم نے
دیواریں گرا ڈالیں!
عجب نشہ رگ و پے میں رواں رکھا
ہوا کے لمس سے محظوظ ہونے کا
عذابِ حبس سے محفوظ ہونے کا

●

مگر پھر یوں ہوا
اک چار دیواری کے احساسِ تحفظ سے بھی
وہ محرومی مقدر بن گئی
اور یہ ہوا صحرا کی وسعت
قبر کی تنگی کا منظر بن گئی

●

سو اب یوں ہے
ہواؤں کے نگر کس سمت ہیں
ہم کوئی اندازہ نہیں رکھتے
کہ اب ہم واپسی کا کوئی دروازہ نہیں رکھتے

فاروق انجم
سکریٹری بزم تاج بھوپال

غزل

جب بھی ملا وہ ٹوٹ کے ہم سے ملا تو ہے
ظاہر ہے اس خلوص میں کچھ مدعا تو ہے

اس کو نیا مزاج نیا ذہن چاہیے
بچّہ زباں چلاتا نہیں سوچتا تو ہے

کیا منصفی ہے آپ کی خود دیکھ لیجیے
انصاف شہر شہر تماشہ بنا تو ہے

گو امن ہو گیا ہے وہاں قتل و خوں کے بعد
دروازہ سازشوں کا ابھی تک کھلا تو ہے

دیکھتے لہو کے ہم کو بتا دیں گے راستہ
شاید کسی کے پاؤں میں کانٹا چبھا تو ہے

منزل کی جستجو میں اکیلے نہیں ہیں ہم
ہمراہ تو نہیں ہے ترا نقشِ پا تو ہے

تہذیب کے لبادے میں سب بے لباس ہیں
انجم ترے بدن پہ دریدہ قبا تو ہے

پروفیسر کیشو میشرام
ترجمہ: نور پرکار
KUWAIT AIRWAYS,
TECH STORES (EJ)
PO BOX-528,
13006- SAFAT,
KUWAIT

چہرے

جو لفظوں کو صرف چہرے سمجھتے ہیں
انھیں کس طرح اور کیسے کہا جائے
لفظ کے معمولی معنی پر نظر رکھ کر
کیا کرتے ہیں جو اوروں کی نظر بندی
لفظ کھل اُٹھتے ہیں
کسی قیمتی کوٹ پر کسی گھنی زلف کی اوٹ میں
اور جو موقع کو خدا جان کر
کچھ لمحوں کے لیے ہو جاتے ہیں "بڑے"
ان سے کیا کہا جائے ــــ کس طرح کہا جائے ؟

لفظوں کے لیے مصائب نہیں جھیلے جنھوں نے
درد کیسے کہا جائے ان سے بانجھ کو کھ کا
انھیں دکھائیں کیسے آئینہ دکھوں کا !
دل جسم / پیٹ / کوکھ کے زخم
راستوں سے گزرتے وقت جنھیں پسینہ بھی نہیں آیا
انھیں یہ حق نہیں کہ دکھوں کے اظہار کا وسیلہ بنیں
نام نمود ہی میں کھوئے رہیں
ان سے کیا اور کس طرح کہا جائے

لفظ کا کوئی ایک روپ ہو ہی نہیں سکتا
وہ کبھی تو بڑھاوے کا وسیلہ بنتے ہیں
کبھی تو گرد پنکھڑی رکھ کر
اپنا ہی جلن کا چلن دیکھتے ہیں

کبھی تو کھول دیتے ہیں گرہیں
کبھی تو آئینے دلوں کے
مایوسیوں میں جھونک دیتے ہیں
جو صرف چہروں سے کھیلنے کے عادی ہیں
ان سے کیوں اور کیسے کہا جائے
تہہ در تہہ
پوشیدہ معنی کے
کئی اور بھی سمندر ہیں !!!

توقیر چغتائی
۱۲۱۳ ارمپا پلازہ۔ م ا ع جناح روڈ کراچی

غزل

تکلف کے مراحل سے گزرنا چاہیے مجھ کو
کسی دن اُس کی آنکھوں میں اُترنا چاہیے مجھ کو

وہ بچھڑا ہے تو اُس میں کوئی میری بھی خطا ہوگی
سبھی الزام اُس پر ہی نہ دھرنا چاہیے مجھ کو

یہ لہریں ایک دن جا کے بھنور میں چھوڑ آئیں گی
سمندر کے کنارے سے بھی ڈرنا چاہیے مجھ کو

میں اُس کے سامنے ساری زبانیں بھول جاتا ہوں
نہیں معلوم کیسے بات کرنا چاہیے مجھ کو

کئی دن سے تو وہ بھی لاتعلق سا گزرتا ہے
بس اب تو اپنے وعدوں سے مکرنا چاہیے مجھ کو

کیلاش ماہر
ڈی ۲۹۵ زرمان وہار، نئی دہلی ۹۲

میرے ساتھی بانس کے پیڑ

کھڑکی سے باہر
پیڑوں کے جھرمٹ میں
ٹین کی چادر اوڑھے سائباں۔
دُھندلا، دُھندلا، میلا سا
بارش کی بوچھاروں سے بھی
جس کی گرد نہیں دُھل پائی۔

باہر ——
اُونچے، لمبے پیڑ
پربت کی چوٹی سے جھانک رہے ہیں
آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں!

ہم دونوں!
اِس تنہا اور کُشادہ کمرے میں
کاٹھ کے بستر پر لیٹے
دیرینہ خوابوں کی سرگوشی
سُنتے سُنتے بُور ہو چکے
پھر بھی یہ ماحول پُرانے جیون کی
کڑوی تنہائی سے
بہتر ہے!
کاش!
برابر کے کمرے سے، بچّوں کا بے ہنگم شور۔
(کبھی کبھی اِس سرگوشی سے
جو دیرینہ خوابوں میں اکثر ہوتی ہے)
اپنے کانوں میں
امرت کی مانند ہو سکتا / لیکن!
بچّے تو دلّی میں رہتے ہیں

تم بھی کچھ دن بعد۔
اُسی دلّی کی گلیوں اور بازاروں میں
کھو جاؤ گی (اپنی جان سے پیاروں میں)
میرے ساتھی!
کھڑکی سے باہر پیڑوں کے جھرمٹ میں
اوڑھے ٹین کی چادر
سائبان۔
لمبے لمبے بانس کے پیڑ!

محسن زیدی
۱۸/۵۲ اندرا نگر لکھنؤ

غزل

آئے ہیں ساحلوں پر سب کشتیاں جلاک
اب تو یہیں رہیں گے ہم بستیاں بساک

ہر زاویے سے ہم نے دیکھا ہے شب کا منـ
شمعیں کبھی جلا کر، شمعیں کبھی بجھاکر

اک نام لوحِ دل پر دوبارہ لکھ رہا ہو
پہلے جو لکھ چکا تھا اس نام کو مٹاکر

برباد اب نہیں ہیں اس شہرِ آرزو میں
آباد ہو گیا ہوں دل میں بسے بساکر

اس سے مرا تعلق کچھ تھا بھی کچھ نہیں ہے
دنیا نے رکھ دی لیکن اک داستاں بنا

آویزاں کر رہا ہوں ہر در پہ ایک چہـ
اک شمع رکھ رہا ہوں ہر طاق پر جلاکر

دلّی سے جا رہا ہوں محسنؔ مگر نہ پوچھ
کیا کچھ یہاں سے لے کر کیا کچھ یہاں گنوا

ڈاکٹر رؤف پاریکھ
302, ALKEBREYA ARCATTLE,
438/C BLOCK 7/8,
ADAMJI NAGAR,
KARANCHI-75350
(PAKISTAN)

مزاح: تعریف اور نظریات

اردو میں طنز و مزاح کے الفاظ بالعموم بیک وقت استعمال کیے جاتے ہیں جبکہ انگریزی میں مزاح HUMOUR[1] اور طنز (SATIRE) دو الگ خصوصیات تصور کی جاتی ہیں۔ مغرب میں طنز اور مزاح کی الگ الگ تعریفیں اور توضیحات ملتی ہیں۔ لیکن اردو میں اس ضمن میں بہت کم کام ہوا ہے۔

مزاح کی تعریف

مزاح (HUMOUR) کا لفظ لاطینی لفظ HUMERE سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: "مرطوب ہونا"۔ قرون وسطی کے اطباء کے درمیان یہ خیال تھا کہ انسانی جسم میں چار اقسام کی رطوبتیں (یا ہیومر (HUMUR) خون، بلغم، صفرا اور سودا پائی جاتی ہیں۔ مخصوص تناسب میں ان کی آمیزش سے انسانی مزاج تشکیل پاتا ہے اور ان رطوبتوں کی کمی بیشی انسان کے مزاج پر اثر انداز ہوتی ہے[2]۔ یہ خیال طبِ مشرق میں بھی موجود تھا اور اخلاط اربعہ کی مناسبت سے چار اقسام کی طبیعتیں یا مزاج بیان ہوئے ہیں: سودائی، صفراوی، بلغمی اور آتشی (یا دموی) چنانچہ لفظ ہیومر (HUMUR) ہجے کی تبدیلی کے ساتھ رطوبت کے علاوہ مزاج اور طبیعت کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا خاص طور پر اگر یہ مزاج غیر متوازن یا احمقانہ ہوتا[3]۔ خود ہمارے ہاں بھی غیر متوازن مزاج کسی ایک رطوبت کی کمی بیشی کا نتیجہ قرار پایا۔ چنانچہ اردو میں لفظ سودائی (جس میں سودا کی زیادتی ہو) خبطی اور پاگل کا ہم معنی ہے اس طرح رفتہ رفتہ (HUMUR) یا (HUMOUR) کا لفظ مضحکہ خیز یا ظریفانہ کا مترادف ہو گیا۔ حتیٰ کہ ۱۷۰۲ء میں جارج فرکوہر (GEORGE FARQUHAR)[4] (۱۶۷۸ء - ۱۷۰۷ء) نے اسے "مزاح" کے معنوں میں استعمال کیا[5]۔

مزاح کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) مزاح کا مطلب ہے "خندہ آور یا ہنسنے کے قابل"[6]

(۲) اشیاء کا ظریفانہ پہلو دیکھنا مزاح ہے[7]۔

(۳) مزاح ایک قسم کا عمل ہے جو ردِ عمل کے طور پر ہنسی کو ابھارنے کا رجحان رکھتا ہے[8]۔

(۴) مزاح عمل، تقریر یا تحریر کی وہ صفت ہے جو تفریح، نرالا پن، مذاق، ہنسی، ظرافت اور غیر سنجیدگی کو برانگیختہ کرتی ہے، تفریح آور اور مضحکہ خیز کو سمجھنے یا تقریر و تحریر میں ظاہر کرنے

کی صلاحیت۔[۵]

(۵) مضحکہ خیز اور قہقہہ آور شے کو سمجھنے اور اس سے حظ اٹھانے کی ذہنی صلاحیت وہ جو ہنسی اور تفریح کا سبب بنتی۔[۶]

(۶) وہ صفت جو کسی چیز کو ظریفانہ، تفریح آور اور مضحکہ خیز بناتی ہے، ہنسی کے قابل ہونے کی خوبی، ظریفانہ، مضحکہ خیز اور تفریح آور کو سمجھنے، سراہنے اور کہنے کی صلاحیت۔[۷]

(۷) مزاح کا مقصد ہی ہنسانا ہے۔[۸]

انگریزی میں موجود مزاح کی تعریفوں کا یہ ایک جائزہ تھا۔ اگر اردو میں اسی انداز میں مزاح کی تعریف یا لفظی معنی تلاش کیے جائیں تو احساس ہوتا ہے کہ اردو میں مزاح کے ذہنی عوامل ان کی شناخت اور مزاح کے محرکات کے مسائل پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ بلکہ اردو میں مزاح کی کیفیت کا تجزیہ لفظی معنی اور اصطلاحی مفاہیم سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ قدیم لغات میں مزاح کا مفہوم "فقرہ، لطیفہ، ٹھٹھا، شوخی، پھکڑ، ہزل، پھبتی، جگت، دل لگی اور تمسخر" وغیرہ سے واضح کیا گیا ہے۔[۹] ڈاکٹر وحید قریشی (پ ۱۹۲۵ء) کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے کہ ہمارا قدیم سرمایۂ تنقید مزاح کی تعریف، مزاح کی اقسام اور مزاح کے مقاصد کے ذیل میں خاموش ہے۔[۱۰] نسبتاً جدید دور کے تنقید نگار مثلاً مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء ۱۹۱۴ء) بھی مزاح کا مطلب "ہنسی، چہل، دل لگی، ٹھٹھول"[۱۱] بیان کرتے ہیں۔ بلکہ حالی نے مزاح کی تاریخ اور خصوصیات بیان کرنے سے پہلے مزاح، بالخصوص ناشائستہ مزاح، ہجو پھکڑپن وغیرہ کی اچھی خاصی مذمت کی ہے اور مسلمانوں کی مزاح سے دلچسپی کا ذکر کرنے کے بعد تاسف سے کہا ہے:

"اس قوم کی فصاحت، ذہانت اور فضیلت جس قدر مزاح میں صرف ہوتی ہے ویسی کسی اور کام میں نہیں ہوتی۔ یہاں تعجب کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کمینہ خصلت اسی قوم کے حصے میں کیوں آئی ہے۔"[۱۲]

پنڈت رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۷ء - ۱۹۰۲ء) نے "فسانۂ آزاد" (۱۸۸۰ء) میں ایک جگہ لکھا ہے:

"لغت میں مزاح کے معنی ہیں خوش طبعی کرنا اور اصطلاح میں ایرادِ معقولاتِ لطیفہ و استعمالِ نقلیاتِ ظریفہ بہ پابندیٔ آدابِ تہذیب کو کہتے ہیں۔"[۱۳]

اس کے بعد سرشار نے اس مزاح کی مذمت کی ہے جو دروغ و فحش سے پیدا ہوتا ہے اور حد اعتدال سے گزر جاتا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے پنچ اخبارات کو نکتہ چینی کا نشانہ بنایا ہے۔[۱۴]

گویا بیسویں صدی کے آغاز سے قبل تک اردو میں مزاح کو بالعموم اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا جاتا تھا اور اس کی بڑی وجہ اردو شاعری میں ہزلیات، فواحشات اور ہجویات نیز پنچ اخبارات و رسائل کا پھکڑپن تھا۔

انگریزی اور اردو میں مزاح کی تعریفوں کا جائزہ لینے اور انگریزی میں لفظ ہیومر (HUMOUR) کے سب سے پہلے مزاح کے معنوں میں استعمال کا ذکر کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ اردو میں لفظ مزاح سب سے پہلے (HUMOUR) کے معنوں میں کب استعمال ہوا۔

شاہ عالم ثانی (۱۷۵۵ء - ۱۸۰۶ء) میں "عجائب القصص" کے نام سے جو نثری داستان تحریر کی تھی اس میں ہمیں سب سے پہلے لفظ مزاح ملتا ہے۔ "عجائب القصص" میں یہ لفظ کم از کم پانچ بار استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

"اکثر اوقات اختر سعید بھی بعض باتیں مزاح کی سنا کر آسمان پری کو خوش کرتا تھا۔"[۱۸]

اور

"اے آسمان پری خیر ہے، تمہیں سوائے ٹھٹھے کے اور مزاح کے کچھ نہیں آتا۔"[۱۹]

ایک اور جگہ "عجائب القصص" میں مزاح ذرا سے مختلف معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

"بادشاہ زادی نے اوّل جانا کہ مشتری واسطے میرے بہلانے کے ٹھٹھے سے اور مزاح سے یہ بات کہتی ہے۔"[۲۰]

لیکن اس آخری مثال میں مزاح کا لفظ دل لگی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

"عجائب القصص" سے قبل مزاح ہمیں لفظ "مذاخ" کی صورت میں ملتا ہے جو دراصل "مذاق" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ لفظ "قصۂ مہر افروز و دلبر" میں آیا ہے جو محمد شاہ (۱۷۱۹ء - ۱۷۴۸ء) یا احمد شاہ (۱۷۴۸ء - ۱۷۵۴ء) کے دور میں کسی وقت اغلباً ۱۷۳۲ء کے لگ بھگ تخلیق کی گئی لیکن ہم اسے مزاح HUMOUR کے معنوں میں نہیں لے سکتے کیونکہ اس کا استعمال یہاں مزاح کے بجائے مذاق یا دل لگی کے معنوں میں ہوا ہے ملاحظہ ہو:

"کوئی کسی سے مذاخ (مذاق) کرتی ہے"[۲۲]

اس کے بعد کے دور کی داستانوں اور تصانیف میں لفظ ظرافت عام ملتا ہے۔ خاص طور پر "عیاروں" کی مسخرگی کے لیے عیاری یا ظرافت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہمیں مزاح کے لفظ کا عام اور بکثرت استعمال نظر آتا ہے۔ لیکن مزاح کے ساتھ طنز کو جوڑ کر "طنز و مزاح" کی ترکیب نہ جانے کس کی ایجاد ہے۔ بہر حال اب یہ ترکیب اردو میں پوری طرح رائج و مستعمل اور مقبول ہو چکی ہے اور مزاحیہ ادب کے لیے بالعموم طنز و مزاح ہی کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں البتہ مغربی ادب میں طنز SATIRE کو الگ صنف کے طور پر بھی برتا گیا اور سوئفٹ (SWIFT) (۱۶۶۷ء - ۱۷۴۵ء) اور والٹیر (VOLTAIRE) (۱۶۹۴ء - ۱۷۷۸ء) وغیرہ نے طنزیہ تخلیقات پیش کیں۔ دراصل یہ تصور لاطینی اور یونانی سے مغربی ادب میں آیا تھا۔

بہر حال مشرق ہو یا مغرب، مزاح کی بیشتر تعریفوں میں مزاح کا تعلق ہنسی سے جوڑا گیا ہے۔ مزاح اور ہنسی (یا مسکراہٹ) لازم و ملزوم سمجھے گئے ہیں۔ کوئی حرکت خیال، واقعہ، صورتحال احساس، لفظ، جملہ یا ترکیب ایک عمل ہے اور اس پر آنے والی ہنسی (یا مسکراہٹ یا محض تبسم زیر لب) ایک ردعمل ہے۔ یہی ردّ عمل مزاح ہے۔ گویا مزاح کی تعریفوں کا نچوڑ یہ ہے کہ

"کسی عمل، خیال، صورت حال، واقعے، لفظ یا جملے کے خندہ آور پہلوؤں کو دریافت کرنا، سمجھنا اور ان سے محظوظ ہونا مزاح ہے"۔

یہ اور بات ہے کہ ہر شخص مزاح کا ایک اپنا معیار رکھتا ہے جو اس کے مزاج، شخصیت اور ذہانت پر منحصر ہوتا ہے۔ ایک ہی واقعہ مثلاً کسی کا پھسل کر کیچڑ میں گر جانا کسی کے لیے مزاحیہ اور کسی کے نزدیک افسوسناک ہو سکتا ہے۔ ایک بات پر ایک شخص ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے اور دوسروں کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تو کجا کسی قسم کا تاثر ہی نمودار نہیں ہوتا۔ گویا مزاح کا معیار اور حسِ مزاح قطعی ذاتی اور انفرادی چیز ہے۔ اسی لیے یہ کہنا پڑے گا کہ حسن کی طرح مزاح کا بھی ہر شخص کا ذاتی معیار ہوتا ہے۔

طنز SATIRE کی تعریف

طنز کے انگریزی مترادف لفظ SATIRE کے بارے میں کسی زمانے میں یہ غلط فہمی پائی جاتی تھی کہ یہ لاطینی لفظ SATYRE سے مشتق ہے۔[23] سیٹائر (SATYRE) دراصل یونانی علم الاصنام میں جنگل کا دیوتا تھا جس کے لمبے لمبے کان اور دم ہوتی تھی۔[24] قدیم یونانیوں کے ہاں ایک مخصوص نیم مزاحیہ ڈراما پایا جاتا تھا جس کے کردار دیوتا SATYRE کا بہروپ بدلتے تھے اور اسے SATYRE DRAMA کہا جاتا تھا۔[25] غالباً اسی نیم مزاحیہ اور نیم طنزیہ صنف ادب کی بنا پر یہ باور کر لیا گیا کہ SATIRE کی اصلیت SATYRE میں پنہاں ہے کیونکہ تمسخر دونوں میں قدر مشترک ہے۔

لیکن SATIRE درحقیقت لاطینی لفظ SATURA سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں مختلف قسم کے پھلوں سے بھری ہوئی تشتری یا طباق۔[26] دیوتا سیٹائر (SATYRE) کو زرعی پیداوار ایک طباق میں نذر کی جاتی تھیں جسے SATUR LANX کہتے تھے۔[27]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ SATIRE اور SATURA LANX کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ دوسری صدی قبل مسیح میں لاطینی طنز و نگار لوسی لی اس (LUCILIUS) (۱۸۰ ق م، ۱۰۲ ق م) نے ایک صنف شاعری SATIRE اختراع کی تھی۔ یہ ہیکسامیٹر[28] میں لکھی جاتی تھی اور اس میں عاداتِ بد اور حماقتوں کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا تھا۔[29] لوسی لی اس کے بعد آنے والوں مثلاً ہوریس (HORACE) (۶۵-۸ ق م)، پرسی اس (PERSIUS) (۳۴ء - ۶۲ء) اور جووِنل (JUVNAL) (۶۰ء - ۱۳۰ء) نے بھی اسے کامیابی سے برتا۔ بعد میں اسے مختلف بحروں میں لکھا جانے لگا اور وحدت خیال اور مضمون کی وحدت کی شرائط باقی نہ رہیں[30] چنانچہ یہ ایک قسم

کا طباق یا تشتری تھی جس میں مختلف النّوع طنزیہ خیالات اور مضامین، جن کے موضوع میں بوقلمونی ہوتی، مختلف بحروں میں پیش کیے جاتے تھے۔ اردو میں طنز کوئی صنف ادب نہیں بلکہ ایک ادبی اسلوب اور صفت ہے۔ لیکن مغرب میں اسلوب کے ساتھ ساتھ اسے صنف کے طور پر بھی برتا گیا۔ مزاح کی طرح طنز کی بھی متعدد تعریفیں ملتی ہیں۔ مثلاً:

(۱) طنز ایک ادبی اسلوب ہے جس میں کسی فرد، بنی نوع انسان یا مکتبۂ فکر کی کمزوریوں، برائیوں اور بد اخلاقیوں کو، اصلاح کے خیال سے تضحیک اور تحقیر کا نشانہ بنایا جائے[31]۔

(۲) ایک ادب پارہ، اصلاً نظم میں، جو لازماً حماقتوں اور برائیوں پر تنقید کرے یہاں تک کہ ان کے لیے مضحکہ اور حقارت کے جذبات پیدا ہو جائیں۔ اس کے بنیادی ہتھیار رمز (IRONY) طعنہ (SARCASM)، دشنام (INVECTIVE) بذلہ سنجی (WIT) اور مزاح (HUMOUR) ہیں[32]۔

(۳) ایک ادب پارہ جس میں عاداتِ بد، حماقتوں، ناانصافیوں وغیرہ کو تضحیک اور اہانت کا نشانہ بنایا جاتا ہے، بری عادات اور حماقتوں وغیرہ پر مضحکہ RIDICULE، طعنہ (SARCASM) رمز (IRONY) وغیرہ کی مدد سے چوٹ کرنا اور ان کا تمسخر اڑانا[33]۔

(۴) ایسی تحریر جس کا مقصد انسانی بداعمالیوں اور مکر پر روشنی ڈالنا اور مذاق (COMEDY) مضحکہ (RIDICULE) رمز (IRONY) اور بوالعجبی (GROTESQUE) کے ہتھیاروں کی مدد سے چوٹ کرنا ہو[34]۔

(۵) ایسی تنقید یا تعریض جس سے جذبۂ تفریح اور نفرت کو تحریک ہوتی ہو[35]۔

(۶) ایک نظم، جدید استعمال میں نثر، جس میں عاداتِ بد اور حماقتوں کے لیے مضحکہ کے جذبات پیدا کیے جائیں[36]۔

طنز کی تقریباً تمام تعریفوں میں طنز کو تنقیص اور تنقید سے وابستہ کیا گیا ہے۔ گویا طنز اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن اس کے لیے مزاح بھی لازمی شرط ہے۔ طنز میں اگر مزاح شامل نہیں ہو تو وہ طنز نہیں طعنہ ہے۔ مزاح کے بغیر طنز محض جلی کٹی سنانے کے مترادف ہے یا زیادہ سے زیادہ اسے وعظ و نصیحت کہا جائے گا۔ طنز جہاں نکتہ چینی کرتا ہے وہاں ساتھ ساتھ ہنستا بھی ہے[37]۔ اس کی ہنسی اور نکتہ چینی دونوں اصلاح کے خیال سے ہوتی ہیں۔ غرض طنز کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ:

> "حماقتوں، برائیوں، بے ڈھنگے پن، بد تہذیبی اور بد اخلاقی کی مذمت، بد مزگی پیدا کیے بغیر، اس طرح کرنا کہ ان کے خلاف جذبات بیدار ہوں اور مزاح بھی پیدا ہو۔"

گویا مزاح کے بغیر طنز کا تصور محال ہے۔ مزاح، طنز سے پاک ہو سکتا ہے۔ لیکن طنز میں مزاح کی موجودگی از حد ضروری ہے۔ طنز اور مزاح باہم اس طرح گھلے ملے اور یک جان ہوتے ہیں کہ ان کی الگ الگ سرحدوں کی نشان دہی بے حد دشوار بلکہ تقریباً ناممکن ہوتی ہے اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ طنز و مزاح ہی کے ماتحت ہوتا ہے یا اختتام چیلن

(پ ۱۹۱۲ء، م ۱۹۷۲ء) کے الفاظ میں طنز مزاح ہی کی ایک قسم ہے[38]۔
طنز کے علاوہ مزاح کی دیگر مثالیں اور اقسام موجود ہیں، مثلاً رمز (IRONY) اور بذلہ سنجی (WIT) وغیرہ[39]۔

مزاح کے نظریات

یہ جاننے کے بعد کہ مزاح کیا ہے یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ مزاح کیوں اور کیسے پیدا ہوتا ہے۔ مزاح کی نوعیت، ماہیت اور اسباب کے تعین کے لیے ادیبوں اور فلسفیوں کی کوششیں دو ہزار سال سے زیادہ عرصے سے جاری ہیں لیکن آج بھی جب ان مسئلوں پر غور کیا جاتا ہے تو بالکل نئے نظریات سامنے آنے کے بجائے بات گھوم پھر کر وہیں آجاتی ہے اور پرانے نظریات میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہو پاتا۔

افلاطون (۴۲۷ ق م - ۳۴۷ ق م) اور ارسطو (۳۸۴ - ۳۲۲ ق م) سے لے کر آج تک جن فلسفیوں، مصنفوں اور ماہرین نفسیات نے مزاح کی نوعیت، ماہیت اور اسباب وغیرہ پر بحث کی ہے ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ان میں سے کچھ نے مزاح کے موضوع پر باقاعدگی سے بحث کی ہے اور بعض نے کسی دوسرے موضوع پر لکھتے ہوئے ضمناً مزاح پر بھی کچھ کہہ دیا ہے۔

ان میں سے کم و بیش سبھی نے مزاح کا تعلق ہنسی سے جوڑا ہے اور اسی لیے ان میں سے اکثر مزاح پر بحث کرتے کرتے ہنسی کی نوعیت اور ہنسی کی وجوہات کی بحثوں میں کھو جاتے ہیں۔

ان تمام نظریات[40] کو اختصار کی خاطر تین بڑے گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے[41]۔
ان تمام کے نظریات کلی طور پر ایک دوسرے سے مماثل نہیں اور نہ ہی فروعی اختلافات سے مبرا ہیں لیکن بنیادی خیال کی بنا پر یہ تقسیم کی جا سکتی ہے۔

۱۔ برتری کا احساس (SUPERIORITY)

پہلا گروہ ان فلسفیوں کا ہے جن کے نزدیک مزاح برتری کے احساس سے وجود میں آتا ہے۔ ہم جسے کمتر، بے ڈھنگا، بدصورت، غلط یا احمق تصور کرتے ہیں اس پر ہنستے ہیں اور اس وقت اپنی برتری کا احساس ہمارے دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اس نظریے سے کسی نہ کسی طور اتفاق رکھنے والوں میں افلاطون (PLATO) ارسطو (ARISTOTLE) سیسرو (CICERO) (۱۰۶ ق م - ۴۳ ق م) کوئنٹی لین (QUINTILIAN) (۳۵ء - ۹۵ء) فرانسس بیکن (FRANCIS BACON) (۱۵۶۱ء - ۱۶۲۶ء) رینے دیکارت (RENE DESCARTES) (۱۵۹۶ء - ۱۶۵۰ء) تھامس ہابز (THOMAS HOBBES) (۱۵۸۸ء - ۱۶۷۹ء) جوناتھن سوئفٹ (JONATHAN SWIFT) (۱۶۶۷ء - ۱۷۴۵ء) ایڈیسن (ADDISON) (۱۶۷۲ء - ۱۷۱۹ء) الیگزنڈر بین (ALEXANDER BAIN) (۱۸۱۸ء - ۱۹۰۳ء)

اور ہنری برگساں (HENRI BERGSON) (۱۸۵۹ء - ۱۹۴۱ء) وغیرہ شامل ہیں۔ اس نظریے کے مخالفین یا معترضین میں والٹیئر (VOLTAIR) (۱۶۹۴ء - ۱۷۷۸ء)، ژاں پال رختر (JEAN PAUL RICHTER) (۱۷۶۳ء - ۱۸۲۵ء) اور میکس ایسٹ مین (MAX EASTMAN) وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

۲- غیر مطابقت

اس نظریے کے مطابق توقعات اور نتائج میں اختلاف اور عدم مطابقت کی بنا پر ہنسی پیدا ہوتی ہے۔ جب ہماری توقعات پوری نہیں ہو پاتیں تو ہم بے اختیار ہنس پڑتے ہیں۔ اس نظریے کے داعین اور مویدین میں فلپ سڈنی (PHILIP SIDNEY) (۱۵۵۴ء - ۱۵۸۶ء) بلیز پاسکل (BLAISE PASCAL) (۱۶۲۳ء - ۱۶۶۲ء)، امانوئیل کانٹ (IMMANUEL KANT) (۱۷۲۴ء - ۱۸۰۴ء)، سڈنی اسمتھ (SYDNEY SMITH) (۱۷۷۱ء - ۱۸۴۵ء) ولیم ہیزلٹ (WILLIAM HAZZLIT) (۱۷۷۸ء - ۱۸۳۰ء) شوپنہاور (SCHOPENHAUER) (۱۷۸۸ء - ۱۸۶۰ء) ہربرٹ اسپنسر (HERBERT SPENCER) (۱۸۳۰ء - ۱۹۰۳ء) تھیوڈور لپس (THEODOR LIPPS) (۱۸۵۱ء - ۱۹۱۴ء) اور آرتھر کوئسلر (ARTHUR KOESTLER) (پ ۱۹۰۵ء) وغیرہ شامل ہیں۔ بلکہ کوئسلر کا نظریہ پہلے اور دوسرے دونوں گروہوں کے نظریوں پر محیط ہے۔

۳- دباؤ میں تخفیف (RELIEF OF TENSION)

تیسرے گروہ کے ماہرین کے خیال میں کسی قسم کے دباؤ یا ممانعت کے ہٹ جانے سے ہنسی کو تحریک ملتی ہے، معاشرہ، مذہب اور اخلاق جو پابندیاں ہم پر لگاتے ہیں ان میں لمحاتی تخفیف یا چھٹکارے سے ہم اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہیں اور ہنس پڑتے ہیں۔ اس نظریے کے حامیوں میں سگمنڈ فرائیڈ (SIGMUND FREUD) (۱۸۵۶ء - ۱۹۳۹ء) چارلس برنارڈ رینوویئر (CHARLES BERNARD RENOUVIER) (۱۸۱۵ء - ۱۹۰۳ء) اور جان ڈیوی (JOHN DEWEY) (۱۸۵۹ء - ۱۹۵۲ء) وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ان تینوں گروہوں کے نظریات میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ سچائی موجود ہے اور ہر نظریہ مزاح کو کسی حد تک سمجھنے میں معاون ہے۔ مثلاً احساسِ برتری کا نظریہ تحریف، رعایت لفظی اور رمز وغیرہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مزاح کی نوعیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ دباؤ میں تخفیف کا نظریہ بھی مزاح کو کسی حد تک واضح کرتا ہے بالخصوص فحش یا جنسی لطائف کی نوعیت کو۔

موجودہ دور میں ہمارے ہاں بھی مزاح کی تعریف اور اسباب کے سلسلے میں کئی اہلِ قلم نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر یا تو انگریزی سے ماخوذ ہیں یا ان میں بہت کم کوئی نئی بات ملتی ہے۔ قدیم لغات، حالی اور سرشار کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ ان کے

علاوہ پریم چند نے بھی ہنسی اور مزاح کے سلسلے میں ایک مضمون بعنوان "ہنسی" تحریر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے بنیادی طور پر سنسکرت سے خوشہ چینی کی ہے۔ انھوں نے ہنسی کی چھے قسمیں اور اس کے محرکات بھی بیان کیے ہیں اور سنسکرت سے ظرافت کی مثالیں بھی پیش کی ہیں ساتھ ہی وہ یہ خیال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ انگریزی میں اس قسم کی مثالیں اور تقسیم نہیں ملتی (جو ظاہر ہے کہ غلط ہے) اسی ضمن میں برج موہن دتاتریہ کیفی (۱۸۶۶ء - ۱۹۵۵ء) نے بھی کچھ کوشش کی ہے اور مطائبات کے زیر عنوان مزاح پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے ہاں ایک نیا خیال یہ ملتا ہے کہ انھوں نے ظرافت کو بنیاد مان کر مزاح، طنز اور بذلہ وغیرہ کو اس کی شاخیں قرار دیا ہے جبکہ ہمارے ہاں اکثر لوگ "ظرافت" کو کوئی واضح مفہوم نہیں دے پائے۔ ان کے علاوہ رشید احمد صدیقی (۱۸۹۲ء - ۱۹۷۷ء) نے گاہے بگاہے اپنی مختلف کتابوں میں ضمناً مزاح کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ جب کہ مزاح پر اکا دکا جملے بہت مل جاتے ہیں۔ مثلاً سجاد انصاری کے ہاں۔ یا عظمت اللہ خاں (۱۸۸۷ء - ۱۹۲۷ء) کے ہاں۔

لیکن مزاح کے کسی نظریے یا نظریات کے گروہ کو مزاح کی نوعیت اور ماہیت پر پوری طرح محیط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہذا کسی ایک نظریے سے اتفاق اور بقیہ کو ٹھکرانا درست نہیں۔ بلکہ ان تمام میں پیش کردہ وجوہات کے علاوہ بھی مزاح کی کچھ نہ کچھ وجوہات اور خصوصیات ہیں۔

مزاح احساس برتری کے نتیجے میں بھی پیدا ہو سکتا ہے اور کسی بات کے خلاف توقع وقوع پذیر ہونے پر بھی۔ دباؤ ہٹ جانے پر بھی مزاح جنم لیتا ہے۔

تحریف، پہیلیوں، معموں اور رعایتِ لفظی وغیرہ کو سمجھنے کے لیے ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ذہانت کے استعمال سے جو ذہنی حظ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بھی مزاح کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ابہام کے نتیجے میں بھی مزاح پیدا ہو سکتا ہے۔

مزاح اور ہنسی کو بالعموم لازم و ملزوم کہا اور سمجھا گیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر ہنسی مزاح کے ذیل میں نہیں آتی۔ قہقہہ اور مسکراہٹ کو ایک معصوم بچے سے لے کر ایک پاگل تک میں دیکھا جا سکتا ہے جو برتری کے احساس یا غیر مطابقت کے خیال سے آزاد ہوتے ہیں اور دباؤ سے بھی۔ ہنسی احساس شکست کا بھی نتیجہ ہو سکتی ہے اور فتح کا اعلان بھی۔ کبھی کبھی مسکراہٹ۔ اعتراف ناکامی کی علامت بھی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ کسی کی موت پر قہقہے لگاتے ہیں۔ مجمع کی ایک الگ نفسیات ہوتی ہے۔ مجمع میں اگر چند لوگ کسی معمولی بات پر قہقہے لگائیں تو پورا مجمع ان کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہنا کہ انسان کیوں اور کب ہنستا ہے آسان نہیں ہے۔

ہر شخص اپنی ذہنیت اور ذہانت کے مطابق ہنستا ہے اور ہنسنے یا کسی بات، خیال یا واقعے کے لطیف پہلوؤں سے محظوظ ہونے یا نہ ہونے کے لیے اپنی ذاتی یا مخصوص وجوہات رکھتا ہے۔ اسی طرح افراد کے علاوہ اقوام کی بھی اپنی حسِ مزاح ہوتی ہے۔ جو بات امریکیوں

کے نزدیک مزاحیہ ہے ممکن ہے کہ وہی بات کسی اور قوم مثلاً جاپانیوں کے لیے باعثِ خندہ نہ ہو۔

مزاح کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ہمدردی پر مبنی ہوتا ہے جبکہ طنز میں ہمدردی کا عنصر نہیں ہوتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمدردانہ اور بے ضرر مزاح بہت کم پایا جاتا ہے مزاح کسی حد تک جارحیت کا شائبہ ضرور لیے ہوتا ہے۔ البتہ رعایتِ لفظی HUN تکرار (ALLITERATION) وغیرہ سے پیدا ہونے والے مزاح کو بے ضرر کہا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کا نشانہ کوئی نہ ہو۔ لیکن بالعموم مزاح اور بذلہ سنجی (WIT) کا کوئی نہ کوئی ہدف ضرور ہوتا ہے اور یہ ایک طرح کی تضحیک اور اہانت ہوتی ہے جس نے بھیس بدل لیا ہوتا ہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ مزاح ہمدردی پر مبنی ہوتا ہے یا مزاح نگار اپنے نشانۂ تمسخر سے ہمدردی رکھتا ہے، محض خوش فہمی ہے۔ اگر مزاح نگار کو کسی سے ہمدردی ہوتی تو وہ اسے نشانہ ہی کیوں بناتا؟

اس کی مثال یوں ہے کہ اگر کوئی عام آدمی یا بالخصوص ہمارا مخالف) کیلے کے چھلکے پر پانو رکھنے سے پھسل پڑے تو ممکن ہے کہ ہم ہنس پڑیں اور ہمارے ساتھ وہ تمام لوگ بھی جو یہ منظر دیکھ رہے ہیں ہنس پڑیں گے۔ لیکن اگر ہمارا کوئی عزیز، بزرگ یا قابلِ احترام شخص پھسلے تو ہم نہیں ہنسیں گے۔ اس لیے کہ ہمیں اس سے ہمدردی ہے۔ گویا مزاح ہمدردی کی موجودگی میں پیدا نہیں ہوتا۔ اس مثال سے مزاح کا وہ نظریہ بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں مزاح کی وجہ احساسِ برتری بیان کی گئی ہے۔ کوئی شخص پھسل گیا، آپ نہیں پھسلے، وہ بے وقوف ہے اور آپ ہوشیار ہیں یا کم از کم وہ آپ سے کمتر ہے۔ لاشعوری طور پر یہ خیال آتے ہی آپ ہنس پڑیں گے۔

البتہ طنز کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ طنز کے متعدد وجوہ میں سے ایک وجہ ہمدردی یا اصلاح کا جذبہ ہو سکتا ہے۔ سماج کی خامیوں یا افراد کی حماقتوں کو دیکھ کر ان کا مضحکہ اڑانے والا، ان پر طنز کرنے والا ان کی اصلاح چاہتا ہے۔ ان خامیوں کو طنز کی زد میں لے کر ان کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ انھیں درست کرو۔ گویا طنز نگار کو اپنے نشانے سے ہمدردی ہونا ممکن ہے۔ لیکن خالص مزاح نگار جو کج اور بے ڈھنگے زاویے اور ناہمواریاں دیکھ صرف ہنس پڑتا ہے اور بے نیازی سے آگے بڑھ جاتا ہے اسے ان ناہمواریوں اور ٹیڑھ سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی اور اسی لیے وہ ان کے اصلاح کے درپے نہیں ہوتا یہ اور بات ہے کہ اسے ہنستا دیکھ کر لوگ اس کمی کا احساس کر لیتے ہیں اور اسے صحیح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن مزاح نگار کا مقصد اصلاح نہیں ہوتا جبکہ طنز اصلاح یا نفرت کے جذبے کی پیداوار ہوتا ہے۔ گویا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مزاح بے نیازی کی پیداوار ہوتا ہے اور طنز میں چاہے وہ نفرت کا نتیجہ ہو یا اصلاح (یا دوسرے الفاظ میں محبت و ہمدردی) کا، جذبات کو بنیادی طور پر دخل ہوتا ہے۔

حواشی

(۱) امریکی اس لفظ کے ہجے HUMOR کرتے ہیں

(۲) ENCYCLOPEDIA AMERICANA جلد ۱۴، (کینیٹی کٹ، ۱۹۸۳ء) ص ۵۶۳

(۳) THE NEW CAXTON ENCYCLOPEDIA جلد ۱۰ (لندن، ۱۹۷۲ء) ص ۳۱۷۶

(۴) آئرلینڈ میں پیدا ہونے والا انگریزی کا ایک طربیہ نگار

(۵) THE NEW CAXTON ENCYCLOPEDIA جلد ۱۰، ص ۳۱۷۶

(۶) ENCYCLOPEDIA AMERICA جلد ۱۴، ص ۵۶۳

(۷) THE NEW CAXTON ENCYCLOPEDIA جلد ۱۰، ص ۳۱۷۶

(۸) ENCYCLOPEDIA BRITANNICA جلد ۹ (شکاگو ۱۹۸۲ء) ص ۵

(۹) THE OXFORD ENGLISH DICTIONARY جلد ۵ (اوکسفورڈ، ۱۹۷۰ء) ص ۵۲۴، ۵۴۰

(۱۰) CHAMBERS TWENTIETH CENTURY DICTIONARY (ایڈنبرا ۱۹۸۱ء) ص ۶۳۶

(۱۱) WEBSTERS DICTIONARY جلد ۱ (نیویارک ۱۹۷۵ء) ص ۸۸۵

(۱۲) کونسٹلر، ارتھر (KOESTLER ARTHUR) THE ACT OF CREATION (لندن، ۱۹۶۴ء) ص ۲۷

(۱۳) اس کی تفصیلات وحید قریشی نے "اردو نثر کے میلانات" میں دی ہیں (لاہور ۱۹۸۶ء) ص ۴۱-۴۳

(۱۴) ایضاً ص ۴۳: محمد حسین آزاد نے "نیرنگ خیال" میں "خوش طبعی" کے زیر عنوان مزاح کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ADDISON کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے نیز عربی کے قدیم سرمایہ ادب میں ہنسی کی نوعیت اور ہنسی کے نظریات کی تفصیلات کے لیے: روزینتھال، فرانز ROSENTHAL FRANZ

HUMOR IN EARLY ISLAM (لنڈن، ۱۹۵۶ء) ص ۱۳۲-۱۳۸

(۱۵) "کلیات نثر حالی" (مرتبہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی) (لاہور، ۱۹۶۷ء) ص ۲۴۱

(۱۶) "کلیات نثر حالی" جلد ۱، ص ۴۵۱- ایضاً

(۱۷) "فسانۂ آزاد" جلد ۴ حصہ دوم (دہلی ۱۹۸۶ء) ص ۵۳۴

(۱۸) ایضاً ص ۴۵۴-۴۵۷، حالی اور سرشار دونوں نے مزاح کی مذمت غالباً اس لیے بھی کی کہ دونوں کو "اودھ پنچ" نے تضحیک و تعریض کا نشانہ بنایا۔

(۱۹) (مرتبہ راحت افزا بخاری) (لاہور ۱۹۶۵ء) ص ۱۵۳

(۲۰) ص ۲۱۴، نیز ص ۲۰۰ پر بھی لفظ مزاح آیا ہے۔

(۲۱) ص ۷۸۴

(۲۲) عیسوی خاں بہادر "قصہ مہر افروز و دلبر (مرتبہ مسعود حسن خاں، حیدر آباد دکن، ۱۹۶۰) ص ۲۹

(۲۳) ENCYCLOPEDIA AMERICANA جلد ۲۴ ص ۲۹۴

(۲۴) CHAMBERS TWENTIETH CENTURY DICTIONARY ص ۱۲۰۰

(۲۵) THE NEW CAXTON ENCYCLOPEDIA جلد ۱۶، ص ۵۲۶۳

(۲۶) ENCYCLOPEDIA AMERICANA جلد ۲۴، ص ۲۹۴

(۲۷) رشید احمد صدیقی، "طنزیات و مضحکات" (لاہور ۱۹۶۶ء) ص ۱۴

(۲۸) ایک لاطینی بحر جس میں چھے ارکان ہوتے تھے۔ انگریزی میں بھی اسے معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اپنایا گیا

(۲۹) ENCYCLOPEDIA AMERICANA جلد ۲۴، ص ۲۹۴

(۳۰) رشید احمد صدیقی "طنزیات و مضحکات"، ص ۲۳

(۳۱) ENCYCLOPEDIA AMERICANA جلد ۲۴، ص ۲۹۴

(۳۲) CHAMBERS TWENTIETH CENTURY DICTIONARY ص ۱۲۰۰

(۳۳) WEBSTERS DICTIONARY جلد ۲، ص ۱۹۱۱

(۳۴) THE NEW CAXTON ENCYCLOPEDIA جلد ۱۲، ص ۲۷۱ ۵

(۳۵) رشید احمد صدیقی، "طنزیات و مضحکات"، ص ۲۸

(۳۶) THE OXFORD ENGLISH DICTIONARY جلد ۹، ص ۱۱۹

(۳۷) ہلٹن، ارل (HILTON EARL) اور شریل ڈاروِن (SHRELL DARWIN) EXPOSITION (بلمونٹ کیلی فورنیا ۱۹۶۷ء) ص ۲۲۴

(۳۸) "تنقید اور عملی تنقید" (دہلی ۱۹۵۲ء) ص ۳۴

(۳۹) مزاح کی مختلف اقسام اور صورتوں کے لیے ملاحظہ کیجیے وزیر آغا "اردو ادب میں طنز و مزاح (لاہور ۱۹۷۷ء) ص ۳۴-۴۴ نیز عبدالغفور، خواجہ "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" (دہلی ۱۹۸۳ء) اور "شگوفہ زار" (دہلی ۱۹۷۷ء)

(۴۰) میگھی، پال ای (MCGHEE PAULEE) HUMOUR ITS ORIGIN AND DEVELOPMENT (سان فرانسسکو ۱۹۷۹ء) ص ۱

(۴۱) ان میں سے بعض نظریات کی تفصیل کے لیے: وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، پہلا باب نیز وحید وحید قریشی "اردو نثر کے میلانات ص ۴۴۔ ۴۷، یوسف ناظم "اردو ظرافت نگاری" مشمولہ شگوفہ ماہنامہ حیدرآباد دکن، ہندستانی مزاح نمبر، جون ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۷۔ ایم محمد اسلم قریشی، "ڈراما نگاری کا فن" (دہلی ۱۹۸۳ء) ص ۳۸۵-۳۹۵

(۴۲) یہ تقسیم ENCYCLOPEDIA AMERICANA سے ماخوذ ہے۔ جلد ۱۴، ص ۵۶۳-۵۶۴

(۴۳) مضامین پریم چند (مرتبہ عتیق احمد)، (کراچی ۱۹۸۱ء) ص ۳۶۴-۳۶۳

(۴۴) "کیفیہ" (لاہور ۱۹۵۰ء) ص ۳۲۲-۳۲۹

(۴۵) "محشر خیال" میں سجاد انصاری مزاح پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں "ندرتِ خیال کے ساتھ بھی بے نیازی انتہائی ذہانت اور ذوقی تفریح سے مل کر ظرافت بن جاتی ہے" (لاہور ۱۹۵۷ء) ص ۱۳۸

(۴۶) عظمت اللہ خاں نے "مضامین فرحت" کے دیباچے میں "خوش مذاقی" کے عنوان سے مزاح پر مختصراً اظہار خیال کیا ہے اور LIGHT HUMOUR کا ترجمہ "خوش مذاقی" کیا ہے۔

(۴۷) وزیر آغا "اردو ادب میں طنز و مزاح" ص ۴۰-۴۲ نیز محمد احسن فاروقی "مزاح اور مزاح نگاری"

مشمولہ "ساقی" ماہنامہ کراچی مئی ۱۹۵۹ء ص ۲۴
(۸۴) کوئسٹلر آرتھر THE ACT OF CREATION (KOESTLER ARTHUR) (لندن ۱۹۶۴ء) ص ۲۷
(۹۴) مائکس جارج ENGLISH HUMOUR FOR BEGINNERS (MIKES GEORGE) (لندن ۱۹۸۰ء) ص ۵۵-۶۰
۵۹) وقار عظیم - طنز کا جذباتی پہلو، مشمولہ "ساقی" ماہنامہ دہلی، ظرافت وطنز نمبر اپریل ۱۹۴۵ء ص ۱۷

ڈاکٹر عبدالمغنی
پروفیسر کوارٹر۔ سائنس کالج کمپاؤنڈ

ابنِ فرید بحیثیت افسانہ نگار

جناب ابنِ فرید ایک اچھے تنقید نگار کی حیثیت سے معروف ہیں اور ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے شائع ہو کر اہل نظر سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے نفسیاتی جہت سے معاشرتی مضامین بھی لکھے ہیں اور اصلاحی ناول یا ناولٹ بھی جو مقبول ہو چکے ہیں۔ لیکن بالعموم ادب کے قارئین بھول گئے ہیں کہ اولاً اور اصلاً جناب ابنِ فرید ایک اعلیٰ پایے کے افسانہ نگار ہیں۔ جن کی افسانہ نگاری کا دور ۱۹۵۲ء تا ۱۹۶۲ء کا دہ عشرہ ہے جب ترقی پسندی اپنے عروج پر تھی اور جدیدیت کا چرچا شروع نہیں ہوا تھا۔ اس دور میں اشتراکی اندازکی ترقی پسندی اور بے سمت و بے ہنر جدیدیت دونوں کے میلانات سے جدا۔ ابن فرید نے افسانہ نگاری کی ایک ایسی راہ نکالی جو ایک طرف پریم چند کے مکتب فکر کی معاشرتی حقیقت پسندی سے قریب تھی اور دوسری طرف قرۃ العین حیدر کی عصری حسیت سے۔ گرچہ ابنِ فرید کا نقطۂ نظر دونوں سے مختلف تھا۔ اس نقطۂ نظر کو اخلاقی کہا سکتا ہے۔ اس میں بہ یک وقت ایک نفسیاتی گہرائی اور دینی احساس دونوں عناصر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ اس لیے کہ ابنِ فرید نے عصر حاضر کے سماج اور انسان کا مطالعہ اسلام کی معاشرتی قدروں کی روشنی میں، واقعات اور کرداروں کی تہوں میں ڈوب کر کیا ہے۔ یہ ان کے ذہن و فکر کا معاملہ ہے۔ جہاں تک فن کاری کا تعلق ہے۔ وہ توصنف افسانہ نگاری کے تسلیم شدہ اور معروف اصول و لوازم کے مطابق قصے کی پوری دل چسپی کو برقرار رکھتے ہوئے ماجرا سازی اور تعمیر عروج کرتے ہیں۔ دوسرے زمان و مکان کی وحدتوں کے قدیم معیار سے زیادہ وحدت تاثر کو ملحوظ رکھتے ہوئے چشمۂ خیال اور علامت نگاری کے جدید ترین رجحانات کی بھی قدرے رعایت اپنے بعض افسانوں میں ایک معقول حد تک اس طرح کرتے ہیں کہ تجریدی افسانہ نگاری کی لغویت پیدا نہیں ہوتی۔

بر وقت میرے سامنے جناب ابنِ فرید کے دس افسانوں پر مشتمل ان کا پہلا

مجموعہ "یہ جہاں اور ہے" ہے۔ عنوان کتاب کی کہانی کی ہیروئین ایک ایسی لڑکی ہے جو ایک ایسے اپ ٹوڈیٹ نوجوان سے شادی کی پیش کش رد کر دیتی ہے جس کے ساتھ اس کا رشتہ طے کرنے کے لیے پورا خاندان بے قرار ہے۔ اس لیے کہ یہ نوجوان اپنی بعض غیر اخلاقی حرکتوں کی وجہ سے ہیروئن کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ حالاں کہ سماج کے موجودہ معیار کے لحاظ سے وہ ایک بہت ہی ہونہار نوجوان سمجھا جاتا ہے۔ ہیروئن کی یہ غیر معمولی مثالیت اشارہ کرتی ہے کہ آج کی اخلاقی اعتبار سے زوال پذیر دنیا سے الگ، ہیروئن کے ذہن کا جہان اور ہے، جو بلند تر انسانی اور تہذیبی قدروں کا حامل ہے اور اس میں زندگی کی متانت و نفاست کا تصور موجودہ زمانے کے غیر سنجیدہ اور کثافت آلود رویے سے بالکل مختلف ہے۔ یہ موضوع دراصل ابن فرید کی پوری افسانہ نگاری کا نشان ہے اور اس نادر موضوع کا عنوان اقبال کے اس مشہور شعر کی یاد دلاتا ہے:

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

(حال و مقام ..... بال جبریل)

دوسرے افسانے "عشرت لاج میں ایک اجنبی" (مجموعے کی فہرست میں پہلا افسانہ) کا ہیرو بھی "یہ جہاں اور ہے" کی ہیروئین ہی کی طرح ایک ایسا مثالی نوجوان ہے جس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے اعلیٰ جدید اور امیر خاندان میں ایک اجنبی بن جاتا ہے اور اپنے مضبوط کردار سے ایک تعیش پسند خاندان کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ خاندان کے دوسرے سب افراد کے مقابلے میں اس کی ذہنی و اخلاقی برتری بہت واضح ہے۔ یہ دونوں افسانے موجودہ سماج میں ایک خوش گوار انقلاب کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور جدید معاشرت کے سطحی، غیر ذمہ دارانہ اور بے کردار ماحول میں ایک بہتر تبدیلی کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں۔

تیسرا افسانہ "گیارہ آدمی ایک جزیرہ" ایک تخئیلی کہانی ہے جو علامتی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس میں گویا ایک ہنگامی صورت حال پیدا کر کے انسان کے مختلف کرداروں کا مطالعہ کیا گیا ہے اور تمام دعووں کے باوجود انسان کی بے بسی کا تماشا دکھایا گیا ہے۔

چوتھی کہانی "رشک کرتا ہے سواد آسماں" ایک مثالی خاندانی زندگی کی نہایت پُر اثر تصویر کشی ہے۔ جس میں شوہر اگر پُر وقار ہے تو بیوی حد درجہ وفادار اور کار گزار، دونوں کی باہمی محبت غربت کے باوجود ان کی زندگی میں ایک سرور انگیز کیف پیدا کرتی ہے اور سماج میں ان کا بھرم قایم رکھتی ہے۔ یہ گہرے حسین اور

دلکش انسانی جذبات کا موقع ہے جس کی نفاست میں رومانیت سے زیادہ حقیقت
در صداقت کا آب و رنگ ہے۔ پانچواں افسانہ "ساحل سے طوفان کا نظارہ" پر ترقی
پسندی کا عکس ہے لیکن اس میں سماجی انصاف کے لیے انسانی خدمت کی راہ
میں کردار کی جس پختگی اور ایثار کے ساتھ ساتھ اطمینان قلب کا اظہار ہیرو کی سیرت
اور سرگرمی سے ہوتا ہے وہ اشتراکیت سے کچھ آگے کی چیز معلوم ہوتی ہے اور
اس کی مثالیت میں دین داری وخداترسی کا آہنگ ہے۔ چھٹی کہانی "نیلوفر" ایک
لڑکی یا عورت کا خالص نفسیاتی مطالعہ ہے۔ جس میں اس کی عجیب و غریب شخصیت
کے نفسی محرکات کا بہت ہی خوب صورت، گہرا اور سچا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس سے
نفس انسانی بالخصوص نسائیت کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کے بظاہر سمجھ میں نہیں
آنے والے اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں۔

ساتواں افسانہ "چاند، سمندر اور شہر" جنگ عظیم ثانی کی نہ صرف فوجی، سیاسی
اور معاشی بلکہ اس سے بھی زیادہ معاشرتی اور اخلاقی تباہ کاریوں کی نہایت
عبرت خیز تصویر کشی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یورپ کی متمدن و مہذب قوموں
کے افراد نے جنگ میں کتنی ہول ناک درندگی، وحشت اور بربریت کا ثبوت دیا
اس افسانے میں جنگ سے متاثر ہونے والے علاقوں کی منظر نگاری ایک سیاح
کی طرح کی گئی ہے۔ اس لیے اس میں سیاحت نامے کا لطف بھی ہے اور جنوب
مشرقی ایشیا کے جغرافیہ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ جن کا تعلق درحقیقت بعد جنگ کے
اثرات سے ہے۔ آٹھویں کہانی "نشانہ" ۱۹۹۱ء کی لکھی ہوئی ہے اور اس میں فرقہ
وارانہ مسلم کش فسادات کے ایک اندوہناک واقعے کی ایسی لرزہ خیز موقع...
نگاری اتنے لطیف افسانوی انداز سے کی گئی ہے کہ اس کی عمدہ فن کاری کو کلاسکی
کہا جا سکتا ہے اور اس کا انتخاب فسادات پر لکھے جانے والے عالمی سطح کے بہترین
افسانوں کی ایک محدود فہرست میں بھی بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ اردو افسانہ نگاری
میں جدیدیت کی بے ماجرا تجریدی رد کے خاتمے پر تخلیق کی ہوئی یہ باماجرا، بامعنی
قصے کی دل چسپی سے بھرپور، لیکن علامتی حد تک خیال انگیز کہانی، جس میں چشمۂ
خیال کی تکنیک کی بھی کچھ جھلک ہے، آج کے افسانہ نگاروں کو سچی فن کاری کے
کئی مفید سبق دے سکتی ہے۔

آخری دو افسانے "رام ہر رنگ زمیں" اور "دامن یوسف" عہد قدیم کی
بعض عبرت خیز اور سبق آموز داستانوں کی، مختصر لیکن پر اثر پیمانے پر، فن کارانہ
انداز سے مرقع نگاری کرتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کے انسان کی
دل چسپی اور اس کے فائدے کے لیے صدیوں قبل کے واقعات کی تصویر کشی
کس طرح کی جا سکتی ہے اور گزرے ہوئے زمانوں میں بھی انسان کے ذہن و

کردار کا اندازہ موجودہ دور سے کتنی مشابہت رکھتا ہے۔ ان دونوں افسانوں میں ایک آفاقی رنگ ہے اور یہ انجیلی ہونے کے باوجود حقیقی زندگی کے اشارے ہیں۔ انھیں حقیقی بنانے میں چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں کی تفصیلات وجزئیات کی پیش کش پر افسانہ نگار کی اس قدرت کو بہت کچھ دخل ہے جس کا اظہار اس کے تحریر کئے ہوئے دوسرے تمام افسانوں میں بھی ہوا ہے۔ قدیم وجدید دونوں ادوار کے انسان اور اس کے سماج کی تصویر کشی میں افسانہ نگار کا کمال اس کے عمرانی مطالعات کی وسعت کا پتا دیتا ہے۔ عمرانیات کے اس پس منظر کو نفسیات سے افسانہ نگار کی گہری آگہی بہت معتبر بنا دیتی ہے اور بے خطا ماجرا سازی کا پختہ ہنر داستان سرائی کا جادو جگاتا ہے۔

جناب ابن فرید کے یہ افسانے ترقی پسندی کے دور میں ابھرنے والے ایک اور اخلاقی نقطۂ نظر کے حامل مثالیت پسند افسانہ نگار جیلانی۔ بی اے، مرحوم کی یاد دلاتے ہیں۔ دونوں کے درمیان قدر مشترک یہ ہے کہ فن کاری کے کمال کے ساتھ وہ عصر حاضر کی سطحیت کے برخلاف معاشرت میں ایک بنیادی اصلاح چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے آج کے مادہ پرست اور تعیش پسند انسان کے ذہن و کردار میں بہتر تبدیلی لانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس تبدیلی کے لیے وہ سماج میں ایک بار پھر اخلاقی قدروں کے فروغ کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اخلاقی باختگی ہی موجودہ انسانیت کا وہ مرض ہے جس نے اسے بڑی حد تک کردار کی استواری سے محروم کر دیا ہے۔ بہرحال ابن فرید کے فکر وفن کی وسعت اور لطافت جیلانی، بی اے کے فکر وفن سے کچھ زیادہ ہے۔ گرچہ جیلانی نے زیادہ کثرت کے ساتھ اتنے ہی اچھے افسانے لکھے ہیں جتنے ابن فرید نے، مگر زیر نظر کتاب ابن فرید کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جب کہ جیلانی کے افسانوں کا مجموعہ شاید مرتب ہونے کے باوجود شایع نہیں ہوا ہے، حالانکہ ان کی تعداد اچھی خاصی ہے۔

توقع کی جا سکتی ہے کہ جب جناب ابن فرید نے تیس سال قبل تحریر کیے ہوئے اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ اب شایع کیا ہے اور اس میں حال فی الحال لکھا ہوا ایک اعلا پائے کا افسانہ "نشانہ" بھی شامل ہے تو اب وہ افسانہ نگاری کی طرف نئے سرے سے اور زیادہ زور وشور کے ساتھ متوجہ ہوں گے، ساتھ ہی ناول نگاری کی طرف مزید توجہ دیں گے۔ یہ ایک خوش آیند توقع ہوگی اس لیے کہ ترقی پسندی کے رد عمل میں جدیدیت نے اردو افسانہ نگاری کی جو شکست و ریخت کی ہے اس سے ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جسے ابن فرید جیسے پختہ کار اور بالغ نظر فن کار نہ صرف پُر کر سکتے ہیں بلکہ نئے افسانہ نگاروں کی رہنمائی بھی فکر وفن کی بلند تر منزلوں کی طرف کر سکتے ہیں۔

افسانوں کا زیر نظر مجموعہ کاغذ، جلد، سرورق اور کتابت وطباعت کے لحاظ سے بہت نفیس اور دیدہ زیب ہے جس کی قیمت نوے ۹۰ روپے، صفحات ۲۷۲ اور پتہ بیت الصالحہ، زینہ عنایت خاں، رام پور - ۲۴۴۹۰۱ (اترپردیش) ہے۔

ڈاکٹر سراج بہادر گوڑ
جوبلی کامنڈوا ۱/۹۹۰-۱-۸-۱ سوریہ نگر
حیدرآباد

پروفیسر نثار احمد فاروقی

کچھ تاثرات

نثار احمد صاحب فاروقی کی شخصیت اور ادبی خدمات پر کتاب نما نے ایک شمارہ شائع کیا ہے جس کی آج رسم اجرا انجام پا رہی ہے۔ اسے ڈاکٹر خلیق انجم نے ترتیب دیا ہے اور متعدد احباب نے نثار احمد فاروقی پر مضامین لکھے ہیں۔

غالباً خلیق انجم کی ترتیب و تالیف کی زندگی میں یہ پہلا موقع ہوگا کہ باریک حروف میں کتابت کے باوجود متعدد مضامین مجموعہ میں شامل نہ ہو سکے، حالانکہ انھیں اکثر یہ شکایت ہوتی ہے کہ کافی مضامین حاصل نہ ہو سکے۔

یہ محض علامت ہے اس بات کی کہ نثار احمد فاروقی پر کتنے لوگ نثار ہونے کو تیار ہیں اور رہتے ہیں۔

کتاب کے آخر میں بیگم سلمیٰ خاتون نے پروفیسر نثار احمد فاروقی کی تصنیفات، تالیفات تراجم و نگارشات کا ایک قابل قدر اشاریہ بھی ترتیب دیا ہے۔ اس کے دیکھنے ہی سے ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی ہے۔ ۷ تراجم۔ ۵ تالیفات، ۴ رسائل و محاضرات، ۳ مقدمات، فارسی ادب سے متعلق ۴ مضامین، عربی ادب پر ۱۳۔ اور انگریزی مضامین ۷، تدوین و تحقیق ۱۰، مجموعہائے مضامین ۴، تحقیقی مضامین انگریزی میں ۲، مساعت ۵،۔ ان کے علاوہ زیر طبع کتابیں جن کی کتابت ہو چکی ہے ۷ ہیں۔ پھر بیگم سلمیٰ خاتون نے پروفیسر نثار احمد فاروقی کے تنقیدی مضامین کا ذکر نہیں کیا (یا کیا بھی ہے تو سہواً میری نظر سے نہیں گزرا)

اس کے علاوہ مختلف مضامین ہیں جو ہند و پاک کے مختلف چھوٹے بڑے رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

یہ سب دیکھنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ نثار احمد صاحب کا ادبی قد ان کے جسمانی قد سے کئی گنا اونچا ہے اور شاید ہی کوئی ان کا ہم عصر ان کا مقابلہ کر سکے۔

سید امیر حسن عابدی نے کہا ہے کہ پروفیسر نثار احمد فاروقی عربی پڑھاتے ہیں، فارسی پڑھتے ہیں اور اردو لکھتے ہیں۔ لیکن انھوں نے بھی فاروقی صاحب کی انگریزی اور ہندی تخلیقات سے صرفِ نظر کیا ہے۔

کتاب نما کے زیر نظر شمارے کو شروع سے آخر تک دیکھ لینے کے بعد پروفیسر نثار احمد فاروقی کی ایک عظیم شخصیت ابھرتی ہے۔

اول تو وہ ۱۹۵۷ء سے دہلی یونیورسٹی میں لائبریرین کے عہدے پر مامور رہوئے۔ بس میٹرک پاس تھے۔ نہایت عسرت اور تنگی کا دور تھا۔ اور بقول ڈاکٹر خلیق انجم ان کی دوڑ ”چار آنے“ کی چائے سے ادیبوں کے ”چنڈو خانے“ تک تھی۔

پھر انھوں نے انٹر میڈیٹ کیا۔ بی۔ اے کیا۔ ایم۔ اے کیا اور پی۔ ایچ۔ ڈی۔

اب عربی کے پروفیسر ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت کی تعمیر میں متعدد عوامل نے کام کیا ہے۔

ایک تو یہ کہ یہ ددھیال کی طرف سے اہم واسطوں سے خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضؓ سے وابستہ ہیں اور ننھیال کی طرف سے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے منسلک ہیں۔ یہ خود ایک ایسی وراثت ہے جس کا اپنا سکّہ ان پر واضح ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان پر تصوف کا گہرا اثر ہے اور یہ ان کی تحریروں سے بھی واضح ہے۔ تصوف کا کارنامہ ہی یہ ہے کہ ایاز، محمود سے دور ہی رہا لیکن اپنے وقار اور تیور میں محمود سے آگے رہا۔ اور ایک طرح سے اس فصل نے اس کے اندر خود شانِ محمودی پیدا کر دی۔ تیسری بات یہ واضح ہے کہ پروفیسر نثار احمد فاروقی اسلام سے نہ صرف وابستہ ہیں بلکہ گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں ان کا مذہب یہ ہے کہ دوسرے مذاہب سے رواداری برتی جائے۔ اسلام کے بہت بڑے عالم ہونے کے باوجود بلکہ شاید اس وجہ سے ان کے ہاں مذہبی تنگ نظری نہیں ملتی۔ یہاں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری کے مضمون میں فاروقی صاحب کی مولانا آزاد کے بارے میں یہ رائے اس کی گواہی دیتی ہے۔

> مولانا آزاد نے مذہب کا گہرا مطالعہ ضرور کیا تھا مگر اسے کبھی سیاسی نظریات پر غالب نہ آنے دیا اور بڑے قومی مفاد کو مذہبی تنگ نظری کی قربان گاہ پر کبھی نہیں چڑھایا۔“

کیا یہی بات خود پروفیسر نثار احمد فاروقی کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی؟ فرق یہ ہے کہ فاروقی صاحب سیاست کے مرد میدان نہیں ہیں لیکن ان کی علمی اور ادبی زندگی میں کہیں ان پر تنگ نظری کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ وہ سرسید اور مولانا آزاد کی طرح تقلید پر نہیں بلکہ اجتہاد پر ایمان رکھتے ہیں سرسید نے کہا تھا کہ سماج ترقی کرتا ہی رہتا ہے اور بدلے ہوئے حالات کے تحت مذہبی تعلیمات کی تاویل کرنی پڑتی ہے نئے مسائل نئے حل کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ماضی ہمارے مستقبل کے لیے انسپریشن رہے تو ٹھیک ہے۔ لیکن اسے ہمارے پیروں کی زنجیر نہ بننے دیا جائے اور نہ ہی یہ ہمارے ذہنوں کو مفلوج کر پائے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی کے سلسلۂ نسل میں ایک بزرگ نظام الدین شہید گزرے ہیں۔ جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ ”کافروں“ سے لڑتے ہوئے رنتھمبور میں شہید ہو گئے۔

، ان ہی سے متعلق نثار احمد فاروقی نہ صرف "کافروں" سے میل جول اور اپنائیت رکھتے ، بلکہ ان کے لیے ہر طرح کی قربانی کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ نثار احمد ہیں اپنے خیال نثار ہو سکتے ہیں۔

خواجہ حسن ثانی نظامی نے لکھا ہے کہ خدا نے نثار احمد فاروقی کی "پشت کو کمر کے پاس ، تو سیدھا رکھا ہے مگر شانوں کے پاس مستقل خم کر دیا ہے"، خواجہ صاحب کو حیرت وں ہے؟ سر کتاب کے سامنے خم ہوتا ہے اور کمر صرف محراب کے سامنے۔ اور یہی فاروقی احب کی سرشت ہے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی محقق پائے کے ہیں اور نقاد بھی معرکے کے۔ انشائیے بھی ھتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں۔ تنقید نگاری کے تعلق سے کافی بے معنی بحث ہوتی رہی ہے۔ ہ اس کا تحقیق سے کوئی تعلق نہیں اور پھر مواد کو دیکھا جائے یا ہیئت کو۔

مگر نثار احمد فاروقی کی تحقیق میں تنقید کا رنگ ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ اور نقید میں تحقیق کا بقدر ضرورت امتزاج بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح مواد اور ہیئت میں بھی ایک بط ہوتا ہے۔ عظیم فیروز آبادی نے صحیح لکھا ہے کہ پروفیسر نثار احمد فاروقی کے پاس مواد ی گراں مایگی کے ساتھ انداز بیان کی رنگا رنگی اور نثر کی تخلیقی شان۔۔ کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

نثار احمد فاروقی کے پاس عقل اور مذہبی وجدان میں تطبیق اور ہم آہنگی ہے۔ ان کی نظر میں شریعت اور فقہ میں حالاتِ زمانہ کی رعایت کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ ایک پرانی بحث ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اقبال "عقل" پر "دل" کی برتری کے قائل ہیں۔ یہ الفاظ دیگر سائنس اور REASON کو عقیدے کا نگہبان بھلے مان لیں لیکن اس پر حاوی نہیں دیکھنا چاہتے۔ لیکن سرسید اور پھر مولانا آزاد نے تطبیق اور اجتہاد پر زور دیا ہے۔ نئی حقیقتوں کا سامنا نئے حوصلوں، نئے ہتھیاروں اور نئے داؤ پیچ سے کرنا ہے۔

آخر میں یہ بھی بتلا دوں کہ نثار احمد فاروقی کا تعلق میرے اپنے شہر حیدرآباد سے بھی گو کچھ دنوں کے لیے ہی سہی رہا ہے۔ آپ دہلی کو عالم میں انتخاب کہہ لیں ۔ اور قریوں میں تو سہیل عظیم آبادی اور شہاب الدین دسنوی نے دسنہ اپنے گاؤں کو بھی عالم میں انتخاب کہا ہے۔ مگر ہم نے ان سب سے اپنا راستہ ذرا الگ بنایا ہے اور حیدرآباد کو فرخندہ بنیاد کہتے ہیں۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک وہاں رہے۔ اور اگست ۱۹۴۷ء میں کسی سے کچھ کہے بغیر چپکے سے دہلی چلے آئے۔ اور یہاں جیسے تیسے بس گئے۔ جس زمانے

میں وہ حیدرآباد میں تھے اور اردو شریف نام کے محلے کے ایک اسکول میں پڑھتے تھے، حیدرآباد سخت کشمکش کے دور سے گزر رہا تھا۔ نثار احمد فاروقی صاحب حسن خبر سے بنے تھے وہ اسے گوارا نہیں کرسکتا تھا۔

نثار احمد صاحب کا ایک اور کارنامہ مولانا آزاد کے چلائے ہوئے رسالے "ثقافۃ الہند" کو بہتر طور پر چلانا بھی ہے۔ اسی رسالے کی وجہ سے ہندستان سے عرب دنیا متعارف ہوئی ہے حکومت ہند کی اس کابینی سب کمیٹی سے مولانا آزاد کا تعلق بھی تھا جو امور خارجہ پر نظر رکھتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ہی ہندستان کی ان کھڑکیوں کو کھول دیا جو مغربی ایشیا کی طرف کھلتی تھیں۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی کا دم ہم سب کے لیے، اردو والوں کے لیے بلکہ سارے ملک کے لیے غنیمت ہے۔ اور کتاب نما کے زیر نظر شمارے سے پروفیسر صاحب کی ہمہ جہتی شخصیت کی ایک جھلک ہی سہی ہمیں مل جاتی ہے۔

احمد سہیل

312, KCRMATH,
DRIVESAN JOSE,
C A 95132 (U.S.A)

عمرانیاتی حسیت کا روپ بہروپ

"تین بتی کی راما" انسانی پیچیدہ رویّوں اور حاشیائی احساس کی چھوٹی بڑی کہانیاں ہیں جو روایتی رکھ رکھاوے معذرت کرتے ہوتے کاسموپولیٹن تمدن کے عمرانیاتی ساختیے کے خدوخال کو واضح کرتی ہیں جہاں روایتی اساطیر کو مخصوص حضروی معاشرت نے رد کر دیا ہے اور فرد کے معاشرتی اور اقتصادی مطالبات زندگی ایک نئی میکانی تہذیب و تمدن کا انکشاف کرتے ہیں۔ ناول میں گلی کوچوں کی عامیانہ زبان کو برتا گیا ہے، یہ زبان کاسموپولیٹن سائیکی کی اجتماعی شناخت بھی بنتی ہے جو زماں و مکاں کے مخصوص دائرے میں جنم لے کر اپنے استعارے، تشبیہات، مجرورت، رمز و علامتوں، تمثیلی پیرایے اور پیکریت کے نئے لسانی ساختیے اور لہجے کی مختلف جہتوں کو تشکیل دیتی ہیں اور کہانی کہنے والا نئے بیانیہ اظہار کو روشناس کرواتے ہوئے کرداروں ماحولیات، واقعات اور کہانی کی پوری فضا کو قاری کے حوالے کر کے منظر سے غائب ہو جاتا ہے یوں قاری کو کہانی کار کے معدوم ہو جانے سے انجانا سا تزکیہ میسر آ جاتا ہے اور وہ کہانی کے کرداروں میں اپنے کردار کا بھی اضافہ کر دیتا ہے، عدم مغائرت کی یہ فضا ناول کے تخلیقی اظہار کی ایک جاندار تکنیک ہے کیونکہ روایتی طور پر کہانی کار کبھی بھی قاری کے ذہن پر اپنی گرفت کو ڈھیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔ کہانی کار کا یہ احتیاطی عمل جبر بن جاتا ہے جبکہ قاری دورانِ قرأت کرداروں کے ساتھ ان کے خیالات، سوچوں اور محرومیوں سے تبادلۂ فکر کرتا ہے۔ قاری کو فکری آزادی کا موقع فراہم کرنا وسیع القلبی سے زیادہ جرأت القلبی کا مظاہرہ ہوتا ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ناول میں فرد کو اپنی معاشرتی اجتماعی اور انفرادی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہے کیونکہ بنیادی معاشرتی ڈھانچہ مشکوک ہے۔ ناول میں ماحولیات کی جو اجتماعی حیثیت ابھری ہے وہ نظامِ معاشرت کے متضاد چہروں کی کیمیاگری ہے اور ایک طرح کی انسانی رشتوں اور اس کے روایتی اقدار اور وضعداری سے انحراف ہے جو بڑے کاسموپولیٹن ساختیے میں مادے کے میکانکی روابط کے در آنے سے پیدا ہوتے ہیں اس فضا میں تمدن اور نظریہ کے مابین نہ ہی کسی قسم کا تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی ماورائی یا مابعد الطبیعیاتی جبر انسانی ذہن

کو متاثر کرتا ہے۔ ناول کا تمام قصہ تین بتی کے علاقے کے مخصوص ماضی اور حال کے تقابل سے جنم لیتا ہے جہاں فرد کو ہر وہ چیز زندہ رکھے ہوتے ہے جس کی وہ تردید کر رہا ہے، بنیادی معاشرتی، معاشی اور حیاتیاتی ضرورتوں کے لیے انسان کو اپنی شناخت یا خلیقے کو کھو دینا پڑتا ہے اور وہ ــــ وہ بن جاتا ہے جو وہ نہیں ہے۔ آسودگی کو حاصل کرنے کی انسان کو بڑی آرزو ہوتی ہے جیسے ہی اس کے آثار کہیں نظر آتے ہیں فرد اسے فوراً حاصل کر لینا چاہتا ہے۔

"وہ بولی، سیٹھ اور سیٹھانی دس دن کا واسطے باہر گام گیا ہے
ابھی دس دن تلک میں سیٹھانی اور تو سیٹھ ہے۔ یہ دس دن
اپن نیچو کچن میں نہیں سوئے گا سیٹھ کا بیڈ روم میں
سیٹھ کا بستر اوپر سوئے گا ــــ "پھر" فر کیا۔ اپنا اور اس کا ناٹک فٹ ہے
بس اپن گھس گیا سیٹھ کا بیڈ روم میں۔ ڈنلوپلو کے بستر اور بر جولی اور۔۔
باقی تم لوگ سمجھ جاؤ۔" (صفحہ ۸۹-۹۰)

ناول میں جس مخصوص لسانی تجربے کا ماجرا ملتا ہے وہی ناول کی ماحولیاتی آگہی اور انفرادی تکلم ہے اور یہی لسانی تجربہ تخلیقی اظہار میں تبدیل ہو کر نئی معنیات، جمالیات، وصف، امتیازات، ثقافتی مرکبیات اور فنی لوازم کی حدود کا تعین کرتا ہے، لفظ کی معنویت ماحولیاتی وظائف کے عکس سے جنم لیتی ہے۔ ناول یا افسانہ نگاری کے روایتی ذاتی کلامیہ سے انحراف کر کے ناول نگار نے واقعہ اور اظہار میں جو براہ راست تطبیق پیدا کی وہ فکشن کی نئی شعریات کی متنی۔ سیاقی اور تاریخی حیثیت اور تکنیک کے اوصاف کا محاکمہ ہے۔ انسان کی روایتی شیطان پرستی نے خدا سے فرد کا تعلق توڑ دیا۔ انسان اپنے مکر اور گھناؤنے طرز عمل کی وجہ سے بٹ کر رہ گیا۔ انسان کا یہی بٹوارا جدید انسان کی زندگی کا المیہ ہے۔

"اب ہم کہیں۔ سسرا ای بمبئی اور ای بمبئی کا لوگ، باگ دھرم
اور نیچ بیچ۔ کو نو بات کا کھیال ناہیں کرت ہیں۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔ ہوت کا منی؟ کل ہمارا سیٹھ پارٹی دیا۔ کھوب دارو چلی
وہاں دھما چوکڑی مچی۔ پھر ہم کا دیکھے بتائین؟ سب مردوا،
سب ہی مہرار وا انکھین پر رومال باندھ لین اور بھیّا
آپس میں رل گئے۔ جو نو مردوا کے ہاتھ جون مہرارو لگی وہ
او کا لے کے پڑ گئین" (صفحہ ۱۸۰)

اس تمدن شکن احساس نے لکھنے والے کے تصور کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ جہاں رات گئے سفید پوش تمدن اور معاشرت کا تجزیہ سیدھے سادے معصوم لوگ تین بتی کے اطراف بنی ہوئی منڈیروں پر بیٹھ کر کرتے ہیں۔

"کھالی تین۔ بتی اوپر آدمی کا ایمان دھرم بھرشٹ کرنے کو بہت کچھ ہے
اپنے راماؤں کو دیکھو"

یہی پکار یہی احساس پھیل کر ناول کا روپ دھار لیتا ہے جو کاسموپولیٹن عمرانیاتی حسیت کا روپ بھی ہے اور بہروپ بھی! جہاں انسان کا مصنوعی وجود اس کے اصل وجود سے اپنی برطرفی کا اعلان کرتا ہے۔ "تین بتی کی راما" اس بات کا احساس دلواتی ہے کہ کاسموپولیٹن معاشرت میں انسان سے انسان کا قلبی رابطہ منقطع ہو چکا ہے۔

ننھے مُنّے بچوں
کے لیے
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں
بتاشے
نرسری کے بچوں کے لیے آسان
زبان میں دلچسپ نظمیں قیمت ۶/۵۰
جاں نثار دوست
بچوں کے لیے باتصویر کہانی
قیمت ۵/- روپیے
جادو کی ہنڈیا
5/-
بھیڑیے کا گانا
6/50
شیر اور بکری
7/50
کوّے کا خواب
7/-
دُم کٹی لومڑی
6/50
چاند کی بیٹی
5/-
چالاک بلّی
6/50
بھائی بانسری
قیمت 7/50

رضوان اللہ
۱۷۸ ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

اردو کے دو بنگالی ادیب

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے انتقال کے بعد مغربی بنگال، خصوصاً کلکتہ میں بہتیرے تعزیتی جلسے ہوئے اور وہاں کے اخباروں میں بھی بہت کچھ لکھا گیا لیکن شہزاد منظر نے جنوری ۱۹۹۴ء کے "کتاب نما" میں شانتی بابو کے متعلق وقیع معلومات بہم پہنچائی ہیں اور ان کا یہ مشورہ قابل لحاظ ہے کہ "بنگالی ادبا اور شعرا کے علاوہ ان بنگالیوں کی خدمات کو بھی تاریخ زبان و ادب میں جگہ دی جائے جنھوں نے اردو کو ذریعہ اظہار بنایا"

سوال یہ ہے کہ یہ کام کون کرے۔ ظاہر ہے کہ پہلی ذمہ داری مغربی بنگال اردو اکاڈمی پر عائد ہوتی ہے۔ شانتی بابو کی ذات سے قطع نظر اردو زبان پر بنگال کے احسانات ہیں۔ آزادی وطن کے بعد ہر طرف چھائی ہوئی تاریکی کے دور میں بھی بنگال نے اردو کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی، رواداری کی روایت جاری رکھی۔ اگر بنگال کے اردو والے شانتی بابو کے سلسلہ میں کوئی کام کرتے ہیں تو یہ ان کی طرف سے بنگال کو خراج کی ایک علامت سمجھا جا سکتا ہے اور اس کام کا حلقہ وسیع تر بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر بات جب اردو زبان و ادب کے حوالے سے کی جاتی ہے تو اس سلسلے میں مرکزی ادارے بھی ذمہ داریوں سے پہلو نہیں بچا سکتے۔ دیکھیے پہل کون کرتا ہے۔

شانتی بابو کے پانو اور پنجے بنگال کی اردو صحافت میں پیوست تھے لیکن کچھ تو ان کے مزاج کی بے نیازانہ سادگی اور کچھ اسٹیبلشمنٹ سے ان کی وابستگی نے فاصلے پیدا کر دیے تھے۔ کچھ ایمرجنسی کے زمانے کی کارفرمائیاں بھی تھیں۔ اردو اخباروں پر نظر رکھنے کے لیے حکومت کو شانتی بابو سے بہتر شخص نہیں مل سکتا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طور مرکزی اور ریاستی دونوں حکومتوں کے لیے کام کر رہے تھے۔ میں اس زمانے میں "آزاد ہند" کے اداریے لکھ رہا تھا (۱۹۷۶ء میں عصر جدید کی تنگ ظرفی کا مارا ہوا احمد سعید ملیح آبادی سے صاحب کی پکڑ میں آ گیا تھا یوں تو وہ بہت عرصہ سے مجھ پر کمندیں ڈال رہے تھے میں ہی کترا کر نکل جاتا تھا) ہماری ساری تحریریں سنسر کے لیے رائٹرس بلڈنگ بھیجی جاتی تھیں وہاں سے منظوری کی مہر لگ کر آ جانے کے بعد ہی اشاعت کے لیے دی جا سکتی تھیں وہاں سنسر کرنے کے لیے پورا عملہ رہا ہوگا جن میں شانتی بابو بھی شامل تھے۔ انھوں نے دو ایک بار ٹیلی فون کر کے بعض وضاحتیں بھی طلب کیں لیکن ان کا

...دیہ اور لہجہ نہایت سادگی اور انکساری کا ہوتا۔ انھوں نے کبھی کسی طرح کی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ان کی شرافت اور انسان دوستی کی مثال خود شہزاد منظر نے بیان کی ہے۔

ظاہر ہے شانتی بابو نے اپنی محنت اور لگن سے ادبی خدمات انجام دے کر مغربی بنگال کے اردو حلقوں کو زبان و ادب کے تئیں اپنے خلوص کا یقین دلا دیا۔ اب لازم ہے کہ کوئی ادارہ آگے بڑھے اور سب سے پہلے ان کی اہم تصنیفات کی نہ صرف اشاعت ثانی کرے بلکہ اس کی منفعت کو شانتی بابو کے وارثوں تک پہنچائے۔

شہزاد منظر نے (جنھیں ہم لوگ "تبسم" کہتے تھے) دو بنگالی ادیبوں کا ذکر کیا ہے۔ دوسری شخصیت بسنت کمار چٹرجی کی ہے وہ بھی شہزاد منظر کے "ہم مشرب" تھے لیکن ان دونوں کا ساتھ نہیں ہوا اس لیے انھوں نے چٹرجی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ نہ تو کافی ہے نہ درست۔ دراصل چٹرجی کی کلکتہ سے دہلی مراجعت کے بعد وہاں کے ادبی اور صحافتی افق پر شہزاد منظر اور شانتی رنجن بھٹاچاریہ دونوں نمودار ہوئے۔

بسنت کمار چٹرجی کلکتہ کے قریب واقع قصبہ سیرامپور کے رہنے والے تھے یہ وہی سیرامپور ہے جہاں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں سے بنگالیوں کی جوابی کارروائیوں کے نتیجہ میں انگریزی اور بنگلہ صحافت کے انکھوئے پھوٹے۔ چٹرجی کی وہیں پیدائش ہوئی لیکن ان کے والد ریلوے ملازم تھے اور ان کی پوسٹنگ جالندھر ہوگئی تھی اس لیے چٹرجی کا ابتدائی دور جالندھر میں گزرا چنانچہ وہ اپنی وضع قطع اور کھڑی بولی کے اعتبار سے بالکل پنجابی معلوم ہوتے تھے مگر ان کی گھریلو زبان بنگلہ تھی جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان کے چھوٹے سوتیلے بھائی جب ان سے ملاقات کے لیے کلکتہ آتے تو بنگلہ زبان میں ہی چٹرجی کی جھڑکیاں سن کر جاتے۔"

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں چٹرجی نے دہلی کے بعض اردو اخباروں میں کام کیا۔ آزادی کے بعد نہ معلوم کن حالات نے انھیں کلکتہ جانے پر مجبور کیا۔ ۱۹۵۱ء میں وہ عصر جدید کلکتہ میں نیوز اڈیٹر تھے ان کی اس حیثیت میں میں نے ان کے ساتھ دو برس کے قریب کام کیا۔ وہ کلکتہ کے ترقی پسند ادیبوں اور صحافیوں کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے اور ان کے اندر موجود بنگال کی فطری انقلاب پسندی پر پنجاب کی آب و ہوا نے اچھی سان رکھ دی تھی۔ کلکتہ سے ان کی دہلی مراجعت کا سبب بھی بیان کرنا چاہتا ہوں کہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اگست ۱۹۵۳ء میں جب شیخ عبداللہ کو کشمیر کی وزارت عظمیٰ سے معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا تو ایجنسیوں نے خبریں کچھ اس طرح دیں کہ وہ ملک و قوم کے غدار تھے اور اسی بنا پر ان کے خلاف کارروائی کی گئی۔ چٹرجی نے جو عصر جدید کے نیوز اڈیٹر تھے خبروں کے لب و لہجہ کے مطابق انھیں صفحہ اول پر لیڈ بنا کر شاہ سرخیاں لگا دیں جن میں شیر کشمیر کو "غدار قوم" کہا گیا تھا۔

عصر جدید کے مالک خان بہادر شیخ محمد جان صاحب مغربی بنگال کانگریس پارٹی کے

ن اور نامزد ایم ایل سی تھے۔ اپنے اخبار میں لوگوں کو رکھنا اور نکالنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔
س طرح بے آبرو ہونے والوں کی فہرست خاصی طویل ہے جس میں اس وقت کی اردو
صحافت کے کتنے ہی گہنائے ہوئے چاند اور ٹوٹے ہوئے تارے شامل ہیں۔ انہی حالات و
مشاہدات نے شین مظفر پوری کو "صحافت یا عصمت فروشی" لکھنے پر مجبور کیا ہوگا۔ خان
بہادر صاحب شیخ صاحب سے سیاسی قربت رکھتے تھے۔ ان کو اپنے اخبار میں لگی ہوئی سرخیاں
بہت ناگوار گزریں۔ یہ بات بالکل فطری تھی۔ جو کچھ ہوا وہ اچانک اور بالکل غیر متوقع تھا، اس
کا ردعمل اور انجام بھی نا معلوم تھا۔

اگلے دن شام کو جب حسب معمول خان بہادر صاحب کا دربار لگا تو چٹرجی طلب
کیے گئے اور خان بہادر صاحب نے جو بے حد برافروختہ تھے ان کو بہت سخت سست کہا،
لیکن چٹرجی کا ایک ہی جواب تھا کہ میں کیا کروں جیسی خبریں تھیں میں نے ویسے ہی سرخیاں لگا دیں۔
اس دن چٹرجی کو حکم ہوا کہ خاص خاص خبروں کی سرخیاں تجویز کر کے رات میں دس بجے تک
خان بہادر صاحب کے گھر پر، جو اس زمانے میں قریب ہی تھا، بھیج دیا کریں اس طرح وہ
خود خبروں کی ترجیحات اور سرخیوں کا فیصلہ کر سکیں گے۔

چند دنوں ایسا ہی ہوا لیکن ایک رات ڈیڑھ بجے کے قریب کچھ ایسی خبریں آگئیں کہ چٹرجی تذبذب
میں پڑ گئے اور انھوں نے دوبارہ سرخیاں تجویز کر کے خان بہادر صاحب کے ہاں بھیج دیں۔
ظاہر ہے ان کی نیند میں خلل پڑا ہوگا۔ انھوں نے اس حرکت کو چٹرجی کی شرارت پر محمول کیا اور اگلی
شام کو دربار میں چٹرجی طلب کیے گئے اور ان کی فوری برطرفی کا حکم صادر ہوا۔ ان کی جگہ مصطفےٰ
صابری صاحب کا قلمدان رکھا گیا (جو واقعی قلمدان تھا) ان کا نام عصر جدید کے اڈیٹر کے طور
پر چھپا کرتا تھا۔

دراصل خان بہادر صاحب نے چٹرجی کی برطرفی کا فیصلہ پہلے ہی دن کر لیا تھا لیکن
ایک تململاہٹ دونوں کے دل میں تھا وہ یہ کہ پریس کمیشن کی رپورٹ آنے والی تھی جس کی قانونی
کنہیات سے سب ناآشنا تھے لیکن مالکوں میں ایک طرح کی ہراسانی تھی اور کارکن صحافیوں
میں کسی قدر خوش امیدی۔ درمیانی چند دنوں کے دوران خان بہادر صاحب نے سیاسی
مشاورت کر لی ہوگی۔ پھر چٹرجی کو پروانۂ راہداری دے دیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک چٹرجی
رائٹرس بلڈنگ (مغربی بنگال سکریٹریٹ) کے چکر کاٹتے رہے لیکن بات کچھ بنی نہیں۔ بالآخر
وہ خاموشی سے دہلی روانہ ہو گئے۔

چٹرجی دہلی میں کوئی پندرہ بیس برس پرتاپ اخبار میں کام کرتے رہے۔ پھر سوویٹ
انفارمیشن سروس میں چلے گئے۔ ۷۰ء کے عشرہ کے اواخر میں وہاں نہ معلوم ان پر کیا گزری کہ
بیکار ہو گئے۔ انہی دنوں امریکن رپورٹر کے اردو اڈیشن کی اشاعت شروع ہوئی تو وہاں اردو
سکشن کے انچارج کول صاحب کی وساطت سے چٹرجی اس کے اڈیٹر ہو گئے۔ بدقسمتی سے
وہ پرچہ اپنی اشاعت کے دو سال بھی نہیں پورے کر سکا تو چٹرجی پھر بیکار ہو گئے لیکن

دوبارہ سوویٹ انفارمیشن سروس میں لے لیے گئے۔ چٹرجی کا مولانا عطاء الرحمٰن قدسی کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنا، ان کا عصر جدید سے پرتاپ تک دو انتہاؤں کے درمیان سفر اور سوویٹ اور امریکن انفارمیشن آفسوں کے درمیان ان کی آمد و رفت میرے لیے ہمیشہ باعث حیرت رہی۔ ۸۰ء کے عشرہ کے اوائل میں ان کا انتقال ہوا۔

کلکتہ میں قیام کے دوران چٹرجی صحافتی مضامین اور افسانے لکھا کرتے تھے۔ ڈیڑھ بجے رات تک ہم لوگ اخبار کا کام کرتے اس کے بعد میں گھر چلا جاتا اور چٹرجی اپنی ذاتی تحریروں میں لگ جاتے۔ صبح چار بجے تک بیڑی کی راکھ اور جلیبیوں اور ان کی ان گنت تعداد میں ماچس کی تیلیوں کا ڈھیر میز کے نیچے چھوڑ کر وہ اسی بلڈنگ کی بالائی منزل پر اپنے کمرے میں جا کر سو رہتے۔ پھر شام کو چار بجے تازہ دم ہو کر دھرمتلہ کی راہ پکڑتے۔

چٹرجی بہت تیز ترجمہ کرتے اور جتنی تیزی سے ان کا قلم چلتا اتنی ہی تیزی سے وہ بائیں ہاتھ سے اپنی زلفیں اینٹھتے اور سلجھاتے رہتے۔ ان کے ترجمہ کی ایک خوبی یہ تھی کہ انگریزی کے طویل اور پیچیدہ جملوں کو بھی جوں کا توں اردو میں منتقل کر دیا کرتے جبکہ ہم لوگ بالعموم ایسے جملوں کا ترجمہ کرتے ہوئے ان کو توڑ کر اردو کے کئی چھوٹے چھوٹے سیدھے جملوں میں تبدیل کر دیتے۔ دہلی میں ان کی دو ایک تصانیف شائع ہوئیں۔

چٹرجی کے متعلق ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مجاز صاحب انتقال سے پہلے آخری بار کلکتہ کے مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ جاڑے کا زمانہ تھا۔ مشاعرے کے بعد بھی کوئی ہفتہ عشرہ وہ کلکتہ میں گھومتے پھرے اور کسی طرح رخصت ہونے کو تیار نہ تھے۔ شیروانی بھی کہیں گروی رکھ چکے تھے۔ یہ صورت حال ان کے میزبانوں کے لیے بڑی پریشان کن تھی۔ ایک رات وہ عالم بیخودی میں بھاگتے ہوئے عصر جدید کے دفتر میں آ گئے۔ میں اور چٹرجی آخری کاپی کی تیاری میں مصروف تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ کچھ پلاؤ، ہم لوگوں کی کوشش تھی کہ انھیں کچھ دیر مصروف رکھیں تاکہ کام کو کچھ نپٹا کر باہر نکلیں چنانچہ ان سے غزلوں کی فرمائش کی گئی اور وہ بھی یہاں وہاں سے ایک ایک دو دو شعر سنا کر گلا چھڑاتے رہے۔

بالآخر ہم لوگ چائے کی آخری پیالی کے لیے اپنے روایتی وقت پر اٹھے۔ امجدیہ ہوٹل ۱۲ بجے بند ہو جاتا تھا ہم لوگ پانچ منٹ پہلے پہنچا کرتے تھے۔ اس رات مجاز صاحب بھی ساتھ تھے۔ چٹرجی نے بیرے سے تین چائے لانے کو کہا۔ بس مجاز صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور بگڑ کر بولے "تو مجھے چائے پلانے کے لیے یہاں لایا ہے"؟ چٹرجی نے کہا کہ یہاں تو صرف چائے ہی مل سکتی ہے۔ مجاز صاحب گویا ہوئے "سالے! میں سمجھ گیا تو چٹرجی نہیں مکرجی ہے"۔

●

مجتبیٰ حسین
نکور اپارٹمنٹس پلاٹ نمبر ۲
پٹ پڑ گنج۔ نئی دہلی

یوسف ناظم کے تخلیقی سفر کی نصف صدی

جب آپ یہ سطریں پڑھ رہے ہوں گے تو ادھر آپ کی زندگی میں نیا سال آچکا ہوگا جو ہر سال آتا ہے اور ادھر بمبئی میں بزرگ مزاح نگار یوسف ناظم کے تخلیقی سفر کی نصف صدی مکمل ہو رہی ہوگی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ پل دو پل کی بات نہیں یہ نصف صدی کا قصہ ہے۔ اگر یوسف ناظم کرکٹ کے کھلاڑی ہوتے اور کسی ٹسٹ میچ میں ان کی نصف سنچری مکمل ہوتی تو اسٹیڈیم میں موجود سارے تماشائی ایک ساتھ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے اور تالیوں کی گونج میں انھیں ان کے فن کی داد دیتے۔ لیکن ادب اور کرکٹ کے میدان میں داد دینے کے نہ صرف آداب مختلف ہیں بلکہ ان کے اصول بھی جداگانہ ہیں۔ ادب کے میدان سے ادیب کو آؤٹ کرنے کے لیے کسی بولر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اکثر ادیب تو اپنی وکٹیں خود گرا کر نہ صرف آؤٹ ہو جاتے ہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے "فیلڈ آؤٹ" تک ہو جاتے ہیں۔ پچاس برس تک لگاتار اور مسلسل لکھنا کرکٹ کا کھیل نہیں ہے کہ آدھے دن میں نصف سنچری بنائی اور "مین آف دی میچ" قرار پاکر داد وصول کر لی۔ پھر یوسف ناظم کا کمال یہ ہے کہ ان کا تخلیقی سفر ایک رخا نہیں ہے بلکہ یہ وہ چو مکھا سفر ہے جس میں ادیب راستے بدل بدل کر اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ کبھی شمال میں جا رہا ہے تو کبھی جنوب میں، کبھی مغرب کی طرف گامزن ہے تو کبھی مشرق میں بڑھ رہا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ کبھی شعر کہہ رہا ہے تو کبھی ترجمے کر رہا ہے، کبھی تنقید لکھ رہا ہے تو کبھی مزاح لکھ رہا ہے۔ کبھی بچوں کے لیے لکھ رہا ہے تو کبھی بچوں کے والدین کے لیے لکھ رہا ہے۔ (بلکہ بچوں کی ماؤں کے لیے بھی کبھی کبھی الگ سے لکھ دیتا ہے)۔ ایسے چو مکھے تخلیقی سفر کے لیے صرف قلم اور کاغذ ہی کافی نہیں ہوتے بلکہ اس کے لیے ادیب کے پاس ایک اچھا، مقوی اور پائدار کلیجہ بھی ہونا چاہیے۔ (خدا کے فضل سے یوسف ناظم کے پاس یہ کلیجہ موجود ہے)۔

یوسف ناظم جامعہ عثمانیہ کے اولین مزاح نگار ہیں جیسے مخدوم محی الدین اور سکندر علی وجد جامعہ عثمانیہ کے اولین شعرا رہے ہیں۔ میں انھیں کبھی نہایت سنجیدگی کے ساتھ دکن کا "بابائے مزاح نگاری" کہتا ہوں تو ناراض سے ہو جاتے ہیں۔ ویسے ان کی ناراضگی بے سبب بھی نہیں ہے کیونکہ وہ بابائے قوم مہاتما گاندھی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کا حشر خود اپنی چشم پاکباز سے دیکھ چکے ہیں (چشم گنہگار ان کے پاس نہیں ہے۔ یہ تو ہم جیسے پاکبازوں کے حصہ میں آتی ہے) ملاوہ بھی

بابائے مزاح نگاری کے لقب سے بزرگی جھلکتی ہے اور یوسف ناظم ۷۴ برس کے ہو جانے کے باوجود بزرگی کی تہمت اپنے سر لینے کو تیار نہیں ہیں (یہی وجہ ہے کہ وہ ابھی حال حال تک اپنے بالوں کو خضاب سے رنگتے رہے ہیں)۔ وہ اب بھی نہ صرف نوجوانوں کی سی زندگی جیتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو حرکتیں بھی نوجوانوں کی سی کرتے ہیں۔ ۷۴ برس کی عمر میں جو دہ برس کی عمر والا قہقہہ لگاتے ہوئے میں نے یوسف ناظم کو ہی دیکھا۔ اپنی باتوں پر مجھے کبھی ہنسی نہیں آتی۔ یوسف ناظم اپنی ہی باتوں پر بے ساختہ ہنسنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی چست فقرہ ان کی نوک زبان پر ہوتا ہے اور فقرہ بھی ایسا جس سے پہلے ہی ان کی اپنی دل آزاری ہوتی ہو تو ہو لیکن دوسرے کی دل آزاری نہ ہو پائے۔ وہ فقروں کے وزیر اعلا نہیں بلکہ وزیر اعظم ہیں۔ ان کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے ذہین اور دلچسپ فقروں کی مدد سے اپنے مضمون کا محل تعمیر کر دیتے ہیں۔ ان کا مضمون جب بھی پڑھتا ہوں تو مجھے بیا کے گھونسلے کا خیال آ جاتا ہے۔ جس طرح بیا ادھر ادھر کے چھوٹے بڑے تنکے جمع کر کے ایک مضبوط گھونسلہ تعمیر کر دیتی ہے اسی طرح یہ اپنے مضمون کا تانا بانا بنتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بیا اپنے گھونسلے میں تنکوں سے ہٹ کر بریکٹوں کا استعمال نہیں کرتی۔ (کیونکہ بچاری بیا بریکٹوں کا استعمال جانتی ہی نہیں) جبکہ یوسف ناظم اپنے مضمون میں بریکٹوں کا استعمال خوب کرتے ہیں۔ وہ اپنی تحریریں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بے تکان بریکٹ لگاتے چلے جاتے ہیں (ان کے مضامین میں بریکٹوں کی آمد ہوتی ہے آورد نہیں) اردو کے سارے ادیبوں نے مل کر اپنی تحریروں میں اتنے بریکٹ نہیں لگائے ہوں گے جتنے اکیلے یوسف ناظم نے اپنی تحریروں میں لگائے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے ہاں زیادہ تر افسانے ڈیشس (DASHES) کی مدد سے لکھے جاتے تھے۔ رومانی افسانوں کا دور آ گیا تھا لیکن اخلاقی اقدار ابھی باقی تھیں۔ لہذا افسانہ کے کسی خاص موڑ پر افسانہ نگار جب ڈیش لگاتا تھا تو رومان کے نازک ترین اسرار و رموز خود بخود ہویدا ہو جاتے تھے۔ ہیرو اسی ڈیش کی آڑ میں ہیروئن سے بغلگیر ہوتا تھا اور اسی ڈیش میں وہ وصل کی لذتوں سے ہمکنار ہوتا تھا۔ سماج نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ کھلے بندوں یہ پوچھ بیٹھتا کہ "چولی کے پیچھے کیا ہے؟" غرض اس زمانہ میں لفظوں میں اتنی ترسیل نہیں ہوتی تھی جتنی کہ ڈیشوں میں ہوتی تھی۔ افسانہ سو صفحوں کا ہوتا تھا تو اس میں لگ بھگ پچاس صفحوں کے ڈیش استعمال ہوتے تھے۔ ڈیشوں کی ایسی فضول خرچی کبھی نہیں دیکھی۔ جب کاغذ کے دام بڑھنے لگے تو افسانوں کی رومانی فضا خود بخود کم ہوتی چلی گئی اور آج ڈیش ہمارے ادب سے تقریباً غائب ہو چکے ہیں۔ (سماج کی آنکھ کا پانی جو مر چکا ہے) اس خلا کو پُر کرنے کے لیے یوسف ناظم نے بریکٹوں کو زحمت دی۔ وہ بریکٹوں کے پہلے ہی موجد نہ ہوں لیکن ان کے استعمال پر انھیں جو قدرت حاصل ہے وہ کسی کے حصّہ میں نہ آئی۔ (میں نے اپنی تحریر میں جب بھی بریکٹ لگانے کی کوشش کی میری تحریر بریکٹ سے باہر نکل آئی)

یوسف ناظم کو میں مزاح نگاروں کا فیض احمد فیض کہتا ہوں۔ اس لیے کہ فیض احمد فیض جس بے دلی اور بے لطفی سے اپنا کلام سناتے تھے کم و بیش اتنی ہی بے دلی سے یوسف ناظم

بنے اچھے بھلے مزاحیہ مضامین کو سناتے ہیں۔ لگتا ہے مضمون نہ سنا رہے ہوں کسی سرکاری فرض
ے عہدہ برآ ہو رہے ہوں۔ سانس لیے بغیر، ادھر ادھر دیکھے بنا، سامعین سے بے پروا،
ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا کیے بغیر جب وہ اپنا مضمون سنانا شروع کرتے ہیں تو سامعین سے
یں زیادہ ان کی اپنی خواہش یہ ہوتی ہے کہ مضمون جلد از جلد ختم ہو اور جان چھوٹے (جان
سامعین کی نہیں خود یوسف ناظم کی)۔ نتیجہ میں ہم جیسے گلے باز مزاح نگار جو "ترنم" سے مزاحیہ
مضامین سناتے ہیں بے پناہ داد وصول کرکے یوں مطمئن ہو جاتے ہیں جیسے ادب میں اپنا ایک
لگ مقام بنا لیا ہو۔ میرے دوست اور دکنی زبان کے ممتاز اور معتبر شاعر حمایت اللہ بیان کرتے
یں کہ سلیمان اریب کی وفات پر بمبئی میں جو تعزیتی جلسہ منعقد ہوا تھا حمایت اللہ بھی اس جلسہ
یں موجود تھے۔ جلسہ کی تعزیتی فضا کو مزید تعزیتی بنانے کے لیے منتظمین نے مائکروفون کا
وئی انتظام نہیں کیا تھا۔ چنانچہ یوسف ناظم نے جیسے تیسے اپنی "ننگی آواز" میں (جیسے ننگی
آنکھ یا NAKED EYE ہوتی ہے) اپنا مضمون سنایا تھا۔ میں نے جب اس مضمون کے بارے
میں حمایت اللہ کی رائے پوچھی تو بڑی معصومیت کے ساتھ جواب دیا "مضمون کچھ اچھا ہی تھا
اور غالباً ہمارے اریب صاحب کے بارے میں ہی تھا کیونکہ اس مضمون میں دو ہی لفظ ایسے
تھے جنھیں میں بار بار سن پا رہا تھا اور وہ بھی اس لیے سن پا رہا تھا کہ میرے کان ان دو لفظوں
سے مانوس تھے" میں نے پوچھا "وہ دو لفظ کونسے تھے؟"

بولے "ایک لفظ تو "سلیمان" تھا اور دوسرا "اریب" تھا" بہت دنوں بعد میں نے
جب ان کی "مضمون سرائی" کے بارے میں حمایت اللہ کی رائے سے انھیں واقف کرایا تو نہ
صرف محظوظ ہوئے بلکہ سلیمان اریب کے بارے میں خود اپنا مضمون بیسیوں بار حمایت اللہ
کی زبانی سن چکے ہیں (مضمون کی خوبی ملاحظہ ہو کہ جب اسے حمایت اللہ بھی سناتے ہیں تو ہم
جیسوں کو بھی دو لفظ ہی سنائی دیتے ہیں۔)

یوسف ناظم ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں بھرپور زندگی جینے کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ جامعہ
عثمانیہ کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو مخدوم، میر حسن، خنکر جی، ظفر الحسن، اشفاق حسین
اور سکندر علی وجد کے فوراً بعد نمودار ہوئی تھی۔ ان کے اپنے ہم عمروں میں عابد علی خاں، خواجہ
حمید الدین شاہد، ہاشم علی اختر، محبوب حسین جگر، میکش، لطیف ساجد وغیرہ رہے ہیں۔ لیکن
یوسف ناظم نے اپنے ہم عمروں کے سہارے ہی زندہ رہنے کو کافی نہیں سمجھا۔ جامعہ عثمانیہ
نے بعد میں اردو کی جتنی نسلیں پیدا کیں ان سے انھوں نے نہایت دوستانہ مراسم قائم کیے۔
جن لوگوں نے عزیز قیسی، وحید اختر، شاذ تمکنت، قاضی سلیم اور انور معظم وغیرہ سے (جو ان
سے بہت جونیئر رہے ہیں) یوسف ناظم کی بے تکلفی دیکھی ہے وہ اوّل الذکر اصحاب کو یوسف ناظم
کا ہم مکتب سمجھتے ہیں۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ حد ہو گئی کہ بعض لوگ تو انھیں اب
مزاح نگار دولت رام کا بھی ہم مکتب سمجھنے لگے ہیں (اس بہانے دولت رام کو بھی مکتب میں
جانے کی سعادت حاصل ہو گئی ہے) یوسف ناظم اصل میں جامعہ عثمانیہ کے فرزند ہی نہیں

ہیں بلکہ جامعہ عثمانیہ کا ایک تسلسل بھی ہیں۔ حیدرآبادی تہذیب کی بقا کی علامت ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۶ء میں جب میرے ذہن میں اردو کے طنز و مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس منعقد کرنے کا خیال آیا تھا اور میں نے زندہ دلان حیدرآباد سے اس ضمن میں تعاون مانگا تھا تو اس کانفرنس کے انعقاد میں یوسف ناظم نے بمبئی میں بیٹھ کر سب سے زیادہ مدد کی تھی یہ وہی تاریخی کانفرنس تھی جس کا افتتاح مخدوم محی الدین نے اور جس کی صدارت کرشن چندر نے کی تھی۔

یوسف ناظم نے آج سے پچاس برس پہلے غالباً شاعری سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاعری تو انھوں نے صرف "ضرورت شعری" کے تحت کی تھی، مگر اس لمبے تخلیقی سفر کے بعد اب یوسف ناظم کی سب سے بڑی اور اکیلی پہچان ایک منفرد مزاح نگار کی ہے۔ مزاح نگار کی حیثیت سے پہچانے جانے میں کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔ اردو کے اچھوتے شاعر اور بے مثال مزاح نگار ابن انشا کا جب انتقال ہوا تھا تو خلیل الرحمن اعظمی نے ان کی یاد میں ایک مضمون لکھتے ہوئے ایک جملہ اس طرح کا بھی لکھا تھا "افسوس کہ اردو کے ایک منفرد شاعر کو پاکستان کے اہل ادب نے اسے ایک مزاح نگار کی حیثیت سے رخصت کیا"۔ خلیل الرحمن اعظمی مرحوم کے اس جملہ پر میں نے ان سے خاصی بحث کی تھی اور بعد میں وہ ابن انشا کی مزاح نگار والی شناخت سے مطمئن ہو گئے تھے۔ ایک بار یوسف ناظم سے کسی نے کہا تھا "مزاح نگاری دوسرے درجہ کا ادب ہے"۔ اس پر یوسف ناظم نے کہا تھا "اس لیے کہ اردو میں پہلے درجہ کا ادب لکھا ہی نہیں جاتا"۔

یوسف ناظم ہمارے کلاسیکی ادب کی بہترین روایات کے امین ہیں اور اگر مزاح نگاری دوسرے درجہ کا ادب ہے تو یوسف ناظم بلاشبہ اس دوسرے درجہ کے ادب کے پہلے درجہ کے ادیب ہیں۔ میں یوسف ناظم کو ان کے تخلیقی سفر کے پچاس سال مکمل ہونے پر سلام کرتا ہوں (مجھے یقین ہے کہ اس کے جواب میں وہ مجھے وعلیکم السلام ضرور لکھ بھیجیں گے) آخر میں ایک بریکٹ اور برداشت کرلیں (یوسف ناظم پر کالم لکھنے کا ہی یہ فیضان ہے کہ اس کالم میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بریکٹ راہ پا گئے ہیں۔ ذرا گن کر تو بتایئے)۔

یوسف ناظم

مجتبیٰ حسین کو وعلیکم السلام

جی بھر کر اپنی تعریف سن لی جائے تو کم خوابی کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف مجھ پر ۲ جنوری ۹۴ء کو ہوا۔ یہ میری ادبی زندگی کی پچاس فل اسکیپ صفحوں پر مشتمل کتاب کی رونمائی کا موقع تھا اور جب اپنی تعریف سننے کا بھوکا پیاسا شخص سامنے بیٹھا ہو تو لوگ کچھ زیادہ ہی دریا دل ہو جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر قدح خوار کا ظرف نہیں دیکھا جاتا اور اس دن بھی وہی ہوا۔ کرم فرماؤں نے دریا دلی کا نہیں بحرہ عرب دلی کا

بوٹ دیا اور بے تکلف دوستوں نے ایک سے ایک بہتر سہرا پڑھا۔ (معلوم نہیں کس استاد شاعر سے لکھوا کر لائے تھے لیکن نہیں یہ تو نثر میں تھے) میں سچ کہنے کا عادی نہیں ہوں ورنہ کہتا میں اس تلطف کا مستحق نہیں تھا۔ سچ کہنے کی توفیق بھی تا نہ بخشد خدائے بخشندہ والی بات ہے اور ہم جیسے لوگ اسی امید میں جیتے رہتے ہیں کہ کبھی تو سچ بولنے کی توفیق ہوگی لیکن یہ توفیق بھی شاید وصال یار کی طرح کی کوئی غیر شرعی نعمت ہے۔ لڈو کھانے اور دل میں لڈو پھوٹنے کے فرق کا احساس بھی مجھے اسی دن ہوا۔ رہی سہی کسر مجتبیٰ حسین نے پوری کردی۔ مجتبیٰ کو تو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ جس دن میری تعریف میں ان کا غلو در آغوش مضمون چھپا اسی دن دوپہر میں مجھے حیدرآباد سے فون پر اس کی اطلاع مع مبارکباد موصول ہوئی تھی۔ ہوائی باتیں ایسی ہی زود سفر ہوتی ہیں۔ میں جھوم گیا بلکہ گھوم گیا۔ مجتبیٰ یقیناً دل میں خوش ہوں گے کہ یہ مضمون لکھ کر انھوں نے بمبئی آنے کی وعدہ شکنی کی تلافی کردی۔ کاش میں اتنا کشادہ دل ہوتا کہ ان کی خوش فہمی کے جواب میں کم سے کم ہونہہ ہاں ہی کر سکتا لیکن بہرحال مجتبیٰ کے اس مضمون سے اہل حیدرآباد کو خوش ہونا چاہیے کہ اتنا عرصہ دلی میں رہنے کے باوجود مجتبیٰ کی قطب شاہی بے جگری اور ہم جلیسانہ شگفتگی متاثر نہیں ہوئی۔ مجھے ان کے مضمون کے ہر لفظ میں حیدرآباد کی مٹی کی مہک محسوس ہوئی۔ الفاظ کو چکھنے کا کوئی طریقہ ہے نہیں ورنہ میں انھیں چکھ بھی لیتا۔ یہ رکھ رکھاؤ ظرافت نگاری کی دین ہے۔ اچھا ہوا مجتبیٰ نے افسانہ نگاری سے اپنا دامن ملوث نہیں کیا۔ مجھے یاد ہے۔ مجھے انھوں نے اپنا ایک افسانہ سنایا تھا (ظاہر ہے خود ہی لکھا ہوگا) یہ کوئی ۳۰، ۳۵ سال پہلے کی بات ہے۔ افسانہ سنانے کے بعد انھوں نے میری صورت دیکھ کر اندازہ لگالیا تھا کہ ان کی اس حرکت سے مجھے کتنا دکھ پہنچا تھا۔ افسانہ نگاروں کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا اور ان سے میل جول رکھنا بری بات نہیں ہے بلکہ بعض افسانہ نگار تو ایسے لاکھا ہیں جن سے ملنا ہی چاہیے لیکن ان کی صحبت کا اتنا اثر قبول کرنا کہ اچھا خاصا آدمی خود افسانہ لکھنے لگے سوائے بزدلی کے اور کیا ہو سکتا ہے ہاں افسانہ نگار اگر ظرافت نگار بننا پسند کرتے ہیں تو اسے آمدنت باعث آبادی ما۔ (رشید قریشی مرحوم نے یہی کیا تھا۔ دوسروں کو خوش کیا اور خود بھی اچھے رہے)۔ قلم کا صحیح استعمال کیا ہے مجتبیٰ جانتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ صرف ظرافت نگاری ہی ایک جنس عفیفہ رہ گئی ہے ورنہ تنقید نگاری میں اب تنقید کا ہونا ضروری نہیں ہے افسانے سے کہانی نکل گئی غزل آزاد ہوگئی اور نظم لڑکھڑانے لگی۔ ایک بات البتہ خوش آیند ہے کہ تنقید نگاروں کے ہاں کافی مزاح در آیا ہے اور ہمارے ادب میں اگر کبھی ظرافت کی کمی محسوس ہوئی تو تنقید اس کا بدل ثابت ہوگی۔ خوشی کی بات ہے کہ مزاح نگاروں نے اپنا کوئی نقاد پیدا نہیں کیا ورنہ مجتبیٰ جانتے ہیں کہ ہر تحریک نے اپنا ایک شیئر ہولڈر نقاد ضرور پیدا کیا ہے۔ ادب کو اسٹاک ایکسچینج بنانے میں نقادوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

مجتبیٰ نے اپنے مضمون میں میرے بریکٹوں کا بہت ذکر کیا ہے میرے نزدیک تو بین بھی حروف تہجی ہیں ان کے ساتھ بس مشکل یہ رہی کہ ان کا تلفظ نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنے

مضمون میں کافی بریکٹ استعمال کیے ہیں اور فرمائش کی ہے کہ کوئی انھیں گن کر بتائے کہ یہ تعداد میں کتنے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر وہ خود بھی گنیں تو حسابی غلطی ضرور کریں گے۔ ایک قوس دو علامتوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی یہ علامتیں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ہوتی ہیں یہیں نظر چوک جاتی ہے۔ یوں بھی قوس گننے کی نہیں، دیکھنے، برتنے اور سمجھنے کی چیز ہوتے ہیں میں خود کو بھی قوسین میں بند ایک جملہ سمجھتا ہوں۔ ویسے مجتبیٰ حسین کو قوسین کا محتاج ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی ضرورت تو انھیں پیش آتی ہے جن کی تحریر میں قوس و قزح نہ ہو۔

مجتبیٰ حسین نے مجھے دکن کا بابائے مزاح نگاری کہا ہے۔ اچھا کیا۔ بابا ہمارے یہاں بچوں کو بھی کہا جاتا ہے کیا میں ان سے پوچھ سکتا ہوں کہ انھوں نے مزاح نگاری کی بے بی کسے کہا ہے (میں نے صرف پوچھا ہے پتا نہیں مانگا ہے) مجتبیٰ نے رو میں کئی قیمتی جملے مجھ پر صرف کر دیے۔ میں انھیں اتنا فضول خرچ نہیں سمجھتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کا ذکر کر کے تو اس شخص نے مجھے واقعی آبدیدہ کر دیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ دولت رام کا ذکر بھی انھوں نے فوراً ہی کر دیا ورنہ میں کافی دیر تک افسردہ رہتا۔

اپنائیت اور غیریت میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ اپنائیت کی ڈور ہلکی سی ضرب سے ٹوٹ جاتی ہے اگر ٹوٹتی نہیں تو لچک ضرور باقی ہے۔ مجتبیٰ کے پیار بھرے تخاطب میں ان کے اس جملے نے کہ "میں یوسف ناظم کو ان کے تخلیقی سفر کے ۵۰ سال مکمل ہونے پر سلام کرتا ہوں" مجھے خفیف کر دیا (یہ ڈبل کا میٹھا وہ کہاں سے لے آئے) وعلیکم السلام تو مجھے کہنا ہی ہے کیوں کہ یہاں معاملہ شرعی ہو گیا ہے لیکن یہ ضرورت شعری بھی ہے دراصل میں مجھے ان سے یہ کہنا ہے کہ ادیب کو ادیب ہی رہنا چاہیے مودب نہیں بننا چاہیے۔ وہ اقبال کے مصرع سے دھوکا کھا۔گئے کہ ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں' یہ مصرع انھوں نے اہل ہوس' کے لیے کہا ہے اہل خرد کے لیے نہیں۔ مجتبیٰ حسین خود فرحت اللہ بیگ ہوں تو ہوں کم سے کم میں ڈپٹی نذیر احمد نہیں ہوں۔ اور اگر وہ مجھے سلام کرنا ہی چاہتے ہیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ مجھے مزید مواقع فراہم کرنے میں تامل نہ ہوگا۔ میرا یہ وعدہ 'سیاسی' ہے اس لیے انھیں بذریعہ "سیاست" پہنچایا جا رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ جگر سوختہ ان کا محبوب ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود
شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

سرونج کی کلاسیکی شاعری کے عناصر اربعہ

ناطق، دانش، راھی، میر
(دستیاب کلام کی روشنی میں)

سہانی اور خوش گوار راتوں کی سرزمین مالوہ میں بھوپال سے تقریباً سو کلو میٹر شمال کی جانب ایک چھوٹی سی بستی سرونج، آباد ہے جو آزادی سے قبل ریاست ٹونک کا حصہ تھی۔ تہذیبی اعتبار سے یہ بستی گوناگوں صفات کی حامل ہے۔ اس کی سیاہ چکنی مٹی، گھنے جنگلات چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور دامنِ کوہ میں دور تک بکھرے ہوئے شیریں کنووں کا شفاف اور ہاضم پانی عرصۂ دراز تک مقامی آبادی کی صحت اور خوش خوراکی کا تحفظ کرتے رہے ہیں۔ ریاست ٹونک کے نیک دل حکمران مذہبی ذہن رکھتے تھے اور اعمال وعقائد میں سید احمد شہید کے وسیلے سے خانوادۂ ولی اللّٰہی سے منسلک ہو گئے تھے، نتیجتاً رعایا پر بھی اس کا راست اثر پڑا اور ریاست کے حنفی المسلک باشندے اسی راہ پر گامزن ہوئے، چنانچہ سرونج کے مدرسہ ریاض المدارس کا فارغ التحصیل طالب علم سیدھا دیوبند جاتا تھا۔ مذہب پسند ہونے کے ساتھ ساتھ اہل سرونج ادب پسند بھی تھے، خصوصاً شاعری سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ آج بھی بڑی حد تک یہی صورت حال ہے، یہاں کی پُر کیف، رومان پرور فضا نے ان کی وہ ذہنی اور وجدانی تربیت کی ہے کہ کم تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ، صحیح شعر کی تحسین کرتا ہے۔ سرونج کے شاعروں اور شعر پسندوں کا مزاج اردو زبان کے ان کلاسیکی شعرا کے مزاج سے مماثلت اور مطابقت رکھتا ہے جن کی ذہنی تربیت مشرقی ادبیات (عربی وفارسی) کے سایے میں ہوئی تھی۔ اہل سرونج کے مزاج میں استغنا اور خود داری کی جو جھلک نمایاں ہے وہ بھی اسی تربیت کی مرہونِ منت ہے۔ اہل سرونج سے رسم و رواہ رکھنے والا کوئی بھی شخص جب ذہنی تحفظات سے باہر نکل کر دیکھے گا تو یہ بات محسوس کیے بغیر نہیں رہے گا کہ سرونج کی مزاج میں خود داری، سادگی، تواضع، خلوص اور استغنا کا حسین امتزاج ہے۔ تکلیف ہو یا مسرت غصّہ ہو یا محبت اہل سرونج کے چہرے سے ہر جذبہ فوراً عیاں ہو جاتا ہے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو اپنے جذبات چھپانے پر قادر ہوں، یہ سرونج والوں کی صفائی قلب کی دلیل ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ سرونج والے زود رنج اور غیر ضروری حد تک حسّاس ہونے کے ساتھ چند صفات عالیہ کو بروئے کار لانے میں بسا اوقات غلو کر جاتے ہیں، اس کے نتیجے میں خود پسندی

کو خود داری، لاپرواہی کو سادگی اور تساہل و آرام طلبی کو استغنا سمجھنے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ اہل سرونج کی خوش اخلاقی اور خوش مزاجی میں بہر حال کوئی کلام نہیں، ان صفات میں سرونج اپنا ثانی نہیں رکھتا، شوخی اور ظرافت تو گویا اس کا خمیر ہیں، اس خاص معاملے میں ساری بستی مستثنیات سے بھی مستثنیٰ ہے۔ حالی نے غالب کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے کلام میں شوخی اس طرح بھری ہے جس طرح ستار کے تاروں میں سُر ہوتے ہیں۔ سرونج میں آپ کسی عمر کے شخص سے ملاقات کیجیے خواہ سفید ریش ہی کیوں نہ ہو، شوخی اور ظرافت کے میدان میں آپ کو غالب نظر آئے گا۔

سرونج کے اس کھلے ڈلے ماحول کو ذہن میں رکھیے اور ہندستانی شاعری کے اس منظر نامے کو یاد کیجیے جب اردو زبان کی دکنی آمیز غزل دہلی میں ریختہ اور پھر رشکِ فارسی بنتی ہوئی لکھنؤ پہنچتی ہے اور وہاں سے شوخ و شنگ ہو کر حالی کے طعنوں اور سرزنش کے باوجود اپنے آپ کو امیر و داغ کے حوالے کر دیتی ہے۔ لکھنؤ میں اگرچہ ناسخ نے اس کی زبان کو کافی صاف ستھرا کر دیا تھا مگر مزاج ابتدا سے ہوائی پایا تھا، انشا اور جرأت و رنگین کی صحبتوں نے چنچل، طرار اور دیدہ دلیر کر دیا تھا چنانچہ داغ و امیر کے بعد داغ و امیر کے شاگرد لے اڑے اور اپنے اساتذہ کی آواز بازگشت بن کر خوب چہکے یہاں تک چاروں جانب ان کی آواز میں آواز ملانے کی کوششوں کو شاعری کی معراج خیال کیا جانے لگا، ریاست ٹونک بھی انھیں آوازوں کے حصار میں آگئی مگر اسی عہد سے ملے ہوئے عہد میں کچھ ایسی آوازیں بھی سنائی دیں جو امیر و داغ کی آوازوں سے قدرے مختلف تھیں اور ان آوازوں میں اپنی الگ شناخت قائم کرنے کا حوصلہ جھلک رہا تھا، حسرت، اصغر، جگر، جوش، فانی، اختر شیرانی، فیض اور فراق وغیرہ انھیں مختلف آوازوں اور منفرد لہجوں کے نام ہیں۔ اسی دور میں وہ آواز بھی سنائی دی جس کے تیور آسمانی آواز کے سے تھے، یہ اقبال کی آواز تھی۔

سرونج کے چاروں شاعر ناطق، دانش، راہی، نیر اپنے عنفوانِ شباب میں یہ ساری آوازیں متواتر سن رہے تھے اور اپنے اپنے ذوق و مزاج کے مطابق ان کا اثر بھی قبول کر رہے تھے۔ سرونج کی کلاسیکی شاعری کے یہ چاروں ستون اپنی اپنی جگہ مضبوط و مستحکم ہیں۔ ان کے رنگ و روغن کا فرق ان کے اندازِ فکر اور شیوۂ گفتار کے فرق کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے۔ ان چاروں کو امتیاز کی آسانی کے لیے اگر ہم چار آوازیں تسلیم کر لیں اور پھر غور سے سنیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سب سے زیادہ بھرپور اور پُراثر آواز عرفان محمد خاں ناطق مالوی کی ہے، بلاشبہ ناطق مالوی سرونج کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

ناطق مالوی کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ تقریباً اٹھارہ برس پہلے ناطق مالوی کے فن پر ایک مضمون سپردِ قلم کیا تھا جو انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے ہفت روزہ 'ہماری زبان' میں یکم جولائی ۱۹۶۶ء کو شائع ہوا تھا۔ میں نے وہ مضمون تلاش کیا اور پڑھا تو یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ وہ ایک اچھا مضمون تھا مگر ناطق مالوی کا کلام اس سے زیادہ کا

متقاضی ہے۔ ناطق خوددار انسان اور فطری شاعر ہیں، ان کے فن کا معیار بلند اور لہجہ اعتماد سے عبارت ہے۔ ان کے کلام میں خیال اور الفاظ کا توازن اور حسین امتزاج ہے جو شعر میں ترنم بھی پیدا کرتا ہے اور تاثیر بھی۔ غم ان کی زندگی کا حقیقی سرمایہ ہے جس کی تلخی ان کی فکر میں شامل ہے لیکن یہ تلخی ان کی فطری صلح پسندی پر غالب نہیں آتی اور نہ ان کے حوصلے کو پست کرتی۔ ان کی فطر اس تلخی کی ہمیشہ تہذیب کرتی رہتی ہے۔ تجرباتی زندگی کے تلخ حقائق کو ناطق نے طنز کے لطیف اور مہذب پیرائے میں بیان کیا ہے۔

ہمارا حال بڑے مسکرا کے پوچھتے ہیں　　کرم نوازیٔ احباب کا جواب کہاں
دردِ دل ہے آج کچھ ٹھہرا ہوا　　چارہ سازِ بے کساں یہ کیا ہوا
آنکھ میں دو آنسو بھی نہ تھے　　روتا کیا چھلکاتا کیا

ناطق مالوی کو فنِ شعر پر اس درجہ عبور حاصل ہے کہ مشکل سے مشکل زمین میں روانی اور صفائی کو زک پہنچائے بغیر گہری بات کہ گزرتے ہیں ان کے اشعار سہل ممتنع کی نادر مثالیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑی بڑی باتیں کہنا ان کا دوسرا کمال ہے۔ غیوّر شرفا کی طرح ناطق نے اپنی ساری زندگی خصوصاً زندگی کا آخری حصّہ عسرت اور تنگ دستی میں بسر کیا مگر کسی کے آگے دستِ طلب نہ پھیلایا، اپنے سوزِ دروں کا اظہار ضرور کیا مگر سوزِ دروں کی قربان گاہ پر عزتِ نفس کو چڑھانا گوارا نہ ہوا۔ فن کے اظہار میں شوخی اور طنز ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ چھوٹی بحروں میں یہ جوہر اور زیادہ کھلتے ہیں، ہلکی ہلکی چٹکیوں کے ساتھ شوخی و شگفتگی اور سوز و گداز میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اس فنی سلیقے کے ساتھ کہ روانی اور برجستگی میں چنداں فرق نہیں آتا۔ ذرا یہ اشعار دیکھیے۔

تم سے آنکھ چرانا کیا　　تم جیسا ہو جانا کیا
دردِ دل ہے آج کچھ ٹھہرا ہوا　　چارہ سازِ بے کساں یہ کیا ہوا
شامِ غم تکمیلِ غم فرما گئی　　وہ نہ آئے اور ہمیں نیند آگئی
اس توقع پر تو ہم برسوں جئیں گے چارہ گر　　جان لیوا ہے تو کیا ہے، ہے تو آثارِ وفا
اک سیلِ اضطراب ہے پہلو میں موجزن　　دل ہو تو کوئی دل کو رکھے اختیار میں

اور ذرا اس شعر کے تیور بھی ملاحظہ کیجیے۔

غیر پابندیٔ آئینِ وفا کیا کرتا　　میری تقلید کوئی میرے سوا کیا کرتا

اس بلند آہنگ مطلع میں دعوائے عشق، رقیب کو چیلنج، میدانِ عشق میں مبارز طلبی اور ہر مقابل کو ہزیمت دینے کے بعد شکست خوردہ حریف کے لیے "کیا کرتا"، اپنی مثال آپ ہے۔ ردیف پر جتنا غور کیجیے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں لہجہ بدل کر پڑھیے، استفہامیہ، خطابیہ، ندائیہ اور پھر دیکھیے معنی کی کیسی دنیا آباد ہے غیر (رقیب) کی بے چارگی، تحقیر اور تمسخر کے ساتھ اپنی شان و عظمت کا سارا ساز و سامان اس شعر میں موجود ہے۔ اسی غزل کے مقطع میں ایک خوددار انسان کی بے چارگی کو ناطق نے نہایت موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

منتِ غیر نہ تھا شیوۂ ناطق لیکن   ناموافق تھی زمانے کی ہوا کیا کرتا

اچھے شاعر کی پہچان یہ ہے کہ اس میں خیال کی بلندی، مشاہدے کی گہرائی، نظر کی وسعت، تجربے کی کثرت اور اظہار کی صداقت، تمام شعری خصائص، فن کی سرپرستی میں پروان چڑھتے ہیں۔ ناطق میں بھی یہ ساری خوبیاں بڑی حد تک موجود تھیں انھوں نے قدیم موضوعات اور قدیم الفاظ و تراکیب کو اپنے مخصوص انداز میں برتا ہے اور نئی معنویت پیدا کی ہے۔

چارہ گر سنتا ہے دل کی دھڑکنیں کیوں بار بار   دل ہی دل میں بھی نہ لے کوئی کسی کا نام کیا
پا کے مزاج یار کچھ اپنی طرف جھکا ہوا   میں نے کہا زہے نصیب دل نے کہا برا ہوا
ہائے اس گھر کی تباہی کا نہ پوچھو عالم   جو بیاباں بھی نہ ہو اور بیاباں ہو جائے
دن تو جیسے بھی ہوا کاٹ لیا چل پھر کے   فکر اب یہ ہے کدھر جائیں کہاں رات کریں
شمع کے آنسو شکستِ جام و مینا کی صدا   جو سمجھا جائے ہے محفل سے اٹھا جائے ہے

ناطق کی سیاسی بصیرت اور تقسیم کے تناظر میں بھی تین شعر ملاحظہ کیجیے۔

لوگ وہ شاطر کہ بہاروں کی ہوا تک بھی نہ دی   ہم وہ دیوانے کہ رازِ گلستاں کہتے رہے
رات بھر یہ سوچتا رہتا ہوں میں   کل کا سورج دیکھیے دکھلائے کیا
اک مصیبت ہو گیا ہے چند تنکوں کا لگاؤ   ورنہ کوئی دلکشی ایسی نشیمن میں نہیں

پہلے شعر میں بہار، ہوا، دیوانے، گلستاں اور تیسرے شعر میں تنکے اور نشیمن میں رعایت لفظی ہے اور یہ فن اکثر اشعار میں نہایت خوبی سے برتا گیا ہے۔

ناطق مرحوم کا سارا کلام گمنامی کے گوشے میں پڑا تھا۔ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کا بھلا ہو کہ اس نے کلام ناطق کا کچھ حصہ (جتنا دستیاب ہوا) آج سے چار سال پہلے "سخنِ معتبر" کے نام سے چھاپ کر اس کی زندگی بچالی ہے مگر ابھی بہت کچھ باقی ہے اور ناطق مالوی پر از سر نو کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ناطق مرحوم کا قرض سارے سرونج، تمام صوبہ اور سب سے زیادہ ناطق کے نواسے ڈاکٹر شاہد میر پر ہے۔ دیکھیے کون؟ کتنا؟ اور کب ادا کرتا ہے؟ میرے خیال میں ڈاکٹر مختار شمیم کی یہ رائے نہایت صائب اور مستحسن ہے کہ سرونج میں ناطق مالوی کی یادگار قائم ہونا چاہیے۔

ناطق مالوی کے بعد سرونج کے دوسرے اہم شاعر محمد علی دانش مالوی ہیں۔ دانش مالوی ہاؤ بھاؤ سے بھی شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ عسرت اور تنگ دستی کی گود میں پرورش پانے والے سرونج کے بیشتر شاعر دانش مالوی کی شخصیت میں بڑی والہانہ کشش ہے۔ سرونج کی بیشتر نیک نام ہستیوں کی طرح دانش بھی "سیلف میڈ" ہیں گورنمنٹ سینیر سیکنڈری اسکول کے پرنسپل کی حیثیت سے کوروائی میں ریٹائرڈ ہوئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ انھوں نے موجودہ مقام اپنے ذوق و شوق اور کڑی محنت و مشقت سے حاصل کیا ہے۔ دانش مالوی سرونج کے ان گنے چنے شاعروں میں سے ہیں جو شاعرانہ مزاج لے کر اس دنیا میں آئے ہیں۔ ایسے لوگ سرتاسر شاعر ہوتے ہیں، یہاں تک کہ شاعری ان کی تمام تر دلچسپیوں کا مرکز و محور بن جاتی ہے۔ یہ حضرات

شاعری کی دیوی کے پرستار ہوتے ہیں۔ انھیں نام نمود سے بھی کوئی زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ وہ شاعری سے کماتے کم اور گنواتے زیادہ ہیں۔ دانش نے بھی کبھی اپنی نمایش کا سوانگ نہیں رچایا بس وہ ساری عمر شاعری اور شاعری کی حد تک موسیقی کی پرستش کرتے رہے۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ سرونج میں مذہبی ماحول کے باوصف شاعری کے ساتھ موسیقی کا بھی بول بالا رہا چنانچہ زیرِ نظر مضمون کے پچھتر فیصد شاعر غزل ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے، ایک شاعر ناطق مالوی اگرچہ تحت اللفظ پڑھتے رہے مگر فنِ موسیقی کے وہ بھی دلدادہ اور واقف کار تھے۔ دانش مالوی تو ترنم کے ایسے شیدائی تھے اور شاید اب بھی ہیں کہ شعر کو ترنم سے علیحدہ کرکے سننے میں انھیں زیادہ لطف نہ آتا تھا۔ عجب نہیں کہ انھوں نے اساتذہ کے کلام کا مطالعہ بھی ترنم کے ساتھ کیا ہو۔ ان کے عروج کے زمانے میں کوئی ایسا ترنم جاننے والا نہ ہوگا جسے دانش مالوی کے فیضِ تربیت نے شاعر نہ بنا دیا ہو۔ دانش مالوی کے شاگرد بھی سب سے زیادہ ہیں۔ اس معاملے میں انھیں سرونج کا مصحفی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ عمر بھر کئی آوازوں میں پڑھتے رہے اور ان آوازوں پر وجد کرتے رہے۔ دانش مالوی خود بھی خاصی پاٹ دار آواز کے مالک ہیں اور اپنا منفرد ترنم رکھتے ہیں۔ ان کی آواز میں ایک خاص قسم کی لرزش اور تھرتھراہٹ ہے جو سننے والوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ماضی قریب تک دانش مالوی کے بغیر سرونج میں مشاعروں کا تصور ممکن نہ تھا۔ دانش اور مشاعرہ لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ ان کی ترنم ریز غزلیں سن کر محفل جھوم جھوم جاتی تھی۔ غزل پڑھتے وقت ان کے چہرے پر ایسا جال اترآتا تھا کہ بے اختیار جگر کی یاد آجاتی۔ میر عرفانی نے دانش کے کلام میں نزاکتِ خیال اور رعنائی کا ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ یہ دونوں خوبیاں ان کے کلام کی جان ہیں لیکن ان کی بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے غم کو انگیز کرتے ہوئے رعنائی کو قائم رکھا ہے۔ زندگی کے سرد و گرم سے گزرتے ہوئے اگرچہ انھوں نے بہت دکھ جھیلے مگر وہ کہیں ٹوٹے نہیں۔ ان کی غزلوں میں مایوسی اور غم، نشاط انگیز کیفیت کے شانہ بہ شانہ چلتے ہیں۔ کہیں کہیں انھوں نے جدید شاعری کا لب و لہجہ بلکہ لب و لہجے سے زیادہ نئی شاعری کے الفاظ استعمال کرنے کی شعوری کاوش کی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ اپنے قدیم انداز میں زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے ہیں چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ستم گر جب یہ عالم ہو تو کس دل سے تجھے کوسوں — اٹھاؤں بد دعا کو ہاتھ اور دل سے دعا نکلے

میں چل پڑا ہوں راہِ محبت میں ان کے ساتھ — اب میرے انتظار میں عمرِ رواں رہے

دوستو ہنسنا ہنسانا کیا ہمیں آتا نہیں — غم سے فرصت کا کوئی لمحہ میسر بھی تو ہو

اٹھا پردہ تو اسرارِ محبت ہو گئے افشا — حقیقت کی نظر سے جب انھیں دیکھا تو ہم نکلے

زمانہ شوق سے اب اہتمامِ دار کرے — پکارنا تھا "انا الحق" جسے پکار آیا

تم اگر ہوتے نہ جانِ زندگی — کون کرتا زندگی کی آرزو

ہر بار تری بزم سے لائے ہیں نیا غم — ناکامِ محبت کبھی ناکام نہ آئے

کر دیا دیوانگی نے محو احساسِ الم
اب تو رونا چاہتا ہوں اور ہنسی آجائے ہے

بڑی مدت میں ڈرتے ڈرتے آئینہ اٹھایا تھا
نگاہیں ملتے ہی اک اجنبی چہرا نظر آیا

چلچلاتی دھوپ میں بھی نیند سی آنے لگی
اپنے لٹے گھر کی دیواروں کا سایہ دیکھ کر

آپ کے غم میں مرا ہر ہر نفس
رام کے بن باس میں چودہ برس

دانش مالوی کے ان اشعار کے بعد اس فہرست کے تیسرے نمائندہ شاعر مولانا زبیر احمد راہی قاسمی ہیں۔ راہی قاسمی سرونج کے اساتذہ میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے دینی علوم کے ساتھ مشرقی شعریات خصوصاً عربی اور فارسی کا راست مطالعہ کیا ہے۔ دیوبند سے فارغ ہو کر عصری تعلیم حاصل کی اور ایک استاد کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ راہی قاسمی فن شعر پر عبور رکھتے ہیں۔ ان کی یہ خوبی اور علمی مرتبہ انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔ راہی قاسمی اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی شعر کہتے ہیں خصوصاً ان کی فارسی نعتیں عقیدت اور فن کا بہترین امتزاج ہیں۔ اردو میں انھوں نے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کی شاعری میں عشقِ مجاز اور تصوف کی رنگ آمیزی کے علاوہ سیاست کی بے راہ روی پر بھی لاتعداد اشعار موجود ہیں۔ ایسے اشعار میں وہ طنز کا سیدھا اور بھرپور وار کرتے ہیں۔ زمانے کی کج ادائی عزیزوں اور دوستوں کی بے اعتنائی اور معشوقانِ ستم پیشہ کی بے وفائی پر انھوں نے ہزار زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ ابتدا میں انھوں نے بہت سی نظمیں کہی تھیں۔ ان کی اکثر عشقیہ نظمیں اختر شیرانی کے رومانی عہد کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ غزل میں سوز و گداز اور حزن و ملال کی کیفیت ہے۔ لیکن جہاں کہیں طنز کا استعمال کیا ہے کھل کر وار کرنے کو ترجیح دی ہے۔ سیاسی اشعار میں یہ رویہ اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ غزل ترنم سے پڑھتے ہیں اور بقول تمیر عرفانی "دانش کے بالکل ضد ہیں، مدھم سے کبھی اونچے نہیں جاتے" کلام کے سوز و گداز کا رنگ ان کے حزینہ ترنم سے مل کر مزید گہرا اور پُرتاثیر ہو جاتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

گزر گئے عشق کے مراحل یوں ہی مسلسل خموشیوں میں
نہ اس نے حالِ تباہ پوچھا نہ ہم نے رودادِ غم سنائی

چاند تارے سر آسماں سو گئے
آ بھی جا رات کے پاسباں سو گئے

ادھر یادِ ان کی نشتر بن کے چبھتی ہے رگِ جاں میں
گھٹاؤں کو اُدھر ضد ہو گئی ہے گھر کے آنے کی

اس شعلۂ پنہاں کو لے جائیں گے محشر تک
ہم ہوں گے قیامت میں اور دردِ جگر ہوگا

آرہی ہے ذرے ذرے سے صدائے الفراق
اشکِ خونیں دیدۂ تر سے رواں ہونے کو ہے

راہی قاسمی کے مندرجہ ذیل اشعار حسنِ بیان، وسعتِ خیال اور معنویت کے لحاظ سے بلند پایہ ہیں۔

ہم ان کی بزم سے اٹھ کر تو آگئے لیکن
سوال یہ ہے کہ اب زندگی کہاں گزرے

آج خوش فہمیٔ اغیار کا ٹوٹا ہے طلسم
اس نے اپنوں کو بھی اپنا نہ کہا میرے بعد

اللہ رے یہ جرات یک قطرۂ لہو
بارِ غمِ حیات اٹھانے چلا ہے دل

بھروسہ ناخدا پر کرنے والو — بہت اونچا ہے پانی آج سر سے
موت کتنی بھی خوبصورت ہو — زندگی کا بدل نہیں ہوتی

راہی قاسمی اپنے تخلص کے استعمال میں مومن کے ہم نوا ہیں، ان کے مقطعوں میں تخلص کی رعایت سے راہ، سنگ راہ، رہ دشوار، رہ گزر، رہبر، رہزن، کارواں، میر کارواں، سفر، ہم سفر، پا، شکستہ پا، شجر، سایہ، قدم، نقش قدم، منزل، خضر منزل اور جستجوئے منزل جیسے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں مثلاً

خضر منزل نے بتائے ہیں نشان منزل کے — ورنہ راہی کی یہ اوقات کہاں تھی پہلے
میں نے ایسے بھی کئی نقش قدم چھوڑے ہیں — دیں گے راہی کو جو منزل کا پتہ میرے بعد

ذاتی تجربات اور مشاہدات کے علاوہ راہی قاسمی اقبال اور ترقی پسندی دونوں سے متاثر ہیں ان کے کلام میں جا بجا اقبال کے اثرات اور ترقی پسند تحریک کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔

راہی قاسمی کے بعد اس مجلس کے چوتھے اور اس مضمون کے آخری شاعر میر عرفانی کا ذکر خیر باقی رہ جاتا ہے۔ میر عرفانی کے بارے میں ڈاکٹر شان فخری اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں۔

"مرحوم (میر عرفانی) سرونج کے ان ناقابل فراموش شعرا میں تھے جو اپنی شگفتہ مزاجی، یار باشی، پر لطف انداز گفتگو، ہر دلعزیزی اور سراپا اخلاق ہونے کی بنا پر مدتوں اپنی کمی کا احساس دلاتے رہیں گے۔"

سرونج کے میر اپنے شعری رویے میں دہلی کے میر کی بالکل ضد تھے سوائے اس ذہنی اشتراک کے جس میں زندگی کے تئیں دونوں کی فکر کا محور اثبات ہے۔ وانش مالوی کی طرح میر عرفانی بھی سرونج کے مشاعروں اور ادبی محفلوں کی جان تھے۔ میر عرفانی کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ وہ ہر نشست کو چشم زدن میں شعری نشست بنا دیا کرتے تھے۔ کسی ہوٹل میں یاران نشاط چائے پینے بیٹھے کہ چائے کے ساتھ شعر و سخن کا بھی ایک دور ہو گیا قاضی گھاٹ کے "نشاط کلب" والی بال گراؤنڈ پر ارباب ذوق کھیل شروع ہونے کے انتظار میں بیٹھے ہیں، نیٹ باندھا جا رہا ہے اور کچھ کھلاڑیوں کا بھی انتظار ہے۔ گویا کھیل شروع ہونے میں ابھی پندرہ بیس منٹ یا نصف گھنٹے کی دیر ہے۔ اب اگر وہاں میر عرفانی موجود ہیں تو یہ وقت ضرور شعر و ادب کے حساب میں جائے گا۔ لیکن یہ غیر رسمی نشستیں ایسی نہیں ہوتی تھیں کہ ان میں سب اپنا کلام بلاغت نظام پیش کرتے ہوں۔ ان میں بیت بازی مصرعے بازی، لطیفے بازی، سنجیدہ اور غیر سنجیدہ بحث و مباحثہ، ان گنت گفتنی اور ناگفتنی موضوعات تھے جو زیر بحث آتے۔ بس اتنا ہوتا کہ میر عرفانی گفتگو کے سارے سلسلے شعر و سخن سے منسلک کر دیتے اور کسی کو احساس بھی نہ ہوتا۔ ان کے دم تک سرونج میں شاعری کا وہ چرچا رہا کہ اودھ کی زوال آمادہ حکومتوں کی یاد تازہ رہتی تھی۔ ہماری نسل کو اسی ماحول نے ذوق ادب بخشا ہے میر عرفانی کا حافظہ بھی بلا کا تیز تھا مختلف

شعرا کے سیکڑوں اشعار نوک بر زبان تھے۔ خود بھی سناتے، دوسروں کو بھی ترغیب دیتے بلکہ ترغیب دینے کے لیے ہی سناتے تھے۔ فی البدیہہ شعر کہنے میں ان کا کوئی حریف نہ تھا اور یہ شعر بھی ایسے لاجواب ہوتے کہ سننے والے حیرت زدہ رہ جاتے۔ بلاشبہ مرحوم انتہائی زندہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شاعری امید و حوصلہ اور سرور و کیف کی شاعری ہے۔ انھوں نے زندگی کو مثبت انداز میں دیکھا تھا۔ خیال کی نشاط انگیزی اور زبان و بیان کا رنگ و آہنگ ان کی شاعری کے حوالے سے زندگی کو حوصلہ بخشتے ہیں۔ فن شعر گوئی میں انھوں نے اکثر کوئی نہ کوئی نیا انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ غزل کے فرسودہ مضامین کو بقدر امکان نیا بنانے کی کاوش کرنا۔ بات کو ذرا سا گھما کر بیان کرنا۔ بات میں بات پیدا کرنا ان کی سیماب صفت طبیعت کو بہت راس آگیا تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جسے دیکھو خوشی کی جستجو ہے
خوشی اک مستقل غم ہوگئی ہے

یہ ملال خستگی کیوں یہ غمِ شکستگی کیا
یہ پستیاں بنیں گی کبھی رفعتوں کے زینے

عزمِ محکم سعیٔ لاحاصل نے بخشا ہے ہمیں
کس طرح پھر سعیٔ لاحاصل کو لاحاصل کہیں

اے ناخدا وہ زعمِ تفاخر کہاں گیا
ادنیٰ سی ایک موج سفینہ ڈبو گئی

میں نے کہا ہے کون حریفِ غمِ دوراں؟
اک جام چھلکتے ہوئے یوں بول اٹھا میں

ہم سفر اپنا تمھیں کیسے بنالوں یارو
بیٹھ جاتے ہو جہاں سایۂ دیوار ملے

جا اے قاصد جا کر ان سے سب میری کہانی کہہ دینا
بیتاب ہے دل رکتی ہی نہیں اشکوں کی روانی کہہ دینا

اے تبر انھیں خط کیسے لکھوں اب ہاتھ مرے تھراتے ہیں
یہ کورا کاغذ دے دینا پیغام زبانی کہہ دینا

اے شبِ غم کچھ خبر ہے آج وہ آنے کو ہیں
آج تجھ سے عمر بھر کا ساتھ چھوٹا جائے ہے

آخر میں تبر عرفانی کی ایک فی البدیہہ غزل بھی سن لیجیے جسے انھوں نے بطور چیلنج قبول کیا تھا۔ غزل کی ردیف "جنوں ہو جاتی ہے" اس اعتبار سے دلچسپ تھی کہ اس کا پہلا حصہ مذکر اور دوسرا مونث ہے۔ تبر عرفانی نے اپنی شاعرانہ ذہانت سے قافیہ تلاش کیا اور نہایت کم وقت میں پانچ اشعار کی مندرجہ ذیل غزل کہہ کر اہلِ محفل کو حیرت انگیز مسرت سے ہم کنار کر دیا تھا۔ غزل ہے۔

جب حد سے محبت بڑھتی ہے تشکیلِ جنوں ہو جاتی ہے
ہر جرأتِ دل بڑھتے بڑھتے تبدیلِ جنوں ہو جاتی ہے

کہتی ہے خرد جس کو دنیا ہے ایک چراغ راہ گزر
جب حد میں جنوں کے آتی ہے قندیلِ جنوں ہو جاتی ہے

اس اہلِ جنوں کی محفل میں تو ہوش و خرد کا نام نہ لے
دیوانے ایسی باتوں سے تذلیلِ جنوں ہو جاتی ہے

آغازِ جنوں میں اٹھتے ہیں خود ہاتھ گریباں کی جانب

فرحت جہاں
یوکلپٹس، ۱۴۸/ای۔ عیدگاہ ہلز،
(بھوپال ۴۶۲۰۰۱)

"یہ نہ تھی ہماری قسمت"

شکوہ شکایت کی ہمیں عادت نہیں ہے۔ ہمارے پاس کیا ہے اور کیا نہیں ہے اس پر دھیان اس لیے نہیں دیتے کہ اپنا حالِ زار دیکھنے کے بجائے دوسروں پہ نظر رکھنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے نگاہ چار ہونے کا بھی امکان رہتا ہے۔ اور جب یہ امکان بھی نہیں کہ آیا ہم اس حسین، رنگین اور دلچسپ دنیا میں رہیں گے کیونکہ صرف چار دن ہی تو زندہ رہنے کا حکم ملا ہے پانچویں دن تو خیمہ کی طنابیں کھل ہی جاتی ہیں۔ پھر خواہ مخواہ واویلا کیوں مچائیں۔ شکوہ شکایت کرکے زبان کو بے مزہ کیوں کریں۔ زبان تو شیریں ہی اچھی لگتی ہے۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر جس کے منہ سے میٹھی میٹھی باتیں نکلتی ہیں ہم تو اسی کے دل و جان سے ہو رہتے ہیں۔ چاہے وہ نیتا ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے الیکشن کے زمانہ میں جب نیتا لوگ گلے میں ہار ڈالے سر پہ ٹوپی لگائے اپنے چمچوں کے ساتھ ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور مدھر آوازمیں کہتے ہیں

"آپ ہمیں ووٹ دیں ہم آپ کو روٹی، کپڑا اور مکان دیں گے"

ایک تو آواز کا جادو اور پھر لین دین کا سن کر ہم اس قدر خوش ہوتے ہیں اس قدر ہوتے ہیں کہ فوراً ان کا منہ شکر کے دانوں سے بھر دیتے ہیں۔ جب کہ اس مہنگائی کے زمانہ میں ایک ایک دانہ کا مزہ ہم مہینوں اور برسوں اٹھاتے — لیکن — خیر — یہ سوچ کر صبر کر لیتے ہیں کہ دانہ دانہ پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام — چاہے نام رام ہو یا رحیم۔ ہمیں تو ہر لفظ سے پیار ہے۔ دل چاہتا ہے کہ لفظوں کو چومتے رہیں۔ ہم لفظوں پہ اتنا یقین رکھتے ہیں کہ کسی لفظ کی پیشانی پر شرمندگی کا پسینہ آئے۔ کسی حرف پہ آنچ آئے یہ ہم دیکھ ہی نہیں سکتے۔ چاہے کتنی ہی آگ چاروں طرف لگی ہو اور زندوں کو مُردوں میں بدل رہی ہو۔ ہمارے پیٹ میں بھی کئی مرتبہ بھوک کی آگ لگی لیکن کیا مجال جو ہم نے حرف پہ حرف آنے دیا ہو۔ چُپ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہاں خالی منہ جماہیوں پہ اختیار نہیں رہتا سو وہ بار بار لیتے رہتے ہیں۔ سوچتے ہیں کیوں نہ وعدوں سے ہی پیٹ بھر لیں۔

روٹی کے بعد کپڑوں کا نمبر آتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کپڑے بھی پہنتے ہیں لیکن بالکل ماڈرن لوگوں کی طرح جہاں تک ہو سکتا ہے کم سے کم پہنتے ہیں۔ نہاں اور عیاں میں زیادہ فرق نہیں

ہونے دیتے۔ اس وجہ سے ہر جگہ ہمیں عزت ملتی ہے چاہے فائیو اسٹار ہوٹل کا فلور ہو یا اسٹار بننے کے لیے کوئی فلم اسٹوڈیو۔ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں اور نوجوان طبقہ تو ہمیں پلکوں پہ بٹھاتا ہے۔ خدا کرے دل میں بھی بٹھا لیتا ہو۔ کوئی ہماری برہنگی کو نہیں دیکھتا ہمارے مختصر کپڑوں پہ نظریں جماتا ہے اور ہم یہ دیکھ دیکھ کر محظوظ ہوتے رہتے ہیں کہ دیکھو کم کپڑوں میں کتنی عزت مل رہی ہے یہ کسی کو معلوم ہی نہیں کہ جیب میں ایک چھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے کہ جس سے ہم اپنی تنگ دامانی کچھ تو کم کر سکتے۔

خیر تن تو ہمارا کسی نہ کسی طرح ڈھک ہی جاتا ہے لیکن من کھلا رہ جاتا ہے ہم جانتے ہیں کہ پھر کوئی ایسا نیتا ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹائے اور ووٹ کے بدلے من کو ڈھانکنے کی بات کرے۔ پھر ہم اس کا منہ پہلے سے زیادہ میٹھا کریں گے۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتے ہیں چائے کے لیے شکر کا ایک دانہ بھی نہیں رکھیں گے اور سیکرین کی گولیوں سے کام چلا لیں گے۔ بس کسی طرح ہمارا من ڈھک جائے تاکہ اندر کی آنکھ کو اچھی بری بات نظر ہی نہ آئے۔ جب آنکھ کچھ دیکھے گی ہی نہیں تو خواہ مخواہ نیر کیوں بہائے گی اور صبح شام ہونے والے سانحوں پہ ہمارا من اس طرح برہنہ پا کانٹوں پر بھی نہ گھسٹتا پھرے گا اور پھر پاؤں میں سے کانٹا نکالنا بھی تو آسان کام نہیں ہوتا۔ سوئی کی نوک چبھتی رہتی ہے لیکن وہ کمبخت گرفت میں ہی نہیں آتا۔ آتنک وادیوں کی طرح تکلیف دے کر نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے۔

ایک گھر بھی ہے ہمارے پاس جس پر ہم بہت اتراتے رہتے ہیں اور خود کو ان امریکیوں اور روسیوں سے لاکھ درجہ بہتر سمجھتے ہیں جو SPACE میں جا کر نہ زمین کے رہتے نہ آسمان کے معلق لٹکتے رہتے ہیں بے چارے۔ نہ جانے اس وقت ان کا دماغ کہاں رہتا ہوگا ہمیں کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہمارا گھر زمین پر ہے۔ لیکن دماغ ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔

ہمارے گھر کا حدود اربعہ کچھ بھی سہی لیکن ہمارے گھر کی چھت نے ہمیں ایسے ایسے سبق سکھائے ہیں زندہ رہنے کے وہ گُر بتائے ہیں کہ اب۔

اثر مجھ کو ذرا نہیں ہوتا۔ رنج راحت فزا نہیں ہوتا
پھر کیوں شکایت کر کے من کو مت میلا کریں۔

موسم برشگال کو لیجیے۔

جب کالی کالی گھٹائیں امڈ امڈ کر آتی ہیں اور باد و باراں کے جھکڑ اپنا زور دکھاتے ہیں تو ایسے حسین موسم میں ہمیں اپنے زور بازو نہیں زور شانہ دکھانے کا بھی خوب موقع ملتا ہے جیسے ہی چھت کا کوئی حصہ گرتا ہے ہم اپنا کندھا لگا دیتے ہیں۔ چھت کے دیکھا دیکھی دیوار بھی کھڑے کھڑے بیٹھنے لگتی ہے۔ ہم کھڑے ہو کر فوراً اس کو بھی اٹھانے میں لگ جاتے ہیں کبھی مشرق کی جانب تو کبھی مغرب کی جانب۔ کبھی خود کو اٹھاتے ہیں کبھی دیوار کو۔ اس طرح پوری برسات اٹھک بیٹھک ہوتی رہتی ہے۔ ٹی وی میں یوگا والے بھی ہماری اٹھک بیٹھک

کے آگے بیچ ہیں ۔ ہم یہ سوچ کر دل ہی دل میں خوش ہوتے رہتے ہیں کہ اگلی برسات تک اینکر و بیٹکس کے ماہر ضرور ہو جائیں گے ۔ کیا خبر ورلڈ ریکارڈ میں آ جائیں ۔ اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا ۔ دعا یہ ہے کہ دوسروں کے گھر ایسے نہ ہوں ۔

اب دوسرا فائدہ ملاحظہ کیجیے ۔

موسم سرما میں جب بیچ بستہ ہوائیں ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر چھت کے بے شمار سوراخوں سے اندر آ کے ہمارے گلے لگتی ہیں والہانہ انداز میں ہمارے انگ انگ کو چھوتی ہیں تو ان کو محسوس کر کے اور دانتوں کو کٹکٹاتے ہوئے سوچتے ہیں کہ دیکھو جہاں چاہ ہو وہاں راہ نکل ہی آتی ہے ۔ انرجی سوراخوں میں سے بھی ہو سکتی ہے ۔

ایک سبق دماغ پہ کندہ ہوا ۔

چار مہینے بعد موسم اپنا چولا بدلتا ہے لیکن چھت ہم سے نظریں نہیں پھیرتی ہر موسم میں مہربانیوں کی بارش کرنے سے نہیں چوکتی ۔ یہاں تک کہ جب سورج آگ برسا رہا ہو اور لوگ گرمی کی شدت سے گھبرا کر اندر باہر ہو رہے ہوں ۔ نہ کولر کام دیں نہ ایر کنڈیشنر بلڈ پریشر زیادہ ہو جائے تو کبھی کم ۔ لیکن یقین جانیے ہماری چھت کی وجہ سے ہمارا دورانِ خون نہ کبھی تیز ہوتا ، نہ مدھم ۔ قاعدے کے مطابق رگوں اور نسوں میں دوڑتا پھرتا ہے ۔ کیونکہ ہم اندر باہر نہیں ہوتے ۔ آرام سے چھت کے نیچے لیٹے رہتے ہیں اس میں سے دھوپ بھی آتی ہے اور سایہ بھی ۔ دونوں کا مزہ ملتا رہتا ہے ۔ یہ ہی تو ہماری چھت کی خوبی ہے ۔ بڑی فرشتہ خصلت پائی ہے اس نے ـــــ لیکن ۔ فرشتے تو چھت کے نیچے رہتے ہی نہیں ۔

ان ہی تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ شکوہ شکایت کیوں کریں اور خود کو بدمزہ کریں خواہ مخواہ ہی لوگ آنکھیں نم رکھتے ہیں اور دل رنجور ۔

ایک دن کیا ہوا کہ ہم اپنی سوچوں پہ بے حد خوش ہو رہے تھے کہ ہماری ایک جواں سال سہیلی نے اچانک آ کر ہمارے خیالوں کو ڈسٹرب کر دیا ۔ ہم نے دیکھا اس کے ہونٹوں پہ بڑی دلآویز مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور چہرے پہ گلابیاں بکھیر رہی تھیں ۔

"کیا بات ہے بنو آج بڑی خوش نظر آ رہی ہو ؟"

"ذرا کان لاؤ میرے پاس "

ہم نے فوراً کان اس کے منہ کے پاس لگا دیا ۔

"آج ہم دوپہر کو ننگے پا تو گئے تھے چپکے چپکے دیدار عاشق کے لیے "

"ہائے تمہارے تلوے نہیں جلے چپل کیوں نہیں پہن لی تم نے " ہم نے اس کی تکلیف کا سوچ کر گھبرا کے کہا ۔ یہ سن کے وہ بُری طرح بگڑ گئی ۔ کہنے لگی ۔

"تم اس کرب آمیز لذت سے ہی ناواقف ہو ۔ تم کیا جانو محبت میں کتنا کھٹا میٹھا مزہ ہوتا ہے ۔ سنو میری جان یہ تو آگ اور شبنم کا جوڑ ہے ۔ پھر "چپکے چپکے " کی گردان کرنے لگی بالکل

علامہ علی کی طرح ۔ "عشق کرو تو پتا چلے کہ احساس میں کیسی ست رنگی دھنک کھلی رہتی ہے ہر دم۔ میں بھوپال میں خواتین کی انجمن "دھنک" کا نہیں کہہ رہی جس میں مردوں کا داخلہ بھی ممنوع قرار دے دیا گیا ہے ۔ لیکن تم تو ہر دم صرف روٹی کپڑا اور مکان پاکر نہال ہوئی جاتی ہو۔ ذرا اس کوچہ میں بھی تو قدم رکھ کے دیکھو"۔ اس نے حقارت سے ہماری طرف دیکھا۔ ہیلمیٹ پہنا، ہیرو ہونڈا پہ پیر مارا اور یہ جا وہ جا۔ وہ چلی گئی لیکن اس کی نگاہیں برچھی کی طرح ہمارے اندر چبھ گئیں۔ ہمیں اپنے آپ میں بڑی شرمندگی محسوس ہوئی کہ واقعی زمانے کے نشیب و فراز تو ہم نے خوب خوب دیکھ لیے لیکن ابھی تک رخِ محبوب کو نہیں دیکھا۔ نہ کبھی عاشق ہوئے نہ محبوب کہلائے سانسہ دل تو وا اژگوں پڑا ہے۔ یا خدا! اپنے حضور میں ہماری دعا بھی قبول فرما۔ ہمارے ویرانہ دل میں بھی محبت کے گلاب کھلا دے چاہے وہ ہائی برِیڈ ہوں یا فلوری بنڈا۔ ہم نے پتا کر لیا کہ کچھ اور کریں یا نہ کریں لیکن آج کل میں ہی عشق کے سمندر میں کود کر ضرور دیکھیں گے کہ یہ آگ کا دریا ہے یا یخ بستہ سمندر یا معتدل۔

رات بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ پارہ کی طرح بے قرار رہے کہ کب صبح ہو اور ہم اپنی زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز انجام سے بے پرواہ ہوکر کریں۔ آسمان پہ تارے جھلملا رہے تھے لیکن ہم نے ان کو گننا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ یہ کام تو عشق کے بعد کا ہے۔

آخر کسی نہ کسی طرح رات کاٹی۔ مرغ کے جاگنے سے پہلے ہی جاگ پڑے ۔ ایک عجیب طرح مستی و شرارت ہمارے رگ و پے میں دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی ابھی تو عشق کے میدان میں قدم بھی نہیں رکھا اور ہمارا یہ عالم ــــــ خود پہ تعجب ہوا۔

صبح ہی صبح تلاشِ محبوب میں نگاہ جو اٹھائی تو حیرتوں کا منظر دکھائی پڑا۔ لوگ اِدھر سے اُدھر بھاگے جا رہے تھے ۔ ان کے ہاتھوں میں جھنڈے تھے ۔ تلواریں بھی خوب چمک رہی تھیں ۔ ارے یہ کیا؟ ــــ آج تو ہم تلاشِ محبوب میں نکلنے والے تھے ۔ اس کے چہرہ کی چمک دمک دیکھنا چاہتے تھے ۔ اس کے بجائے نیزوں اور بھالوں کی چمک نظر آ رہی ہے۔ طرح طرح کے نعرے لگ رہے ہیں ہجوم کے چہرے غصہ سے انگارہ ہو رہے ہیں۔ یہ ہمارے شہر کو کیا ہو گیا ۔ یہ کیسی صبح ہوئی ہے ۔ روشنی سے تو کونا کونا منور ہو رہا ہے لیکن صبح غائب ۔ نگاہ حیران و پریشان چاروں طرف دوڑتی پھر رہی تھی اور کان فلک شگاف نعروں سے پھٹے جا رہے تھے ۔ کچھ دیر بعد پولیس کی جیپ اعلان کرتی ہوئی گزر گئی ۔ "بھائیو بہنوں! شہر میں فساد کی وجہ سے کرفیو لگا دیا گیا ہے ۔ کوئی باہر نہ نکلے ۔ ورنہ دیکھتے ہی گولی مار دی جائے گی"

اعلان کیا تھا ہمارے ارمانوں پہ گولیوں کی بوچھار تھی ۔ یہ سنتے ہی ہم نیم جاں ہوئے پھر گھبرا کے پوچھا ۔ "یہ فساد ہوا کیوں؟"

ایک متوحش راہ گیر نے بھاگتے بھاگتے کہا "اپنے جلسے ہوکیوں "خارج کر دو بی بی"

منہ سے بے ساختہ نکلا "کیوں"، لیکن سب نے چپکی سادھ لی۔ معلوم نہیں "کیوں"

یا خدا اگر اسی طرح راستے بند ہونے لگیں، شاہراہوں کے ہونٹوں پہ چپک لگ جائے گلی کوچے ویران ہو جائیں، نہ آدمی نظر آئے نہ آدم زاد۔ تو محبوب کو ہم کیسے تلاش کر پائیں گے۔ کہاں ڈھونڈیں گے اسے۔ پھر گھبرا کے سوچا۔

"کیا واقعی ہمارا کوئی محبوب ہو گا نہ عاشق۔ عشق کی دلفریبیاں نہ دلفگاریاں، ضعف نہ گریہ۔ خونچکاں مژگاں نہ تار تار گریباں۔

تو پھر کیا؟ —— کچھ بھی نہیں۔

کیا بالوں میں منہدی بھی نہیں۔

بقیہ صفحہ ۴۳ کا

اے میر کوئی پوچھے تو ذرا ان چاک گریباں والوں سے
کیا چاکِ گریباں کرنے سے تکمیلِ جنوں ہو جاتی ہے

یہ ہیں سرونج کی کلاسیکی شاعری کے چار ستون جن کی طویل مگر خاموش ادبی خدمات ہنوز تشنۂ اعتراف ہیں۔ کیا مستقبل ان کی خدمات کا اعتراف کرے گا؟

شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان

تالیف :- مولانا حکیم محمود احمد برکاتی

اس کتاب میں برکاتی صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ نیز ان کی تصانیف، تلامذہ، مریدین شاہ ولی اللہ کا تعارف بھی ہے۔

قیمت -/۵۴ روپے

تذکرۂ ماہ و سال

مالک رام

اس مجموعے میں اردو کے بیشتر ادیب، شاعر، نقاد، کالم نگار، صحافی اور دوسرے اہم عمائد (جنھوں نے اردو ادب کی قابلِ قدر خدمت کی ہے) کی تاریخِ ولادت اور جو ہماری بدقسمتی سے انتقال کر چکے ہیں ان میں سے اکثر کی تاریخِ وفات بھی درج ہے۔ کسی بھی اہم ادیب پر مضمون لکھتے وقت اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

افکارِ اقبال

محمد عبدالسلام خاں

اس اہم کتاب میں علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی، ان کے اردو اور فارسی کلام پر سیر حاصل بحث ان کے مذہبی اور سیاسی افکار، اور کچھ ایسے اہم واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جو اب تک اندھیرے میں تھے۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

تحقیق نامہ

مشفق خواجہ

مشفق خواجہ اردو کے وہ واحد محقق ہیں جو ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی اہمیت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی خلا کو پُر کرتے ہوں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں ایسے ہی اہم ترین مضامین شامل ہیں۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

مرضیات

حکیم نعیم الدین زبیری

بیماریوں کے اصولی اسباب اور ان کی وجہ سے افعال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعے یعنی ماہیت الامراض (پیتھالوجی) پر جامع اور آسان بحث طلبہ کے علاوہ اطبا کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔

قیمت -/۵۱ روپے

تاثر نہ کہ تنقید

صدیق الرحمٰن قدوائی

تنقید، ادب کی ایک اہم شاخ ہے مگر اس کا ضرورت سے زیادہ چرچا بھی اچھا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص "نقاد" ہو جائے ادب کو تنقید کے سوا بھی مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے جن کا انحصار پڑھنے والوں کے انفرادی مزاجوں پر ہے۔ یہ تصنیف ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔

قیمت -/۵۱ روپے

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے

(عہدِ حاضر کے ۱۹ اہم ادیبوں کے انٹرویو)

طاہر مسعود

قیمت -/۶۶ روپے

کھلے خطوط

مراسلہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

● پروفیسر مظفر حنفی، صدر شعبہ اردو، کلکتہ یونیورسٹی کلکتہ

"کتاب نما" (فروری ۱۹۹۴) کا "اشاریہ" خیال انگیز ہے اور اردو کے مسئلے پر ایک نئے زاویے سے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون اس شمارے کی جان ہے۔ مولانا عارف ہسوی ایک عظیم مجاہد آزادی تھے۔ ان کی رحلت آزادیٔ ہند سے گیارہ بارہ برس پہلے ہوگئی تھی بعد ازاں ملک میں جو بے انصافی اور تعصب کا دور آیا اس کے تحت عارف مرحوم کی خدمات اور اہمیت کا کما حقہٗ اعتراف کیا جانا خلافِ مصلحت سمجھا گیا۔ عارف ہسوی صاحب کی بیوہ (محترمہ ثمہ بی بی) کو حکومت سے پنشن بھی آزادی کے کہیں سولہ سال بعد اس وقت ملی جب راقم الحروف نے ماہنامہ 'آجکل' دہلی میں ایک مضمون لکھ کر اہل اقتدار کی توجہ اس طرف مبذول کی۔ پروفیسر فرمان نے بجا طور پر اپنے مضمون کے ذریعے ایک اہم لیکن فراموش کردہ شخصیت کو اس کا جائز مقام دلانے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں قارئین کی معلومات کو مکمل کرنے کے لیے کچھ اور باتیں عرض کرنی ہیں:

بے شک عارف ہسوی اور حسرت موہانی، دونوں نے مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں تعلیم حاصل کی، دونوں انتہائی پُرجوش اور جری مجاہد آزادی تھے، دونوں نے انتہائی سخت قسم کی قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں اور دونوں میں مزاجی ہم آہنگی تھی۔ عارف ہسوی نے حسرت موہانی کی پہلی مستند سوانح حیات قلم بند کی لیکن بہت لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہے کہ جس طرح حسرت موہانی نے قدیم اور اہم شعراء کے انتخاب شائع کیے تھے (جنھیں اردو اکیڈمی یو۔ پی نے آگے چل کر گیارہ جلدوں میں "انتخاب سخن" کے نام سے پیش کیا) اسی طرح مولانا حسرت ہسوی نے بھی متعدد شعرائے متقدمین کے مختصر انتخاباتِ اشعار اپنے مقدموں کے ساتھ شائع کیے تھے اور یہ "سرخ جیبی کتاب سیریز" میں منظر عام پر آئے تھے اس سیریز کی ناشر دی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ (دہلی) تھی جس کے مینجنگ ڈائرکٹر شیخ احسان الحق ہوا کرتے تھے۔ اسّی اسّی صفحات پر مشتمل ان انتخابات کی قیمت چار آنے متعین کی گئی تھی ان کتابوں کا سائز ۵×۲½ تھا اور کتابت خفی لیکن بے حد روشن حروف میں پندرہ سطری۔ کاتب تھے سید عباس علی امجد اور یہ جیبی کتابیں محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپتی تھیں۔ ان کا زمانۂ اشاعت ۱۹۲۹/۳۰ء تھا اس سلسلے کی کم و بیش اکیس کتابیں میری نگاہ سے گزریں جن میں سے اکثر کے مصنف و مرتب مولانا حسرت ہسوی تھے اور جن شعرا کے اشعار کا انتخاب اور کلام پر تنقیدی محاکمہ ان میں شامل تھا ان میں سودا، میر، مصحفی مومن اور غالب جیسے مشاہیر کے نام آتے ہیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ جامعہ ملیہ یا دہلی یونیورسٹی کا کوئی ریسرچ اسکالر اس جانب توجہ دے کر عارف ہسوی کی علمی اور ادبی خدمات پر

تحقیقی کام کرے گا۔

عارف ہسوی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ قید بامشقت کی سختیوں کے ساتھ وہ جیلوں میں رہے تو وہاں سیاسی قیدیوں کے طرحی مشاعروں کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور ان مشاعروں میں طرحی غزلیں پیش کرنے والوں میں عبدالمجید خواجہ، خجندی میرٹھی، فراق گورکھپوری، شاہد فاخری، کرشن کانت مالویہ، شاہ صغیر حسن الہ آبادی، جہابیر تیاگی، حفیظ الرحمان فرخ آبادی، رام نریش تریپاٹھی، احمق پھپھوندوی جیسے شاعر اور مجاہدین آزادی شامل تھے یہ مشاعرے ۲۱-۱۹۲۰ء میں آگرہ جیل میں منعقد ہوئے اور مشاعروں کی غزلوں میں عام طور پر انگریزی حکومت کے خلاف اشعار کہے جاتے تھے۔ ان مشاعروں کی تفصیل میرے مضمون "شعرائے زنداں" (مشمولہ نقد ریزے) میں دیکھی جا سکتی ہے جو اوّلاً "ماہنامہ آجکل" دہلی میں ۱۹۶۲ء کے آس پاس شائع ہوا تھا۔ خالد محمود کی غزل بہت دن بعد دیکھی خوب ہے۔

● انور شمیم انور فیروز آبادی، ۱۹۳/۳ چوک حاجی پورہ فیروز آباد

مہمان مدیر جناب سید ظفر ہاشمی کا "اشاریہ"، "رکھیو احباب مجھے تلخ نوائی سے معاف" شمارہ کے وقار و وزن کا ضامن ہے۔

غالب اگر اپنے دردِ دل کے فزوں ہونے سے تلخ نوائی پر مجبور ہوئے تھے تو ہاشمی صاحب کی تلخ نوائی میں اردو کا درد ہے، جسے انھوں نے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے لیکن یہ تلخ نوائی بعنوانِ دگر حق نوائی ہے۔

اس موضوع پر بالعموم اہلِ قلم (بلااستثنائے چند) علمی بصیرت کی نمائش میں زورِ قلم صرف کر کے غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ مضمون کی فضا کو بوجھل بنا دیتے ہیں۔ لیکن ہاشمی صاحب نے مصلحت زدہ سیاست سے قطعِ نظر سچائیوں کا سیدھی سیدھی طرح اظہار کیا ہے ان کے اسلوب میں طنز ہے لیکن انتہائی دردمندانہ اور شائستہ بھی۔ ان کے مشوروں میں خلوص اور مشاہدات میں گہرائی ہے۔

دیگر مضامین میں ڈاکٹر وزیر آغا کا انشائیہ اور اردو انشائیہ نگاری، بھی مفید مطلب ہے۔ نیز مولانا عارف ہسوی، مولانا حسرت موہانی کے اولین سوانح نگار (فرمان فتح پوری) بھی خاصے کی چیز ہے۔

● ڈاکٹر عابد صفی، ریڈر شعبہ اردو، مدراس یونیورسٹی، مدراس

فروری کے کتاب نما میں انور سدید کا مضمون دیکھا تو ایک جگہ کھٹک گیا۔ صفحہ ۴۱ کے تیسرے پیراگراف میں عزیز تمنائی کا ذکر ہے۔ عزیز تمنائی بفضلِ خدا حیات ہیں اور حال ہی میں ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "سرہانے کا چراغ" منظر عام پر آیا ہے۔

● حاجی مرزا نعیم اللہ بیگ زائر، ۷/۹ ہاتھی خانہ فتح گڑھ یوپی

کتاب نما کا خصوصی شمارہ غلام ربانی تاباں، شخصیت اور ادبی خدمات، بذریعہ وی پی موصول ہوا، مضامین کا بہ نظرِ عمیق مطالعہ کیا آفاق حسین نے صرف میرا نام قلمبند کیا ہے، مجھے ان سے کوئی شکوہ نہیں ہے البتہ ڈاکٹر اسلم فرخی جو فتح گڑھ کے اصل باشندے ہیں (جن سے میری ملاقات اور مراسم رہے ہیں اور اب بھی خط و کتابت جاری ہے) کا مضمون بہت غور سے پڑھا۔ موصوف نے میرا ذکر کرنے میں انصاف سے کام نہیں لیا ہے اور متعدد واقعات قلم بند کرنے میں

ان سے سہو سرزد ہو گیا۔ کتاب نما کے قارئین کو
یقیناً غلط فہمی ہوئی ہوگی۔

میں ایک مختصر اور جامع حقائق پر مبنی ایک
خاکہ ارسال کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ کسی
شمارہ میں شائع کر کے ممنون فرمائیں گے۔

● شگفتہ طلعت سیما ۵/۸۹ رپن اسٹریٹ، شبلی ہاؤس کلکتہ

فروری کا کتاب نما پیش نظر ہے۔ جناب
سید ظفر ہاشمی نے اپنے اداریے میں بڑی
اچھی بات کہی ہے۔ لیکن کیا اس پر عمل ہو رہا
ہے؟ ضرورت ہے عملی طور پر اردو کے لیے
تمام اردو والے مضبوط قدم اٹھائیں۔ صرف
مضامین اور غزلیں لکھ کر کچھ ہونے والا نہیں
ہے۔ طنز و مزاح کا حصہ واقعی اس بار مزا
دے گیا۔ پرویز اللہ مہدی اور شفیقہ فرحت
نے جس انداز میں نشتر لگائے ہیں اس کی داد
نہ دینا کفر ہوگا۔ باقر مہدی کی غزل کا مطلع ؎

وفا شعار ہیں سرکش ہیں خوار ہیں ہم لوگ
زمانہ ساز کے سینے میں خار ہیں ہم لوگ

کتنے بند دریچوں کو کھول گیا۔

● عبید الماس　جوہانگر بنگلور

فروری ۱۹۹۴ء کے کتاب نما میں جناب انور
سدید کا ایک مضمون ۱۹۹۳ء کے "رفتگان
کے ساتھ چند لمحے" شائع ہوا ہے اس مضمون
میں تامل ناڈو کے ممتاز شاعر عزیز تمنائی صاحب
کا ذکر صیغہ ماضی میں کیا گیا ہے۔ عزیز تمنائی میرے
عزیز ترین دوست ہیں اور خدا کے فضل و کرم
سے بقید حیات ہیں۔ پتا نہیں انور سدید صاحب
کو یہ اطلاع کیسے اور کہاں سے ملی کہ عزیز تمنائی
کا شمار رفتگان میں کیا جائے۔

● اے۔ ایم ناصرہ تی آر ۲/۹/۴ وجے نگر کالونی حیدرآباد

فروری کے شمارہ میں جہاں مدیر سید
ظفر ہاشمی کا دل سوزی سے لکھا ہوا مضمون پڑھ
کر یہی خیال آیا کہ ہر وہ شخص جس کی مادری زبان
اردو ہے اور اردو کی بقا کے لیے کچھ کرنا چاہتا
ہے وہ ضرور کچھ نہ کچھ تجاویز پیش کرتا ہے اور
اپنی دانست میں سمجھتا ہے کہ اس کی تجاویز سے
اندھیرے چھٹ جائیں گے اور اجالا ہو جائیگا۔
یہ ہماری خوش فہمیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔
اردو کو عوامی زبان کی حیثیت سے پروان چڑھانے
کی انھوں نے جو تجویز پیش کی ہے وہ کم از کم
جنوبی ہند میں ناکام ہو چکی ہے۔ کیرالا، مدراس
آندھرا اور کرناٹک میں مسلمان ایسے ہیں
جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ ان پر آپ
کس طرح اردو کو مسلط کر سکتے ہیں؟ ان لوگوں
کی ادبی، ثقافتی ضرورتیں ملیالم، تامل، تلنگی اور
کنڑی زبان سے پوری ہوتی ہیں۔ مذہبی ضرورت
کے لیے وہ عربی سیکھتے ہیں۔ حیدرآباد جہاں
اردو زبان میں اعلا تعلیم کا شاندار تجربہ کیا گیا
تھا وہاں کی یہ حالت ہے کہ والدین اپنے
بچوں کو اردو بحیثیت سکنڈ لنگویج پڑھانے
پر بھی آمادہ نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ گھریلو ملازمت
کرنے والی عورتیں اور رکشا چلا کر گزر بسر کرنے
والے بھی انگلش میڈیم کے خواہاں ہوتے ہیں۔
مسجدوں میں پڑھنے والے بچوں کو ان کے ماں
باپ عربی زبان میں دینی تعلیم پڑھانے کے
خواہش مند ہوتے ہیں اور مسجد میں پڑھانے
والے اساتذہ کو جو مشاہرہ دیا جاتا ہے
اس کے بعد یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ
وہ عربی میں بنیادی نماز، روزہ وغیرہ سکھانے
اور عربی قاعدہ اور قرآن شریف پڑھانے کے
علاوہ ایک اور زبان سکھائیں جس سے شاید
وہ خود نابلد ہوتے ہیں۔
یہاں کی ایک مشہور درس گاہ جو مسلمانوں

ہی کی ہے وہاں اردو کے بجائے دینی تعلیم کا پریڈ رکھا گیا ہے جو انگریزی میں دی جاتی ہے۔ اردو پڑھانے کے خواہش مند چاہتے تھے کہ اردو کی بھی پرورش ہو، اردو والوں، والدین سے التجائیں کیں کہ سیکنڈ لنگویج اردو رکھی جائے۔ انھوں نے کہہ دیا کہ ان کے بچے دینی تعلیم سیکھ رہے ہیں یہ ان کے لیے خوشی کا باعث ہے، اردو نہ آنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، اور یہ تضیع اوقات ہے۔ کانونٹ اسکول میں اردو کے لیے وہ لکچرار رکھنا گوارا نہیں کرتے اور زبردستی طالب علم کی زبان ہندی لکھواتے ہیں تاکہ اردو مادری زبان میں تعلیم دلوانے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوسکیں، والدین بغیر ہچکچاہٹ کے کہتے ہیں کہ اردو کی تعلیم ہماری روزی روٹی کے لیے آڑے آرہی ہے۔

جناب سید ظفر ہاشمی سے میری گزارش ہے کہ اپنے زرخیز دماغ سے کچھ اور فائدہ مند تجاویز پیش کریں۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

● رام پرکاش کپور، ۱۸/۱۷، ایم۔آئی۔جی۔ پدم نابھ پور
درگ ۴۹۱۰۰۱ مدھیہ پردیش

فروری ۱۹۹۴ء کے کتاب نما میں جناب سید ظفر ہاشمی صاحب کا اشاریہ میں نے بہت غور اور دلچسپی سے پڑھا۔ اس سے پہلے بھی جناب سید ظفر ہاشمی نے اپنے دو ماہی رسالہ گلبن کے جولائی اگست اور ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۳ء کے اداریوں میں کچھ اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرکے ایک اہم بحث کا آغاز کیا تھا۔ ان اداریوں میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ "اردو کی ترقی اور تحفظ کے لیے ضروری نہیں کہ اس کا رشتہ روزی روٹی سے جوڑا جائے،

یہ خیال ایک فریب ہے۔ جس کی لپیٹ میں بڑے بڑے ادبا اور قائدین بھی دکھائی دیتے ہیں۔ عوام کا بہک جانا تو معمولی بات ہے"۔ اور یہ بھی کہ "کیا انگریزی، ہندی اور دوسری صوبائی زبانیں بڑھتے ہوئے متعصبانہ ماحول میں اپنے وجود کی قیمت پر اردو کو پنپنے دیں گی۔ اگر کوئی شخص ایسا سوچتا ہے تو وہ بہت خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ اس لیے اردو کے لیے سیاسی بیساکھی کا مطالبہ کرنا وقت ضائع کرنا ہے"۔ اور یہ بھی کہ "ہمیں ذاتی طور پر اردو پڑھانے کا انتظام اس طرح کرنا ہوگا۔ جس طرح ہم قرآن شریف پڑھانے کا انتظام کرتے ہیں . . . ۔ اردو کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ فاسد خون ہی پیدا کرتا ہے۔ اس سے نفرت کی آگ ہی بھڑکتی ہے اور تعصب پروان چڑھتا ہے۔ ہم جتنا اس پر زور دیں گے اُتنا ہی اردو کے خلاف نفرت پیدا ہوگی"۔

میں نے ان کے جواب میں اور اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے انھیں ایک خط لکھا تھا جو گلبن کے نومبر دسمبر ۱۹۹۳ء کے شمارہ میں انھوں نے شائع کیا ہے۔ اس خط کی ایک فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ کتاب نما کے قارئین کے سامنے جناب سید ظفر ہاشمی کے اشاریہ کے جواب میں میرے خیالات بھی پیش کیے جائیں۔

"جولائی، اگست ۱۹۹۳ء کے گلبن کے شمارے میں آپ نے ایک بڑا اہم سوال اٹھایا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ آپ کا یہ کہنا کسی حد تک ہی صحیح ہے کہ "اردو کی ترویج و تحفظ کے لیے ضروری نہیں کہ اس کا رشتہ روزی روٹی سے جوڑا جائے، لیکن آپ کو یہ ماننا

پڑے گا اور یہ میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں
کہ اردو کی ترویج و ترقی اور تحفظ روزی روٹی
سے جڑے بنا اگر ناممکن نہیں تو نہایت ہی مشکل
ضرور ہے۔ بقول جناب شمس کنول "اگر اردو
روزی روٹی سے جڑ جائے تو ہر رمضانی و فقیر
چند کسی کے کہے بغیر خود ہی اردو سیکھنے کی کوشش
کرے گا اسے کسی ترغیب کی ضرورت نہیں ہوگی"
(کتاب نما جولائی ۱۹۹۲ء)

ایک سوال آپ نے اور اٹھایا ہے۔
"کیا ہندی اور دوسری زبانیں بڑھتے ہوئے
متعصبانہ ماحول میں اپنے وجود کی قیمت پر اردو
کو پنپنے دیں گی" اس سلسلے میں ماہنامہ کتاب نما
نئی دہلی کے جنوری ۱۹۹۳ء کے شمارہ میں چھپے
میرے اپنے اشاریہ کا حوالہ دینا چاہوں گا۔

"..... ہمیں اس بات کے لیے PUBLIC OPINION
بنانا ہوگا اور عام لوگوں کو یقین دلانا ہوگا کہ اردو
والے ہندی علاقائی زبانوں کے خلاف نہیں ہیں۔
ہندی کو اردو والوں نے کبھی حقارت سے نہیں
دیکھا اس کے حق میں ہمیشہ آوازیں اٹھائیں لیکن
کچھ ہندی والے اردو کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں حالانکہ
ہندی کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور
اسے قومی زبان کی مراعات دی ہوئی ہیں یہ اور
بات ہے کہ ملک میں خاص کر جنوبی ہندستان میں
ہندی مخالف رویہ نے شدت اختیار کر رکھی
ہے (اس میں اردو والے شامل نہیں ہیں)
علاقائی زبانوں کی اہمیت سے تو کسی کو انکار
نہیں لیکن اس حقیقت سے کیوں انحراف
کیا جاتا ہے کہ علاقائی زبانوں کے بولنے والوں
کی بڑی تعداد کے بعد اردو کا ہی نمبر آتا ہے۔
ہم کو ہندی والوں اور علاقائی زبانوں کے بولنے
والوں کو یقین دلانا ہے کہ اردو والے علاقائی زبانوں
اور ہندی کی جگہ اردو کو نہیں دلوانا چاہتے۔ ہندی
ہندستان کی قومی زبان مان لی گئی ہے اور علاقائی
زبانوں کو بھی اپنے اپنے علاقوں میں سرکاری زبانوں
کا درجہ حاصل ہے۔ ہمارا مطالبہ تو صرف اتنا
ہے کہ اردو کو دوسری زبان کا درجہ دیا جائے۔
اس کے منظور ہونے سے اردو کسی بھی
طرح ہندی یا علاقائی زبان کے لیے خطرہ ثابت
نہیں ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ اردو زبان کا ادب
اور شاعری دوسری زبانوں کے بولنے والوں
کے لیے بے پناہ کشش رکھتے ہیں لیکن یہ دوسری
زبان کی جگہ نہیں لے گی، ہاں یہ سارے ہندستان
کے رابطے کی زبان بن سکتی ہے اور اس میں
رابطے کی زبان بننے کا تاریخی و لسانی وصف
بھی ہے لیکن یہ زبان کسی زبان کے لیے خطرہ
نہیں بن سکتی"

آپ نے یہ بھی لکھا ہے "اردو کے لیے
سیاسی بیساکھی کا مطالبہ کرنا وقت ضائع کرنا
ہے" اور یہ بھی کہ "اردو کو سرکاری زبان بنانے
کا مطالبہ فاسد خون ہی پیدا کرتا ہے اس سے
نفرت بڑھتی ہے اور تعصب پروان چڑھتا ہے۔
ہم جتنا اس پر زور دیں گے اتنا ہی اردو کے
خلاف نفرت پیدا ہوگی"

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کہ ہمارا مطالبہ
کہیں بھی اور کبھی بھی اردو کو پہلی سرکاری زبان
بنانے کا نہیں رہا ہے۔ ہمارا مطالبہ تو یہ ہے
کہ جن صوبوں میں آبادی کے کافی بڑے حصے
کی زبان اردو ہے وہاں ہندی اور علاقائی زبانوں
کے بعد اسے دوسری زبان کا درجہ دیا جائے۔
یہ بنیادی حق ہمارے ودھان نے ہمیں دیا
ہے ہم اپنا یہ حق کیوں چھوڑیں۔ تمام سیکولر
پارٹیوں نے الیکشن کے وقت یہ وعدہ بار بار

ٹھہرایا ہے کہ اردو کو یو پی، بہار، ہریانہ، پنجاب مدھیہ پردیش، راجستھان اور آندھرا پردیش میں دوسری زبان کا درجہ دلائیں گے اور یہ سب ان پارٹیوں کے الیکشن مینی فیسٹوز میں موجود ہے۔ ہمیں اس وعدہ کو پورا کرانے کے لیے مسلسل جدو جہد کرنی ہوگی۔ اور سیاسی پارٹیوں کو مجبور کرنا ہوگا کہ وہ اپنا وعدہ پورا کریں، ہم اپنا یہ جمہوری اور بنیادی حق صرف اس لیے چھوڑ دیں کہ ملک میں کچھ فرقہ پرست عناصر اور حکومت کے کچھ لوگ اردو کے مخالف ہیں یا سیاسی پارٹیاں اپنے وعدوں کے بارے میں مخلص نہیں ہیں۔ نہیں بالکل نہیں ہم اپنا بنیادی حق بالکل نہیں چھوڑیں گے اور اس کے لیے ہر ممکن قربانی دیں گے۔

آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اردو ہمیں اپنے بل بوتے پر سیکھنا ہوگا۔ سرکار سے ہم اتنا مطالبہ ضرور کر سکتے ہیں کہ جس محلہ شہر یا گاؤں میں مسلمانوں کی آبادی دس فیصد ہو وہاں ہر اسکول اور کالج میں اردو مضمون پڑھانے کا انتظام کرنا ہوگا لیکن سرکار اگر یہ مطالبہ نہیں مانتی تو ہمیں ذاتی طور پر اردو مضمون پڑھانے کا انتظام اسی طرح کرنا ہوگا جس طرح قرآن شریف پڑھانے کا انتظام کرتے ہیں، ہم یہ نہیں کہتے کہ قرآن کریم کا پڑھنا اردو پڑھنے کے مترادف ہے، ہمارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے ذاتی طور پر اپنے اداروں کے ذریعے اپنے بچوں کو اردو تعلیم دے سکتے ہیں"۔ (مسلمانوں کی ہی آبادی کیوں؟ اردو اور لوگوں کی بھی مادری زبان ہے)

آپ کس دنیا میں رہتے ہیں۔ جناب خیالی پلاؤ پکانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ پاؤں زمین پر لائیے اور اصلیت جاننے کی کوشش کیجیے گورنمنٹ تو پھر بھی آپ کا مطالبہ مان لے گی۔ کیوں کہ اسے آپ کے ووٹ چاہئیں لیکن آپ طلبہ کو کیسے راضی کریں گے کہ اردو پڑھیں۔ آپ طلبہ کے والدین کو کیسے منوائیں گے کہ اپنے بچوں کو اردو مضمون لینے کے لیے مجبور کریں۔ اونچے اور اونچے متوسط طبقے کے بچے تو پڑھتے ہی پرائیویٹ انگلش میڈیم اسکولوں میں ہیں، وہ نواحی گورنمنٹ یا میونسپل اسکولوں میں نہیں پڑھتے اور نہ ہی ان کے والدین چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اردو جیسی زبان پڑھیں۔ باقی رہے نچلے متوسط اور نچلے طبقے کے بچے اور ان کو آپ تب تک اردو پڑھنے کے لیے راغب نہیں کر سکتے جب تک آپ اردو کو روزی روٹی سے نہیں جوڑ دیتے، آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ تقریباً تمام صوبوں میں اردو اکادمیاں قائم ہیں اور یہ بھی تو ہمارے اپنے ہی ادارے ،، ہیں اور اردو کی ترویج و ترقی کے لیے قائم کیے گئے ہیں اور گورنمنٹ ان پر کروڑوں روپے خرچ کر رہی ہے اور ان کے چلانے والے بھی اردو کے بہی خواہ ہیں لیکن ان سے اردو کی کیا پیش رفت ہوئی ہے کتنے ہزار غیر اردو داں کو لکھنا پڑھنا سکھایا گیا ہے صرف سیمیناروں اور مشاعروں سے تو اردو کی ترویج و ترقی ممکن نہیں ہے۔

ایک اور نہایت ہی اہم پوائنٹ ہے جس کا آپ نے ذکر تک نہیں کیا وہ یہ ہے کہ سیاسی اور سماجی سطح پر جدو جہد کے ساتھ اردو کی ایک اندرونی لڑائی بھی ہے۔ اردو کی لڑائی صرف حکومت اور سیاسی پارٹیوں سے ہی نہیں ہے اردو کی لڑائی ان لوگوں سے بھی ہے جو اردو بولتے ہیں، اردو کے مشاعرے

پڑھتے ہیں، اردو کی مجالس میں شریک ہوتے ہیں، اردو کے نام پر روٹی کھاتے ہیں، اردو کے کاروان کو چلاتے ہیں، اردو میں فلمیں لکھ کر ہندی نام سے بیچتے ہیں، اردو کے گانوں پر ہندی سرٹیفکیٹ برداشت کرتے ہیں اور بیچ بیچ میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کی مانگ بھی کرتے ہیں اور عوام کو گمراہ کرتے ہیں، ان تمام بڑے بڑے حضرات کے بچے اردو نہیں پڑھتے نہیں بولتے، نہیں جانتے اور نہ خود یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اردو جیسی زبان سیکھیں، ان کے گھر میں اردو اخبار نہیں آتے اگر آتے ہیں تو مفت، ہاں انگریزی و ہندی اخبار و رسالے خرید کر آتے ہیں۔ انگریزی میں چھپی خبر جلد ان کی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن اردو کے اخبار میں چھپی خبر کو گھٹیا اور بکواس کہتے ہیں، ہماری لڑائی ان سب سے بھی ہے اور سب سے پہلے ان سے دست بستہ یہی عرض کرنا ہے کہ اردو اخبار و رسالے صرف خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیے اور چاہے آپ کسی علاقے میں رہتے ہوں اردو کے اخبار و رسائل اپنے ہاکر سے طلب کریں اور سب سے اہم بات اپنے بچوں کو اردو پڑھنے پر مجبور کریں۔

آخر میں آپ سے بھی ایک درخواست ہے کہ اردو جیسی زبان کو صرف مسلمانوں کی زبان کہہ کر محدود مت کیجیے (آپ کی اپیل مسلمانوں سے ہے) اردو عوام کی زبان ہے کسی خاص فرقہ یا مذہب کی نہیں، اردو تو ہمارے دیش کی گنگا جمنی بانسری ہے یہ ہمارے بزرگوں کی صدیوں کی ریاضت کا حصول ہے۔ یہ ہماری انمول وراثت ہے اور اپنی پیدائش سے لے کر آج تک ہر طبقہ ہر فرقہ کے لوگوں کی زبان بن کر زندہ ہے اور اس میں ہمارے ملک کی روح سمائی ہوئی ہے، خدارا اسے محدود مت کیجیے۔

● قاسم ندیم بمبئی ۴۳

سید ظفر ہاشمی صاحب کا تیکھا مگر غور طلب اداریہ اہمیت کا حامل ہے۔ طنز و مزاح میں شفیقہ فرحت کا طنزیہ ردّ عمل اور پرویز اللہ مہدی کا 'بمبئی میں بھوپال' عمدہ تحریریں ہیں۔ محمد رفیع انصاری نے پاکستان سے متعلق اردو شعرا کے نظریات کا مختصر مگر اچھا جائزہ پیش کیا ہے۔

● م۔ق۔ سلیم 'سائبان' ۴۶۹-۲-۱۹
بیرون فتح دروازہ، حیدرآباد

اشاریہ فروری ۱۹۹۴ء "رکھیو احباب مجھے تلخ نوائی سے معاف"۔ جناب سید ظفر ہاشمی نے جن گوشوں کو وا کیا ہے قابل صد آفریں ہے۔ اردو کے بارے میں صحیح اور مکمل نظریہ پیش کر کے آج کے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور محققوں کو ایک نئی فکر دی ہے اور ساتھ میں چیلنج بھی کیا ہے کہ ہم کب تک خوش فہمی میں مبتلا رہیں گے۔ اردو ادب صرف مڈل کلاس مسلمانوں کی زبان بن گئی ہے آج کا ہر بڑا آدمی (خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو) اپنے بچوں کو اردو پڑھانا معیوب تصور کرتا ہے اور ان کے بچے انگریزی زدہ اردو بول کر اردو کا جنازہ نکال رہے ہیں۔ جہاں تک میرا اپنا تجزیہ ہے صرف اردو جاننے والا طبقہ ہی مذہب سے وابستہ ہے اور جو لوگ (مسلمان) اردو نہیں جانتے وہ مذہب سے کافی دور ہیں۔ میں خود درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہوں اور وہاں پر انٹرمیڈیٹ (بارہویں) کے طلبہ جو کہ اردو سے نابلد ہیں اسلام سے

کوسوں دور ہیں ان کو ایمان مفصل اور ایمان مجمل تک یاد نہیں۔ اس کی وجہ ابتدا سے انگریزی تعلیم ہے۔ کسی دکنی شاعر نے کہا تھا۔

جب بچہ سنائے A.B.C
باوا (والد) تو خوشی سے پھول گئے
اولاد ہے مسلم باوا کی
اک کلمہ طیب یاد نہیں

آج ہمارا معاشرہ جدھر بھی جا رہا ہے اس کی اصل وجہ زبان ہے۔ اگر ہم اپنے بچوں کو دوسری زبان کے ساتھ اردو اور عربی کی تعلیم دیں تو ہماری زبان کا تحفظ ہو سکتا ہے اس کو فروغ مل سکتا ہے۔ اس کی پذیرائی ہو سکتی ہے۔ اور اردو پروان چڑھ سکتی ہے ظفر صاحب نے سچ کہہ کر ان چہروں کے نقاب اتارے ہیں جو اردو کا دم بھرتے ہیں۔

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

تعلیم و تعلّم

مصنف ڈاکٹر محمد اکرام خاں
قیمت ۱۵، روپے۔ اشاعت: دسمبر ۱۹۹۳ء
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
تبصرہ نگار: عبداللہ ولی بخش قادری

" تعلیم و تعلم کتاب ایک تجزیاتی مطالعہ ہے،، یہ مصنف کے خود نوشتہ پیش لفظ کا پہلا جملہ ہے اور اس سے قاری کو اس کے مطمح نظر کا اشارہ مل جاتا ہے جس کی وضاحت کتاب کے دس ابواب میں ملتی ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے 'کتابی تعلیم' ۔یہاں مروّج اور فرسودہ طریقۂ تعلیم کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی بخوبی صراحت کی گئی ہے۔ دوسرا باب' اسکول اور کمیونٹی' ہے جو توجہ دلاتا ہے کہ کیوں کر اسکول کے گرد و پیش سے روابط بڑھائے جا سکتے ہیں اور ان سے 'کیا، اور' کیسے، کما حقہ استفادہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان کا سارا بیان اسی ادراک کی تائید میں ہے کہ،، تعلیم مجموعی اعتبار سے جماعتی عمل ہے۔ بچہ فطرتاً سیکھنے پر مجبور ہوتا ہے اور ہر اس شخص اور تجربے سے سیکھتا ہے جس سے اس کا واسطہ پڑتا ہے"۔ تیسرا باب' تعلیم و تعلم کا روایتی طریقہ، ہے۔ مصنف کے خیال میں " اس خام خیالی (روایتی طریقہ تدریس) کی ان چار مفروضات پر قائم ہے: (۱) طلبہ کو سیکھنے اور سکھانے کے لیے روایتی طریقہ تدریس پر مبنی کوشش زیادہ مفید ہوتی ہے۔ (۲) استاد زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں کہ طلبہ کو کیا سیکھنا چاہیے (۳) پڑھانے کے لیے ایک مخصوص طریقہ تدریس ہے جس کے ذریعے جماعت کے تمام طلبہ برابر سیکھ سکتے ہیں۔ (۴) تمام طلبہ کو ایک ساتھ مقررہ معیار کے مطابق مقررہ علم حاصل کر لینا چاہیے۔ اس ضمن میں ان خامیوں کا احاطہ کر لیا گیا ہے جن سے کم و بیش ہم سب واقف ہیں مگر چھٹکارا پانے سے قاصر رہے ہیں۔ یہ باب درحقیقت اصل موضوع کے نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے اور باب اوّل قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ پہلے دو ابواب کو اسی روایتی طریقے کا مظہر گردانا جا سکتا ہے۔ چوتھا باب' غیر مربوط تعلیم، ہے جس سے مراد غیر متعلق مواد تعلیم ہے جو کہ غیر مربوط طریقے سے پڑھایا بھی جاتا ہے۔ اگلا باب' تعلیم بذریعہ تحقیق' اچھا خاصا دقیق نظر آتا ہے۔ یوں

مصنف کا ارشاد بالکل بجا ہے کہ "ہمیں تو یہ کہنا ہے کہ جو تعلیم دی جائے اور جس سطح تک دی جائے، اس کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنا چاہیے جو تعلیم کے اصل مقصد کو حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکے۔ وہ چاہتے ہیں کہ "مضامین اور کاموں کے ذریعے طلبہ کو انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں اور دشواریوں کے سمجھنے اور حل کرنے کی تربیت دی جائے"، لیکن ماحول کو سازگار بنانے میں ان کی لَے کافی بلند ہو جاتی ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ مصنف کو تلخ حقائق کا احساس نہ ہو۔ انھوں نے آخر میں خود ہی کہا ہے کہ "شاید کوئی بندۂ خدا اس کی افادیت کو سمجھ کر اس پر عمل کرنے کے لیے ضروری حالات پیدا کر سکے"۔ چھٹے باب "رائج تعلیمی انتظام کے اثرات" میں مضر اثرات کی وضاحت کی گئی ہے اور ان کے سلسلے میں اصلاحی اقدامات کی طرف اشارے بھی کیے گئے ہیں۔ ساتواں باب "سازگار ماحول کی ضرورت" ہے اور نواں "تعلم کے لیے چند شرائط" دونوں مل کر صورت حال کو سازگار اور تعلم کو مفید و بارآور بنانے کے لیے ضروری عوامل و وسائل کی نشان دہی کر دیتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان آٹھواں باب "کامیاب استاد کی چند خوبیاں" آتا ہے جس کا نچوڑ مصنف کے ہی الفاظ میں یوں ہے: "جب ہم کسی اچھے اور کامیاب استاد کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ چار خوبیاں زیادہ متاثر کرتی ہیں (۱) تعلم کے لیے مناسب اور سازگار ماحول پیدا کرنے کی صلاحیت (۲) تدریس اور تعلم کے لیے تجربات اور تحقیقات کو ترجیح دینا (۳) ایسے وسیلوں اور موقعوں کو پہچاننے، فراہم کرنے کی صلاحیت رکھنا جس سے تعلیم میں مدد ملتی ہے (۴) اپنے کردار اور شخصیت کو سمجھ لینے اور اسے صحیح طور پر استعمال کرنے کی صلاحیت۔ آخری باب "استادوں کی تعلیم" ہے۔ اس طرح بجا طور پر تان تربیت اساتذہ پر آکر ٹوٹتی ہے۔ مصنف کا کہنا بالکل درست ہے کہ "در اصل اسکولی تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے استادوں کی تعلیم کو بہتر بنانا ہوگا۔ اور ان اداروں کو نظری مضامین اور عملی تجربوں بالخصوص مشقِ تدریس کے پروگرام میں وہ تمام تجربے شامل کرنے ہوں گے جن کی بدولت ان کے فارغ التحصیل، اسکولوں میں بحیثیتِ استاد، وہ طریقۂ تدریس اور تعلم استعمال کر سکیں جو فرد کی پوشیدہ صلاحیتوں کو فروغ دے کر اچھا سماجی انسان بنانے کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہو چکے ہیں"۔

آخری تین ابواب میں "خلاصہ" کا عنوان قائم کر کے اہم نکات کو دہرا دیا گیا ہے۔ اچھا ہوتا اگر یہ التزام سب ابواب کے ساتھ برتا جاتا۔ مجموعی طور پر تعلیم و تعلم کا مقصود، شخصیت کی نشو و نما اور سیرت کی تعمیر ہے جس کے حصول کے لیے "طفل مرکز" تعلیم کو ضروری گردانا گیا ہے۔ یہ افکار تعلیم ایک ایسے استاد تعلیم کے فکر و عمل کا ماحصل ہیں جنھوں نے تربیت معلمی کے حصول کی ابتدا جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں کی اور تکمیل انگلستان اور امریکا کی شہرہ آفاق تربیت گاہوں میں لیکن جن کا میدان کار جامعہ ہی رہا اور ملک کے تعلیمی حلقوں میں ڈاکٹر محمد اکرام خاں کے نام سے روشناس ہوئے۔ انھوں نے جامعہ کی فیکلٹی تعلیم سے اب بارہ چودہ سال قبل سبک دوشی پائی۔ اس کے بعد وہ کلیتاً اردو میں تعلیمی ادب پیدا کرنے کے لیے وقف ہو گئے

اور اب تک تقریباً ایک درجن کتابوں کے مصنف بن چکے ہیں۔ اردو میں علمی ادب کی طرف بالعموم اور تعلیمی ادب کی طرف بالخصوص کم ہی رجوع کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جامعہ کے اساتذہ نے خاص طور پر اپنی ذمہ داری محسوس کی ہے اور ان میں ڈاکٹر خان کا حصہ ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی نگارشات، ایک پختہ ذہن کی دین ہیں اور سلیس و بامحاورہ نیز غیر مبہم علمی نثر کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔

تعلیم و تعلم کا تعارف، پروفیسر محمد نذیر الدین مینائی کے زور قلم کا نتیجہ ہے وہ رفعتِ فکر بھی رکھتا ہے اور حسنِ ادا بھی۔ مصنف کے بارے میں انھوں نے فرمایا ہے کہ "نظامِ تعلیم نصاب تعلیم، تربیت، درس و تدریس وغیرہ جیسے اہم اور نازک مسائل کے جائزے اور تجزیے میں اگر ایک طرف عالمانہ معروضیت کی بے دردی نظر آتی ہے تو دوسری طرف ایک شفیق اور مخلص استاد کی دردمندی بھی جھلکتی ہے" ان کی اس رائے کی صداقت اور معنویت کا صحیح اندازہ کتاب کے مطالعے سے ہی ممکن ہے۔ پوری توقع ہے کہ اسکولوں کے اساتذۂ کرام بالعموم اور زیر تربیت اساتذہ بالخصوص تعلیم و تعلم سے بھرپور فائدہ اٹھائیں گے جیسا کہ اس کی پیش رو کتب سے اٹھاتے رہے ہیں۔ کتاب کی طباعت صاف ستھری ہے۔ وہ دیدہ زیب اور مجلد بھی ہے۔ خدا کرے ڈاکٹر خان کا قلم یوں ہی رواں دواں رہے۔

ولی سے آتش تک

مرتب: ایم حبیب خاں
تبصرہ نگار: صبا عظیم (بھوپال)
قیمت: ۲۵/- روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار دہلی ۶

اسکول اور یونی ورسٹی درجات کے اردو طلبہ کے لیے درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ ایسی کتابوں کی بھی حیرت انگیز کمی نظر آتی ہے جن کا ظاہر و باطن صاف ستھرا اور معیاری ہو اور جو طلبہ کی نصابی ضرورتوں کی خاطر خواہ تکمیل کر سکتی ہوں یہ کمی اس وقت اور زیادہ افسوسناک ہو جاتی ہے جب مختلف اردو اکیڈمیوں کی مہربانی سے غیر معیاری تخلیقات پر مشتمل سطحی کتابیں جاذب نظر کاغذی پیراہن میں ملبوس ہو کر قافلہ در قافلہ انعامات کی صفوں میں شامل ہو جاتی ہیں۔ ایسے خود غرضانہ ماحول میں اردو کے جن گنے چنے بہی خواہوں نے ذاتی دلچسپی کی بنیاد پر اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے ان میں ایم۔ حبیب خاں کا نام بھی شامل ہے۔

ایم حبیب خاں نے کئی کتابیں مرتب کی ہیں۔ ان کی پہلی کتاب "ولی سے آتش تک" اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس کتاب میں گیارہ کلاسیکی شعرا پر مستند اہل قلم حضرات کے مضامین شامل ہیں، جن کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔ ولی کی غزل از ڈاکٹر وزیر آغا۔ میر تقی میر، مولوی عبد الحق، دَرد کی شاعری کا صوفیانہ لب و لہجہ۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ، میر حسن

کی مثنوی سحر البیان، احتشام حسین، مثنوی گلزار نسیم، پنڈت کشن پرشاد کول، مصحفی اور ان کی شاعری، مجنوں گورکھپوری، انشا کی شاعری، ڈاکٹر محمد حسن، جرأت کی شاعری، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، ناسخ لکھنوی شخصیت اور فن، ڈاکٹر شبیہ الحسن، آتش کا فن شاعری ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر محمد ذاکر کا مضمون "آدمی نامہ" پر اور خود ایم حبیب خاں کے تین مضامین "اردو شاعری کی چند اہم اصناف"، "انشا اور مصحفی کے معرکے"، اور "دلی اور لکھنؤ کے دبستان شاعری پر ایک نظر"، شامل ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اردو کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

اردو ساخت کے بنیادی عناصر

مصنف: ڈاکٹر نصیر احمد خاں
مبصر: پروفیسر ابن شماتوف (ڈاکٹر عبدالرحمٰن) ہیا
تاشقند یونیورسٹی۔ ازبکستان

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ روس اور وسط ایشیا میں عرصہ دراز سے اردو اور ہندی زبانوں پر بہت کامیابی کے ساتھ تحقیقات ہو رہی ہیں۔ روس کے ماہرینِ زبان اردو کے لسانیاتی ادب میں قواعد نویسی سے متعلق کئی مقالے لکھ چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ایکسی بارانیکوو اور بیٹر بارنیکوو کی ہندستانی (ہندی اور اردو) کے عنوان سے لسانی تحقیق میں اردو زبان کی صرف و نحو پر کام ہوا ہے۔ اسی طرح زالمان دمشتیس کی اردو زبان کی قواعد (روسی۔ اردو کا ضمیمہ)، جموتووا کی تصنیف "ہندی اردو" میں مصدر کی فعلی خصوصیات "مصدر کی اسمی خصوصیات" اور "مصدر کے نحوی عمل" جیسے مضامین وغیرہ، یہ تحریریں علمی حلقوں میں کافی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی ہیں۔

ازبک ماہرینِ لسانیات کے ذریعے اردو ساخت بالخصوص اردو کے فعلی نظام کے مختلف موضوعات پر سنجیدگی سے سوچا جا رہا ہے۔ ان حضرات کی تحقیقی کاوشوں کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ فعل کے طور، اس کی شخصی شکلیں اور اسمی حالت کے لاحقوں کے تجزیے پر چند اہم تحریریں سامنے آئی ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور و معروف ماہر لسانیات رحمٰن بیردی محمود جاتوف کی اسکالرشپ بھی قابلِ قدر ہے جنھوں نے "اردو زبان میں فعل کا طور قیاس" اور "اردو میں حالیہ کا نحوی عمل" جیسے تحقیقی مقالے لکھ کر شہرت حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر سونیا چیرنیکووا نے تاشقند میں بیٹھ کر "اردو کے صیغے میں اردو افعال کے صیغوں کے نحوی استعمال پر تحقیق کی ہے اور اس میں صرف کام دکھانے والے افعال کی خبری صورت کے طور معارف کو پیش نظر رکھا ہے۔ تاش منیرا حال منیر الف نے اپنے مقالے بعنوان "خود مختار ہندستان میں اردو زبان کی حیثیت" میں دورِ حاضر کی اردو کے اطلاقی پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ راقم الحروف نے دکن میں پندرھویں صدی سے اٹھارھویں صدی کے درمیان لکھی گئی ادبی کاوشوں کے لسانی پہلوؤں پر تحقیق کی ہے۔

قدیم دکنی پر اس تحقیق کے علاوہ ہندی اور اردو کی تاریخی فرہنگیات سے متعلق ہمارے تحقیقی کام کو بھی ادبی اور علمی حلقوں میں کافی سراہا گیا ہے۔

ہندستان میں اردو کی ساخت پر لکھی گئی کتابوں میں مولوی عبدالحق کی "اردو قواعد" بیلیس کی A GRAMMAR OF HINDUSTANI OR URDU اور عصمت جاوید کی "نئی اردو قواعد" کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ہندو پاک اور دوسرے ممالک میں اردو ساخت کے مختلف پہلوؤں پر الگ الگ لکھے گئے متعدد مضامین اور مقالوں کو بھی یہاں شامل کیا جاسکتا ہے۔ جیسے اردو ساخت کے صوتی پہلوؤں پر پروفیسر محی الدین قادری زور کی HINDUSTANI PHONETICS پروفیسر شوکت سبز واری، پروفیسر مسعود حسین خاں اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مختلف تحریریں۔

ڈاکٹر نصیر احمد خاں کی کتاب "اردو ساخت کے بنیادی عناصر" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب کو پچھلی تمام تحریروں پر اس لیے فوقیت حاصل ہے کہ اس میں اردو ساخت کی مختلف سطحوں کے لسانیاتی تجزیے کو بیک وقت ایک سیر حاصل مقدمے کے ساتھ پہلی بار پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے اردو زبان کے صوتی، صرفی، نحوی اور لفظی پہلوؤں کا تجزیہ کر کے انھیں سات ابواب میں بانٹا ہے اور طویل ابتدائیے میں اردو کی ابتدا و ارتقا، اردو کے لسانی ماحول، اردو کی انفرادیت، اردو اور ہندی کا رشتہ، اردو کی بولیاں، اردو رسم الخط اور اردو میں لسانیاتی تحقیق جیسے موضوعات پر لسانیاتی اصولوں کی روشنی میں بحث کی ہے۔

زیر نظر کتاب کا پہلا باب اردو فونیمیات کے عنوان سے ہے جس میں اردو کی صوتی ساخت یعنی اردو فونیموں اور ان کی عمومی توضیحات کے علاوہ فونیموں کا تجزیہ اور تشریح ملتی ہے۔ باب دوم اردو فونیم تقسیمیات کے نام سے ہے جس میں اردو کے رکنوں کی ساخت اور اردو فونیموں کی تقسیم کی نوعتیں اہمیت کی حامل ہیں۔ تیسرے باب "اردو مارفونیمیات" میں الفاظ کی تشکیل کے وقت ان کی شکلوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ چوتھا باب "مارفیمیات، سابقوں کے اقسام اور ان کے نحوی نغرے، اردو الفاظ کی قسمیں اور ان کی درجہ بندی کا احاطہ کرتا ہے۔ اس باب میں حالت کی تعداد چار بتائی گئی ہیں یعنی فعل کی بیانی، مصدری، تمنائی اور امری حالتیں۔ بیانی حالت میں فعل کی دو ساقتیں شامل کی ہیں۔ نا تمام فعلی صفت اور تمام فعلی صفت، ہمارے خیال میں یہاں حالیہ معطوفہ کو بھی شامل کرنا چاہیے تھا۔ پانچواں باب اردو کی اسمی اور فعلی ترکیبوں کی ساخت اور جملوں کی نحوی ساخت کے گرد پھیلا ہوا ہے۔ یہاں ڈاکٹر صاحب نے جملے کی نحوی ساخت کو سمجھاتے وقت اجزائے کلام کے بجائے الفاظ کے خاص درجوں کو ذہن میں رکھا ہے۔ ہمارے خیال میں اول الذکر طریقہ زیادہ صحیح ہے۔ چھٹا باب اردو فرہنگیات سے متعلق ہے جو بین دیسی اور مستعار الفاظ کا تناسب، دخیل

الفاظ کے تدبھو روپ کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ہے اور آخری ساتواں باب رسم الخط سے متعلق ہے۔ کتاب میں نو جدول اور ۱۲ شجری نقشے پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب میں جو بات کھٹکتی ہے وہ حوالوں کی کمی ہے۔

یہ کتاب اردو کے صوتی نظام اور اردو کی صرفی و نحوی ساختوں کے بارے میں وسیع معلومات فراہم کرتی ہے اس لیے ڈاکٹر نصیر احمد خاں کی اس علمی تحقیق کو اردو لسانیات کے سرمایہ میں نہ صرف ایک کارنامہ بلکہ ایک بڑی امانت بھی سمجھنا چاہیے۔

جنوں کنارا

مصنف : اسعد بدایونی
مبصر : قمر الہدیٰ فریدی
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی
قیمت : ۵/ روپے، لائبریری ایڈیشن ۱۰/

چوراسی غزلوں، تیرہ نظموں اور ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل اسعد بدایونی کا تازہ شعری مجموعہ "جنوں کنارہ" فکر کی تازگی، لہجے کی شگفتگی اور روایت سے شاعر کے رشتے کا خوب صورت اظہار ہے۔ اس رائے کو ان آرا سے تقویت ملتی ہے جو کتاب کے آخر میں برگردِ راوی کے عنوان سے شامل ہیں۔ عرفان صدیقی کا خیال ہے کہ "اپنی تخلیقی تازہ کاری اور تلاش کے سچے جذبے کی بدولت اسعد نے اردو کی نئی شاعری میں پہچانے جانے والے اپنے ہم عصر نوجوان شعرا میں اپنی منفرد شناخت قایم کی ہے۔ ان کی فکر اور ان کے فن کا ارتقا جاری ہے۔ ادب میں پیشن گوئیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں لیکن اسعد کی شاعری توجہ اور اعتبار حاصل کر رہی ہے اور ان کی سچی لگن اور تخلیقی صلاحیتوں کے پیش نظر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے شعری تجربے اردو کی نئی شاعری کے مجموعی حسن اور سچائی کا حصہ بنیں گے۔"

اس میں شبہ نہیں کہ لفظیات اور موضوعات دونوں سطح پر اسعد بدایونی نے اپنی شناخت قایم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ فکر کے بوجھ سے دب کر شعر پھیکا اور بے رس نہ ہو جائے۔ حسن بیان کو ان کی شاعری میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔

میں شاعر کاذب لفظوں کا، میں عاشق کچے رنگوں کا
مرے پاس ہے تھوڑا سرمایا کچھ جذبوں اور امنگوں کا
مرے شہر ترے میدانوں میں کچھ پھول ٹہلتے رہتے تھے
ترے آسماں پہ میلہ تھا کچھ اڑتی ہوئی پتنگوں کا

مرے دریا ترے کناروں پر کچھ ریت گھروندے روشن تھے
ترے پانی کی آغوش میں تھا اک ٹولہ مست ملنگوں کا
جب شاخیں سب تابندہ تھیں جب ساری آنکھیں زندہ تھیں
میں پتہ ہوں اس موسم کا میں نوحہ گر ان رنگوں کا
میں ایک سپاہی ہارا ہوا، تسلیم مجھے تسلیم مجھے
اب ذکر نہ چھیڑو میداں کا اب حال نہ پوچھو جنگوں کا

کیا رشتۂ الفت ٹوٹ گیا یا بازوے وحشت ٹوٹ گیا
کیوں شاخِ شجر سے ملنے کو اب کے مہتاب نہیں آیا

مری انا مرے دشمن کو تازیانہ ہے
اسی چراغ سے روشن غریب خانہ ہے

عجیب خوف پسِ جسم و جاں پکارتا ہے
کہ جس طرح سے کوئی مہرباں پکارتا ہے

مجھے کچھ بھی یاد نہیں آتا میں کس منظر کا حصہ تھا
مرے ہاتھ کٹے کس میداں میں کس بھیڑ میں چہرہ ختم ہوا

اسعد بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے فکر انگیز نظمیں بھی کہی ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں شامل "گزشتہ کل کا سبق" "مفروضہ" اور "منشور" جیسی نظمیں اسی فہرست میں جگہ پائیں گی۔ اچھی کتابت و طباعت اور عمدہ شاعری کا یہ مجموعہ بلاشبہ ادب دوستوں کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔

تقدیرِ حنا

شاعر: سید معین الدین احمد عرشی بھوپالی
صفحات: ۸۸، قیمت: ۲۰ روپے
ناشر: سید شمس الدین احمد شمیم
نیل کنٹھ کالونی عیدگاہ ہلس بھوپال
تبصرہ نگار: سید مسعود الحسن۔ لیکچرار
ریجنل کالج آف ایجوکیشن - بھوپال

"تقدیر حنا" سید معین الدین احمد عرشی بھوپالی مرحوم (پیدائش جولائی ۱۹۲۱ء وفات

۲۸ مئی ۱۹۷۷ء) کا شعری مجموعہ ہے، جسے ان کے چھوٹے بھائی اور دوستوں نے مرحوم کی شعری خدمات اور یاد کو زندہ رکھنے کے لیے بڑی محنت سے یکجا کرکے شایع کرایا ہے۔
تقدیرِ حنا دارالاقبال بھوپال کے ایک ایسے ہونہار نوجوان شاعر کا کلام ہے جس کو زندگی میں بے رحم تقدیر نے دیوانہ بنا دیا تھا اور پھر موت کے بے رحم ہاتھوں نے وقت سے پہلے دنیائے شعر و ادب سے چھین لیا۔

عرشی بھوپالی اپنی مختصر شاعرانہ زندگی میں بھوپال اور بیرون بھوپال کے عظیم شعراء مثلاً حضرت جگر مرادآبادی، جاں نثار اختر، ذکی بھوپالی، شعری بھوپالی، باسط بھوپالی اور حامد سعید خاں صاحب سے خراجِ تحسین وصول کرچکے تھے اور ایک روشن شاعرانہ مستقبل کی پیشن گوئی پا چکے تھے۔ عرشی بھوپالی کو اگر بھوپال کا اسرار الحق مجاز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اگر انھیں موقع ملتا تو وہ بجا طور سے ان بزرگوں کی توقعات پر پورے اترتے۔ عرشی صاحب کے دوست واحباب اور ان کے برادرِ عزیز شمیم صاحب لائقِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے بھوپال کے آسمانِ شاعری کے اس ٹوٹے ہوئے تارے کے کلام کو جمع کرکے شائقینِ شعر و ادب کے ہاتھوں تک پہنچا دیا ہے۔ اب یہ ان کا کام ہے کہ وہ اس سے لطف اندوز ہوں اور اس کا مقام متعین کریں۔

"تقدیرِ حنا" کے نام سے معنون اس مجموعۂ کلام میں عرشی بھوپالی کی شخصیت اور شاعری پر بھوپال کی دو بزرگ ادبی شخصیتوں محترم اختر سعید خاں اور اشتیاق عارف صاحب کی رائیں اور احساسات بڑی تفصیل سے درج ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ اپنی زندگی میں ہی عرشی صاحب ادبی حلقوں میں کتنے پسند کیے جاتے تھے اور کتنے محبوب تھے۔

"تقدیرِ حنا" کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی باغ میں کوئی عندلیب گرمیٔ نشاطِ محبت میں نغمہ سنجی کر رہا ہو اور باغ کا ہر ہر گوشہ اس کی نغمہ سے بے خود ہوگیا ہو۔ عرشی بھوپالی کی شاعری بنیادی طور سے غزل کی شاعری ہے۔ عرشی کی شاعری میں آہنگ لفظ، اور صوت اس طرح ایک جان ہوگئے ہیں کہ شعر شاعر کی خودی و بے خودی، اور نشاط و مستی کا ترجمان بن گیا ہے۔ شاید ایسے ہی کلام کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"۔ عرشی کے کلام میں جگر مرادآبادی کی وارفتگی اور نغمگی کے ساتھ فیض کی شاعری کے رنگ اور آہنگ کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ جو روایتی غزلیہ شاعری سے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہے۔ اس میں درد و داغ و سوز و سازِ آرزو بھی ہے اور شکستِ آرزو بھی، جو عرشی کے عہد کا کرب بھی تھا اور ہمارے عہد کا کرب بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو چیز عرشی کے کلام کو زندہ رکھے گی وہ "زخم بن

جاؤں کبھی زخم کا مرہم بن جاؤں " کا انداز ہے۔
کیونکہ ہمارے سامنے آج جو شاعری آرہی ہے وہ ہمیں زخموں کے ایسے صحرا میں چھوڑ جاتی ہے جس کا کوئی انت نہیں ہے۔ شاید اس بات کا احساس شاعر عرشی کو بھی تھا تبھی اس نے اتنا خوب صورت شعر کہا جو آج اس کے دیوان کا عنوان بن گیا ہے۔

گُل کا ہے سلیقہ نہ بہاروں کا شعور
ہائے کن ہاتھوں میں تقدیرِ حنا ٹھہری ہے

عرشی کے کلام میں فیض کا انداز، سماجی آگہی، انقلابی آہنگ اور لہجے کی شائستگی اور ملائمت ان کے اخذ و قبول کی صلاحیت اور فطری شاعرانہ ذوق و شوق کی نشاندہی کرتا ہے اور قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ چند شعر اس مضمون کے ملاحظہ ہوں۔

ابھی نہ دے مجھے اذنِ بہار اے ساقی
ابھی حیات ستاروں سے ہم کلام نہیں

ہزار طرح سے رسوا ہیں اہلِ درد تو کیا ۔۔۔ سرِ دیار ہوئے ہیں ہزار بار ہوئے

جہانِ طوق و سلاسل سے تیرے دیوانے ۔۔۔ بڑے وقار بڑے بانکپن سے گزرے ہیں

عرشی بھوپالی نے تقریباً ۳۷ سال کی عمر پائی اور بقول ان کے برادرِ خورد شمیم صاحب ان کی دیوانگی کی مدت تقریباً ۱۲ سال ہے اس طرح ان کی ہوش مندی کی مدت ۲۴ سال ہوئی اس مختصر فرصت عمر میں اگر ان کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو اس میں دیوانگی کم اور فرزانگی زیادہ پائی جاتی ہے
مجموعۂ کلام کے آخر میں دو طویل نظمیں " آزادیٔ امروز " اور " رفیقوں کی رہائی سے متاثر ہو کر " درج ہیں۔ دونوں نظموں کا بیانیہ انداز، لفظیات، اور روانی میں عرشی کی غزل کا رنگ اور آہنگ چھپا ہوا ہے۔ ان نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر عرشی مرحوم کو خدا نے فرصت عطا کی ہوتی تو وہ اردو غزل کے ساتھ نظم کا حق بھی بخوبی ادا کرتے جس کی کمی بھوپال کے شعرا میں شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔
غرض عرشی بھوپالی کا پورا مجموعۂ کلام نقش ہائے رنگا رنگ سے بھرا ہوا ہے اور اس قابل ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچے، کیونکہ خود عرشی مرحوم کے الفاظ میں یہ اپنے پڑھنے والوں سے اس طرح سے مخاطب ہے۔

جو بن سکے نہ کسی طرح بھی ز ملنے سے
وہ نقش چھوڑ کے اٹھا ہوں آستانے سے

شاد عارفی، ایک مطالعہ

مرتب :- پروفیسر مظفر حنفی
صفحات :- ۴۰۴
قیمت :- ۱۲۵/- روپے
مبصر :- علقمہ شبلی (کلکتہ)
تقسیم کار: سسٹم ٹرسٹ پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریاگنج، نئی دہلی

شاد عارفی ہمارے ان قد آور شاعروں میں سے ہیں جو اپنے انفرادی رنگ و آہنگ کی وجہ سے ہر ہجوم میں نمایاں نظر آتے ہیں اور آوازوں کی بھیڑ میں بھی جن کی آواز بہ آسانی پہچان لی جاتی ہے لیکن یہ ہمارے ادب کا المیہ ہے کہ ایسا صاحب طرز شاعر بھی ناقدریوں اور پریشانیوں کا شکار رہا۔ ان کی روشن خیالی اور وطن دوستی کا غلط مفہوم لیا گیا اور اس کے لیے انھیں بڑی قیمت ادا کرنی پڑی اور غالباً انھیں حالات نے انھیں اپنے ماحول کی ذہنی بیماریوں اور سماجی ناہمواریوں پر وار کرنے کی دعوت دی۔ اردو میں طنز و مزاح کی روایت نئی نہیں لیکن دور حاضر میں جن شاعروں نے اس کی طرف خصوصی توجہ دی ان میں یگانہ چنگیزی اور شاد عارفی بہت نمایاں ہیں۔ شاد نے اپنی شوریدہ مزاجی، صاف گوئی اور بے باکی کی بدولت اردو شاعری میں ایسی تلخ حقیقت نگاری کا انداز پیدا کیا جو ان سے پہلے خال خال ملتی ہے۔ ان کی کھردری شاعری اور ان کے لہجے کا تیکھا پن ایک طرف معاشرتی تضادات کو آئینہ دکھاتا ہے تو دوسری طرف جدید شاعری کی راہ بھی ہموار کرتا ہے۔

شاد عارفی کے فن اور شخصیت سے پروفیسر مظفر حنفی کی نئی کتاب "شاد عارفی، ایک مطالعہ" حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب شاعر کے فن اور شخصیت کے متعلق مضامین اور آرا پر مشتمل ہے۔ 'باقیات شاد عارفی' کے عنوان سے شاد صاحب کے کلام، مضامین اور مکاتیب کا انتخاب بھی اس میں شامل ہے۔ اس سے پہلے بھی مظفر حنفی شاد صاحب کے شاعری مجموعوں کے علاوہ ان کے سلسلے میں "ایک تھا شاعر" (۱۹۶۷ء) اور شاد عارفی، شخصیت اور فن (۱۹۷۷ء) شائع کر چکے ہیں۔ اس لحاظ سے شاد عارفی بہت خوش نصیب ہیں جنھیں مظفر حنفی جیسا عقیدت مند ملا جن کی کاوشوں سے ان کی وفات کے چند سال کے اندر ہی ان کے فکر و فن کا بھرپور اعتراف کیا گیا۔

زیر نظر کتاب میں شخصیت پر پانچ مضامین ہیں۔ یہ مضامین ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کی خاص بات یہ ہے کہ شاد عارفی کی تصویر ایک انسان کی حیثیت سے پیش کی گئی ہے جس میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خامیاں بھی۔ محض مدح سرائی سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ شاد صاحب کی کمزوریوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس سے ان کی شخصیت اور فن کے محاکمہ میں مدد ملتی ہے۔ طاہرہ اختر کا "رڈن ماموں"، ایم پاشا کا "بٹن کا چاقو" اور ڈاکٹر سلیم اختر کا "شخصیت اور فن کا آئینہ" خصوصی مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔

شاد صاحب کے فن پر جو مضامین کتاب میں شامل ہیں ان میں فرمان فتح پوری کا مضمون "شاد عارفی: ایک طنز نگار غزل گو" مختصر ہونے کے باوجود اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ تاریخی تناظر میں شاد کی طنز نگاری پر وہ یوں روشنی ڈالتے ہیں۔

"ان (شاد) کا طنزیہ لہجہ کہیں کہیں غالب کے لہجے سے بہت قریب تر ہو گیا ہے، اتنا قریب کہ دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔۔۔۔ لیکن دو باتیں شاد عارفی کے لہجے کو بالکل الگ کر دیتی ہیں ایک تو یہ کہ اوپر غالب کے شعروں کے ذریعے جس طنزیہ لہجے کی نشان دہی کی گئی ہے، وہ غالب کے اسلوب کا ایک جزو ہے اور شاد عارفی کے طنز کا دامن، انداز نظر اور موضوع پر اعتبار سے غالب کے مقابلے میں وسیع، با مقصد اور بہت واضح ہے۔"

دوسرے مضامین بھی شاد عارفی کی غزل گوئی اور نظم نگاری کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں اور ان کی شاعری کی خصوصیات کو اجاگر کر کے ان کے فن کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے شاد عارفی کے خطوط کی خصوصیت کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے وہ رقم طراز ہیں:

"ان کے مطالعہ سے ہمیں نہ صرف شاد عارفی کی خط نگاری کے فن سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ ان کی طبیعت کی سادگی، بے ریائی، بے باکی، نرمی، گرمی، سختی کا جو علم ہوتا ہے اور ان کی فطرت، مزاج، میلان، رجحان، دلچسپی، شغل سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کی دھوپ چھاؤں سے ہی آگاہی نہیں ہوتی بلکہ بعض ایسی حقیقتیں بھی روشن ہو جاتی ہیں جن کا علم عام طور سے نہیں ہو سکتا تھا۔"

زیر نظر کتاب میں شامل ۷۵ مکاتیب سے بھی دسنوی صاحب کے خیالات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ظ۔ انصاری کے نام ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہے۔

"چوں کہ آئینہ کے متعلق آپ نے میری رائے معلوم کی ہے۔ اس لیے میں جو کچھ لکھ رہا ہوں اسے ذرا غور سے مطالعہ کریں۔ اب آپ نے سلام مچھلی شہری اور ساغر نظامی مکالمہ نثر کر دیا ہے جو بذات خود محل نظر ہے۔ بقول یگانہ چنگیزی یہ "چھٹ بھیئے" فن کو کیا جانیں۔ شاعری کی دم انھیں نہیں سوجھتی۔ غزل گوئی اور شاعری کا فرق، بڑا فرق ہے جو شعر کہنا اور شعر گھڑنا دو مختلف کیفیات کا نام ہے جو بلند و پست کی حیثیت رکھتا ہے۔"

کتاب میں شاہیر ادب کے مختصر تجزیے اور رائیں بھی شامل ہیں، جو اپنے اختصار کے باوجود شاد عارفی کے فکر و فن کو ابھارنے میں مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔ شاد عارفی کے مضامین اور منظومات کے انتخاب نے بھی کتاب کو دستاویزی شکل دے دی ہے۔ مظفر حنفی صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کی تحسین و تقلید نہ کرنا ادبی گناہ کے مترادف ہے۔"

پاکستانی مطبوعات

مندرجہ ذیل کتب صرف ایک ایک یا دو، دو کی تعداد میں ہیں جن کا آرڈر پہلے آجائے گا اس کی تعمیل کر دی جائے گی۔ (ادارہ)

اردو رسم الخط کے بنیادی مباحث (لسانیات)
ڈاکٹر سہیل بخاری ۳۰/
اصول نفسیات اوّل (نفسیات) پروفیسر عبدالحئی علوی ۵۰/
" " دوم " " " ۷۵/
تدریس اردو (تعلیم) ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۴۸/
منتخبات اخبار اردو (تحقیق) ڈاکٹر معین الدین عقیل ۹۲/
لسانی مقالات حصہ اول (تحقیق) سید قدرت نقوی ۵۰/
" دوم " " ۵۲/
سوم " ڈاکٹر سہیل بخاری ۸۵/
اردو زبان میں ترجمہ کے مسائل (تعلیم) اعجاز راہی ۴۵/
ترجمے کا فن (تعلیم) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ۳۵/
منتخبات اردو نامہ (تحقیق) ڈاکٹر معین الدین عقیل ۷۵/
اردو میں فنی تدوین (تحقیق) ڈاکٹر ایم ایس ناز ۱۵۰/
جاویدان اقبال اول (اقبالیات) ڈاکٹر جاوید اقبال ۱۱۵/
" " سوم " " ۱۰۰/
" چہارم " " ۱۲۵/
اردو میں لغت گوئی (مذہبیات) ڈاکٹر ریاض مجید ۱۷۵/
شارحین غالب کا تنقیدی مطالعہ اول (غالبیات)
ڈاکٹر محمد ایوب شاہد ۱۲۵/
" " دوم " " ۹۰/
ابلاغ عام کے نظریات (ذرائع ترسیل) ڈاکٹر محمد شمس الدین ۳۰/
مغرب سے نثری تراجم (تعلیم) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ۱۴۰/
فرہنگ اثر (مجلد) جلد سوم اثر لکھنوی ۱۴۰/
" " چہارم " " ۷۵/

فرہنگ عامرہ (لغت) محمد عبداللہ خاں خویشگی ۱۲/
تصویری صحافت (جرنلزم) مہدی حسن ۳۶/
ریڈیائی صحافت " سجاد حیدر ۳۶/
اقبال بنام شاد (اقبالیات) محمد عبداللہ قریشی ۵۰/
مکتوب نگاری ڈاکٹر مسکین علی حجازی ۳۶/
لسانیات پاکستان (لسانیات) ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی ۸۵/
کتابیات تراجم اول ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ۷۵/
" " دوم " ۵۵/
روداد سیمینار اصول تحقیق (تحقیق) اعجاز راہی ۲۵/
تاریخ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (سیرت) ایم۔ ڈی فاروقی ۲۰۰/
پیام مشرق (اقبالیات) ۳۵۰/
میزان اقبال (اقبالیات) پروفیسر محمد منور ۱۰۰/
اردو میں بچوں کا ادب ڈاکٹر محمود الرحمٰن ۵۰/
اردو مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) نور احمد شاد ۴۵/
زبان و بیان (لسانی مقالات) وارث سرہندی ۳۵/
ہندی اردو لغت (لغت) راجا راجیشور راؤ اصغر ۹۰/
اردو نثر میں سیرت رسولؐ (سیرت) ڈاکٹر انور محمود خالد ۱۷۵/
نقد اقبال حیات اقبال (اقبالیات) ڈاکٹر تحسین فراقی ۲۰۰/
پیام مشرق (اقبالیات) ڈاکٹر عبدالوہاب عزام ۲۱/
تعلیم کا مسئلہ (تعلیم) ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ۲۴/
قرآن اور سنت کی روشنی میں۔ خلا کا اسلامی تصور
عبدالقادر وارثی ۱۲۵/
سید عابد علی عابد ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ ۱۵۰/
اقبال کا سیاسی سفر (اقبالیات) محمد حمزہ فاروقی ۱۷۵/
اقبال اور عالمی ادب " ڈاکٹر عبدالمغنی ۱۴۰/
سنسکرت اردو لغت (لغت) ڈاکٹر محمد انصار اللہ ۲۰/
لسانی رابطہ پروفیسر پریشان خٹک ۳۵/
اردو سندھی کے لسانی روابط۔ شرف الدین اصلاحی ۴۲/
منتخبات اردو نامہ اول ڈاکٹر معین الدین عقیل ۸۵/
مختصر قانونی اصطلاحات مولوی فیروز الدین ۱۲/
غیر ملکیوں کے لیے اردو ڈاکٹر عابدہ سلطانہ ۱۲/

اردو میں عدالتی فیصلہ نویسی اور منتخب عدالتی فیصلے
ڈاکٹر عبدالمالک عرفانی ۱۵/
قومی زبان یک جہتی نفاذ اور مسائل۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ۳۲/
اصطلاحات بیمہ کاری ڈاکٹر سہیل بخاری ۲۰/
اصطلاحات کسٹم حسین احمد شیرازی ۲۵/
بیمہ کاری بیدار ملک ۸۰/
پنجاب کے قدیم اردو شعرا خورشید احمد خان یوسفی ۵۶/
ہمارے کتب خانے ڈاکٹر ملک حسن اختر ۳۲/
درجہ بندی سید ریاض الدین ۶۰/
کشاف اصطلاحات تاریخ محمد صدیق قریشی ۱۵/
کتابیات قواعد اردو ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری ۴۰/
کشاف اصطلاحات سیاسیات دوم
محمد صدیق قریشی ۴۰/
ذہن انسانی کا حیاتیاتی پس منظر شہزاد احمد ۴۶/
مسل بندی و مسل داری پروفیسر نیاز عرفانی ۲۵/
قومیت کی تشکیل اور اردو زبان جیلانی کامران ۵۵/
اردو کے قدیم عدالتی نمونے میاں محمد اسلم ۳۶/
اردو اور پشتو کے مشترک الفاظ پروفیسر پریشان خٹک ۲۵/
تعلیمی عمرانیات ڈاکٹر مظفر حسن ملک ۸۰/
کتابیات قانون اردو عطش درانی ۱۵/
فرہنگ اصطلاحات برقیات طارق محمود ۴۰/
وفیات مشاہیر پاکستان پروفیسر محمد اسلم ۱۰۰/
سرکاری خط و کتابت دوم ربیعہ فخر/محمد اظہار الحق ۵۰/
〃 〃 سوم واحد خان چیمہ ۵۵/
〃 〃 چہارم نیاز عرفانی ۵۵/
〃 〃 پنجم محمد اظہار الحق ۵۰/
〃 〃 ششم مجلد مسعود احمد چیمہ ۶۰/
〃 〃 ہفتم 〃 محمد اظہار الحق ۶۰/
〃 〃 ہشتم 〃 〃 ۴۶/
〃 〃 نہم 〃 محمد عطاء اللہ خان ۸۲/

بچوں کی پاکستانی کتابیں

مندرجہ ذیل کتب ایک ایک دو، دو کی تعداد میں ہیں جس کا آرڈر پہلے آجائے گا اس کی تعمیل کردی جائے گی۔ (ادارہ)

نجاشی کا دربار شاہدہ بخاری ۶/
چاندی کا جوتا صفیہ سلطانہ صدیقی ۸/
چنومنو اور شیطان پروفیسر عنایت علی خان ۶/
انوکھا خزانہ ڈاکٹر محمود الرحمٰن ۸/
غلطی کا نتیجہ اعجاز احمد ۶/
نیت کا پھل عشرت رحمانی ۸/
پھول ہی پھول پروفیسر محمد اسحاق ۶/
دو مائیں 〃 ۸/
نافرمان بیٹا ام کاشان ۶/
پیاری کہانیاں پروفیسر عنایت علی خان ۶/
تمہارا یہ آنسو محمد افتخار/محمد شاہد ۷/
سلطان کی سائکل 〃 〃 ۶/
ٹیلی فون کی گھنٹی سید جنید اخلاق ۱۲/
آغاز سفر محمد افتخار/محمد شاہد ۷/
خوشگوار حادثہ سید ریحان احمد ۸/
کالا پتھر محمد عمران احمد خان ۱۰/
صبر کی چٹان محمد افتخار ۸/
ماسٹر جی محمد افتخار/محمد شاہد ۷
خواب مرتے نہیں محمد افتخار ۱۰/
سالگرہ کا تحفہ شگفتہ فاضل ۱۲/
اونچے درختوں کا باغ محمد افتخار/محمد شاہد ۹/
کالا چور 〃 〃 ۹/
آہ کا اثر محمد افتخار ۸/
خدا پر بھروسہ محمد افتخار/محمد شاہد ۸/
پہلا فضائی حملہ زبیر طارق ۱۲/
نقصان کی تلافی عامر یونس ۱۰/

حرکت میں برکت	محمد افتخار / محمد شاہد	۹/	نقاب پوش	محمد افتخار	۱۰/
آٹو گراف	انیسہ سلیم	۱۲/	سنگین وجہ	محمد افتخار / محمد شاہد	۱۰/
چڑیا کی دوستی	محمد افتخار	۱۰/	بد دیانتی کا انجام	محمد افتخار	۸/
تین دوست	محمد افتخار / محمد شاہد	۸/	کایا پلٹ	محمد افتخار / محمد شاہد	۶/
سات کہانیاں	محمد افتخار	۱۴/	زندگی کے آداب	خواجہ عابد نظامی	۸/
روشنی کی تلاش	زبیر طارق	۱۲	اخلاقی کہانیاں	//	۱۲/

مکتبہ پیام تعلیم کی کم قیمت پر عمدہ کتابیں

سوانح

بچوں کے غلام السیدین	ذکیہ ظہیر	۵/
قصہ میر امن دلی والے کا	ڈاکٹر اسلم فرخی	۴/
بچوں کے ڈاکٹر سید عابد حسین	صغرا مہدی	۴/
// مولوی عبد الحق	ڈاکٹر خلیق انجم	۴/۵۰
// مرزا غالب	ڈاکٹر اسلم فرخی	۴/
// محمد حسین آزاد	//	۴/
// ڈپٹی نذیر احمد	//	۴/
// رنگا رنگ خسروؒ	//	۴/
// سلطان جیؒ	//	۴/۵۰
مولانا شبلی نعمانی	//	۴/۵۰
بچوں کے صالحہ عابد حسین	ڈاکٹر صغرا مہدی	۴/
مولانا اسماعیل میرٹھی	حکیم نعیم الدین زبیری	۲۱/
ہمارے عظیم سائنس داں	حکیم محمد سعید	۸/
چند مشہور طبیب اور سائنس داں	(ادارہ)	۹/
مولانا آزاد کی کہانی	ظفر احمد نظامی	۱۸/
بچوں کے ذاکر صاحب	مرتبہ عبد اللہ ولی بخش قادری	۴/
اندرا گاندھی کی کہانی	شمیم حنفی	۶/
بچوں کے چار بزرگ دوست	صالحہ عابد حسین	۲/۵۰
امیر خسروؒ	(ادارہ)	۲/۵۰

جوہر قابل	مسعود احمد برکاتی	۳/
شفیع الدین نیر	اطہر پرویز	۷/۵۰
گاندھی بابا کی کہانی	بیگم قدسیہ زیدی	۱۲/
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں	یوسف ناظم	۳/
میر انیس	محمد حسین حسان	۲/

سائنس، طب اور عام معلومات

چیزوں کی کہانی	آصف فرخی	
یہ کیسا بخار ہے	(ادارہ)	۴/۵۰
آپ کا جسم	علی ناصر زیدی	۶/
گندا پانی	ادارہ	۴/۵۰
کیوں اور کیسے	محمد ابراہیم شاہ	۶/
سائنس کی دنیا	فرید الدین احمد	۸/
کمپیوٹر کیا ہے	حکیم نعیم الدین زبیری	۸/
ذرے کی	مہدی جعفر	۲۱/
عجائب گھر	قاسم صدیقی	۱۲/
علاج میرا دشمن	//	۹/
پرواز کی کہانی	علی ناصر زیدی	۶/
غذا کی کہانی	//	۳/
زنگوں کی بستی	سہیل انور	۵/

ادبی تہذیبی خبریں

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کو ایوارڈ برائے تنقید

گزشتہ دنوں بزم فروغ ادب کی جانب سے مشہور ناقد، شاعر اور انشائیہ نگار ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کو سال ۱۹۹۴ء کا ادبی ایوارڈ برائے تنقید ایک خصوصی جلسے میں پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر ارشد ان دنوں بی۔ این کالج پٹنہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو کے عہدے پر فائز ہیں اور ان کی آدھا درجن تنقیدی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ایوارڈ سے متعلق استقبالیہ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر عبد المغنی نے اس یقین کا اظہار کیا کہ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد بہار کی ادبی تنقید کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ بہار میں جو نئی نسل کے تنقید نگار ہیں ان میں سب سے امید افزا نام ڈاکٹر ارشد کا ہے اس جلسے میں ڈاکٹر قدوس جاوید، شفیع جاوید، شفیع مشہدی، جناب سید رضی حیدر، ایڈیٹر روزنامہ صدائے عام، جناب اشرف فرید ایڈیٹر قومی تنظیم، جناب ہارون رشید اور جناب فخر الدین عارفی کے علاوہ ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کی کثیر تعداد موجود تھی۔

"بنیاد" کا یوسف ناظم نمبر منظر عام پر

پچھلے دنوں بمبئی سے ایک خالص علمی وادبی رسالہ "بنیاد" کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ رسالہ سال میں دو بار شائع ہوگا۔ اس بار معروف مزاح نگار جناب یوسف ناظم کے فن و شخصیت پر ایک نمبر شائع کیا گیا ہے جس میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر صفی الدین صدیقی، ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، پرویز اللہ مہدی، مشتاق مومن اور مظہر سلیم نے یوسف ناظم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس ادبی رسالے کے مدیر سلطان علی خاں اور شریک مدیر مظہر سلیم ہیں۔ اس نمبر کی قیمت ۴۵ روپے ہے۔ زر سالانہ ۵۰ روپے۔ ادب ذوق قارئین اسے مندرجہ ذیل پتوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۔ بی ۴ کاکو گنج، ا۔ نیسبت روڈ، مجگاؤں بمبئی ۱۰
۲۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ، ناکہ جے جے ہسپتال بمبئی ۳

ہریانہ اردو اکادمی کے کتابوں پر انعام

سال ۱۹۹۲-۹۳ء کے لیے اکادمی نے تین قلم کاروں کو ان کی کتابوں پر الگ الگ چار ہزار روپے کے انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ انعام پانے والے قلم کار جناب امیر چند بہار (زخم و مرہم)، جناب بلبیر سنگھ راسخ (لہر لہر) اور جناب رام لعل نابھوی (چکبست) قرار دیے گئے ہیں۔

سرونج میں سیمینار اور مشاعرہ

مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال کی جانب سے ایک روزہ سیمینار اور مشاعرہ مشہور تاریخی بستی سرونج میں بتاریخ ، فروری ۹۴ء منعقد کیا گیا۔ سیمینار مرحوم وقار قاطمی کے نام معنون کیا گیا جس میں وقار فاطمی کے فن پر جناب فضل تابش نے مضمون پڑھا۔ ڈاکٹر شاہد میر نے سرونج کی دو سو سالہ شعری تاریخ کا جائزہ لیا اور ڈاکٹر شان فخری نے سرونج کی نثری خدمات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر خالد محمود کے مقالے کا موضوع

سرونج کے اساتذۂ فن تھا۔

سیمینار کی نظامت پروفیسر مختار شمیم اور صدارت ویرنارائن شرما نے کی۔ پروفیسر آفاق احمد سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکادمی بطور مہمان خصوصی شریک رہے۔

مشاعرہ جناب دانش مالوی کی صدارت اور ڈاکٹر بشیر بدر کی نظامت میں دیر رات تک جاری رہا۔ جناب راہی قاسمی، کلیم سرونجی، شاہد میر، ضیا اسدی، خالد محمود، مختار شمیم، شان فخری سیفی سرونجی، شفیق سرونجی، ظفر سرونجی، محمود ذکی (اجین)، قاضی محمود (بھنڈ)، عزیز اندوری (اندور)، فضل تابش، فضل صہبا بھوپال، شاہد بھوپالی، رہبر جونپوری (تمام بھوپال سے) نے شرکت کی۔ تمام تقریبات کے کنوینر ڈاکٹر شاہد میر تھے جنھوں نے آخر میں تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

رفیق رہبر کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

گلبرگہ ۳ مارچ (راست) جناب محمد رفیق رہبر لکچرار اردو ایم ایس آئی کالج گلبرگہ کو گلبرگہ یونی ورسٹی نے ان کے مقالہ محمد اکبر الدین صدیقی حیات اور کارنامے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے، یہ مقالہ پروفیسر ڈاکٹر طیب انصاری کے زیر نگرانی لکھا گیا۔

شعبۂ اسلامیات میں تعزیتی جلسہ

آج یکم مارچ ۱۹۹۴ء کو ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی صاحب کی رحلت پر شعبۂ اسلامیات و شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے جلسہ منعقد کیا گیا۔ جلسہ مولانا عبدالکریم صاحب کی

خواتین بھوپال کی ادبی و سماجی تنظیم دھنک میں معروف افسانہ نویس و ناول نگار جیلانی بانو بحیثیت مہمانِ خصوصی، تصویر میں آپ کے ساتھ فرحت جہاں، مہر النساء پرویز، شفیقہ فرحت (صدر تنظیم)، بیگم عادل رشید، فیروزہ تجمل اور خورشید سکندر بخت

تلاوت کلام پاک سے شروع ہوا اور صدر شعبہ پروفیسر محمد سالم قدوائی صاحب نے ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب مرحوم کی زندگی اور خدمات پر روشنی ڈالی، ان کے بعد شعبہ عربی کے سابق صدر اور مشہور محقق پروفیسر مختار الدین صاحب نے ندوی صاحب مرحوم کی علمی اور تحقیقی کاموں کی وضاحت فرمائی۔ پروفیسر لیٰین مظہر صدیقی نے مرحوم ندوی صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کیے، آخر میں ڈاکٹر احتشام بن حسین صاحب نے تعزیتی قرارداد پیش کی۔ جلسے میں شعبہ عربی دراسات ایشیا مغرب اور مولانا آزاد لائبریری کے اساتذہ اور اراکین نے شرکت کی دعائے مغفرت کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

اشتیاق عالم اعظمی کو پی، ایچ، ڈی، تفویض

جواہر لال نہرو یونی ورسٹی نے اشتیاق عالم اعظمی کو ان کے مقالہ، "مغرب کا ہجری اردو ادیب ایک مطالعہ" پر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے، مقالہ اردو زبان کے وسیع تر ادب میں ایک نئے عنوان اور ایک نئے باب کا اضافہ ہے' اس کے نگراں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی تھے۔ ممتحن پروفیسر شمیم اختر اور پروفیسر عنوان چشتی تھے۔

سرور کائناتؐ کی شان مبارک میں

کہے ہوئے بہترین اشعار

بزم اقبال کی خصوصی مجلس میں باتفاق رائے تجویز پاس کی گئی کہ آج تک ہندو پاک و بیرونی ممالک میں جتنے بہترین اشعار رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ مبارک میں کہے گئے ہیں ان کو جمع کر کے ایک خوبصورت اور ضخیم کتاب "ثنائے محمدؐ" کے نام سے قارئین کو پیش کی جائے۔

اس لیے گزارش ہے کہ جن حضرات کو نعت پاک کے اپنے یا کسی دوسرے کے بہترین اشعار یاد ہوں وہ بزم اقبال کے پتے پر ارسال فرمائیں ہم ان اشعار کو بعد شکریہ ان کے نام کے ساتھ اس متبرک کتاب میں شائع کریں گے۔

پتا: بزم اقبال، ۹ گلشن اقبال، نزد رمبھا ٹاکیز
جنسی جہانگیر آباد بھوپال ایم، پی

پٹنہ دوردرشن بلاتاخیر اردو پروگرام کی شروعات کرے

اردو کے مشہور افسانہ نگار اور حلقہ ادب بہار کے جنرل سکریٹری جناب فخر الدین عارفی نے دور درشن کیندر پٹنہ کے اسٹیشن ڈائرکٹر مسٹر ایم۔ پی ورما سے پر زور مطالبہ کیا ہے کہ وہ پٹنہ دور درشن سے بلاتاخیر اردو پروگرام کے نشریے کا بندوبست کریں۔ مسٹر فخر الدین عارفی نے اس بات پر اپنے گہرے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ دور درشن کیندر پٹنہ سے روزانہ آدھے گھنٹے کا مقامی پروگرام نشر کیا جاتا ہے جو اکثر ہندی اور کبھی کبھی بھوجپوری پروگرام پر مشتمل ہوتا ہے لیکن اس میں اردو کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، جبکہ اردو نہ صرف یہ کہ بہار کی دوسری سرکاری زبان ہے بلکہ اس کے بولنے کی تعداد ریاست میں ایک کروڑ تیس لاکھ سے بھی زائد ہے۔

شجاع خاور کا نام

میں نے اپنا قلمی نام مختصر کرنے کی غرض سے حال ہی میں ایک اعلان شائع کرایا تھا جس

کے مسلسل ردِ عمل سے صاف ہے کہ تمام قارئین نے میرے اس فیصلے کو نامنظور سا کر دیا ہے۔

پس میں اپنا مذکورہ اعلان القط کرتا ہوں۔

نتیجہ یہ کہ حسب سابق میرا پورا نام ہی شائع ہوا کرے گا۔ یعنی شجاع خاور۔

تعزیتی نشست

جھریا۔ گزشتہ دنوں صاحب طرز ادیب صحافی کلام حیدری کے سانحہ ارتحال پر ۲۰ فروری شام ۴ بجے نیشنل اسکول آف لرننگ شمشیر نگر جھریا میں ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت کلام حیدری کے دیرینہ رفیق جناب گیان پرکاش رہبر نے کی۔ سب سے پہلے کلام حیدری کی دو منٹ خاموش رہ کر بارگاہ ایزدی میں دعا مغفرت کی گئی۔ پھر یکے بعد دیگرے شرکاء نے کلام حیدری کی ادبی اور صحافتی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا۔ شرکاء میں عمائدین شہر کے علاوہ جناب الیاس احمد گدی، غیاث احمد گدی مرحوم کے بڑے صاحبزادے تصور ربانی آمر صدیقی، پروفیسر رونق شہری، غیاث اکمل وقار عسکری، عاشق ظفر، ڈاکٹر حبیب عادل امتیاز دانش، حسن نظامی، نثار احمد نثار، ابو طلحہ فخر، محمد جمیل قابل ذکر ہیں۔

گلدستہ عیدین و تہوار و تقاریب کی اشاعت

اردو ادب کے ممتاز نثر نگار جناب محمد رضی الدین معظم صاحب انچارج گزیٹیڈ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول دارالعلوم حیدرآباد کی تازہ ترین تصنیف "گلدستہ عیدین و تہوار و تقاریب" شائع ہو چکی ہے ۲۵۸ صفحات پر مبنی اس تصنیف میں جملہ مذاہب کے عیدین تہوار کے علاوہ قومی تقاریب پر مبنی (۱۰۲) مضامین شامل ہیں جس میں ممتاز عالم دین حضرت علامہ مولانا الحاج مفتی محمد عظیم الدین صاحب ممتاز صحافی حضرت محمد محبوب حسین جگر صاحب نائب مدیر روزنامہ سیاست ممتاز مزاح نگار ڈاکٹر نریندر لوتھر صاحب اور ممتاز خاتون ادیب پروفیسر ڈاکٹر زینت ساجدہ صاحبہ کی گرانقدر آراء شامل ہیں۔ کتاب "گلدستہ عیدین و تہوار تقاریب" مبلغ ۸۰ روپے میں، محافظ الحاشعین ۸۶۶ رحیم منزل شاہ گنج حیدرآباد ۲ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

مصطفیٰ فقیہ صاحب نہیں رہے

کوکن برادری کی ممتاز شخصیت، سابق وزیر اور انجمن اسلام بمبئی کے نائب صدر عالیجناب غلام مصطفیٰ فقیہ صاحب کا پیر ۲۸ فروری ۹۴ء گزر کر شب میں انتقال ہوا۔ مرحوم کئی دنوں سے علیل تھے۔ عوام کے محبوب اور محترم رہنما کا آخری دیدار کرنے کے لیے ان کا جسدِ خاکی یکم مارچ صبح اسلام پوری بندر کے گراؤنڈ پر لایا گیا پھر ان کے وطن بھیونڈی ضلع تھانہ میں لے جا کر تدفین عمل میں آئی۔

مولانا کوثر نیازی کا انتقال

مولانا کوثر نیازی کا آج اسلام آباد میں دماغ کی رگ پھٹ جانے سے انتقال ہو گیا۔ وہ ۶۱ برس کے تھے۔ مولانا مرحوم اسلامی فقیہہ کونسل کے سربراہ تھے۔

مولانا کوثر نیازی مرحوم کو دماغ کی رگ پھٹنے کے بعد اسلام آباد میں انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (پاکستان) میں دا

کرایا گیا تھا۔ مولانا مرحوم نے جماعت اسلامی کے رکن کی حیثیت سے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا تھا لیکن اسلام اور دوسرے امور پر ان کے خیالات اعتدال پسند تھے۔ وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے اور مسٹر بھٹو کی کابینہ میں پہلے وزیر اعلا اور پھر بعد میں وزیر مذہبی امور بنائے گئے۔ ان کا شمار اچھے مصنفوں میں کیا جاتا تھا۔

شمس الزماں کا انتقال

نئی دہلی۔ معروف صحافی، مفکر، اردو دوست اور سماجی کارکن مسٹر شمس الزماں کا آج دوپہر آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۵۲ برس کے تھے۔ پسماندگان میں بیوہ، ایک بیٹی، بھائی اور بے شمار احباب و پرستار ہیں۔ تدفین شام کو نظام الدین میں واقع قبرستان پنج پیراں میں ہوئی۔ وہ اخبار سنڈے میل کے پبلشر تھے۔

شمس الزماں نہایت ہی خوش اخلاق، نیک دل، اور دوست نواز انسان تھے، ادبی، تہذیبی سماجی زندگی میں ہمیشہ سرگرم اور پیش پیش رہنے والے زندہ دل شمس الزماں کی پیدائش ۱۹۴۲ء میں بھاگل پور (بہار) میں ہوئی تھی۔ صحافتی زندگی کا آغاز انھوں نے کلکتہ سے شروع کیا۔ وہ آزاد ہند اور اردو کے کئی دیگر اخبارات سے منسوب رہے۔ انھوں نے کچھ عرصہ حیدرآباد میں بھی گزارا۔ وہاں سیاست کے اسسٹنٹ اڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔

مرحوم ظ۔ انصاری نے بمبئی سے جب آئینہ کی اشاعت دوبارہ شروع کی تو شمس الزماں نے بھی ان کے ساتھ ادارتی ذمہ داری نبھائی۔ وہ ۱۹۷۵ء میں دہلی آئے اور یہاں کی سماجی و ادبی زندگی میں سرگرم ہو گئے۔ راجدھانی کی کئی ادبی و ثقافتی انجمنوں سے وابستہ رہے۔ دلی اردو اکادمی سے ایوارڈ حاصل کیا۔ فلم سنسر بورڈ کے ممبر ہونے کے علاوہ آرگنائزیشن آف انڈر اسٹینڈنگ اینڈ فریٹرنٹی کے جنرل سکریٹری تھے۔ انگریزی ماہنامہ "تھرڈ ویو" کے مدیر رہے۔ انھیں موسیقی سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔

ان کے انتقال پر ممتاز طنز و مزاح نگار مسٹر مجتبیٰ حسین نے کہا کہ شمس الزماں کے یوں اچانک انتقال سے اردو زبان و صحافت ایک سرگرم اور بے باک صحافی سے محروم ہو گئی ہے۔ وہ بے حد مخلص اور ہر کسی کے کام آنے والے انسان تھے۔ اردو اکادمی کے سابق سکریٹری مسٹر اشتیاق حسین عابدی نے کہا کہ اردو دنیا ایک باصلاحیت اور زندہ دل انسان سے محروم ہو گئی۔

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں "ہم سخن" کا رسم اجرا

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں طالب علموں کی پندرہ روزہ دیواری میگزین "ہم سخن" کا اجرا شیخ الجامعہ پروفیسر بشیر الدین صاحب کے دستِ مبارک سے عمل میں آیا۔

تقریب کی صدارت پروفیسر عنوان چشتی (ڈین و صدر شعبۂ اردو) نے کی۔ جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ بعد ازاں میگزین کے مدیر اسلم جمشید پوری نے میگزین کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ صدر شعبۂ اردو، پروفیسر عنوان چشتی صاحب نے مہمان خصوصی جناب پروفیسر بشیر الدین وائس چانسلر کا خیر مقدم کیا۔ نیز فیکلٹی آف لسانیات اور بطور خاص شعبۂ اردو کے معاملات و مشکلات

میں وائس چانسلر صاحب کی خصوصی توجہ کا شکریہ ادا کیا۔ وائس چانسلر صاحب نے اپنی تقریر میں میگزین کی اشاعت پر مسرت کا اظہار کیا۔ اور اسے طلبہ کی ذہنی و تہذیبی تعمیر کے سلسلے میں ایک مثبت قدم بتایا۔ آخر میں ڈاکٹر صغرا مہدی، ناظم تقریب نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب میں جن حضرات نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں خواجہ محمد شاہد (رجسٹرار) پروفیسر حنیف کیفی، پروفیسر شمیم حنفی، زیڈ۔ رحمٰن نیّر (مدیر بیسویں صدی) ڈاکٹر سہیل فاروقی (مدیر جامعہ) ڈاکٹر قمر غفار (صدر شعبۂ فارسی) ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی (صدر شعبۂ عربی) ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی، ڈاکٹر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر شہناز انجم ڈاکٹر صادقہ ذکی، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر شمیع افروز زیدی، ڈاکٹر رضی احمد کمال، ڈاکٹر شرما، ڈاکٹر اقتدار عالم، ڈاکٹر فریدہ خانم، ڈاکٹر اقبال احمد، ڈاکٹر نور الاسلام، ڈاکٹر گپتا وغیرہ۔ تقریب میں شعبۂ اردو کے علاوہ فیکلٹی آف ہیومینٹیز کے جملہ شعبوں کے طلبہ و طالبات نے بھی شرکت کی۔

اس موقع پر نیشنل اسلامک فورم کے تحت انٹر یونی ورسٹی مقابلوں میں شعبۂ اردو کے طالب علموں کے ذریعہ تقریری و تحریری میں حاصل کی جانے والی ٹرافیاں بھی وائس چانسلر صاحب نے طلبہ و طالبات کو اپنے دست مبارک سے عطا کیں اور مبارکباد دی۔

مشہور شاعر محسن زیدی نے لکھنؤ بسا لیا

نئی دہلی۔ اردو کے مشہور و مقبول شاعر محسن زیدی ریٹائر منٹ لینے کے بعد اب مستقل طور پر لکھنؤ میں آباد ہو گئے موصوف کا پتا یہ ہے۔

محسن زیدی
۱۸/۵۴ - اندرا نگر۔ لکھنؤ۔ یو۔ پی

سید محمد ابراہیم کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری

مدراس کے سید محمد ابراہیم کو بہار یونیورسٹی مظفر پور نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ آپ نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان "قربی ویلوری حیات و خدمات" ڈاکٹر نجم الہدیٰ صاحب پروفیسر و صدر شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی مظفر پور (بہار) کی نگرانی میں لکھ کر پیش کیا تھا۔ مقالہ نگار فی الحال گورنمنٹ مدرسۂ اعظم ہائر سکنڈری اسکول مدراس کے اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر ہیں اور مدراس کے مشہور و معروف حکیم ڈاکٹر الحاج میر طفیل احمد کے فرزند ہیں۔

سرسیّد کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے

پروفیسر خلیق احمد نظامی

ہمارے عہد کے صف اول کے مورخ، ادیب اور تصوف کے ماہر پروفیسر خلیق احمد نظامی نے محسن اعظم سرسید کی شخصیت، فکر و نظر عقائد اور ان کی قومی خدمات کا بھرپور جائزہ لے کر بتایا ہے کہ ہمارے عہد میں سرسید کی معنویت کیا ہے۔

سرسیّد کی شخصیت اور ان کی خدمات پر مختلف زبانوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں یہ کتاب اہم اضافہ ہے۔

ضخامت: ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ۸۰/ روپے

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانبدارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ
کتاب نما
نئی دہلی ۲۵

مئی ۱۹۹۴ء جلد ۳۴ شمارہ ۵

فی پرچہ 6/=
سالانہ 55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 75/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) 170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 320/=

ایڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
TELEPHONE 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پرنٹر پبلشر سید دسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں/غزلیں

مانگے کا اجالا

طنز و مزاح

کہانی

کھلے خطوط

جائزے — عبارت کیسے لکھیں/تشدید/نفی مرکب نفی/احمد شوقی ایک مطالعہ/دیس دیس کے اجالے/موسم موسم بہ پیہم شعور ادراک

نئی مطبوعات

مولانا عبدالوحید صدیقی (شخصیت اور ادبی خدمات)
کتاب نما کا خصوصی شمارہ پروانہ ردولوی ۵۱/-
اردو صحافت عدالت اور آزادی رائے عشرت علی صدیقی ۱۰/-
لو (شعری مجموعہ) تسنیم فاروقی ۱۰۰/-
ہندوستانی جمالیات اوّل (جمالیات) شکیل الرحمٰن ۲۰۰/-
" دوم " " ۶۰/-
پطرس کے خطوط (خطوط) پطرس بخاری ۳۰/-
برصغیر میں اردو ناول (تنقید) ڈاکٹر خالد اشرف ۲۰۰/-
عشہزادکا (ناول) کرن ٹھاکر ۸۰/-
چاند چراغ (شاعری) کمار پاشی ۶۰/-
پانچواں آسمان " ساحر شیوی ۷۵/-
سرورِ عالمؐ (سیرت رسولؐ) مولانا غلام رسول مہر ۳۰/-
سیرۃ النبی بعلاز وصال نبی " مولوی عبدالمجید صدیقی ۶۰/-
مجربات بوعلی سینا (طب) بوعلی سینا ۱۰۰/-
علم الصیدلہ " دنیم احمد اعظمی ۴۰/-
فیروز اللغات جیبی (اردو لغت) مولوی فیروز الدین ۲۵/-
ادب اسلوبیات (مضامین) ڈاکٹر نصیر احمد خان ۵۰/-
اردو نثر کا فنی ارتقاء (تنقید) ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۲۰۰/-
نعت سرور (نعتیہ کلام) قاری سرور علی خاں قادری ۱۰/-
آؤ بہنیں (کہانیاں) (N.B.T.) مترجم سجاد رضوی ۱۴/-
سوغات نمبر (مجلہ) محمود ایاز ۸۰/-
قصیدہ نبی رحمتؐ (قصیدہ) حفیظ بنارسی
نجات کا راستہ پروانہ ردولوی ۲۲/-
خود رو (شعری مجموعہ) سید بشارت علی ۸۰/-
میدان (غزلیں) انور ندیم ۸۰/-
خوابوں کے ہم سایے شاہد جمیل ۸۵/-
رقص درویش (تاریخی ناول) اسلم راہی ۸۰/-
آشیانوں کے متلاشی " " ۸۰/-
مقدس دیوداسی " " ۸۰/-

سرورق ڈاکٹر قیصر شمیم

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی کتابیں

محمدؐ اور قرآن

ڈاکٹر رفیق زکریا

مترجم: ڈاکٹر مظفر محی الدین

ڈاکٹر رفیق زکریا کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ اس کتاب میں سلمان رشدی کے ناول "شیطانی آیات" کا مدلل اور عالمانہ جواب دیا گیا ہے۔ ۳۲۴ صفحات۔

قیمت دو سو روپے

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

مولانا عبدالوحید صدیقی

شخصیت اور ادبی خدمات

مرتبہ: پروانہ ردولوی

اردو کے بے باک اور حق شناس صحافی مولانا عبدالوحید صدیقی کی ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں ملک کے بزرگ صحافیوں اور اہل علم کی نگارشات کا مجموعہ : قیمت ۵۱/- روپے

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

خواجہ حسن نظامی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ: پروفیسر نثار احمد فاروقی

اردو کے صاحب طرز ادیب، صحافی، خاکہ نگار، مترجم و مفسر قرآن خواجہ حسن نظامی کے فن اور شخصیت پر اردو کے ممتاز ترین ادیبوں کی نگارشات کا اہم مجموعہ (مئی کے آخری ہفتے میں شائع ہوگا)

قیمت ۵۱/- روپے

مہمان مدیر
ڈاکٹر قیصر شمیم
۱۶۵ حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی ۱۷

اشاریہ

ادب عالیہ کا مستقبل

ادب عالیہ میں لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے۔ اچھی شاعری سے لطف اندوز ہونے والوں کا حلقہ سمٹتا سکڑتا جارہا ہے۔ درسگاہوں میں ذہین طلبہ HUMANITIES کی طرف بہت کم راغب ہورہے ہیں۔ یہ صورتِ حال صرف اردو کی یا ہندستان کی ہی نہیں ہے بلکہ ساری دنیا میں ادب و فلسفہ کی تعلیم بے توجہی کا شکار ہے۔ اپریل ۱۹۹۰ء میں پورتوریکو کے شہر سینٹ جوان میں دنیا بھر سے آئے ادبا، ناقدین اور مدیران نے اس مسئلہ پر تشویش کا اظہار کیا تھا، لیکن نشستند و گفتند و برخواستند۔ ایک صارف سماج میں اس مسئلہ کا کوئی پائیدار حل بھلا کیا ڈھونڈا جاسکتا ہے؟ اس سماج کی اپنی منطق ہے۔ سائنس و ٹکنالوجی، کامرس اور مینجمنٹ کا علم زندگی کی آسائشیں مہیا کراسکتا ہے، ادب و فلسفہ کی تعلیم بھوک اور بیکاری کے سوا اور کیا بخش سکتی ہے؟ میر تقی میر کی شاعری کو پڑھنے کے لیے جس مذاقِ سخن کی ضرورت ہے اس کا مطالبہ ہے: مطالعہ اور ریاض۔ دستوئیفسکی اور ٹالسٹائی کو پڑھنے کے لیے تحمل درکار ہے اور نتیجہ چمک دمک سے عاری ایک سادہ زندگی۔ اگر زندگی کی مادی آسائشیں میسر ہیں تو کلاسیکی موسیقی کیوں سنیں یا میر کو کیوں پڑھیں، الوپ جلوٹا کا کیسٹ سننا کافی ہے عمدہ فکشن پڑھنا اور اس پر غور کرنا دقت طلب کام ہے، ٹیلی ویژن کا پروگرام وقت گزاری کے لیے موجود ہے۔ ابھی تک اتنی حیا باقی ہے کہ بہت سے لوگ ادب عالیہ سے اپنی عدم واقفیت کو چھپاتے ہیں اور موسیقی کی محفل میں کلاسیکی موسیقی کے سمجھنے کا ڈھونگ بھی رچاتے ہیں۔ ویسے حیاتیاتی سطح پر بھی انسان اور جانور میں یہ فرق ہنوز ہے کہ جانور کے لیے محض چارے کی تلاش اصل حیات ہے اور انسان، سائنس کی ایجاد کردہ مادی آسائشوں سے بھی فیض یاب ہونا چاہتا ہے۔ اس کا یہ گمان یقین کی سرحدوں تک پہنچ گیا ہے کہ پیسے سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ لہٰذا وہی علم حاصل کیا جائے جس میں فوری طور پر زیادہ سے زیادہ پیسا ہاتھ آسکے۔ بنیے تو بہادر شاہ ظفر کو بھی قرض دیتے تھے مگر تاجرانہ ذہنیت کو کبھی اتنی وقعت حاصل نہیں ہوئی تھی جتنی کہ آج

ہے۔ یہ اس صارف سماج کی سب سے بڑی جیت ہے۔

وہ نسل، جس کے ذہن و مزاج کی تربیت میں ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، جسے زبان اور اس کے استعمال کا سلیقہ نہیں سکھایا جارہا ہے اور فلسفہ جس کے لیے بیکار کی اُلجھن ہے، وہ موجودہ صارف سماج کے لیے نہایت موزوں ہے اور وہی میڈیا کی بیشتر سرگرمیوں کی مخاطب بھی ہے۔

اس وسیع پس منظر میں اردو زبان و ادب کی تدریس کا جائزہ لیجیے اور اردو لکھنے پڑھنے والوں پر نظر ڈالیے۔ آزادی سے قبل یا اس کے ذرا بعد تک اردو متموّل اور تعلیم یافتہ گھرانوں کی بھی زبان تھی۔ مثالوں کی کمی نہیں۔ اُدبا، شعرا اور اساتذہ کی فہرست میں اب بھی ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہے جنھوں نے مختلف سماجی علوم کے ماہر ہونے اور مغربی زبان و ادب کے استاد ہونے کے باوجود اُردو سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے۔ ملک کے ممتاز سائنس دانوں میں اب بھی ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جن کی تعلیم اردو سے شروع ہوئی تھی۔ شانتی سروپ بھٹناگر، جن کی موت کو بہت طویل عرصہ نہیں گزرا ہے، ایک عظیم سائنس داں ہی نہیں اُردو کے مشہور شاعر بھی تھے۔ آزادی کے چند برسوں بعد صورتِ حال بدلنی شروع ہوئی۔ بقول شخصے، جسے کہیں داخلہ نہیں ملتا ہے وہ زبان و ادب کی دہلیز پر آکھڑا ہوتا ہے۔ ذہین طلبہ شاذ و نادر ہی، اپنی مرضی سے اس کوچے کا رُخ کرتے ہیں۔ درس گاہوں میں جو لوگ زبان و ادب پڑھتے ہیں، اساتذہ بھی انھیں میں سے ہوں گے۔

اور خود تدریس کی حالت کیا ہے؟

پوری دنیا میں زبان سکھانے کے طور طریقوں میں انقلابی تبدیلی آئی ہے اور اس نے ایک الگ علم کا مرتبہ پالیا ہے۔ زبان کی تعلیم سے متعلق تحقیق نے نئی رفعتوں کو چھُو لیا ہے، لیکن ہم نے اس طرف سے اپنی آنکھیں موند لی ہیں۔ اس معاملے میں ہم اپنے قدما سے بھی بہت پیچھے ہیں۔ آزادی کے بعد زبان سکھانے کے لیے متعدد پرائمر بنائے گئے ہیں، مگر مولوی محمد اسماعیل میرٹھی، عبدالغفار مدھولی اور پرنسپل سجاد مرزا نے جو کام کیا تھا اس پر کوئی اضافہ تو درکنار ہم اُن کے قریب بھی نہیں پہنچ پائے ہیں۔ اُردو میں علت و معلول کی بحث اور معلولوں معتلوں کا ذکر تو بہت ہے مگر وہ بنیادی تحقیق نہیں ہو رہی ہے جس پر زبان سکھانے کے نئے اور سائنٹفک طریقوں کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ ہم نے ابھی تک اپنے بزرگوں کے کام کا جائزہ بھی نہیں لیا ہے۔

زبان کی تعلیم تقریباً مفقود ہے، البتہ ادب پڑھانے کا شور ہر طرف ہے۔ کسی بھی دانش گاہ سے گذشتہ دس برس کے، امتحان کے سوالات منگوا کر دیکھ لیجیے اندازہ ہو جائے گا کہ بعض ناقدین کے مضامین کے مجموعے بار بار کیوں چھپتے ہیں۔ شعری متن پڑھنے والا طالب علم امتحان میں کم نمبر پاتا ہے، تنقیدی مضامین پڑھنے والا امتیازی نشان پاتا ہے۔ راقم الحروف نے ایک محفل میں اپنی یہ حقیر رائے پیش کی کہ کسی بھی شاعر کے بارے میں عمومی نوعیت

نے سوالات کرنے کے بجائے اگر اس کے کلام سے چند اشعار کا انتخاب کیا جائے اور طالب علم سے کہا جائے کہ وہ ان اشعار کی روشنی میں جواب لکھے تو شاید بہتر نتائج برآمد ہوں۔ ایک مرد دانا نے سن کر کہا: اس انتخاب کے لیے بھی تو سلیقہ درکار ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کلیم الدین احمد کے ساتھ درس گاہوں سے عملی تنقید بھی ماضی کے دھندلکے میں کہیں کھو گئی ہے۔ بھولے بھٹکے جو طلبہ ہمارے ہاتھ آتے بھی ہیں، ہم ان میں بھی شعور ادب کا ذوق پیدا کرنے میں اکثر ناکام ہیں۔

تو کیا ہم نے فکر و عمل کی ساری صلاحیتیں کھو دی ہیں اور حالات کے بدلنے پر بالکل ہی قادر نہیں ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو آخر آنے والا زمانہ کیسا ہوگا؟

باقر مہدی
ی، ا۔ روری ورڈشن، کارٹر روڈ
باندرہ (ویسٹ)، بمبئی ۵۰

حالی کی یاد میں

لفظ جب لفظ سے ملتا ہے فغاں اُٹھتی ہے
معنی معنی کی فضا خوف سے تھراتی ہے
آبلے پھوٹ کے رگ رگ میں سما جاتے ہیں
آہ سی سینے میں ہر سمت بکھر جاتی ہے
یوں تو رہتی ہے خلش پہلو میں خاموش مگر
جانے کیا سوچ کے رہ رہ کے اُبھر آتی ہے
جب تعلق نہیں میرا کسی ہنگامے سے
بے گناہی مری پھر کیسے سزا پاتی ہے
ٹوٹے ٹوٹے ہوئے شیشے میں یہ تیری تصویر
میری اک یاد کو سینے سے لگا جاتی ہے
خط میں کچھ بھی نہیں بس چند لکیروں کے سوا
سارے کاغذ پہ لکھے لفظ مگر ذاتی ہے
نیند آندھی ہے نہ آئے گی میری آنکھوں میں
صبح ہر روز دبے پاؤں چلی آتی ہے
دن کسی طرح کتابوں میں گزر جاتا ہے
رات بے وجہ مجھے آکے جگا جاتی ہے
دستکیں دے کے اندھیرے میں چھپی تکتی ہے
موت تنہا ہے مجھے دیکھ کے شرماتی ہے
ٹھوکریں کھا کے سنبھلنا بھی پڑے گا باقر
ایک بیوہ پہ بڑے درد سے سمجھاتی ہے

فراق کی یاد میں

سب سے آگے گیا، وہ پیڑ تو اونچا بھی نہیں
توڑ کے بیٹھا ہے اور سیب کو چکھا بھی نہیں
ہر طرح شور ہے ہنگامہ ہے میلہ ہے کوئی
کیا نکلنے کا بڑے شہر سے رستہ بھی نہیں
اہلِ دنیا سے مجھے کوئی شکایت۔ کیوں ہو!
میں نے جینے کا ہنر جان کے سیکھا بھی نہیں
پوچھنے والوں نے ہر موڑ پہ روکا لیکن۔
مجھ کو منزل کا کہاں شوق تھا ٹھہرا بھی نہیں
گھومتا پھرتا ہوں بس ایک خلش کی خاطر
ہم سفر کوئی نہیں اور میں تنہا بھی نہیں
وادیِ غم میں تو چکر ہے گزر گاہوں کا
راہِ امکاں بھی نہیں، جینے کا دھوکا بھی نہیں
ٹھوکریں کھا کے تھکا بیٹھا ہوں حیراں حیراں
عمر کے گزرے مہ و سال کو ناپا بھی نہیں
کچھ تو کہہ آج زمانہ تجھے کیسے سمجھے؟
کیا عجب شخص ہے سیدھا نہیں اُلٹا بھی نہیں
کون سنتا ہے بڑے غور سے تیری باتیں
تجھ سے کچھ کہنے کا اب تو مجھے یارا بھی نہیں
ہاں غزل ختم کر، وہ صبح کا تارا ڈوبا
جا کے سو جا کہیں تو برسوں سے سویا بھی نہیں
اپنی بے خوابی پہ کب ناز تھا باقر تجھ کو
خاک پہ لیٹا ہے اوروں کو جگایا بھی نہیں

معروف چودھری
۸۔ ذاکر باغ جامعہ نگر
نئی دہلی ۲۵

دو غزلیں

جانے کیوں بڑھ گیا ان آنکھوں کا غم آخرِ شب
آپ ہی آپ ہوئی جاتی ہیں نم آخرِ شب

مندمل زخم کو کرتی ہے عطا ناخنِ یاد
فکر ہو جاتی ہے مائل بہ کرم آخرِ شب

وادیٔ شب سے گزر آئے ہیں اک عزم کے ساتھ
کاش ٹوٹے نہ ارادوں کا بھرم آخرِ شب

بزمِ تخئیل میں ابھرے کئی مبہم چہرے
یاد آئے کئی موہوم سے غم آخرِ شب

رقص میں ہے پسِ زنداں کوئی وحشی شاید
جھنجھنا اٹھی ہے زنجیرِ ستم آخرِ شب

رشکِ فلک تھی کشتِ شبستاں گزشتہ شب
لو دے اٹھی تھیں یاد کی کلیاں گزشتہ شب

پھر دل کے بام و در سے کرن پھوٹتی رہی
ایک بار پھر تھا دل شفقستاں گزشتہ شب

گلگونۂ خیال میں تھا کوئی گلبدن
تخئیل کیوں تھی ایسی گل افشاں گزشتہ شب

پھوٹا ہر ایک داغ سے اک شعلۂ امید
تھے محوِ یادِ حرماں نصیباں گزشتہ شب

آیا تھا کھنچ کے دل سے کئی مرحلوں کے بعد
وہ اشک جو تھا زینتِ مژگاں گزشتہ شب

شجاع خاور
۱۵ - پارک لین نئی دہلی نمبر ۱

اب دور بھی کرو مرے دن رات کی کمی
تم تو امیر ہو تمھیں کس بات کی کمی

پہچان زندگی کے مرض کی ہے بس یہی
بہتات ماہ و سال کی لمحات کی کمی

دل کھول کر نہ روئے تو جل جاؤ گے میاں
گرمی کو تیز کرتی ہے برسات کی کمی

اسلوب خوب ترکِ تعلق کے خط کا ہے
الفاظ کی زیادتی جذبات کی کمی

میں دیکھتا ہوں خواب بہت صرف اس لیے
خوابوں سے پوری ہوتی ہے حالات کی کمی

مرنے سے پہلے مر کے نہ دیکھا اگر جناب
آخیر تک رہے گی شروعات کی کمی

بے جا تلاش کرتے ہو کیوں کائنات میں
اپنی کمی شجاع جو ہے ذات کی کمی

ثروت سنائی بریلوی

گھر کے اندر باہر جیسی باتیں کرتے ہیں
کچھ پس منظر، منظر جیسی باتیں کرتے ہیں

عکس ہیں لیکن کتنے گم صم کتنے چپ چپ سے
آئینے بھی پتھر جیسی باتیں کرتے ہیں

ساقی قلقل مینا جیسی باتیں کرتا ہے
رند جوابا ساغر جیسی باتیں کرتے ہیں

آپ مرے زخموں پر مرہم رکھنے گئے تھے
آپ ہی تیر و نشتر جیسی باتیں کرتے ہیں

شور مچائیں تن تن مٹی پانی آگ ہوا
چند سپاہی لشکر جیسی باتیں کرتے ہیں

یمہ ضیاء الدین
یمنی

دل میں رہ رہ کے چمک اٹھتی ہے یوں یاد کی لو
ضوفشاں کا رخ دریچوں سے کرے برقِ فلک
آمدِ شب سے کہیں پہلے اُفق پر جیسے
ملگجی شام کے آنچل میں ستاروں کی چمک

جیسے زندانوں کی خاموشی میں صوتِ زنجیر
ماحصل جیسے دفینوں کا ہو کوئی تصویر
جس طرح کہنہ مقابر میں سے نکلی تحریر
جیسے انجام کو پہنچے نہ علاج تدبیر
دشتِ تنہائی رقم کردہ بدست تقدیر
جس فسانے کا نہ عنوان ہو نہ حرف تشہیر
سلسلہ یاد کا توڑے جو حدیثِ دلگیر
ہو جو نشتر سا رگِ جاں کو وہ حرف تقصیر
اجنبی ہو کے جو گزرے وہ شناسا رہ گیر

آہ اک دفن ہو سینے میں کہیں جیسے کسک
دل میں رہ رہ کے چمک اٹھتی ہے یوں یاد کی لو
ضوفشاں کا رخ دریچوں سے کرے برقِ فلک

شاہد نجیب آبادی
پوسٹ بکس ۶۵۷۲۴
بحرین

غزل

یوں بظاہر ہے گلستاں کی طرح
زیست ہے موسمِ خزاں کی طرح

پہلے دل میں سمایا وہ، اور پھر
چھا گیا مجھ پہ آسماں کی طرح

وہ مقدس کتاب کی مانند
اور میں حافظِ قرآں کی طرح

سطح پر میں حباب ساں لرزاں
اور وہ بحرِ بے کراں کی طرح

اس کا اک ایک لمحہ ہے انمول
اور میں عمرِ رائیگاں کی طرح

میں تو تنہا گزر گیا شاہد
وہ جو گزرا تو کارواں کی طرح

ڈاکٹر محمد کلیم الحق قریشی
انوار العلوم جونیر کالج
حیدرآباد

خیابانِ ریحان کا اجمالی تعارف
تحقیق کی روشنی میں

ریحان الدین لکھنوی المتخلص بہ ریحاؔن نہایت پُرگو اور باکمال شاعر تھے ان کے اشعار میں بلا کی روانی ہے اور یہ اشعار ان کی خداداد صلاحیت اور قوتِ متخیلہ کے آئینہ دار ہیں۔ لکھنؤ کے ایک زمین دار منور جو اہلِ علم کی قدردانی اور سرپرستی کیا کرتے تھے اور جن کے یہاں باکمال اور باصلاحیت لوگوں کا اجتماع رہا کرتا تھا ان کا ریحان لکھنوی سے قصۂ گل بکاؤلی کو نظم کرنے کا اصرار ظاہر کرتا ہے کہ وہ گمنام نہیں تھے انھوں نے پہلی بار قصۂ گل بکاؤلی کو نظم کیا۔ خیابانِ ریحان اور گلزارِ نسیم کے تقابلی مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظم دیا شنکر نسیؔم کی نظروں سے ضرور گزری ہے مگر وہ اوّلیت کا سہرا" اپنے سر باندھنے کے آرزو مند ہیں! اسی لیے کہتے ہیں۔

وہ نثر ہے دادِ نظم دوں میں ۔۔۔ اس مے کو دو آتشہ کروں میں

ان کا یہ دعوا باطل اور گمراہ کن ہے۔ پروفیسر گیان چند جین اردو مثنوی شمالی ہند میں (صفحہ ۳۴۴) لکھتے ہیں۔

"مندرجہ بالا مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہبِ عشق کے علاوہ نسیؔم نے خیابانِ ریحاؔن کو بھی پیشِ نظر رکھا"

خیابانِ ریحان ۱۲۱۱ھ میں لکھی گئی اور گلزارِ نسیم کا سنِ تصنیف ۱۲۵۴ھ ہے یعنی دونوں مثنویوں کے سنِ تالیف میں ۴۳ سال کا فصل ہے۔ ریحان لکھنوی کا تذکروں میں ذکر نہیں ملتا۔ تمام اہم تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں جبکہ غیر معروف اور معمولی درجہ کے شعرا کا ذکر ہر تذکرے میں موجود ہے۔ افسر صدیقی امروہوی جنھوں نے فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان ترتیب دی تھی ریحان لکھنوی اور ان کی مثنوی جس کا تاریخی نام "باغ بہار" ہے کا تذکرہ کرتے ہوتے لکھا ہے کہ تذکرہ ریاض الوفاق میں ریحان لکھنوی کا ذکر ہے اور وہ کلکتے میں ملازم تھے۔ ریحان لکھنوی کے حالات کا کچھ پتا نہیں چلتا ہمارے تذکرہ نگاروں نے انھیں کیوں نظر انداز کر دیا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مستشرقین گارساں دتاسی اور اسپرنگر ریحان لکھنوی کی مثنوی کا نہ صرف ذکر کرتے ہیں بلکہ اسے اس زمانے کی مشہور نظم قرار دیتے

ریحان لکھنوی کا اصل نام ریحان الدین تھا اور تخلص ریحان تھا۔ اس مثنوی کا ایک مخطوطہ تحقیقی مرکز مشرقی مخطوطات حیدرآباد میں ہے دوسرا انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتب خانہ خاص کی ملکیت ہے جسے حفاظت کے لیے نیشنل میوزیم کراچی کی تحویل میں دے دیا گیا ہے ان دونوں نسخوں میں مصنف کا نام ریحان الدین ہی لکھا ہے گارساں دتاسی اور اسپرنگر بھی ریحان الدین کے نام سے اس مثنوی کا ذکر کرتے ہیں۔ مخزن نومبر و دسمبر ۱۹۰۸ء کے شماروں میں سید خورشید علی حیدرآبادی نے پہلی بار اس یادگار مثنوی کا تعارف کرواتے ہوئے تبصرہ کیا ہے اس مثنوی کا تاریخی نام "باغ بہار" ہے انھوں نے بھی مصنف کا نام ریحان الدین المتخلص بہ ریحان لکھنوی لکھا ہے۔ مخزن جنوری ۱۹۱۰ء میں احمد علی شوق قدوائی نے اپنے مضمون میں سید خورشید علی کے مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے مصنف کا نام ریحان حسین خاں ریحان لکھا ہے جو درست نہیں۔

مثنوی کا نام کتاب بکاولی منظومہ یا قصۂ گل بکاولی منظومہ ہے لیکن گارساں دتاسی کہتا ہے کہ اس کا نام "خیابانِ ریحان" ہے۔ اس مثنوی کے چالیس باب ہیں اور ہر باب کو مصنف گلگشت کا نام دیتا ہے اس لیے بعض اس مثنوی کو "منظوم گلگشت" سے موسوم کرتے ہیں۔ گارساں دتاسی کے دیے ہوتے نام اور شاعر کے نام اور تخلص کی مناسبت سے "خیابانِ ریحان" ہی موزوں نام معلوم ہوتا ہے۔

ریحان بہت پرگو شاعر تھے جذبات نگاری منظر نگاری اور مکالمے کے موقعوں پر قادرالکلامی تشبیہ و استعارے کے فنکارانہ استعمال کے ذریعہ شاعری کے اچھے اور مثالی نمونے پیش کیے ہیں۔

گل بکاولی کے تعلق سے اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اب مزید کچھ کہنا مناسب نہیں: فرہنگ آصفیہ، محمد الدین فوق کی تحقیقات طلسم بکاولی، ڈاکٹر گیان چند جین کی دونوں کتابوں، "اردو مثنوی شمالی ہند میں" اور "اردو کی نثری داستانیں"، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی "منظوم داستانیں" (اردو کی)، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" اور مختلف رسائل میں گل بکاولی سے متعلق اہم مضامین کی روشنی میں مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ آیا یہ قصہ ہندوستانی الاصل ہے یا اس میں ہندی، ایرانی عناصر پائے جاتے ہیں۔ بکاولی نام کی اور خریدال نام کی کیا حقیقت ہے! یہ افسانہ ہے یا حقیقت وغیرہ یہ ساری بحثیں میرے مقالہ کے پہلے باب میں مختصراً ہی سہی سمٹ کر سامنے آگئی ہیں۔

خیابانِ ریحان میں تشبیہ استعارے اور صنعتوں کے استعمال کی شعوری کوشش:

پروفیسر گیان چند جین سے جب میں نے ذکر کیا کہ ریحان لکھنوی یقیناً بڑے باکمال شاعر تھے اور انھوں نے کثرت سے تشبیہ، استعارے اور صنعتوں کا استعمال کیا ہے تو فرمایا کہ اکثر شعرا کے ہاں تشبیہ اور صنعتوں کا استعمال غیر شعوری طور پر ہوا ہے یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ کوشش شعوری ہے یا نہیں ۹ میں نے کہا تھا کہ موقع محل کے ساتھ کثرت سے اس کا استعمال

اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کوشش شعوری ہے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ہستی سے لگا کنارہ کرنے — دریا میں چلا وہ ڈوب مرنے
جب تک رہی مجھ پہ سایہ گستر — اک آن پڑی نہ دھوپ مجھ پر
ہے شادی و غم سے یہ مرکب — ہیں جس کے گواہ روز اور شب
جس دن سے ہوا ہے وہ نظر بند — کھانے کی ہے اس نے کھائی سوگند
اس مار کو پہلے مار لے تو — پھر گنج بھی بے شمار لے تو
جا بانکھے وصف چار پائی — کاغذ پہ قلم کو نیند آئی
اُمّت کو نہیں اس آگ کی تاب — درکار ہے ذوالفقار کی آب
ہر چند کہ ہو گیا تھا لاغر — بے دانہ و کاہ کوہ پیکر

یہ صرف چند مثالیں ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ تشبیہ اور صنعتوں کا استعمال شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔ بلا مبالغہ ایسے سیکڑوں اشعار مثال میں اور پیش کیے جا سکتے ہیں۔

تشبیہ میں ندرت اور صنعت گراں حسن ہے۔ ریحان لکھنوی کی مثنوی کے مطالعہ کے بعد یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس عہد کی کوئی مثنوی یا نظم اس کے جواب میں پیش نہیں کی جا سکتی اور بعد میں بھی اس کا جواب ممکن نہ ہو سکا اس کے جواب میں گلزارِ نسیم کو پیش تو کیا جا سکتا ہے مگر اس کے لیے دو باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اولاً یہ کہ دیا شنکر نسیم نے اس مثنوی سے استفادہ کیا ہے اور اس میں صنعتوں کا استعمال خیابانِ ریحان کے مطالعہ کی دین ہے۔

دوسرے یہ کہ نسیم کے کلام میں تصنع اور آورد ہے ہر کوئی بآسانی یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ محض صنعت، ایہام یا رعایت لفظی کی خاطر شعر کہے گئے ہیں جب کہ ریحان کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ اس میں آمد ہی آمد ہے بے تکلفانہ صنعتوں کا استعمال اور ایسا بے ساختہ پن کہ قاری کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ شعر میں صنعت، تشبیہ، استعارے اور رعایتِ لفظی کا استعمال ہوا ہے اس فرق کو اہل نظر فن پر گہری نظر رکھنے والی باریک بیں اور نزاکت آشنا نگاہیں ہی خوب سمجھ سکتی ہیں۔ خیابانِ ریحان و گلزارِ نسیم کا تقابل تصنع اور آورد کا بے ساختہ پن اور آمد کے ساتھ تقابل ہے۔ آمد اور بے ساختہ پن کو تصنع اور آورد پر برتری حاصل ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ریحان کے یہ اشعار سن کر بے ساختہ واہ نہ کہنا اور داد نہ دینا پاکیزہ ذوق اور مذاقِ صحیح کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔

سبزہ لگا اُگنے برگِ گل پر — طوطی ہوتی جمع گردِ شکر
گم ہو گیا آفتاب انور — جوں بیضۂ ماکیاں تہِ پر
تاریک ہے ایسی یہ گزرگاہ — خورشید کو سوجھتی نہیں راہ
اس پھول کی گفتگو میں یکسر — چُپ ہو گیا غنچہ وار شکر

غنچے نے دہان کو فراست ‏ ‏ کرتی تھی یاں جبر لطافت
رخسار پہ زلف پر خم و تاب ‏ ‏ جوں ناگ کرے ہے سیرِ مہتاب
پیشانی پہ موئے عنبریں فام ‏ ‏ جوں گھیرے ہو آفتاب کو شام
یوں سبزہ و گل بہم تھے دمساز ‏ ‏ جیوں روتے لبان پہ سبزہ آغاز
یوں بیٹھ پہ گیسوئے سمن سا ‏ ‏ جوں سایۂ شمع تا کفِ پا
بھونرے لگے گل پہ گنگنانے ‏ ‏ کلیاں لگیں چٹکیاں بجانے
اور بالوں میں اس کے مانگ کی لیک ‏ ‏ کیا کہیے کہ نکتہ ہے یہ باریک
تشبیہ میں اس کی کیا بتاؤں ‏ ‏ مضمون میں کس سے مانگ لاؤں
میں وصفِ دہن سے منہ لیا موڑ ‏ ‏ سنگین تھا چوم کر دیا چھوڑ
کچھ مجھ سے نہ پوچھو بیچ لڑی کی ‏ ‏ میں کیا کہوں اس گلے پڑی کی
ان پہنچوں سے جا پڑی جو پہنچی ‏ ‏ کس مرتبہ، مرتبہ کو پہنچی
کیوں کر نہ وہ اپنی چھب پہ اکڑے ‏ ‏ ان ہاتھوں کو جس کا ہاتھ پکڑے
لمندر نے جو تھا اسے سراپا ‏ ‏ تھی سنگ وہ ہو گئی سراپا
پاسخ میں کہا یکا ولی نے ‏ ‏ اس چاہ کی غم کی باولی نے

ایسے اشعار کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اسے ترتیب دینے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ جو لوگ گلزارِ نسیم میں صنعتوں اور رعایتِ لفظی کے محاسن بیان کرتے ہیں وہ خیابانِ ریحان پر بھی ایک نظر ڈالیں اور فیصلہ دیں کہ بلاغت، معنی آفرینی اور کمالِ فن کے ساتھ ساتھ بے ساختہ پن اور آمد کے اعتبار سے کیسے فضیلت حاصل ہے!

صنعتوں میں جدت و اختراع:۔ ریحان لکھنوی نے صنعتوں کے استعمال میں جدت و اختراع سے بھی کام لیا ہے ایک تو یہ کہ انھوں نے دو دو یا تین شعر مسلسل لکھے ہیں ان میں صنعتوں کے استعمال میں توسیع کا عمل دکھائی دیتا ہے مثلاً

لیکن اسے کیا اثر کرے پند ‏ ‏ جو عشق کے سلسلے میں ہے بند
مجنوں کو ہے پند و بند بے جا ‏ ‏ سودائی کو نفع وعظ سے کیا
اس بحرِ عمیق میں وہ بے کس ‏ ‏ بے حس تھا پڑا تھا صورتِ خس
ہر چند ہوا وہ آب میں غرق ‏ ‏ تھی آتش عشق کی وہی حرق
پانی سے ہوا وہ اور سرکش ‏ ‏ روغن سے ہو تیز جیسے آتش
ہیں آدمی زاد زشت طینت ‏ ‏ لازم نہیں جن کو ان سے الفت
اس انس کو چاہیے وہ ہم جنس ‏ ‏ پھبتی نہیں جن کو انس با انس

دوسرے تجنیس مذیل میں جدت یا اختراع۔ مولوی نجم الغنی تجنیس مذیل کی تعریف یوں کرتے ہیں[1]۔
"تجنیس مذیل یعنی دو لفظ متجانس میں سے ایک لفظ کے آخر میں دو حرف کی

---

[1] بحر الفصاحت، ۹-۶

زیادتی ہو جیسے مانگ اور مانگتی، ترس اور ترساتی، قل اور قلقل ۔۔۔۔،،
ریحان لکھنوی نے متجانس لفظوں میں آخر میں نہیں اوّل ہی دو حرف کی زیادتی کرتے ہیں جیسے

قد اس کا الف تھا ہو گیا نون	سر اس کا ہوا تھا بید مجنون
ہے شاطر آسماں دغل باز	مت اس سے ہو میرے یار انباز
ریحان نہ ہوا تو اب بھی ہشیار	جاتے رہے تیرے ساتھ کے یار
ہر چند کہ ہے تو صاحب مال	ہو جائے گا ایک دم میں پامال
جو آج ہے نانِ شب کا محتاج	کر دے اسے پل میں صاحب تاج

ایسے اشعار کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ میں نے اس پر غور کیا اسے ہم تجنیس مذیل نہیں کہہ سکتے تو کیا ہم اسے تجنیس مذیل ناقص یا تجنیس مذیل زائد و ناقص کا نام دے سکتے ہیں۔ میرے نزدیک اس صنعت کا یہی نام ہر لحاظ سے موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔
فارسی شعر اور مصرع :۔ ریحان لکھنوی نے مثنوی میں فارسی شعر اور مصرع بھی نظم کر دیے ہیں مثلاً

بے باغ و بہار یک گذر نہ	بے نقش و نگار یک گذر نہ
فرزند گر بود خلف بہ	در ناخلفی کند تلف بہ
دل خستۂ دردِ بے نصیبی	پابستۂ رشتۂ غریبی

مثنوی میں جملہ (۷) شعر فارسی میں نظم ہوتے ہیں اور فارسی مصرعوں کی تعداد (۲۷) ہے۔ ان میں صرف چند مصرعے بطور نمونہ یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ آبستنِ سو ہزار نو روز ۲۔ در عشق خوش است مے پرستی ۳۔ فارغ ز خیالِ کعبہ و دیر
۴۔ دیدار طلب نگاہ بر در ۵۔ جز کاہشِ جان و رنجش دل ۶۔ دیر آید و ہم درست آید
ان میں بعض مصرعے ایسے آسان اور سہل ہیں کہ معمولی فارسی داں قاری کو محسوس تک نہیں ہوتا۔

ہندوستانی عناصر :۔ ریحان لکھنوی ہندی اور ہندو مائتھالوجی سے بھی واقف معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کلکتے میں قیام کے دوران میں ہندو احباب کی رفاقت کا نتیجہ ہو سکتا ہے جہاں مذہبی وحدت کے مقابلے میں تہذیبی اور لسانی وحدت زیادہ طاقتور اور مستحکم ہے۔ اس باب میں اس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے اس مثنوی میں جو اشعار ہندوستانی عناصر کی نمائندگی کرتے ہیں وہ یہ ہیں۔

جس وقت کریں ہوا ترا رام	راون کرے آنکھوں سے ترا کام
ہر سمت تھا رنگ ہر طرف راگ	جوں ہندو کے گھر میں ہولی اور پھاگ
تشبیہ مجھے یہ سوجھی معقول	ہے ہاتھ کشن کے پیچھی کا پھول
وہ حسن اور جمال کی دھنی تھی	وہ گل بدن اصل پدمنی تھی

جب تک کر رہے گی زندگانی — زینت پوجے گی شنکر اور بھوانی
تم بھونرے ہو یار پدمنی ہے — رس لیجیے ابھی تو آبنی ہے

قافیائی شعور کی خامی: ریحان لکھنوی نے مثنوی میں غلط قافیے باندھے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قافیائی شعور ناپختہ تھا انھوں نے بعض اشعار میں خیر کا قافیہ دیر۔ کم کا قافیہ انجم۔ چلا کا قافیہ ملا۔ ہم کا قافیہ تم۔ خوش کا قافیہ آتش باندھا ہے۔ وہ اشعار ذیل میں درج ہیں۔

ان دونوں گھر میں عقد ہے خیر — لازم نہیں کارِ خیر کو دیر
یوں ہو گئی آمے کی روشنی کم — جوں مہر کے شعشعے سے انجم
ناچار مکاں سے اٹھ چلا وہ — در آ کے وزیر سے ملا وہ
کیا چاہیے اور آنکھیں ہم کو — روشن رکھے حق تعالیٰ تم کو
بارے ہوئی سن کے دیوی خوش — سرد اس کی ہوئی غضب کی آتش

تعقید لفظی: ریحان لکھنوی کے کئی مصرعے ایسے ہیں جن میں تعقید لفظی کا عیب پایا جاتا ہے ان میں صرف چند کی یہاں نشان دہی کی جاتی ہے۔
۱۔ بزم اس کی میں شعر و شاعری کا ۲۔ ماں اس کی نے سن کے یہ حقیقت ——— ۳۔ ماں اس کی نے اس کا تب پکڑ ہاتھ۔ ۴۔ وقت اپنے کا تان سین ہر ایک

ریحان لکھنوی کا ماخذ: ریحان لکھنوی کا ماخذ ایک نثر قصہ بکاولی ہے جو ۱۱۸۱ھ سے پہلے لکھا گیا تھا۔ ریحان نے اپنی مثنوی ۱۱۸۱ھ میں مکمل کی اور انھوں نے وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک تو لکھنؤ کے زمیندار کے پاس یہ قصے کہ حاضر ہوا تھا اور زمین دار نے ریحان کو اس قصہ کو نظم کرنے کی ترغیب دی تھی۔ اس قصہ کی تصنیف کے کم از کم سات آٹھ سال بعد لالہ نہال چند لاہوری نے عزت اللہ بنگالی کی تصنیف کا ترجمہ کیا تھا۔

نسخوں کی تفصیلات: اب تک کی معلومات کی روشنی میں ہم یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس مثنوی کے تین نسخے دنیا میں موجود ہیں۔ ایک نسخہ تحقیقی مرکز مشرقی مخطوطات حیدر آباد میں ہے اور دوسرا انجمن ترقی اردو پاکستان کی ملکیت، نیشنل میوزیم کراچی کی تحویل میں ہے۔ تیسرا نسخہ برٹش میوزیم لندن میں ہے۔
ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا کہنا ہے کہ اس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں ہے یہ بات گارساں دتاسی کے خطبات کے حوالے سے کہی گئی ہے۔ اس نسخہ کی تفصیلات اور اشعار کی تعداد سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ دوسرا ہے جب تک یہ نظر سے نہ گزرے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔
خطبہ میں کہتا ہے کہ ہندوستان میں اس کے اور بھی کئی نسخے ہوں گے مگر ان کی دریافت اور بازیافت ابھی تک نہیں ہو سکی۔

بنیادی نسخہ بنانے کی وجہ:- نسخہ حیدرآباد کے مقابلے میں نسخہ کراچی کئی اعتبار سے بہتر ہے تاہم اس میں بھی املا کی غلطیاں اور کتابت کی غلطیاں موجود ہیں۔ نسخہ حیدرآباد کے ترقیمہ میں سنہ ۱۲۵۰ھ اور نسخہ کراچی کے ترقیمہ میں سنہ ۱۲۵۸ھ درج ہے یعنی نسخہ کراچی، نسخہ حیدرآباد کے آٹھ سال بعد لکھا گیا۔ میں نے نسخہ کراچی کو بنیادی نسخہ بنانے کا فیصلہ کیا جب میں نے استاذ محترم پروفیسر گیان چند جین کو یہ دونوں نسخے دکھائے انھوں نے مطالعہ کے بعد فرمایا کہ نسخہ کراچی، نسخہ حیدرآباد سے زیادہ بہتر ہے۔

خیابانِ ریحان کا املا:- خیابانِ ریحان میں املا کی بڑی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ دونوں کاتب کر اے کو ملا کر، کاے لکھتے ہیں۔ اسی طرح ہی کے بجائے ہیں تیار کے بجائے طیار۔ نسخہ حیدرآباد کا کاتب ج کے بجائے چ اور ڑ کے بجائے ر لکھتا ہے۔ نسخہ کراچی کا کاتب ہمیشہ ڈھونڈ کو ڈھونڈ اور پتھر کو پتھر لکھتا ہے۔ ایسی اور بھی غلطیوں کی تفصیلات باب میں موجود ہیں۔

املا کی مغالطہ انگیزیاں:- ایک ہی لفظ کو مختلف مقامات پر اسی طرح لکھا گیا ہے۔ رہنے کے لیے ن ح کا کاتب رہیں اور ن ک کا کاتب رہے لکھتا ہے اور رہنے کے لیے بھی یہی املا اختیار کیا گیا ہے۔ ایک ہی شعر میں غضب ناک اور ناک، ملک اور تلک لکھا گیا ہے یعنی ک کی جگہ گ اور کبھی گ کی جگہ ک لکھا گیا ہے وہ کیلئے کہیں و وا اور کہیں او لکھا گیا ہے۔

قصہ بکاولی اور مسائل تصوف:- مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ایک مضمون معارف ۱۹۲۰ء میں لکھا تھا نہال چند لاہوری نے قصہ کے درمیان میں جہاں تصوف و معرفت کے نکات بیان کیے ہیں اسی کو مولانا نے پیش کیا ہے۔ اس لیے تصوف و معرفت کے نکات کو مولانا عبدالماجد دریا بادی سے منسوب نہیں کیا جانا چاہیے۔

مغربی زبانوں میں قصہ بکاولی میں علامت اور تہذیبوں میں معنوی ربط کی تلاش:- مشہور نقاد حسن عسکری مرحوم نے قصہ گل بکاولی میں علامت نگاری، مصر، جاپان اور چین کی تہذیبوں میں معنوی ربط وغیرہ کی تحقیق سے متعلق کچھ مضامین فرانسیسی میں لکھے تھے۔ فرانس اور جرمن کے اسکالروں کو بھی اس موضوع سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اس سلسلہ میں جناب حسن عسکری نے جو خط معاون پروفیسر شمیم احمد کو لکھا تھا اور شمیم احمد و جناب سہیل عمر کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی اس کے اقتباسات اس باب میں پیش کیے گئے ہیں جن کی وجہ سے نئے گوشے نظر کے سامنے آتے ہیں۔

گلزارِ نسیم سے متعلق چند طلب باتیں:- نسیم نے خیابانِ ریحان سے یقیناً استفادہ کیا ہے اور یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ ہندو ہونے کی وجہ سے نسیم نے ایک ہندوستانی الاصل قصہ کا انتخاب کیا اور اس کا ماخذ بھی ایک ہندو کی تصنیف ہے۔ دراصل نسیم کو ایک تیار خاکہ، مسالا اور مواد، خیابانِ ریحان، کی شکل میں ان کے ہاتھ آگیا ریحان کے

تتبع میں ہی گلزارِ نسیم میں صنعتیں، ایہام اور رعایت لفظی وغیرہ کا استعمال ہوا ہے اس میں جن خوبیوں اور محاسن کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ریحان لکھنوی کی مثنوی کی ہی مرہونِ منت ہیں۔

معرکۂ شرر و چکبست، مذہبی اور علاقائی عصبیت کی جنگ :- چکبست نے ایک خاص مقصد کے تحت لکھنؤ کے باکمال شعرا پر اور آتش کے تمام شاگردوں پر ایک کم عمر ہندو شاعر کی برتری ثابت کرنے کے لیے گلزارِ نسیم کا نیا اڈیشن مع مقدمہ شائع کروایا شرر اور دوسرے اصحاب اسے برداشت نہ کر سکے اور ادبی معرکہ آرائی شروع ہوگئی یہ دراصل مذہبی اور علاقائی عصبیت کی جنگ تھی جس میں علاقائی عصبیت کو فتح ہوئی اور شرر کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

چکبست کے سنجیدہ و منطقی استدلال میں جانبداری :- چکبست ہی اس سارے ہنگامے کے ذمّے دار تھے اس بحث میں بیشتر اصحاب نے ادب اور شائستگی کا دامن ہاتھوں سے چھوڑ دیا شخصی جملوں اور ابتذال درکاکت سے ادب کا دامن داغدار کیا مگر چکبست نے اعتدال اور توازن کو ملحوظ رکھا ان کی تحریروں میں سنجیدگی بھی ہے اور منطقی استدلال بھی مگر ان تحریروں میں جانبداری ہے۔

معرکۂ شرر چکبست سے پہلے گلزارِ نسیم کی مقبولیت و قدر و قیمت :- ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا یہ خیال کہاں تک درست ہے کہ گلزارِ نسیم ایک معمولی مثنوی تھی جسے معرکۂ شرر و چکبست نے بہت زیادہ شہرت بخشی۔ دیکھنا یہی ہے کہ کیا اس معرکہ سے قبل بھی یہ مثنوی اتنی ہی مقبول تھی۔

اودھ پنچ اور دیگر اردو یا مسلم اخبارات شرر کا ساتھ دیتے تو کیا صورت حال مختلف نہ ہوتی :- اس بحث میں حصّہ لینے والے بعض اصحاب کا کہنا یہ ہے کہ اگر اودھ پنچ چکبست کا ساتھ نہ دیتا تو اس معرکہ میں شرر کو کامیابی نصیب ہوتی۔ اودھ پنچ کے پیش نظر چکبست کی حمایت سے زیادہ دلی کے مقابلہ میں لکھنؤ کی زبان اور کمال کو ثابت کرنا تھا اس معرکہ سے چکبست اور اودھ پنچ کو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔

گلزارِ نسیم میں آتش کے اشعار :- چکبست یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ نسیم نے اپنے استاد کی اصلاح کو قبول نہیں کیا اور استاد کی اصلاح میں نقص تھا اس لیے یہ اصلاح باکمال شاگرد کے نزدیک قابل قبول نہ تھی۔ چکبست کے معترضین کہتے ہیں کہ اس مثنوی میں نہ صرف آتش کا بلکہ ان کے دوسرے شاگردوں کا حصہ بھی ہے یہ بات بھی ایسی ہی تحقیق طلب ہے جیسی چکبست کی بیشتر باتیں اور نسیم سے منسوب واقعات۔ یہ ناقابل قیاس بات ہے کہ گلزارِ نسیم، آتش کی اصلاح اشعار اور مصرعوں سے خالی ہے حمدیہ اشعار کے یہ دو شعر ہیں۔

حمد حق و مدحت پیمبر — کرتا ہے ہر دو زباں سے یکسر

پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے یعنی کہ مطیع پنج تن ہے

ان کے تعلق سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اشعار یقیناً آتش کے ہیں پانچ انگلیوں کے ساتھ مطیع پنجتن کی طرف کسی ہندو کا ذہن منتقل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس صداقت سے انکار مشکل ہے اس طرح مثنوی میں آتش کی اصلاح اور ان کے مصرعوں اور اشعار کی موجودگی کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

مثنوی گلزارِ نسیم کی اپنی جگہ اہمیت کے باوجود "خیابانِ ریحان" کا یہ تو ہے اس کے علاوہ گلزارِ نسیم کے گل بوٹوں میں آتش کا خونِ جگر معمولی آنکھوں کو بھی دکھائی دیتا ہے۔ جہاں تک صنائع بدائع، تشبیہ، استعارے اور تجنیسِ تام و تجنیسِ خطی کا تعلق ہے خیابانِ ریحان اپنی جگہ بے مثال اور اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ مثنوی طویل ہونے کی وجہ سے اس میں رطب و یابس بھی ہے۔ ریحان لکھنوی اس پر نظر ثانی کرتے اور زبان و بیان کی خامیوں والے اشعار اور دیگر اشعار حذف کرتے تو اس کے حسن صوری و معنوی میں اور اضافہ ہو جاتا۔

خیابانِ ریحان میں جو خامیاں نگاہ میں کھٹکتی ہیں ان کا مختصراً یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

زبان و بیان کی غلطیاں :- ریحان کی مثنوی زبان و بیان کی خامیوں سے پاک نہیں ہے دل بند اور جگر بند کا استعمال ابتدا میں صحیح ہوا لیکن بعد میں یہی لفظ اولاد، نورِ نظر یا لختِ جگر کے بجائے محبوب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جیسے بکاولی کو تاج الملوک کا غم ہے ؎

دل بند کے غم سے ہے جگر چاک اُس بند سے میں نہیں ہوں غمناک صفحہ ۲۷۶

تاج الملوک کی گرفتاری کے بیان میں یہ شعر ہے

یاں خود ہوا بے گنہ نظر بند واں دیر میں قید وہ جگر بند صفحہ ۳۸۱

یعنی تاج الملوک بکاولی کا دل بند اور بکاولی تاج کی جگر بند ہو گئی۔

راجا چترسین کا وزیر اپنی بیٹی سے کہتا ہے

دے راحت سینۂ مکدر چپکے سے کہا کہ میری دلبر صفحہ ۳۸۲

اس سے بھی زیادہ فاحش غلطیاں اور الفاظ کا بے جا استعمال اس مثنوی کا ایسا عیب ہے جو نظروں میں بری طرح کھٹکتا ہے۔

نسخۂ حیدرآباد کے تین زائد شعر :- نسخۂ حیدرآباد میں یہ تین شعر زائد ہیں۔ نسخۂ کراچی میں یہ شعر نہیں ہیں۔

تھا کاوہ میں چرخی دوڑ میں تان جست اس کی تھی برق خیز طوفان

بولا شہ زادہ داغ برسہ اس نے کہا برجہار بلکہ

دکھلائی گردوں نے پھر تو وہ سر پیچ ہے کہ بر دو لا کا لو جبی ڈکذام کر

جذبات نگاری اور کمالِ حسن، باغ وغیرہ کی تعریف میں ریحان کا کمال :- ریحان لکھنوی نے

ان موقعوں پر اپنے فن اور کمال کی خوب داد دی ہے ان اشعار کی تعداد زیادہ ہے ان کے مطالعہ سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ شاعر کا ذہن کتنا رسا اور تخیل کی پرواز کتنی بلند ہے۔

ہند کی تعریف (صفحہ ۲۷) رات کا سماں (۴۹) خواہش عقد (ص ۹۵) دیو کی تعریف (ص ۱۰۰) کھانے کی تعریف (ص ۱۱۳) باغ کی تعریف (ص ۱۲۴ تا ۱۲۵) اس سے پہلے (ص ۱۱۷) مکھڑے کی تعریف (ص ۱۳۲) پستان کی تعریف (ص ۱۴۴) کمر کی تعریف (ص ۱۴۶) تاج کی تعریف (ص ۱۹۹) گھوڑے کی تعریف (ص ۲۰۴) محسن کی تعریف (ص ۲۱۴) تاج کی تعریف بہ زبان بکاؤلی (ص ۲۳۰) بحر کی تعریف (ص ۲۵۸) باغ کی تعریف (ص ۳۳۲) عشق کی تعریف (ص ۳۵۱) باغ کی تعریف (ص ۳۸۸)

مکالمہ کے موقع پر بھی جو اشعار کہے گئے ہیں ان کی تعداد بھی زیادہ ہے۔

گلگشت چالیسویں یعنی آخری باب کا اجمالی جائزہ ہے۔ گلزار نسیم کا آخری باب بہرام اور روح افزا پری کے عشق اور شادی سے متعلق ہے یعنی باغ ریحان میں اس قصہ کو شامل نہیں کیا گیا اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ گلگشت چالیسویں میں ریحان نے اپنے فن، معانی و مضامین کے تعلق سے شاعرانہ تعلّی سے کام لیتے ہوئے ایک طرح کی خودستائی کی ہے اور اس اندیشے کا بھی اظہار کیا ہے کہ لوگ نکتہ چینی بھی کریں گے تو وہ عیب جو یا عیب ہیں کی حیثیت سے مشہور ہوں کیونکہ نیکوں کی شان میں بری بات کہنا بد ذاتوں کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ اور جو ہنرور ہوتے ہیں وہ کسی پر طنز نہیں کرتے۔ ضرور اصلاح بگڑے ہوئے کو بنانے کی نیت سے کریں تو شاعر اسے جان سے دعا دے گا۔" ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریحان لکھنوی کے ہمعصر شعراء حسد سے کام لیتے ہوئے ان کے کلام پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ مگر شاعر یا مصنف کو نکتہ چینی اور تنقید سے نہیں گھبرانا چاہیے۔ تصنیف کے بعد تنقید اور نکتہ چینی کا دروازہ کھل جاتا ہے جسے بند نہیں کیا جا سکتا۔

مثنوی کا تاریخی نام باغ بہار، ایک وضاحت ہے۔ نسخہ حیدرآباد میں اس تاریخی نام سے متعلق دو شعر ہیں جو نسخہ کراچی سے مختلف ہیں یعنی ؎

ہاتف نے دی مجھکو یہی آواز کہو باغ بہار اے سخن ساز
۱۲۱۲ھ بارہ سو بارہ ہجری میں یار انجام ہوا یہ باغ بے خار

باغ بہار کے بجائے باغ و بہار، لکھا گیا ہے جو غلط ہے باغ و بہار سے ۱۲۱۸ء اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ بارہ سو بارہ ہجری کہنا بھی غلط ہے ریحان لکھنوی اس کے بعد دعا کرتے ہیں کہ الٰہی میرا یہ کلام لوگوں کی زباں پہ جاری رہے اور بد دیدوں کی نگاہ سے اور بدبختوں کے طعنہ سے اسے بچاتے رکھنا بحق خدا کی کرنا اور خدا کا [illegible]

ساتھ زہاد، عشاق وغیرہ کے دل حزیں اور جان پاک کی قسم دے کر کہتے ہیں انہیں حور و جنت نہیں بلکہ جوار رحمت چاہیے اور جب تک جسم میں جاں رہے کسی کا محتاج نہ کر۔ مجھے اپنی پناہ میں لے کر میری دستگیری فرما اور میری اس دعا کو از بہر خدا مستجاب کر دے آمین۔"

اضی عبید الرحمٰن ہاشمی
شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

جدید اردو ہندی افسانہ

اردو، ہندی کی لسانیاتی تشکیل کے پیش نظر دونوں زبانوں میں جو قریبی رشتہ اور موانست ہے شاید اسی کا یہ بھی ایک مظہر ہے کہ دونوں زبانوں کے ادب میں بعض اقدار نہ صرف مشترک ہیں بلکہ اس مجموعی ادبی، جمالیاتی اور ثقافتی ورثہ کا اس طرح جزو بن چکی ہیں کہ دونوں کو الگ کرنے کا عمل خاصا دشوار ہے۔ اردو، ہندی افسانہ کا ارتقائی سفر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اکثر ایسا لگتا ہے کہ صرف رسم الخط کی تبدیلی ہی راہ میں حائل ہے اور اگر یہ پردہ درمیان سے ہٹ جائے تو پھر دوئی کا التباس بھی ختم ہو جاتا ہے، یہ ایک قدرتی عمل بھی ہے اور ذہن کو اپیل بھی کرتا ہے، اب اگر EMPHASIS کا یہ فرق ہے تو وہ کسی بہت بڑے فرق یا امتیاز کی غمازی نہیں کرتا۔ ہوا یہ ہے کہ دونوں زبانوں میں پریم چند کی اہمیت اور اولیت تسلیم شدہ ہے، دونوں زبانوں کا سماجی و سیاسی مقدر ایک ہی رہا ہے، اس لیے دونوں کے فکری دھارے بھی ایک دوسرے کی تکذیب یا تردید کرنے کے بجائے تائید اور حمایت کرتے ہیں۔ اگر اردو فکشن نے بعض قد آور شخصیتوں کو جنم دیا تو ہندی فکشن نے بھی کچھ بڑے نام ہمیں دیے ہیں، مثلاً جے شنکر پرشاد، جے نیندر کمار، یش پال، اگیے، راہل، امرت رائے، ناگ ارجن، بھگوتی چرن ورما، شری لال شکل بھیرو پرساد گپت، اوپیندر ناتھ اشک، بھیشم ساہنی، کمل جوشی، موہن راکیش، امر کانت، منو بھنڈاری، نرمل ورما، مارکنڈے، راجیندر یادو کملیشور، منوہر شیام جوشی، اسی طرح منٹو، بیدی، عصمت، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، حسن عسکری، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، انور سجاد، بلراج مینرا، انور عظیم، سریندر پرکاش احمد ہمیش، وغیرہ

اردو ہندی افسانے میں فنی و موضوعی یکسانیت کے عام منظر کو دیکھتے ہوتے جو فرق اقدار کی EMPHASIS کے بطور سامنے آتا ہے اس کے سبب ادبی سرمایے میں ایک سر رنگارنگی، ہمہ جہتی اور حسن پیدا ہوتا ہے۔ اس صدی کے ممتاز دانشور ژاں پال سارتر نے مجموعی طور پر فکشن کے بارے میں جب یہ کہا تھا کہ یہ ایک ترغیبی ادب ENGAGED LITERATE ہے تو اس کا مدعا واضح تھا کہ شاعری میں تو یہ ممکن ہے

کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے مادی کائنات سے نکل کر ایتھر کی فضا میں پرواز کر لیں لیکن فکشن ہمیں زندگی کے جس التباس سے روشناس کرتا ہے وہ سراسر مادی زندگی کی ہی ایک آئیڈیل حالت ہوتی ہے یہاں زمان و مکان کے حصار کے اندر رہ کر ہی زندگی اور اس کے حقایق کا مشاہدہ ممکن ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو کے مقابلہ میں ہندی کہانی زمین اور اس کی گرفت سے نکل بھاگنے کے بجائے اس سے پیوستہ رہی ہے، ہندی کہانی نے شروع سے ہی اس رمز کو پالیا تھا کہ زندگی کا کوئی بھی تصور حقیقی اور واقعاتی PRAGMATIC اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ زندگی سے ہمرشتہ رہ کر اس کے خدوخال کو دیکھا اور پرکھا نہ گیا ہو، اردو کہانی آزادی ملک کے بعد عرصہ تک اس روایت پر خود بھی عمل پیرا رہی لیکن اس اصول کا آئندہ قائم نہ رہ سکی اور اپنے پاکستانی ہم سفروں کے نقش قدم پر چل کر ایسی کچھ بھول بھلیوں میں الجھ رہی، پاکستان میں تو خیر مجبوری تھی کہ وہاں جمہوری اداروں کی مسلسل پامالی کے سبب براہ راست گفتگو محال تھی، اس لیے افسانوں تک میں وہ تمام حربے اپنائے گئے جو شاعری کے لیے مخصوص کیے جاتے ہیں، تجریاتی طریقۂ اظہار، علامتی و تمثیلی اسلوب، ہندستان میں ہندی روایت سے کٹ کر اردو، جو فکشن نے جو تجریاتی طریقہ کار اختیار کیا اس کے دیگر اسباب میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ چونکہ خود فکشن کا جدید تصور ہی مغرب سے آیا تھا اس لیے نئے دور میں مغربی تجربات کو نظر انداز کیا جانا ممکن نہ تھا، جیمس جوائس، ورجینیا ادلف، ڈی ایچ لارنس وغیرہ کے تکنیکی اسالیب سے استفادہ کے سبب فکشن گرچہ اپنے مفہوم سے عاری تو نہ ہوا لیکن ترسیل و ابلاغ کے گوناگوں مسائل ضرور پیدا ہوتے، اردو کی نئی نسل ان ذہنی تضادات سے باخبر ہے۔

قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں یہاں ہندی کے معروف نقاد اور دانشور ڈاکٹر نامور سنگھ کے خیالات اپنے خیال کے ثبوت میں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر نامور سنگھ نئی ہندی کہانی کے امکانات اور پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"آزادیِ وطن کے بعد چھٹی دہائی کی ابتدا میں ہندی افسانے کی تاریخ میں ایک نئے شعور نے آنکھ کھولی اور باہوش انداز سے نئی شاعری کے وزن پر نئی کہانی کا آغاز کیا، ملک کی آزادی کے ساتھ ہی ایک نئے تخلیقی شعور کی بیداری فطری عمل تھا جس کا لازمی ردعمل نئی کہانی جیسی ایک قطعی نئی صنف میں خواہ نہ ہوا ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں افسانہ نگاروں کی ایک پوری نسل افسانہ نگاری کے میدان میں سرگرم عمل ہے......

بے شمار و بیش بہا فنی صلاحیتوں کا یک وقت افسانے کی جانب رخ کرنا ہندی ادب میں یقیناً ایک اہم واقعہ قرار دیا جائے گا۔ بھیرو پرشاد گپتا کی زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ 'کہانی' اور اس کے بعد 'نئی کہانیوں' نے ان نئے فنکاروں کے لیے ایک وسیع میدان عمل تیار کیا۔

اس نئی نسل کے کچھ مصنفین نے علاقائی زندگی کی کہانیوں، تقیدوں اور شخصی خاکوں کے ذریعے متوسط طبقہ کی شہری زندگی کی کشمکش کو اپنی فنکارانہ عکاسی سے فن افسانہ کو نکھارنے کی کوشش کی ہے اس دہائی کے افسانے سے متعلق تحقیقی رویے کو ایک منظم تحریک میں منتقل کرنے کی کوشش کے باوجود افسانے کی رنگا رنگی اور وسعت جدید شعور کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، بھیشم ساہنی کی سادگی و سلاست، رام کمار کی گہری دوستی انسان نرمل ورما کا ہمدردانہ لب و لہجہ، امرکانت کی دلپذیر نشتر زنی رگھوبیر سہائے کی خوا گہی، راجیندر یادو کی تکنیکی پچہ کاری، رینو کی موسیقی نیز علاقائی رنگ آمیزی مارکنڈے کی دیہاتی عکاسی اور پرسائی کے تیکھے سماجی شعور سے اس دور کا ہندی افسانہ جگمگا رہا ہے، اس دور کے بیشتر ہندی افسانہ نگاروں نے ہندی افسانے کو یقیناً سنجیدہ ذریعہ اظہار کے روپ میں قبول کیا ہے، نئی افسانہ نگاری کی قدیم روایتوں کی پیروی کرنے کے بجائے زندگی سے براہ راست آنکھ ملانے کا عہد کیا ہے، انھوں نے نصابی نظریہ حیات سے الگ ہٹ کر مسلمہ معروضوں اور مانگے کی سچائی پر قائم صداقتوں کی چھان بین کی ہے، گرچہ ان کا یہ عمل ادب میں چنداں نیا نہیں ہے تاہم موجودہ دور میں ادبی نقطۂ نظر سے انقلابی اور بارآور ثابت ہوا ہے، مجموعی اعتبار سے اس عہد میں ایسے بیس بائیس افسانے منظر عام پر آئے ہیں جو اعلیٰ ترین فنی قدروں پر پورے اترتے ہیں۔"

ڈاکٹر نامور سنگھ کی اس تحریر کے بعد نئے ہندی افسانے پر جو کچھ بھی کہا جائے گا وہ محض انھیں باتوں کی تکرار ہوگی، حد یہ ہے کہ ہندی کے معروف ادیب نقاد اور کہانی کار کملیشور بھی نئی ہندی کہانی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکے، مضمون وہی ہے لیکن یہ مختلف ہے، لکھتے ہیں:

"نئی کہانی کی تحریک ترقی پسند تحریک سے عدم اطمینانی کے سبب وجود میں آئی تو سچیتن کہانی کی تحریک اس وقت تک کے تمام رجحانات اور تحریکوں کے خلاف آواز تھی سچیتن کہانی کا مقصد سپاٹ یا مبہم کہانی سے نہ ہو کر زندہ جاوید کہانی سے ہے، نئی کہانی، کہانی، سماانتر کہانی یا تیرے پچھدر کی کہانیاں یعنی سماکالین کہانی جتنے بھی ناموں سے گزرے اگر اس میں فکر نہیں ہے تو وہ کہانی نہیں ہے، کہانی کار یا تخلیق کام کرنے والا کسی بھی میدان سے منسلک فرد اس بات سے بخوبی واقف ہوتا ہے کہ تخلیق کی پہلی شرط زندہ جاوید ہوتا ہے ... سچیتنا کا ایک نقطۂ نظر ہے، وہ نقطۂ نظر جس میں زندگی سے ہمکنار بھی ہونا پڑتا ہے اور زندگی کو سمجھنا بھی چاہتا ہے۔"

کملیشور نے یہاں ان رجحانات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو آزادی کے بعد سے اب تک

ہندی کہانی میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے اور ختم ہوتے رہے ہیں، یعنی سچیتن کہانی، اکہانی، سماناتر کہانی، تیسرے یکمپورکی یا سماآلین کہانی، ان رجحانات سے کہانی لکھنے والے جڑتے بھی رہے اور بچھڑتے بھی رہے، اس لحاظ سے غور کیجیے تو ایسا لگتا ہے کہ ہندی فکشن کی روایت حقائق کی جستجو اور عرفان کے لیے کس درجہ مضطرب رہی ہے۔ اسے کسی پہلو قرار نہیں، زندگی کو الگ الگ زاویہ اور رنگ سے دیکھنے کا یہ حوصلہ بھی زندگی کے تئیں زیادہ وفاداری اور خلوص کی غمازی کرتا ہے۔

ہندی افسانہ اس تمام فنی و فکری روایت کو جو افسانے کے نام پر آزادی سے قبل موجود تھیں کلاسیکی روایت کا حصہ سمجھتا ہے اور حصول آزادی کے بعد کی کہانی کو نئی کہانی سے تعبیر کرتا ہے اس میں ترقی پسند دور میں لکھی گئی کہانیاں بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ نئی کہانی یا نئے عہد کے انسانی مسائل کے تذکرہ کو بھی جب جب نظرِ تازہ سے دیکھا گیا تو اس کے لیے نئے نام تجویز کیے گئے، مذکورہ ناموں کی موجودگی کا شاید یہی جواز ہے۔

آج بھی ہندی میں جو کہانیاں لکھی جا رہی ہیں اور جو نئے نام لیے جاتے ہیں وہ اکثر خود کو جن وادی کہانی کار کہلانا ناپسند کرتے ہیں، جن وادی کیکھک بالعموم وہ لوگ ہیں جو کہانی کے لیے راست اظہار کو ہی مناسب سمجھتے ہیں اسی لیے ان کی مزمت بھی کی جاتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ اس طرز فکر پر زور دینے والے ادب کو صحافت بلکہ اس سے بھی گھٹیا مقام پر لے جا رہے ہیں، کہانی کا فن اپنی موت آپ مر رہا ہے۔

ہندی کی مانند ہمعصر اردو افسانے بھی کثرت سے لکھے جا رہے ہیں، چونکہ زمانہ سر تا سر COMMERCIALISATION کا ہے اس لیے ہر شخص منڈی میں مال لانے کی فکر میں معروف ہے، جس طرح اس عہد کی شاعری میں آوازوں کی یکسانیت، اور شعور میں خود شاعر کی شخصیت اکثر غائب ہو گئی ہے افسانوں میں بھی کیفیت کے بجائے کمیت پر زور ہے، اس تہی دامنی کے لیے جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ چونکہ ہمارے عظیم فنکاروں نے اب سے بہت پہلے فکر و فن کے تمام ممکنہ تجربات کر ڈالے تھے اس لیے اب نئے لکھنے والوں کے لیے بچا ہی کیا ہے جس پر طبع آزمائی کر کے وہ بھی سرفرازی حاصل کریں، دوسری طرف طارق چھتاری کا دعوا ہے کہ

> "۱۹۶۰ء کے بعد کی نسل نے افسانے کے افق پر پاؤں اتنی مضبوطی سے جمائے کہ ۱۹۷۰ء کے بعد کی نسل کے انتہا پسند جدید افسانہ نگار بھی ان کے اسلوب اور اسٹائل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، غیاث احمد گدی جن کا جدید رجحان کی طرف خاصا جھکاؤ ہو گیا تھا پھر سے کہانی کو کہانی کی اصل شکل میں دیکھنے کے آرزو مند ہو گئے، خود انور سجاد نے واضح اور تجرباتی بھول بھلیوں سے مبرا کہانیاں لکھنی شروع کر دیں، سریندر پرکاش جو تلقارس، دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم، برف پر ایک مکالمہ جیسی کہانیاں لکھ چکے تھے، جوگیندر پال

کے یہاں بھی ابہام داخل ہوتا جارہا تھا مگر وہ پھر سے اپنی پرانی روش
یعنی قصے اور پلاٹ کی طرف لوٹ آتے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا
کہ خود جدید رجحان کے علمبرداروں نے بھی اپنے کیے ہوئے تجربوں سے صرف
کامیاب تجربوں کو اپنایا اور انتہا پسندی سے منہ موڑ کر سماجی مسائل پر اچھی
اور پسندیدہ کہانیوں کی تخلیق کی ہے۔"

اس بیان سے یہ فکری تضاد رفع نہیں ہو پایا تاکہ یہ افسانہ نگار پہلے صحیح راستے سے بعد میں غلط راستہ پر چل پڑے یا صورت حال اس کے برعکس ہوئی۔

اردو کے ہمعصر افسانہ نگاروں میں پیغام مسعود، الیاس احمد گدی، احمد یوسف، سلام بن رزاق، عبد الحمید، انور خان، انیس رفیع، طارق چھتاری، پیغام آفاقی، انجم عثمانی، قمر احسن، شوکت حیات، آصف فرخی اور سید محمد اشرف وغیرہ ہمارے ان افسانہ نگاروں میں ہیں جن کی کہانیوں کو پڑھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں نے سماجی شعور کو اپنا رہنما بنایا ہے اور بیانیہ طرز کے بجائے بعض حضرات نے انتظار حسین اور بعض نے انور سجاد سے اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے، بہرحال مستقبل کے اردو افسانے کا انحصار بہت کچھ فنکار کی اپنی داخلی شخصیت کی طاقت اور اعتماد پر منحصر ہوگا جس کا آج واضح فقدان نظر آتا ہے۔

جدید اردو ہندی افسانے پر یہ گفتگو اس وقت تک معنی خیز اور مکمل نہیں ہو سکتی جب تک بعض نمایندہ افسانہ نگاروں کی کہانیوں کے تراشے بھی قارئین کی خدمت میں پیش کیے جائیں۔

اس سلسلہ میں محض چند سطور پیش کر کے کچھ خاص نکات کو روشن کرنے پر اکتفا کروں گا۔ آگے بڑھنے سے قبل میں یہ معذرت بھی کرتا چلوں کہ میں نے ہمعصر ہندی افسانہ نگاروں کے ناموں کی فہرست سازی کرنے سے قصداً گریز کیا ہے، ہندی کہانیاں لکھنے والے ملک کے جغرافیائی حدود کو دیکھتے ہوئے اس کثرت سے ملتے ہیں کہ اگر ان میں سے اکثر کا نام لیا جائے تو پھر بطور نمونہ ان کے کچھ تراشے بھی گفتگو میں شامل کیے جائیں جس کے لیے غالباً یہاں گنجائش ہے اور نہ ہی موقع اس لیے فرض کی ادائیگی اگلی صحبت کے لیے اٹھا رکھنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ذیل کا اقتباس ہندی کے معروف کہانی کار دھرم ویر بھارتی کی کہانی گلکی، نو، ۱۹۶۰ء کے بعد لکھی جانے والی نئی ہندی کہانی کے نمونہ کے طور پر پیش ہے۔

"بچے چپ کھڑے تھے، اب تک جو ہو رہا تھا ان کی سمجھ میں آرہا تھا، پر آج یہ کیا ہو گیا یہ ان کی سمجھ میں نہیں آسکا، پر وہ بولے نہیں، صرف مٹی ادھر گئی اور نالی میں بہتا ہوا ایک موٹا ہرا کیڑا کانپنے لگی کہ منانے والا مخبر دار جو کچھ چرایا" مٹی پیچھے ہٹ گئی، وہ سب کسی غیر متوقع خوف میں سمٹ کر کھڑے ہو گئے، صرف بروا الگ سر جھکائے کھڑا تھا، دوسرے دن چبوترا خالی تھا،

دکان کا مانس اکھڑوا کر لوائے نالے میں گاڑ کر اس پر ترئی کی بیل چڑھوا دی تھی
اس دن پیچھے آنے پر ان کی ہمت اس چبوترے پر جانے کی نہ ہوئی
جیسے وہاں کوئی مر گیا ہو، بالکل سنسان چبوترا تھا اور پھر تو ایسی جھڑی لگی کہ جگنوں
کا نکلنا بند۔ چوتھے یا پانچویں دن رات کو سہسا تک بارش تو ہو رہی
تھی پر بادل بھی ایسے گرج رہے تھے کہ منّا اپنی کھاٹ سے اٹھ کر اپنی ماں کے پاس
گھس گیا۔ بجلی چمکتے ہی جیسے کمرہ روشنی سے ناچ ناچ اٹھا تھا۔"

اس اقتباس کو پڑھنے پر اندازہ لگانا محال نہیں کہ یہاں صداقت کے اظہار پر زور ہے جس سے ترقی پسند نظریہ ادب کی حمایت ہوتی ہے۔ تقریباً یہی صورت حال اس دور کے تمام کہانی کاروں کے ہاں ملتی ہے، سکتی بودھ کی تحریر دیکھیں

"ایک طرح سے وہ پچھلی ساری رات جاگتا رہا تھا جگت (چچا زاد بھائی)
اور سیودھ (سگا چھوٹا بھائی) کا لکا سے آئے تھے، دلی اسٹیشن پر ہی دونوں کی
ملاقات ہو گئی تھی، بے بی (بڑی بہن) ایرانڈیا سے اور دوا طوفان سے،
جب بھی جھپکی آتی وہ اٹھ بیٹھتا اس ڈر سے، کہ کہیں کسی کی گاڑی نہ مس
کر جاتے، سب سے پہلے جگت اور سیودھ آئے تھے، ایک بار تو وہ نروس
ہو گیا تھا، ساری گاڑی دیکھ ڈالی وہ لوگ نہیں ملے، نراش ہو کر اس
نے سوچا کہ پھاٹک کے پاس جا کر کھڑا ہو جائے اور سارے مسافروں کو
دیکھ جائے، اسی ہڑبڑی میں وہ دوڑتا ہوا پھاٹک کی طرف جا رہا تھا کہ
جگت نے اسے زور سے پکارا"

اس اسلوب کے متوازی اگر جن وادی لیکھک سنگھ سے وابستہ کہانی کاروں کی تحریروں کو دیکھیں تو قدرے فرق محسوس ہوتا ہے، ہمعصر ہندی افسانہ اپنے اسی اسلوب سے پہچانا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو سنجیو کی کہانی لہر سے چند سطور:

"پردیسی ڈکسن کالج میں داخلہ کے بعد پہلی بار خاندان کی تمام بندشوں سے ملی
آزادی جگہ جگہ دیواروں پر لکھے پولیٹیکل پاور فلوز فرام دی بیرل آف دی گن!..
.... نکسل باڑی پو جھوا ما در پو تھوا۔ ... جیسے نعرے ماؤ کی لال کتاب،
کالج اسٹریٹ کے فٹ پاتھوں اور کالج اسکوائر پارک کے گول دیگھی کے
ہونے والے ہیم پور۔ دودھیا ساگر، بادوپور، شیو پور انجینئرنگ کالج کے طلبہ
کے درمیان گھومتی افواہ ۔۔ ایسے گرم ماحول میں پکنے لگی تھی میری جھجک
بھری بے سکون رات"

طارق چھتاری نے بجا طور پر اردو ہندی افسانے کی کچھ مشترک اقدار کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ کملیشور کا جو سماجی وژن ہے وہ کسی قدر رشو کی بصیرت سے مماثلت رکھتا ہے، کملیشور کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

"اُس نے گریبج کے جوتے اتارے تھے تو بدبو کا بھبکا سا اٹھا تھا کچھ ویسا ہی جیسا کہ بہتوں کے کپڑے اتارنے پر اٹھا کرتا تھا، خاص طور سے منوکرانی سے پھوٹتا تھا جو رات گیارہ بجے کے بعد ہی آیا کرتا تھا اور فارغ ہونے کے بعد کمر میں درد کے سبب پتھر کی طرح بیٹھا رہ جاتا تھا تب جگنو اسے اٹھاتی تھی اور وہ رانیں کھجلاتا ہوا چلا جاتا تھا پھر کنور جیت ہوٹل والے کی طرح بدبودار تو تھا ہی اٹھنے سے قبل کھاٹ پر بیٹھ کر اوں اوں کرکے ڈکاریں لیتا تھا۔"

اسی انداز کی دوسری کہانیوں میں موہن راکیش کی کہانی سیفٹی پن بھی ہے جو حقیقت کے ایک خاص پہلو کو بڑی خوبی کے ساتھ ابھارتی ہے، کہانی اس جملے سے شروع ہوتی ہے:

"مسز سکسینہ پلاٹ کے نام پر اپنا ناول زبانی سنا رہی تھیں لیکن میرا دھیان اپنی پتلون کی بٹنوں کی طرف تھا ..... ناول کے سب کرداروں کے نام ایک جیسے تھے یا مجھے لگ رہے تھے"

جدید ہندی کہانیوں میں سچائی کی جستجو، ایک ایسا میلان ہے جو تمام کہانیوں میں مل جاتا ہے، سُم آنسل کی کہانی 'اسپیڈ بریکر' کا اقتباس دیکھیں

".. اور سپاہی لکڑی کے ہاتھوں پر ٹکی بھوسا بھرے آدمی کی آکرتی پر گولی چلانے کی مشق کر رہا تھا۔ وہ آکرتی یا آدمی برباد گولی کھا کر گھوم جاتی تھی"

ستی اودھو کی کہانی سمجھوتہ کا یہ اقتباس لکھیں۔

"میں آہستہ آہستہ کرسی پر بیٹھتا ہوں وہ افسر پھر فائلوں میں ڈوب جاتا ہے دو پلوں کا آرام مجھے اچھا لگتا ہے میں کمرے کا معائنہ کرنے لگتا ہوں وہی کمرہ میرا جانا پہچانا جس کی ہر چیز میری جانی ہے میری دیکھ ریکھ میں اس کا انتظام ہوا ہے"

الاچند رجوشی کی کہانی 'کابالک' کا یہ اقتباس دیکھیں:

"جو لوگ لاش کو پہچانتے آتے تھے وہ چاروں طرف سے کھلے ٹین کے شیڈ کے اندر شکن مٹانے کی کوشش کر رہے تھے، کچھ تو پوال بچھا کر چادر یا کمبل تان کر لیٹ گئے تھے، کچھ بیٹھے ہوئے چپ چاپ بیڑی یا سگریٹ پھونک رہے تھے اور کچھ طرح طرح کے موضوعات پر بحث کرتے ہوئے گپ بازی کے فن کا پورا مزا لے رہے تھے"

منو بھنڈاری اپنی کہانی 'ابھری سمجھوتی' کے آخر میں لکھتے ہیں:

"وہاں شادی شدہ عورتیں تو بھلے ہی شادی شدہ مردسے عشق کرلیں، جب تک چاہا عشق کیا دل بھر گیا تو لوٹ کر اپنے کھونٹے پر"

اس ...... سادگی میں طنز و تعریض کے جو نشتر ہیں اس کا لطف بھی ...... [illegible]

ہے۔

وقت کی پابندی کے پیش نظر اور طوالت سے گریز کے باعث چاہنے کے باوجود ہم نے ہندی کہانیوں کے محض چند تراشوں پر ہی اکتفا کیا ہے، کچھ ایسا ہی معاملہ اردو کہانیوں کا ہے، اردو میں پرانے اور نئے قلم کاروں کی اچھی اور نمائندہ کہانیوں کی تعداد کافی ہے لیکن ہم یہاں دو چار مختصر اقتباسات پر ہی اکتفا کرنے پر مجبور ہیں، یہاں جو نمونے پیش کر رہا ہوں وہ سب کے سب ان کہانیوں سے ماخوذ ہیں جو ۱۹۷۰ء اور ۱۹۹۰ء کے دوران لکھی گئیں۔

سب سے پہلے قمر احسن کی معروف کہانی "اسپ کشت مات" سے اقتباس پیش ہے جو اپنے خاص علامتی اور رمزیاتی مفہوم کے باعث دلچسپی کا حامل ہے:

"سامنے آپریشن ٹیبل پر اس کا لہولہان پیٹ کھلا ہوا تھا، چاروں طرف خون بہہ رہا تھا اور خون میں سرخ تر بہ تر ایک ٹوٹا گھوڑے کا لہو تر اسر اس کے پیٹ میں سے جھانک رہا تھا، بھینچے ہوئے دانتوں کی قطاریں کھلی باچھوں سے باہر نکلی آرہی تھیں،
گھوڑا ذرا سا گردن گھمائے اپنی زردی مائل آنکھوں سے باپ کو گھور رہا تھا۔"

سید محمد اشرف کی کہانی "ڈار سے بچھڑے" اپنے رمزیاتی اسلوب کے سبب قابل توجہ ہے

"میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، کبھی محسوس ہوتا پانی ساکت ہو گیا ہے، کبھی لگتا پرندے بے حرکت ہو گئے ہیں . . . . . دیر تک پانی پر نظریں جمائے رہنے سے سکوت اور حرکت کا فرق مٹ جاتا ہے، سب ایک جیسا ہو جاتا ہے، ہاں ہر فرق مٹ جاتا ہے اور آج اس تالاب پر بیٹھے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ پانی ہی نہیں کائنات کی ہر چیز ساکت ہو گئی ہے —— بالکل بے حرکت ہو گئی ہے —— اگر حرکت ہے تو صرف ان سپنوں میں، جو ان پرندوں کی گول گول بھولی بھالی آنکھوں میں چمک رہے ہیں، اگر زندگی ہے تو صرف اس امید میں کہ ہم واپس گھر جائیں گے، اگر گرمی ہے تو صرف اس جذبے میں کہ ہم دوبارہ برف چومیں گے، اگر جوش ہے تو صرف اس امنگ میں کہ ہم اپنی چھوڑی ہوئی عزیز چیزیں واپس پائیں گے جو انڈوں کے خول میں بند ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔"

اردو کے نوجوان افسانہ نگاروں میں طارق چھتاری اپنے ہم عمروں میں نسبتاً زیادہ سنجیدہ فنی و فکری رویہ کے حامل تسلیم کیے جاتے ہیں ان کا افسانہ "نیم پلیٹ" رود شعور کی تکنیک کا ایک کامیاب تجربہ ہونے کے سبب کافی مشہور ہوا۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

"وہ نیم پلیٹ جو بار بار ان کے ذہن سے نکل کر گر پڑتی ہے کیا لکھا ہے اس میں؟ کچھ دکھائی نہیں دیتا —— سب کچھ مٹ چکا ہے،

دور تک پھیلا ہوا ایک بہت بڑا میدان ہے جس کی زمین میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ چکی ہیں، سورج کا گولا پھیل کر اتنا بڑا ہو گیا کہ پورا آسمان اس کے پیچھے چھپ جاتا ہے، روشنی اتنی تیز ہے کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا کہ اچانک دور کوئی بہت چھوٹی سی چیز نظر آئی،
کیا ہے وہ؟
کوئی انسان ہے جو اپنے چاروں طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہا ہے، اس کے قریب کوئی بھی نہیں ہے، وہ تنہا ہے
بالکل تنہا ــــ
ارے وہ تو میری طرف بڑھ رہا ہے اور اب میری آنکھوں کے اتنا قریب آگیا کہ اس کے پیچھے سارا میدان، آسمان اور سورج کا، پھیلا ہوا گولا بھی چھپ گیا ہے۔
کون ہے یہ شخص؟
"میں ...؟ اور ان کی آنکھوں کے سامنے خود ان کی اپنی ذات اندھیرا بن کے چھانے لگی"
مگر میں کون ہوں، کیا نام ہے میرا؟ "

نئی نسل کے لکھنے والوں میں انجم عثمانی کی کہانیاں انتظار حسین کے اسلوب سے گہری مماثلت رکھتی ہیں، یوں بھی انجم عثمانی اپنی فنی مہارت کے سبب ایک CONSUMMATE ARTIST ہیں، ان کی کہانی "ایک ہاتھ کا آدمی" سے اس وصف کی نمائندگی ہوتی ہے۔

"ایک دن وہ آئے گا جب بڑے بڑے کام انجام دینے والے اپنے اعمال کی تفصیل بائیں ہاتھ میں لیے ایک طرف ہوں گے اور نیک کام انجام دینے والے اپنے اعمال کی تفصیل دائیں ہاتھ میں لیے دوسری طرف ــــ اور تب سورج بائیں ہاتھ والوں کے عمیق سر پہ سوا نیزے پر ہوگا، دماغ کھولتی ہنڈیا کی طرح گرم ہوں گے۔ نفوس ایک دوسرے سے اس طرح بے پروا ہوں گے کہ ماں باپ اولاد کو، اولاد ماں باپ کو پہچاننے سے انکار کر دے گی اور دائیں ہاتھ والے بائیں ہاتھ والوں کی طرف پلٹ کر نہ دیکھیں گے۔"

ان مختصر سی مثالوں سے بھی اردو، ہندی کہانی میں جو فرق و امتیاز ہے یا یکسانیت اور اشتراک کی موجودہ صورت حال ہے اس کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے، بلاشبہ فنی اور تکنیکی اعتبار سے اردو افسانہ ہندی سے بہت آگے ہے۔ اس کا ایک علمی معیار ہے مگر اس کے قاری محدود ہیں جب کہ ہندی کہانی زمینی زندگی اس کی حشر سامانیوں، ارضی سماجی رشتوں سے منسلک ہو کر معنوی سطح پر سادگی کے اصول کی [illegible] ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کا حلقہ اشاعت [illegible]

وسیلہ ہے، عوام وخواص دونوں میں مقبول ہے لیکن اسے امتیازی صورتِ حال سے قطع نظر موجودہ دور میں جہاں تک افسانے کی مقبولیت اور قدر و منزلت کا سوال ہے اس میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہوا ہے۔ یہ سوچنا کہ شاعری نے افسانے کو اس کے منصب سے بے دخل کر دیا ہے۔ صحیح نہیں ہے، کہانی میں عوامی دلچسپی بڑھی ہے اور بڑھتی رہے گی البتہ یہ حقیقت ہے کہ لوگ اب کہانی پڑھنے اور سُننے کے بجائے دیکھنے کو ترجیح دیتے ہیں اسکرین میڈیا کے فروغ نے پرنٹ میڈیا کے لیے جو چیلنج پیدا کیا ہے موجودہ دور میں کہانی کو بھی اس کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

یاد رکھیے

اگر آپ کی خریداری نمبر کے سامنے سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہو گئی براہ کرم اپنا سالانہ چندہ کی مبلغ ۵۰/- روپے فوراً بھیجیے (منیجر)

مانگے کا اُجالا

والیس آنا ہے کالم ہی، کا خامہ بگوش کے دربار میں اور رقص کرتا قلم کی ہر جنبش کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر محظوظ ہوتا ناز نین بے تکلیف کا بلا تفریق مذہب وملت "تجبیر" سے "کتاب نما" تک۔

ساڑھے تین سال قبل ہم نے کالم نگاری کو اس ارادے کے ساتھ ترک کیا تھا کہ اب دوبارہ اس کوچۂ رسوائی میں قدم نہ رکھیں گے لیکن جب رسوائی مقدر بن چکی ہو تو انسانی ارادے کی حیثیت ہی کیا! ہم سمجھتے تھے کہ کالم نگاری ترک کر کے سکون و عافیت کی زندگی بسر کریں گے مگر اس طرح تو رہا سہا سکون بھی غارت ہو گیا کیوں کہ جو بھی ملتا تھا، یہی پوچھتا تھا کہ اس ترکِ ادب یا ترکِ لذات کا سبب کیا ہے۔ بقول احمد فراز ہم کس کس کو جدائی کا سبب بتاتے اور کہاں کہاں تک بتاتے، لہٰذا سوال کرنے والوں کو مطمئن کرنے کے لیے ہم کوچۂ رسوائی میں واپس آگئے ہیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے سوال کرنے والے مطمئن نہیں ہوں گے، وہ اب ہماری واپسی کا سبب پوچھیں گے۔

کالم نگاری چھوڑنے کے بے شمار اسباب تھے۔ سب سے بڑا سبب تو ہم خود تھے کہ ہمیں اپنے کالموں میں یکسانیت نظر آنے لگی تھی جیسے ہمارے کالم نہ ہوں مشکور حسین یاد کے انشائیے ہوں۔ ایک ہی جیسی باتیں اور ایک ہی جیسا انداز اور ایک ہی جیسے لوگوں کا تذکرہ ہوتا تھا۔ وہی انیس ناگی، وہی ساقی فاروقی، وہی ڈاکٹر انور سدید، وہی ڈاکٹر سلیم اختر، وہی بشیر بدر، وہی باقر مہدی اور حد تو یہ ہے کہ وہی استاد لاغر مراد آبادی جن کے سامنے ہم نے اپنے کالموں کی یکسانیت کا مسئلہ پیش کیا تو انھوں نے فرمایا، اردو ادب کی دنیا محدود ہے جب اسی میں وسعت اور تنوع نہیں ہے تو آپ کے کالموں میں کوئی نئی بات کہاں سے آئے گی۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بس اپنا فرض ادا کرتے رہیے۔ ہم نے پوچھا، ہمارا فرض کیا ہے، فرمایا یہی کہ ایک ہی جیسی باتیں ایک ہی جیسے انداز میں لکھتے رہیے۔

کالم نگاری چھوڑنے کا دوسرا سبب یہ تھا کہ فرمائشوں نے ہمیں پریشان کر دیا تھا

بلا مبالغہ ہر مہینے درجنوں کتابیں اس فرمایش کے ساتھ موصول ہوتیں کہ ہم ان پر اظہارِ خیال کریں۔ ظاہر ہے کہ ہر کتاب اس لائق نہیں ہوتی کہ اس پر اظہارِ خیال کیا جائے کیوں کہ اکثر کتابیں تو اختفائے خیال کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں۔ نیز کالم میں اتنی گنجایش کہاں سے آئے کہ ہر مصنف کی خواہش پوری کی جائے۔ ظاہر ہے کہ ہم منتخب کتابوں ہی سے انصاف کر سکتے تھے اور پھر انصاف کا معیار بھی ہمارا خود ساختہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ جن کتابوں سے انصاف کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی، ان کے مصنفین ناراض ہو جاتے تھے اور ناراضی بھی اتنی شدید ہوتی تھی کہ وہ ہمیں ذہنی اذیت پہنچانے کے لیے اپنی مزید تصانیف بھیجتے رہتے تھے۔ طرفہ تماشا یہ کہ جن کتابوں پر ہم طبع آزمائی کرتے تھے، ان کے مصنفین بھی ہم سے خوش نہیں ہوتے تھے بلکہ بعض تو اس حد تک ناخوش ہو جاتے کہ قانونی کارروائی کی دھمکیاں دینے لگتے تھے۔ ایک آدھ نے وکیل کے ذریعے نوٹس بھی بھجوا دیا۔ کراچی میں مستقل قیام کی وجہ سے ہم لاقانونیت سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا قانون سے ڈرتے ہیں۔ وہ تو خدا بھلا کرے "تکبیر" کے مدیرِ محترم محمد صلاح الدین کا کہ انھوں نے نوٹس کا جواب بھجوا دیا اور بات آئی گئی ہو گئی، ورنہ ہم دوبارہ کالم نویسی شروع کرنے کی بجائے اب تک ہرجانے کی رقم کی قسطیں ادا کر رہے ہوتے یا قسطوں کی عدم ادائی کی صورت میں کسی "کنجِ تنہائی" میں محسن بھوپالی کی کلیات پڑھ رہے ہوتے کہ ہم جیسے ایسی ہی عبرت ناک قید با مشقت کے مستحق ہیں۔ انھیں باتوں کی وجہ سے تو ہم کالم نگاری کو کوچۂ رسوائی کہتے ہیں۔

کالم نگاری ترک کرنے کا تیسرا اور سب سے اہم سبب یہ ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "آبِ گم" شائع ہو گئی۔ اس کتاب کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ نثر کیسے لکھی جاتی ہے اور طنز و مزاح کسے کہتے ہیں۔ یوسفی صاحب کو ہم عموماً نہیں پڑھتے کہ کہیں اُن کی چال چلنے کی کوشش میں ہم اپنی چال بھی نہ بھول جائیں۔ لیکن شامتِ اعمال سے ہم نے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی اس رائے سے متاثر ہو کر کہ پچھلے سو برسوں میں اردو نثر میں "آبِ گم" جیسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ یہ کتاب پڑھ ڈالی کتاب پڑھنے کے بعد ہم پروفیسر صاحب کی رائے سے اس حد تک متفق ہوئے کہ خود موصوف کی تصانیف پر سو برس پہلے کی لکھی ہوئی کتابوں کا گمان ہونے لگا اور خود اپنی تحریریں ہمیں اُن مصنفین کی تحریریں نظر آنے لگیں جن کو لکھنے سے باز رکھنے کے لیے ہم کالم لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ "آبِ گم" کی موجودگی میں ہم جیسوں کا طنزیہ و مزاحیہ کالم لکھنا ایسا ہی ہے جیسے اقبال صفی پوری کا سہگل کی طرز میں غزلیں گانا۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر یوسفی صاحب سے یہ عرض کر دیا جائے کہ آپ ضرور لکھیے مگر ایسا بھی کیا کہ دوسروں پر لکھنے کے سارے راستے بند کر دیے جائیں۔ کبھی کبھار منھ کا مزہ بدلنے کے لیے ایک آدھ چیز ہمارے معیار کی بھی لکھ دیا کیجیے تاکہ کہا جا سکے کہ کرنل محمد خاں کی طرح یوسفی صاحب بھی ترقیِ معکوس کو بُرا نہیں سمجھتے۔

یہ تو ہوئے اسبابِ ترک اور ترکِ ترک کا سبب یہ ہے کہ ہمارے کچھ قارئین ایسے بھی ہیں جو ہماری دائمی مفارقت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ وہ اکثر ہمیں اپنے حصارِ عافیت سے باہر نکلنے کی ترغیب

رہتے ہیں۔ ہم لاکھ سمجھاتے ہیں کہ جب غالب خستہ کے بغیر کام بند نہیں ہوئے تو ہمارے نہ لکھنے سے کیا فرق پڑے گا ہم خستہ ہی نہیں واماندہ و درماندہ بھی ہیں۔ مگر ہماری بات کسی نے نہیں سُنی۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ استاد لاغر مراد آبادی نے بھی لعن طعن کی اور فرمایا، جب نثری نظم لکھنے والوں اور ساختیات و پس ساختیات کی پھلجھڑی چھوڑنے والوں کو کوئی نہیں ٹوکتا تو آپ کالم لکھنے سے کیوں شرماتے ہیں۔ لکھنے سے پہلے شرمانے سے بہتر ہے کہ آدمی لکھنے کے بعد نادم ہو تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ندامت بلا سبب ہے۔ یہ دلیل ایسی تھی کہ سرِ تسلیم خم کیے بغیر چارہ نہ رہا۔

استادِ گرامی نے بیکار بیٹھنے کی جو بات کی ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ ہم اپنے عہدِ رہائی یعنی کالم نہ لکھنے کے زمانے میں بیکار نہیں رہے یہ زمانہ بھی کالم نگاری ہی کے کھاتے میں جمع ہوا۔ اس ابہام کی توضیح یہ ہے کہ مکتبہ جامعہ دہلی کے شاہد علی خاں صاحب ہمارے کرم فرما ہیں اور اپنے رسالے "کتاب نما" کے ذریعے ہمارے کالموں کو ایک بہت بڑے حلقے تک پہنچاتے رہے ہیں۔ ہندستان کے ادبی حلقوں میں ہماری باریابی خاں صاحب ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اگر وہ ساڑھے چھ برسوں تک باقاعدگی سے ہر مہینے ہمارا کالم شائع نہ کرتے تو آج ہندستان میں ہمیں جاننے والے اتنے بھی نہ ہوتے کہ ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جاسکتے۔ اب خدا کے فضل سے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

شاہد علی خاں صاحب نے فرمائش کی، اب آپ فارغ ہیں تو اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے کالموں کا ایک انتخاب تیار کر دیجیے تاکہ اسے آپ کی پہلی اور آخری یادگار کے طور پر شائع کر دیا جائے گویا خاں صاحب یہ چاہتے تھے کہ کالم نگار اپنے کام سے گیا ہے تو کیا ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ ان کی یہ تجویز ہمیں پسند آئی کہ بغیر محنت کے صاحبِ کتاب بننے کا موقع مل رہا تھا۔ "تکبیر" میں چھپے ہوئے کالموں کو جمع کیا ان پر ایک نظر ڈالی۔ اندازہ ہوا کہ سبھی کالم سراپا انتخاب ہیں بشرطیکہ ناقابلِ انتخاب کالموں کا مجموعہ چھاپنا ہو۔ ظاہر ہے "آپ گم" کے مطالعے کے بعد یہی ہونا تھا!

اس مرحلے پر اردو کے منفرد نقاد مظفر علی سید نے ہماری دستگیری کی اور انتخاب کی ذمہ داری قبول کرلی ہماری حوصلہ افزائی کے خیال سے انھوں نے فرمایا، کوئی مصنف اپنے تحریروں کا انتخاب خود نہیں کرسکتا کیوں کہ اسے اپنی ہر تحریر "عالم میں انتخاب" اور آپ کو "کالم میں انتخاب" نظر آتی ہے۔ میں انتخاب کروں گا تو یہ نہیں دیکھوں گا کہ اچھا کالم کون سا ہے اور بُرا کون سا میں تو اس پر نظر رکھوں گا کہ کون سا کالم کم بُرا ہے اور کون سا زیادہ اس طرح ایک اچھا انتخاب آسانی سے مرتب ہو جائے گا۔

انتخاب مرتب کرنے کا یہ کڑا معیار سید صاحب ہی کے بس کی بات ہے کیوں کہ ان کی نگاہِ انتخاب خوبیوں سے زیادہ عیبوں کی قدردان ہے اور پھر اس معاملے میں وہ خاصے تجربہ کار بھی ہیں جس کا ثبوت نظیر صدیقی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا وہ انتخاب ہے جو سید صاحب نے مرتب فرمایا تھا اور چند سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔ شاید اسی انتخاب کی وجہ سے لوگ بھول چکے ہیں کہ

تقلید صدیقی صرف نقاد نہیں، طنز و مزاح میں بھی رواں ہیں۔ ایسا ہونا ہی چاہیے تھا کسی نقاد کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ تنقیدی مقالات کے ہوتے ہوئے الگ سے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے۔

سید صاحب نے نہایت توجہ اور محنت سے ہمارے کالموں کو پڑھا اور ان تمام کالموں کو مسترد کر دیا جو ان کی پسندیدہ شخصیات کے بارے میں تھے۔ یہاں تک کہ وہ کالم بھی ان کے نزدیک بے اعتبار ٹھہرا جو خود ان کے اعزاز میں لکھا گیا تھا اور جس میں ان کے وزیٹنگ کارڈ کو ان کی واحد مستقل تصنیف قرار دیا گیا تھا، اور تصنیف بھی ایسی جس کے کئی اڈیشن چھپ چکے ہوں۔ جی تو چاہتا تھا کہ سید صاحب کے مسترد کردہ کالموں کو بطور انتخاب شائع کر دیا جائے تاکہ ان کی محنت اور ہماری نالائقی کا دستاویزی ثبوت لوح جہاں پر حرف مکرر کی طرح باقی رہ جائے۔ لیکن اس قسم کے کالم تعداد میں بہت زیادہ تھے لہٰذا دوسری قسم کے کالم ہی کتابی صورت میں محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے بعد نظر ثانی کا مرحلہ آیا دو چار کالم پڑھ کر ہی فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کتابت کی غلطیاں زیادہ ہیں یا معنوی اغلاط۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں کالموں کی معنوی اغلاط بھی کاتب کے کمال فن کا اظہار نظر آتی ہیں۔ بہرحال ہم نے بڑی محنت سے کتابت کی غلطیاں دور کر دیں اور باقی ہر طرح کی اغلاط کو اصل کے مطابق باقی رہنے دیا تاکہ ہم پر اصل میں تحریف کا الزام نہ آئے۔ اب یہ انتخاب جلد ہی مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوگا۔ اس کے بعد اس کا جعلی اڈیشن پاکستان سے شائع کیا جائے گا۔ اس اہتمام کا سبب یہ ہے کہ پاکستان میں ہندستانی کتابوں کے جعلی اڈیشن ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔ ●●

ڈاکٹر یعقوب یاور
وسنت کالج، وارانسی

مجاز کا تصور انقلاب

اگر ناقدوں کا ایک حلقہ کہتا ہے کہ مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں مطرب ہے مجاز انقلابی نہیں انقلاب کا مغنی ہے اس کی شاعری قاہری اور دلبری کا آمیزہ ہے۔ تو دوسرا حلقہ کہتا ہے کہ مجاز کا انقلاب رومانی تخریب پسندی سے مستعار ہے۔ اس کی شاعری میں تخلیقی اثر انگیزی کی کمی اور بندوق کی آواز زیادہ ہے۔ یہ حلقہ پہلے حلقہ کے جواب میں کہتا ہے کہ مجاز نے نقارے سے مُر لگانے کی احمقانہ کوشش کی ہے اس کی شاعری نعرے کو گوارہ بنانے کا عمل ہے اس کی قاہری اور دلبری کا آمیزہ تیل اور پانی جیسا ہے جو تھوڑی ہی دیر بعد اپنی حقیقت واضح کر دیتا ہے۔ پہلا حلقہ دوسرے کو غلط اور رجعت پسند ٹھہراتا ہے تو دوسرا حلقہ پہلے کو بددیانت اور جانبدار قرار دیتا ہے۔ تنقید کا یہ انداز اسی رومان پسندی کی مثال ہے جس کا شکار مجاز رہا ہے اس کے ناقد بھی زعم سخن فہمی یا جانبداری میں رومانی انتہا پسندی کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے تنقید کا یہ رویہ مجاز کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ بہتر ہوگا کہ اس کی شاعری کو پرکھنے کے لیے غیر رومانی اور غیر جانبدار تنقید کو بروئے کار لایا جائے جس سے اسکی شاعری کے نقوش اپنے حقیقی رنگ و آہنگ کے ساتھ واضح ہو سکیں۔

پہلے پہلے شاعری میں کسی موضوع کے برتنے کے عمل پر گفتگو کرتے ہیں۔ شاعری کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہے جس طرح انسانی جذبات عشق و حسن، سراپا نگاری یا جنسیات سے شاعری کو گریز نہیں اسی طرح انقلاب بھی شاعری کا موضوع بن سکتا ہے انقلابی شاعری کے لیے انقلابی مزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ شاعری کھانے کے ہضم ہونے کی خوشگوار ڈکار کے بجائے کثیر خورانی کے نتیجے میں ہونے والی قے بن جاتی ہے۔ جب تک انقلاب شاعر کا مزاج نہیں بنے گا اس کی تخلیق خارجی فسادگری اور نعرہ بازی سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آخر یہ انقلابی مزاج ہے کیا؟ جس ماحول میں شاعر رہتا ہے وہاں وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے وہ بے خبر نہیں رہ سکتا ان میں سے کچھ باتوں کو اسکا مزاج رد کر دیتا ہے کہ وہ اس کی فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہوتے اور جو واقعات اس کی فطرت سے قریب ہوتے ہیں انھیں قبول کر لیتا ہے۔ رد و قبول کا یہ عمل عموماً غیر شعوری ہوتا ہے اور اکثر شاعر کو خود اس بات کا احساس نہیں ہو پاتا کہ اس نے کن چیزوں کو رد یا قبول کیا ہے۔ یہ فطری عمل شاعر کی تخلیق کو اثر انگیزی سے ہم کنار کرتا ہے لیکن اگر ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کو ایسی چیزوں کو بھی خارجی دباؤ کے تحت قبول کرنا پڑتا ہے جنھیں اسکے مزاج نے رد کر دیا ہو یہ خارجی

دباؤ جب کسی شاعر پر مسلط ہو جاتا ہے تو اس کی فطری رَو میں رخنہ پڑتا ہے اور اس کی تخلیق وہ تاثر قائم کرنے میں ناکام رہتی ہے جس کی توقع اس شاعر سے کی جاتی ہے دراصل جب ماحول میں کوئی بات اس طرح رچ بس گئی ہو کہ خاص و عام اسکے بغیر شاعری کا تصور نہ کر سکیں تو شاعر کے پاس دو راستے ہوتے ہیں یا تو وہ اپنے فطری رجحان پر برقرار رہے اور نامقبولیت اور تاریک مستقبل کے اندیشے کو گلے لگائے یا پھر بہ جبر ہی سہی اس بات کو قبول کرے چاہے وہ اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہو یا نہیں اکثر شاعر آخر الذکر طریقہ اپنا کر بظاہر اپنے مستقبل کو تابناک بنا لیتے ہیں لیکن در اصل وہ اپنے ادبی زوال کی راہ متعین کر لیتے ہیں۔ مجاز کا تصورِ انقلاب بھی اسی دشت کا سیاح ہے انقلاب اسکا مزاج نہ تھا وہ حسن و جمال کا مغنی تھا لیکن ماحول کے جبر نے اسے انقلاب کے گیت گانے پر مجبور کر دیا۔ وہ انقلاب کا نقیب بنا لیکن اسکا اندرون اسکا شعری ضمیر اسکے لیے اسے ملامت کرتا رہا اسی بیچ نہ جانے کب یہ اوڑھا ہوا انقلاب اسکے مزاج سے ہم آہنگ ہو گیا اسے پتا ہی نہ چلا اور وہ اکثر ایسے اشعار کہتا رہا جس سے اس کی شرمندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی شرمندگی باقی رہی اس بات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ایک اجمالی نظر اس کے شعری سفر پر ڈال لینا بھی مفید ہوگا۔

۱۹۳۲ء میں مجاز نے پہلی بار اپنے آپ کو شاعرِ مزدور و دہقاں قرار دیا۔

بہ ایں رندی مجاز اک شاعرِ مزدور و دہقاں ہے

اگر شہروں میں وہ بدنام ہے بدنام رہنے دے

یہ شعر مجاز نے کیوں کہا؟ یا شاعرِ مزدور و دہقاں ہونے کا فخریہ اظہار اس جیسے غنائی شاعر کو کیوں ضروری معلوم ہوا؟ حالانکہ مجاز کی اس سے پہلے کی شاعری اس دعوے کو یکسر باطل قرار دیتی ہے۔ پھر اس اعلان کے بعد جیسے مجاز خود بھول گیا کہ اس دعوے نے اس پر کچھ نئی ذمہ داریاں عائد کی ہیں اس لیے تقریباً ایک سال تک اس کے قلم سے ایسی کوئی تخلیق نہیں نکلی جو اس دعوے کی حمایت کرتی۔ اب ذرا مجاز کی اس مجبوری کا جائزہ لیتے ہیں جس کے تحت اسے یہ دعویٰ کرنا پڑا۔ سیاسی اعتبار سے یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کی تحریکِ آزادی اپنے عروج پر تھی جس میں مزدوروں کسانوں اور عام آدمی کا تعاون سب سے زیادہ تھا۔ انقلاب روس کا اثر ہندوستان تک پہنچ چکا تھا جس سے پس ماندہ طبقے میں بیداری اور اپنی اہمیت کا احساس جاگا۔ ادبی اعتبار سے یہ وہ زمانہ تھا جب چند نوجوانوں کے افسانوں کا مجموعہ "انگارے" منظرِ عام پر آ چکا تھا اس کی حمایت ترقی یافتہ پسندی اور مخالفت رجعت پرستی قرار دی جانے لگی تھی ان افسانوں میں سماج کی فرسودہ روایات پر چوٹ کرتے ہوئے انقلاب کا صور پھونکا گیا تھا۔ ظاہر ہے ہر اعتبار سے یہ عہد انقلاب اور عوام کی برتری کا احساس دلانے کی حمایت کر رہا تھا۔ مجاز کا مزاج مزدوروں کی زبوں حالی اور کس مپرسی سے متاثر ہو کر ان کی ہمدردی اور حمایت میں نغمے تو گا سکتا تھا لیکن انقلاب اس کے مزاج سے ہٹ کر دور کی بات تھی چنانچہ اس نے انقلابی کہلانے کے بجائے شاعرِ مزدور و دہقاں ہونے کا اعلان کیا حالانکہ مزدوروں سے ہمدردی بھی ایک خارجی جذبہ تھا لیکن ایک دردمند دل اس سے متاثر ہو سکتا تھا

راج کا حصہ بننے میں کچھ وقت لگا انقلاب اس وقت تک مجاز کا خارجی عمل رہا جب تک وہ اس
ے مزاج کا جزو نہ بنا۔ بتدریج انقلابی شاعری میں بھی اس کا فطری آہنگ جھلکنے لگا لیکن جب
قلاب کا مصنوعی طوفان ادب کو تہ و بالا کرنے لگا تو مجاز کے قدم بھی ڈگمگانے لگے اور وہ شاعری کو نعرہ
زی اور صحافت سے قریب لے گیا۔ ماحول سے متاثر ہونا انسان کی فطرت ہے مجاز بھی اپنے ماحول
سے متاثر ہوا تو یہ کوئی جرم نہ تھا لیکن غیر شعوری طور پر اس نے اپنی شاعری پر ظلم ضرور کیا ورنہ شاعر
شباب کے ابتدائی نقوش گواہی دے رہے تھے کہ اس کی انتہا وہ عروج ہے جہاں تک پہنچنے
کے لیے شاعر صدیوں تک اپنے خون جگر کا نذرانہ پیش کرتا رہتا ہے۔

مجاز انقلابی نہیں تھا اس کے سامنے انقلاب کا کوئی واضح تصور بھی نہیں تھا حلقۂ احباب
میں اس نے جس انقلاب کا ذکر سنا تھا اس کا مفہوم خونریزی قتل و غارت گری اور دنیا کو تباہ
کر دینے کے بعد ایسے ماحول کی تعمیر کا عزم تھا جس کی سربراہی مزدوروں اور دہقانوں کے ہاتھوں
میں ہو۔ حالانکہ یہ انقلاب کا نہایت محدود تصور تھا پھر بھی مجاز کا تصور انقلاب یہی ہے شاعر انقلاب
جوش ملیح آبادی سے مجاز کے تعلق کو کون نہیں جانتا۔ جوش کا تصور انقلاب رومانی انتہا پسندی کی
بہترین مثال ہے مجاز نے اسی انقلاب کو اپنایا ہے۔ لیکن مجاز چونکہ بنیادی طور پر اختر شیرانی کی
شاعری سے بھی متاثر ہے اس لیے جب جوش کے انقلاب اور اختر کے رومان کا آمیزہ تیار ہوا
تو مجاز کے تصور انقلاب کا جنم ہوا۔ جو جوش سے قدرے مختلف ہے اس تصور میں انقلاب کا سفر حصول
منزل سے زیادہ چلتے رہنے پر اصرار کرتا ہے اسی لیے مجاز انقلاب کے نتائج سے زیادہ انقلاب
کے مسلسل عمل پر زور دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کی شاعری میں انقلاب کی خونریزی
اور تخریب تو ہے لیکن نتائج کی آسائش اور تعمیر کا فقدان ہے دراصل یہ تعمیر اور تخریب کا نہیں بلکہ انقلابی
عمل اور نتائج سے دلچسپی رکھنے کا فرق ہے مجاز اپنی شاعری سے ان لوگوں کو اکسا کر تباہی بربادی
اور قتل و غارت گری پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتا ہے جنھیں کل عنان اقتدار سنبھالنی ہے اس وقت مجاز
کو یہ خیال نہیں رہتا کہ تخریب کی حد کیا ہو اور یہی بات بیشتر ناقدین کو موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ مجاز کو تخریب
پسند قرار دیں حالانکہ اس طرح جلد بازی میں نتائج اخذ کر لینا مجاز کے ساتھ صریح ناانصافی ہے

آئیے اب دیکھتے ہیں کہ مجاز کا تصور انقلاب اس کی شاعری میں کس طرح جلوہ گر ہوا ہے اور
قاری پر اس کا کیا اثر مرتب ہوتا ہے ناقدوں کے دونوں انتہا پسند گروہوں کی رائے سے قطع نظر اگر غیر
جانب داری سے مجاز کی انقلابی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو اتنی مایوسی نہیں ہوتی جتنی ناقدوں کا ایک گروہ منوانے
پر مصر ہے ہاں یہ بھی غلط نہیں ہے کہ مجاز کی غنائی شاعری جس کا تعلق انقلاب سے نہیں ہے اس بلندی
پر نظر آتی ہے جہاں تک اس کے معاصرین میں شاید ہی کوئی پہنچ سکا ہو۔

مجاز کے یہاں انقلاب کا جو تصور "آوارہ" (سال تخلیق ۱۹۳۷ء)
سے شروع ہوا تھا وہ بعد یہ جہاں کی شکل میں تبدیلی لاتا ہوا "آہنگ نو" (سال تخلیق ۱۹۴۲ء) تک آتا ہے
آوارہ کی تخلیق کے وقت تک انقلاب مجاز کی شاعری کا مقصد نہیں بن پایا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ
انقلاب کی خارجی دنیا اور اس کی ہوائی انقلابیت ہے اسی رَو کے تحت "سرمایہ داری" "ہمارا جھنڈا" "مزدوروں کا

ـت جیسی نظمیں وجود میں آئیں جن میں مجاز مزدوروں کی حمایت کے زعم میں شعری صداقتوں سے
ـی دست بردار ہوتا نظر آتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تصور اپنے بیشتر لوازم کے ساتھ شاعری کے وجدانی عنصر اور
ـاس کے شعری اظہار میں نکھار کا سبب بنتا ہے اظہار کی اس رَو کے دوران جب جب مجاز کو شکیبا
ـی مبتلا ہوتا ہے تو اس کے قلم سے ایسے اشعار نکلتے ہیں

کوئی اُنظر تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے
جگانا چاہتا ہوں آہ وہ میں گا نہیں سکتا

کیا تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

ابھی رہنے دے کچھ دن لطف نغمہ مستیٔ صہبا
ابھی یہ ساز رہنے دے ابھی یہ جام رہنے دے

یہ جا کر کوئی بزم خوباں سے کہہ دے
کہ اب درخور بزم خوباں نہیں ہیں

ـاور وہ قطعہ جو مجاز نے شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کو نذر کیا اور جس میں انقلاب پر طنز کی جھلک نمایاں ہے

پیر جوش شباب کیا جانے　　　شورش اضطراب کیا جانے
سینۂ انقلاب چھلنی ہے　　　شاعر انقلاب کیا جانے

ـان اشعار سے جس تاسف کا احساس ہوتا ہے وہ مجاز کی داخلی کشمکش کو سمجھنے میں معاونت کرتی
ہے مجاز کو معلوم ہے کہ اس کی شاعرانہ فطرت کن باتوں کو گوارہ کرتی ہے اور وہ ناگوار چیزوں کو اپنی شاعری
کا حصہ بنانے پر مجبور ہے "ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر" کی یہی کیفیت اسے بار بار بزم
جاناں کی یاد دلاتی رہتی ہے اور یہی کسک مجاز کی انقلابی شاعری کو انسانی فطرت سے قریب کر
دیتی ہے عاشق کا مچلتا ہوا دل جب انقلاب کے طوفان سے ٹکراتا ہے تو پہلے وہ بزم خوباں میں پہنچنے
کی خواہش کا اظہار کرتا ہے اور جب یہ ممکن نظر نہیں آتا تو محبوب کو پرچم تھام کر اپنے ساتھ آنے
کی دعوت دیتا ہے

اس بحث سے قطع نظر کہ مجاز کا تصور انقلاب تعمیری ہے یا تخریبی اس تصور کا تعلق اسکے
خارج سے ہے یا داخل سے اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ مجاز کی انقلابی شاعری نے ہندوستان
کی تحریک آزادی پر اپنا مثبت اثر چھوڑا ہے اسکی بیشتر نظمیں انقلابیوں کے لبوں پر مچلتی رہی ہیں شاید
مجاز اپنی انقلابی شاعری سے بس اتنا ہی کام لینا چاہتا تھا اور اگر ایسا ہے تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا
ہے انقلابی شاعری نے اسکے ادبی مرتبے کو کس حد تک متاثر کیا ہے اس سوال کی اہمیت بہر حال
اپنی جگہ ہے اسے اس ہنگامی عہد میں جو مقبولیت ملی وہ دلکش اور لائق توجہ ضرور ہے لیکن آج اسکی ادبی
شناخت جس شاعری سے قائم ہے وہ بہر حال اسکی انقلابی شاعری نہیں ہے ●●

یوسف ناظم
۱۹۔ الہلال۔ ۱۳۔ باندرہ ری کلیمیشن
باندرہ۔ بمبئی

کھیل غیروں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

آنکھ کا آپریشن بھی کیا آپریشن ہوتا ہے۔ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس آپریشن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں آئی سرجن آپ کے کپڑے نہیں اتروا تا۔ (اصل میں اس آئی سرجن کا کانگریس (آئی) سے کوئی تعلق نہیں ہے) ورنہ آج کل تو کپڑے اتروانے کی رسم اتنی عام ہو گئی ہے کہ اس کے لیے اب فلموں کی بھی قید نہیں رہی۔ آنکھ کے آپریشن میں مریض مکمل کاسٹیوم میں ملبوس رہتا ہے بلکہ ڈاکٹر کے کاسٹیوم کا ایک حصہ یعنی سر پوش اسے بھی عطا کیا جاتا ہے جو آپریشن سے فراغت کے بعد واپس طلب کر لیا جاتا ہے۔ آنکھوں کا معاملہ عجیب و غریب ہے۔ کچھ لوگ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہیں اور کچھ ایسے خوش نصیب ہیں کہ کچھ دیکھتے ہی نہیں۔ آنکھ کب موتی پہن لیتی ہے آدمی کو بالکل پتا نہیں چلتا۔ (یہ موتی چونکہ کسی سمندر کی آغوش سے برآمد نہیں ہوتا اس لیے اسے موتیا کہا جاتا ہے اور نہ اس موتیا میں پھول کی خوشبو ہوتی ہے) اور آنکھ کب بند ہوگی اس کے بارے میں جو بھی نجومی بتاتا ہے وہ اس سچ اور صرف سچ کی طرح ہوتا ہے جو حلف لے کر عدالت میں بولا جاتا ہے۔ اس عالم فاضل نجومی کو خود اپنی آنکھ کے بارے میں علم نہیں ہوتا کہ وہ کب بند ہوگی لیکن قدرت نے چونکہ ساری مخلوق کو رزق پہنچانے کی ذمہ داری قبول کی ہے اس لیے یہ نجومی بھی اپنے تبحر علمی کے سہارے اپنے اہل و عیال کے ساتھ زندہ اور خوش و خرم رہتا ہے۔ آنکھ کو اتفاق سے قدرت نے قوت گویائی بھی دی ہے اور اکثر [illegible] تو مرد و خواتین آنکھوں آنکھوں میں باتیں کر لیتے ہیں۔ اپنے اس بیان کی تائید میں ہم اردو کے کچھ اشعار بھی پیش کر سکتے ہیں لیکن اس وقت ہم کسی شاعر کی وکالت نہیں کر رہے ہیں اور یوں وہ سارے اشعار خود آپ کو بھی یاد ہیں۔ آنکھ کو قوت گویائی ملی ہے لیکن یہ کبھی کبھی جواب بھی دے دیتی ہے اسی خاموشی کے ساتھ جس خاموشی سے یہ مصروف تکلم ہوتی ہے اور یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب آدمی کہتا ہے ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں [illegible] ایک ساغر کی جگہ دو دو ساغر نظر آنے لگتے ہیں [illegible] کیفیت [illegible] ہوتی ہے۔ ایک انگلی کی دو دیکھتا ہے تو پریشان ہو جاتا

ہے کہ اتنے لوگ کیوں انگشت نمائی کر رہے ہیں۔ گھر میں افرادِ خاندان کم بھی ہوں۔ گھر بھرا بھرا معلوم ہونے لگتا ہے۔ گھر بھرا پُرا ہو تو خوشی ہونے کی بات ہے لیکن اگر صرف ایسا دکھائی دے تو سمجھ لینا چاہیے کہ واقعہ کچھ اور ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔

ایک دن اپنی حسب معمول شہر نوردی کے دوران میں بازار میں فٹ پاتھ پر کھڑا دنیا کی نیرنگیاں (جن میں کچھ رنگینیاں بھی تھیں) دیکھ رہا تھا کہ سڑک کی دوسری طرف یعنی مقابل کے فٹ پاتھ پر مجھے اپنے دوشناسا دکھائی دیے میں نے انھیں پہچانا تو نہیں لیکن انھوں نے مجھے رُکے رہنے کا اشارہ کیا۔ بمبئی میں عام حالات میں بھی ٹریفک کا جام ہونا عام ہے۔ جب مطلع صاف ہوا تو وہ دونوں میری طرف بڑھے۔ آدمی سڑک پار کی تھی کہ دوسرے رُخ سے حسن مطلع شروع ہوگیا اور اِن دونوں کی رفتار شکستِ ناروا کی شکار ہو گئی۔ بمبئی میں یہی ہوتا ہے۔ ماحول یا تو ابر آلود رہتا ہے یا گرد آلود۔ لوگ وقفے وقفے سے اپنے کپڑوں کی گرد جھٹکتے رہتے ہیں۔ یہ گرد تو دور ہو جاتی ہے لیکن وہ گرد جو پچھلے چند سالوں سے دلوں میں بس گئی اور ذہنوں میں رچ گئی ہے دور نہیں ہوتی۔ خیر وہ دونوں شناسا جب اس فراخ سڑک کو دوسرا باب طے کر کے میرے قریب پہنچے تو میں نے شفقت رحمانی کو پہچان کر اُن سے پوچھا اور وہ کہاں رہ گئے ؟ شفقت نے حیران ہو کر الٹا مجھ سے پوچھا کہ وہ کون؟ میں نے کہا اے بھئی وہی جو تمہارے ساتھ تھے۔ جب شفقت نے مجھے یقین دلایا کہ وہ تنہا ہی تھے تو میں سمجھ گیا کہ میری آنکھوں کا مطلع صاف نہیں ہے۔ طرح طرح کے وسوسے غیب سے خیال میں آنے لگے جن میں سے ایک وسوسہ یہ تھا کہ اگر اسی طرح ایک کی جگہ دو نظر آنے لگے تو اس ملک کی آبادی ۹۰ کروڑ کی بجائے ایک سو اسّی کروڑ ہو جائے گی اور موجودہ تباہ کاری کی رفتار کو بھی اسی تناسب سے تیز تر کا اعلان کرنا پڑے گا۔ ورنہ اس آبادی کو نیم زندہ رکھنا بھی محال ہو جائے گا۔ جب بھی ایسا ویسا کوئی وسوسہ مرے دل میں آتا ہے تو پہلے تو میں خود ہی اپنے بل بوتے، کچھ اقوال زرّیں اور کچھ اشعارِ رنگین کے ذریعے اسے دل سے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن جب یہ وسوسہ کسی طرح دل بدر ہونے پر رضامند نہیں ہوتا تو میں ہمیشہ اپنے دوست سکندر خاں سے مشورہ کرتا ہوں۔ سکندر خاں کوئی خطابی یا مصنوعی پٹھان نہیں ہے۔ وسوسے بھی ان سے دور ہی رہتے ہیں۔ ان میں یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ ہر معاملے کی تہ تک فوراً پہنچ جاتے ہیں۔ میرا معاملہ شاید کچھ زیادہ گہرا تھا بھی نہیں اس لیے انھیں اس کی تہ تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں کرنی پڑی۔ میری کیفیت سنتے ہی بولے چلو کسی ڈاکٹر کو آنکھیں دکھاؤ۔ میں نے کہا خاں صاحب ایک تو میری آنکھیں چھوٹی دوسرے میں خود ناچیز میں غریب کیا کسی کو آنکھیں دکھا سکتا ہوں۔ خاں صاحب میں دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بامحاورہ اردو سمجھتے نہیں ہیں لیکن کوئی حرج نہیں۔ اُن میں دوسری منفعت بخش خوبیاں بھی بہت ہیں۔ وہ ہمدرد دوا خانے کی چلتی پھرتی شاخ ہیں۔ لوگ اُن کے آگے پیچھے گھومتے رہتے ہیں اور یہ کسی کو مایوس نہیں کرتے اور میں کیا عرض کروں۔ بہتوں کو تو اُن سے یہ شکایت ہے کہ وہ وزیر نہ ہوتے ہوئے بھی اتنے

باتدبیر کیسے ہوگئے۔ یہ بھی کوئی سوال ہوا۔ وزیر باتدبیر کا محاورہ فقرہ پارینہ ہے اب جو بھی وزیر ہوتا ہے باتقدیر ہوتا ہے۔ سکندر خاں نے میری بامحاورہ اردو کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ کل صبح ۹ بجے تیار رہنا میں آج ہی شام کو ڈاکٹر خورشید دستور سے وقت طے کرلوں گا۔ میں نے کہا یہ تو بہت مہنگی ڈاکٹر ہوں گی۔ یہ سُن کر سکندر خاں خود تو نہیں مسکرائے لیکن اُن کی مونچھیں مسکرائیں۔ اُن کی یہ مسکراہٹ، وہی فاروکٹری کا خاموش ترجمہ ہے۔ کچھ لوگوں کی باچھیں کھل اُٹھتی ہیں۔ اُن کی مونچھیں کھل اُٹھتی ہیں۔

تماشا کرائے جو تیمارداری

دوسرے دن میں 'بسرو چشم' حاضر تھا۔ سکندر خاں اپنی موٹر کار خود چلاتے ہیں۔ سالانہ چار ایکسیڈنٹ پابندی سے کرتے ہیں جن میں سے تین خطرناک ہوتے ہیں راہ گیر بال بال بچ جاتے ہیں۔ اِن کی کار کافی پُرشور ہے یہ ذوالفقار علی خاں کی کار کی طرح صرف اسس وقت 'خموش' ہوتی ہے جب گیرج میں بند ہو۔ وہی ذوالفقار علی خاں جو ڈاکٹر سر محمد اقبال کے دوست تھے اور جن کی کار کے بارے میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے کہا تھا۔

موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش
کہتے ہیں بعد میں ان دونوں کی دوستی میں رخنہ پڑ گیا تھا

لیکن اسس کی وجہ موٹر نہیں کچھ اور تھی۔ سکندر خاں کی خوفزانہ شہرت کے پیش نظر مجھے اُن سے کہنا چاہیے تھا کہ خاں صاحب چلیے ٹیکسی میں چلتے ہیں لیکن اگر میں یہ کہتا تب بھی کسی نہ کسی حادثے سے دوچار ہوتا۔ میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور یہ اسس وقت تک خم رہا جب تک ہم دستور کلینک نہیں پہنچ گئے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں اسس سے پہلے آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاسس گیا ہی نہیں تھا لیکن میں جن کے پاسس گیا وہ ماہر امراض چشم نہیں صرف ماہرین چشمہ تھے۔ از سرِ نو اے بی سی ڈی پڑھاتے اور چشمے کا نمبر طے کرتے تھے۔ یہ دُور کا نہیں چشم بد دور کا چشمہ ہوتا تھا۔ پڑھنے کے لیے ایسی تحریر پیش کرتے تھے جس کی روشنائی اڑ چکی ہوتی اور یہ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی مخطوطہ پڑھنے کا امتحان لیا جا رہا ہو۔ ڈارک روم سے باہر نکلنے پر البتہ آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں ایک سے ایک خوبصورت فریم شوکیس میں موجود ہوتے۔ چشمہ ساز کی خوبصورت اور مزین دکان پر فرحت کا احساس اس لیے بھی ہوتا کہ وہاں جتنے بھی مددگار مامور ہوتے ان سب میں حسِ جمالیات ضرور موجود ہوتی۔ وہ طرح طرح کے فریم آپ کی آنکھوں پر لگاتے کانوں پر سجاتے اور بتاتے کہ آپ کے رُخِ زیبا پر کون سا فریم بہار دے رہا ہے اور کس چشمے کی مدد سے آپ کی شخصیت میں مزید نکھار آ گیا ہے۔ سامنے رکھا ہوا آئینہ اسس مددگار کی ہر بات کو جھٹلاتا لیکن چشموں کے شوروم میں تو جذبۂ خود بینی کو مہمیز ملتی ہے۔ آپ کی جیب ہلکی ہو جاتی لیکن اسس وقت سکندر خاں کی معیت میں میں جس کلینک میں موجود تھا۔ وہاں سارے حاضرین طلب کی آنکھوں پر یا تو سیاہ چشمے نصب تھے یا ایک آنکھ پر سبز مرہم لگا ہوا تھا۔ یہ خوش نگاہی کے طلب گاروں کی محفل تھی۔ کچھ لوگوں کو بھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دوا ڈلی ہوئی

تی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دیدۂ پرآب والے حضرات میرے ہم مشرب ہیں اور جہاں ہم نشیں عنقریب ہم میں بھی سرایت کرنے والا ہے۔ وقت مقررہ پر میرا نام پکارا گیا جیسا کہ عدالتوں میں ہوتا ہے لیکن یہاں انداز حاکمانہ نہیں عاجزانہ تھا۔ سکندر خاں میرے ساتھ بلکہ یوں کہیے میں اُن کے ساتھ بغرض معائنہ پیش ہوا۔ ڈاکٹر پر نظر پڑی تو ایسا محسوس ہوا گویا مہرعالم تاب کا منظر کھلا۔ ڈاکٹر خورشید ہم با مسمیٰ معلوم ہوئیں۔ سکندر خاں نے مجھے بتا دیا تھا کہ ڈاکٹر خورشید دستور، ڈاکٹر دستور کی متبنیٰ بیٹی ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں ڈاکٹر دستور کے حسن انتخاب کی داد دی اور مجھے یقین ہو گیا کہ ان کے ہاتھوں میرا زاویۂ نگاہ ٹھیک بٹھائے گا۔ معائنے کی رسم ذرا طویل تھی لیکن دل خوش کن تھی میز پر لیٹے لیٹے چھت کو تکتے رہنا یا معائنہ کار کی انگلی پر نظر جمائے رکھنا، بظاہر لایعنی اشعار معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ تک بندی نہیں ادق گوئی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر انہی خارج از بحر اشعار سے اپنے مطلب کی بات معلوم کر لیتا ہے اور یہ ڈاکٹر تو ایرانی النسل تھیں۔ دیوان حافظ سے فال نکالنے کی ماہر۔ ڈاکٹر نے میری دونوں آنکھوں میں کوئی دوا ڈال دی۔ میری پتلیاں پھیل گئیں اور منظر دیکھنے کی کوشش کی تو ایسا محسوس ہوا کہ ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار۔ جی میں تو آیا کہ ڈاکٹر خورشید دستور کو مخاطب کر کے کہوں کہ اے پرتو خورشید جہاں تاب ادھر بھی۔ سایے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے لیکن ڈاکٹر کے مطب میں شعر خوانی اور وہ بھی ایک خاتون ڈاکٹر کے مطب میں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر میں نے یہ شعر بآواز بلند پڑھ دیا جس میں اتفاق یعنی حسن اتفاق سے ڈاکٹر کا نام آ گیا ہے تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ اس بچارے کے اعصاب پہ عورت ہے سوار۔ آنکھیں بند ہوں تو عجیب عجیب خیالات دل میں آتے ہیں۔ ایک خیال یہ آیا کہ ڈاکٹر اقبال جنھوں نے وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ کہہ کر ہم سب کو دنگ کر دیا، کیسے کہہ سکتے تھے کہ تخنوروں اور مصوروں کے اعصاب پر عورت سوار ہے، وجود زن تو قدرت کا ایک عطیہ ہے۔ فیوض الٰہی میں سے ایک فیض۔ میں انہی خیالات میں غوطہ زن تھا کہ ڈاکٹر کی آواز سنائی دی۔ وہ سکندر خاں سے کہہ رہی تھیں۔ جی ہاں تی نہیں تھیں۔ ادب پہلا قرینہ ہے۔ یہ بات مجھے یاد ہے کہ آپ ایک گھنٹے کے بعد آ کر اپنے دوست کو لے جائیے۔ مجھے ابھی ان کی آنکھوں پر کچھ اور کام کرنا ہے۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ ڈاکٹر میری آنکھوں سے کیا کام لیں گی۔ بہر حال موقع شکایت کا نہیں شکر کا تھا۔ وقت بہر صورت گزر جاتا ہے۔ آدمی سولی پر ہو یا میز پر۔ ہاں کچھ خوش قسمت لوگ ضرور ایسے ہیں جو کرسی پر بیٹھتے ہیں تو ۵ سال تک اسے چھوڑتے نہیں۔ یہ خود تو سیاست جانتے ہی ہیں ان کا دربان بھی سیاست جانتا ہے اور کوئی فریادی سیاست دربان سے ڈر کر ان کے در پر صدا نہیں دیتا۔

ڈاکٹر خورشید نے کچھ دیر بعد مجھ پر دوبارہ عنایت کی نظر کی اور معائنہ کے نتیجے کے اعلان میں بتایا کہ میری دونوں آنکھوں کا موتیا پک چکا ہے۔ (چلیے میری کسی بات میں تو پختگی آئی) اور یہ کہ میں جب چاہوں اپنی دونوں آنکھوں میں سے کوئی ایک آنکھ آپریشن کے لیے پیش کر سکتا ہوں۔ ڈاکٹر نے یہ خوشخبری بھی سنائی کہ آپریشن سے پہلے میری آنکھوں کی سونوگرافی ہو گی (کھل گئی پیدائی میری) آنکھوں کی بھی سونوگرافی ہوتی ہے یہ سن کر واقعی میری آنکھیں

فرسٹ راؤ ہوگئیں۔ بعد میں پتا چلا کہ میری آنکھوں کا علاقہ کافی زرخیز ہے۔ ان کے اندر بال پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ (چشم تر کے کمالات ہیں)۔ دو تین امتحانات بھی تجویز کیے گئے۔ خون کا امتحان، دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے معلوم کرنے کا امتحان، شکر رنجی کا امتحان۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ خون کے معاملے میں اس کا رنگ نہیں پوچھا جاتا۔ سرخ رنگ تو یوں بھی دنیا کے نقشے میں مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ میں اپنی پھیلی ہوئی پتلیوں کے سائے میں گھر واپس ہوا۔ کہا گیا کہ انھیں اصلی حالت پر واپس سفر کرنے میں کم سے کم ۴۸ گھنٹے ضرور درکار ہوں گے۔ آنکھوں میں آنسو تو تھے ہی روزانہ عرق بھی ٹپکتا رہا۔ خود کو تو توفیق نہیں ہوتی لیکن آنکھیں ہمیشہ باوضو رہتی ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں سارے امتحانات میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوا۔ مشینیں ان ممتحنوں کی طرح تعصب یا جانبداری نہیں برتتیں جو طالب علموں کے پرچے جانچتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ممتحن تو اتنے نبض شناس ہوتے ہیں کہ حروف کی نشست اور ان کے دائروں سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ کن انگلیوں کی پیداوار ہیں۔ پانچ نمبر تو یقیناً زیادہ دے دیتے ہیں۔ سونوگرافی بھی مجھ میرے لیے ایک تجربہ اور معلومات میں اضافے کی چیز تھی اچھی گزری اور اب تو میں سونوگرافی کے موضوع پر رک رک کر تقریر بھی کر سکتا ہوں۔ ڈاکٹر کے دستِ صبا نے خطۂ چشم سے وہ سارے رخنے ہٹا دیے جو ان کے نشتر کی سبک رفتاری میں حائل ہو سکتے تھے۔ خود ڈاکٹر نے آپریشن کے لیے میری دونوں آنکھوں میں سے ایک آنکھ کا انتخاب کیا اور طے کیا پہلے بائیں آنکھ کی بینائی تیز کرنے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ مجھے ان کا انتخاب پسند آیا۔ کسی اور معاملے میں تو بائیں بازو، چلنے کی ہمت اب رہی نہیں ہے (گویا کہ پہلے تھی) کم سے کم آپریشن کے معاملے میں تو یہ رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اپنی انا کا بھی اظہار کرنا ضروری تھا اس لیے میں نے ڈاکٹر سے کہا، جی میں خود بھی آپ سے یہی کہنے والا تھا کہ بائیں آنکھ کو پہلے مستحکم کریں۔ بائیں سمت میں لینے سے آدمی میں تنقیدی شعور پیدا ہوتا ہے جو ان دنوں ضروری ہے۔ تنقید کی کئی قسمیں ہیں۔ جدلیاتی ساختیاتی، جمالیاتی، تجزیاتی یہ سب کام آنے والی تنقیدیں او[illegible] ان میں سے کسی ایک پر بھی آپ کو قابو حاصل ہو گیا تو آپ کی ازدواجی زندگی کا کامیابی سے ہمکنار ہونا ضروری ہے۔ تنقید کا یہ بہت روشن پہلو ہے۔ ڈاکٹر کو میں نے اپنی بائیں آنکھ کے انتخاب پر مبارکباد دی اور آپریشن کی تاریخ تک ڈاکٹر کی ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کرنے کا یقین دلاتے ہوئے میں نے اس دوران صالح زندگی گزارنے کا حتمی وعدہ کیا۔

۴۔ مری آنکھوں کی بیشانی میں ہیں اسباب مستوری۔

آپریشن کا دن میرے لیے عید کا دن تھا اس لیے کہ آنکھ کے آپریشن کے بعد کئی ہفتوں تک سنانا منع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ۔ دو دن پہلے سے کیپسول اور ٹانک سے تواضع ہوتی ہے۔ صبح سویرے آنکھ میں ہر دو منٹ رنگوں کی دوائیں ڈالی جاتی ہیں اور آنکھ کو صاف ستھری حالت میں پیش کیا جاتا ہے آپریشن سے [illegible] کی پلکیں کاٹ دی جاتی ہیں [illegible] چشم ہے۔

گام زن ہوتی ہے تو جسم میں ایک جھرجھری سے آجاتی ہے۔ سختی سے ہدایت ہوتی ہے آنکھ بند رکھی جائے اور آنکھ ہے کہ مانتی ہی نہیں۔ اُس دن مجھے معلوم ہوا کہ ننگی آنکھ (NAKED EYE) کسے کہتے ہیں۔ یہ وہ آنکھ ہوتی ہے جس پر نہ سایبان ہوتا ہے نہ نیچے کوئی دہلیز۔ اُس وقت آپ کو آئینہ نہیں دکھایا جاتا۔ آپریشن تھیٹر میں لے جایا نہیں جاتا آپ خود چل کر جاتے ہیں دوسرے آپریشنوں کی بات الگ ہوتی ہے۔ اُن میں سے کچھ آپریشن تو ذبیحہ کی تعریف میں آتے ہیں مریض خود چل کر نہیں جاتا اُسے ڈھکیل کر لے جانا پڑ جاتا ہے (اسٹریچر پر) جس آپریشن تھیٹر میں مجھے لے جایا گیا اس میں اسلحہ کم تھے۔ افراد بھی کم۔ کیفیت البتہ زیادہ تھی۔ ڈاکٹر نے میرا اس طرح استقبال کیا جیسے کسی تہنیتی تقریب میں صاحبِ اعزاز کا کیا جاتا ہے۔ اپنی ایک ہم جلیس سے تعارف کرایا اور کہا اگر ضرورت پڑی تو یہ آپ کو بے ہوش کریں گی ورنہ یہ کام صرف جزوی اور مقامی طور پر ہوگا یعنی صرف حلقۂ چشم و ابرو میں۔ میں نے دل میں کہا یہی تو مقاماتِ آہ و فغاں ہیں اور یہ بھی کہا اب مجھے بے ہوش ہونے کے لیے کسی انجکشن کی ضرورت نہیں ہے۔ اور پھر یہ بھی کہا آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں)۔ مجھے آپریشن ٹیبل پہ لیٹ جانے کی ہدایت دی گئی اور دونوں ڈاکٹر مصروفِ دیدہ آرائی ہوگئے۔ نہایت تیز روشنی میری آنکھوں پر ڈالی گئی میں نے کہا کاش ہمارا مستقبل بھی اتنا روشن ہوتا۔ یہ خیال دل میں آیا ہی تھا کہ روشنی بجھ گئی۔ مجھے تھوڑا تھوڑا محسوس ہوا کہ میں کچھ کھو رہا ہوں۔ ڈاکٹر نے میری توجہ ہٹانے کے لیے کچھ کہا بھی اور میں سمجھا بھی لیکن کھلونے دے کے بہلانے کا یہ انداز میری توجہ میں حامل نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر کی "سرانگشتِ شفائی" میری چشمِ گنہگار پر یوں رقص کناں تھی جیسے رگِ گل سے بلبل کے پر باندھنے کا اہتمام ہو رہا ہو۔ چہرہ میرا سُن تھا۔ لیکن میری قوتِ گویائی برقرار تھی۔ بلبل کا خیال ذہن میں آتے ہی میں نے اپنے بارے میں سوچا کہ طرح ہمنوا میں بھی گل ہوں کہ خاموش رہوں۔ ڈاکٹر سے میں نے کچھ پوچھا جواب بھی ملا۔ بتایا گیا کہ ابھی آخری پیرا[illegible]ف باقی ہے۔ ہم جلیس کی انگلیاں میری نبض پر تھیں اور اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دیکھ کر میں نے اندازہ کر لیا کہ میری نبض، آہستہ رو مضافاتی ٹرین کی رفتار سے چل رہی ہے۔ دھیمی لیکن خبت انداز میں۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے حلقۂ چشم میں ایک نازک سا شیشہ حلول کر رہا ہے۔ یہی وہ آپریشن تھا جس کی میں نے تعریف سُنی تھی۔ اُسے آپ مرصّع کاری بھی کہہ سکتے ہیں اور شیشہ گری بھی۔ اس ورقی شیشے کی 'رفت' کے لیے جتنی بھی جگہ بنائی جاتی ہے اُسے ڈاکٹر کی ماہرانہ خیاطی چند لمحوں میں سیل بند کر دیتی ہے۔ ٹانکے لگتے ہیں جو آنکھ ہی میں چند دن مقیم رہ کر نابود ہو جاتے ہیں (باور آیا میں ٹانکوں کا ہوا ہو جانا)۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر کے سانس لینے کی آواز آئی۔ سانس تو پہلے بھی چل رہی ہوگی لیکن آواز میں نے اب سُنی۔ یہ اطمینان کی سانس تھی۔ میری آنکھ کی تدوین و تہذیب کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ جلد بندی ہو چکی تھی اور اس پر "سرورق" بھی لگا دیا گیا تھا۔ وہی سبز رنگ کا۔ مجھ سے اُٹھنے کے لیے کہا گیا اور پھر اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کے لیے۔ کاش ہمارے یہاں سب لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے

ہوسکتے۔ لوگوں کی درجہ بندی نہ ہوتی۔ یہی وہ خواب ہیں جو جاگتی آنکھوں میں بسے رہتے ہیں۔ والدین کی آنکھوں کے یہ خواب وراثتاً بچوں میں منتقل ہوتے ہیں۔ یہی ایک جایداد منقولہ ہے جس پر کوئی تنازعہ نہیں ہوتا۔ کوئی فوجداری نہیں ہوتی۔ نئی نسل سے پوچھ کر دیکھیے یہی جواب ملے گا۔ ہمیں ترکے میں خواب ملے ہیں۔ معلوم نہیں یہ ترکہ کب متروک ہوگا۔

میں بیک بینی و دو گوش، کمرۂ جراحی سے نکل کر حجرۂ استراحت میں پہنچا اور بستر پر دراز ہوگیا۔ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ میں بائیں طرف کروٹ نہ لوں۔ اپنی اپنی عادت ہے اتفاق دیکھیے کہ مجھے بائیں کروٹ ہی قرار آتا ہے اور ڈاکٹر نے اسی کروٹ پر تحدید عائد کردی۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ کھانے پینے کی ممانعت نہیں تھی۔ بس ملائم غذا کی سفارش کی گئی۔ تری آوا نمکٹ اور مدینے (کھچڑی کہاں نہیں پکتی)۔ آٹھ گھنٹے کے آرام کے بعد ڈاکٹر نے آنکھ پر لگا سرپوش ہٹایا۔ تماش بینوں کو انھوں نے وہ شیشہ بھی دکھایا جو میری آنکھ میں نصب کیا گیا تھا۔ دیکھنے والوں نے بہ نظر استحسان اسے دیکھا اور ڈاکٹر کے حسن کمال کی داد دی۔ مطب سے میری واپسی بھی اتنے ہی خوشگوار ماحول میں ہوئی جتنے خوشگوار ماحول میں میرا خیر مقدم ہوا تھا۔ اس وقت میں سب کو ایک آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ ایک مضحکہ خیز خیال دل میں یہ آیا کہ کسی زمانے میں رعیت کو ایک نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا کیوں کہ اب ایسا سوچنا بھی خیال است محال است و جنوں۔

۴

انڈرگریجویٹ: وہ لوگ جن کی دونوں آنکھوں کا آپریشن ہوچکا ہے اس مضمون کے گریجویٹ ہیں، ایک آنکھ والے صرف انڈرگریجویٹ۔ ان اہل نظر لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور چشمہ پوش خواتین و حضرات سے ان کا مقابلہ ہورہا ہے لیکن چشمہ پوش آبادی زیادہ ہے ان میں کمسن اور نابالغ بچے بھی شامل ہیں۔ چشمے اب اتنے عام ہوگئے ہیں کہ بہتوں کے گلے کا ہار بن گئے ہیں۔ ہر دس آدمیوں میں ایک آدمی ضرور ایسا دستیاب ہوجاتا ہے جس کے گلے میں عینک مالا پڑی ہو۔ اب عینک واقعی پہنی جانے لگی ہے۔ خواتین کے گلے کی زنجیر کی طرح۔ مردوں کو ان عینک مالاؤں سے کھیلنے کی عادت تو نہیں پڑی ہے لیکن رفتہ رفتہ پڑ جائے گی اور عینک مالائیں اچک لینے کی بھی وارداتیں ہونے لگیں گی۔ اہل ہنر جانتے ہیں کہ گلے کی دو زنجیر جو بار بار ہونٹوں تلے دابی جائے ۲۲ قیراطی سونے کی ہوتی ہے۔ عینک مالا کی قیمت اتنی تو نہیں آئے گی لیکن آج کل تو ایک وقت کے کھانے کی قیمت کی بھی کوئی چیز ہاتھ آجائے تو دل کی مراد بر آتی ہے۔ بھیڑ زیادہ ہو یا کسی سے گلے ملنا ہو تو عینک سے گلوخلاصی تو نہیں ہوتی لیکن اسے آنکھوں پر سجا لیا جاتا ہے۔ یہ عینک اس لحاظ سے قابل قدر ہوتی ہے کہ گھروں میں بیوی بچوں کو اس کی تلاش پر مامور نہیں کیا جاتا۔ نہ تو بے پر روٹی جلتی ہے اور نہ بچوں کے ٹی وی دیکھنے کے شغل میں مداخلت ہوتی ہے۔ لیکن آنکھ کے آپریشن کے مرحلے سے گزرنے والے لوگوں کی سماجی حیثیت صرف عینک استعمال کرنے والے لوگوں کے مقابلے میں

خاصی اونچی ہوتی ہے۔ ان کے پاس گفتگو کا ایک موضوع ہوتا ہے اور ان کا تجربہ چاند پر جانے والے خلا بازوں کے تجربے سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ کسی بھی محفل میں جا بیٹھئے چار چھے آدمی اس نوعیت کے مل جاتے ہیں بلکہ بعض لوگوں کا تو کہنا ہے کہ تفریح کے مقامات پر یہ بھی اب ان لوگوں کے باضابطہ جلسے ہونے لگے ہیں۔ کسی بھی پارک یا گارڈن میں یہ لوگ اس طرح بیٹھ جاتے ہیں جیسے کوئی چوپال لگی ہو۔ سوالات یہ ہوتے ہیں۔

آپ کی کون سی آنکھ کا آپریشن ہوا۔ بائیں آنکھ کا۔ جی میری بھی بائیں آنکھ کا ہوا ہے دائیں کا بھی ہوگا۔ آپ کی آنکھ میں لینس (LENS) کہاں کا ہے۔ جی میرا بھی امریکن ہے۔ آسٹریلیا سے بھی اچھے لینس آرہے ہیں۔ اب میں اپنی دوسری آنکھ میں آسٹریلین لینس ہی لگواؤں گا۔ (جی ہاں ابھی بیچ کرکٹ کی دیکھنے میں سہولت ہوگی)۔ آپ کا ڈاکٹر کون تھا۔ اچھا اچھا وہ تو بہت مشہور ڈاکٹر ہیں۔ فیس بھی اونچی ہوگی بس کچھ ایسی خاص نہیں اور آج کل روپے کی قیمت ہی کتنی ہے۔ جی ہاں آنکھ کے معاملے میں روپے کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ پھر کوئی صاحب باضابطہ تقریر کرتے ہیں اور پہلے زمانے کے آپریشن اور آج کے آپریشن کا موازنہ اس طرح کرتے ہیں جیسے انیس و دبیر کا موازنہ ہو رہا ہو یا جوش و فراق کا۔ پھر کہتے ہیں بس اس آپریشن میں ایک ہی تکلیف ہے نہانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ تین ہفتوں تک سر نہ دھونا ایک عذاب معلوم ہوتا ہے کہیں سے آواز آتی ہے آپ کے سر میں ہے کیا سب تو پہلے ہی کھل چکا اب ان جلسوں میں بھی شریک ہونے لگا ہوں بلکہ احباب میرے لیے چشم براہ رہتے ہیں میں نے ایک دن بتایا کہ کل میرا آپریشن ہونے والا تھا اس دن ایک خاتون بھی وہاں موجود تھیں اور شکایت کر رہی تھیں کہ ڈاکٹر نے ان سے فیس کی رقم زیادہ مانگی ہے۔ کسی نے پوچھا کیوں تو جواب دیا ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ میری آنکھیں غلافی ہیں اس لیے ان پر زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ یہ سن کر سارے حاضرین نے ان خاتون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا چاہا۔ کسی کو موقع ملا کسی کو نہیں۔ ان میں سے ایک خاتون نے کہا اے تمہاری تو پلکیں بھی بہت دراز ہیں۔ تمہارے میاں اُن کی جدائی برداشت کرلیں گے۔ پھر میں نے بتایا کہ ایک کے بعد اور کیا کیا باتیں ہوئیں میں سن نہیں سکا۔ میرا نام پکارا جا چکا تھا۔

میں تو رائے دوں گا کہ توفیق ہو تو ہر شخص کو آنکھ کا آپریشن کروانا چاہیے۔ زندگی میں ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔ ایک آنکھ کا آپریشن ہی سہی لیکن کروانا چاہیے۔

مجتبیٰ حسین
مکان نمبر ۲۰۰۲، انکور اپارٹمنٹس
پلاٹ نمبر ۷، پٹ پڑگنج دہلی ۹۲

کچھ نثار احمد فاروقی کے بارے میں

ماہنامہ "کتاب نما" کے مدیر اور مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں بڑے کمال کے آدمی ہیں۔ اِدھر انھوں نے بعض اہم ادیبوں اور شخصیتوں کے بارے میں اپنے رسالے کے خصوصی شمارے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ انھوں نے ابتدا میں تو دو چار خصوصی شمارے مرحومین کے بارے میں شائع کیے۔ مگر اب یہ ان لوگوں کے خصوصی شمارے بھی شائع کرنے لگے ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے اب تک زندہ ہیں (خصوصی شمارے کی اشاعت کے بعد مر جائیں یہ الگ بات ہے) مگر یہ اردو والوں کے مزاج کے یکسر خلاف بات ہے۔ ہم کسی کی پیٹھ پیچھے تعریف اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ اس شخصیت کی پیٹھ قبر میں نہ اتار دی جائے جس کی تعریف مقصود ہو۔ زندگی میں تو پیٹھ پیچھے غیبت ہی بھلی لگتی ہے۔ ایک دو بار شاہد علی خاں سے شکایت بھی کی کہ آپ کی اس "غیر اردو" حرکت کی وجہ سے ہمیں زندہ ادیبوں کی بھی عزت کرنے کی عادت پڑتی جا رہی ہے۔ آخر کتنوں کی عزت کریں؟ مُردوں کی تو خیر واجب ہے، اب زندوں کی بھی کرنا پڑ رہی ہے۔ ہماری شکایت کے جواب میں وہ ہمیشہ دور درشن والی ہنسی ہنس کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

ابھی پچھلے دنوں انھوں نے ہمارے دوست پروفیسر نثار احمد فاروقی کے بارے میں اپنے رسالے کا ایک خصوصی شمارہ شائع کیا ہے (سچ تو یہ ہے کہ اس شمارے کے گہرے مطالعے کے بعد ہم میں نہ یہ تاب ہے نہ مجال کہ نثار احمد فاروقی کو اپنا دوست کہہ سکیں۔ ہماری کیا بساط کہ اپنے آپ کو ان کے حلقہ احباب میں شامل کر سکیں، حالانکہ ان سے پینتیس (۳۵) برس پرانی دوستی ہے) اگرچہ نثار احمد فاروقی کو ہم بہت پہلے سے ایک بے پناہ عالم، بے بدل محقق، بے مثال انشا پرداز اور ایک بے ریا نقاد کے طور پر جانتے ہیں۔ لیکن ہمیں کیا پتا تھا کہ یہ اتنے بڑے عالم، اتنے بڑے محقق اور نقاد وغیرہ ہیں۔ بلاشبہ ہم ان سے قدم بہ قدم اکتساب علم کرتے رہے ہیں، لیکن ان سے اُتنا ہی ضروری علم حاصل کیا جتنی کہ ہماری خوش دلی اور خوش ذوقی کو ضرورت تھی۔ اب جو خصوصی شمارے میں ان کی علمی فتوحات اور ادبی کارناموں کا تفصیل سے ذکر پڑھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں (نیند میں بھی بڑی مشکل سے بند ہو رہی ہیں) ہماری حالت اس غیر تعلیم یافتہ عمر رسیدہ شخص کی سی ہو گئی ہے جس نے پچاس برس کی عمر کے بعد

تعلیم حاصل کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ ایک دن پاسکن نے گرامر کی کتاب پڑھی اور جب اسے اچانک یہ احساس
ہوا کہ گرامر کے باضابطہ مطالعے کے بغیر بھی وہ پچھلے کم و بیش پچاس برسوں سے صحیح زبان بولتا رہا ہے
تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ چنانچہ اب ہم اس احساس کے باعث خوشی کے مارے پھولے
نہیں سما رہے ہیں کہ پچھلے (۳۵) برسوں سے ہم ایک بڑے عالم کی صحبت میں وقت گزار رہے
ہیں اور ہمیں اس کا پتا ہی نہ چل سکا۔ بات در اصل یہ ہے کہ نثار احمد فاروقی علم کا ایک سمندر ہیں جس
کو جتنا پانی چاہیے لے لے۔ ہمارے لیے تو چلو بھر پانی بھی کافی ہے۔
ان کے اس وافر اور فالتو علم سے ہمیں کیا لینا دینا ہے۔ ہم نے ان کے علم سے صرف اتنا ہی
استفادہ کیا ہے جتنا کہ ہماری خوش دلی اور خوش ذوقی کو درکار تھا۔ وہ عالم ہونے کے باوجود بے حد
ہنسوڑ اور خوش مذاق آدمی ہیں۔ ایسے کھلے دل سے ہنستے ہیں کہ ان کے کھلے دماغ والے عالم ہونے
پر شبہ سا ہونے لگتا ہے۔
لندن میں ہیروڈس کا ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے جس میں سوئی سے لے کر ہاتھی تک ساری
چیزیں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ اصل میں نثار احمد فاروقی بھی علم کا ایک ایسا ہی ڈیپارٹمنٹل اسٹور
ہیں۔ ہمیں اس ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے صرف سوئی درکار تھی سو وہ لے لی۔ ہاتھی سے ہمیں کیا مطلب!
وہ ہم سے عمر میں دو ایک برس بڑے ہوں گے لیکن جتنا علم انھوں نے اس مختصر سی مدت میں اپنی
ذات میں جمع کر لیا ہے اس کے لیے ہم جیسے آدمی کو کم از کم پانچ سو برس کی عمر درکار ہوگی۔ جس
آدمی نے بارہ برس کی عمر سے لکھنا شروع کیا ہو اور جو دنیا کی بہترین کتابوں کا مطالعہ کر چکا ہو، اس
کے علم کے کیا کہنے۔ وہ چار زبانوں پر گہری دسترس رکھتے ہیں۔ فارسی تو ان کے گھر کی لونڈی ہے۔
اردو، مادری زبان ہے، عربی کے وہ پروفیسر اور استاد ہونے کے علاوہ صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی
بھی ہیں۔ انگریزی پر ایسا عبور رکھتے ہیں کہ لگتا ہے کہ انگریز ان کی انگریزی دانی سے مرعوب ہو کر ہی
اس ملک کو چھوڑ کر چلے گئے۔ زبانیں تو وہ اور بھی کئی جانتے ہیں لیکن صرف چار زبانوں کو ہی اچھی
طرح جاننے کا دعوا کرتے ہیں (ذرا سوچیے کہ شرعی مجبوریوں کا کتنا پاس و لحاظ رکھتے ہیں) لیکن
حیرت یہ ہوتی ہے کہ اتنی ساری زبانیں جاننے کے باوجود نہایت سادہ اور آسان زبان لکھتے
ہیں۔ کہتے ہیں جو آدمی زبان پر قدرت رکھتا ہے وہ مشکل زبان لکھ ہی نہیں سکتا۔
یادش بخیر۔ ہم سے ان کی ملاقات غالباً ۱۹۵۰ء میں حیدرآباد میں روزنامہ "سیاست"
کے انتخاب پریس میں ہوئی تھی۔ اردو کے خاموش خدمت گزار منظور احمد (جو ان دنوں اردو مجلس
کے سکریٹری تھے) ان کے ہمراہ تھے، کسی مخطوطے کی اشاعت کا مسئلہ تھا۔ پہلی ملاقات میں
ہم نثار احمد فاروقی کی گہری علمیت سے مرعوب تو ہوئے تھے لیکن ان کی شخصیت میں خوش دلی کا
جو سرا ہمیں نظر آیا تو اُسے تھام لیا اور آج تک اسی کو تھامے ہوئے ہیں۔ حیدرآباد سے انھیں
بے پناہ اُنس ہے۔ بچپن میں وہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء تک حیدرآباد کے مدرسہ وسطانیہ ابو شریف
میں تعلیم بھی حاصل کر چکے ہیں۔ اب بھی اکثر حیدرآباد آتے جاتے رہتے ہیں (بڑی خاموشی کے
ساتھ)

حیدرآباد سے وہ کتنا گہرا تعلق رکھتے ہیں اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک بار انھوں نے ہم سے چکنی سپاری اور لیموں کا حیدرآبادی اچار لانے کی فرمائش کی، وہ ہم نے لاکر ان کے حوالے کیں تو ان کی قیمت دینے لگے، ہم نے لینے سے انکار کیا تو بولے "ایسا ہے تو اگلی بار ایک کلو سپاری اور دو کلو اچار اور لیتے آئیے گا۔"

نثار احمد فاروقی نہایت کم عمری میں ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام، مولانا سید ابوالحسن ندوی جیسے صاحبانِ علم سے اپنی علمیت کا رہا منوا چکے ہیں۔ اب جو ہم ان کی علمیت کے معاملے میں رطب اللسان ہیں تو یہ بے وقت کی راگنی ہی ہے۔ وہ تو آئے دن علم کے سمندر میں غوطہ لگاتے رہتے ہیں اور جب بھی سطح پر نمودار ہوتے ہیں تو تہہ سے کوئی نہ کوئی موتی ضرور لے آتے ہیں۔ ایک بار ہمیں بھی علم کے سمندر میں غوطہ لگانے کا مشورہ دے چکے ہیں۔ ہم نے کہا "ہمیں ڈر ہے کہ ایک بار غوطہ لگایا تو پھر واپس نہیں آنے کے " بولے "فکر نہ کرو، کیا عجب کہ کئی برس بعد کوئی محقق تمھیں موتی کے روپ میں سمندر سے پھر باہر نکال کرلے آئے۔"

نثار احمد فاروقی کی دوستی ہمارے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی میں ایک لائبریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے اپنی علمی اور عملی زندگی کا آغاز کیا تھا اور آج وہ دہلی یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ آج دنیائے علم وادب میں ان کا طوطی بولتا ہے۔ اردو کے اکثر نام نہاد نقاد جو مغربی تنقید کے حوالے دے کر ادب میں اپنی جگہ بنانے کی خواہش میں خوار ہو رہے ہیں انھوں نے بھی نثار احمد فاروقی سے بہت کچھ اکتساب کیا ہے، یہ سب جانتے ہیں۔

ان کا حافظہ غضب کا ہے بلاشبہ اردو، فارسی اور عربی کے ہزاروں اشعار انھیں زبانی یاد ہیں۔ پہلے وہ غالب کے طرفدار تھے، پھر میر کے سخن فہم ہوئے۔ میر پر ان کی کتاب "تلاشِ میر" اہلِ نظر سے داد حاصل کر چکی ہے۔ میر کی آپ بیتی "ذکرِ میر" کا سلیس اردو ترجمہ بھی انھوں نے ۱۹۵۷ء میں چھاپا تھا، جس کا دوسرا اڈیشن آج کل زیرِ طباعت ہے۔

میر کے اشعار بھی وہ ایسے برمحل اور پُرتاثیر انداز میں پڑھتے ہیں کہ خود میر بھی اپنا شعر سنتے رہ جائیں۔

ہمیں یاد ہے کہ جب شاہد علی خاں نے ہمیں کتاب نما کا عابد علی خاں مرحوم سے متعلق خصوصی شمارہ مرتب کرنے کے لیے کہا تو بربنائے دوستی ہم نے نثار احمد فاروقی سے اس خصوصی شمارے کے لیے مضمون لکھنے کی خواہش کی۔ بولے: "کل دوپہر میں گھر آکر مضمون لے جاؤ۔" دوسرے دن ہم گئے تو مضمون تیار تھا۔ اب جو ہم نے مضمون پڑھنا شروع کیا تو دنگ رہ گئے۔ ان کی اپنی مخصوص فصاحت، روانی اور سلاست تو تھی ہی، لیکن عابد علی خاں مرحوم کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس پر ان کی نظر نہ گئی ہو۔ ہم نے کہا: اتنے کم وقت میں عابد علی خاں مرحوم کے بارے میں اتنی تفصیلات آپ کو کہاں سے مل گئیں؟

بولے ۔ میاں مجتبیٰ ۔ عابد علی خاں ان بزرگوں میں سے تھے جن کی کتاب زندگی کے ایک ایک ورق کو زبانی یاد رکھنا ہم سب کا فرض ہے ۔ جس شخص نے بُرے وقت میں اردو صحافت پر احسان کیا ہو اُسے کوئی بھلا دے تو اس سے بڑی محسن کشی اور کیا ہو گی؟

نثار احمد فاروقی خود ہماری مزاح نگاری کے بارے میں بڑی انوکھی اور دلچسپ رائے رکھتے ہیں ۔ ایک دن کہنے لگے ، تمھارے اکثر مزاحیہ مضامین پڑھتا ہوں تو آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں ۔ چنانچہ تمھارے مضمون "اردو کا آخری قاری" کو جب بھی پڑھتا ہوں آنکھوں سے آنسو ہی پونچھتا رہ جاتا ہوں ؛ تمھارے مزاح میں جو غم انگیزی ہے وہ غیر معمولی چیز ہے اور میں ایسے مزاح کی معراج سمجھتا ہوں ۔"

ہم نے کہا : یہ بات آپ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ میرے غم سے واقف نہیں ہیں ۔ وہ نہایت مضحکہ خیز ہے ۔

بولے : آج کے دور کی سچائی غم کی مضحکہ خیزی اور مزاح کی غم انگیزی کے بیچ میں کہیں پوشیدہ ہے ۔

جی تو بہت چاہتا ہے کہ شاہد علی خاں کو اس خصوصی شمارے کی اشاعت پر مبارکباد دی جائے لیکن انھیں کیا معلوم کہ اس خصوصی شمارے کے مطالعے کا ہماری ذات پر کیا معکوس اثر پڑا ہے کیونکہ ہمیں اندیشہ ہے کہ نثار احمد فاروقی سے ہمارے (۴۵) برس پرانے اور وہ بھی بے تکلفانہ تعلقات اب ویسے نہیں رہیں گے جیسے کہ اب تک تھے ۔ اب ہمیں بھی احتراماً ان کی صحبت میں دیگر عالموں کی طرح خاموش رہنا پڑے گا ۔ نقصان ہمارا تو کیا ہوگا ان کا ہی ہوگا کیونکہ بقول حضرت علیؓ علم تو جاہلوں کو دیکھ کر ہی سیکھا جاتا ہے ۔

مین تابش

غزل

ہیں اور موڑ کہانی کا
دشت عجب حیرانی کا

رات بہت طوفانی ہے
حال ہے بے سامانی کا

ہیں رستے میں خاک ہوا
عہد تھا گل دامانی کا

معرکہ سر ہے اور میں
نوحہ اپنی جوانی کا

بس اک رات اُداسی کی
بس اک پھول نشانی کا

ابراھیم اشک
۳۳۷۔ سائی نواس
شانتی نگر، کرلا۔ بمبئی

دوہے
اردو کے نام

میٹھی بولی ہند کی، اُردو جس کا نام
ہر اک دل کو جیتنا، اس کا پہلا کام

ایسی بولی ہے جسے، بولے ہندستان
جس کو اردو آ گئی، بڑی اس کی شان

خسروؔ، میرؔ، ولیؔ، قلیؔ، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ
ایسی کر گئے شاعری، گھر گھر پھیلا شوق

کئی زباں کے رَس ملے، یکجا ہوئی مٹھاس
تب اتنا شیریں ہوا، اردو کا احساس

تن من اُردو ہے مرا، اُردو ہے احساس
زباں نہیں، ہے زندگی، یہ گل میں ہوں باس

کبھی تقاضے وقت کے پورے کرتی جائے
اردو کا جو نقش ہے، کبھی نہ مٹنے پائے

نسیم عزیزی
۳۱۲ بیلیلیس روڈ ہوڑہ

طریقے مختلف ہیں اس کے ظلم و مہربانی کے
عجب قصّے ہیں اس قاتل ادا کی نوجوانی کے

سنوارا ہے اسے اس طرح جیسے ہو غزل کوئی
نہ کیوں چرچے ہر جانب ہوں اس کی گلفشانی کے

بچھا جاتا ہے دل، تم نے بڑھایا گھر کی زینت کو
کہاں ملتے ہیں دنیا میں یہ لمحے شادمانی کے

ہے شمع رہ گزر گویا تمھارا حسنِ جاں افزا
ہیں قصّے ماہ و انجم میں تمھاری ضوفشانی کے

مجھے خوشبو نہیں بھاتی نسیم ایسے مکانوں کی
جہاں بکھرے ہوئے ہر سو نشاں ہوں لامکانی کے

ڈاکٹر جلال اصغر فریدی
عربی ڈپارٹمنٹ
۱۴۳ - جوگابائی - جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

دستِ تہِ سنگ

(فیض احمد فیض کی یاد میں)

کہیں کشاکشِ ہستی کہیں سکوتِ حیات
کہیں نقاب گری تو کہیں حجاب کھُلا
اُٹھائے جام تو زنجیرِ فن چھنک اٹھی
بروئے دار و رسن بابِ انقلاب کھُلا

شعورِ ذات سے احساسِ دردمندی تک
لہو کے چھینٹے ملے موسمِ بہار کے ساتھ
بدن کا لوچ ہو یا غم گزیدہ جاں کی تھکن
شکست و ریخت کے پیکر ملے قرار کے ساتھ

دیارِ یار ہو، مقتل ہو یا درِ زنداں
صبا کے جھونکے دل و روح و جاں کے پاس ملے
یہ انتشارِ عناصر وہ آگہی کا کرب
تصوّرات زماں و مکاں کے پاس ملے

معاشرہ جو تشدد پسند ازل سے رہا
نقیبِ امن کے آہنگ سے بدلنا تھا
کوئی رسن یہ گلو ہو کہ کوئی حلقہ گوش
نظامِ دستِ تہِ سنگ [illegible] تھا

ابوالخیر نشتر
بنگی مسجد بتیا
مغربی چمپارن بہار

تمام عمر تجسس کی دھوپ میں گزری
نہ جانے کون سی منزل مری نگاہ میں ہے

قدم قدم تری چاہت کا نور آنکھوں میں
مرا شریک سفرِ دل مری نگاہ میں ہے

ہے ارتقاءِ بلندی پہ آج کا انساں
خود اپنے آپ سے غافل مری نگاہ میں ہے

قلم کو بیچ کے منصب خریدنے والا
رگِ ضمیر کا قاتل مری نگاہ میں ہے

وفا، خلوص و محبت کی آرزو نشتر
صلیب و دار و سلاسل مری نگاہ میں ہے

نثار احمد نثار
بیگم پور۔ سمستی پور
بہار

احساس کے گھروندے میں

میرے احساس کے گھروندے میں
چین رہتا تھا دو گھڑی کے لیے
نیند چپکے سے آہٹوں کو لیے
میری آنکھوں میں یوں سمائی تھی
دل کے ویران باغ میں شاید
کچھ شجر سبز ہونے والے تھے
کچھ نئی لذّتوں کے سایے تھے
وہ گھڑی ساعت مسرت تھی
تیری آواز اب ہر ایک شب کو
خواب سے اس طرح جگاتی ہے
سارا گلشن اُجاڑ دیتی ہے
مجھ کو اس پل گمان ہوتا ہے
میرے احساس کے گھروندے کو
چین ملتا نہیں گھڑی بھر کو
خواب چپ چاپ میری آنکھوں کو
الوداع کہہ کے لوٹ جاتا ہے

نصیر رحمتی
۱۴۴ پیریار ہوسٹل
جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی ۶۷

آزاد نظم

سلگتی ہوئی ریت پا کر
حسین شام کے ساحلوں سے
ہواؤں نے آکر یہ پوچھا
بتاؤ
سمندر کہاں ہے
حسین شام کے ساحلوں نے
بڑی بے بسی سے
مری سمت
نظریں اٹھا کر کہا
کہ
ان پاگلوں کو
کہاں سے سمندر کا کوئی پتا دے

ایم۔ اے۔ کاوش
کھیری ٹاؤن
حکیم پور۔ کھیری، یوپی

ہم نے مانا مختصر ہے زندگی
پھر بھی کتنی معتبر ہے زندگی

زندگی اپنی جگہ کچھ بھی نہیں
موت کا پیغامبر ہے زندگی

ہے شب دیجور سے افزوں کبھی
اور کبھی شمس و قمر ہے زندگی

اس جہانِ رنگ و بو میں کھو نہ جا
تو مسافر، اور تیری ہمسفر ہے زندگی

خوبیوں سے اس کو کاوش دے جلا
تو ہے آئینہ، تری آئینہ گر ہے زندگی

شریف قریشی
بھوسہ منڈی گنج فتح گڑھ
ضلع فرخ آباد یوپی

سید محمد رافق زماں
شعبۂ فزکس، مارواڑی کالج
بھاگلپور بہار

مری زندگی وہ کتاب ہے
جو کھلی ہے سارے جہان پر

مرے سب چراغ چلے گئے
کہیں آندھیوں کی اڑان پر

میں وہ میہماں کہ گراں رہا
نہ مکین پر، نہ مکان پر

کئی پھول شاخ سے گر گئے
مری بے جہت کی اڑان پر

نہ شریف تاب سخن رہی
نہ گرفت کوئی بیان پہ

خدا تجھ کو ہجوم مشتعل دے
مجھے دے درد لیکن تجھ کو دل دے

گناہوں پر جو اکثر خون رلائے
دل حسّاس دے اور منفعل دے

شکست فاش بھی ہے مجھ کو منظور
ارادے تو نہ اتنے مضمحل دے

بہاروں میں جو اکثر لہلہائیں
خدایا زخم اتنے مندمل دے

نہ مجھ کو عارضی مسند عطا کر
اگر دے پوریا تو مستقل دے

نہیں ہیں ہاتھ گر لائق دعا کے
الٰہی مجھ کو بس روے خجل دے

[illegible]اس موہیتے
۲۲۳ [illegible] پیٹھ۔ پونے ۳۰

مترجم: قاسم ندیم
نوشس کالونی ۵۰۰ ء گووندی بمبئی ۴۳

اذان

جدید مراٹھی ادب سے ایک کہانی

پتھروں کی مدد سے تحصیل آفس کے چاروں طرف کمپاؤنڈ بنا ہوا، اور اس کے احاطے میں پولیس اسٹیشن بھی۔ پولیس اسٹیشن کے سامنے کافی اونچا وائرلیس کا ٹاور، اس ٹاور کے سامنے تقریباً دو سو فٹ کی دوری پر مسجد کہ مسجد کا بھی ایک اونچا مینار اذان دینے کے لیے موجود تھا۔ اسی مینار سے کریم مُلّا اذان دیتے۔ دونوں ہاتھ کانوں کے پاس رکھ کر فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی اذان پابندی سے دیتے۔ لاؤڈ اسپیکر چھوٹا ہونے کے باوجود اذان کی آواز دور تک جاتی..... اللہ اکبر...... اللہ اکبر...... لاالہ الا اللہ۔

پولیس اسٹیشن کے سامنے مسجد کے بازو میں پولیس انسپکٹر کا بنگلہ تھا۔ تبادلہ ہوکر جب سے میں یہاں آیا ہوں روزانہ اذان کی آواز سُن رہا ہوں۔ صبح سویرے پونے چھے بجے کے قریب ماحول کے سناٹے کو توڑتی ہوئی اذان کی آواز گونجتی۔ کھڑکی میں سے دیکھنے پر کریم ملّا کی سفید داڑھی پہلے دکھائی دیتی۔ قدآور کریم ملّا بھی مینار پر چھوٹے سے دکھائی دیتے۔ سفید پاجامہ، سفید کُرتا اور سر پر جالی دار سفید ٹوپی، یہی اُن کا لباس تھا۔

وہ مسجد کے احاطے میں ہی رہتے۔ ڈھائی سو روپے ماہانہ تنخواہ۔ بیوی کا انتقال ہوچکا تھا۔ ایک لڑکا بشیر، گورا چِٹا تھا۔ روزانہ کالج جاتا۔ کریم ملّا پولیس اسٹیشن نزدیک ہونے کی وجہ سے ہمارے پاس اکثر آتے رہتے۔ تقریباً سبھی پولیس والے اُن کے دوست تھے۔ "لڑکا کالج میں پڑھتا ہے" یہ بات سبھی کو فخریہ انداز سے بتاتے۔ اُن کی اردو پر مراٹھی زبان کا اثر زیادہ تھا۔

"وہ کیا ہے صاحب، بشیر کی پڑھائی ادھر برابر نہیں ہوتی، اس لیے میں نے ہی کہا، تو ذاکر حسین بورڈنگ میں جاکر بیٹھا کر۔ جماعت کا بورڈنگ ہے۔ پیسا ویسا لگتا نہیں۔" کریم مُلّا ایک دن مجھ سے کہہ رہے تھے۔ میں کام میں مصروف تھا۔ پھر بھی خالی پیلی گردن ہلا رہا تھا۔

"ایک بات پوچھوں صاحب؟"

"پوچھیے!"

"انسپکٹر بننے کے لیے کتنا سیکھنا پڑتا ہے؟"

"گریجویٹ ہونا ضروری ہے۔"

"ابھی لڑکا ایف وائی میں ہے اور تین سال لگیں گے نا صاحب!"

"ہاں!"

بیٹے کو پولیس انسپکٹر بنانا ہی اُن کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ پہلی بیوی مرنے کے بعد شادی نہیں کی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا بنا کر بیٹے کو کھلاتے۔ مالی حالت بالکل کمزور تھی۔ کبھی کبھی فیس کے لیے مجھ سے پیسے بطور قرض لے جاتے۔ مگر وعدے کے مطابق لوٹا بھی دیتے۔

ایک دن وہ بیٹے کو لے کر میرے گھر آئے۔ "صاحب کو سلام کرو۔" اپنے بیٹے سے انھوں نے کہا۔ بیٹے نے مجھے سلام کیا۔

"صاحب یہ ہے میرا لڑکا۔"

"اچھا، اچھا۔"

"اونچائی برابر ہے نا؟" وہ پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے کم از کم اونچائی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ "برابر ہے۔"

"اور کیا کرنا پڑے گا صاحب؟"

مجھے ہنسی آگئی۔ اس قدر مقابلہ آرائی کے باوجود ایک مؤذن بیٹے کو انسپکٹر بنائیں گے؟ لڑکا ہوشیار ہے یا نہیں؟ کریم ملاّ تو سیدھے سادے تھے۔ اُن کا بیٹا خاموش کھڑا تھا۔

"اور کیا کرنا پڑے گا صاحب؟"

"روز صبح رننگ کرنا پڑے گی۔ فزیکل تندرستی کا ٹسٹ ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"سُن لو، صاحب کیا بولتے ہیں۔ روز سویرے جلدی اُٹھ کر دوڑنے کے لیے جایا کرو۔ سمجھ گئے؟"

اُن کے لڑکے نے گردن ہلائی۔

اس پولیس اسٹیشن میں کام کرتے ہوئے جیسے جیسے دن گزرتے گئے، ویسے ہی کریم ملاّ کی سادگی مجھ پر عیاں ہوتی گئی۔ کچھ پولیس والے انھیں درمیان میں بٹھا کر اکثر مذاق اُڑایا کرتے تھے اور وہ صرف ہنستے رہتے۔ "آپ اپنے بیٹے کو صرف انسپکٹر ہی کیوں بنا رہے ہیں؟ اُسے تو سیدھے ڈی ایس پی بنایئے۔" کوئی پولیس والا کہتا۔ "ہمارے مالک اندر بیٹھے ہیں۔ وہ اسے ڈی ایس پی بھی بنا سکتے ہیں۔" اور اس جملے پر سب پولیس والے ہنس پڑتے۔

ایک دن پولیس والوں کو بلا کر میں نے خوب ڈانٹ پلائی۔ "کریم ملاّ کا مذاق کیوں اُڑاتے ہو؟ اپنے بیٹے کو انسپکٹر بنانے کی اُن کی ضد ہے۔ لڑکا تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اُن کی قسمت کا ... [illegible]

وقت کا پہیا برابر گھوم رہا تھا۔ اذان بھی پابندی سے جاری تھی۔ میرے دن کی
روقات صبح کی اذان سے ہوتی۔ اذان کی آواز دل پر دستک دیتی۔ اللہ کا نام صبح صبح بڑا پیارا
تا۔ کبھی کبھار سماعت پر گراں بھی گزرتا۔ جس طرح سے کالی داس کے اشلوک سُن کر مجھے
رجھری آجاتی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ شکنتلا اور مسجد کا تعلق میری سمجھ سے باہر تھا۔

اگست کے مہینے میں مسلمانوں کے محلوں میں جگہ جگہ تعزیے اور پنجے بٹھائے گئے۔
ایک محلے سے اگربتیوں کی خوشبو آرہی تھی۔ شہادت کی رات آئی۔ مسلمان دولہا، دولہا کرتے
ے تمام رات سواریاں اور پنجے اٹھاتے رہے۔ پولیس کا بھرپور بندوبست تھا۔ ان پنجوں سے
ن، حسینؓ کی یاد تازہ کرنا تھی۔ حسنؓ حسینؓ پیغمبر کے نواسے تھے۔ وہ جہاد میں شہید ہوئے تھے۔ اسی
ہ ان کی یاد میں تعزیے اٹھائے جاتے ہیں۔

یہ شہادت کی رات پولیس والوں پر بھاری رہتی۔ پولیس والے خود کو مقتل میں کھڑے
ئے سمجھتے۔ ہر سال کی طرح آنکھوں میں تیل ڈال کر مجمع کے ساتھ گھومتے رہتے۔ مجمع جب
ہندوؤں کی گلیوں میں داخل ہوتا تو پولیس والوں کو سخت ہوشیار رہنا پڑتا۔ اس وقت نقاروں
رتاشوں کی آواز بھی بڑھ جاتی۔

صبح نہا دھو کر دوبارہ گیارہ بجے تک پولیس والوں کو تر و تازہ ہو جانا پڑتا۔ پھر محرم کا جلوس
شروع ہو جاتا۔ اس میں لاٹھی، ڈھال وغیرہ کی کرتب بازی شروع ہو جاتی۔ بڑے چوراہے
ر لاٹھی گھمانے کی زیادہ نمائش ہوتی۔ کوئی سوئیوں کا کوڑا اپنی پیٹھ پر مارتا تو اس جگہ
بھیڑ بہت زیادہ ہو جاتی۔ پھر آہستہ آہستہ جلوس ندی کی جانب چل پڑتا۔ وہاں ایک ایک
سواری، پنجہ ٹھنڈا ہوتا رہتا۔ دن ڈھلنے تک تمام ٹھنڈے ہو جاتے۔ ندی کنارے بھی
پولیس والے چوکس رہتے۔

ندی کنارے کریم مُلّا دکھائی دیے۔ وہ بھی جلوس میں شامل تھے۔ مجھے دیکھ کر
انھوں نے سلام کیا۔ نزدیک آکر کہنے لگے، "صاحب یہ خوشی کا دن نہیں ہے۔ جوان لڑکے
اچھلتے ہیں، گاتے ہیں۔ مجھے بالکل پسند نہیں۔ آج تو ماتم کا دن ہے۔ ابھی لڑکوں کا خون گرم ہے۔
عقل کم ہے اور جوانی زیادہ ہے نا صاحب ہم جیسے بوڑھوں کی بات کون سنتا ہے؟"

میں ان کی تمام باتیں سنتا رہا۔ سبھی سواریاں، پنجے اور تعزیے ٹھنڈے ہو گئے۔
اب پندرہ دن کے بعد گنپتی کا تہوار شروع ہو جائے گا۔ انھیں بھی اسی جگہ پانی میں
ڈوبایا جائے گا۔

ہر سال کی طرح لوٹتے ہوئے مسلمان الوداع ...... الوداع غمگین آواز سے کہتے جا رہے
تھے۔ میں نے کریم مُلّا کی جانب دیکھا وہ بھی اونچی آواز سے الوداع ..... کہتے ہوئے اپنے
آپ میں گم تھے۔

محرم کے بعد دیکھتے دیکھتے گنپتی آگئے۔ سارے شہر میں لاؤڈ اسپیکروں کا شور شرابہ شروع
ہو گیا۔ پولیس کا بندوبست بڑھ گیا۔ غنڈوں، بدمعاشوں کو تڑی پار کے آرڈر دیے گئے۔ کچھ

سیاستداں ناراض بھی ہوگئے۔ چند ایک گنپتی منڈلوں نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے گنپتی ہی نہیں بٹھائے۔ پولیس کے خلاف اخبارات میں مختلف خبریں شائع ہوئیں۔ ہر سال کی طرح امن کمیٹی کی میٹنگیں ہوئیں۔ ہندو مسلم ممبران شریک ہوئے۔ امن کا وعدہ کر کے لوٹ گئے۔ ایس آر پی (S.R.P) بھی آگئی۔ دس دن ختم ہونے پر گنپتی کا جلوس شروع ہوا۔ پچھلے سال کی طرح شراب پی کر جلوس میں لاتعداد گنپتی تھے۔ ہر گنپتی کے سامنے بینڈ باجا، بزم موجود تھے۔ ہر ایک گنپتی کے سامنے اسی گلی اور محلے کے لوگ مستی میں ناچ رہے تھے۔ جلوس کی رفتار بہت سست تھی۔ جلوس کو آگے ڈھکیلنے کا کام پولیس کے ذمّے تھا۔ "ہمیں اس چوراہے پر ناچنے دیجیے، اس چوراہے پر ناچنے دیجیے۔" مختلف منڈل کے لوگ ڈیمانڈ کرنے لگے۔ کسی سے لاؤڈ اسپیکر کی آواز کم کرنے کے لیے پولیس والے کہتے تو وہ فوراً جواب دیتا۔ تمھیں مسجد پر لگا ہوا لاؤڈ اسپیکر دکھائی نہیں دیتا۔ ہمیں کیوں منع کر رہے ہو۔ پہلے وہ بند کرو۔ یہ آواز انسان کی نہیں دار و اور نفرت کی تھی۔

سال گذشتہ کی طرح کوئی بھی مسلمان سڑک پر نہیں آیا۔ جلوس کو جاتے ہوئے وہ گھروں کی چھت پر سے یا پھر دروازوں کی دراڑوں سے دیکھ رہے تھے۔ سارے آدمی، پولیس والے اور راستے گلال سے لال ہوگئے تھے۔ کلکٹر، ڈی ایس پی، نہرو چوک میں تھے۔ ضلع مجسٹریٹ لال سرکل میں موجود تھے۔ وائرلیس کی گاڑیاں شہر کے مختلف ٹھکانوں پر موجود تھیں۔ واکی ٹاکی اہم افسران کے ہاتھوں میں دیئے گئے تھے۔ کال پر کال شروع تھے۔ کالنگ اپیل، کالنگ بیکر، کالنگ جاری..... جلوس کی لمبائی تقریباً ڈیڑھ کلو میٹر۔ دو سو گنپتی۔ گنپتی ڈبونے کا وقت صبح سات بجے۔ سادہ لباس میں پولیس والے شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان سے اندرونی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔

ایک سادہ لباس پولیس مین نے میرے قریب آکر کہا، صاحب، نہرو چوک میں گڑبڑ ہوگی۔ جے جوان گنپتی منڈل کے گنپتی پر نہرو چوک میں پتھر پھینکے جائیں گے۔

"کیا وجہ ہے؟"

"رد یوار پیٹھ کے جوانوں کو آپ نے نوٹسیں دی ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جے جوان منڈل والوں نے ہمارے خلاف گواہیاں دی ہیں۔ اسی لیے وہ نہرو چوک میں فساد برپا کر دیں گے۔"

"کالنگ بیکر، کالنگ بیکر۔"

"بیکر ریپلائنگ۔"

"جے جوان منڈل کہاں ہے؟"

"نہرو چوک کے نزدیک آگیا ہے صاحب۔"

"کالنگ کنٹرول۔ نہرو چوک میں ایکسٹرا فورس بھیجیے۔ ایس آر پی پلاٹون بھیجیے۔"

"صاحب، جلوس میں سے گزرنے کے لیے راستہ نہیں۔ گاڑی نہیں جاسکتی۔"

"گھاٹ پر موجود پلاٹون کو نہرو چوک میں آنے کے لیے کہیے۔"

"یس سر"

"سائٹ میں آنسو گیس بھی بھیجیے"

جب تک یہ دستہ نہرو چوک میں پہنچا، وہاں سنگ باری شروع ہو چکی تھی۔ پولیس والوں کے ہیلمیٹ پر پتھر گر رہے تھے۔ تین چار ہزار لوگ اس میں شریک تھے۔ اینٹوں اور پتھروں کی بارش سے کلکٹر صاحب کی جیپ کی شامت آگئی۔ پولیس نے جیپ پر سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے امن اور شانتی کی اپیل کی۔ بار بار اپیل کی۔ مگر بے سود۔ آنسو گیس چھوڑی گئی۔ آنکھیں جلتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ سب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہوا کا رخ بدلنے پر پولیس والوں کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی۔ اور پھر لاٹھی چارج کا حکم دیا گیا۔ مگر اب کی بار پولیس پر سنگباری شروع ہو گئی۔ سارے شہر میں فساد پھوٹ پڑا۔ جہاں بھی پولیس والے دکھائی دے رہے تھے انھیں نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ جہاں کہیں پولیس کی طاقت کم نظر آتی وہاں تلوار سے بھی حملے شروع ہو گئے۔

ایکسٹرا ایس آر پی آئی۔ زور دار لاٹھی چارج شروع ہو گیا۔ سر پھوٹ کر خون گلال میں شامل ہو رہا تھا۔ جنونی لوگ ایسڈ بلب پھینکنے لگے۔ مزید ایس آر پی بلوائی گئی.... ہاتھ پیر فریکچر ہونے لگے۔ کلکٹر صاحب ہیلمیٹ لگائے کھڑے تھے مگر فساد قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ زور دار لاٹھی چارج کی وجہ سے مجمع تتر بتر ہو گیا۔ مگر مختلف ٹولیوں کی شکل میں شہر میں دکانوں کی توڑ پھوڑ کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر کلکٹر صاحب نے گولی بار کا حکم دے دیا۔

"کالنگ بیکر۔ کالنگ بیکر۔"

"بولیے"

"صاحب منڈی کے چوراہے پر فسادیوں نے حملہ کر دیا" منڈی چوکی کے ہیڈ کانسٹیبل نے اپنی حفاظت کے لیے گولی چلا دی۔ ایک آدمی ہلاک ہو گیا"

"کالنگ کنٹرول۔ منڈی چوراہے پر فورس بھیجیے۔ میں بیکر بول رہا ہوں"

"یس سر"

"کالنگ ڈیلٹا۔ باڈی ہسپتال لے کر جائیے"

"یس سر!"

میں کلکٹر صاحب کے پاس گیا۔ "سر منڈی کے نزدیک فائرنگ میں ایک آدمی ہلاک ہو گیا"

کلکٹر صاحب نے کندھے اچکائے اور کہا "اِٹس آل رائٹ"

فساد آہستہ آہستہ قابو میں آتا جا رہا تھا۔ دواخانے میں موجود کانسٹیبل کا مجھے فون آیا۔

"سر، لاش ایک مسلمان کی ہے"

"مسلمان؟"

"جی ہاں صاحب، اپنے کریم ملّا کا بشیر"

میں ایک دم لرز کر رہ گیا۔ بلڈ پریشر شروع ہو گیا۔ آواز بھاری ہو گئی۔ پھر بھی میں نے پوچھا

"تم پورے یقین کے ساتھ کہہ رہے ہو؟"

"اپنے کریم مُلّا کے لڑکے کو کون نہیں پہچانتا ہے صاحب۔"

"وہ منڈی کے پاس کیسے آ گیا؟"

اس کا دوست محبوب بھی ساتھ ہے۔ اس نے بتایا، کرشن ناکے سے اسٹیشن کی طرف دونوں رننگ کے لیے جا رہے تھے۔ یہ دونوں کا معمول تھا۔"

"رننگ؟"

"ہاں صاحب۔"

میں نے فون نیچے رکھا۔ ہندو ہندو کے فساد میں ایک بے گناہ مسلم نوجوان ہلاک ہو گیا۔ پولیس انسپکٹر بننے کے لیے صبح سویرے رننگ کے لیے نکلنے والا نوجوان۔ میری آنکھوں کے سامنے کریم مُلّا کا سادگی سے پُر چہرہ آ گیا۔

میں نے ڈی۔ ایس۔ پی اور کلکٹر کو اس حادثہ کے بارے میں بتایا۔ گولی غلطی سے ایک بے گناہ مسلمان کو لگ گئی۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی۔ اب کی بار کلکٹر صاحب نے کندھے نہیں اُچکائے۔ دونوں بھی فکر مند ہو گئے۔ اب اگر مسلمانوں کو غصہ آ گیا تو؟ فرقہ وارانہ فساد اُن کے سوچنے کا انداز بدل گیا تھا۔ سارے افسران ڈی ایس پی صاحب کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ سبھی کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ اب اگلا ایکشن پلان کیا ہونا چاہیے؟

تین چار مسلم پی ایس آئی بھی تھے۔ ان سے مشورہ کیا گیا۔

"صاحب ہم مسلم لیڈروں کو بُلا کر حالات کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

عباس بیگ، عثمان مُلّا، عبدالغنی، داؤد شیخ اور رسول شیخ ان لیڈران کو پولیس جیپ کے ذریعے پولیس اسٹیشن لایا گیا۔

میں نے گھڑی دیکھی، صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔

"کیا ہوا صاحب؟ کچھ لفڑا ہے کیا؟" عباس بیگ نے پوچھا۔

مُلّانی نے کہا، "وہ کیا ہے کہ... فساد شروع ہوا تو پولیس نے فائر کر دیا۔"

"پھر....."

"گولی اپنے کریم مُلّا کے لڑکے کو لگی اور وہ ہلاک ہو گیا۔

سب جیسے پتھر سے بن گئے۔ بالکل مورتی کی طرح۔

یا اللہ...... کریم کو کسی نے بتایا بھی یا نہیں؟ عباس بیگ نے کہا۔

"بتائیں گے؟ لیکن کیسے بتائیں گے؟ بعد میں انھیں بتانا تو ہے ہی۔"

مُلّانی نے عبدالغنی کی طرف دیکھ کر کہا، "عبدل بابو! آپ جا کر بتائیں گے؟"

عبدالغنی نے گردن جھکا لی۔ سبھی کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ سبھی مٹی کے پتلے بن گئے تھے۔ ذرا بھی حرکت نہیں ہو رہی تھی۔ کریم مُلّا سے یہ سب بتانے کی ہم میں بھی ہمت نہیں تھی۔

صبح کے پونے چھ بج گئے۔ کریم ملا مسجد کے چبوترے پر آ گئے۔ ہمیشہ کی طرح جالی دار سفید ٹوپی پہنے ہوئے مینار پر چڑھے۔ دونوں ہاتھ کانوں کے نزدیک لے جا کر انھوں نے اذان دینا شروع کی۔ اللہ اکبر..... اللہ اکبر.....

کریم ملا سے میں نے باتوں باتوں میں ایک مرتبہ فجر کی اذان کا مطلب پوچھا تھا۔ انھوں نے تفصیل سے اس کا مطلب بتایا تھا۔ فلاح کی جانب آیئے اور نماز نیند سے بہتر ہے۔ ان دو جملوں نے میرے ذہن کی بے شمار پرتوں کو کھرچ ڈالا تھا۔

آج مجھے بے حد احساس ہو رہا ہے کہ نہ تو ہم نے آج تک فلاح کا راستہ اختیار کیا ہے اور نہ ہی ہم ابھی تک نیند سے جاگے ہیں۔

اذان کی آواز سناٹے میں بکھر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کریم ملا کے زندگی کا مقصد بھی تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ میں نہیں جانتا یہ کب تک تحلیل ہوتا رہے گا؟

غضنفر
اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر
۱-۱۷ مدن موہن سالویہ مارگ
لکھنؤ

بھیڑ چال

"پاپا! پاپا! کوئی کہانی سنایئے نا"
"اچھا سنو! ایک راجا تھا' اس کی ایک رانی"
"یہ کیا پاپا! دادی اماں کی طرح آپ بھی وہی گھسی پٹی انسانوں کی کہانی لے کر بیٹھ گئے! کوئی نئی کہانی سنایئے! خوف ناک جانوروں کی کہانی! جس میں شیر ہو' چیتے ہوں' بھیڑیا ہو۔
"ہاں پاپا! ایسی ہی کوئی کہانی جس میں اڈونچر ہو' سسپنس ہو' تھرل ہو!"
نئی کہانی کی فرمایش سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ ذہن ایسی کسی کہانی کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔ نگاہیں دور دور تک پہنچ گئیں۔
"کیا سوچ رہے ہیں' سنایئے نا۔"
"ابھی سناتا ہوں' ذرا کہانی کو ٹھیک سے یاد تو کر لینے دو ——"
"ہاں' سنو!"
بچے الرٹ ہو کر بیٹھ گئے۔
"کسی جنگل میں بہت سارے جانور تھے۔ ان میں بھیڑیں بھی تھیں۔ بھیڑوں کے ریوڑ جنگل میں چاروں طرف جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔
ان بھیڑوں کو جنگل کے کچھ جانور پسند نہیں کرتے تھے اور ان کے خلاف اپنے دل میں میل بھی رکھتے تھے۔ ناپسند کرنے اور میل رکھنے کی پہلی وجہ یہ تھی کہ ان جانوروں کے خیال میں بھیڑیں باہر سے آئی تھیں ——"
"کیا سچ مچ بھیڑیں باہر سے آئی تھیں؟"
"کہتے تو یہی ہیں کہ ان کے سکڑ دادا باہر سے آئے تھے مگر انھوں نے جنگل کو ہی اپنا گھر بنا لیا تھا۔ بہت سی بھیڑوں کو تو اس بات کا پتا بھی نہیں تھا۔ نفرت کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ بھیڑیں بچے بہت پیدا کرتی تھیں اور
جنگل [illegible]

پھرنے اور بھاگنے دوڑنے میں دقت ہوتی تھی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ بھیڑوں کا رہن سہن اور کھان پان ان جانوروں سے الگ تھلگ تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جنگل کا راجا شیر بھیڑوں پر مہربان تھا۔ یہ اور بات تھی کہ شیر کی مہربانیاں زیادہ تر ان چند بھیڑوں تک ہی محدود تھی جن کے بال زیادہ سفید اور کالے گھنے تھے۔ بھیڑوں کی بہت بڑی تعداد تو ایسی بھی تھی جن کے بدن پر بال نہیں تھے اور جن پر تھے بھی، وہ کالے چھدرے اور بکھرے تھے۔ اور ان کے پیٹوں میں بڑے بڑے گڈھے بھی تھے۔"

"گڈھے کیوں تھے پاپا؟"

"اس لیے کہ پیٹ بھر چارہ نہ ملنے سے وہ خالی ہو کر گڈھے بن گئے تھے۔"

"اوہ! اور چارہ کیوں نہیں ملتا تھا؟"

"پیٹ بھر چارہ انھیں اس لیے نہیں ملتا تھا کہ جنگل کی بہت سی چراگاہوں میں انھیں گھسنے نہیں دیا جاتا تھا۔"

"بیٹا! تم سوال بہت کرتی ہو، کہانی سننے دو! آگے کیا ہوا پاپا؟"

"بھیڑوں سے نفرت کرنے والے جانور شیر سے بھی جلتے تھے۔ شیر سے اُن کی دشمنی کی وجہ یہ تھی کہ وہ جنگل کا خیال کم اور اپنا زیادہ کرتا تھا۔ اس کی من مانی بھی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔

شیر سے جلنے والے جانور ہمیشہ شیر کو نیچا دکھانے کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ مگر کامیابی نہ ملنے پر اپنا غصہ بھیڑوں پر اُتارتے تھے۔ کبھی بھیڑوں کے بچے پکڑ لے جاتے تھے۔ کبھی بوڑھوں کو مار گراتے۔ اور کبھی کبھی ریوڑوں پر ہلّا بول کر انھیں اتنا دوڑاتے کہ بہت سی بھیڑیں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر کچل جاتیں۔

شیر سے اُن کی دشمنی بڑھتی گئی۔ اور اس حد تک بڑھ گئی کہ انھوں نے ایک دن شیر کے خلاف جنگل کے بہت سے جانوروں کو ایک پیڑ کے نیچے جمع کر لیا۔ اور نہایت ہی اثر دار اور غصّے سے بھری آواز میں کہا۔

شیر کی من مانی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیں اس کے خلاف مل جل کر کچھ کرنا چاہیے۔ یوں بھی اس جنگل پر اس کو راج کرتے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ اب کسی دوسرے کو موقع ملنا چاہیے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا کہ آپس میں مشورہ کر کے ان میں سے کچھ جانور شیر کے پاس گئے، اور نہایت ٹھہرے ہوئے گمبھیر لہجے میں شیر سے کہا۔

"ہمیں آپ پر بھروسا نہیں رہا۔ اب ہم اپنا راجا کسی اور کو بنانا چاہتے ہیں

شیر نے ضبط اور دھیرج کے ساتھ اُن کی بات سُن کر پوچھا۔
"کیا یہ جنگل کے سبھی جانوروں کی رائے ہے؟"
جانوروں نے زور دے کر جواب دیا۔
"ہاں، جنگل کے سبھی جانور چاہتے ہیں کہ اُن کا راجا اب کسی دوسرے کو بنایا
ائے" ـــــ اُن کا جواب سن کر شیر بڑی نرمی سے اطمینان بھرے لہجے میں
دلا۔ "مگر میری جانکاری کے مطابق سبھی جانور ایسا نہیں چاہتے۔ پھر بھی میں اس
کے لیے تیار ہوں کہ آپ اپنا راجا کسی اور کو چُن سکتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ میدان
ن میں بھی اتروں گا۔"
جانوروں نے شیر کی شرط مان لی۔ اب طے یہ کرنا تھا کہ شیر کے مقابل میدان
یں اتارا کس کو جائے۔ جانوروں کی خواہش جاننے پر پتا چلا کہ باگھ، بھیڑیا
ینندوا، بھالو سبھی راجا بننا چاہتے تھے۔ ایک ساتھ چاروں تو بن نہیں سکتے تھے
اس لیے فیصلہ یہ ہوا کہ چاروں ہی میدان میں اتریں۔ جو جیت جائے گا اسے
جنگل کا راجا بنا دیا جائے گا۔
اس فیصلے کے بعد باگھ، تیندوا، بھیڑیا اور بھالو چاروں جنگل میں گھوم
گھوم کر تمام چھوٹے بڑے جانوروں سے ملنے لگے۔
یہ چاروں امیدوار باری باری سے بھیڑوں کے پاس بھی پہنچے اور اپنے
اپنے دانتوں کو چھپاتے ہوئے میٹھی آواز میں بولے۔
"ہم اگر راجا ہو گئے تو تمھارے لیے جنگل کی ساری چراگاہیں کھول دیں گے
کوئی روک ٹوک نہیں ہو گی۔ ہمارے راج میں تم پر کوئی حملہ نہیں کرے گا۔
تمھارا ایک بچہ بھی نہیں مارا جائے گا۔"
بھیڑوں کے ریوڑ سے کچھ بھیڑیں اپنی گردن اچکا اچکا کر ان کی طرف
دیکھنے لگیں۔
ادھر شیر نے بھی جنگل کے جانوروں کو اپنے پاس بُلا بُلا کر اُن سے ملنا
شروع کر دیا تھا۔ ایک دن اس نے زیادہ سفید اور کافی گھنے بالوں والی بھیڑوں
کو بھی اپنے کچھار میں بُلایا اور نہ جانے اُن کے کانوں میں کیا کہا کہ جب وہ کچھار
سے باہر نکلیں تو اُن کی آنکھیں ہرنوں کی طرح چمک رہی تھیں۔"
"پھر کیا ہوا؟"
"ایک دن جنگل کے سبھی جانور ایک بڑی سی وادی میں جمع ہوئے۔ راجا
بننے کی خواہش رکھنے والے شیر، باگھ، تیندوا، بھیڑیا اور بھالو پانچوں
مجمع سے ہٹ کر پانچ کناروں پر کھڑے ہو گئے۔
ایک ایک کر کے جانور اپنے اپنے جھنڈ سے نکل نکل کر پانچوں کے

پاس پہنچنے لگے۔ زیادہ سفید اور کافی گھنے بالوں والی بھیڑیں دور تک پھیلے ہوئے اپنے ریوڑ سے نکل کر شیر کی طرف بڑھیں۔ اُن کے پیچھے پیچھے پھدر پھدر کرتا ہوا بھیڑوں کا سارا ریوڑ بھی شیر کے پاس پہنچ گیا۔

شام تک جانوروں کا سارا ہجوم پانچ حصوں میں بنٹ گیا تو ان کی گنتی شروع ہوئی۔ شیر کے پاس جمع ہوئے جانوروں کی تعداد سب سے زیادہ نکلی۔ شیر جیت گیا اور پھر سے جنگل کا راجا بن بیٹھا۔

باگھ، تیندوا، بھیڑیا اور بھالو اپنی ہار سے بہت دُکھی ہوئے اور شرمندہ بھی۔ ان سب نے اپنی ہار کا ذمہ دار بھیڑوں کو ٹھہرایا۔ باگھ اور بھیڑیا نے تو مارے غصے کے بھیڑوں کے ریوڑ پر جگہ جگہ حملے شروع کر دیے۔

بدحواس ہوکر بھیڑیں شیر کے پاس پہنچیں۔ شیر نے ان کی آہ وزاری سُن کر غراتے ہوئے اعلان کیا۔

"خبردار! اب اگر کسی نے ان پر حملہ کیا تو اس کا بُرا انجام ہوگا۔ مگر شیر کی غراہٹ کے باوجود حملے نہیں رُکے۔

کچھ دنوں بعد تیندوا اور بھالو ایک ساتھ مل کر بھیڑوں کے پاس آئے اور بہت ہی اعتماد کے ساتھ ہمدردانہ انداز میں بولے:

"گھبراؤ نہیں، ہم تمھاری حفاظت کریں گے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمھارے واسطے ہم جنگل کی دوسری چراگاہیں بھی کھلوادیں گے۔"

تیندوے اور بھالو کی نرم ملائم باتیں سن کر بھیڑیں جگالی کرنے لگیں۔ جیسے ان کے سوکھے معدوں سے بہت ساری ہری ملائم پتیاں ان کے منہ میں آگئی ہوں۔ ان کے سر ہلنے لگے۔ پانو آگے پیچھے ہونے لگے۔

گرگٹوں کے ذریعے شیر تک جب یہ خبر پہنچی تو گھبرا کر فوراً اس نے اپنی صلاح کار لومڑی کو طلب کیا۔ لومڑی نے اپنی آنکھیں نچا کر خبر کی گمبھیرتا سے شیر کو آگاہ کیا۔ شیر نے بنا دیر کیے اپنے پالتو درندے جنگل کے کونے کونے میں دوڑا دیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے باگھ اور بھیڑیے کے بہت سارے حمایتی جمع کر لیے گئے۔

باگھ اور بھیڑیا شیر کی اس حرکت سے جھلّا اٹھے۔ اور شیر کو اس کی اس حرکت کا مزہ چکھانے کے لیے دونوں آپس میں مل گئے۔ دھیرے دھیرے انھوں نے اپنے ساتھی گیدڑ اور بندر کو بھی بُلالیا۔

شیر سے مقابلے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ سبھی جی جان سے جُٹ گئے۔ گیدڑوں کی باقاعدہ بیٹھکیں ہونے لگیں۔ ہواں ہواں نکلنے لگا۔ دور دراز کے گیدڑ بھی اس کورس میں شامل ہو گئے۔ گیدڑوں نے بھی اپنی بھبکیوں سے بھیڑوں

ڈرانا شروع کردیا۔
بندر بھیڑوں کے ریوڑوں کے آس پاس کے پیڑوں پر چڑھ کر دانت کچکچانے
لگے۔ قلابازیاں کھانے کے بہانے بھیڑوں کی پیٹھوں پر دھم دھم کودنے لگے
باگھ اور بھیڑیے نے بھی اپنے حملے تیز کر دیے۔
بھیڑیں اوپر، نیچے، دائیں، بائیں چاروں طرف سے پریشان ہونے لگیں۔
ر جگہ ان کے بچے کچلے جانے لگے۔ بوڑھی بھیڑیں اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے لگیں۔
ر نوجوان بھیڑیں لنگڑانے لگیں۔

تنگ آکر سفید اور گھنے بالوں والی بھیڑوں کے پیچھے بہت سی دوسری بھیڑیں
ی اپنی فریاد لے کر شیر کی کچھار میں پہنچیں، رو رو کر حال سنایا۔ خون رستے ہوئے
خم دکھائے۔ درندوں سے اپنی حفاظت کے لیے شیر کے پیروں پر جھک کر
ا تھا، گڑگڑانے لگیں

شیر نے اپنے شیروں کو حکم دیا کہ وہ حملہ روکنے کا جتن کریں۔ مگر اس کے
وجود باگھ اور بھیڑیے کے حملے نہیں رکے۔

بھیڑیں شیر سے ناامید اور مایوس ہو کر رحم طلب آنکھوں سے دوسری طرف
یکھنے لگیں۔ زیادہ سفید اور گھنے بالوں والی بھیڑیں بھی اس بار ان کے ساتھ
ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر کہ بھیڑیں ان کی طرف دیکھنے لگی ہیں باگھ اور اس کے
ساتھیوں نے حملے روک دیے۔

بھیڑیں اطمینان کی سانس لینے لگیں مگر کچھ روز بعد اچانک ایک دن رات
ی تنہائی میں ان پر پھر حملہ ہو گیا۔ اس حملے میں کافی ساری بھیڑیں مر گئیں۔ بھیڑوں
کے ریوڑ میں کہرام مچ گیا۔ ان کی چیخ و پکار سے سارا جنگل دہل اٹھا۔ ان کے غم
یں شریک ہونے اور ان سے ہمدردی جتانے جنگل کے کونے کونے سے
جانور پہنچنے لگے۔

اپنا سارا کام کاج چھوڑ کر جنگل کا راجا شیر بھی ان کے پاس پہنچا۔ بھیڑوں
کی حالت دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ رو رو کر اس نے
بھیڑوں کا حال پوچھا۔ آگے بڑھ کر ان کے زخموں پر مرہم رکھا۔ ہمدردی کے
بول بول کر ڈھارس بندھایا، ہر طرح کا دلاسا دیا۔ اور اپنے کارندوں سے
ہہ کر ان کے آگے ہرے، نرم چارے کا ڈھیر لگوا دیا۔ صرف یہی نہیں کہ شیر
نے بھیڑوں کے غم میں آنسو بہایا، ان کے لیے مرہم پٹی اور چارہ پانی کا بندوبست
کیا بلکہ ان کی تسلی کے لیے بہت سے گیدڑ، بندر اور کچھ باگھ بھیڑیے پکڑ
کر بند کر دیے۔

شیر کے آنسوؤں اور اس کے چارہ گری کے جذبوں سے بھیڑیں پسیج گئیں۔

شیر کے خلاف ان کے دلوں میں بیٹھا ہوا میل دُھل گیا۔ اور وہ پھر سے محبت کے ساتھ شیر کی طرف دیکھنے لگیں۔

"پھر کیا ہوا؟"

جس رات بھیڑوں کے ریوڑ پر حملہ ہوا تھا' اس رات کئی نوجوان بھیڑیں جاگ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں نے حملہ کرنے والوں کو پہچان لیا تھا۔ اس رات حملہ کرنے والوں میں باگھ' بھیڑیے اور ان کے ساتھی نہیں تھے۔

"حملہ کرنے والے پھر کون تھے؟"

"یہ نہیں بتاؤں گا آخر سسپنس بھی تو چاہیے نا!"

"ہاں' سسپنس تو چاہیے۔ آگے؟"

ان نوجوان بھیڑوں نے جب دوسری نوجوان بھیڑوں کو یہ بتایا کہ اس رات ہم پر حملہ کرنے والے کون تھے تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلی رہ گئیں۔ مگر بوڑھی بھیڑوں کو یقین نہیں آیا۔ خاص طور سے زیادہ سفید اور گھنے بالوں والی بھیڑوں کو تو بالکل نہیں۔

اس حادثے کے بعد نوجوان بھیڑوں کو شدت کے ساتھ یہ احساس ہو گیا کہ جنگل میں رہنا ہے تو اپنے بچاؤ کے لیے خود ہی کوئی راستا ڈھونڈنا ہوگا۔

ایک دن دو نوجوان بھیڑیں کسی بات پر آپس میں جھگڑ رہی تھیں اور ایک دوسرے کو ٹکریں مار رہی تھیں کہ اچانک انھیں اپنے جسموں پر پڑی چوٹوں کے درد کی ٹیس سے محسوس ہوا کہ ان کے پاس تو کوئی بڑی کار آمد چیز موجود ہے۔ دونوں آپس کی لڑائی کو بھول کر ایک دوسرے کے سروں کی طرف دیکھنے لگیں۔ کچھ دیر بعد دونوں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ان کے سروں میں کیا تھا پاپا؟"

"سسپنس!"

"سوری پاپا! آگے؟"

"ان دونوں نے پہلے نوجوان اور بعد میں بوڑھی بھیڑوں سے اپنے اپنے سروں کی طرف دیکھنے کو کہا۔ اپنے سروں کو دیکھ کر ان سب کی آنکھیں بھی چمک گئیں۔ سب اپنی رگوں میں ایک عجیب طرح کی راحت محسوس کرنے لگیں۔ مگر ایک دن ایک بوڑھی بھیڑ نے نوجوان بھیڑوں کو مخاطب کیا۔

"ہم نے اپنے سروں کو تو دیکھ لیا مگر ہم جب تک اپنے پیروں کو نہیں دیکھیں گے' بات نہیں بنے گی۔"

نوجوان بھیڑوں کی نگاہیں اس دن سے اپنے پیروں پر مرکوز ہو گئیں۔

جنگل میں راجا کو ہٹانے کی لہر ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانور پھر سے

دی میں جمع ہوئے۔ امیدوار کناروں پر کھڑے ہو گئے۔
اپنے اپنے جھنڈ سے نکل کر جانور امیدواروں کی طرف بڑھنے لگے۔ زیادہ
فید اور کالی گھنے بالوں والی بھیڑیں اپنے ریوڑ کی اگلی صف سے نکل کر آ گئے
ھیں مگر کوئی بھی بھیڑ ان کے پیچھے نہیں گئی۔ یہ دیکھ کر تمام جانور ہٹانے میں
گئے۔ وادی پر سکوت طاری ہو گیا۔ ایک ایک جانور انھیں آنکھیں پھاڑ
پھاڑ کر دیکھنے لگا۔
تب اگلی صف سے ایک نوجوان بھیڑ گردن اٹھا کر خاموشی کو چیرتی ہوئی بولی:
"ہمیں اس طرح آپ حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ ہم کوئی اجنبی نہیں
لکہ وہی بھیڑیں ہیں جو برسوں سے اس جنگل میں آپ کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ فرق
رف اتنا ہے کہ اب ہم اپنی چال بھول چکے ہیں اور ہمیں احساس ہو گیا ہے کہ
مارے سروں پر دو دو نکیلے سینگ ہیں۔"
تمام جانوروں کی نگاہیں ان کے پیروں اور سینگوں کی طرف دوڑ گئیں۔
دور دور تک بھیڑیں فوجیوں کی طرح پاؤں سے پاؤں ملائے کھڑی تھیں۔ اور
ان کے سروں پر سجے دو دو نکیلے سینگ ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی لڑائی کے
میدان میں بے شمار سپاہیوں کے دونوں کندھوں پر سنگینیں تنی ہوں۔ ●●

سائنسی موضوعات پر
مکتبہ پیام تعلیم کی فخریہ پیشکش
یہ کیسا بخار ہے؟
قیمت ۲/۵۰
گندا پانی
قیمت ۲/۵۰
آپ
کا
جسم
علی ناصر زیدی
قیمت
کمپیوٹر
کیا ہے
قیمت
سائنس کی دنیا
فرید الدین احمد
قیمت 8/
کیوں اور کیسے
محمد ابراہیم شاہ
قیمت 6/
عجائب گھر
قاسم صدیقی
قیمت 10/

کھلے خطوط

● رؤف خیر، بیت الخیر، رسالہ بازار، گول کنڈا

صرف اشاریہ کے تعلق ہی سے دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ سید ظفر ہاشمی صاحب چونکہ اردو کے مسائل سے راست تعلق رکھتے ہیں اس لیے انھیں بہتر انداز میں سوچ سکتے ہیں دیگر اردو داں حضرات ان مسائل کے بارے میں "سنتے" ہیں سوچتے نہیں۔ جس طرح مذہب اسلام صرف غربا میں زندہ ہے اسی طرح اردو بھی صرف غریب مسلمانوں کی زبان ہو کے رہ گئی ہے۔ امرا تو اردو پڑھنا لکھنا کسر شان سمجھتے ہیں۔ اردو یقیناً مذہب اسلام سے جڑی ہوئی ہے مگر SO CALLED مسلمانوں کو مذہب اسلام ہی سے کب دلچسپی ہے جو اردو سے ہوگی وہ تو ان کے والدین نے ان کا نام مسلمانوں جیسا رکھ دیا ہے سو وہ مسلمان کہلاتے ہیں۔ یہ قومی یک جہتی اور مذہب بیزاری کو ہم معنیٰ سمجھتے ہیں اسی لیے اپنی شناخت کھوتے جا رہے ہیں۔

سید ظفر ہاشمی کا اشاریہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے ان کی تلخ نوائی دراصل حقیقت بیانی ہے ان کا یہ جملہ بہت اہم ہے کہ "(اردو کو) پیٹ سے نہیں ذہن و روح سے جوڑنا ہوگا پیٹ کا رشتہ آپ دوسری زبانوں سے استوار کریں یہی وقت کا تقاضا ہے"

کتاب نما کے ذریعہ آپ نے ظفر صاحب کی آواز تمام اردو والوں تک پہنچا دی۔ دیکھیے نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

● ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، مارواڑی کالج، بھاگلپور، بہار

فروری کے کتاب نما میں سید ظفر ہاشمی نے اداریہ میں میرے دل کی بات کہہ دی ہے میں بھی وہی سب کچھ دیکھتا اور سوچتا رہا ہوں جسے ظفر ہاشمی صاحب لکھ گئے ہیں۔ اتنے تلخ اور اتنے سچے، کھردرے اداریہ کی اشاعت پر مبارکباد قبول کریں — انشائیہ فہمی کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا نے بہت کام کیا ہے اُن کا یہ تازہ مضمون انشائیہ فہمی کی توسیع ہے۔ عارف ہسوی پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون مزید تحقیق کے لیے ذہن کو آمادہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے ۱۹۹۳ء کے رفتگاں کے ساتھ جو لمحے گزارے ہیں اُن کے گواہ ہم سب ہیں:

● شفیع اللہ خاں راز، کٹرہ بردل۔ اٹاوہ

فروری ۱۹۹۴ء کے شمارے میں کاتب صاحب نے میری غزل کے چوتھے شعر کا مصرع اولیٰ ناموزوں کر دیا ہے مصرع یوں ہے۔

دشمنی پر ہیں لوگ آمادہ

● نثار احمد نثار، بخیم پور، سمستی پور، بہار

فروری ۱۹۹۴ء کے شمارے میں جناب باقر مہدی کی غزل کو چھوڑ کر اس بار کا حصہ منظوم ایک دم بے جان ہے۔ تارا چند رستوگی صاحب نے اپنے مکتوب میں ڈاکٹر نادر علامی، اور کمال احمد صدیقی کو اچھا شاعر کہنے سے گریز کیا ہے۔ کیا ایک ایماندار ادیب کا ایسا کہنا مناسب ہے؟ کمال احمد صدیقی ماہر عروض داں ہونے کے ساتھ ایک معتبر شاعر بھی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کا مضمون "۱۹۹۳ء کے رفتگاں کے ساتھ چند لمحے"

تشنہ رہ گیا ہے۔ گوپال متل مرحوم کا ذکر کرد مضمون میں شامل ہے لیکن مفتی شوکت علی فہمی کا نہیں ہے۔ جبکہ مفتی شوکت علی فہمی اور گوپال متل کا انتقال ایک ہی دن ۱۵ اپریل ۱۹۹۳ء کو ہوا۔

● تسنیم احمد مودی خانہ کیمپ ۔ پونے
شمارہ مارچ ۹۴ء میں جہاں اداریہ کے تحت "یکسانیت کے نفسیاتی نتائج" اور اسی قبیل سے "خوابوں کی حقیقت" دونوں علمی اور معلوماتی مضامین ہیں، وینکوں کی ملکہ سے ملاقات، کو ظاہر ہے دلچسپ ہونا ہی چاہیے شعری حصہ بھی معیاری ہے۔

● شارق عدیل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ
کتاب نما مارچ ۱۹۹۴ء نظر کے سامنے ہے اور وینکوں کی ملکہ کے حوالے سے آنکھوں کو روشن کر رہا ہے۔ "خوابوں کی حقیقت" سے کسے انکار ہو سکتا تھا مگر اسی تحریر کے آخری خواب کی تعبیر نے خواب و تعبیر دونوں کو مشکوک کر دیا۔ ڈرا کسی پری وش کا، زندگی سے بھرپور تحریر ہے تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی مگر ہونٹوں کو تبسم بخشتی ہے "یکسانیت کے نفسیاتی نتائج"، ایک فکر انگیز مقالہ ہے شعری حصہ بھی بہتر ہے۔ "کتاب نما فروری ۹۴ء" سید ظفر ہاشمی کا مقالہ "رکھیو اجبا مجھے تلخ نوائی سے معاف"، کچھ لوگوں کے لیے شاید تلخ ہو مگر سچائی کی اپنی مجبوری ہے کہ وہ ازل سے ہی تلخ ہے۔

● سید مرتضیٰ حسین، فاطمہ منزل۔ ذکی روڈ، علی گڑھ
رسالہ کتاب نما دلی نے اردو ادب اور اس کے ہم نواؤں میں ایک قدر مطلق اور اعتباری نشان قائم کر لیا ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ ماضی۔ حال۔ مستقبل سب پر نگاہ رکھی جاتی اور اردو ادب کے ہر صنف ادب پر بحث و مباحثہ ہوتا ہے نثری مضامین اور شعری سرمایہ بھی نثر کی طرح کسی زبان کی بنیادی ضرورت ہے۔ کتاب نما میں اس کا خاص التزام رکھا جاتا ہے جس سے ہم میں شعوری اصلاح ہو سکتی ہے۔

مارچ ۹۴ء کے شمارے میں اردو ڈراما پر چند سطری خیال آرائی بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔ احمد جمال پاشا کی ایک نادر اور غیر مطبوعہ تحریر کی اشاعت خوبی کی بات ہے اور پرلطف بھی۔

مجتبیٰ حسین کے قلم میں قدرت نے مزاح سے زیادہ طنز کی صلاحیت عطا کی ہے یا مزاح کی زیادہ کی، اس کا فیصلہ آسان بات نہیں ہے مگر ان کے یہاں بات ہی بات میں بھرپور طنز کی علامت، مزاح کے تاثر کی علامت بن کر ابھرتا ہے اس کی داد کے لیے محتاط تصور کی ضرورت ہے محتاط اس لیے کہ مجتبیٰ حسین اپنے قلم سے ایسے گوشے عریاں کر جاتے ہیں جس سے کوئی قاری بھی اثر لیے بغیر گزر نہیں سکتا اور لطف کی بات یہ کہ زبان آسان اور طرز ادا بوجھل نہیں ہے۔ مسیح الحسن رضوی پر ایک اچھا تاثر نامہ کیا ہے اس سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ اسی طرح مجموعی طور سے کتاب نما کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔

● ڈاکٹر حمید اختر سرد صوفی، اسلام آباد، میرٹھ
مارچ ۹۴ء کا کتاب نما پڑھا۔ جہاں تک جناب م م راجندر کا لکھا ہوا اشاریہ "یکسانیت کے نفسیاتی نتائج"، پسند آیا۔ ڈاکٹر [illegible]

صدیقی کی کاوش "خسرو کے کلام میں تاریخی شہادتیں" ایک اچھا تحقیقی مقالہ ہے۔ مجتبیٰ حسین کا طنزیہ مضمون "دیگوں کی ملکہ سے ملاقات" اردو کے کھوکھلے نعرے لگانے والوں کے لیے بھرپور طنز ہے۔ کیف یکی نظر ایوان غزل کی طرف بھی۔ والد محمود احمد کی نظم شہر آشوب اور شگفتہ طلعت سیما کی نظم مطالبہ اچھی نظمیں ہیں۔

● شریف قریشی۔ بھوسہ منڈی، گنج گرنجہ، فرخ آباد

کتاب نما کے شمارے (مارچ ۱۹۹۴ء) میں ستیہ پال آنند کی نظم "مرتا نہیں ہوں" ایک تاریخی پس منظر میں لکھی گئی سطور ہیں جو احساسات کے متعلق سائنٹفک ہونے کی ایک کوشش کا نتیجہ ہیں۔ خیال کلاسیکیت پر مبنی ہے۔ ارسطو کے نظریات کے مطابق فطرت ہمیشہ باعمل رہتی ہے۔ کلاسیکیت فطرت کو حیاتیاتی عنصر سے خالی نہیں سمجھتی۔ ورڈز ورتھ کے نزدیک شاعری احساسات کی تاریخ یا سائنس ہے۔ مجتبیٰ حسین کا مضمون "ایک ملاقات دیگوں کی ملکہ سے" پسند آیا۔ دور حاضر میں علمی اداروں کی ناقص کارکردگی و زبوں حالی، حصول علم کی بے فیضی اور جہالت کی فرمانروائی ایسے حقائق ہیں جن سے روگردانی نہیں کی جا سکتی اس مضمون میں علم کو افلاس اور جہل کو دولت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دیگوں کی ملکہ کے مکالمات نہایت جامع اور سبق آموز ہیں اس کا کردار منطقی نکتہ نگاہ سے ایک مفکر، عالم اور فنکار کے کردار سے بھی بلند و بالا ہے۔ شمشاد حسین کا مضمون "خوابوں کی حقیقت" ہر لحاظ سے ایک دلچسپ نفسیاتی مضمون ہے۔ اور اب م۔م راجندر کا انشائیہ "اشاریہ" میں انسان کی غیر معمولی قوت تخیلہ اور ادبی یکسانیت پر جو بحث کی گئی ہے نہایت موثر ہے بالخصوص طالبان علم کے لیے سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔ عمل تخلیق کے نفسیاتی نتائج کا انحصار منفرد انسان کی اعصابی قوت پر ہوتا ہے۔ رینک جو ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور اپنی بے پناہ ذہانت کے سبب فرائیڈ کا سکریٹری مقرر ہوا۔ فرائیڈ کے کہنے پر ہی اس نے وی آنا یونیورسٹی سے فلسفے اور جرمن میں ڈاکٹریٹ کی چنانچہ وہ پہلا نفسیاتی داں تھا جس نے خلقی کی مدافعت (RESISTANCE) کو بڑھتی ہوئی خود اعتمادی کی علامت قرار دیا۔ اشاریہ کے مصنف جناب م۔م راجندر صاحب کو بہتر تخلیق کے لیے مبارکباد۔

آخر میں کالم کھلے خطوط کے صفحہ ۳۷ پر ڈاکٹر حمید اختر صاحب کا مراسلہ پڑھا ڈاکٹر صاحب نے ایک مقام پر "کسی محبان اردو کے لیے" استعمال کیا ہے جو غلط ہے محب اردو ہونا چاہیے تھا کسی کے ساتھ واحد مستعمل ہے جمع کا صیغہ نہیں۔

● احمد آزاد، گیا، بہار

کتاب نما کے جنوری ۹۴ کے شمارہ میں معین شاہد صاحب کے افسانوی مجموعہ "دعا کے نیم شبی" پر جناب کوثر مظہری صاحب کا تبصرہ نظر سے گزرا۔ ان کا تبصرہ بڑا ہی جاندار اور مستند ہے۔ لیکن فاضل مبصر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "صفحہ ۴۴ پر معین شاہد نے لفظ "مجبوتا" کے بدلے "مجبوتا" استعمال کیا ہے جو صحیح نہیں ہے"۔ واضح رہے کہ لفظ

"جوٹھا" ایک "پس خوردہ" کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو ہندی کا لفظ ہے اور جوٹھے کھانے کے لیے یہ لفظ صحیح ہے لغت میں بھی یہی پایا جاتا ہے اور لفظ "جھوٹا" دروغ گو کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔
معین شاہد کا یہ وصف ہے کہ بہار کی عام بول چال کو وہ اپنے افسانوں میں بڑے ہی حسن و خوبی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اسی صفحہ پر "وہاں پر کی زمین اس طرح ڈھکی تھیں" میں لفظ "پر" کو زائد اور غلط بتایا جبکہ لفظ "پر" ایک خاص جگہ اور زمین کی نشاندہی کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے میری ناچیز رائے میں یہ بھی درست ہے۔
البتہ کتاب کے سرورق پر "نیم شبی" کو اس طرح آرٹسٹ نے لکھ دیا ہے کہ "ش" پر "ت" کا گمان ہوتا ہے اور اس میں صاحب کتاب کی کوئی غلطی نہیں۔ اندرونی صفحہ پر "دعائے نیم شبی" کو پڑھنے کے بعد تصحیح ہو جاتی ہے۔ یہ آرٹسٹ کے قلم کی غلطی ہے۔

● مسعود خلیق، نو سرکمشن ہاؤسنگ کوآپریٹو سوسائٹی نزد لبرٹی گارڈن ملا دویسٹ بمبئی۔

مارچ ۹۴ء کا شمارہ مضامین نظم و نثر کے حوالے سے یکساں بلند معیار کا حامل نہیں ہے خاص کر غزلیات کا حصہ بہت کمزور ہے چار غزلوں میں وہی پرانی بلکہ آزمودہ "فارمولا اصطلاحات" دہرائی گئی ہیں جو "کلیشے" سے بھی کچھ آگے بڑھ کر اپنے معانی کھو چکی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں "دردِ دل، درِ دلبر" "اعجاز مسیحائی" "دلِ بے تاب" "اشکِ غم" "رگِ جاں" "دید کا ارمان" "راہِ الفت" "غمِ دوراں" (نعیم اللہ بیگ) "درِ زنداں" "راہِ وفا" "زہرِ ہلاہل" "موجِ گردابِ بلا" (مقبول حسن لاری) "شعلہ صفت" "گردِ سفر" "شدت دردِ والم" (غنی اعجاز) "سلسلۂ رہگزر" "راہبر" "چراغ سحر" "نامہ بر" "بال و پر" "غم معتبر" (قوافی کے طور پر) اور "رنج والم" "سایوں کی جستجو" "صحرائے آرزو" (کرامت علی کرامت) وغیرہ وغیرہ مشمولہ غزلیات کی سطحیت صرف مضامین اور استعاروں میں یکسانیت کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ گھِسے پٹے "چبائے ہوئے لقموں کی سی لفظیات کی وجہ سے بھی ہے جو غزل کی انحطاط پذیر "زبان" کے طور پر شاعروں میں قبول کی جاتی ہے۔
یہ ایک خوش کن امر ہے کہ جہاں فرسودہ مضامین اور روایتی انداز بیان سے پُر یہ غزلیں طبیعت کو مکدر کرتی ہیں، وہ طنز و مزاح میں والد حمزہ پوری کی "شہر آشوب" ہنساتی تو ہے، رلاتی بھی ہے۔ ستیہ پال آنند کی نظم "مرتا نہیں ہوں" خاص طور پر تعریف کے قابل ہے۔ موصوف نے گزشتہ دو تین برسوں میں "کتاب نما" میں چار پانچ بہت اعلا پائے کی نظمیں ہمیں پڑھنے کو دی ہیں۔ نہ صرف ان منظومات کے موضوعات اچھوتے رہے ہیں بلکہ سائنس، فلسفہ تاریخ، اساطیر سے مستعار لیے گئے استعاروں کے توسط سے اور کرم خوردہ لفظیات سے پرہیز نے ان نگارشات کو نظم معرا کی قبیل میں ممتاز کر دیا ہے "مرتا نہیں ہوں" بعد چہارم یعنی "وقت" کے بارے میں ہے جو لافانی ہے جس کی تفہیم و تجسیم تقسیم روایتی انداز سے نہیں ہو سکتی۔ جو کل

بھی وہی تھا، جو آج بھی ہے۔ پومپیائی،
ہڑپہ، مصر، لنکا، یونان، روم، پاٹلی پتر
گاندھارا، اجنتا سے لے کر نیویارک کے
سکائی سکریپر تک وقت ایک ہی ہے
مجھے یقین ہے، ستیہ پال آنند کی یہ نظم اردو
کی اچھی نظموں میں شمار کی جائے گی۔ ہم موصوف
سے ایسی ہی اور نظموں کی توقع بھی کرتے
ہیں۔

● رحمت امروہوی، مرزا پور، احمد آباد، گجرات
فروری کے کتاب نما میں مہمان مدیر جناب
سید ظفر ہاشمی سے آپ نے اداریہ لکھوا کر
ایک بڑا اور اہم کام کیا ہے جس کے لیے آپ
دونوں حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں، ظفر
صاحب سچی اور کھری بات کہنے میں کبھی چوکتے
نہیں ہیں، ظفر صاحب نے اداریے میں وہ
تمام باتیں کہہ ڈالی ہیں جنھیں ہم اردو والے
مصلحت کی بنا پر کہتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ کچھ
لوگوں کو ان کی بات بُری لگی ہوگی مگر سچی بات
تو کڑوی ہی ہوتی ہے۔ ظفر صاحب اردو
کے شیدائی ہی نہیں بلکہ دیوانے ہیں اور
ایسے ہی دیوانوں کے دم سے اردو زندہ
ہے اور یہ دیوانے زبانی باتیں ہی نہیں کام
بھی کرتے ہیں۔ ظفر صاحب احمد آباد گجرات
سے آج چودہ سال سے اردو کا رسالہ
ماہنامہ "گلبن" نکال رہے ہیں جبکہ دہلی
جیسی جگہ سے نئے نئے اردو رسالے نکلتے
ہیں اور سال دو سال میں دم توڑ دیتے
ہیں۔ ظفر صاحب نے احمد آباد گجرات میں پہلی
مرتبہ دو روزہ اردو میلے کا اہتمام کیا وہ
بھی کسی سرکاری یا اکادمی کے تعاون کے بغیر

مشاعرہ، قوالی اور دوسرے ثقافتی پروگرام
منعقد کیے آج بھی ان کے ادارے کی طرف
سے اردو املا کلاسیں چلائی جارہی ہیں
ظفر صاحب خود سرکاری ملازم ہیں رات دن
انگریزی سے واسطہ پڑتا ہے بڑی مصروف
زندگی ہے ... حیرت ہوتی ہے کہ اتنی
ساری مصروفیت کے باوجود وہ اتنا سارا
کام کیسے کر لیتے ہیں۔ اردو زبان کے ساتھ
انھیں سچا جذبۂ ہمدردی ہے اور اسی
سرشاری اور والہانہ محبت نے ان سے
یہ سب باتیں کہلوائیں ہیں۔ آخر میں اس
اداریے کے متعلق اتنا عرض کردوں کہ
اگر کتاب نما میں شائع ہونے والے
اردو کے سلسلے میں اداریوں کو غزل تصور
کر لیا جائے تو یہ اداریہ اس کا مقطع
ہے۔

● یوسف ناظم، ۱۴، الہلال ۱۳ باندرہ ریکلیمیشن بمبئی
کتاب نما کے تازہ شمارے میں اپنی
نظم 'مقتل' پڑھ کر آپ کا شکریہ ادا کرنے
کو جی چاہا۔ پہلے مصرع میں 'لفظ' تو مزید یہ
چھوٹ گیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ باذوق
قارئین اس غلطی کو میری طرف منسوب
نہیں کریں گے تاہم میں چاہتا ہوں کہ اصل
مصرع دوبارہ لکھ دوں "تر خون آدم بہے
سڑکوں پہ تو رنگینی ہے"۔ مجتبیٰ حسین کے
مضمون کے جواب میں میں نے جو کچھ لکھا تھا
وہ آپ کے پاس کیسے پہنچ گیا۔ کچھ وقت
ملتا تو میں بھی نظر ثانی اور اضافوں کے بارے
میں سوچتا۔ وہ صرف 'سلام' کا جواب
تھا۔ مزاج تو میرا بعد میں پوچھا گیا۔ خیر کوئی

...نھوں نے ایک بڑے موضوع کو مختصر
موضوع میں سمو کر دریا کو کوزے میں بند کر
نے کی کامیاب کوشش کی ہے اگر وہ اہل
بھوپال کی دانش پروری کے سلسلے میں
حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض اور عالمی
شہرت کے مصور صادقین کی پذیرائی کا ذکر
فرما دیتے تو ایک رخ زیادہ روشن ہو جاتا
بھوپال پر مختلف شعرا کی نظموں اور اشعار
کو انھوں نے بڑی کاوش سے یکجا
کیا ہے۔ بھوپال پر میری نظم "پچیس لیے
کے بعد"، آفتاب جدید بھوپال میں ۱۳ مارچ
۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی تھی غالباً ان کی
نظر سے نہیں گزری۔ صادقین نے بھوپال
پر ایک رباعی لکھ کر مجھے دی تھی وہ قارئین
کی نذر کر رہا ہوں۔

معمورۂ دل نشیں کو کرتے ہیں سلام
جیسے کہ کسی جمیل کو کرتے ہیں سلام
ہم جس کو فلک بھی ارہا ہے ادب
بھوپال کی سرزمیں کو کرتے ہیں سلام

بھوپال کے ... ۱۰/۳/۸۴ ... صادقین

● شفیقہ فرحت بھوپال۔
سنا تھا کہ اپریل میں "فول" بنایا جاتا
ہے لیکن آپ نے اسی ماہ میں مکروفن
کے لیے اپنے پھول کھلائے ہیں کہ جی
داد دینے کو ... ہے۔ موہن چراغی

صاحب کے اداریے پر دانشوروں کو
سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ ہر تخلیق کا
تفصیلی تبصرہ چاہتا ہے۔ لیکن وقت کم
اور قلم کوتاہ۔ پھر بھی رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ
کے پورٹریٹ اور ابوالکلام قاسمی صاحب
کے مضمون پر مکرر داد نہ دینا ظلم اور ناانصافی
ہے۔ اور ہم تو "حقوق انسانی" کے علم
بردار ہیں۔

● ریاض الرحمٰن شیروانی، حبیب منزل علی گڑھ۔
کتاب نما کے اشاریے اب تک
بالعموم لسانی اور ادبی موضوعات سے متعلق
ہوتے تھے، اپریل ۸۴ء کے شمارے میں
مہمان مدیر موہن چراغی صاحب نے اسے
سیاسی رنگ دے دیا ہے۔ سیاست
زندگی کا ایک ایسا رخ ہے جس سے مفر
نہیں ہے۔ اس لیے یہ کوئی قابل
اعتراض بات نہیں ہے۔ اس اداریے
میں موہن چراغی صاحب نے کئی بہت
پتے کی باتیں کہی ہیں۔ مثلاً اس سے کسی
کو انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ قانون
اپنے ہاتھ میں لینے کا کسی کو اختیار نہیں
ہے اور تشدد، خواہ کسی کی بھی طرف
سے ہو، یقیناً ناپسندیدہ ہے۔ تاہم یہ
امر بھی غور طلب ہے کہ جب کوئی فرد یا
جماعت قانون اپنے ہاتھ میں لیتی ہے
یا تشدد پر آمادہ ہو جاتی ہے تو اس کے
پیچھے کیا عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ جب
تک ان عوامل کی بیخ کنی، یا کم سے کم اصلاح
نہ کی جائے گی لاقانونیت اور تشدد کا سد
باب، اپنی تمام نیک خواہشات کے باوجود
کرنے سے قاصر ہی رہیں گے۔ کشمیری

لاقانونیت اور تشدد میں پاکستان کا جو رول ہے وہ ڈھکا چھپا نہیں ہے اور بلاشبہ لائق مذمت ہے لیکن خود ہم اس کے کس حد تک ذمّے دار ہیں اس کے اعتراف سے بھی ہمیں احتراز نہیں کرنا چاہیے۔ اتفاق سے میں ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۸ء تک کشمیر میں رہا ہوں اور اس کی تاریخ کے اس نہایت اہم دور سے پوری طرح باخبر ہوں۔ پہلی مرتبہ شری جگ موہن کا کشمیر کے گورنر کی حیثیت سے تقرر جنتا دل کی حکومت میں نہیں کانگریس (آئی) کی حکومت میں ہوا تھا اور جگ موہن صاحب نے کشمیر پہنچ کر پہلا کارنامہ یہ انجام دیا تھا کہ ریشہ دوانیاں کرکے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی عوامی حکومت کو گرا کر غلام محمد شاہ کو وزیر اعلا کی حیثیت سے کشمیری عوام پر مسلط کر دیا تھا اور پھر ایک چھوٹے سے فرقہ وارانہ فساد کو بہانہ بنا کر ان کی حکومت کو بھی معطل کرکے اقتدار خود اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے جلد بازی اور بے صبری سے کام لے کر کانگریس (آئی) سے اس خیال سے اتحاد کر لیا کہ اس کے بغیر انھیں وزارت اعلا کی کرسی تک دوبارہ پہنچنا دشوار نظر آیا اور یہ کشمیر میں نقطۂ آغاز تھا کانگریس (آئی) کے ساتھ نیشنل کانفرنس کی عدم مقبولیت کا۔ اور پھر ۱۹۸۷ء کے انتخابات میں جو عدیم المثال دھاندلیاں کی گئیں وہ کشمیری مسلمانوں کے لیے اونٹ کی کمر پر روایتی آخری تنکا ثابت ہوئیں اور اس طرح پاکستان جو مدت سے اس تاک میں تھا کشمیری مسلمانوں کے ہاتھ میں بندوق اور گولا بارود تھما دینے میں کامیاب ہو گیا۔

اسی طرح اس میں کلام نہیں کہ پھولن دیوی کو یہ حق ہرگز نہیں تھا کہ وہ ۱۹ افراد کو لائن میں کھڑا کرکے گولیوں سے بھون دیتی۔ لیکن یہ کہنا بھی انصاف کا خون کرنا ہے کہ "پھولن دیوی پر ظلم ہوا ہوگا" ہوا ہوگا نہیں، واقعی ظلم ہوا تھا اور وہ ظلم بھی اس سے کم شرمناک نہیں تھا جس ظلم کی بعد میں وہ مرتکب ہوئی۔ پہلے خود اس کی برادری کے ایک بااثر شخص نے اور پھر اس کے نواح کے ٹھاکروں نے اجتماعی طور پر اس کے ساتھ جو وحشیانہ برتاو روا رکھا دراصل وہی ذمّے دار تھا پھولن دیوی کو ایک ظالم ڈاکو بنا دینے کا۔ اور ایک پھولن دیوی کی بات نہیں ہے، ہمارے سماج میں "امن کے محافظوں" کے زیرِ سایہ نہ معلوم روز کتنی پھولن دیویاں یا مان سنگھ وجود میں آتے رہتے ہیں اور ہماری زبانیں گنگ اور ہمارے قلم شکستہ رہتے ہیں، ان میں جنبش نہیں پیدا ہوتی ہے۔

• بابری مسجد کے نام پر دکانیں "کھولنے" والوں کے خلاف علم بغاوت ضرور اٹھانا چاہیے تھا اور اسے "ایک سازش کے تحت توڑ" دینے والوں کی نشاندہی بھی ضرور کرنی چاہیے تھی لیکن جن لوگوں نے پہلے یہ یقین دہانی کی تھی چاہے کچھ ہو جائے عمارت کو نقصان نہیں پہنچنے دیا جائے گا اور پھر یہ المیہ پیش آ جانے کے

بعد وعدہ کیا تھا کہ مسجد وہیں تعمیر ہوگی جہاں پہلے تھی ان کے ساتھ بھی کسی قسم کی نو رعایت یا ان کی طرف سے پسپا ہونے کا کوئی جواز نہیں ہے اور جو ایسا کرتا ہے کہنا پڑے گا کہ اگر اس کی دیانت مشکوک نہ بھی ہو تو وہ بزدل ضرور ہے۔

غرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حق گوئی یکطرفہ ہرگز نہیں ہونی چاہیے، ورنہ وہ حق گوئی نہیں رہتی ہے مطلب پرستی ہو جاتی ہے۔ حق گوئی اسی وقت صحیح معنی میں حق گوئی ہوتی ہے جب اس میں اپنے پرایے کی تمیز نہ کی جائے۔

(تبصرہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

عبارت کیسے لکھیں

مصنف: رشید حسن خاں
اشاعت: مارچ ۱۹۹۴ء
صفحات: ۱۳۶
قیمت: پندرہ روپے
تبصرہ نگار: عبداللہ ولی بخش قادری
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شخصیت کا ایک پہلو اتنا معروف ہو جاتا ہے کہ دوسرے پہلوؤں کے لیے حجاب بن جایا کرتا ہے خواہ اُن میں بھی جوہر قابل موجود ہو۔ معاملہ رشید حسن خاں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ اُن کی شہرت بحیثیت ایک محقق اور نقاد مسلّم ہے اور اسی بنا پر اُن کی ایک اور نہایت وقیع اور اہم کیفیت یعنی زبان کی خدمت، بنیادی اہمیت کی حامل ہونے کے باوجود ابھی تک درخورِ نگہِ گرم تک نہیں ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے خواہ رشید حسن خاں کی ذات پر کوئی حرف نہ آیا ہو کیوں کہ اُن کا نام بہر حال آسمانِ ادب پر روشن ہے لیکن اس نظر اندازی کی بدولت بہر حال نقصان ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ نئی نسل کی اُردو دانی کی طرف بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ لہٰذا عام حالات کی اردو کش فضا کے طفیل روز بروز اردو املا اور تلفظ کی ریڑھ گلنے میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو کے اخبارات ہوں یا رسائل، مکتبے ہوں یا اکادمیاں، انجمن ترقی اردو ہند ہو یا ترقی اردو بیورو، اپنی طباعتی سرگرمی میں صحتِ املا کا لحاظ رکھنے کی لگن کہیں نظر نہیں آتی۔ اب رہے اردو اساتذہ، تو دانش کدوں میں ادب فہمی کی بلند آہنگی نے زبان کی زیرین لے کو نگاہوں سے اوجھل کر رکھا ہے اور مدرسوں میں استادوں کی لاعلمی نے بے نیاز بنا دیا ہے اور ان کی روش میں کولھو کے بیل کی گردش دکھائی دیتی ہے۔

اس کس مپرسی کے عالم میں رشید حسن خاں نے اپنی ادبی مصروفیت کے باوصف، زبان کی

طرف قابلِ قدر توجہ کی ہے۔ "اردو املا" جیسی ضخیم تصنیف اور "زبان و قواعد" جیسی زبان کے چند اہم مباحث سے متعلق کتاب کا روئے سخن، بڑوں کی طرف ہے جنھیں ترقی اردو بیورو نے شائع کیا ہے۔ "اردو کیسے لکھیں؟" اور "انشا اور تلفظ" کا مخاطب، مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف جو مکتبہ جامعہ نے پیش کی ہیں۔ وقتاً فوقتاً، رسائل و کتب میں زبان و بیان سے متعلق متفرق مضامین، مستقل تصانیف پر مستزاد ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب "عبارت کیسے لکھیں" مذکورہ بالا دو کتب کی ہی توسیع و توضیع قرار دی جاسکتی ہے۔ اُس کے بارے میں اپنے "پیش لفظ" کے اختتام پر رشید حسن خاں یوں رقم طراز ہیں:

"مکتبہ جامعہ نے ایک چھوٹی سی کتاب چھاپی تھی جس کا نام تھا "اردو کیسے لکھیں؟" اس میں بھی املا کا بیان تھا۔ کئی سال کے تجربے نے یہ بتایا کہ بہت سی ضروری باتوں سے متعلق تفصیل کچھ کم ہے اور کچھ باتیں چھوٹ بھی گئی تھیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب میں ان کمیوں کو پورا کر دیا جائے۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس کتاب سے ہمارے طالب علموں کو املا سے متعلق ضروری معلومات یکجا مل سکے گی اور ان کی تحریر ان خرابیوں سے محفوظ رکھ سکے گا جن سے عبارت میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور بدصورتی بھی اپنی جگہ بنالیتی ہے۔"

اِن جملوں سے کتاب کی غرض و غایت بخوبی واضح ہو جاتی ہے لیکن اس کی افادیت کا ادراک، اس کے مطالعے سے ہی ممکن ہے۔ کل صفحات ۱۳۶ ہیں جن میں ۱۲۵ متن سے متعلق ہیں۔ عبارت صاف اور مدلل ہے۔ ہر بات کو مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ ان کی تحریر بذاتِ خود اُن کے قول و فعل کی بولتی ہوئی تصویر نظر آتی ہے اور اس کی کتابت، کماحقہٗ ان کے مثبت کردہ اصولوں اور ضابطوں کی زبانِ حال سے تائید کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جس کے لیے مکتبہ اور اس کے خوشنویس دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ فہرست میں ستر سے زائد عنوانات درج ہیں جن میں تین جلی ہیں۔ متن میں ورق کی صفحے کی پیشانی پر صرف ایک جلی ہے جو کہ فہرست میں تمام عنوانات سے خفی تر ہے اور متعدد عنوانات جلی ہیں مگر وہ حاشیائی ہیں۔ جن میں پہلی "تنوین کا الف" ہے جبکہ فہرست میں یہ عنوان ہے ہی نہیں۔ یہ صورتِ حال رونما نہیں ہونی چاہیے تھی۔ لیکن فہرست کی خوبی یہ ہے کہ اس کے جملہ عنوانات متن میں ایک چھوٹے سے دائرے سے ایک دوسرے سے بالکل جدا کیے گئے ہیں اور فہرست میں عنوان کے آگے وہی صفحہ درج ہے جہاں اس سے متعلق کہا گیا ہے۔ لہٰذا بھٹکنے کا سوال نہیں ہے۔ یوں کتابت، طباعت اچھی ہے اور قیمت کم۔ اس کتاب کے سلسلے میں مصنف نے طالب علموں سے توقعات وابستہ کی ہیں جیسا کہ پیش لفظ کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے لیکن میں تو یہ عرض کروں گا کہ ہر وہ شخص جو اردو میں کچھ بھی لکھتا ہے خواہ وہ نجی خط ہی کیوں نہ ہو، اس کتاب کی رفاقت اُسے لغزشِ قلم اور خلطِ بحث سے محفوظ رکھنے کا باعث ہوگی اور درس و تدریس کے راہ نوردوں کے لیے رہنمائی کا ایک چشمہ بنے گی۔

تشدید

مصنف : علیم صبا نویدی صفحات : ۱۴۰
قیمت : ۳۰ روپے
مبصر : جمیل اختر

"تشدید" علیم صبا نویدی کی ہائیکو شاعری کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل دو مجموعے "تیر سیلے" اور "شعاع شرق" کے نام سے شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔ علیم صبا نویدی بہ یک وقت ایک شاعر، ایک افسانہ نگار اور ایک ادیب ہیں۔ ان کے چھے شعری مجموعے طرحِ نو، لمس اوّل، ردِ کفر، فکر بز، نقش گیر اور بجارت جوق اور افسانوی مجموعے روشنی کے بھنور، شگاف در شگاف، اجلی مسکراہٹ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ قید شکن کے نام سے آزاد غزلوں کا انتخاب ترتیب دیا ہے۔ اور "آزاد غزل شناخت کی حدوں میں" میں آزاد غزل سے متعلق مختلف نقادوں کے مضامین کو مجتمع کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں اپنی نوعیت کی پہلی کتابیں ہیں جس میں ایک نئی صنف آزاد غزل اور اس پر کی گئی تنقید کو صرف اس لیے جمع کر کے شائع کیا تاکہ آزاد غزل کی شناخت میں آسانی ہو اور اس کی ترقی کو ممکن بنایا جا سکے۔

علیم صبا نویدی چوں کہ خود ایک تخلیقی فن کار ہیں اور نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ وہ تخلیق میں تجربے کے قائل ہیں اس لیے ہر نئے تجربے کو لبیک کہتے ہیں اور اس کو اپنانے میں سب سے آگے رہتے ہیں۔ آزاد غزل ہو کہ ہائیکو وہ گرم جوشی سے ان کی پذیرائی کرتے ہیں اور ان کی ترقی کے لیے راہیں ہموار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر نئی صنف اور ہر نئے تجربے کو اس کثرت سے برتتے ہیں کہ اس میں اپنی ایک پہچان بنا لیتے ہیں۔ آزاد غزل ہو کہ ہائیکو ان دونوں صنف کو اپنانے میں انھوں نے پہل کی اور اسے فکر و فن کی ایسی بلندی عطا کی جس کا تصور محال تھا۔

ہائیکو جو ایک جاپانی صنف سخن ہے اور جس کے معنی کھیل کود کی نظم ہیں۔ صنفی اعتبار سے تین مصرعوں اور سترہ اوقات کی یہ نظم پانچ سات پانچ کے وقفی تناسب میں لکھی جاتی ہے۔ یہ عالمی ادب کی مختصر ترین نظم ہے۔ یہ نظم پھیلے ہوئے معنی کو سترہ صوتی اوقات میں سمیٹ لیتی ہے۔ اس کی دوسری اہم خصوصیت اس کی ہما کائی کیفیت ہے۔ یہ الفاظ میں تصویر کشی کا کارنامہ انجام دیتی ہے۔

اس جاپانی صنف سخن کو علیم صبا نویدی نے اردو کی زمین میں بو کر اور ہندستان کی فضاؤں میں رچا بسا کر اور اپنے تخلیقی پیکروں میں ڈھال کر ایک عرصہ کی محنت اور ریاضت کے بعد اردو میں ایک نئی صنف سخن کے طور پر اسے قبولیت عام بخشی ہے۔ اور اس میں اردو کی روایتی خوشبو پیدا کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب "تشدید" کی زیادہ تر ہائیکو نظمیں اردو کے تہذیبی مزاج سے ہم آہنگ ہیں اور اس میں مروجہ "ثلاثی" کی تکنیک بھی اپنائی گئی ہے۔ مختلف بحروں میں طبع آزمائی کے ساتھ اکثر قافیہ اور ردیف کا التزام بھی ملتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ آدھے حصے میں ہائیکو نظمیں ہیں اور آدھے میں علیم صبا نویدی کی ہائیکو نظموں پر لکھے گئے تنقیدی مضامین ہیں۔ یہ مضامین ڈاکٹر نار قادری، گیان چند جین، نادک حمزہ پوری اور ڈاکٹر مظہر شہبری کے ہیں۔ جس میں انھوں نے علیم صبا نویدی کی کاوشوں کو سراہا ہے۔ کتاب کا مقدمہ

اکبر اختر بستوی نے لکھا ہے۔ کتاب خوبصورت کتابت و طباعت سے آراستہ ہے۔ اور قیمت چالیس روپے ہے۔ یہ کتاب ہائیکو تخلیق کاروں کو کسی بھی طرح کے تجربے میں نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ تجربہ کے لیے روشنی فراہم کرے گی۔

نفی ضرب نفی

شاعر: ساجد حمید
صفحات: ۱۴۴ قیمت: ۴۰ روپے
ملنے کا پتہ: نمبر ۱۹ نہرو نگر، ساگر ۴۷۰۰۰۵
مبصر: ناز بھارتی

ساجد حمید دنیائے شعر و ادب کا ایک تابندہ نام ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام "پانی کے مہتاب" ۵ سال قبل شائع ہو کر قبول خاص و عام ہو چکا تھا۔ "نفی ضرب نفی" ان کا دوسرا مجموعہ ہے جو حال ہی میں کرناٹک اردو اکیڈمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے نہ کسی سے پیش لفظ لکھوایا ہے اور نہ ہی والیوں کا انبار۔ ویسے بھی نقاد و مبصر کا کام کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس مجموعہ میں تقریباً ۶۰ غزلیں اور ۵۰ نظمیں ہیں۔

"نفی ضرب نفی" ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جس کا رنگ نہ جدید ہے اور نہ روایتی۔ اس کا اسلوب منفرد ہے۔ بجا طور پر ہم اسے نادیدہ و ناشنیدہ لہجہ کہہ سکتے ہیں۔ ساجد حمید کی شاعری نتھری، ستھری، سچی اور تخلیقی توانائیوں سے بھرپور ہے۔ انھوں نے نہ صرف بھاری بھرکم الفاظ استعمال کیے ہیں اور نہ مرعوب کن۔ بلکہ اپنی روزمرہ زبان میں اپنے حسی تجربات کا فن کارانہ اظہار کیا ہے۔ ان کی شاعری الفاظ کی کرتب بازی نہیں بلکہ زندہ الفاظ کی موزوں ترتیب ہے جس میں تازگی اور موسیقیت کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائی بھی نظر آتی ہے۔ تشبیہات و استعاروں کی ندرت آفرینی قابل تحسین ہے۔ ان کی شاعری میں قاری کے جمالیاتی احساس کو آسودگی بخشنے کے علاوہ اپنے ذہنی اور احساساتی تجربوں کو کامیابی کے ساتھ ترسیل کرنے کی قوت بھی ہے۔ اس مجموعہ کی نظموں میں ایک آہنگ اور وحدت ہے جو شاعری کے تخلیقی جوہر اور ریاضت کا غماز ہے۔ کوہ جشاں، نفی ضرب نفی، انتشار صفت، میں پیاسا ہوا، یقین کی خوشبو، باتوں باتوں میں، وغیرہ نظمیں یوں ہی وجود میں نہیں آئیں۔ ساجد حمید میں شعر کہنے کا سلیقہ ہے اور لفظوں کو برتنے کے فن سے وہ خوب واقف ہیں۔ اس بات کی تصدیق نفی ضرب نفی میں شامل مندرجہ ذیل اشعار سے ہو جائے گی۔

آگہی مجبور تھی تھی شب بھر آیتیں کھل رہی تھیں سینوں میں
اجلی اجلی کپاس جیسے لوگ کیا ہوئے ڈھونڈنا صحیفوں میں

فلک سے توڑ لائے چاند تارے مگر کب جسم میں باقی نہیں ہے
طیور لوٹ کے کاشن میں کہاں چکے ہوں گے وہ اس اشارے کا مطلب سمجھ چکا ہوگا

کتاب آفسیٹ پر چھپی ہے۔ باذوق قارئین کو اس مجموعہ کا مطالعہ یقیناً آسودہ بخش ثابت ہوگا۔ ●●

احمد شوقی - ایک مطالعہ

مولف :- محمد اظہر حیات
مبصر :- سعید الدین سیناتی - ابوظہبی متحدہ عرب امارات
قیمت :- ۲۰/- روپے
پتا ناشر :- حیات بکڈپو، مومن پورہ - ناگپور نمبر ۱۸

اردو شاعری میں جس طرح غالب و اقبال کا مقام ہے تقریباً وہی حیثیت عربی شاعری میں متنبی اور شوقی کی ہے - زیر نظر کتاب احمد شوقی - ایک مطالعہ عربی ادب کے ایسے ہی باکمال شاعر و ادیب کے حالاتِ زندگی اور شاعری پر مختصر اور جامع روشنی ڈالی گئی ہے - جس کے مصنف محمد اظہر حیات ہیں جو ناگپور یونی ورسٹی کے شعبہ "اردو، عربی سے منسلک ہیں۔

مقدمہ کے طور پر "یہ کتاب" کے عنوان سے ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے مصنف کا تعارف پیش کیا ہے نیز کتاب کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی ہے احمد شوقی ایک مطالعہ - ۴ ابواب پر منقسم ہے -

پہلا باب : احمد شوقی - حالات و کوائف - دوسرا باب : شوقی اور ہندستان تیسرا باب : شوقی اور اقبال آخری باب شوقی کے چند مرثیے - کتاب ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے جسے پڑھنے کے بعد بہت کم وقت میں قاری، احمد شوقی کا گرویدہ اور عقیدت مند بن جاتا ہے - "شوقی اور ہندستان" عنوان کے تحت مصنف نے شوقی کی نظم "گاندھی" کا ترجمہ پیش کیا ہے - نیز محمد علی جوہر کی وفات حسرت آیات کا مرثیہ مع اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے - یہ ایک عربی شاعر کا جوہر کو بہترین خراج عقیدت ہے - اس کا ترجمہ بھی رواں دواں اور سلیس اردو میں کیا گیا ہے -

مصنف نے شوقی اور اقبال کا موازنہ بڑی عرق ریزی سے کیا ہے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے - اور اعلا تنقید نگاری کا حق ادا کر دیا ہے - اقبال کے جو شعری حوالے دورانِ موازنہ پیش کیے گئے ہیں وہ بہت مناسب اور اپنی مثال آپ ہیں - سرورق دیدہ زیب ہے اور قیمت ۲۰ روپے مناسب ہے - مصنف کو چاہیے کہ وہ اہم موضوعات پر اسی طرح مختصر کتابیں لکھتے رہیں - اللہ سے دعا ہے کہ وہ ان کے قلم میں مزید زور پیدا کرے - آمین -

دیس دیس کے اُجالے

مصنف :- ڈاکٹر محمود الحسن
مبصر :- ملک زادہ جاوید
قیمت :- پچاس روپے
تقسیم کار :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵

اردو میں ایسی کتابوں کی بے حد کمی ہے جن میں دیگر زبانوں خصوصیت کے ساتھ ترکی اور عربی ادب کی شاعری اور فکری رجحانات کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے یہ ایک سنجیدہ علمی اور ادبی کام ہے جس کی طرف لوگوں کی توجہ کم جاتی ہے ڈاکٹر محمود الحسن کی کتاب "دیس دیس کے اجالے"

اُن چھے مضامین پر مشتمل ہے جن میں جدید عربی شاعری اور جدید عربی ادب کی سمت و رفتار اور اُن کے چند اہم پہلوؤں کا نہ صرف جائزہ لیا گیا ہے بلکہ عراق کے نامور شاعر "جمیل الزہاوی" اور عہد جدید کے عرب شاعر شوقی، جدید ترکی ادب کے فکری رجحانات اور "بیدادہ سے حصارہ تک" کے عنوان سے مختلف ادیبوں شاعروں اور انشاپردازوں کی تخلیقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے ان مضامین کو پڑھ کر اُن مسائل اور مراحل سے ہماری واقفیت بڑھتی ہے جن سے ترکی اور عربی ادب ماضی میں گزرا ہے یا حال میں گزر رہا ہے ڈاکٹر محمود الحسن کے یہ مضامین "معارف" "اعظم گڑھ" "برہان" دہلی اور "آجکل" میں پہلے شائع ہو چکے ہیں جنھیں انھوں نے ترمیم و تنسیخ اور حذف و اضافے کے بعد شائع کیا ہے مصنف نے رشحات میں لکھا ہے کہ "اس مجموعے کو خاص طور پر اس لیے لکھا گیا ہے تاکہ معاصر ادبی رجحانات اور نمونوں کو سمجھنے کے لیے یہ بطور تمہید اور پس منظر کے کام دے سکے اور ایک جامع قابلِ فہم تاریخی تناظر کے طور پر اس سے معنی خیز انداز کے ذریعے مفید مدد مل سکے۔"

اُن اردو داں حضرات کے لیے جو عربی اور ترکی زبان سے واقفیت نہیں رکھتے یہ کتاب بے حد معلوماتی مفید اور کار آمد ہے اور ان دونوں زبانوں کے ادیبوں شاعروں کی فکری صلاحیتوں اور اُن کے تخلیقی رویے کو سمجھنے میں ممد معاون ثابت ہوتی ہے اور اسے ایک سنجیدہ علمی اور ادبی کارنامہ کہا جا سکتا ہے یہ افسوس کی بات ہے کہ ایسے وقیع مضامین پر مشتمل کتاب معمولی کتابت خراب کاغذ اور ایسے ڈسٹ کور کے ساتھ شائع ہوئی ہے جو جاذبِ نظر نہیں ہے کتاب کی قیمت پچاس روپے زیادہ نہیں ہے۔

موسم موسم روپ

مصنف :- شاہد کلیم
ناشر :- ثروت پبلی کیشن پٹنہ نمبر ۴
مبصر :- سلیم شہزاد
قیمت :- ۴۰ روپے
رابطہ :- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ نمبر ۴

جینت پرمار کے خوبصورت سرورق سے مزین اور بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے اشاعت پذیر شاہد کلیم کا یہ شعری مجموعہ تقریباً اسّی غزلوں اور بیس نظموں پر مشتمل ہے۔ اس سے پیشتر مصنف کی دو اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں "زیر بار" (شاعری) اور "محرک" (مضامین)۔

یوں تو ہر فنکار ایک حد تک ناقدانہ بصیرت کا مالک ضرور ہوتا ہے لیکن جو فنکار فنی اظہار کے علاوہ اپنے تنقیدی اظہار کی اشاعت بھی کرتا ہو بالخصوص اپنے فن کے توسط سے عمومی فن کے متعلق اس کے خیالات ایک اہمیت کے حامل

ہوتے ہیں۔ شاہد کلیم کا فنی اور شعری نظریہ اظہار کی صداقت اور جدت پسندی رہا ہے جس کی مثالیں ان کے پہلے مجموعے "زیر بار" کے علاوہ زیر تبصرہ مجموعے "موسم موسم روپ" میں صفحے صفحے پر نمایاں نظر آتی ہیں۔ زمانۂ حال کی تیز رفتار زندگی جینے والے ایک عام فرد کی نظر سے وہ زندگی کے مشینی نظام کو دیکھتے پرکھتے ہیں اور ان کی فنکارانہ بصیرت اس پہچان اور پرکھ کو فن کا روپ دیتی ہے جیسے ان کے اشعار اور نظموں کا موسم موسم روپ سمجھنا چاہیے۔

فنکارانہ عمومیت جو جدید شاعری میں موضوعات اور لفظیات کی تکرار کی صورت میں اجاگر ہوتی ہے "موسم موسم روپ" کی شاعری میں بھی واضح ہے لیکن شاہد کلیم نے اپنے مخصوص فکری اور فنی رجحان کے زیر اثر اسے اپنی شاعری پر حاوی ہونے نہیں دیا ہے مثلاً ان کی زیر نظر غزلوں میں جدید غزل کی روایتی زمین بہت کم نظر آتی ہیں۔ ان کی بجائے انھوں نے طبع زاد زمینوں میں اشعار کہے ہیں اور یہ زمین اپنے قوافی اور ردیفوں کے معنوی اتصال کا عمدہ نمونہ ہیں۔ لسانی نقطۂ نظر سے ان کے یہاں صیغۂ ماضی کی مختلف شکلیں بکثرت مستعمل ہیں اور صیغۂ مضارع بھی جو شاعر کی تمنا پسندی کی مثال بن گیا ہے مثلاً

(۱) رشتہ ٹوٹا / کھلونا ٹوٹا

راستہ روشن ہوا / سلسلہ روشن ہوا

نظارگی تباہ ہوئی / روشن ہر ایک راہ ہوئی وغیرہ

اور (۲) داستاں ہو جاؤں میں / دشت بے کراں ہو جاؤں میں

اچانک روشنی ہو جائے تو / دوستی ہو جائے تو

رعنائیاں کہاں ڈھونڈیں / اچھائیاں کہاں ڈھونڈیں وغیرہ

شاہد کلیم اپنی غزلوں میں کسی فعل کی گردان کو بالخصوص ردیف میں خاص فنکاری سے برتتے ہیں مثلاً

مجھے جلا کے، شام سیاہ میں رکھیے

کوئی چراغ تو شہر تباہ میں رکھیے

تو اپنے آپ کو اس درجہ بدحواس نہ رکھ

ہوا کے دوش پہ دیوار کی اساس نہ رکھ

(اس مطلعے میں ایطائے جلی کا عیب ہے)

اداسی، گہری خاموشی، اندھیرا رکھ گیا

مرے گھر میں کوئی منظر کھنڈر کا رکھ گیا

اس کے علاوہ مختلف افعال کی مختلف شکلیں زیر تبصرہ مجموعے کی غزلوں میں اظہار سے گزری ہیں۔

تبصرے کا اختتام شاعر کے ایک جملے پر کیا جاسکتا ہے:

"میں اپنی تخلیق میں اسلوبیات کا منفرد خیال رکھتا ہوں کہ سنجیدہ اور معتبر قاری میری آواز اور میرے احساس کو سمجھ سکیں۔"

عمدہ کتابت اور طباعت کا حامل یہ شعری مجموعہ واقعی مستحق ہے کہ سنجیدہ اور معتبر قاری سنجیدگی اور اعتبار سے اس کا مطالعہ کریں۔

شعور و ادراک

مصنف: محمد ایوب واقف
مبصر: علی جواد زیدی
قیمت: ۸۰ روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، بمبئی، علی گڑھ

شعور و ادراک گہرے اور وسیع مطالعے اور ہمہ گیر مشاہدے ہی سے فروغ پاتے ہیں۔ ایک ادبی ناقد اور محقق ان سے دامن نہیں بچا سکتا۔ ادیبوں کی وہ نسل جو انتہائی انکسار اور بلند نظری سے سمجھیں بزرگ کہتی ہے وہی مستقبل کا سرمایہ امید ہے اور میرے دوست محمد ایوب واقف کا شمار اسی نسل سے ہے۔ وہ نہایت خاموشی سے لیکن بڑے خلوص اور استقلال کے ساتھ تقریباً چوتھائی صدی سے خدمت ادب میں مصروف ہیں اور اب بزم ادب میں تازہ ترین تحفہ "شعور و ادراک" کے ساتھ آتے ہیں۔

اس میں "اندراوت" کے خالق نور محمد شاہ کامیاب جونپوری کو متعارف کرا کے ایک اہم مصنف اور اس کی تصنیف کی خوبیوں کی طرف ہمیں متوجہ کیا ہے۔ نہ جانے کیسے کیسے گوہر شہپارے گمنامی میں نوادرات پڑے ہوئے کسی ایوب واقف کے انتظار میں رہتے ہیں۔ اسی صف میں گجرات کے ایک قدیم شاعر خوشتر احمد آبادی کے مرثیوں کی بازیافت بھی آتی ہے۔ ضرورت ہے کہ "اندراوت" اور کلام خوشتر کی تدوین و اشاعت کا کام ہماری اکیڈمیاں ہاتھوں میں لیں تاکہ تاریخ ادب صرف غزل و قصیدہ کے محدود دائرے سے باہر قدم نکال سکے اور اردو کو ادبیات عالم میں اس کا صحیح مقام دلانے میں کامیاب ہو۔ تحقیق کے سلسلے میں ابتدائی پچاس صفحات جن میں نور محمد شاہ کامیاب اور خوشتر احمد آبادی کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے خاصے کی چیز ہے۔

ایوب واقف نے خاکوں میں خواجہ احمد عباس، مولانا صباح الدین عبدالرحمن، قرۃ العین حیدر، جوش ملیح آبادی، جگن ناتھ آزاد اور اختر الایمان جیسے کئی انہی عناصر یکجا کر دیے ہیں اور ان کی شخصیت کے بہت سے دلکش پہلو اجاگر ہو گئے۔ راہی معصوم رضا اور عصمت چغتائی کا اور بہت سی اہم شخصیتوں کا بھی ذکر سلسلہ بیان میں آگیا ہے۔ اس سے اس مجموعے میں تنوع اور دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں میرے ذکر کی گنجائش نکالنا بھی ان کی اعلیٰ ظرفی کا نمونہ ہے ذکر میرا اس خوبصورت محفل میں کیا ہے تو شکریہ لازم نہ ہوتا تو شکایت نہ ہوتی۔ من آنم کہ من دانم۔

[illegible] صفحات پر پھیلا ہوا یہ مجموعہ مضامین ہماری تنقید و تحقیق میں ایک خوشگوار اضافہ

ہے۔ واقف پورے عقیدہ اور احتیاط سے قلم اٹھاتے ہیں اور اپنی تحریروں میں علمی شگفتگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کے خاکے ان کے انٹرویو اور رپورتاژ سب پڑھنے کی چیزیں ہیں اور قاری پر اپنا بھرپور اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ آیندہ بھی اپنے توانا قلم سے مفید کام لیتے رہیں گے۔

ادبی تہذیبی خبریں

معین احسن جذبی کو اقبال سمّان

بھوپال۔ مدھیہ پردیش حکومت نے اردو کے معروف شاعر معین احسن جذبی کو "اقبال سمان" برائے سال ۹۳-۱۹۹۲ دینے کا اعلان کیا ہے۔

۱۹۸۶ میں ریاستی حکومت کے ذریعہ شروع کردہ پُروقار قومی انعام اب تک علی سردار جعفری، قرۃ العین حیدر، اختر الایمان، عصمت چغتائی، آنند نرائن ملا اور مجروح سلطان پوری کو دیا جا چکا ہے۔ یہاں ایک سرکاری خبر کے مطابق یہ انعام ایک لاکھ روپیہ نقد اور ایک سند توصیف پر مشتمل ہے۔ ایک اعلا سطحی اختیاراتی کمیٹی نے جو مجروح سلطان پوری ابن فرید، شجاع خاور، نعیم احمد، رفعت سروش ظہیر احمد صدیقی اور ہارون ایوب پر مشتمل تھا اس سال کے انعام کے لیے اتفاق رائے سے جذبی کے نام کی سفارش کی۔

مبارک پور (اعظم گڑھ) میں ۲۱ اگست ۱۹۱۲ء میں پیدا ڈاکٹر جذبی ۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۴ء تک مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرار رہے ڈاکٹر جذبی "غالب انعام، امتیاز میر انعام اور مہاراشٹر، اترپردیش اور ہریانہ کی اردو اکادمیوں کے انعامات بھی حاصل کر چکے ہیں۔

اب ہر سال اردو کے ایک صحافی کو دس ہزار روپے کا نقد انعام ملے گا

لکھنؤ۔ اترپردیش کے وزیر اعلا ملائم سنگھ یادو نے اعلان کیا ہے کہ مجاہدِ آزادی اور ممتاز اردو صحافی مولانا عبدالوحید صدیقی مرحوم کی یاد اور اعتراف خدمات کے طور پر اترپردیش میں جلد ہی ایک اردو جرنلزم انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے گا جس کے لیے جلد ہی ایک کمیٹی کی تشکیل کی جا رہی ہے فی الحال سال رواں سے اترپردیش اردو اکاڈمی کے ذریعہ قلم کے اس سپاہی کی یاد میں ہر سال اردو کے ایک صحافی کو دس ہزار روپے کا نقد انعام دیا جائے گا۔

۱۹ اپریل کو محبوب ملت مولانا عبدالوحید صدیقی کی تیرھویں برسی پر منعقدہ اس یادگاری تقریب میں زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ملائم سنگھ یادو نے کہا کہ مولانا ایسے مجاہد آزادی تھے جنھوں نے ایک طرف آزادی کی لڑائی لڑی، دوسری طرف اردو کی لڑائی میں بھی آگے رہے ان کا قلم سماجی انصاف کی جنگ لڑتا رہا اور آج میں بھی سماجی انصاف کے لیے برسرپیکار ہوں۔ مولانا سے میری دعا سلام رہی۔ افسوس جب مجھے کچھ کرنے کا موقع ملا ہے تو مولانا ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ شہر ادب لکھنؤ کے زیر اہتمام سہکار بھون میں منعقدہ شاندار یادگاری تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے اترپردیش کے گورنر جناب موتی لال وورا نے اپنی جامع اور تاریخی تقریر میں مولانا

عبدالوحید صدیقی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا ان اشخاص میں سے تھے جنھوں نے تقسیم ہند کی بھرپور مخالفت کی تھی۔ ان بے باک صحافیوں میں تھے جنھوں نے انگریزی دور میں بھی قلم کی آواز کو بلند رکھا اور ناانصافی کے خلاف لڑتے رہے۔ اس موقع پر آل انڈیا اقلیتی سیل کے چیرمین طارق انور نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارے بزرگوں نے وراثت میں ہمیں بہت کچھ دیا ہے اگر ہم اس کو بھول جاتے ہیں تو ہمارا وجود خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

مولانا عبدالوحید صدیقی کی سماجی، ملّی، قومی اور صحافتی خدمات کے اعتراف کے لیے منعقدہ اس تاریخ ساز یادگاری جلسہ میں کنوینر معصوم نہٹوری، استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین ڈاکٹر عمار رضوی، صدر خان غفران زاہدی، جنرل سکریٹری ملک زادہ منظور احمد اور لکھنؤ کے دیگر صحافیوں، شاعروں اور دانشوروں کے علاوہ مولانا سید احمد ہاشمی جناب روشن بیگ (سابق وزیر کرناٹک) بمبئی بلٹز کے اڈیٹر ہارون رشید علیگ، بزرگ صحافی پروانہ ردولوی، تمیس رام پوری جمشید عادل علیگ، نوبھارت ٹائمز کے سابق نائب مدیر سہیل وحید اور مولانا عبدالوحید صدیقی (مرحوم) کے دو صاحبزادگان خالد مصطفیٰ صدیقی (اڈیٹر ہما) اور شاہد صدیقی اور مولانا مرحوم کے فرزند زادہ نعیم صدیقی بھی شریک ہوئے۔ بعد میں جلسہ مشاعرے میں بدل گیا جس میں مشہور شاعروں نے حضرت مولانا عبدالوحید صدیقی کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

ڈاکٹر رفیق زکریا کی انگریزی تصنیف
اردو اڈیشن کا اجراء

نئی دہلی ۔ "میری کتاب سے سلمان رشدی کی کتاب کے ناشر ادارے پینگوئن کو پہلی بار معلوم ہوا کہ قرآن کی حقیقت اور تعلیمات کیا ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ رشدی کی شرانگیز کتاب کا جواب دیا جانا نہایت ضروری تھا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ڈاکٹر رفیق زکریا نے اپنی کتاب "محمدؐ اور قرآن" کی وضاحت کی جو انھوں نے سلمان رشدی کی انگریزی ناول "شیطانی آیات" کے جواب میں لکھی ہے اور جو ۱۹۸۸ء میں پینگوئن نے شائع کی تھی۔

ڈاکٹر زکریا کی انگریزی کتاب ۱۹۹۱ء میں اصلاً پینگوئن کے ادارے ہی سے چھپی اور اب مکتبہ جامعہ کے ادارے سے اس کا اردو اڈیشن شائع ہوا ہے۔ اس کی رسمِ اجرا ۲۹ مارچ کو یہاں غالب اکادمی میں مشہور صحافی اور مصنف جناب خشونت سنگھ نے کی جو ۱۹۸۸ء میں پینگوئن کے ایک مشیر بھی تھے۔

چنانچہ یہ جلسہ نہایت معلومات افزا اور فکر و خیال کا ایک گرم چشمہ بن گیا۔ اس کی صدارت سید مظفر حسین برنی اور نظامت ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے کی۔ آڈیٹوریم سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور اس میں ہر فرقے کے لوگ موجود تھے۔ جلسے کا اہتمام انجمن ترقی اردو (ہند) جامعہ اسعد علی گڑھ

غالب اکادمی اور مکتبہ جامعہ (نئی دہلی) کے اشتراک سے ہوا تھا۔ کتاب کا ترجمہ جناب مظہر محی الدین نے کیا ہے اور اس کا پیش لفظ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے۔

جناب خشونت سنگھ نے بتایا کہ سلمان رشدی کے ناشرین نے اس کی کتاب کی اشاعت سے قبل اس کا مسودہ بغرض مطالعہ انہیں بھیجا تھا اور انھوں نے اس کی اشاعت نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن پینگوئن نے ان کے مشورے کو رد کر دیا اور سلمان رشدی کی کتاب شائع کر دی۔ امر واقع یہ تھا کہ وہ مصنف کو پہلے ہی ۸۵ ہزار پونڈ کا اڈوانس ادا کر چکے تھے۔

جناب خشونت سنگھ نے کہا کہ وہ کسی کتاب پر پابندی کے حق میں نہیں ہیں لیکن کسی کو یہ حق بھی نہیں دینا چاہئے کہ وہ کسی طبقے کے مذہبی جذبات کو مجروح کرے۔ انھوں نے ڈاکٹر رفیق زکریا کی کاوش کی تعریف کی اور کہا کہ یہ رشدی کی حرکت کے توڑ کا صحیح طریقہ ہے۔

ڈاکٹر زکریا نے بتایا کہ ان کی انگریزی کتاب لاکھوں کی تعداد میں یورپ اور امریکا میں فروخت ہو چکی ہے۔ انھوں نے جلسے کے بعض شرکا کے اور بالخصوص پروفیسر مسعود حسین کے اعتراضات کا بڑے جوش و خروش سے جواب دیا اور کہا کہ اسلام روز اول سے اپنے مخالفوں کے جنہ میں یہودیوں کے بد معتقد رسمی چیلنج پیش رہے ہیں۔ جملوں کا نشانہ رہا ہے۔ سلمان رشدی اسی گروہ کھیت کا گندہ پھل ہے۔ اور ہندستان میں ہندوؤں کے حامی بھی سلمان رشدی کی بدنام کتاب کے حوالے سے کہتے ہیں کہ مسلمان متعصب اور جارح ہے۔ ان حالات میں صرف کسی فتوی کے اجرا سے قضیہ بند نہیں ہو جائے گا۔ سلمان رشدی کے قتل سے بھی اس کی کتاب کا زہر ختم نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس کا موثر جواب دینا ہی مناسب ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی انگریزی کتاب کی مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی اور مولانا کوثر نیازی مرحوم جیسے علما کرام نے تعریف کی ہے اور اب دوسرے لوگوں کو بھی رشدی کا جواب دینا چاہیے۔

ڈاکٹر زکریا نے بتایا کہ اگرچہ ارباب پینگوئن نے ان کی اصل انگریزی کتاب کو شائع کرنا منظور کیا لیکن ان کی درخواست کے باوجود انھوں نے اس کا پیپر بیک اڈیشن شائع کرنے سے انکار کیا۔

صدر جلسہ سید مظفر حسین برنی نے کہا کہ ڈاکٹر رفیق زکریا نے بڑا اہم اور مفید کام کیا ہے اور ان کی کتاب کا پیغام ہندستان میں غیر مسلموں تک بھی پہنچنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا ترجمہ دوسری زبانوں بالخصوص ہندی میں بھی ہونا چاہیے۔ سلمان رشدی کی کتاب کو ایک اور اسلام دشمن سازش اور واہیات تحریر قرار دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ حکومت ہند نے اس پر پابندی لگا کر مسلمانان ہند پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ یہ اس کا اخلاقی فرض تھا اور ہر حکومت کو ایسا کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ ڈاکٹر رفیق زکریا نے نہ صرف نہایت عالمانہ جواب دیا ہے بلکہ اسلام کی نہایت دوست تفسیر بھی

پیشی کی ہے۔

جامعہ اردو (علی گڑھ) کے وائس چانسلر پروفیسر مسعود حسین نے کہا کہ رشدی اسلام کا کوئی عالم نہیں۔ لہٰذا اس کی کتاب جو ایک ناول ہے اور جس کا مقصد صرف اسلام کی تضحیک ہے۔ زیادہ نوٹس نہیں لیا جانا چاہیے تھا۔

بلٹز (اردو) کے اڈیٹر جناب ہارون رشید نے بتایا کہ سلمان رشدی کی کتاب پر پابندی لگانے کے لیے ڈاکٹر رفیق زکریا، جناب اقبال مسعود اور بمبئی کے دوسرے اصحاب نے حکومت ہند کو مراسلہ بھیجا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی دل آزار نوعیت پر صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ دوسرے فرقوں کے لوگوں کو بھی اعتراض ہے۔ ڈاکٹر زکریا نے بڑے استدلال اور استقلال سے اسے باطل ثابت کیا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کہا کہ وہ کسی کتاب پر پابندی لگانے کے خلاف ہیں لیکن بعض اوقات خیر اور شر میں حد فاصل کا تعین کرنا نہایت ضروری ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ اس امر پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ حکومت ہند نے سب سے پہلے سلمان رشدی کی کتاب پر پابندی لگائی۔

جناب ضیاء الدین شکیب نے جو کئی برسوں سے لندن میں مقیم ہیں کہا کہ بعض انگریزوں نے بھی سلمان رشدی کے خلاف لکھا ہے اور ان کے ادارے مسلم فیڈریشن نے اس کے تراشے جمع کیے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رجسٹرار جناب خواجہ شاہد نے کہا کہ ڈاکٹر زکریا نے صرف رشدی ہی کا جواب نہیں دیا بلکہ تمام دشمنان اسلام کا منہ بند کیا ہے۔

شہرہ آفاق ناولسٹ ڈاکٹر ملک راج آنند نے کہا کہ اہل مغرب اہل ایشیا کے خلاف جو گستاخیاں کرتے ہیں ان کا جواب خود اہل ایشیا ہی کو دینا ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ رشدی کے بدنام ناول کی اشاعت کے بعد انھوں نے اسے ایک مراسلہ بھیجا تھا جس میں اس کے ناول کی مذمت کی تھی۔ کیونکہ اس میں اپنی ہی ماؤں بہنوں کی توہین کی گئی ہے۔ اب ڈاکٹر زکریا نے اس کا عالمانہ اور مہذب جواب دیا ہے۔

جناب رفعت سروش نے "جہاد قلم" کے عنوان سے ڈاکٹر زکریا کو منظوم خراج تحسین پیش کیا جسے بہت پسند کیا گیا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں نے مقررین اور سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیق زکریا کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ کہا کہ وہ فروغ تعلیم کے بڑے فعال حامی اور عامل ہیں اور انھوں نے ہمارا شہر میں درجنوں ادارے قائم اور مضبوط کیے ہیں۔ کاش ایسے مخلص کارکن ہر شہر میں پیدا ہو جائیں۔ ان کی تازہ کتاب نہ صرف موجودہ بلکہ آئندہ نسلوں کی بھی ذہنی رہنمائی کرے گی۔

(جی، ڈی، چندن)

رفیعہ قادری کو پی ایچ ڈی کی

گلبرگہ۔ گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ نے مسز رفیعہ قادری لیکچرار اردو...

ڈگری کالج گلبرگہ کو ان کے مقالہ "میر عابد علی خاں، حیات اور کارنامے" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کا مستحق قرار دیا ہے ڈاکٹر رفعیہ قادری نے اپنا مقالہ ڈاکٹر طیب انصاری کی نگرانی میں لکھا۔ ڈاکٹر یوسف سرمست نے ممتحن کے فرائض انجام دیے

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نئی کتاب

ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات

کا اجرا

نئی دہلی۔ ہندستان میں اردو یونیورسٹی کے قیام کے بارے میں اس سے متعلقہ کمیٹی کی رپورٹ مرکزی کابینہ میں آچکی ہے اور اب اسے جلد ہی عملی جامہ پہنایا جائے گا۔"

یہ انکشاف امور خارجہ کے وزیر مملکت جناب سلمان خورشید نے ۱۷ مارچ کو یہاں انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نئی کتاب "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" کی رونمائی کرتے ہوئے کہا۔ جلسے کی صدارت متذکرہ کمیٹی کے چیرمین جناب عزیز قریشی نے کی۔ جناب سلمان خورشید نے کہا کہ ملک کی تقسیم کا سب سے زیادہ بوجھ اردو زبان کو اٹھانا پڑا جو اپنے جنم بھوم سے نکل کر ایک ایسی جگہ پہنچ گئی ہے جو اس کا گھر نہیں۔ اب نئی تدبیروں سے اس کی سسکتی ہوئی جان کو یہاں پانی مل رہا ہے اور اس میں نئی ہمت پیدا ہو رہی ہے موصوف نے کہا کہ ایک اور المیہ یہ ہو کہ ہمارے معاشرے نے اپنی نئی نسل کے لیے ایک ایسا طرز تعلیم اختیار کیا جو مادری زبان سے دوری پیدا کرتا ہے۔ اردو یہاں بھی سب سے زیادہ ستم رسیدہ رہی۔ اب امید واثق ہے کہ اردو یونیورسٹی کے قیام سے پورے ملک میں اردو پھلے پھولے گا وزیر موصوف نے کہا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نئی کتاب سے اردو عالمی ادب کے نئے نظریات کے ہم دوش ہو گئی ہے۔ یہ ہمارے کتب خانوں میں ایک نئی کتاب کا اضافہ ہی نہیں بلکہ اردو زبان اور ادب کے عظیم سرمایہ کا فلاحی ثمرہ ہے جو پوری دنیا کے لیے قابل استقبال ہے۔

جناب خورشید نے امید ظاہر کی کہ جب اردو یونیورسٹی کا باضابطہ قیام ہو گا تو اس میں پہلا پتھر پروفیسر نارنگ لگائیں گے انھوں نے کہا کہ وہ ملک کے سیکولرزم کی روشن علامت ہیں۔

ان سے قبل جلسے کے ناظم جناب محمود ہاشمی نے کہا کہ پروفیسر نارنگ کی کتاب حالی کے مقدمہ شعر و شاعری اور محمد حسین آزاد کی تنقیدی تحریروں کے بعد بیسویں صدی کی اردو کی انقلاب آفریں تصنیف ہے۔ اس میں پچھلی تین دہائیوں میں جرمنی سے فرانس تک سفر کرنے والی علمی، ادبی اور لسانی تحریکوں اور تصورات کی روداد پیش کی گئی ہے۔ موصوف نے کہا کہ نئے نظریات سے صدیوں پرانی ادبی روایت اور ادبی فلسفے کا انہدام ہو رہا ہے اور اس کتاب سے ہندستان کے ادیبوں کو مشرقی شعریات کی حیثیت اور اہمیت کا ایک نیا احساس اور ادبی تصورات کے

کتاب تھا
ہے ایک نیا تناظر دے گا
کسی نئی کتاب کے اجرا پر ہونے والے
ملک کے ہر روز مرہ جلسوں سے یہ ایک بڑا
مختلف جلسہ تھا اس میں دہلی، علی گڑھ
اور بمبئی کے اردو، ہندی اور انگریزی کے
ممتاز ترین ادیب، دانشور اور نقاد یکجا
ہو گئے تھے جن میں سے ایک درجن برگزیدہ
اہل فکر و قلم نے کتاب کے مشمولات پر اظہار
خیال کیا۔

ان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جناب
شافع قدوائی اور پروفیسر ابو الکلام قاسمی،
دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالحق اور
پروفیسر شارب ردولوی، جواہر لال نہرو
یونیورسٹی کے پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی،
بمبئی یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالستار دلوی،
ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری پروفیسر
اندر ناتھ چودھری، ہندی ادیب اور نقاد
پروفیسر کے جی ورما اور جناب بلراج کومل
شامل تھے۔ جناب متین امروہوی نے
مصنف کو منظوم خراج تحسین پیش کیا۔

مقررین نے کہا کہ یہ ایک عہد ساز کتاب
ہے اور اس سے ایک نئے ادبی سفر کا
آغاز ہوگا۔

پروفیسر نارنگ نے مقررین کے کلمات
تحسین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ
وہ اپنے چالیس سال کے ادبی سفر میں
سے عرصہ تیس سال سے اس موضوع پر
نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک کے
دانشوروں سے بھی ذکر و فکر کرتے رہے
ہیں جو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے کتاب
[illegible] ہے جو وہ کہنا چاہتے
تھے بلکہ وہ بھی موجود ہے جو وہ نہیں کہنا
چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ روز اوّل
سے کسی ایک بات پر بنی نوع انسان کا ذہنی
اور قلبی اتفاق نہیں ہوا ہے اور یہ سوال
ہمیشہ ابھرتا رہا ہے کہ حقیقت میں صداقت
کیا ہے؟ ہر قاری ایک تحریر یا قول کے اپنے
طور پر معنی اخذ کرتا ہے۔ تفہیم کے اس
عمل میں بنیادی طور پر مجادلے اور مباحثے
کی گنجائش ہے۔ پروفیسر نارنگ نے کہا
کہ اس آویزش سے ڈرنا نہیں چاہیے۔
مغرب کے نظریات کے مقابل میں ہم اپنی
دفاع سے لڑتے رہتے ہیں لیکن ہماری
اپنی روایت میں بہت سارے خزانے
ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو پہچانا چاہیے۔

صدر جلسہ جناب عزیز قریشی نے کہا
کہ ہمارے بعض ادیب اپنے مایہ ناز مشترکہ
کلچر کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان میں اپنے ہی
ورثے پر یقین اور اسے منوانے کی قابلیت
نہیں ہے۔ مقام افسوس ہے کہ ہماری
نئی نسل جس سے انقلاب پسند اور اصلاح
پرور ہونے کی توقع تھی، بنیاد پرستی اور
فرقہ واریت کی طرف مائل ہے۔ ہمارے
دانشوروں کو اس پر توجہ دینا چاہیے اور
امید ہے کہ یہ کتاب ان کی رہنمائی کرے گی
(جی۔ ڈی۔ چندن)

مسقط میں شعری محفل

گزشتہ دنوں مجان ہوٹل مسقط میں
عہد ساز اردو شاعر پروفیسر وحید اختر کی
صدارت میں ہند و پاک مشاعرے کا شاندار
اہتمام کیا گیا جس [illegible]

سال نو کی یہ اوّلین ادبی تقریب سلطنت عمان کے دارالخلافہ مسقط میں ہوئی۔ مشاعرہ ۹۴ء دو وجوہات کی بنا پر مسقط میں منعقدہ گزشتہ مشاعروں سے مختلف رنگ لیے ہوئے تھا پہلی وجہ یہ کہ وحید اختر، شہزاد احمد اور شہریار جو کہ مشاعروں کے بجائے اپنی گراں قدر اور غیر معمولی اہمیت کی حامل تخلیقی کاوشوں کی بدولت ادبی دنیا میں نہایت بلند مقام رکھتے ہیں، کو اس مشاعرے میں مدعو کرکے اہل ذوق کو ان کے عمدہ اور معیاری کلام سے مستفید ہونے کا سنہری موقع فراہم کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ یہ یادگار محفل مشاعرہ "کمپنی اسپانسرشپ" کے بجائے ادب پرور احباب کے پرخلوص تعاون سے منعقد کی گئی۔ بلاشبہ یہ تجربہ کامیاب رہا۔ مشاعرے کی نظامت کے لیے جانی پہچانی شخصیت سلیم جعفری کو دوبئی سے خاص طور پر مدعو کیا گیا چنانچہ انھوں نے حسب روایت حسن نظامت سے مشاعرے کی خوب رونق بڑھائی۔ انھوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ آپس میں تحائف کا لین دین کرتے ہوئے دیگر قیمتی اشیاء کے بجائے عمدہ اور معیاری کتابیں ایک دوسرے کو پیش کریں۔

"مشاعرہ ۹۴ء کے روح رواں معروف محقق، ادیب اور شاعر ہمایوں ظفر زیدی نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ وحید اختر شہزاد احمد، شہریار اور عادل لکھنوی جیسی عظیم ادبی ہستیوں کی مسقط میں تشریف آوری مسقط میں مقیم شائقین ادب اردو کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ انھوں نے مشاعرے کے انعقاد کے ضمن میں جملہ ادب دوستوں اور پی آئی اے کے مقامی منیجر ممتاز علی راجپر کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

مشاعرے کے آغاز میں مقامی شعراکیفی حسینی اشعر کاظمی، عارف انوارالحق، فرزانہ اعجاز، مروت احمد عبدالودود مخلص، شاداب لکھنوی، اسدالرحمٰن ظفر، عابد فاروق، یوسف شکیل، سعید احمد واحد اور میزبان ہمایوں ظفر زیدی نے اپنا کلام سنایا تو مہمان شعرائے کرام وحید اختر، شہزاد احمد اور شہریار کا ایک ایک شعر سامعین نے نہایت انہماک سے سنا اور ان پر دل کھول کر گلہائے داد و تحسین نچھاور کیے مگر عادل لکھنوی نے اپنے مزاحیہ اشعار سے بلا مبالغہ مشاعرہ گاہ کو کشت زعفران بنا دیا اور سامعین سے خوب داد حاصل کی۔

مشاعرہ ۹۴ء کے انتظامی معاونین میں رئیس احمد خان، جمال مرزا اور راقم الحروف کے نام شامل ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسقط میں مقیم طلبائے قدیم، مقامی جامعہ میں تعینات چند احباب کے علاوہ رئیس احمد خان، جمال مرزا، قیصر عابدی، ڈاکٹر محسن رضا اور سعید احمد واحد نے مہمان شعرائے کرام کے اعزاز میں ظہرانوں اور عشائیوں کا اہتمام کیا جبکہ سرکردہ پاکستانی شخصیت شاہد بشیر نے حسب روایت مہمان شعراء کو اپنے ہاں مدعو کرکے ان کی پذیرائی کی۔

بہار اسٹیٹ اردو اکادمی کے انعامات

ایوارڈ کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

[ ]ا انصاری ایوارڈ ۔ اختر الایمان
جاں نثار اختر ایوارڈ ۔ سریندر پرکاش
[ ]ا جولین ایوارڈ ۔ سید نعیم الدین
ساحر لدھیانوی ایوارڈ ۔ شاہد لطیف

صحافتی ایوارڈ:۔
۱۔ لطیف جعفری (شام نامہ مالیگاؤں)
۲۔ شعیب خسرو (اورنگ آباد ٹائمز)
۳۔ افتخار اکبر (نیا اردو سماچار ناگپور)

خوشنویسی ایوارڈ:
۱۔ غلام رسول اشرف (ناگپور)
۲۔ انیس چشتی (پونے)
۳۔ عبدالرحمٰن (بمبئی)

طغریٰ نویسی ایوارڈ:
۱۔ سید عبدالستار ایوارڈ (اورنگ آباد)

تزئین کاری ایوارڈ:
۱۔ شکیل اعجاز (آکولہ)

۱۹۹۴ء کی مطبوعات پر انعامات

پہلا انعام ۷۰۰۰/-
شاعری ۔ "سیاہ در سیاہ" باقر مہدی
افسانہ ۔ "فسانہ کہیں جسے" رفعت نواز
تنقید ۔ "پریم چند، حیات نو" مالک رام
تعلیمی طبی ۔ "ہیلو ڈاکٹر" ڈاکٹر وقار شیخ
بچوں کا ادب ۔ "ممی کب آئیں گی" مشتاق مومن

دوسرا انعام ۵۰۰۰/-
شاعری ۔ "دھوپ کا دریچہ" کفیل آذر
طنز و مزاح ۔ "کچوکے" پرویز اللہ مہدی
تحقیق ۔ "ملک محمد جائسی کی پدماوت جدید تحقیقات کی روشنی میں" منظور الحسن
تعلیمی نصاب ۔ "طریقہ تعلیم اور پیمائشی قدر" غلام نبی مومن۔

بچوں کا ادب ۔ "کیلنڈر" قاضی مشتاق احمد

تیسرا انعام ۴۰۰۰/-
شاعری ۔ "درد نہاں" ملک تلسے
افسانہ انشائیہ ۔ "دانائے راز" آدم نصرت
تکنیکی ادب ۔ "آدم خور چیتا" ریاض احمد خان
بچوں کا ادب ۔ "الف سے اونٹ" بابو آر، کے

عرعر سعودی عربیہ میں عید ملن مشاعرہ

عید سعید کے حسین موقع پر "بزم احباب سخن" عرعر جو پچھلے دس سال سے منطقہ حدود شمالیہ عرعر میں ادبی مجالس کا باقاعدہ انعقاد کرتی رہی ہے اس کے زیر اہتمام عید سعید کے پُر وقار موقع پر ایک خوبصورت مشاعرے کا انتظام کیا۔ ڈاکٹر حنیف ترین صدر بزم احباب سخن عرعر نے نظامت کے فرائض بہ حسن و خوبی نبھائے، جبکہ شہر عرعر کی ممتاز شخصیت جناب اشرف علی نے اس محفل کی صدارت کی۔

جناب نعیم احمد قاسمی (نائب صدر) ڈاکٹر خالد رسول (جنرل سکریٹری) جناب غلام نبی شاکر صاحب (سکریٹری) جناب عبدالرزاق صاحب (نائب سکریٹری) جناب خالد پرویز صاحب (آرگنائزر) جناب شمشاد احمد (ٹریژرار) نے اس سے متعلق تمام امور میں سرگرمی سے حصہ لیا۔

کچھ شعراء کے نمونہ کلام درج ذیل ہیں جنھیں سامعین نے بہت سراہا۔

(۱) نعیم احمد قاسمی، چمپارنی

جو ضیا مانگتے ہیں ان کو منور نہ کہو
ہر زبان جاننے والے کو سخنور نہ کہو

ہر سلیقے سے قرینے سے ہیں کچھ اپنے اصول
درو دیوار نہیں جس کے اُسے گھر نہ کہو

(۲) غلام نبی شاکر۔ چکوالی

خوشیاں کسی کی دیکھ کر جلتے ہیں آپ لوگ
کس کو تھا یہ گمان کہ ایسے ہیں آپ لوگ
لفظوں میں احتیاط ہے پیشِ نظر مفاد
جھوٹے ہیں آپ لوگ نہ سچے ہیں آپ لوگ

(۳) عبدالرزاق جھوی۔ اندوری

یہ فتویٰ حاکمِ زر کا ہے دوستو اب تو
بدی کے کارِ جہالت کو بھی ثواب لکھوں
جب ان کے جلوے میرے آس پاس ہوتے ہیں
اُداس لمحے بھی خوشیاں عجب سی ڈھوتے ہیں

(۴) گلزار احمد ریاض، سیالکوٹی

اے دلِ بے قرار چُپ ہو جا
جا چکی ہے بہار چُپ ہو جا
اب نہ آئیں گے روٹھنے والے
دیدۂ اشکبار چُپ ہو جا

(۵) اعجاز احمد جہلمی

زمانے نے ظلم و ستم یوں کیے
کہ ہم زندہ رہ کر نہ زندہ رہے

(۶) محمد بابر لاہوری

گرم ریگوں پہ رحمت برسنے لگی
ایک راعیؐ سے پُرنور مکہ ہوا
تیری جنگ جیلہ بنی بیٹھے وہ
دنیا بانٹی گئی کوئی سانجھا ہوا

(۷) ڈاکٹر حنیف ترین۔

پیٹ کی خاطر پھرے سنسار میں
زندگی یوں کٹ گئی بے کار میں
رات لوری دے رہی ہے چاند کو
چاند الجھا ہے خیالِ یار میں

اردو کی معروف طنز و مزاح نگار شفیقہ فرحت کا نیا پتا

۲۴۔ تاپتی اپارٹمنٹ۔ روشن پورہ
بھوپال۔ ایم۔ پی

افتخار اعظمی کا لندن میں انتقال

نئی دہلی۔ شاعر و نقاد مسٹر افتخار اعظمی کا ۲؍اپریل کو لندن میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ وہ ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھے۔ مسٹر افتخار اعظمی بی بی سی اور ٹی وی سے منسلک تھے ان کا ولایت کا سفرنامہ بہت مقبول ہوا۔
مرحوم کا لکھنؤ سے گہرا تعلق تھا اور جہانگیر آباد پیلس کے ایک حصے میں رہتے تھے مرحوم کا آبائی وطن موضع بینگھاں (جونپور) تھا پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بچیاں ہیں۔

روزنامہ منصف کے چیف اڈیٹر محمود انصاری کا ریاض میں انتقال

وزیر اعظم کا اظہار تعزیت

حیدرآباد — مقامی اردو اخبار "منصف" کے چیف اڈیٹر مسٹر محمود انصاری کا سعودی عرب کی راجدھانی ریاض میں شاہ فیصل اسپتال میں آج علی الصباح انتقال ہو گیا وہ ۵۴ برس کے تھے پسماندگان میں ان کی اہلیہ ہیں۔ مسٹر

انصاری پچھلے چھ برسوں سے کینسر کے عارضہ میں مبتلا تھے اور شاہ فہد کے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ شاہ فیصل اسپتال میں ان کا علاج چل رہا تھا۔ انھوں نے ۱۹۷۷ء میں "منصف" کی شروعات کی تھی۔ اور وہ کل ہند چھوٹے و درمیانی درجہ کے اخبارات کی ایسوسی ایشن کی آندھرا پردیش شاخ کے صدر تھے ان کو آج شام ریاض میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

دریں اثنا وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ نے مسٹر انصاری کے انتقال پر اظہار تعزیت کیا ہے۔ اپنے پیغام میں مسٹر راؤ نے کہا ہے کہ مسٹر انصاری نے اردو صحافت کو فروغ دینے میں خاص طور پر اردو کمپوزنگ، پرنٹنگ اور اسکرپٹ میں ایک نیا رجحان قائم کیا ہے ان کے انتقال سے ملک اردو صحافت ایک جید ہستی سے محروم ہو گیا۔ انھوں نے سوگوار کنبے سے تعزیت کی ہے۔

جناب راجیندر بہادر موج کو صدمۂ جانکاہ

یہ خبر انتہائی غم و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے ممتاز و مشہور شاعر جناب راجیندر بہادر موج کے جواں سال بیٹے کلدیپ سکسینہ ایڈوکیٹ کا ۲۹ مارچ ۹۴ء کو بہت مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ ان کی آخری رسومات ان کے آبائی وطن فتح گڑھ میں ادا کی گئیں۔ مرحوم مختلف سیاسی، سماجی و ادبی حلقوں سے منسلک تھے۔ ان کے انتقال سے سبھی حلقوں میں طویل عرصہ تک خلا محسوس کیا جائے گا۔ ضلع فرخ آباد کی بیشتر تنظیموں کی جانب سے تعزیتی جلسے منعقد کر کے آنجہانی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ مرحوم کے پسماندگان میں ایک بیوہ اور تین بچے ہیں۔ (مسرور حسن سرور)

ماہنامہ "کتاب نما" کے خصوصی شمارے مولانا عبد الوحید صدیقی نمبر کی رسم اجرا

ممتاز صحافیوں، سیاسی رہنماؤں کی شرکت اور رئیس مرزا کی نظامت نے چار چاند لگا دیے

نئی دہلی۔ غالب اکیڈمی آڈیٹوریم میں ماہنامہ "کتاب نما" کے خصوصی شمارہ بعنوان "مولانا عبد الوحید صدیقی، شخصیت اور ادبی خدمات" کی رسم اجرا کرتے ہوئے مرکزی وزیر مملکت برائے امور خارجہ سلمان خورشید نے مولانا عبد الوحید صدیقی کی صحافتی خدمات کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے اس خصوصی شمارے کے مضامین کے چند عنوانات: "ایک شعلہ جو چراغ تھا"، اور "مولانا نے نوک قلم سے نشتر اور روشنائی سے مرہم کا کام لیا"، پڑھے۔ اور مولانا عبد الوحید صدیقی کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ انھوں نے ایک ایسے دور میں حق شناسی کا ثبوت دیا جو ہندستان کے عوام کے لیے نزاکتوں سے بھرا ہوا تھا۔ تقسیم ملک سے پہلے انھوں نے ملک کی تقسیم کی مخالفت کی مگر

جب ملک تقسیم ہوگیا تو انھوں نے اپنے قلم کا پورا زور نئے ہندستان کی تعمیر اور ترقی پر صرف کیا اور کمزور طبقات میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مولانا مرحوم کی یاد میں ایک ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کے سلسلے میں ہر ممکن تعاون دینے کا وعدہ کیا۔

(مرکزی وزیر مملکت برائے امور خارجہ جناب سلمان خورشید کتاب نما کا خصوصی شمارہ اس کے مرتب جناب پروانہ ردولوی کو پیش کر رہے ہیں۔)

سابق وزیر خارجہ جناب اندر کمار گجرال نے بھی اس موقع پر مولانا مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ مولانا عبدالوحید صدیقی نے روزنامہ نئی دنیا کے ذریعہ آزاد اور بے خوف صحافت کی جو رسم قائم کی تھی اسے نئی دنیا اور نئی زمین (ہندی) کے ذریعہ ان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے شاہد صدیقی بڑی جرأت اور ترتیب کے ساتھ آگے بڑھا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ "ہمارا شاہد صدیقی سے بعض معاملات میں اختلاف بھی ہوتا ہے لیکن میں نئی دنیا کا مستقل قاری ہوں اور جب کبھی یہ پرچہ مجھے نہیں ملتا تو میں ٹیلی فون کر کے اسے حاصل کرتا ہوں۔ انھوں نے نئی دنیا کو معیاری صحافت کا نمونہ قرار دیتے ہوئے مولانا عبدالوحید صدیقی مرحوم سے اپنے تعلقات کا بھی ذکر کیا اور تعمیری اپوزیشن کو پروان چڑھانے میں ان کے رول کو سراہا اور کہا کہ تقسیم ہند کے بعد کے نازک دور میں مولانا کے قول و عمل نے مسلمانوں کو بڑا سہارا دیا۔"

ریاست جموں وکشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبد اللہ نے کہا کہ میرے والد شیر کشمیر شیخ محمد عبد اللہ کی نظر بندی کے خلاف جس بے باکی اور جرات کے ساتھ مولانا عبد الوحید صدیقی نے اداریے تبصرے کیے وہ اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ مرکزی حکومت کشمیریوں کے جذبات و احساسات کا احترام کرے گی جو ملی ٹینٹوں اور سیکورٹی فورسیز دونوں ہی کی بندوقوں سے تنگ آ چکے ہیں۔

جناب سبط رضی ایم پی نے بھی اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مرحوم نے تقسیم ملک سے پہلے آزادی کی لڑائی میں اپنے قلم کو استعمال کیا اور بعد میں پیدا ہونے والے مایوسی، تاریکی اور نامرادی کے ماحول میں ان کا قلم روشنی کا مینار ثابت ہوا۔ پروفیسر قمر رئیس نے اپنی تقریر میں کہا کہ آزادی کے بعد اردو صحافت کو نیا رخ دینے والوں میں مولانا عبد الوحید صدیقی سر فہرست ہیں اور ان کی صحافتی اور ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ گلزار حسینیہ اجراڑہ کے مہتمم مولانا عبد اللہ مغیثی صاحب نے کمزور طبقات کے درمیان مفاہمت اور اتحاد پیدا کرنے کے لیے مولانا عبد الوحید صدیقی مرحوم کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں دار العلوم دیوبند کے ایک فعال مجاہد سے تعبیر کیا جب کہ خواجہ حسن ثانی نظامی نے مولانا کے عزم و حوصلہ اور مشکلات کا حوصلہ مند مقابلہ کرنے کی صلاحیتوں پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر مولانا کے ایک پرانے رفیق کار بزرگ صحافی اور اس خصوصی شمارے کے مرتب جناب پروانہ ردولوی نے مولانا مرحوم کی ہمہ جہت شخصیت کے دینی، صحافتی اور سیاسی کرداروں کی خصوصیات اور اردو کی بقا کے لیے ان کی جد و جہد کا بطور خاص تذکرہ کیا۔ انھوں نے کتاب نما کے اڈیٹر شاہد علی خاں کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اپنے رسالہ کا خصوصی شمارہ مولانا مرحوم کی یاد میں بھی شائع کیا۔ اس سے پہلے وہ عابد علی خاں مرحوم کی یاد میں بھی ایک خصوصی شمارہ شائع کر چکے ہیں۔

وزیر اعظم کے سیاسی مشیر جناب جتیندر پرساد ایم پی نے اپنی تقریر میں کہا کہ مولانا مرحوم نے تقسیم وطن کے بعد پریشان حال مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی اور ان میں عزم و حوصلہ پیدا کیا۔ انھوں نے کہا کہ جو لوگ صداقت اور حق کی آواز کو بلند کرتے ہیں وہ کبھی نہیں مرتے اور مولانا عبد الوحید صدیقی بھی ایسے لوگوں میں تھے۔ صدر جلسہ جناب کلدیپ نیر نے بتایا کہ وہ مولانا عبد الوحید صدیقی کی تجویز پر انگریزی صحافت کے میدان میں اترے تھے۔ اگر مولانا انھیں انگریزی صحافت کی جانب مائل نہ کرتے تو وہ اردو ہی کے صحافی بن کر رہ جاتے۔ انھوں نے "نئی دنیا" اور "ہفتہ روزہ نئی زمین" کے چیف اڈیٹر شاہد صدیقی کو مولانا عبد الوحید صدیقی مرحوم کی بے باکی اور بے خوفی کا پیکر قرار دیا اور تعمیری صحافتی قدروں سے ان کی وابستگی کی تعریف کی۔ جناب متین امروہوی اور جناب جمال بھارتی نے مولانا مرحوم کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

جناب شاہد صدیقی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ نئی دنیا ہمیشہ حق کی آواز بلند کرتا رہے گا اور قومی و ملی مسائل میں کبھی بھی مرعوبیت کا شکار نہ ہوگا۔ کتاب نما کے خصوصی شمارہ کی رسم اجرا کی اس تقریب کا اہتمام دہلی رائٹرز فورم نے کیا تھا۔ نظامت کے فرائض رئیس مرزا نے ادا کیے اور مولانا آزاد اور مولانا عبدالوحید صدیقی کے خوبصورت اور معنی خیز جملوں اور موقع محل کے لحاظ سے بہترین اشعار پیش کرکے خوب داد حاصل کی۔

مکتبہ پیام تعلیم کی کم قیمت پر عمدہ کتابیں

سوانح

کتاب	مصنف	قیمت
بچوں کے حسرت موہانی	ڈاکٹر اسلم فرخی	۳/
بچوں کے غلام السیدین	ذکیہ ظہیر	۵/
قصہ میر امن دلی والے کا	ڈاکٹر اسلم فرخی	۲/
بچوں کے ڈاکٹر سید عابد حسین	صغرا مہدی	۳/
〃 مولوی عبدالحق	ڈاکٹر خلیق انجم	۲/۵۰
〃 مرزا غالب	ڈاکٹر اسلم فرخی	۳/
〃 محمد حسین آزاد	〃	۳/
〃 ڈپٹی نذیر احمد	〃	۳/
〃 رنگا رنگ خسرو	〃	۳/
〃 سلطان جی	〃	۲/۵۰
مولانا شبلی نعمانی	〃	۲/۵۰
بچوں کے صالحہ عابد حسین	ڈاکٹر صغرا مہدی	۲/
مولانا اسماعیل میرٹھی	حکیم نعیم الدین زبیری	۴/
ہمارے عظیم سائنس داں	حکیم محمد سعید	۸/
چند مشہور طبیب اور سائنس داں	ادارہ	۹/
مولانا آزاد کی کہانی	ظفر احمد نظامی	۱۲/
بچوں کے ذاکر صاحب	مرتبہ عبدالقوی [illegible]	۴/
اندرا گاندھی کی کہانی	شمیم حنفی	۴/
بچوں کے چار بزرگ دوست	صالحہ عابد حسین	۳/۵۰
امیر خسرو	(ادارہ)	۳/۵۰
[illegible]	[illegible]	[illegible]
جوہر قابل	مسعود احمد برکاتی	۳/
شفیع الدین نیر	اطہر پرویز	۴/۵۰
گاندھی باپو کی کہانی	بیگم قدسیہ زیدی	۳/
گاندھی جی جنوبی افریقہ میں	یوسف ناظم	۳/
میر انیس	محمد حسین حسان	۲/

سائنس، طب اور عام معلومات

کتاب	مصنف	قیمت
چیزوں کی کہانی	آصف فرخی	
یہ کیسا بخار ہے	(ادارہ)	۲/۵۰
آپ کا جسم	علی ناصر زیدی	۴/
گندا پانی	ادارہ	۲/۵۰
کیوں اور کیسے	محمد ابراہیم شاہ	۴/
سائنس کی دنیا	فریدالدین احمد	۸/
کمپیوٹر کیا ہے	حکیم نعیم الدین زبیری	۸/
ذرّے کی	مہدی جعفر	۴/
عجائب گھر	قاسم صدیقی	۳/
علاج میرا دشمن	〃	۹/
پرواز کی کہانی	علی ناصر زیدی	۴/
غذا کی کہانی	〃	۳/
رنگوں کی بستی	سہیل انور	۸/

بچوں کے لیے مذہبی کتابیں

حضرت یحییٰ علیہ السلام) منورہ نوری خلیق ۳/-
حضرت آدم علیہ السلام ـ منورہ نوری خلیق ۴/-
رسالہ دینیات اول محمد نعیم الدین زبیری ۳/
رسالہ دینیات دوم " " ۴/
رسالہ دینیات سوم " " ۵/
رسالہ دینیات چہارم " " ۵/
رسالہ دینیات پنجم " " ۶/
بزرگانِ دین محمود علی خاں جامعی ۴/
امت کی مائیں حسین حسنی ۴/۵۰
اچھی باتیں سعد الدین انصاری ۴/۵۰
خوب سیرت اول حکیم محمد سعید ۶/
خوب سیرت دوم " ۴/۵۰
سلطان جیؒ اسلم فرخی ۴/
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں فضل قدیر ندوی ۴/۵۰
رحمان کا جہان رفیع الزماں زبیری ۶/
کمسن صحابی " ۵/
اسلام کے جاں نثار " ۴/
سیرت پاک مختصر مختصر احمد خاں خلیل ۳/
نور کے پھول حکیم محمد سعید ۹/
سب سے بڑے انسان۔ رسول اللہؐ " ۴/۵۰
حضرت حمزہ رضہ احتشام علی رحیم آبادی ۳/
حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضہ " ۳/
حضرت ابوہریرہ رضہ " ۴/
حضرت محبوب الٰہیؒ مشیر الحق ۳/
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ " ۲/
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ " ۳/
حضرت معین الدین چشتیؒ " ۳/
حضرت ابوبکر صدیق رضہ " ۶/
حضرت طلحہ رضہ " ۳/
حضرت سلمان فارسی رضہ " ۲/۵۰
حضرت ابوذر غفاری رضہ " ۳/
[illegible] " ۲/

حضرت عبداللہ بن عباسؓ مشیر الحق ۳/
نیک بیٹیاں " ۲/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ حصہ اول عبدالواحد سندھی ۷/۵۰
" حصہ دوم " ۶/
قرآن پاک کیا ہے؟ " ۴/
اسلام کیسے شروع ہوا؟ " ۷/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار اول، دوم " فی حصہ ۶/=
اسلام کے مشہور امیر البحر " ۹/
رسول پاکؐ " ۶/
دس جنتی الیاس احمد مجیبی ۵/۵۰
سرکار کا دربار " ۶/۵۰
چار یار " ۷/۵۰
آں حضرتؐ (اردو) " ۲/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی) " -/۴۰
اللہ کا گھر خلیل احمد جامعی ۴/۵۰
اللہ کے خلیل " ۳/۵۰
رسول پاک کے اخلاق " ۴/
اللہ کے صفی " ۲/۵۰
ہمارا دین حصہ اول سید شہاب الدین دسنوی ۸/۵۰
" دوم " ۷/۵۰
" سوم " ۸/۵۰
منہاج القرآن خدیجہ سیدنا طاہر سیف الدین ۴/۵۰
ارکان اسلام مولانا اسلم جیراجپوری ۳/۵۰
عقائد اسلام " ۲/۵۰
خلفائے اربعہ خواجہ عبدالحیٔ فاروقی ۹/
نبیوں کے قصے " ۶/۵۰
ہمارے رسولؐ " ۶/
پیارے رسولؐ سلطانہ آصف فیضی ۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاء ادارہ ۲/
مسلمان بیبیاں اعجاز الحق قدوسی ۶/
ہمارے نبیؐ سید نواب علی رضوی ۳/۵۰
سرکار دو عالم محمد حسین حسان ۹/
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد) ۔ (کلاں) ۴/۵۰

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانبدارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

جون ۱۹۹۴ء جلد ۳۴ شمارہ ۶

فی پرچہ	6/=
سالانہ	55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	320/=

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 630191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ. اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ. پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ. یونی ورسٹی مارکیٹ. علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین دیباچات 'نقد و تبصرہ' کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں/غزلیں

مانگے کا اجالا

خود نوشت

طنز و مزاح

جائزے اور ادبی، تہذیبی خبریں

۲

نئی مطبوعات

خواجہ حسن نظامی شخصیت اور ادبی خدمات۔ کتاب نما نمبر
نثار احمد فاروقی / ریحان احمد عباسی ۴۵/-
قصہ حاتم طائی (معیاری ادب) سید حیدر بخش حیدری ۴۵/-
کشمیر کے فارسی ادب کی تاریخ ۱۳۵۲ء تا ۱۸۱۹ء تک
(قصے، فارسی ادب) م م مسعودی ۲۵۰/-
ریچن سے رنجیت تک (تاریخ کشمیر) م م مسعودی ۱۴۰/-
میلان (مجموعہ غزلیات) انور ندیم ۸۰/-
باسی ہونٹ (افسانے) اوم کرشن راحت ۴۵/-
کنٹر ادب (مجلہ) خلیل مامون۔ عزیز اللہ بیگ ۸۰/-
دل کی آواز (گلدستہ اشعار) مرتب ڈاکٹر سید صادق علی ٹونکی
۲۰/-
گستاخ رسولؐ کی سزا (سیرت) مولانا رعایت اللہ فاروقی ۲۵/-
کاخ غریباں (بچوں کا ادب) سید ساجد علی ٹونکی ۲۰/-
جہاں دیدہ (سفرنامہ) محمد تقی عثمانی ۱۱۰/-
روح کی بیماریاں اور ان کا علاج۔ حکیم محمد اختر ۸۰/-
یوکیشنل ہندی اردو لغت (ڈکشنری)
راجہ راجیشور راؤ اصغر
۹۰/-
یوکیشنل ہندی انگریزی اردو لغت (ڈکشنری)
ایم عرفان صدیقی
۹۰/-
یوکیشنل اسٹینڈرڈ انگلش سے انگلش (اردو ڈکشنری)
۲۰۰/-
تاریخ خاندیش کے بکھرے اوراق (تاریخ)
ڈاکٹر اکبر رحانی
۵۰/-
ہندوستانی وفاق تبدیلی کا ایک نقشہ (سیاست)
پروفیسر رشید الدین خاں
۶۰/-
اسباب زوالِ امت (مذہب) شکیب ارسلان ۱۵/-

سرورق ــــ عشرت علی صدیقی

مہمان مدیر
عشرت علی صدیقی
۱۴۳- زنجور خانہ، کینٹ روڈ، لکھنؤ

اشاریہ

اردو اور احتساب

پچھلے چند دنوں میں اردو کی ترویج، ترقی اور بقا کے لیے دلوں کو خوش کرنے والے اور امید بندھانے والے بعض اعلانات سامنے آتے ہیں۔ نئی دہلی میں فروغ انسانی وسائل کے وزیر ارجن سنگھ نے کہا ہے کہ ترقی اردو بورڈ کو عنقریب ایک خود مختار ادارہ بنا دیا جائے گا۔ اتر پردیش کے وزیر اعلا ملائم سنگھ یادو نے اردو کو روٹی روزی سے جوڑنے کی ترکیبیں تجویز کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنادی ہے اور اس کمیٹی کے پہلے ہی جلسے میں کہا ہے کہ جس پرائمری اسکول میں اردو کے پانچ طالب علم بھی ہوں گے وہاں ایک اردو ٹیچر کا تقرر کر دیا جائے گا اور ریاست میں شانتی سرکشا بل کے نام سے جو نیا پولیس دستہ بنایا جارہا ہے۔ اس کی بھرتی میں ایسے افراد کو ترجیح دی جائے گی جو ہندی کے علاوہ ایک اور ہندستانی زبان بھی جانتے ہیں۔ اس دوسری ہندستانی زبان کی جگہ اردو کو لانے کے لیے اتر پردیش کی حکومت نے سہ لسانی فارمولا میں یہ ترمیم کر دی ہے کہ سکنڈری سطح پر طلبہ ہندی کے ساتھ اردو پڑھ سکیں گے اور انگریزی تیسری یعنی ماڈرن یورپی زبان کی حیثیت سے پڑھیں گے۔ یہ فارمولا جب شروع میں نافذ کیا گیا تھا تو یوپی کے زیادہ تر اسکولوں میں دوسری ہندستانی زبان کی حیثیت سے سنسکرت پڑھائی جانے لگی تھی۔ اردو کو چونکہ آزادی کے فوراً بعد دیش نکالا یا پردیش نکالا دے دیا گیا تھا اس لیے اس کی پڑھائی پرائمری اور سکنڈری سطح کے سرکاری اسکولوں میں بالکل بند نہیں تو بہت کم ہوگئی تھی۔ اس لیے زبان کی حیثیت سے اردو پڑھانے کا کوئی معقول بندوبست نہیں تھا جبکہ سنسکرت پڑھانے والے موجود تھے۔ یہ زبان ہندی کے ساتھ بھی پڑھائی جاتی تھی اور اگرچہ اس کی حیثیت دراصل ایک کلاسیکی زبان کی ہے مگر اتر پردیش میں اسے جدید ماڈرن ہندستانی زبان کے زمرے میں شامل کر لیا گیا تھا اس دھاندلی پر اردو والوں کے علاوہ اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے بھی اعتراض کیا مگر تعلیم چونکہ آئین کے تحت ریاستوں کے دائرہ اختیار میں آتی ہے اور چونکہ اس مسئلے پر ریاستی حکومت کو برطرف نہیں کیا جا سکتا تھا، اس کے علاوہ چونکہ ملک میں تقسیم کے جنون کے بعد جوابی جنون پیدا ہوگیا تھا اس لیے نہرو کی بات پر بھی دھیان نہیں دیا گیا۔

کچھ عرصے کے بعد جنون گھٹ گیا اور اردو کے لیے ماحول پہلے کا اتنا ناسازگار نہیں رہا۔ اس اثنا میں انجمن ترقی اردو نے اتر پردیش میں دستخطی تحریک چلائی اور بیس لاکھ افراد کے دستخطوں سے

صدر جمہوریہ کی خدمت میں میمورنڈم پیش کیا۔ بہار اور دوسری ریاستوں میں بھی اردو کی تعلیم و ترویج کے لیے مہمیں چلیں اور اردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائے جانے کے علاوہ ذریعہ تعلیم بنائے جانے کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ اس معاملے میں بہار، اتر پردیش سے آگے نکل گیا۔ وہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت نہ صرف اصولاً بلکہ قانوناً اور عملاً بھی مل گئی۔ اتر پردیش میں اردو کو یہ حیثیت دینے کا قانون بہت دیر میں بنایا گیا اور وہاں کانگریسی حکومت مجلس قانون ساز سے قانون منظور کرانے کے تھوڑے ہی دنوں بعد بدل گئی۔ دوسری پارٹیوں کی حکومتوں نے اس قانون کو منسوخ تو نہیں کیا مگر اسے نافذ بھی نہیں کیا۔ سرکاری دفتروں میں اردو زبان اور رسم خط کی درخواستیں دینے کی اجازت بحال رہی لیکن عملی طور پر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اس لیے کہ جن دفتروں میں یہ درخواستیں دی جاتی تھیں وہاں اردو جاننے والے شاذ و نادر ہی ملتے تھے اور اکثر اردو میں لکھی ہوئی درخواستوں کے ساتھ ان کے ہندی ترجمے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ اہل معاملہ اپنی اغراض کے تحت درخواستیں ہندی میں دیتے رہے۔ یہ حالت آج بھی برقرار ہے اور اردو کی حق تلفی جاری ہے۔

جہاں تک اردو کی تعلیم کا تعلق ہے پنڈت کملا پتی ترپاٹھی نے اتر پردیش کے وزیر اعلا کی حیثیت سے کہا تھا کہ اردو کے ساتھ پچھلے برسوں میں جو بے اعتنائی برتی گئی ہے اس کی تلافی کے لیے اردو کی تعلیم کے سلسلے میں اسکول میں چالیس اور کلاس میں دس طلبہ کے معلنہ (مروجہ نہیں!) فارمولے پر عمل درآمد کے بجائے ہر اسکول میں اردو ٹیچر کا بندوبست کیا جانا چاہیے۔ اردو ٹیچر تو کئی ہزار مقرر کر دیے گئے مگر اردو تعلیم کے سلسلے میں نہ تو دس اور چالیس کے فارمولا پر پوری طرح سے عمل کیا گیا اور نہ وزیر اعلا ترپاٹھی کے اعلان پر۔ اردو والے برابر شکایت کرتے رہتے ہیں کہ اردو ٹیچروں کی خالی ہو جانے والی اسامیاں لمبے عرصے تک خالی پڑی رہتی ہیں، اردو کتابیں بہت تاخیر سے بازار میں آتی ہیں، اردو ٹیچروں سے دوسرے مضامین پڑھوائے جاتے ہیں اور ریاست کے محکمۂ تعلیم کے جن افسروں کو اردو تعلیم کی نگرانی کرنے اور سرکاری احکام کی پابندی کرانے کے لیے رکھا جاتا ہے خود ان کے لیے اردو جاننا ضروری نہیں ہے۔ اس لیے نہ تو احکام کی پابندی ہو پاتی ہے اور نہ پابندی کی نگرانی۔ بہ ظاہر افسر اور اہل کار اس ڈھیل کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ حکومت اردو کے معاملے میں پوری طرح سنجیدہ نہیں ہے۔ یہ احساس ٹیچروں میں بھی پایا جاتا ہے اور حکومت کی بے اعتنائی سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں بے پروائی کرتے ہیں۔ کبھی اسکول کی کل وقتی ملازمت کو جز وقتی ملازمت بنا لیا جاتا ہے اور ٹیچر اس ملازمت کے ساتھ دوسرا روزگار بھی کرنے لگتے ہیں۔ یہ بد اطواری پرائمری سطح سے اعلا ترین سطح تک پائی جاتی ہیں۔ یونی ورسٹی ٹیچر پوری پابندی سے کلاس نہیں لیتے اور پڑھانے سے زیادہ وقت مشاعرے اور سیمینار وغیرہ کرنے کرانے پر صرف کرتے ہیں۔

اردو کی روٹی کھاتے، مگر اس کا حق ادا نہ کرنے والوں میں ٹیچروں کے علاوہ بہت سے دوسرے افراد اور ادارے بھی شامل ہیں۔ یہ ادارے اور افراد اردو کی ترویج و ترقی کے نام پر مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے مالی امداد اور اردو کے ٹھیکیدار بن کر سیاست اور سماج

میں اثر و رسوخ حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی بدولت اردو کا نام تو ستائی دیتا رہتا ہے مگر اردو کا کام بہت کم ہوتا ہے۔ سرکاریں مبالغہ آمیز منصوبے اور فرضی حسابات داخل کر دیے جاتے ہیں اور جلسوں میں کارکردگی سے متعلق فرضی اعداد و شمار پیش کر دیے جاتے ہیں۔ منفعت کے لیے کبھی خوشامد سے کام لیا جاتا ہے اور کبھی دھونس دھمکی سے۔ یہ طریقے ہر جماعت اور ہر حکومت کے ساتھ اختیار کیے جاتے ہیں اور ہمیشہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کامیابی کا پھل اردو کو نہیں بلکہ اردو کا نام لینے اور استعمال کرنے والے چند افراد کو ملتا ہے۔

اردو والوں کی دنیا میں خلوص اور ایثار کے کچھ بہت ہی اعلا و ارفع نمونے بھی دکھائی دیتے ہیں اور اردو کے نام پر حکومتیں جو کچھ کہتی اور کرتی ہیں اس میں بھی بعض اوقات نیک نیتی اور انصاف پسندی بھی کارفرما رہتی ہے لیکن "مالِ مفت دلِ بے رحم" کی مثالیں بھی ملتی ہیں اور نقد و جنس کی شکل میں دی جانے والی امداد میں ایک پہلو سیاست کاری اور منہ بھرائی کا بھی ہوتا ہے۔ سونے چاندی کے ٹکڑے کھلا کر اکثر اوقات ممکنہ معترضین کا منہ بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہر حکومت یہ کوشش کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی حد تک کرتی رہی ہے۔ اسی لیے کوئی حکومت اس بات کی فکر نہیں کرتی کہ آیا اس کی دی ہوئی امداد صحیح ڈھنگ سے اور اصل مقصد کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ حکومتوں کی طرف سے اردو انجمنوں کو جو امداد دی جاتی ہے اس کے علاوہ اکادمیوں اور مختلف ناموں سے قائم ہونے والی کمیٹیوں کا پورا خرچ سرکاری خزانے سے آتا ہے۔ اس خرچ میں سے اردو کے طالب علموں کو وظیفے، اردو شاعروں اور مصنفوں کو گذر بسر اور دوا علاج اور کتابوں کی اشاعت کے لیے امداد اور ان کی کارکردگی پر انعام اور اعزاز دیا جاتا ہے۔ خرچ کی یہ مدیں مناسب اور ضروری ہیں۔ اس خرچ کے محرکات میں اردو دوستی کے علاوہ انسانیت دوستی بھی شامل ہیں لیکن سوچنے اور جانچنے کی بات یہ ہے کہ محض اردو کی ترویج و ترقی کے نام پر جو امداد دی جاتی ہے اس سے اردو کی جڑوں میں بھی مضبوطی آتی ہے یا اس امداد کا اثر اور فائدہ شاخوں اور پتوں ہی تک محدود رہ جاتا ہے۔

ابھی تک یہ اثر اور فائدہ وہیں تک محدود ہے۔ چنانچہ اردو پر حکومتوں کی طرف سے خرچ کی جانے والی رقم میں اضافے کے باوجود اردو جاننے اور اردو پڑھنے والوں اور اردو میں خط کتابت کرنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ اتر پردیش میں ابھی تک اردو کی تعلیم کو زندہ رکھنے کا سہرا بڑی حد تک ان مکتبوں کے سر ہے جو زیادہ تر دینی تعلیمی کونسل یا دوسرے بڑا لوٹے یا رضاکارانہ اداروں کی طرف سے چلائے جا رہے ہیں اور سرکاری امداد یا تو بالکل نہیں یا محض برائے نام پاتے ہیں لیکن ان اداروں میں صرف ایک ہی فرقے کے بچے جاتے ہیں اور وسائل کم ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ کام نہیں کر پاتے۔ سماجی اور مالی اعتبار سے اونچے طبقوں کے بچے ان اسکولوں میں نہیں جاتے اور دوسرے طبقوں کے لوگ سوچتے ہیں کہ بچوں کو اردو پڑھانے سے انھیں یا ان کے والدین کو اتنا معاشی فائدہ نہیں ہوگا جتنا کہ دوسرے مضامین پڑھانے سے ہوگا اب اردو کو روٹی روزی سے جوڑنے کے لیے اتر پردیش کی حکومت جو قدم اٹھا رہی ہے وہ ابھی

بالکل ابتدائی قسم کا ہے اور اس کا فائدہ صرف وہ طبقے اٹھا سکیں گے جن کے افراد شانتی سر کھشا بل میں بھرتی ہونا چاہیں گے جبکہ اردو والوں کا مطالبہ اور انصاف کا تقاضا ہے کہ اردو کی تعلیم اونچی سے اونچی سطح تک دی جائے اور یہ تعلیم حاصل کرنے والے اعلا سے اعلا عہدوں تک پہنچ سکیں۔

حکومت کی نیت چاہے جتنی صاف اور اس کا ارادہ چاہے جتنا نیک اور اس کی پالیسی چاہے جتنی اچھی ہو مگر اس کے احکام پر عمل درآمد کا انحصار افسروں اور اہل کاروں کی نیّت فرض شناسی اور دیانتداری پر ہوتا ہے۔ ان لوگوں میں یہ احساس پیدا کرنا ضروری ہے کہ حکومت اردو کو اس کا پورا حق دینا چاہتی ہے اور اس معاملے میں افسروں اور اہل کاروں کی کوتاہی اور شرارت برداشت نہیں کرے گی۔ اس کوتاہی اور شرارت کی نشان دہی اور روک تھام کے لیے اردو والوں کو بھی چوکنا رہنا ہوگا اور سرکاری عملے کی کارکردگی پر نگاہ رکھنے کے علاوہ اس بات پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی کہ پرائمری سے یونی ورسٹی سطح تک کہ اردو ٹیچر جو اردو کی روٹی کھاتے ہیں حق نمک کس حد تک ادا کرتے ہیں اور جو افراد اور ادارے اردو کے نام پر سرکار سے مدد لیتے ہیں۔ ان کا کام کتنا اصلی ہوتا ہے اور کتنا فرضی۔ امدادی رقوم کے آمد و خرچ کا آڈٹ جتنا ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ ضروری کام کا آڈٹ ہے۔ حکومت کی مشینری اتنی سست رفتار بلکہ کج رفتار ہے کہ وہ دوسری طرح کا آڈٹ ٹھیک سے نہیں کر سکتی۔ یہ ذمّہ داری خود اردو والوں کو لینی ہوگی اور حکومت کے علاوہ اردو ٹیچروں اور اردو اداروں کا بھی احتساب کرنا ہوگا۔ اس احتساب میں جتنی دیر لگے گی اور جتنی لاپروائی ہوگی اردو کی جڑیں اتنی ہی کمزور ہو جائیں گی اور اس پیڑ کے پتّے جلد یا دیر جھڑ جائیں گے شاخیں سوکھ جائیں گی اور اردو ایک کلاسیکی زبان بن کر رہ جائے گی۔ اردو کو اس نوبت سے بچانے کی ذمہ داری محض حکومت پر نہیں بلکہ اردو والوں اور ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے اس نشان سے محبّت رکھنے والے سبھی لوگوں پر ہے۔

احمد ندیم قاسمی

غزلیں

دستک یہ کمال کر گئی تھی
اک پل میں صدی گزر گئی تھی

پھر نور کا اک دفور سا تھا
اُس تک تو مری نظر گئی تھی

کس دل سے اُسے وداع کرتا
آنکھوں میں تو ریت بھر گئی تھی

میں بڑھ نہ سکا اُفق سے آگے
ہاں، گردِ سفر مگر گئی تھی

دن کی بھی پکار پر نہ نکلی
وہ رات جو میرے گھر گئی تھی

سینے پہ پہاڑ بن کے اُتری
فریاد، جو بے اثر گئی تھی!

ہوا نے گھر کا دروازہ بجایا
میں حیراں تھا، مرے ہاں کون آیا

مجھے اپنا بنایا صرف اُس نے
جو تھا دنیا کی نظروں میں پرایا

جب اپنا عشق پہنچا انتہا تک
تو ہر انساں کو سینے سے لگایا

میں سرگرداں ہوں اپنی جستجو میں
مجھے کوئی اشارہ دے، خدایا!

سدا سے روشنی منزل ہے میری
سدا پیچھے رہا ہے میرا سایا

ندیم اِس عہد کا یہ المیہ ہے
موحّد نے خدا کو بُت بنایا

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

انداز گفتگو کیا ہے۔	(تنقیدی مضامین)	شمس الرحمٰن فاروقی	۷۵/-
اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن)	اقبال (شعری مجموعہ)	مرتبہ شائستہ خان	۷۵/
عربی اور بابلی تہذیب و تمدن	(تاریخ)	مالک رام	۷۵/
جامِ جہاں نما۔ اردو صحافت کی ابتدا	(اردو صحافت)	گربچن چندن	۷۵/
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	(علمی)	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/
اردو ناول میں عورت کا تصور	(تحقیق)	فہمیدہ کبیر	۴۵/
نوٹوں کی تلاش	(ناول)	ایاز سیوہاروی	۶۰/
تاثر نہ کہ تنقید	(تنقید)	صدیق الرحمٰن قدوائی	۵۱/
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	(اطلاعی)	ترجمہ نذیر الدین مینائی	۲۵/
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے	(انٹرویوز)	طاہر مسعود	۶۶/
مرضیات	(طب)	حکیم نعیم الدین زبیری	۵۱/
بانگ درا	(شعری مجموعہ، طلبہ اڈیشن)	اقبال	۹/
بالِ جبریل	(شعری مجموعہ) 〃	〃	۶/
ضربِ کلیم مع ارمغان حجاز (اردو نظمیں)	(شعری مجموعہ) 〃	〃	۶/
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۴۸/
گوشے میں قفس کے	(طنزیہ مزاحیہ)	دلیپ سنگھ	۴۵/
سحر کے پہلے اور بعد	(جگ بیتی)	سعید الظفر چغتائی	۵۱/
افکارِ اقبال	(اقبالیات)	محمد عبدالسلام خاں	۱۲۵/
فرمان فتح پوری	(شخصیت اور ادبی خدمات)	مرتبہ خلیق انجم	۳۵/
تذکرہ ماہ وسال	(تذکرہ)	مالک رام	۱۲۵/
تحقیق نامہ	(تحقیق)	مشفق خواجہ	۱۲۵/
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	(مذہب)	حکیم محمود احمد برکاتی	۴۵/
خواب اور خلش	(شعری مجموعہ)	آل احمد سرور	۶۶/
سفر	(ناول)	رابعہ تبسم	۲۷/
تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز	۵۱/
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/
پت جھڑ کی آواز (نیا اڈیشن)	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی	۱۵۰/
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۷/
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/
نہار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۴۵/

ڈاکٹر محمد علی صدیقی
معرفت ماہنامہ افکار
۱۰۵/سی نیشنل آٹو پلازہ مارسٹن روڈ کراچی

ادب، مقصدیت اور لایعنیت

میرا خیال ہے کہ جدید اردو تنقید میں ساختیاتی، ساخت شکن اور مابعد ساختیاتی مکاتبِ تنقید کے بارے میں گزشتہ پانچ سال سے ایک مخصوص افتادِ طبع کے ادیبوں و نقادوں کے مابین جس جوش و ولولے سے گرماگرم بحث جاری ہے اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے علمی حلقوں میں مغربی ــــ اور خالصتاً مغربی ــ افکار کے لیے واضح طور پر ایک نرم گوشہ پایا جاتا ہے۔ بعض حضرات کے خیال میں یہ ساری رستہ خیز ایک افسوس ناک صورت حال کی غمازی کرتی ہے کہ ہمارے ادب کے بعض ذہین افراد، پورے خلوص کے ساتھ، اپنے ادبی منظر نامے سے قطع تعلق کرکے مغربی حلقہ علمی کے ایک "مردہ" موضوع کو اپنے ادب کے عصری سیاق و سباق کے بغیر زندہ رکھنے کے لیے اس شدت سے حصہ لینے کے متحمل ہو سکتے ہیں کہ کبھی کبھی یہ گمان گزرتا ہے کہ کیا اس پوری بحث میں ہمارے ادب کے ماضی یا حال کی تفہیم کی کوئی قابلِ تقلید کاوش سامنے آسکی ہے یا محض آموختہ ہی کو حاصلِ فکر سمجھنے کی تن آسانی برتی گئی۔

ہمارے ایک صف اوّل کے نقاد نے ساختیات کی بحث و تمحیص کے آغاز کے لیے لسانی تشکیلات کی تحریک کو یاد کیا ہے جو ساٹھ کے عشرے میں چلی بڑھی تھی اور پھر دس پندرہ سال کے عرصے میں تاریخ کا حصہ بن گئی تھی۔ لسانی تشکیلات کے موضوع پر راقم الحروف نے حزبِ اختلاف کا کردار ادا کیا تھا اور محض بحث برائے بحث کے انداز میں نہیں بلکہ اس دعوے کے ساتھ کہ اگر شاعری یا ادب کا "پیرہن" "زبان" ہے تو پھر ادبی شہ پاروں کی تخیلاتی زبان کمپیوٹر سائنس کی زبان کی طرح خالص ریاضیاتی نہیں ہو سکتی۔ جب ہم کسی شاعر کی زبان پر حشو و زوائد کا الزام لگاتے ہیں تو ہمارے الزام کا مطلب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ شعری زبان اپنی تمام تر تخیلی جادوگری کے باوجود کفایتِ لفظی کے حسن سے عاری نہ ہو۔ جوش ملیح آبادی کے بارے میں یہ کہا جاتا رہا ہے کہ زبان ان کے سامنے لونڈی کی طرح ہاتھ باندھے ملتی ہے اور فیض کے بارے میں، جوش کے برخلاف، یہ رائے قائم کی گئی کہ وہ کفایتِ لفظی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ یوں تو جوش اور فیض روایتی شعری زبان سے یکساں طور پر استفادہ کرتے

نظر آتے ہیں لیکن اوّل الذکر زبان کے معاملے میں "فیاض" اور آخر الذکر "محتاط" قرار پائے لیکن جوش اور فیض کے بعد اختر الایمان کی شعری زبان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اختر الایمان نے "محتاط" فیض کی شعری زبان سے ہٹ کر شعری زبان اختیار کی جو فیض احمد فیض کی زبان کے مقابلے میں "محتاط تر" نظر آئی۔ لیکن لسانی تشکیلات کے بعض شعرا نے اختر الایمان تک کی شعری زبان میں بھی حشو و زوائد ڈھونڈ لیے اور اس مکتب زبان کے واللہ اعلم مجید امجد اور منیر نیازی کی شعری زبان کو لسانی تشکیلات کی زبان سازی کے نسخے کے قریب تر کیوں سمجھ لیا۔ میرا خیال ہے کہ لسانی تشکیلات کے لسانی فلسفے سے قریب تر زبان صرف افتخار جالب ہی نے تحریر کی۔ افسوس یہ ہے کہ ان کی شعری زبان میں بھی حشو و زائد نظر آتے ہیں۔ لسانی تشکیلات کے وکلا نے بہر طور ایک مثالی ــــ یعنی ریاضیاتی ــــ زبان لکھنے کی کوشش تو بہت کی لیکن وہ لسانی تشکیلات کے فلسفے پر پوری اترنے والی زبان تخلیق نہ کر سکے اور بالآخر اس تحریک کی تان "نثری نظم" پر ٹوٹی جسے حد سے حد "جدید تر" شعری اظہار کی کاوش قرار دیا جا سکتا ہے، روایتی زبان سے ــــ صرف نحو اور صوتیات کی حد تک ــــ برات کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ شاید اسی لیے نئی نظم کی تحریک میراجی اور راشد کی شعری زبان سے قدرے مختلف شعری زبان کی تحریک بن کر رہ گئی۔ جسے حد سے حد مقامی (INDEGENOUS) حسیت کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔ نئی نظم کے وکلاء اپنے سماج کے بارے میں واضح سوچ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی دانست میں ایک ایسے سماج کو جس کی بنیاد ہی "ٹیڑھی" تھی سیدھا کرنا چاہا اور اس طرح انھوں نے ؎

بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

کے مصداق ترقی پسندانہ فکر سے اغماض برتتے ہوئے بھی وہ میراجی کی باطن پرستی اور ہیئت پرستی کے مقابلے میں اپنے سماج کے "نقاد" ثابت ہوئے۔ ان کی سماجی تنقید، تقلید محض کے خلاف تھی اور پھر ہم نے دیکھا کہ ستر کی دہائی کے وسط سے اسی کی دہائی کے وسط تک ترقی پسند اور جدید ادبا کی اصطلاحوں میں کوئی خاص فرق نہیں رہ پایا تھا سوائے اس کے کہ بعض جدید ادبا خود کو عادتاً ترقی پسند مصنفین کی فہرست میں تلاش کیا کرتے تھے اور بعض ترقی پسند ادبا ترقی پسندوں کی فہرست میں۔

گزشتہ پانچ چھے سال کی یک طرفہ "مناظرہ بازی" سے ایک بات بڑی حد تک درست ثابت ہوتی نظر آرہی ہے کہ جب بعض ادیبوں کے لیے ادب اور اعلا آدرش ایک دوسرے کے نقیض ٹھہرنے لگیں۔ تاریخی شعور کے حامل ادبا کو غیر ادیب قرار دینے کی خواہش یک بیک بیدار ہونے لگے اور اس صدی کے تیسرے عشرے کی نظریاتی کج بحثی کا کوئی معقول جواز موجود نہ ہو تو پھر "متن کے ساختیاتی مطالعے" اور ادبی شہ پاروں کے حقیقی متن کی دریافت نو کے ایک ایسے مشن پر گامزن ہونے کے

لیے پَر تو لے جائیں جس سے ہمارے یہاں کے روایتی، ترقی پسند اور جدید ادیب یکساں طور پر سراسیمہ ہو جائیں۔ فرانس اور امریکی جامعات میں ساختیاتی مطالعہ ایک ایسے سیکولر کلچر کے فریم ورک میں چنداں اہمیت نہیں رکھتا جہاں ایک نکتے کی ہزار تاویلات کے لیے مناسب ذہنی آمادگی کسی اچنبھے کی بات نہیں ہے لیکن ہمارے یہاں یہ تصوّر ہی مضحکہ خیز شمار ہوگا کہ علامہ اقبال کی "مسجد قرطبہ" متداول متن کے بجائے کوئی اور متن دریافت کیا جائے جو اقبال کے متن سے یکسر مختلف ہو۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر متن کے بطلان (UNDAMINE) کرنے کا مطلب اصل متن کی دریافت تو بھی قرار دیا جائے تب بھی ہمارے معاشرے میں ایک متن کی تاویل و تفسیر کی گنجایش کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ متن بذاتِ خود اضافی ہے ایک وہ متن جو آپ کے لیے متن ہے اور ایک وہ متن جو میرے لیے متن ہے ہمارے یہاں کے روایتی معاشرے میں "حدث" بھی "قائم" کی ضد ہے اور بنا بریں "بدعت اور گمراہی" ہے۔

اسی لیے ہمیں زبان اور متن کے بارے میں جدّت طرازی کے میدان میں چوگان کھیلتے ہوئے خیال رکھنا چاہیے کہ جو مکتبِ فکر "بدعت اور گمراہی" کے لیے سازگار معاشرے میں بھی قصّہ پارینہ ثابت ہو چکا وہ اقدار، تاریخ اور نظریے کو عزیز رکھنے والے معاشرے میں کیونکر قبول کیا جا سکتا ہے۔ میں ساختیاتی اور ساخت شکن مکاتبِ فکر کے وکلا سے درخواست کروں گا کہ وہ کلاڈ لیوی اسٹراس سے پہلے ابن منظور کی تالیف "لسان العرب" (قاہرہ) کا مطالعہ ضرور کریں اور حدث، حدیث اور حادث کے فرق پر غور کرنے کی تکلیف گوارا کریں۔

کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ "روایتی" "نظریاتی" اور "جدید" نقطہائے نظر میں سے کوئی ایک مکتبِ خیال بھی تاویل کی آزادی کو متن کے ساتھ مادر پدر آزاد رویّے کو اس بنا پر جائز نہیں ٹھہراتا کہ اس طرح انسانی دانش کے ارتقا کی کہانی ناقابلِ بیان کی حد تک الجھ جائے گی اور ہمارے ہاتھ اندھیروں کے علاوہ کچھ نہ آئے گا۔

بہتر یہی ہوتا کہ متن کے اندر سے بزعم خود صحیح متن تخلیق کرنے کی بجائے جلوہ صد ہزار تاویلات کو ممکن بنانے والی نظر تخلیق کرنے پر زور دیا جائے کہ یہی وہ اختصاص ادب ہے جو اسے دوسرے شعبہ جات سے ایک طرف اور دوسری طرف چیستانی گورکھ دھندوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ آج یونانی رزمیہ اور طربیہ لاطینی ڈراما و شاعری، قدیم عرب شاعری اور ہندی کلاسیکس کے حسن اور اہمیت میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ تغیر پذیر علوم اور آگہی کے پس منظر میں گزرے وقتوں کا ادب بھی ہم پر اپنے نئے معانی منکشف کرتا چلا جا رہا ہے۔ ساختیاتی مطالعہ اور اس کے بعد ساخت شکن اور مابعد ساختیاتی مطالعے نے "متن" کی اضافیت کے ساتھ ابہام، اقدار، تاریخ اور نظریے کو بھی اضافی بنا دیا ہے اور یہی وہ موڑ ہے جہاں سے وہ مسافت شروع ہوتی ہے جس کی تمازت اور حدت سے فرشتوں کے پَر جلتے ہیں اور شاید اسی لیے انسان اس آگ سے گریزاں ہے کہ وہ لنے

بچوں کے لیے مذہبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
حضرت یحییٰ علیہ السلام	منورہ نوری خلیق	۳/=
حضرت آدم علیہ السلام	منورہ نوری خلیق	۴/-
رسالہ دینیات اول	محمد نعیم الدین زبیری	۳/
رسالہ دینیات دوم	"	۴/
رسالہ دینیات سوم	"	۵/
رسالہ دینیات چہارم	"	۵/
رسالہ دینیات پنجم	"	۶/
بزرگانِ دین	محمود علی خاں جامعی	۴/
امت کی مائیں	حسین حسنی	۴/۵۰
اچھی باتیں	سعد الدین انصاری	۴/۵۰
خوب سیرت اول	حکیم محمد سعید	۶/
خوب سیرت دوم	//	۴/۵۰
سلطان جی	اسلم فرخی	۴/
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں	فضل قدیر ندوی	۴/۵۰
رحمان کا جہان	رفیع الزماں زبیری	۶/
کمسن صحابی	//	۵/
اسلام کے جاں نثار	//	۴/
سیرت پاک مختصر مختصر	احمد خاں خلیل	۳/
نور کے پھول	حکیم محمد سعید	۹/
سب سے بڑے انسان۔ رسول اللہؐ	"	۴/۵۰
حضرت حمزہؓ	احتشام علی رحیم آبادی	۲/
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	//	۲/
حضرت ابوہریرہؓ	"	۴/
حضرت محبوب الٰہیؒ	مشیر الحق	۴/
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	//	۲/
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	//	۳/
حضرت معین الدین چشتیؒ	//	۳/
حضرت ابوبکر صدیقؓ	//	۶/
حضرت طلحہؓ	//	۲/
حضرت سلمان فارسیؓ	//	۲/۵۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	//	۲/
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	//	۲/
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	مشیر الحق	۳/
نیک بیٹیاں	//	۲/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ حصہ اول	عبدالواحد سندھی	۷/۵۰
" حصہ دوم	//	۶/
قرآن پاک کیا ہے؟	//	۴/
اسلام کیسے شروع ہوا؟	//	۷/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار اول، دوم	// فی حصہ	۶/=
اسلام کے مشہور امیر البحر	//	۹/
رسول پاکؐ	//	۶/
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۵/۵۰
سرکار کا دربار	//	۶/۵۰
چار یار	//	۷/۵۰
آں حضرتؐ (اردو)	//	۳/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	//	۱۰/۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۴/۵۰
اللہ کے خلیل	//	۳/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	//	۴/
اللہ کے صفی	//	۲/۵۰
ہمارا دین حصہ اول	سید شہاب الدین دسنوی	۸/۵۰
" دوم	//	۷/۵۰
" سوم	//	۸/۵۰
منہاج القرآن	خیدہ سیدنا طاہر سیف الدین	۴/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۲/۵۰
عقائد اسلام	//	۲/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحی فاروقی	۹/
نبیوں کے قصے	//	۶/۵۰
ہمارے رسولؐ	//	۶/
پیارے رسولؐ	سلطانہ آصف فیضی	۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	ادارہ	۲/
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۶/
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی رضوی	۲/۵۰
سرکار دو عالم	محمد حسین حسان	۹/
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد)		۱/۵۰

ابراہیم یوسف
نیم روڈ امامی گیٹ بھوپال

قسط نمبر۲

اردو ڈراما ۱۹۹۰ سے ۱۹۹۴ تک

(سلسلے کے لیے ملاحظہ ہو کتاب نما مارچ ۱۹۹۴ء)

بھوپا۔ جاوید دانش (کناڈا) عصری ادب دہلی مطبوعہ جنوری ۱۹۹۰ء

عصری ادب دہلی کا یہ شمارہ جولائی تا اکتوبر ۸۹ء کا ہے لیکن جنوری ۹۰ء میں شائع ہوا ہے۔ جاوید دانش نے یہ ڈراما جنوبی افریقہ میں کالے لوگوں کی آزادی کی جد و جہد کے پس منظر میں لکھا ہے۔ بھوپا کی تشریح کرتے ہوئے جاوید دانش لکھتے ہیں کہ پولیس جب اس لفظ کا استعمال کرتی ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے گرفتاری لیکن سیاہ فام لوگوں کے نزدیک اس کا مطلب ہوتا ہے احتجاج۔ ڈرامے میں سفید فام آقاؤں کے ظلم و ستم کو پیش کیا گیا ہے کہ وہ معمولی معمولی باتوں پر سیاہ فاموں کو قید کرتے ہیں سزائیں دیتے ہیں اور اکثر کو قید خانے میں مار بھی ڈالتے ہیں۔ احتجاج کرنے والوں پر بے دریغ گولیاں چلاتے ہیں اور یہ سارا ظلم سیاہ فام پولیس والوں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ لیکن سیاہ فام پولیس اس سے دست کش ہوتی جا رہی اور سفید فام آقاؤں کے خلاف اُن کے جذبات بھی بھڑک اٹھے ہیں۔ ڈراما اپنے موضوع اور احتجاجی رویے کے باعث اہم اور فنی نقطہ نظر سے مکمل ہے۔

زینت محل۔ زین الدین حیدر۔ نیا دور لکھنؤ جنوری ۱۹۹۰ء

بہادر شاہ ظفر اپنے قید کے دن رنگون میں گزار رہے ہیں اور اپنے ایک ملنے

والے سائیں سہیل شاہ سے گفتگو میں مصروف ہیں کہ ایک انگریز میجر اُن سے ملنے آتا ہے بادشاہ کو اس کی آمد سے ناگواری ہوتی ہے مگر اسے اندر بلا لیتے ہیں اور کہتے ہیں (انھوں) نے جو دوسرے مکان کے لیے کہا تھا اس کا انتظام ہوا یا نہیں کیوں کہ یہ مکان تکلیف دہ ہے۔ میجر کہتا ہے کہ یہاں اس سے اچھا مکان نہیں مل سکتا اور طنزیہ کہتا ہے کہ یہاں لال قلعہ تو ہے نہیں جس کے محلات میں آپ رہتے تھے۔ اسی وقت زینت محل آتی ہیں اور انگریز میجر کی گستاخی پر غصے میں اس کی اور اپنی حیثیت بتلاتی ہیں بادشاہ انھیں روکنا چاہتے ہیں مگر وہ غصے میں برابر میجر کو بُرا بھلا کہتی رہتی ہیں کہ بادشاہ پر کھانسی کا شدید دورہ پڑتا ہے اور وہ نڈھال ہو جاتے ہیں۔ ڈرامے میں بہادر شاہ کی مجبوری کو پیش کیا گیا ہے جس سے وہ سمجھوتہ کر چکے ہیں لیکن زینت محل میں ابھی اپنی پرانی آن باقی ہے۔ ڈرامے میں ڈرامائیت کی کمی ہے۔

مانجھی دور کنارہ۔ پاندھی ننکانوی۔ پرواز ادب پٹیالہ مئی جون ۱۹۹۱ء

دریا میں طغیانی آئی ہوئی ہے اور قرائن کہتے ہیں کہ پانی جلد ہی کناروں سے اُبل پڑے گا۔ ایک نوجوان مانجھی کنارے بیٹھا طوفان کو دیکھ رہا ہے۔ اسے اپنی ماں کے پاس پہنچنے کی جلدی ہے جو اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس وقت ایک بوڑھا مانجھی اپنی کشتی لے کر آتا ہے جس میں اس کے بیوی بچے ہیں وہ نوجوان مانجھی سے کہتا ہے کہ اس کا چپو ٹوٹ گیا ہے اگر نوجوان اپنا چپو دے دے تو وہ اپنے بیوی بچوں کو محفوظ مقام پر پہنچا کر ابھی واپس آ کر اس کا چپو لوٹا دے گا۔ پہلے تو نوجوان آنا کانی کرتا ہے مگر بوڑھے کی خوشامد کرنے پر چپو دے دیتا ہے مگر بوڑھا واپس نہیں آتا مجبوراً نوجوان بغیر چپو کے کشتی دریا میں ڈال دیتا ہے اور ڈوب جاتا ہے۔ ڈرامے میں تشویش کا پہلو موجود ہے مگر خود کلامی سے بہت کام لیا گیا۔ ڈرامے کا تصور اسٹیج کے بغیر ممکن نہیں ہے اس ڈرامے کے سلسلے میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا دریا میں آئی باڑھ کو اسٹیج پر بتلایا جا سکتا ہے؟

نثار تیری گلیوں پر۔ ظہیر انور۔ آبشار کلکتہ جنوری ۱۹۹۱ء

یہ ڈراما ایک ایسے خاندان کے لوگوں کی تمناؤں اور آرزوؤں پر مبنی ہے جو اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں اور اپنے ملک کے ہر فرد کے لیے مساوات کے حامی ہیں اور فرسودہ نظام کو انقلاب کے ذریعے بدلنا چاہتے ہیں اس لیے صاحبِ اقتدار لوگوں کے ظلم و ستم کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ ڈرامے میں مجاز کی نظم "یہ میرا

چمن ہے میرا چمن" اکثر بیک گراونڈ سے گائی جاتی ہے۔ یہ ایک احتجاجی ڈراما ہے بوڑھے تو بوڑھے بچے بھی کسی مقابلے کے لیے جو پینٹنگز بناتے ہیں ان میں بھی انقلاب اور احتجاج کی جھلک نظر آتی ہے۔ ڈراما مختصر ہے مگر فنی اعتبار سے مکمل اور بامقصد ہے۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء - پاندھی ننکانوی۔ ایوان اردو دہلی جنوری ۱۹۹۱ء

رام دھن جو جنگ آزادی میں حصہ لے چکا ہے تقسیم اور اس کے رد عمل میں ہونے والے فسادات سے بہت دکھی ہے جس کا اظہار وہ اپنی بیوی اور پڑوسیوں سے کرتا ہے۔ وہ اس سے اور بھی دکھی ہے کہ اب کوئی گاندھی جی کی بھی نہیں سنتا بلکہ کچھ لوگ تو ان کی بُرائی بھی کرتے ہیں وہ اسی موضوع پر اپنے پڑوسیوں سے گفتگو کر رہا ہوتا ہے کہ اسے خبر ملتی ہے کہ کسی نے گاندھی جی کو گولی مار دی۔ سوائے اور دکھی ہونے کے وہ اور کیا کر سکتا ہے وہ محلے والوں سے کہتا ہے کہ وہ اپنے گھروں میں چولھا نہ جلائیں۔ ڈرامے میں عمل و حرکت، کشمکش اور تشویش کا فقدان ہے۔

بڑھتی دھوپ اترتی دھوپ - رفیعہ منظورالامین

شگوفہ حیدرآباد، سالنامہ ۱۹۹۱ء

رفیعہ منظورالامین نے یہ ڈراما ٹیلی ویژن کے لیے لکھا ہے اور جگہ جگہ کیمرے کی ڈزلیشن اور سچویشن کی وضاحت کر دی ہے۔ سلیمہ خاتون اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتی ہے اس کے والد شاعر تھے اور اپنا دیوان بھی چھپوایا تھا اور اس کے فروخت کی یہ ورت نکالی تھی کہ دکانداروں سے سامان اُدھار لیتے تھے اور قیمت کے طور پر اپنے وان کی کاپیاں دے دیتے تھے۔ سلیمہ کو بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا اور وہ تحسین احمد ریغ سے شاعری سیکھنے جانے لگی۔ نزع صاحب عمر رسیدہ مگر دل والے تھے وہ سلیمہ ں دلچسپی لینے لگے۔ اسی دوران ایک پہلوان صاحب بھی شاعری سیکھنے آنے لیے۔ پہلوان تو پھر پہلوان ٹھہرے شاعری سے کیا واسطہ۔ شاعری کے مقابلے میں ن کی دلچسپی سلیمہ میں بڑھنے لگی اور کچھ ایسا چکر چلایا کہ سلیمہ سے اُن کی شادی ہو گئی ر نزع صاحب ہاتھ ملتے رہ گئے۔ ڈراما فنی اعتبار سے مکمل اور دلچسپ ہے۔ نزع حب کی ملازمہ نصیبن کے کردار نے اپنے طنز سے ڈرامے میں نہ صرف دلچسپی

پیدا کی ہے بلکہ جان ڈال دی ہے۔

اگر شادی ہو جاتی لیلیٰ مجنوں کی ۔ غلام جیلانی ۔ شگوفہ حیدرآباد

سالنامہ ۱۹۹۱ء

لیلیٰ مجنوں کی شادی ہو چکی ہے اور وہ خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں اختلافی مسائل کو ابھرنے نہیں دیتے ان کے دوست رابعہ اور نعمان نے بھی محبت کی شادی کی ہے مگر وہ بات بات پر جھگڑتے رہتے ہیں اور ایک دن رابعہ ناراض ہو کر اپنے میکے چلی جاتی ہے۔ لیلیٰ مجنوں کو اس پر حیرت ہوتی ہے کہ دونوں نے محبت کی شادی کی تھی پھر یہ اختلاف کیوں لیکن ایک دن ایسا بھی آتا ہے کہ لیلیٰ بھی ایک معمولی بات پر اپنے گھر جانے کو تیار ہو جاتی ہے۔ ڈرامے کا مقصد یہ ہے کہ عشق و محبت الگ چیز ہے اور شادی شدہ زندگی الگ چیز۔ ڈراما دلچسپ ہے۔

بیوی اور مکان ۔ اظہار اثر ۔ آجکل دہلی ۔ اپریل ۱۹۹۱ء

بیوی اور مکان مسائلی ڈراما ہے جو انسان کی بنیادی ضرورت مکان کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے۔ رمیش جس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے ایک ایسے کرایے کے مکان میں رہتا ہے جو انتہائی خستہ حالت میں ہے اور کسی وقت بھی منہدم ہو سکتا ہے مالک مکان مرمت اس لیے نہیں کراتا کہ اسے مکان خالی کرانا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مکان گر جائے تاکہ مکان خالی ہو جائے اور وہ اس کی جگہ ایک عالیشان مکان بنوا سکے اور اچھا کرایہ وصول کر سکے۔ ایک روز بارش کا طوفان آیا ہوا ہے اور مکان کے گرنے کا خطرہ بڑھ گیا ہے۔ مجبوراً میاں بیوی مکان چھوڑ دیتے ہیں۔ رمیش اپنی بیوی کو تو اس کے میکے چھوڑ آتا ہے اور خود اپنے ایک دوست کے ساتھ رہنے لگتا ہے پرابلم یہ ہے کہ اس کے ساس سسر کے گھر میں صرف دو کمرے ہیں جن میں وہ اپنے آٹھ بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ اب رمیش کی اپنی بیوی سے آزادانہ ملاقات ممکن نہیں ہے ایک رات وہ دونوں چھپ کر مکان کے باہر ملتے ہیں جب رمیش دیوار کود کر واپس جانا چاہتا ہے تو پولس کا سپاہی اسے چور سمجھ کر پکڑ لیتا ہے اور تھانے لے جاتا ہے۔ مکان کے مختلف پہلوؤں پر اچھی طرح روشنی ڈالی گئی ہے۔ اچھا مسائلی اور دلچسپ

ڈراما ہے اور بڑی حد تک فنی کمزوریوں کو پورا کرتا ہے۔

باباصاحب امبیڈکر۔ زین الدین حیدر۔ نیادور لکھنؤ

مارچ، اپریل ۱۹۹۱ء

ڈرامے میں پیش کیا گیا ہے کہ باباصاحب امبیڈکر کو ہریجن ہونے کے باعث اعلیٰ ذات کے لڑکوں اور اساتذہ کے ذریعے کس طرح ذلتیں برداشت کرنا پڑیں اور کس طرح انھوں نے پامردی اور باغیانہ انداز سے اُن کا مقابلہ کیا۔ ان کے ہریجن ہونے کی وجہ سے پنڈتوں نے انھیں سنسکرت پڑھانے سے انکار کر دیا تو انھوں نے فارسی پڑھی۔ مہاراجہ بڑودہ کے وظیفے پر امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور کامیاب بیرسٹری زندگی گزارنا شروع کی۔ گاندھی جی ان سے متاثر ہوئے اور دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ گاندھی جی نے وعدہ کیا کہ آزادی ملنے کے بعد ہریجنوں کی شکایتیں دور کی جائیں گی۔ امبیڈکر کی بچپن کی باغیانہ اور انقلابی زندگی کو اچھی طرح پیش کیا گیا۔ ڈرامے میں عمل و حرکت کے مقابلے میں مکالمے زیادہ ہیں۔

عظیم اللہ خاں۔ زین الدین حیدر۔ نیادور لکھنؤ۔ اگست ۱۹۹۱ء

عظیم اللہ خاں مجاہد آزادی اور ناناصاحب کے دست راست تھے اس ڈرامے میں ان کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کا بے یار و مددگار ہو جانا ایک انگریز مشنری کا ان کی پرورش کرنا اور تعلیم دلوانا اپنی لڑکی سے شادی کرنے کا لالچ دے کر انھیں عیسائی بنانے کی کوشش کرنا۔ عظیم اللہ خاں کا اپنی والدہ کے ساتھ اس مشنری کا گھر چھوڑ دینا۔ مزید تعلیم حاصل کرنا۔ ناناصاحب کا انھیں اپنا مشیر بنانا اور انگریزوں کو ہندستان سے نکالنے کا پلان بنانا وغیرہ۔ عظیم اللہ خاں کی شخصیت اور زندگی کے مختلف پہلو تو ابھرے ہیں مگر واقعات سپاٹ طور پر پیش کیے گئے ہیں اور ڈرامائیت کا فقدان ہے۔

تبدیلی۔ پاندھی ننکانوی۔ ایوان اردو دہلی۔ اگست ۱۹۹۱ء

دُرگاداس شہر کے مشہور بیرسٹر ہیں۔ وہ انگریزوں کے مداح ہیں بہت سے انگریز اُن کے دوست ہیں اور انگریز افسروں کے ساتھ اُن کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ جب ہندستان چھوڑو کی تحریک شروع ہوتی ہے تو اُن کا لڑکا پران اس میں حصہ لیتا ہے۔ انگریز

حاکم انھیں بلا کر انھیں حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے لڑکے کو قابو میں رکھیں اور اسی افسر کا جو کل [illegible] کا ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھا رویہ ایک دم بدل جاتا ہے اور وہ ان کی توہین تک کرتا ہے [illegible] تو انھیں اپنے بیٹے پر غصہ آتا ہے کہ اس کی وجہ سے ان کی توہین ہوئی ہے کہ [illegible] ہیران کے گھر کی تلاشی لیتی ہے۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھل ہی نہیں پائے ہیں کہ نوکر آکر اطلاع دیتا ہے کہ ہیران ایک مجمع میں تقریر کر رہا تھا کہ پولیس نے آکر وہاں لاٹھی چارج کیا، گولیاں چلائیں اور گھوڑ سوار پولس نے مجمع کو روند ڈالا ہیران کا کچھ پتا نہیں کہ اسکا کیا حشر ہوا۔ اب ان کو احساس ہوتا ہے کہ ہیران نے جو راستہ اپنایا ہے وہی صحیح راستہ ہے۔ ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں حصہ لینے کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں۔ متاثر کن ڈراما ہے اور پاندھی صاحب کے لکھے ہوئے ڈراموں میں شاید سب سے اچھا

تیسری آنکھ ۔ پاندھی ننکانوی ۔ پرواز ادب پٹیالہ ستمبر دسمبر ۱۹۹۱ء

ایک شاعر جنگل میں ایک جھونپڑی دیکھتا ہے ماحول اسے بہت خوشگوار معلوم ہوتا ہے اور جھونپڑی کے پاس ایک پتھر پر بیٹھ کر گنگنانے لگتا ہے کہ ایک شخص آتا ہے اور جھونپڑی کے باہر بیٹھ کر بھنگ گھوٹنے لگتا ہے۔ دوران گفتگو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرگھٹ ہے اور وہ شخص مُردے جلانے کا کام کرتا ہے۔ آج وہ شخص بہت خوش ہے کیوں کہ چند اہم لوگوں کی موت کے باعث اُس کی اچھی آمدنی ہوئی ہے۔ وہ اُن سب لوگوں کی تعریف کرتا ہے لیکن اُن کی روحیں جن میں ایک لیڈر کی ایک سیٹھ کی اور ایک کوتوال کی ہے باری باری سے ظاہر ہوتی ہیں اور اپنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتی ہیں۔ اس پر شاعر سوچتا ہے کہ اس کی ایک تیسری آنکھ بھی ہے جس سے وہ لوگوں کی برائیوں اور کمزوریوں کو دیکھ سکتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ وہ تیسری آنکھ سے ان سب برائیوں کو دیکھ کر بیان کرے گا۔ خیال اچھا ہے ڈرامے میں طنز بھی موجود ہے مگر ڈرامائیت نہیں۔

کس نے سوچا تھا ۔ ایم۔ اے کریمی ۔ تعمیر ہریانہ، فروری ۱۹۹۲ء

مرزا صاحب کی کچھ چھٹیاں بچی ہوئی ہیں، اور سال ختم ہو رہا ہے وہ یہ چھٹیاں لیتے ہیں کہ گھر پر رہ کر آرام کر سکیں گے مگر گھر پر رہنے سے بیوی انھیں اتنے کام کرنے کو کہتی ہیں کہ انھیں چھٹیاں لینے کا افسوس ہوتا ہے۔ بیچ بیچ میں نوکری کی بیہودگیوں کو بھی

پیش کیا گیا ہے۔ مزاحیہ ڈراما ہے۔

چور۔ ریوتی سرن شرما۔ آجکل، دہلی، فروری ۱۹۹۲ء

ایک ہال میں ایک لیکھک، ایک وکیل، ایک سیٹھ، ایک سرکاری افسر، ایک صنعت کار، ایک زمیندار، ایک راج نیتک، ایک ایڈیٹر اور ایک خوبصورت لڑکی موجود ہیں اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں کہ ایک پولس انسپکٹر آتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک چور ابھی ابھی یہاں آیا ہے کیا انھوں نے اسے دیکھا ہے۔ سب یہی جواب دیتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے کام میں مشغول ہیں انھیں کسی چور کے آنے کا علم نہیں۔ انسپکٹر یہ کہہ کر چلا جاتا ہے کہ جو سب کے بعد آیا ہے وہی چور ہے میں تھوڑی دیر میں پھر آؤں گا آپ لوگ طے کر لیجیے کہ بعد میں کون آیا ہے۔ انسپکٹر کے جانے کے بعد لیکھک ہر شخص سے گفتگو کرتا ہے وکیل خود کو بتلاتا ہے کہ وہ صرف CONSTITUTIONAL LAWYER ہے لیکن اس نے سیٹھ کے لیے ایک اسٹے آرڈر لیا ہے جس سے ایک سڑک اور پل بنانے کا کام ٹھپ پڑا ہے۔ اس سڑک کی تعمیر سے سیٹھ کی دو کانیں توڑ دی جاتیں۔ بیس سال سے عوام پریشانی میں مبتلا ہیں۔ افسر صاحب سب کے بعد دفتر آتے ہیں اور سب سے پہلے چلے جاتے ہیں اور دفتر کے اوقات میں کام کرنے کے بجائے چائے پیتے رہتے ہیں غرض یہ کہ ہر شخص کسی نہ کسی طرح اپنے ذاتی مفاد کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اس طرح معاشرے کا ہر ذمہ دار شخص کسی نہ کسی طرح چور ہے اس ذاتی مفاد کے چکر میں عام شہری برابر پستا اور بھوکا ہوتا جا رہا ہے ڈراما بہت بامقصد اور طنزیہ ہے اور سماج کے ان چوروں کی نقاب کشائی کرتا ہے شرما جی نے جانے کیوں ہندی اور انگریزی کے الفاظ استعمال کیے ہیں جب کہ ان کے متبادل اردو میں موجود ہیں

سویرے سویرے۔ وصال احمد، پرواز ادب پٹیالہ، جولائی، اگست ۱۹۹۲ء

یہ ڈرامے کے مقابلے میں ایک بخیل کا کریکٹر اسکیچ زیادہ ہے جو گھر کے لیے نمک تک خریدنے میں بخل سے کام لیتا ہے۔ ڈرامائی کشمکش موجود نہیں ہے اور بعض جگہ ڈرامے کے ابتدائی اصولوں کو بھی نظر انداز کیا گیا ہے۔

سمندر کے سوار۔ شاکر، پرشارتھی، پرواز ادب پٹیالہ، جنوری، فروری ۱۹۹۲ء

انگریزی کے مشہور ڈرامے RIDERS TO THE SEA سے ماخوذ ہے۔ ایک

عورت کے بیٹے، شوہر اور سسر سمندر میں ڈوب کر مر چکے ہیں جس سے وہ نیم
پاگل ہو گئی ہے۔ آخری بیٹا جب سمندر پر جاتا ہے تو وہ ناامید ہے اور اسے
محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب واپس نہیں آئے گا اور اس کا اندیشہ صحیح ثابت ہوتا
ہے۔ آخری بیٹے کی موت پر وہ نہایت مایوسی کے عالم میں کہتی ہے "اب برسوں
بعد مجھے آرام ملے گا۔ اب چین ملے گا۔ اب میں گہری نیند سویا کروں گی" عورت
کے دکھوں اور نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے بہت متاثر کن ڈراما ہے

دلبری کا بھرم - جاوید دانش (کینیڈا) نیا سفر دہلی، جنوری تا مارچ ۱۹۹۲ء

جناب جاوید دانش نے یہ ڈراما کینیڈا میں رہتے ہوئے لکھا ہے اور اس پر نوٹ
دیا ہے کہ اس ڈرامے کے تمام کردار اور واقعات فرضی ہیں مطابقت صرف اتفاقی ہوگی
اس قسم کے نوٹ سے لامحالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کسی قانونی گرفت سے بچنے
کے لیے اس قسم کا اظہار کیا گیا ہے۔ اکثر شعرا حضرات امریکہ اور کینیڈا وغیرہ مشاعرے
پڑھنے جاتے رہتے ہیں اور ممکن ہے غیر ارادی طور پر انھیں میں سے کسی کے کردار
کی جھلک اس میں در آئی ہو۔ یہ ایک مناسب طوالت کا یک بابی ڈراما ہے۔ ایک شاعر
احمر اعظم مشاعرے میں حصہ لینے ٹورنٹو گیا ہوا ہے یہاں اس کی خوب آؤ بھگت
ہوتی ہے۔ اس کے انٹرویو لیے جا رہے ہیں سپاس نامے پیش کیے جا رہے ہیں
اور اس کو POET OF THE YEAR کا اعزاز بھی دیا جاتا ہے جس کا اہتمام اس کے کالج کے
زمانے کی محبوبہ طلعت نے اپنے ذرائع سے کیا ہے۔ لیکن کچھ اور خواتین بھی یہاں
احمر کی فین ہیں جن میں زارا نام کی ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی بھی ہے جو احمر سے
بہت متاثر ہے اس کے مقابلے میں احمر اپنی پہلی محبت اور محسن طلعت کو نظر انداز
کرتا ہے طلعت کو اس کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ مایوسی کے عالم میں ہوٹل کی
پانچویں منزل سے گر کر خودکشی کر لیتی ہے۔ احمر ایک معمولی وقفے کے لیے اس واقع
سے متاثر ہو کر خاموش تو ہو جاتا ہے مگر پھر فوراً ہی مشاعرے میں جانے کے لیے
تیار ہو جاتا ہے اگرچہ زارا اور طلعت کے درمیان احمر کی وجہ سے چپقلش تھی مگر اس
واقع سے زارا احمر کے کردار کو سمجھ لیتی ہے اور کہتی ہے "احمر صاحب میں آپ کو
عظیم انسان سمجھتی تھی ہو سکتا ہے آپ ایک بڑے شاعر ہوں مگر آپ --- آپ آدمی
بہت چھوٹے اور گھٹیا قسم کے ہیں" زارا کا احمر کے بارے میں یہ فیصلہ بہت مناسب
ہے کیوں کہ جاوید دانش نے جس طرح احمر کے کردار کو پیش کیا ہے اس میں مصلحت
پسندی، نمود و نمائش، شہرت حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے اصولوں کی قربانی
وعدوں کو غلط رٹ کرنا اور خود کو غیر معمولی انسان ظاہر کرنا شامل ہے۔ جاوید دانش

نے امر کے کردار کو نمایاں کرنے کے لیے ایک دوسرے شاعر سحر بھنوری کا کردار تراشا ہے جو بظاہر شرابی ہے مگر اپنے اصولوں اور آدرشوں کو کسی بڑے سے بڑے لالچ کی خاطر قربان کرنے کو تیار نہیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے شہرت کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ ان متضاد کرداروں نے ڈرامے کو بڑی معنویت بخشی ہے۔ آج کی مادی دنیا نے انسان سے کیا کیا کچھ چھین لیا ہے بڑی اچھی طرح ابھر کر سامنے آیا ہے۔ یہ ڈراما فنی اور معنوی اعتبار سے اس دور میں لکھے جانے والے ڈراموں میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔

اور نہیں جنگ۔ مترجم ظہیر انور، ماہنامہ انشا، کلکتہ، ستمبر ۱۹۹۲ء

ظہیر انور نے یہ ڈراما براہ راست بنگلہ زبان سے ترجمہ کیا ہے۔ ڈرامے کا موضوع ایٹمی جنگ کی ہولناکیاں پیش کرنا ہے۔ ایک فوجی کمانڈر اور ایک سپاہی جن کا جہاز جنگ میں تباہ ہو گیا ہے کسی طرح ایک کشتی کے ذریعے ایک ایسے جزیرہ میں پہنچ جاتے ہیں جو بظاہر غیر آباد ہے، درخت ہیں لیکن ان میں پھل پھول اور پتے نہیں ہیں۔ انھیں وہاں ایک ایسی قوم آباد ملتی ہے جو زمین دوز مکانوں میں رہتی ہے اور شکل و صورت کے لحاظ سے بے حد ڈراونی بھوتوں جیسی ہے اس قوم کا سردار انھیں بتلاتا ہے کہ پانچ ہزار سال پہلے وہ ایک ترقی یافتہ قوم تھے اس زمانے میں ایک ایٹمی جنگ لڑی گئی تھی جس سے سب کچھ تباہ ہو گیا۔ ان کی صورتیں مسخ ہو گئیں۔ جزیرے کی فضا اس قدر مسموم ہو گئی ہے کہ اس پر زندہ رہنا مشکل ہے اور جزیرے پر کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پانچ ہزار سال سے اس لعنت کو بھگت رہے ہیں اور صرف مچھلیاں ان کی غذا ہیں اور آخر میں وہ ان دونوں کو خون خرابے سے دور رہنے کو کہتا ہے۔ ایٹمی جنگ کے خلاف ایک اچھا مقصدی ڈراما ہے۔

ہری کونپلیں۔ مبین صدیقی۔ شاعر بمبئی جون ۱۹۹۱ء

اے مصوّر۔ مبین صدیقی۔ آجکل دہلی، ستمبر ۱۹۹۲ء

بند کر دو۔ مبین صدیقی۔ ایوان اردو دہلی، دسمبر ۱۹۹۲ء

ان تینوں تخلیقات کا ایک جگہ اس لیے ذکر کیا جا رہا ہے کہ مصنف ان تخلیقات کو ڈرامے میں ایک نیا تجربہ تصوّر فرماتے ہیں "ہری کونپلیں" میں کوئی کردار نہیں ہے

لی مکالمہ نہیں ہے صرف سین بیان کردیے گئے ہیں۔ پہلے سین کو اس طرح بیان کیا
صرف لہلہاتے کھیت ہیں اور دوسری طرف توپیں گرجتی ہیں اور دیکھتے
ی دیکھتے باغات اور کھیت خاکستر ہوجاتے ہیں۔ دوسرے سین میں بارش ہوتی ہے
ور تیسرے سین میں پھر زمین سے ہری کونپلیں نکلنے لگتی ہیں گویا تخریب کے بعد
پھر کا عمل شروع ہوگیا ہے۔ اے مصور میں ایک شخص دوپہر میں کھڑا سورج کو تک
رہا ہے دوسرا سین سہ پہر کا ہے سورج کی تمازت کم ہوگئی ہے اب اس شخص کے
ہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوتے ہیں تیسرا سین شام کا ہے آدمی کی حیرت احتجاج
یں بدلتی ہے اور وہ ایک دم جنون میں آجاتا ہے۔ چوتھا رات کا ہے اس میں وہ شخص
وجود نہیں ہوتا پانچواں سین صبح کا ہے اس میں وہ شخص پہلے تو منظر کو حیرت
سے دیکھتا ہے پھر اسٹیج پر ادھر ادھر دوڑنے لگتا ہے جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہے
چھٹے سین میں وہ سمندر کے کنارے بیٹھا ہے کہ سورج کی کرنیں اس پر پڑتی ہیں
ر حیرت اور خوشی سے اسکا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔ اس ڈرامے کا کوئی اور مقصد سمجھ
یں نہیں آتا کہ خدا کی تخلیقات میں سورج سب سے عظیم تخلیق ہے اور مختلف اوقات
یں اس کا اثر انسان پر مختلف ہوتا ہے۔ تیسرا ڈراما نما (مبین صاحب نے جو فوٹو
کاپیاں مجھے ارسال کی ہیں ان پر اپنے قلم سے ڈراما نما لکھ دیا ہے) "بند کردو" ہے
س میں مسلح سپاہی ایک محلے میں داخل ہوتے ہیں، لوٹ مار کرتے ہیں اور نوجوان
ڑکیوں کو ریپ کرتے ہیں افسر جو خود ریپ کرنے میں مشغول ہے حکم دیتا ہے
۔روشنی بند کردو۔ جب ڈاکٹر لڑکیوں کا معائنہ کرنے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کرتا
ہے تو پولس اس سے رپورٹ بدلوانا چاہتی ہے اور اس کے انکار کرنے پر حکم دیا
تا ہے کہ ڈاکٹر کو بند کردو۔ شاید فسادات کے زمانے میں پولس کی زیادتیاں بتلانا
مقصود ہے۔ ایوان اردو نے اس ڈراما نما کو افسانے کے طور پر شائع کردیا جس پر
مصنف کو سخت اعتراض ہے۔ مصنف نے جس طرح لکھا تھا ایوان اردو کو ویسے
ہی شائع کرنا چاہیے تھا۔ مگر یہ ڈراما نما اس قدر ترقی پسند ہے کہ اسٹیج پر ریپ کرتے
ہوئے دکھلایا گیا ہے۔ مبین صاحب ابھی ان ڈراما نما تخلیقات کو ڈرامے میں تجربہ قرار
دیتے ہیں مگر ابھی اس تجربے کے نقوش واضح نہیں ہوئے ہیں۔ وہ اس پر اور غور
فرمائیں ممکن ہے کوئی صورت پیدا ہوجائے۔

مرزا ادیب کے ڈراموں کی انفرادیت۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

کتاب نما دہلی، جنوری ۱۹۹۰ء

ڈاکٹر حسرت نے اپنے مضمون میں ڈرامے کی اہمیت اور دوسری اصناف

جیسے ناول اور افسانے سے ڈرامے کے فرق کو ظاہر کرنے کے بعد مرزا ادیب کے چند ڈراموں سے بحث کرنے کے بعد مرزا صاحب کے فن کے بارے میں فرماتے ہیں "زندگی کو پرکھنا اس کے مسائل کو سمجھنا زندگی کی ترجمانی کے مترادف ہے۔ مرزا ادیب ایک ایسے ہی فنکار ہیں جو گہرائی میں جاکر زندگی کے فلسفے کو سمجھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ الجھے ہوئے مسائل کو نہایت ہمدردی اور دردمندی کے ساتھ پیش کرتے ہیں ان کی دردمندی کا جذبہ اُن کے احساسات کا آئینہ دار ہے پیچیدگیاں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل' دکھ' درد اور خوشیوں کو وہ اس انداز سے سمجھتے ہیں کہ واقعات اور حالات اپنی تمام نوعیت کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور پڑھنے والا آسانی کے ساتھ اپنی راہ کا تعین کر سکتا ہے؟ مرزا ادیب کے فن کے بارے میں یہ ایک نپی تلی رائے ہے۔ مضمون بھرپور ہے اگر مرزا ادیب کی ڈرامے کے فن پر گرفت پر بھی کچھ اور لکھا جاتا تو خوب ہوتا۔

ڈرامے کی صورت حال۔ مرزا ادیب۔ تکمیل بھیونڈی، جنوری ۱۹۹۰ء

مرزا ادیب کا یہ مختصر مضمون ہمارا انتخاب کے زیر عنوان تکمیل میں شائع کیا گیا ہے شاید کسی پاکستانی رسالے سے نقل کیا گیا ہے لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ مرزا صاحب نے یہ مضمون کب لکھا تھا۔ مرزا صاحب کا خیال ہے کہ پارسی تھیٹر اور ادبی ڈراموں نے کوئی ایسی روایت نہیں چھوڑی تھی جس کی بنیاد پر قیام پاکستان کے بعد ڈرامے کا احیا ہو سکتا۔ ڈرامے کو سہارا پہلے ریڈیو پھر ٹیلی ویژن نے دیا۔ ڈرامے اسٹیج بھی ہوتے رہے اور عوام ان میں دلچسپی بھی لیتے رہے مگر ان کا معیار بلند نہیں تھا۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے پاکستان میں ڈرامے پر جو کام ہوا ہے اس کا بہت مختصر جائزہ لیا ہے۔ مضمون اپنے اختصار کے باعث بہت تشنہ ہے۔

کچھ اردو تھیٹر کے بارے میں۔ ظہیر انور، آبشار کلکتہ، عید نمبر ۱۹۹۱ء

ظہیر انور نے اپنے اس مضمون میں ایک اہم نکتے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج تک ڈرامے کی تنقید کے نام پر جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے وہ صرف اسکرپٹ کی خوبیوں اور خامیوں کے گنوانے تک محدود رہا ہے اور تھیٹر کے تعلق سے کسی بھی اسکرپٹ کی پیش کش کو مجرمانہ حد تک نظر انداز کیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں تھیٹر کی روایت قائم نہ ہو سکی۔ ڈراما صرف اسکرپٹ کا نام نہیں ہے اور نہ صرف اسکرپٹ رائٹر ہی اہم نہیں ہے بلکہ پروڈیوسر، ایکٹر، لائٹ مین، میک اپ

میں سب اہم ہیں کیونکہ ان کے تعاون ہی سے کسی اسکرپٹ کی کامیابی منحصر ہوتی ظہیر انور کا یہ خیال اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ اگر ہمیں اردو تھیٹر کی روایت قائم کرنا ہے تو ہمیں ڈرامے کے بارے میں اپنا تنقیدی نقطۂ نظر بدلنا ہوگا اور پیش کش کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔ لیکن دقت یہ ہے کہ اردو ڈرامے بہت کم اسٹیج ہوتے ہیں اور جب تک کوئی ڈراما اسٹیج پر نہ آئے اس کے مختلف پہلوؤں پر کس طرح غور کیا جاسکتا ہے سوائے اس کے کہ اسکرپٹ کے بنیادی پہلوؤں پر غور کر لیا جائے اور صرف اسکی ادبی حیثیت کا تعین کر لیا جائے۔ بہر حال ادبی حیثیت بھی ڈرامے کا ایک پہلو ہے۔

بادل سرکار کا تھرڈ تھیٹر ۔ ظہیر انور، روح ادب، اپریل تا جون ۱۹۹۱ء

بادل سرکار کا تھرڈ تھیٹر آجکل بہت مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ ظہیر انور نے اسی تھیٹر کے بارے میں اس مضمون میں معلومات فراہم کی ہیں بادل سرکار کے ذہن میں تھرڈ تھیٹر کا خیال کیوں پیدا ہوا یہ شہری تھیٹر اور لوک تھیٹر سے کس طرح مختلف ہے اور بنیادی طور پر اس کی پیش کش میں انسانی جسم اور تھیٹریکل زبان کا کس طرح استعمال کیا جاتا ہے اور کم سے کم لاگت میں کسی بھی جگہ کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے وغیرہ وغیرہ مضمون بہت ہی معلوماتی ہے اور تھرڈ تھیٹر کو سمجھنے میں بہت کار آمد۔

سیموئل بیکٹ کی یاد میں ۔ محمد اقبال حسین ۔ ایوان اردو دہلی اکتوبر ۱۹۹۱ء

سیموئل بیکٹ پر اور اسکے ڈرامے "گودو کے انتظار میں" پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ یہ مختصر مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اقبال حسین صاحب نے بیکٹ کی زندگی کے مختصر طور پر حالات بیان کیے ہیں۔ "گودو کے انتظار میں" کا مختصر خاکہ بیان کیا ہے اور لایعنی ڈرامے پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ڈراما "مغربی یورپ کے طرز فکر کی عکاسی کرتا ہے۔ جدید کرب و یاس، اخلاقی قدروں کا فقدان اور تہذیب سے حد درجہ دوری کی حس شدت سے بیکٹ نے عکاسی کی ہے وہ یقیناً قابل ستائش ہے" مضمون بے حد مختصر ہے اور مطالعہ کے بعد تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

اردو یکبابی ڈرامے میں موضوعاتی و فکریاتی تنوع ۱۹۲۵ تا ۱۹۷۵ء

ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی ۔ نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۹۱ء، اپریل ۱۹۹۲ء

یہ ایک طویل مضمون ہے جو نوائے ادب بمبئی کے تقریباً پچاس صفحات پر

پھیلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صدیقی لکھتے ہیں کہ "ایک ڈراما نگار کسی دوسرے فنکار کے مانند کسی دکسی مخصوص معاشرے کی مخلوق ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا ترجمان بھی ہوتا ہے اور مبصر بھی اور اس کی فنی تخلیقات اور ڈرامائی تصویر کشی میں معاشرے کے مختلف پہلوؤں کا عکس بھی ضرور نظر آتا ہے۔ ان عقائد اور پیغامات کا پرتو بھی دکھائی دیتا ہے جو اس کے اخلاقی، مذہبی رجحانات سے ممتاز ہوتے ہیں۔ ان سیاسی ملکی، اقتصادی معاملات، تعمیری اور تخریبی حالات و سانحات کی دارو گیر کی تمثیل آرائی بھی ہوتی ہے جو ایک مخصوص معاشرے کو انفرادی شخصیت عطا کرتے ہیں۔" اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ڈاکٹر صدیقی نے ۱۹۲۵ء اور ۱۹۷۵ء کے درمیان لکھے جانے والے یکبابی ڈراموں میں تقریباً ایک سو پچاس ایسے موضوعات کی نشاندہی کرتے ہیں جنھیں ڈراما نگار اپنے ڈراموں میں پیش کرتے رہے ہیں۔ ان میں سماجی سیاسی اور معاشرتی موضوعات کے علاوہ طنز و مزاح انفرادی اور اجتماعی نفسیات پر لکھے گئے ہر قسم کے ڈرامے شامل ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صدیقی ان ڈراموں سے مکمل طور پر مطمئن نہیں ہیں کہ ان میں سے زیادہ تر ڈراموں میں احترام فن موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر صدیقی نے جن ڈراموں کی موضوعاتی اعتبار سے نشاندہی کی ہے ان پر تنقید و تبصرہ نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ ان پر اپنی کتاب اردو یکبابی ڈراما میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ بہر حال مضمون بہت محنت سے لکھا گیا ہے اور اردو ڈرامے پر کام کرنے والوں کے لیے تحفہ ہے۔

جاترا۔ بنگال کی اہم روایت۔ ظہیر انور۔ انشا کلکتہ، اگست، ستمبر ۱۹۹۲ء

ہندستان کے لوک ناٹکوں میں بنگال کے لوک ناٹک جاترا کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ظہیر انور نے اپنے مضمون میں اس کی تاریخی اہمیت، مذہبی بنیاد، عہد بعہد اسکی عروج و زوال کی کہانی، وقت کے ساتھ اس میں ہونے والی تبدیلیوں اور اسکی پیش کش پر روشنی ڈالی ہے۔ مذہبی بنیاد ہونے کے باوجود اس نے سماجی مسائل کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ مگر کچھ بنگالی ناقدین نے اس پر اعتراضات بھی کیے مگر اسکی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ ظہیر انور کا خیال ہے کہ جدید تھیٹر اور فلموں کے باعث اس کی مقبولیت متاثر ہوئی ہے اور اپنے وجود کو قایم رکھنے کے لیے جاترا نے سستے قسم کے گیت بلند بانگ موسیقی نیز جنسی آسودگی کے تصور کو اپنا کر اپنے فطری فارم کو داغدار کیا ہے۔

کامیڈی آف دی آرٹ (ایک اطالوی فارم) ظہیر انور

علم و ادب جولائی تا دسمبر ۱۹۹۲ء

پندرھویں اور سترہویں صدی کے درمیان اطالوی تھیٹر نے بہت ترقی کی اور ان کے اثرات پورے یورپ پر پڑے۔ اسی درمیان کامیڈی آف آرٹ ڈرامے ایک فارم کی شکل میں ابھرا۔ ظہیر انور نے اس فارم کا تعارف کرایا ہے کہ اس کے اختراع میں مزدوروں کی دلبستگی پیش نظر تھی جس میں کردار مختلف ماسک پہن کر نمودار ہوتے ہیں اور اپنے ماسک کی مناسبت سے اپنے کردار پیش کرتے ہیں۔ اس ڈرامے میں یہ مستقل کردار ہوتے ہیں۔ کردار اپنی آوازوں اور حرکات و سکنات سے جس کردار کا وہ روپ دھارے ہیں طنز اور مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ظہیر انور کا خیال ہے کہ طربیہ کی یہ قسم آج بھی اکثر و بیشتر اسٹیج پر نظر آتی ہے۔

سماعی ڈرامے (ڈرامے کی ایک نئی شاخ) ظہیر انور، روح الادب، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۲ء

ظہیر انور نے بنگال میں شمبھو مترا کے کیے گئے ایک تجربہ کی بنیاد پر ڈرامے کی ایک نئی شاخ سے ہمیں متعارف کرایا ہے۔ اس میں ڈرامے کو پڑھا جاتا ہے اسٹیج نہیں کیا جاتا پڑھنے والا الفاظ کو اپنی آواز کے اتار چڑھاؤ کے ذریعے اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ معنوں کی ایک دنیا اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ یہ سماعی ڈرامے اسٹیج ڈراموں سے اس طرح مختلف ہوتے ہیں کہ ان کے لیے اسٹیج کے لوازمات کی ضرورت نہیں ہوتی اور نشری ڈراموں سے اس طرح مختلف ہیں کہ نشری ڈراموں میں آواز کو سنا جا سکتا ہے اور سماعی ڈرامے عوام کے سامنے سنائے جاتے ہیں۔ ظہیر انور نے ہمیں اس نئے فارم سے روشناس تو کرا دیا ہے مگر ابھی اس کے خد و خال مکمل طور پر واضح نہیں ہوئے ہیں۔

سارتر کی ادبی تخلیقات۔ پروفیسر زاہدہ زیدی، آجکل، دہلی، مارچ ۱۹۹۲ء

محترمہ زاہدہ زیدی نے اپنے اس مضمون میں، سارتر کی دیگر تصانیف کے ساتھ ساتھ اس کے دو ڈراموں "مکھیاں اور بند کمرہ" کا بھی جائزہ لیا ہے۔ مکھیاں کے بارے میں لکھتی ہیں کہ "اس کے ابتدائی دور کا ڈراما ہے اور سوفوکلیز کی دیو مالائی کہانی کا جدید ڈرامائی روپ ہے جس میں سارتر نے اصل (ORIGINAL) کہانی کے ظاہری خد و خال

کو قائم رکھا ہے لیکن اس کی معنویت کو اس حد تک بدل دیا ہے کہ وہ ڈرامائی صورت حال سارتر کے مخصوص وجودی تصورات کی تجسیم بن گئی ہے۔" اس کے بعد ڈرامے کا مختصر پلاٹ دیا گیا ہے۔ دوسرا ڈراما بند کمرہ ہے جس کے بارے میں زاہدہ زیدی تحریر فرماتی ہیں کہ "سارتر کا دوسرا اہم ڈراما بند کمرہ (NO EXIT) ہے جس کے کردار زیادہ دلچسپ اور پیچیدہ ہیں اور ان کا مطالعہ بڑی باریک بینی سے کیا گیا ہے۔ لیکن اس ڈرامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں سارتر کے وجودی تصورات ڈرامے کی نئی ساخت میں پوری طرح پیوست ہیں اور ڈراما ایک طویل استعارہ (EXTENDED METAPHOR) معلوم ہوتا ہے۔" تین گنہگار ایک کمرے میں بند ہیں یہ کمرہ ان کے لیے جہنم ہے۔ انھیں تین کرداروں کا مطالعہ ہے۔ زاہدہ زیدی فرماتی ہیں کہ "بند کمرہ" سارتر کا کامیاب ترین شاہکار ہے جس سے سارتر کی ڈرامائی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔" بہر حال یہ مضمون سارتر کی چند تخلیقات کے بارے میں نہ صرف قیمتی معلومات بلکہ اس کے فن کو سمجھنے میں بھی مدد کرتا ہے۔

یوجین آئینیسکو (اوان گارد ڈرامے کا ایک اہم نام) زاہدہ زیدی

ایوان اردو دہلی اپریل ۱۹۹۲ء

ایبسرڈ ڈراما کی تحریک کے اماموں میں بیکٹ اور آئینیسکو کے نام سر فہرست ہیں۔ زاہدہ زیدی آئینیسکو کے بارے میں لکھتی ہیں کہ "آئینیسکو نے ڈرامے کے پوشیدہ امکانات کو بروئے کار لا کر ذہن انسانی کے رموز و اسرار اور لاشعور کی ..در تہ گہرائیوں کو فن کے قالب میں ڈھالا۔ آئینیسکو نے سطحی حقیقت نگاری، ..رامے کے منطقی تصور، میکانکی سانچے، مصنوعی روایات اور بندھے ٹکے ..صولوں سے انحراف کیا اور ایک ایسے وجدانی اور آفاقی ڈرامے کا تصور پیش ..ا جو انسانی حقیقتوں کو توڑ موڑ کر روایتی انداز سے پیش کرنے کے بجائے داخلی ..ہنے کی گہرائیوں میں اترنے، لاشعور کی دنیا کو بے نقاب کرنے اور حیرت انگیز ..یرتوں کے انکشاف کی صلاحیت رکھتا تھا۔" وہ یہ بھی فرماتی ہیں کہ آئینیسکو ..نے اسٹیج کی بے جان اشیاء کو ڈرامائی کرداروں میں تبدیل کر دیا۔ آئینیسکو کے ..میاب ترین ڈراموں میں کرسیاں، نیا کرایہ دار، اسباق اور گینڈے شامل کرتی ..ں۔ ان میں سے اکثر پر انھوں نے تفصیل سے بحث کی ہے اور ان کے موضوعات ..ر ان کا فنی تجزیہ کیا ہے۔ اس کے ابتدائی دور کے ڈراموں میں کرسیوں کو شاہکار

ڈرا دمشق ہیں اور دو سب سے دور کے ڈراموں میں گیلئے، قاتل، بادشاہ سلامت، ماہ فظا اور ہوا میں چہل قدمی کو قابل ذکر فرماتی ہیں۔ آخر میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ یہ جائزہ حرف آخر نہیں ہے۔ پھر بھی زاہدہ زیدی صاحبہ نے ایونیسکو کے ڈراموں کا جس طرح تعارف کرایا ہے وہ ڈرامے سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے اہم ہے

مشرقی بنگال میں اردو ڈرامے کا پس منظر۔ کلیم سہسرامی

کتاب نما، دہلی، اگست ۱۹۹۲ء

کلیم سہسرامی صاحب نے اپنے اس مضمون میں اردو ڈرامے کی تاریخ کے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے کہ اندر سبھائی دور میں مشرقی بنگال میں اردو کا آغاز ہو چکا تھا۔ اردو کے طبعزاد ڈرامے لکھے اور کھیلے جا رہے تھے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن مرحوم کی کتاب "ڈھاکہ پچاس برس پہلے" کا ایک طویل اقتباس پیش کیا ہے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ واجد علی شاہ کے کلکتہ جانے سے بعد جب اودھ میں ڈرامے کا زوال ہوا تو اردو تھیٹر پہلے بمبئی نہیں بلکہ ڈھاکہ منتقل ہوا اور اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ ابتدا میں بمبئی میں جو ڈرامے اسٹیج ہوئے وہ طبعزاد نہیں بلکہ گجراتی سے ترجمہ کیے ہوئے تھے جب کہ ڈھاکہ میں طبعزاد ڈرامے اسٹیج کیے جا رہے تھے۔ کلیم صاحب نے "بہار بلبل" نامی ڈرامے سے تفصیلی بحث کی ہے اور اب تو اس کا اصل متن بھی شائع کر دیا ہے اور عشرت رحمانی صاحب نے اس ڈرامے کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں انھیں دور کر دیا ہے۔ اس مضمون کی بنیاد پر کوئی ریسرچ اسکالر مشرقی بنگال میں اردو ڈرامے پر کام کر سکتا ہے۔

اردو ڈراما اور انارکلی۔ عالیہ خان۔ ایوان اردو، دہلی، جولائی ۱۹۹۲ء

دو ڈھائی صفحات کے اس مختصر مضمون میں اردو ڈرامے کے فن، سنسکرت ڈراما اور اردو ڈرامے کی تاریخ اور ڈراما انارکلی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ہر چیز تشنہ رہ گئی ہے۔

عربی ادب میں ڈراما اور اوپیرا کا تصور۔ گردیال سنگھ مجذوب

آج کل، دہلی مئی ۱۹۹۲ء

مجذوب صاحب نے تمثیل کی تین قسمیں بتلائی ہیں۔ اول مصوری، دوم

سنگ تراشی اور سوم اوپیرا۔ ان تینوں پر مختصر بحث کرنے کے بعد عربی زبان میں اوپیرا کی
عدم موجودگی کے وجوہ پر روشنی ڈالی ہے لیکن بعض عربی کی مشہور کتابوں کے بارے میں
فرماتے ہیں "ابن طفیل کی کہانی (حسن بن یقظان)، ابوالعلا المعری کی کہانی رسالۃ الغفران
مقالات بدیع الزماں اور مقالات حریری وغیرہ۔ ان کتابوں میں مکالمات یا مانولاگ
جو ڈرامے ہی کے بہترین عناصر ہیں جگہ جگہ بکھرے آسانی سے دستیاب ہیں اور یہی ڈراما
یا تھیٹر کے تصور کے لیے ایک جاندار محرک ہیں" مجذوب صاحب کا خیال ہے کہ عربی
میں تھیٹر یا اوپیرا کو فروغ دینے میں یہودیوں اور عیسائیوں کا ہاتھ زیادہ ہے۔ مجذوب صاحب
بتلاتے ہیں کہ ہارون النقاش نے عربی میں سب سے پہلے ۱۸۴۸ء میں البخیل نام کا ڈراما
اسٹیج کیا اس کے بعد عربی میں ڈرامے کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ مضمون عربی
ڈرامے کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔

۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۴ء کے درمیان ابراہیم یوسف نے درج ذیل مضامین لکھے

(۱) غالب اور ڈراما۔ کتاب نما دہلی۔ جنوری ۱۹۹۱ء
(۲) اردو ڈرامے کے کمزور پہلو۔ سابر نامہ گاندھی نگر۔ ۱۹۹۰ء
(۳) اردو میں ڈانس ڈرامے اور بیلے۔ تعمیر ہریانہ۔ دسمبر ۱۹۹۱ء
(۴) اردو ڈراما ۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۰ء تک۔ کتاب نما دہلی۔ فروری ۱۹۹۲ء
(۵) اردو ڈراما اور آج کا معاشرہ۔ عصری آگہی دہلی جلد ۲۔ ۱۹۹۲ء
(۶) اردو میں ڈانس ڈراما۔ ایوان اردو دہلی۔ جنوری ۱۹۹۳ء
(۷) اردو ڈرامے میں فوق الفطرت کردار۔ کتاب نما دہلی۔ اگست ۱۹۹۳ء

۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۴ء کے درمیان مندرجہ ذیل مجموعوں پر روایتی انداز کے تبصرے شائع ہوئے

(۱) پروانے کی خاک از علی عباس امید مبصر نعمان شوق۔ تعمیر ہریانہ فروری ۱۹۹۰ء
(۲) رنگ منچ۔ مرتبین انورامام و سلطان احمد۔ مبصر ایوان اردو دہلی جولائی ۱۹۹۰ء
(۳) دوسرا کرہ از زاہدہ زیدی۔ مبصر ادارہ شاعر بمبئی۔ جلد ۲۱ شمارہ نمبر ۲
(۴) گرداب۔ کمال احمد۔ مبصر ڈاکٹر ہارون ایوب۔ تعمیر ہریانہ ستمبر ۱۹۹۰ء

۵) دوسرا کمرہ از زاہدہ زیدی مبصر سعید الظفر چغتائی۔ آجکل دہلی۔ جولائی۔ ۱۹۹۱ء
۶) گرداب از کمال احمد مبصر خورشید اکرم۔ آج کل دہلی۔ اگست ۱۹۹۱ء
۷) زندہ گزٹ از عنایت حسین جیلانی مبصر شمیم حنفی۔ آجکل دہلی ستمبر۔ ۱۹۹۱ء
۸) ایک اور سپر اسٹار از قاضی مشتاق مبصر ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کتاب نما دہلی اکتوبر۔ ۱۹۹۱ء
۹) گرداب از کمال احمد مبصر ڈاکٹر اعجاز علی ارشد۔ کتاب نما دہلی مارچ۔ ۱۹۹۲ء
۱۰) تصویر غالب از ڈی۔ ای۔ ہیرسن مبصر ڈاکٹر سیفی پریمی کتاب نما دہلی مارچ۔ ۱۹۹۲ء
۱۱) صحرائے اعظم از زاہدہ زیدی مبصر ڈاکٹر محمد حسن۔ عصری ادب دہلی اپریل تا جولائی۔ ۱۹۹۲ء
۱۲) گرداب از کمال احمد مبصر ڈاکٹر محمد حسن۔ عصری ادب دہلی اپریل تا جولائی۔ ۱۹۹۲ء
۱۳) ڈاکٹر پشلعوث کی از رفعت سروش مبصر ڈاکٹر محمد حسن۔ عصری ادب دہلی اپریل تا جولائی۔ ۱۹۹۲ء
۱۴) دوسرا کنارہ از غلام جیلانی مبصر ابراہیم یوسف۔ کتاب نما دہلی جنوری۔ ۱۹۹۳ء
۱۵) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے از شکیل شاہجہاں پوری مبصر ابراہیم یوسف۔ کتاب نما دہلی جنوری۔ ۱۹۹۳ء
۱۶) صحرائے اعظم از زاہدہ زیدی مبصر محمود سعیدی ایوان اردو دہلی جون۔ ۱۹۹۲ء
۱۷) دوسرا کمرہ از زاہدہ زیدی مبصر شہناز ہاشمی۔ ایوان اردو دہلی اکتوبر۔ ۱۹۹۳ء
۱۸) صحرائے اعظم از زاہدہ زیدی مبصر مسز آمنہ کشور۔ آجکل دہلی مئی۔ ۱۹۹۳ء

ان تبصروں پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مجموعوں پر مختلف حضرات نے تبصرے کیے ہیں اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ ان تبصروں سے ایک ہی مجموعے پر مختلف مبصرین کے نقاط نظر سے آگاہی ہوتی ہے۔

مجموعی جائزہ لینے سے پہلے یہ اعتراف کر لینا ضروری ہے کہ اس دوران جو مجموعے شائع ہوئے جو ڈرامے اور ڈراموں کے بارے میں جو مضامین لکھے گئے یہ ان کا مکمل جائزہ نہیں ہے۔ صرف وہی مجموعے، ڈرامے اور مضامین زیر بحث آئے ہیں جن تک راقم الحروف پہنچ سکا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا گیا ہوگا جو دسترس سے باہر رہا۔ مثلاً کچھ مجموعوں کے بارے میں تبصروں اور اشتہارات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شائع ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک نظر سے نہیں گزرے جیسے ساجدہ زیدی کا چاروں موسم، النور امام و سلطان احمد کا رنگ منچ، عنایت حسین جیلانی کا زندہ گزٹ، قاضی مشتاق کا ایک اور سپر اسٹار، ڈی۔ ای۔ ہیرسن کا تصویر غالب وغیرہ۔ میں سب سے معذرت خواہ ہوں۔ دستیاب ہونے پر انشاء اللہ ضرور اس جائزہ کے ضمیمہ میں شامل کر دیے جائیں گے۔

مجموعی طور پر جب ہم ان چار پانچ سالوں کا جائزہ لیتے ہیں تو اطمینان ہوتا ہے کہ تعداد میں کم سہی مگر چند اچھے ڈراموں کے مجموعے منظر عام پر آئے جن میں زاہدہ زیدی کا "دوسرا کمرہ" اور "صحرائے اعظم" ساجدہ زیدی کا "تر مد کوئی نہیں" ظہیر انور کا "نئے موسم کا پہلا دن" اور ابراہیم یوسف کا (بزعم خود) "الجھاوے" ان مجموعوں کو اردو کے ڈرامائی ادب میں

اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ برخلاف اسکے جب ہم اس دوران لکھے جانے والے ڈراموں پر
نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مایوسی ہوتی ہے کہ دو چار ڈراموں کے علاوہ کوئی قابل ذکر ڈراما
نہیں لکھا گیا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ڈراما نگار کسی واقعے کو سپاٹ طور پر مکالموں میں
بیان کر دینے کو ڈراما سمجھ بیٹھے ہیں اور کشمکش کو خواہ وہ خارجی ہو یا داخلی اکثر نظر انداز کر گئے
ہیں اور بلا کشمکش کے ڈراما وجود میں نہیں آتا مثلاً پانڈے سنکالوی صاحب نے جو ڈرامے
کسی تاریخی واقعہ کو موضوع بنا کر لکھے ہیں ان میں نہ تو تشویش کا کوئی پہلو ہے اور نہ کشمکش
کا یہی صورت حال ان ڈراموں کی بھی ہے جو زین الدین حیدر صاحب نے کسی تاریخی شخصیت
کو موضوع بنا کر لکھے ہیں۔ اگر ڈرامے میں تشویش اور کشمکش کو نظر انداز کرنے کا رجحان
اسی طرح قائم رہا تو پھر ڈرامے، افسانے اور حالات زندگی میں کوئی فرق نہیں رہ جانے گا
ہر موضوع ڈرامے کے لیے ہوتا بھی نہیں ہے جب تک اس میں واضح طور پر کشمکش اور
تشویش کا پہلو نہ ہو۔ اس دوران لکھے جانے والے اچھے ڈراموں میں اظہار اثر کا "بیوی
اور مکان" ریوتی سرن شرما کا "چور" اور جاوید دانش کے "بھوپا" اور دلبری کا بھرم" کا نام
لیا جا سکتا ہے۔ چار پانچ سالوں میں چار اچھے ڈرامے کوئی معقول تعداد نہیں ہے۔ باقی
ڈرامے یا تو فنی اعتبار سے بہت کمزور ہیں یا پھر ان میں فن کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔
ترجمے کے اعتبار سے یہ دور خشک سالی کا دور رہا۔ ظہیر انور نے ایک ڈرامے کا ترجمہ کیا اور
بس۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے اس میں زیادہ تر معلوماتی مضامین لکھے گئے۔ ظہیر
انور نے" بادل سرکار کا تھرڈ تھیٹر" "جاترا۔ بنگال کی ایک اہم روایت" "کامیڈی آف دی آرٹ"
اور "سماجی ڈرامے۔ ڈرامے کی ایک نئی شاخ" پر مضامین لکھے اور یہ سب معلوماتی ہیں۔
ابدہ زیدی کے دونوں مضامین" سارتر کی ادبی تخلیقات اور یوجین ایونیسکو میں معلومات
کے ساتھ ڈرامے کے تجزیہ کرنے کا ضرور معیار قائم کیا ہے۔ ہمارے ناقدین اپنے دور کے
راموں پر لکھنے سے جانے کیوں چشم پوشی کرتے ہیں۔ اگر ڈرامے پر بادل ناخواستہ قلم
ٹھاتے ہیں تو اردو ڈرامے کی تاریخ کو موضوع بناتے ہیں۔ آج اردو ڈرامے کی کیا صورت
ال ہے اس طرف کم نظر ڈالتے ہیں۔ ڈراموں کے مجموعوں پر تبصرہ کرتے وقت مصلحت
سندی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اگر دو چار جملے تنقیدی لکھتے بھی ہیں تو انداز معذرت کا
ا ہوتا ہے۔ اگر ہمیں اردو ڈرامے کا معیار بلند کرنا ہے تو اس منفی رجحان کو بدلنا ہوگا اور
منف کو بھی خوش دلی سے اعتراضات پر غور کرنا ہوگا۔

بچوں کی نئی دلچسپ کتابیں

ننھے منے بچوں کے لیے

بتاشے ۶/۵۰
جاں نثار دوست ۵/:
چاندی کی بیٹی (با تصویر) ۵/:
دم کٹی لومڑی " ۶/۵۰
جادو کی ہنڈیا " ۵/:
شیر اور بکری " ۶/۵۰
کتے کا خواب " ۶/۵۰
بھیڑیے کا گانا " ۶/۵۰
چالاک بلی " ۶/:
گدھے نے بجائی بانسری " ۶/۵۰

بڑے بچوں کے لیے

نوعلی کا آدم خور ۴/=
غریب لکڑہارے کی کہانی ۶/=
خلائی مسافر ۶/-
ہمت کے کرشمے ۶/-
مونٹی کرسٹو کا نواب ۹/=
ہمارے عظیم سائنس داں ۸/=
سام پہ کیا گزری ۳/۵۰
غذا کی کہانی ۳/-
زیبو ۶/-
شہنشاہ نے کہا میں مفلس ہوا ۶/-
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی ۴/-
سنہرے اصول ۳/-
نرالے گویے ۲/-
باتونی کچھوا ۴/-
بد شہزادی ۶/-

مولانا آزاد کی کہانی ۱۸/:
تنہا سیاح ۷/-
ابو خاں کی بکری ۱۵/-
پرواز کی کہانی ۳/-
سمندری طوفان اور تین لڑکے ۶/-
خالی ہاتھ ۹/:
حاجی بابا کی ڈائری ۶/۵۰
بہادر علی ۷/۵۰
کھلونا نگر ۷/:
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی ۶/:
قصہ اژدہا پکڑنے کا ۵/:
ننھا سراغ رساں ۵/:
ابو علی کا جوتا ۵/:
چند مشہور طبیب اور سائنس داں ۹/-
چور پکڑو ۳/-
چالاک خرگوش کے کارنامے ۷/۵۰
جادو کی سارنگی ۳/-
جادو کا چھلا ۳/-
پانچ جاسوس ۸/۵۰
جنگل کی ایک رات ۶/:
ہرن کا دل ۲/:
اچھی کہانیاں ۲/۵۰
دریا کی رانی ۲/:
گوہر شہزادی ۳/:
تین اناڑی ۶/:
چوری کی عادت ۳/۵۰
شرارت ۳/:
دلی کی شادی ۴/=
گاندھی جی دکنی افریقہ میں ۲/:
بندر اور نائی ۳/۵۰
رنگوں کی بستی ۴/:

پراسرار غار ۵/:
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں ۶/۵۰
بچوں کے ذاکر صاحب ۶/:
ننھا مٹھو ۲/:
آؤ ڈراما کریں ۳/:
سلام صمصامہ ۵/:
چھپیرا اور اس کی بیوی ۳/۵۰
ایک کھلا راز ۳/۵۰
بھوتوں کا جہاز ۶/۵۰
صحت کی الف بے ۵/:
لومڑی کا گھر ۳/:
بچوں کی کہانیاں ۳/:
بابا ناصح ۳/:
ہار کی تلاش ۶/:
سرخ جوتے ۳/۵۰
اندرا گاندھی ۶/:
ننھا فرشتہ ۳/۵۰
جوہر قابل ۳/:
بھیڑیے کے بچے ۳/:
ننھا جھبرو ۳/۵۰
پلک نہ مارو ۶/:
بچوں کے افسر ۶/:
شریر شیرا ۳/:
پری رانی ۳/:
خطرناک سفر ۳/۵۰
پرندوں سے جانوروں تک ۲/۵۰
ٹوٹے کھلونے ۵/=
اندھے کا بیٹا ۲/۵۰
پانچ بونے ۲/=
بچوں کے چار بزرگ دوست ۳/=
سہانے ترانے ۱/۵۰

سید ضمیر جعفری

غزل

○

گردن کٹ گئی کالر سے — ٹینک ڈھلے ہیں ڈالر سے
کتنا سرد اور زرد ہُوا — انساں، انساں کے ڈر سے
اس کا نسخہ اور کوئی؟ — جنگ رُکی کب لشکر سے
مال برآمد کون کرے — نقب لگی ہے اندر سے
دفتر— ہٹی کھٹی کی — حاکم ہیں سوداگر سے
مشرق مغرب کے مابین — کنوئیں کی جنگ سمندر سے
سورج مانگے ہے کرنیں — چھت لٹکی چمگادڑ سے
دھوپ بھی نکلی نم نم سی — بادل بھی کم کم برسے
جانے کب چھوٹے گی جان — دارا اور سکندر سے
گھر کو آگ نہ لگ جائے — ایٹم کے بجلی گھر سے
سماں کہے اس دھوپ میں مانگ — چھاؤں ماں کی چادر سے

میرے شعر کی سُد مٹی
جہلم اور گوادر سے

احمد سعید صدیقی،
بی-۸ کرسنٹ شوز ماڈل کالونی۔
کراچی۔

غزل

(۱)

اک لطف تھا آزار میں
اک آنکھ تھی دیوار میں
تھا خون میرے جسم پر
اور زخم تھا تلوار میں

یوسف میں تھے یوسف کئی
بازار سے تھے بازار میں
سر میں تھا اک سودا عجب
تھا جن کوئی اس غار میں

یوں ہی نہ تھے خاموش ہم
لکھا تھا کیا اظہار میں

(۲)

اک صدا بے صداؤں کے اندر
کوئی پتھر ہواؤں کے اندر
اک پرندہ اڑان کرتا ہوا
اور دشائیں دشاؤں کے اندر
تن بہت سے مقدروں کے خلاف

دل بہت سے دعاؤں کے اندر
وہم سے کچھ یقین کے پیچھے
زہر سا کچھ دواؤں کے اندر

حفیظ بنارسی
ملکی محلہ
آرہ۔ بہار

غزل

ہر غم کے لیے دل جو کشادہ نہیں رکھتے
شاید کہ وہ جینے کا ارادہ نہیں رکھتے

روداد نہ ہو جس پہ کسی جانِ غزل کی
ہم دل کا ورق اتنا بھی سادہ نہیں رکھتے

میخانے کے یہ محتسب تازہ ہیں کیسے
ساغر میں لہو رکھتے ہیں بادہ نہیں رکھتے

گزریں گے ہر اک راہ سے سرمست و غزلخواں
ہم اہلِ محبت غمِ جادہ نہیں رکھتے

دولت کے پرستار ہیں جو بندۂ زر ہیں
ان لوگوں سے ہم ربط زیادہ نہیں رکھتے

سعود منزل۔ گولا گنج،
لکھنؤ۔

غزل

میرے کانوں میں یہ کیسی صدائے نوحہ خوانی ہے

بہت بوجھل سی پلکیں ہیں بہت دل پر گرانی ہے

کہاں کے مشرق و مغرب سبھی اک رنگ دکھتے ہیں

یہاں بھی خون پانی ہے، وہاں بھی خون پانی ہے

تو کیا سچ ہے کہ ہم ہابیل اور قابیل جیسے ہیں

تو کیوں ہم پہ ازل سے یہ عتابِ آسمانی ہے

نہ اس گہرے کنویں کی یاترا پر کوئی پلٹے گا

نہ بولے پیر مینا ہی اب کسی کو آزمانی ہے

اگر خوفِ خدا ہے تو تمہارا دل بھی ہم دیکھیں
چلو سیلاب سے اک ڈوبتی کشتی بچانی ہے
یہ سچ ہے شمسؔ جی اب اپنے دل سے بات کرتے ہیں
جو ان کی خود کلامی ہے وہ ہم سب کی کہانی ہے

۹۱ بینی چرچ روڈ جہانگیر آباد
بھوپال۔ ایم۔ پی

غزل

ہم سفردہ ہیں آگہی کے لیے
ان اندھیروں میں روشنی کے لیے

مصلحت آپ ہی سے سیکھی ہے
دوستی کی ہے، دشمنی کے لیے

آپ کچھ بھی تو التفات کریں
یہ بھی لازم ہے آدمی کے لیے

بہہ رہے ہیں جو آنکھ سے آنسو
وہی سرمایہ ہیں کسی کے لیے

التجا تو نہ کی کبھی بھی ظہیرؔ
غرض ہے یہ تو بندگی کے لیے

پرکاش تیواری
۱۹۹ سیکٹر ۲۔ آر۔ کے پورم
نئی دہلی۔

رنگِ زندگی

سیاہ سفید کیا ہرا
نفس نفس حیات کا
ہر ایک رنگ ہے بھلا
سے سیاہ رات کا
سکونِ جاں سے ہے بھرا
سیاہ زلفِ یار میں
لیں غموں سے راحتیں
سیلی ساونی گھٹا
کرے چمن ہرا بھرا
سفید رنگ صبح کا
بشر کو خواب دے نیا
سفید رنگ پیار کا
سدا رہے دُھلا دُھلا
سفید ماں کے دودھ سا
ہمیشہ مامتا بھرا
ہرا ہے زندگی ہے چہک
ہرا ہے شاخ کی مہک
ہرے سے کائنات ہے
جہان میں حیات ہے !!

حسن رضاؔ
کوارٹر نمبر ۱۶۔ اے
یرمرس کیمپ۔ رائچور۔ کرناٹک

غزل

گاؤں پر تو بادل مارے گرجے بھی اور برسے بھی
ایسے میں کچھ لوگ سنا ہے پانی پانی ترسے بھی

بستی بستی بنجر بنجر بن بن گھومے بنجارے
کون سے سکھ کی خاطر جانے اوب گئے ہیں گھر سے بھی

کتنے ہی دیوانے پنچھی ہم نے دیکھا گلشن میں
کاشانے تعمیر کیے ہیں اپنے بال و پر سے بھی

پایا پانی سے ٹخنوں گھٹنوں اور کمر سے بڑھتے ہوتے
اب جو گلے تک آیا ہے وہ پانی گزرا سر سے بھی

کوئی مقرر سمت نہیں ہے آج ہوائیں چلتی ہیں
دائیں بائیں آگے پیچھے نیچے سے اوپر سے بھی

آشاؤں کے دیپ جلانا سیکھ گئے ہیں خان رضاؔ
اور چراغاں کر سکتے ہیں اپنی چشمِ تر سے بھی

ساجد حمید
شیموگا۔ کرناٹک

رفیق جعفر
۱۲/۶۱ مالونی کالونی نمبر ۶ بمبئی ۹۵ ...۴۰۰

راستے چُپ چاپ ہیں عزمِ سفر خاموش ہے
الجھنوں کی بھیڑ میں گم ہر نظر خاموش ہے

سب مناظر ایک سے ہیں سارے چہرے ایک سے
برف احساسات ہیں میری نظر خاموش ہے

یوں بہار آئی چمن میں ذرّہ ذرّہ جی اٹھا
دل کے آنگن کا مگر تنہا شجر خاموش ہے

کیا ہوئے وہ مدبھرے بھرپور روشن قہقہے
میرے ساقی میکدہ کیوں اس قدر خاموش ہے

اس کے آنے کا کوئی امکان کیا باقی نہیں
ساجدم پھر کیوں چراغِ رہگزر خاموش ہے

آنکھ دبی اور نکلا پانی
موتی بن کر بکھرا پانی

میں نے دیکھا شہروں شہروں
سونے سے بھی منہگا پانی

بیتی باتیں یاد دلانے
رم جھم رم جھم برسا پانی

ساون کے ماتھے پر جیسے
جھومر بن کر چمکا پانی

جس میں ڈوبے میرا ماضی
ٹوٹ کے برسے ایسا پانی

جس کا کوئی رنگ ہو جعفر
دیکھا تم نے ایسا پانی!

رسالہ ہندستانی الہ آباد (۱۹۳۱ء۔۱۹۴۸ء) سے انتخاب

اردو ادب

اس مجموعے میں ظفر الاحسن لاری، عبدالسلام ندوی، سیماب اکبرآبادی، گنپت سہائے سریواستو، رفیق حسین، بھگوت دیال ورما، سید مبارز الدین احمد رفعت، ہیش پرشاد وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔

قیمت ۵۰/ روپے

اردو لغت

اس مجموعے میں سید مسعود حسن رضوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، عبدالباری آسی، محمد اجمل خاں، سلیم جعفر، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور نعیم الرحمٰن کے اہم مضامین شامل ہیں۔ قیمت ۴۰/ روپے

چند ادبی مشاہیر کی تحریریں

میر، سرشار، جلال، اقبال، اصغر گونڈوی، محمود شیرانی، ٹیگور، سروجنی نائیڈو پر لکھے ہوئے مضامین نیز ان ادیبوں میں سے اکثر کے لکھے ہوئے مضامین اس گلدستے میں شامل ہیں۔ قیمت ۷۰/ روپے

اردو ہندی ہندستانی

یہ مجموعہ ہے اظہر علی، سید ابوالقاسم، سعید انصاری، محمد اجمل خاں، کرشن پرشاد کول، تارا چند وغیرہ کے اہم ترین مضامین کا۔ قیمت ۴۰/ روپے

ہندی ادبیات

اس مجموعے میں نور الحسن نیر کاکوروی، طاہر محسن علوی، اقبال ورما، سید رشید الحسن، کشتہ قادری اور محمد ضیاء الدین کے مضامین شامل ہیں۔

قیمت ۴۰/ روپے

تاریخ

اس مجموعے میں آغا مہدی حسین، بینی پرشاد، بنارسی پرشاد سکسینہ، سید مقبول احمد صمدنی، محمد تقی احمد، بریاگ دیال، شوکت تھانوی، پروفیسر عبدالباسط، حکیم شمس اللہ قادری، اور ایچ اے آر گب کے مضامین شامل ہیں۔ قیمت ۶۰/ روپے

سائنس

اس مجموعے میں شبیر احمد غوری، رفعت حسین صدیقی، صدر الدین عظیم، امداد حسین خاں، مقبول الرحمٰن، محمد امین عباسی، راغب بدایونی، جعفر حسن، محمد ذکی الدین اور پروفیسر منہاج الدین کے اہم ترین مضامین شامل ہیں۔ قیمت ۶۰/ روپے

خدا بخش لائبریری جرنل ۷۰ — اڈیٹر عابد رضا بیدار

خدا بخش لائبریری کا یہ جرنل نہایت اہم ترین مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں امیر خسرو پر بھی مضمون ہے اور سکوں کے اشعار پر بھی۔ مخطوطات شناسی پر بھی اور بابری مسجد اور رام جنم بھومی پر بھی۔ مسلمان اور سائنس پر بھی اور مسٹر جناح پر بھی۔

قیمت ۷۵/ روپے

ہندستان اپنے حصار میں — ایم جے اکبر

مترجم۔ مسعود الحق

ایم جے اکبر کی معرکۃ الآرا کتاب جس نے انگریزی میں شائع ہوتے ہی ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس کتاب میں ہندستان کی سیاست کے تاریک گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ایک اہم دستاویز۔

قیمت ۱۰۰/ روپے

مانگے کا اُجالا

سخن در سخن

خامہ بگوش

تنقید یا دشنام نویسی

ساقی فاروقی کی ایک نظم کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے انھیں ایک خط میں لکھا تھا۔ "آپ فن کی ان بلندیوں پر ہیں کہ لوگ آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو ان کی ٹوپیاں اور پگڑیاں گر جاتی ہیں۔"

ساقی نے اس بیداد نما داد کا شکریہ ان لفظوں میں کیا تھا۔

"اس طرح کی داد وہی لوگ دیتے ہیں جو اندر سے مضبوط ہوں۔ شکریہ میرے دوست بہت بہت شکریہ۔"

ہم نے ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے کالم میں لکھا تھا

"ساقی کی بلندیوں کو دیکھ کر جو ٹوپیاں اور پگڑیاں نہیں گرتیں انھیں ساقی خود اپنے ہاتھ سے گرا دیتے ہیں۔"

ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہمارا یہ تبصرہ دراصل ایک پیش گوئی ہے، اور ٹھیک دس برس کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا کی دستارِ فضیلت ہوگی اور ساقی فاروقی کا دستِ باد پیما۔ ممکن ہے مشاعروں میں شرکت کرنے والے پیشہ ور شاعروں اور نثری نظم لکھنے والوں کو "دستِ باد پیما" کا مطلب سمجھنے میں دقت ہو۔ انھیں مزید تھوڑی سی دقت ہوگی، اس ترکیب کا مفہوم کسی لغت میں دیکھ لیں، یا پھر اس کالم کا اگلا پیراگراف غور سے پڑھ لیں۔

دس سال پہلے ڈاکٹر وزیر آغا، بقول ساقی، اندر سے بہت مضبوط تھے، لیکن اب وہ اتنے کمزور ہو چکے ہیں کہ ساقی نے ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ یہ اعلانِ جنگ ڈاکٹر صاحب کے نام ساقی کے ایک طویل خط کی صورت میں سامنے آیا ہے جو پہلے فوٹو اسٹیٹ کی صورت میں تقسیم ہوا پھر دہلی کے سہ ماہی "ذہنِ جدید" میں شائع ہوا ہے

لاہور کے رسالے "معاصر" میں جلوہ افروز ہوا ہے۔ جب تک ہمارا یہ کالم شائع ہوگا امید ہے یہ خط کئی اور رسالوں میں چھپ کر ساقی کی شہرت میں بے پناہ اضافہ کا سبب بن چکا ہوگا۔ ایک خط سے اتنی بہت سی شہرت سمیٹ لینا، ساقی کا کمال نہیں کہ شہرت آج کل اسی طرح ملتی ہے۔ ساقی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے یہ خط بڑی محنت سے اور بہت سے خطرات مول لے کر لکھا ہے جس کا اندازہ خط کی ان آخری سطور سے ہوتا ہے۔ "بہت تھک گیا ہوں۔ صبح کے سات بجے ہیں۔ رات بھر سوچتا اور لکھتا رہا ہوں۔ آج رات بھی سگریٹ کے تین پیکٹ، فرانس کی ایک سرخ وائن کی بوتل اور جرمنی کی ایک سفید وائن کی بوتل پی چکا ہوں۔ یہ چیزیں دل کے مریض کے لیے زہر ہیں۔"

یہ ایک رات کی روداد ہے۔ باقی دو راتوں میں بھی یہی کچھ ہوا ہوگا۔ اس سے ساقی کی محنت اور لگن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک اعلا مقصد کے حصول کے لیے دل کا مریض ہونے کے باوجود زہر خوری کا شغل فرماتے رہے ہیں۔ چھے بوتلوں کی روشنائی سے انھوں نے جو خط لکھا ہے، اسے پڑھتے ہوئے، پڑھنے والا بھی جھومنے لگتا ہے اور اس کا سر اس طرح گھومنے لگتا ہے جیسے خط لکھنے والے کا دست بادپیما۔

اس خط کو بار بار چھپوانے کا مقصد شاید یہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا مشتعل ہو کر اس کا جواب لکھیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اس طرف توجہ ہی نہیں کر رہے۔ ہماری رائے میں انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ ان کی بجائے ساقی مشتعل ہو جائیں گے اور ان کے نام ایک اور خط لکھ ڈالیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے پچھلے دنوں ساقی نے رسالہ "سوغات" بنگلور کے اڈیٹر محمود ایاز کے نام گالیوں بھرا ایک خط لکھا تھا۔ جب کوئی جواب نہ آیا تو ایک اور خط لکھ دیا جس میں سابقہ گالیوں کی شرح بھی تھی اور کچھ نئی گالیوں کا اضافہ بھی تھا۔ اگر اس خط کا بھی جواب نہ آیا تو پھر سمجھ لینا چاہیے کہ محمود ایاز کی ساری زندگی ساقی کے خط وصول کرنے میں گزر جائے گی۔

ساقی کی خوبی یہ ہے کہ جب وہ کوئی عتاب نامہ لکھتے ہیں تو مکتوب الیہ کو بعد میں بھیجتے ہیں، پہلے اس کی سیکڑوں نقلیں ادھر ادھر تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس سے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ مکتوب الیہ کی رسوائی بڑے پیمانے پر ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ جن لوگوں کو اس خط کی نقلیں ملتی ہیں وہ اس خیال سے دہل جاتے ہیں کہ ایسا خط ایک دن ان کے نام بھی لکھا جا سکتا ہے، اسی لیے تو ہم نے ساقی کے تنقیدی مضامین کے مجموعے "بازگشت و بازیافت" پر تبصرہ کرتے ہوئے انھیں ایک ادبی دہشت گرد قرار دیا تھا اور یہ لکھا تھا

شرافت کی بات اسی لیے درمیان میں آئی کہ ساقی کی لغت میں لحاظ و مروّت نام کی کوئی چیز نہیں ہے، وہ بے باکی بلکہ سفاکی کی حد تک صاف گو ہیں۔ واضح رہے کہ صاف گوئی کو بے معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا۔

ساقی کی تازہ ترین دہشت گردی کا ہدف ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ بظاہر تو ساقی نے ان کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے لیکن انداز بیان ایسا اختیار کیا ہے جیسے ڈاکٹر صاحب سے ان کی پرانی دشمنی ہو۔ حالانکہ دونوں میں سولہ برس تک خوشگوار دوستانہ تعلقات رہے ہیں جن کی تفصیل خود ساقی نے اپنے خط میں بیان کردی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دونوں کے درمیان اسی خطوں کا تبادلہ ہوا۔ ساقی نے متعدد مرتبہ لاہور اور سرگودھا میں ڈاکٹر صاحب کی میزبانی کے مزے لوٹے۔ میزبان ہی نہیں، اس کے طلازمو نے بھی مہمان کو زیر بار کیا۔ دو مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا بھی لندن گئے۔ ساقی نے اس پر اظہار افسوس بھی کیا ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی خاطر خواہ مدارات نہیں کرسکے۔ ہمیں ساقی کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔ مہمان کی مدارات صرف دعوتیں کرنے سے نہیں ہوتی۔ خط لکھ کر بھی کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا ساقی نے اپنا فرض بخوبی ادا کردیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ساقی کی تواضع پر جو کچھ خرچ کیا ہوگا، اس سے کہیں زیادہ ساقی نے ن چھے بوتلوں پر صرف کردیا ہوگا۔ جو خط لکھنے کے دوران خالی کی گئیں۔

باہمی محبت کے سلسلے میں خط میں ساقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ "آپ نے میری ن گنت نظموں کے سلسلے میں غلو سے کام لیا اور اس طرح داد دی (جس طرح) راشد محمد حسن عسکری، ناصر کاظمی، سلیم احمد اور راطیر نفیس دیا کرتے تھے ...... میں نے بھی ب کی علمی فراست اور آپ کی تنقیدی بصیرت کو اپنے کسی انٹرویو میں نظر انداز نہیں کیا۔ لکہ آپ کے فیض والے مضمون سے اتنا خوش ہوا کہ اپنی ایک نظم یا غزل آپ کے نام معنون کردی۔ یہ سعادت میں نے کسی اور کو نہیں بخشی۔"

استاد لاغر مرادآبادی نے یہ اقتباس پڑھ کر فرمایا۔

"اب کے ساقی نے ڈاکٹر وزیر آغا کو ایک اور سعادت بخشی ہے کہ ان کے نام کے خط میں گالیوں سمیت ایسی بہت سی باتیں لکھ دی ہیں جنھوں نے سولہ برسوں کے مخلصانہ تعلقات پر خاک ڈال دی ہے۔"

ہمیں استاد گرامی کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ ساقی کی دشنام طرازی ہمیشہ خلوص پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خلوص وہ ہوتا ہے جو انھیں

آپ کی ذات گرامی سے ہے۔ اور پھر دشنام طرازی اور دشنام نویسی ہی تو ساقی کی شناخت ہے ڈاکٹر وزیر آغا کا احترام اپنی جگہ لیکن ڈاکٹر صاحب کی خاطر ساقی اپنے آپ کو بے شناخت تو نہیں کر سکتے۔

ہمیں اس سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ ساقی نے اپنے خط میں دل کا غبار نکالا ہے یہ دل کا نہیں دماغ کا غبار ہے جسے دماغ سوزی بھی کہا جا سکتا ہے۔ ساقی کو ڈاکٹر صاحب کے کلام میں عروض، زبان و بیان اور الفاظ کے استعمال کی جو غلطیاں نظر آتی ہیں وہ دماغ سوزی ہی کا نتیجہ ہیں۔

ساقی نے جتنی دماغ سوزی ڈاکٹر صاحب کی شاعری پر کی ہے اگر اس کا دسواں حصہ وہ اپنی شاعری پر صرف [illegible] تو ان کا مجموعہ کلام "دیوان غالب" کے برابر رکھا جا سکتا تھا۔

غالب کا مکان، ایک مسجد کے پہلو میں تھا جس کی بنا پر غالب اپنے آپ کو "ہمسایۂ خدا" کہا کرتے تھے۔ اسی طرح ساقی بھی اپنے مجموعے کو دیوان غالب کے ساتھ رکھا دیکھ کر "ہمسایۂ غالب" ہونے پر فخر کر سکتے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ خود غالب کا کیا ردّ عمل ہوتا؟

لوگ پوچھتے ہیں کہ آخر فریقین میں اتنے گہرے تعلقات کا ایسا افسوس ناک انجام کیوں ہوا۔ اس کی وجہ بھی ساقی نے خود ہی بتا دی ہے۔ خط کے شروع میں وہ لکھتے ہیں "میری شکایت یہ رہی کہ آپ نے مجھ سے زیادہ کم تر شاعروں کا گوشہ (اپنے رسالے) اوراق میں نکالا، میرا کیوں نہیں"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ساقی کی شکایت بجا ہے۔ آخر ڈاکٹر صاحب نے اپنے رسالے کے غالب نمبر اور اقبال نمبر شائع کیے ہیں، اگر ایک گوشہ ساقی فاروقی کا بھی نکال دیتے تو کیا حرج تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جان بوجھ کر ساقی سے "زیادہ کم تر" شاعروں یعنی غالب اور اقبال کو اچھالا اور ساقی کو نظر انداز کیا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سارا قصور ڈاکٹر صاحب کا نظر آتا ہے۔ کاش وہ صرف خطوں ہی میں ساقی کی تعریف نہ کرتے، اپنے رسالے کے صفحات کو بھی آلودۂ مدح کر دیتے تو ساقی کو ان کی شان میں "قدح نامہ" لکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

بعض لوگوں کی مذکورہ رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ فرق کیا، ڈاکٹر صاحب ساقی کی شان میں گوشہ کیا، پورا نمبر بھی شائع کر دیتے تو اس سے ساقی کی حیثیت میں کیا فرق پڑتا۔ وہ جیسے ہیں اور جس مقام پر ہیں، ویسے ہی اور وہیں رہتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح غالب اور اقبال سے متعلق خصوصی شماروں کی اشاعت کے بعد بھی ان دونوں شاعروں کے قد و قامت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اصل بات یہ ہے کہ ساقی اس رسالے کے ذریعے خود کچھ حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اپنے حوالے سے رسالے کے معیار کو اونچا دیکھنے کے خواہاں تھے۔ ساقی کا گوشہ چھپتا تو چار دانگ عالم

اور ان کی دھوم مچ جاتی۔ رسالہ گودام میں پڑے رہنے کی بجائے ہاتھوں ہاتھ بک جاتا۔ آدھا اڈیشن تو ساقی خود ہی خرید لیتے کہ وہ معیاری کتابیں اور رسالے بڑی تعداد میں خرید کر دوستوں میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان

تالیف :۔ مولانا حکیم محمود احمد برکاتی

اس کتاب میں برکاتی صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ نیز ان کی تصانیف، تلامذہ، مریدین شاہ ولی اللہ کا تعارف بھی ہے۔

قیمت -/۴۵ روپے

تذکرۂ ماہ و سال

مالک رام

اس مجموعے میں اردو کے بیشتر ادیب، شاعر، نقاد، کالم نگار، صحافی اور دوسرے اہم عمائد (جنھوں نے اردو ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے) کی تاریخ ولادت اور جو ہماری بدقسمتی سے انتقال کر چکے ہیں ان میں سے اکثر کی تاریخ وفات بھی درج ہے۔ کسی بھی اہم ادیب پر مضمون لکھتے وقت اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

افکارِ اقبال

محمد عبدالسلام خاں

اس اہم کتاب میں علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی، ان کے اردو اور فارسی کلام پر سیر حاصل بحث، ان کے مذہبی اور سیاسی افکار، اور کچھ ایسے اہم واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جو اب تک اندھیرے میں تھے۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

تحقیق نامہ

مشفق خواجہ

مشفق خواجہ اردو کے وہ واحد محقق ہیں جو ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی اہمیت کی بنا پر ہمارے ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی خلا کو پُر کرتے ہوں۔ زیر نظر مجموعہ میں ایسے ہی اہم ترین مضامین شامل ہیں۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

مرضیات

حکیم نعیم الدین زبیری

بیماریوں کے اصولی اسباب اور ان کی وجہ سے افعال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعے یعنی ماہیت الامراض (پیتھالوجی) پر جامع اور آسان بحث۔ طلبہ کے علاوہ اطبا کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔

قیمت -/۱۵ روپے

تاثرنہ کہ تنقید

صدیق الرحمٰن قدوائی

تنقید، ادب کی ایک اہم شاخ ہے مگر اس کا ضرورت سے زیادہ چرچا بھی اچھا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص "نقاد" ہو جائے۔ ادب کو تنقید کے سوا بھی مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے جن کا انحصار پڑھنے والوں کے انفرادی مزاجوں پر ہے۔ یہ تصنیف ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔

قیمت -/۵۱ روپے

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے

(عہد حاضر کے ۱۹ اہم ادیبوں کے انٹرویو)

طاہر مسعود

قیمت -/۶۶ روپے

رفعت سروش

پتّہ پتّہ بوٹا بوٹا......

(خودنوشت) قسط نمبر ۱

رفعت سروش معروف ادیب شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں اب تک ان کی پچیس کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ رفعت سروش کی کتاب "بمبئی کی بزم آرائیاں" اور "بستی بستی یہ دل ہے" بالترتیب ۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۳ء میں چھپ کر اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں انھوں نے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۹۱ء تک کے اپنے حالات زندگی اور اپنے ماحول کو نہایت بے باک انداز سے پیش کیا ہے، مگر انھوں اپنے بچپن سے لے کر ۱۹۴۵ء تک کے حالات ہنوز قلم بند نہیں کیے تھے اُن کی تفہیم کے لیے اُن کے ابتدائی حالات کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب "پتّہ پتّہ بوٹا......" اس کمی کو پورا کرے گی۔ جو ہم بالاقساط شائع کریں گے۔

(ادارہ)

گرمی کے دن ہیں۔ صحن میں ایک بیری کا درخت ہے جس کے کھٹے میٹھے بیر اپنا الگ ہی ذائقہ رکھتے ہیں ——— دن ڈھل گیا۔ اسارے میں مٹی کے تیل کی ڈبیا جل رہی ہے۔ باہر بھی اس کی دھیمی دھیمی روشنی آ رہی ہے۔ بیری کے پیڑ کے نیچے تین چار بان کی چارپائیاں کھڑی کر کے ان پر دوپٹے اس طرح ڈال دیے گئے ہیں کہ بھول بھلیاں بن گئی۔ سات آٹھ لڑکیاں۔ جن کی عمریں دس بارہ سال کے اندر ہیں۔ اس دوپٹوں کی بھول بھلیاں میں گھس کر اور چھپ چھپ کر ایک دوسرے کو پکڑنے کا کھیل کھیل رہی ہیں اور اس کھیل کا نام ہے "چندر روپاٹ" ان لڑکیوں کے ساتھ تین چار سال کا ایک لڑکا بھی کھیل رہا ہے۔ مگر اس کی کچی دائی ہے اس لیے اگر وہ پکڑا بھی جائے تو چور نہیں مانا جاتا۔

قصبہ کے ایک بڑے زمیندار مفتی صاحب کے دیوان خانے کے باہر ایک [illegible]

بڑی جوہڑی ۔ گولی جوہڑی کا ۔ اسس کا پانی نکالا جا رہا ہے۔ مچھلیاں ٹوکرے بھر بھر کے پکڑی جا رہی ہیں۔ اور اسس جوہڑی کو مٹی سے بھرا بھی جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پورے محلہ کی بیل گاڑیاں مٹی ڈھو رہی ہیں۔ اسس منظر کو دیکھنے کے لیے ایک بھیڑ جمع ہے۔ اسی بھیڑ میں ایک چار پانچ سال کا لڑکا بھی کھڑا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ جانے وہاں تک کیسے پہنچ گیا ہے۔ صبح سے دوپہر ہو گئی۔ تماشا دیکھ رہا ہے اور مزے لوٹ رہا ہے۔ اچانک اسس کی بڑی بہن۔ جو مشکل سے دس گیارہ سال کی ہو گی، روتی روتی اسس کی طرف لپکتی ہے اور پیچھے سے کان کھینچ کر دو تھپڑ رسید کرتی ہے "مٹ گئے۔ یہاں کھڑا ہے، ہم صبح سے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے۔ بازار اور سارے محلے کھونڈ ڈالے۔ چل گھر چل۔ خوب مار پڑے گی ۔" لڑکا کچھ نہ بولتا ہے۔ نہ روتا ہے بس کان دبائے۔ بہن کے ساتھ چل پڑتا ہے۔

صبح کا وقت ہے۔ اسارے میں ایک شیشہ رکھا ہے ٹوٹا ہوا۔ ٹنگا ہوا نہیں ہے۔ بڑے بھائی نیچے جھک جھک کر شیشے میں اپنا منہ دیکھ کر گئے ہیں ان کے جانے کے بعد چھوٹا بھائی ۔ تین چار سال کا لڑکا صرف میلا کچیلا اونچا سا کرتہ پہنے ہوئے شیشے کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ اپنا منہ دیکھتا ہے۔ اس کی سمجھ میں شیشے کا جادو نہیں آتا۔ اپنا منہ دیکھ کر وہ سمجھتا ہے کہ ادھر کوئی اور ہے اور وہ شیشے کے پیچھے ہاتھ سے ٹٹول کر دوسرے لڑکے کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر بے سود۔

گرمی کے دن ۔ دوپہر میں زبردستی کوٹھے میں پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ مگر چار پانچ سال کا لڑکا۔ دن میں کیا سوئے گا۔ روشن دان سے دھوپ کی ایک پٹی سی آ رہی ہے گھر میں ۔ اور اسس دھوپ کی پٹی کی زد میں دھول چمک رہی ہے وہ بار بار اسس دھوپ پٹی میں ہاتھ مارتا ہے۔ اور دھول کے ذرے تیزی سے ہلتے ہیں۔ کیسا لطف آ رہا ہے اسے دھوپ اور دھول کے اس کھیل میں۔

اُفوہ۔ ہنسی بھی آ رہی ہے اور گھن بھی۔ اچھا خاصا کالا کلوٹا ہلوٹھا سا تین چار سال کا لڑکا۔ پلنگ پر لیٹا ہے اور اپنا ایک پانو کھینچ کر پانو کا انگوٹھا چوس رہا ہے۔ نمکین نمکین سا عجیب ذائقہ۔

چدّر زویا کھیلتا ہوا، گولی جوہڑی کے پٹنے کا تماشا دیکھتا ہوا، شیشے کے پیچھے اپنے آپ کو ہی پکڑتا ہوا دھوپ اور دھول کا کھیل کھیلتا ہوا، پانو کا انگوٹھا چوستا ہوا ۔ یہ کالا کلوٹا موٹا مکدر سا لڑکا۔ میرے ذہن کے تہ خانے سے نکل کر سامنے آ گیا ہے۔ بھلا میں کیوں نہ پہچانوں گا اسے ۔ یہی تو ہے شوکت ۔ حافظ محمد علی کا لڑکا۔ کنیز فاطمہ کے دل کا ٹکڑا۔ اور اپنی بہن کلثوم عرف بالی آپا کا لاڈلا اور اپنی بوڑھی نانی زینی کا چہیتا۔

ننگا پھرے تو کیا ہے، پہنے پھرے تو کیا ہے۔ آگا بھی کھل رہا ہے، پیچھا بھی کھل رہا ہے" اس لڑکے کو میں اتنا جانتا ہوں جتنا اپنے آپ کو جان سکتا ہوں۔ اصل تو شوکت ہی ہے۔ سید شوکت علی۔ پھر اس نام میں شوقی نگینوی کا اضافہ ہوا۔ ۴۲ء سے ۴۴ء تک۔ اور پھر جدت پسندانہ ادبی قلابازی کھاکر، سید شوکت علی شوقی نگینوی " ایک چھوٹے سے نام " رفعت سروش" میں سما گیا۔ لیکن یہ اٹھارہ سال " سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے" سفینۂ قلم۔

حافظ سید محمد علی، خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، بڑے باکمال حافظ تھے۔ قرآن بہت اچھا یاد تھا۔ گھر کے قریب محلہ لوہاری سرائے (نگینہ) کی مسجد صلاح والی میں پیش امام تھے۔ پہلے کچھ دن جامع مسجد نگینہ میں موذن رہے اور پھر صلاح والی مسجد میں پیش امام۔ بچوں کو درس قرآن بھی دیتے تھے اور امامت کے علاوہ صبح و شام کچھ خوش حال لوگوں کے دیوان خانوں میں وظائف بھی پڑھتے تھے خیر و برکت کے لیے۔ دو دو روپے کے معمولی معاوضے پر۔ اور دس روپیہ مسجد سے تنخواہ بھی ملتی تھی۔ مگر کتنی برکت تھی ان دس بارہ روپوں میں کہ انھوں نے پکا دو منزلہ بنوالیا تھا۔ خود ہمیشہ مسجد میں ہی سوتے تھے۔ تپ دق جیسی بیماری کے دوران بھی مسجد میں ہی رہے۔ بس آخری آٹھ دس دن گھر پر رہے اور وہیں فرشتۂ اجل کو لبیک کہا۔ جون ۶۸ء میں اندازاً ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ میں نے اپنے ہوش میں ابا کو اسی حال میں دیکھا اور ان کے معمولات میں سرِ مو فرق نہ آیا۔

اپنی پیدائش سے پہلے کے جو حالات معلوم ہو سکے ان میں بھی کچھ زیادہ پیچیدگی نہیں ہے۔ ہم لوگ سنی سید ہیں۔ دادا مرحوم سید علی اور پردادا سید یعقوب علی۔ اس سے آگے کے نام بھی نہیں معلوم۔ شجرہ ہمارے پاس نہیں۔ ایک صاحب تھے ہمارے بزرگوں میں سید تجمل حسین۔ سنا ہے ابا کی ہزار کوشش کے باوجود انھوں نے شجرہ نہیں دیا۔ اور شاید اس لیے کہ شجرہ کی رو سے ہماری کافی زمین اور صحرائی جائداد نکلتی تھی جس پر دوسروں کا قبضۂ غاصبانہ تھا۔ ہمارے دادا کے پاس بہت تھوڑی سی زمین تھی جس پر وہ کھیتی کرتے تھے اور کھیت مزدوری بھی۔ ہمارے تایا سید مشتاق علی جب تک زندہ رہے، کھیت مزدوری کرتے رہے یا گھاس کھود کر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے رہے۔ ان کا انتقال جوانی ہی میں ہو گیا تھا۔ ایک بیوہ کے علاوہ تین لڑکے اور دو لڑکیاں چھوڑیں۔ صرف بڑی لڑکی کی شادی ہوئی تھی، جن کو سب بوبو کہتے تھے۔ تایا کے انتقال کے چار پانچ سال بعد ابا نے بیوہ بھابھی سے شادی کر لی مگر نباہ نہ ہو سکا۔ اور چند ماہ بعد میری پیدائش سے دو تین ماہ پہلے ہی علاحدگی ہو گئی۔ مگر دیور بھاوج کا پرانا رشتہ خوشگوار رہا۔ اما

کی پہلی بیوی تھیں جن کو میرے ساری عمر دیکھا تھا۔ خاندان کی ہی عورت تھیں۔ ابا کے انتقال کے وقت ان کے دو جوان شادی شدہ لڑکے تھے اور ایک کنواری بیٹی۔ ہم سب ایک ہی حویلی میں رہتے تھے اور وہ شکستہ مکان ابھی موجود ہے۔ اس خاندان میں میرے ابا حافظ سید محمد علی، اپنے بڑے بھائی، والد اور دادا سے زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ یعنی حافظ قرآن۔ اور خط و کتابت کرنے لائق اردو جانتے تھے۔ اسی لیے ابا نے آبائی پیشہ کھیتی اختیار نہیں کیا بلکہ مدارس میں درس قرآن دینے لگے۔ اور ابتدا سے ہی انھیں وظیفے پڑھنے اور چلّہ کشی کا شوق ہو گیا، اور وہ شوق اس حد تک بڑھا کہ وہ جوانی میں ہی تارک الدنیا ہونے کی منزل تک پہنچ گیا ان کے کاغذات میں ایک سند ملی ہے جس کی رو سے والد صاحب حافظ محمد علی شاہ کو ان کے پیر و مرشد میاں مولا حسن قلندر نے ۷ رجادی الثانی ۱۳۲۷ھ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا اور بیعت کرنے کی اجازت دی تھی۔ اس خلافت نامہ کی نقل پیش کر رہا ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حق حق حق

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ [illegible] علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وصفحہ ... بالتجدید دستار خلافت بدست صاحب اجازت کنید چاہیت
اجازت و بیعت خلق اللہ راگردد فقط اللہ باقی من کل فانی

~~فقیر محمد ... سلسلہ ... فاروقی حنفی ...~~

بتاریخ ... ماہ ربیع الاول [illegible]

گواہ شد — گواہ شد — گواہ شد

عبداللہ خلیفہ اکبر ... — محمد ...

ابّا ایک عرصہ تک سلیم پور گڑھی کے (ضلع مرادآباد) یتیم خانہ میں درسِ قرآن دیتے رہے۔ اور پھر نگینہ چلے آئے تھے۔ پیرانِ کلیر شریف کے عرسِ مبارک میں ہر سال جاتے تھے اور ان کے ساتھ کلیر شریف کو آتے جاتے رام پور والے پیارے میاں صاحب بھی ہمارے گھر قیام فرمایا کرتے تھے۔

میری یاد میں ابّا نرے "حافظ جی اور شاہ صاحب" نہیں تھے، بلکہ وظائف اور عبادات سے جو وقت بھی بچتا اس میں گھر کے افراد کے ساتھ بیٹھتے، خاص طور سے عشاء کی نماز کے بعد گیارہ بارہ بجے تک۔ صبح کو فجر کی اذان دینے سے پہلے کثرت کرنے کے عادی تھے اس لیے وہ چھریرے بدن کے ہونے کے باوجود نہایت طاقت ور تھے۔ بہت بلند آہنگ تھے اور ان کی اذان کی آواز کئی میل تک سنی جا سکتی تھی۔ پنجہ لڑانے کے شوقین تھے اور پیدل چلنے کے تو وہ مردِ میدان تھے۔ کوسوں کی مسافت پیدل طے کرتے تھے اور بہت تیز۔ ان کا لباس فقیرانہ تھا۔ ہمیشہ نیلا تہمد پہنتے۔ ہاتھ میں لاٹھی ضرور رکھتے۔ ویسے بھی ان کو اسلحہ رکھنے کا شوق تھا۔ ان کے پاس تیل پلائی ہوئی لاٹھیاں، بلم، تلواریں اور گپتیاں رہتی تھیں۔ خاکسار تحریک کے زمانے میں بیلچہ لے کر پریڈ کرنے بھی جاتے تھے کبھی کبھی۔

لاٹھی چلانے کے ماہر تھے اور سنا ہے سلیم پور میں کسی گروہ سے لڑائی ہو گئی تو پانچ چھ آدمیوں سے اکیلے ہی نمٹے۔ مگر وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے صلح کل تھے۔ ایک وقار تھا۔ نا کاہو سے دوستی نا کاہو سے بیر۔

میری والدہ (مرحومہ) کنیز فاطمہ بڑی خوبیوں کی خاتون تھیں۔ وہ گھر بھر میں پڑھی ہوئی عورت مانی جاتی تھیں کیونکہ انھیں قرآن شریف پڑھنے کے علاوہ اردو پڑھنی بھی آتی تھی۔ وہ میلاد شریف بہت اچھا پڑھتی تھیں۔ روایتیں بھی اور نعتیں بھی۔

ان کے پاس محلہ کی لڑکیاں قرآن شریف پڑھنے آتی تھیں اور ملّانی جی کے نام سے مشہور تھیں بہت باہمت اور صابر و شاکر عورت تھیں۔ اس امر کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی اولاد کو مقدور بھر پڑھایا اور یہ ان کا ہی فیضِ تربیت ہے کہ ہم سب بھائیوں نے اپنے زمانے اعتبار سے اور اپنے ماحول کو دیکھتے ہوئے خاصی تعلیم حاصل کی۔ جب میرے تایا سید مشتاق علی کا انتقال ہوا تو صرف بڑی بوبو (بتول فاطمہ) کی شادی ہوئی تھی۔ تینوں چھوٹے بھائی ممتاز علی، امتیاز علی اور اشتیاق علی چھوٹے تھے۔ اور بہن کلثوم فاطمہ تو مشکل سے دو ڈھائی سال کی تھی۔ سب سے بڑے لڑکے ممتاز علی پرائمری اسکول کے درجہ تین میں پڑھتے تھے۔ عمر ہو گی بارہ تیرہ سال۔ محلہ کی عورتوں نے اماں کو دلاسا دیتے ہوئے کہا "بالی کی ماں! تو کس بات کا غم کرے ہے۔ اللہ رکھے تیرے آگے تین لڑکے ہیں۔ بلدیا لگا دے۔" اماں نے بڑے اعتماد سے کہا کہ "نہیں"۔ میں اپنے لڑکوں کو پڑھاؤں گی تاکہ دھوپ میں نہیں چھانو میں بیٹھیں۔" اور انھوں نے اپنے لڑکوں کو قبل از وقت زیر بار کرنے کے بجائے خود کوٹنے اور پیسنے کا کام سنبھال لیا۔ فجر کے وقت سے چکی پیستیں اور دن میں دھان کوٹتیں۔ پھر بچوں کو پڑھاتی بھی تھیں۔ تینوں بھائی عربی مدارس میں پڑھنے لگے۔ سنا ہے ابا انھیں اپنے ساتھ سلیم پور گڑھی لے گئے تھے۔ وہ ایک یتیم خانہ بھی تھا اور مدرسہ بھی۔ اس قسم کے مدارس اس زمانے میں تو عام تھے اور آج بھی ہیں۔ ان بھائیوں کی زندگی کی جد و جہد کے قصے بھی طولانی ہیں۔ قصہ مختصر بڑے بھائی ممتاز علی تو مختلف مدارج طے کرتے ہوئے مولوی ہوئے، فاضل دیو بند۔ اور اپنے ہم عصروں میں بے حد ممتاز۔ بھائی امتیاز نے حفظ قرآن کیا، درس نظامی پورا نہ کر سکے۔ وہ مدرسہ قاسمیہ (نگینہ) سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر بمبئی چلے گئے اور وہاں بحیثیت جدید طرز کے ٹیلر ماسٹر کے خوش حال زندگی گزاری۔ بھائی اشتیاق نے بھی قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد کافیہ تک عربی پڑھی۔ پھر اردو۔ انگریزی پڑھی۔ ٹیچرس ٹریننگ کی اور معلمی کا باعزت پیشہ اختیار کیا۔

میں عرض کر رہا تھا کہ ہماری والدہ نے شوہر کے انتقال کے بعد محنت مشقت کر کے اپنے بچوں کو پڑھایا، لکھایا اور اپنے اس خواب کی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھی کہ ان کے بیٹے باپ دادا کی طرح محنت مزدوری کرنے اور بھری دوپہری میں گھاس کھودنے کے بجائے علم کے زیور سے آراستہ ہو کر چھانو کی آرام دہ زندگی گزار رہے ہیں۔ بیچ میں اماں کو چند ماہ کوٹنے پیسنے سے نجات مل گئی تھی جب وہ کچھ دن ابا کے نکاح میں رہیں، اس کے بعد وہی چکی اور موسل۔ مگر کیا مجال کہ ان کے ماتھے پر ایک شکن آجائے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو میں نے یہی دیکھا کہ اماں منہ اندھیرے اٹھ کر چکی پیسنا شروع کر دیتی تھیں۔ میرے

کانوں میں چکی کی نغمگی ہوئی آواز آج تک گونجتی ہے۔ میں نے ایک نظم میں بھی کہا ہے ؎

وہ آخر شب کا سناٹا وہ چکی کا شیریں نغمہ
لہراتا ہوا تاریکی میں وہ ماں کی مشقت کا سایہ

صبح سے شام تک چکی پیسنا یا دھان کوٹنا اماں کا معمول تھا۔ مگر صابر و شاکر ایسی کہ چہرہ پر ایک شکن نہیں۔ نہایت خوش مزاج، دوسروں کو ہنسانے والی۔ اور خود اس قدر ہنسنے والی کہ جیسے انھیں کوئی غم نہیں ـــــ اور رات کو اکثر میلاد پڑھنے جاتیں۔ میں بھی بتاشے اور دمیدے کھانے کے شوق میں ساتھ جاتا۔ بہت اچھا لگتا تھا جب سب عورتیں آواز سے آواز ملا کر نعتیں پڑھتی تھیں، اور سلام کی لے تو جیسے بچپن سے کانوں میں رس گھولتی رہی ہے۔

یا رسول سلام علیکَ ۔ یا حبیب سلام علیکَ ۔ صلوٰۃ اللہ علیکَ

آج غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ چکی اور موصل کا Rythm اور میلاد شریف کی نعتوں کا میری طبیعت کی موزونیت میں بڑا دخل ہے۔

سنا ہے میں Pre-mature بچہ تھا۔ مئی جون کی گرمیوں میں بھی مجھے لحاف میں لپیٹ کر رکھا جاتا تھا۔ ماں کا دودھ پینے کی قوت نہ تھی۔ میری نانی روئی کے پھوئے کو پانی یا دودھ میں بھگو کر میرے منہ میں ٹپکا دیتی تھیں۔ ایک تو کوٹنے پیسنے کی مشقت۔ اس پر میں ایک عذاب جان! اماں دال روٹی کی فکر کریں یا مجھے دیکھیں۔ میری ساخت پرداخت میری بہن بالی آپا کے ذمہ تھی جو خود بھی چھے سات سال کی تھیں یا آتے جاتے نانی پھوئے سے دودھ پلا جاتیں۔

نانی ـــــ کتنی عظیم روح تھی وہ ـــــ ان کے صرف ایک بیٹی تھیں اماں۔ نانی بیوہ ہو کر بیٹی کے گھر رہنے لگی تھیں۔ مگر ان کے سر نہیں پڑیں ـــ وہ مفتی توسل حسین کے دیوان خانے میں ڈیڑھ روپیہ ماہوار پر مصالحہ پیسنے پر ملازم تھیں، بوڑھی، کمر جھکی ہوئی۔ مگر ان کا معمول تھا صبح اٹھ کر دیوان خانے کی طرف چل پڑنا۔ دوپہر کو وہاں سے لوٹنا تو ہم دونوں۔ بالی اور میرے لیے کچھ نہ کچھ کھانے کو لانا۔ اور تیسرے پہر پھر مصالحہ پیسنے کے لیے دیوان خانے روانہ۔ جانے کب سے ان کا یہ معمول ہوگا۔ مگر میں نے اپنی یاد سے ۳۹ء تک ان کو یہی محنت و مشقت کرتے دیکھا۔ جب بھائی برسر روزگار ہو گئے اور انھوں نے نانی کو دیوان خانے جانے کے لیے منع کیا اور کہا کہ اس میں ہماری بے عزتی ہے۔ تو وہ سنی ان سنی کر کے ٹال دیتیں اور کرتیں وہی جو وہ کرتی آئی تھیں۔ عمر بھر کسی کا نہیں کھایا۔ بلکہ بیٹی نواسے، نواسیوں کو کھلایا اور نہایت اڑے وقت میں پورے خاندان کو سہارا دیا۔ وہ اپنے انتقال سے پندرہ بیس دن پہلے گھر بیٹھیں اور پھر معبود حقیقی سے جا ملیں۔ میری یاد میں انھوں نے نماز کبھی نہیں پڑھی اور روزہ ایک نہیں چھوڑا۔ ابا جب کبھی مذاق میں ان سے

کہتے کہ خالہ نماز پڑھا کرو۔ تو ادھر سے منہ موڑ کر اماں سے کہتیں ۔ اری کنیز! امتیاز کا خط نہیں آیا۔ یا مجھ سے پوچھنے لگتیں : ارے سوختہ (شوکت) کیا کھائے گا۔ ایسے نیک اور بے ریا بندے کم ہوتے ہیں۔ انھوں نے طویل عمر پائی اور ساری عمر خدمت کی۔ بچوں کو بیمار دیکھ کر بے چین ہو جاتیں۔ بغیر کسی کو بتائے سات مرچیں اتار کر مول گنج کی مسجد والے حافظ ابراہیم کے پاس لے جاتیں، نظر کی دعا پڑھوا کر لاتیں اور مرچوں کو جلتی آگ میں ڈال دیتیں۔ جب دھسک نہ نکلتی تو بڑے بھرپور انداز میں کہتیں : اری کنیز ۔ یا اری بہو ۔! دیکھ لے نظر ہوئی تھی اسے۔ لے اسے یہ پڑھا ہوا پانی پلا دے۔ اماں کہتیں "اری ماں یہ شرک ہے"، مگر وہ سنی ان سنی کر جاتیں نانی اس گھر کی روح تھیں۔ اپنی بیوگی کی آدھی جوانی اور بڑھاپا اس شان سے گزارا جیسے گھر میں کوئی باقاعدہ کمانے والا مرد ہو۔ اور کچھ دن بعد جب بیٹی بھی بیوہ ہو گئی تو اسے لفظی دلاسا دینے کے بجائے اس کی عملی مدد کی۔ اور کچھ دنوں کے بعد جب نواسی (یعنی بو بو بتول فاطمہ) بھی صرف چوبیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں۔ اور ان کا شوہر اپنی بیوہ ماں اور ڈیڑھ سال کا بچہ چھوڑ کر تپ دق کا لقمہ بن گیا تو تین نسلوں کی بیوگی اس گھر کا مقدر بن گئی۔ اگرچہ بو بو الگ رہتی تھیں اپنی بوڑھی ساس کے ساتھ، اور انھوں نے سلائی شروع کر دی تھی اپنا پیٹ پالنے کے لیے، مگر وہ تھیں تو اسی بیوگی کی لڑی میں پروئی ہوئی۔

بو بو کا لڑکا ریاست مجھ سے ڈیڑھ سال بڑا تھا۔ جب میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو یہ پورا منظر نامہ میرے سامنے تھا۔ مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ دونوں طرف سے سوتیلا تھا۔ اس کے برعکس ریاست سے سب کو ہمدردی تھی۔ مگر ہم دونوں لڑکوں کی دوستی تھی۔ میں فاقہ مستی میں بھی موٹا تازہ اور تگڑا تھا۔ اور ریاست کو پھول کی طرح رکھا جاتا تھا، مگر وہ جسمانی طور پر مجھ سے کمزور تھا۔ وہ مجھے مار دے تو کچھ نہیں۔ لیکن اگر میں اس کے ایک ہاتھ رسید کر دوں تو مجھ پر چار ہاتھ پڑیں۔ اماں تو خاموش رہتیں ۔ بچاری کیا کہتیں۔ باجی آپا بھی بے بسی سے دیکھتی رہ جاتیں۔ مگر نانی کو اپنا نواسہ زیادہ پیارا تھا۔ آخر اس نے اسے بے دودھ کی چھاتیوں کا دودھ پلا کر پالا تھا۔ بو بو کو نانی کی یہ بات ناگوار گزرتی اور وہ ان سے چڑنے لگیں۔ ایک دن ریاست نے مجھے بے وجہ مار دیا۔ میں بڑھا تو میرا ہاتھ روک دیا گیا۔ نانی کو یہ بات ناگوار گزری اور غصہ اتارنے کے لیے انھوں نے میرا منہ ہی تھپڑا دیا۔ مجھے اب تک یاد ہے کتنا پیار تھا ان کی ماریں ۔ اور یوں مار کھاتا ۔ جھڑکیاں سنتا اور نفرت بھری نظروں کے وار اپنے دل پر سہتا۔ میں بڑا ہوتا چلا گیا۔

ڈاکٹر سید حامد حسین
ای ۲/۴/۱۸۴ پروفیسر کالونی
بھوپال ۳ ایم، پی

راجا ین جگ سون

(لوک کتھا کے روپ میں ایک طنزیہ فینٹسی)

اجودھیا سے بیس کوس پورب میں ایک بستی تھی، اتنی پرانی کہ کسی کو یاد نہ تھا کہ پہلے اس کا نام کیا تھا۔ یاد تھا تو بس یہ کہ اس پر جگوں سے دیوتا جیسے راجا راج کرتے تھے۔ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا۔ کتنے راجا ہوئے، ان کی گنتی کسی کو معلوم نہ تھی۔ راج محل کے پچھواڑے ان راجاؤں کی چھتریاں تھیں۔ کہتے ہیں کبھی یہ ایک کے پیچھے ایک چندر لوک تک پھیلی ہوئی تھیں اور انھیں چھتریوں کے سنہری کلسوں سے وہ سیڑھی بنی تھی جس پر چندرما ہر ماہ ایک بار اوپر سے نیچے اور پھر نیچے سے اوپر اپنی یاترا کیا کرتا تھا۔ پورنماشی کی رات وہ سب سے اوپر والے کلس کی ٹیک لگا کر ساری دنیا پر اپنی کرنوں کی بارش کرتا اور پھر روز رات ایک ایک کلش پکڑ کر نیچے اترتا رہتا اور دنیا والوں کے لیے اس کا اجالا سمٹا جاتا یہاں تک کہ اماوس کی وہ رات آجاتی جب مائیں اپنے لالوں کو سینے سے چمٹا کر جھونپڑی کے اندھیرے کونوں میں سمٹ کر سو جاتیں اور بھوت، چڑیل، پریت اور پشاچ شمشانوں میں نکل آتے۔

لیکن چندرما کی لاڈلی اس بستی میں کوئی رات اندھیری نہ ہوتی۔ وہ رات جب دنیا اماوس کی کالی گدڑی میں اپنا منہ چھپا لیتی۔ اس بستی کی سب سے جگمگاتی رات ہوتی کیونکہ اس رات چاند راج محل کے کلس پر آکر ٹک جاتا اور چاند کی ساری کرنیں راج محل کے آنگن میں سمٹ آتیں اور ان کے ساتھ ساتھ بستی کی ساری سنوریاں اور نوجوان اس آنگن میں سمٹ آتے۔ یہ رات چندرما کی شوخ اور چنچل کرنوں کی ہوتی۔ کچھ جھروکے میں بیٹھے مہاراجا اور مہارانی راج مکٹ بننے کا جشن کرتیں۔ جو ناکام ہوتیں وہ شرم سے کیاریوں میں جا کر منہ چھپا لیتیں اور پھولوں کا روپ لے کر مہاراجا اور مہارانی کو ٹکٹکی باندھے تکنے لگتیں۔ کوئی کرن خاموشی سے کسی سندری کے گھونگھٹ کو چھیڑ اس کے لبوں میں سرایت کر جاتی۔ کوئی دوسری کی پایل میں سما جاتی۔ کسی کو شرم سے جھکی نگاہوں کی چھاؤں بھلی لگتی اور کسی کو چھلکتے بدن کا گداز راس آجاتا۔ پھر جب کسی نوجوان کی بانسری کو کوئی کرن گدگدا دیتی تو کچھ دوسرے ہاتھ ڈھولک کی تھاپ کے

لیے بے قابو ہو جاتے اور اس کے بعد قدم بس میں نہ رہتے اور نہ بدن۔ رات بھر چاند اپنی دولت لٹاتا رہتا، لوگ ناچتے رہتے اور مہاراجا کے چہرے کے گرد ہالہ روشن سے روشن تر ہو جاتا۔ یہ محفل چلتی رہتی یہاں تک کہ مشرق کے کنارے سے منہ نکال کر سورج بھی اس جشن نور کو دیکھتا اور اس کی ازلی رقابت اسے اس محفل کو درہم برہم کر دینے پر مجبور کر دیتی۔

چاند سیڑھی سیڑھی چڑھتا پھر باہر کی دنیا کی طرف واپس ہونے لگتا اور بستی کے لوگ پھر اس رات کا انتظار کرنے لگتے جب چاند پھر سے راج محل کے آنگن میں اترے گا، پھر سے راج محل کا دروازہ کھلے گا۔ انھیں مہاراجا کا درشن ہوگا اور مہاراجا کے مکٹ پر نثار ہونے والی چاند کی کرنیں ان کی طرف بھی پلٹیں گی اور انھیں خوبصورتی، مسرت اور عشرت کے احساس سے مالامال کر دیں گی۔ وہ اپنے کھیتوں میں لوٹ جاتے، جی توڑ محنت کرتے، چٹان جیسی سخت زمین کا سینہ چیر کر غلہ پیدا کرتے۔ ان کی عورتیں گایوں کا دودھ دوہتیں، دہی بلوتیں، مکھن نکالتیں۔ وہ موٹا اناج کھاتے، مٹھا پیتے۔ لیکن چاندنی بھری رات جب وہ اپنے کندھے پر بڑھیا غلے کی گٹھری لیے اور ان کی عورتیں سر پر گھی کے کلسے رکھے راج محل کے آنگن میں پہنچتیں تو ان کی گردن میں ایک عجیب فخریہ تناؤ ہوتا۔ وہ چھوٹے تھے بہت چھوٹے۔ پرجا۔ نہایت حقیر پرجا۔ لیکن یہ کیا کم ہے ان کے پاس اپنے مہاراجا کو پیش کرنے کے لیے کچھ نذرانہ تو تھا۔

وقت کے الٹ پھیر میں نجانے کتنی صدیاں گزر گئیں۔ کتنے یگ بیت گئے اور بستی والے بستی پر چاندنی کی برسات کی دیکھتے ہوئے اسے "سورگ سدھا" کہنے لگے۔ بھلا جنت بھی اور کیا ہوتی ہوگی۔

پھر ایک بار گنگا پار سے اس بستی میں کچھ بیوپاری پہنچے۔ رنگین اور خوبصورت پگڑیاں پہنے جن میں مور کے پنکھ لگے ہوئے تھے اور دوسرے کئی رنگ برنگے پر بھی، جنھیں بستی والوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ گلے میں جھولے ڈالے تھے جو طرح طرح کے ٹکڑوں کو ٹانک ٹانک کر بنائے گئے تھے۔ کچھ ٹکڑے بڑے چمک دار تھے ان پر خوبصورت نقش و نگار بنے تھے۔ ابھرے ہوئے ٹانکوں سے سارا کام کیا ہوا تھا لیکن گدڑی کی طرح بے ڈھنگا نہیں۔ ان کے پاس سلاجیت بھی تھا۔ موسلی بھی۔ کیسر بھی اور کستوری بھی۔ کافور بھی اور ہینگ بھی۔ انوکھی اور عجیب چیزیں جنھیں بستی والوں نے نہ دیکھا تھا اور نہ برتا تھا۔ لیکن بیوپاری کہتے تھے کہ ان میں بڑی بڑی طاقتیں اور لذتیں چھپی تھیں۔ بستی والوں نے ان کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا، طاقت، طاقت کی لذت، لذت کی طاقت۔ موٹا اناج کھا کر اور مٹھا پی کر ان کے بارے میں سوچ بھی کون سکتا ہے اور یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے

ان کے پاس دینے کو بھی کیا تھا، صرف موٹا اناج اور مٹھا اور یہ بیوپاریوں کے کس کام کا۔

بیوپاری چلے گئے۔ لیکن پھر ان کی ایک ٹولی آئی۔ اس بار یہ جب وہ لوٹے تو یہ بتاتے گئے کہ اچھے اناج اور گھی کے بدلے یہ لذتیں مل سکتی ہیں اور کچھ نوجوان اس بار چاندنی بھری رات کے جشن میں کندھوں پر گٹھریاں لے کر راج محل نہیں گئے۔ کچھ دن بعد بیوپاری نیا ساز و سامان لے کر آئے اور بستی کے پاس ہی اپنے ڈیرے ڈال کر پڑ گئے۔ پھر تو ہر ہفتے ہاٹ بھرنے لگا۔ راج محل کا آنگن سونا پڑنے لگا۔ چاندنی آتی پلٹ جاتی۔ اب ہینگ اور کستوری کی خوشبو دھیرے دھیرے بستی والوں کو لبھانے لگی۔ انھیں پہلے ایسا لگا کہ بیوپاریوں کے ہاتھ اچھا اناج اور گھی سونپ کر وہ راج محل کی امانت میں خیانت کر رہے ہیں۔ لیکن آہستہ، آہستہ وہ اس کے عادی ہوتے گئے۔ بیوپاریوں نے دنیا دیکھی تھی۔ وہ بستی والوں کو دنیا کی بات بتاتے تھے۔ مال اس کا ہوتا ہے جو اسے پیدا کرتا ہے۔ اناج اور گھی راجا کا نہیں بستی والوں کا اپنا تھا۔ وہ چاہیں اس کے بدلے ایک رات کی چاندنی لے لیں یا مہکتی، جوش کھاتی، کیسر اور سلاجیت کی لذتیں۔ وہ خود اپنے مالک تھے خود اپنے مالک؟ ہاں ہاں خود اپنے مالک! راجا کے آنگن میں اب بھی چاندنی کی برکھا ہوتی تھی لیکن بیوپاریوں نے نئی طاقت کا سورج لا کر بستی والوں کی جھولی میں ڈال ڈال دیا تھا۔ ان کے ہاتھ میں کھوئی ہوئی طاقتوں کے خزانے کی کنجی تھما دی تھی۔

اور پھر ایک دن مہاراجا بھی مر گیا۔ کسی نے اس کی سمادھی نہیں بنائی۔ کوئی چھتری تعمیر نہیں ہوئی۔ کوئی کلس نہیں لگا اور پھر چاند بھی پلٹ گیا۔ اب سورگ سدھا نام کی بستی سورگ سدھا نہیں رہی یہ کوئی بھی عام بستی ہو گئی۔

بیوپاریوں نے بستی والوں سے کہا مہاراجا کے بعد تم ہی ہر چیز کے مالک ہو۔ تمھیں راجا ہو۔ ہم تمھارے خادم ہیں۔ تمھاری خدمت کرتے رہیں گے۔ بستی والوں نے بڑا جشن منایا۔ بڑی دھوم مچائی۔ بیوپاریوں کے ڈیروں کے سامنے اناج کے ڈھیر لگا دیے۔ بیوپاری بڑے کام کے لوگ تھے۔ وہ اپنے کو لوگوں کا حاکم نہیں خادم بتاتے تھے۔ بستی والوں کی خدمت ہی اب ان کا مقصد تھا اور بستی ان کی کرم بھومی۔ اب ڈیروں سے کیا کام چلتا۔ نیو ڈال کر پکے مکان بننا شروع ہو گئے بستی والوں کی خدمت جو جٹ کر کرنا تھی۔ لوگوں کی خدمت کو کون آسان کہتا ہے وہ تو بڑی مشقت اور کڑی محنت چاہتی ہے اور جیسے جیسے خدمت کا کام بڑھتا گیا ویسے ویسے خادموں کی ضروریات بڑھتی گئیں۔ پھر جو بستی والوں کی خدمت میں لگا ہو اس کی خدمت سے بستی والوں کو انکار کی کیا گنجایش تھی اور بستی والوں نے جی جان سے خدمت کی۔

لیکن خدمت کچھ ایسا میٹھا جذبہ ہے کہ اس میں مقابلے کی بات اپنے آپ ہی آجاتی ہے۔ اور خدمت کرنے والوں میں بھی ایک ایسا ہی مقابلہ شروع ہوا۔ ظاہر ہے فیصلہ تو بستی والوں کے ہاتھ میں تھا کہ وہ خدمت کا موقع کس کو دیتے ہیں۔ خدمت کا کاروبار بڑھا تو خادم بھی بڑھنے لگے۔ زیادہ خادموں کی وجہ سے ضرورتیں بھی بڑھ گئیں۔ اب تو بستی والوں کا سارا بڑھیا اناج اور گھی بھی خادموں کے لیے کم پڑنے لگے۔ لیکن بستی والوں کو اس سے بڑی ہمت تھی کہ خادم ان کے ہیں اور ان کے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ بستی والوں کو کبھی کبھی اپنے لیے موٹا اناج اور مٹھا بھی پورا نہیں پڑتا۔ لیکن وہ اس کی شکایت نہ کرتے اور اس سے خوش ہوتے کہ خادم ان کی قدر کرتے تھے، اس حد تک کہ وہ ہمالیہ پار سے لایا ہوا کستوری تیل ان کے بائیں ہاتھ کی پشت پر مل کر بھی اس کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کرتے اور بستی والے اس تیل کی مہک سونگھ سونگھ کر پانچ پانچ سال گزار دیتے اور اپنے خادموں سے بے اطمینانی کا وسوسہ بھی اپنے دماغ میں پیدا نہیں ہونے دیتے۔

اس طرح کچھ سال اور بیت گئے۔ بستی والے اپنے خادموں کی خدمت میں پہلے سے بھی زیادہ جٹ گئے۔ اب انھوں نے مٹھا بھی ترک کر دیا تھا۔ صرف موٹے اناج پر گزر کرنے لگے تھے۔ لیکن اسی زمانے میں پوری بستی دو عجیب و غریب بیماریوں کا شکار ہو گئی۔ ایک تو ہر شخص کی گردن میں ایک تکلیف دہ اکڑن پیدا ہو گئی تھی اور دوسرے ہر ایک پر اچانک ایک بھیانک دورہ پڑتا۔ اسے لگتا کہ وہ کہیں کچھ رکھ کر بھول گیا ہے اور وہ اسے دیوانہ وار ڈھونڈتا اور جب نہیں ملتا تو پاگلوں کی طرح سر کے بال نوچتے اور اپنے کپڑے پھاڑنے لگتا۔

بیوپاریوں نے سر جوڑ کر اس پر بڑا غور کیا۔ ہر طرح کی تدبیریں کیں۔ نجومیوں اور تانترکوں کی بھی مدد لی لیکن مشکل حل نہ ہوئی۔ پھر ہوا یوں کہ بیوپاریوں کے بیچ جو خادم بنے بیٹھے تھے ان میں پھوٹ پڑ گئی اور جب سب کو ایک دوسرے کی کمزوریوں کا پورا علم ہو گیا تو ایک بیوپاری نے اپنی تدبیر سے خود کو ان سب کا حاکم مقرر کر دیا۔ جلد ہی اس کے مکان پر پہرے دار مقرر ہو گئے۔ پھر نوبت بجنے لگی۔ سلام اور نذر لینے کی رسم واپس آ گئی اور پھر جب اس کا بیٹا بیس سال کا ہوا تو قلعہ کے صحن میں ایک شاندار جشن ہوا جس میں اسے ولی عہد مقرر کیا گیا۔ پھر تو ہر ماہ جشن ہونے لگے۔ کبھی کبھار گنگا پار سے نٹ آ کر تماشا دکھاتے۔ کبھی پاس پڑوس کے راجاؤں مہاراجاؤں کی دعوت ہوتی۔ کبھی آتش بازی کا تماشا ہوتا اور دھیرے دھیرے بستی والوں نے محسوس کیا کہ اس کی یادداشت لوٹ رہی ہے۔ بھولنے کا دورہ اب نہیں پڑتا۔ نئے راجا کے آگے جھک کر سلام کرنے سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان کی گردن میں اب پہلی سی لچک آ گئی تھی۔ اور جس دن ان کے حاکم کی

موت کے بعد اس کی نئی سمادھی پر جس کا نام انھوں نے بڑے چاؤ سے سورگ گھاٹ رکھا تھا، سنہری کلس لگایا گیا اور ولی عہد نے کرسی سنبھالی اس دن انھوں نے دیکھا کہ چاند پھر سے نئے راج محل کے صحن کی طرف اتر رہا ہے۔

بستی والوں پر پھر سے چاندنی کی برکھا ہونے لگی اور انھوں نے عہد کیا کہ وہ اب کبھی چاند سے اپنا رشتہ نہیں توڑیں گے۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد چاند نے اس بستی کو گود لے لیا۔ دنیا والوں کو وہ بستی کہیں نظر نہیں آتی۔ ہاں اس کا عکس چاند میں دکھائی دیتا ہے۔

مجتبیٰ حسین
۲۰۲، انکور اپارٹمنٹس
پلاٹ نمبر ۷، پٹ پڑ گنج
نئی دہلی

کیا اردو پھر گھروں میں واپس آرہی ہے؟

صاحبو! عرصہ ہوا کہ ہماری زندگی میں "خوش خبریاں" آنی بند سی ہوگئی ہیں (یوں بھی اس عمر میں ہمیں کون سا میٹرک کا یا بی اے کا امتحان دینا ہے کہ اس کا نتیجہ برآمد ہو تو کوئی خوش خبری ہمارے حصہ میں بھی آئے) یہ سب عمر کا تقاضا ہے جہاں خوش خبریاں ایک ایک کرکے غائب سی ہونے لگتی ہیں۔ لیکن بحیثیت اردو ادیب ہم اپنے لیے نہ سہی کم از کم اردو زبان کے سلسلہ میں کوئی خوش خبری سننے کے لیے عرصہ سے بے تاب رہے ہیں دس بارہ برس پہلے تک ہم اس خوش فہمی کو خوش خبری سمجھتے رہے کہ اردو اب بھلے ہی ہندستان میں پروان نہ چڑھے یورپ، امریکا، خلیجی ممالک اور کناڈا وغیرہ میں اس کی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں۔ اردو کی ان نئی بستیوں میں بھی ہم ہو آئے۔ وہاں بھی یہ بستیاں انھیں لوگوں سے آباد ہیں جن کی عمریں چالیس پچاس برس سے اوپر ہیں مگر جن کا بینک بیلنس ذرا اچھا ہے اور جو ہندستان کے شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کو ان بستیوں میں مدعو کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ جو شاعر، ادیب اور نقاد ان بستیوں میں ہو آئے انھوں نے ہندستان واپس آکر اردو کی ان نئی بستیوں کا حال اپنے سفرناموں میں کچھ یوں بڑھا چڑھا کر پیش کیا جیسے اردو اب امریکا اور کناڈا کی دوسری سرکاری زبان بننے والی ہو حالانکہ ان سفرناموں کا مقصد اردو کی ترقی پر اظہار مسرت کرنا نہیں ہوتا بلکہ ان کا ایک پوشیدہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان شاعروں اور ادیبوں کو کسی نہ کسی طرح دوبارہ ان ملکوں میں بلایا جائے تاکہ یہ واپسی میں پھر ایک بار وی سی آر، کیمرے، ٹیلی ویژن سیٹ وغیرہ لیتے آئیں۔ کچھ شاعروں اور ناقدوں کو اس میں کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ چنانچہ یہ اب بھی سال میں دو ایک بار اردو کی ان نئی بستیوں میں وہاں کے اردو بولنے والوں کے خرچ پر اعزازی سفر کرکے آتے ہیں اور پھر نئے سرے سے سفرنامے اور رپورتاژ لکھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

ہمیں افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ اردو کی نئی بستیوں کی شان میں قصیدے لکھنے والوں کو اردو کی پرانی بستیوں میں اردو کی زبوں حالی کا بالکل احساس نہیں ہوتا۔ اردو

یہاں کے دفتروں اور اسکولوں میں تو خیر غائب ہوتی چلی جا رہی تھی اب گھروں سے بھی غائب ہونا شروع ہو گئی تھی۔ مگر پچھلے ہفتے ہم حیدرآباد گئے تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یاقوت پورہ میں ہم اپنی بھتیجی کے جس مکان میں ٹھہرے تھے اس سے دس بارہ مکان بعد کے تین چار مکانوں میں اردو پھر سے واپس آ گئی ہے۔ ہم جس مکان میں اکثر ٹھہرتے ہیں۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ یہ چاروں طرف سے مسجدوں سے گھرا ہوا ہے۔ لہٰذا صبح میں بیک وقت سات آٹھ مسجدوں سے، جو ہمارے مکان سے بمشکل بیس پچیس گز کے فاصلہ پر واقع ہیں، اذانوں کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ گنہگار سے گناہ گار آدمی بھی فجر کے وقت یہاں ضرور بیدار ہو جاتا ہے۔ ان اذانوں سے تو ہمارے کان خاصے آشنا ہیں لیکن دو تین گھنٹوں بعد اچانک ہمارے کانوں میں اردو کے "حروف تہجی" کے ورد کی آوازیں آنے لگیں۔ اس آواز سے ہمارے کان برسوں سے بالکل نا آشنا تھے بلکہ سچ پوچھیے تو اردو کے ادیب ہونے کے باوجود ان حروف کی صحیح ترتیب بھی ہمیں اب یاد نہیں رہی تھی۔ کچھ دیر تو بستر میں ہی لیٹے لیٹے اپنے احساس کمتری کو مٹانے کے لیے ان حروف تہجی کا "آموختہ" کرتے رہے۔ ہم نے سوچا کہ اردو کا کوئی بہی خواہ "ٹیپ ریکارڈ" پر حروف تہجی کا ٹیپ بجا رہا ہوگا۔ کچھ دیر بعد جب اردو حروف تہجی کے ورد کا شور تھما تو اقبال کی ایک نظم کورس کی شکل میں گائی جانے لگی۔ ہم نے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے اپنے ایک نواسے کو پکارا تو پتا چلا کہ گھر میں نہیں ہے۔ دوسرے کو پکارا تو وہ بھی موجود نہیں تھا۔ جب سب سے چھوٹے نواسے کو ہم نے طلب کیا اور دیگر نواسوں کی غیر موجودگی کا سبب پوچھا تو اس نے بڑی معصومیت سے کہا "یہ سب تو اردو کی گرمائی کلاسوں میں شرکت کے لیے گئے ہیں۔ آپ بھی وہاں کیوں نہیں جاتے۔ گھر میں بیکار پڑے رہتے ہیں اردو ہی سیکھ لیجیے۔ وہاں تو آپ کی عمر کے لوگ بھی اردو سیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔ اس کے جواب کو سن کر ہمیں "عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ" کی جانب سے شروع کی گئیں، اردو کی گرمائی کلاسوں کا خیال آیا جہاں شہر حیدرآباد میں گرمی کی چھٹیوں میں طلبہ کو اردو زبان سکھانے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ ہم نے ان کلاسوں کا حال اخبار میں پڑھا تھا لیکن ہمیں کیا پتا تھا کہ اردو اچانک ہمارے گھر سے دس بارہ مکان پہلے تک نہ صرف پہنچ جائے گی بلکہ ہمارے نواسوں کے حوالہ سے خود ہمارے گھر میں بھی گھس آئے گی۔ یقین ہی نہیں آیا کہ یہ زبان سکھائی بھی جا سکتی ہے اور اسے کوئی سیکھ بھی سکتا ہے (حالانکہ ہم نے خود تھوڑی دیر پہلے اردو حروف تہجی کی صحیح ترتیب اس کلاس سے سیکھی تھی) جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ ہماری زندگی میں خوش خبریاں آنی بند ہو گئی ہیں۔ مگر پچھلے ہفتہ ہم نے خود اپنے کانوں سے ایک ایسی خوش خبری سنی ہے جسے سن کر ہم سرشار سے ہو گئے ہیں۔ شخصی خوش خبریوں سے ہم یوں بھی بے نیاز سے ہو چکے ہیں۔ البتہ اپنی زبان اور تہذیب کے بارے میں کوئی خوش خبری (جو ہمیشہ غیر شخصی ہوتی ہے) سنتے ہیں

تو دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔

اردو کی تعلیم کے سلسلہ میں عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کا سارا کام رضا کارانہ بنیادوں پر ہو رہا ہے۔ اردو پڑھنے والے اور اردو کو پڑھانے والے دونوں رضا کارانہ طور پر سامنے آرہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گھروں میں یہ کلاسیس چلائی جارہی ہیں ہمیں یوں لگا جیسے اردو اب صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ تحریک بنتی چلی جارہی ہے اور کوئی بھی جذبہ یا تہذیب کا کوئی بھی پہلو اس وقت تک سماج میں پنپ نہیں سکتا جب تک کہ وہ " تحریک " کی شکل نہ اختیار کرلے۔ اردو والوں کی نفسیات کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ اپنی زبان اپنی تہذیب اور اپنی شناخت کے تحفظ کے لیے انھیں ہمیشہ کسی دوسرے سرسید احمد خاں " کی آمد کا انتظار رہتا ہے۔ سرسید احمد خاں کو گزرے ہوئے سو برس بیت گئے۔ لیکن ہمیں اب بھی کسی سرسید کا انتظار ہے۔ حالانکہ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرلینا چاہیے کہ اب ہمارے درمیان سرسید کی طرح کا کوئی سرسید پھر سے پیدا نہیں ہوگا۔ اب ہمیں چھوٹے چھوٹے علاقائی سرسیدوں کی ضرورت ہے۔ ریاستی سطح کے سرسیدوں کو تو چھوڑیے۔ ہم تو اس بات کے حق میں ہیں کہ یاقوت پورہ، دبیر پورہ، بنجارہ ہلز، حمایت نگر وغیرہ کے بھی الگ الگ سرسید ہونے چاہئیں۔ سو سال پہلے ہمارے حالات ایسے تھے کہ ایک بڑے سرسید کے بغیر ہمارا کام نہیں چل سکتا تھا مگر آج کے حالات چھوٹے سرسیدوں کے متقاضی ہیں۔

اردو کی گرمائی کلاس کے درس کو سننے کے بعد جب ہم باہر جانے کے لیے گھر سے نکلے تو دیکھا کہ ڈیڑھ دو سو طلبہ (جن میں کچھ بزرگ حضرات بھی شامل تھے جو پتا نہیں اردو سیکھنے والے تھے یا پڑھانے والے) جلوس کی شکل میں ہمارے گھر کی گلی کے سامنے سے اردو کی کچھ نظمیں گاتے ہوئے گزر رہے ہیں جیسا کہ ہم پہلے بھی کہیں لکھ چکے ہیں۔ ۔ جب بھی ہمیں کوئی ایسا جنازہ نظر آتا ہے جس میں مرنے والے کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ۔ تو ہم اس جلوس جنازہ میں ضرور شرکت کرتے ہیں کیونکہ ہمیں یوں لگتا ہے جیسے یہ جلوس ۔نازہ صرف مرنے والے کا نہیں بلکہ اردو رسم الخط کا بھی ہوتا ہے۔ بھلا جو آدمی اردو ۔م الخط کے جنازوں میں اتنے خشوع و خضوع سے شرکت کرتا ہو وہ بھلا اردو رسم ۔نط کے دوبارہ پیدا ہونے کے جلوس میں کیسے شرکت نہ کرتا۔ لہذا ہم بھی اس جلوس ۔ کافی دور تک چلتے رہے۔ جنازوں میں تو ہم چالیس قدم تک ساتھ دیتے ہیں لیکن ۔دو طلبہ کے اس جلوس میں ہم کم از کم ایک کلومیٹر دور تک چلتے چلے گئے۔ (اس کی ایک ۔بہ یہ بھی تھی کہ اس دن کوئی آٹو رکشا والا نہیں مل رہا تھا)۔ کچھ دور بعد جب یہ جلوس ۔ اور سڑک پر مڑ گیا جو ہماری منزل کی طرف نہیں جاتی تھی تو ہم بھی رک گئے۔ ہم ۔دو طلبہ کے اس جلوس کا یہیں تک ساتھ دے سکتے تھے۔ کیونکہ اس جلوس کو تو ۔ بہت دور تک جانا ہے۔ ہماری بساط تو بس اتنی کا تھی، خوشی ۔۔۔

کہ اردو اب رضاکارانہ طور پر نہ صرف گھروں میں واپس آرہی ہے بلکہ سڑکوں پر بھی دکھائی دینے لگی ہے۔ اردو والوں میں یہ بل بوتا پیدا ہو جائے تو پھر کسی حکومت یا کسی ادارہ کی طرف دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ حکومت کی طرف دیکھ دیکھ کر ہم نے یوں بھی ۴۰ برس ضائع کر دیے۔ ہمیں یاد ہے کہ دو تین مہینے پہلے جب جناب زاہد علی خاں اور ظہیر الدین علی خاں مینیجنگ اڈیٹر "سیاست" نے اس طرح کے گرمائی کورس کا ذکر کیا تھا۔ تو ہم حسب عادت ہنس کر خاموش ہو گئے تھے۔ ہم نے کہا تھا "پچھلے ۲۵ برسوں سے ہم اردو میں قلم گھس رہے ہیں۔ ابتدا میں ہمیں کچھ قارئین بھی ملے مگر اب یہ دن بہ دن کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب یہ تو ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ادب بھی پیدا کرو اور اسے پڑھنے کے لیے قارئین بھی تیار کرو۔ اب اگر آپ نے روزنامہ "سیاست" کے لیے قارئین بھی پیدا کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے"۔ بولے میں "سیاست" کے لیے قارئین پیدا کرنے کی نہیں سوچ رہا ہوں۔ میں تو صرف اردو قارئین کو پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ بعد میں وہ جو چاہیں سو اخبار پڑھیں"۔ ہمیں خوشی ہے کہ ظہیر الدین علی خاں کا ایک چھوٹا سا خیال اب ایک تحریک بن گیا ہے جس میں پانچ ہزار طلبہ اردو سیکھ رہے ہیں۔ اردو اب صرف اپنی انا، اس کے بولنے والوں کے بل بوتے اور ان کے عزم و حوصلہ سے ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ اردو والوں میں ایک عرصہ بعد یہ عزم و حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ پانی اور ایک توانا تحریک کو اپنا راستہ ڈھونڈنے کے لیے کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ یہ دونوں اپنا راستہ آپ بنا لیتے ہیں۔

حسن بن جمیل
شعبہ انگریزی۔ یو۔ پی کالج پوسا
سمستی پور۔

ڈیرک والکاٹ

نوبل انعام کے آئینے میں

ویسٹ انڈیز کے جزائر اگر کسی ایک وجہ سے مشہور ہیں تو وہ وجہ کرکٹ ہے۔ سیاہ فام اکثریت والے یہ جزائر کئی چھوٹے چھوٹے خود مختار ممالک پر مشتمل ہیں۔ مگر کرکٹ کے میدان میں ان کی ٹیم متحد ہو کر کھیلتی ہے۔ عالمی کرکٹ میں قدم رکھنے کے بعد ویسٹ انڈیز اس کھیل کا سپر پاور بن گیا۔ ۱۹۷۵ اور ۱۹۷۹ء کے پہلے اور دوسرے عالمی کپ کی فاتح ویسٹ انڈیز کی ٹیم تھی۔

ویسٹ انڈیز نے جہاں بلے بازی میں روہن کنہائی، کلائیو لائیڈ، گاڈن گرینج، ووین رچرڈز، اور ڈیسمنڈ ہینز جیسے سربرآوردہ کھلاڑی دیے وہیں گیند بازی میں ویسلے ہال، کلارک، رابرٹس، کرافٹ، ہولڈنگ، مارشل، گارنر اور ایمبروز جیسے برق رفتار کھلاڑی پیدا کیے۔ کرکٹ کی تاریخ کا عظیم ترین آل راؤنڈر سر گار فیلڈ سوبرس کو بلا چوں و چرا تسلیم کیا جاتا ہے۔

۱۹۹۲ء کا سال غرب الہند کے لیے انتہائی اہمیت کا سال تھا۔ جب کھیل سے قطع نظر اس کے ٹیلنٹ کو عالمی سطح پر نہ صرف محسوس کیا گیا بلکہ تسلیم کیا گیا۔ اس جینئس کا تعلق کرکٹ سے نہیں بلکہ ادب عالیہ سے ہے۔ جزیرہ ہائے غرب الہند کے لوگوں کے لیے ۸ اکتوبر ۱۹۹۲ء ایک یادگار دن تھا۔ اس دن ۱۹۹۲ء کا نوبل انعام برائے ادب وہیں کے ممتاز شاعر اور ڈراما نگار ڈیرک والکاٹ کو دیا گیا۔ والکاٹ نے داد و تحسین کا یہ عالمی خراج وصول کرتے ہوئے کہا تھا۔ "میرے لیے بڑی بات یہ ہے کہ ویسٹ انڈیز کے ادب کو عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا۔"

والکاٹ کے حالاتِ زندگی اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالنے سے قبل آئیے نوبل انعامات برائے ادب کی تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالیں۔

الفریڈ نوبل ۱۸۳۳ - ۱۸۹۶ : ALFRED NOBEL سویڈن کے مشہور کیمیا

تھے انھوں نے دیکھا کہ مخفی طاقتوں کی تحقیق کے میدان میں اپنی صلاحیتیں صرف کیں۔ اس سے انھیں وافر آمدنی ہوئی۔ نوبل کی وصیت کے مطابق ان کی اس دولتِ کثیر اور اس سے حاصل ہونے والے سود کی رقوم سے ہر سال نوبل انعامات دیے جاتے ہیں۔ جن میدانوں میں کارہائے نمایاں کے صلے میں یہ انعامات دیے جاتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) علم طبیعات (۲) علم کیمیا (۳) علم عضویات و ادویہ (۴) علم معاشیات (۵) ادب (۶) امن۔

یہ انعامات رواں صدی کے پہلے سال یعنی ۱۹۰۱ء سے دیے جا رہے ہیں۔ ۱۹۱۴ء، ۱۹۱۸ء، ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۳ء میں یہ انعامات سیاسی و جنگی وجوہات کی بنا پر تقسیم نہیں ہو پائے۔

وطنِ عزیز ہندستان نے بھی ایک ایسے سپوت کو جنم دیا جس نے ادب کی دنیا میں اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کروایا۔ ۱۹۱۳ء میں غلام ہندستان کے رابندر ناتھ ٹیگور کو نوبل انعام برائے ادب دیا گیا۔ یہ انعام ان کی ادبی خدمات اور خصوصاً ان کے شاہکار "گیتا نجلی" پر ملا۔

نوبل انعامات دنیا کے عظیم ترین اعزازات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ عالمی سطح کا ادب خواہ کسی بھی ملک یا زبان میں تخلیق ہو رہا ہو اسے اس انعام کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔ انعام کے مستحق افراد کا انتخاب سویڈن کی ایک کمیٹی کرتی ہے۔ اکثر یہ سنا اور کہا جاتا ہے کہ یہ کمیٹی غیر جانبدار اور نیوٹرل نہیں ہے۔ اور یہ کہ اس میں بھی ایک مخصوص لابی سرگرم ہے۔ جو خاص مفادات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سائنس دانوں، ادیبوں، ماہرین معاشیات، اور علمبرداران امن کو انعامات کی خطیر رقم سے مالا مال کر دیتی ہے۔ ہر چند کہ ان شبہات اور نکتہ چینیوں کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا تاہم امر واقعہ یہ ہے کہ با صلاحیت لوگ ہی ان انعامات کے حق دار قرار پاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص جو عالمی شہرت کا حامل بھی ہے اور بظاہر نوبل انعام کا مستحق بھی نظر آتا ہے نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس اعزاز سے محروم رہ جاتا ہے اور کوئی غیر معروف شخص جسے کمزور دعویدار UNDERDOG سمجھا جا رہا ہے۔ نوبل انعام کا حق دار گردانا جاتا ہے۔ میری ذاتی رائے میں مہاتما گاندھی کا نوبل انعام برائے امن سے سرفراز نہ کیا جانا اور ۱۹۵۳ء میں سابق برطانوی وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل کو ادب کا نوبل انعام ملنا مذکورہ بالا شبہات کو مضبوط کرتے ہیں۔ ان دونوں واقعات میں کوئی رشتہ نہیں اور نہ ہی میرا مقصد سر چرچل کی خدمات میں کیڑے نکالنا ہے۔ صرف ذاتی نقطۂ نظر سے مثال پیش

کرنا مقصود تھا۔

ادب کے یہ انعامات تصوراتی یا تخیلاتی IDEALISTIC تخلیقات کے صلے میں دیے جاتے ہیں۔ چرچل کی تصانیف بدقت ہی ادب عالیہ کے زمرے میں آپائیں گی۔ آج دنیا کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ امن و آشتی کا علمبردار مہاتما گاندھی زیادہ مقبول ہے یا اسے "نیم برہنہ فقیر" کہنے والا سامراجیت پسند چرچل۔ ۱۹۹۱ء میں انگریزی کے عالمی شہرت یافتہ ناول نگار گراہم گرین GREENE کا انتقال ہوا۔ شائقین ادب مدت سے منتظر تھے کہ گرین کا ادبی ریاض رنگ لائے گا۔ اور انھیں ادب کے نوبل انعام سے سرفراز کیا جائے گا۔ لیکن کوئی ناکردہ گناہی ضرور تھی جس نے انھیں محروم رکھا۔ ویسٹ انڈیز سے بات شروع ہوئی ہے تو ٹرینیداد TRINIDAD کے برہمن نسل کے ناول نگار و صحافی وی۔ ایس۔ نائپال V.S.NAIPAUL کا ذکر کرتا چلوں۔ نائپال کو برطانیہ کا بوکر BOOKER انعام ۱۹۷۱ء میں ملا۔ ماہرین ادب ان کے متعلق بھی نوبل انعام کے استحقاق کی بات سوچتے رہے ہیں۔

ان تمام نکتہ چینیوں کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نوبل پرائز کمیٹی کے لیے بھی اتنے سارے ادیبوں میں سے ایک کا انتخاب انتہائی دشوار اور پریشان کن کام ہوتا ہے۔ کیونکہ علم و ادب کے میدان میں درجہ بندی اور عظمت و اہمیت کی سیڑھیوں کی تعمیر و تعین ناممکن سی بات ہے۔ آخر یہ کمیٹی فرشتوں پر مشتمل اراکین پر تو ہوتی نہیں۔ ماضی میں ادب کے نوبل انعامات حاصل کرنے والے چند معروف نام حسب ذیل ہیں۔ ڈبلیو۔ بی۔ ایٹس۔ YEATS جارج برنارڈ شا SHAW جان گالزوادی، او نیل O'NEILL، ٹی۔ ایس۔ ایلٹ T.S.ELIOT برٹرانڈ رسل RUSSELL ہمنگوے HEMINGWAY، البیر کامیو CAMUS سارترے SARTRE سموئیل بیکٹ BECKETT چیسلاؤ میلوز، سال بیلو SAUL BELLOW پبلو نرودا NERUDA بورس پاسترناک، ولیم گولڈنگ GOLDING گارشیا مارکوئز GARCIA MARQUEZ مجیب محفوظ، اوکتاو یو پاز OCTARIO PAZ وغیرہ۔

اب آیئے ۱۹۹۲ء کا نوبل ادب انعام پانے والے شاعر ڈیرک والکاٹ کی جانب لوٹیں۔ آپ کی پیدائش ۱۹۳۰ء میں غرب الہند WEST INDIES کے جزیرہ سنٹ لوسیا میں ہوئی۔ والکاٹ جڑواں میں سے تھے۔ ان کی نانی اور دادی کے اجداد غلام تھے۔ ڈیرک نے سنٹ میری کالج جمائکا JAMAICA اور یہ ویسٹ انڈیز یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۹ء میں ٹرینیدا تھیٹر ورکشاپ کی بنیاد ڈالی جہاں ان کے کئی ڈرامے پہلی بار منظر عام پر آئے۔ ان ڈراموں میں

۱۹۷۱ء DREAM ON MONDAY MOUNTAIN' THE JOKER ۱۹۷۸ء OF SEVILLE
اور ۱۹۷۸ O'BABYLON قابلِ ذکر ہیں۔ شاعری میں ان کی منفرد شناخت
حسب ذیل مجموعہ ہائے کلام پر مبنی ہے۔ 'In a Green Sea Grapes'
The Castaway and other poems, Night: Poems 1948-60
The fortunate Traveller,
والکاٹ کے تازہ ترین مجموعوں میں MIDSUMMER TOBACCO شامل ہے
بحیثیت ادیب والکاٹ کی توجہ اس بات میں ہے کہ وہ خود کیا ہے اور وہ
جو کچھ ہے اس کی تعمیر میں اس کے خاندان، اس کی برادری، اس کی زندگی
اور اس کے شاعرانہ مشاغل کا کیا رول رہا ہے۔ عام طور سے ان کی شاعری
آپ بیتی نظر آتی ہے۔ شاعری اور ڈرامہ دونوں میں سیاہ فام والکاٹ کی توجہ
غرب الہند اور وہاں کے ادب کی قومی شناخت پر مبذول نظر آتی ہے۔
یورپی اور غرب الہندی (کیریبیائی) تہذیبوں کی مشترکہ وراثت کے ما بین
ہونے والی کشمکش کو والکاٹ نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ انھیں ان باریکیوں
کا شدید احساس ہے۔ خود والکاٹ کے الفاظ میں " اس میں وطن یا جلا وطنی
میں سے ایک کے انتخاب کے ساتھ ساتھ خود افروزی یا وطن کے ساتھ "روحانی
غداری" کے جذبات شامل ہیں۔ ڈراموں میں والکاٹ نے نظم و نثر کا امتزاج
پیدا کیا ہے۔ علاقائی حبشیوں (سیاہ فام باشندوں) کی زبان کے الفاظ بھی
جا بجا استعمال کیے ہیں۔
والکاٹ کی نظمیں جن میں بیشتر ایجابی CONFESSIONAL اور خود استفساری
قسم کی ہیں۔ کلاسکی تلمیحات سے معمور ہیں۔ ان میں انتہائی وضاحت اور
صفائی کے ساتھ یورپی اور کیریبیائی مناظر قدرت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ وجود شر
کا احساس بھی والکاٹ کی شاعری میں گہرا ہے۔ یہ طاغوتی قوت کبھی سیاسی
جبر و استبداد کی شکل میں سر اٹھاتی ہے تو کبھی رنگ و نسل کے بھید بھاؤ
APARTHEID کی صورت میں۔ وقت، موت اور خدا کے ساتھ انسان کے
تعلقات کو بھی والکاٹ نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس کی مثال مشہور نظم
ANOTHER LIFE ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد کے ادب خصوصاً
شاعری میں انتشار، بے چینی، بے وطنی اور بے یقینی جیسے موضوعات عام
رہے ہیں۔ آج کے بھاگتے، دوڑتے بلکہ اڑتے مشینی دور میں انسان
ہمہ وقت نت نئے تجربات سے دوچار ہو رہا ہے۔ ایک حساس تخلیق کار کے
ذہن میں آج ایسے خیالات جنم لے رہے ہیں جو براہِ راست آج کے ماحول
کی پیداوار ہیں۔ اور آج سے پہلے ان کا تصور و احساس ناممکن تھا۔
سائنس کی موشگافیوں کی باوجود وجودِ انسانی کی گتھیاں آج تک سلجھ نہ

سکیں۔ برق رفتار تغیر و تبدل کے اس دور کا اندازہ ALVINTOFFLER کی
کتاب FUTURE SHOCK پڑھ کر بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے ان حالات
میں جو ادب تخلیق ہوگا وہ موضوع یا اسلوب کے اعتبار سے بہت آسان
ہرگز نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کا ادب گزشتہ صدیوں کے
ادب سے مجموعی طور پر زیادہ مشکل اور ثقیل ہے۔ والکاٹ نے بھی انتشار
جلا وطنی اور بے یقینی جیسے موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ مگر
ہر جگہ اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اردو ادب میں
بھی مذکورہ بالا موضوعات نئے نہیں۔ حسن نعیم کا ایک خوب صورت شعر ملاحظہ فرمائیے

پاؤں سے لگ کے کھڑی ہے یہ غریب الوطنی
اس کو سمجھاؤ کہ ہم اپنے وطن آئے ہیں

اسی موضوع پر ایک اور حسین شعر افتخار عارف کا ہے ؎

گھر کی وحشت سے لرزتا ہوں مگر جانے کیوں
شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

آج جبکہ موجودہ صدی اپنے اختتام کی جانب رواں دواں ہے۔ والکاٹ کو
آج کا ہومر HOMER تصور کیا جا رہا ہے۔ اس کی خاص اور بنیادی وجہ ان کی
تازہ ترین تخلیق OMEROS ہے۔ والکاٹ نے قدیم یونان کے کلاسیکی شاعر
HOMER کے رزمیوں کے پس منظر میں دور جدید پر مبنی ۳۲۵ صفحات
پر مشتمل رزمیہ OMEROS لکھ کر ادبی دنیا میں دھوم مچا دی۔ اور شاید یہی بلند پایہ
تخلیق ۱۹۹۲ کے نوبل انعام برائے ادب کے لیے ان کے نام کے اچانک انتخاب
کی فوری وجہ بھی بنی۔

ڈیرک الٹن والکاٹ DEREK ALTON WALCOTT ریاستہائے متحدہ امریکہ
کے تاریخی شہر بوسٹن BOSTON میں درس و تدریس سے منسلک ہیں۔

سائنسی موضوعات پر
مکتبہ پیام تعلیم کی فخریہ پیش کش
کمپیوٹر
کیا ہے
قیمت ۸/-
یہ کیسا بخار ہے؟
قیمت ۲/۵۰
سائنس کی دنیا
فریدالدین احمد
قیمت 8/-
گندا پانی
قیمت ۲/۵۰
کیوں اور کیسے
محمد ابراہیم شاہ
قیمت 6/-
آپ
کا
جسم
علی ناصر زیدی
قیمت ۶/-
عجائب گھر
قاسم صدیقی
قیمت 10/-

(تبصرہ نگار کی رائے سے   اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اسلامی نظامِ تعلیم کے خدوخال

پیش کش: فاؤنڈیشن فار ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ انڈیا
مبصر:- عبداللہ ولی بخش قادری
اشاعت:- ۱۹۹۳ء
قیمت:- ۴۵/- روپے
سول ڈسٹری بیوٹرز، قاضی پبلشرز، دیج بلڈنگ، حضرت نظام الدین۔ نئی دہلی ۱۳

یہ کتاب سات مضامین کا مجموعہ ہے البتہ "مقدمہ" اور "پیش لفظ" ان پر مستزاد ہیں۔ ایک مضمون "دینی اور لادینی نظامِ تعلیم" پروفیسر متین الرحمٰن مرتضیٰ کا ہے اور ایک بعنوان "دینی اور جدید نظامِ تعلیم کا انضمام" سید معروف شاہ شیرازی صاحب کا۔ باقی پانچ مضامین "دو متوازی نظامِ تعلیم"، "نظامِ تعلیم اور ریاست"، "مقاصدِ تعلیم"، "اسلامی تعلیمی نظام کے خدوخال (بنیادی عناصر)" "چند اہم امور"، پروفیسر مسلم سجاد کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ اس مجموعہ مضامین کے بارے میں اُس کے مرتب جناب مظفر حسین غزالی اپنے "مقدمہ" میں یوں رقم طراز ہیں: "خاکسار نے فاؤنڈیشن کے حکم پر اس سلسلہ کے مضامین جمع کیے اور انھیں ایک ترتیب میں اس طرح رکھا کہ اسلامی نظامِ تعلیم کے خدوخال ذہن میں واضح ہو سکیں۔ اپنی ضرورت کے مطابق ان مضامین میں کہیں کہیں معمولی حذف و اضافہ بھی کیا ہے تاکہ یہ مواد ہمارے ملک کے پس منظر میں مفید ثابت ہو سکے۔ لیکن اس بات کا پورا خیال رکھا گیا ہے کہ اس ترمیم سے مصنف کے اصل مدعا پر اثر نہ پڑے۔" مزید برآں ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی، چیرمین فاؤنڈیشن نے "پیشِ لفظ" کا آغاز یوں فرمایا ہے: "اسلامی نظریۂ حیات، اُس کے بنیادی عقائد اور افکار کو نقصان پہنچانے اور ان پر سے امتِ مسلمہ کے یقین و اعتماد کو متزلزل کرنے کے لیے عصرِ حاضر اور مغربی استعمار نے جو ہمہ جہتی جدوجہد انجام دی ہے، اُس کا سب سے طویل المیعاد اور دور رس طریقۂ کار جدید اور سیکولر نظامِ تعلیم کی ترویج اور اُس کا نفاذ تھا اور ہے۔"

مندرجہ بالا بیانات سے اِس کتاب کی غرض و غایت کا اشارہ ملتا ہے۔ پروفیسر سجاد کے مضامین مطلوبہ موضوع کے اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں اور دیگر دو مضامین اگرچہ اپنے اپنے

انداز میں 'تائیدِ مزید' کی سی حیثیت رکھتے ہیں تاہم اپنے مصنفین کی بالغ نظری کی بنا پر توجہ کے مستحق ہیں۔ مثال کے طور پر پروفیسر مبین الرحمٰن کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو: "ہندستان میں مسلم عہدِ حکومت میں تعلیم کا انتظام ہمیشہ معاشرے کی آزاد قوتوں کے ہاتھ میں رہا۔ ریاست نے حصولِ علم کی سہولتوں کے فروغ میں کسی طے شدہ ریاستی حکمتِ عملی کے تحت کوئی کردار ادا نہیں کیا البتہ بادشاہوں اور اُن کے امراء یا اہلِ خاندان نے انفرادی حیثیت میں فروغِ علم کی کوششوں کی سرپرستی ضرور کی۔ مسلمان حکمرانوں کے اِس طرزِ عمل کی وجہ سے برِصغیر میں تعلیم آزاد اور سرکاری مداخلت سے آزاد رہی اور اسی آزادی ہی کا نتیجہ تھا کہ ہندوؤں مسلمانوں نے اپنی اپنی ضرورتوں اور اپنے اپنے عقائد و نظریات کے مطابق اپنی اپنی تعلیم کا بندوبست خود کیا اور کسی طبقے کو یہ شکایت یا محرومی نہ رہی کہ اُس کی تعلیم اُس کے مطلوبہ خطوط پر نہیں ہو رہی" یہ بیان محض حقائق کی باز گردانی نہیں ہے بلکہ ہمیں آئینہ بھی دکھاتا ہے تاکہ اُس سے سبق حاصل کریں۔ اُن کے مضمون کا ماحصل یہ ہے کہ "برطانوی عہد میں مسلمانوں کے دیوبند کی طرز کے دینی تعلیمی ادارے اور علی گڑھ کی طرز کے جدید لادینی تعلیمی ادارے دراصل مسلمانوں کی آزاد تعلیم میں برطانوی اقتدار کی مداخلت کا ردِ عمل تھے۔ یہ مقاصد کے اعتبار سے حریف نہیں تھے البتہ مزاج کے اعتبار سے مختلف تھے" یہ آخر الذکر جملہ بظاہر نہایت متنازعہ فی اور تفصیل طلب نظر آتا ہے۔ لیکن اپنے سیاق و سباق میں مدلّل معلوم ہوتا ہے۔ دراصل مافی الضمیر یہ ہے کہ "نظامِ تعلیم کو نظریاتی جہت" دی جاتے۔ شیرازی صاحب نے اپنے مضمون میں نظام تعلیم کا ایک خاکہ پیش کیا ہے جس میں ابتدائی، ثانوی اور اعلا تعلیم کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے واضح کیا ہے کہ "ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ نظامِ تعلیم میں دوئی Duplication نہ ہو، اسلام ایک ہے تو اسلامی نظامِ تعلیم بھی ایک ہونا چاہیے لیکن یہاں آکر ہمیں ایک عرصے تک حکمت عملی سے کام لینا ہوگا اور ایک حد تک دو نظاموں کو تسلیم کرنا ہوگا، ایک وہ نظام جو 'درسِ نظامی' کی شکل میں اسلامی مدارس میں رائج ہے اور دوسرا جدید نظامِ تعلیم جو صرف ہماری دنیاوی ضروریات کے پیشِ نظر ترتیب دیا گیا ہے" اسلامی ریاست میں یہ حکمت عملی محض 'عبوری، مصلحتِ وقت' سے زائد وقعت نہیں رکھتی، صرف 'یقینِ محکم' کا معاملہ ہے لیکن ایک مسلمان اقلیت کی صورتِ حال کہیں زیادہ نازک اور سنگین مسائل و مراحل کی حامل ہے۔ اس مضمون میں اس طرف توجہ نہیں کی گئی ہے کیونکہ فاضل مصنف کے سامنے مسلم معاشرہ ہی رہا ہے۔ البتہ پروفیسر سجّاد نے اپنے مضمون "نظامِ تعلیم اور ریاست" کے آخر میں 'غیر مسلم حکومت میں مسلمان اقلیت کی تعلیم' کے زیرِ عنوان بھی مختصراً اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ اس ضمن میں اُن کا ارشاد ہے کہ "(۱) ریاست مذہب کی بنیاد پر علاحدہ ادارے خود قائم کرتی ہو یا قائم کرنے کی اجازت دیتی ہو تو مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور ان اداروں میں بنیادی تعلیم کے ساتھ اپنا ہنر بھی سکھائیں کہ فارغ التحصیل نوجوان معاشرہ میں اپنی جگہ بنائیں اور اپنی ذات سے اسلام کی دعوت پھیلانے کا ذریعہ بنیں۔ معیاری ابتدائی تعلیم کے اداروں

کا جال بچھا دیں اور یہاں اتنی مضبوط بنیاد فراہم کی جاتی کہ اگلے مرحلے کے لیے جب یہ مسلمان طلبہ دوسرے اعلا تعلیمی اداروں میں جائیں تب بھی اُن کی بنیادِ ایمانیات معرض خطر میں نہ پڑیں۔ اسی طرح کے تمام تعلیمی اداروں میں ترتیب کا ایک اہم جزو یہ ہونا چاہیے کہ طالب علم غیر اسلامی معاشرہ سے سمجھوتہ کرنے پر راضی نہ ہو بلکہ اُسے تبدیل کرنے کی جدوجہد کو اپنا لائحہ عمل بناتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۲) ریاست ادارے قائم کرنے کی اجازت نہ دے تب بھی مسلمانوں پر سے یہ فرض ساقط نہیں ہو جاتا۔ مسلمانوں کی بقا کا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے کہ اُن کی نئی پود کا دل و دماغ اسلام پر مطمئن اور راضی ہو۔ ۔ ۔ اسلامی تعلیم کا وہ دائرہ جو گھر اور والدین سے متعلق ہے ایسی صورتِ حال میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔" پروفیسر سجاد کے یہ مذکورہ بالا افکار نہ صرف بصیرت آفریں ہیں بلکہ دعوتِ عمل دیتے ہیں۔ اُن کے دیگر مضامین بھی اپنی بھرپور افادیت رکھتے ہیں۔ "اسلامی تعلیمی نظام کے خدوخال"، اُن کا سب سے طویل مضمون ہے جس میں استاد، طالب علم، نصاب، کتاب و تدریسی آلات، ہم نصابی سرگرمیاں، حکومت اور تعلیمی انتظامیہ معاشرہ عنوانات کے تحت میدانِ تعلیم کا جائزہ لیا گیا ہے اور اُس کے بعد آنے والا مضمون "چند اہم امور" ایک حد تک اپنے پیش رو کا تتمہ گردانا جا سکتا ہے جس میں تعلیم بالغان، تعلیم نسواں، اقامت گاہیں، سہولتوں کی فراہمی، تعلیمی معیار، جدید تحقیقات سے استفادہ، جیسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ کتاب بصیرت آفریں کہلانے کی مستحق ہے اور مہمیز کا کام انجام دیتی ہے۔ اس کا مطالعہ اُمتِ مسلمہ کی فلاح و بہبود کے احساسات مرتب کرنے کا امکان رکھتا ہے۔ یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ اُس کی کماحقہٗ پذیرائی کی جائے گی اور فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام اس سے زائد بسوط جامع کتب کی اشاعت کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

عکس زار

مصنف : سید علی احمد دانش

قیمت : ۳۰ روپے

ملنے کا پتہ : نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ امین آباد لکھنؤ

مبصر : جمیل اختر

"عکس زار" سید علی احمد دانش کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں کل بارہ مضامین شامل ہیں۔ جن میں زیادہ تر مضامین میر انیس کی شاعری اور ان کے شاگرد و متعلقین پر ہیں۔ انیس پر دانش کے یہ مضامین انیسیات کے ذیل میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہوں یا نہیں لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ انیس شناسی میں ان کی اہمیت و افادیت سے انکار مبنی بر انصاف نہیں ہوگا۔ آج کے دور میں جب کہ انیس شناسی ایک مشکل مسئلہ بن گئی ہے اور انیس سے متعلق اختلافات کی خلیج دن بدن بڑھتی جا رہی ہے ایسے میں دانش کے مضامین ضرور انیس شناسوں کو کچھ روشنی فراہم کریں گے۔ خاص طور پر یہ مضامین یعنی "میر انیس کا نو دریافت کلام" "ہماری مجلسی تہذیب اور میر انیس" "حالات میر انیس اور ان کا غیر مطبوعہ کلام" "میر انیس کے ایک گمنام شاگرد عطا فیض آبادی" "انیسیات کے ذیل میں ایک گراں قدر اضافہ ثابت ہوں گے۔ اور لوگ اس کی اہمیت

و افادیت کو تسلیم کریں گے۔

دوسرے مضامین میں شدید لکھنوی، لائق لکھنوی، کلب عابد کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کی شاعری پر مضمون لائق توجہ ہے۔ اور ان سے قارئین کے معلومات میں یقیناً اضافہ ہوگا۔ "بہادر شاہ ظفر کی دلی اور اس کے مرثیہ نگار" میں ظفر کے ہم عصر شعراء کی مرثیہ نگاری کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور قابل ذکر مرثیہ نگاروں کے ضمن میں جن شعراء کو پیش کیا گیا ہے ان میں داغ دہلوی، تشنہ دہلوی، آزردہ، سالک دہلوی ظہیر دہلوی، محسن، عابد، اکرام دہلوی، عیش دہلوی اور شیفتہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ایک مضمون زمانہ کا اکبر نمبر بھی ہے۔ جس میں اس نمبر میں شامل تمام مضامین کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اس مضمون کی حیثیت ایک تبصرے کی ہے۔

اس طرح عکس زار میں شامل تمام مضامین معلوماتی ہیں۔ خود مصنف کا تعلق بھی خاندان انیس سے ہے اس لیے بھی علمی و ادبی حلقوں میں اس مجموعے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور انیس سے متعلق نئی معلومات کو بھی استناد حاصل ہوگا۔

اردو زبان وادب کا خاکہ

مصنف: ڈاکٹر خوشحال زیدی
قیمت: ۴۰ روپے
مبصر: نسرین بیگم
ناشر: ادارہ بزم خضر راہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

اعلا مقصد شوق کی کامیابی اختیار کرنے یہ زندگی کی بڑی کامیابی ہے۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی ایک ممتاز محقق ہیں۔ موصوف نے "اردو زبان و ادب کا خاکہ" میں ہر پہلو پر عمیق نظر ڈالی ہے۔ انھیں اس حقیقت کا شدت سے احساس رہا کہ اردو طلبہ کے لیے ایسی ایسی کتابوں کی کمی ہے جو کہ طلباء و طالبات کے لیے معاون ہوں اور ان کی پیش آنے والی دشواریوں کا حل تلاش کر سکے۔ اس کام کی اشد ضرورت تھی۔ اس کمی کو زیدی صاحب نے محسوس کیا اور نہایت عرق ریزی سے طلبہ و طالبات کے لیے کتابیں ترتیب دیں۔ انھوں نے اردو نصاب کو مد نظر رکھ کر اس طرح کی کتابیں تحریر کیں۔ اس کے علاوہ ان کے بے شمار تحقیقی مقالے اردو کے معیاری جریدوں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ جد و جہد مسلسل جاری ہے۔
چنانچہ "اردو زبان وادب کا خاکہ" جس میں زبان کی ماہیت، آغاز و ارتقا، کھڑی بولی اور اردو، دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول اور اس کے علاوہ اردو اصناف ادب کا ارتقا جس میں افسانوی ادب" داستان، ناول، افسانہ، خاکہ نگاری، ڈراما اور مزاح نگاری پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے اردو اصناف سخن کا ارتقا، تنقید و تحقیق، جس میں مارکسی تنقید، سائنٹفک تنقید، نفسیاتی تنقید اور لسانیات، داستان گوئی، ناول نویسی، افسانہ نگاری، ڈراما نویسی اور مختلف ڈرامے و ڈراما نگاروں کے فن پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ نثر نگاری میں مرزا غالب، سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، سرشار، مولوی عبدالحق، نیاز فتحپوری،

خواجہ حسن نظامی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریا بادی، فرحت اللہ بیگ، مسعود حسن رضوی ادیب، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، احتشام حسین اور کلیم الدین احمد اس کے علاوہ چند مشہور شعرا اور ان کی شعری تخلیقات بحیثیت نظم گو اور غزل گو کے پیش کیا ہے۔ مثنوی، مرثیہ، جس میں انیس دبیر کی مرثیہ نگاری، سودا، ذوق، غالب اور محسن کی قصیدہ نگاری کا احاطہ کیا ہے۔ اور آخر میں مصنفین و شعرا کرام کی پیدائش، وفات اور تصانیف کی طویل فہرست بھی پیش کی ہے۔ ایک ہی وقت میں ان تمام چیزوں کا یکجا کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ اس کے ساتھ زیدی صاحب نے طلباء کے معیار کا بھی خاص خیال رکھا ہے جس سے زیادہ سے زیادہ طلبا استفادہ کر سکیں۔

مکاتیبِ شمیم

مرتب و ناشر: شمس بدایونی
مبصر : ڈاکٹر سیفی پریمی
قیمت : ۳۰ روپے
ملنے کا پتا: روشن پبلیکیشنز، روشن محل، محلہ سوتھا بدایوں

"مکاتیب شمیم" کی اشاعت، فخرالدین میموریل کمیٹی حکومت اترپردیش لکھنؤ کے تعاون سے ہوئی ہے۔ بدایوں میں اس وقت نوجوان اہل قلم سرگرم کار ہیں۔ وہ اپنی تخلیقات ہی نہیں بلکہ کنز مخفی کا بھی سراغ لگا کر منظر عام پر لا رہے ہیں۔ شمس بدایونی نے ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی کی فراخدلی سے من موہن لال ماتھر شمیم بریلوی کے خطوط حاصل کیے۔ مرتب کیا اور اشاعت کا اہتمام بھی کر دیا۔ دیباچہ، مقدمہ، حواشی سب کچھ خود ہی لکھا۔

من موہن لال ماتھر شمیم کی پیدائش ۱۸۹۴ء کو ہوئی اور وفات ۱۹۵۴ء میں پائی۔ بی۔اے، ایل۔ایل۔بی پاس کر کے وکالت کرنے لگے۔ ۱۹۳۰ء میں بریلی کالج میں جونیر پروفیسر شعبۂ قانون مقرر ہوئے۔ نہایت ذہین، صاحب نظر اور نکتہ رس تھے۔ ان کے حلقۂ احباب میں فانی بدایونی، ڈاکٹر محمد اسحاق، جگر بریلوی، ڈاکٹر سعید احمد بریلوی، پرنسپل عبدالشکور تماشائی وغیرہ شامل ہیں۔

شیام موہن لال سکسینہ ۱۸۹۰ء بریلی میں پیدائش۔ ۱۹۷۶ء کو میرٹھ میں وفات پائی۔ بی۔اے پاس کر کے یوپی کی مختلف تحصیلوں میں نائب تحصیلدار رہے۔ ۱۹۴۳ء میں پینشن پا کر انٹر کالج میں اردو فارسی کا درس دینے لگے۔ ادبی دنیا ان کو جگر بریلوی کے نام سے جانتی ہے۔

"مکاتیب شمیم" میں ۹۹ خطوط ہیں۔ ان میں سے ۸۳ جگر بریلوی کے نام ہیں۔ پہلا خط ۱۹۱۸ء اور آخری خط ۱۹۵۴ء کو لکھا گیا۔ ۱۶ خطوط ڈاکٹر محمد اسحاق کے نام ہیں۔ پہلا خط ۱۹۲۳ء اور آخری خط ۱۹۳۵ء کو لکھا گیا۔

ڈاکٹر محمد اسحاق کے نام جتنے خطوط ہیں وہ کاروباری نوعیت کے ہیں۔ ذاتی حالات اور زیادہ علالت کی تفصیل درج ہے۔ ان سے گہرے تعلقات اور خلوص کا پتا چلتا ہے۔

کلاس فیلو کے باہمی ربط کا جلوہ ہے۔
شمیم اور جگر کے مابین خطوط کا رنگ دوسرا ہے۔ ان میں خیر سگالی بھی ہے۔ انتظار ہے اور غالب فضا شعر و سخن اور عروضی نکات کی ہے مثلاً ۶۴-۶۵
"تم نشہ میں بھی میری جاں نہ کھلے" نشہ کا استعمال اس طرح ہرگز جائز نہیں اور اگر کسی کے کلام میں ہو تو میری رائے میں قابل تقلید نہیں۔ آپ لکھتے ہیں۔ "بزم عدو سے جاں نہیں۔ کوچۂ جاں جان جاں نہیں" تو آخر یہ کیا بلا۔ غور کیجئے تخمیس میں آپ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ تیسرے شعر کی تخمیس اچھی خاصی ہے۔
"ناوک نیم کش" خوب ہے اور نہایت خوب ہے۔ مگر کیوں صاحب! یہ پرائی بہو بیٹیوں کا تکنا کہاں تک روا ہے۔ آپ یہ واقعہ مجھے سنا چکے ہیں۔ مگر کیا اب اس قدر کھل کھیلے کہ دنیا کو سنانے میں بھی شرم نہیں۔ یعنی اب آپ اس کی طباعت پر بھی آمادہ ہیں"۔
کہیں کہیں فانی بدایونی کا ذکر بھی ہے۔ ص ۹۶۔ ڈاکٹر محمد اسحاق خاں کو ایک خط میں لکھا ہے۔ "شاید کسی خط میں آپ نے فانی صاحب کے متعلق بھی دریافت فرمایا تھا۔ آج کل اٹاوہ میں تشریف رکھتے ہیں۔ اور ایک فنافی الشعر صاحب کمال جیسی کچھ وکالت کر سکتا ہے، کر رہے ہیں۔ چھ سات مہینوں بعد برسوں ایک خط ان کا آیا تھا۔ چند اشعار تازہ بھی مرحمت فرمائے ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے"۔

میں محو تماشا ہوں دنیا ہے تماشائی	مشتاق نگاہوں کی اللہ رے رسوائی
محفل سے جو وہ اٹھے لیتے ہوئے انگڑائی	لبریز تموّج تھا اک خط میخانہ
جب ذکر بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی	پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا

"مکاتیب شمیم" میں زندگی اور کلچر کی سطح پر اس دور کے اقدار و کردار، آداب، معمولات، راز نہاں اور حسن بتاں کے جلوے ہی جلوے نظر آتے ہیں۔ شمس بدایونی نے ان خطوط کو سورج کی کرنوں کے سپرد کر دیا۔ یہ ادبی فیضان ہے۔ مرتب کی محنت، حوصلہ افزائی اور تحسین کی مستحق! شمیم اور جگر کی تصویریں قابل قدر ہیں۔ کتاب عمدہ چھپی ہے۔

دام تحریر

مصنف :۔ ڈاکٹر جلیس سہسوانی
نوعیت :۔ ناول
قیمت :۔ دس روپے
مبصر :۔ ڈاکٹر تنویر احمد خاں
ملنے کا پتا :۔ جلیس سہسوانی، رستم لاڈ، سہسوان (بدایوں) یوپی

گذشتہ چند برسوں میں افسانہ کی بہ نسبت ناول بہت کم لکھے گئے ہیں اور ان میں بھی نئی نسل کے نمائندے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کی وجہ جو بھی رہی ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ ناول نویسی کے لیے وسیع الخیالی اور استغات

ڈاکٹر جلیس سہسوانی پچھلی تین دہائیوں سے آسمان ادب پر نمودار ہوئے ہیں اور "جلتے بجھتے چراغ"، "قلم کی شکست"، "فولادی انسان"، "موم کے پتھر" اور "پھیلتے اندھیرے" وغیرہ ناول تخلیق کر چکے ہیں۔ "دام" تحریر ڈاکٹر جلیس سہسوانی کی تازہ ترین رومانی ناول ہے جس میں ناول نگار نے انجم زیدی اڈیٹر گل فشاں کے عشق کی داستان کو خطوں کے ذریعہ بیان کیا ہے جو ایک پی ایچ ڈی اسکالر یاسمین ضیاؔ کے دام فریب میں گرفتار ہو کر اس سے عشق کر بیٹھتا ہے اور یاسمین کے بار بار عاشقانہ خطوط لکھنے اور انجم زیدی کو لکھنؤ آنے کی دعوت دینے پر وہ آخر بدایوں سے لکھنؤ پہنچ ہی جاتا ہے لیکن یاسمین ضیاؔ کے سامنے پہنچ کر اس حقیقت کا راز کھلتا ہے کہ یاسمین تو "عشق میں کشش ہے" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ رہی تھی اور وہ تجربہ کرنا چاہتی تھی کہ کیا عشق میں واقعی کشش ہے۔ اس لیے اس نے انجم زیدی کو خطوط لکھ کر بدایوں سے لکھنؤ آنے پر مجبور کر دیا۔

ناول کی فضا رومانی مگر اصلاحی ہے مصنف کے ذہن میں اصلاحی شعور کارفرما ہے وہ وادی عشق میں قدم رکھنے والوں کو خبردار کر دینا چاہتے ہیں کہ حسن دھوکا بھی ہو سکتا ہے جس کا خمیازہ کبھی کبھی عاشق صادق کو ہی بھگتنا پڑتا ہے۔

ناول کا انداز تحریر اتنا دلچسپ اور حقیقی ہے کہ پڑھنے کا اشتیاق بڑھتا ہی ہے گھٹتا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ ڈاکٹر جلیس صاحب کا تجرباتی ناول ہے وہ انجم زیدی کے پردے میں اپنے آپ کو چھپا نہیں سکے ہیں۔ وہ "گل کدہ" بدایوں کے اڈیٹر ہیں اور انجم زیدی "گل فشاں" کے۔ انداز تحریر میں ایک درد اور کسک بھی ہے۔ زبان پر انھیں اچھی طرح گرفت حاصل ہے۔ مضامین کو بڑے موثر انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ خط و کتابت کے ذریعہ ناول کی تکمیل شاید جلیس سہسوانی کا نیا تکنیکی تجربہ ہے جس میں وہ پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ اصلاح معاشرہ اور انقلابی شعور ادب کا اہم جز ہے۔ جلیس سہسوانی نے اپنے ناول میں اس امر کو ملحوظ رکھا ہے ناول نگار کو ناول کا فن آتا ہے فنی نکتہ نگاہ سے ناول کا کینوس بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہے گرچہ یہی اس ناول کا نکتہ عروج ہے تاہم ناول نگار اگر چاہتا تو اس کو مزید آگے بڑھا سکتا تھا۔

ڈسٹ کور پر مصنف کی تحریر تو گوارا تھی مگر سرورق پر اس بے دفا محبوبہ کی تصویر ادبی ناول میں کھلتی ہے۔ امید ہے جلیس صاحب کا یہ ناول ایک المیہ ہوتے ہوتے بھی الارم کا کام دے گا اور ادبی حلقوں میں اپنا ایک مقام پیدا کرے گا۔ کاغذ سفید اور چمکدار ہے۔ کتابت صاف ستھری نستعلیق ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔

معذرت

گرمی کی شدت اور بجلی کی آنکھ مچولی نے پریس اور دفتر کا نظام درہم برہم کر دیا۔ بعض دن تو ایسے بھی گزرے کہ بجلی دن دن بھر نہیں آئی۔ اور اگر آئی بھی، تو تھوڑی دیر کے لیے اپنی جھلک دکھا کر اپنے آقاؤں کی گود میں واپس جا کر بیٹھ گئی۔ مجبوراً شعری حصہ کے کچھ صفحات، اور کچھ خطوط کے صفحات روکنا پڑے۔ انھیں آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔ نیز پروف ریڈنگ بھی ٹھیک سے نہیں ہو پائی۔ امید کہ درگزر فرمائیں گے۔

(ادارہ)

ادبی تہذیبی خبریں

اترپردیش اردو اکادمی کے انعامات

مولانا ابوالکلام آزاد انعام: پندرہ ہزار روپے

جناب اخترالایمان

مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں دس دس ہزار روپے کے انعامات:-

۱- جناب اوپندر ناتھ اشک (الہ آباد)
۲- پروفیسر سید مجاور حسین (الہ آباد)
۳- پروفیسر ملک زادہ منظور احمد (لکھنؤ)
۴- پروفیسر کنور اخلاق محمد خان شہریار (علی گڑھ)

اردو کی ترویج واشاعت کے لیے خصوصی انعام دس ہزار روپے

۱- ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم (لکھنؤ) (پس ازمرگ)

پانچ پانچ ہزار روپے کے تین انعامات

۱- جدید شاعری - پروفیسر ظہیر احمد صدیقی
۲- سیاہ سیاہ - جناب باقر مہدی
۳- تفہیم - جناب رشید حسن خاں

تین تین ہزار روپے کے تین انعامات

۱- چہرہ در چہرہ - جناب مجتبیٰ حسین
۲- مقالات ونشریات - ڈاکٹر کاظم علی خاں
۳- فیض احمد فیض افکار واقدار - ڈاکٹر شفیق اشرفی

دو دو ہزار روپے کے سترہ انعامات

۱- خوباں ادب - جسٹس مرتضیٰ حسین
۲- رسالہ پطری لعل - پروفیسر ظل الرحمٰن
۳- اردو شاعری کی گیارہ آوازیں - عبدالقوی دسنوی
۴- اردو مثنوی مطالعہ اور تدریس - ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
۵- اکثر یاد آتے ہیں - جناب مظہر امام
۶- جوش کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ - ڈاکٹر عقیل احمد
۷- کرشن چندر شخصیت اور فن - جگدیش چندر ودھاون
۸- پریم چند حیات نو - مانک ٹالا
۹- دیار صبا - پیام فتح پوری
۱۰- موج عارفین - صابر دت
۱۱- جلے پیڑ کی چھاؤں - ایم کوٹھیاوی راہی
۱۲- کاٹھ کا گھوڑا - رتن سنگھ
۱۳- روپ کے پھول - قتیل راجستھانی
۱۴- میں بھی فسانہ تم بھی کہانی - اقبال متین
۱۵- فکر اقبال کے سرچشمے - ڈاکٹر آفاق فاخری
۱۶- منظر پس منظر - نشتر خانقاہی
۱۷- ادراک - گوہر عثمانی

ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے کے بارہ انعامات

۱- سخن - وقار خلیل
۲- یہ جہاں اور ہے - ڈاکٹر ابن فرید
۳- رنگ محل - م-م راجندر
۴- کف گل فروش - سعید شہیدی
۵- بیسویں صدی میں عرب قومیت کا فروغ - ڈاکٹر فیروز سلطانہ
۶- کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے - ڈاکٹر نقی حسین جعفری
۷- واجد علی شاہ کا دور مٹیا برج - ڈاکٹر زہرا ممتاز
۸- کہانی خواب - محسن خاں
۹- ناگپور میں اردو - ڈاکٹر شرف الدین ساحل
۱۰- تہذیب الاخلاق - محترمہ نفیس بانو
۱۱- جونک - پروانہ ردولوی
۱۲- جذب عشق - ڈاکٹر عبدالرؤف

ایک ایک ہزار کے چونتیس انعامات

۱۔ جلسہ ۔ شیخ سلیم
۲۔ فرہنگ کلام میر ۔ شاہینہ تبسم
۳۔ لسانیات اور دکنی ادبیات ۔ شہناز نبی
۴۔ آدم خور چیتا ۔ ریاض احمد خاں
۵۔ اردو ادب کی تاریخ ۔ سید محمد عظیم
۶۔ کتاب سنگ ۔ کاظم جرولی
۷۔ دوپہر کا سفر ۔ ملکہ نسیم
۸۔ رستے چھالے ۔ راجندر نرائن سکسینہ
۹۔ حصار ۔ ڈاکٹر طاہر حسین طاہر
۱۔ مشاہیر شعرائے اردو کی فارسی شاعری ۔ انیس ادیب
۱۔ نور الہدیٰ ۔ عیش میرٹھی
۱۱۔ چمن در چمن ۔ چندر بھان نگم راحت کانپوری
۱۱۔ آگہی کے استعارے ۔ ڈاکٹر مبارک انصاری بڈھیہ
۱۱۔ سلگتی ریت ۔ اسلم الہ آبادی
۱۔ دینی رباعیاں ۔ کمال الدین حسن
۱۔ نشاط غم ۔ قمر حسین رضوی
۱۔ پھلجھڑیاں ۔ سطوت رسول
۔ ہندستانی تاریخ و ثقافت اور فنون لطیفہ
عتیق انور صدیقی
۔ تذکرہ شعرائے اترپردیش ۔ عرفان عباسی
۔ ابن خلدون ۔ ڈاکٹر نسیم احمد صدیقی
۔ مشائخ گورکھپور ۔ صوفی وحید الحسن
۔ آخری درویش ۔ عشرت ظفر
۲۔ نگار ڈے حضور ۔ ڈاکٹر سہیل احمد زیدی
۱۔ شعرائے طنز و مزاح ۔ خان فہیم
۱۔ سنگ در سنگ ۔ عزمی خیرآبادی
۔ بچپن ۔ فاطمہ وحیدہ جاشی
۔ دھان کی کاشت ۔ ناظم جعفری
۔ مرادآباد کی تاریخ اور صنعت ۔ تاباں نقوی امروہی
۲۹۔ اہل وطن کے نام ۔ عاصم گونڈوی
۳۰۔ پچھوکے ۔ پرویز یداللہ
۳۱۔ طرفہ تماشہ ۔ مسیح انجم
۳۲۔ آس پاس ۔ فاطمہ تاج
۳۳۔ انگاروں کا شہر ۔ صبا فاطمہ
۳۴۔ برگ و ساز ۔ ناخر جلال پوری

کاتبوں کو انعامات

۱۔ جلال الدین احمد (لکھنو) ایک ہزار روپے
۲۔ سید حسن (الہ آباد) پانچ سو روپے
۳۔ محمد اعلم (دہلی) پانچ سو روپے

ناشر انعام

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۔ پانچ سو روپے

مہاراشٹر انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام

عید ملن

مہاراشٹر انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ۲ اپریل ۹۴ء کو لکی ہوٹل کے ٹیرس پر ایک تقریب عید ملن اور محفل سخن کے نام سے منعقد ہوئی کالی داس گپتا رضا نے مشاعرے کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ جناب نوشاد علی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا نے مختصر طور پر عید کی مبارکباد پیش کی۔ یوسف ناظم کے تعارفی کلمات کے بعد بمبئی کے مقبول شاعر عبدالاحد ساز نے مشاعرے کی نظامت کی۔ جس میں قیصر الجعفری رفیعہ شبنم عابدی، اثر فیض آبادی، شاہد لطیف قاسم امام۔ صادقہ نواب، قتیل راجستھانی، قیصر عثمانی، شجاع الدین ساجد، عین دت، جاوید

ندیم، عبید اعظمی، عرفان جعفری، امین تابش نے اپنا کلام سنایا۔ مہمانوں کی شیر خرمے سے تواضع کی گئی۔ اور یہ محفل نہایت خوش گوار ماحول میں چار گھنٹے تک جاری رہی۔ لکی ہوٹل (باندرہ) ادبی محفلوں کا مرکز بنتا جا رہا ہے اور یہ جگہ انتظامیہ کے حسن سلوک اور محل وقوع کی بنا پر بہت پسند کی جائے گی۔

علمی تعاون کی اپیل

راقم "احتشام حسین شخصیت اور ادبی خدمات" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھ رہا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ مواد تو پاکستان میں دستیاب ہے اور کچھ احتشام حسین مرحوم کے صاحبزادے جناب "ڈاکٹر جعفر عسکری صاحب" کی عنایات سے مل گیا ہے۔ تاہم ابھی درج ذیل مواد کی ضرورت ہے: "ادب اور سماج" "ویرانے"، "جدید ادب"، "منظر اور پس منظر" "شعلے"، "انتخاب جوش"، احتشام کی مرتب کردہ نصابی کتب"، احتشام حسین کے غیر مطبوعہ خطوط۔ انڈیا میں شائع ہونے والے ادبی رسائل کے احتشام حسین نمبر،

راقم کی احتشام حسین کے چاہنے والوں سے استدعا ہے کہ اگر درج بالا مواد یا کوئی ایسا مواد جو احتشام حسین کی شخصیت اور نظریات کے کسی گوشے کو عیاں کر سکے ان کے پاس موجود ہو، تو درج ذیل پتے پر اطلاع دیں۔ راقم اس مواد سے استفادہ کرنے کے لیے ان سے رابطہ قائم کرے گا۔

پروفیسر اسد علی خاں پوسٹ بکس نمبر ۱۲۷۰
جی۔ پی۔ او اسلام آباد (پاکستان)

انجمن حدیقۃ الادب، میسور کا

یادگار علمی و ادبی اجلاس

میسور ــ ہماری گفتگو کے دوران اگر ہم غالب اور اقبال کا حوالہ نہ دیتے تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ شخص بہت کم پڑھا لکھا ہے مگر ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ نسل دوراں تو یہ بھی فراموش کر چکی ہے کہ غالب اور اقبال کون تھے۔

جناب مقصود علی خاں (مدیر اعلیٰ سالار بنگلور) انجمن حدیقۃ الادب، میسور کی ایک یادگار علمی و ادبی نشست سے بہ حیثیت مہمان خصوصی خطاب فرما رہے تھے جو مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان کی یاد میں منعقد کی گئی تھی۔

سابق پروفیسر ایم۔ اے قادر صاحب (سینٹ فلومناس کالج، میسور) نے اردو زبان کا ایک منفرد شاعر: مولانا ظفر علی خان، کے عنوان پر جامع و پُر مغز تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے تین بڑے شاعر ہیں میر، غالب اور اقبال۔ مگر فی البدیہہ، بامعنی اشعار کہنے کا فن مولانا ظفر علی خان کا وہ خاصہ تھا جو ان تینوں کے نصیب میں نہیں آیا۔ فی البدیہہ شعر زبان سے ایسے نکلتا جیسے بندوق کی گولی۔ محترم نے مولانا کی سیاسی زندگی کا بھرپور تجزیہ فرماتے ہوئے کہا کہ مدیر تو اداریہ لکھتا ہے مگر "زمیندار" کا مدیر، ہر دوسرے، تیسرے دن سلگتے مسائل پر بولتی نظمیں کہتا تھا۔ موصوف نے مولانا ظفر علی خان سے ملاق

دوستوں کے کئی دلچسپ واقعات سنائے۔
"مولانا آزاد کی ادبی خدمات" کے زیرِ عنوان ڈاکٹر بی۔ شیخ علی صاحب (سابق وائس چانسلر منگلور و گوا یونی ورسٹی) نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی، صحافتی و مذہبی خدمات پر ایک بامعنی مقالہ پیش کیا۔

استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے جناب محمد نورالحق نعیم (معتمد انجمن حدیقۃ الادب میسور) نے مہمانوں کا تعارف کروایا اور انجمن کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ملک کے نامور فرزندوں کی یاد تازہ کرنا ہمارا فرضِ منصبی ہے اور یہ ان پر احسان نہیں بلکہ اپنی اقبال مندی کا ثبوت ہے۔

اس ادبی اجلاس کا آغاز مولانا حافظ و قاری جناب حفظ الرحمٰن (امام مسجد مبین، میسور) کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ جناب محمد ہاشم علی (سابق پروفیسر اردو، جامعہ میسور) نے صدارت فرمائی اور محمد فاروق نشتر (شریک معتمد انجمن حدیقۃ الادب، میسور) نے شکریہ ادا کیا۔ یہ اجلاس انسٹی ٹیوٹ آف انجینیرس واقع بی، ایل، ای روڈ، میسور میں منعقد ہوا۔

سورت میں غیر طرحی مشاعرہ

سورت ــ "ملیشیا" سے تشریف لائے ہوئے بزرگ شاعر جناب آثم راندیری اور "لندن" سے تشریف لائے ہوئے شاعر نواز عزیز الدین معلم کے اعزاز میں "اردو مرکز" سورت کی جانب سے ایک غیر طرحی مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت گجراتی کے معتبر شاعر جناب آمر پالن پوری نے کی اور نظامت کے فرائض ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر و ادیب جناب شکیل اعظمی نے بہ حسن خوبی انجام دیے۔ جن شعرا کو سامعین نے زیادہ پسند کیا اور ان میں انجم قنوجی، شکیل اعظمی، شکیل شاہ، وسیم ملک، اثر پالن پوری، آثم راندیری، درپن اکبری، زحمت سورتی، عبدالرشید ماہر، ساجد جاہنری، گل انکلیشوری، خمار مالیگانوی، ساغر برہان پوری، ساز والوری، اور رملیش گاندھی کے نام قابل ذکر ہیں۔

ادارے کے صدر جناب ایڈوکیٹ کاظم حکیم نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔

اردو زبان سرکار کی غلط پالیسیوں کا شکار

ہارون رشید کا احتجاج

ناگپور ــ مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام ناگپور کے انصار کمیونٹی ہال میں مورخہ ۱۶ جنوری کی سہ پہر کو ایک تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی جس کا موضوع ہے "اردو معاشرے میں تعلیمی پسماندگی کے اسباب" تھا۔ کانفرنس کی صدارت کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر عبدالرب عرفان (صدر شعبہ اردو و فارسی، وسنت راؤ نائیک انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز ناگپور) نے انجام دیے۔

کانفرنس میں جناب شبیر حسین جوش (اورنگ آباد) جناب محمد حسن فاروقی (مالیگاؤں) ڈاکٹر صفدر (دروڈ) ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر (امبیت) ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن (ناگپور) اور ڈاکٹر محمد

شرف الدین ساحل (ناگپور) نے اپنے وقیع اور پر مغز مقالے پیش کیے جنھیں سامعین نے بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنا۔
کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے اکادمی کے کارگزار صدر اور اردو بلٹز کے اڈیٹر جناب ہارون رشید (علیگ) نے اردو زبان کے متعلق سرکار کی غلط پالیسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احتجاج کیا کہ سرکار نے کچھ ایسی پالیسیاں اختیار کی ہیں جن کے نتیجے میں وہ زبان جس نے جنگ آزادی کے دوران عوامی بیداری پیدا کرنے میں سب سے اہم رول ادا کیا، آج دھیمی موت کا شکار بن کر رہ گئی ہے۔
بیشتر مقالہ نگاروں نے اس تلخ حقیقت کا اعتراف کیا کہ اردو معاشرے میں تعلیمی پسماندگی کا بنیادی سبب علم و تعلیم کی حقیقت، اہمیت اور افادیت سے بے خبری اور ناآشنائی ہے
اس تعلیمی کانفرنس میں مہمانان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر ڈاکٹر سید نعیم الدین (پریسیڈنٹ ایوارڈ یافتہ) امیر ملک صاحب (امیر جماعت ملک، ناگپور) ڈاکٹر ایم۔ اے۔ عزیز صاحب (صدر انجمن حامی اسلام، ناگپور) اور جناب محمد حفظ الرحمن صاحب (اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن، ناگپور) شریک ہوئے شرکا، اور مہمانانِ خصوصی کی خدمت میں انجمن حامی اسلام، ناگپور کی جانب سے تولڈر پیش کئے گئے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد سمیع اللہ (ممبر اردو اکادمی، امراؤتی) بھی اس جلسے میں بہ نفسِ نفیس حاضر تھے۔
اس کانفرنس میں ناگپور اور کامٹی کے اسکولوں، جونیر کالجوں اور کالجوں کے اساتذہ، طلبہ نیز ریسرچ اسکالروں نے بڑی دلچسپی اور سرگرمی کے ساتھ مباحثے میں حصہ لیا۔ کانفرنس کی نظامت کے فرائض پروفیسر سلیم ضیا اور انصاری اصغر جمیل نے ادا کیے۔ خطبۂ صدارت کے بعد ڈاکٹر مدحت الاختر (ممبر اردو اکادمی، ناگپور) نے حاضرین مہمانان خصوصی، صدر جلسہ، شرکا اور والنٹیرز کا شکریہ کیا نیز اپنے معاونین خصوصی جناب صدیق علی خاں چھٹپل، جناب شاہد کبیر اور ڈاکٹر نظیر رشیدی کا بطور خاص ذکر کیا۔

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانبدارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی

جولائی ۱۹۹۴ء جلد ۳۴ شمارہ ۷

فی پرچہ	6/=
سالانہ	55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	320/=

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برنی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں/غزلیں

مانگے کا اجالا

طنز و مزاح

انشائیہ

خود نوشت

جائزے.......

نئی مطبوعات

بیسویں صدی میں عرب قومیت کا فروغ (تحقیقی مقالہ)
ڈاکٹر فیروز سلطانہ ۱۰۰/-

گستاخ رسولؐ کی سزا مولانا وجاہت اللہ فاروقی ۲۵/-

اصول تحقیق و ترتیب متن (نیا اڈیشن) تحقیق
ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۱۰۵/-

سرسید کی نثری خدمات (ادبی مضامین) ڈاکٹر مشتاق احمد ۹۰/-

شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری (نیا اڈیشن اضافہ شدہ)
پروفیسر وہاب اشرفی ۱۵۰/-

نفرت کی چٹان (ناول) الیاس سیتاپوری ۴۰/-

بنیادی معلومات قرآن مجید (مذہب) مولانا ظفر علی ۱۸/-

پیغام جہاد امام حسن البنّا شہید ۸/-

اسباب زوال امت (تاریخ) علامہ شکیب ارسلان ۱۵/-

اچھا مسلمان کیسے بنا جائے؟ (مذہب) عطا محمد ۱۵/-

ایمان باللہ اور اس کے عملی تقاضے (مذہب)
روشن غنی ۸/-

ذہنی اور اعتقادی ارتداد مولانا علی میاں ندوی ۹/-

مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ ڈاکٹر احسان حق ۵/-

طلبہ کے لیے ضابطہ اخلاق (تعلیم) علی اصغر چشتی ۸/-

ایک مثالی استاد (تعلیم) پروفیسر محمد اکرم طاہر ۵/-

دعوت و تبلیغ میں مسجد کا کردار (مذہب)
مولانا امیر الدین مہر ۱۲/-

اصول اسلام (مذہب) مولانا محمد ادریس کاندھلوی ۲۴/-

رسولؐ وحدت (سیرت) علامہ سید سلیمان ندوی ۸/-

اس کے لیے (افسانے) بانو سرتاج ۴۰/-

ہندستان میں فلسفہ خودی کا ارتقا (مضامین)
نشور واحدی ۹۰/-

صدیق جائسی (شعری مجموعہ) مرتب محمد نور الدین خاں ۵۰/-

سرورق ——— سراج اجملی

ایوان شاد کا مشاعرہ (تمثیل) غلام جیلانی ۱۵/

ایک خواب عام آدمی کا (ڈراما) مترجم عبدالعزیز عرفان ۵/-

اندازے (تبصرے) نگراں ڈاکٹر سید محمد عقیل ۶

تاریخ خاندیش کے بکھرے اوراق (تاریخ)
ڈاکٹر اکبر رحمانی ۵۰/-

بیان اپنا (علمی مضامین) حسن عباس فطرت ۴۰/-

مہمان مدیر
سراج اجملی
ریسرچ اسکالر، دہلی یونی ورسٹی دہلی

اشاریہ

ادب ہی کیوں؟

اُردو رسائل وجرائد کے مدیروں سے پوچھیے کہ آج کل کیا شائع کر رہے ہیں تو ایک عام جواب ہے کہ "کچھ خاص چیز نہیں آ رہی ہے۔" اوّل درجے کے رسائل سے لے کر چند صفحات پر مشتمل غیر معروف اور ہر لحاظ سے معمولی پرچوں تک جہاں بھی دیکھیے شاعری کی بھرمار ہے، پوچھیے تو جواب ملتا ہے کہ روزانہ ہماری ڈاک میں اسّی فی صد شاعری ہی آتی ہے جس میں سے ۹۵ فی صد غزلیں ہی ہوتی ہیں' اور ساتھ ہی کسی کا حوالہ، کسی کی سفارش یا اور کوئی اخلاقی دباؤ کہ اسے شائع کر دو۔ شاعری کے بعد دوسری صنف ادب جو بغرض اشاعت رسائل کو ارسال کی جاتی ہے وہ ہے افسانہ اس کے بعد نمبر آتا ہے تنقیدی مضامین کا۔ پھر ڈرامے، خاکے اور رپورتاژ وغیرہ وغیرہ۔

پچھلے زمانوں میں ایک چیز ہوتی تھی علمی نثر جس سے ادب ہمارے رسائل تقریباً خالی نظر آتے ہیں۔ علمی مضامین سے اب رسائل کے وزن ووقار میں اضافہ کیوں نہیں ہوتا، شاعری عام طور پر متاثر کیوں نہیں کرتی؟ وہ شے جسے اعلا ادب کہا جاتا ہے کہاں گم ہے، اس پر غور کرنا ادب کی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ درحقیقت "ادب FULL TIME JOB ہے FLIRTATION نہیں"۔ آج جس بات پر ہم ان صفحات میں غور کر رہے ہیں اس کے پس پشت جو بنیادی وجہ ہے وہ یہی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا علمی مضامین کی کمی کی وجہ کیا ہے؟ اس کا تعلق بھی مذکورہ جملے سے ہے، ہوا یہ ہے کہ ہم نے محنت اور ریاضت کا طریقہ چھوڑ کر تن آسانی اور سہل انگاری کو شعار بنا لیا ہے، وہ مشقت وہ توجہ اور وہ عرق ریزی جس کا مطالبہ کوئی بھی سنجیدہ موضوع کرتا ہے اور نہ ہی STAMINA۔ وقت تو یوں نہیں ہے کہ آج کے COMPUTER AGE میں ہم ہر آدمی کو وقت کی کمی کی شکایت کرتے دیکھتے ہیں، سو ہم بھی فیشن کے طور وقت کی کمی کی شکایت کرتے ہیں۔ دوسری بات، ہمیں بھی تو روٹی کا انتظام کرنا ہے، مادّی آسائشیں حاصل کرنی ہیں، اعلا طرز زندگی اپنانا ہے اور ان سب کے لیے ضرورت ہے پیسوں کی۔ تو ہم پیسوں کے لیے اپنے وقت کا استعمال کریں یا ان بے مصرف باتوں کے لیے۔ دوسری بات

STAN IN کی ہے تو اس کے لیے جس تہذیبی فضا اور جس معاشرتی ماحول کی ضرورت ہوتی
ی، گھر، محلّہ، پڑوس، سماج اور زعمائے شہر جس طرح نسلوں کی تربیت کرتے تھے، اس
راج و ماحول کو اس CONSUMER CULTURE نے اپنی چکا چوند سے خیرہ کر رکھا
ہے۔ اب وہ محفلیں اور وہ بزرگ نہیں ملتے جو جملے میں تذکیر و تانیث کی غلطیوں پر بچپن سے
ں ٹوک ٹوک کر صحیح زبان بولنا اور سننا سکھا دیتے تھے، ایسی ہستیاں اب قصّہ ماضی
ن چکی ہیں جو اپنی روزمرہ کی گفتگو میں ادبی حوالے، اشعار، ضرب الامثال اور عربی و فارسی کے
قرے بے تکلف استعمال کر کے جملے کے حسن و دلکشی کو تو بڑھاتی ہی تھیں، بات کو یک
گونہ وزن بھی عطا کرتی تھیں۔ اب ہماری بستیوں سے مثنوی مولانا روم کے اشعار لحن کے ساتھ
پڑھنے کی کوئی روایت وابستہ نہیں۔ مثنوی کی محافل اور اس کے رموز و نکات پر بحثیں تو
دور کی بات ہے۔ اب کسی دیوان خانے میں شام کے وقت حقّہ کی گڑگڑاہٹ اور اس کے
دھوئیں کی خوشگوار مہک کے دوران کلیلہ و دمنہ، شاہنامۂ فردوسی اور داستانِ امیر حمزہ
کے حوالے سننے کو نہیں ملتے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ علمی گفتگو کا وہ ماحول جو ادبی
حیثیت کے حامل افراد نہیں بلکہ شعرائے شہر اپنی نجی محفلوں سے بناتے تھے، اور جہاں
چھوٹے مودب بیٹھ کر کانوں سے پڑھتے تھے، قطعی مفقود ہے ریاضت کا وہ درس جو
اساتذہ دیتے تھے اب نہیں دیا جاتا، مشق کا وہ انداز جو تحریر کو جلا بخشتا تھا، بار بار لکھنا،
کاٹنا اور پھر لکھنا، تحریر کی نوک پلک سنوارنا، اس کے داخلی اور خارجی حسن کو بڑھانا
اس میں ٹھوس مواد شامل کرنا، یہ سب شاید اس طرح نہیں کیا جا رہا ہے اور نتیجہ سامنے
ہے۔

شاعری کے نام پر بھی عام طور پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ خاص طور پر مایوس کن ہے،
ایک قابلِ ذکر شاعر کوئی نیا موضوع، کوئی نئی زمین یا کوئی خاص اندازِ سخن پیش کرتا ہے
تو اس کو شعرا کا ایک جم غفیر اپنا لیتا ہے اور اس قدر گرد اڑاتا ہے کہ اصل بات اس
میں گم ہو جاتی ہے۔ تخلیقی صلاحیت کا فقدان نہیں ہے لیکن پھر بھی بات کیلئے سے آگے نہیں
بڑھتی۔ حرف کی عظمت اور لفظ کی حرمت کا احساس ہمارے آج کے معاشرے سے اُٹھتا
جا رہا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ خیال بغیر تجربے کی بھٹی کی شکل دیکھے بندھے ٹکے الفاظ
کا جامہ پہن کر کسی بحر اور کسی وزن میں کاغذ پر اتر جاتا ہے، اس پر محنت نہیں کی جاتی، ریاض
نہیں کیا جاتا۔ اساتذہ کے دواوین سے رشتہ تو دور کی بات ہے ہمارا آج کا شاعر چند
معروف ناموں کے علاوہ اساتذہ کے ناموں تک سے ناواقف ہے۔ سیماب اکبر آبادی نے
کہیں لکھا ہے کہ میں شاعری کے آغاز میں کئی کئی صفحے صبح سے شام تک اشعار لکھ کر سیاہ
کر ڈالتا۔ پھر انھیں پھاڑ دیتا اور یہ سب صرف برائے مشق و ریاض ہوتا۔ آج کوئی بھی اتنی
محنت کرنے اور اتنا جوکھم اُٹھانے کو تیار نہیں۔
یہ ٹھیک ہے کہ زمانہ ایک سا نہیں ہوتا ارتقا کا عمل بہت سی پچھلی باتوں کا ناسخ ہوتا

ہے لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو قدر کا درجہ حاصل کرلیتی ہیں اور انھیں بہر حال برتا جاتا ہے، ان کا خیال رکھا جاتا ہے اور ان سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ آج اسی کا فقدان ہے۔

آج ادب کا کاروبار سمٹ کر چند اداروں تک محدود ہو گیا ہے۔ سماج کے ہر طبقے میں پچھلی دہائیوں میں جس طرح اردو ادب کا بول بالا تھا اب نہیں رہا۔ اس کی وجہ سے بھی ہمارے ادب میں DIMENSIONS نہیں نظر آتے۔ اور جن کو ادب کی ذمے داری سونپ دی گئی ہے یا جنھوں نے اسے خود اوڑھ لیا ہے وہ اپنے ترجیحات، تعصبات اور لکشمن ریکھاؤں کے اسیر ہیں۔ اس سے باہر نکلنے کو تیار نہیں، نہ ہی اس میں باہر کی کوئی خوشبو داخل کرنے کو تیار ہیں۔ معاصرانہ چشمکیں قدما کے یہاں بھی تھیں۔ گروہ بندیاں اس وقت بھی تھیں، اپنوں کو اٹھانے کی عملی کوشش اس وقت بھی تھیں لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس وقت جذبۂ رشک نسبتاً زیادہ تھا آج یہ ساری باتیں جس طرح اپنا رنگ دکھا رہی ہیں ان کے پیچھے جذبۂ رشک نہیں جذبۂ بغض و حسد اور عناد نظر آتا ہے جو ادب کے فروغ کے لیے نقصان دہ ہے۔ بعض صاحبانِ صلاحیت، جن کا تعلق کسی نظریاتی و ادبی گروہ سے ہے، وہ اس نظریے کے تئیں اس قدر وفادار ہیں کہ ادب سے ان کی وفاداری پر سوالیہ نشان قائم ہو جاتا ہے اور اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود ادب کو وہ سب کچھ نہیں دیتے جو دینے کے اہل ہیں۔

اُردو کا افق وسیع ہوا ہے، اب اردو ہند و پاکستان سے باہر یورپ و امریکہ میں اپنی نئی بستیوں میں پروان چڑھ رہی ہے۔ وہاں سے آنے والی دیدہ زیب اور خوبصورت کتابیں دیکھ کر بادی النظر میں تو خوشی کا احساس ہوتا ہے لیکن بیشتر کتابوں کے اندر کا کھوکھلا پن اور ان "ادب پاروں" میں تمام حسن و جمال کے باوجود جو کمی کھٹکتی ہے وہ ہے "ادبیت" کی۔ لمبی لمبی رقومات کا اصراف، وہ کتابوں کی اشاعت پر ہو، سمینار و مشاعرے اور اپنے اپنوں کے "ادبی اسفار" پر، دیکھ کر تکلیف ہی ہوتی ہے کیوں کہ یہ اخراجات بالعموم بعد کے APPRECIATION کے اخلاقی مطالبے کے لیے کیے جاتے ہیں۔

غرض کہ جو جس سماجی حیثیت کا حامل ہے وہ اپنی اس حیثیت اور اس کے اثرات کو اپنی ادبی حیثیت کا حامل ہے وہ اپنی اس حیثیت اور اس کے اثرات کو اپنی ادبی حیثیت منوانے کے لیے بیساکھی کے بطور استعمال کر رہا ہے۔ اگر کسی کے پاس دولت ہے تو وہ دولت کے بل بوتے پر، کسی کے پاس کوئی اعلا عہدہ ہے تو وہ اس عہدے سے مرعوب کر کے خود کو استناد کے رتبے پر فائز دیکھنا چاہتا ہے لیکن اسے اس بات کا علم ضرور ہوگا کہ اصل قدر شناس وقت ہوتا ہے، ہم آج زندہ ہیں، فعال حیثیت کے حامل ہیں اور اس کے سہارے خود کو بہت بڑا ادیب، شاعر، افسانہ نگار یا ناول نگار ثابت کروا لیں، لیکن ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ کل جب ہم نہ ہوں گے، وہ بھی نہ ہوں گے جنھوں نے ہمیں بوجوہ استناد کا درجہ عطا کیا، آنے والے زمانے کا سفاک ناقد و قدر شناس ہوگا

اور ہماری تحریریں، اس وقت کیا ہوگا۔

ایک بات اور ہم اپنی ان ساری حرکتوں سے اصل اور GENUINE ادیب کی حق تلفی کرتے ہیں، اسے ابھرنے کا موقع نہیں دیتے، اس کے ریاض، اس کی مشق اور ادب سے اس کی ایماندارانہ وابستگی کے نتیجے میں جو کچھ اسے ملنا چاہیے، اس پر ایک غاصبانہ قبضہ کرکے ہم اسے محروم کر دیتے ہیں اور اس کا TALENT بروقت روشنی میں نہیں آ پاتا۔

آخر میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ادبی تخلیق اگر ہم نے ایمانداری سے کی ہے ریاضت کے اس عمل کو سرانجام دیا ہے جو تخلیقی گہرائی و گیرائی پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے اور کسی طرح کا شارٹ کٹ ادب کے تعلق سے نہیں اپنایا ہے تو کل کا قدر شناس ہم سے صرف نظر نہیں کر سکتا اور اگر ہمیں صبر نہیں ہے ہم شارٹ کٹ اور بغیر محنت و ریاضت، راتوں رات ادبی امارت کا خواب دیکھ رہے ہیں یا اس کوشش میں مصروف ہیں تو میں بصد معذرت یہی عرض کروں گا کہ اس دنیا میں بہت سارے دھندے ہیں پھر ادب ہی کیوں؟

اسلم فرخی
ی - ۱۵۵ بلاک ۵ گلشن اقبال
راچی ۴۷

غزل

جو خوش کلام نہ تھے حرف سادہ رکھتے تھے
وہ عرضِ حال کا حق کچھ زیادہ رکھتے تھے

اُنھیں سے شہر میں تھی روشنی بھی رونق بھی
غریبِ شہر تعلق زیادہ رکھتے تھے

بہ فیضِ وقت سوئے دار آ گئے ورنہ
نہ کوئی شوق نہ کوئی ارادہ رکھتے تھے

اُنھیں سے عام ہوئی جان و تن کی عُریانی
جو خوش لباس تھے زرّیں لبادہ رکھتے تھے

کبھی گلہ نہ کیا ہم نے کم نگاہی کا
یہ اور بات توقع زیادہ رکھتے تھے

ہُوا ہے گردِ ملامت سے راستہ مسدود
گئے وہ دن کہ درِ دل کشادہ رکھتے تھے

غضب کے لوگ تھے شہرِ وفا کے راہی بھی
لہو کے زور سے توقیرِ جادہ رکھتے تھے

نگاہِ پیرِ مُغاں میں نشاطِ خاطر تھا
اُمید ہم بھی پئے استفادہ رکھتے تھے

نہ مے کدہ ہے نہ وہ التفاتِ پیرِ مُغاں
خوشا وہ دور کہ توفیقِ بادہ رکھتے تھے

ہوئے ہیں ضعف سے لاچار ورنہ ہم اسلم
درِ نظام کا پختہ ارادہ رکھتے تھے

ننھے منے بچوں کے لیے دلچسپ اور باتصویر کہانیاں
بتاشے
نرسری کے بچوں کے لیے آسان
زبان میں دلچسپ نظمیں قیمت ۶/۵۰
جاں نثار دوست
بچوں کے لیے باتصویر کہانی
قیمت ۵/- روپے
جادو کی ہنڈیا
5/-
بھیڑیے کا گانا
6/50
شیر اور بکری
7 50
کوے کا خواب
7/-
دم کٹی لومڑی
6/50
کس نے بجائی بانسری
قیمت 7/50
چالاک بلی
6/50
چاند کی بیٹی
5/-

رشید حسن خاں
ڈی، سی ۹ گوائر ہال،
دہلی یونی ورسٹی، دہلی

معرکۂ چکبست و شرر کا پس منظر

(زیرِ ترتیب مثنوی گلزارِ نسیم کے مقدمے کا ایک باب)

اس قضیے کا پس منظر عموماً لوگوں کے سامنے نہیں، اس لیے عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اس معرکے کا آغاز شرر کے تبصرے سے ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ ۱۹۰۵ء میں جب چکبست نے مثنوی گلزارِ نسیم کا نیا اڈیشن مفصل مقدمے کے ساتھ شائع کیا، تو شرر نے اپنے رسالے دل گداز میں اُس پر تبصرہ کیا، جو دو قسطوں میں اس رسالے کے شمارۂ مارچ، شمارۂ اپریل ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ پھر جولائی ۱۹۰۵ء میں مزید اعتراضات پر مشتمل شرر کا مضمون تیسری قسط کے طور پر شائع ہوا۔

چکبست نے اس تبصرے کی پہلی دو قسطوں کا مفصل جواب لکھا، جو حسرت موہانی کے رسالے اردوے معلیٰ (علی گڑھ) کے شمارۂ جولائی ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ یہ اس معرکے کی پہلی دو تحریریں ہیں۔ (شرر کی تیسری قسط کا جواب چکبست نے اودھ پنچ میں لکھا، جو اُس کے شمارۂ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا تھا۔)

پہلی تحریر شرر کی ہے، اس طرح بہ ظاہر معرکے کا آغاز اُن کی تحریر سے ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ رائے بھی ظاہر کی گئی ہے کہ ہر لحاظ سے زیادتی شرر کی تھی۔ چکبست نے سنجیدہ جوابی تحریریں لکھیں، اس کے مقابلے میں شرر نے اور اُن کے طرف داروں نے غیر علمی انداز سے کام لیا جو لوگ یہ باتیں کہتے ہیں، اُن کے سامنے عموماً شرر کا تبصرہ ہوتا ہے اور چکبست کا جوابی مضمون اور بس۔ یہیں سے غلط فہمی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں صحیح نتیجے پر اس وقت تک نہیں پہنچا جا سکتا جب تک اِس بحث کا پس منظر پیشِ نظر نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معرکے کا خاموش آغاز شرر کے تبصرے سے تقریباً دو سال پہلے ہو چکا تھا، یعنی اُس کی بنیاد پڑ چکی ہے۔

فروری ۱۹۰۳ء میں چکبست کا ایک مضمون "پنڈت دیا شنکر کول نسیم" کے عنوان سے کشمیر درپن میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون مضامینِ چکبست (انڈین پریس الہ آباد) میں شامل ہے۔ اِس مضمون میں نسیم کی تعریف کے سلسلے میں بعض متعارف شعراے لکھنؤ کے لیے غیر مناسب الفاظ لکھے گئے ہیں اور غیر سنجیدہ اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے، مثلاً رعایتِ لفظی کے بیان میں لکھا ہے:

”یہ نسیم ہی کو فخر حاصل ہے کہ کہیں اپنے تئیں لغزشِ کی ہوا نہ لگنے دی۔
اکثر شعرائے اُردو نے اِسی رنگ میں بہک کر اپنے کلام کو بے رنگ کر دیا ہے۔
مثلاً امانت کا دیوان اِس بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ اِس شاعر کے لیے تناسبِ
لفظی کا شوق جنون کے درجے تک پہنچ گیا ہے، لیکن چوں کہ زبان پر قدرتِ
کاملہ حاصل نہیں اور طبیعت میں شستگی کا جوہر نہیں، لہٰذا جو شعر اِس رنگ میں
کہا ہے، اُسے پڑھ کر ہنسی آتی ہے...... نیم حکیم اور نیم ملا تو سُنتے تھے، یہ نیم شاعر
ہیں۔“

شوق قدوائی لکھنؤ کے مقتدر شاعر تھے، اُن کے لیے لکھا ہے:

”احمد علی شوق ایک لکھنؤ کے شاعر ہیں، اُنھوں نے بھی ایک مثنوی کہی ہے اور
گلزارِ نسیم کا رنگ اُڑایا ہے، لیکن جو تناسبِ لفظی نسیم کے لیے جوہر ہے، اُن
کے لیے عیب بن گیا ہے...... مراد یہ ہے کہ تناسبِ الفاظ کا نباہنا ایک امرِ دشوار
ہے۔ ہر طفلِ مکتب کا کام نہیں۔“

شوق کا جنون کے درجے تک پہنچ جانا، زبان پر قدرتِ کاملہ حاصل نہیں، یہ نیم شاعر ہیں!
یہ سب ٹکڑے سنجیدہ بیانی کے خلاف ہیں۔ شوق جیسے شخص کے لیے یہ لکھنا کہ ”ایک لکھنؤ کے
شاعر ہیں“ غیر مناسب اندازِ بیان کی انتہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی غیر معروف اور نو سکھیے شاعر
کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ”ہر طفلِ مکتب کا کام نہیں“ سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار
کے نزدیک امانت اور شوق (وغیرہ) سب شاعری کے لحاظ سے طفلِ مکتب تھے۔ امانت پر اصل
اعتراض غلط نہیں تھا، لیکن اُس کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے اور جو اندازِ بیان اختیار
کیا گیا، وہ یقیناً قابلِ اعتراض تھا۔ اسی مضمون میں اُنھوں نے پہلی بار یہ بھی لکھا: ”اکثر متعصب
مسلمان کہتے ہیں کہ آتش نے نسیم کو یہ مثنوی کہہ کر دے دی تھی۔“ یہاں بھی اندازِ بیان غیر محتاط
اور غیر علمی ہے۔ اِس افواہ کی تردید ضرور کرنا چاہیے تھی، لیکن اِن لفظوں میں نہیں۔ یہ خیال رہے
کہ اِس وقت تک شرر نے اِس مثنوی کے سلسلے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔

اِس مضمون کے آخر میں اُنھوں نے ایسے چار ”واقعات“[1] لکھے ہیں جن کا مقصد بہ ظاہر
یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیگر شعرائے لکھنؤ پر نسیم کی برتری کا بالواسطہ اظہار کیا جائے۔ خاص کر یہ
ظاہر کیا جائے کہ شاعری کے لحاظ سے نسیم کا مرتبہ ناسخ و آتش سے کم نہیں تھا۔ اِن چاروں ”فرضی
واقعات“ کو درج کرنے سے پہلے اِسی مضمون میں وہ لکھ چکے تھے کہ ”نسیم کا کلام آتش و ناسخ،
ذوق و غالب کا ہم پایہ نہیں“ لیکن اِن چاروں ”واقعات“ کو اُنھوں نے جس انداز سے مرتب
کیا اور لکھا، اُس سے واضح طور پر مترشح ہوتا ہے کہ درحقیقت نسیم کسی سے کم نہیں تھے۔

---

[1] مقتدر مرزا پوری نے اپنی کتاب بزمِ خیال میں یہ چاروں ”لطیفے“ یہیں سے نقل کر لیے ہیں، حوالے
کے بغیر ص ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶۔ مگر پہلے لطیفے میں ”مذہبی چوٹ“ والی عبارت شامل نہیں کی۔

ان کا لکھا ہوا پہلا "واقعہ" یہ ہے:

"ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مشاعرے کی صحبت تھی، نسیم بھی وہاں موجود تھے
شیخ ناسخ نے اُن کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ پنڈت جی! ایک مصرع کہا ہے،
دوسرا مصرع نہیں سوجھتا کہ پورا شعر ہو جائے۔ انھوں نے جواب دیا:
فرمایئے۔ ناسخ نے مصرع پڑھا:

شیخ نے مسجد بنا، مسمار بُت خانہ کیا

اُن کے منہ سے مصرع نکلنے کی دیر تھی کہ یہاں دوسرا مصرع تیار تھا:

تب تو اک صورت بھی تھی، اب صاف ویرانہ کیا

..... شیخ ناسخ نے شاعری کی آڑ میں مذہبی چوٹ کی تھی، لیکن نسیم نے خوب ٹھنڈا
کر دیا۔"

اس "فرضی لطیفے" کے اندراج کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بالواسطہ انداز سے یہ ظاہر کیا جائے کہ ناسخ، نسیم کو برابر کا شاعر سمجھتے تھے اور یہ کہ مقابلے میں سرِ مشاعرہ ناسخ کو نسیم کے مقابلے میں خفت اُٹھانا پڑی۔ اس لطیفے کا آخری ٹکڑا: "ناسخ نے شاعری کی آڑ میں چوٹ کی تھی" انتہا سے زیادہ قابلِ اعتراض ٹکڑا ہے۔

ایک "واقعہ" یہ لکھا ہے کہ مشاعرے میں نسیم نے ایک شخص کو ٹوک دیا اور وہیں اُس سے اچھا مصرع موزوں کر کے سنا دیا۔ اس حکایت کی آخری سطر یہ ہے: "اِن کی شاعرے میں دھاک بیٹھ گئی، وہ بے چارہ ذلیل ہو گیا۔"

تیسرے "واقعے" میں یہ لکھا ہے کہ ایک دن آتش کے یہاں شاگردوں کا جمگھٹا تھا۔ رند، صبا، خلیل وغیرہ کے ساتھ نسیم بھی موجود تھے۔ شاگردوں کی فرمایش پر آتش نے ایک غزل شروع کی۔ نسیم نے اشعار کی تخمیس شروع کی۔ جتنی دیر میں آتش دوسرا شعر سوچتے تھے، یہ اس عرصے میں اُن کے پہلے شعر پر مصرعے لگا چکتے۔" اس حکایت کا آخری حصہ یہ ہے اور یہی 'جانِ سخن" ہے:

"جب آتش نے غزل ختم کی، تو صبا، رند، خلیل کے چہروں کے رنگ
فق تھے۔ ابھی تک یہ لوگ اپنے تئیں اہلِ زبان خیال کرتے تھے اور نسیم کو
ہندو سمجھ کر، زیادہ وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔"

چوتھا "واقعہ" یہ لکھا ہے کہ ایک بار دہلی سے تین مصرعے امتحاناً لکھنؤ بھیجے گئے کہ شاعرانِ لکھنؤ اِن پر مصرعے لگا کر بھیجیں۔ "اب اہلِ لکھنؤ کی کوشش ہوئی کہ ایسے مصرعے لگا کر بھیجے جائیں کہ دہلی والوں کو بھی یہاں کی شاعری کا قائل ہونا پڑے۔ اگر مصرعے سست لگے، تو کرکری ہو جائے گی۔ غرض کہ تین شخصوں کو، جو کہ ہر طرح سے اِس کام کے لیے موزوں خیال کیے گئے، ایک ایک مصرعے پر مصرعے لگانے کا کام سپرد ہوا۔ پہلا مصرع ناسخ کو دیا گیا، دوسرا آتش کو اور تیسرا نسیم کو۔ گو کہ اس وقت اور بڑے بڑے شاعر بھی موجود تھے، مگر آتش و ناسخ کے ساتھ لکھنؤ کی آبرو

قائم رکھنے کا شرف نسیم کو حاصل ہوا۔" اس حکایت کا آخری جملہ یہ ہے: "تینوں استادوں نے جی توڑ کر مصرعے لگائے ہیں۔"

اس حکایت میں آتش، ناسخ اور نسیم کو برابر کے استاد بنا دیا گیا اور یہی اصل مقصد تھا۔ انھوں نے راوی کا یا ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے دہلی سے مصرعے بھیجے تھے، کس کے پاس بھیجے تھے، لکھنؤ کے "تین اساتذہ" کا انتخاب کس نے کیا تھا۔ ان میں سے کسی بات کا وہ حوالہ دے بھی نہیں سکتے تھے، یوں کہ یہ سب خانہ ساز روایتیں تھیں۔ ان میں سے پہلی روایت کے متعلق قاضی عبدالودود صاحب نے جو کچھ لکھا تھا، اُسی کو نقل کیا جاتا ہے، اسی سے معلوم ہو گا کہ یہ کس پایے کا فرضی قصہ تھا:

"وہ شعر، جس کا ایک مصرع بہ قولِ چکبست ناسخ کا اور دوسرا نسیم کا ہے، دراصل میر اعلیٰ علی کا ہے اور تذکرۂ میر حسن میں موجود ہے، جو اس وقت وجود میں آیا ہے جس وقت ناسخ بہت کم عمر تھے اور نسیم کے اس دنیا میں آنے میں بہت دیر تھی۔ الفاظ کے خفیف اختلاف کے ساتھ میر اعلیٰ علی کا مطلع یہ ہے:

توڑ بُت، زاہد نے کیوں مسجد یہ بُت خانہ کیا
تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

لطف یہ ہے کہ نسیم کے استاد بھائی رند کے یہاں بھی یہ مطلع لفظوں کے ناقابلِ اعتنا اختلاف کے ساتھ ملتا ہے:

ٹوٹے بُت، مسجد بنی، مسمار بُت خانہ ہوا
تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ ہوا

اس میں کچھ شک نہیں کہ مطلع میر اعلیٰ علی کا ہے۔ رند نے یا تو سرقہ کیا ہے، یا اُنھیں توارد ہوا ہے۔ ناسخ کی "شاعری کی آڑ میں مذہبی چوٹ" اور اُن کے مصرعے پر نسیم کا مصرع پہنچانا افسانۂ محض ہے۔ میرا یہ مدعا نہیں کہ چکبست اس داستان کے واضع ہیں، مگر غلو بُری چیز ہے۔ کئی روایتیں جو کسی طرح قابلِ قبول نہیں، اُس کی بدولت دیباچے میں مندرج ہو گئی ہیں۔"

(معاصر، حصہ اوّل، ص ۹)

قاضی صاحب نے آوارہ گرد اشعار (مرتبۂ عابد رضا بیدار) میں اسی حکایت کے سلسلے میں

لہ کالی داس گپتا رضا صاحب نے اپنی کتاب "چکبست - کچھ باز دید، کچھ پیش رفت" میں لکھا ہے: میں کلیاتِ ذوق کا مطالعہ کر رہا تھا، تو.... ایک مطلع نظر پڑا، جو صاف صاف اوپر کے شعر کا چربہ ہے۔ یہاں بھی شعر کا خالق ایک مسلمان (ذوق) ہی ہے اور شعر کی شوخی میں کلام نہیں:

ہوس میں کعبے کی کیوں شیخ بت خانے سے گم رہ ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے، واں اللہ اللہ ہے (ص ۸)

زید لکھا ہے :

"گلزارِ نسیم مرتبۂ چکبست کی اشاعت کے کچھ ہی بعد ریاض خیرآبادی نے لکھا تھا کہ یہ حکایت مصنوعی ہے، کہیں اور نہیں ملتی۔ ناسخ و نسیم کے مرتبے میں بڑا فرق تھا۔ ناسخ انھیں قابلِ خطاب نہ سمجھتے ہوں گے۔ چکبست نے نہ پہلے بتایا تھا کہ یہ حکایت اُنھیں کہاں سے ملی اور نہ جہاں تک میرا علم ہے، انھوں نے ریاض کے اعتراض کے بعد اپنے ماخذ سے متعلق کسی قسم کی اطلاع دینے کی ضرورت محسوس کی۔ ریاض کا خیال ہے کہ وہ خود مخترع ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے کسی سے سُنی ہوگی۔ نسیم سے جو غلو تھا، اُس نے اِس پر غور کرنے کا موقع نہ دیا کہ کتنی دور از قیاس ہے۔" (ص ۴۵)

میرا خیال یہی ہے کہ چکبست نے خود یہ حکایت وضع کی تھی۔ اِس قیاس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ اِسی مضمون کے آخر میں نسیم کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے :

"کسی شاعر نے رباعی کہی :

مغموم رکھا مدام دل گیری نے
مارا ہے جواں فلک کی بے پیری نے
واللہ کہ آتشِ فروغِ ناسخ
ٹھنڈی کر دی نسیم کشمیری نے"

دوسرے شعر کو بہ ظاہر پہلے شعر سے کچھ علاقہ نہیں، لیکن مقصودِ شاعر یہی دوسرا شعر ہے۔ اسے اُس قول کا تتمہ سمجھیے کہ "شیخ ناسخ نے شاعری کی آڑ میں مذہبی چوٹ کی تھی، لیکن نسیم نے خوب ٹھنڈا کر دیا۔" الفاظ کا اشتراک توجہ طلب ہے۔ یہ رباعی "کسی شاعر" کے بجائے خود چکبست کی ہے۔ رضا صاحب نے چکبست سے متعلق اپنی محولۂ بالا کتاب میں اِسے چکبست کے غیر مستند اول کلام کے طور پر شامل کیا ہے۔ انتساب کی تصدیق پنڈت دتاتریہ کیفی نے کی تھی۔ تفصیل کے لیے اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ (ص ۴۰)

آج بھی یہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ چکبست کے اِس مضمون سے لکھنؤ والوں میں ناراضی کی لہر تو ضرور پیدا ہوئی ہوگی، لیکن (میری معلومات کے مطابق) اس سلسلے میں کسی نے کچھ نہیں لکھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک جذباتی نوجوان کا جذبۂ اخوت و کشمیر دوستی سمجھ کر اِسے نظرانداز کر دیا گیا ہو۔ یہ خیال رہے کہ ۱۹۰۳ء میں، جب یہ مضمون شائع ہوا تھا، اس وقت چکبست کی عمر تقریباً اکیس برس کی تھی۔

جب چکبست نے مثنوی گلزارِ نسیم کا نیا ایڈیشن مرتب کیا (جو ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا تھا) تو اُس پر مفصل دیباچہ لکھا۔ اُس دیباچے میں اِس مضمون کے بیش تر حصّوں کو شامل کر لیا گیا۔ اُن چاروں فرضی واقعات کو بھی شامل کر لیا گیا، دو مزید "واقعات" کے اضافے کے ساتھ۔ بعض عبارتوں کا اضافہ بھی کیا گیا۔ مثلاً ۱۹۰۳ء والے مضمون میں صرف یہ لکھا تھا: "غرض کہ

آتش کی نظرِ ثانی کے بعد مثنوی طبع ہوئی۔ شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بِک گئی۔" (مضامین چکبست، ص ۵) دیباچے میں اسی بات کو اس طرح لکھا گیا: "غرض کہ آتش کی نظرِ ثانی کے بعد یہ مثنوی ایک مشاعرے میں پڑھی گئی جس میں لکھنؤ کے تمام سربرآوردہ شعرا جمع تھے، بعد ازاں طبع ہوئی۔ شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بِک گئی۔" مشاعرے میں پڑھے جانے کی روایت بھی کہیں اور نہیں ملتی۔ بہ ظاہر یہ بھی طبع زاد لگتی ہے۔ امانت کے لیے جو الفاظ پہلے لکھے گئے تھے، اُنھیں جوں کا توں رکھا، لیکن ایک مثالیہ شعر کا اضافہ کر دیا۔ نیز اسی سلسلے میں رِند کا ایک شعر اور قلق کا ایک مصرع بڑھا دیا۔ البتہ شوق قدوائی کا نام نکال دیا، لیکن عبارت میں اضافہ کر دیا: "ایک صاحب نے گلزارِ نسیم کا جواب لکھا ہے اور چوں کہ تناسبِ لفظی گلزارِ نسیم کا خاص جوہر ہے، لہٰذا انھوں نے بھی اس رنگ میں شعر کہے ہیں، مگر لطافتِ سخن قائم نہ رکھ سکے۔"

پہلے مضمون کو تو لوگوں نے نظر انداز کر دیا تھا، لیکن اس بار بات ہی بدلی ہوئی تھی کہ ایک مفصل تحریر مثنوی کے نئے اڈیشن کے ساتھ سامنے آئی تھی۔ اب یہ بات پوری طرح سامنے آ گئی کہ اس مثنوی کو اور اس مثنوی کے مصنف کو افضل اور برتر ثابت کرنے کے لیے لکھنؤ کے معروف شاعروں اور استادوں کے مرتبے کو گھٹانے کی دانستہ کوشش کی گئی ہے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ شرر کے سامنے جب یہ مثنوی آئی ہوگی، تو انھوں نے پہلے دیباچے کو دیکھا ہوگا اور ایسے مقامات پر نظر ضرور رُکی ہوگی اور ایسے بیانات ناگوار بھی گزرے ہوں گے۔ چوں کہ اصل چیز تو مثنوی تھی، جس کی یکتائی اور بے مثالی کو نمایاں کرنے کے لیے یہ سب کچھ لکھا گیا تھا؛ اس لیے یہ ہونا ہی چاہیے تھا کہ مثنوی کا جائزہ لینے کے دوران اس کا دیباچہ اور دیباچے کے ایسے بیانات ذہن پر اثر انداز رہے ہوں، ہمہ وقت نظر کے سامنے رہے ہوں اور انھی کی روشنی میں مثنوی کا جائزہ لیا گیا ہو۔ پھر یہ بتانا ضروری سمجھا گیا ہو کہ جس مثنوی کی اس قدر تعریف کی گئی ہے، اس میں زبان اور بیان کے عیب کس قدر ہیں۔

اس سلسلے میں کچھ اور لکھنے سے پہلے چکبست کے ایک قول کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ داغ کی شاعری پر اُن کا جو مضمون ہے، اس میں انھوں نے ایک جگہ داغ کی شخصیت اور شاعری پر اہلِ لکھنؤ کی طرف سے جو غیر مناسب اور استہزائیہ اعتراض کیے گئے تھے اور عیب لگائے گئے تھے، اُن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اس رسوائی کے لیے وہ حضرات بھی ایک حد تک ذمے دار ہیں جو داغ کے کمال کو فروغِ بے جا دینا اپنا فخر سمجھتے ہیں..... داغ کی بہت کچھ مدحت سرائی کی ہے..... اگر اسی پر اکتفا کیا جائے تب بھی غنیمت تھا، لیکن قیامت تو یہ ہے کہ اس فانوسِ خیالی کے تیار کرنے کی فکر میں اکثر شعرائے لکھنؤ کو مٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بھلا لکھنؤ کے آتش مزاجوں کو اس کی تاب کہاں..... اس اشتعالک نے دبی ہوئی آگ کو اچھی طرح سے

مشتعل کر دیا۔"

(مضامینِ چکبست، ص ۹۹)

ان کی یہ تحریر، واقعہ یہ ہے کہ نسیم اور گلزارِ نسیم کے سلسلے میں خود اُن پر زیادہ اچھی طرح صادق آتی ہے، کہ اُنھوں نے نسیم کے محاسن کو نمایاں کرنے کے لیے یہ ضروری خیال کیا کہ لکھنؤ کے متعارف شعرا کے لیے غیر مناسب اندازِ بیان اختیار کیا جاتے۔ اس کا ردِ عمل تو ہونا تھا اور ہوا اور اُنھی کے لحاظ سے "دبی ہوئی آگ کو اچھی طرح سے مشتعل کر دیا۔" اس طرح اُس ردِ عمل کی ذمے داری حقیقتاً اُنھی پر عائد ہوتی ہے۔

یہ بات کہ تبصرہ لکھتے وقت دیباچے کے غیر مناسب بیانات ہمہ وقت شرر کے سامنے رہے ہیں، محض قیاس آرائی نہیں، شرر نے خود اس کا واضح لفظوں میں اظہار کیا ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے۔ شرر کا تبصرہ تین قسطوں میں چھپا تھا۔ پہلی قسط میں مثنوی پر کوئی اعتراض نہیں ملتا بل کہ اُس کا ذکر بھی ضمنی طور پر آیا ہے۔ یہ پوری قسط دیباچے سے متعلق ہے، اس میں شرر نے یہ بھی لکھا ہے:

"اس کے بعد قابلِ ریویو نگار نے تناسبِ لفظی کی بحث شروع کی ہے اور اس صنعت میں نسیم کا کمال دکھایا ہے۔۔۔۔ مسٹر چکبست نے امانت، خلیل، رند اور قلق کا ایک ایک شعر یا مصرع نقل کر کے سب کی شاعری میں دھبا لگایا ہے۔ چناں چہ امانت کی نسبت لکھتے ہیں: تناسبِ لفظی کا شوق جنوں کے درجے تک پہنچ گیا ہے، لیکن چوں کہ زبان پر قدرتِ کاملہ حاصل نہیں ہے اور۔۔۔۔
واقعی یہ افسوس کی بات ہے کہ اس ریویو میں نسیم کے مقابل میں بعض مشہور و معروف اور مستند شعرا کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے اور محض اُن غیر معتبر کہانیوں کی بنیاد پر، جن سے یہاں کے تمام شعرا بے حال نا آشنا ہیں۔ ممکن ہے وہ کسی خاص میں شہرت رکھتی ہوں، مگر محققین کے نزدیک بالکل بے بنیاد ہیں۔"

اس کے بعد دوسری قسط سے مثنوی پر اعتراضات کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دیباچے کے ایسے اندراجات کو شرر نے بہ طورِ خاص اور بہ طورِ اصل سامنے رکھا تھا۔ جب یہ بحث آگے بڑھی، تو دوران بحث بعض اور لوگوں نے یہی بات لکھی، اس میں ریاض خیر آبادی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اُنھوں نے کئی مضامین میں (جو ریاض الاخبار میں چھپے تھے) اس کا حوالہ دیا ہے۔ ریاض کے سارے مضامین تو سامنے نہیں، صرف وہی مضامین پیشِ نظر ہیں جنھیں شیرازی نے معرکۂ چکبست و شرر میں شامل کر لیا ہے۔ انھی مضامین کے دو اقتباسات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی:

"ہم پھر کہیں گے کہ اس میں قابلِ الزام جو صاحب ہیں، وہ جناب چکبست ہیں، جنھوں نے محققانہ دیباچہ نہیں لکھا، اعلانِ جنگ دیا اور مشہور استادوں کی توہین کی اور غلط روایات اور غلط قصے، فرضی کہانیاں درج کر کے لکھنؤ والوں

کا دل دکھایا۔ ایسی حالت میں اگر نسیم صاحب کی فاش غلطیاں دکھا دی گئیں۔۔۔
تو کیا بُری بات جناب شرر نے کی۔"

(معرکہ، طبع اول، ص ۲۵۸)

"مسٹر چکبست۔۔۔۔۔ نے آتش ورند و صبا، خواجہ وزیر، ناسخ سب کی تحقیر و توہین کی اور ایک حد تک سب کا درجہ نسیم سے گھٹا دیا۔ نسیم کی غلطیاں دکھا کر، شرر کو رند و صبا کا جواب دینا تھا، وہ حاصل ہو گیا۔" ایضاً، ص ۲۵۶)

حکیم برہم نے بھی ایک مضمون میں یہی باتیں لکھی ہیں:

"اس بات کا جواب کوئی مہذب شخص نہیں دے سکتا کہ امانت مرحوم کی طبیعت میں شستگی نہ تھی۔۔۔۔ اگر ذاتی افعال و اقوال پر یہ حملہ ہے تو اس کا جواب اہلِ لکھنؤ دے سکتے ہیں۔۔۔۔۔ مقدمہ لکھتے وقت جس طرح جناب حالی کو اس بات کا خیال نہ تھا کہ کوئی اِس پر نگاہ ڈالے گا، اسی طرح مسٹر چکبست صاحب بھی یہ سمجھے ہوئے تھے کہ کون دیکھنے والا ہے اور کون خیال کرتا ہے۔ نسیم کا مرتبہ اس قدر بلند کرنا چاہیے کہ ناسخ اور آتش بھی لحد میں بے قرار ہو جائیں۔ افسوس ہے کہ خلافِ توقع ہر شخص کی نظر پڑ گئی۔"

(ایضاً، ص ۲۶۷)

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ نقشِ اول تو وہ پہلی تحریر تھی، جسے بہ ظاہر نظر انداز کر دیا گیا تھا؛ مگر وہی مضامین جب دوبارہ دیباچے کی صورت میں سامنے آئے تو بات بڑھی۔ اس طرح اصل جھگڑا چکبست کے دیباچے کا تھا۔ مثنوی پر دراصل دیباچے کے اندراجات کے جواب کے طور پر اعتراض کیے گئے۔ یہ تھا پس منظر اس معرکے کا۔ اِن تفصیلات کو سامنے رکھے بغیر، محض تبصرہ اور جوابِ تبصرہ کو دیکھ کر صحیح نتائج نہیں نکالے جا سکتے۔

شرر کے تبصرے میں کئی باتیں ایسی تھیں جو ہر لحاظ سے قابلِ اعتراض تھیں۔ ایک تو یہ کہ کئی جگہ اندازِ بیان غیر سنجیدہ ہو گیا ہے، جیسے یہ لکھنا کہ یہ نہایت ذلیل قسم کی غلطی ہے یا طنزیہ فقرے لکھنا۔ اِس نے اُن کے تبصرے کی علمی حیثیت کو نقصان پہنچایا۔

دوسرے یہ کہ پہلی قسط میں انھوں نے بھی دو ایسی روایتیں درج کیں جن کو قبول نہیں کیا جا سکتا اور چکبست کی درج کی ہوئی روایتوں کی طرح گپ کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ایک روایت میں یہ قول بھی تھا کہ یہ مثنوی دراصل آتش کی کہی ہوئی ہے۔ شرر نے اِس روایت کو اِس انداز سے لکھا جیسے اُن کو اِس سے اتفاق ہو۔ اس کے بعد جب وہ یہ لکھتے ہیں کہ اس مثنوی میں جتنی غلطیاں ہیں، وہ کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ہوں گی اور اِس میں لکھنؤ کی مستند زبان نہیں، تو ظاہر ہے کہ یہ تضاد بیانی ہے۔ اگر یہ مثنوی آتش نے کہہ کر دے دی تھی، تو پھر اس میں اِس قدر غلطیاں تو نہیں ہونا چاہیے تھیں اور اس کی زبان بھی غیر مستند نہیں ہونا چاہیے تھی۔ چکبست نے اس تضاد بیانی کا خاص طور پر مضحکہ اُڑایا۔ اِس سلسلے میں اِس بات کو فراموش کر دیا گیا

کہ آتش والی روایت کو سب سے پہلے خود چکبست نے اپنے مضمون میں لکھا تھا، جس کا حوالہ آچکا ہے۔

یہ بات بھی ہے کہ شرر کے متعدد اعتراض درست نہیں تھے، مگر سب سے بڑھ کر شرر کی یہ غلطی تھی کہ انھوں نے چکبست کے مرتبہ نسخے کے متن کی صحت کا اندازہ کرنے کے لیے ایک موخر اڈیشن (نامی پریس لکھنؤ) کو سامنے رکھا۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقۂ کار غلط تھا۔ اگر مقابلہ کرنا تھا تو مثنوی کی اشاعتِ اوّل کو سامنے رکھا جاتا، کیوں کہ چکبست نے یہ واضح کر دیا تھا کہ اُن کے نسخے کا متن، طبعِ اوّل کے مطابق ہے۔ چکبست نے یہ صراحت نہ کی ہوتی، تب بھی اصولاً کسی موخر اشاعت کو پیشِ نظر رکھنا قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ چکبست نے اس پر حملے کیے، طنز کیا اور شرر کی اِس غلطی کا پورا فائدہ اُٹھایا۔

چکبست کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ مثنوی کی اشاعتِ اول حریفوں میں سے کسی کے پاس نہیں، اِس سے اُنھوں نے بہت فائدہ اُٹھایا، صحیح بھی اور غلط بھی۔ شرر کے تبصرے کا جواب لکھا تو نہایت اعتماد کے ساتھ کئی جگہ جواباً یہ لکھ دیا کہ طبعِ اوّل میں اسی طرح ہے، حالاں کہ متعدد مقامات پر صورتِ حال اِس کے برعکس تھی۔ چوں کہ ایسے سب اشعار ضمیمۂ تشریحات میں زیرِ بحث آگئے ہیں۔ اس لیے یہاں مثالوں سے قطعِ نظر کرتا ہوں۔

وہ جو کہا گیا ہے کہ عشق اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے، اس معرکے میں بھی یہ ہوا کہ ہر طرح کے بیانات دیے گئے اور ہر طرح کے مضامین لکھے گئے۔ جن لوگوں نے اس معرکے کی تفصیلات کو اچھی طرح نہیں پڑھا، انھوں نے اس طرح کے جملے لکھے ہیں کہ: "چکبست کا لہجہ اس بحث میں شروع سے آخر تک بڑا متین اور شایستہ رہا۔" حقیقت یہ ہے کہ دونوں طرف سے ہر طرح کے مضامین لکھے گئے سنجیدہ اور شایستہ بھی اور غیر سنجیدہ اور غیر شایستہ بھی۔ یہ ہونا ہی تھا، اِس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ شروع ہی سے اودھ پنچ نے اس بحث میں چکبست کے طرف دار کی حیثیت سے حصہ لینا شروع کیا[1]۔ اودھ پنچ کے مضامین طنز اور ظرافت کے ساتھ ساتھ پھکّڑپن سے بھی خالی نہیں ہوتے تھے۔ حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری والی بحث اس پر گواہ ہے۔ خود چکبست کا یہی خیال تھا اور اِس کا تحریری ثبوت موجود ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی چکبست کے خاص ممدوحین میں سے تھے، کشمیری تو تھے ہی؛ اودھ پنچ نے سرشار کو بھی اپنا نشانہ بنایا تھا اپنے پورے روایتی آداب کے ساتھ، یعنی اُسی انداز سے، جس انداز سے شرر کے خلاف صف آرائی کی تھی۔ ویسے تو چکبست اودھ پنچ کے طرف دار تھے، مگر یہاں معاملہ ذرا مختلف تھا۔ انھوں

---

[1] ڈاکٹر شریف احمد نے اپنے تحقیقی مقالے "عبدالحلیم شرر، شخصیت اور فن" میں لکھا ہے کہ شرر نے اودھ پنچ کے غیر سنجیدہ مضامین کا جواب دینے کے لیے "ظریف" نام کا ایک ہفتے وار اخبار نکالا تھا۔ "عشرت لکھنوی کا کہنا ہے کہ اس کے اڈیٹر منشی نثار حسین تھے۔ افسوس ہے کہ ظریف کے پرچے بھی دست یاب نہیں ہوتے، ورنہ یہ معلوم ہو جاتا کہ شرر نے حریفوں کے حملے کس ڈھال پر روکے تھے۔" (ص ۴۸)

نے سرشار پر جو طویل مضمون لکھا ہے اور جو مضامین چکبست (انڈین پریس الٰہ آباد) میں شامل ہے، اُس میں ایک جگہ اصلی بات لکھ گئے ہیں :

"اِس موقع پر ہم کو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عموماً اودھ پنچ کے معترضین کی تحریریں انصاف پسندی کے جوہر سے خالی ہیں۔ ایک ایک جملہ اِس امر کی شہادت دیتا ہے کہ دلی تعصب زبانِ قلم سے رنگِ سخن بن کر پھوٹ نکلا ہے۔"

(ص ۴۶)

اِس عبارت میں ایسے ہی کئی اور جملوں کا اضافہ کر کے، معرکۂ چکبست و شرر کے سلسلے کی بحث پر اس کا اطلاق کیا جائے تو یہ بیان زیادہ پُر معنی بن جائے گا اور برمحل نظر آئے گا۔ یرا خیال یہی ہے کہ اودھ پنچ نے اپنے انداز سے اس بحث میں حصہ نہ لیا ہوتا، تو یہ بحث اُس ندر غیر سنجیدہ اور غیر شایستہ نہ ہو پاتی، جس قدر ہو گئی تھی۔

اوپر جو ایک جملہ نقل کیا گیا ہے: "چکبست کا لہجہ اس بحث میں شروع سے آخر تک بڑا تین اور شایستہ رہا" یہ شرر سے متعلق ایک تحقیقی مقالے میں ہے۔ مقالہ نگار نے اسی سلسلے میں زید لکھا ہے کہ: "اُن کا تعلق چوں کہ وکالت سے تھا، اس لیے اُن کے دعوے اکثر و بیشتر دلیلوں کے ساتھ ..... ہوتے تھے۔" مقالہ نگار کو معلوم نہیں کہ چکبست نے اُس وقت تک وکالت کا امتحان بھی اِس نہیں کیا تھا۔ وکیل ہونا درکنار۔ اِس عبارت کو نقل کرنے سے میرا مقصد اعتراض کرنا نہیں، قصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہمارے زمانے میں جن لوگوں نے اس معرکے سے متعلق رائے ظاہر کی ہے، وہ عموماً سرسری مطالعے اور کچھ مفروضات پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ چوں کہ اس عرکے کے پس منظر سے واقفیت حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا، اس لیے اس کو صحیح تناظر میں ہیں دیکھا جا سکا ہے۔ عام طور پر اِس سلسلے میں چکبست کا وہ جواب نظر کے سامنے ہوتا ہے جو اردوے معلیٰ میں چھپا تھا؛ مگر چکبست نے اُس کے علاوہ اور بہت کچھ بھی لکھا ہے۔ ہاں پنے نام سے نہیں لکھا اور ایسی تقریباً سبھی تحریریں اودھ پنچ میں شائع ہوئی تھیں۔ مثلاً "جنت ی ڈاک" کے عنوان سے جو خط اودھ پنچ میں شائع ہوئے ہیں، وہ سب حقیقتاً چکبست کے لکھے ہوئے تھے۔ معرکۂ چکبست و شرر کے مرتب نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے:

"جو مضامین اودھ پنچ میں "جنت کی ڈاک" کے سلسلے میں آتش کے خطوط کے عنوان سے شائع ہوئے، وہ بھی لوگ جناب چکبست کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ہم کو بھی ذاتی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ مضامینِ مذکور جناب چکبست کے لکھے ہوئے ہیں۔"

یہ خیال رہے کہ یہ کتاب چکبست کی زندگی میں شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح انیس و دبیر کے ام سے جو رباعیاں اور جان صاحب کے نام سے جو غزل چھپی تھی، اور وہ غزل جس کا مطلع ہے:

زلفِ جاناں کی طرح ہے تاگ بل کھائی ہوئی
اُف تری گندھی جوانی جوشش پر آئی ہوئی

یہ سب چکبست کا کلام ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: چکبست کہہ بازدید "کچھ پیش رفت"
ص ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴۔

یہ واقعہ ہے کہ متعدد اعتراضات کے جواب میں چکبست نے بہت تلاش کے ساتھ اسناد فراہم کیں، ان سے اُن کے مطالعے کی وسعت کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ سخن سازی سے بھی کچھ کم کام نہیں لیا۔ مقدور کے مطابق غلط بیانی سے بھی کام لینے میں تکلف نہیں کیا اور ایسی مثالیں بھی بہ طورِ سند پیش کیں، جو حقیقتاً غیر متعلق تھیں۔ ضمیمۂ تشریحات میں ایسی ساری مثالیں متعلقہ اشعار کے تحت زیرِ بحث آگئی ہیں، اس لیے یہاں مثالیں پیش کرنا ضروری نہیں؛ البتہ محض بہ طورِ نمونہ ایک حوالہ دوں گا۔ حالی نے مقدمے میں اس شعر پر بھی اعتراض کیا تھا:

آتا تھا شکارگاہ سے شاہ
نظارہ کیا پدر نے ناگاہ

حالی کا اعتراض یہ تھا کہ دونوں مصرعے مربوط نہیں: "ظاہر الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ "شاہ" اور شخص ہے اور "پدر" اور شخص ہے، حالاں کہ پدر اور شاہ سے ایک ہی شخص مراد ہے۔" چکبست نے جواباً لکھا کہ "اس اعتراض کی نسبت صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ اصل شعر اس صورت پر ہے:

آتا تھا شکارگاہ سے شاہ
نظارہ کیا پسر کا ناگاہ

چکبست کا بیان قطعی طور پر خلافِ واقعہ ہے۔ نسخۂ طبع اوّل میں یہ شعر اسی طرح ہے جس پر حالی نے اعتراض کیا تھا۔ بات یہ تھی کہ چکبست کو بھی یہ تو محسوس ہوا تھا کہ یہاں نسیم نے غلطی کی ہے، اس کے لیے انھوں نے یہ کیا کہ اپنے مرتبہ نسخے میں دوسرے مصرعے کو بدل کر لکھا۔ یہ تحریف ہوئی۔ اس کے بعد حالی کے جواب میں لکھا کہ اصلاً شعر یوں نہیں، یوں ہے اور یہ غلط بیانی ہوئی۔ ضمیمۂ تشریحات میں شعر ۳۰ کے تحت تفصیل ملے گی۔

یہ بات بھی نظر میں رکھنے کی ہے کہ چکبست کے مرتبہ نسخے کو اس مثنوی کا معتبر اڈیشن نہیں کہا جا سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں ہر طرح کی غلطیاں ہیں۔ کہیں تو چکبست نے لفظوں کو بدلا ہے، کہیں لفظ بڑھائے ہیں اور کہیں متن شعر کا صحیح طور پر تعین نہیں کر پائے ہیں۔ اگر ان کے کسی حریف نے نسخۂ طبع اوّل سے اُن کے پیش کیے ہوئے متن کا مقابلہ کر لیا ہوتا، تو یہ ساری باتیں اسی وقت سامنے آجاتیں۔ شرر کے اعتراضات اور چکبست کے جوابات کے سلسلے میں یہ بات ہمارے ذہن میں ضرور رہنا چاہیے کہ جس طرح شرر کے سب اعتراض درست نہیں تھے، اُسی طرح چکبست کے سارے جوابات بھی قابلِ تسلیم نہیں تھے۔ چکبست کی ایک غلطی یہ بھی تھی کہ انھوں نے ہر اعتراض کا جواب دینا چاہا اور اس کے لیے مناسب و غیر مناسب ہر انداز سے کام لیا، یا یوں کہیے کہ کام لینا پڑا۔ یہاں سخن فہمی کے بجائے طرف داری کا عمل دخل تھا۔ شرر کے تبصرے کی تہ میں اُن فرضی روایتوں کی کارفرمائی شامل تھی جو چکبست کے مضامین میں

سامنے آئی تھیں۔ اِس کا امکان ہے کہ یہ روایتیں نہ لکھی گئی ہوتیں اور لکھنؤ کے اہم شعرا کے لیے غیر مناسب الفاظ استعمال نہ کیے جاتے تو شاید یہ معرکہ وجود ہی میں نہ آتا۔ نیز اودھ پنچ نے اپنی روایت کے مطابق اِس میں حصہ نہ لیا ہوتا تو اِس کا امکان ہے کہ بحث ہوتی تو اُس کا رنگ و آہنگ خاصا مختلف ہوتا۔

ڈاکٹر عصمت جاوید
ا۔ سیوبن۔ کباڑی پورا
اورنگ آباد۔ مہاراشٹر

رفعت نواز کے افسانے

"فسانہ کہیں جسے" رفعت نواز کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "وہ بات" ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا جسے آج تقریباً پندرہ سال ہو رہے ہیں۔ "وہ بات" میں دس افسانے شامل تھے۔ زیر نظر مجموعہ "فسانہ کہیں جسے" میں کل سولہ افسانے ہیں، اس دوران انھوں نے اور بھی کچھ افسانے لکھے ہوں گے کیونکہ ان کے افسانے وقتاً فوقتاً ہندوپاک کے جراید میں شایع ہوتے رہتے ہیں پھر بھی بحیثیت مجموعی رفعت نواز کے تخلیقی سفر کی رفتار دھیمی ہی کہلائے گی لیکن اگر کمیت کے مقابلے میں کیفیت کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو پطرس بخاری ایک دبلی پتلی کتاب لکھ کر لازوال شہرت کے مالک نہ بنتے۔ اگرچہ رفعت نواز بہت کم لکھتے ہیں لیکن جو بھی افسانہ ان کے قلم سے نکل جاتا ہے وہ اپنی جگہ انتخاب ہوتا ہے۔ اس میں کوئی نہ کوئی ندرت ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کا کینوس بھی کافی مختصر ہے ایک چھوٹی سی دنیا ہے جس میں دفتر اور گھر چند دوست احباب، بچپن کی یادیں، چچاؤں، ماموؤں، خالاؤں اور پھوپھیوں کے تذکرے ہیں۔ رومانس نام کی کوئی چیز نہیں لیکن کینوس کا اختصار دراصل اُن کے افسانوں کی کمزوری نہیں بلکہ ان کی زبردست قوت ہے۔ اُن کے یہاں اخلاق آموز قصوں کی تلاش اتنی ہی فضول ہے جتنی نفسیاتی اعتبار سے بیمار اور پیچیدہ کرداروں کی تلاش لایعنی ہے، دراصل وہ کوئی خاص مقصد سامنے رکھ کر کہانی نہیں لکھتے اور نہ بے مقصدیت اور زندگی کی لغویت کے احساس کا ہلکا سا شائبہ ان کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں کا کینوس اس لیے مختصر ہے کہ وہ جس زندگی سے واقف ہیں جو زندگی وہ جیتے ہیں، برتتے ہیں اسی سے اپنے افسانوں کے لیے مواد حاصل کرتے ہیں نہ وہ غیر ضروری جزئیات سے کام لے کر اپنی ہمہ دانی اور قادرالکلامی کا سکہ بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ افسانے کے نام پر نام نہاد تخلیقی نثر لکھ کر کوئی سماں باندھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ چھوٹے چھوٹے حسین فقرے لکھ کر تشبیہوں اور استعاروں کا جادو جگا کر اصل افسانے سے قاری کی توجہ ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر بھی اُن کے افسانوں میں وہ بات ضرور ہے، فسانہ کہیں جسے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کے تخلیقی سفر کے دوران اردو فکشن میں جو نئے نئے تجربے ہوتے رفعت نواز اس سے غافل یا بے خبر رہے ہوں، اگر ایسا ہوتا تو وہ "بات" کے دیباچے میں یہ نہ لکھتے

"ادب میں موسم بدلتے رہتے ہیں اور انہی کے ساتھ چھوٹے موٹے پودے اور جھاڑ جھنکاڑ اُگتے چلتے اور کچھ دن بہار جانفزا دکھلا کر اپنے انجام کو پہنچتے رہتے ہیں مگر وہ تناور درخت کہ تجربے کی آبیاری، اپنے اطراف کی جیتی جاگتی زندگی کی طاقت اور صادق طرز اظہار سے فیض یاب ہوتے ہیں، ہر موسم میں سربلند و سرفراز رہتے ہیں۔ گذشتہ کچھ برس ادبی موسموں کی پے بہ پے تبدیلیوں سے عبارت ہیں اور اسی مناسبت سے مختلف رنگوں کے پھول پودوں سے ان کا دامن بھرا ہوا ہے لیکن ان میں استقامت کتنوں کو حاصل ہے؟ یہ سوال ادب کے نقادوں کے سوچنے کا ہے۔ میرا کام تو صرف زندگی کے عطا کردہ ان گنت تجربوں میں سے ان چند تجربوں کو جو مجھ میں اور میرے دور کے لوگوں میں مشترک ہیں انھیں چھانٹ کر الگ کرنا اور انھیں ان کے حسب حال زبان دینا ہے سو یہ کام میں فیشنوں اور مقبول رواجوں سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ اپنے اندر کے مطالبوں سے مجبور ہو کر برسوں سے کر رہا ہوں اور اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک یہ مطالبے جاری رہیں گے۔"

موجودہ اردو فکشن میں بیانیہ عنصر تقریباً مفقود ہو چلا ہے لیکن اگر کسی نے کہانی میں کہانی پن کو محفوظ رکھا ہے بلکہ اسے اعتبار کا درجہ دیا ہے تو وہ رفعت نواز اور ان کے چند ہم عصر ہیں، یہ بہت بڑی بات ہے، جب کوئی ادبی تجربہ فیشن کے طور پر چل پڑا ہے تو ادبی نقالوں اور انھیں اچھالنے والے ڈھنڈورچی نقادوں کا ایک جلوس نکل پڑتا ہے، اس جلوس میں اکثر نئے لکھنے والے نوجوان جنھیں ادب میں اپنی شناخت کی بڑی جلدی ہوتی ہے، شامل ہو جاتے ہیں، ان نئے لکھنے والوں میں یقیناً کچھ صلاحیت فنکار بھی ہوتے ہیں لیکن اکثریت نقالوں کی ہوتی ہے۔ کچھ رسالوں کے اڈیٹر کھرے اور کھوٹے میں تمیز کیے بغیر ان سب کی پذیرائی کرتے ہیں، ان کی حمایت کرنے والے نقادوں کی بھی کمی نہیں ہوتی لیکن چونکہ با صلاحیت قاری سے ان تجربوں کا رشتہ کٹ جاتا ہے اس لیے ایسے تجربے بہت جلد اپنی موت آپ مر جاتے ہیں، پھر نئے تجربوں کی پرورش ہوتی ہے اور وہ بھی اپنے انجام کو پہنچتے ہیں۔ رفعت نواز کا یہ کمال ہے کہ وہ نعرے لگانے والے جلوس میں شامل نہیں ہوتے۔ وہ تجریدی اور علامتی افسانوں کی ہنگامہ آرائیوں سے نہ تو متاثر ہوتے اور نہ سستی شہرت کی خاطر انھوں نے اپنی روش بدلی، یہی نہیں بلکہ بیانیہ افسانوں میں انھوں نے ایسا فنی نکھار پیدا کیا جو قدیم روایتی بیانیہ افسانوں میں نہیں پایا جاتا تھا۔

روایتی بیانیہ افسانے دو طرح کے ہوتے ہیں، پلاٹ والے افسانے اور کردار والے افسانے، پلاٹ والے افسانوں میں واقعات میں پیچیدگیاں، کرداروں میں غلط فہمیاں، تصادم، قاری کے ذہن میں تشویش (SUSPENCE) کے جذبے کو جگانا، اور اسی طرح دوسرے عناصر کے ذریعے پلاٹ کو نقطۂ عروج پہنچانا بڑی اہمیت رکھتا ہے، پھر افسانے کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے پلاٹ کی ساری پیچیدگیاں دور کر دی جاتی ہیں، بُرے کرداروں کو ان کے کیے کی سزا ملتی ہے اور اچھے کردار اپنی نیکی کا صلہ

تے ہیں جسے اصطلاح میں شاعرانہ انصاف (Poetic justice) کہتے ہیں۔ بڑے کرداروں کا ضمیر
یک ایک جاگ اٹھتا ہے جسے قلب ماہیت (Change of heart) کہتے ہیں۔ پلاٹ کے یہ تمام نشیب و
فراز چونکہ افسانے میں سما نہیں سکتے اس لیے بالعموم افسانے کو نقطۂ عروج پر ہی ختم کر دیا جاتا ہے۔
کردار والے افسانوں میں واقعات ضمنی حیثیت رکھتے ہیں اور افسانہ نگار کی ساری توجہ کردار سازی
پر ہوتی ہے۔

رفعت نواز کے افسانوں میں جیتے جاگتے کردار بھی ہیں اور واقعات کا یہ ایک مخصوص رُخ
بھی لیکن قاری کو اس کا مطلق احساس نہیں ہوتا کہ افسانے کا پلاٹ یا اس کے کردار افسانہ نگار
کی مرضی کے تابع ہیں اور یہی وہ خوبی ہے جو بیانیہ افسانوں کو فن کا اعتبار دیتی ہے۔ رفعت نواز کے
بیشتر افسانے فنی اعتبار سے معتبر ہیں۔ اردو میں اکثر ایسے افسانے بھی لکھے گئے ہیں جن کا اختتام
چونکا دینے والا ہوتا ہے اور اسی چونکا دینے والے اختتام پر افسانے کی ساری عمارت کھڑی کی جاتی
ہے۔ "فسانہ کہیں جسے" میں صرف دو افسانے ایسے ملے جن کا اختتام چونکا دینے والا ہے "نیا گھر" اور "نام"۔
نیا گھر کا ہیرو جس کا کوئی نام نہیں اپنے لیے نیا گھر بنانے میں ساری پونجی اور توانائی صرف کر دیتا ہے،
گھر بنا بھی لیتا ہے لیکن اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے بقول افسانہ نگار "دوسرے
دن وہ منوں مٹی تلے اپنے نئے گھر میں اطمینان سے سو رہا تھا" افسانے کا اختتام یعنی اس کا بنیادی
مقصد یعنی دنیا کی بے ثباتی کا نقش ابھارتا ہے لیکن اس طرح پورے افسانے کا فنی حسن مجروح ہو
کر رہ جاتا ہے اور پڑھنے والے پر اس بات کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ افسانہ منصوبہ بندی کے تحت لکھا
گیا ہے۔ لیکن افسانہ نام میں صرف چونکا دینے والی کیفیت نہیں ہے۔ بلکہ اس میں راکھ میں چھپے ہوئے
انگاروں کی گرمی بھی ہے جو اپنا دیرپا اثر بھی چھوڑتی ہے۔ اسے ہم خاموش احتجاج یا نا آسودہ تمنا کی تکمیل
کی کوشش بھی کہہ سکتے ہیں۔ افسانے کا مرکزی کردار لطیف اب برسر روزگار ہو گیا ہے ماں باپ کو
اس کے لیے مناسب رشتے کی تلاش ہے۔ لطیف کو ایک لڑکی روحی پسند آ جاتی ہے، روحی ملازمت
پیشہ تھی۔ لطیف کسی نہ کسی طرح اپنی پسند ماں سے منوا لیتا ہے اور ماں باپ کی جانب سے
سلسلہ جنبانی ہوتی ہے۔ لڑکی والے بھی راضی ہو جاتے ہیں لیکن بات منگنی تک بھی نہیں پہنچتی،
اس لیے کہ روحی کے والد نے رشتے کے لیے جو شرطیں مقرر کی تھیں وہ لطیف کے والدین کے لیے
ناقابل قبول تھیں بلکہ لطیف نے خود یہ شرطیں قبول نہیں کی تھیں کیونکہ بقول افسانہ نگار "
اسے لگا کہ روحی کے والدین کو داماد کی نہیں بلکہ مکان، زیور اور روپوں کی ضرورت ہے۔" لیکن اس واقعہ
کے بعد خود لطیف کو روپے کمانے کی دھن ہو جاتی ہے اور وہ کویت چلا جاتا ہے۔ لطیف کا روحی سے
کوئی شدید جذباتی رشتہ نہیں تھا۔

"بس میں ہر روز آمنا سامنا ہو جاتا تھا وہ باتیں تو نہیں کرتے تھے لیکن شناسا ضرور تھے۔ روحی
سے روز یہی بس اسٹاپ پر خاموش ملاقات ہو جاتی تھی، اسے دیکھ کر روحی ذرا سا ہاتھ اٹھا کر سلام
کر دیتی تھی۔ مسکرا کر وہ ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔ بات اس سے آگے نہیں بڑھی تھی"
ظاہر ہے لطیف اسے بھول بھی گیا ہوگا کیوں کہ اس دوران اس کی شادی بھی ہو گئی بال بچے

بھاگ ہوتے۔ کویت میں پندرہ سال کا طویل عرصہ گزارنے کے بعد لطیف اپنے وطن میں مستقلاً بس جانے کے لیے آتا ہے تو اس کی ملاقات اتفاقاً اپنے لڑکپن کے ساتھی منیر سے ہوتی ہے جو بقول افسانہ نگار "خوب موٹا ہو گیا تھا۔ سر کے بال سفید ہو گئے تھے اور چہرے کا گوشت لٹک گیا تھا"۔ منیر لطیف کو اس رات کھانے پر بلاتا ہے، جہاں لطیف کو پتا چلتا ہے کہ روحی، منیر کی بیوی ہے اور ایک نو سالہ لڑکے کی ماں ہے، اس کے بعد کا حال افسانہ نگار کی زبانی سنیے۔

منیر نے لمبی تمہید کے بعد اپنی بیوی کا لطیف سے تعارف کرایا۔ طالب علمی کے قصے سناتے اور اس کی امارت کی داستان سناتی۔ روحی خاموشی سے سنتی رہی۔ روحی پہلے جیسے ہی پرکشش تھی۔ ... کھانے کی میز پر بھی وہ چپ چپ سا کھویا کھویا سا رہا۔ روحی کھانے کی چیزیں اس کی پلیٹ میں ڈالتی رہی اور اصرار کر کے کھلاتی رہی۔ کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے لطیف نے (روحی کے) لڑکے کو اپنی طرف کھینچ کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور اس کی جیب میں اپنا قیمتی پین لگا دیا۔ منیر منع کرتا رہ گیا پھر اس نے سو روپے کا نوٹ بھی اس کی جیب میں ٹھونس دیا۔ روحی کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے اپنائیت کی چمک نمودار ہوئی۔

بڑا پیارا لڑکا ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟

نام تو لئیق احمد ہے لیکن ہم اسے لطیف کہہ کر بلاتے ہیں، یہ عرفیت روحی نے رکھی ہے۔ منیر نے کہا۔ ... چونک کر لطیف نے روحی کی طرف دیکھا، دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں لیکن پاندان لانے کا بہانہ کر کے روحی فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

کیا واقعی یہ سچ ہے کہ عورت اپنا پہلا پیار زندگی بھر نہیں بھولتی۔ شیکسپیئر نے کہا تھا نام میں کیا رکھا ہے لیکن رفعت نواز کے اس افسانے نے یہ تاثر چھوڑا ہے کہ نام میں خاموش داستان بھی سما سکتی ہے۔

اس مجموعے میں مجھے دو افسانے بطور خاص پسند آئے۔ سکھ دکھ اور پرکھ ۔۔۔ سکھ دکھ کسی قدر اضافی ہیں بالخصوص قدیم اور جدید نسلوں کے درمیان، اس کا بھرپور حساس انسانہ سکھ دکھ پڑھ کر ہوتا ہے۔ طبائع میں اختلاف فطری ہے لیکن عمر کا تفاوت اور تیزی سے بدلتا سماجی ماحول اس اختلاف کو ایک مستقل صورت بھی عطا کرتا ہے۔ افسانے کا "میں" ایک گاؤں عمدہ نگر میں جہاں اس نے اپنے لڑکپن کے چار سہانے سال گزارے تھے ایک شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے جاتا ہے اور اپنے ساتھ اپنے نوجوان بیٹے مشتاق کو بھی لے جاتا ہے کیونکہ

"شاید میں مشتاق کو اپنے ماضی اور اپنی یادوں میں شریک کرنا چاہتا تھا، برسوں سے میں اسے اپنے لڑکپن اور نوجوانی کے قصے سنا تا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ حیرت اور دلچسپی سے میری باتیں سنے"۔

غرض باپ بیٹا ایک موٹر سائکل پر عمدہ نگر کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گاڑی مشتاق چلا رہا تھا اور بڑی تیز رفتاری سے چلا رہا تھا۔ افسانے کے "میں" کا جو بھی حال ہوا

سی کی زبانی سنیے۔

"سڑک کھلی اور صاف دیکھ کر وہ اسپیڈ بڑھا دیتا اور میں ذرا سا اچک کر اسپیڈو میٹر دیکھنے لگتا۔ سوئی ساٹھ اور ستر کے درمیان ناچ رہی تھی۔ میری آنکھوں میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ جب کوئی خطرناک موڑ آتا تو وہ جھٹکے سے بریک لگاتا اور مجھے دھکا سا لگتا اور میں اس کی کمر کے گرد ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر کے سر اس کی پیٹھ سے لگا دیتا۔ تحفظ کا احساس ہوتا۔ یہ لین دین کا سلسلہ بھی عجیب ہے، جب مشتاق چھوٹا اور کمزور تھا تو کسی چیز سے ڈر کر مجھ سے لپٹ جاتا تھا اور خود کو محفوظ تصور کرتا تھا اور اب میں اسے اپنا محافظ سمجھ رہا تھا۔"

عمرہ نگر پہنچ کر افسانے کا 'میں' اپنے بیٹے کو وہ مکان دکھانا چاہتا تھا جس میں اس کا لڑکپن گزرا تھا املی کا پرانا پیڑ دیکھ کر لڑکپن کی یادوں نے سر ابھارا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کا حال خود افسانہ نگار کی زبانی سنیے۔

"املی کے بڑے پیڑ کے نیچے پہنچا تو پیڑ پر چڑھنے کی خواہش سر اٹھانے لگی۔ جوتے موزے اتار کر پتلون کے پائنچے چڑھا کر پیڑ پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مشتاق ہنس رہا تھا۔ ساتھی منع کر رہے تھے ۔۔۔۔ سانس پھول گیا تھا۔ پسینے میں بدن شرابور ہو گیا تھا ۔۔۔۔ بیچ والی ٹیڑھی شاخ پر نظر پڑی تو چونک پڑا۔ شاید برسوں پہلے املیاں کھاتے کھاتے چاقو سے اپنا نام پیڑ پر لکھا تھا۔ حرف دھندلا گئے تھے لیکن غور سے دیکھنے پر پڑھے جا سکتے تھے۔ مسرت سے بے قابو ہو کر مشتاق کو آوازیں دینے لگا اور اوپر بلانے لگا۔ بڑی مشکل سے سیڑھی کی مدد سے اسے پیڑ پر چڑھایا گیا وہ خوف کے مارے لرز رہا تھا اور اپنی سفید پتلون پر کالی کالی کھرونچیں دیکھ کر چڑھ گیا تھا۔ میں نے بے تابی سے کہا "پڑھو! غور سے پڑھو بیٹے" حیرانی سے اس نے میری طرف دیکھا اور غور سے تحریر پڑھنے لگا۔ آپ کا نام لکھا ہوا ہے، اور تو کچھ نہیں، اس میں اتنا جذباتی ہونے کی کیا بات ہے ۔۔۔؟ خواہ مخواہ آپ نے مجھے پریشان کر دیا۔ اس نے جھلا کر کہا اور سیڑھی سے نیچے اترنے لگا اور مجھے ایسا لگا جیسے املی کی اس خمیدہ شاخ پر میں اپنے دھندلاتے نام کی طرح معدوم ہوتا جا رہا ہوں۔"

رفعت نواز نے دو ناقابلِ فراموش کردار بھی اردو افسانے کو دیے ہیں۔ وہ "سلسلہ" کا بوڑھا مہندر سنگھ ہو یا اس کا پاگل بیٹا یا پھر "آئینہ" کے مرزا گمپلاس، دونوں میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے حالانکہ جن حالات نے دونوں کو پاگل بنایا ہے وہ بالکل مختلف ہیں۔ "دائرہ" میں وظیفہ یافتہ بزرگوں کا ایک بنیادی مسئلہ کیا ہے، وقت گزاری کا مسئلہ۔ ملازمت کی مصروفیات ختم ہونے کے بعد وظیفہ یافتہ بزرگ نہ صرف خود کو اختیارات سے بے دخل بلکہ خالی خالی محسوس کرتے ہیں۔ دائرہ کے صدیقی صاحب کا بھی یہی حال تھا انھوں نے بھی ایک دن اپنی مصروفیت کا سامان مہیا کر ہی لیا۔

"صدیقی صاحب نے بوٹ اتار کر ایک طرف سرکا دیے اور بیوی سے انتہائی نرمی سے کہا "تاجو ہمیشہ کی طرح کل صبح اوّل وقت اٹھ کر ہمارا ناشتہ تیار کر دینا اور ساتھ ہی ٹفن بھی، وہی ہمارا پرانا ٹفن باکس نکال لینا۔ تھوڑی دیر رک کر صدیقی صاحب نے مسکرا کر کہا "میرا تقرر رحمت علی خاں دینی و علمی ٹرسٹ کے زائد معتمد کی حیثیت سے ہو گیا ہے ۔۔۔ ان کی آواز میں زندگی کی کھوئی ہوئی کھنک

گئی جو کچھ دنوں سے بھٹک گئی تھی۔

میں ہیر کو اس مجموعے کا شاہکار افسانہ سمجھتا ہوں۔ کہانی بڑی سیدھی سادی ہے۔ پلاٹ میں داؤ پیچ نہیں لیکن جذبات کے داؤ پیچ نے اسے شاہکار بنا دیا ہے۔ کہانی ایک بھائی اور اس کی سوتیلی بہن کے گرد گھومتی ہے۔ بہن سوتیلی ہے لیکن بھائی اسے سگی بہن کی طرح چاہتا ہے۔ پھر ان کے درمیان موروثی جائیداد کے بٹوارے کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہانی محبت اور نفرت کے بدلتے ہوئے سایوں سے گزرتی ہے۔ دولت کا موہ خون کے رشتے کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ بھائی بہن ایک دوسرے کا منہ دیکھنے کے روادار نہیں ہوتے۔ پھر جب بھائی کو پتہ چلتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا انتقال ہو گیا ہے تو سماجی رشتے پر خون کا رشتہ غالب آ جاتا ہے اور بھائی اپنی بیوہ بہن کا سہارا بن جاتا ہے۔ اس افسانے کی خوبی یہ ہے کہ اس کے دونوں کردار نہ فرشتہ ہیں نہ شیطان بلکہ انسان ضعیف البنیان ہیں۔ افسانے میں حق و باطل کی کشمکش تو ہوتی ہے لیکن قاری دونوں کرداروں کو حق پر سمجھتا ہے اور یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے پر زیادتیاں بھی کی ہیں۔

غرض رفعت نواز کے افسانوں میں زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں۔ کسی ازم کی تبلیغ نہیں اور نہ خود ترحمی کے جذبات ابھارنے کی یا زندگی کی بے معنویت کا احساس ابھارنے کی مصنوعی کوشش ہے۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ سمجھنے کے لیے ہمیں کسی نقاد سے رجوع ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ ان کے سب افسانے بیانیہ ہوتے ہیں لیکن قدیم بیانیہ افسانوں کی طرح وہ شاعرانہ انصاف کی خاطر واقعات کی لگام اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتے اور نہ کرداروں کو کٹھ پتلی کی طرح نچاتے ہیں۔ اس لیے ان کے افسانے بیانیہ ہونے کے باوجود فنی اعتبار سے پختہ ہوتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ "افسانہ کہیں جسے" کو ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور ہمارے جدید نقاد ان افسانوں کی صحیح قدر شناسی کریں گے۔

نیّر مسعود
"ادبستان" سید دیال روڈ
لکھنؤ

مسعود حسن ادیب کی پہلی تالیف

اشعار برائے بیت بازی (۱۹۰۷ء)

میں نے ۱۹۷۳ء میں سہ ماہی "تحریر" دہلی کے ادیب نمبر کے لیے ادیب مرحوم کے حالاتِ زندگی پر مبنی ایک مضمون لکھا تھا (مسعود حسن رضوی)۔ اس مضمون میں بیشتر حالات ادیب سے دریافت کر کے لکھے گئے تھے۔ ان کے ابتدائی نام "محمد مسعود" اور کتاب "اشعار برائے بیت بازی" کے بارے میں اس مضمون کے ضروری اقتباس درج ذیل ہیں۔

"۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء (۱۵ محرم ۱۳۱۱ھ) کو بیگم ہاشمی (والدہ ادیب) کے یہاں (دو بچوں کی موت کے بعد) ایک اور بچہ پیدا ہوا۔ سانولے رنگ کا یہ منحنی اور کمزور سا بچہ اپنے باپ سے بہت مشابہ تھا۔ اس کا نام محمد مسعود رکھا گیا اور عرفیت ننھے قرار پائی۔"

"ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے مسعود میں ایک تبدیلی یہ آگئی کہ وہ "محمد مسعود" سے "سید مسعود حسن" ہو گئے۔ دراصل ان کو اپنا نام شروع ہی سے ناپسند تھا۔ ان کے والد (سید مرتضیٰ حسین)، چچا (سید تصور حسین) اور دوسرے بزرگوں کے نام "حسن" یا "حسین" پر تھے۔ ان ناموں کے بیچ میں "محمد مسعود" انھیں بے جوڑ لگتا تھا اس پر وہ کئی بار ماں سے اُلجھ بھی چکے تھے کہ ان کا نام محمد مسعود کیوں رکھا گیا۔ آخر انھوں نے اپنا نام بدل ہی لیا اور ہائی اسکول کا امتحان اسی نئے نام سے دیا۔ رفتہ رفتہ محمد مسعود کو لوگ بھول گئے اور ان کی جگہ سیّد مسعود حسن نے لے لی۔"

"اُناؤ میں انگریزی کا اسکول تو تھا مگر اردو کا کوئی اسکول نہ تھا اس لیے اُناؤ سے تین میل دور کرون گانو کے ورناکولر اسکول میں مسعود کا نام لکھوایا گیا۔ اس وقت مسعود گیارہ بارہ سال کے تھے۔"

"باپ کی تند مزاجی مسعود کو ورثے میں ملی تھی۔ اسی کے ساتھ ان کی فطری جھینپ اور جھجک نے ان کو بڑا ذکی الحس اور نازک دماغ بنا دیا تھا۔ جھینپ کا یہ عالم تھا کہ اگر (ان کے) راستے میں کہیں ایک دو آدمی بھی کھڑے ہوتے تو مسعود ٹھہر جاتے۔ یا کترا کر نکل جاتے۔ کچھ کم سنی اور کچھ حالات کے دباو کی وجہ سے مزاج کی اس کیفیت کا اظہار غصے سے زیادہ آنسوؤں کی شکل میں ہوتا تھا۔ چنانچہ کرون کے اسکول میں مسعود کی شہرت ذہانت کے علاوہ اس لحاظ سے بھی تھی کہ یہ لڑکا بڑا زود حس ہے، ذرا سی جھڑکی میں اس کے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ ایک بار اسکول میں ایک نئے ہیڈ ماسٹر وشپال سنگھ آئے ۔ ۔ ۔ ۔ انھیں مسعود کی گریہ سامانی کا حال معلوم ہوا تو وہ بھی تماشے کے مشتاق ہوئے اور کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہنے لگے۔ مسعود اس وقت بیت بازی کے چیمپین تھے اور پورہ پوری جماعت کو تنہا ہرا دیا کرتے تھے۔ مشق کے لیے ایک چھوٹی سی بیاض پر اشعار لکھتے اور فرصت میں انھیں یاد کیا کرتے تھے اس بیاض کے سرورق پر لکھا تھا "اشعار برائے بیت بازی" یہ بیاض ہیڈ ماسٹر صاحب تک پہنچا دی گئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ فوراً مسعود کی طلبی ہوئی۔ یہاں آدھا خون یہی سن کر خشک ہو گیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بلایا ہے۔ ڈرتے ڈرتے وہاں پہنچے تو بیاض دکھا کر سوال کیا گیا:

"یہ کاپی تمھاری ہے؟"

اعتراف کرنا پڑا۔ اس پر ہیڈ ماسٹر صاحب نے تیوری چڑھا کر سخت لہجے میں کہا۔

"یہ تم یہاں پڑھنے آتے ہو یا اشعار برائے بیت بازی لکھنے"،

بس اتنا کافی تھا۔ آنکھوں کا دوآبہ جاری ہو گیا۔ بڑی مشکل سے ہیڈ ماسٹر صاحب نے سمجھا بجھا کر چپ کرایا۔"

زیر نظر بیاض ظاہراً وہی اشعار برائے بیت بازی والی کاپی ہے لیکن یہ کرون کے زمانہ طالب علمی کی نہیں بلکہ اس وقت کی ہے جب آدیب وہاں کے ورناکیولر اسکول سے ۱۹۰۶ء میں چوتھا درجہ پاس کر کے اناؤ کے مڈل اسکول میں آ گئے تھے اور پانچویں درجے کے طالب علم تھے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ کرون والی کاپی اس سے پہلے تیار ہوئی تھی یا اسی کاپی کو اضافۂ اشعار کے بعد اب نئے سرورق سے مزین

کیا گیا تھا لیکن ادیب نے یہ واقعہ مجھے اس زمانے میں سنایا تھا جب ان کی عمر اسی سال کی اور یادداشت کمزور ہو گئی تھی، اس لیے اس امکان کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ واقعہ کرون کے ورناکیولر اسکول کا نہیں بلکہ اٹاوے کے مڈل اسکول کا ہے، اور روشپال سنگھ اسی مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوں۔

"اشعار برائے بیت بازی" کا سرورق کے بعد والا ورق سادہ ہے۔ اس کے بعد پ سے ی تک سے شروع ہونے والے شعر درج ہیں۔ آخری شعر کے بعد آدھا صفحہ خالی ہے اور اس کے بعد بیاض کے سرورق سادہ ہیں۔ خط ناپختہ ہے اور کچھ شعروں میں املا کی غلطیاں ہیں مثلاً "ذوالجلال" "بے نظیر" "تامل" کی جگہ "زل جلال" "بے نذیر" "تعمل" لکھا گیا ہے۔ کہیں کہیں کوئی لفظ یا حرف چھوٹ گیا ہے۔ اس نقل میں املا کو درست کرکے اور چھوٹے ہوئے لفظوں کو کھڑے قوسین کے اندر لکھا گیا ہے۔

کبھی کبھی ادیب اپنے بچوں میں بھی بیت بازی کا مقابلہ کراتے تھے اور اس میں ایک آدھ مرتبہ (دونوں فریقوں کی طرف سے) خود بھی شریک ہوتے۔ اپنے بارے میں بتلاتے تھے کہ تنہا پوری جماعت کو ہرانے کی ترکیب انھوں نے یہ نکالی تھی کہ ہر حرف سے شروع ہونے والے شعروں کو کسی ایک حرف مثلاً الف پر "توڑتے"، یعنی ختم کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ جماعت کے پاس اس حرف سے شروع ہونے والے شعروں کا ذخیرہ ختم ہو جاتا اور ادیب جیت جاتے تھے۔

ایک بار میں نے اپنے اسکول میں بیت بازی کا ایک مقابلہ جیتا اور گھر آکر ادیب کو بتا بھی دیا کہ میں نے ن سے شروع ہونے والا شعر یوں پڑھا تھا۔

نہر پر چل رہی ہے پن چکی ‌ ‌ ‌ دھن کی پوری ہے کام کی پکی عبث

مخالف ٹیم ث کا شعر نہ دے سکی اور ہار گئی۔ اس پر ادیب ہنسنے لگے، پھر انھوں نے کہا کہ کبھی کبھی ضرورت آپڑنے پر ہم بھی بعض شعروں کے پہلے یا آخری لفظ کو بدل دیا کرتے تھے مگر اس طرح کہ شعر کا وزن اور مفہوم برقرار رہتا تھا۔ تمھاری طرح سینہ زوری کرکے "عبث" کے اضافے سے شعر کو ناموزوں اور مہمل نہیں کر دیتے تھے۔ تعجب ہے کہ مخالف ٹیم نے تمھارے پڑھے ہوئے شعر کو "القط" نہیں کیا۔ ادیب کا کہنا تھا کہ بیت بازی کی سب سے زیادہ افادیت ان کے تین قواعد کی وجہ سے تھی۔ ایک تو یہی "القط" کا قاعدہ تھا جس کی رو سے ناموزوں یا غلط پڑھے جانے والے شعر کو مخالف ٹیم "القط" کہہ کر کالعدم اور مقابلے سے خارج کرا دیتی تھی۔ اس سے بچوں کی توجہ معائب شعر کی طرف رہتی تھی۔ دوسرے دو قاعدے، جن کا نفاذ ان کے

نے میں کبھی کبھی ہوتا تھا۔ ان میں ایک یہ تھا کہ شعر پڑھنے والے کو بتانا ہوتا تھا کہ
س شاعر کا کہا ہوا ہے (تاکہ فی البدیہہ گڑھ کر شعر نہ پڑھے جا سکیں) دوسرا قاعدہ
ہ اگر فریق مقابل مطالبہ کر دے تو اپنے پڑھے ہوئے شعر یا اس کے کسی لفظ
معنی بیان کرنا ہوتے تھے۔

(سرورق)

۷۸۶

اشعار برائے بیت بازی

محمد مسعود طالب علم درجہ پنجم مڈل اسکول اوناؤ
۱۵ جنوری ۱۹۰۷ء
روز سہ شنبہ

(اشعار برائے بیت بازی)

(پ)

رفشانی حسرت پرواز میں اب کیا ضرور — دام صیاد اجل لے مرغ جاں نزدیک ہے
یری میں کس مزے کو جوانی کے روئیے — سو داغ دے گئے مجھے دو دن بہار کے
بھر جائے سوز دل کا مزہ آنکھ میں اگر — ہو مثل لالہ دیدۂ نرگس ایاغ داغ
پھٹے پھرتے ہیں شہروں شہروں ہم املے سے الکا — ضعیفی میں ہیں خامہ ہمارا چوب دستی ہے
پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار — اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا
پنبۂ داغ دل کو حیراں ہوں — نہ رہا خرقۂ زمستانی
پھول اس نے کھلائے کھلتے ہیں روز — دو وقت ملائے ملتے ہیں روز
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی — جو نہ آتی تھی وہ بلا آئی!
پانو اقبال کے اکھڑنے لگے — ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے
پھیلی ہے یہ چاندنی سراسر — یا فرش ضیا کا ہے زمیں پر
پہرا ہے روش روش بٹھایا — نرگس کو ہے دیدباں بنایا
پاکر نور نظر یہ قابو — پرواز میں شپرک ہے ہرسو
پھولے پھلے گلشن تمنا — عقبیٰ مرے پھول، پھل ہو دنیا
پے تعظیم استقبال جاں ہے — سرِ محملِ خداوندِ جہاں ہے
پھر یہ کہا آج کہاں کس طرف — بولی ہوا حکم خدا جس طرف

پھر چھوڑ گئی ہیں جہاں میں
پھر زیست کا ذائقہ چکھا

پایا تو تجھے کہیں نہ دیکھا
دیکھا تو تجھے کہیں نہ پا

پالا سو مفارقت ہے انجام
دانا ہے تو مجھ سے لے مرے د

(ت)

تارکِ ہستی سے اس کا آستاں نزدیک ہے
بے نشانوں سے بہت وہ بے نشاں نزدیک

تری بندہ نوازی ہفت کشور بخش دیتی ہے
جو تو میرا جہاں میرا عرب میرا عجم میر

تاریکیِ لحد سے نہیں دل جلے کو خوف
روشن رہے گا تا بہ قیامت چراغِ دا

ترے فقیر نے وحشت میں کی مذمتِ مال
اڑائیں دامنِ دولت کی دھجیاں کیا کیا

تیری سرعت کے مقابل اے عمر
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ تخ

تھا ترنج زر ایک خرد پاس
رنگ کا زرد پر کہاں بو باس

تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانباریِ گوہر سہ

تھا ملہمِ غیب مرغ گویا
سنتے ہیں ادھر چلا وہ جو

تو نے کیا نیند کو مسلّط
قدرت ہے تری بڑی غذا

تابشِ حسن سے مانند شعاعِ خورشید
رخِ پُرنور پہ ہے تیرے مؤثر سہرا

تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

تیر بارانِ فاقہ نے مارا
بک چکی تھی کلاہ بارانی

تجھ سے بیزار ہوا جاتا ہوں سوئے ملکِ عدم
منہ نہ دکھلائے خدا پھر مجھے دنیا تیرا

تری ہی ذات کریم و رحیم ہے یارب
سوا ترے کوئی مشکل میں کس کے کام آ

تپش دے نالۂ جاں حزیں میں
اثر دے دودِ آہِ آتشیں میں

ترقی پر رہے شوقِ اسیری
رہے وحشت کو پاسِ دستگیری

تاکید ہے باغباں کی یکسر
ہو دخل نہ غیر کا یہاں پر

تحریر کہیں یہ کہکشاں کی
ہے مانگ یہ موتیوں سے تاکم

تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

ترقی پر رہے شوقِ اسیری
رہے وحشت کو پاسِ دستگیری[1]

تازگی فکر کی کبھی نہ گئی
جب سنائی نئی سنائی بات

(ٹ)

ٹکرے ہوتے ہیں سنگِ غربت میں
سوکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں

ٹک تیر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

---

[1] اس شعر پر نوٹ۔ دو جگہ لکھ گیا۔

حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا — قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
منڈا ہوا تا جروں کا بازار — سودے کا معاملہ چکایا
وہ جو سر پہ چھال کی تھی — عریانی میں پردہ حال کی تھی
پی جو بنائے چھیل کر چھال — دکھلائی نہ دے نظر کی تمثال
ہرے جہاں میں بیگانے سب سے — تجھ پر ہوئے ہیں دیوانے جب سے

(ش)

بت ہوا جب سے حال اُن کا — پھر بھی نہ ہوا مآل ان کا (کذا)
بت یہ حدیث سے ہوا ہے خوشخو — گر ماہِ محرم ہو نمایاں ہر سو
نی رکھتی نہ تھی وہ صورت میں — غیرت حور تھی حقیقت میں (۵۰)

(ج)

ہو ملاقات کی تمنا ادھر کو تو بھی رواں ہوا ے دل — سفر سے ممکن نہیں ہے پھرنا مسافران رہ عدم کا
س وقت اُتر گئی گھٹا سی — آنکھوں میں چراغ ٹمٹمایا
جب چور کی آنکھ میں سمائی — اس نے چوری سے جی چرایا
جغرافیہ داں کی راہ گم ہے — لنکا ہے کہاں کدھر ملایا
جس پھل کو چھوا جو پھر کیا غور — ہاتھ آیا نہ کچھ حباب کے طور
جانا کہ طلسم کا ہے جنگل — ہے یاں کے درخت کا یہی پھل
جس شخص کے پاس یہ ثمر ہو — ہتھیار نہ اس پہ کارگر ہو
جوش و خروش رعد نے یہ دھوم دھام کی — ہرگز کسو کی کسی کی نہ پہنچا پکار کو
جہاں میں ہوں ترے الطاف حاوی — امیروں اور غریبوں پر مساوی
جوں جوں وہ ذر سے کہتے ہیں دوری — ضرب ان پہ تیری پڑتی ہے پوری (۲)
جاتا ہے آہو جب چوٹ کھا کر — گرتا ہے آخر کچھ دور جا کر
جس جا تعصب ہے عین ایماں — انصاف کا غل کرتی ہے تو واں
جس ملک میں ہے جاری غلامی — ہوتی ہے تو واں بردوں کی حامی
جس سرزمیں میں پانی ہے عنقا — تو چھیڑتی ہے واں ذکر دریا
جب دیکھتی ہے قومیں بگڑتی — ہے آگ میں تو قوموں کے پڑتی (۴)
جھڑکی ہے تیری عادت میں داخل — ترشی ہے تیری طینت میں داخل
جاہل ہمیشہ تجھ سے لڑے ہیں — ناداں ہمیشہ تجھ سے اڑے ہیں
جو حرف حق سے بھاگے بگڑ کر — حق ان کو لایا گردن پکڑ کر
جن بستیوں میں تو چہچہاتی — کھیتی انھیں کی یاں لہلہاتی
جب دور تیرا مغرب میں آیا — مغرب کو تو نے مشرق بنایا (۵)
جہاں تک کہ سرکش تھے اطراف کے — وہ اس شہ کے رہتے تھے قوموں تلے

ج مالک نے کیا پھر کاشت کر
صورتِ خرمن ہوئی اب جلوہ گر

بس کو میسر نہیں کمکی پھٹی
خوش ہے توقع پہ وہ زربفت کی

نھیں دنیا میں رہنا ہے سبھی معلوم ہے ان کو
کہ دیں اب جہل (و) نادانی کے معنی ذلت وخوار کا

ہاں علم تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر
تجارت کی نہ ہوگی تا قیامت گرم بازار کا

ہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرماں روائی ہے
جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے

(چ)

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت
مزاج تو از حال طفلی نہ گشت

چرخ کا مطلق اسے دھڑکا نہ تھا
رنج یہی تھا کوئی لڑکا نہ تھا

چشم پوشی کی اگر احباب نے پروا نہیں
عین عریانی میں یاں جامہ میسر ہوگیا

چرخ گرداں ہے ترقی میں (تنزل) کو نہ بھول
ماہ نو ہوکر تو ہی کیا جلد لاغر ہوگیا(۸)

چاہیے نام اس کا اے خامہ
زینت نام زیر خر نامہ (کذا)

چاہنا جو مجھے تو حشر میں کہنا اے دل
داورِ حشر نہ ملنے گا گواہی تیری

چڑھا منصور سولی پر پکارا عشق بازوں کو
یہ بامِ عشق کا زینہ ہے آئے جس کا جی چاہے

چک یہ وجع میں محسوس ہے مرے کہ خیال
کرے ہے یوں کہ مفاصل میں تجمع ہے قبیح (کذا)

چل دیے لے کے دل راز کو چلنے والے
ہاتھ ملتے ہی رہے ہاتھوں کے ملنے والے

چل دیے سوئے عدم دہر سے چلنے والے
رہ گئے جو کفِ افسوس تھے ملنے والے

(ح)

حیا غنچوں کو دی رازِ نہاں کی
لبِ بلبل کو دی رخصت فغاں کی

حاسد کو ایک دم نہیں راحت جہاں میں
رنجِ حسد سے جان ہے جب تک کہ جان میں

حمد بے حد اس خدائے پاک کو
خاک سے پیدا کیا افلاک کو

حمد بے حد قدیر ذو الجلال
شان جس کی بے نظیر و بے مثال(۹)

حق کے سب آخر طالب ہوئے ہیں
تب حق کے داور غالب ہوئے ہیں

حسبِ استفسار پیر راز داں
کی مفصل وجہ غربت کی بیاں

حق نے عطا کیا ہے تجھے زور بے محل
فولاد کی رگیں ہیں تو دل ہے ترا اٹل

حملے سے تیرے بچنے کو کافی نہیں مگر
اللہ رے تیرا حوصلہ بل بے ترا جگر

حریف نالۂ بیداد ہوں میں
شریک صحبت فریاد ہوں میں

حسد و رشک و تکبر یہ برے ہیں اعمال
اور سوا ان کے طمع کا بھی برا ہے...

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں
ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

حق ہر کا ہے لفظ میں فقط فرق
معبود کی یاد میں ہیں سب غرق

حرام مے ہوئی ہر ایک دین و ملت میں
یہ بڑھ کے رہ نہیں سکتی ہے قید قلت میں

حجاب ہو گیا رخصت ادب نے کی فریاد
نہ ان کو خوف خدا ہے نہ خدشۂ جلاد(۱۰)

واس جب ہوئے غائب تو پھر ہے پرساں کون
جو گالیاں لگے دینے تو ہوں ثنا خواں کون

(خ)

خاموشی پہ گل ہے یہ کھلاتی
ہے چرب زبانیاں دکھاتی

خلد میں پلٹے گا جب تک نہ جگر یہ سید
غضب و قہر کو رحمت کو بدلنے والے(؟)

خامہ یہ تھکا نہ رک گیا ہے
سر لوح پہ رکھ کے جھک گیا ہے

خرابی دوست رکھ اس دم مزاجی
بہ رنگ برق دے شعلہ مزاجی

خوب سبھی شہر اک اک دکاں
طرفہ عمارات عجائب مکاں

خلیل سال نہ میں قائل ہوا ستاروں کا
بدل کے رنگ یہ بہروپیے ہزار آئے

خاکساری سے نہیں بہتر جہاں میں منعمی
مل گئی جس کو یہ دولت کیمیاگر ہو گیا

خامے کا صفحے پر رواں ہونا
شاخ گل کا ہے گل فشاں ہونا

خاک میں رشک آسماں ہیں ملے
ہائے کیسی بلند ایوانی(؟)

خانۂ بلبل شیدا نہیں تنہا پھونکا
تو نے اے آتش گل باغ ہے سارا پھونکا

خدا کے کام کچھ آلات پر نہیں موقوف
ابو البشر ہوئے بے مادر و پدر پیدا

خوف آتا ہے کسی معشوق کی مژگاں نہ ہو
دشت میں پڑنے نہیں دیتا قدم میں خار پر

خامے نے پائی طبیعت سے مدد
باد باں بھی اٹھتے ہی لنگر کھلا

خاکساری ہے ان اوصاف پہ مجھ میں ایسی
غازۂ چہرہ نہیں اور بجز خاکستر

خود نمائی کے سوا کچھ (بھی) نہیں تجھ میں صفت
سادہ لوحی کے سوا کچھ بھی نہیں تجھ میں ہنر

خردوں پہ کیا سلوک کرے گا کوئی بزرگ
دشمن بنے جو مہر کی اُن پر نگاہ کی

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

خرمن جلا دیا تھا برق الم نے میرا
میں جان دے چکا تھا تو نے مجھے جلایا

خوشامد میں ہم کو (وہ) قدرت ہے حاصل
کہ انسان کو ہر طرح کرتے ہیں مائل(؟)

خوش نہ ہوں دولت دنیا سے زمانے والے
روئیں گے صورت فوارہ خزانے والے

خوں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے
ایام ضعیفی میں بھی طاقت ہے یسر سے

(د)

دوا کوئی ورزش سے بہتر نہیں
یہ نسخہ ہے کم خرچ بالا نشیں

داغ پر داغ کھا نہیں سکتے
ناز(و) غمزدہ اٹھا نہیں سکتے

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی

دانہ دانہ زیر سنگ آسیا
بے تامل پیس کر آٹا کیا

دہقان کو کھیت میں کیا چت
گو کھیت کو گیدڑوں نے کھایا

دل سے رخصت ہے تاب(و) طاقت کی
بے قراری نے استقامت کی

دنیا نے ان پر گو ظلم توڑا
دامن انھوں نے تیرا نہ چھوڑا

دلدوز ہیں سب تیری ادائیں
کڑوی ہیں ساری تیری دوائیں (۳)
دیتی ہے اوّل تو زخم کاری
مرہم کی آخر آتی ہے باری
دم بہ دم کہتی ہے بڑھیا سن لو
حرص کا آخر نتیجہ کیا ہوا
دیتی ہے طعنے بے غیرتوں کو
کرتی ہے رسوا بے عزتوں کو
دیا تھا زبس حق نے ذہن رسا
کئی سال میں علم سب پڑھ گیا
دولت نہ نصیب میں تھی تیرے
تھا لعل پنہاں شکم میں میرے
دیا ہے، خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے میش تجمل حسین خاں کے لیے
دے کر صیاد نے دلاسا
چاہا پھر کچھ لگائے لاسا

(ڈ)

ڈھوروں نے بھی چھوڑ دی جگالی
چپ ہیں نہیں کان تک ہلایا
ڈاکٹر ہیں بیس واں بہر علاج
یاں نہیں ہے ایک کی بھی احتیاج
ڈر جانوروں کا جی میں بیٹھا
اک تخلِ کہن پہ چڑھ کے بیٹھا

(ذ)

ذرا اس لینے غم دل (کو) تو غنیمت جان
بدل خوشی سے تو اس دور میں نہ کر زنہار
ذات کی کُنہ کو کیا فہم کریں گے اوہام
سیکڑوں نوع کے جس میں ہیں دقائق مغلق

تحقیقی مضامین — مالک رام

اُردو کے ممتاز محقق اور ماہرِ غالبیات مالک رام صاحب کے منتخب تحقیقی مضامین کا نیا مجموعہ۔ ۶۰/=

باتیں کچھ سُریلی سی — داؤد رہبر

عہدِ حاضر کے موسیقاروں کی مختصر سوانح اور فنِ موسیقی پر ایک بسیط مقالہ، موسیقی سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ایک قیمتی تحفہ۔ ۳۶/=

خُسرو نامہ (تحقیق) — حبیب رضوی

امیر خسرو وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے ہندی زبان میں یہ صلاحیت پیدا کی کہ ایک ایک لفظ میں جہان معنی پنہاں ہو سکیں۔ اس کتاب میں خسرو کے اسی کارنامے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ۲۱/=

ریت کی دیواریں (ناول) — رفعت سروش

رفعت سروش صرف شاعر ہی نہیں ناول نگار بھی ہیں۔ ریت کی دیواریں آپ کا کامیاب رُومانی ناول ہے۔ ۲۱/=

بنجر بادل (ناول) — کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کا شمار اب صفِ اوّل کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ موصوف کا یہ نیا ناول ایک اچھوتے اور دل ہلا دینے والے موضوع پر ہے۔ ۳۳/=

تذکرہ (ناول) — انتظار حسین

قدیم زمانے کی آہستہ روی اور جدید دور کی تیز رفتاری کو زبان کے دو مختلف پیرایوں کی مدد سے گرفت میں لے کر انتظار حسین نے ناول کے ایک نئے اسلوب کی طرح ڈالی ہے۔ ۵۴/=

مُسلمانانِ ہند سے — پروفیسر

وقت کے مطالبات — ریاض الرحمن شروانی

پروفیسر شروانی نے یہ اہم خطبہ ڈاکٹر عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام ہونے والے جلسے میں جنوری ۱۹۸۰ء میں دیا تھا۔ اس خطبے میں ان مسائل سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے جن سے آج کا ہندستانی مسلمان دوچار ہے۔ ۸/=

ہندستانی مُسلمانوں کی

قومی تعلیمی تحریک — شمس الرحمن محسنی

قومی تعلیمی تحریک، قومی تعلیمی ادارے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پچاس سالہ زندگی کے نشیب و فراز کی داستان۔ ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۵۰/=

دُنیا کے بڑے مذہب — عمادالحسن آزاد فاروقی

اس کتاب میں دنیا کے آٹھ بڑے مذہب ہندو مت، بُدھ مت، جین مت، زرتشت، سکھ مت یہودیت، عیسائیت اور اسلام کو جدید معیارِ تحقیق کے مطابق ہمدردانہ لیکن غیر جانب دارانہ اور معروضی انداز سے متعارف کرایا گیا ہے۔ ۱۵/=

حَرف حَرف روشنی — حمایت علی شاعر

حمایت علی شاعر کی شاعری میں آگ کی سی گرمی بھی ہے پھول کی نرمی بھی، اپنے عہد کا کرب بھی ہے اور مستقبل کی طرب انگیز آہنگ بھی۔ ۱۵/=

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
صدر شعبۂ اردو، مہاراشٹر کالج بمبئی ۸

دو نظمیں ـــــ تسلیمہ نسرین کے نام

(۱)

مقدس کتابوں نے مجھے کبھی رَد نہیں کیا

انجیل نے کہا میں ماں ہوں
وید نے کہا میں دھرتی ہوں
قرآن پکارا میں کھیتی ہوں

میرے قدموں کے نیچے جنت ہے۔
روزِ حشر
میرے بچّے میرے اور صرف میرے نام سے
اپنی قبروں سے اٹھائے جائیں گے!!

تخلیقِ آدم میرے بغیر بے معنی
تزئینِ کائنات میرے وجود کی ضامن
تبلیغِ دین میرے سرمایے کی احسان مند
مباہلہ میری شرکت کے بغیر نامکمل
تنزیلِ تطہیر میری شمولیت کی منتظر
کربلا میرے خطبوں کے بغیر ادھوری!!

پھر یہ کون ہیں جو مجھے رد کر رہے ہیں؟
یہ تو
خدا کے بیٹے بھی نہیں!
وید کے پاٹھک بھی نہیں!
اللہ کے بندے بھی نہیں!

یقیناً اس کی اولاد ہیں
جس نے روزِ ازل
میرے ماتھے پر
لفظ "گندم" تحریر کرنے کی گندی جسارت کی تھی
اور آج ـــ
تسلیمہ نسرین!
تمھارے اندر بھی وہی بول رہا ہے
کہیں تم اُسی کی بیٹی تو نہیں؟
اور کہیں اُس کی طرح
مقدس کتابیں تمھیں بھی رد نہ کر دیں۔

(۲)

میں خوف زدہ کبوتری نہیں
کہ جس پر کوئی باز بڑی آسانی سے جھپٹ پڑے
میں وہ سہمی سہمی سی بلّی بھی نہیں
جو گھر کے کچن میں
دُودھ کی پتیلی دیکھ کر میاؤں میاؤں کرتی ہے
میں وہ دُبکی ہوئی کُتیا بھی نہیں
چند چھیچھڑوں کے عوض

جو اپنے مالک کے تلوے چاٹتی ہے!

مجھے ایسے گھناؤنے ناموں سے مت پکارو
میرا دل نفرت سے بھر جاتا ہے!
ہمدردی کے پردے میں
یہ میرے قتل کی سازش ہے جو برسوں سے چلی آ رہی ہے
لیکن میں — اپنے قاتلوں کے چہرے
بہت اچھی طرح پہچانتی ہوں
ان میں کوئی میرا مسیحا نہیں
یہ تو شیئر بازار کے وہ دلّال ہیں
جو انسانیت اور حقوقِ نسواں کی بولی لگا کر
مجھے بیچنا اور اپنا دھندا چلانا چاہتے ہیں

میرے ماتھے پر کوئی اشتہار نہ چپکاؤ
مظلومیت کا، محرومی کا، ناانصافی کا
میں نے مقدس کتابیں پڑھی ہیں
اور اپنی قیمت خوب جانتی ہوں

ہو سکے تو
اپنے ننگے ذہن کو
فکر کی عریانیت اور گمراہی سے بچاؤ
اور تسلیم کرو کہ میں ماں ہوں اور تم بیٹے
میرے اور صرف میرے قدموں تلے ہی تمھاری جنت ہے
اور تسلیم کرو کہ تم باپ ہو اور میں بیٹی
تمھارا ناموس میری اور صرف میری عفت و عصمت ہے

یہ میں نہیں کہہ رہی ہوں
وہ "کتاب" کہہ رہی ہے
جس کے بدلنے کا حق
خود اُسے بھی نہیں تھا
جس پر یہ نازل ہوئی تھی

پھر —
تسلیمہ نسرین!
تم کس کھیت کی مُولی ہو؟؟

• • • ——————— • • •

رؤف صادق
۱۷/۹ گیٹ نمبر ۲ اولڈ کلکٹر کمپاؤنڈ
ملوانی۔ ملاڈ بمبئی ۹۵

غزل

لفظ کوئی زبان سے نکلا — تیر جیسے کمان سے نکلا
ڈھلتے سورج کو دیکھ کر سایہ — میرے ٹوٹے مکان سے نکلا
جب بھی منزل مجھے نظر آئی — میں سفر کی تکان سے نکلا
شام رنگین کا گمشدہ سورج — صبح کے سائبان سے نکلا
آدمی کا یقین کیا کیجیے — اب خدا بھی گمان سے نکلا
گھر میں فاقہ تھا جس کے چہرے پر — گھر سے نکلا تو شان سے نکلا
خود کو شوکیس میں سجا کر میں — خواہشوں کی دکان سے نکلا
شخصیت کا وہ بن گیا پرتو — لفظ جو بھی زبان سے نکلا
صبح جاگی تو چپکے چپکے سے — ایک چہرہ چٹان سے نکلا

مخمور سعیدی
۱۔غالب اپارٹمنٹ پروانہ روڈ
پیتم پورہ، دہلی

غزل

وہ خود نہیں، دوسرا ہے شاید
اُسے کوئی بد دعا ہے شاید

جسے کوئی بھی سمجھ نہ پائے
وہی مرا مدعا ہے شاید

ملے کسی سے نہ سوچ اُس کی
وہ اِس طرح سوچتا ہے شاید

جو میری قربت سے ہے گریزاں
وہ دور تک دیکھتا ہے شاید

جو بستیوں سے گزر رہی ہے
یہ جنگلوں کی ہوا ہے شاید

ملول، میرا ہی دل نہیں ہے
اُداس، ساری فضا ہے شاید

ہم اُس کی چاہت سے ہاتھ اُٹھالیں
یہی تو وہ چاہتا ہے شاید

بُرا نہ چاہے کوئی کسی کا
اِسی میں سب کا بھلا ہے شاید

کہا جو مخمورؔ تم نے خود سے
ہر ایک نے سُن لیا ہے شاید

نسیم سحر
پوسٹ بکس ۹۲۵ جدہ ۲۱۴۳۲

ہائیکو

اُکتاہٹ سی ہے
یہ دن کاٹ لیا لیکن
کل کا دن سر پر!

اُس کے جاتے ہی
دل یہ چاہنے لگتا ہے
پُروا تھم جائے!

چڑیاں دیکھی ہیں
کس نے چُن دی ہیں اینٹیں
کچّے آنگن میں

اس کے لبوں پر کیوں
نام کسی کا آیا ہے
میں بے نام ہوا

میرے کمرے میں
کچھ آوازیں کہتی ہیں
میں موجود نہیں

سورج نگری میں
آخر کیسے ممکن ہے
سایے میں چلنا

رات کی تنہائی
کٹ ہی جاتی ہے لیکن
ذات کی تنہائی؟

محسن بھوپالی
۴ الف - ۵/۱۳ اے ناظم آباد، کراچی

ہائیکو

ہم جو بوتے ہیں
جب کھیتوں میں اگتا ہے
پھر کیوں روتے ہیں

بوندا باندی میں
کتنا اچھا لگتا ہے
برساتی کا بوجھ!

پھر بھی ہیں دشمن
جل میں مچھلی اور بگلے
دونوں کا جیون

کلیاں کھلنے دو
پھولوں کو اور بھونروں کو
کھل کر ملنے دو

میرا سایہ ہے
تاریکی میں وہ مجھ سے
ملنے آیا ہے

ساون کے بادل
کھیتوں میں دھول اڑتی ہے
بستی میں جل تھل

دھوکا دیتے ہو
نم آنکھیں، اور ہنستے ہونٹ
آئینہ دیکھو!

کرامت بخاری
۲۷۔ اے قیصل ٹاؤن جی او آر ۷۔ لاہور

غزل

کرب کو کچھ کم کیا
موت کا ماتم کیا

پیار کے مجرم ہوئے
آپ کو محرم کیا

اس دوائے درد نے
درد کو برہم کیا

نبض رک رک کر چلی
پیار جب پیہم کیا

قطرہ قطرہ سوچ کر
آنکھ کو پرنم کیا

آج تک اس نے سوال
جو کیا مبہم کیا

یہ چراغِ زندگی
عمر نے مدھم کیا

مراٹھی نظمیں

پروفیسر کیشو میشرام
ترجمہ: لُور پرکار

کچھ اس سے متعلق

پیدا نہیں ہوا
امید و بیم کا کوئی سوال
موندی موندی آنکھوں، کانپتی بھرائی آواز سے
دایا کے ہاتھ پر اس نے پہلا قدم رکھا
ہوا کے دوش پر پھڑپھڑاتے رہے کیلنڈر کے صفحات
اُچھلتے کودتے لمحے، دن، مہینے سال
پیدا نہیں ہوا
اُمید و بیم کا کوئی سوال!

تار پر چلنے والے گونگے جانور کی طرح
دم بھی نکل پڑا
اپنے حصے میں آئے ہوئے ماہ و سال کی طرف
روگ لیے سنسار کا
گھر میں روتے، چیختے، کلبلاتے بچّوں کی بھیڑ
بیوی کا غصّے سے بھرا پیار
والدین کی بیماری۔ کاشی یاترا
بہما کے ہفتے، بھائی بہنوں کی فیس اور پکنک
بالشت بھر جگہ میں سبھی کچھ
ٹھیس سے بچنا محال!

اس سے متعلق کبھی بھی کچھ
کچھ ایسا ہی آپ سے، مجھ سے متعلق بھی
پیدا ہی نہیں ہوا
امید و بیم کا کوئی سوال
چلتی رہتی ہے ہوا
پھڑپھڑاتے رہتے ہیں کیلنڈر کے صفحات
اچھلتے رہتے ہیں لمحے، دن، مہینے سال!!!

کھوج

سُکھوں کی جمع شدہ پُونجی
ختم ہو جاتی ہے
سُکھوں کی کھوج میں
اَن گنت راہوں پر ٹٹولتی بجھی ہوئی آنکھیں
ہر روز اپنی شخصیت صرف اپنی خاطر
کم ہوتی نظر، ہلتے دانت، گرتے ہوئے بال
پھینک دی جاتی ہے مجھ پر
اُپدیشوں کی گرم راکھ!
تم ابھی تک کچھ کر نہیں پاتے۔ کچھ بھی نہیں!
اب قدم قدم پر اندھیرا ہے
روح جو مایوسیوں سے پھولی پھلی ہے
پیاس کے کنوئیں دلوں کی کھائی میں
لطیف جذبات کے امڈتے سوتے ذہنوں کے کھنڈر میں
سوئے پڑے ہیں
ہاتھوں کا مسلسل نہ رکتا ہوا ایک ہی تیشہ
کھردری انگلیوں سے ___ کسی موڑ پر
ایک چوراہا
اَن گنت راستوں پہ ___!!!

قیوم کنول
کاشانہ کنول، مقیم کی چال
گومتی پور، احمد آباد

غزل

کرب کی گود میں راحت کے سمندر رکھ دو
یعنی گرتی ہوئی دیوار پہ چھپّر رکھ دو

کچھ تو اُمید کی دہلیز پہ منظر رکھ دو
پھول جب رکھ نہیں سکتے ہو تو پتھر رکھ دو

جو نمائش کی منڈیروں پہ فقط جلتے ہیں
گھر میں اب ایسے چراغوں کو بجھا کر رکھ دو

جسم ہو جائے نہ خاموش مزاروں کی طرح
کوئی چنگاری مری روح کے اندر رکھ دو

صلح کی ریل میں گر تم کو سفر کرنا ہے
آستینوں میں چھپاتے ہوئے خنجر رکھ دو

روشنی شہر کے آنگن میں بکھر جائے گی
کاٹ کر غم کی فصیلوں پہ مرا سر رکھ دو

ان پہ سو جاؤ گے تو جسم میں چبھ جائیں گے
یہ نکیلے ہیں کنول خواب کے بستر رکھ دو

شاعرہ :- پربھا گانو رکر
مراٹھی سے ترجمہ
وقار قادری

استقبال

دروازے پر دستک
"اس گھور اندھیری رات میں کون ہے؟"
دروازہ کھولا
سامنے بیتا جیون تھا
بھولا بسرا جیون
زخموں سے چُور نڈھال
در در کی ٹھوکریں کھا کر
واپس لوٹ آیا تھا
مرے روبرو آن کھڑا تھا
کل جو بیت چکا تھا!
آج مرا یہ جیون
اک روپ لیے ہے
بسا بسایا گھر
ہنستے کھیلتے بچے
جانے اب کیوں آیا ہے!
کل — جو بیت چکا ہے
لاکھ جتن کر
میں اس کو لوٹا نہیں پائی
"بھول جا مجھ کو"
کہہ نہیں پائی
اس کو یوں اپنایا جیسے
ماں اپنے
بھولے بھٹکے بچے کو
شام ہوئے گھر لوٹ آنے پر
اپنے گلے لگاتی ہے

کوثر مظہری
...ردو جامعہ ملیہ اسلامیہ
...ہلی ۱۱۰۰۲۵

ہائیکو

جیون ساتھی تم
کھولو آنکھیں بولو کچھ
کیوں ہو جی گم صم

کشتی بے پتوار
طوفاں ہے اور ساحل دور
کیسے جائیں پار

ظالم کا سردار
پوجوں یا نیزہ ماروں
آیا میرے دوار

جیون اور سنسار
کیا بیچیں کیا سودا لیں
سکھ دکھ کا بازار

چل جلدی اب چل
پتھریلی ہیں راہیں بھی
جانا ہے پیدل

حنا انجم
۱۸۰، بلوہا، بلرام پور (یوپی)

رخسارِ صبا پر میں رمق چھوڑ گئی ہوں
بکھری کبھی تو خوشبو کے ورق چھوڑ گئی ہوں

تسلیم کریں یا نہ کریں لوگ اسے لیکن
مٹ کر بھی وفاؤں کے سبق چھوڑ گئی ہوں

اس گھر کی ہر اک اینٹ کو باندھے ہے مرا پیار
جاتے ہوئے ہر اینٹ پہ حق چھوڑ گئی ہوں

جس پر مرے جذبوں کا کوئی رنگ نہ ابھرا
اس چہرۂ بے حس کو بھی فق چھوڑ گئی ہوں

گھیرے ہی رہیں گے تجھے آسیب کی صورت
کچھ ایسے مسائل میں ادق چھوڑ گئی ہوں

چپ چاپ میں گھلتی رہی اوروں کے دکھوں میں
سب سنگ جبینوں پہ عرق چھوڑ گئی ہوں

آؤں نہ حنا وقت دعا یاد ہیں کیوں کر
ہر ایک ہتھیلی پہ شفق چھوڑ گئی ہوں

مانگے کا اُجالا

سخن در سخن

خامہ بگوش

وہ لکھیں اور پڑھا کرے کوئی

وامق جونپوری اس سال اکتوبر میں ۸۵ برس کے ہو جائیں گے۔ ترقی پسندوں کی باقیات میں وہ اس وقت سب سے سینیر ہیں۔ قحط بنگال پر ان کا گیت "بھوکا ہے بنگال" قحط بنگال سے بھی زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ اسی گیت کے حوالے سے وہ پہچانے جاتے ہیں اور یہی گیت انھیں اردو ادب کی تاریخ میں زندہ رکھے گا۔ فیض کے سوا کسی ترقی پسند شاعر کی گرہ میں اس ایک گیت کے برابر بھی ادبی مال نہیں ہے۔ بلکہ وہ گرہ ہی نہیں ہے جس میں مال رکھا جاتا ہے۔

وامق صاحب نے زندگی بھر شاعری کرنے کے بعد نثر کی طرف توجہ کی ہے اور "گفتنی ناگفتنی" کے نام سے اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ شاعروں کی نثر اور نثر نگاروں کی شاعری ان کی مزید رسوائی کا باعث ہوتی ہے۔ مگر وامق صاحب نے تو کمال کر دیا ہے، ان کی نثر ان کی شاعری سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر نثر نگار ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی اچھی نثر بننے کے امکانات تھے مگر ردیف، قافیے اور وزن کی پابندیوں نے اس خوبی کو ابھرنے نہ دیا۔ زیر نظر کتاب لکھتے وقت چونکہ وہ ان پابندیوں سے آزاد تھے، اس لیے نثر کا حسن اس طرح ابھرا ہے کہ وہ لکھیں اور پڑھا کرے کوئی۔

انھوں نے اپنی نثر کو بنایا سنوارا نہیں، یعنی بزرگ لکھنے والوں کی تقلید نہیں کی جو بالوں سے بچا ہوا خضاب اپنی تحریروں میں صرف کر دیتے ہیں

بلکہ ایسی سیدھی سادی زبان لکھی ہے جو اپنی سادگی کی وجہ سے پُرکشش بن گئی ہے۔ اس میں پہاڑی ندی کا بہاؤ ہے جس میں اونچ نیچ پائی جاتی ہے۔ یہ اونچ نیچ اسلوب کی وجہ سے نہیں، ان واقعات کی وجہ سے ہے جو اس کتاب میں جمع کیے گئے ہیں اور جن میں سے بعض کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

باریک کتابت میں بڑے سائز میں پونے چار سو صفحات کی اس کتاب کی ضخامت کا مصنف نے یہ جواز پیش کیا ہے "مجھ کو تو یہی مناسب معلوم ہوا کہ جہاں تک حافظہ مساعدت کرے۔ تمام رطب و یابس کو خود نوشت میں اس طرح سمو دیا جائے کہ دانش جویانِ سائنس و ادب کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے" حافظے نے واقعی بڑی مساعدت کی، وہ تو خیریت گزری کہ اس خود نوشت کا ایک حصہ کتاب میں شامل نہیں کیا گیا، ورنہ اس کا امکان تھا کہ قارئین کی قوتِ برداشت مساعدت کرنے سے انکار کر دیتی۔

خود نوشت کا ایک حصہ کتاب میں اس لیے شامل نہیں کیا گیا کہ جب کتاب مکمل ہوگئی تو جناب مصنف کو خیال آیا: حضرت وامق تم تو اب کہیں کے نہ رہے۔ اس کی پریشانی نہ تھی کہ دنیا کیا کہے گی، البتہ اس تصور سے کہ اپنے بچّے اور اعزّائے خاص کیا خیال کریں گے میں شرم سے پانی پانی ہوگیا" جناب کو پانی پانی ہونے سے بچانے کے لیے ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے (جن کی فرمائش پر یہ کتاب لکھی گئی ہے) کتاب کا کچھ حصہ روک لیا۔ جو مولانا ابوالکلام آزاد کی روایت کے مطابق تیس سال بعد چھپے گا۔ مولانا آزاد نے تو بلا وجہ انتظار کرایا تھا تیس برس بعد ان کی کتاب کے جو صفحات منظرِ عام پر آئے ان میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ اگر وہ تیس سال پہلے چھپ جاتے تو قیامت برپا ہو جاتی ۔ بلکہ تیس برس بعد بھی ان صفحات کی اشاعت کی ضرورت نہ تھی۔ مگر وامق صاحب کی کتاب کا جو حصّہ روک کیا گیا ہے وہ یقیناً دلچسپ ہوگا ورنہ مصنف کا شرم سے پانی پانی ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس حصّے کو ایک طویل مدت تک شائع نہ کرنا، ان قارئین کے ساتھ بڑی زیادتی ہے جنھوں نے شائع شدہ حصّے کو پڑھنے کی زحمت اٹھائی ہے اس زحمت کی تلافی کے لیے روکے گئے حصّے کی اشاعت بہت ضروری ہے۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے دیباچے میں اور حضرت وامق نے کتاب کے آخر میں یہ بتایا کہ مصنف کے بچوں کے اصرار پر کتاب کا ایک حصّہ شائع نہیں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ بچوں نے کتاب کا یہ حصّہ پڑھنے کے بعد ہی اصرار کیا ہوگا۔ وامق صاحب کو یہ ڈر تھا کہ شرم سے پانی پانی کر دینے والا حصہ چھپے گا تو بچّے اسے پڑھیں گے، لیکن بچے خاصے سمجھ دار نکلے اور انھوں نے کتاب کے چھپنے سے پہلے پورا مسودہ پڑھ لیا۔ اس صورت میں کتاب میں قطع و برید کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

کاش کتاب کا جو حصّہ رَد کیا گیا ہے وہ شائع کر دیا جاتا اور جو حصّہ شائع ہوا ہے، وہ اگر تیس برس بعد تو کیا تین سو برس بعد بھی شائع ہوتا تو کوئی حرج نہ تھا۔

کتاب کے دیباچے میں وامق صاحب نے اپنے بارے میں فرمایا ہے۔ (۱) امتدادِ زمانہ نے (مجھے) بد دماغی کی حد تک تنگ بنا دیا ہے (۲) مجھ میں بڑا عیب یہ ہے کہ کبھی کبھی بلا سوچے

ہ ایسی بات کہہ جاتا ہوں جو نہ کہنی چاہیے۔ (۳) غیبت سننے اور غیبت کرنے میں مجھ کو بے حد
آتا ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ یہ باتیں مذاق میں لکھی گئی ہیں، لیکن کتاب پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ
ہو سکتا ہے کہ پوری کتاب ہی از راہِ مذاق لکھی گئی ہو، مگر مذکورہ باتیں صد فی صد سنجیدگی
تحریر کی گئی ہیں۔ علی سردار جعفری کے بارے میں اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے اگر صرف
کو پیش نظر رکھا جائے تو وامق صاحب کے مذکورہ بالا ارشادات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

سردار جعفری اور وامق جونپوری میں بظاہر بڑی دوستی ہے، لیکن بباطن معاملہ کچھ اور ہے
س کی وجہ یہ ہے کہ وامق صاحب کو اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ
ردار جعفری نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں کئی ترقی پسند
اعروں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے لیکن ان کا "وغیرہ وغیرہ"
کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ یہی نہیں جب وامق مشاعروں
یں کلام سناتے ہیں تو سردار جعفری اس دوران مسلسل
ہنستے رہتے ہیں۔

س قسم کا ایک واقعہ وامق نے اس طرح بیان کیا ہے:
فراق گورکھپوری میں ایک بہت بڑا عیب یہ تھا کہ جب کوئی شاعر مشاعرے میں اپنا
لام سناتا تو وہ عقب میں بیٹھے بیٹھے سامعین کے روبرو نہایت مضحکہ خیز شکلیں بناتے
ہتے تھے جس سے سامعین کی توجہ کلام سنانے والے شاعر کی طرف سے ہٹ جایا کرتی
ی۔ اب سردار جعفری نے کم و بیش یہی وتیرہ اختیار کیا ہے۔ میں جتنی دیر غزل اور نظم سناتا رہا
ہ کھسیائے ہوئے انداز میں اپنے دانتوں کی نمائش کرتے رہے ۔۔۔۔ سردار کی اس
فیف الحرکاتی پر مجھ کو بے حد افسوس ہوا۔ خود ان کا ضمیر بھی ملامت کر رہا ہوگا۔"

آخری جملہ نامکمل معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ سردار کا ضمیر کس کو
لامت کر رہا ہوگا۔

ایک دوسری جگہ وامق صاحب نے لکھا ہے کہ ترقی پسند تحریک کو سردار جعفری نے
بے حد نقصان پہنچایا ہے، نیز یہ کہ "ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اپنی شاعری
کے متعلق وہ عدم تیقین کا شکار ہیں۔ وہ کسی اچھے شاعر کو ترقی کرتا ہوا اور ادب میں
خاص مقام پیدا کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ فیض اور اقبال کو ایک مدت
تک بڑا شاعر ماننے پر تیار نہیں تھے۔ اقبال کے خلاف ایک طویل مقالہ لئے گھوما
کرتے تھے۔ فیض کے متعلق انھوں نے مجھ سے خود کہا تھا کہ وہ دوئم درجے کے
شاعر ہیں ۔۔۔۔ اپنی بات منوانے پر ان کو بہت ملکہ ہے۔ مغالطوں کے بادشاہ ہیں۔
وہ دوسرے شعرا کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔"
دو بڑے ترقی پسندوں کی باہمی لڑائی میں ہمیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، تاہم

م یہ ضرور عرض کریں گے کہ جو شخص اقبال اور فیض کی عظمت کا منکر ہو، وہ اگر اپنی کتاب ن وامق جونپوری کا ذکر، وغیرہ وغیرہ ” والی فہرست میں کرے تو اسے وامق صاحب کی ظمت کا برملا اعتراف سمجھنا چاہیے۔

اوپر کی سطور میں ہم نے کتاب کے دیباچے کا اقتباس درج کیا ہے جس میں وامق صاحب نے اپنا یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ خود نوشت میں تمام رطب ویابس کو سمو دینا چاہیے یر نظر کتاب اسی نظریے کی عملی تشکیل ہے لیکن اس میں توازن نہیں پایا جاتا، کیونکہ ر طب، کم ہے اور ”یابس“ زیادہ۔ کتاب کا بڑا حصّہ مشاعروں کی بے مزہ تفصیلات ے گرد و غبار میں گم ہے۔ وامق صاحب نے زندگی میں جتنے بھی مشاعروں میں شرکت کی ہے ن میں کتاب کے قارئین کو بھی زبردستی سامعین کے ساتھ بٹھا دیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایک شاعرے میں جو طویل خطبۂ صدارت پڑھا تھا، وہ بھی پورے کا پورا درج کر دیا ہے۔

> ِامق صاحب نے زندگی کا بڑا حصّہ مشاعروں میں اور خاصا حصّہ ان مشاعروں کی روداد لکھنے میں صرف کر دیا۔ خدا کی ی ہوئی اس نعمت، یعنی زندگی کا ایسا مسرفانہ مصرف کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔

ِامق صاحب کو اس کی شکایت ہے کہ انھوں نے شاعری کے میدان میں جو کارنامے انجام دیے ہیں انھیں نقادوں نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے۔ موصوف کی یہ شکایت بجا ہے، اور خوشی کی بات یہ کہ نقادوں کی کوتاہی کا ازالہ انھوں نے خود ہی کر دیا ہے۔ کتاب میں پورا ایک باب اپنی ڈائمنڈ جوبلی کے حوالے سے باندھا ہے۔ اس جشن کے موقع پر جو تقریریں کی گئیں، ان کے اقتباسات درج کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ ”وامق شناسی“ کا دور شروع ہو چکا ہے۔ وامق صاحب نے ڈائمنڈ جوبلی کا حال خاصی تفصیل سے لکھا ہے اور یہ تک بتا دیا ہے کہ اس موقع پر جو کھانا پیش کیا گیا، اس میں بریانی اور رائتہ بے مثال تھے نیز جس فوٹوگرافر نے تصویریں کھینچیں وہ اپنے فن کا استاد تھا۔

۱۹۶۰ء میں وامق صاحب چند دنوں کے لیے پاکستان بھی تشریف لائے تھے۔ یہ ایوب خاں کے مارشل لا کا زمانہ تھا۔ اس سفر کی روداد بہت دلچسپ ہے۔ کاش ہمارے کالم میں اتنی گنجائش ہوتی کہ یہ ساری روداد نقل کی جا سکتی۔ تاہم صہبا لکھنوی سے ملاقات کا واقعہ سنائے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ یہ وامق صاحب کی زبانی سنیے ”صہبا اور افکار اپنے ترقی پسند نظریات کی پاداش میں حکومت کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے عالم یہ تھا کہ کھلے عام صہبا سے ملنا اور بات چیت کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں ٹیکسی سے اتر کر صہبا سے ملنے ان کے دفتر میں چلا گیا۔ ہم لوگ گلے ملے اور باہر نکل کر ٹیکسی سے مل کر کھڑے ہو گئے۔ خیریت و عافیت کے دو چار جملوں کے بعد صہبا نے کہا، اب آپ جائیے۔ باقی سب ٹھیک ہے، انشاء اللہ پھر ملیں گے۔ ہوا ابھی بہت گرم ہے“ جناب وامق کی

سادگی کا بھی جواب نہیں۔ صہبا صاحب نے انھیں جلدی سے اس لیے رخصت کیا کہ کہیں مہمان کی تواضع وغیرہ میں وقت ضائع نہ ہو، ورنہ مارشل لا کے دور کی ہوا تو موصوف کے لیے نہایت ٹھنڈی اور روح پرور تھی کیونکہ وہ "افکار" کا بنیادی جمہوریت نمبر شائع کر چکے تھے جس میں ایوب خاں کی تعریف میں صفحوں کے صفحے سیاہ کیے گئے تھے۔

وامق صاحب کا حافظہ غضب کا ہے۔ انھیں جو کچھ بھی یاد تھا، اسے کاغذ پر منتقل کر دیا، اس کے باوجود انھیں کتاب کی ضخامت میں کمی نظر آئی تو خدا بخش لائبریری پٹنہ کے ایک سیمینار کی روداد کئی صفحوں میں لکھ دی۔ یہ روداد اتنی مفصل ہے کہ اس سے ان اسّی دانشوروں کے نام بھی معلوم ہو جاتے ہیں جنھوں نے اس سیمینار میں شرکت کی تھی۔

وامق صاحب نے اپنا ایک خواب بھی گیارہ صفحوں میں بیان کیا ہے یہ خواب انھوں نے چھ قسطوں میں دیکھا تھا۔ ان قسطوں میں ایسا معنوی تسلسل پایا جاتا ہے جو زیر نظر کتاب میں بھی نہیں ملتا۔

اس خواب میں بیسیوں افراد آتے ہیں، وامق صاحب کو نہ صرف ان افراد سے ہونے والی طویل گفتگو پوری طرح یاد رہی بلکہ یہ بھی حافظے میں محفوظ رہا کہ کس نے کیسے اور کس رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہی نہیں، وامق صاحب نے خواب کی چھٹی قسط کے شروع میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ نیند کا پوری طرح غلبہ ہو جانے کے ایک گھنٹے بعد خواب شروع ہوا۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ پوچھیں کہ وامق صاحب کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ سونے کے کتنی دیر بعد خواب شروع ہوا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ وامق صاحب وقت کی پابندی کے عادی ہیں۔ انھوں نے خواب کے شروع اور ختم ہونے کے اوقات مقرر کر رکھے تھے۔ ●

پروفیسر گیان چند

اُردو کے بزرگ ترین ادیب

ایک دن رام لعل نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں ۸۰ سال سے اوپر کے زندہ ادیبوں کی فہرست بناؤں۔ میں نے حسب ذیل فہرست تیار کی جسے صرف معروف ادیبوں تک محدود رکھا ہے۔ ولادت کی تاریخیں مالک رام کے تذکرۂ ماہ و سال نیز دوسرے ذرائع سے لی ہیں۔ پاکستانی ادیبوں کے بارے میں میرے پاس معتبر معلومات نہیں۔

	ولادت		
آنند نرائن مُلّا	۲۴ اکتوبر ۱۹۰۱ء	اپندر ناتھ اشک	۱۴ دسمبر ۱۹۱۰ء
حجاب امتیاز علی	۱۹۰۳ء	نور الحسن ہاشمی	۲۱ اگست ۱۹۱۱ء
شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی	۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء	پرکاش مونس (میرے بڑے بھائی)	۷ ستمبر ۱۹۱۱ء
پورن سنگھ ہنر	۱۸ دسمبر ۱۹۰۴ء	آلِ احمد سرور	۹ ستمبر ۱۹۱۱ء
محمد عبداللہ قریشی لاہور	۴ اپریل ۱۹۰۵ء	معین احسن جذبی	۲۱ اگست ۱۹۱۲ء
ممتاز مفتی	۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء	رام پرکاش ساحر ہوشیارپوری	۱۰ فروری ۱۹۱۳ء
نوبہار صابر پٹیالوی	یکم نومبر ۱۹۰۷ء	احمد مجتبیٰ وامق جونپوری	۲۳ فروری ۱۹۱۳ء
حیات اللہ انصاری	یکم مئی ۱۹۰۸ء	شہاب الدین دسنوی	۶ جولائی ۱۹۱۳ء
دیویندر ستیارتھی	۲۸ مئی ۱۹۰۸ء	سردار جعفری	۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء
غلام حسن کسری منہاس لاہور	۲۴ دسمبر ۱۹۰۹ء	حمیدہ سلطان احمد	۷ اکتوبر ۱۹۱۳ء
عشرت رحمانی	۱۹ اپریل ۱۹۱۰ء	شہاب سرمدی	۱۸ مارچ ۱۹۱۴ء
تاراچرن رستوگی	۱۹ جون ۱۹۱۰ء	مرزا ادیب لاہور	۴ اپریل ۱۹۱۴ء
ممنون حسن خاں	۱۱ نومبر ۱۹۱۰ء	نسیم حجازی	۱۹ مئی ۱۹۱۴ء

احمد ندیم قاسمی کی تاریخِ ولادت مالک رام نے ۳۰ نومبر ۱۹۱۶ء لکھی ہے جب کہ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، جلد دہم، ص ۵۰۴ پر ۱۹۱۴ء درج ہے

دیگر اداروں کی مطبوعات

ہندوؤں کے تیوہار — بالکشن بترہ ابر

اس کتاب میں اہلِ ہنود کے تمام تیوہار و برت درج ہیں جن سے ہندو قوم کی دھارمک زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔ قیمت ۴۰/ روپے

اردو رسائل (۱۹۹۲ء میں)

۱۹۹۲ء میں اردو میں کون کون سے رسالے شائع ہو رہے ہیں اس مجموعے میں ان رسائل کے سرورق کا عکس مع مشمولات شائع کر دی گئی ہیں اس سے رسالے کے تیور اور طور سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے قیمت ۱۰۰/ روپے

کرنل محبوب احمد

کرنل محبوب! آزاد ہند فوج کے ایسے بہادر نوجوان کا نام ہے جسے ہندستان کی جنگ آزادی میں، نیتاجی سبھاش چندر بوس کی قیادت میں لڑنے کا فخر حاصل رہا۔ آزاد ہندی فوج اور نیتاجی کی معتبر ترین واقعات اس کتاب میں ملیں گے۔ قیمت ۲۵/ روپے

پٹنہ کے کتبے — فصیح الدین بلخی (م ۱۹۶۲ء)

اس کتاب کے اندر جتنے کتبات کی نقلیں پیش کی گئی ہیں ان میں سے بہت سے کتبوں کا اب وجود ہی نہیں رہا۔ تحقیق، جستجو کا اہم کارنامہ۔
قیمت ۵۰/ روپے

چند اہم اخبارات و رسائل — قاضی عبدالودود

یہ اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو قاضی صاحب مرحوم نے وقتاً فوقتاً اردو کے بعض اہم رسائل اور اخبارات کے بارے میں لکھے۔ قیمت ۳۰/ روپے

ہندوؤں کے اوتار — لالہ بالکشن بترہ ابر

بھگوان کے کئی اوتار ہیں لیکن ان میں سے دس مکھیہ ہیں، اس کتاب میں انھیں دس اوتاروں کے مستند حالات درج ہیں۔ قیمت ۲۰/ روپے

جامع الشواہد — مولانا ابوالکلام آزاد، تقدیم مسیح الحسن

اس کتاب کی کہانی گنجلک بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۰۹ء میں کتابی رسالہ کی صورت میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ اس اڈیشن کا ایک نسخہ مولانا آزاد کا اصلاح شدہ ہے۔ اس لیے مرتب نے اصل مطبوعہ متن کے ساتھ اصلاح شدہ متن بھی شائع کر دیا۔
قیمت ۴۰/ روپے

طلسم ہوشربا

طلسم ہوشربا اصلاً سات بلکہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے (جلد ۵ کے دو حصے ہیں) اور دو مزید جلدیں بقیہ طلسم ہوشربا۔ اس طرح کل دس جلدیں ہوتی ہیں۔ خدا بخش لائبریری نے طلسم ہوشربا پر لکھے ہوئے اہم ترین مضامین کا ایک مجموعہ "مقدمہ طلسم ہوشربا" بھی شائع کر دیا ہے۔ اس طرح طلسم ہوشربا کو پڑھنے اور اس کی خوبیوں کو سمجھنے کے لیے ۱۱ جلدیں ہو جاتی ہیں۔

طلسم ہوشربا اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم اوّل، پنجم دوم، ششم، ہفتم۔ فی جلد ۱۰۰/ روپے اور مقدمہ طلسم ہوشربا کی قیمت ۲۰/ روپے ہے۔

مجتبیٰ حسین
۲۰۰۔ انکور اپارٹمنٹس
پٹ پڑ گنج نئی دہلی ۹۲

مزاج پرسی کرنا مشکل فن ہے

بڑا کٹھن ہوتا ہے وہ مرحلہ جب ہمیں کہیں کسی کی مزاج پرسی کرنے کے لیے جانا پڑتا ہے۔ پرسہ دینا اور مزاج پرسی کرنا یہ دو ہی چیزیں ایسی ہیں جن کا گر ہمیں آج تک نہ آیا۔ اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ جوں جوں ہماری عمر میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے ہماری زندگی میں ان دونوں کاموں کی گنجائش کچھ زیادہ ہی نکلتی چلی جارہی ہے۔ یوسفی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ایک زمانہ تھا جب محفلوں میں ہمارا تعارف کچھ اس طرح کرایا جاتا تھا کہ فلاں کے بھانجے ہیں اور فلاں کے بھتیجے ہیں۔ اور اب اس طرح تعارف کرایا جاتا ہے کہ فلاں کے ماموں، فلاں کے چچا اور فلاں کے نانا ہیں" عمر کی یہ وہ منزل ہوتی ہے جب دنیا سے آدمی کے رشتے ناطے ایک ایک کرکے ٹوٹنے لگتے ہیں اور وہ اپنے آپ میں سمٹتا چلا جاتا ہے۔ ادھر ہم جب بھی حیدرآباد جاتے ہیں تو ہمارے دو اہم کام یہی ہوتے ہیں، مزاج پرسی کرنا اور پرسہ دینا۔ پچھلے دنوں ہم حیدرآباد گئے تو چار عدد مزاج پرسیاں (دو تازہ، دو پرانی) اور دو عدد پرسے ہمارا انتظار کررہے تھے۔ سچ پوچھیے تو پرسہ دینے میں ہمیں اتنی دشواری پیش نہیں آتی جتنی کہ کسی کی مزاج پرسی کرنے میں۔ کیونکہ پرسہ دیتے وقت آدمی کو اپنے چہرہ پر جھوٹ موٹ کی جو غمگینی اور کسی حد تک المناکی وغیرہ طاری کرنی پڑتی ہے ویسا چہرہ قدرت نے ہمیں بچپن سے عطا کر رکھا ہے بلکہ اس چہرے کو ساتھ لے کر ہم کسی شادی میں بھی شرکت کے لیے جاتے ہیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم مبارکباد دینے نہیں بلکہ پرسہ دینے آئے ہیں۔ اپنے پیدائشی غمگین چہرے کی وجہ سے پرسے تو ہم آسانی سے نپٹا لیتے ہیں لیکن مزاج پرسی میں ہمیں بڑی تگ و دو اور محنت کرنی پڑتی ہے۔ ہم حیدرآباد پہنچے تو پتا چلا کہ ہمارے دوست ڈاکٹر مغنی تبسم بھی اس بار اپنی مزاج پرسی کروانے کے لیے ہماری آمد کا انتظار کررہے ہیں۔ مغنی تبسم دوستوں کو یہ نادر موقع ذرا کم ہی فراہم کراتے ہیں۔ کچھ دوست ایسے ہیں جن کی مزاج پرسی ہم پچھلے دو تین برسوں سے لگاتار کرتے چلے آرہے ہیں لیکن نہ تو ان کا

مزاج ٹھیک ہوا اور نہ ہی ہمارے انداز مزاج پرسی میں کوئی فرق آیا۔ ایسی مزاج پرسیاں
ب ایک دفتری معمول سا بن گئی ہیں۔ لیکن مغنی تبسم کی مزاج پرسی کرنے کے تصور میں
جو کشش تھی وہ ہمیں سب سے پہلے ان کے پاس لے گئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ مغنی
بسم اپنی تحریروں میں ادیبوں اور شاعروں وغیرہ کی اکثر مزاج پرسی کرتے رہتے
ہیں (اور ایک بار ہماری بھی مزاج پرسی کر چکے ہیں) ہم نے سوچا کیوں نہ ان کی مزاج
پرسی کر کے حساب کو بے باق کر دیں۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ان کے مزاج کو کیا
ہوا ہے۔ صرف اتنا پتا چلا تھا کہ گھر سے باہر نہیں نکل سکتے اور آدمی عموماً دو ہی
صورتوں میں گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ یا تو مقروض ہو یا بیمار ہو۔ ہم نے ان کی مزاج پرسی
کرنے کے معاملہ میں عجلت اس لیے بھی دکھائی کہ کہیں ہمارے جاتے جاتے وہ صحت
یاب ہو کر گھر سے نہ نکل جائیں۔ ہم پہنچے تو اسٹول پر اپنی سیدھی ٹانگ رکھے بیٹھے
تھے۔ اسٹول چونکہ چھوٹا تھا اس لیے اسٹول اور اپنی ٹانگ دونوں کو "ہم رتبہ اور
ہم پلہ" بنانے کے لیے اسٹول کے پایوں کے نیچے جہاں اصولاً دو اینٹیں ہونی چاہیے
تھیں وہاں دو ضخیم سی ڈکشنریاں رکھی ہوئی تھیں (ڈکشنریوں کا ایسا نادر استعمال ہم
نے کہیں نہیں دیکھا۔ پروفیسر ہونے کے یہی تو فائدے ہیں) ہم نے اپنے چہرہ پر مصنوعی
غمگینی طاری کرتے ہوئے گہری تشویش اور تردد کے ساتھ پوچھا۔

"آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

ہمارے آسان سے سوال کا ہاں یا نہیں میں جواب دینے کی بجائے بولے "بھئی! میرا تو
ایک ہی مزاج ہے مگر آپ نے یہ جملہ کہہ کر کہ "آپ کے مزاج کیسے ہیں" بادی النظر
میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرے دس بارہ مزاج اور بھی ہیں۔ بیمار کا
مزاج یا خود مزاج پرسی کرنے والے کا مزاج کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو، اسے کم از کم
زبان کی غلطی تو نہیں کرنی چاہیے۔ پھر آپ تو ادیب ہیں۔ میں تو شدید بخار کی بحرانی
کیفیت میں بھی زبان کی غلطی کرتے یا اسے سننے کا روادار نہیں ہوں"

ہم نے کہا "مغنی تبسم! آپ بھی حد کرتے ہیں۔ آپ کی جان پر بن آئی ہے اور آپ صرف
و نحو کے چکر میں پڑے ہیں"

بولے "کس نے کہا کہ میری جان پر بن آئی ہے۔ بھلا چنگا ہوں۔ صرف ایک ٹانگ
میں درد ہے۔ اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ٹانگ میرے سالم مزاج کا حصہ ہے تو یہ سراسر
غلطی ہے۔ یوں بھی ہم جیسوں کے لیے ٹانگوں کا جسم سے جڑے رہنا اتنا ضروری بھی
نہیں ہے۔ ہمیں کون سا رکشا چلانا ہے یا لکڑیاں توڑنی ہیں۔ ادب میں صرف باتیں
بنانا ہے۔ سو وہ ٹانگوں کی مدد کے بغیر بھی اچھی بن جاتی ہیں"

ان کی باتوں کو سن کر ہم اپنے چہرہ پر سے غمگینی کے آثار کو ہٹانے کی دانستہ کوشش
کرنے لگے تو کسی قدر تشویش کے ساتھ ہمارے چہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے

"یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ دو مہینوں بعد آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ آپ کی آنکھوں کے نیچے جو حلقے ہیں وہ اتنے سیاہ کیوں ہو گئے ہیں؟ آخر آپ کی صحت کو کیا ہوتا جا رہا ہے"
ہم نے کہا "ادھر مہینہ بھر سے کھل کر بھوک نہیں لگتی۔ راتوں کو نیند بھی ٹھیک سے نہیں آتی"
پوچھا "کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کیا؟"
عرض کیا "ادب کے ڈاکٹروں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ طب کے ڈاکٹروں کے پاس جانے کا وقت کہاں سے لاؤں گا"
بولے "یہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیے۔ یوں بھی اردو ادب میں اب نئے ادیبوں کے آنے کا سلسلہ ختم ہوتا جا رہا ہے البتہ جو ادیب پہلے سے موجود ہیں ان کے جانے کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ آپ پر احتیاط لازم ہے۔ اردو ادب کو آپ سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں"
ہم نے کہا "یہ اردو ادب کی سراسر ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی ہے کہ اب بھی ہم سے امیدیں وابستہ کیے بیٹھا ہے۔ ساٹھ برس کے ہونے جا رہے ہیں۔ آخر کب تک ہم سے امیدیں وابستہ کی جائیں گی"
بولے "اردو ادب کے لیے آپ ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔ آپ کی صحت کا یہ حال کب سے ہے؟"

اس جملہ سے ہم نے اندازہ لگایا کہ مغنی تبسم بڑی چالاکی کے ساتھ ہم سے اپنی مزاج پرسی کروانے کے بجائے خود ہماری مزاج پرسی کرنے پر اتر آئے ہیں لہٰذا ہم نے ان کی نیت کو تاڑ کر کہا "اپنی مزاج پرسی کو آپ صرف ادب تک ہی محدود رکھیں تو اچھا ہے۔ ہمارے طبی مزاج کے بارے میں پرسش کرنے کا ہم نے آج تک کسی کو اختیار نہیں دیا" یہ کہہ کر ہم وہاں سے خالی ہاتھ واپس آگئے اور یوں مغنی تبسم کی مزاج پرسی کرنے کا جو ایک نادر موقع ہاتھ آیا تھا وہ بھی جاتا رہا۔

جو لوگ مثالی صحت رکھتے ہیں ان کے دکھ درد کو بھلا کوئی کیا جانے۔ خود ہماری مثال لیجیے کہ آج تک کسی اسپتال میں کسی بھی مرض کے علاج کے لیے شریک نہیں ہوئے۔ لعنت ہے ایسی صحت پر۔ ہمارے کیسے کیسے دوست ہیں جو اسپتال میں مختلف بیماریوں کے بہانے بیسیوں بار شریک ہو کر نازک اندام نرسوں سے اپنی نبضیں پکڑوا چکے ہیں۔ اور ایک ہماری منحوس نبض ہے کہ اگر اسے کسی نے زکام اور نزلہ کی آڑ میں پکڑا بھی تو کس نے؟ ڈاکٹر سید عبدالمنان، ڈاکٹر رام پرشاد، اور ڈاکٹر شاہد علی خاں نے۔ افسوس ہوتا ہے کہ ہم تو دوستوں کی مزاج پرسی کرنے کے لیے بھاگے پھرتے ہیں اور کوئی ہماری مزاج پرسی کرنے

کے لیے نہیں آتا۔ پھر ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو مزاج پرسی کروانے کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین تصور کرتے ہیں۔ اس وقت ہمیں اپنے ایک دوست کی یاد آگئی جو سیاسی حلقوں میں بھی خاصی شہرت اور اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک بار وہ بیمار پڑ کر اسپتال میں شریک ہوئے۔ روزانہ سیکڑوں لوگ گلدستے، پھل وغیرہ لے کر ان کی مزاج پرسی کو آتے رہے۔ مزاج پرسی کرنے والوں کی باضابطہ فہرست مرتب ہوتی تھی اور دوسرے دن اخباروں میں ان کے نام یوں شائع ہوتے تھے جیسے یہ مزاج پرسی نہ کرتے تو ہمارے دوست کا زندہ رہنا محال تھا۔ ایک دن یہ مژدہ جانفزا بھی آیا کہ خود وزیر اعظم ہندستان ان کی مزاج پرسی کے لیے قدم رنجہ فرمانا چاہتے ہیں۔ خوشی کے مارے ہمارے دوست کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ لیکن بُرا ہو ڈاکٹروں کا کہ انھوں نے اسی دن انھیں اسپتال سے ڈسچارج کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارے دوست ایک ایک ڈاکٹر کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر منت سماجت کرتے رہے کہ مجھے مزید دو دنوں تک اسپتال میں ہی رہنے دیا جائے۔ علاج نہ کرنے کی جتنی بھی فیس ہو سکتی ہے وہ مجھ سے وصول کر لی جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وزیر اعظم میری مزاج پرسی نہ کریں اور میں یونہی مفت میں صحت یاب ہو جاؤں۔ مگر اسپتال کے ارباب اختیار کا کہنا تھا کہ وزیر اعظم کے آنے کی صورت میں انھیں سارے اسپتال کی صفائی وغیرہ کا بندوبست کرنا پڑے گا یہ اخراجات کون کرے گا۔ اور آپ حیرت کریں گے کہ ہمارے دوست نے از راہ مزاج پرسی ان اخراجات کا بوجھ بھی خوشی خوشی برداشت کیا۔ جتن کیا نہ کرتا مگر شومئی قسمت دیکھیے کہ وزیر اعظم کسی ایمرجنسی میں ایسے اُلجھے کہ ہمارے دوست کی مزاج پرسی کرنے کے لیے نہ آسکے۔ بالآخر نائب صدر جمہوریہ کی جانب سے ان کی مزاج پرسی کرنے کی صورت میں ان کے صحت یاب ہو جانے کا سودا طے کرایا گیا۔ تب کہیں جا کر وہ اسپتال سے نکلے (نکلے نہیں بلکہ نکالے گئے) مگر اب بھی ہم جیسوں سے نازدارانہ انداز میں کہتے ہیں "تم دیکھ لینا ایک دن میں وزیر اعظم سے اپنی مزاج پرسی کروا کے چھوڑوں گا۔ وزیر اعظم مزاج پرسی نہ کریں تو خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اور تم جانتے ہو کہ میں کوئی کام کرنے کا بیڑہ اٹھا لیتا ہوں تو اسے پورا کر کے رہتا ہوں"

معروف چودھری
۴۲، ذاکر باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

انشائیہ

فریبِ فرار

یہ کیسی عمارت ہے جس میں مُتنگ مُتنگ سے میں قید ہوں۔ لگاتار جستجو میں ہوں کہ کوئی دروازہ کوئی کھڑکی یا کوئی شگاف نظر آجائے۔ ہر طرف ایک سی دیوار۔ بدرنگ، کریہ اور بھیانک دیوار جو مجھے گھیرے ہوتے ہے۔ فرش پر جگہ جگہ میرے اپنے خون کے دھبے۔ دیواروں پر جگہ جگہ میرے اپنے خون کے چھینٹے۔ چھت ..... مگر چھت تو آج تک نظر ہی نہیں آئی معلوم نہیں ہے بھی کہ نہیں اور اگر ہے تو میری حدِ نظر سے پرے۔ کاش میں یاجوج ماجوج ہوتا دیوار تو خیر کیا چاٹ کر ختم کرتا ہاں ایک کام ضرور مل جاتا۔ دیوار کے گھٹنے بڑھنے سے دن اور رات کا اندازہ تو ہوتا۔ ارجن کا بیٹا ابھیمنیو ہی ہوتا تو ماں کے پیٹ سے اس چکرویو کو توڑنے کا طریقہ سیکھ آیا ہوتا مگر میں معمولی اوسط درجے کے خاندان کا فرد جس کے باپ نے ماں کو کوئی گُر کی بات اگر بتائی بھی ہوگی تو گھریلو معاشیات کا کوئی نسخہ ہوگا.... تو پھر میں کیا کروں؟..... خودکشی...؟ مگر اس کا کیا ثبوت کہ میں زندہ ہوں بھی ممکن ہے مر ہی چکا ہوں اور یہ میری قبر ہو..... مگر میں مردہ کیسے ہوسکتا ہوں؟ وہ سامنے خون کا دھبہ بالکل تر و تازہ ہے۔ میرا سر درد کی لہروں پہ تیر رہا ہے۔ نہیں نہیں میں زندہ ہوں۔

میں پھر کسی شگاف کی جستجو میں دیوار اور فرش کی جانچ شروع کر دیتا ہوں۔ اپنے کام میں اتنا منہمک ہوں کہ کسی اور بات کا احساس تک نہیں۔ اب سناٹا ہے کہ کان کے پردے پھٹ رہے ہیں۔ نظر میں سپاٹ دیوار کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ کبھی کبھار خواب کی صورت نظروں میں ایک دروازہ لہرا اٹھتا ہے۔ میں لپکتا ہوں اور دیوار پر ایک تازہ خون کا دھبہ چھوڑ کر فرش پر ڈھیر ہو جاتا ہوں ..... مگر یہ کیا؟ ایسا تو کبھی نہیں ہوا؟ کیا یہ بھی دھوکا ہے؟ محض سراب؟ سامنے فرش پر نیچے جاتا ہوا زینہ نظر آرہا ہے۔ ہیلوسنیشن ہی سہی مگر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟ ارے یہ تو واقعی زینہ ہے۔ نہ تو ٹھوکر لگی نہ سر پھٹا اور میں ایک زینہ نیچے اتر بھی آیا۔ ڈرتے ڈرتے دوسرے زینے پر قدم رکھتا ہوں۔ ٹھوس زینہ۔ دل بلّیوں اچھل رہا ہے۔ جلدی جلدی تمام زینے طے کر کے ایک دروازے کے سامنے کھڑا ہوں۔ دور دور تک ہرا بھرا میدان۔ آنکھیں عادی نہ ہونے کے باوجود بھی سکون محسوس کرتی ہیں۔

تھوڑا دم لے لوں۔ ہوا کتنی صاف ستھری ہے۔ دھیرے دھیرے انگ انگ میں تازگی اتر رہی ہے۔

"بابوجی"

کوئی مجھ سے مخاطب ہے؟ یعنی میں بہرہ نہیں ہوں۔ مگر آواز کدھر سے آئی۔ ذرا باہر نکل کر دیکھوں تو۔

باہر پہلا قدم۔

سامنے ایک بوڑھا ایک لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا بڑی ملتجی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔

"بابوجی"

"بابا کچھ مجھ سے کہہ رہے ہو؟"

"ہاں بابوجی۔ دیکھیے نا بابوجی میرے بچے کے ہاتھ دیکھیے۔ اس کی ساری انگلیاں کچل دی گئی ہیں"

میری نظر لڑکے کے ہاتھ پر پڑتی ہے۔ پہلا خیال آتا ہے کہ بھاگ کر اندر سے دروازہ بند کرلوں۔ کس قدر بھیانک منظر ہے۔ ناخن ادھڑے ہوتے ہیں، پھٹے ہوئے گوشت کے ٹکڑے لٹک رہے ہیں۔ خون آہستہ آہستہ رس کر زمین پر گر رہا ہے۔ لڑکے کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں۔ "سپاٹ"...... بالکل اندر کی دیوار کی طرح۔ میں لرز جاتا ہوں۔

"مگر یہ کیسے؟" میری آواز میلوں کا فاصلہ طے کرتی ہوئی میرے کانوں سے ٹکراتی ہے۔

"مالک نے سزا دی ہے"

"سزا دی ہے؟ مگر کیوں؟"

"یہ بدبخت یہاں کی ریت و رواج بھول کر ایک گرے ہوئے شخص کو اُٹھا رہا تھا"

"مگر اس میں جرم کیا ہے؟"

"بہت بڑا جرم ہے بابوجی مالک اسے اچھا نہیں سمجھتا"

"یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی۔ مالک اسے اچھا کیوں نہیں سمجھتا؟"

"مالک اسے اچھا نہیں سمجھتا کیا یہ وجہ کم ہے؟ بابوجی آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں"

"چلو میں تمہارے مالک سے ملوں گا"

"بابوجی چلیے پہلے مالک کے کارندے سے مل لیجیے۔ اس سے ملے بغیر مالک سے ملنا ممکن نہ ہوگا"

بوڑھا بڑبڑاتا لڑکھڑاتا تیز تیز قدموں سے ایک طرف لپکتا ہے۔ میں بھی چلتا ہوں۔ لڑکا نارمل چال چلتا ہوا ہمارے آگے آگے ہے۔ چہرہ بالکل سپاٹ بالکل دیوار... میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا دیوار کا خیال پیچھا نہیں چھوڑے گا؟ تھوڑی دور چلنے پر ایک شخص سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ پوچھتا ہے۔

"یہ میرا آدمی کون ہے؟" نہایت ملائم اور مہذب آواز۔ لاحول ولا قوۃ میں تو سمجھا تھا کہ یہ شخص یقیناً بہت ظالم ہوگا۔ کرخت آواز ہوگی۔ بے ہودہ لہجہ ہوگا۔ مگر یہ شائستہ آواز، میری ہمت بندھتی ہے۔

"جی یہ میں ہوں"

"میں کون؟"

نام؟ ارے واقعی میرا نام کیا ہے؟ اب میں کیا بتاؤں؟ بڑی الجھن میں ہوں۔

"تشریف رکھیے" میں ادھیڑ بن سے چھٹی پا جاتا ہوں۔

"نام جانے دیجیے کام بتایئے"

"جی۔ وہ دیکھیے ۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ یہ تو ظلم ہے۔ دیکھیے لڑکے کے ہاتھ دیکھیے ساری انگلیاں کچل دی گئیں۔ یہ تو زیادتی ہے۔ خدا کے لیے کچھ کیجیے۔ آپ ۔۔۔۔ آپ تو بہت کچھ کر سکتے ہیں"

"ابھی لیجیے"

میں دل ہی دل میں اس کی رحم دلی کا قائل ہو جاتا ہوں۔ کون کہتا ہے دنیا بُری جگہ ہے اگر ایک بھی انسان مظلوم کی آواز سننے کو تیار ہے تو دنیا بری جگہ نہیں ہو سکتی۔ گھنٹی کی آواز میرے خیال کا تسلسل توڑ دیتی ہے۔

ایک انتہائی سنجیدہ آدمی بڑی دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں کچھ اوزار ہیں۔ اب یہ لڑکے کے ہاتھ کی مرہم پٹی کرے گا۔

"زبان نکالو"

میں چونک پڑتا ہوں۔ ابھی ہاتھ کی انگلیوں اور زبان کے تعلق پر غور ہی کر رہا ہوں کہ "چھک" کی آواز آتی ہے اور لڑکے کی زبان کٹ کر زمین پر گر پڑتی ہے۔ لڑکا اور بوڑھا جھک کر سلام کرتے ہیں اور تیزی سے باہر چلے جاتے ہیں۔۔۔ مجھے جب ہوش آتا ہے تو میں ایک پگڈنڈی پر بھاگ رہا ہوں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں۔ بھاگتے بھاگتے ایک عالیشان مکان کے دروازے میں گھس جاتا ہوں۔

"آپ کون ہیں" چوکیدار پوچھتا ہے۔

"یہاں کا مالک کون ہے، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں، میں اس کے سوال کو نظر انداز کر جاتا ہوں"

"کیا کام ہے" وہ پوچھتا ہے۔

"تم کو معلوم ہے کھیتوں کے اس پار بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ ظلم سمجھتے ہو؟ انیائے ۔۔۔ پاپ گھور پاپ"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔ خیر۔ سامنے باغ کے درمیان نہر ہے۔ مالک وہیں ملے گا"

میں اُدھر ہی چل پڑتا ہوں۔ ہر طرف خاموشی ہے مگر ہر چیز سلیقے سے ہے۔ فصلیں بہت اچھی ہیں۔ باغ پھلوں سے لدا پڑا ہے۔ لگتا ہے یہاں کا کام کاج بہت محنتی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ سامنے نہر نظر آتی ہے۔ اچانک ذہن کو پھر ایک جھٹکا لگتا ہے۔ ایک لحیم شحیم آدمی سے زنجیروں میں جکڑا ہوا گھسٹتا ہوا چل رہا ہے۔ میں لپکتا ہوں کہ اس کی مدد کروں۔ وہ شخص مجھے دیکھ کر مسکرانے لگتا ہے۔

"کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں" میں پوچھتا ہوں۔

"شائد نہیں مگر میں ضرور آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ بولیے" وہ کہتا ہے۔

"میں یہاں کے مالک سے ملنا چاہتا ہوں"

"تو پھر بولیے نا مالک میں ہی ہوں"

کیا یہ سچ بول رہا ہے۔ بھلا یہ مالک کیسے ہو سکتا ہے۔ جھوٹا کہیں کا۔

"بکواس بند کرو۔ تم مالک کا پتا بتاؤ میں صرف اس سے بات کروں گا۔ میرا وقت خراب مت کرو۔ تم ہی سوچو تم مالک کیسے ہو سکتے ہو؟"

وہ آدمی مسکراتا ہے۔ پھر ہنس پڑتا ہے۔ ایک ہاتھ آزاد کر کے چٹکی بجاتا ہے۔ ایک خوبصورت اور تندرست نوجوان سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ دلکش خدوخال، بانکا جسم مگر چہرہ بالکل سپاٹ دیوار کی۔۔۔۔ مجھے جھرجھری آتی ہے۔ میں ابھی کچھ سوچ بھی نہیں پاتا کہ زنجیروں میں جکڑا آدمی ہاتھ بغل میں لے جاتا ہے اور پھر

"ٹھائیں"

میں چونک اٹھتا ہوں۔ خوبصورت نوجوان کے دل میں سوراخ ہو چکا ہے۔ تازہ تازہ خون کا فوارہ اُبل رہا ہے۔

"بس مالک ہوں بولو کیا کام ہے" بھاگتے بھاگتے یہ آواز سنتا ہوں۔ بے تحاشا ایک طرف بھاگ پڑتا ہوں۔ بہت دیر تک دوڑتے رہنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ ایک دیوار کے کنارے کنارے بھاگ رہا ہوں۔ اچانک سامنے ایک بہت بڑا پھاٹک نظر آتا ہے۔ میں تیزی سے باہر نکل کر ڈھیر ہو جاتا ہوں۔ بے ہوش ہونے سے پہلے دیکھتا ہوں کہ پھاٹک بند ہو رہا ہے۔

پتا نہیں کتنی دیر کے بعد ہوش میں آتا ہوں۔ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتا ہوں۔ دروازے پر نام کی تختی لگی ہوئی ہے۔ گھسٹتا ہوا قریب جاتا ہوں اور تختی کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

"میرے خدا! یہ تو میرے اپنے نام کی تختی ہے" مجھے اپنا نام یاد آجاتا ہے۔

میں اب سوچ رہا ہوں کہ گھر سے بھاگ کر باہر آیا ہوں یا باہر سے بھاگ کر گھر میں۔

ڈاکٹر مظہر حسین
سنٹر آف انڈین لینگویجز، اسکول آف لینگویجز
جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی ۶۷

سرسیّد احمد خاں

مسلم معاشرے کی اصلاح کا خاکہ

سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء) کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ انھوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح کی خاطر جو پیمانہ اختیار کیا تھا وہ مغربی تھا۔ یعنی وہ مغربی اقدار کی بنیاد پر مسلم معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور مغربی اقدار سے مسلم معاشرے کے تمام شعبوں کو ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی تحریروں کے مطالعے سے اس خیال کی کوئی توثیق نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے برعکس انھوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح کا پیمانہ اسلامی شرع کو قرار دیا تھا۔ اس مضمون میں بنیادی طور پر اسی امر پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس مضمون میں ان امور کا مختصراً احاطہ کیا گیا ہے کہ سرسیّد کے ہاں مسلمانوں کی پسماندگی کا کیا تصوّر تھا اور وہ ان کی ترقی کے لیے کس نہج پر ان کی اصلاح کرنا چاہتے تھے، ان کے نزدیک مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی پسماندگی کے کیا اسباب تھے، وہ مسلم معاشرے کے کن شعبوں میں اصلاح کرنا چاہتے تھے اور انھوں نے مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی اصلاح کا کیا پیمانہ وضع کیا تھا۔

یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا سرسیّد کو مسلم معاشرے کے رسم و رواج اور تہذیب کی پستی کا احساس ہندستان پر انگریزوں کے مکمل سیاسی تسلط کے بعد ہوا یا یہ کہ یہ احساس ان کے ہاں پہلے سے موجود تھا۔ تاہم اس کا واضح اظہار ان کے ہاں ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور مغل حکومت کے خاتمے کے بعد ہی ہوا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان کے اندر مسلمانوں کی تہذیبی معاشی پستی کا احساس ۱۸۵۷ء سے قبل بیدار ہو چکا تھا۔ تب بھی انھوں نے اس وقت تک اس کی اصلاح کے لیے شاید کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی تہذیب کے ساتھ سرسید کے ربط سے ان کے ہاں یہ شعور پیدا ہوا کہ وہ زوال آمادہ ہندستانی سماج اور ترقی یافتہ مغربی معاشرہ کے درمیان موجود تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی فرق کو سمجھ سکیں۔ اسی شعور نے ان کے ہاں خصوصاً ہندستانی مسلم معاشرے میں رائج رسم و رواج اور تہذیب کی پستی کا احساس پیدا کیا۔ یہ احساس اس قدر شدید تھا کہ انھوں نے ہندستانیوں

کی تہذیب و معاشرت سے متعلق برطانوی سامراجی تنقید کو آسانی سے قبول کرلیا[۵] انھوں نے اپنے انگلینڈ کے قیام کے دوران وہاں کی تہذیبی، سماجی اور معاشی ترقی کو دیکھا اور اس سے ہندستان کے مسلمانوں کی حالت کا موازنہ کیا تو انھیں اس بات کا احساس شدت کے ساتھ ہوا کہ مجموعی طور پر ہندستان کے مسلمانوں کی حالت دن بہ دن ابتر ہوتی جارہی ہے۔ اس صورت حال پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے وہ انگلینڈ ہی سے محسن الملک (۱۸۳۷ء-۱۹۰۷ء) کو لکھتے ہیں کہ افسوس کہ مسلمان ہندستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں ۔۔۔ ہائے افسوس! ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے مونہہ میں ہاتھ دیتے ہیں ۔۔۔ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے"[۶]

سرسید جب انگلینڈ میں تھے تب ہی ہندستان کے مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی اصلاح کی غرض سے ان کے ذہن میں ایک رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ انگلینڈ سے واپس آنے کے فوراً ہی بعد انھوں نے ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو اس رسالے کا اجرا کیا جس کا بنیادی مقصد ان کے نزدیک 'ہندستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب' کرنا تھا تاکہ دنیا کی مہذب قومیں انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھنا بند کردیں اور وہ بھی دنیا میں معزز اور مہذب قوم کہلاسکیں[۷]۔ تہذیب سے سرسید کی کیا مراد تھی؟ ان کے ہاں تہذیب کا کیا تصور تھا؟ اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

> اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت، تمدن اور طریق تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلا درجہ کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا، جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکن اور وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے[۸]۔

تہذیب کی اس تعریف کے دائرے میں گویا سرسید نے انسانی معاشرے کے تمام امور کو سمیٹ لیا۔ اس سے اس بات کا اندازہ بھی آسانی سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ سامراجی صورت حال میں ہندستانی مسلمانوں کو کس قسم کی تہذیب سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ سرسید کی تعریف کے آخری حصے کو ذہن میں رکھیے جہاں وہ تہذیب کو وحشی پن اور انسانیت کے درمیان ایک خط فاصل قرار دیتے ہیں۔ یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ سرسید کے ذہن میں ہندستانی عوام کے بارے میں برطانوی سامراجی حکمرانوں کی تنقیدیں تھیں۔ یہ حکمران ہندستانی عوام کو وحشی خیال کرتے تھے۔ جب سرسید انگلینڈ گئے اور وہاں کی ترقی یافتہ تہذیب و معاشرت کو دیکھا تو انھیں ہندستانی عوام کے بارے میں برطانوی تنقید صحیح معلوم ہونے لگی۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ سرسید ہندستانی مسلمانوں کو تہذیب، شائستگی، انسانیت اور علوم و فنون کی اس اعلا اور ترقی یافتہ سطح پر لے جانا چاہتے تھے جس کا نمونہ اس وقت برطانوی قوم تھا۔

سرسید کے نزدیک مسلمانوں کا دنیوی رسم و رواج کو دینی معاملات میں شامل کرلینا اور وقت کے دھارے اور اس کی رفتار سے ان کی بے خبری، ان کی تہذیبی پسماندگی کی سب سے اہم وجہ ہے، جس کا اطلاق دنیا کی ان تمام قوموں پر ہوتا ہے جو ایک زمانے میں عروج پر تھیں اور بعد میں زوال آمادہ ہوگئیں۔ ان کے خیال میں دینی احکام اور دنیوی معاملات کی نوعیت الگ ہے۔ دینی امور کا تعلق 'روحانی اخلاق اور روحانی تہذیب' سے ہے جس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے برعکس دنیوی مسائل اور تہذیب و تمدن ہر وقت تغیر پذیر ہیں اس لیے ان کو دینی امور میں شامل کرنا تنزل کا موجب ہو سکتا ہے۔ اس طرح انھوں نے دین اور دنیا دونوں کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنے کا مشورہ دیا۔ سرسید نے افسوس ظاہر کیا کہ 'دنیا آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور ہم اسی پرانی لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں اور ذلت و ادبار کو پہنچتے ہیں'[۵] اس لیے انھوں نے اس پر زور دیا کہ زمانے میں ترقی کے ساتھ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ روایتی رسم و رواج اور طور طریقے کو ترک کریں اور ترقی یافتہ قوموں کے رسوم اور عادات و اطوار اختیار کریں[۶]

مسلمانوں کا اپنی فطری صلاحیتوں اور قوتوں کا استعمال نہ کرنا اور روایتی اور فرسودہ رسوم کا پابند ہونا سرسید کے نزدیک مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی پسماندگی کی دوسری وجہ ہے انھوں نے کہا کہ جس معاشرے کی تہذیب دقیانوسی روایات اور پرانے رسم و رواج کی پابند ہوگی وہاں انسان اپنی فطری صلاحیتوں کو نہ بروئے کار لا سکتا ہے اور نہ انھیں فروغ ہی دے سکتا ہے۔ بلکہ ایسی صورت میں اس کے برعکس تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ انھی فطری صلاحیتوں اور قوتوں کے ذریعے اخلاقی اور تہذیبی حسن و قبح میں امتیاز کیا جاتا ہے اور انسان کی عقلی اور علمی استعداد کو فروغ حاصل ہوتا ہے[۷] ان کے خیال کے مطابق ترقی اور تنزل دونوں ایک تاریخی منطق کے تابع ہیں اور جو قوم اور معاشرہ تاریخ کے ارتقا کے عمل کا ساتھ دینے کے بجائے اس کو روکنا چاہتا ہے اس کے لیے زوال ناگزیر ہے۔ ان کا یقین تھا کہ ان کے عہد میں مسلمان بھی اسی حالت کو پہنچ چکے تھے[۸]

سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی پسماندگی کی ایک اور وجہ ان کا وہ تعصب بھی ہے جس کے وہ بری طرح شکار رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اس تعصب کے سبب مسلمان قدیم روایات اور رسم و رواج کے بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں اور مہذب قوموں کے رسم و رواج کو اپنانے کے معاملے میں منفی رویہ اختیار کرتے رہے ہیں۔ سرسید کا خیال ہے کہ ہندستان کے مسلمان تعصب کی وجہ سے بے شمار دنیوی فوائد سے محروم اور ذلت و خواری اور بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جب تک وہ تعصب ترک نہیں کرتے وہ دنیوی فوائد سے محروم رہیں گے۔ سرسید کی رائے ہے کہ مذہب تعصب کی تعلیم نہیں دیتا ہے[۹]

سرسید نے ہندستانی مسلمانوں کی تہذیبی پستی کے جن اسباب کی نشان دہی کی اس کا مقصد مسلم ذہنیت اور رجحانات سے خود مسلمانوں کو واقف کرانا ہے جو اُن کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے فروغ کی راہ میں حائل ہیں۔

مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی اصلاح کرنے کی جستجو نے سرسید کو دنیا کی مختلف قوموں کی تہذیبوں کی تاریخ کے مطالعے کی طرف بھی مائل کیا۔ انھوں نے اپنے اس مطالعے کی روشنی میں تہذیب و تمدن کے ارتقا میں کلیدی رول ادا کرنے والے لوازم سے بحث کی۔ اس عمل میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ایک قوم کا اپنی معاشرتی اور تہذیبی ترقی کے لیے دوسری قوم کی تہذیب و معاشرت سے اشتراک عمل ضروری ہے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اس میں جمود طاری ہو جائے گا اور ترقی کی رفتار رک جائے گی[۱۰]

معاشرتی اور تہذیبی ترقی کے مفہوم اور نکات سمجھنے اور سمجھانے کی ساری کوششیں سرسید کے لیے محض علمی نہیں ہیں بلکہ ان کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی معاشرتی اور تہذیبی ترقی کی راہ ہموار کرنا اور اس راہ کو اختیار کرنے کے لیے مسلمانوں کے اذہان کو تیار کرنا ہے۔

سرسید کا خیال تھا کہ کسی مخصوص سماج کی تہذیبی ترقی یا تنزل، اس معاشرے کے علوم و فنون، اخلاق و عادات، معاشرت و تمدن، ملک و دولت اور جاہ و حشمت کا اشاریہ ہوتا ہے جس سے اس سماج کی مجموعی صورت حال اور اس کی ترقی یا تنزل کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے سرسید کے نزدیک تہذیب ایک مخصوص معاشرے کی مجموعی ترقی کی پیداوار ہے۔ یعنی ایک معاشرہ جس قدر ترقی یافتہ ہوگا اس کی تہذیب بھی اسی قدر ترقی یافتہ ہوگی اور اگر معاشرہ زوال آمادہ ہوگا تو اس کی تہذیب بھی زوال آمادہ ہوگی۔ تہذیب و معاشرے کے رشتے سے متعلق سرسید کی یہ تاویل خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ سرسید کا یہی وہ بنیادی اصول تھا جس نے ان کو زوال آمادہ مسلم معاشرتی زندگی کی اصلاح اور اس کے ذریعے مسلم معاشرے کی پسماندہ تہذیب کی اصلاح کی طرف راغب کیا۔ اس کے متعلق انھوں نے کہا کہ وہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کو اعلیٰ درجے کی تہذیب سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان سے زیادہ تہذیب یافتہ قومیں ان کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں[۱۱]

سرسید نے مسلمانوں کی توجہ ان کی معاشرتی زندگی اور تہذیب کے ان شعبوں کی طرف مبذول کرائی جو ان کے نزدیک اصلاح کے متقاضی تھے۔ انھوں نے جس قسم کی معاشرتی اور تہذیبی تبدیلی اور اصلاح کا خاکہ اپنے ذہن میں مرتب کیا تھا اسے ذیل میں مختصراً پیش کیا جاتا ہے ۱۔ شادی اور غمی کی رسوم سے ہندو اثرات کا اخراج ۲ اکل و شرب میں مغربی طور طریقے کا برتاؤ ۳ مہذب قوموں کی طرح طرز لباس میں درستی ۴ ترک تقلید

اور آزادانہ غور وفکر، شادی بیاہ اور دیگر مواقع پر فضول خرچی کی روک تھام، خود غرضی کی جگہ مسلمانوں میں قومی جذبے کی بیداری، مسلمان کسانوں کے درمیان جدید تکنیک کے ذریعے زراعت کا فروغ، مسلمان کے درمیان تجارت کی توسیع، جدید مغربی تکنالوجی کا استعمال، مغربی سائنس اور علوم وفنون پر مبنی اعلا دنیوی تعلیم کے ساتھ علوم دینی کا حصول، مذہب سے توہمات کا اخراج، قرآن اور حدیث کی روح کے مطابق مذہبی عقائد کی درستی، اور مذہبی احکام کی تحقیق وتدوین [۱۲]

سرسید نے مسلم معاشرتی زندگی اور تہذیب کے تمام شعبوں کو اپنی اصلاح کے دائرے میں لے لیا۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلم معاشرے کے تمام شعبوں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور ایک ترقی یافتہ تہذیب اور معاشرت کی تعمیر کے متمنی تھے۔

سرسید نے تہذیب ومعاشرت کے جن قابل اصلاح امور کی نشاندہی کی، ان میں اصلاح کرنے سے قبل انھوں نے ایک پیمانہ وضع کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ سب سے پہلے اپنے ذہن سے تعصبات نکال کر اپنی اور دوسری قوموں کی تہذیب ومعاشرت کی تشخیص اور ان کے اچھے اور برے عناصر کی نشاندہی کریں۔ سرسید کے اس مشورے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنی اور دوسری قوموں کی تہذیب ومعاشرت کے حسن وقبح سے باخبر ہونے کے بعد اپنی قوم کے اچھے عناصر پر برقرار رہتے ہوئے دوسری قوموں کے اچھے عناصر کو بھی 'بلا تعصب اختیار کریں، اپنی قوم کے برے عناصر کو ترک کریں اور دوسری قوموں کے برے عناصر سے بھی بچتے رہیں [۱۳] کیوں کہ سرسید کا خیال تھا کہ ان امور میں کورانہ تقلید کرنے سے انسان کی فطری صلاحیتیں اور قوتیں زائل اور ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے انسان کو نہایت ہی وسیع مرتبہ دیا اور کہا کہ اس کا کام تقلید کرنا نہیں بلکہ قوت ایجاد سے کام لے کر ترقی کرنا ہے کیوں کہ انسان کے لیے عقل وشعور اور قوت ایجاد سے کام لینا بالکل فطری ہے [۱۴]

سرسید کا خیال تھا کہ مسلم معاشرت اور تہذیب میں تقلید کی وجہ سے ایجاد وجدت کی قوت زائل اور ترقی کی راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ اس لیے اس جاں بہ لب تہذیب ومعاشرت میں نئی قوت اور نئی جان ڈالنے کے لیے مہذب قوم کی تہذیب اور معاشرت کے صحت مند عناصر کو ان میں داخل کرنے کی ضرورت ہے [۱۵]۔ سرسید کے اکثر مخالفین اور ناقدین نے ان کے بارے میں ایسا تاثر قائم کیا ہے کہ وہ مغربی تہذیب وتمدن کی کورانہ حمایت کرتے تھے اور ان کے عناصر کو مسلم معاشرت اور تہذیب میں مکمل طور پر داخل کرنا چاہتے تھے اور مسلم معاشرے کی اصلاح ان ہی خطوط پر کرنے کی خواہش رکھتے تھے لیکن سرسید کی ذات سے اس قسم کے خیالات منسوب کرنا ٹھوس حقائق پر مبنی نہیں معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ

اپنی تہذیب و معاشرت کے حسن و قبح کی تشخیص کرتے وقت نہ صرف تحقیقی نظر سے کام لیں اور دیگر مہذب قوموں کی رسوم و عادات اختیار کرنے میں احتیاط اور عقل مندی کا ثبوت دیں [۱۶] بلکہ ان کی رسوم و عادات کے عناصر کو اپنی تہذیب و معاشرت میں داخل کرتے وقت ان عناصر سے احتراز برتیں جن کی شرعاً ممانعت ہے اور ان عناصر کو قبول کریں جو شرع کی رو سے مباح ہیں۔ ان کے عملی اقدام سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ جہاں انھوں نے اپنے کالج میں دنیا میں کار آمد اور مفید مغربی علوم رائج کیے وہیں انھوں نے مشرقی علوم اور دینیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ سرسید نے یہ نہیں کہا کہ مہذب قوموں کی تمامتر رسوم و عادات بے عیب اور بے فرز ہیں۔ البتہ انھوں نے یہ ضرور کہا کہ ان میں نقائص کم ہیں اسی لیے وہ اعلیٰ اور معزز، خیال کیے جاتے ہیں [۱۷]

یہی وجہ ہے کہ یوروپینوں کی نقل میں مسلمانوں کے شراب پینے اور جوا کھیلنے کا سن کر سرسید کو بہت تکلیف ہوتی تھی اور مسلمانوں کو کسی مہذب قوم کی عمدہ خصلتوں اور عادتوں میں پیروی کرتے دیکھ کر ان کو نہایت خوشی ہوتی تھی [۱۸] انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ چونکہ ایک سچے مذہب اسلام کے پیرو ہونے کے ناتے مسلمانوں کے لیے، مذہبی پابندی، ضروری ہے۔ اس لیے مسلم معاشرتی زندگی اور تہذیب کو مہذب قوموں کے رسم و رواج سے آہنگ کرتے وقت احکام شرعی کا لحاظ رکھنا لازمی ہے۔ اسی لیے سرسید نے مسلمانوں کی تہذیب و ترقی کے پیش نظر ان کو مشورہ دیا کہ وہ اس عمل میں صرف ان اچھے عناصر کو اختیار کریں جو شرع کی رو سے مباح ہیں اور ان سے، احتراز، برتیں جن کی شرعاً ممانعت ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اول صورت میں لوگوں کی باتوں کی پروا کیے بغیر اور مروجہ رسم و رواج کا خیال کیے بغیر ان کا اختیار کرنا، قومی ترقی، کے پیش نظر نہ صرف ضروری بلکہ، فرض، قرار دیا [۱۹] سرسید متمدن قوموں کی تہذیب کے صحت مند عناصر کو غور و فکر کے بعد ہی ہندوستان کی جاں بہ لب مسلم معاشرت اور تہذیب میں داخل کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی تہذیب اور رسوم و عادات کے حسن و قبح کی چھان بین کرتے وقت تحقیقی نظر پیدا کرنے کی اپیل کی اور متمدن قوموں کی تہذیب کے صحت مند عناصر کو پرکھنے کے لیے، مباحات شرعیہ، دانائی اور ہوشیاری کو پیمانہ قرار دیا۔

برطانوی تہذیب سے ربط کے نتیجے میں سرسید کے اندر مسلم معاشرتی زندگی اور تہذیب کی پسماندگی کا احساس بیدار ہوا۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی پسماندگی کے کئی اسباب تھے۔ اول مسلمان دنیوی مسائل اور دینی احکام کو ایک ساتھ جوڑ کر دیکھتے ہیں، اور ان کو ایک دوسرے سے الگ تصور نہیں کرتے۔ چوں کہ سرسید کا خیال ہے کہ وقت اور حالات کے بدلنے سے دینی امور میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے جبکہ دنیوی معاملات ان سے متاثر ہوتے ہیں اور ان میں تبدیلی یقیناً واقع ہوتی ہے اس لیے دنیوی مسائل کا جواز JUSTIFICATION مذہب

میں تلاش کرنا ان کی پسماندگی کا ایک سبب ہے۔ دوم، مسلمان نظریاتی سطح پر پرانے رسم و رواج اور خیالات کے حامل ہیں اور ان کی تقلید کرتے ہیں[۷] اس لیے وہ ان فطری صلاحیتوں کا استعمال نہیں کر پاتے ہیں جو ان کو فطرت نے ودیعت کی ہیں اور جو کسی بھی سماج کی ترقی اور اس میں جدید رجحانات کے فروغ کا باعث ہوتی ہیں۔ سوم، ان کا خیال ہے کہ ہندستانی مسلمان تنگ نظر اور متعصب ہیں اس لیے وہ ترقی یافتہ اور متمدن قوموں کی تہذیب و معاشرت کے عناصر کو اپنی جاں بہ لب تہذیب و معاشرت میں داخل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ سرسید کا اس بات میں مستحکم یقین ہے کہ جب کوئی قوم یا ملک خود کو اپنے تہذیبی اور معاشرتی دائرے میں محصور کرلیتا ہے تو اس کی تہذیب و معاشرت کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا نشو و نما اور اس کی ترقی تبھی ہوسکتی ہے جب وہ اپنے حصار سے باہر آئے اور اس کا تہذیبی اور معاشرتی میل جول، متمدن اور ترقی یافتہ اقوام اور ممالک سے ہو۔ اس طرح سرسید مختلف قوموں اور ممالک کے درمیان تہذیبی اشتراک عمل پر بہت زور دیتے ہیں۔ اس اصول میں یقین کے نتیجہ میں سرسید نے ہندستان کی جاں بہ لب مسلم معاشرتی زندگی اور تہذیب میں نئی قوت اور نئی جان ڈالنے کی غرض سے ان میں متمدن اور ترقی یافتہ قوموں اور ملکوں کی تہذیب اور معاشرت کے عناصر کو قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن ان عناصر کو قبول کرتے وقت انھوں نے احتیاط اور عقل مندی سے بھی کام لینے کی ہدایت کی اور انھوں نے اسی کے ساتھ یہ شرط بھی عائد کی کہ متمدن اقوام اور ممالک کی تہذیب و معاشرت کے صرف اچھے اور صحت مند عناصر قبول کیے جائیں جو شرعاً بھی مباح ہوں۔

حواشی اور حوالے

۱ سرسید بنام محسن الملک، مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۸۹۹ء، مکتوبات سرسید (لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۵۹ء) ص ۴۹
۲ ایضاً۔ مورخہ ۲ فروری ۱۸۷۰ء، ایضاً ص ص ۹۰-۸۹
۳ «تمہید» ۸-۳۵، مقالات سرسید جلد ۱: مضامین متعلق تہذیب الاخلاق (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء)۔ ص ۳۵۔ ۴ ایضاً۔
۵ «مذہب اور معاشرت» ۹-۱، مقالات سرسید، جلد ۵: اخلاقی اور اصلاحی مضامین (لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء) ص ۶۔ ۶ «رسوم و عادات»، ۱۹-۱۳ ایضاً ص ص ۱۶-۱۵
۷ «رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات» ۳۱-۲۰، ایضاً۔ ص ۲۱ ۸ ایضاً ص ۲۶
۹ «تعصب»، ۱۵-۱۲ تہذیب الاخلاق، جلد ۲: مضامین سرسید احمد خاں (لاہور: ملک چنن الدین ککے زئی، ب۔ت) ص ص ۱۳-۱۵۔
۱۰ «سویلزیشن، یعنی شائستگی اور تہذیب» ۲۶۰-۲۴۳، مقالات سرسید، جلد ۴: علمی تحقیقی مضامین (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء)۔ ۱۱ رسوم و عادات ص ۱۷
۱۲ «کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیئے» ۵۵-۵۰، تہذیب الاخلاق جلد ۲۔

۱۳؎ رسوم و عادات ص ۱۴ ۱۴؎ رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات۔ ص ۲۲

۱۵؎ ایضاً۔ ص ص ۲۶، ۱۳۱ «مہذب قوموں کی پیروی» ۳۴-۳۲۔ مقالات سرسید، جلد ۵، ص ۲۴۶

۱۶؎ رسوم و عادات۔ ص ص ۱۶، ۱۷۔ ۱۷؎ ایضاً ص ۱۷۔

۱۸؎ مہذب قوموں کی پیروی۔ ص ص ۳۴-۳۳۔ ۱۹؎ رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات ص ۳۱۔

رفعت سروش
۲- بی پاکٹ سی
سدھارتھ ایکسٹینشن نئی دہلی ۱۴

قسط نمبر ۲

پتّہ پتّہ بوٹا بوٹا........

(خودنوشت)

اماں کو گھر میں بہو لانے کا بڑا چاؤ تھا۔ بھائی میاں (مولوی سید ممتاز علی) نگینہ میں پڑھ رہے تھے اور ایک مسجد میں امامت بھی کر رہے تھے۔ لڑکی کی تلاش شروع ہوئی۔ ہمارے رشتے کی کئی پھوپھیاں تھیں۔ چھوٹی پھوپھی کے اکلوتے بیٹے سید برکت علی سے، جو پولیس میں سپاہی تھے، ہماری بوبو کی شادی ہوئی تھی۔ ان کی بڑی بہن پھوپھی کبریٰ کے شوہر تھے اپنے وقت کے جید عالم اور حکیم مولوی سید محبوب علی۔ وہ چاند پور میں مطب کرتے تھے (بعد میں نگینہ آ گئے تھے) اور سب سے بڑی پھوپھی کا نام صغرا تھا۔ وہ منسوب تھیں حکیم محبوب علی صاحب کے بڑے بھائی مولوی یعقوب علی سے، جو موضع کھجوری (ضلع میرٹھ) میں مسجد کے پیش امام تھے۔ ان کی منجھلی دختر بلقیس سے بھائی میاں کا رشتہ طے ہوا اور شادی ہو گئی۔ بھائی میاں کہا کرتے تھے کہ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا اور یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں۔ سنی سنائی لکھ رہا ہوں، مگر معتبر لوگوں کی زبانی —— بھابی بلقیس ہمارے گھر نگینہ آئیں۔ میں سوچ سکتا ہوں کہ اماں کو کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔ ان کی چکّی کی مشقت ہی نہیں، چرخے کی کتائی وغیرہ بھی جاری تھی۔ پھر ہماری نانی کی بابرکت کمائی تھی۔ مفتی توسل حسین کے گھر ویسے تو نانی ملازمت کرتی تھیں، اور اماں ان کی لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھاتی تھیں۔ مگر وہ پرانے لوگ تھے اور ان دونوں کا اس بنا پر بہت احترام کرتے تھے کہ سیدانیاں تھیں۔ اس وجہ سے مالک اور ملازم جیسے تعلقات نہیں تھے۔ کسی حد تک سہیلیوں جیسے تعلقات کی نوعیت تھی۔ دیوان خانے والیوں نے بھابی بلقیس کو اپنے گھر دو چار دن رہنے کے لیے بلایا۔ وہ جا کر رہیں۔ اور انھوں نے دیوان خانے والیوں کے ایسے کان بھرے کہ ان کے کان کھڑے ہو گئے انھوں نے بعد میں اماں کو بلایا تو کہا کہ ملانی جی! آپ کو ایسے تو بڑی چاہ تھی بہو لانے کی۔ اور اب بہو آ گئی تو اس کے ساتھ بدسلوکی کرتی ہو۔ اماں کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ بھابی وہاں جا کر ایسا گل کھلائیں گی اور ان کی برسوں کی جمی جمائی ساکھ کو دو دن

ں مٹا دیں گی۔ ظاہر ہے انھوں نے ان تمام باتوں سے لاعلمی کا اظہار کیا جو ان کی نسبت بھابی نے کہی تھیں۔ اماں کے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ انھوں نے بھائی میاں سے کہا۔ خیر صلح صفائی ہوئی مگر دلوں میں گرہ تو پڑ گئی۔ اور بھابی بلقیس زیادہ تر اپنے والدین کے گھر کھجوری رہنے لگیں۔ مجھے ان کا اپنے گھر رہنا یاد ہے جب میں جامع مسجد میں پڑھتا تھا۔ وہ اپنے پہلے بچے سیّد کی پیدائش کے موقع پر نگینہ آئی تھیں۔ اور کچھ دن رہی تھیں۔

بھائی میاں کی شادی کے بعد گھر کے حالات نے ایک رخ یہ بھی اختیار کیا تھا کہ بھائی امتیاز علی پڑھائی چھوڑ کر تلاشِ معاش بمبئی چلے گئے تھے اور جب دو ڈھائی سال بعد بمبئی سے واپس آئے تو اپنی شادی کے موقع پر، ان کی شادی حکیم محبوب علی کی صاحبزادی قدوسی بیگم کے ساتھ ہوئی۔ وہ شادی مجھے اچھی طرح یاد ہے پھوپھا محبوب کے یہاں شادی کے موقع پر ان کے بہت سے مولوی دوست آئے تھے اور ساری رات وعظ ہوئے تھے۔ مولوی مبارک حسین، مولوی شبّیر بخش اور خود پھوپھا محبوب علی۔ یہ سب اپنے وقت کے بہترین واعظ اور مولوی تھے۔ ایسے وعظ میں نے اس کے بعد نہیں سنے۔ شادی کی تقریب بالکل سادہ ہوئی تھی۔ مہر کا سوال آیا تو پھوپھا نے پوچھا۔ امتیاز کتنے کا زیور لائے ہو۔ انھوں نے کہا۔ سو روپے کا تو بس سو روپے مہر بندھے گا۔

بھائی امتیاز بمبئی سے آئے اور دو ڈھائی مہینے رہ کر چلے گئے۔ بھابی قدوسی کبھی ہمارے گھر رہتیں، کبھی اپنے والدین کے گھر کماں پاڑے (نگینہ کا ایک محلّہ) اماں اب بھی چکی پیستی رہیں اور چرخا کاتتی رہیں۔ بھابی قدوسی سے سات سال تک کھانا نہیں پکوایا۔ بالی آپا بڑی ہو رہی تھیں اور انھوں نے گھر کا تمام کام سنبھال لیا تھا۔

میں نے حافظ نیاز علی نابینا سے قرآن پڑھ لیا تھا اور ریاست اور میں ایک ساتھ پرائمری اسکول میں داخل کرا دیے گئے تھے۔ میں رہتا تھا اپنی اماں کے پاس ہی۔ ابا میرے خرچ کے دو روپے ماہوار اماں کو دیتے تھے۔ اب میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ میرا کس سے کیا رشتہ ہے۔ چچی کے لڑکوں حافظ حامد علی اور حافظ شاہد علی کو تو مجھ سے کوئی لگاؤ ہی نہ تھا۔ میں عملی طور پر اپنے تائے زاد بھائیوں کو ہی اپنا سگا بھائی گردانتا تھا۔ مگر کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی تھی کہ میرے اعتماد کو ٹھیس لگتی۔

اسکول میں داخل ہونا میرے لیے فالِ نیک ثابت ہوا۔ میرا حافظہ ایسا تیز کہ جو کتاب دو چار بار پڑھوں زبانی یاد ہو جائے۔ حساب میں بھی ہوشیار۔ کلاس میں اول نمبر پاس ہونے لگا۔ میں نے بھائی میاں کی دیکھا دیکھی تکیوں اور چادروں پر بیل بوٹے بنانے سیکھ لیے۔ اب تو میری مانگ بڑھ گئی۔ شوکت ذرا ہماری قمیص

سا گلا بنا دے۔ شوکت! ایک اچھا سا نقشا بنا دے تکیہ پر۔ اب شوکت تھا کہ گھر کے اور محلہ والوں کے تکیوں اور چادروں پر نقش بنایا کرتا۔ اور اپنی کاپی کے ایک کاغذ پر پھول بنا دیتا اور ہم سبق لڑکوں سے ایک کے چار کاغذ بدلے میں لیتا۔ ان دنوں میں نے محلہ کی دو ایک لڑکیوں کو ٹیوشن بھی پڑھانا شروع کر دیا۔ ۲ آنے مہینہ یا ہم آنے مہینے بے صبری سے مہینہ ختم ہونے کا انتظار کرتا۔ اور جہاں دو چار آنے ملے۔ فوراً غبارے یا گیند لے آیا۔ اور جیسے چاہا کھیلا۔ ہائے کتنا لطف آتا تھا ان دو چار آنوں کو حاصل کر کے جیسے دنیا کا خزانہ مل گیا ہے۔ کیا بات تھی اپنی کمائی کی۔ آج ہزاروں روپے کماؤ تو بھی وہ لطف نہیں آتا۔

اب تو جانے کیا ہو گیا۔ اس زمانے میں میری آواز بہت اچھی اور سُریلی تھی، نگینہ میں ایک صاحب دائم علی پردیس سے ریٹائر ہو کر آئے اور انھوں نے شب برات کے موقع پر آتش بازی کے خلاف فضا تیار کرنے کا پروگرام بنایا۔ اسکولوں کے بچوں کو گا سکھلائے۔

آتش بازی تو ہے کام شیطان کا
اس میں نقصان ہے دین وایمان کا
مال کا ہے ضرر خوف ہے جان کا
آتش بازی تو ہے کام شیطان کا

سیکڑوں لڑکوں کا جلوس یہ گانا گاتا ہوا بازاروں سے نکلتا۔ ہم اس جلوس کے آگے آگے گاتے ہوئے چلتے۔ میں اور ایک وجاہت۔ ہم دونوں کے ساتھ پورا جلوس گاتا۔ خوب لطف آیا۔ یہ گانا اتنا مشہور ہوا کہ بچے سڑکوں پر گاتے پھرتے۔ اب جب کبھی اس زمانے کا کوئی ساتھی مل جاتا تو آتش بازی والے گانے کی یاد بچپن لوٹا دیتی ہے۔ ریاست بھی میرا ہم سبق تھا، مگر وہ پڑھنے میں اتنا ٹھس نکلا کہ اسے کئی سال تک حروف شناسی بھی نہیں آئی۔ امتحان میں وہ میرے پیچھے بیٹھتا۔ میں اپنی تختی یا کاپی جھکا کر اسے نقل کرا دیتا۔ اور اس کی گاڑی بھی ساتھ ساتھ چلتی۔

پرائمری اسکول کے دو ٹیچر مجھے اب بھی یاد ہیں۔ ایک منشی عبدالستار۔ درجہ دوئم میں انھوں نے پڑھایا تھا۔ اسکول کے بعد شام کو اپنے گھر بلایا کرتے تھے۔ نام تو ہوتا تھا پڑھانے کا۔ مگر اپنے گھر کا بہت سا کام لڑکوں سے کرلیتے تھے۔ ان کے یہاں کھیتی ہوتی تھی۔ ہم لوگ گیہوں، مٹی کے کوٹھے کٹھلیوں میں بھرتے، یا کچھ ایسے ہی کام۔ انھیں بچوں کو مارنے کا بہت شوق تھا۔ بات بے بات شہتوت کی قمچیوں سے مار مار کر ہتھلیاں سُجا دیتے تھے۔ بہت رعب تھا ان کا۔ اور دوسرے تھے منشی شوکت علی۔ انھوں نے درجہ تین میں پڑھایا۔ اب تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جب میں نگینہ جایا کرتا تھا اور ان سے ملاقات ہو جاتی تھی تو بہت خوش ہوتے تھے

اور اپنے ملنے والوں سے بہ صد فخر کہا کرتے تھے کہ یہ میرے شاگرد ہیں۔
نگینہ کے وہ دن بڑے پُرلطف تھے۔ کبھی کبھی یاد آتے ہیں تو اچانک کوندا سا لپکتا ہے میری یاد میں ہمارے گھر میں ایک بیری کا پیڑ تھا۔ مگر پہلے ایک نیم کا پیڑ بھی تھا جسے بعد میں کٹوا دیا تھا۔ شاید میرے تحت الشعور میں وہ نیم کا پیڑ رہا ہوگا۔ اور وہ بچہ بھی میری یاد سے پہلے کا ہے۔ یعنی میں شعوری طور پر اسے نہیں جانتا۔ ۵۸ء میں ایک نظم پڑھی۔ نظم کیا ایک تصویر جس کی آؤٹ لائن۔ لکیروں کے بجائے لفظوں سے بنائی گئی۔

بچپن کی تصویر

ایک چھپر سا گھر نیم کے سائے میں
اونگھتا ہے دھندلکے میں لپٹا ہوا
شام کا وقت ہے اور چولھا ہے سرد
صحن میں ایک بچہ برہنہ بدن
باسی روٹی کا ٹکڑا لیے ہاتھ میں
سر کھجاتا ہے، جانے کس سوچ میں
اور اُسارے میں آٹے کی چکی کے پاس
ایک عورت پریشان خاطر، اُداس
اپنے رخ پر لیے زندگی کی تھکن
سوچتی ہے کہ دن بھر کی محنت کے بعد
آج بھی روکھی روٹی ملے گی ہمیں
تم حقارت سے کیوں دیکھتے ہو اسے
دوست یہ میرے بچپن کی تصویر ہے

وادیٔ گل صفحہ ۱۴۵ / ۱۹۵

یہ کھردری سی تصویری نظم شاید مجھ سے ہی میرا تعارف کراتی ہے کیونکہ اس بچہ کو میں نے اپنے شعور کی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ کہیں تحت الشعور سے نکل کر سامنے کھڑا ہوگیا اور "نیم کا پیڑ" اسی عمل کی علامت ہے۔ ہاں ایک دوسری نظم ہے۔ ایک اس بچے کی جسے میں نے چلتے پھرتے اور اسکول جاتے دیکھا ہے۔ یہ نظم میں نے اس وقت کہی جب یہ لڑکا ۲۸، ۲۹ سال کا جوان تھا۔ کون سی بات کب تخلیقی پیکر پاتی ہے اس کو ریاضی کے کسی فارمولے سے حل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی نگینہ کی ابتدائی یاد کی ایک تصویر ہے۔ ایک نقش ہے۔

لڑکپن

دیکھ یہ صبح زمستاں اوس میں بھیگی ہوئی
کہر میں چھپتی ہوئی

ٹھنڈ میں ٹھٹھرے پڑے ہیں اس گلی کے سب مکاں
دھوپ آئی ہے فقط مسجد کے اس مینار پر

اک شکستہ گھر کا دروازہ کھلا
ایک لڑکا ننگے سر اور ننگے پانو
گھر سے نکلا ہاتھ بغلوں میں دبائے
اور بستہ اپنے سینے سے لگائے
ملگجی سی ہے کرن امید کی
اس کے چہرے پر اداسی کے بجائے
جا رہا ہے بارِ مستقبل کا شانوں پر اٹھائے
یہ میرے البم کی ایک تصویر ہے
میرے احساسات کی تحریر ہے۔

(مری صدا کا غبار ص ۱۵ ۱۹۶۳ء)

یہی تو ہوں میں ۔ بغل میں بستہ ۔ ننگے پانو ۔ میں پہلے تو ننگے پانو ہی پھرتا تھا۔ پھر کبھی کبھی ریاست کا پرانا جوتا مجھے بخش دیا جاتا تو میں بڑی کراہت سے پہنتا۔ اور دل میں سوچتا۔ کیوں پہنوں میں اس پھٹے پرانے جوتے کو۔ مگر شکایت کیسے کروں ۔ اور کروں تو کس سے ۔ پھر میرے لیے دو آنے کی کھڑاؤں آئی۔ پانو کے تلوے کے برابر لکڑی کا تراشا ہوا ٹکڑا۔ اور اس میں پنجہ اٹکانے کے لیے نوار کی پتلی سی پٹی۔ جس پر دونوں طرف ٹین کی پتیاں کیلوں سے ٹھوک دی جاتیں۔ کھڑاؤں پہننے کا عام رواج تھا غریب گھروں میں ۔ میں ذرا تیز اور کبھی کبھی اچک اچک کر چلتا تھا اس بے ربط چال سے کھڑاؤں کی لکڑی ٹخنوں پر چوٹ کرتی تھی ۔ اور کھڑاؤں پہننے کے دنوں میرے ٹخنے اکثر زخمی رہتے تھے ۔ مگر کیا پروا ۔ یوں ہی ریت مٹی میں کھیلتے پھرتے تھے ۔ آج کل کی سی بات نہیں تھی کہ اس طرح چوٹ لگ جائے تو فوراً ٹٹنس کا انجکشن لگواؤ۔ اور پھر جیسے ننگے پانو کی عید ہوئی ۔ ایک عید کے موقع پر ابا میرے واسطے دھوڑی (کچا چمڑا) کا نیا جوتا لے آئے ۔ وہ جوتا پہن کر کیا خوشی ہوئی تھی ۔ وہ خوشی دل کے کسی گوشے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک ۔ ابھی ایک دو سال پہلے۔ وہ پیارا دھوڑی کا جوتا میرے ذہن میں چرمرایا۔ اور وہ چرمراہٹ نظم بن گئی ۔ کب کی خوشی کب عود کر آئی ۔ انسانی ذہن کی کارفرمائی بھی عجیب ہے۔

دھوڑی کے جوتے

چرمر، چرمر، چرمر
دھوڑی کے نئے جوتے

کس کا بچپن آج خوشی سے ناچ رہا ہے۔
یادوں کی پروائی آج یہ کیسی خوشبو لے آئی ہے
ننگے پانو کی پہلی عید تھی
جب دھوڑی کے، تیل پلائے ستے، جوتوں نے
تلووں کو کانٹوں سے بچایا
کنکر، پتھر، کیچڑ، تپتی ریت سے کی پیروں کی حفاظت
بے خوفی سے چلنے کا انداز سکھایا

ساٹھ برس سے کچھ اوپر کی بات
مگر جیسے کل کا قصہ ہے

باپ کی شفقت
ماں کی ممتا
جانے کیا کیا یاد آتا ہے
چُرمر، چُرمر، چرمر، چرمر
اس آواز میں کیا جادو ہے
دھوڑی کے جوتوں میں جیسے
گئے زمانوں کی خوشبو ہے

(شاخ گل۔ ۱۶ اپریل ۱۹۹۱ء)

کوئی نہیں جانتا کہ کب کوئی بات، کوئی واقعہ کسی تخلیق کا محرک بنتا ہے۔ ویسے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ واقعات کا "ترجمہ" کر دیتے ہیں، شاید ان ترجموں میں تخلیق کا کف اور سوز دروں شامل نہیں ہوتا۔

تو میں یاد کر رہا تھا نگینہ کے پرائمری اسکول اور اس کی فضا کو۔ وہ نگینہ کی میونسپلٹی کا اسکول تھا اور تھانے کا اسکول کہلاتا تھا۔ ایک اونچا ٹیلہ تھا۔ اس پر تھا یہ اسکول۔ ایک طرف تھانہ اور متصل جامع مسجد۔ زندگی نے ایک ڈگر پالی تھی۔ اسکول مزے سے چل رہا تھا۔ پھر اتھل پتھل ہوئی۔

بھائی میاں کہیں بھی ہوں۔ عید کرنے ضرور نگینہ آتے تھے۔ اس عرصہ میں وہ مدرسہ قاسمیہ نگینہ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد "دورہ" کے سال کے لیے دارالعلوم دیوبند جا کر، مولوی کی سند حاصل کرنے کے بعد غلام بھیک نیرنگ کے قائم کردہ تبلیغ کالج کرنال میں تین سال کا کورس پورا کرنے کے بعد مولنہ (ضلع میرٹھ) کے مکتب تائید الاسلام میں صدر مدرس ہو چکے تھے۔ میں نے ایک جملہ میں بھائی میاں کی زندگی کے نو دس سال کے عرصہ کی چھلانگ لگا دی۔ ان کی تفصیلات بڑی

ہم ہیں۔ ذرا ٹھہر کر بیان کروں گا۔ ابھی تو ذکر کرنا ہے اپنی زندگی کی "اتھل پتھل کا"
بھائی میاں نے اماں کو بتایا کہ بھابی بلقیس کمزوری میں ہے۔ ان کو ٹی۔ بی کا شبہہ
ہے۔ گاؤں میں علاج نہیں ہو سکتا اس لیے میں نے سوانہ میں مکان کرایے پر لے لیا
ہے۔ علاج کے لیے سوانہ میں اچھے حکیم بھی ہیں اور ڈاکٹر بھی۔ مگر تیمار داری کے لیے
ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ طے ہوا کہ بوبو کو سوانہ لے جائیں۔ مناسب ہے۔ مگر
بوبو نے کہا کہ ریاست کا دل اکیلے نہیں لگے گا اس لیے شوکت کو بھی لے چلو۔ بوبو کے
فیصلے پر کون دم مارے۔ شوکت کا کان پکڑ کر بھیڑ کی طرح لے جایا گیا۔ اپنے ابّا سے
دور۔ اپنی اماں سے دور۔ اپنی نانی سے دور۔ اور اپنی بہن بالی آپا سے دور۔
اسکول سے نام کٹا دیا گیا۔ اور یہ چار آدمیوں کا قافلہ نگینہ سے سوانہ روانہ ہو گیا۔
مجھے یاد ہے کہ اس وقت تو اس طرح چلا جانا بالکل برا نہیں لگا۔ بلکہ ریل میں بیٹھنے کی
وہ خوشی تھی کہ جس کا ٹھکانہ نہیں۔ سفر تھا نگینہ سے مراد آباد۔ مراد آباد سے گاڑی
بدل کر ہاپوڑ۔ ہاپوڑ سے گاڑی بدلی جائے گی میرٹھ کے لیے۔ اور میرٹھ پہنچ کر موٹر
یا تانگے سے سوانہ ۔۔۔ دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے کہ خوب لطف آئے گا۔

(باقی آئندہ)

زیڈ۔ ایم خاں
۵۷/۱، ہاشمی خانہ،
فتح گڑھ، یو۔پی۔

چراغ تلے...

کبھی کبھی میری طبیعت اپنی نااہلی پر جھنجھلا اٹھتی ہے۔ لیکن یہ نااہلی نہیں بلکہ ناسمجھی ہے۔ ہم اس کو ناسمجھی بھی کیوں کہیں کیونکہ حکومت بے دریغ ' بڑے زور شور سے اس کی تحقیق پر سرمایہ لٹا رہی ہے۔ اور۔ وہ سب کے سب دانشور لوگ ہیں۔ بڑھتے چلو۔ لیکن مجھے ان دانشوروں کی کاوشیں سراب کیوں نظر آتی ہے۔ کم سے کم یہ تو ایک معمہ ہے ہی میرے لیے۔ اسی لیے بار بار ایک بے چین لہر میرے ذہن و دل پر اٹھتی ہے کہ کاش میرا اپنا کمپیوٹر ہوتا، اپنی ریسرچ لیبارٹری ہوتی اور میں بھی اخباروں میں، رسالوں میں اپنے تجربات شائع کرواتا۔ ان کی مثال بن جاتا۔

بہرحال میرے دل میں یہ جذبۂ ریسرچ ایسا موجزن ہوا کہ میں نے بغیر کسی آلہ امدادگاہ کے عینی ریسرچ شروع کردی۔ کبھی تجسیم نگاہ کو پھیلا کر کبھی اس کے گوشوں کو سکیڑ کر، کبھی آنکھیں کھول کر کبھی موند کر بالکل اسی طرح جیسے (ٹی۔ وی پر "ٹرننگ پوائنٹ" پروگرام میں ایک قیم و دلدادۂ ریسرچ کی کاوش بیان کی گئی تھی کہ) سائنسی کھوج کی دھن میں مگن لیکن سرمایہ اور سہولتوں سے معذور ایک شخص نے اپنی برہنہ آنکھوں سے سورج کا ہر زاویہ سے گہرا مطالعہ کرکے یہ پتا لگا لیا کہ سورج کی سطح پر سیاہ دھبے ہیں (اس کے مطابق تو یہ نئی تحقیق تھی۔) اسی کی قوت بینائی اور برداشت کو مشعل راہ بنائے ہوئے میں نے بھی منطقہ ہوائی (وایو منڈل) کی حالت دیکھنا شروع کی لیکن دوربین کو ماتھے پر لٹکا کر، صرف تسکین قلب کی خاطر۔ دراصل میں یہ تجزیہ کرنا چاہتا تھا کہ اس پالیوشن یعنی زہریلی سمیت میں کتنا وزن ہے کہ یہ سمیت اور یہ گیسیں اڑ جانے کے بعد بھی ہم انسانوں پر ہر وقت برستی رہتی ہیں اور طرفہ یہ کہ اسے ایسی حرکتیں کرنے کے لیے ان کو کسی خاص موسم و وقت کی ضرورت بھی نہیں۔ ہماری ہی ایجادات سے جنم لینے والی یہ بھوری بلا ہم پر ہی کیوں حملہ آور ہوتی رہتی ہے۔ "ہماری ہی بلی ہم کو ہی میاؤں"۔ میں ان گیسوں سے یہ بھی دریافت کرنا چاہتا تھا کہ ان کی قوت پرواز کیوں جواب دے جاتی ہے کہ وہ بجائے اور اونچا اڑنے کے، اور جاکر آسمان پر برسنے کے بادل کی دنیا پر چھا کر ہم انسانوں کی قدرت کا لوہا منوانے کے، وہ اپنے محسن کش ہونے کا کیوں مظاہرہ کرتی ہیں اور ہانپتی کانپتی ہم پر ہی آگرتی ہے۔ وہ ہوا کے جن کاندھوں پر سوار ہو کر ادھر ادھر سیر کرنے جاتی ہیں کیوں اس سے دل برداشتہ ہو جاتی ہیں۔ (بالکل انسانوں کی طرح۔ وہ انسان جو ہمیشہ اپنے

محسن کا گلا دبانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔) اور جب ہم اس کے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو سہارا دینے کے لیے اس کو اپنی آغوش میں لینا چاہتے ہیں تو وہ بجائے باہوں میں آنے کے ہماری آنکھوں میں گھس بیٹھتی ہے، سانسوں کے اُتار چڑھاؤ میں سما جاتی ہے، ہماری نرم و نازک جلد سے چمٹ جاتی ہے اور جب ابھرتی ہے تو، ڈاکٹروں کے مطابق، جلدی امراض کی شکل میں، امراض چشم بن کر، دم کو دمہ میں تبدیل کر کے۔ چلو ہم انسان تو اس کو، نا اہل بچوں کی طرح طوعاً و کرہاً برداشت کر لیتے ہیں لیکن یہ اپنی ہم جنس اوزون گیس جو بے زبان ہے، جو آکسیجن کا جسم نازک ہے، وہ آکسیجن جو ہمارے جینے کا بڑا سہارا ہے، اس کو بھی پراگندہ کرنے سے نہیں چوکتی اور خود کو سورج کی تیکھی اور گرم کرنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اوزون گیس میں تحلیل ہو جاتی ہے تاکہ اوزون گیس سورج کی پیرا بینگنی کرنوں سے ہم انسانوں کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ آخر یہ کیوں اتنی دشمنی کرنے پر اتر آئی ہے۔ لیکن معاً میرے دل میں ایک خیال کروٹ لینے لگا جو کہ رہا تھا کہ "تم انسانوں کی حرکات بدکیا اس سے بہتر ہیں جو خود اپنے خالق کے مقابل کھڑے ہو کر بجائے سر جھکانے اس کا شکر ادا کرنے کے اپنا سر اٹھا کر اس کو چیلنج کر رہے ہو۔ خود کو اس قادرِ مطلق کے ہم رتبہ ثابت کرنے کے لیے عزم کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہو۔" چونکہ یہ خیال معترضہ تھا اور میرے دائرۂ ریسرچ سے باہر، اس لیے میں نے اس کو فوراً ہی جھٹک دیا۔

مجھے ان گیسوں سے اس لیے زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے کیونکہ وہ نتیجہ ہیں ہماری جلاوت (نہیں) زود فہمی اور فکر تحقیق کا۔ ہم نے سالہا سال کی کاوشں کے بعد، آرام زندگی کی خاطر ایجادات کیں اور اس کو ترقی یافتہ قدم کہا۔ ہم نے حیرت انگیز مشین ایجاد کیں، انڈسٹریز اور فیکٹریاں قائم کیں، بھٹیاں بنائیں جن کے بطن سے ڈھل ڈھل کر آٹو وی ہیکل (موٹر گاڑیاں اسکوٹر، موٹر سائکلیں، ماپڈ وغیرہ) ہوائی جہاز اور مختلف کیمیکل، بارود، ایٹم و ہائڈروجن بم، میزائل وغیرہ وغیرہ سامنے آئیں اور ہم نے اس پر ناز کیا لیکن اب اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی زہریلی گیسیں مثلاً ہائڈرو کاربن مونو آکسائڈ، نائٹروجن اکسائڈ اور الڈی ہائڈس وغیرہ کے مضر اثرات مہلک ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی مجھے ہنسی آگئی اپنے پیروں میں کلھاڑی مارنے والے مقولہ پر۔ خیر۔ اس سے کلھاڑی کی ایجاد، اس کی دھار اور افادیت کا اندازہ تو ہو ہی گیا۔ اور اگر اربوں کی آبادی میں دس، بیس یا پچاس لاکھ ہر سال گھٹتے رہے، اپنی ایڑیاں رگڑتے رہے، نابینا ہو کر گرتے پڑتے چلتے پھرتے رہے، گھٹ گھٹ کر مرتے رہے تو عیش کرنے والوں کی آبادی میں نہ تو کوئی امتیازی کمی آجائے گی اور نہ اضافہ آبادی میں۔ البتہ ایک فائدہ یہ ہو گا کہ اگر لولے، لنگڑے و اندھے پیدا ہوتے رہے تو حکومتوں کو درپیش مسئلہ بے روزگاری خود بخود حل ہو جائے گا۔ ان اضافی خیالات نے بات میں بات پیدا کر دی۔ ورنہ۔ خیر۔

ہاں یہ بات بھی قابل تحقیق ہے کہ زمین کی فضا، یہ انسان، یہ چرند و پرند اور یہ شجر و حجر۔ ان میں ایسی کیا چاشنی ہے جو ان گیسوں کو پسند ہے۔ اگر ان کو پسند ہے تو کیوں یہ سائنس داں اور یہ سربراہِ ملک ان کی پسند میں حارج ہوتے ہیں۔ کیا وہ گیس واقعی اتنی مہلک ہیں جتنے کہ یہ حضرت انسان

ان کے ٹمیٹ اور کارخانے۔ کیونکہ وہی تو ان کی پیدائش کا ذریعہ نہیں۔

ابھی میں اسی تحقیق مکرر میں منہمک خود کو کھوئے ہوئے تھا کہ میرا بچہ علیم اور بیٹی ترنم کے شور نے میری توجہ مسلسل کو درہم وبرہم کر دیا لیکن اس وقت میں ناگواری محسوس کرنے کے باوجود مسکرا اٹھا کیونکہ مجھ کو بلا کاوش "شور" کے مضر اثرات کا ریزلٹ مل گیا تھا جس کو سالہا سال کی تحقیق کے بعد سائنس دان مضرِ صحت ثابت کر سکے تھے۔ کہ شور کسی قسم کا ہو اپنی کیفیت بلند آواز کی بنا پر ذہن میں پراگندگی پیدا کر دیتا ہے، چاہے وہ کرکٹ پھینکتے وقت چھکا لگانے پر ہو یا کیچ پر، چاہے وہ موٹر وہیکل، موٹر سائیکل، اسکوٹر و ماپڈ کا ہو یا تھری وہیلر کا، ان کی چال کا یا ہارن کا۔ چاہے وہ ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ اور کارخانوں کی مشین کا یا اسٹاک ایکسچینج میں "بڈ" کا۔ کوئی بھی شور، سب پردۂ سماعت پر ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ خواہ وہ لاؤڈ اسپیکر بہ مدھر کا، آرکسٹرا اور پاپ سانگ کی جھنکار کا یا پوری والیوم سے کھلے ہوئے ریڈیو، ٹرانسسٹر اور ٹی، وی کا۔ ہاں میں "زندہ باد، مردہ باد" کا نام نہ لوں گا۔ اگر کسی نے سن لیا تو میرے خلاف دھرنا و گھیراؤ کی تجویز پاس کروا دے گا اور اس میں، یہ پردوشن کی کھوج میں کھوئے ہوئے نیتا بھی شامل ہو جائیں گے پھر ایک نیا شور و غوغا شروع ہو جائے گا "نہیں چلے گی نہیں چلے گی تا ناشاہی نہیں چلے گی۔ درحق بات خاموش رہے۔ یہ شور بلند رہے)" اور یہ راج میں سنگھاسن پر براجمان نیتا اس دھواں دھار ماحول میں اپنی ریپالا اور جیٹ میں سفر کرنے کا فوراً پروگرام بنا لیں گے، اور دھواں چھوڑتے ہوئے وایو منڈل کو پردوشن رہت بنانے کے لیے دنیا کی سیر کرنے نکل جائیں گے کروڑوں ڈالر خرچ کرنے کے لیے۔

باوجود ضبط ناگواری اور فرضی مسکراہٹ کے، بچوں کے اس شور نے میرے تارِ ذہن میں تناؤ پیدا کر دیا اور اعصاب میں سن سناہٹ۔ میں نے دوسرے ہی لمحے بچوں کو خشمگین نگاہوں سے دیکھا اور وہ دُم دبا کر بھاگ گئے۔ اس شور نے، جس کو میں پہلے صرف ناپسندیدگی پر محمول کرتا تھا، میرے اندر چڑچڑاہٹ پیدا کر دی۔ میرا اندازِ فکر بدل گیا کہ میری ناپسندیدگی مرض ہے اور وجہ مرض یہ شور۔

ابھی میں نتیجہ مرتب کرنے جا ہی رہا تھا کہ علیم اور ترنم پھر جھگڑتے ہوئے میرے کمرہ میں آگئے اور چیخ چیخ کر اپنا مقدمہ پیش کرنے لگے۔ میں نے ڈانٹ کر خاموش ہو جانے کو کہا جس پر وہ دونوں منہ بسورتے منمنا کر کہنے لگے

"آپ سنیں گے نہیں تو فیصلہ کیسے کریں گے"

اور میں اس معصومانہ انداز پر مسکرانے لگا۔ علیم نے کہا

"آپ اس کو نوبال کا رول سمجھا دیجیے۔ یہ میری بات نہیں مانتی ہے" میں نے ان کو سمجھا کر واپس کیا اور کہا "اب شور نہ کرنا" جس پر علیم نے بکھرے ہوئے جملوں میں کہا جس کا مطلب اس طور پر تھا

"ابو! کرکٹ میں شور تو کیا ہی جاتا ہے۔ آپ ٹی وی نہیں دیکھتے۔ ابو! شور تو اپنی کامیابی

کا اظہار ہے۔ خوشی کے موقع کم ہاتھ لگتے ہیں نا۔ پھر خوش رہنے سے خون بڑھتا ہے، اور۔ اور۔ ہمت بڑھتی ہے۔ ہے نا ابّو؟۔ ہر شوق میں شور ہے۔ اس سے ہم کیسے بچ سکتے ہیں۔ شور کون نہیں کرتا۔ پریسیڈینٹ سے لے کر کارسیوک تک۔"

اس کے اس جواب نے میری پیشانی پر سنجیدگی کے آثار ابھار دیے جس کو چھپانے کے لیے مجھے سگریٹ کا ایک لمبا کش لینا پڑا۔ جیوں ہی دھوئیں نے اُمڈ کر کمرہ میں پھیلنے کے لیے قدم آگے بڑھایا، علیم اور ترنم خالی ہاتھ سے اس کو دور ڈھکیلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ترنم نے کہا

"ابّو! آپ سگریٹ پھینک دیجیے۔ دھواں گھٹن پیدا کر دیتا ہے میری سانسوں میں"، یہ بڑا زہریلا معلوم ہوتا ہے مجھے"

اس کے ماتھے پر پڑے ہوئے بل اور سکڑی ہوئی ناک نے مجھے اس تکلیف کا احساس دلایا۔ پھر بھی میں نے اسکو سمجھانے کی غرض سے کہا

"بیٹا یہ دھواں تو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ تو اب سماج کا فیشن بن گیا ہے۔ ایک تلخ ضرورت جیسے آتش بازی کا دھواں جو دیوالی، بارات اور دوسری تقریبات کی رونق بڑھاتا ہے بلکہ ایک اور ناگزیر دھواں جیسے کھانا بنانے والے چولہوں کا، کارخانوں اور فیکٹریوں میں بھٹیوں کا، موٹر وہیکل واسکوٹر کا، اور ریل گاڑی اور ہوائی جہاز وغیرہ کا۔ اور۔ سب سے زیادہ خطرناک سپر پاور بننے کے لیے مختلف ایٹمک اور کیمیکل ٹیسٹوں کا، مصنوعی سیاروں کا دھواں۔ بیٹا! یہ دھواں تو ہماری ضروریات زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے۔"

"ابّو! اور سب تو درست ہے لیکن یہ بیڑی و سگریٹ، آتش بازی و بارود کا دھواں ہماری ضروریات زندگی کا حصہ کیسے۔۔۔؟۔ یہ تو شوق ہے نہ کہ ضروریات۔؟"

اس کا جواب دینے کے لیے مجھے تامل کرنا پڑا اور میں تاویل ڈھونڈنے لگا۔ فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور جو آیا بھی وہ یہ کہ۔۔۔۔کہ۔۔۔۔۔ لیکن آپ کو تو بتانا ہی پڑے گا کہ حکومت جو ضامن ہے عوام کی صحت کی، یہ اس کا ذریعہ آمدنی ہے۔ ان کے استعمال کو اونچی سطح پر جاری رکھوانا لابدی ہے۔ اور سال میں ایک ہفتہ، سب کے خلاف نہیں تو کم سے کم بیڑی سگریٹ کے خلاف اخباروں اور تقریروں کے ذریعہ پروپیگنڈا کرنا اس کا اخلاقی فرض ہے۔ آپ ہنسیے نہیں۔ عملی طور پر اس انڈسٹری کو بڑھاوا دینا بھی ملک کی معیشت کے لیے نہایت ضروری ہے اور باریک حروف میں اس کے ہر پیکٹ پر زہر لکھوانا، صحت عامہ کی خاطر، عوام کو مطلع کرنا بھی حکومت کا اخلاقی فرض ہے۔

ہاں ہاں آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں "زہد کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی"، میں نے مزید بات کو نہ بڑھا کر بچوں سے یہ کہا کہ تم باہر جا کر میدان میں کھیلو جس پر ترنم بول اٹھی

"ابّو! وہاں دھول اڑتی ہے اور وہ ہمارے بالوں اور کپڑوں کو گندہ کر دیتی ہے

امی ناراض ہوتی ہیں۔ اور۔ لو! وہ دھول بھی تو آنکھ میں، ناک میں سانس
میں گھسنے لگتی ہے"
میں نے زچ کھاتے ہوئے کہا
"بیٹی دھول اور مٹی سے مفر نہیں۔ جب تک ہوا میں اڑنے اور اڑانے کی طاقت
ہے دھول اڑتی ہی رہے گی۔ یہاں نہیں تو کہیں اور سے اڑ کر آئے گی"
یہ کہ کر میں زیادہ سنجیدگی محسوس کرنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ دھواں جو ضروریاتِ زندگی کے لیے کی گئی ایجادات کا نتیجہ ہے اور یہ دھول جو اپنی گود میں مختلف گیسوں کو لیے ہوا کے کاندھوں پر سوار ہر علاقہ پر چھائی رہتی ہے، یہ انسانی اجسام کو ہی نہیں بلکہ حیوانات، جمادات اور نباتات کو بھی اپنی سمیت سے متاثر کر رہی ہے یعنی ایک موٹر دو پہیہ کل جو ہماری ایک نہایت ضرورت ہے وہ ایک منٹ میں اتنی آکسیجن کنزیوم کرتا ہے جو ۱۱۲۵ انسانوں کی سانس لینے کے لیے درکار ہے اور ایک منٹ میں طیارہ کے دھوئیں میں جو کاربن ہوتا ہے [illegible] ہوا کے منطقہ میں موجود اوزون گیس جو آکسیجن کا ایک مفید حصہ ہے اس کو وہ کاربن زہریلا بنا دیتا ہے۔ اس اوزون گیس کی ایک افادیت یہ بھی ہے کہ وہ ہم کو سورج کی پیرابینگنی کرنوں سے محفوظ رکھتی ہے لیکن یہ کاربن، ہر روز، اوزون میں حل ہو کر ہمارے محفوظ رکھنے والے ذرائع کو تباہ کر رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ آکسیجن جو ہماری زندگی کا اہم ترین حصہ ہے اور جس کو ۱۰ درخت ایک دن میں بنا پاتے ہیں وہ ۱ لیٹر گیسولین جلنے میں کھپ جاتی ہے۔ لیکن اس سمیت سے چھٹکارا غیر ممکن ہے کیونکہ وجہ پرورش یہ گیس تو جنم لیتی ہیں ہماری ایجادات کے بطن سے اور ایجادات ہماری نہایت ضرورت بن گئی ہیں۔ وہاں وہ مہلک گیس جو آئے دن پیدا ہو رہی ہیں سپر پاور بننے کی دوڑ میں، سائنس دانوں اور قدرتی سیارگان کی ماہیت جاننے کے لیے، دنیا کی جاسوسی کرنے کے لیے، مصنوعی سیاروں کی شکل میں اور ان کی کمی اڑان کے باعث۔ نیز اسلحہ کے ذخیروں میں آتش فشانی دھماکے کی وجہ سے اور یہ آب و ہوا کو از حد زہریلا بنا رہے ہیں، وہ تو ضرورت زندگی نہیں۔ پھر؟۔ عملی زندگی میں ان پر کنٹرول؟؟۔
یہ تو خود را فضیحت دیگراں نصیحت کے مصداق ہے۔ "کارِ بد تو خود کریں الزام دیں اس دور کو"
آج کل اوزون گیس کا نام ہر ملک کے سربراہ کی میٹنگ میں دہرایا جاتا ہے اس لیے میرے ذہن نے اس پر غور و فکر کرنے کے لیے میرے جذبۂ تحقیق کو ابھارا۔ بس مجھ سے نہ رہا گیا اور میں کمرہ سے باہر نکل پڑا اس فضائی ماحول کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے لیے۔ جب میں نے اس آفتابِ جہاں تاب کی شعلہ بار نگاہوں سے نگاہیں ملائیں اور محسوس کیا اور سوچا کہ جب اتنی طاقت ور ہیں کہ اپنی تمازت سے ایام ماہ مئی تک کو جھلسا رہی ہیں تو یہ کیوں نہیں اس سمیت کو خاکستر بنا دیتیں جو انسان دنیا کو پرورش کر رہی ہیں کیا یہ بھی مات کھا گئی ہیں ان گیسوں سے یا ان کا کوئی ساز باز ہے ان سے۔ میں بھی تجزیہ کرنے کے لیے سورج کے روبرو کھڑا رہا اور گیسوں سے متاثر

فضا کی تملاہٹ کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مسلسل دیکھتے رہنے کے باعث آفتاب سے نکلتی ہوئی چنگاریوں سے میں نے اپنی آنکھوں میں جلن محسوس کی اور اچانک پوری فضا مجھے سیاہ نظر آنے لگی۔ میں گھبرا اٹھا۔ دل نے فوراً سوال کیا۔ "روشن دن میں یکایک اندھیرا؟" میں نے جواب حاصل کرنے کے لیے اپنی پھیلائی ہوئی آنکھوں کو ٹھوکا دیا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ تو سو رہی ہیں۔ ! انھوں نے میری حماقت پر۔ نہیں نہیں۔ میری تحقیق پر شرمندہ ہو کر خود کو پردۂ مژگاں میں چھپا لیا۔ قدرے تامل کے بعد ہی یہ گتھی سلجھ گئی کہ آفتاب کی تیز چمک اور تمازت میری بصارت کی برداشت سے پرے تھی۔ میں نے فوراً دوربین کو ماتھے سے اتار کر آنکھوں پر چڑھا لیا لیکن اس دوربینی کے باوجود اس چمکتے ہوئے آسمان کی فضا جس پر نقرئی چادر پھیلی ہوئی تھی اُس پر بدروشن کا کوئی ذرۂ مثقال یا حباب آگیں مرغولۂ گیس نظر نہ آیا جبکہ آج کل نیتاؤں کی زبان پر ہر طرف پھیلے ہوئے امراض کی وجہ یہ فضائی بدروشن ہے یہ گیسیں ہیں۔ اور امراض روز افزوں ترقی پر ہیں مثلاً کالرا، ڈائریا آنکھوں کی سوزش، آنکھیں دکھنا، اندھاپن، سر چکرانا، سردرد ملیریا، ٹائیفائڈ، وائرل فیور، کھانسی، پھیپھڑوں کی دیگر بیماریاں، گردہ اور پتے کی تکالیف، آنتوں کی سوزش، ایسر، ٹی بی، کوڑھ و دوسرے جلدی امراض، ذہنی تناؤ، بہراپن وغیرہ وغیرہ جن کی ایک لمبی فہرست ہے۔

"میں تھک ہار کر کمرہ میں آکر بیٹھ گیا اور ہکلاہٹ میں مبتلا ہو کر بڑبڑانے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ امراض پیدا کرنے والی گیسوں کی بارش زمین پر ہو چکی ہے جس کے باعث مطلع اتنا صاف و شفاف نظر آرہا ہے اور گیسیں غائب ہیں"

اسی وقت دوسرے خیال نے جنم لے کر کہا کہ

"جناب! ڈاکٹر اور سائنس داں، زیادہ تر امراض کے پھیلنے کی وجہ ان جراثیم کو بتاتے ہیں جو زمین پر پیدا ہوتے ہیں جن کا تدارک، آپ کو بغیر ہوا میں اڑتے ہوئے زمین پر ہی ممکن ہے۔ ہوا کے گھوڑوں پر سوار اُن گیسوں کا پیچھا کرنے اور ان گیسوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تگ و دو چھوڑیے۔ اور ان دانشوروں حکمرانوں کی پیروی بھی چھوڑیے جو پیروں تلے نہ دیکھ کر وایو منڈل کو بدروشن رہت بنانے کے لیے اپنے جیٹ طیاروں سے دھواں چھوڑتے ہوئے خود اوزون اور آکسیجن کو زہریلا بنا رہے ہیں اور پیریا ورن کانفرنس میں ......"

ابھی میں اپنے تخیلات کو ایک لڑی میں پرو بھی نہ سکا تھا کہ علیم اور ترنم منہ لٹکائے میرے سامنے آکھڑے ہوئے اور مجھ کو بڑبڑاتے سن کر استعجابیہ نظروں سے دیکھنے لگے گویا میں کسی بھوت سے بات کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑے رہے اور میری توجہ اپنی طرف مبذول نہ دیکھ کر میرا کاندھا ہلاتے ہوئے علیم نے کہا

"ابو! آپ کس سے بات کر رہے ہیں۔ آپ کے چہرہ پر ....؟"

اور میں چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے ہوا س یکجا کیے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا

"بیٹا! میں اپنی ریسرچ کے نتائج پر خود سے بحث کر رہا تھا"

"کیسی بحث ابّو؟"

"یہ کہ زمین پر پیدا ہونے والی گیس فضا میں کیسے پہنچ جاتی ہے پھر وہ کیسے اثر کر ہمارے جسم میں مرض کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ صرف انسانی اجسام کے لیے ہی اتنی مہلک کیوں ہے اور وہ کیوں نہیں ان جراثیم کو ہلاک کرتی ہے جو ہماری زمینی آب ہوا میں پیدا ہوتے رہیں اور آئے دن ہمارے اندر مختلف امراض پیدا کر رہے ہیں اور ۔ ۔ ۔ ۔"

لیکن میری نظروں نے مجھے اپنی بات پوری کرنے بھی نہ دی ۔ انھوں نے بچوں کے جسم پر پڑے گندے چھینٹے، غلاظت میں لت پت گیند اور ہاتھ دیکھ کر میری پیشانی پر بل ڈال دیے ۔ بچے سہم گئے ۔ علیم نے ڈرتے ڈرتے اپنا بیان صفائی دیتے ہوئے کہا

"ابّو! آپ باہر چل کر دیکھ لیجیے ۔ جبھی تو ہم باہر نہیں کھیلتے ۔ نالیاں کوڑے اور گندگی سے اٹی پڑی ہیں ۔ ان کا گندہ پانی کوچہ بہ کوچہ بہہ رہا ہے ۔ بلکہ ان سے کئی اور نالیاں پھوٹ پڑی ہیں ۔ ہم گیند کیچ کر رہے تھے کہ ایک موٹر سائکل گزری ادھر ۔ ۔ ۔ ۔"

بچوں کی اس حالت کو دیکھ کر میرا سب جذبۂ تحقیق کافور ہو گیا ۔ دل نے کہا "بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا" یہاں تو ہر وقت، ہر ہر قدم پہ ہم ان زہریلے جراثیم کو جو ہماری ہلاکت کے لیے اپنے ہی گہوارہ میں، امنڈتی ہوئی نالیوں، گڈھوں میں، کوڑے کے ڈھیر میں پل رہے ہیں، اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے نظر انداز کر رہے ہیں ۔ کون سا قریہ دیہات چھوٹا بڑا شہر ایسا ہے جہاں یہ حالت نہیں ۔ بڑے شہروں میں امنڈتے ہوئے گٹر، ان کے مضافاتی علاقوں کی گندگی، گندے نالے، نالیوں میں بہتا ہوا پاخانہ، گڈھوں میں سڑتا ہوا پانی، واٹر پائپ میں پینے کے لیے پانی سپلائی کیا گیا بدبودار پانی اور اسمیں انگڑائیاں لیتے ہوئے کیڑے جن کے بارے میں آئے دن اخباروں میں خبریں چھپتی رہتی ہیں ۔ ابھی ابھی مئی کے تیسرے ہفتہ میں آگرہ کا وہ واقعہ جہاں ایک علاقہ میں، صبح صبح جن لوگوں نے واٹر پائپ لائن سے پانی پیا، چند منٹ کے بعد ہی وہ بے ہوش ہو گئے اور ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی ۔ اس حادثہ میں تقریباً ۵۰ اشخاص لقمہ اجل بن گئے (لیکن اس پانی کو صاف ستھرا رکھنے کے بجائے کروڑہا روپیہ دریاؤں کے پانی کی صفائی پر خرچ کرنے کا اعلان کر کے اور اخباروں کو موٹی موٹی سرخیاں عطا کر کے اپنی کامیابی پر خوش ہونا) جبکہ دریا کا پانی شاذ و نادر ہی کوئی شخص ہی استعمال کرتا ہے) ۔ بازاروں میں لگے ہوئے کوڑے کے ڈھیر، کھلی رکھی خوردنی اشیاء پر بیٹھی ہوئی مکھیوں کا جمگھٹ ۔ نیم سڑے ہوئے پھل لگی ہوئی مٹھائیاں، ڈھابوں میں گندے ہاتھوں اور ناقابلِ استعمال سبزی سے بنائی ترکاری، شوربوں کے ذریعہ پھیلتی ہوئی گندگی اور جراثیم یہ سب کچھ ہماری نظروں کے سامنے ہے لیکن ہم اسکو نظر انداز کر کے، اپنی دانشوری کا سکہ بٹھانے کے لیے ہوا میں تیر تُکّے ٹٹولیاں کر رہے ہیں

میرا دل مجھ کو جھڑکیاں دے رہا تھا اور میں خاموش بچوں کی حلیہ دیکھ رہا تھا کہ ترنم نے اپنی طرف سے میری توجہ ہٹاتے ہوئے کہا

"اتو! آپ چیرمین سے بات کیوں نہیں کرتے۔! وہ صفائی کیوں نہیں کرواتے ہیں؟ ہر بعض کے تجربہ کے باوجود میں نے اُسی وقت چیرمین کو ٹیلیفون کیا اور شہر میں پھیلنے والی بیماریوں کا تذکرہ کیا اور کہا "کم سے کم آپ مہینہ میں ایک مرتبہ ہی شہر کا گشت کر لیا کریں، ان صفائی والوں کو مجبور کریں کے ہفتہ میں ایک مرتبہ ہی وہ تکلیف اٹھا لیا کریں، واٹر ورکس انجینیر کو ہدایت کریں کہ وہ سال میں کم سے کم دو بار ہی واٹر ٹینک کی صفائی کا انتظام کریں اور ڈِس انفیکشن پر دھیان دیں، وہ پائپ لائنس جو ہفتوں چٹکی اور ٹوٹی پڑی رہتی ہیں اور ان کے ذریعہ آنے والا گندہ پانی پینا پڑتا ہے، اس کو بلا تاخیر درست کرا یا کریں!!

میں اپنی شکایات پوری طرح بیان کر بھی نہ سکا تھا کہ وہ جھلا کر بول اٹھے "شری مان! یہ سب کیا دھرا تو آپ لوگوں کا ہی ہے۔ جب سوک سینس مرجاتا ہے تو رونا ہی پڑتا ہے۔ کوئی چارہ نہیں۔ دوسری بات اور دھیان پوروک سنیے۔ ہیلتھ وبھاگ کھلا ہوا ہے۔ جو نگو چکتسا ادھیکاری کے آدھین ہے میرے سینیٹری انسپکٹر موجود ہیں جو اس کام کی نگرانی کرتے ہیں۔ واٹر ورکس انجینیر جونیر انجینیر سب تعینات ہیں وہی آپ کا کشٹ نوارن کریں گے۔ وہ اس بات کی تنخواہ پاتے ہیں۔ اور میں! ۔ میں تو صرف آپ لوگوں کا سیوک ہوں۔ آپ ان ادھیکاریوں سے شکایت کیا کریں۔ وہی سمادھان کریں گے۔ لیکن مہاشے جی! وہ سب بھی مجبور ہیں کرمچاری گنتر کی حرکتوں سے اور کرمچاریوں کا بل ہیں نیتا گنتر۔ نیتاؤں کا بل ہیں یہ کرمچاری گنتر جو ان کے ووٹ بینک ہیں، یہ اُن کی پاکٹ میں ہیں وہ ان کی پاکٹ میں۔ جواب نمبر ۳۔ ڈیموکریسی میں ادھیکار پہلے کرم بعد میں۔ جب ان کے کہنے کے مطابق ان کی اپنی مرضی کے مطابق ان کے ادھیکار پورے نہیں کیے جاتے تو کام کرنے کا سوال ہی نہیں، اگر آپ بزور کام لینا چاہیں تو سامنا کیجیے مردہ باد ہڑتال، گھیراؤ اور دھرنے کا، نعروں کی گونج کا "تاناشاہی نہیں چلے گی، جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا" پہلے حق بعد میں فرض۔ مہودے! میں اسمرتھ ہوں۔ آپ منتری جی سے بات کریں۔"

میں بُت کے مانند ان کا جواب سن رہا تھا کہ اُس جملہ کے اختتام پر زور سے ٹیلیفون پٹکنے کی آواز آئی اور میں چونک پڑا۔ چیرمین صاحب نے یکطرفہ ٹیلیفون کاٹ کر اپنے غصہ کا اظہار تو کر دیا لیکن میں، اس ملک کی کیوں کہوں اپنی اپنی بد قسمتی پر افسوس کے چند کلمات بھی ان تک نہ پہنچا سکا۔ اور میں بصورت لاچار کبھی بچوں کو کبھی ٹیلیفون کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ

"فضا میں گیسوں کے باعث پیدا ہونے والے پردوشن کی وجہ ان، انڈسٹریز، آٹو وہیکل، ہوائی جہاز، بارود وکیمیکل وغیرہ کو تو ہم نیست نابود نہیں کر سکتے نہ ایٹمک ٹیسٹوں سے انحراف کر سکتے ہیں لیکن۔ کیا یہ زمین پر پھیلا ہوا پردوشن جو گندگی کے باعث ہے اور سب سے زیادہ مہلک ثابت ہوا ہے اس کو۔ ؟ ۔ لیکن اس کو ختم کرنے کے لیے ہم کو ہوا میں سیر کرنے کے بجائے زمین پر اترنا پڑے گا۔ اور شاید۔ راج سنگھاسن پر بیٹھنے والوں کے لیے یہ ممکن نہیں۔"

پھر خیال آیا کہ

"کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے کرتا دھرتا، دواخانوں کو اگر اپنے ذاتی مفاد کے لیے نہیں تو ملک

کو ترقی دینے کے نام پر بڑھاوا دے رہے ہیں اور ہم انسانوں کی زندگی سے کھیل رہے اپنی ایجادات کا سکہ بٹھانے کے لیے۔ آخر یہ سپر پاور ان کو ستعمال اپنانے کا عزم رکھنے والے کس قسم کے دانشور ہیں؟
کیا وہ معالج کبھی کامیاب ہو سکتا ہے جو تشخیص شدہ وجہ مرض کی جانب سے اپنی آنکھیں چرالے اور ممکن و آسان علاج کرنے کے لیے قدم نہ اٹھائے۔ وہ وجوہات جو ہر وقت، ہر ساعت اس کی نظر کے سامنے ہیں، جس کے زہریلے اثرات سے ہر فرد و بشر متاثر ہے اور وہ وجوہات زمین پر رہی ہیں جہاں اس معالج نے جنم لیا لیکن اس کا علاج کرنے کے بجائے وہ ہوا میں اڑ رہا ہے۔ وجہ پردہ پوشی اور اس کا علاج تلاش کرنے کے لیے سرگرداں ہے اور دوسروں کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہے، دریوزہ گری کر رہا ہے۔

میں نے اسی فکر کی ترنگ میں ٹیلیفون ڈائل کیا۔ جواب ملا

"منسٹر جی ابھی ابھی سپر پاور کانفرنس میں بھاگ لینے پیرس گئے ہیں" جس پر میری زبان سے بلا ارادہ نکل گیا

"اس وقت تو کوئی ٹرین جاتی نہیں"

جواب ملا

"آپ نرے بدھو معلوم ہوتے ہیں۔ ارے شری مان منتری جی جیٹ سے جایا کرتے ہیں۔ وہ جیٹ جو گہرے دھوئیں کی لمبی لکیر بناتا ہوا اڑتا ہے۔ سمجھے؟"

اس جواب نے مجھے فکر کے بھنور میں جھونک دیا اور میرا ذہن خود کو بچانے کے لیے ایک سوال کرتا رہا

"اس تابناک دور میں آج بھی ایسا معالج کیوں اس ڈیبٹ کی طرح ہے جس کے سر پر چراغ روشن ہو لیکن اس کے تلے۔۔۔۔؟؟؟"

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

ڈاکٹر مشیر الحق

شخصیت اور فکری بصیرت

مرتب:۔ شاہ عبدالسلام

مبصر:۔ ڈاکٹر خالد محمود

قیمت:۔ =/۳۰ روپے

ملنے کا پتا:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مشیر الحق میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی زیر نظر کتاب "ڈاکٹر مشیر الحق، شخصیت اور فکری بصیرت"، کشمیر کے شہید وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحق کے علم وفضل کا شایان شان اعتراف اور ان کی شخصیت کو بہترین خراج عقیدت ہے۔ مکتبہ جامعہ نے یہ کتاب پُرکشش انداز میں شائع کی ہے۔

پروفیسر مشیر الحق اپنی شگفتہ مزاجی اور اکہرا بدنی کے باوجود پُروقار شخصیت کے مالک تھے ان کے تبحر علمی اور بصیرت فکری کے سبھی معترف ہیں۔ جو علمائے کرام ان کے انداز فکر ونظر سے اختلاف رکھتے تھے وہ بھی ان کے خلوص نیت کے قائل تھے۔ ان کی شخصیت اعلا انسانی اقدار کا مجموعہ تھی ان کی ذات میں جو صفات عالیہ جمع تھیں وہ کسی ایک انسان میں مشکل سے یکجا ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے مقالہ نگاروں نے اگر ایک طرف ان کی نکتہ رسی، باریک بینی، بالغ نظری معروضی اور مدلل انداز بیان اور اخلاقی جرأت کا بار بار تذکرہ کیا ہے تو دوسری طرف یہ حضرات ان کی سلاست روی، شریف النفسی، دوست و دشمن نوازی، خوش خلقی، سادہ مزاجی، حلم، تواضع، انکسار اور رواداری کی تعریف و توصیف میں بھی رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کی ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ معنوی اعتبار سے یہ ان موضوعاتی کتابوں سے قدرے مختلف ہے جو کسی نہ کسی کی مدح سرائی میں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مرتب نے اس کتاب کے مضامین کا انتخاب کرتے ہوئے جو معروضی اور بڑی حد تک غیر جانبدارانہ انداز اختیار کیا ہے اس نے اس کتاب کو ایک اہم دستاویز بنا دیا ہے۔ اس کتاب کا مرکزی تصور اور مقصود نظر تو بلاشبہ مشیر الحق مرحوم کی شخصیت اور فکری بصیرت پر روشنی ڈالنا ہی ہے لیکن اس روشنی کے بعض زاویے اتنے مختلف، متضاد اور متصادم ہیں کہ مشیر صاحب کے ساتھ ساتھ فکر اسلامی پر بھی خاصا معلومات افزا مواد یکجا ہو گیا ہے۔ مرتب نے حسن اتفاق سے پروفیسر

مشیر الحق کے ایک مطبوعہ مگر اہم مضمون "سیکولر ہندستان میں شریعت کے نفاذ کا مسئلہ"، اور اس پر مولانا عبد الغفار ندوی کا اختلافی تبصرہ معہ جواب مکتوب الیہ پروفیسر مشیر الحق (دونوں غیر مطبوعہ بھی خط ہیں) شائع کرکے اس کتاب کی اہمیت کو دوبالا کردیا ہے۔ اس مضمون کی شمولیت سے مشیر صاحب کے طرز فکر اور طرز استدلال کا صحیح اندازہ ہوجاتا ہے۔ مولانا عبد الغفار ندوی صاحب کے خط کی اہمیت یہ ہے کہ ان کا خط فکر اسلامی کے تعلق سے ان علمی مباحث اور اختلافات واعتراضات کی نمایندگی کرتا ہے جو طبقہ علما اور مشیر الحق مرحوم کے درمیان ادب واحترام اور تہذیب وشایستگی کے پاس ولحاظ کے ساتھ موجود تھے۔

کتاب کے موضوعات میں تنوع ہے۔ مشیر الحق مرحوم کی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مضمون نگاروں میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر نثار احمد فاروقی، مولانا محمد مجیب اللہ ندوی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر اجتبیٰ ندوی، پروفیسر شعیب اعظمی، پروفیسر کبیر احمد جائسی، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر محمد راشد ندوی، پروفیسر ابو الکلام قاسمی، پروفیسر محمد سالم قدوائی، پروفیسر احتشام حسین ندوی، پروفیسر زبیر احمد فاروقی، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی، پروفیسر بدر الدین الحافظ، پروفیسر صغرا مہدی، ڈاکٹر محسن عثمانی، ڈاکٹر سید عبد الباری، ڈاکٹر ظفر احمد، ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر شمس تبریز خاں، ڈاکٹر عبد اللطیف اعظمی، ڈاکٹر شاہ عبد السلام، شاہ محی الحق فاروقی، مولوی اقبال احمد ندوی، احتشام الدین صدیقی، ابو محمد شبلی، شہناز انجم اور ڈاکٹر شیث محمد اسمعیل جیسے علما اور دانشوروں کے نام شامل ہیں۔

کتاب کی قیمت ۳۰۰ روپے ہے جو بظاہر بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے مگر ۱۲۴۱ صفحات پر مشتمل اس وقیع کتاب میں فہرست مضامین اور لکھنے والوں کے اسمائے گرامی پر نظر ڈالتے ہی قیمت کا جواز سمجھ میں آجاتا ہے۔ ••

دکنی ادب

مصنف: ڈاکٹر قیوم صادق
ناشر: کرناٹک ادبی سرکل صادق منزل راجا پور روڈ گلبرگہ (کرناٹک)
قیمت: بیس روپے
مبصر: ڈاکٹر سیفی پریمی

ڈاکٹر قیوم صادق کی تصنیف "دکنی ادب" اس سلسلے میں ایک اضافہ ہے۔ مصنف نے ریڈیو اور سیمینار کے لیے لکھی گئی تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں موجود ہیں مگر قاری کو یہ سمجھنے میں دشواری پیدا ہوتی ہے کہ دکنی زبان اور ہماری اردو زبان دو مختلف زبانیں ہیں یا دکنی زبان اصل میں اردو زبان کے ارتقا کی ایک اہم کڑی ہے۔

زیر نظر کتاب میں (۱۳۵۴ء تا ۱۷۰۷ء) زبان وادب کی تاریخ درج ہے۔ دکن میں اردو

نثر سالم غاز بندہ نواز خواجہ گیسو دراز سے کیا گیا ہے۔ عادل شاہی دور۔ ۱۴۹۰ء تا ۱۶۸۶ء کو محیط ہے۔ بیجاپور کی دکنی پر مرہٹی اور کنٹری زبان کے اثرات واضح کیے ہیں۔ شاہ میراں جی شمس العشاق عربی فارسی زبان کے شاعر تھے۔ کنٹری زبان میں عربی فارسی کے الفاظ ملتے ہیں۔ شاہ جی کی شاعری میں ہندی، سنسکرت الفاظ کا استعمال نیز برج بھاشا اور اپ بھرنش کا اثر ملتا ہے۔ شاہ برہان الدین جانم نے عربی فارسی الفاظ سے دامن بچایا۔ مقامی اور عوامی زبان کو ذریعۂ شعر بنایا۔ ان کے یہاں غزل، مرثیہ، خیال اور دوہرے وغیرہ اصناف کو برتا گیا ہے۔ شاہ امین الدین اعلیٰ کی زبان ٹھیٹ دکنی ہے۔ ہلکا سا اثر برج یا گجری کا بھی ہے۔ نصرتی نے علی نامہ تصنیف کیا۔ یہ مثنوی ۱۰۶۷ ہجری تک کی تاریخ بتاتی ہے اور اصل میں عادل شاہی خاندان کی تاریخ ہے۔ ہاشمی نابینا شاعر تھے مگر ان کی مثنوی یوسف زلیخا کی دھوم ہے۔

قطب شاہی دور ۱۵۰۸ء تا ۱۶۸۷ء متعین ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نادر روزگار شخصیت ہے۔ اس نے ۱۵۵۶ء سے ۱۶۱۱ء تک زندگی کی بھرپور بہاریں دیکھیں۔ شہر حیدرآباد بسایا۔ چار مینار کی تعمیر کی۔ پہلا صاحب دیوان شاعر معانی اور قطب تخلص اختیار کیا۔ وجہی، غواصی، رازی، نشاطی، ولی، سراج وغیرہ نامور شعرا میں شامل ہیں۔ وجہی کی سب رس، اور نشاطی کی "پھول بن" مقبول عام ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ احمد زبیری نے فارسی میں "بساتین" کی تخلیق کی۔ پھول بن اصل میں اسی کا ترجمہ ہے۔

ان اشارات سے قاری کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ دکنی ادب کی تاریخ مرتب کرنے میں حکمراں طبقہ، صوفیہ کرام اور شعرا نے کیا اور کتنا اہم رول ادا کیا ہے اور اس کا مطالعہ مصنف کی کوشش، تلاش اور پیش کش کے بغیر ناممکن تھا۔ اس لیے مصنف کی تصنیف قابل تحسین ہے ــــ مگر اشاعت کے شوق نے مصنف کو ڈگر سے ہٹا دیا۔ کتاب کا آخری مضمون "مغلیہ دور میں اردو شاعری" شامل ہے۔ اس کا نفس مضمون سے کوئی علاقہ نہیں۔ یوں بھی یہ شعرا کی فہرس اور Sweeping Remarks کی نیرنگی ہے۔

ص ۱۲۰، ۱۲۱:۔ چار سطر اور چار لفظوں میں حکیم مومن خاں مومن دہلوی کا عجیب و غریب محاسبہ ختم! میرا قلم مصنف کی ہمدردی میں متن کو دہرانے پر آمادہ نہیں۔ یہ عرض ضرور ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد، علامہ نیاز فتحپوری اور پروفیسر مولانا ضیا احمد بدایونی کے ارشادات کا مطالعہ کر کے مومن پر تین سطریں ہی لکھ دیجیے تاکہ کفارہ ادا ہو سکے۔

کتاب شاندار چھپی ہے۔ ●●

سورۂ فاتحہ

مصنف : الطاف احمد اعظمی

مبصر : شاہ افتخار

قیمت : ۱۵ روپے

ناشر : ادارہ تحقیقات و اشاعت علوم قرآن، ...

اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں قرآن حکیم کی فضیلتیں بیان کی ہیں۔ احادیث نبوی اس پر مزید اضافہ

ں۔ اس کے علاوہ قرآن کریم کے مفسرین اور شارحین، محدثین اور علماء نے قرآن کریم کی آیات کی فضیلتوں کے بیان میں ایک بیش بہا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ فاضل مولف نے "سورۂ فاتحہ" کی فضیلتیں بیان کر کے اس کارواں میں شمولیت اختیار کی ہے۔ انھوں نے سورۂ فاتحہ کی ہر ایک آیت کی فضیلت بیان کی ہے۔ سورۂ فاتحہ کے متعدد ناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اس کی وجہ تسمیہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے خود اقرار کیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے "سورۂ فاتحہ" کی جو شرح لکھی ہے، وہ اپنی جگہ بے مثال ہے۔ لیکن اس کے باوجود فاضل مولف نے سورۂ فاتحہ کی فضیلت اور شرح لکھی ہے۔ ہمارے خیال میں اس کا سبب یہ ہے کہ فاضل مولف نے سورۂ فاتحہ کی شرح لکھتے ہوئے ایک خاص مکتبِ فکر کے خیالات کی اشاعت کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ

(۱) "قرآنِ مجید کے اس تصورِ عبادت کی روشنی میں مسلمانوں کا جائزہ لیجئے تو صاف نظر آتا ہے کہ انھوں نے عبادت کا وہ مفہوم سمجھ رکھا ہے جو دوسرے مذاہب کے پیروکاروں میں مقبول ہے۔" ص۵۵

(۲) "ہمارا اپنا خیال ہے کہ آج مسلمانوں کا سوادِ اعظم، شعوری یا غیر شعوری طور پر "مغضوب" اور "ضالین" کے نقوشِ قدم کی پیروی کر رہا ہے۔" ص۱۰۱

مولف نے مسلمانوں کے "سوادِ اعظم" کو جن "شرعی خطابات" سے نوازا ہے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مولف اپنے سوا یا اپنے ملک کے چند غیر مقلد اور جاہل بہ وہابیت افراد کے علاوہ ہندستان کے تمام مسلمانوں کو "مغضوب" اور "ضالین" کا پیروکار تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ خدا کے فضل سے مسلمانوں کی کثیر تعداد یا اجماعِ اُمت کبھی غلطی پر نہیں ہو سکتا۔ اصلاح کا جذبہ نیک ہوتا ہے مگر اس میں اعتدال ضروری ہے۔ اور ایک دوسرے کے مسلک کا احترام ضروری ہے

قرآن اور علم الافلاک

مصنف : حکیم سیّد محمد کمال الدین حسین ہمدانی
مبصّر : شاہ افتخار
قیمت : ۱۲ روپے
ناشر : رنگ محل علی گڑھ شعر۔ انصاری روڈ، مظفر نگر یوپی

زیر نظر کتاب پروفیسر سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی نے محنت سے لکھی ہے۔ اس میں سورج، چاند، زمین، اور ستاروں کے بارے میں قرآنی تعلیمات کو پیش کیا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ قرآن کریم میں فرمایا تھا" وہی موجودہ دور کی سائنس ثابت کر رہی ہے۔ اور یہ کہ سائنس قرآنی تعلیمات پر کوئی اضافہ نہیں بلکہ اس کے ماتحت ہے۔ اور خوشہ چیں ہے انھوں نے قرآن کریم کی سورۂ نساء کی آیت ۳۳ کو بنیاد بنایا ہے۔ جس میں اللہ نے فرمایا ہے کہ "اس کی ذات وہ ذات ہے جس نے رات اور دن، سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ اور (یہ) کل (اپنے اپنے) مدار پر تیرتے (گردش کرتے) ہیں۔ انھوں نے اس بات پر حلفی زور دیا ہے کہ اگر قرآن کریم

کی تعلیمات عام ہوں تو مسلمانوں کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ اور اس سے زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ کتاب اپنے مباحث کے اعتبار سے اہم ہے

رنگ تماشہ

مصنف : حمید الماس
صفحات : ۱۱۲
قیمت : ۴۰ روپے
ملنے کا پتہ : موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دلی ۲
مبصر : جمیل اختر

"رنگ تماشا" حمید الماس کی دو سو مختصر نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ نظمیں مختلف بحروں میں لکھی گئی ہیں۔ اور تین سطروں پر مشتمل ہونے کے سبب ہر نظم کو "تثلیث" کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی بھی نظم میں تثلیث کی روایتی ہیئت نہیں اپنائی گئی ہے جس میں پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ صنفی اعتبار سے تین مصرعوں اور سترہ اوقاف (پانچ سات پانچ) کے وقفی تناسب میں لکھی جانے والی جاپانی صنف ہائیکو کا شائبہ بھی ان نظموں میں کسی پر نہیں۔ اس لیے انھیں صرف مختصر نظمیں کہا جا سکتا ہے۔ کوئی مخصوص نام نہیں دیا جا سکتا۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

(۱) زعم کرتی ہیں نئی نسلیں ہمیشہ (۲) کس لیے وہ لکھ رہا ہے (۳) چومتی ہے آخری پتے کو جب ان سے پہلے
(۲) بے ضرر باتوں کی تشریحیں (۳) ڈوبتے سورج کی آزردہ کرن
(۱) کس سے تسخیر جہاں تو ہوئی۔ (۲) بہت (۳) تھر تھر آتا ہے شجر

حمید الماس کی یہ دو سو مختصر نظمیں دراصل ان کے تجربات ہیں۔ انھوں نے اردو میں کچھ نئے تجربات کیے ہیں اور مختصر نظم کو نئی ہیئتوں کے ساتھ کچھ نئے انداز دے کر اردو میں ایک صنف کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ ان تجربوں میں بھی انھوں نے زندگی کے نت نئے تجربات کو فنی پیکروں میں ڈھال کر اپنی فنکارانہ عظمت کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے ذات و کائنات میں وقوع پذیر ہونے والی لمحہ لمحہ تبدیلیوں کو جسے انھوں نے "رنگ تماشا" کا نام دیا ہے ان کے حقیقی روپ میں اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ دو سو نظمیں دراصل اسی رنگ تماشا کو شعری پیکر میں دو سو بار کاغذ پر ثبت کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب میں حمید الماس کے شعری کاوشوں پر سلیم شہزاد اور بلراج کومل کا دو مختصر مضمون ہے۔ جس میں انھوں نے نئے تجربوں کے لیے حمید الماس کی کوششوں کو سراہا ہے۔ حمید الماس کی بہت سی کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ امید ہے یہ کتاب بھی پچھلی کتابوں کی طرح بے حد مقبول ہوگی اور لوگ ان کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اردو میں کچھ اور تجربات کریں گے اور ان تجربوں کو فروغ حاصل ہوگا۔ کتابت و طباعت عمدہ اور قیمت مناسب ہے۔ ●●

ہمارے خطوط

● محمد رافق، شہبازیہ ادبی کونسل، مولانا چک، بھاگلپور
زیر نظر رسالہ میں بھی مہمان مدیر ڈاکٹر قیصر شمیم کا اشاریہ " ادب عالیہ کا مستقبل " ہر اردو نواز کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہر تعلیم یافتہ خاندان میں نوجوانوں کی اردو سے بیزاری اور بے رغبتی ہی دل دکھانے کے لیے کیا کم ہے جو مزید تفصیل میں جاکر زخموں کو کریدیں۔ سید ظفر ہاشمی سے خط و کتابت ہوئی، ان کے مضامین کی ہنوز پذیرائی جاری ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس پر تمام اردو ادارے اور اکاڈمیاں سر جوڑ کر بیٹھیں اور اپنے اپنے اعمال و افعال کا احتساب کریں۔ خامیوں کو درست کریں اور اسے وقار کا مسئلہ نہ بنائیں یہ ایک مخلص اہل قلم کا رد عمل ہے جس میں اردو داں طبقے کے دل کی آواز گونج رہی ہے
مئی ۹۴ء کے کتاب نما میں جناب مجتبیٰ حسین کا مضمون " کچھ نثار احمد فاروقی کے بارے میں " بے انتہا پسند آیا۔ طنز و مزاح کے شہنشاہ مجتبیٰ حسین واقعی اپنے قلم کا جادو جگانے میں ماہر ہیں۔ ہر ہر جنبش قلم سے انھوں نے نشتر لگایا ہے اور ہمارے زخموں کی جراحی ہنسی ہنسی میں کرتے چلے گئے ہیں " کھیل غیروں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا " میں جناب یوسف ناظم صاحب نے بھی فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے۔
بظاہر چھوٹے سے رسالے میں جس کا نام " کتاب نما " ہے آپ جس خوبصورتی سے مواد کو سجا سنوار کر پیش کرتے ہیں اور صفحات کو جس Economy کے ساتھ استعمال کرتے ہیں وہ تمام رسالوں کے لیے قابل تقلید ہے۔

● شریف قریشی ۱۲ بھوسہ منڈی، فتح گڑھ، فرخ آباد
مئی ۹۴ء کے "کتاب نما" کے صفحہ ۵۶ پر جناب ایم۔ اے کاوش صاحب کی غزل پڑھی۔ غزل کی ابتدا بحر رمل مثمن محذوف فاعلاتن فاعلاتن فاعلن سے کی گئی ہے مگر شعر نمبر ۴ اور ۵ کے ثانی مصرعے اس بحر سے خارج ہو گئے۔ دونوں مصرعے بحر رمل سالم فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن میں موزوں ہو گئے ہیں۔ غزل کی حقیقی بحر کے ساتھ یہ سراسر زیادتی ہے۔

● ظفر ہاشمی جمشید پور، بہار
کبھی کبھی ہمارے ادب میں کوئی ایسا جیالا بھی ہوتا ہے جو نئی تاریخ بنا دیتا ہے آپ اپنے پرچے میں " مہمان اداریہ " کے ذریعے یہی کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔
فروری کے شمارے کا اداریہ، جناب سید ظفر ہاشمی مدیر "گلبن"، احمد آباد نے لکھ کر اور آپ نے اس کو شائع کر کے وہ سنگ میل پیش کیا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔
جناب سید ظفر ہاشمی نے اپنے پرچے "گلبن" کے ذریعے ہمیشہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے طویل جنگ کی ہے اس کے علاوہ دوسرے پلیٹ فارم کے ذریعے بھی جہاں اور جب ان کو موقع ملا ہے عملی طور سے اپنی بے لوث خدمات کا ثبوت فراہم کیا ہے ہمیں ان کے نظریات سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مذکورہ اداریہ میں اٹھائے گئے سوالات

ر ستجاویز کے تناظر میں ہمیں بے حد سنجیدگی
ے ساتھ ان پر عمل پیرا ہونے کی شدید ضرورت
ہے۔

کوثر مظہری، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

کتاب نما، کا تازہ شمارہ مئی ۹۴ء کچھ
ن قبل پٹنہ سے منگوایا تھا۔ خوب ہے۔
پ کی سعیٔ جمیلہ نے اسے اور بھی حسن بخشا
ہے۔ نئی نسل سے تعلق رکھنے والے جناب
یصر شمیم کا اداریہ/اشاریہ " ادب عالیہ کا مستقبل"
چھا تو ہے مگر بھرپور نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے
کہ بات کرتے کرتے اچانک غنودگی غالب
آگئی ہو۔ حالانکہ جن نکات کی طرف اشارے
ہوئے ہیں، ان میں وسعت بہت تھی۔ سب
کچھ کے باوجود آپ مبارکباد کے لائق ہیں کہ
قدامت پسندی کے غار سے نکل کر نئی روشنی
سے قارئین "کتاب نما" کو خیرہ کرنے کی کامیاب
کوشش کی ہے۔ یہ سلسلہ اگر دو سالوں تک
باقی رہے تو نئی سوچ کی کئی جہتیں منظر شہود
پر آجائیں گی۔

● م۔ق۔سلیم، سائبان، ۶۹۴-۲-۱۹
بیرون فتح دروازہ، حیدرآباد

ڈاکٹر قیصر شمیم کا اشاریہ " ادب عالیہ
کا مستقبل"، مئی ۹۴ء تشنہ رہ گیا۔ انھوں
نے مکمل طور پر ادب عالیہ کے مستقبل کے بارے
میں بحث نہیں کی۔ بلکہ چند ایک پہلوؤں کے
بعد اس کو مختصر کر دیا۔ مگر نفس مضمون بتانے
میں کامیاب رہے۔ اور جن امور کی نشاندہی
کی یقیناً آج وہ بے توجہی کا شکار ہیں۔ اچھی
شاعری سے لطف اندوز ہونے والوں کا حلقہ
سمٹتا اور سکڑتا ہی نہیں جا رہا ہے بلکہ منجمد
ہوتا جا رہا ہے۔ اچھا ادب پڑھنے کے لیے
آنکھیں ترستی ہیں۔

مشہور ادیبہ عصمت چغتائی نے کہا تھا
" ہم نے جن ادیبوں کو پڑھ کر لکھنا شروع کیا
آج ایسے ادیب کہاں؟ آج کے ادیب ہم کو
پڑھ کر لکھتے ہیں تو پھر معیاری ادب کہاں سے
تخلیق ہوگا؟"

ایک ادیبہ کے یہ چبھتے ہوئے تیر اس وقت
کے ادیبوں پر ایک کاری ضرب تھے اور یہی
وجہ ہے کہ آج ادب کے شاہکار نظر نہیں
آتے۔

" سرود رفتہ"، یا " یاد رفتگاں " کے عنوان
سے اگر آپ ہر ماہ ایک " ادب پارہ" شائع
کریں تو نوجوان نسل اس سے آشنا ہوگی
یہ شہ پارہ کتاب نما کی جلد ۱ سے شروع
کریں۔ تو ہم کو چونتیس (۳۴) سال پہلے کے
ادب کے خد و خال سے واقفیت ہوگی۔ آج
ادب عالیہ کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ خاص
طور پر ہندستان میں ادب تخلیق کرنے والوں
کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ہمارے
ادب کا معیار اسی طرح گرتا رہا تو آنے والا
کل ہمارے ادب کے لیے بے ادبی [illegible]
رہ جائے گا۔ اشاریہ " اشاریہ " کی طرح
ہو تو بہتر رہے گا۔ اتنے مختصر اشاریہ مت لکھوائیے
کہ صرف اشاروں اشاروں میں پڑھ سکیں۔

● سعید الظفر چغتائی۔ علی گڑھ

پچھلے شمارے سے افتخار احمد اعظمی
کے انتقال کی خبر ملی۔ کتنی ہی یادیں آکے بکھر
گئیں۔ جولائی سن ۵۲ء کی بات ہے، میں
ہائی اسکول پاس کرکے لکھنؤ پڑھنے گیا ہی
تھا کہ اسی جہانگیر آباد پیلس میں جہاں ان دنوں
وہ عبد الغنی انصاری صاحب کے یہاں رہتے

تھے، ان سے اور قاضی خورشید احمد سے ملاقات ہوئی ــــ قاضی صاحب جن کا سا باکمال استاد میں نے تب سے اب تک روئے زمین پر نہیں دیکھا اور جن کا ذکر تہذیب الاخلاق (علی گڑھ) کے اوراق میں کر چکا ہوں۔ پڑوس کا معاملہ تھا، برابر ملاقات ہوتی رہتی۔ پھر انھوں نے علامہ اقبال سہیل کے دیوان اور مجموعۂ نعت مرتب کیے تو ایک ایک نسخہ مجھے بھی عنایت کیا۔ برسوں بعد جب میں مولوی گنج منتقل ہو گیا تھا، ملے تو اپنے ساتھ آثر لکھنوی صاحب کے گھر لے گئے اور میری اس نیاز مندی کا سلسلہ ان کے "شریف ادب" کے انتقال سے کچھ پہلے یوروپ سے میری عارضی بلکہ چھٹیوں میں (واپسی اگست) سن ۷۶ء تک جاری رہا۔ اس کا حال "جامعہ" میں بیان کر چکا ہوں۔ اثر صاحب نے افتخار اعظمی کی فرمائش ہی پر دیوان سہیل پر اپنا مفصّل مقدمہ لکھا تھا۔ وہ افتخار کے مذاقِ شعر کو بہت سراہتے تھے۔

اس اثنا میں افتخار ایک بار پھر علی گڑھ کے کے ہو کے گئے تھے۔ اور جامعہ ازہر کے منصوبے بنا رہے تھے۔ شاعر تو ان دنوں ہمارے کھاتے پیتے مسلم معاشرے میں ہر دوسرا نوجوان ہوتا تھا مگر افتخار کا والہانہ مزاج کچھ ایسا فطری طور پہ شاعرانہ تھا۔ جیسا اس عمر میں شاید قارث کرماں کا رہا ہو یا کم و بیش۔ مجھ سے ایک دن کہنے لگے، یہ سائنس وائنس میں کیوں کھپ رہے ہو۔ جدید عربی و فارسی پڑھو۔ مشرقِ وسطیٰ میں بڑے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔ مگر خود ان امکانات سے ہمیشہ دور رہے۔ ہاں جدید و قدیم ادب پر مضامین لکھے اور چھاپے۔

رفیقِ حیات انگلستان سے چل کے خود لکھنؤ آئیں اور کچھ دن ان کی ہی جائداد سنبھالنے کے بعد خود انھیں کو سنبھال کے لندن لے گئیں۔ میں علی گڑھ میں ملازم ہو گیا تھا کہ ایک روز وارد ہوئے، پہچانا تو بولے، میں کہتا تھا "اسٹاف روم" میں جہاں ہر کس سیاستِ بحث رہا ہے، یہ کون خموش بیٹھا سوچ رہا ہے۔ وہ آخری ملاقات تھی۔

کیسا حسین شخص اور کیسا تارک الدنیا!

ایک قصہ اور یاد آیا۔ پہلی شادی ایک عرب ادیبہ سے کی تھی مجھے فخر سے بتایا تھا کہ اُن کی اہلیہ نے مولانا علی میاں کو فون کیا تو وہ عربی زبان و ادب کے نکتہ سنج ادیب بلاغتِ عربیہ کے کیف سے ویسے ہی سرشار ہو گئے جیسے کبھی مامون الرشید ہوتے تھے۔ خطاب کے جواب میں فرمایا انی اسمع یعنی تم رطب اللسان رہو، میں ہمہ تن گوش ہوں۔ اس سے مرحوم کے ذوقِ ادب اور شعورِ حُسن کا اندازہ کیجیے ــ

ادبی و تہذیبی خبریں

یوپی انجمن ترقی اردو کی صدر

سلطانہ حیات کا انتقال

لکھنؤ۔ ۶ جون قومی آواز لکھنؤ کے بانی مدیر حیات اللہ انصاری کی اہلیہ محترمہ سلطانہ حیات کا دل کی حرکت بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا محترمہ سلطانہ حیات نہ صرف تعلیمی میدان میں کافی سرگرم تھیں بلکہ وہ ایک طویل مدت سے اترپردیش انجمن ترقی اردو کی صدر بھی تھیں۔ ۷۰ سالہ سلطانہ حیات سماجی کاموں میں بھی پیش پیش رہتی تھیں۔ لواحقین میں ان کے شوہر حیات اللہ انصاری اور دو بچے ہیں انھیں آج شام یہاں دفن کیا گیا۔ ادارہ کتاب نما و مکتبہ جامعہ مرحومہ کے انتقال پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعاگو ہے اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے آمین، اور متعلقین کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

جدّہ میں منظر بھوپالی کے اعزاز میں مشاعرہ

ہندستان کے معروف شاعر جناب منظر بھوپالی گزشتہ دنوں جدّہ آئے تو اُن کے اعزاز میں خاتون شاعرہ محترمہ منوّر النساء منوّر کے ہاں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا اس محفل کی نظامت احمد سعود قاسمی نے اور صدارت عبدالباری انجم نے کی۔ کلام کا انتخاب پیش خدمت ہے۔

آئینہ خانہ ہے عالم سارا
آپ کیا پائیں گے حیران ہوکے
اپنی بے باکی پہ نازاں ہے کوئی
ہم پشیماں ہیں پشیماں ہوکے

(عبدالباری انجم)

خواب دکھانے والوں سے ہوشیار رہو
جادوگر کی چالوں سے ہوشیار رہو
غافل ذرا ہوئے تو سرک جائے گا
لکڑی کی ان ڈھالوں سے ہوشیار رہو

(منظر بھوپالی)

دشت و صحرا کو چمن زار بناؤ تو کہیں
خار زاروں کا کوئی یار بناؤ تو کہیں

(منور النساء منوّر)

اپنی آواز کو اوروں سے ملانے والے
تری پہچان مٹادیں گے زمانے والے
کس طرح اپنی مسافت کو مکمل کرتا
مجھ سے آگے تھے نشاں مجھ کو مٹانے والے

(شاہد انور)

مجھے دیکھے ہوئے منظر نہیں بچھتے
مگر جو کچھ ہے نادیدہ بلاتا ہے
روانہ ہو رہا ہوں پھر سفر پر میں
کہ اک بھولا ہوا وعدہ بلاتا ہے

(نسیم سحر)

میں ہوں ایک لفظ مٹا مٹا سا کسی پرانی کتاب کا
یہ بہت ہے آپ نے پڑھ لیا مری فکر میری زبان کیا
کہیں سوز حرب کی تھی تطار کہیں سلسلے تھے گھٹاؤں کے
اسی دھوپ چھاؤں میں گم ہوئی مرے جسم سے مری جان کیا

(سید محمد احمد نقوی)

حلقہ ادب بہار کے زیر اہتمام شاندار فکشن سمینار

۱۵ جون کو مقامی اردو بھون میں حلقہ ادب بہار کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ زیر صدارت ڈاکٹر عبدالمغنی صدر حلقہ ادب بہار منعقد ہوا جلسے کی کارروائی حلقہ ادب کے جنرل سکریٹری جناب فخرالدین عارفی نے چلائی۔ جلسے میں کئی اہم فیصلے کیے گئے جن میں چند درج ذیل ہیں۔

طے کیا گیا کہ حلقہ ادب بہار کی جانب سے اکتوبر ۱۹۹۴ء میں ایک شاندار فکشن سمینار کا انعقاد کیا جائے۔ فکشن سمینار کی تیاریوں کو آخری شکل دینے اور اس کی کارروائیوں کو تیزی سے آگے بڑھانے کی غرض سے ایک سب کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے درج ذیل حضرات ممبر نامزد کیے گئے۔

جناب شفیع مشہدی، ڈاکٹر عبدالصمد، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، جناب مشتاق احمد نوری جناب قاسم خورشید، ڈاکٹر جاوید حیات، جناب فخرالدین عارفی (کنوینر)

طے کیا گیا کہ اس سلسلے میں ماہنامہ مریخ کا ایک فکشن نمبر بھی شائع کیا جائے۔ اس سلسلے میں طے کیا گیا کہ جولائی ۹۴ء سے مریخ کا شمارہ ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں شائع کر دیا جائے گا۔ نیز عنقریب اس رسالے کے کئی خاص شمارے مثلاً "عبدالصمد نمبر" "فکشن نمبر" اور "بہار نمبر" شائع کیے جائیں گے۔

آخر میں یہ بھی طے کیا گیا کہ جولائی کے اوائل میں حلقہ ادب بہار کی جانب سے عظیم آباد کے اساتذہ سخن کے اعزاز میں ایک مخصوص شعری نشست کا انعقاد کیا جائے، جس میں تمام بزرگ شعرائے کرام کے علاوہ دوسرے نمایندہ شعرا حضرات کو بھی دعوت دی جائے گی۔

جلسے کی کارروائی میں درج ذیل اہم اور قابل ذکر شخصیتوں نے حصہ لیا۔

ڈاکٹر عبدالمغنی، جناب شفیع مشہدی، جناب قیوم خضر، ڈاکٹر عبدالصمد، پروفیسر شکیب ایاز جناب سید انیس الرحمٰن، پروفیسر صدیق مجیبی ڈاکٹر شبیر احمد، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، جناب مشتاق احمد نوری، جناب فخرالدین عارفی، جناب نسیم مظفرپوری، جناب شام رضوی، جناب قاسم خورشید، ڈاکٹر جاوید حیات، ڈاکٹر شاہد جمیل، ڈاکٹر حبیب مرشد خاں، ڈاکٹر اشرف النبی قیصر، جناب منظر عالم مخدومی، جناب محمد نور عالم، جناب افتخار عظیم چاند اور جناب نسیم احمد وغیرہ۔

حلقہ ادب بہار کے جنرل سکریٹری جناب فخرالدین عارفی نے آخر میں تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

وسیم بیگم کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری

وسیم بیگم کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کی طرف سے ان کے مقالے "بیسویں صدی میں اردو غزل ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۷ء تک" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ انھیں یہ ڈگری پروفیسر محمد ذاکر کی نگرانی اور پروفیسر عنوان چشتی کے دور صدارت میں ملی ہے اس سے قبل ڈاکٹر وسیم بیگم نے دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو سے ایم، فل پاس کیا تھا، ان کا موضوع "مصحفی کی مثنوی بحر المحبت کا تنقیدی تجزیہ" تھا، ڈاکٹر وسیم کی ذات اور

اعلا کارکردگی سے اردو ادب کی بہترین توقعات وابستہ ہوگئی ہیں۔

اسلم جمشید پوری
سکریٹری بزم جامعہ شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

مخمور کاکوروی کو پی ایچ ڈی

اردو شاعر اور شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر مسٹر فرقان علی سلمانی (مخمور کاکوروی) کو لکھنؤ یونی ورسٹی نے ان کے تحقیقی مقالہ "میر نذر علی درد کاکوروی حیات اور کارنامے" پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ انھوں نے یہ مقالہ پروفیسر سید محمود الحسن رضوی صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونی ورسٹی کی نگرانی میں سپرد قلم کیا ہے۔

پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

ڈاکٹر (کماری) نگار سلطانہ کو کانپور یونی ورسٹی نے اپنے جلسۂ تقسیم اسناد منعقدہ ۲۳ اپریل ۱۹۹۴ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مرحمت کی۔ یہ ڈگری ڈاکٹر موصوفہ کو اپنے تحقیقی مقالے "بیسویں صدی میں اردو کے غیر مسلم نعت گو شعراء" پر تفویض کی گئی ہے یہ تحقیقی مقالہ "مہاتما گاندھی پی۔ جی کالج فتح پور" کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتح پوری کی نگرانی میں لکھا گیا ہے۔"

پٹنہ میں عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ

پٹنہ۔ آج سہ پہر یہاں انجمن ترقی اردو بہار کی مجلس عاملہ نے ڈاکٹر عبدالمغنی کے زیر صدارت ایک اہم جلسہ میں تجویز منظور کرکے فیصلہ کیا کہ اردو زبان و ادب کے مسائل پر غور وفکر کے لیے پٹنہ میں انجمن کے زیر اہتمام ایک عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا جائے۔ اور اس سے قبل ڈویزنل کانفرنسوں کے بعد ایک ریاستی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا جائے تاکہ اردو آبادی کو درپیش مشکلات کا حل نکالنے کے لیے اقدامات تجویز کیے جائیں۔ اس سلسلے میں ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی اور انجمن کی سالانہ گرانٹ میں اضافے کے لیے صدر انجمن نے وزیر اعلیٰ بہار شری لالو پرشاد یادو کا شکریہ ادا کیا۔

مجلس عاملہ نے تفصیل کے ساتھ غور وفکر کرکے قانون اردو کے نفاذ، پرائمری، سکنڈری، یونی ورسٹی اور مدرسہ کی سطحوں پر اردو کی تعلیم، اقلیتی تعلیمی اداروں کے مطالبات، مرکزی تعلیمی اداروں میں اردو کے مضمون کی شمولیت، بہار پبلک سروس کمیشن میں اردو ذریعہ امتحان کے سلسلے میں مشکلات، بہار ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن سے اردو کتابوں کی اشاعت کے متعلق شکایات، بہار اردو اکادمی کی بہتر کارکردگی نیز مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونی ورسٹی کے قیام کے فیصلے پر عمل درآمد وغیرہ متعدد موضوعات و مسائل پر تجویزیں منظور کیں، ساتھ ہی انجمن کی نئی ممبر سازی کا فیصلہ کیا۔ ایک خاص تجویز کے ذریعے حکومت بہار کو مشورہ دیا گیا کہ سکنڈری اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے کا استعمال اس طرح ہو کہ پہلی زبان مادری زبان کے بعد دوسری زبان کے طور پر ایک جدید ہندستانی زبان کی حیثیت سے جیسے

اردو بولنے والے ہندی پڑھ رہے ہیں۔ ویسے ہی ہندی بولنے والے بھی اپنی خوشی سے اردو پڑھیں۔ انجمن کی مجلس عاملہ نے حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ مجوزہ اردو یونی ورسٹی بہار میں قائم کی جائے، اس لیے کہ اردو پڑھنے والے طلبہ وطالبات یہاں سب جگہوں سے زیادہ ہیں اور اردو چودہ سال سے ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہے۔

ریاست کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے انجمن کی مجلس عاملہ کے جن ارکان و مدعوئین خصوصی نے غور و بحث میں نمایاں طور پر حصہ لیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

جناب سید رضی حیدر (جنرل سکریٹری) پروفیسر ابوذر عثمانی (نائب صدر) جناب جمیل احمد ایڈوکیٹ (نائب صدر) جناب سید انیس الرحمٰن (خازن) جناب ہارون رشید پروفیسر مظفر اقبال، جناب ڈاکٹر شبیر احمد (سکریٹری)، پروفیسر قمر اعظم ہاشمی، جناب ریاض عظیم آبادی (سکریٹری) جناب فخرالدین عارفی (سکریٹری)، پروفیسر شفیع احمد، جناب معین شاہد، جناب سید فضل وارث، جناب اختر مدھوپوری، جناب اویس احمد دوراں، جناب محمد اکرام الحق، جناب احترام الیقین، نجیب اختر، جناب شمیم ربانی، جناب عبدالقیوم انصاری، جناب حبیب مرشد خاں جناب رسول اختر، جناب منظور حسن، پروفیسر ظفر حبیب، جناب قیوم خضر، ڈاکٹر شکیب ایاز وغیرہم۔

افتخار عظیم

آفس سکریٹری۔ انجمن ترقی اردو۔ بہار

ہمدم صحرائی کی کتاب "شہر سخن" کا رسم اجرا

جموں (بیتاب) گزشتہ دنوں جموں کے پریمیر ہوٹل میں جناب ہمدم صحرائی (ریٹائرڈ کرنل پی ایس کپور) کے پہلے مجموعۂ کلام "شہر سخن" کا اجرا ہوا۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی کشمیر ٹائمز کے چیف اڈیٹر جناب وید بھسین کے ہاتھوں سرانجام پائی جبکہ تقریب کی صدارت بزرگ شاعر و نقاد جناب طالب ایمن آبادی نے فرمائی۔

اس موقع پر جموں یونی ورسٹی شعبہ اردو کی ریڈر محترمہ خورشید ہمراہ صدیقی نے "شہر سخن" پر "محبتوں کا شہر" کے عنوان سے ایک مکمل جائزہ پیش کیا جسے بے حد سراہا گیا۔ اس موقع پر جناب بھسین، محترمہ ہمراہ اور جناب طالب ایمن آبادی نے اس بات پر زور دیا کہ اردو زبان کو ختم کرنے کے لیے جہاں مختلف عناصر کی طرف سے آئے دن عجیب عجیب ہتھکنڈے استعمال میں لائے جارہے ہیں وہاں ہمارا فرض بنتا ہے کہ اردو زبان کی بقا اور فروغ کے لیے ایـ انتظام کیا جائے جس سے یہ زبان زندہ رہ سکے۔ اس موقع پر محبان فروغ اردو او بزم اردو ادب جموں جس کے پلیٹ فارم یہ تقریب منعقد کی گئی مشترکہ طور پر فیصلہ کیا ہے جو لوگ اردو زبان سے لگاؤ تو رکھـ ہیں لیکن اردو رسم الخط نہیں جانتے انھیں مفت اردو تعلیم دینے کے لیے سینٹر قا کیے جائیں۔

تقریب کے آخر میں ایک شعری نشسـ

کا انعقاد کیا گیا جس میں جناب طالب ایمن آبادی۔ عرش صہبائی، عابد مناوری۔ بیتاب جے پوری، ہنسراج بے بس، جمال گیاوی، یوگیندر طاہر، سریندر سرمد، بشیر تشنہ، وجے ساحل، ہمدم عادل ہیرانگری، دویندر مشتاق، نغیر کھوڑا و دیگر کئی مقامی شعرا نے اپنا تازہ کلام پیش کیا۔ نظامت کے فرائض بیتاب جے پوری نے ادا کیے۔

اقبال اکیڈمی محبوب نگر کے زیر اہتمام علامہ اقبال میموریل لیکچر

محبوب نگر (اے پی) اقبال اکیڈمی محبوب نگر کے زیر اہتمام "علامہ اقبال میموریل لیکچر" کا اہتمام بتاریخ ۱۵ اپریل ۹۴ء بروز ۱۰ بجے دن کیا گیا تھا ممتاز ماہر اقبالیات جناب ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب پروفیسر اسلامک اسٹڈیز لندن یونی ورسٹی نے بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ علامہ اقبال مشرقی علوم و عرفان اور مغربی افکار و عمل کے رمز شناس تھے۔ ان کی شاعری نے مشرق و مغرب میں فکر کے کئی چراغ روشن کیے اور مسلمانوں میں حکیمانہ فکر پیدا کرنے میں ایک مثبت رول انجام دیا ہے۔ اس اجلاس کو جناب ظہیر الدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈمی حیدرآباد، جناب کریم رضا معتمد اقبال اکیڈمی حیدرآباد، جناب مضطر مجاز صاحب نے مخاطبت کا شرف حاصل کیا۔ مولانا حافظ و قاری سید شاہ غفور الحق صاحب نے اقبال اکیڈمی محبوب نگر کی سرگرمیوں کو سراہا۔ دعا کے بعد ایک محفل شعر منعقد کی گئی۔ جناب حلیم بابر، جناب ظہیر ناصری، جناب سلیم عابدی، جناب نور آفاقی جناب مضطر مجاز، جناب کریم رضا اور غوث عنایت اللہ نے کلام سنا کر داد حاصل کی۔

پروفیسر وہاب اشرفی بہار اسٹیٹ یونی ورسٹی سروس کمیشن کے چیرمین نامزد

اردو حلقے میں یہ خبر خوشی کا باعث ہوگی کہ بہار سرکار نے اپنی کشادہ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اردو کے ممتاز اور ہر دلعزیز ادیب اور نقاد پروفیسر وہاب اشرفی کو بہار اسٹیٹ یونی ورسٹی سروس کمیشن کا چیرمین بنا دیا۔ غالباً پروفیسر وہاب اشرفی اردو کے پہلے ادیب ہیں جن کو اتنا اہم عہدہ پیش کیا گیا ہے ورنہ ہمارے خیال میں پروفیسر موصوف اس سے بھی بڑے اور اہم منصب کے اہل ہیں۔

ادارہ کتاب نما اور مکتبہ جامعہ موصوف کی کامیابی اور ترقی کے لیے دعا گو ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی کا موجودہ پتا۔

دفتر

Gokul Marg,
North Shri Krishna Puri,
Boring Road,
PATNA-13
Ph: 260063

رہائش

22, Strand Road,
Netaji Subhash Marg,
PATNA-800001
Ph: 653472

اردو کے دو معروف ادیب صحت یاب

اردو داں حلقے میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے ممتاز ادیب ڈاکٹر اسلم فرخی اور مسعود احمد برکاتی دل کے شدید حملے کے بعد اللہ کے فضل و کرم سے اب اچھے ہیں اور حسب سابق لکھنے، پڑھنے میں مصروف ہیں۔

دادا بھائی پھالکے ایوارڈ کے وقار میں اضافہ

اردو کے منفرد لب و لہجے کے شاعر

● شہنشاہ تغزل

مجروح سلطانپوری

کو اقبال سمان کے بعد دادا بھائی پھالکے ایوارڈ ملنے پر ادارہ کتاب نما اور مکتبہ جامعہ اپنی طرف سے اور تمام اردو داں حضرات کی طرف سے مبارکباد پیش کرتا ہے اور مجروح صاحب کی صحت، سلامتی اور درازیٔ عمر کے لیے دعاگو ہے۔

[illegible] خلیق ٹونکی [illegible]

* نئی دہلی۔ ۲۵ جون (بذریعہ ٹیلی فون) یہاں آمدہ اطلاع کے مطابق ہندستان کے مشہور خطاط محمد خلیق ٹونکی کا آج شام ان کے آبائی وطن ٹونک میں انتقال ہو گیا۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔ ان کی عمر ۶۲ برس تھی۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ ۱۳ سال کی عمر سے ہی پریس لائن میں قدم رکھنے والے مسٹر خلیق نے خطاطی کے فن کے حصول کے لیے ہندستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور آخرکار ۱۹۵۳ء سے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ وہ جمعیۃ علماء کے روزنامہ الجمعیۃ سے وابستہ رہے۔ ۱۹۶۷ء میں اس وقت کے وزیر تعلیم پروفیسر نورالحسن نے غالب اکیڈمی میں خطاطی کا اسکول کھول کر مسٹر خلیق ٹونکی کو اس کا انچارج مقرر کر دیا۔ انھیں ان کے فن خطاطی کی وجہ سے ۱۹۸۴ء میں غالب سب ایوارڈ اور ۱۹۸۵ء میں نیشنل ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۸ء کی آکارا نمائش میں بھی انھوں نے حصّہ لیا اور ۱۹۸۸ء میں حکومت عراق کی دعوت پر ایک خطاطی نمائش میں ہندستان کی نمایندگی کی۔ ۱۹۹۰ء میں حکومت ہند کی جانب سے انھیں حج کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب بھی بھیجا گیا تھا۔ اشتیاق عابدی کے زمانے میں اردو اکیڈمی کی جانب سے انھیں ۹۳-۱۹۹۲ء کا بہترین اردو خطاطی ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ (قومی آواز)

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ
کتاب نما
نئی دہلی ۲۵

اگست ۱۹۹۴ء جلد ۳۴ شمارہ ۸

فی پرچہ	6/=
سالانہ	55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	320/=

ایڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ ممبئی ۴۰۰۰۰۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات، نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برلٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں/غزلیں

مانگے کا اجالا

طنز و مزاح

جائزے

نئی مطبوعات

تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات (تاریخ)
ڈاکٹر سید جمال الدین ۵۱/
سائنس کی ترقی اور آج کا سماج (خطبات) ڈاکٹر سید ظہور قاسم ۱۰/-
معاصر اردو تنقید مسائل و میلانات (تنقید)
مرتب پروفیسر شارب ردولوی ۵۵/
ابوالکلام آزاد ایک تقابلی مطالعہ (آزادیات)
قاسم سید علیگ ۳۰/
نمائندہ اردو افسانے (افسانوی ادب)
مرتبہ پروفیسر قمر رئیس ۶۰/
تاریخ ادب اردو (تاریخ اردو) مرتبہ کرناٹک اکیڈمی ۱۰۰/
نئی سمتوں کا شعور (تنقید) ڈاکٹر خورشید سمیع ۸۰/
چاروں موسم (مغربی ڈرامے) ڈاکٹر ساجدہ زیدی ۱۵۰/
خونخوار لڑکیاں (جاسوسی) ابن صفی ۳۵/
درندوں کی بستی " " ۳۵/
ہلاکت خیز " " ۳۵/
فضائی ہنگامہ " " ۳۵/
الف لیلیٰ نیا اڈیشن (داستان) ادارہ ۲۵/
میزان (شعری مجموعہ) انور ندیم ۸۰/
میٹھی میٹھی بولیاں (دوہے) نادم بلخی ۳۵/
تہذیب الاخلاق تحقیقی مطالعہ (تنقید)
نفیس بانو ۱۲۵/
ادب، فلسفہ اور وجودیت (پاکستانی مطبوعہ)
شیما مجید، نعیم احسن ۳۵۰/
انسائیکلوپیڈیا قائد اعظم (پاکستانی مطبوعہ)
زاہد حسین انجم ۱۲۰۰/
فتاویٰ عالمگیری مکمل ۱۰ حصص (مذہب)
مترجم سید امیر علی ۱۸۰۰/

سرورق ــــــــ شمیم طارق

فتاویٰ رضویہ جلد پنجم (مذہب) احمد رضا خاں صاحب ۲۵۰/
سرور القلوب (مذہب) " ۵۰/
داستان حق پرستوں کی " وقار صدیقی ۳۵/
دہلی میں اردو افسانہ (افسانوی ادب) ڈاکٹر ہما ۱۲۵/
مذہب مسلمان اور سیکولرزم ڈاکٹر اشفاق محمد خاں
قیمت عام اڈیشن ۱۵۰/
ڈی لکس اڈیشن ۲۰۰/

مہمان مدیر
شمیم طارق
فلیٹ نمبر ۲۷ - چوتھی منزل - مرزبان نیشن
بائیکلہ فروٹ مارکیٹ
بمبئی ۲۷

اشاریہ

تخلیقی ادب کی موجودہ صورت حال

انسان کی باطنی قوتوں کو نظریہ سازی کے ذریعہ چھوٹے چھوٹے دائروں میں بانٹ دینے یا پھر ادب کو کسی سیاسی موقف کا بانگ دار بنا دینے کے ردّ عمل میں زندگی کی مرکزیت ومعنویت کے خلاف ہر عمل کو اپنی پہچان بنا لینے کی کوششوں کو تخلیقی عمل سمجھ لینے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زندگی کی بصیرت اور علم کی آگہی کا بیج مرنے لگا ہے۔ نئی نسل میں انسانی قدروں اور اجتماعی صداقتوں کی تلاش کی کوئی سعی رہ گئی ہے نہ خود اپنی مخفی قوتوں کو پا لینے کی تڑپ ــــ نتیجتاً آج کا سارا ادب داخلی انتشار اور ذہنی خلفشار کی زد پر ہے۔

بیس پچیس برس کے عرصے میں مطلع تخلیق پر طلوع ہونے والے قلم کاروں میں زندگی کی وہ بصیرت اور زبان وادب کی وہ معنویت و لطافت بھی نہیں ہے جو اس سے پہلے کسی نہ کسی سطح پر نظر آجاتی تھی۔ شاید اس لیے کہ ادبی نظریہ سازوں نے مختلف اصطلاحوں کی مختلف بلکہ متضاد وضاحتوں سے وہ بھول بھلیاں تعمیر کی ہیں جن میں پھنس جانے والا باہر نکلنے کا راستہ بھول کر کھلاہٹ وجھنجھلاہٹ میں کبھی خود اپنے آپ سے جوجھتا اور کبھی دیواروں سے سر ٹکراتا ہے۔

یہ اس لیے بھی ہے کہ زندگی اور ادب کے حوالے سے اب تک جتنی بھی بحثیں مسلط کی گئی ہیں ان میں افراط و تفریط نے اس بنیادی صداقت کو قبول کرنے سے بوجوہ انحراف کیا ہے کہ تنوع اور گہرائی ادب کی خصوصیت ہے اور حسن بیان شعر و ادب کی ــ ان دونوں کا متوازن امتزاج زندگی کی دلکشی اور ادب کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔

ادب نیا پرانا نہیں ہوتا، اس کا ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں اور جس طرح ایک خاص عہد کا انسان اس میں اپنے کارناموں کو شامل کرکے اگلی نسلوں تک پہنچاتا ہے اسی طرح ایک دور کا شاعر وادیب شعری ادبی سرمایوں کا محافظ و نگراں بن کر انھیں سنبھالتا بھی ہے اور تخلیق کار ہونے کے ناتے وقت و حالات

کے تقاضوں کے مطابق ترمیم وتنسیخ کرکے، انھیں نئی نسل کو سونپتا بھی ہے متقدمین، متوسطین اور متاخرین ادبی شعری زنجیر کی مسلسل کڑیاں ہیں جنھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ماضی میں جو ادب اچھا اور سچّا ادب مانا گیا اُسے آج بھی اچھا اور زندگی سے قریب تر مانا جائے لیکن یہی بات حال کے ہر تجربے کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے کیونکہ زندگی کے تئیں نظریے اور رویّے میں تبدیلی کے ساتھ اچھّے اور سچّے کی تعریفیں بدلتی رہتی ہیں اس کے باوجود عہد بہ عہد منتقل ہوتی صداقتوں میں 'کچھ' تو ہوتا ہے جس کو ہر عہد 'امانت' سمجھتا ہے؟

اسی 'کچھ' کی ترجمانی یا مصوّری کرتے وقت ادب کی روایتوں، فن کی لطافتوں اور عصری تقاضوں کا لحاظ ضروری ہے کیونکہ ادب اور زندگی ایک دوسرے کی ہم نوائی اور رہنمائی میں اپنا سفر طے کرتے ہیں۔ دونوں کا ایک دوسرے پر اثر پڑتا ہے۔

زندگی کو اجتماعی شکل میں دیکھا جائے یا انفرادی اور ذاتی سطح پر، ادب کے سرچشمے زندگی ہی سے پھوٹتے ہیں۔ زندگی سے بے تعلق ہوکر کوئی ادب صحیح معنی میں ادب نہیں ہوسکتا اور اس تعلق کے بدلے یہ اپنے مقام ومرتبے یا خود مختار نظام کا سودا کیے بغیر زندگی کی خدمت بھی کرتا ہے تزئین بھی —— جس سے حال میں ماضی کے نقوش اُبھرتے ہیں اور ماضی وحال کے ان نقوش میں مستقبل کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

اس میں عورت ومرد کی تفریق بھی جائز ہے کیونکہ وہ زمانہ لد گیا جب عورتیں صرف موضوعِ سخن بننے کے لیے ہوا کرتی تھیں انھیں کسی کو موضوعِ سخن بنانے کا حق حاصل تھا نہ ان میں اتنی ہمّت تھی کہ وہ کسی چیز کو خصوصاً مردوں کو موضوعِ گفتگو بنائیں۔ جین آسٹین، جینا وولف، میرا بائی، نینترا سہگل اور خود اردو میں قرۃ العین حیدر نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ کسی مرد کی تخلیق سے کم تر نہیں ہے۔

اچھّے ادب کی تخلیق کے لیے حالات کا سازگار ہونا بھی کوئی شرط نہیں ہے، کیونکہ دنیا کا عظیم ادب وہ ہے جو ناسازگار حالات ہی میں تخلیق ہوا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جنگ چھڑی، قومی بحران پیدا ہوا یا قوم کے ایک حصّے نے بمباری کی یا دوسرے نے دہشت گردی کی راہ اپنائی اور پھر حکومتِ وقت نے ظلم وقہر کے سلسلے دراز کر دیے تو ادیبوں نے قلم رکھ دیے یا شاعروں نے احساسات کی بہرے دلری قبول کر لی بلکہ جب ملکوں میں خاک وخون کے سیلاب آئے۔ شہر کے شہر جلا کر راکھ کر دیے گئے یا آبادی تاراج کر دی گئیں تب بھی شاعروں اور ادیبوں نے خونِ دل کی سیاہی سے لکھنے کا کام جاری رکھا، پھانسی چڑھے، گولیوں سے اڑائے گئے اور جلاوطن ہوئے پھر بھی ذہنی خلفشار وقلبی انتشار، روحانی بے اطمینانی اور

اقتصادی کساد بازاری کے اثرات کو اپنے ذہن و ضمیر پر مسلط ہونے نہیں دیا۔ لہٰذا ناسازگار حالات میں بھی ایک تابناک ادبی دور کا آغاز ہوا۔

یورپ میں قرونِ اولیٰ کی رزمیہ داستانوں سمیت نشاۃ ثانیہ کا سارا ادب، ریفارمیشن کے زمانے کا جرمن ادب، روسی روایت اور سوشلسٹ حقیقت پسندی، فرانس کی عقلیت پسندی کو چھوڑ دیے، ہندستان میں دارالمصنّفین، جامعہ ملیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انجمن ترقی اردو، جامعہ عثمانیہ.......... نے غلامی کے عہد میں بھی کیسے کیسے ادیب شاعر، محقق، مترجم اور صحافی دانشور پیدا کیے ہیں۔

شخصیتوں میں مولانا آزاد، پنڈت نہرو، مولانا حسرت موہانی اور فیض احمد فیض نے اپنی بہترین تخلیقات جیل میں لکھی ہیں اور بشمول اردو، ہندستان کی ساری جدید زبانوں کی نشوونما اسی دور میں ہوئی ہے جب حالات قطعی سازگار نہیں تھے۔

آج اردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد کم ہوسکتی ہے لیکن جو لوگ اردو لکھنے پڑھنے کا کام کر رہے ہیں ان کے لیے آج کے حالات، عہدِ غلامی، کے حالات سے بڑے نہیں ہیں اس کے باوجود اردو میں تخلیقی ادب کی صورتِ حال دن بہ دن سنگین ہوتی جارہی ہے تو شاید اس لیے کہ تخلیق میں لایعنیت کی طرف بہاؤ اور تنقید میں نامانوس مغربی اصطلاحات و اقوال کی تجارت کی طرف جھکاؤ کے سبب شعروادب کا عام قاری سے رشتہ ٹوٹا ہے اور دوسری طرف اکیڈمیوں کی ریلیف پر خود کو زندہ رکھنے کی کوششوں میں، نیم ادبی لوگوں نے دھندہ اور چندہ کے ساتھ، ذاتی اور لمحاتی تاثر و تجربے کو ادب سے جوڑ کر 'شہرت طلبی'، کو نیم ادبی دائرے کا مرکزی نقطہ بنا دیا ہے۔

اس دائرے میں ہمہ گیر و عالمگیر اور شعورِ انسانی کے مسائل تک پہنچانے والی تمام شعوری لاشعوری کوششیں، شجرِ ممنوعہ، کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہاں اپنی اور اپنوں کی قدآوری کے نقارے بجائے جاتے ہیں اور یہی نہیں کہ دوسروں کے منطقی بھرقد کی بھی پروا نہیں کی جاتی۔ سرے سے ان کے وجود ہی کا انکار کیا جاتا ہے ایسے میں جدید ذرائع ابلاغ کا ہمیں نظرانداز کرنا لازم ہے سو وہ ہو رہا ہے۔

اس سے نجات کی یہی صورت ہے کہ ضمیر کے ساتھ جینے مرنے کا حوصلہ رکھنے والے تخلیقی صلاحیتوں اور انسانی قدروں کو ہم آہنگ کرنے کی راہ میں نئے، خون ادب، کو نئے، شعورِ زندگی، کی حرارت عطا کریں۔

وہ شعورِ زندگی، جو روایت کا منحرف بھی ہو معترف بھی۔ کیونکہ جب یہ دونوں دھارے ملتے ہیں تو ادب، بحرِ بے کنار، موجیں مارتا ہے اور چھوٹے چھوٹے جزیرے اس کی راہ روکتے ہیں۔

ستیہ پال آنند
الریاض - ۱۱۳۴۴
ص۔ب ۶۳۵۰

آنے والی سحر بند کھڑکی ہے

(البیرٹ کامو کے نام)

برف زاموسموں کے ترازو میں تلتی ہوئی
سرد یخ بستہ رات اپنی قیمت چکانے کو ہے
اور میں اپنے کمرے میں بے خواب بیٹھا ہوا
سوچتا ہوں
مجھے اپنے کندھوں پہ کب تک کسی جھوٹ کا
بھاری پتھر اٹھا ہوئے "سسی فس"[ل] کی طرح
لامکاں، لازماں
آسماں کی بلندی پہ چڑھنا پڑے گا
یہ طرّہ جو سر پر مرے سج رہا ہے
بہت خوبصورت ہے، لیکن
کلاہِ کج انداز کے زیر سایہ مرا سر کہاں ہے؟
مجھے اب سسی فس کی مانند جینا نہیں ہے
کہ بے چہرگی ہی اگر روز و شب کا مقدر ہے

مجھ کو مرنا پڑے گا ۔۔۔ اسی رات کو
اپنی قیمت چکانی پڑے گی!

آنے والی سحر بند کھڑکی ہے
جس سے میں ٹکراؤں گا، شیشہ ٹوٹے گا
اور منزلوں کی بلندی کی پازیب باندھے
چھناکے کی آواز سے میں اڑوں گا
فقط چند لمحوں کی پرواز ہوگی
فقط چند لمحے مری زیست اور موت کے درمیاں
مجھ کو اڑنے کا احساس ابدی فراہم کریں گے
میں اس بے حسی کی اسیری سے آزاد ہو کر جیوں گا
فقط چند لمحے
کئی ایک عمروں کا حاصل!

ل Sisyphus یونانی دیومالا کے مطابق Corinth کا راجا جسے پاتال (Hades) میں یہ سزا دی گئی تھی کہ وہ ایک بھاری چٹان کو دھکیلتا ہوا پہاڑ کی چوٹی تک لے جائے۔ جہاں سے چٹان ہر بار لڑھک کر پھر تلہٹی تک آ پہنچتی تھی۔ ادبی علامت کے طور پر انسانی تگ و دو جس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ برآمد ہو۔ لیکن جسے کرتے رہنے پر مجبور ہونا پڑے۔

شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان

تالیف:- مولانا حکیم محمود احمد برکاتی

اس کتاب میں برکاتی صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ نیز ان کی تصانیف، تلامذہ، مریدین شاہ ولی اللہ کا تعارف بھی ہے۔

قیمت -/۴۵ روپے

تذکرۂ ماہ و سال

مالک رام

اس مجموعے میں اردو کے بیشتر ادیب، شاعر، نقاد، کالم نگار، صحافی اور دوسرے اہم عمائد (جنھوں نے اردو ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے) کی تاریخ ولادت اور جو ہماری بدقسمتی سے انتقال کر چکے ہیں ان میں سے اکثر کی تاریخ وفات بھی درج ہے۔ کسی بھی اہم ادیب پر مضمون لکھتے وقت اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

افکارِ اقبال

محمد عبدالسلام خاں

اس اہم کتاب میں علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی، ان کے اردو اور فارسی کلام پر سیر حاصل بحث، ان کے مذہبی اور سیاسی افکار، اور کچھ ایسے اہم واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جو اب تک اندھیرے میں تھے۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

تحقیق نامہ

مشفق خواجہ

مشفق خواجہ اردو کے وہ واحد محقق ہیں جو ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی اہمیت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی خلا کو پُر کرتے ہوں۔ زیر نظر مجموعہ میں ایسے ہی اہم ترین مضامین شامل ہیں۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

مرضیات

حکیم نعیم الدین زبیری

بیماریوں کے اصولی اسباب اور ان کی وجہ سے افعال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعے یعنی ماہیت الامراض (پیتھالوجی) پر جامع اور آسان بحث، طلبہ کے علاوہ اطبا کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔

قیمت -/۵۱ روپے

تاثر نہ کہ تنقید

صدیق الرحمٰن قدوائی

تنقید، ادب کی ایک اہم شاخ ہے مگر اس کا ضرورت سے زیادہ چرچا بھی اچھا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص "نقاد" ہو جائے۔ ادب کو تنقید کے سوا بھی مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے جن کا انحصار پڑھنے والوں کے انفرادی مزاجوں پر ہے۔ یہ تصنیف ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔

قیمت -/۵۱ روپے

بہ صورت گر کچھ خوابوں کے

(عہد حاضر کے ۱۹ اہم ادیبوں کے انٹرویو)

طاہر مسعود

قیمت -/۶۶ روپے

رشید حسن خاں
ٹی سی۔ ۹۔ گائر ہال
دہلی یونی ورسٹی دہلی

گلزارِ نسیم سے متعلق بعض روایتیں

(۱) چکبست نے دیباچۂ گلزارِ نسیم میں لکھا ہے:

"جس وقت یہ مثنوی تیار ہوئی، اِس کا حجم بہت زیادہ تھا۔ جب آتش کے پاس اصلاح کے لیے لے گئے، تو آتھوں نے کہا کہ ارے بھئی! اتنی بڑی مثنوی کون پڑھے گا.... اُستادِ کامل کی بات دل پر اثر کر گئی۔ مثنوی کی نظرِ ثانی کی۔ جتنے بھرتی کے شعر تھے، نکال ڈالے۔ بلکہ جو مطلب چار شعروں میں ادا ہوتا تھا، اُس کو اختصار کے ساتھ ایک ہی شعر میں ادا کیا اور آتش کے پاس لے گئے۔ اُستاد نے شاگرد کی محنت پر آفریں کہی اور اصلاح کا قلم اٹھایا؛ لیکن اکثر اصلاحیں نسیم نے نہ مانیں.... غرض کہ آتش کی نظرِ ثانی کے بعد یہ مثنوی ایک مشاعرے میں پڑھی گئی، جس میں لکھنؤ کے تمام سر برآوردہ شعرا جمع تھے، بعد ازاں طبع ہوئی۔"

اِس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ نسیم نے یہ مثنوی دوبارہ از سرِ نو لکھی تھی۔ سوال یہ ہے کہ یہ ساری باتیں معلوم کس طرح ہوئیں؟ یہ کیسے معلوم ہوا کہ آتش نے یہ کہا تھا؟ نسیم نے دوبارہ مثنوی لکھی، جب آتش نے اصلاح کی، تو نسیم نے اکثر اصلاحیں نہیں مانیں؟ مشاعرے میں کسی مثنوی کا پڑھا جانا اور ایسے مشاعرے میں جس میں لکھنؤ کے تمام سر برآوردہ شعرا جمع ہوں، بجائے خود ایسی بات ہے جس کو معتبر حوالے کے بغیر قبول کرنا مشکل ہے۔ یہ بات صرف چکبست کو معلوم ہوئی، کسی اور نے اِس نئے واقعے کا کہیں ذکر نہیں کیا، حالاں کہ یہ خاص واقعہ تھا اور خلافِ معمول۔ اِس کا کچھ نہ کچھ چرچا ہونا تو ضرور تھا۔ پھر یہ بات چکبست کو بھی اب یاد آئی۔ اِس دیباچے سے تقریباً دو سال پہلے اُنھوں نے کشمیر درپن میں نسیم سے متعلق جو مضمون لکھا تھا، اُس میں اور سب باتیں لکھیں، مگر یہ نہیں لکھا تھا کہ اصلاح کے بعد یہ مثنوی ایک ایسے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی جس میں لکھنؤ کے تمام اہم شاعر موجود تھے۔

اِسی سلسلے میں دو اور روایتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ شرر نے جب چکبست کے مرتب کیے

ہوئے نسخۂ گلزارِ نسیم پر تبصرہ لکھا، تو اُس میں چکبست کی اِس عبارت کا حوالہ دے کر لکھا تھا:

"مگر معتبر ذرائع سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انتخاب واختصار کا یہ آخری عمل اور تصرّف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا۔ منشی اشرف علی مرحوم، جو نسیم دہلوی کے شاگرد تھے، اِس واقعے کو خود مجھ سے بیان کرتے تھے، بلکہ اُن کا بیان تھا کہ پنڈت دیا شنکر کی لکھی ہوئی اصل مثنوی کے بہت سے اوراق ہم نے بھی اپنی آنکھ سے دیکھے تھے، جو بہت ہی عام مذاق کے تھے۔ اِس بیان کی تصدیق میر وزیر علی صبا نے بھی ہمارے بعض بزرگوں کے سامنے کی تھی۔"

آپ نے دیکھا، وہی اندازِ بیان ہے کہ ہم نے یہ روایت سُنی تھی، ہمارے بزرگوں کے سامنے فلاں بات کہی گئی تھی۔ ایسے اندازِ بیان میں آسانی یہ ہوتی ہے کہ آپ جو چاہیں کہہ سکتے ہیں اور لکھ سکتے ہیں، کیوں کہ ایسی روایتوں کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا، ہاں زبانی اور تحریری بحث بہت کی جا سکتی ہے۔ اِس روایت میں یہ ٹکڑا بہ طورِ خاص توجہ طلب ہے کہ نسیم کی لکھی ہوئی اصل مثنوی کے بہت سے اوراق راوی نے اپنی آنکھ سے دیکھے تھے، "جو بہت ہی عام مذاق کے تھے"۔ جانِ سخن یہ آخری ٹکڑا ہے، اِسی کی خاطر اِس "چشم دید راوی" کا یہ بیان پیش کیا گیا ہے۔ خیر، اب جوابی روایت بھی دیکھ لیجیے۔ چکبست نے جب شرر کے تبصرے کا جواب لکھا، تو اُس میں "جوابِ آں غزل" کے طور پر یہ بھی لکھا:

"حکیم رضا حسین صاحب سہا مرحوم، میر وزیر علی کے داماد تھے اور شاگرد بھی تھے، اُن کی خدمت میں برسوں نیاز حاصل رہا اور بہت مرتبہ گلزارِ نسیم کا ذکر آیا۔ اُنھوں نے کبھی مجھ سے یہ نہ کہا کہ گلزارِ نسیم میں آخری تصرّف اور اختصار کا عمل خواجہ آتش کے قلم سے ہوا تھا... بلکہ وہ کہتے تھے کہ میر وزیر علی صبا ہمیشہ ایسی روایتوں کی تردید فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ گلزارِ نسیم خاص پنڈت دیا شنکر نسیم کی تصنیف ہے۔ بے شک حسبِ دستور اِس میں کہیں کہیں آتش کی اصلاحیں موجود ہیں۔"

چکبست نے سہا کی یہ روایت جس طرح لکھی ہے، اُس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِس کو درست مانتے تھے اور اِس سے متفق تھے۔ اِس طرح اُنھوں نے اپنی پہلی بات کی تردید خود ہی کر دی کہ آتش کے کہنے پر نسیم نے اِس مثنوی کو دوبارہ لکھا تھا اور یہ بھی کہ نسیم نے اکثر اصلاحیں نہیں مانی تھیں۔

یہ بات بھی نظر میں رکھنے کی ہے کہ شرر نے اگر میر وزیر علی صبا سے تائیدی سند

حاصل کی تھی، تو چکبست نے میر وزیر علی صبا کے داماد سے سند حاصل کرلی۔ ہاں یہ ذہن ضرور رہے کہ صبا نے شرر کے بزرگوں کے سامنے شہادت دی تھی اور تنہا نے خود چکبست کے سامنے یہ تائیدی بیان دیا ہے۔
چکبست سے پہلے محمد حسین آزاد آبِ حیات میں یہ لکھ چکے تھے:

"مثنویِ مذکور جب پہلے اُنھوں نے لکھی تو بہت بڑی تھی۔ خواجہ آتش اپنے اُستاد کے پاس اصلاح کو لے گئے۔ اُنھوں نے کہا: بھیّا! اتنی بڑی کتاب کو دیکھے گا کون۔ وہ اپنا، وہ "یک" کا قانون یہاں بھی جاری کرو۔ اِس میں کنایہ یہ اشارہ تھا کہ پنڈت صاحب فوج شاہی میں منصف تھے اور بہ موجب قانونِ حکومت کے سب کی تنخواہوں میں "دہ یکی" کاٹ لیتے تھے۔ گھر گھر میں اِس شکایت کا چرچا تھا۔ یہ مثنویِ مذکور لے گئے اور اختصار کیا تو ایسا نچوڑا کہ عطر نکال لیا۔"

آزاد کا ڈرامائی بیان آپ نے پڑھ لیا، کیسی جزئیات بہم پہنچائی ہیں کہ عام پڑھنے والے کو ایمان لاتے ہی بن پڑے گی۔ میرا خیال یہ ہے کہ اصل بیان تو آزاد کا تھا؛ چکبست نے اُسے اپنی عبارت میں اپنے انداز سے لکھا۔ آزاد نے ماخذ کا حوالہ دینے کے بجائے صرف اپنے قلم پر بھروسا کیا تھا۔ چکبست یہ اعتماد کہاں سے لاتے، یوں اُنھوں نے ایک راوی کا حوالہ دینا ضروری خیال کیا۔ آزاد کی منقولۂ بالا عبارت چکبست کی نظر میں تھی، اِس کا ثبوت یہ ہے کہ آزاد نے آبِ حیات میں گلزارِ نسیم سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اُس کا کچھ حصّہ چکبست نے اِسی دیباچے میں ایک اور مقام پر پیش کیا ہے۔ اِس سے قطعیت کے ساتھ یہ متعین ہو جاتا ہے کہ آزاد کی یہ عبارت اُن کی نظر میں تھی اور اُنھوں نے دراصل اُسی سے استفادہ کیا ہے۔
آزاد نے یہ جو لکھا ہے کہ "مثنویِ مذکور جب اُنھوں نے لکھی تو بہت بڑی تھی" اِس کو سند میں پیش کرنا یوں مناسب نہیں ہوگا کہ آبِ حیات میں خالق باری کے لیے اُنھوں نے لکھا ہے:

"خالق باری، جس کا اختصار آج تک بچّوں کا وظیفہ ہے، کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی" (آبِ حیات، نظم اردو کی تاریخ)

کسی کو آج تک وہ بڑی بڑی جلدیں نہیں ملیں۔ ملتیں کیسے، ہوتیں تو ملتیں۔ آپ پوچھیں گے کہ پھر لکھا کیسے؟ تو یہ سوال تو آبِ حیات کے سلسلے میں بہت سے مقامات پر کیا جا سکتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ ایسی روایتوں کو آنکھیں بند کرکے مان لینا قطعی طور پر مناسب نہیں۔
گلزارِ نسیم کا اختصار بے مثال ہے۔ ایسی کوئی دوسری مثنوی اُس وقت تک سامنے نہیں آئی تھی (اور نہ اُس کے بعد سامنے آئی)۔ یہ بالکل نئی شعری روایت

تھی، نیا انداز تھا۔ اِس کے لیے یہ لکھنا کہ نسیم نے تو اُسی طرح لکھی تھی جیسے اور مثنویاں لکھی گئی تھیں اور لکھی جاتی تھیں، یہ تو آتش کی اُستادی کا کمال ہے کہ انھوں نے اِسے دوبارہ لکھوا کر اِس شکل میں سامنے آنے دیا؛ یہ بات دل چسپ بھی تھی اور یہ بھی تھا کہ ایک نئے اور نوجوان شاعر کو ایسے کسی کارنامے کا تنہا مالک بنانے کے مقابلے میں، بزرگوں کی نظر میں یہ بہتر صورت ہو سکتی تھی کہ اِسے شاگرد کی جودتِ طبع کے بجائے اُستاد کا فیض بتایا جائے۔

جو شخص دل لگا کر اور نظر جما کر اِس مثنوی کا مطالعہ کرے گا، اُسے یہ ضرور معلوم ہو جائے گا کہ اکثر مقامات پر اشعار باہم ایسی پیوستگی رکھتے ہیں کہ ایک شعر بھی نکال دو تو وہ بیان ادھورا رہ جائے گا۔ پوری مثنوی میں کہیں بھی پیوندکاری کا شبہ نہیں ہوتا۔ صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ پوری مثنوی ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ یوں یہ ماننا مشکل اور بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے اشعار کو جگہ جگہ سے بدلا گیا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ نسیم نے یہ پوری مثنوی اِسی انداز میں لکھی تھی۔ ہاں اصلاح کے لیے پیش کی ہو گی، مگر یہ معلوم کرنے کی کوئی صورت نہیں کہ کس قدر اصلاح ہوئی تھی اور یہ کہ نسیم نے اکثر اصلاحیں قبول نہیں کی تھیں۔ اِس سلسلے میں جو روایتیں لکھی گئی ہیں، وہ بہ ظاہر قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتیں۔ چکبست نے طرف داری میں اور شرر نے جذبۂ مخالفت کے تحت یہ سب کچھ لکھا ہے، خاص طور پر چکبست نے، کہ اُنھوں نے واقعہ تراشی اور روایت سازی میں بہت زورِ طبع صرف کیا ہے۔ جب تک اِن روایتوں کی تصدیق نہ ہو سکے اُس وقت تک اِن کو قابلِ قبول نہیں قرار دیا جا سکتا (اور اب تک ایسی کسی روایت کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے)۔

آزاد کی روایت کے متعلق گیان چند جین نے لکھا ہے:

> "آزاد کی روایت ہے کہ نسیم جب اپنی مثنوی کو آتش کے پاس اصلاح کے لیے لے گئے، اُنھوں نے اُسے مختصر کرنے کا مشورہ دیا۔ . . . . . لیکن اِس واقعے کی صداقت کا کوئی ثبوت نہیں"۔
> (اردو مثنوی شمالی ہند میں، ص ۴۹۶)۔

مگر اِسی کتاب میں اُنھوں نے آگے چل کر لکھا ہے:

> "اگر یہ نظم کچھ اور طویل ہوتی تو اِس میں شاعرانہ بیانات خاطر خواہ ہوتے۔ آتش نے اِس مثنوی کو مختصر کرا کے ہمیں بہت سے حسین بیانات سے محروم کر دیا۔ اور اِس طرح نادانستہ اردو ادب کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا"، (ایضاً ص ۸۸)

اُن کے پہلے قول کے مطابق اگر "اِس واقعے کی صداقت کا کوئی ثبوت نہیں"

تو پھر یہ کہنے کا کیا جواز ہوگا کہ آتش نے اسے مختصر کرا کے "اُردو ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا"۔ اُن کا پہلا قول بجائے خود درست تھا۔

چکبست نے میر وزیر علی صبا کے داماد سے جو روایت نقل کی تھی، اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے ریاض الاخبار میں لکھا گیا تھا:

"اِس کو تمام شعرا جانتے ہیں کہ کُل صاحبِ مذاق سخن سنجوں کو یقین ہے کہ یہ مثنوی نسیم کی نہیں، آتش کی ہے۔ منشی امیراللہ صاحب تسلیم زندہ بیٹھے ہیں، وہ مجھ سے فرماتے تھے کہ اِس میں آتش کے سب شاگردوں کا کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور شریک ہے اور نسیم نے جو کچھ کہا، اُس کا بہت تھوڑا حصّہ اِس میں باقی ہے۔"

(معرکۂ چکبست و شرر، ص ۲۵۰)

ویسے تو میں اِس روایت کو، جسے صحیح طور پر گپ کہنا چاہیے، درج نہ کرتا؛ لیکن محض اِس لیے لکھا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ اِس مثنوی کے سلسلے میں جو زبانی روایتیں درج کی گئی ہیں، تصدیق کے بغیر اُن کو قبول نہیں کرنا چاہیے، راوی کوئی بھی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس سلسلے کی اکثر و بیشتر روایتیں خانہ ساز ہیں۔

---

(۲) جلیل مانک پوری (تلمیذِ امیر مینائی) نے ایک مضمون (شائع شدہ دبدبۂ آصفی، حیدرآباد) میں لکھا تھا:

"امیر اللغات میں جس کتاب کا شعر لکھا گیا ہے، خواہ دیوان ہو یا مثنوی یا مرثیہ یا قصائد یا سلام، اِس کے ساتھ مصنّف کا تخلّص لکھا گیا؛ مگر بہ خلاف اِس کے گلزارِ نسیم کا شعر جہاں دیا ہے، وہاں "گلزارِ نسیم" لکھا ہے، "نسیم" نہیں لکھا۔ یہ بھی دلیل قوی ہے اِس کی کہ صاحبِ امیر اللغات کے نزدیک گلزارِ نسیم، نسیم کی تصنیف نہ تھی"۔ (معرکۂ چکبست و شرر، ص ۱۹۲)۔

جلیل کا یہ لکھنا تو صحیح ہے کہ امیر مینائی کے لغت میں گلزارِ نسیم کے اشعار جہاں جہاں سند میں آئے ہیں، عموماً وہاں اُن کے ساتھ لفظ "گلزارِ نسیم" آیا ہے؛ لیکن اِس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ امیر مینائی اِس مثنوی کو نسیم کی تصنیف نہیں مانتے تھے، درست نہیں۔ اِسی لغت میں ایک جگہ امیر نے نہایت واضح الفاظ میں اِس مثنوی کو نسیم کی تصنیف بتایا ہے۔ "آج کدھر سے چاند نکلا" کے ذیل میں امیر نے لکھا ہے:

"اور نسیم لکھنوی نے گلزارِ نسیم میں "چاند" کی جگہ خورشید بھی کہا ہے:

طالع سے کسے تھی ایسی اُمید نکلا ہے کدھر سے آج خورشید

(امیر اللغات، حصّۂ اوّل، ص ۶۵)

ں واضح قول کے باوجود یہ کہنا کہ امیر مینائی اِس مثنوی کو نسیم کی تصنیف نہیں سمجھتے تھے، بڑی زیادتی بل کہ الزام تراشی ہے۔ امیر اللغات میں بہت سے مقامات پر ایسا ہوا کہ مثالیہ فقروں کے ساتھ صرف کتاب کا نام لکھا گیا ہے، مصنّف کا نام نہیں لیا گیا۔ مثلاً ص ۲۶ پر فسانۂ عجائب کی سند مندرج ہے، لیکن سُرور کا نام نہیں آیا۔ یا صفحات ۱۲۹، ۱۴۴، ۱۵۰ پر عودِ ہندی سے کلمات منقول ہیں اور مصنّف کا نام نہیں لکھا گیا۔ نسیم کے سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ اِس لغت میں نسیم دہلوی (اصغر علی خاں نسیم، تلمیذ مومن) کے بہت سے شعر سنداً پیش کیے گئے ہیں اور ہر جگہ صرف "نسیم" لکھا گیا ہے۔ غالباً التباس سے بچنے کے لیے نسیم لکھنوی کے اشعار کے ساتھ "گلزارِ نسیم" لکھا گیا۔ اِس کی تائید کے لیے یہ ایک قرینہ بھی موجود ہے کہ منقولۂ بالا عبارت میں جہاں دیا شنکر نسیم کا حوالہ آیا ہے، وہاں امیر نے "نسیم لکھنوی" لکھا ہے۔ "لکھنوی" کی تخصیص بہ ظاہر اُسی التباس کو بچانے کے لیے کی گئی ہے۔

اب اِس روایت کا ایک اور رُخ۔ چکبست نے شرر کے تبصرے کے جواب میں جو مضمون لکھا تھا، اُس میں یہ بھی لکھا:

> "گلزارِ نسیم کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ لکھنؤ کے مشہور و معروف شاعر منشی امیر احمد صاحب مینائی نے امیر اللغات میں زبان و محاورے کی بحث میں گلزارِ نسیم کے سیکڑوں شعر سند کے طور پر پیش کیے ہیں"۔

"سیکڑوں شعر" بڑا مبالغہ اور غیر محتاط اندازِ نگارش کا نمونہ ہے۔ امیر اللغات کے پہلے حصّے میں سند کے اشعار دوسرے حصّے کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ دوسرے حصّے کے آغاز ہی میں مولّف نے اِس کی صراحت کر دی ہے کہ اِس حصّے میں "اشعارِ مثالیہ بہت کم دیے ہیں" [امیر اللغات، حصّہ دوم، ص ۱۸]۔ پہلا حصّہ ۳۱۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اُس میں گلزارِ نسیم کے کل ستاون شعر بہ طور سند منقول ہیں [شمار میں ایک دو شعروں کی کمی بیشی ممکن ہے]۔ دوسرے حصّے کا کیا حال ہے، اِس کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ شروع کے پچاس صفحوں میں صرف تین شعر ملتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اِس لغت کے دونوں حصّوں میں گلزارِ نسیم کے سو شعر بھی بہ مشکل آئے ہوں گے۔ امیر اللغات کا دوسرا حصّہ ۳۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ چکبست کی تحریروں میں نسیم اور گلزارِ نسیم سے متعلق مبالغہ پسندی کا جو عام انداز ملتا ہے، یہ قول بھی اُسی کا نتیجہ ہے۔

---

(۳) تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود کے مولّف دیبی پرشاد بشّاش نے نسیم کے ترجے

میں گلزارِ نسیم اور سحر البیان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

"اور بعض بعض اصحاب دونوں ہی کو لاجواب بتاتے ہیں، مگر مرزا غالب نے جو رائے اِس بارے میں دی ہے، وہ بہت اچھی ہے۔ انصاف یہ ہے کہ خوب انصاف کی کہی ہے۔ یعنی کسی نے غالب سے پوچھا تھا کہ دونوں میں کون بہتر ہے، تو اُنھوں نے فرمایا کہ: "مثنویِ میر حسن فصاحت است و گلزارِ نسیم بلاغت"۔

غالب سے جو قول منسوب کیا گیا ہے، وہ قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتا۔ خیال رہے کہ یہاں بھی ایک زبانی روایت کے واسطے سے یہ لکھا گیا ہے۔ باوصفِ تلاش مجھے غالب کا ایسا کوئی قول نہیں ملا۔ عبارت کی نامعقولیت مزید برآں۔ میرے استفسار پر مولانا عرشی مرحوم نے بھی یہی رائے ظاہر کی تھی :

"مثنویِ میر حسن اور گلزارِ نسیم کے سلسلے میں غالب کے نام سے جو قول آپ نے تحریر فرمایا ہے، میں نے کہیں غالب کے یہاں نہیں پایا، نہ کسی ایسے راوی کی سند سے سُنا جو غالب کا قول نقل کرنے میں مستند مانا جاتا ہو۔ پھر جیسا کہ آپ نے خود فرمایا ہے، کوئی پڑھا لکھا اِس انداز پر لفظِ فصاحت و بلاغت کو استعمال بھی نہیں کرتا"

(مکتوب بہ نامِ راقم الحروف)

---

(۴) شرر نے گلزارِ نسیم پر جو تبصرہ لکھا تھا، اُس میں ایک یہ اعتراض بھی کیا تھا کہ چکبست نے اپنے مرتبہ نسخے میں جگہ جگہ متن میں ترمیم بھی کی ہے۔ اِسی سلسلے میں شوق قدوائی نے ایک مضمون میں لکھا تھا :

"میں نے جھگڑوں کی بحث میں یہ ذکر دیکھا کہ گلزارِ نسیم میں ترمیم کی گئی ہے . . . . میں آپ کو اُس انتخاب کی جانب متوجہ کرتا ہوں جو حضرت مصحفی مرحوم کے متعدد دیوانوں سے حضرت اسیر و آمیر مرحومین نے فرمایا اور وہ چھپ گیا ہے۔ آپ اُس کو اور حضرت مصحفی کے اصلی دیوانوں کو ملاحظہ فرمائیے تو یہ عقدہ حل ہو جائے کہ دیوانوں کے اغلاطِ کتابت کی تصحیح کس حد تک انتخاب میں کی گئی ہے۔ اب جو اعتراض گلزارِ نسیم کی تصحیح کے متعلق حضرت چکبست پر عائد کیا جائے، وہی اعتراض اُن دونوں اُستادوں پر بھی عائد ہوگا جو انتخاب کے بانی تھے"

[معرکۂ چکبست و شرر، ص ۱۵۹] ۔

شوق نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بہت مغالطہ انگیز ہے۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ آمیر و اسیر نے جب مصحفی کا انتخاب تیار کیا تھا، تو اصل دواوین میں جو کتابت کی غلطیاں

تھیں، اُن کو درست کر دیا تھا اور یہی چکبست نے کیا ہے کہ اغلاطِ کتابت کی تصحیح کی ہے اِس میں کچھ برائی نہیں، بل کہ یہ تو کرنا ہی چاہیے تھا؛ مگر ان کے دونوں قول قطعی طور پر غلط ہیں۔ امیر و اسیر نے اغلاطِ کتابت کی تصحیح نہیں کی تھی، اُستاد کے کلام میں اصلاح فرمائی تھی اور بعض اشعار میں یہی کام چکبست نے کیا ہے۔ مصحفی کے انتخاب سے متعلق نسبتاً تفصیل سے انتخابِ ناسخ [مکتبہ جامعہ، نئی دہلی] کے مقدمے میں لکھ چکا ہوں۔ یہاں مختصراً محض وضاحت کی غرض سے یہ عرض کروں کہ حکم رانِ رام پور کی فرمایش پر امیر مینائی اور اُن کے اُستاد اسیر نے اپنے اُستاد اور دادا اُستاد مصحفی کے کلام کا انتخاب تیار کیا تھا۔ اِن دونوں حضرات نے دیکھا کہ مصحفی کے یہاں ایسے بہت سے شعر ہیں جن کی زبان میں پُرانا پن ہے اور ایسے لفظ بھی ہیں جن کو اب متروک قرار دیا جا چکا ہے۔ اِس کا علاج یہ کیا گیا کہ منتخب اشعار میں ایسے اکثر مقامات پر لفظوں کو بدل دیا گیا۔ ایک مثال سے اِس طرزِ عمل کی وضاحت ہو سکے گی مصحفی کا شعر تھا:

اُس گُل کی باغ میں جو صبا نے چلائی بات
غنچے نے مسکرا کے کہا، ہم نے پائی بات

غالباً اِس خیال سے کہ "بات چلانا" اب فصیح نہیں، شاگردوں نے اُستاد کے پہلے مصرعے کو اپنے انتخاب میں یوں لکھا:

پیکِ صبا نے اُس کے دہن کا کیا جو ذکر

مثنوی گلزارِ نسیم کے متعدد اشعار کے ساتھ یہی سلوک چکبست نے کیا۔ زیرِ ترتیب مثنوی گلزارِ نسیم کے ضمیمۂ تشریحات میں ایسے سب اشعار کی نشان دہی کی گئی ہے؛ یہاں صرف ایک مثال محض اظہارِ مدّعا کی خاطر پیش کرنے پر اکتفا کروں گا مثنوی کی اشاعتِ اوّل میں یہ شعر ہے:

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ
نظّارہ کیا پدر نے ناگاہ

حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں اِس شعر پر بھی اعتراض کیا تھا کہ اِس شعر کے اندازِ بیان سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ "شاہ" اور شخص ہے اور "پدر" اور شخص ہے، حالاں کہ دونوں ایک ہیں۔ یہ اندازِ بیان کی خرابی ہے۔ چکبست نے جواباً لکھا کہ دراصل شعر یوں ہے:

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ
نظّارہ کیا پسر کا ناگاہ

اُنھوں نے اپنے مرتّب کیے ہوئے نسخۂ گلزارِ نسیم میں اِس شعر کو لکھا بھی اِسی طرح۔ اِس کے ساتھ مزید وضاحت کی:

"ابھی لکھنؤ میں ایسے بزرگ موجود ہیں جن کو قریب قریب کُل مثنوی حفظ ہے، اُن کی زبان سے یہ شعر اسی صورت پر سُنا گیا ہے۔"

[دیباچہ گلزارِ نسیم، مرتبۂ چکبست]

یہ کھلی ہوئی غلط بیانی ہے۔ مثنوی کی اشاعتِ اوّل ان کے سامنے تھی، اُس کا حوالہ دینا چاہیے تھا؛ لیکن اُس کا حوالہ یوں نہیں دے سکتے تھے کہ شعر میں تحریف کر چکے تھے۔ حالی کی طرح یہ بات تو چکبست کو بھی معلوم تھی کہ اِس شعر میں بیان کی خرابی ہے اور یہاں شاعر نے صحیح اندازِ بیان اختیار نہیں کیا۔ لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ غلطی دوسروں کے سامنے آئے، اِس لیے اُنھوں نے دوسرے مصرعے میں "پدر نے" کو "پسر کا" سے بدل دیا۔ حالی کے صحیح اعتراض کو نہ ماننا بھی ضروری تھا اور یہ جذبۂ طرف داری کا لازمی نتیجہ ہوا کرتا ہے] اِس لیے بزرگوں کی زبان سے اِس شعر کو اُسی طرح سُنوا دیا جس طرح اُسے خود لکھا تھا۔ [ایسے ہی موقعوں پر وہ مشہور قول یاد آتا ہے کہ عشق اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے]۔ ظاہر ہے کہ نہ امیر و اثر کی وہ روش درست تھی اور نہ چکبست کا یہ طریقہ قابلِ قبول قرار پائے گا۔ تحقیق کی زبان میں اِس طرزِ عمل کو تحریف کہا جائے گا اور ان تینوں حضرات کے پیش کیے ہوئے متن کو غیر معتبر مانا جائے گا۔ شوق قدوائی اور چکبست نے اِس طرزِ عمل کی تاویل جس طرح کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے، اُسے غلط بیانی کہا جائے گا۔

[ناتمام]

رسالہ ہندستانی الہ آباد (۱۹۳۱-۱۹۴۸) سے انتخاب

اردو ادب

اس مجموعے میں ظفر الاحسن لاری، عبدالسلام ندوی، سیماب اکبرآبادی، گنپت سہائے سریواستو، رفیق حسین، بھگوت دیال ورما، سید مبارز الدین احمد رفعت، مہیش پرشاد وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔
قیمت ۵۰/ روپے

اردو لغت

اس مجموعے میں سید مسعود حسن رضوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، عبدالباری آسی، محمد اجمل خاں، سلیم جعفر، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور نعیم الرحمٰن کے اہم مضامین شامل ہیں۔ قیمت ۴۰/ روپے

چند ادبی مشاہیر کی تحریریں

میر، سرشار، جلال، اقبال، اصغر گونڈوی، محمود شیرانی، ٹیگور، سروجنی نائیڈو کے لکھے ہوئے مضامین نیز ان ادیبوں میں سے اکثر کے لکھے ہوئے مضامین اس گلدستے میں شامل ہیں۔ قیمت ۷۰/ روپے

اردو ہندی ہندستانی

یہ مجموعہ ہے اظہر علی، سید ابوالقاسم، سید انصاری، محمد اجمل خاں، کرشن پرشاد کول، تارا چند وغیرہ کے اہم ترین مضامین کا۔ قیمت ۴۰/ روپے

ہندی ادبیات

اس مجموعے میں نورالحسن نیّر کاکوری، طاہر حسن علوی، اقبال ورما، سید رشید الحسن، کشتہ قادری اور محمد ضیاء الدین کے مضامین شامل ہیں۔
قیمت ۴۰/ روپے

تاریخ

اس مجموعے میں آغا مہدی حسین، بینی پرشاد، بنارسی پرشاد سکسینہ، سید مقبول احمد، حمد[illegible] محمد تقی احمد، پریاگ دیال، شوکت تھانوی، پروفیسر عبدالباسط، حکیم شمس اللہ قادری، اور ایچ۔ آر۔ گب کے مضامین شامل ہیں۔ قیمت ۶۰/ روپے

سائنس

اس مجموعے میں شبیر احمد غوری، رفعت حسین صدیقی، صدر الدین عظیم، امداد حسین خاں، مقبول الرحمٰن، محمد امین عباسی، راغب بدایونی، جعفر حسن، ام ذکی الدین اور پروفیسر منہاج الدین کے اہم ترین مضامین شامل ہیں۔ قیمت ۶۰/ روپے

خدا بخش لائبریری "جرنل" اڈیٹر عابد رضا بیدار (۵۰،۰۰)

خدا بخش لائبریری کا یہ جرنل نہایت اہم ترین مضامین کا مجموعہ ہے اس میں امیر خسرو پر بھی مضمون ہے اور سکوں کے اشعار پر بھی۔ مخطوطات شناسی پر بھی اور بابری مسجد اور رام جنم بھومی پر بھی۔ مسلمان اور سائنس پر بھی اور مسٹر جناح پر بھی۔

قیمت ۵۰،۰۰ روپے

ہندستان اپنے حصار میں ایم جے اکبر

مترجم۔ مسعود الحق

ایم جے اکبر کی معرکۃ الآرا کتاب جس نے انگریزی میں شائع ہوتے ہی ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس کتاب میں ہندستان کی سیاست کے تاریک گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ایک اہم دستاویز۔

قیمت ۱۰۰/ روپے

محسن احسان
سربراہ شعبۂ انگریزی
اسلامیہ کالج پشاور، پاکستان

قبا غزل کو ہوئی مرحمت فقیرانہ
کہ حرف حرف میں ہے تمکنت فقیرانہ

انا نے کھینچ لیا ہے حصارِ درویشی
حریمِ ذات میں ہے عافیت فقیرانہ

نظر نظر سے عیاں خسروانہ جاہ و جلال
نفس نفس میں نہاں رمزیت فقیرانہ

جبیں سے چپکے ہوئے ہیں گدائی کے سجدے
مرا خسارہ مری منفعت فقیرانہ

کلاہِ عجز، سرِ انکسار و خلعتِ صبر
عطا ہوئی ہے ہمیں سلطنتِ فقیرانہ

میں ہر غرض سے ہر اک مصلحت سے بالاتر
نزارِ جسم میں ہے کچھ سکت فقیرانہ

تمھیں ہے کس لیے زعمِ قلندری محسن
نہ کوئی وصف نہ کوئی صفتِ فقیرانہ

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ
شعبۂ لسانیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نیاز فتح پوری

لسانی مزاج اور تشکیلِ اُسلوب

نیاز فتح پوری (۱۸۸۴ء۔ ۱۹۶۶ء) اُردو کے ایک صاحبِ طرز انشا پرداز، طرح دار ادیب اور جیّد عالم تھے۔ اُردو زبان پر فن کارانہ قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ انھیں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں پر بھی کامل عبور حاصل تھا۔ علاوہ ازیں انگریزی زبان سے بھی ان کی واقفیت کچھ کم نہ تھی۔ فارسی کا ذوق انھیں اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا جو نہ صرف فارسی کے کلاسیکی ادب کے دلدادہ تھے، بلکہ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ فارسی کا ابتدائی درس نیاز فتح پوری نے گھر پر ہی اپنے والد سے لیا تھا[1]۔ بعد میں انھوں نے مدرسۂ اسلامیہ، فتح پور میں درسِ نظامی کی کتابیں باقاعدہ طور پر پڑھیں اور اس مدرسے کے مدرسِ اعلیٰ مولانا نور محمد سے عربی کی تعلیم حاصل کی[2]۔ آگے چل کر انھوں نے عربی میں اتنا کمال پیدا کر لیا کہ اپنی پہلی بیوی کے انتقال پر عربی میں مرثیہ لکھا[3]۔ انھوں نے بہت سے افسانے بھی عربی زبان سے اُردو میں ترجمہ کیے جو رسالہ "نگار" میں شائع ہوئے۔ ترکی زبان پر انھیں اتنی قدرت حاصل تھی کہ وہ براہِ راست ترکی سے اُردو میں ترجمہ کر سکتے تھے[4]۔ ترکی ادب کا انھوں نے بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ترکی کی مشہور شاعرہ نگار بنتِ عثمان سے وہ اتنے متاثر تھے کہ فروری ۱۹۲۲ء میں انھوں نے آگرہ سے جب اپنا رسالہ جاری کیا تو اس کا نام بھی "نگار" رکھا۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ترکی سیکھنے کا مجھ پر جنون سوار تھا"[5]۔ نیاز نے اپنی ادبی زندگی کی اٹھان میں سجاد حیدر یلدرم سے بہت اثر قبول کیا۔ یلدرم اس

زمانے میں تراجم کے ذریعے اُردو میں انشائے عالیہ کے نمونے پیش کر رہے تھے۔ عربی فارسی کی طرح نیاز نے انگریزی کی تعلیم بھی ابتدا ہی سے حاصل کی تھی اور اس میں اتنی صلاحیت پیدا کرلی تھی کہ مدرسہ اسلامیہ، فتح پور کی انگریزی شاخ کے تین مرتبہ ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ بعد میں اپنے مطالعے کی بنیاد پر انگریزی ادیبوں سے انھوں نے کافی اثر قبول کیا جن میں وکٹر ہیوگو، ہیزلٹ اور آسکر وائلڈ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ الغرض نیاز فتح پوری کے لسانی مزاج کی تشکیل وارتقا میں ان زبانوں کا نہایت اہم رول رہا ہے۔

کسی شخص کے لسانی مزاج کا انحصار اس کی اپنی زبان کی اہلیت یا شعور پر قائم ہوتا ہے جسے لسانیاتی ادب کی اصطلاح میں Linguistic Competence کہا جاتا ہے یہ اصطلاح سب سے پہلے مشہور امریکی ماہر لسانیات نوام چامسکی (Noam Chomsky) نے استعمال کی تھی جس سے کسی شخص کی اپنی زبان کا علم مراد لیا جاتا ہے۔ بعد میں اس نظریے کو ایک دوسرے امریکی ماہر لسانیات ڈیل ہائمز (Dell Hymes) نے چیلنج کیا اور کہا کہ کسی شخص کے لیے محض اپنی زبان کا علم، اہلیت یا شعور ہی کافی نہیں، بلکہ مخصوص سماجی سیاق وسباق میں اسے اپنی زبان کو برتنے اور بروئے عمل لانے کا شعور بھی آنا چاہیے کیوں کہ زبان ایک سماجی مظہر (Social Phenomenon) ہے جسے سماجی سیاق وسباق سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ڈیل ہائمز نے اپنے اس نظریے کو Communicative Competence یعنی ترسیلی شعور یا اہلیت کا نام دیا ہے۔ لسانی مزاج کی تشکیل میں ان دونوں نظریات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

نیاز فتح پوری نے خالص مشرقی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ ہوش سنبھالا تو مذہبی طرز کی تعلیم پائی جس پر عربی اور درسِ نظامی کی گہری چھاپ موجود تھی۔ والد کی صحبت و تربیت نے ان کے اندر فارسی کا گہرا ذوق پیدا کیا۔ چناں چہ یہ دونوں زبانیں ان کے لسانی مزاج کا اٹوٹ اور اہم حصہ بن گئیں۔ آگے چل کر ان کے اندر فارسی کا ذوق اور زیادہ نکھرا۔ ۱۲-۱۳ برس کی عمر میں شاعری شروع کی یعنی عنفوانِ شباب میں لکھنؤ کا رنگین ماحول ملا جس کے اثرات نہ صرف ان کے ذہن و دماغ اور فکر پر مرتب ہوئے بلکہ ان کے لسانی مزاج کی تشکیل میں بھی ان کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ خود انھیں کی زبانی لکھنؤ کی ایک طوائف کے "دربار" کا حال

سنیے جہاں ان کے والد نے انھیں "بالکل آزاد" چھوڑ دیا تھا:

"شام کو چودھرائن کا مکان بالکل دربار نظر آتا تھا جس میں شہر کے اکثر خوش ذوق لوگ شریک ہوتے تھے۔ اور اس محفل میں چودھرائن کی حیثیت ایک معلم کی سی ہوتی تھی جس کی گفتگو اور انداز نشست و برخاست سے لوگ صحیح لکھنوی تہذیب سیکھتے تھے، اس محفل میں شعر خوانی، داستان گوئی، لطائف و ظرافت، ضلع جگت، رقص و سرود، سبھی کچھ ہوتا تھا اور جب لوگ یہاں سے لوٹتے تھے تو موسیقی کا صحیح ذوق یا زبان کا صحیح استعمال، گفتگو کا خاص انداز، لب و لہجہ کی شیرینی، نشست و برخاست کا انداز اور خدا جانے کن کن باتوں کا درس لے کر لوٹتے تھے"۔

کسی شخص کا لسانی مزاج نہ تو پہلے سے طے شدہ (Pre-determined) ہوتا ہے اور نہ خلقی و موروثی، بلکہ یہ کلیۃً اکتسابی اور ماحول کا زائیدہ ہوتا ہے جس کی تحصیل پہلے غیر رسمی پھر رسمی (جب وہ پڑھنا لکھنا سیکھتا ہے) طور پر عمل میں آتی ہے۔ کسی شخص کے لسانی مزاج کی تشکیل میں اس کا عہد، معاشرہ، تہذیب، ماحول، علمی و ادبی روایات، تعلیمی پس منظر، گرد و پیش کے افراد نیز ثانوی زبانیں (جو وہ شعوری طور پر سیکھتا ہے) اہم رول ادا کرتی ہیں۔ نیاز فتح پوری کے لسانی مزاج کی تشکیل میں بھی ان تمام عوامل کی کارفرمائی رہی ہے۔

لسانی مزاج کی اصل، عام اور سادہ صورت روزمرہ کی گفتگو اور عام بول چال میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہر وہ شخص جو اپنی مادری زبان پر قدرت رکھتا ہے ایک مخصوص لسانی مزاج کا بھی حامل ہوتا ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں اس کا ارتقا ادبی زبان کی شکل میں ہی ہوتا ہے۔ یہ لسانی مزاج کی تخلیقی اور فن کارانہ صورت ہے۔ یہ وہی لسانی مزاج ہے جو کسی ادیب کو صاحب اسلوب بناتا ہے۔ اس کی انفرادیت کا ضامن ہوتا ہے اور اسے دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتا ہے۔ کسی ادیب یا شاعر کے اسلوب کی تشکیل میں اس کے تخلیقی اور فن کارانہ لسانی مزاج کی ہی کارفرمائی ہوتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کسی ادیب کا اسلوب اس کے تخلیقی اور فن کارانہ لسانی مزاج کا ہی دوسرا نام ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ جب ہم میر کا اسلوب، غالب کا اسلوب یا میرامن کا اسلوب کہتے ہیں تو اس سے میر، غالب یا میرامن کے لسانی مزاج کی تخلیقیت ہی

مراد لی جاتی ہے۔ روزمرہ کی گفتگو یا عام بول چال کی زبان کی ایک خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ Automatized ہوتی ہے یعنی اس میں ترسیل و ابلاغ کا عمل برجستہ بہ سرعت اور غیر ارادی طور پر سر انجام پاتا ہے اور زبان تحت الشعور کا حصّہ بن جاتی ہے لیکن ادبی زبان میں اس کے بالکل برعکس عمل ہوتا ہے اسی لیے اسے De-automatization کا نام دیا گیا ہے۔ اس کا زبان کے تخلیقی استعمال سے گہرا تعلق ہے۔ زبان کے تخلیقی استعمال میں ادیب کی شعوری کوششوں کو خاصا دخل ہوتا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ زبان کے تخلیقی استعمال سے جو اُسلوب تشکیل پاتا ہے وہ اُس زبان کے بنیادی اُسلوب سے مختلف ہوتا ہے۔ بنیادی اُسلوب میں ایک قسم کا لسانی توازن پایا جاتا ہے جب کہ تخلیقی زبان لسانی توازن کے انحراف کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ لسانی توازن کو ہم لسانی نارم (Linguistic Norm) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ادبی زبان میں ہمیشہ لسانی نارم سے انحراف (Deviation) پایا جاتا ہے جب کہ بول چال کی زبان بنیادی اُسلوب سے قریب تر ہوتی ہے اور اس میں لسانی نارم کی پابندی کی جاتی ہے، لیکن اس میں زبان کے تخلیقی استعمال کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ جہاں تک کہ اُردو کے بنیادی اسلوب کا تعلق ہے عام خیال یہ ہے کہ یہ ایک 'مفروضہ' ہے۔ کیوں کہ اُردو کے کسی بھی مصنف کے اسلوب کو اُردو کا بنیادی اسلوب نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہاں اگر کسی مصنف کا اُسلوب کسی حد تک عام فہم، سادہ، سلیس اور آسان ہے تو اسے بنیادی اُسلوب کے قریب تر ضرور کہا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں سرسیّد، حالی، شبلی اور مولوی عبدالحق کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن کے اسالیب کو اُردو کے بنیادی اُسلوب سے قریب تر کہا جا سکتا ہے۔ ان مصنفین کے برعکس اگر ہم مولانا محمد حسین آزاد، مرزا رجب علی بیگ سرور، مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری کی تحریروں کو دیکھیں تو ہمیں ایک بالکل دوسرا اُسلوب نظر آئے گا جسے پیچیدہ، مرصع، رنگین اور آراستہ اُسلوب قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ اُردو کے بنیادی اسلوب کے برعکس ہے۔ پروفیسر محمد حسن کا یہ خیال تو درست ہے کہ "سرسیّد نے جس سلیس اور سادہ نثر کو رواج بخشا تھا اُسے نیاز نے مرصع اور رنگین بنا دیا" لیکن ان کی یہ بات محلِ نظر ہے کہ ایسا سرسیّد کے ردِّ عمل کے طور پر ہوا۔ نیاز کے اسلوب میں جو صنعت گری اور حسن کاری پیدا ہوئی اس

کے دو محرکات ہیں: اول ان کی حسن پرستی اور جمالیاتی احساس، دوم ان کا مخصوص لسانی مزاج جس کی تشکیل ایک خاص ماحول میں ہوئی تھی۔

نیاز فتح پوری کے دلکش، رنگین، مرصع اور آراستہ اسلوب کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھیں اردو نثر کا جوش کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، کیوں کہ نیاز کے یہاں الفاظ کی وہی گھن گرج پائی جاتی ہے جو جوش ملیح آبادی کے یہاں ہے۔ دونوں کے یہاں زبان کا تاثراتی (Expressive) استعمال اپنی بلندی پر ہے۔ دونوں کے یہاں مرعوب کرنے والا انداز بھی ملتا ہے۔ دونوں کو الفاظ کے استعمال پر زبردست قدرت حاصل ہے۔ دونوں زبان کی رنگینی اور آراستگی پر زور دیتے ہیں اور دونوں عربی فارسی کے الفاظ و تراکیب کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ نیاز فتح پوری اپنی کتاب "ماله وما علیہ" میں جوش کی ایک نظم پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ نظم صرف خوش نما الفاظ و دلکش تراکیب اور خوبصورت تشبیہوں کا مجموعہ ہے جن سے شاعر کے اچھے آرٹسٹ ہونے پر تو حکم لگایا جا سکتا ہے لیکن ان کی مفکرانہ حیثیت پر اس سے کوئی روشنی نہیں پڑتی"۔ جن لوگوں نے نیاز کے افسانوی مجموعوں، انشائیوں، مکاتیب اور دیگر تحریروں کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ خود نیاز کے یہاں "خوش نما الفاظ و دلکش تراکیب اور خوب صورت تشبیہوں" کی کمی نہیں۔ باعتبار اسلوب، نیاز، ابوالکلام آزاد سے بھی بے حد قریب ہیں۔ آزاد کے مجموعۂ مکاتیب "غبار خاطر" اور "مکتوبات نیاز" میں بے شمار اسلوبیاتی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ نیاز فتح پوری نے رنگین ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، حسن پرستی ان کا شعار تھا، اور احساس جمال ان کی کمزوری۔ پھر بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار تھے۔ لہٰذا ان سے سادہ و سہل نثر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن ابوالکلام آزاد کی نثر غیر افسانوی ہوتے ہوئے بھی سادگی اور سلاست سے کوسوں دور ہے۔ نیاز اور آزاد دونوں کی نثر میں آراستگی، صنعت گری، رنگینی اور پیچیدگی ایک عام بات ہے۔ دونوں اپنی نثر میں فارسی الفاظ و تراکیب کی گہری آمیزش سے کام لیتے ہیں اگرچہ فکری اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

نیاز فتح پوری کے اسلوب کی ان کے تمام ہم عصروں نے جی کھول کر داد دی ہے، جوش

نے اپنی تمام تر مخالفتوں کے باوصف نیاز کو "خالقِ طرزِ انشار پرداز" کہا ہے[۱۰۹]۔ فراق گورکھپوری نے انھیں "بلند پایہ اسٹائلسٹ (Stylist)" کے نام سے یاد کیا[۱۱۰]۔ مجنوں گورکھپوری نے ان کے اسلوب کی انفرادیت کو "تخلیقی اسلوب" کا نام دیا اور یہ کہا کہ "نیاز فطرتاً ایک صاحبِ اسلوب ہیں"۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ "نیاز کا بڑے سے بڑا منکر بھی ان کے اسلوب کی ساحرانہ قوت سے مبہوت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نئی نسل کو نیاز سے جو ترکہ ملا ہے وہ اسلوب ہے، ایسا اسلوب جو طرح طرح کی توانائیاں اپنے اندر لیے ہوئے ہے"[۱۱۱]۔ ل۔ احمد اکبرآبادی نے ایک جگہ یہ لکھا کہ "اس دور میں نیاز صاحب اردو کے مسلّم ادیب و انشاپرداز اور بلاشبہ اعلیٰ طرزِ نگارش کے مالک ہیں"[۱۱۲]۔ مالک رام نے ان کی نثر کو "بانکی، البیلی نثر" کہا[۱۱۳]۔ محمد حسن نے نیاز فتح پوری پر اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ ان کی "نثر میں جادو تھا"[۱۱۴]۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نیاز فتح پوری ایک صاحبِ طرز انشاپرداز تھے۔ ان کا اسلوب اپنے اندر ایک انفرادی اور جداگانہ شان رکھتا ہے۔ نیاز کی تحریروں کو پڑھ کر ہم ایک ایسے جمالیاتی تجربے سے گذرتے ہیں جہاں نغمگی، رنگینی، دلآویزی اور حسن کاری سب کچھ ہے۔

اسلوب کا تعلق ادب میں زبان کے استعمال سے ہے۔ چوں کہ ادب کا ذریعۂ اظہار زبان ہے، لہٰذا اظہار کے نت نئے طریقوں، طرزِ بیان کی جدّتوں اور نئے لسانی سانچوں کی تشکیل سے ہی اسلوب کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ یہ تمام اسلوبیاتی وسائل زبان کی صوتی، صرفی، لغوی، نحوی اور معنیاتی سطح پر بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ زبان کا ادبی یا اسلوبیاتی استعمال ایک طرف طرزِ بیان میں اثریت کا موجب بنتا ہے تو دوسری طرف اظہار میں جدّت اور معنی میں اضافے کا سبب بھی قرار پاتا ہے۔ نیاز فتح پوری کی تحریریں جن میں ان کے افسانوی مجموعے، انشائیے، مکاتیب، تنقیدی مقالات، مذاکرات اور ان کی کتاب "مالہٗ وما علیہ" شامل ہے، زبان کے اسلوبیاتی استعمال کے بڑے اچھے اور اچھوتے نمونے پیش کرتی ہیں جن کا تجزیہ ذیل میں محدود طور سے صوتی اور نحوی سطح پر کیا جاتا ہے:

(الف) صوتی

۱۔ صوتی رمزیت

صوتی سطح پر نیاز فتح پوری کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت صوتی رمزیت

(Sound Symbolism) ہے جس میں الفاظ کی اصوات سے ان کے معانی کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً ـــــ

- "زبیدہ میں ناگن کا بل تھا اور لہروں کا لوچ، گلبن کی لچک تھی اور سنبل کا پیچ و خم۔" ۱۵

(لام کی آواز جو اس جملے میں چھ بار استعمال ہوئی ہے، حرکت کے مفہوم کو بخوبی ادا کرتی ہے، بالخصوص بل، لہروں، لوچ اور لچک جیسے الفاظ میں)

- "ساکن سطح آب، سنسان صحرا، خاموش شب ماہ، برف پوش چوٹیاں۔" ۱۶

(یہاں س (ص) ش اور خ کی صفیری (Fricative) آوازوں سے ماحول کے سکوت و سکون کی عکاسی کا کام لیا گیا ہے)۔

- "جس کے ایوان نمانے میں کنیزوں کے ریشمی ملبوسات کی سرسراہٹ ہمیشہ محسوس ہوتی رہتی تھی۔" ۱۷

(یہاں "سرسراہٹ" ایک Onomatopoeic یعنی صوت رمزی لفظ ہے جس میں س کی دونوں اصوات اس آواز کی نقالی کر رہی ہیں جو لباس کے سرکنے، ہلنے یا جسم سے مس ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک اور قریب الواقع لفظ "ملبوسات" بھی ہے جو اگرچہ صوت رمزی لفظ نہیں ہے لیکن اس میں پائی جانے والی س کی آواز "سرسراہٹ" کی س کے ساتھ مل کر صوت رمزی کیفیت کو دوبالا کر رہی ہے۔ انگریزی میں اس کی خوبصورت مثال ٹینی سن کی ایک لائن "And murmuring of innumerable bees." ہے۔

۲۔ تجانسِ صوتی

تجانسِ صوتی (Alliteration) کی مثالیں بھی نیاز کی تحریروں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اس میں کسی جملے یا فقرے کے دو یا دو سے زیادہ قریب الواقع الفاظ ایک ہی مصوتے سے شروع ہوتے ہیں، مثلاً

- "اگر میری رعونت کی تاب سے وہ بچ گیا تو نگاہوں کے تیر سے

کیوں کر جا بنر ہو سکے گا۔" [۱۸]

- "جمنا اپنی نیلگوں چادر میں چاند کا مکھڑا چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اور ناکام ہو کر ساحل پر سر ٹپک رہی تھی۔"
- "ادریہ لانبی گھنی پلکوں کو تو دیکھو جیسے سیاہ ریشم کے باریک و نرم ریشے کسی نے سلیقے سے جما دیے ہوں۔" [۱۹]
- "چاندنی رات تھی، خانقاہ کے نیچے بہنے والی ندی میں چاند نے چراغاں کر رکھا تھا۔" [۲۰]

۳۔ قافیہ بندی

نیاز کے اسلوب نثر کی ایک نمایاں خصوصیت جملوں اور فقروں میں قافیوں کا التزام ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ مقفّیٰ الفاظ استعمال کرتے ہیں جس سے شعر کی سی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

- "راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں، بلند بالا، صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی ہوئی، گردنیں تنی ہوئی، آنکھوں میں تیر، مانگوں میں عبیر، ابروؤں میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پر بندی، اب آپ سے کیا کہوں کیا چیز ہیں۔" [۲۱]
- "وہ جام و مینا کی سرگوشیاں، وہ صحن چمن میں درختوں کی گل پوشیاں، وہ ہلکی ہلکی پھوار، وہ رندانِ بدمست کی ہنگامۂ "بادہ بیار"، آہ کیا پوچھتے ہو!" [۲۲]
- "محبت کو تم جنون و دیوانگی سمجھتے ہو، لیکن غزل گوئی کو بڑی فرزانگی! قربان جائیے اس عقل و فراست کے۔" [۲۳]
- "نسیم! دیکھتے ہو ان چھوٹے چھوٹے بلبلوں کو جو شہاب ثاقب کی طرح نیچے سے اوپر کی طرف بیتابانہ دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک معمولی انسانی زندگی کا بھی یہی فلسفہ ہے۔ ایک بے اختیارانہ صعود، ایک مضطربانہ اقدام، ایک والہانہ استعلا اور ایک مجنونانہ تگ و دو۔" [۲۴]

- "سمجھے کیا عمر کہ جب تو سو جاتی ہے تو کیا ہو جاتی ہے۔" ۲۵؎
- "اس کی رنگینیِ طبع اکتسابی نہیں، بلکہ یکسر وہبی ہوتی ہے اور اسی لیے وہ کبھی موقع پر چوکتا نہیں اور ہونٹوں پر آئی ہوئی بات کو روکتا نہیں۔" ۲۶؎
- "اسے بادلوں کی طرح اپنی خانہ بدوش آوارگیوں میں گم رہنے والے صحرائیو، کیا مجھے کبھی تم اپنے نشۂ وارفتگی میں کبھی شریک کر سکتے ہو جس سے تم نے صحرا کے ذرّوں کو مخمور اور پہاڑوں کی وادیوں کو معمور کر رکھا ہے۔" ۲۷؎

(ب) نحوی

۱۔ عکسِ ترتیب یا تقلیب (Inversion)

ترتیبِ الفاظ (Word-order) اُردو کی ایک اہم نحوی خصوصیت ہے۔ اُردو میں الفاظ بہ اعتبارِ فاعل/مفعول/فعل ترتیب دیے جاتے ہیں۔ مثلاً احمد (فاعل) اخبار (مفعول) پڑھتا ہے (فعل)۔ چامسکی کے نظریۂ نحو کے مطابق کسی جملے کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے —— فقرۂ اسمیہ (Noun Phrase) اور فقرۂ فعلیہ (Verb Phrase)۔ مثلاً احمد (فقرۂ اسمیہ) اخبار پڑھتا ہے (فقرۂ فعلیہ)۔
ترتیبِ الفاظ کی اس مقررہ صورت سے انحراف کو عکسِ ترتیب یا تقلیب کہتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی اسلوبیاتی جدت ہے جو بعض مصنفین کے یہاں اکثر دیکھنے کو ملتی ہے۔ نیاز فتح پوری کی تحریروں میں بھی اس طرزِ اسلوب کے نمونے اکثر و بیشتر پائے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں عکسِ ترتیب کے زیادہ تر وہ نمونے ملتے ہیں جن میں فقرۂ فعلیہ، فقرۂ اسمیہ سے پہلے آتا ہے، مثلاً ——

- "ایک کیفیت تھی بدن میں سنسنی کی، دماغ میں نشے کی، خون میں سرعتِ دوران کی، روح میں بالیدگی اور احساس میں اس شگفتگی کی جو صبحِ نسیم کے چھو جانے کے بعد گل میں پیدا ہونے لگتی ہے۔" ۲۸؎
- "زندگی نام ہے صرف ریگ زار کی سی وحشت کا، بے آب و گیاہ

سرزمین کی سی خنکی کا۔" ۲۹؎

- " جو کسی زمانے میں مخصوص تھا صرف جمیل مناظرِ قدرت کے مطالعے کے لیے۔" ۳۰؎
- " لیکن مجھ سے پوچھیے تو میں کہوں گا کہ وہ صرف کیفیت ہے روح کی، پیام ہے قلب کا۔"

عکسِ ترتیب سے جملے کی معنیاتی ساخت میں اگرچہ کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی تاہم تھوڑا زور اور جذباتی تاثر ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔

۴۔ ساختی متوازیت

ساختی متوازیت (Constructional Parallelism) کے نمونے وہاں پائے جاتے ہیں جب دو یا دو سے زیادہ جملے یا جملے کے قریب الواقع اجزا نحوی ساخت کے اعتبار سے متوازی (Parallel) ہوں یعنی ان میں نحوی مماثلت یا مطابقت پائی جاتی ہو۔ ساختی متوازیت میں بالعموم الفاظ اور حروف (حروفِ علت، حروفِ ربط وغیرہ) کی تکرار پائی جاتی ہے۔ لیکن خالص ساختی متوازیت کا انحصار ان چیزوں پر نہیں ہوتا بلکہ جملوں یا فقروں کے نحوی سانچوں اور شکلوں کی تکرار پر ہوتا ہے۔ ساختی متوازیت جزوی بھی ہو سکتی ہے اور کلی بھی۔ جزوی ساختی متوازیت کسی جملے کے دو یا دو سے زیادہ متواتر اجزا کی نحوی تکرار سے تشکیل پاتی ہے جب کہ کلی ساختی متوازیت میں ایک جملہ دوسرے متواتر جملے یا جملوں سے مکمل طور پر نحوی مطابقت رکھتا ہے۔ کلی ساخت متوازیت کو 'توازن' (Balance) بھی کہتے ہیں۔

متوازیت نیاز فتح پوری کے نثری اسلوب کی ایک ایسی نمایاں خصوصیت ہے جس سے کوئی بھی قاری صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ ان کی ہر تحریر میں خواہ وہ افسانہ ہو یا انشائیہ، تنقید ہو یا تبصرہ، مکاتیب ہوں یا ملاحظات، متوازی ساختوں کے نمونے قدم قدم پر مل جائیں گے۔ وہ اس خوبصورتی کے ساتھ متوازی ساختے (Parallel Constructions) تشکیل دیتے ہیں کہ پڑھنے والا مسحور ہو جاتا ہے۔ نیاز کے اسلوبِ نثر کا یہ ایک بہت بڑا امتیاز ہے جس کی طرف ہر قاری کی توجہ فوراً مبذول ہو جاتی ہے۔ نیاز کے متوازی ساختے خواہ جزوی ہوں یا کلی، اپنے اندر شعر کی سی نغمگی اور دلکشی رکھتے ہیں اور غالباً انھیں کے لیے

"شعرِ منثور" کی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔

(الف) جزوی ساختی متوازیت

- "وہ گھنٹوں مندر کے اندر تنہا بیٹھا رہتا، کسی فکر میں مستغرق، کسی خیال میں منہمک۔" ۳۱
- "میرے نزدیک محبت نام ہے ایک بے غرض انہماک کا، ایک خود فراموش محویت کا۔" ۳۲
- "کیسی کیسی چاندنی راتیں آئیں اور ختم ہو گئیں، کیسی کیسی متوالی گھٹائیں آئیں اور گذر گئیں، لیکن ایک دن بھی 'کھل کھیلنے کا' بہانہ تم نے ہاتھ نہ آنے دیا۔" ۳۳
- "عورت ۔۔۔ ایک روشنی ہے جسے ہم چھو سکتے ہیں، ایک نکہت ہے جس سے ہم گفتگو کر سکتے ہیں، ایک حلاوت ہے جو ہاتھوں سے چکھی جا سکتی ہے، ایک موسیقی ہے جو آنکھوں سے سنی جا سکتی ہے۔" ۳۴
- "ساحلِ تالاب کی تاریکی میں صرف ایک ہی روشنی جگمگا رہی تھی ــــ کہاں؟ میرے پہلو میں، میری آغوش میں، میری نگاہ کے سامنے، میرے لبوں سے نزدیک اور میری روح کے اندر ــــ" ۳۵
- "یہ تو نے کیسے جانا کہ میں صرف تیرے جسم کا پرستار ہوں، صرف تیری صورت کا شیدائی ہوں۔" ۳۶
- "یہ صبح و شام اپنے صحیح فرائضِ زندگی کو بھول کر گھنٹوں تک سنورنے والیاں، یہ اپنے بیباک تبسموں، اپنی دل شکن نگاہوں، اپنی جری و شوخ چتونوں سے دنیا کو مالوف کر دینے کی آرزو رکھتے ہوئے خود کسی سے محبت نہ کر سکنے والیاں۔" ۳۷
- "وہ وقت جس کی آرزو میں میری عمر کے ستر و سال ایک ایک دن کر کے گذر گئے تھے، وہ ساعت جس کا تخیل مجھے پہروں کالج میں مست رکھتا تھا، وہ گھڑی جس کے انتظار میں لاکھوں تمنائیں دل میں خوابیدہ

تھیں، آل"۳۸

(ب) کُلّی ساختی متوازیت

- "ہوا کا ہر جھونکا غم کے غم لیے پھرتا ہے اور کوئی پینے والا نہیں!!
مینہ کا ہر قطرہ نغمۂ جاں سے لبریز ہے اور کوئی اس کا سننے والا نہیں"۳۹

- "بجلی چمکتی تھی اور تمہارا تبسم نگاہوں میں پھر جاتا تھا!! سرو شمشاد
ہوا سے جھومتے تھے اور تمہاری رعنائیاں آنکھوں کے سامنے آجاتی تھیں!!
ساغر میں شراب چھلکتی ہوئی دیکھتا تھا اور تمہاری آنکھوں کا تصور ستانے
لگتا تھا"۴۰

- "ہوا آتی ہے اور میری آنکھوں میں اپنی گرمی چھوڑ جاتی ہے!!
نسیم چلتی ہے اور میرے کانوں میں اپنی ٹھنڈی سانسیں بھر جاتی ہے!!
کہر منتشر ہوتا ہے اور اپنے سیاہ کفن سے مجھے ڈھک لیتا ہے!! بادل اٹھتا
ہے اور مجھ پر برہم ہوکر برس پڑتا ہے"۴۱

- "اس کا صحیح و توانا جسم، جس کے اندر شباب نے اپنا مخصوص
رنگ بھر کر یکسر مینائے رنگین بنا دیا تھا!! اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں،
جن سے نرگس ہر وقت افسوس کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی!! اس کا سڈول
جسم، جس کے ہر ہر عضو سے بہار کا شگفتگی کا مفہوم پیدا تھا"۴۲

"کیا شبنم سبزۂ پامال سے دریافت کر کے اس کو نہال کرتی ہے!! کیا
آبِ نیساں صدفِ تشنہ کام سے پوچھ کر اس کی پیاس بجھاتا ہے!! کیا
نسیم صبح کلیوں سے استمزاج کر کے ان کو شگفتہ کرتی ہے!! کیا ابر کا چھینٹا
کھیتوں سے اجازت طلب کر کے ان کو سیراب کرتا ہے"۴۳

ساختی متوازیت ایک جذبہ انگیز طرزِ بیان ہے۔ اس کا مقصد جذبے کو ابھارنا ہے۔
متوازی ساختوں کے ذریعے یہ کام کئی طرح سے لیا جاتا ہے۔ کہیں ان چیزوں سے گنتی یا ترتیب
کا کام لیا جاتا ہے۔ کہیں یہ مترادفات کا کام انجام دیتے ہیں اور کہیں ان سے بیان میں وضاحت
پیدا کی جاتی ہے۔ ان سب سے قطع نظر متوازی ساختے عبارت میں ایک ایسا آہنگ یا

پیٹرن پیدا کر دیتے ہیں جو صرف شعر میں پایا جاتا ہے۔[۴۳] اسی لیے نیاز کی نثر کو "مترنم نثر" یا "شعرِ منثور" بھی کہا گیا ہے۔ (ماہ نما اگست ۱۹۴۴ء)

۳۔ عکسِ متوازیت (Chiasmus)

یہ ساختی متوازیت کا عکس یا تقلیب ہے۔ جب دو متواتر جملے یا ان کے اجزا ایک دوسرے کا معکوس یا مقلوب ہوں تو اسے عکسِ متوازیت کہتے ہیں۔ اس میں نہ صرف الفاظ و تراکیب کی ترتیب الٹ جاتی ہے بلکہ اکثر نحوی سانچوں میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ نیاز فتح پوری کے اسلوبِ نثر کی یہ بھی ایک اہم خصوصیت ہے۔ مثالیں:

- "تیری آواز صدائے ساز ہے یا صدائے ساز تیری آواز"[۴۴]
- "ایک مرد عورت کو یہی سکھاتا ہے کہ اسے ایک بیوی کیسے بننا چاہیے۔ اور ایک عورت مرد کو یہ سکھاتی ہے کہ اسے ایک اچھا شوہر کیسے بننا چاہیے"[۴۵]
- "جوانی میں بوڑھا ہو جانا اتنا مشکل نہیں جتنا بڑھاپے میں جوان ہونا"[۴۶]
- "کیا عرض کروں وہ کیا بات تھی، بات کیا تھی ایک کیفیت تھی بدن میں سنسنی کی، دماغ میں نشے کی۔۔۔"[۴۷]
- "بمبئی کا بہترین حسن اور حسن کی بہترین خود آرائیاں۔۔۔"[۴۸]

عکسِ متوازیت کا استعمال ساخت کے دوسرے حصے پر جو پہلے حصے کا معکوس ہوتا ہے، زور پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات اس سے نئے معنی بھی پیدا ہوتے ہیں اور معنیاتی تبدیلی بھی واقع ہوتی ہے۔

۴۔ تکرار

تکرار Repetition زبان میں جذباتی طرز پیدا کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ اس کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب متکلم کسی جذباتی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ تکرار سے متکلم کی ذہنی کیفیت کا بھی پتا چلتا ہے۔ جب متکلم کا دل جوش اور جذبے سے معمور ہوتا ہے تو الفاظ کے اتار چڑھاؤ، جملوں اور فقروں کی ترتیب اور ادائگی، نیز گفتگو کے عام انداز اور لب و لہجے میں تو فرق آتا ہی ہے، الفاظ، تراکیب اور فقروں کی تکرار بھی واقع ہوتی ہے۔

تکرار کا جذباتی اور تاثراتی زبان سے گہرا تعلق ہے۔ جوش اور جذبے کے اظہار کے علاوہ تکرار سے بیان میں شدت پیدا کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اس سے عمل کی یکسانیت، تھکن، بیزاری اور مایوسی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ نیاز فتح پوری کی تحریروں بالخصوص ان کے انشائیوں اور افسانوں میں تکرار کے نت نئے پیرائے ملتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

- "نہیں، میں نہیں سننا چاہتی، اپنے سوال کا جواب تجھ سے نہیں چاہتی" ۴۹
- "مردانہ جذبات! میں نہیں سمجھی۔ کس قدر عجیب بات ہے، ایک عورت میں مردانہ جذبات؟ صاف صاف کہہ، یہ مردانہ جذبات کیسے ہوتے ہیں۔ میں سننا چاہتی ہوں کہ وہ کیا کیفیت ہے جو صرف مردوں میں مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ہاں تو نے ایک عورت ہوکر یہ کیسے معلوم کیا کہ وہ جذبات مردانہ ہیں؟ مردانہ! مردانہ!! اُف کس قدر مکروہ، کیسا قابلِ نفرت لفظ ہے" ۵۰
- "ہمارے ملک میں عورتیں مردوں ہی کے ساتھ تعلیم پاتی ہیں۔ اس لیے وہ مردوں ہی کی طرح سوچتی ہیں، مردوں ہی کی طرح بولتی ہیں اور مردوں ہی کی طرح اپنی زندگی بسر کرتی ہیں" ۵۱
- "میں کانپ رہا تھا، میرے جسم کا ایک ایک ریشہ کانپ رہا تھا" ۵۲
- "میں تیرے حسین تحائف واپس کرتا ہوں کہ یہ تیرے ہی حسین جسم کے لیے موزوں ہیں" ۵۳

"ماضی کی داستان بھی کس قدر پرلطف داستان ہے" ۵۴

"ساون کی وہ سیاہ رات، رات کی وہ امنڈ پڑنے والی تاریکی، وہ پہاڑوں اور جنگلوں کو ہلا دینے والی گرج اور پھر اس کے تاریک پردے سے فطرت کا وہ زہرہ گداز تبسم برق، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب اس رات کی کبھی صبح نہ ہوگی" ۵۵

نیاز فتح پوری کے یہاں تکرار کی ایک ترادفی شکل بھی ملتی ہے جس میں مترادف الفاظ

تراکیب اور فقروں کے استعمال سے مفہوم کی تکرار پیدا کی جاتی ہے ۔ اسے ترادفی تکرار (Synonymical Repetition) کہہ سکتے ہیں ۔ نیاز کے یہاں اس کے بڑے اچھے نمونے پائے جاتے ہیں ۔ مثلاً

- "میرے دماغ کا وزن کیوں ہلکا ہو رہا ہے، میں اپنے آپ کو کیوں سبک محسوس کر رہی ہوں" ۵۶ے
- "تف ہے تمہاری جوانی پر اور حیف ہے تمہارے شباب پر" ۵۷ے
- "میں تجھے کیسے پوجوں؟ اپنے جذبۂ پرستاری کی آگ کو کیوں کر ٹھنڈا کروں؟" ۵۸ے
- "وہ اپنی نگاہوں کے افسوں اور باتوں کے جادو سے سب کو مسحور کیا کرتی تھی" ۵۹ے

"میں یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں کہ تو دولت مند ہے، میں یہ معلوم کر کے مسرور ہوتا ہوں کہ تو ذہین و قابل ہے" ۶۰ے

- "حقیقت یہ ہے کہ اسے اپنے حسن پر بڑا غرور تھا، بڑا پندار تھا" ۶۱ے

۶۔ شماریت

نیاز فتح پوری کے اسلوب کی ایک خصوصیت شماریت (Enumeration) بھی ہے۔ یہ بیان کا ایک طرز ہے جس میں مختلف اشیاء یا افعال (Actions) کا ایک ایک کر کے نام گنایا جاتا ہے جس سے ایک زنجیر سی بن جاتی ہے۔ اس سے جملے کی نحوی ترتیب میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جن اشیاء کا ایک ایک کر کے نام لیا جاتا ہے وہ بالعموم ایک ہی زمرے یا قبیل سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں ایک قسم کی معنیاتی ربط پایا جاتا ہے اور یہ کسی بھی طرح تسلسلِ بیان کو مجروح نہیں ہونے دیتا۔ چند مثالیں:

- "یہ شمعدان، یہ گلدان، یہ دروازوں کے پردے، یہ دیواروں کے نقش و نگار، الغرض ہر چیز مجھ سے دور ہٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے" ۶۲ے
- "تمام احاطہ —— در و دیوار، محراب، زینہ، چھت، ستون،

غرض اس عمارت کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں پھول ہی پھول نہ نظر آتے ہوں۔" ۶۳

- "لکھنؤ کی شاعری میں الفاظ کی طلسم بندی، کنگھی، چوٹی، انگیا، آنچل، آرسی، سرمہ، بے معنی صنائع وبدائع اور اسی قسم کی بہت سی سطحی وغیر سنجیدہ خصوصیات کے پیدا ہونے کا سبب یہی تھا۔" ۶۴
- "اسی کے ساتھ چہرہ کا غازہ، رخسار کی گلگونی، لبوں کی سرخی، آنکھوں کی گہری سرمگینی، بالوں کی تموجی آرائش، یہ بھی کوئی غیر معمولی چیز نہ تھی۔۔۔" ۶۵
- "میں نے دیکھا کہ موجیں ہٹ گئیں، مچھلیاں چلی گئیں، آفتاب نے کیچڑ کو خشک کر دیا اور ہوا تیاں اڑا لے گئی۔" ۶۶

۶۔ تضاد (Antithesis)

نیاز فتح پوری اشیاء یا مظاہر کو ایک خاص انداز سے بیان کرنے کے لیے ان میں اور دوسری اشیاء یا مظاہر میں مماثلت یا تناسب کے علاوہ تضاد بھی تلاش کرتے ہیں۔ تضاد منطقی بھی ہوتا ہے اور اسلوبیاتی بھی۔ منطقی تضاد کسی بھی طرح کے دو لفظوں میں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں دیکھا جا سکتا ہے۔ انھیں متضاد الفاظ (Antonyms) کہتے ہیں۔ مثلاً خیر وشر، نیک وبد، لیل ونہار، صبح وشام، زمین وآسمان یا آگے پیچھے، اوپر نیچے، دائیں بائیں وغیرہ۔ اسلوبیاتی تضاد متضاد الفاظ کے خالی خولی استعمال سے نہیں پیدا ہوتا، بلکہ ان کے استعمال میں جدت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کا تعلق زیادہ تر عبارت کے سیاق وسباق سے ہوتا ہے۔ اسلوبیاتی تضاد بالعموم متوازی ساختوں (Parallel Constructions) کی طرز پر ڈھالا جاتا ہے، لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ متوازی ساختوں کی وجہ سے عبارت میں ایک مخصوص قسم کا آہنگ یا پیٹرن پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلوبیاتی تضاد کا ایک مقصد دو چیزوں میں تقابل بھی ہے جس کی بہترین مثال نیاز فتح پوری کے اس جملے میں پائی جاتی ہے، یہ جملہ متوازیت کی بھی ایک اچھی مثال پیش کرتا ہے:

- "ادھر سورج ڈوب رہا تھا اور ادھر ایک بدرِ کامل طلوع ہو رہا

تھا۔" ۶۷؎

اس جملے کے نہ صرف دونوں متوازی ساختے ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ ان کے ہر ہر لفظ میں تضاد پایا جاتا ہے (بہ استثنائے "ایک") صرف دونوں طرح کے الفاظ کے قواعدی زمرے مشترک ہیں:

اُدھر	⟷	اِدھر
سورج	⟷	بدرِ کامل
ڈوب رہا تھا	⟷	طلوع ہو رہا تھا
اُدھر سورج ڈوب رہا تھا	⟷	اِدھر (ایک) بدرِ کامل طلوع ہو رہا تھا

تضاد کی ایک اور عمدہ مثال ذیل کی عبارت میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ پوری عبارت کلی ساختی متوازیت کا بھی ایک بہترین نمونہ ہے جس کا ہر متوازی ساختہ اپنے اندر ایک تضاد رکھتا ہے جسے حرفِ عطف "اور" سے جوڑا گیا ہے۔

● "گویا ایک زرّیں شعاع تھی جو دفعتہً نمودار ہوئی اور پھر چھپ گئی۔ ایک ابتسامِ لطف تھا جس نے طلوع کیا اور پھر فوراً ہی تاریکیوں میں پوشیدہ ہو گیا۔ ایک نورِ فکر تھا جو ایک لمحہ کے لیے چمکا اور بحرِ عدم میں ڈوب گیا۔ ایک معطر پھول تھا جو تھوڑی دیر اپنی نکہت سے مشکر پیدا کر کے مرجھا گیا۔ ایک نغمۂ محبت تھا جو ایک ساعت کے لیے تموّج میں آیا اور پھر ہاویۂ سکون میں غائب ہو گیا۔" ۶۸؎

(ج) معنیاتی

جب ہم کلام کرنے کے لیے لفظوں کا انتخاب کرتے ہیں تو انھیں آپس میں جوڑنا اور ترکیب دینا بھی پڑتا ہے، لیکن یہ عمل اتنا آسان نہیں، کیوں کہ ایک لفظ کو دوسرے لفظ کے ساتھ ترکیب دیتے وقت ہم پر بہت سی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، مثلاً ہمارا لسانی شعور یہ کہتا ہے کہ 'لمبا سانپ'، اور 'اونچا درخت'، کی ترکیبیں بالکل درست ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم 'اونچا سانپ' اور 'لمبا درخت'، کہیں تو یہ معنیاتی اعتبار سے بے میل اور بے قاعدہ

سمجھا جائے گا کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ جسامت کے اعتبار سے جو چیز عمودی یعنی 'کھڑی ہوتی' ہے اس میں اونچائی ہوتی ہے اور جو افقی یا 'پڑتی' ہوتی ہے اس میں لمبائی۔ اس رو سے لمبا سانپ، لمبی پنسل یا لمبی رسی کہنا درست ہوگا اور اونچا سانپ، اونچی پنسل یا اونچی رسی کہنا نادرست۔ انتخابِ الفاظ کے سلسلے میں عائد اس پابندی کو انتخابی پابندی کہیں گے۔ اگر کوئی شخص ان پابندیوں یا ضابطوں کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ لسانی نارم (Norm) سے انحراف کا مرتکب ہوتا ہے۔ انتخابی پابندیاں ہمیں معنیاتی اعتبار سے دو بے میل (Incompatible) الفاظ یا کلموں کو باہم ترکیب دینے سے روکتی ہیں۔ اسے ایک اور مثال کے ذریعے بھی سمجھا جا سکتا ہے: 'ہنسنا' ایک انسانی عمل یا عادت ہے، مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بچہ ہنس دیا، لڑکے ہنسنے لگے یا مجھے ہنسی آگئی۔ لیکن بے جان چیزوں کے لیے لفظ 'ہنسنا' استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کرسی ہنسنے لگی، یا کمرے کو ہنسی آگئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انتخابی پابندیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم کرسی، کمرہ اور اسی قبیل کے اور بہت سے اسما کے ساتھ لفظ 'ہنسنا' اور اس کی تصریفی شکلوں کو ترکیب نہیں دے سکتے۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو یہ انتخابی پابندیوں یا ضابطوں سے انحراف تصوّر کیا جائے گا، اور زبان میں بے قاعدگی (Anomaly) کا موجب قرار پائے گا۔ لیکن ادب بالخصوص شاعری میں اس قسم کے انحرافات کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور انھیں اظہار کی جدّت، انوکھے پیرایۂ بیان، الفاظ کے نئے تلازمات اور نئے لسانی سانچوں کی تشکیل سے تعبیر کیا جاتا ہے[۹] اور یہ چیزیں کسی مصنف یا شاعر کے اسلوب کی انفرادیت کی ضامن قرار پاتی ہے۔ مثلاً پرکاش فکری کا یہ مصرع دیکھیے ؎

میرے کمرے کو ہنسی آئے گی تھوڑی دیر میں

یہاں شاعر نے کمرہ (بے جان اسم) کو فعل ہنسی (انسانی عمل یا عادت) کے ساتھ ترتیب دیا ہے جو انتخابی پابندی کی مبیّنہ خلاف ورزی ہے۔ 'کمرے' اور 'ہنسی' کی ترکیب معنیاتی عدم مطابقت کی وجہ سے بے میل ہوگئی ہے جس کے نتیجے میں زبان میں انحراف پیدا ہو گیا ہے لیکن مذکورہ مصرعہ میں یہ چیز اظہار کی جدّت اور انوکھے پیرایۂ بیان کی حامل ہے۔ اردو میں انتخابی پابندیوں (Selectional Restrictions) سے انحراف کی چند اور مثالیں دیکھیے:

ہنستی ہوئی گئی ہے صبح، پیارے آرہی ہے شام

(جمیل الدین عالی)

اداس شام دریچوں میں مسکراتی ہے

(پروین شاکر)

حدِّ افق پہ شام تھی خیموں میں منتظر

(وزیر آغا)

یادیں رہ جاتی ہیں ڈسنے کے لیے

(شہریار)

تمام رات جگنے خواب اس کی یادوں کے

(انور سدید)

پتیوں کے لحافوں میں دبکی ہوئی سورہی تھی ہوا

(راہی معصوم رضا)

مذکورہ نمونے شاعری سے پیش کیے گئے ہیں جہاں انتخابی پابندیوں سے انحراف ایک عام بات ہے، بلکہ شعری زبان کا ایک وصف ہے۔

نیاز فتح پوری نے نثر میں انتخابی ضابطوں سے انحراف کر کے شعر جیسی دلکشی پیدا کردی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں جو زیادہ تر ان کے افسانوں اور انشائیوں سے لی گئی ہیں:

- "میری آنکھیں نازک حنائی انگلیوں کو چوم رہی تھیں۔" ۲۸؎
- "ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر بیدار ہو کر آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا ہے۔" ۲۹؎
- "پھول کنارِ راہ میں مسرور نظر آتے تھے۔" ۳۰؎
- "چاند چادر سیمیں پھیلا کر اس پر اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔"
- "جمنا اپنی نیلگوں چادر میں چاند کا ٹکڑا چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔"
- "جب رات زیادہ بلند ہو چکی" ۳۱؎
- "چاندنی رات تھی، خانقاہ کے نیچے بہنے والی ندی میں چاند نے

چلاماں کر رکھا تھا۔" ۱۹؎

- "شہزادی ریحانہ ... ساحل بحر پر کھڑی دیکھ رہی تھی کہ جب آفتاب سمندر کے اندر سے تازہ تازہ نہا کر باہر نکلتا ہے تو کائنات کی ہر چیز اس کی پذیرائی کس طرح کرتی ہے۔" ۲۰؎
- "سمندر ہنس کر لہریں لیتا ہے اور ساحل پر اپنی زرد شعاعیں پھیلاتا ہے۔ لہریں بے معنی نظمیں بچوں کو سنایا کرتی ہیں، جیسے ماں پالنا ہلاتے وقت۔ سمندر بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔" ۲۱؎
- "ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری آنکھوں سے اس وقت موسیقی نکل نکل کر تمام وادی میں گونج رہی ہے۔" ۲۲؎

حواشی

۱۔ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں: "میرے والد فارسی کے بڑے مشہور شاعر و انشا پرداز تھے۔ غزل سے انھیں بہت کم دلچسپی تھی، صرف قصائد لکھتے تھے، اور وہ بھی نعت و منقبت میں۔ صہبائی کے شاگرد تھے اور غالب کی فارسیت کے شیدائی۔ اس وقت فارسی تعلیم کا رواج کافی تھا اور صبح کو میرا مکان ایک اچھا خاصا درس گاہ ہو جاتا تھا جہاں زیادہ تر پختہ عمر کے لوگ میرے والد سے فارسی پڑھنے آجاتے تھے۔" (دیکھیے نیاز فتح پوری، "والد مرحوم، میں اور نگار" مشمولہ نگار پاکستان (نیاز نمبر)، حصہ اول، سالنامہ ۱۹۶۳ء، ص ۲۱)۔

۲۔ نیاز نے عربی اپنے وطن (فتح پور) کے مدرسہ اسلامیہ میں مولانا نور محمد صاحب سے پڑھی جو عربی کے عالم تھے اور صرف و نحو، فقہ و حدیث اور منطق وغیرہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں "میں مدرسہ اسلامیہ میں عربی کا درسِ نظامی حاصل کر رہا تھا اور گھر پر والد سے فارسی پڑھتا تھا... اور عربی میں درسِ نظامی کا بڑا حصہ ختم کر کے اس حد تک پہنچ گیا تھا جب صرف و نحو اور منطق کی ضروری تعلیم کے بعد ادبی تعلیم شروع ہوتی ہے۔" (دیکھیے ایضاً، ص ۲۱)

۳۔ بحوالہ امیر عارفی، نیاز فتح پوری (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۷۷ء)، ص ۱۵۔

۴۔ محمد اسحاق صدیقی نے امیر عارفی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے یہ کہا کہ "میں نے ترکی زبان کے کچھ سبق

نیاز صاحب سے پڑھتے تھے۔ نیاز صاحب کو ترکی زبان پر عبور تھا دیکھیے امیر عارفی، محولہ کتاب، ص ۱۰۶۔

۵۔ نیاز فتح پوری، "والدِ مرحوم، میں اور نگار" مشمولہ نگارِ پاکستان (نیاز نمبر)، حصہ اول، سالنامہ ۱۹۶۳ء، ص ۳۹۔

۶۔ نیاز جس زمانے میں مدرسۂ اسلامیہ، فتح پور میں زیرِ تعلیم تھے تو اس وقت ان کی عمر ۱۲، ۱۳ سال کی تھی۔ اس زمانے میں انھیں شعر کہنے کا بھی شوق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ "فارسی میں کبھی کبھی اور اُردو میں اکثر" شعر کہا کرتے تھے۔

۷۔ نیاز فتح پوری، "والدِ مرحوم، میں اور نگار" مشمولہ نگارِ پاکستان (نیاز نمبر)، حصہ اول، سالنامہ ۱۹۶۳ء، ص ۳۶۔

۸۔ دیکھیے محمد حسن کا مضمون "نیاز فتح پوری" مشمولہ شناسا چہرے از محمد حسن (کراچی: غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۱۹۸۰ء)، ص ۹۔ ۲۰

۹۔ جوش ملیح آبادی، "حضرتِ نیاز فتح پوری" مشمولہ نگارِ پاکستان (نیاز نمبر)، حصہ اول، ص ۴۲

۱۰۔ فراق گورکھپوری، "آشفتہ بیانی میری"، مشمولہ نگارِ پاکستان (نیاز نمبر) حصہ اول، ص ۴۵۔

۱۱۔ مجنوں گورکھپوری، "جدید اُردو نثر، نیاز فتح پوری اور نئی نسل"، مشمولہ نگارِ پاکستان (نیاز نمبر)، حصہ اول، ص ۱۰۱۔ ۱۰۴۔

۱۲۔ ل۔ احمد اکبر آبادی، "نیاز فتح پوری کی ادبیت"، مشمولہ ایضاً، ص ۹۵۔

۱۳۔ مالک رام "نیاز اور نیاز مند"، مشمولہ ایضاً، ص ۵۰۔

۱۴۔ محمد حسن، محولہ بالا مضمون، ص ۹۔

۱۵۔ نیاز فتح پوری، "یکے از غوازی مصر"، مشمولہ مذاکراتِ نیاز یا مقالات (لکھنؤ: نگار بک ایجنسی، ۱۹۴۲ء)، ص ۱۳۔

۱۶۔ نیاز فتح پوری، "از ماہ تا بہ ماہی"، مشمولہ مذاکراتِ نیاز یا مقالات، ص ۴۴۔

۱۷۔ نیاز فتح پوری، "شبنمستان کا قطرۂ گوہریں"، مشمولہ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے (کراچی: ادارۂ ادبِ عالیہ، ۱۹۶۰ء)، ص ۳۔

۱۸۔ نیاز فتح پوری، "قربان گاہِ حسن"، مشمولہ ایضاً، ص ۸۷۔

۱۹۔ نیاز فتح پوری، "شبنمستان کا قطرۂ گوہریں"، مشمولہ ایضاً، ص ۱۳

۲۰۔ نیاز فتح پوری "درسِ محبت"، مشمولہ ایضاً، ص ۴۸۔
۲۱۔ نیاز فتح پوری، "مکتوباتِ نیاز" حصہ اوّل (لکھنؤ: نگار بک ایجنسی، ۱۹۴۴ء) بارِ دوم، ص ۱۲۳۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۷۸۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۱۹۔
۲۴۔ نیاز فتح پوری، "تاثراتِ نیاز"، ص ۱۰۰۔
۲۵۔ نیاز فتح پوری "ایک شب کی قیمت"، مشمولہ نگارستان (۱۹۳۹ء)، ص ۷۶۔
۲۶۔ نیاز فتح پوری، انتقادیات، حصہ اوّل (حیدرآباد دکن: عبدالحق اکیڈمی، ۱۹۴۴ء)، ص ۲۵۸۔
۲۷۔ نیاز فتح پوری "برسات"، مشمولہ نگارستان (۱۹۳۹ء)، ص ۸۵۔

۲۸۔ نیاز فتح پوری، "شبنمستان کا قطرۂ گوہریں"، مشمولہ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۱۲۔
۲۹۔ ایضاً، ص ۱۹۔
۳۰۔ نیاز فتح پوری، "درسِ محبت"، مشمولہ ایضاً، ص ۴۴۔
۳۱۔ ایضاً، ص ۶۷۔
۳۲۔ نیاز فتح پوری، شہاب کی سرگذشت (لکھنؤ: نگار شین پریس)، ص ۱۳۔
۳۳۔ نیاز فتح پوری، مکتوباتِ نیاز (حصہ اوّل)، ص ۱۵۹۔
۳۴۔ نیاز فتح پوری "عورت"، مشمولہ نگارستان (۱۹۳۹ء)، ص ۸۲۔
۳۵۔ نیاز فتح پوری "از ماہ تا بہ ماہی"، مشمولہ مذاکراتِ نیاز یا مقالات، ص ۲۶۔
۳۶۔ نیاز فتح پوری "درسِ محبت"، مشمولہ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۴۸۔
۳۷۔ نیاز فتح پوری، شہاب کی سرگذشت، ص ۲۶۔
۳۸۔ نیاز فتح پوری، ایک شاعر کا انجام (لکھنؤ: نگار شین پریس)، ص ۳-۴۔
۳۹۔ نیاز فتح پوری، مکتوباتِ نیاز (حصہ اوّل)، ص ۱۱۱۔
۴۰۔ ایضاً، ص ۱۷۸۔
۴۱۔ نیاز فتح پوری، تاثراتِ نیاز، ص ۸۱-۸۲۔
۴۲۔ نیاز فتح پوری، "درسِ محبت"، مشمولہ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص

۴۳۔ نیاز فتح پوری، مکتوباتِ نیاز (حصّہ اوّل)، ص ۱۰۱۔

۴۴۔ نیاز فتح پوری، "ایک رقاصہ سے"، مشمولہ نگارستان، ص ۷۲۔

۴۵۔ نیاز فتح پوری، تاملاتِ نیاز، ص ۲۴۔

۴۶۔ نیاز فتح پوری، مکتوباتِ نیاز (حصّہ اول)، ص ۱۳۲۔

۴۷۔ نیاز فتح پوری، "شبنمستان کا قطرۂ گوہریں"، مشمولہ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۲۷۔

۴۸۔ نیاز فتح پوری، شہاب کی سرگزشت، ص ۱۲۶۔

۴۹۔ نیاز فتح پوری، "شبنمستان کا قطرۂ گوہریں"، مشمولہ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۲۴۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۲۴۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۵۲۔ نیاز فتح پوری، "یکے از غوازی مصر"، مشمولہ مذاکراتِ نیاز یا مقالات، ص ۱۵۔

۵۳۔ نیاز فتح پوری "قربان گاہِ حسن"، مشمولہ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۹۰۔

۵۴۔ نیاز فتح پوری "چاند کا سفر"، مشمولہ مذاکرتِ نیاز یا مقالات، ص ۶۹۔

۵۵۔ نیاز فتح پوری "برسات"، مشمولہ نگارستان، ص ۸۵۔

۵۶۔ نیاز فتح پوری، شبنمستان کا قطرۂ گوہریں، مشمولہ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۱۰۔

۵۷۔ نیاز فتح پوری، مکتوباتِ نیاز (حصّہ اول)، ص ۱۴۴۔

۵۸۔ نیاز فتح پوری "درسِ محبت"، شبنمستان کا قطرہ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۶۸۔

۵۹۔ نیاز فتح پوری، "قربان گاہِ حسن"، مشمولہ ایضاً، ص ۸۶۔

۶۰۔ ایضاً، ص ۸۹۔۹۰۔

۶۱۔ ایضاً، ص ۶۲۔

۶۲۔ نیاز فتح پوری، شبنمستان کا قطرۂ گوہریں، مشمولہ ایضاً، ص ۱۱۔

۶۳۔ نیاز فتح پوری، "از ماہ تا بہ ماہی"، مشمولہ مذاکراتِ نیاز یا مقالات، ص ۴۔

۶۴۔ نیاز فتح پوری، "مکتوب و مکتوبات"، مشمولہ ایضاً، ص ۱۳۴۔

۶۵۔ نیاز فتح پوری، "یکے از خواتین مصر"، مشمولہ ایضاً، ص ۱۰۱۔

۶۶۔ نیاز فتح پوری، "تاثرات نیاز"، ص ۸۲۔

۶۷۔ نیاز فتح پوری، "از ماہ تا بہ ماہی"، مشمولہ مذاکرات نیاز، ص ۲۵۔

۶۸۔ نیاز فتح پوری، "طائر خاموش پر ایک آنسو"، مشمولہ تاثرات نیاز، ص ۱۳۱۔

۶۹۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے مرزا خلیل احمد بیگ، "اسلوب: تعریف، توضیح اور تشکیل"، مشمولہ زبان، اسلوب اور اسلوبیات، از مرزا خلیل احمد بیگ (علی گڑھ: ادارۂ زبان و اسلوب، ۱۹۸۲ء)۔

۷۰۔ نیاز فتح پوری، "از ماہ تا بہ ماہی"، مشمولہ مذاکرات نیاز، ص ۲۷۔

۷۱۔ نیاز فتح پوری، نگارستان، ص ۱۱۔

۷۲۔ نیاز فتح پوری، عرض نغمہ (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۲ء)، ص ۶۰۔

۷۳۔ نیاز فتح پوری، "درس محبت"، مشمولہ شبستاں کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۴۶۔

۷۴۔ ایضاً، ص ۴۸۔

۷۵۔ نیاز فتح پوری، "کہکشاں کا ایک سانحہ"، مشمولہ نگارستان، ص ۹۵۔

۷۶۔ نیاز فتح پوری، عرض نغمہ، ص ۷۔

۷۷۔ نیاز فتح پوری، "برسات"، مشمولہ نگارستان، ص ۸۷۔

خاطر غزنوی
۳۱۔ گلی نمبر ۱۷، گل بہار نمبر ۲۔ پشاور
پاکستان

مطلعاتی غزل

(اردو غزل میں ایک نیا تجربہ)

میں کہ اک ذرہ تھا مجھ کو آفتاب اس نے کیا
حرفِ بے معنیٰ تھا، بامعنی کتاب اس نے کیا
خاک سے مجھ کو اٹھا کر آسماں اس نے کیا
کس قدر محدود تھا میں بیکراں اس نے کیا
میں کہ تلخابہ تھا مجھ کو انگبیں اس نے کیا
ایک پتھر کو تراشا اور نگیں اس نے کیا
اجڑا جو جو پیڑ تھا سرو و سمن اس نے کیا
اک بیاباں تھا جہاں میرا، چمن اس نے کیا
عشق کو مرہونِ لیلائے وفا اس نے کیا
میرے دل کو دھڑکنوں سے آشنا اس نے کیا
وہ مجسّم روشنی تھا، شب کو روز اس نے کیا
میرے سازِ زندگی کو جاں فروز اس نے کیا
کیا طلسمِ رنگ تھا جس کا اسیر اس نے کیا
میں کہ اک سادہ ورق تھا بے نظر اس نے کیا
ایک دشتِ یاس تھا میں، گلستاں اس نے کیا
میرے ہر خوں گشتہ جذبے کو جواں اس نے کیا
زندگی دی، آشنائے آگہی اس نے کیا
میں کہ تھا بے نام خاطر غزنوی اس نے کیا

…نثار ٹونکی
…الی پلٹن روڈ۔ پل محمد خان
…ٹونک (راجستھان)

قطعات بر وفاتِ
خلیق ٹونکی

اس طرح کی موت ہو گی یہ کبھی سوچا نہ تھا
ہم نے تیرے مرتبے کو آج تک سمجھا نہ تھا
بعد مردن یہ حقیقت ہم پہ روشن ہو گئی
فی الحقیقت خوش نویسی میں کوئی تجھ سا نہ تھا

فن جو تیرا مستند ہے اور کتابت محتشم
زیب دیتا ہے کہ تجھ کو میں کہوں زرّیں رقم
بھول جائے یہ زمانہ، یہ کبھی ممکن نہیں
مر کے بھی زندہ رہے گا تو بھی اور تیرا قلم

کاغذ پہ روشنائی سے گوہر فشاں تھا جو
نازِ وطن تھا، نازشِ ہندوستاں تھا جو
وہ خلق کا خلیق ہمیں داغ دے گیا
ملکِ قلم کا دوستو شاہِ جہاں تھا جو

انساں خوش خصال یقیناً کہیں جسے
فن کار بے مثال یقیناً کہیں جسے
افسوس آج ٹونک سے رخصت ہوا وہی
خطاط باکمال یقیناً کہیں جسے

کاوش بدری
نمبر ۱۳ کانگر تکیہ، نیو اسٹریٹ
آمبور (تمل ناڈو)

"سورۂ سہ گانہ" کی دو غزلیں

- نذرِ محمود ایاز مدیر سوغات -

گماں ہے تیرا مکمل، یقیں ادھورا ہے
مکانِ زہد ہے پختہ، مکیں ادھورا ہے

دیارِ خلد کے جھگڑے تمام ختم ہوئے
ہنوز معرکۂ سرزمیں ادھورا ہے

بگڑا ہوا نہ ہو جب روئے یار منظر سے
فلک کی دوش پہ ماہِ مبیں ادھورا ہے

حجابِ حسنِ رخِ نیم باز کیا کہیے
طویل تر ہے کہیں اور کہیں ادھورا ہے

اگر کسی کی نظر کا اثر نہ ہو دل پر
سرورِ بیعتِ عین الیقیں ادھورا ہے

ہو مہرِ بوسۂ جاں ثبت پائے جاناں پر
وگر نہ سجدہ مقدس نہیں ادھورا ہے

جسے نصیب نہ ہو گنجِ معرفت کاوش
ہو لاکھ عالمِ شرعِ متیں ادھورا ہے

جب خرابات میں بارِ دگر آنے کا نہیں
اتنی پی جاؤ کوئی ہوش میں لانے کا نہیں

غور و فکر سے ہوتی ہی کتابیں زندہ
جبرئیل اور صحیفہ کوئی لانے کا نہیں

تیرا فیضان ہی کشکولِ نظر کو ہے بہت
کاسۂ جاں مرا محتاج زمانے کا نہیں

رو برو ہم نے بھی دیکھا ہے خدا کو لیکن
ذائقہ دید کا اظہار میں آنے کا نہیں

مردمک آئینۂ تمثال نہ ہو تو پتھر
زندگی کیا ہے، اگر رنگ فسانے کا نہیں

سائنسی موضوعات پر
مکتبہ پیام تعلیم کی فخریہ پیشکش
یہ کیسا بخار ہے؟
گندا پانی
آپ
کا
جسم
علی ناصر زیدی
کمپیوٹر
کیا ہے
سائنس کی دنیا
فریدالدین احمد
قیمت 8/-
محمد ابراہیم شاہ
عجائب گھر
قاسم صدیقی

محمد علوی

ایک منظر

پہاڑ کی چوٹی پر
سورج یوں لگ رہا تھا
جیسے کوئی نیتا
اونچے منچ پر بیٹھا
بھاشن دے رہا ہو
نشیب میں
ہزاروں لاکھوں پیڑ
ہرے ہرے پگھڑ باندھے
کاندھے سے کاندھا ملائے
نہایت انہماک سے
بھاشن سن رہے تھے
بات بات پر
سر دھن رہے تھے!!
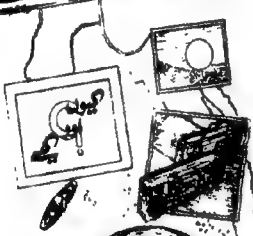
ایک رات جھگی میں

روشنی
برقع پوش عورت کی طرح
کالک جمی لالٹین میں
چھپی ہوئی تھی!
اندھیرا جھگی میں
لتاڑیں مار رہا تھا!
عورت کھاٹ پر
ننگی پڑی ہوئی تھی
مرد میلے کچیلے
کپڑے اتار رہا تھا!
چار بچے
کچے فرش پر سو رہے تھے!
مرد اور عورت
پانچویں بچے کا
بیج بو رہے تھے!!

شاہد نجیب آبادی
پوسٹ بکس ۴۶۵۷۲۳
بحرین

اپنا جو رات دن ہمیں دیتے رہو گے تم
ہم جیسے غم گسار کو ڈھونڈا کرو گے تم

دیتے ہو دھمکیاں ہمیں دن رات قتل کی
ہم نے جو سر جھکا دیا، پھر کیا کرو گے تم

پڑتے ہیں راستے میں مرے دار اور رسن
اے دوست! میرے ساتھ کہاں تک چلو گے تم

اپنا چکے ہو ہم کو تو پھر یہ حجاب کیوں
خود اپنے آپ سے بھی کیا پردا کرو گے تم؟

شاہد، ہزار ضبط و تحمل سے کام لو
اتنا ہی سب دبائیں گے جتنا دبو گے تم

راجیندر بہادر موج
موج مارگ - فتح گڑھ
یوپی

تری تصویر سے اے دوست اکثر بات کی ہم نے
مٹائی اوس کی بوندوں سے دل کی تشنگی ہم نے

ہزاروں زخم کھا کر بھی بنامِ دوستی ہم نے
محبت سے نباہی دشمنوں کی دشمنی ہم نے

سکونِ قلب کی خاطر یہی ترکیب کی ہم نے
بجھائی آنسوؤں کی دھار سے دل کی لگی ہم نے

سکون دیتی ہیں دل کو ٹھوکریں راہِ محبت کی
ہر اک ٹھوکر سے پائی ہے نئی اک زندگی ہم نے

جہاں مہر و وفا کے واسطے ہوتی ہیں تقریریں
وہیں محسوس بھی کی ہے محبت کی کمی ہم نے

اسی امید پر شاید مزاج ان کا بدل جائے
اٹھائے جور و جبر ان کے سبھی ہر بے رخی ہم نے

بجھا کر جانے کتنے اپنے تابندہ چراغوں کو
زمانے کو عطا کی حریت کی روشنی ہم نے

زمانے نے اسی کے کتنے افسانے بنا ڈالے
اگر بھولے سے اپنی داستانِ دل کہی ہم نے

جہاں میں موج رہ کر بے نیازِ شورشِ دنیا
گزاری کشتیٔ عمرِ رواں میں زندگی ہم نے

شجاع خاور
۱- پارک لین
نئی دہلی ۱

بچنے کی خبر بھی نہ کسی یار کو پہنچے
بے کار میں صدمہ کہیں دو چار کو پہنچے

تلوار سے کیا چوٹ قلم کار کو پہنچے
وہ دھار قلم میں ہے کہ تلوار کو پہنچے

خلقت تو ہمیں دیکھنے آئی تھی مگر ہم
اخلاق کے مارے ترے دیدار کو پہنچے

بچنے میں جس آزار سے اک عمر گنوا دی
آخیر میں ہم بھی اسی آزار کو پہنچے

ہم سر پھرے دستار کے بندے ہیں ستم گر
سر لے لے مگر ہاتھ نہ دستار کو پہنچے

نفیس تقی
راج بازار۔ سرونج
ایم۔ پی

عطا جو کی میر نے جوانی، بڑھائی غالب نے شانِ اردو
تمام عالم میں گونج اٹھی ندائے خسرو اذانِ اردو

رموز قرآں کے بیل بوٹے بڑے سلیقے سے سج رہے ہیں
کلامِ اقبال کے تصدق ورق ورق گلستانِ اردو

امیر و داغ و جگر کی غزلیں ہوائیں پھرتی ہیں گنگناتی
فضا میں گھولے ہے نغمگی جو یہی تو ہے وہ زبانِ اردو

وہ جس کے لہجے کی گھن گرج سے لرز اٹھا قصرِ بادشاہی
وہ جوش کا زورِ لفظ و معنی، دہل گئے دشمنانِ اردو

ظفر کا دیار اجڑا لٹا تھا اک دن ہمارا گھر بھی
طلسمِ افرنگ کی بدولت بکھر گیا خاندانِ اردو

انیس و اصغر، فراق و فانی زمیں کے ٹوٹے ہوئے ستارے
انہی کی تابانیوں سے دیکھو دمک اٹھا آسمانِ اردو

ہو یہ دشمن کی سازشوں سے اٹھائیں طوفاں گرائیں بجلی
لہو میں گردش ہے جب تلک ہم سنائیں گے داستانِ اردو

حامدی کاشمیری
شالیمار، سری نگر

تباہی کا وہ منظر بھی نہیں ہے
کہیں اک سوختہ گھر بھی نہیں ہے

خزاں کی گرد آنکھوں پر جمی ہے
کوئی خوابِ گلِ تر بھی نہیں ہے

اک ایسے گھر میں ہوں محبوس جس میں
دریچہ بھی نہیں، در بھی نہیں ہے

یہ رستہ ہے تباہی کا بلاشک
کوئی تو راہِ دیگر بھی نہیں ہے

بجھے گی تشنگی صحرا کی کیونکر
پسِ مژگاں سمندر بھی نہیں ہے

ہوا اِس دشت کی کیا راس آئے
کوئی شاخِ صنوبر بھی نہیں ہے

ظفر رضوی

عجیب مسلک ہے دل کا میرے کہ روزِ یوم حساب دیکھوں
عتابِ رفتہ کی انجمن میں، میں کیسے کیسے عذاب دیکھوں

میں قتل گاہوں سے دور رہ کر بھی قتل گاہوں میں بس رہا ہوں
ہر رنگِ خوں جو سے آب دیکھوں بہ خوشبوئے خوں گلاب دیکھوں

عجیب رستوں کے پیچ و خم تھے کہ منزلوں تک پہنچ نہ پایا
میں عکسِ محرومیِ سفر کو بہ چشمِ محرومِ خواب دیکھوں

جنونِ پیہم ہے موجِ دریا کا ساحلوں پر مچلتے رہنا
میں شدتِ شوق سجدگی میں تمام تر پیچ و تاب دیکھوں

بہت ہی مبہم نقوشِ رخ تھے نہ کاذب تھی نہ صبح صادق
میں اس کے چہرے کو جب بھی دیکھوں تو ایک دُہرا نقاب دیکھوں

ڈاکٹر وہاب تسنیم
بارادری - نیلور

غزل
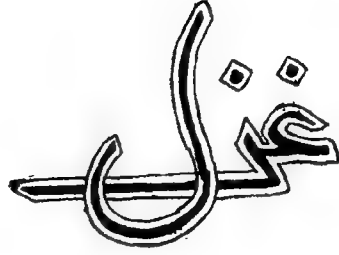
بات بگڑی ہو جہاں بات بنائے رکھو
دل میں چاہت کی خلش اپنے بڑھائے رکھو

شب تاریک میں ملفوف ہو گر شہر تمام
اپنے گھر کو تو چراغوں سے سجائے رکھو

پھر کہیں تازہ نہ ہو جائیں روایاتِ کہن
دلِ ناداں کو ذرا اپنے بچائے رکھو

آج گھر بے در و دیوار کی تصویر سہی
نقش دیرینہ کو سینوں سے لگائے رکھو

کچھ روایات کے تسلسل کا بھی احساس رہے
اپنی نظروں کو خلاؤں پہ جمائے رکھو

ف۔ س۔ اعجاز مدیر ماہنامہ انشاء
۴۔ اے کنائی سیل اسٹریٹ
کلکتہ ۷۳

چارہ گروں کے ساتھ رہوں اور بات ہے
امید اُن سے کچھ نہ رکھوں اور بات ہے

تم سب کے حوصلے تو بڑھاتا رہا ہوں میں
میں خود بھی اپنا ساتھ نہ دوں اور بات ہے

تر کر رہے ہیں لوگ مرے خوں سے اپنا ہونٹ
اِس کا میں انتقام نہ لوں اور بات ہے

انگلی اٹھا کے خوش ہیں جو میرے سماج پر
ان کی رگوں میں کس کا ہے خوں اور بات ہے

پاؤں کے زخم دیکھ کے ڈرنے لگا ہوں میں
زنجیر دے رہی ہے سکوں اور بات ہے

منیر سیفی
چندن پٹی شریف
دربھنگہ، بہار

ابوبکر حیات
شعبۂ اردو۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۲۵

منتشر خوابوں کا انبار کہاں سے لاؤں
وہ تری چشم حیا دار کہاں سے لاؤں
دھوپ چھاؤں کا اثر مجھ پہ بھی ہوتا ہے مگر
میں شجر ہوں لب اظہار کہاں سے لاؤں
ٹوٹ کے چاروں طرف مجھ کو بکھر جانے دو
کانچ ہوں سنگ کا کردار کہاں سے لاؤں
بھید گھر کا مرے سڑکوں پہ نہ پھینکے سیفیؔ
اتنی محتاط میں دیوار کہاں سے لاؤں

ایک دنیا نئی جو بسانے میں ہے
لطف وہ دشت میں گھر بنانے میں ہے
سُن کے آنکھیں تری کیوں برسنے لگیں
بات ایسی کہاں اس فسانے میں ہے
جس سے الفت کا رشتہ ہے گہرا بہت
ہاتھ اس کا مرا گھر جلانے میں ہے
اے حیاتؔ اب بھلا کس کو اپنا کہیں
کوئی ایسا کہاں اس زمانے میں ہے

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی
گل برگ، سورت
(گجرات)

مالک رام - یادیں

مالک رام کی وفات اردو زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والوں اور خصوصاً غالب کے پرستاروں کے لیے صدمۂ عظیم اور انسانیت دوستوں کے لیے صدمۂ عظیم تر ہے۔
مالک رام نہ مالک رام تھے نہ مالک رحمٰن تھے۔ وہ ایک بلند مرتبت، عظیم انسان تھے۔ اولاد آدم کثرت سے پیدا ہوتی ہے مگر ان میں انسان کم ہی ہوتے ہیں۔ آدمی اپنی مجبوریوں، کمزوریوں، خود غرضیوں کے گھیرے میں جکڑا رہتا ہے۔ جو شخص اس حلقہ در حلقہ کے چکر سے باہر آجاتا ہے وہ انسانیت کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔

مالک رام کی عملی زندگی، خیالات اور سماجی رکھ رکھاؤ سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ رسوم وقیود، سبحہ و زنّار سے آزاد شخص تھے۔

مالک رام چلے تو گئے، بس چند یادیں چھوڑ گئے ہیں۔ میرے ان کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ ۱۹۵۰ء کے آس پاس شروع ہوا تھا۔ ان کا خط منشی میاں داد خاں سیاح سے متعلق تھا۔ اس سے قبل رسالہ "اردو" سہ ماہی میرا مضمون سیاح شائع ہو چکا تھا۔ میں نے ان کے منشا کے مطابق معلومات بہم پہنچا دیں۔

اس کے بعد ایک روز شاید اسکندریہ سے مجھے خط ملا کہ آپ کے لیے مصر سے آپ کی کیا پسندیدہ چیز لائی جائے۔ میں نے بھی بے تکلفی سے لکھ بھیجا کہ چلیے کافی میں پینے کا عنبر لائیے گا۔ جب مصر سے لوٹے تو تقریباً دس تولے سیال عنبر تحفتاً مجھے عنایت کیا۔ یہ عنبر آج تک میرے پاس موجود ہے۔ تبرک کی طرح استعمال کرتا رہتا ہوں اس کو چالیس سال ہو گئے ہیں۔ مالک رام کے خلوص و محبّت کی خوشبو دل و دماغ کو معطّر کرتی رہتی ہے۔ اس کی عنبری مہک میں بھی فرق نہیں آیا ہے۔

مالک رام جب کبھی بھی بمبئی تشریف لاتے تو مجھ سے ملاقات کیے بغیر نہیں لوٹتے۔ اکثر غریب خانہ پر بھی چلے آتے تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ صحبت رہتی۔ ایک ملاقات میں جہاتما گوتم بدھ کا ذکر چھڑ گیا، فرمایا قرآن میں لفظ کفل آتا ہے۔ کیا یہ کپل وستو کے لیے نہیں ہو سکتا؟ میں نے عرض کیا: ادیان کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاہم یہ کہوں گا کہ ہر پیغمبر نے انسانیت پھیلانے کی ہر ممکن طریقہ پر کوشش

کی یہی خدمت مہاتما بدھ نے بھی اپنے طریقہ پر انجام دی۔ ایسے وہ پیغمبروں کی صف اوّل میں جگہ پا سکتے ہیں مگر مہاتما بدھ کو اللہ کے وجود سے انکار تھا۔ وہ نروان پر ایمان رکھتے تھے۔

ایک دفعہ حیدرآباد والے عبدالقادر سروری صاحب کے ہمراہ غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔ دو ایک گھنٹے پُر لطف صحبت رہی۔ جب رخصت کا وقت آیا تو میں بھی ساتھ ہو لیا تھا۔ اب زینہ پر کھڑے ہوئے سروری صاحب نے پہلے آپ کا ورد شروع کیا۔ مالک رام نے یہ کہتے ہوئے پیش قدمی کی کہ میں اس تکلّف کا عادی نہیں ہوں۔

مالک رام سے آخری ملاقات ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۲ء کے درمیان ہوئی تھی۔ موصوف گجرال کمیشن کے ایک رکن کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ میں اس زمانہ میں اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں خدمت انجام دے رہا تھا۔ ان کے ہمراہ ایک مشہور و معروف شخص بھی آئے تھے (ان کا نام یاد نہیں آ رہا ہے) یہ بھی گجرال کمیشن کے ایک رکن تھے۔ اتفاق سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈگری کی ارزانی اور ناقدری کا ذکر چھڑ گیا۔ طلبہ اور اساتذہ کی حرکتوں پر سوز خوانی کے بعد فاتحہ پڑھ دیا اور مجلس برخاست ہو گئی۔

برسبیل تذکرہ میں نے شکایت کی کہ مرکزی حکومت کی طرف سے لائبریری کو بڑی بڑی رقمیں گرانٹ دی جاتی ہیں مگر درخواست دینے کے باوجود انسٹی ٹیوٹ کو آج تک کچھ نہ ملا۔ مالک رام نے مشورہ دیا کہ آج آپ گجرال کمیشن سے ملاقات کے وقت یہ مسئلہ پیش کیجیے کیونکہ محکمہ تعلقات کے سکریٹری بھی آئے ہوئے ہیں میں نے اس مسئلہ کو اٹھایا مگر بدعا نکا سرکاری انداز کا جواب مل گیا۔

مالک رام کا آخری خط میرے نام ۱۹۹۰ء کے اواخر میں ملا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ: "آپ کے پاس تمام مواد مہیا ہے۔ اس کو ترتیب دے کر مختصر تاریخ ادب اردو (گجرات میں) تیار کر لیجیے۔ میں نے کام شروع بھی کیا۔ تھوڑا بہت مواد ترتیب بھی دیا لیکن مکمّل ہوتا نظر نہیں آتا۔ عمر کی بیاسویں (۸۲) منزل پر کھڑا ہوں۔ صحت ٹوٹ چکی ہے اس کی تکمیل نئی پود کے نظریات و تصورات پر موقوف ہے۔

انور سدید
۱۷۲ ستلج بلاک۔ اقبال ٹاؤن لاہور

اردو کا خاموش طبع ادیب

پروفیسر احمد علی

پروفیسر احمد علی کی نجی زندگی اور ادبی شخصیت اکثر لوگوں کو معمہ نظر آتی ہے۔ ایک
دفعہ جب وہ اہلِ قلم کانفرنس میں تشریف لائے تو مجھے حیرت ہوئی کہ پروفیسر صاحب نے
اپنی منطقۂ تنہائی سے نکلنا کیسے قبول کیا۔ اپنی سوچ کی لہر کو ہمیشہ موجزن رکھنے والے
ایک ممتاز ادیب نے اپنے قیمتی وقت کا ایسا زیاں کس طرح گوارا کیا۔ مجھے محسوس ہوا
تھا کہ سات آٹھ سو ادیبوں کے ہجوم میں احمد علی بالکل اجنبی تھے، نئی نسل انھیں پہچانتی
نہیں تھی۔ ترقی پسندوں کی نسل نے انھیں اپنی جوانی میں بالکل مسترد کر دیا تھا۔ احمد علی
نے ترقی پسندی کے ان حقیقی تصورات کو جن میں سیاست کا شائبہ نہیں تھا۔ جن سے ادب
کی آزادی کا پرچم بلند ہوتا تھا۔ ابھارنے کی کوشش کی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ادب کی تخلیق
کے لیے مارکسیت کی غلامی ضروری نہیں۔ احمد علی نے اس خیال کو تحریک کے پلیٹ فارم سے
ابھارنے کی کوشش کی تو انھیں شدید مخالفت اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انتہا پسند ادیبوں سجاد ظہیر
علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور ڈاکٹر عبدالعلیم نے ان کا ناطقہ بند کر دیا۔ "انگارے"
کا معاون مصنف اور "شعلے" کا تخلیق کار اس تحریک سے الگ ہو گیا۔ اور پھر ہمیشہ الگ
رہا۔ اصطلاحی ترقی پسندی احمد علی کو قبول نہیں تھی، حقیقی لغوی ترقی پسندی کے ساتھ
وہ تادمِ آخر وابستہ رہے اور ان کے نظریات میں ارتقا کا نامیاتی عمل ہمیشہ جاری رہا چنانچہ
ابتدا الحاد سے کی، ختم ہوئے تو ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن حکیم کا ترجمہ تھا اور
یہی ان کا توشۂ آخرت ہے۔

اہلِ قلم کانفرنس میں احمد علی اگرچہ اجنبی تھے لیکن وہ اس ہجوم میں بھی جہاں
بہت سے چہرے پہچانے نہیں جا سکتے تھے، احمد علی منفرد نظر آتے تھے۔ وہ لابی میں
پورے لباس میں آتے۔ پتلون کی کریز درست۔ کوٹ استری شدہ اور جسم کے ساتھ پوری
طرح بیٹھا ہوا۔ جوتے چمکدار اور پالش شدہ، آنکھوں پر دبیز شیشوں کی عینک۔ بال کھچڑی

ہے۔ لیکن ان کی سب سے نمایاں چیز ان کی بوشائی ؟ تھی۔ لوگ انھیں اونچے درجہ کا بیوروکریٹ سمجھے اور قریب سناتے، میں نے کئی دوستوں کو بتایا کہ اہلِ قلم کے اس جلسے کو ایک اونچی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اس میں شرکت کے لیے غلام عباس، ابوالفضل صدیقی اور احمد علی جیسے ممتاز زمانہ لوگ آئے تھے۔ ان کی آمد کا حال کھلا تو میں نے دیکھا کہ ہوٹل کے دیوان خانے میں ان کے گرد ادیبوں کا اجتماع ہونے لگا اور پھر یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ احمد علی گردن فراز بیوروکریٹ نہیں تھے بلکہ خالصتاً ادیب تھے اور چاہتے تھے کہ نوجوان طبقہ ان سے ادب کے الجھے ہوئے سوالات پوچھے اور وہ انھیں ترقی پسندوں کا ماضی بتائیں، ان پر زمانۂ حال کی نئی تحریکوں کی حقیقت روشن کریں۔

دسمبر ۱۹۳۲ء میں ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر نے باغی مزاج کے الحاد پسندانہ افسانوں کا پہلا مجموعہ "انگارے" شائع کیا تو ڈاکٹر رشید جہاں اور محمود الظفر کے ساتھ احمد علی کے چند افسانے بھی اس کتاب میں شامل تھے۔ اس کتاب کے خلاف پورے ہندستان میں احتجاج شروع ہو گیا تو احمد علی کے قدم ڈگمگائے نہیں تھے۔ وہ اس عقلی زاویے کو روبہ عمل لانا چاہتے تھے کہ انسان پر جمود طاری نہیں ہوتا اور وہ اپنی عقل کی روشنی میں مستقبل کی طرف ارتقا کا سفر جاری رکھتا ہے۔ اس وقت انھیں ترقی پسند تحریک میں اپنے ان خیالات کا پرتو نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں اور ۱۹۳۸ء میں کلکتہ میں اس تحریک کے بڑے اجلاس ہوئے اور آل انڈیا پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی گئی تو وہ اس تحریک کے بانیوں میں پیش پیش تھے۔ ۱۹۳۹ء میں اس تحریک کی نمائندگی کے لیے انگریزی رسالہ "نیو انڈین لٹریچر" جاری کیا گیا تو پروفیسر احمد علی کو اس کے ادارتی بورڈ کا رکن بنایا گیا اس کے پہلے پرچے میں پریم چند کا مشہور افسانہ "کفن" شائع کیا گیا تو اس کا انگریزی ترجمہ بھی احمد علی ہی نے کیا تھا۔

ترقی پسند تحریک کے پیشِ نظر بنیادی طور پر یہ بات تھی کہ ادب کو مارکسی تصورات کے فروغ کے لیے استعمال کیا جائے اور ہندستان میں کمیونسٹ نظام کی راہ ہموار کی جائے اس کے پہلے جلسے کا صدارتی خطبہ پریم چند نے دیا تھا لیکن جب اس تحریک کا منشور سامنے آیا تو اس میں پریم چند کے خطبے کی صدائے بازگشت موجود نہیں تھی، سیاسی مقاصد کے حصول میں سجاد ظہیر کی قیادت میں نوجوانوں کا ایک طبقہ سرگرم عمل ہو چکا تھا۔ اس تحریک نے آزادیِ رائے کو فروغ دینے کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن ادب کی تخلیق کے معاملے میں ادیب کو پابہ زنجیر اور پارٹی کے منشور کا پابند کر دیا گیا۔ اس رویے کے خلاف جو سیاسی نوعیت کا تھا بغاوت کی پہلی آواز احمد علی نے اٹھائی۔ انھوں نے لکھا:

> "تحریک کے سیاسی مربیوں کا کہنا یہ تھا کہ ادب پرولتاریہ ہونا چاہیے کسی ادبی تحریک کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ مصنفوں کے ہاتھ جکڑ دے اور ان کے حقِ رائے اور تحریر کی آزادی کو چھین کر اسے

ایک مخصوص نظریے پر عمل پیرا ہونے پر مجبور کرے۔

اس وقت ترقی پسند تحریک پر سیاسی انتہا پسندوں کا غلبہ تھا۔ چنانچہ احمد علی جیسے معتدل مزاج ادبا اس تحریک سے الگ ہو گئے۔ انھوں نے کمیونسٹ نظریے کی غلامی کو قبول کرنے کے بجائے ایک فطری ادیب کی [illegible] آزادی کو بحال کرا لیا۔ کمیونزم کا نظام ۱۹۹۰ء میں باطل ثابت ہوا اور سوویت یونین منہدم ہو گیا تو مجھے احمد علی کی راست فکری یاد آئی۔ جو انھوں نے ۱۹۳۸ء کے لگ بھگ یہ شکست دیکھ لی تھی۔ لیکن جب ان سے اتنے بڑے واقعے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے صداقت بیانی سے کام لیا اور کہا:۔

> ترقی پسند تحریک سے علاحدگی میری اپنی سوچ کا نتیجہ تھا اور اس کی وجوہات ادبی تھیں، اس وقت کوئی شخص یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ صرف پچاس برس کے دوران سوویت یونین کو اندر کا گھن چاٹ جائے گا۔"

میں سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند تحریک سے احمد علی کی علاحدگی بے حد صحت مند اقدام تھا۔ وہ اگر اس تحریک کے ساتھ رہتے تو زیادہ سے زیادہ احمد ندیم قاسمی جیسے افسانہ نگار بن جاتے اور کرشن چندر کے کشمیری افسانوں کے نئے بلیو پرنٹ تیار کر کے طمانیت محسوس کرتے لیکن وہ حقیقی ترقی پسند سامنے نہ آتا جس نے "دلی کی شام" اور "چہرے اور سفیر" جیسے حقیقت پسندانہ ناول لکھے تھے وہ "قید خانہ" "ہماری گلی" اور "موت سے پہلے" جیسے افسانے پیش نہ کر سکتے۔ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے اور انسان کو فلاح کی اصلی راہ دکھانے کا کبھی خیال تک نہ آتا۔ اب جب کہ متعدد ترقی پسند ادبا وقت کی گرد میں گم ہو چکے ہیں اور جو زندہ ہیں وہ اپنی ادبی موت مر چکے ہیں۔ تو احمد علی ایک مینارہ نور کی طرح روشن نظر آتے ہیں۔ ان کے فن پر مشرق اور مغرب میں مقالات لکھے جا رہے ہیں۔ ان کی سماجی اور تہذیبی آگہی کی داد دی جا رہی ہے۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ احمد علی نے اپنی ادبی زندگی میں ترقی پسندوں کی مخالفت کا ہی سامنا نہیں کیا بلکہ انھیں ہندستان میں انگریزی ناول تصنیف کرنے والوں کی عیب جوئی سے بھی گزرنا پڑا۔ خوشونت سنگھ کو گلہ یہ تھا کہ احمد علی ۱۹۴۷ء میں ہندستان چھوڑ کر پاکستان کیوں چلے گئے تھے۔ اس غصے میں انھوں نے احمد علی کو "بے وفا" کہا کیوں کہ وہ اپنی محبوبہ "دہلی" سے روگردانی اختیار کر گئے تھے۔ السطیر بنون نے لکھا ہے کہ بھارت سے علاحدگی کے بعد افسانے کی دیوی ان سے روٹھ گئی تھی۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ احمد علی اپنی زندگی کے کسی لمحے میں بھی ادب سے غافل نہیں رہے۔ انھوں نے ۱۹۶۴ء میں انگریزی ناول "رات کا سمندر" لکھا۔ چند برس بعد ان کا ناول "چہرے اور سفیر" شائع ہوا۔ اس دوران ان کی اپنی منتخب کہانیوں کا انگریزی ترجمہ منظر عام پر آیا۔ پاکستانی کہانیوں کا ایک

مجموعہ انگریزی میں اکادمی ادبیات نے مسیح الدین صدیقی کے زمانے میں پیش کیا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ احمد علی شاعر بھی تھے۔ ان کی انگریزی نظموں کا مجموعہ "سونا رنگے پہاڑ" چھپ چکا ہے جسے بعض لوگوں نے انگریزی میں "غزل مزاج" شاعری کہا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ جب ترقی پسند اور ہندستانی ادبا احمد علی کے خلاف لکھ رہے تھے تو مغرب میں کارلو کپولا اور برکس کنگ جیسے ادبا ان کے کام کی تعریف کر رہے تھے۔ پاکستان میں صفدر میر، طارق رحمان، عالمگیر ہاشمی اور کامل القادری ان کی تحسین میں رطب اللسان تھے۔ آج ان کی وفات مجھے ادبی دنیا کا ایک بڑا حادثہ محسوس ہوتا ہے۔

مانگے کا اُجالا

خامہ بگوش

قلم برداشت ادب

ڈاکٹر سلیم اختر ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی کتابیں عنایت فرماتے رہتے ہیں، بلکہ گاہ گاہ دوسروں کی تصانیف بھیج کر بھی ہماری ادبی وعلمی تربیت کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔

ہمارے علم کا ۹۵ فیصد حصّہ ڈاکٹر صاحب ہی کی عطا کردہ کتابوں کا مرہونِ منّت ہے، یہی وجہ ہے کہ باقی ۵ فیصد علم بھی ہمارے کام نہیں آیا۔

افسوس کہ ڈاکٹر صاحب اپنی تصانیف خود نہیں پڑھتے، ورنہ وہ آج جس بلند مقام پر جلوہ گر ہیں، اس سے کہیں زیادہ بلند مقام پر فائز نظر آتے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی تصنیف کردہ کتابیں شاید اسی وجہ سے نہیں پڑھتے جس وجہ سے ایک ہوٹل کا مالک اپنے ہوٹل کا کھانا نہیں کھاتا تھا، ہمیشہ گھر سے منگواتا تھا۔ جب اس سے اس کا سبب پوچھا گیا تو اس نے بتایا "اگر اپنے ہوٹل کا کھانا کھا کر مجھے کچھ ہوگیا تو گاہکوں کی خدمت کون کرے گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے ہمارے ادبی ذوق کی تربیت کے لیے ایک دلچسپ کتاب عنایت کی ہے۔ اس کا نام ہے "دلچسپ ملاقاتیں" اور اس کے مرتب ہیں تنویر ظہور۔ اس میں چار درجن کے قریب ادیبوں کے انٹرویو ہیں۔ ان ادیبوں میں نصف تو وہ ہیں جن کے ادیب ہونے کی اطلاع اسی کتاب سے ملتی ہے اور یہ بیچارے بات کرنے سے بھی معذور نظر آتے ہیں۔ باقی نصف ہمارے عہد کے ممتاز اہلِ قلم ہیں جو بات کرنے اور بات بنانے ہی میں نہیں، باتیں بگھارنے کے فن میں بھی طاق ہیں۔

اس مجموعے کا سب سے اچھا انٹرویو ڈاکٹر سلیم اختر کا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ زیرِ نظر کتاب انھیں کی عنایت سے ہمیں ملی ہے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کا مناسب ترین طریقہ یہی ہے کہ ان کے انٹرویو کو سب سے اچھا قرار دیا جائے۔ انٹرویو

کے اچھا ہونے کی دوسری وجہ بھی کوئی ضرور ہوگی جو اس وقت یاد نہیں آرہی۔ اگر یاد آگئی تو آگے چل کر عرض کردیں گے۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب کو بذریعہ خط مطلع کردیں گے۔

واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب سے ہمیں خط و کتابت کا شرف حاصل ہے۔ ہمارے نام ان کے اتنے خط ہیں کہ اگر انھیں مرتب کرکے کتابی صورت میں چھپوا دیا جائے تو ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کی تعداد اکاون ہوجائے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کتاب پچاس کتابوں سے زیادہ مقبول ہوگی کیونکہ یہ ایسی تحریروں پر مشتمل ہوگی جو قلم برداشتہ لکھی گئی ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ پطرس سے کسی نے پوچھا، اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نے ہزارہا صفحات لکھے ہیں۔ لیکن مقبولیت صرف "پطرس کے مضامین" کو حاصل ہوئی جب کہ یہ مختصر سی کتاب آپ کی جملہ تحریروں کے بیسویں حصّے کے برابر بھی نہیں ہے۔ پطرس نے جواب دیا، میں نے اپنی تمام تحریروں پر بڑی محنت کی ہے مگر "پطرس کے مضامین" میں وہ تحریریں شامل ہیں جو میں نے بغیر محنت کے قلم برداشتہ لکھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے انٹرویو میں اپنے بارے میں بہت سی کام کی باتیں بتائی ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے کبھی شاعری بھی کی ہے۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ ہاں جوانی کے دنوں میں ان سے یہ غلطی ہوئی تھی لیکن "جلد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ میری طبیعت کو شاعری سے مناسبت نہیں ہے، اس لیے شاعری ترک کردی۔ کاش شعرا کی اکثریت کو میری مانند وقت پر احساس ہوجاتا تو آج نقادوں کی الجھنوں میں خاصی کمی ہوجاتی۔"

ڈاکٹر صاحب نے بجا فرمایا کہ ان کے شاعری ترک کردینے سے نقادوں کی الجھنوں میں کمی ہوگئی لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ اس فیصلے کے نتیجے میں نقادوں کی تعداد میں ایک کا اضافہ ہوگیا۔ یہاں بھی ایک واقعہ بیان کیے بغیر بات واضح نہیں ہوسکتی۔ مشہور ناول نگار ایم اسلم ایک زمانے میں شاعری سے شوق فرماتے تھے۔ ایک دن وہ علّامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے، اپنا کلام سنایا اور شاعری کے سلسلے میں مشورے کے طالب ہوئے۔ علّامہ نے فرمایا کہ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ شاعری ترک کردیں کیونکہ یہ آپ کے بس کا روگ نہیں۔ اس کے بعد ایم اسلم نے ناول لکھنے شروع کردیے۔ ایک روز انھوں نے دوستوں کی محفل میں بڑے فخر سے کہا "میں نے علّامہ اقبال کے مشورے پر شاعری ترک کی تھی" اس پر ایک دوست نے ان لفظوں میں داد دی "کاش نثر نگاری کے سلسلے میں بھی آپ اُن سے مشورہ کرلیتے۔"

اس واقعے کے بیان کرنے کے بعد یہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو شاعری ترک کرنے کا خیال وقت پر آیا لیکن کسی قسم کا کوئی دوسرا خیال، اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی نہیں آیا۔ یہ اچھا ہی ہوا، ورنہ اردو ادب پچاس بہترین کتابوں سے محروم رہ جاتا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے بارے میں یہ انکشاف بھی کیا ہے "میں بچپن میں نہایت

شرارتی لڑکا تھا۔ جب کالج پہنچا تو ایک لاابالی نوجوان بن چکا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس زمانے میں مجھے پڑھائی سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسکول میں میری شرارتیں رنگ لاتی رہیں اور وقتاً فوقتاً ان شرارتوں کی بنا پر سزا پاتا رہتا۔"

ڈاکٹر صاحب کو بچپن میں پڑھائی سے دلچسپی نہیں تھی اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بچپن ہی سے ان میں نقّاد بننے کی صلاحیت موجود تھی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے۔

شرارتی تو خیر ڈاکٹر صاحب اب بھی ہیں جس کا اندازہ ان کے انٹرویو سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ دبستان سرگودھا کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں وہ فرماتے ہیں " سرگودھا اسکول کی خدمات یقیناً ہیں لیکن وہ ادب کے لیے نہیں بلکہ اس اسکول کے طالب علموں کے لیے "۔ واضح رہے کہ ایک زمانے میں ڈاکٹر صاحب خود سرگودھا اسکول سے منسلک تھے۔ اب وہ فارغ التحصیل ہو چکے ہیں، تاہم انھیں وہ خدمات یاد ہیں جو اس اسکول نے اپنے طالب علموں کے لیے انجام دیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے انٹرویو کے بعد دوسرا اہم انٹرویو ممتاز شاعر قتیل شفائی کا ہے۔ انھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ ان کے علمی زندگی کا آغاز تجارت سے ہوا۔ پہلے انھوں نے کھیلوں کے سامان کی دکان کھولی لیکن مال نایاب ہونے کے باوجود گاہک بے خبر رہے۔ پھر کپڑے کی دکان میں طالع آزمائی کی لیکن مندی کا رجحان ایسا تھا کہ کسی عاشق نے بھی گریبان کے لیے چار گرہ کپڑا خریدنے کی زحمت نہ کی۔ مجبوراً اس دکان کو بھی بڑھانا پڑا۔ اس کے بعد ایک عزیز کو منافع کی توقع پر کچھ رقم دی۔ منافع تو کیا ملتا، اصل رقم بھی ڈوب گئی۔

ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے شاعری شروع کر دی۔ خدا نے اس کاروبار میں اتنی ترقی دی کہ آج قتیل صاحب کا شمار بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔

اگر خدا نخواستہ کپڑے کی دکان چل نکلتی تو آج قتیل شفائی بہت بڑے تاجر ہوتے لیکن اردو ادب ایک طرح دار شاعر سے محروم رہ جاتا۔

مرتب کتاب نے جناب قتیل شفائی سے بعض گستاخانہ قسم کے سوال بھی کیے ہیں جو کم از کم ہمیں پسند نہیں آئے۔ قتیل شفائی صاحب کی ہمت قابل داد ہے کہ انھوں نے بڑے تحمل سے یہ سوالات سنے اور نہایت تحمل سے ان کے جوابات دیے۔

ایک سوال یہ تھا کہ آپ تو ترقی پسند ہیں، پھر بھی آپ نے ضیاء الحق کو اپنی کتابیں کیوں بھیجیں۔ قتیل صاحب کا جواب یہ تھا "مجھ پر لعنت اگر میں نے ضیاء الحق کو کتاب بھیجی ہو۔ ایک مرتبہ ضیاء الحق نے غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اہل قلم کانفرنس میں ضیاء الحق نے مجھے دیکھ کر کہا، قتیل صاحب آپ کی کتابیں مجھے مل گئی ہیں۔ میں نے ان کی رسید آپ کو بھیج دی ہے۔ اب میں کیا کہتا۔ سب میں جھٹلا نہیں سکتا تھا۔"

ضیاء الحق کی زندگی میں نہ سہی، اب سہی، قتیل صاحب نے بہر حال مرحوم کو جھٹلا کر اپنا فرض ادا کر دیا ہے، لیکن یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ جو اہل قلم کانفرنس ضیاء الحق کے ایما پر منعقد ہوئی تھی، اس میں قتیل شفائی صاحب جیسے مستند ترقی پسند نے شرکت کیوں کی۔ یہ مسئلہ جب ہم نے استاد لاغر مرادآبادی کے سامنے رکھا تو انھوں نے فرمایا "غیر ترقی پسندوں کی اہل قلم کانفرنس کے مقاصد سے قتیل صاحب کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تو وہاں اپنی کتابوں کی رسید لینے گئے تھے۔"

ایک سوال یہ بھی کیا گیا کہ گزشتہ دورِ حکومت میں کیا آپ کو بھی پلاٹ ملا تھا؟ — قتیل صاحب نے فرمایا "سب کو ملے ہیں جی۔ میں نے ایک لیا جو میرا حق تھا۔ اوروں نے تو دو دو تین تین حاصل کیے اور کئی دوسری ناجائز مراعات بھی۔"

لاہور کے ادیب خوش قسمت ہیں کہ ہر حکومت انھیں پلاٹ دیتی ہے۔ کراچی والوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ زمین کا پلاٹ تو کیا، حکومت نے کراچی کے کسی ادیب کو ناول یا افسانے کا پلاٹ بھی نہیں دیا۔

اردو ادب کے دو مشہور دبستان جن کے سربراہ جناب احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا ہیں، اس کتاب کا خاص الخاص موضوع ہیں۔ کتاب کے مرتب نے تقریباً ہر ادیب سے ان دبستانوں کے بارے میں سوال کیا ہے۔ بعض نے بہت دلچسپ جواب دیے ہیں لیکن انھیں ہم نقل کرنے کی جسارت نہیں کر سکتے کیونکہ ان میں کسی ایک دبستان کی طرف جھکاؤ پایا جاتا ہے۔ ہماری طرح دونوں کی طرف جھکاؤ نہیں ہے۔

اس کتاب سے پہلی مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ جھگڑے کا آغاز کس طرح ہوا۔ قاسمی صاحب اور آغا صاحب نے اپنے اپنے بیانات میں ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد وجوہ بیان کی ہیں۔ ہمارا یہ منصب نہیں ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ کون صحیح ہے اور کون غلط کیونکہ ہمارے لیے دونوں ہی قابل احترام ہیں، اور احترام کا تقاضا ہے کہ دونوں کو صحیح سمجھا جائے۔ لہٰذا ہم بغیر کسی تبصرے کے ان بیانات کو ذیل میں درج کرتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی "ڈاکٹر وزیر آغا تو میرے دوست تھے بلکہ جب میں سرگودھا جاتا تھا تو انھیں کے یہاں ٹھہرتا تھا۔ میں نے اپنا پرچہ "فنون" نکالا جس میں بھارت

کے ایک بہت اچھے لکھاری عمیق حنفی نے مضمون لکھا۔ اس مضمون پر ڈاکٹر وزیر آغا نے اعتراض کیا۔ اس کے بعد عمیق حنفی نے اس کا جواب دیا کہ اس میں آپ کے اشارے اور حوالے سب غلط ہیں اور آپ کا انداز اور معیار بھی غلط ہے اور آپ کو دھرتی پوجا کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ لہٰذا اس قسم کی تحریریں آپ نہ لکھا کریں۔ اس کے بعد میرے دوست اور مشہور نقاد فتح محمد ملک نے ایک مضمون جدید اردو شاعری پر لکھا۔ اس میں انھوں نے راشد، میرا جی، فیض، مجید امجد اور دوسرے جو بیشتر شعراء تھے، ان کا حوالہ دیا۔ .... وزیر آغا کے بارے میں انھوں نے یہ لکھ دیا کہ ان کو دھرتی پوجا کے فلسفے سے اس لیے محبت ہے کہ وہ خود دھرتی کے ایک بڑے حصے پر قابض ہیں۔ یعنی بڑے زمیندار ہیں۔ یہ جملہ کوئی ایسا نہیں تھا کہ برہم ہوا جاتا بلکہ اسے اچھے موڈ میں لینا چاہیے تھا۔ اس بات پر وہ سخت غصے میں آگئے اور انھوں نے ..... ایسے ایسے مجھ پر حملے کیے کہ میں انھیں دہراتا ہوں تو شرم آتی ہے۔"

ڈاکٹر وزیر آغا، اوراق اور مدیر اوراق سے احمد ندیم قاسمی کی نفرت کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۹۶۶ء کے "اوراق" میں فتح محمد ملک کا مضمون "فیض کی دو آوازیں" چھپا۔ مدیر اوراق نے اس مضمون سے وہ حصے حذف کر دیے جن میں ملک صاحب نے فیض اور ندیم کا موازنہ کرکے ندیم کو فیض سے بہتر شاعر ثابت کرنے کی مضحکہ خیز کوشش کی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ فرمائشی مضمون تھا۔ بس اس بات پر ملک صاحب اور ندیم صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے۔ چنانچہ پچھلے ۲۶ برسوں میں وقتاً فوقتاً "فنون" میں میرے خلاف لکھا جاتا رہا ہے جب کہ "اوراق" اس ضمن میں خاموش رہا ہے۔"

ہم اپنے اس عہد پر قائم ہیں کہ ان اقتباسات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جائے گا تاہم فتح محمد ملک کو تہ دل سے مبارک باد دینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ عہدِ حاضر میں اردو ادب کی سب سے بڑی معرکہ آرائی انھیں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

عبدالقوی دسنوی
پرنس کالونی، نعمت پورہ، عیدگاہ ہلز
بھوپال ۔ ۱

گر تو بُرا نہ مانے

اپریل کے کتاب نما کا مہمان اداریہ پڑھنا شروع کیا تو ابتدا میں ایسا محسوس ہوا کہ کسی انسان دوست، حق پرست، اور انصاف کے علمبردار کی پُرجوش تحریر پڑھ رہا ہوں۔ جس کے نتیجے میں وہ مایوسی کی گھٹا جو ہمیشہ میرے دل پر چھائی رہتی ہے چھٹنے لگی اور ایک احساس جاگنے اور دل کو یہ یقین دلانے لگا کہ یہ مہمان صحافی صرف صحافی نہیں بلکہ بُرائی اور خرابی کے خلاف نبرد آزما ہونے والا مجاہد بھی ہے جو زہر ہلاہل کو قند نہیں کہے گا چنانچہ عقیدت اور احترام سے سر جھک گیا۔ لیکن اداریہ ختم ہوا تو معلوم ہوا کہ زہر ہلاہل اب بھی با وقار رہا اور قند کے حصے میں شرمساری ہی آئی پھر اچانک اقبال کا یہ مصرع ذرا تبدیلی کے ساتھ لب پر رقص کرنے لگا:

سچ کہہ دوں اے صحافی گر تو بُرا نہ مانے

دل نے آواز لگائی اے مرد مجاہد، طبیب صرف صورت دیکھ کر علاج نہیں کرتا۔ پہلے اندر کا حال جاننے کی بھرپور کوشش کرتا ہے اور پچھلے تجربات سے رہنمائی حاصل کرتا ہے تب مرض کی تشخیص کرتا ہے۔ اندر اور باہر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ظاہر میں راہبر اور راہزن دونوں ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ وطن دوست اور وطن دشمن میں بھی فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دونوں کو سمجھنے کے لیے دلوں کو ٹٹولنا پڑتا ہے، دماغ کو پڑھنا پڑتا ہے تب فیصلہ میں وزن آتا ہے اور اعتماد بھی با وزن رہتا ہے۔

ہندستان جسے انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا بیمار ذہن سیاست دانوں کی وجہ سے کچھ عجیب سا ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ بات اب بہت سے محب وطن محسوس کرنے لگے ہیں اور اسے بیمار سمجھنے لگے ہیں — بیماری تعصب اور خود غرضی کی ہے، بیماری کج فہمی اور ہٹ دھرمی کی ہے۔ بیماری حرص و ہوس کی ہے، بیماری ناانصافی اور حق تلفی کی ہے۔ وجہ امیر بننے کی شدید خواہش ہے با اختیار رہنے کا شدید جذبہ ہے۔ اقتدار کی کرسی پر ہمیشہ قابض رہنے کی آرزو ہے

[illegible] سیاست ان کے ایسے ہی خواہشات اور جذبات کی شدت کی وجہ سے رقص کیا ہے۔

اپنی کامیابی کے لیے اکثر سیاست نے تعصب کی مدد سے فتوحات حاصل کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ تعصب کو کبھی مذہب کا لبادہ پہنا کر لایا جاتا ہے۔ کبھی مختلف زبانوں کی ہمنوائی کرتا دکھایا جاتا ہے۔ کبھی وہ معاشیت کی دیواریں کھڑی کرتا نظر آتا ہے۔ اور کبھی وطن کو تقسیم کرتا محسوس ہوتا ہے کبھی اکثریت اور اقلیت کی کشمکش پیدا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ کبھی ذات پات کا زہر گھولتا ہے۔ چنانچہ اس بیمار سیاست سے متاثر ہو کر ہندوستان کے رہنے والے کیا کیا نہیں کر گزرتے ہیں اور کن کن خانوں میں نہیں بٹ جاتے ہیں اور کیا کیا نہیں بن جاتے ہیں ــ لیکن سچے ہندوستانی نہیں بن پاتے ہیں۔

یہی سیاست ہے جو تعصب کے ہتھیار سے ہندوستان کو تقسیم کر چکی ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے مخلص جنگ آزادی کے مجاہد محب وطن کو انڈیا ونس فریڈم میں بلکتا چھوڑ چکی ہے۔

یہ سیاست ہی ہے جس نے تعصب سے متاثر ہو کر ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی ترجمان وطن دوست زبان کو وطن کا نغمہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

الاپتے ہوئے بے زبان کر دیتی ہے۔ یہ وہی زبان ہے جس کی گھن گرج سے ہندوستان سے باہر سات سمندر پار انگریز حکمرانوں کے دل دہل گئے تھے اور ان کی حکومت میں لرزہ پیدا ہو گیا تھا۔ آج آزاد ہندوستان میں ایسی کمزوری پیدا کر دی گئی ہے کہ وہ اب نہ اپنے دکھ درد کی کہانی سنا سکتی ہے اور نہ کوئی سننا پسند کرتا ہے۔ اس کے ساتھ انصاف کی بات تو دور کی ہے۔

ایک زندہ زبان پر یہ ستم متعصب سیاست اور اقتدار کی وجہ سے ہو رہا ہے جس نے کروڑوں ہندوستانیوں کو اس کی مادری زبان سے محروم کر رکھا ہے۔ نتیجے میں ان کی مادری زبان اردو اب اپنے مرنے کی گھڑیاں گن رہی ہے۔ یعنی مرحوم کہے جانے کی منتظر ہے۔

یہ سیاست ہے جس نے تعصب کے سہارے ہندوستانیوں کو اقلیت اور اکثریت میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں اقلیت اور اکثریت کی کشمکش پیدا ہو گئی ہے۔

یہ سیاست ہی کی ہی خود غرضانہ، مستبدانہ اور وحشیانہ چال ہے جس نے سیکڑوں سال پرانی تاریخی مقدس بابری مسجد کو حکومت کی نگرانی اور اکمل انتظامات کے اژدہام میں شہید ہی نہیں کیا اس کے وجود کو نیست و نابود کر دیا ہے اور [illegible]

اگست ۱۹۹۴ء

کہیں
میں ایک نئی عصمت کی داغ بیل ڈال دی ہے اور حکومت تماشائی بنی رہی۔ تماشاؤں کی
محافظ سیاست کرتے رہے ہیں کرتے رہیں گے
عدالت فیصلہ سنانے کا سوچتی رہی ہے سوچتی رہے گی
سیکولر ہندوستان شرمندہ ہوتا رہا شاید آئندہ بھی ہوتا رہے
انصاف پسند ہندوستانیوں کے سر شرم سے جھک گئے ہیں شاید آئندہ بھی جھکتے رہیں گے
اور سیاست بزدلی کا مظاہرہ کرتی رہی ہے شاید آئندہ بھی کرتی رہے گی۔

... اور یہ بھی ہوا کہ ہندوستان کے مختلف، محترم شہروں میں خون کی ہولیاں کھیلی گئیں، گھر جلتے رہے، بچھڑتے رہے، تڑپتے رہے۔ شہر دار شعلہ بار۔ نہ پائے ماندن، نہ جائے رفتن۔ بے بسی، بے کسی، دن خطرناک، رات زہرناک اور محافظوں کے دستے بندوقوں کے نیزے چمکاتے ہوئے ظلم و ستم کی حفاظت کرتے رہے۔

اور کوئی کرشن چندر کی آواز فضا میں گونجتی رہی لرزتی رہی اور کہتی رہی۔
"ہم وحشی ہیں"
اور کوئی سعادت حسن منٹو سیاہ حاشیے کھینچتا ہوا چیخ کر کہتا رہا۔
"مسٹیک (Mistake) ہو گئی"
اور کوئی ساحر لدھیانوی کا یہ شعر آزاد ہندوستان میں ہواؤں سے ٹکراتا ہوا فضا میں ارتعاش پیدا کرتا رہا:

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا
کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں

تو کیا ہوا؟ کیا تعصب کی تیغ و نفرت کے نقارے کی گونج میں کمی آئی؟
کیا ہم نے ساحر کی طرح سوچ کر یہ فیصلہ کیا؟

چلو کہ چل کے سیاسی مقامروں سے کہیں
کہ ہم کو جنگ و جدل کے چلن سے نفرت ہے
جسے لہو کے سوا کوئی رنگ راس نہ آئے
ہمیں حیات کے اس پیرہن سے نفرت ہے

یہ اسی مکروہ سیاست کا جادو ہے کہ ہمارے سیکولر رہنما کشمیر کے معاملے کو ہندوستانی مسلمانوں سے جوڑنے لگے ہیں اور خطرناک آنے والے "کل سے" ہمیں خوفزدہ کرنے میں ہچکچاتے نہیں ہیں۔ گویا ہندوستان کا مسلمان ہندوستانی نہیں ہے اس کی خوشی اور غم ہندوستان کے دشمنوں کے ہاتھ میں ہے اور سارا ہندوستان ان رہنماؤں کے "غیر سیکولر بیانات کو خاموشی سے سنتا رہا ہے کوئی آواز نہیں دیتا کہ — یہ

کیا کہا جا رہا ہے؟ کس کو کہا جا رہا ہے؟ کیوں کہا جا رہا ہے؟ کب تک کہا جاتا رہے گا؟

کبھی ہم نے سنجیدگی سے غور کیا کہ یہ باتیں ملک کے لیے کس قدر زہر ہلاہل ہیں؟ کبھی ہم نے تعصب کو ٹوکا؟ کبھی ہم نے ظالم کو ظلم سے روکا؟ کبھی ہم نے بے تعصبی کو سراہا؟ کہ قومی یک جہتی کو قوت ملے۔ کبھی ہم نے ذات پات کی سرحدوں کو پھاندنے کی کوشش کی کہ انسانوں کو برابری کا درجہ ملے۔ کبھی ہم نے صوبائیت سے اٹھ کر ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کی کہ سب صوبے مل کر ایک ہندستان بناتے ہیں۔ کبھی ہم نے ملک کی ساری زبانوں کو ہندستان کی آواز کہہ کر پکارا کہ سب نے ہندستان کی خدمت کی ہے اور کر رہی ہیں اس لیے سب برابری کے درجہ کی مستحق ہیں۔ کبھی ہم نے ہندستان کے سارے بسنے والوں کو صرف "ہندستانی" سمجھنے کی کوشش کی ہے؟ کیا یہی "سچ" ہے۔ ان باتوں کو ہمیں ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے اور دوسروں پر الزام ڈالنے سے پہلے اپنے دلوں کو ٹٹولنا چاہیے اور تعصب سے رشتہ توڑنا چاہیے کہ یہی تعصب ہمارے محبوب وطن کا دشمن ہے۔ اسی نے ماضی میں تین عظیم ہندستانیوں

مہاتما گاندھی، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی

کو بے وقت ہم سے جدا کر دیا اور نہ جانے کتنے ہندستانی بچوں کو یتیم، کتنی ہندستانی عورتوں کو بیوہ، کتنے ہندستانی بوڑھوں کو بے سہارا کر دیا ہے۔ کتنے ہی گھر جلا دیے، کتنے ہی خاندان اجاڑ دیے اور کتنوں کے مستقبل کو تاریک کر دیا۔ اس لیے اب وقت آگیا ہے کہ ہم للکار کر کہیں۔

تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

اور ہم وطنوں کو آواز دیں۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ ہمیں اشخاص یا سیاسی جماعتوں کا وفادار ہونے کے بجائے ملک کا وفادار ہونا چاہیے اس لیے ہمیں خود غرضانہ اور مریضانہ سیاست کے بجائے ملک کی صحیح خدمت کی طرف توجہ کرنی چاہیے اپنی سربلندی کے بجائے ملک کی سربلندی کا خیال رکھنا ہی ہوش مندی ہے۔ تعصب کے بجائے اتحاد و اتفاق پروان چڑھانا چاہیے۔ نفرت کے بجائے، محبت سے ایک دوسرے کے ساتھ جینے کا سلیقہ سیکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ محبت ہی طاقت ہے، محبت ہی عزت ہے،

محبت ہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ آئیے اقبال کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملا کر بلند آواز میں ہم سب ان کی نظم نیا شوالہ کا یہ حصہ پڑھیں:

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو ہم ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی — آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کی تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامان آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی، شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

یہی سچ ہے، اسی میں ملک کی بھلائی ہے اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے اور عظمت بھی۔

بچوں کے لیے مذہبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
حضرت یحییٰ علیہ السلام	منور رہ نوری خلیق	۳/-
حضرت آدم علیہ السلام	منور رہ نوری خلیق	۴/-
رسالہ دینیات اول	محمد نعیم الدین زبیری	۳/
رسالہ دینیات دوم	"	۴/
رسالہ دینیات سوم	"	۵/
رسالہ دینیات چہارم	"	۵/
رسالہ دینیات پنجم	"	۶/
بزرگانِ دین	محمود علی خان جامعی	۳/
امت کی مائیں	حسین حسنی	۲/۵۰
اچھی باتیں	سعد الدین انصاری	۴/۵۰
خوب سیرت اول	حکیم محمد سعید	۶/
خوب سیرت دوم	"	۲/۵۰
سلطان ٹیپو	اسلم فرخی	۱/
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں	فضل قدیر ندوی	۴/۵۰
رحمان کا جہاں	رفیع الزماں زبیری	۷/
کمسن صحابی	"	۵/
اسلام کے جاں نثار	"	۴/
سیرت پاک مختصر مختصر	احمد خان خلیل	۳/
نور کے پھول	حکیم محمد سعید	۹/
سب سے بڑے انسان رسول اللہؐ	"	۲/۵۰
حضرت حمزہؓ	احتشام الدین حیدرآبادی	۳/
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	"	۳/
حضرت ابوہریرہؓ	"	۲/
حضرت محبوب الٰہیؒ	مشیر الحق	۳/
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	"	۳/
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	"	۳/
حضرت معین الدین چشتیؒ	"	۳/
حضرت ابوبکر صدیقؓ	"	۶/
حضرت طلحہؓ	"	۳/
حضرت سلمان فارسیؓ	"	۲/۵۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	"	۳/
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ	"	۳/

کتاب	مصنف	قیمت
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	مشیر الحق	۳/
نیک بیٹیاں	"	۲/۵۰
اسلام کیسے پھیلا حصہ اول	عبدالواحد سندھی	۷/۵۰
" حصہ دوم	"	۶/
قرآن پاک کیا ہے؟	"	۲/
اسلام کیسے شروع ہوا؟	"	۷/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار اول دوم	" فی حصہ	۶/-
اسلام کے مشہور امیر البحر	"	۹/
رسول پاکؐ	"	۶/
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۵/۵۰
سرکار کا دربار	"	۶/۵۰
چار یار	"	۷/۵۰
آں حضرتؐ (اردو)	"	۳/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	"	۱/۴۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد حامدی	۲/۵۰
اللہ کے خلیل	"	۳/۵۰
رسول پاکؐ کے اخلاق	"	۲/
اللہ کے صفی	"	۲/۵۰
ہمارا دین حصہ اول	سید شہاب الدین دسنوی	۸/۵۰
" دوم	"	۷/۵۰
" سوم	"	۸/۵۰
منہاج القرآن	خلیفہ سید ظاہر سیف الدین	۲/۵۰
ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۲/۵۰
عقائد اسلام	"	۲/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۹/
نبیوں کے قصے	"	۶/۵۰
پیارے رسولؐ	"	۶/
پیارے رسولؐ	سلطانہ آصف فیضی	۲/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	ادارہ	۳/
مسلمان بیبیاں	امداد الحق قدوسی	۶/
ہمارے نبیؐ	سید ثعلب علی رضوی	۳/۵۰
سرکار دو عالمؐ	محمد حسین حسان	۹/
قاعدہ یسرنا القرآن	(مجلد)	۶/۵۰

مجتبیٰ حسین
۲۰۰۔ انکور اپارٹمنٹس
پٹ پڑگنج۔ نئی دہلی

دوردرشن پر اب سچے اشتہارات آئیں گے

حکومت نے اعلان کیا ہے کہ دوردرشن پر جو اشتہارات دکھائے جاتے ہیں ان کے بارے میں حکومت اپنی پالیسی پر نظر ثانی کر رہی ہے کیونکہ حکومت کے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ جن اشیا کے فروغ کے لیے یہ اشتہارات دکھائے جاتے ہیں۔ ان میں ان اشیا کی خصوصیات اور ان کی اچھائیوں کو غیر ضروری طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سیدھے سادے عوام اکثر گمراہ ہو کر ان اشیاء کو خرید لیتے ہیں اور حتی المقدور نقصان اٹھاتے ہیں۔ حکومت یہ چاہتی ہے کہ مشتہرین ان ہی اشیا کی اپنی خوبیوں کا اشتہارات میں ذکر کریں جو فی الواقع ان میں موجود ہوتی ہیں۔ چنانچہ حکومت اس ضمن میں جلد ہی اپنے رہنمایانہ اصول جاری کرنے والی ہے۔

اس اعلان کو پڑھ کر ہمیں افسوس بھی ہوا اور خوشی بھی۔ افسوس اس بات کا کہ اگر دوردرشن پر سچی سچی باتیں دکھائی جانے لگیں تو پھر زندگی میں لطف ہی کیا باقی رہ جائے گا۔ منجن بنانے والے، پلاسٹک کا سامان بنانے والے، صابن اور تیل بنانے والی کمپنیوں کے مشتہرین اگر اپنی اشیا کے بارے میں تھوڑا بہت مبالغہ کرتے ہیں تو اس میں کیا قباحت ہے۔ حکومت بھی تو اپنی فرضی اچھائیوں اور خصوصیات کو دوردرشن کی خبروں اور دیگر پروگراموں میں بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہے جس سے سیدھے سادے عوام اکثر گمراہ ہو جاتے ہیں اور انتخابات میں حکمراں پارٹی کو ووٹ دے کر حتی المقدور نقصان اٹھاتے ہیں۔ امورِ مملکت ہم کیا جانیں مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ زمانہ تشہیر یعنی پبلسٹی کا ہے۔ ہمارے دوردرشن پر تو پھر بھی ذرا کم ہی اشتہارات دکھائے جاتے ہیں۔ امریکا کے سابق صدر مسٹر ریگن کے دورِ صدارت میں ہمیں امریکا میں چند دن رہنے کا موقع ملا تھا۔ وہاں دیکھا کہ خبروں کے بیچ میں بلکہ خبروں کو روک کر اشیا کے اشتہارات دکھائے جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ صدر ریگن کہہ رہے ہیں عالمی امن کے لیے ہمیں بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ "ہم فلاں کمپنی کے بنائے ہوئے مکھن کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں"۔ ایک بیان میں کیوبا کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر وہ جلد از جلد راہ راست پر نہ آجائیں تو ہمارے پریشر کوکر

کا استعمال کیجیے۔ ہر شئے لمحوں میں گل جاتی ہے" اشتہار میں خبر اور خبر میں اشتہار کچھ اس طرح یک جان دو قالب ہو جاتے ہیں کہ صدر امریکا کا بیان اشتہاری کمپنی کا بیان اور اشتہاری کمپنی کا بیان صدر امریکا کا بیان معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی لیے جب تک امریکا میں رہے وہاں کے ٹیلی ویژن پر بہت احتیاط سے خبریں دیکھتے رہے، کیونکہ دو چار دن ہم نہایت سنجیدگی سے کسی کمپنی کا مکھن کھاتے رہے۔ رہی اپنے دور درشن کی بات تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ بعض اشیاء کے اشتہارات ہمیں خود دور درشن کے پروگراموں سے کہیں زیادہ دلچسپ اور معیاری نظر آتے ہیں۔ چنانچہ صابن بنانے والی ایک کمپنی کے اشتہار میں ایک خوبرو حسینہ صابن کو کچھ اس ادا سے اپنے جسم پر ملتی ہے کہ صرف اس اشتہار کو ایک نظر دیکھنے کی خاطر ہم دور درشن کے کئی غیر معیاری پروگرام دیکھ لیتے ہیں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ہم موٹر نشین نہیں ہیں۔ لیکن ٹائر بنانے والی ایک کمپنی اپنے ٹائروں کا اشتہار کچھ ایسے دلفریب انداز میں پیش کرتی ہے کہ پچھلے دنوں ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، یہ ٹائر خرید لیے۔ بعد میں احساس ہوا کہ ہمارے پاس تو کار ہی نہیں ہے۔ چنانچہ اب ان ٹائروں کو استعمال میں لانے کی خاطر ہم ایک موٹر خریدنے کی بابت سوچ رہے ہیں لیکن صرف سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔

ہم نے غور کیا کہ اگر سچ مچ اشتہاروں میں سے مبالغہ کو خارج اور سچائی کو ایمانداری سے شامل کیا جائے تو اشتہارات کی نوعیت کیا سے کیا ہو جائے گی۔ ذیل میں ہم چند سچے اشتہارات نمونے کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔

• ہماری کمپنی کی بنائی ہوئی چائے کی پتی کبھی بھول کے بھی استعمال نہ کیجیے۔ کیونکہ اس میں پچاس فیصد گھوڑے کی لید بلکہ کبھی کبھی تو گدھے کی لید بھی استعمال کی جاتی ہے۔ پچیس فیصد لکڑی کا بُرادہ بھی شامل ہوتا ہے۔ البتہ شرما شرمی میں پچیس فیصد چائے کی پتی بھی اس میں شامل کی جاتی ہے جو کوئی صاحب اس چائے کی پتی کا استعمال کریں گے وہ نقصان کے خود ذمے دار ہوں گے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔"

"ہماری کمپنی کا ٹوتھ پیسٹ پابندی سے استعمال کیجیے انشاء اللہ دو چار مہینوں میں آپ کے دانت یکے بعد دیگرے گرنا شروع ہو جائیں گے۔ مگر اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ٹوتھ پیسٹ کا استعمال پابندی سے جاری رکھیے۔ سال بھر میں آپ کا منہ دانتوں سے محروم ہو جائے گا۔ اس کے بعد آپ ہمارے دندان سازی کے شعبہ سے ربط پیدا کیجیے۔ ہمارا اصلی پیشہ تو دندان سازی ہی ہے اور ٹوتھ پیسٹ بنانا ہمارا ذیلی کاروبار ہے۔ گویا یہ وہ شاخ ہے جس پر ہمارا آشیانہ ہے۔ منہ میں اصلی دانتوں کا رہنا صحت کے لیے مضر ہوتا ہے۔ دانت اصلی ہوں تو نقلی چیزوں کے کھانے سے ان میں سڑن پیدا ہو جاتی ہے اور دانتوں کا درد شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے منہ میں نقلی دانت لگوالیں اور اس کے لیے ہمارے ٹوتھ پیسٹ کا

پابندی سے استعمال کریں۔

ہماری کمپنی کا طوطا مارکہ صابن دیکھنے میں طوطے سے زیادہ ہرا ہوتا ہے بلکہ اس کے استعمال کے بعد تو آدمی بھی ہرا ہرا سا نظر آنے لگتا ہے۔ ہمارے صابن کے بارے میں ایک مشہور فلمی اداکارہ فرماتی ہیں، "میری بدصورتی کا راز یہی طوطا مارکہ صابن ہے جس کے استعمال سے میرے چہرے کا سارا میک اپ اتر جاتا ہے اور میرے چہرے کے سارے کیل مہاسے ابھر کر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس صابن کا استعمال ہرگز نہ کیجیے کیونکہ اس سے جلد میں جلن پیدا ہوتی ہے۔ جلد سفید ہو تو کالی ہو جاتی ہے اور کالی ہو تو سفید ہو جاتی ہے۔ جسم کی میل تو اس صابن سے دور نہیں ہوتی البتہ آدمی کی روح نہایت پاک و صاف ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جسم بدصورت ہو جائے تو آدمی مجبوراً اپنی روح کی طرف راغب ہوتا ہے اور اسے پاک و صاف رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اگر آپ اپنے کالے بالوں کو جلد از جلد سفید کرنا چاہتے ہوں اور پھر انھیں اس تیزی کے ساتھ جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہوں تو آج ہی سے ہمارے ہیر آئل کا استعمال شروع کیجیے۔ انشاء اللہ چند ہی دنوں میں پہلے تو آپ کے بال سفید ہو جائیں گے اور پھر سر سے غائب ہو جائیں گے۔ ہمارے ہیر آئل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آپ کو ہر مہینہ پابندی سے حجام کے پاس جانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس سے حجامت بنوانے کا خرچ کم ہو جاتا ہے۔ ایسے کفایتی تیل دور جدید میں کم ہی دریافت ہو رہے ہیں۔ کچھ مہینوں میں آپ کے سارے بال سر سے غائب نہ ہو جائیں تو دام ہم سے واپس لے لیجیے بشرطیکہ تب تک ہماری کمپنی باقی رہے۔

ہمارا لکڑ ہضم پتھر ہضم چورن استعمال کیجیے۔ یہ نہ صرف پیٹ میں جانے والی اشیا کو ہضم کرتا ہے بلکہ نہایت سلیقہ کے ساتھ اس آدمی کو بھی ہضم کرنا شروع کر دیتا ہے جو اسے استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا چند دنوں میں آدمی کا ہاضمہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ بالآخر اسے چار کندھوں پر سوار کر کے لے جانا پڑتا ہے۔ اس چورن کی دریافت کی بنیاد غالب کے اس مصرع پر رکھی گئی ہے۔

ع موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

تو عالم کیف و سرور میں ہم نے سوچا کہ ہمیں وہ شہرت یافتہ فریڈم فائٹر والا ایرکنڈیشن کہ جسے زبان خاص میں جو آسمان سے اتر کر سیدھی سرکار کے دفتر میں داخل ہو جاتی ہے اور "آکاشں وانی" کہلاتی ہے۔ کا پاس کیوں نہیں مل سکتا۔
آپ کہیں گے کہ دھکے مکّے ٹوٹ پھوٹ اور کانٹوں کے بستر کے درمیان کیف و سرور کا کیا عمل دخل۔ اور کیا ذکر اذکار۔ تو عرض یہ ہے کہ غم کا اپنا ایک نشہ ہے اور تکلیف کی راحت۔
ضمنی مطالعہ یا مزید معلومات یعنی ریفرنس کے طور پر دیکھیے اور پڑھیے ڈیمنی کے ــــ DEMENIQUE THE CITY OF JOY کا ناول۔ آنند نگر۔ اور پھر غالب بھی تو فرما گئے ہیں۔

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

ہاں تو بات تھی فریڈم فائٹر کی۔ اگر ہم نے ذرا بھی عقل سے کام لیا ہوتا تو جتنی مارکٹائی ہماری گھریلو آزادی اور پڑھنے لکھنے کی آزادی حاصل کرنے کے سلسلے میں ہوئی تھی اس سے آدھی میں ہم فریڈم فائٹر امتحان درجہ اوّل اور ڈسٹنکشن کے ساتھ پاس کر سکتے تھے کہ اس جنگ آزادی میں عمر کی کوئی قید تو تھی نہیں۔ تین چار سال کا بچہ بھی ڈنڈے، لاٹھی، لات جوتے کھا سکتا تھا۔
وہ ہم نے بھی حسب ہمت کھائے۔ وہ بھی پولیس والوں کے۔ کہ والد اس خاکسارہ کے ڈی۔ آئی۔ جی تھے۔ سرکار انگلشیا کے وفادار ــــ
وہی ڈنڈے جو کانگریسی کارکنوں اور ستیہ گرہوں پہ برسا کرتے تھے وہی ذرا ہلکے سے کبھی ہم پہ بھی اٹھ جایا کرتے تھے۔ اور جناب ریلوے پاس ڈونڈوں کی گنتی کر کے یا زخموں کی گہرائی ناپ کے تو دیے نہیں گئے۔
فریڈم فائٹر کے لیے جیل جانا لازمی تو نہیں اضافی شرط ہے۔ اب قید خواہ پل دو پل کی ہو یا برس دو برس کی، قید بامروت و محبت ہو یا قید با مشقت بس ایک حجرۂ تاریک ہو اور چند سلاخیں۔
تو ہمارا گھر جو اس زمانے میں بنگلہ کہا کرتا تھا اس کے در و دیوار مضبوطی میں کیا کسی جیل خانے سے کم تھے۔ رہی تاریکی تو اس کا بھی فقدان نہ تھا۔ دن میں درختوں کے جھنڈ کی وجہ سے اور رات میں بجلی کی کمی کی بنا پر (کہ بجلی کا بل تو اپنی ہی جیب سے دینا پڑتا تھا۔)
رہی زندگی ــــ وہ بامشقت تو اب تک گزر رہی ہے۔ غالب کی طرح ہم بھی عالم بالا سے اس عالم آب و گل و گل میں سزا کاٹنے ہی تو آئے ہیں۔ ہم سے زیادہ چین اور آرام تو صرف تہاڑ جیل کے قیدیوں کو نصیب ہے۔
مگر تف ہے اس ناقبت اندیشی پر کہ ان تمام حادثات کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا۔

ضابطۂ تحریر میں اسے لائے نہیں اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ کام ہو نہ ہو کاغذی کاروائی
پکی ہونی چاہیے۔ سیکڑوں اسکول، اسپتال، سڑکیں، پل تالاب ڈھونڈے ڈھونڈے
نہیں ملتے لیکن کاغذ پہ، فائل پہ وہ پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہیں۔ اور بجٹ
کے "شریکِ حیات"۔
پڑھائی جاری رکھنے کے لیے داخلوں کے موسم میں ہر سال بھوک ہڑتال بھی کرنی پڑتی
تھی اور مرن برت کی دھمکی بھی اس انداز سے دینی پڑتی تھی کہ آواز بلند، لہجہ سخت
اور خلوص کم۔
پھر بتائیے ہماری درد بھری داستان اور لرزہ خیز واداتوں کا ایک سرٹیفکیٹ نہیں
بن سکتا تھا؟
جان کے صرفے کے ساتھ تھوڑا سا مال بھی دستور کے مطابق خرچ کر دیتے۔ مگر اتنی
دور اندیشی ہوتی تو دنیا کے اکثر انعامات و اعزازات سے نوازے جاتے۔
اُن الفاظ میں تعریفیں کی جاتیں جن کا وجود کسی لغت میں نہیں۔ بینک کی کوری خالی پاس
بک ہندسوں سے بھر جاتیں۔ اور کچھ نہیں تو ایک عدد تامر پتر تو مل ہی جاتا مع فرسٹ
کلاس فری ریلوے پاس کے۔
اور ہم بقیہ زندگی ہنسی خوشی اپنے گوشۂ عاقبت یعنی ریل کے ڈبے میں گزارتے۔
اب دیکھیں کب کس جنگ کے سلسلے میں فریڈم فائٹرس کی آسامیاں نکلتی ہیں اور
کب ان کے لیے درخواستیں طلب کی جاتی ہیں۔
ویسے اڑتی اڑتی خبر زبانی طیور کی یہ ہے کہ Minimum qualification صرف
چوبیس گھنٹے کی قید ہے۔ خدا جانے زلف کی کہ زنجیر کی۔

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

رسالہ جامعہ

شمارہ ۳-۴، جلد ۹۱

مدیر: شمیم حنفی
ضخامت: ۱۶۰ صفحات
قیمت فی شمارہ: ۱۵ روپے
مبصر: عبداللہ ولی بخش قادری
ناشر: جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

رسالہ جامعہ کا تازہ شمارہ (نمبر ۳-۴، مارچ اپریل ۱۹۹۴، جلد نمبر ۹۱) نئی سج دھج کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ اس کی ہیئت، ماہیت اور ادارت سب ہی تغیر پذیر ہے۔ یوں تو اس خوش گوار تبدیلی کی نوید پچھلے شمارے (نمبر ۲، فروری ۱۹۹۴، جلد نمبر ۹۱) میں نئے مدیر پروفیسر شمیم حنفی نے سنادی تھی پھر بھی اس کے رنگ روپ نے چونکایا۔ مضامین کی ترتیب سے مدیر کے طرز نظر کا انداز ملتا ہے جس کے عنوانات حسب ذیل ہیں:۔

مسائل، معاشرت، ثقافت، شخصیات، ادبیات، منظر نامہ، بازیافت اور تبصرے۔

اس شمارے میں بیرونِ جامعہ مصنفین اور جامعہ کے مصنفین کی تعداد کم و بیش یکساں ہے اور کل تعداد ۲۲ ہوتی ہے۔ جملہ نگارشات میں پانچ ترجمے بھی شامل ہیں مگر وہ اپنے موضوع کی اہمیت اور ترجمے کی وقعت کے اعتبار سے گراں قدر قرار دینے کے مستحق ہیں۔ دیگر مضامین اپنی نشانِ امتیاز جداگانہ طور پر رکھتے ہیں۔ 'منظر نامے' میں کوتیا ۹۳، سیاہ فام ادب پر قومی مذاکرہ، کتابوں کا عالمی میلہ ۹۳ء، ادب کی بین الاقوامی اور قومی انعام یافتہ چند شخصیات سے متعلق مضامین، قرۃ العین حیدر سے ایک گفتگو جیسے موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ 'بازیافت' میں 'جامعہ آرکائیوز سے' ادارے نے چند مشاہیر کے خطوط پیش کیے ہیں۔ اور 'تبصرے' میں تین کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس ترتیب کا آغاز اداریے سے ہوتا ہے جو نہایت مختصر ہے مگر معتدر ہے۔ نئے مدیر نے اپنے عزائم کا یوں اظہار فرمایا ہے کہ وہ رسالہ جامعہ اردو میں دانشوری کے ایک ہمہ گیر تصور کا نمائندہ

ہو گا۔ اسے ہم سائنسی سماجی اور انسانی علوم کی تمام جہتوں، تمام ضابطوں کا ترجمان بنانا چاہتے ہیں" اگر ایسا ہوا تو بجا طور پر کہا جا سکے گا کہ رسالہ جامعہ نے اپنے اکابرین سلف کی پیروی کی ہے اور وہ نہ صرف اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کا حق ادا کرے گا بلکہ ادارے کی روح بیدار کرنے کا بھی موجب ہو گا جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے ساتھ ہی اس کا شعبہ تصنیف و تالیف معرض وجود میں آیا۔ اس کی حیثیت جامعہ کے ایک نقیب اور ترجمان کی تھی جس کی ادارت نورالرحمان صاحب کے سپرد ہوئی جو شعبہ تصنیف و تالیف کے نگراں بھی تھے۔ ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر سید عابد حسین، شعبے کے ناظم اور رسالہ کے مدیر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۴ء سے رسالہ نئی ترتیب سے شائع ہوا یعنی کہ چار چار صفحے اسلامیات، اجتماعیات، ادبیات کے لیے مخصوص کیے گئے اور ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر عبدالعلیم ادارت میں شامل ہوئے۔ جب سے لے کر آج تک رسالے کی روش اور کشش میں نشیب و فراز آتے رہے ہیں، حتیٰ کہ کبھی اشاعت میں تعطل بھی آیا۔ آخری وقفے کا اختتام جشن چہل سالہ (۱۹۶۰ء) کے موقع پر اس کے احیا سے ہوا۔ پھر اس کی سلامت روی جاری رہی ہے۔ اس شمارے میں جس عزم و عمل کا اعادہ کیا گیا ہے اس سے صرف رسالہ جامعہ ہی نہیں بلکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نصب العین کی بھی آبیاری ہوتی ہے۔ کیونکہ جامعہ کے اساسی اصولوں میں اردو زبان میں تعلیم، ایک اہم اور ممیز، مرکزی مقصد کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ امر مسلّمہ ہے کہ کوئی زبان، علمی زبان بنے بغیر اور رہے بغیر، اپنی بقا کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ حصولِ آزادی کے بعد، اردو سیاستِ روزگار کی بھینٹ چڑھ گئی اور ایسا لگتا ہے کہ ہمیں اپنی ناعاقبت اندیشی اور تن آسانی کے طفیل احساسِ زیاں بھی جاتا رہا ہے۔ لہٰذا اس جمود آمادہ فضا میں رسالہ جامعہ کے پیکر میں حرارت کی ایک رمق بھی نعمت غیر مترقبہ سی نظر آتی ہے جس کے لیے پوری مجلس مشاورت بالعموم اور مدیر نیز اُن کے معاونین بالخصوص مبارکباد کے مستحق ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ وقت کے ساتھ اس کی آب و تاب میں اضافہ ہو گا۔ ادبی و علمی وقار کے ساتھ ساتھ اس میں حسنِ سادہ کی نمود بھی پائی جاتی ہے۔ سرورق کی زیریں حد پر درج ہے۔ "جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ادبی و علمی ترجمان" اس شمارے سے آس بندھتی ہے کہ رسالہ جامعہ کما حقہٗ اس منصب کا اہل قرار پائے گا۔

علی گڑھ تحریک

سماجی اور سیاسی مطالعہ

مصنف: مظہر حسین
سن اشاعت: ۱۹۹۳ء۔
ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی۔
قیمت: سو روپے۔ صفحات: ۳۰۴
مبصر: رشید حسن خاں

تحقیق آشوبی اور آسان پسندی کے اس دورِ ابتلا میں کبھی کبھار بعض ایسے

مقالے بھی سامنے آجاتے ہیں جن کو دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ہمارے نوجوانوں میں سنجیدگی کے ساتھ کام کرنے والے موجود ہیں اور یہ روایت منقطع نہیں ہوئی ہے۔ اس طرح نا امیدی کامل ذہن میں اپنی جگہ نہیں بنا پاتی۔ مظہر حسین کا تحقیقی مقالہ "علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ" جب پہلی بار مجھے ملا تو حسب معمول بدگمانی نے گنہ گار کیا کہ یہ بھی ویسا مقالہ ہوگا جیسا اکثر تحقیقی مقالے ہوتے ہیں لیکن جب اس کو از اوّل تا آخر پڑھا تو معلوم ہوا کہ مقالہ نگار نے روش عام کی پیروی نہیں کی بلکہ دل لگا کر کام کیا ہے اور محنت کی ہے سخن طرازی کے شیوۂ عام کی بھی رعایت نہیں کی ہے۔ اس کے برعکس علمی انداز کی نثر لکھی ہے واضح ارشن انشائیہ انداز نگارش کے اثرات سے محفوظ۔

مقالہ نگار نے پرانی دستاویزوں کی مدد سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ علی گڑھ کے باہر یعنی دوسرے لفظوں میں سرسید تحریک کے دائرہ اثر سے باہر نئی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی اور اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ علی گڑھ تحریک ایسی واحد تحریک نہیں تھی جس نے مسلمانوں میں اس زمانے میں نئی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا کیا ہو۔ مسلم حلقوں میں نئی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کا احساس کارفرما تھا۔ مقالہ نگار نے مستند حوالوں کے ذریعہ سے اعداد و شمار پیش کیے ہیں جو ان کے اس نقطۂ نظر کی پورے طور پر تائید کرتے ہیں۔

اس مقالہ میں جس غیر روایتی انداز فکر سے کام لیا گیا ہے اس میں مقالہ نگار کی ذہانت، محنت، ذوق تحقیق اور اچھا کام کرنے کے جذبے کے ساتھ ساتھ جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی کی اس روایت کے اثرات بھی صاف طور پر نمایاں نظر آتے ہیں، جہاں طالب علموں کے ذہن نئے خیالات، جدید تصورات اور غیر روایتی انداز فکر اور طرز فکر سے کسی حد تک آشنا ضرور ہو جاتے ہیں۔ یہ بات میں ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ اس مقالے کو پڑھ کر اس کی توثیق بہت خوبی کے ساتھ ہوتی ہے۔ مجھے توقع ہے کہ ایک اچھی معلوماتی کتاب اور ایک قابل قدر مقالے کی حیثیت سے اس کتاب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

اگر اس کا دوسرا اڈیشن شائع ہو تو میری رائے ہے کہ اس میں بحث کے دائرے کو وسیع کر کے اس بات کو بھی موضوع بحث کے طور پر شامل کر لیا جائے کہ ہندستان کے دوسرے تعلیمی اداروں کی طرح کیا سرسید کا مقصود بھی محض گریجویٹ پیدا کرنا تھا یا وہ جدید ذہن بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اگر یہ بات درست ہے کہ سرسید کے نزدیک تعلیم وسیلہ تھی نیا علمی سائنسی اور حقیقت پسندانہ انداز نظر پیدا کرنے کی، تو کیا دوسرے اداروں میں اور علی گڑھ کے مرکز میں کچھ فرق تھا؟ یہ بنیادی سوال ہے اور اس پر بحث کی جانی چاہیے تھی۔

کرشن چندر
شخصیت اور فن

مصنف : جگدیش چندر ودھاون
مبصر : پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی
قیمت : ۲۵۰ روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

اردو کے مشہور و معروف مصنفین کے بارے میں یوں تو اکثر گفتگو ئیں رہتی ہیں لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں مستند حقائق پر مبنی کوئی کتاب تلاش کرنے نکلیں تو اکثر ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے۔ بکھرے ہوئے مضامین، توصیفی اور تہنیتی بیانات دوسرے تیسرے ماخذ سے حاصل کیے ہوئے واقعات ولطائف تو بہت مل جائیں گے۔ مگر وہ کس حد تک قابلِ اعتنا ہوں گے یہ نہیں کہا جا سکتا اور پھر جو مصنف جتنا مقبول ہو اس کے گرد اسی نسبت سے تحسین یا کبھی کبھی تحقیر کا ایک ہالہ بن جاتا ہے اور اس کی اصل شخصیت کا ایک مقبولِ عام روپ رہ جاتا ہے اور یہی روپ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ رہ جاتا ہے۔ اس صورتِ حال پر اگر کوئی ایسی کتاب سامنے آئے جس میں کسی مصنف کے بارے میں سارے حاصل شدہ مواد کو ترتیب و تسلسل کے ساتھ ساتھ یکجا کر کے رائے قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہو تو نہ صرف ایک خلا پُر ہوتا ہے بلکہ اسے پڑھنے کے دوران متعلقہ شخصیت بھی آمنے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے خواہ ذفت نے اسے کچھ دور ہی کیوں نہ کر دیا ہو۔

کرشن چندر کے بارے میں ودھاون صاحب کی کتاب ایسی ہی ایک ضخیم جلد ہے جس میں ان کی سوانح، شخصیت اور فن کے بارے میں نہایت مشقت کے ساتھ ساتھ سارے حقائق بھی جمع کر دیے گئے ہیں۔ اس کے پس منظر میں مصنف کی جستجو اور کرشن چندر سے ان کا ذاتی لگاؤ ہے وہ بھی عیاں ہو جاتا ہے۔ کرشن چندر کو جو لوگ جانتے ہیں ان کے دلوں سے کرشن کی معصوم، ہنس مکھ اور دلکش شخصیت کا نقش مٹ نہیں سکتا۔ اور یہ کتاب نہ جانے کتنی یادوں اور باتوں کو ایک ایک کر کے ہر ورق کے ساتھ زندہ کرتی ہے۔

کرشن چندر اس عہد کے مقبول ترین فکشن نگاروں میں رہے ہیں اور ہر اہم تخلیق کار کی طرح ان کا فن بحث اور تنازعہ کا موضوع بھی بنا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور اشتراکیت سے ان کی وابستگی نے اگر ایک طرف ان کے فن کو ایک سمت عطا کی تو دوسری طرف اسی کے سبب اس بحث کو بھی ہوا ملی کہ کرشن چندر کے لیے وابستگی ضروری ہے یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ کرشن چندر کو اردو کا عظیم افسانہ نگار سے لے کر محض ایک چلتا ہوا مقبولِ عام افسانہ نگار تک سب کچھ کہا گیا اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ ہر عہد کے اہم ادیبوں کے بارے میں خصوصاً ان لوگوں سے متعلق جن کی تحریروں نے آنے والی نسلوں کو متاثر کیا۔ اس طرح کی بحثوں کا اٹھنا بھی ان کی اہمیت ہی کی ایک

دلیل ہے۔

ودھاون صاحب کرشن چندر کی شخصیت اور فن دونوں کے عاشق ہیں۔ ان کا یہ عشق کتاب کے ہر ہر فقرے سے اور ان کے عام لہجے میں عیاں ہے۔ چنانچہ کرشن چندر سے متعلق ہر وہ شے جو کرشن کا چاہنے والا دیکھنا پڑھنا چاہے گا اس کتاب میں مل جائے گی۔ ان کی تحریر کے عکس۔ ان کی ذاتی اور خانگی زندگی کے اتار چڑھاؤ۔ تعلقات کا بگاڑ اور بناؤ، ان کی حسن پرستی، معاشقے اور دوسری شادی، دوستوں کی محفل نوشا نوش کی سرمستیاں، ایک جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویر ہمارے سامنے لے آتی ہیں۔

ودھاون صاحب نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک شخصیت اور دوسرا فن۔ شخصیت والا حصہ اس اعتبار سے نادر ہے کہ یہاں بہت کچھ وہ ہے جو کہیں اور نہیں ملے گا۔ اس کے علاوہ کرشن چندر پر مختلف رسائل، کتابوں اور مضامین سے بھی مواد حاصل کر کے یکجا کر دیا گیا ہے۔ کرشن چندر کے احباب و اعزہ کے انٹرویو پر مبنی ان کی شخصیت تعلقات اور فن سے متعلق رائیں ہیں۔ محققوں طالب علموں اور کرشن چندر کے پرستاروں کے لیے یکساں طور پر یہ حصہ دلچسپ اور مفید ہے۔

فن سے متعلق صفحات پر ودھاون صاحب نے ان کی جملہ تحریروں میں سے کچھ پر خصوصی طور سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ شاید اس لیے کہ کرشن چندر نے جتنا کچھ لکھا ہے اس میں سے ہر چیز پر اظہار خیال کا حق ادا کرنے کے لیے کئی جلدیں درکار ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ان کے اسلوب کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے منتخب افسانوں کو خاص طور سے سامنے رکھا۔ اسی طرح ناولوں کا بھی اجمالی جائزہ لیا ہے جیسا کہ کہا جا چکا ہے کرشن چندر کا فن غور و فکر کرنے کے لیے اس قدر وسیع میدان فراہم کرتا ہے کہ کسی ایک شخص کی رائے کو حرف آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ ودھاون صاحب کا فنی جائزہ بھی کرشن چندر سے متعلق مباحث کا تتمہ نہیں بلکہ ان کے بارے میں بحث کو اور آگے بڑھاتا ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ کرشن چندر پر اب تک یہ سب سے مستند اور قابل اعتبار حوالے کی کتاب ہے جو اہل علم میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی رہے گی۔

مرتب: محمد عبدالحی
قیمت: پچاس روپے
ناشر: جے۔ جے پبلشرز اینڈ بک سیلرز ملک پیٹھ
حیدرآباد ۵۰۰۰۳۶
مبصر: پروفیسر اختر الواسع

جامعہ عثمانیہ

۱۹۱۸ء میں حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں منشور خسروی کے ذریعہ جامعہ عثمانیہ کا قیام

ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس جامعہ کا قیام ہندستانی نظام تعلیم میں ایک تاریخی اہمیت کا اس لیے بھی حامل ہے کہ جدید ہندستان میں قدیم و سیکولر علوم و فنون کی تعلیم کے لیے پہلی بار ایک دیسی زبان اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا تھا۔ اردو جو ایک دیسی زبان تھی جس نے دکن میں جنم لیا اور دہلی میں پروان چڑھی اور پھر شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک رابطہ کی، انسانی جذبات کے تمام مظاہر کے اظہار کی اور ہر طرح کے علوم و فنون کی ترویج کی مکلّف زبان بن گئی تھی۔ یہ تجربہ بے انتہا کامیاب رہا اور بقول پروفیسر سیدہ جعفر "جامعہ عثمانیہ کے شاندار تدریسی ریکارڈ، اس کی قائم کردہ صحت مند اور جاندار روایات اور اس کی تعلیمی فضیلتوں نے ماہرینِ تعلیم کو چونکا دیا اور اس جامعہ کا شہرہ سرحدیں اور سمندر پار کر کے اعلا تعلیم کے دور دراز مرکزوں تک پہنچ گیا۔"

جامعہ عثمانیہ دراصل اس احساس کا نتیجہ تھی جس کا ذکر اس کے قائم کرنے کے لیے جاری حکم میں اس طرح درج ہے کہ "ایک ایسی یونی ورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طرح کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہو کر جسمانی و دماغی و روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے ... اس یونی ورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیے کہ اعلا تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو قرار دی جائے مگر انگریزی کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔

جامعہ عثمانیہ کی تاریخ اور تعارف پر اکثر لکھا گیا ہے لیکن زیر نظر کتاب جو جناب محمد عبدالحی صاحب نے ترتیب و تالیف کی ہے، اس اعتبار سے خاصی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں جامعہ عثمانیہ کے قیام، اس کی تعلیمی و تدریسی منصوبہ بندی، تجربات اور خد و خال کو بڑی محنت اور لگن کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ نیز اس کی ایک دستاویزی اہمیت بھی ہے کہ اس میں اس تمام تاریخی مواد کو یکجا کر دیا گیا ہے جو اس کے قیام اور ارتقا پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ولی الدولہ بہادر اور سر تیج بہادر سپرو کے خطبات جلسہ تقسیم اسناد بھی نقل کر دیے گئے ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کا ۹ر جنوری ۱۹۱۸ء کا جامعہ عثمانیہ کے قیام پر ایک خط، چانسلرس اور وائس چانسلرس کے ناموں کی فہرست اور پلاٹینم جوبلی رپورٹ بھی زیر نظر کتاب میں شامل ہیں۔ کتاب پُر از معلومات ہے لیکن اگر اس کی قیمت کچھ کم رکھی جاتی تو قارئین تک اس کی رسائی میں اور زیادہ سہولت ہوتی۔

قصیدۂ نبیِ رحمت

مصنف: حفیظ بنارسی
مبصر: سہیل احمد فاروقی
ناشر: بیگم صالحہ حفیظ، ملکی محلہ، آرہ
صفحات: ۴۲ قیمت: حسب استطاعت

جناب حفیظ بنارسی منفرد لب و لہجہ کے شاعر کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں

ہیں۔ ان کی تخلیقات ملک اور بیرون ملک شائع ہونے والے مؤقر ادبی جرائد کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ قصیدہ کی صنف میں اپنی زیر نظر شعری کاوش "قصیدہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم" کی صورت میں انھوں نے بارگاہِ رسالت میں خراج عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے اس کے ساتھ انھوں نے اردو میں قصیدہ گوئی کی تاریخ میں ایک زریں باب کا اضافہ بھی کیا ہے۔

قصیدہ ساٹھ اشعار پر مشتمل ہے جس کا تعارف پروفیسر طلحٰہ رضوی برق صاحب نے تحریر کیا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہر شعر ستارہ صفت ہے۔ تشبیب کے اشعار کی روانی اور بے ساختگی کی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں:-

ہے ارضِ بنارس کا گدا کتنا مکرم!
رہتی ہے مدینے کی گلی آنکھوں میں ہر دم
گنگا میں جھلکتا ہے رُخِ کوثر و زم زم
اے بادۂ عرفاں ترے قربان گئے ہم

یہ قصیدہ قرآن کریم میں مذکور رسول کے اوصافِ حمیدہ کی دلکش تصویر کہا جا سکتا ہے حفیظ صاحب نے نعت رسول کے موضوع کو بڑی خوش اسلوبی سے برتا ہے اور قرآنی مصطلحات و تلمیحات سے کسب فیض کرتے ہوئے ایک موزوں لفظیات وضع کی ہے حرمت رسول کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے انھوں نے کمالِ بشریت کے اسرار سے بھی قاری کو آگاہ کیا ہے۔

قصیدہ میں استمداد و استغاثہ کے مرحلہ پر پہنچ کر انھوں نے جو لہجہ اور انداز اختیار کیا ہے بہت برمحل ہے۔

ہو مجھ کو اجازت تو میں اک عرض گزاروں
مدت سے مرے دل میں ہے اک محشرِ ماتم

فنی محاسن کے ساتھ نعتیہ قصیدہ کی روایت اور اس کے اسالیب پر شاعر کی گہری نظر بھی قابلِ توجہ ہے۔ واقعہ معراج کو انھوں نے کتنے آسان پیرایہ میں باندھا ہے۔ ملاحظہ ہو:

معراج کی شب ہو گیا یہ راز بھی افشا
ترے سے ترے دوریٔ گردوں ہے بہت کم

یہاں ہمیں اقبال سہیل بھی ضرور یاد آئیں گے جنھوں نے کہا تھا:

حضور اس طرح گزرے گنبد مینائے گردوں سے
نظر جس طرح شیشے سے گذر جائے بہ آسانی

بیشتر اشعار میں کوزی آوازوں کے میم کی ردیف سے اتصال نے صوتی آہنگ کو زیادہ پراثر اور باوقار بنا دیا ہے۔ حفیظ بنارسی "زمین نعت میں دادِ سخن وانی" کے پوری طرح مستحق ہیں۔

اکثر یاد آتے ہیں

مصنف: مظہر امام
ناشر: ادب پبلی کیشنز، نئی دہلی
اشاعت: ۱۹۹۰ء
قیمت: ۷۵ روپے　صفحات: ۱۵۶
مبصر: ڈاکٹر صغرا مہدی

مظہر امام اردو کے ممتاز شاعر ہیں۔ ان کے چار شعری مجموعے منظر عام پر آکر شائقین ادب اور ناقدین ادب سے داد وصول کر چکے ہیں "آزاد غزل" کی ایجاد کی وجہ سے بھی ان کی خاصی شہرت ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا اور پھر شاعری کی طرف آئے مگر نثر سے ان کی دلچسپی باقی رہی۔ ان کے تنقیدی مضامین بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ "خاصے بحث انگیز ثابت ہوئے ہیں۔ ابھی حال میں ان کی تازہ تصنیف "اکثر یاد آتے ہیں"، منظر عام پر آئی ہے۔

اس میں ان ادبی شخصیتوں کے بارے میں ذاتی تاثرات کا اظہار ہے جو مظہر امام سے قریب رہے ہیں یا جن سے ان کی دوستی تھی یا پھر جن سے وہ کسی نہ کسی لحاظ سے متاثر ہوئے ہیں جیسے جگر مراد آبادی، مولانا ملیح آبادی، اشک امرت سری، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، اختر قادری کرشن چندر اور خلیل الرحمن اعظمی۔ ان حضرات کے خاکوں میں جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے محبت، دوستی اور قربت کے رنگ گہرے ہیں اور مصنف نے ان یادوں کو بہت خوبصورت اور دلآویز انداز میں سمیٹا ہے جو مصنف کو اکثر آتی ہیں۔ ادب میں شخصی مضامین کی اپنی ایک اہمیت ہے اس میں ہم کسی ادیب و شاعر کی شخصیت کی وہ جھلکیاں بھی دیکھ لیتے ہیں جو اس کی سوانح، اس پر لکھے گئے مقالوں یا خود نوشت میں نہیں ملتی۔ اس میں مظہر امام نے دوستی، محبت، احترام و عقیدت کے جوش میں بہہ کر ان لوگوں کو جو ان مضامین کا موضوع ہیں فرشتہ نہیں بنا دیا ہے بلکہ ان کی کمزوریوں اور خامیوں کا ذکر بھی ہے جو انھیں انسان کی صف میں رکھتا ہے۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے جملوں، اشاروں میں بہت گہری باتیں کہہ دی ہیں۔

اسی طرح پرویز شاہدی اور جمیل مظہری کے خاکے بھی بہت خوب ہیں ان دونوں کی خاص طور سے جمیل مظہری کی انوکھی شخصیت کے خد و خال بہت خوبی سے ابھارے گئے ہیں۔

ان مضامین میں صرف شخصیات کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایک ادبی منظر نامہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے تحت ہونے والی کانفرنسیں، مشاعرے، ادبی محفلیں، معاصرانہ چشمکیں، بذلہ سنجیاں اور ناگفتنی عادات اور حرکات سبھی کا ذکر ہے۔

ان مضامین میں بعض باتیں ایسی آگئی ہیں جن کا ذکر ضروری نہیں تھا اور اس کا احساس کہیں کہیں خود مظہر امام کو بھی ہے اسی لیے وہ لکھتے لکھتے یہ معذرت کرنے

لگتے ہیں کہ "گو ان باتوں کا تعلق اس مضمون سے نہیں ہے۔"

اصل میں جب اسی طرح ذاتی نوعیت کے تعلقات اور ملاقاتوں کے بارے میں لکھا جائے تو خود لکھنے والے کا ذکر آنا ناگزیر ہے لیکن اگر وہ ذکر زیادہ ہو تو وہ اچھا نہیں لگتا۔ ان مضامین میں مظہر امام اپنا ذکر کرتے ہیں مگر اس میں خودستائی کا ذکر نہیں ہے نہ خود کو نمایاں کرنے کی شعوری کوشش بلکہ اس میں ایک خاص طرح کی سادگی بلکہ سادہ دلی ہے اس لیے یہ بات کھٹکتی نہیں۔

زبان بہت آسان ہے مگر ادبی چاشنی بھی ہے۔ بات کہنے کا سیدھا سادا انداز ہے مگر دلچسپ ہے اور قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں بہت دلچسپ اور اہم ادبی مسئلے بھی زیر بحث آئے ہیں اس لیے اس کی ادبی اہمیت بھی ہے۔

دلوں کی خیر

(اسلحہ کی ذخیرہ اندوزی اور عالمی افلاس)

مصنف: اکرام اللہ
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶
صفحات: ۲۱۶ قیمت: ۱۰۰ روپے
مبصر: رباب رشیدی

یہ ایک سائنٹفک اور معلوماتی کتاب ہے اور اس موضوع پر اعداد و شمار دیتے ہوئے خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں دنیا کے فوجی اخراجات، بیو کلیائی ہتھیاروں کی ہلاکت آفرینی اور اسلحہ کی دوڑ پر دفاع کے نام سے کروڑوں ڈالر کے مصارف کس بے دردی سے کیے جا رہے ہیں اس کی پوری قلمی تصویر پیش کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں دنیا کی غریبی، ناخواندگی، دوا علاج کی ناکافی سہولتیں اور دنیا کے دیگر مسائل غذا، پانی، مکانوں اور روزگار کی قلت کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور اس تفصیل کو پیش کرنے کے بعد یہ دکھایا گیا ہے کہ اگر ہتھیاروں پر کیا جانے والا خرچ دنیا کے ترقیاتی پروگراموں میں لگا دیا جائے تو دنیا سے غریبی، تنگ دستی، جہالت اور بیماری کو کس حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔

کتاب کا اصل موضوع انسان، اس کی بقا اور ترقی کا مسئلہ ہے امن عالم قائم کرنے کے لیے تخفیف اسلحہ کی تحریک کتنی ضروری ہے اسے بہت واضح طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اب تک دنیا میں جتنی جنگیں ہوئی ہیں ان میں کتنا جانی و مالی نقصان ہوا ہے اور آج بھی دنیا میں دہشت زدگی اور تشدد سے کتنے زبردست خطرات لاحق ہیں اس کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ پسماندہ ملکوں کی اقتصادیات کس طرح ان سے متاثر ہو رہی ہے اور یہ ملک کیسے زبوں حالی کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں اس کی بھی تفصیلی روداد پیش کی گئی ہے۔

اردو میں اپنے موضوع پر یہ پہلی اور واحد کتاب ہے اور مصنف لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر یہ کتاب لکھ کر اردو زبان میں ایک گرانقدر کتاب کا اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب لائبریری کے لیے بھی اور عام قاری کے لیے بھی معلومات افزا ثابت ہوگی۔

حیدرآباد کے قصے کہانیاں اور روایات

محرک: جناب عابد علی خاں مرحوم
قیمت: ۱۲ روپے صفحات: ۴۰
ناشر: روزنامہ سیاست حیدرآباد ۲۲
مبصر: مظفر حسین غزالی

زیر تبصرہ مختصر کتاب عابد علی خاں مرحوم اڈیٹر روزنامہ سیاست کی حیدرآباد کی تاریخ وراس کی روایات وتہذیب سے دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں زاہد علی خاں نے لکھا ہے کہ "انھوں نے (عابد علی خاں نے) اپنے نام سے اخبار سیاست میں یہ اعلان کیا کہ حیدرآباد کے بارے میں قصے کہانیاں اور روایات جمع کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک قصہ بھی اعلان کے ساتھ بطور نمونہ درج کیا۔ اعلان کے جواب میں کچھ مواد وصول ہوا مگر علالت کی وجہ سے وہ اس پر توجہ نہ دے سکے۔ جو مواد وصول ہوا تھا اسے اب کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔" اس طرح یہ کتاب وجود میں آگئی۔ کتاب کا محرک کوئی بھی بنا ہو اور اسے مرتب کسی نے بھی کیا ہو لیکن آج ہمارے ہاتھ میں ایک ایسی کتاب ہاتھ آگئی جس سے قدیم حیدرآباد کی تہذیب اور نوابوں کی شان و شوکت، جاہ وحشمت، دریادلی اور دولت کی فراوانی کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض قصے تو انتہائی سبق آموز ہیں اور بعض میں اس زمانے کی مفلوج سیاست اور زوال کے اسباب کی جھلک بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔

ان قصوں میں درباری آداب، نظم وضبط، ادیب وشعرا کی پذیرائی، رعایا سے ہمدردی اور سماجی اصلاح کے واقعات بھی پائے جاتے ہیں مثلاً فقیر کی اشرفی، جوان کے دل کی بات، صفحہ ۶ پر ایک پولیس جوان کا قصہ اور صفحہ ۱۲ پر چوکیدار کا قصہ، سماجی اصلاح کی بہترین مثالیں ہیں۔

نوابوں کی رنگین مزاجی مشہور ہے اس کتاب میں بھی شراب نوشی اور رنگین مزاجی سے متعلق کئی کہانیاں موجود ہیں لیکن ان سب کے ساتھ ایسے قصے بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نوابین حیدرآباد قدروں کی قدر اور اپنی زبان کا پاس ولحاظ رکھتے تھے۔ اس سلسلے کی کئی کہانیاں ہیں لیکن "دایہ کو جتی بنالیا" ایک بہترین کہانی ہے۔

"ارم منزل کی تعمیر" ایک اچھا قصہ ہے اس میں اخلاقی تربیت کی سیکھ موجود ہے نظام حکومت میں بہت سے غیر مسلم بڑے بڑے عہدوں پر مقرر تھے۔ وہ حکومت قومی

یکجہتی کی ایک مثال تھی۔ نوابین حیدرآباد کا غیر مسلموں کے ساتھ سلوک بھی بہت اچھا تھا اور وہ مختلف طریقوں سے ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔ مثلاً چاکنے کا گھڑا اور دوسری دنیا میں اجر پانے کی آس اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

آخر میں یہی کہوں گا کہ یہ کتاب دکنی لب ولہجہ کے ساتھ اردو میں گرانقدر اضافہ ہے۔ اس اہم کتاب کے لیے زاہد علی خاں مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کیونکہ انھوں نے اس کتاب کو شائع کرکے حیدرآباد کی تاریخ و تہذیب میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایسا مواد فراہم کر دیا ہے جو ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل کر سکتا ہے۔

طباعت و کمپیوٹر کی کتابت دیدہ زیب ہے اور ٹائٹل کتاب کے موضوع سے مناسبت رکھتا ہے۔ امید ہے یہ کتاب اردو داں حضرات کے علاوہ دکن سے دلچسپی رکھنے والے حضرات میں بھی مقبول ہوگی اور اپنی معنوی خوبیوں کی وجہ سے پسند کی جائے گی۔ میرا احساس ہے اردو زبان اور تاریخ کے طلبہ کو اس کتاب کو خصوصی طور سے پڑھنا چاہیے۔

مرثیے کی سماجیات

مصنف: ڈاکٹر عقیل رضوی
مبصر: احمد محفوظ
ملنے کا پتا: نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ۔
قیمت: ۶۰ روپے

جدید دور میں جو نئے علوم ہمارے سامنے آئے ہیں ان میں سماجیات Sociology بھی شامل ہے۔ اس علم میں سماجی صورتوں کا ایک ایسا مطالعہ کیا جاتا ہے جس میں افراد اور ان کی زندگی کے مختلف پہلو معروضی طور پر ہمارے پیش نظر ہوتے ہیں۔ چوں کہ ادب کا سماج سے گہرا رشتہ ہے اس لیے ادب کو سماجیات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش یقیناً اہمیت رکھتی ہے۔ زیر نظر کتاب اسی کوشش کا نہایت وقیع اور نمایاں اظہار ہے۔

ہماری ادبی روایت میں مرثیے کی اس لحاظ سے خاص اہمیت ہے کہ ایک طرف اس میں اعلا شاعری کی صفات موجود ہیں تو دوسری طرف اس شاعری میں ہمیں سماج اور معاشرے کی آئینہ داری بھی ملتی ہے۔ مثلاً اگرچہ مرثیے کا موضوع واقعۂ کربلا اور اس سے متعلق کردار ہیں جو اسلامی اور عربی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ اردو مرثیے میں کربلا کے واقعات و کردار کی جو تصویر کشی ملتی ہے وہ زیادہ تر ہند اسلامی تہذیب کی رہین ہے۔

زیر نظر کتاب اس لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ ڈاکٹر عقیل رضوی نے مرثیے کو سماجیات کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کا کام اولیت کے ساتھ کیا ہے۔ مصنف نے

اس کتاب میں قدیم و جدید اردو مرثیوں میں ان سماجی پہلوؤں کی تلاش کی ہے جو ہماری تہذیب اور ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں۔ انیس اور دبیر کے مرثیوں کے ساتھ ساتھ مصنف نے جدید مرثیہ نگاروں خاص کر وحید اختر، امید فاضلی، ناشر نقوی، جمیل مظہری، سید آل رضا وغیرہ کے مرثیوں سے بھی بحث کی ہے اور دراصل اس کتاب میں جدید مرثیو ں کے حوالے سے زیادہ باتیں کی گئی ہیں۔

عقیل رضوی نے نئی زمانہ مرثیوں کی عدم مقبولیت کے اسباب سے بھی بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں کلاسیکی مرثیے اور آج کے جدید مرثیوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انیس و دبیر کے زمانے میں مرثیوں کا میدان عمل مجلسیں ہوا کرتی تھیں جب کہ آج کے مرثیے اس طرح مجلسوں میں پڑھے جانے کی چیز نہیں رہ گئے ہیں۔ بلکہ اب مرثیوں کو شائع شدہ صورت میں ہی زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے میں یہ بنیادی فرق بھی آج مرثیوں کی مقبولیت میں کمی کا ایک سبب ہے۔

ڈاکٹر عقیل مرثیوں میں ہونے والی موضوعاتی اور فکری تبدیلیوں کو بھی زیر بحث لائے ہیں اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ آج کے مرثیوں میں دور حاضر کے مسائل اور پیچیدگیوں کو واقعاتِ کربلا کے پس منظر میں نہایت خوبی سے پیش کیا جا رہا ہے۔ یا یوں کہیے کہ واقعۂ کربلا ایک استعارہ بن گیا ہے۔ کربلا کا واقعہ اور خصوصاً حضرت امام حسین اور یزید کو تو ہماری شاعری میں بہت پہلے سے بالترتیب امن و آشتی اور ظلم و بربریت کے استعارے اور علامت کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے اور جس کی عمدہ مثال جوش کی نظم "حسین اور انقلاب" ہے لیکن وہ شاعری اس طرح کے مرثیو ں کا حکم نہیں رکھتی جو کلاسیکی مرثیوں کے ضمن میں آتے ہیں۔ آج کے مرثیوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے مرثیے ہیں اور پھر واقعہ کربلا کے بیان کا التزام اس طرح رکھا گیا ہے کہ جدید دور کا آشوب بھی ان میں نہایت خوبی کے ساتھ نظر آتا ہے۔

بلاشبہ یہ کتاب مرثیے کے مطالعہ کو ایک نیا زاویہ عطا کرتی ہے کیونکہ اس سے پہلے مرثیے کے مطالعے میں ایسی کوشش نظر نہیں آتی جو پوری ایک کتاب پر محیط ہو۔ اس کتاب میں مطالعہ کا جو طریق کار ہمارے سامنے آیا ہے اسے
کہنا اس لیے بجا ہے کہ سماجیات الگ سے ایک
ہے۔ لہٰذا مرثیے کو سماجیات کے حوالے سے دیکھنا یقیناً ہمارے ادب کی تفہیم و تعبیر میں ایک اضافے سے کم نہیں۔

۲۰۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب قیمت کے لحاظ سے اس لیے مناسب ہے کہ عمدہ کاغذ پر کتابت و طباعت بہت خوب ہے۔ مرثیے کے انسلاکات نظر میں رہیں تو سرورق کی سیاہ زمین بھی بامعنی ہو جاتی ہے۔

سارا جہاں ہمارا

مصنف: سلیم فاروقی
ناشر: اسماعیل میرٹھی اکاڈمی، پاکستان
مبصر: ڈاکٹر یوسف عثمانی
قیمت: ۹۰ روپے

ادب کی صحرا نوردی کوئی آسان کام نہیں، خصوصاً "بچوں کا ادب" کوہِ ندا کی خبر لانے سے کم نہیں۔ سلیم فاروقی ایک عرصے سے شاعر، نثر نگار اور معلم کی حیثیت سے شعر و ادب اور تعلیم کے میدان میں سرگرم ہیں۔

ادب تاریخ کی نہ صرف ایک معتبر دستاویز ہوتا ہے بلکہ سماج کی برائیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کا ایک ذریعہ بھی اور انسانیت، شرافت و حمیت کے جذبات کو بیدار کرنے والی صدا بھی۔ سارا جہاں ہمارا دراصل اسی صدا کی بازگشت ہے۔

سلیم فاروقی کی یہ تیسری کتاب ہے، قوم اور زبان کے بچوں کے لیے ایک علم دوست و درد مند کا تحفہ۔ تحفہ اس لیے کہ "بڑے ادیب" اور "بڑے شاعر" بچوں کے ادب کو کچھ خاطر میں کم ہی لاتے ہیں۔ سلیم فاروقی کو اس حقیقت کا ادراک ہے کہ اگر بچپن ہی سے ذہن کو حق گوئی و بیباکی، بے خوفی اور سرفروشی کی تعلیم نہ دی جائے تو کوئی قوم سرخروئی و ترقی کی منزلیں سر نہیں کرسکتی۔ اس مجموعے میں 'سارا جہاں ہمارا' میں سات ڈرامے ہیں۔ محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، صلاح الدین ایوبی اور ٹیپو سلطان وغیرہ جیسی عظیم شخصیات کے کارناموں کا ان میں ذکر ہے۔ ڈرامے چونکہ نوخیز اذہان کے لیے لکھے گئے ہیں اس لیے کہانی کو سادہ اور عام فہم رکھنے کی شعوری کوشش ہے۔ تکنیکی اعتبار سے یہ ڈرامے بے شک شاہکار نہ قرار پائیں مگر یہ بچوں کے ذہنوں پر ایسے نقوش ضرور چھوڑ جائیں گے جو انھیں سیدھی راہ کے انتخاب اور اس پر چلنے پر ضرور راکسا دیں گے۔

ڈراموں کا مواد خاصا مستند ہے جس سے فاروقی صاحب کی جانفشانی کا اندازہ بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔

شکیل عادل زادہ (مدیر سب رنگ) نے صحیح کہا ہے۔ "سلیم فاروقی کی اس کتاب میں ہمارے نوواردانِ بساط کے لیے بہت سبق ہے۔ شجاعت کا، ذہانت کا، حق کا، حوصلے کا اور حمیت کا سبق۔"

کھلے خطوط

● سید شہاب الدین دسنوی، تاج منزل، ٹی این بنرجی روڈ۔ پٹنہ، بہار

میری رنگین تصویر تلاش کرکے آپ نے اچھا نہیں کیا۔ ذرا سوچیے تو، اگر اسے وہیں رہنے دیتے تو سو برس کے بعد محققین کو کتنا اچھا مسالہ ہاتھ آجاتا! یہ تصویر کس کی ہے؟ کب لی گئی تھی؟ یہ کسی ادیب، شاعر یا تنقید نگار کی ہے؟ ان کو انتقال کیے ہوئے کتنے سال ہوئے؟ ان کے ادبی، سیاسی ثقافتی کارنامے کیا کیا تھے؟ ان کی تحریریں کہاں کہاں شائع ہوئیں؟ ان کے ادبی کارناموں پر ناقدانہ نظر وغیرہ وغیرہ

دیکھیے نا، کتنے موضوعات پر تحقیق کرنے والوں کو آپ نے محروم کر دیا۔ کئی تو اس تحقیق پر پی۔ ایچ۔ ڈی حاصل کر لیتے۔ خیر اب کیا ہو سکتا ہے، تصویر کیا نکل آئی، تیر کمان سے نکل گیا۔

آپ نے "کتاب نما" کے لیے اداریہ لکھنے کی دعوت دی ہے جس کے لیے شکر گزار ہوں لیکن اس وقت میری بصارت اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ اپنا لکھا ہوا پڑھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر کچھ ماہ بعد آپریشن سے بینائی لوٹ آئی تو انشاء اللہ ملکی تعلیم کی صورت حال پر لکھوں گا۔

زکریا صاحب کی کتاب انگریزی میں پڑھ چکا ہوں۔ انھیں میں نے لکھا تھا کہ اللہ میاں نے سلمان رشدی کے گناہ بخش دینے کا فیصلہ کیا تو وہ اس لیے ہوگا کہ اس نے آپ سے یہ کتاب لکھوائی۔

● انور سدید ۲، ۱۷ ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔ ۱۸

عزیز تمنائی صاحب کی زندگی کی نوید ملی۔ میں اپنے غلط ماخذ پر شرمندہ ہوں۔ خدا انھیں زندہ رکھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک مرتبہ منیر نیازی کی وفات کی خبر بھارت کے اخبارات میں چھپ گئی تھی۔ اس کے اوائل میں لاہور میں یہ اطلاع پھیل گئی کہ وارث علوی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ہر ایک کو بتانا پڑا کہ یہ غیر مصدقہ خبر ہے اسے نہ پھیلائیں۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب ادبی دنیا میں "ڈس انفرمیشن" کا سلسلہ بھی چل نکلا ہے جسے چاہیں مار ڈالیں — پچھلے دنوں اظہر جاوید کو یہ خبر ڈاکٹر سلیم اختر نے پہنچائی کہ ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید میں لڑائی ہو گئی ہے۔ بول چال بند اور سلسلۂ تعلق منقطع ہے۔ مشفق خواجہ صاحب نے ہم دونوں کو بتایا کہ وہ لاہور میں جہاں کہیں گئے ہر شخص نے انھیں یہ خبر سنا کر خوشی کا اظہار کیا۔ آغا صاحب نے وضاحت کی کہ یہ ایک طبقے کی دیرینہ خواہش ہے کہ کاش ایسا ہوتا؟۔ اب اس خواہش کو خبر بنا دیا گیا ہے۔

اس بدعت کے خلاف ادیبوں کو قلم اٹھانا چاہیے۔

مشفق خواجہ صاحب نے پبلک کے پُرزور اصرار پر "سخن در سخن" کا سلسلہ پھر شروع کر دیا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ اجالا اب "کتاب نما" کے ذریعہ پورے ہندوستان میں پھیل رہا ہے۔ اس مرتبہ

...ب نما میں غضنفر کے "بھیڑ چال" کے
...ان سے غضب کی کہانی لکھی ہے۔ مجتبیٰ
...ین نے نثار احمد فاروقی کا تعارف باندازِ
...کرایا ہے۔ ان کی شخصیت کے نئے
...شوں تک میری رسائی کرادی ہے۔ مجتبیٰ
...ین کیا باغ و بہار آدمی ہیں کہ مزاح سے
...دل کھلاتے ہیں، طنز کو تلوار نہیں بناتے۔
تحریک ترقی پسند کے بانی رکن احمد علی
...دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں۔ یہاں کسی
...قی پسند کی آنکھ اتنے بڑے حادثے پر
نہیں ہوئی۔ ان سے ہزار اختلاف ہوتا،
...میں یاد کیا جانا چاہیے تھا۔ وہ اردو کے
...بڑے ادیب تھے۔ ادیب میں ہمیشہ زندہ
...ہیں گے۔

...بسمل عارفی، لشن پور حکیم آباد، سمستی پور، بہار

اپریل کے کتاب نما میں یوسف ناظم کے
...لیقی سفر کی نصف صدی" اور "مجتبیٰ حسین کو
...علیکم السلام" ہمارے مزاح لکھنے والوں کے
...یے عبرت کی چیز ہے۔

...وجے دیو سنگھ، نڑول پیسٹ نگروٹا، جموں توی

اپریل ۹۴ء کا اشاریہ جہاں مدیر
...جناب موہن چراغی صاحب کا لکھا ہوا پڑھنے
...کو ملا جس میں انھوں نے جن دو باتوں پر
...کافی زور دیا تھا یا توجہ دلائی تھی۔ ان میں
...ایک وہ لوگ ہیں جن کا "ذہن ماؤف"
ہو چکا ہے۔ دوسرے وہ جن کی زبان "گنگ"
ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ تمام اشاریہ
...میں ایسا لگا جیسے ہم کسی اخبار کا اڈیٹوریل
پڑھ رہے ہیں۔ جو بالکل ایک نئی طرح
کا اشاریہ پڑھنے کو ملا۔ شاہد صاحب
...۱۹۸۷ء کے بعد یہ اشاریہ بھی اپنی نوعیت کا
کا تھا۔ جو موجودہ حالات کی دین لگتا ہے
آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ "کتاب نما"
کا اشاریہ تقریباً چھ سات سال سے
بدستور لکھا جا رہا ہے اور بدلتے ہوئے
حالات کے ساتھ اس میں بھی تبدیلیاں رونما
ہوئی ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ کتاب نما
کا اشاریہ کسی اخبار کے پہلے صفحہ کی مانند
دہشت گردی، مندر، مسجد اور فرقہ وارانہ
فسادات وغیرہ سے ہٹ کر اشاریہ لکھا
جائے یہ تکلیف دہ خبریں تو ہمیں دن بھر
اخباروں اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے
ذریعے سے ہم تک پہنچ ہی جاتی ہیں لہٰذا اشاریہ
کم سے کم اس سے پرے ہو۔

یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ اب بزرگ
ادیبوں کے اظہار خیالات کے علاوہ نئی نسل
کے ادیبوں اور شاعروں کے خیالات بھی
کتاب نما کے اشاریہ میں پڑھنے کو ملیں گے
آج کے زمانے میں بزرگوں کو ہی ہر جگہ مواقع
حاصل ہیں اور نئی نسل کی طرف دھیان
بھی کم ہی دیا جاتا ہے کیوں کہ اس میں وہ
صلاحیتیں کہاں؟ خیر! کتاب نما میں شامل
مضامین، نظمیں، غزلیں، طنز و مزاح اور
جائزے بڑے معلوماتی اور پُر مغز ہوتے ہیں
جن کو پڑھنے سے اکتاہٹ نہیں ہوتی۔
پروفیسر ابو الکلام قاسمی صاحب کا مضمون
بعنوان "ادب میں سہل نگاری کی اہمیت"
کافی اہمیت کا حامل ہے بلکہ حقیقت پر مبنی
ہے۔ ان کا کہنا حق بجانب ہے کہ حالی،
ملٹن اور کالرج کا ذکر سادگی اور سہل نگاری
کے حوالے سے ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں
کہ آج کے دور میں جب ہم تخلیقی عمل پر نظر

ڈالتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشکل پسندی، الجھاؤ اور پیچیدگی کا ہر جگہ غلبہ نظر آتا ہے، وہ قاری اور تخلیق کار کے مابین افہام و تفہیم کی راہ کو ہموار نہیں کرتا۔

● ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی، اردو بازار، دہلی

مئی ۹۴ء کے کتاب نما کے اشاریے میں ڈاکٹر تبسم شمیم نے بڑے مختصر اور جامع انداز میں سچی باتیں کہہ دی ہیں۔ ادب کا تعلق پیٹ سے زیادہ روح و ذہن سے ہوتا ہے اور اب ماحول ہی ایسا بدل چکا ہے کہ روح کے تغذیہ کی طرف کسی کا ذہن ہی نہیں جاتا ترجیحاً تبدیل ہو چکی ہیں۔

تینوں مضامین جاندار ہیں، "مانگے کا اجالا" کی بازآمد پر خامہ بگوش اور آپ دونوں کا شکریہ! یوسف ناظم کی آنکھ کا آپریشن مزا دے گیا۔ "اذان" اچھی کہانی ہے بلکہ ہمارے گرد منڈلاتی ہوئی سچائی ہے۔ اب کچھ "کھلے خطوط" کے تعلق سے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ادبی زبان اور بول چال کی زبان مختلف ہوتی ہے۔ بقول حضرت سیماب اکبرآبادی "ہر زبان کا علمی اور ادبی حصہ عوام کی زبان سے فائق ہوتا ہے۔" لیکن بعض لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ یہ لفظ چونکہ فلاں علاقے میں بولا جاتا ہے اس کو ادب میں بھی استعمال کرنا چاہیے خواہ اردو داں طبقہ کے اکثر افراد سمجھ بھی نہ سکیں یا وہ اس کو اس طرح صحیح سمجھ کر نہ بولتے ہوں۔ ایک صاحب کا اصرار ہے کہ ہم سایہ دار درخت کو جھاڑ درخت لکھیں گے آپ سمجھ نہ سکیں تو یہ آپ کا قصور ہے۔ زیر نظر شمارے میں احمد آزاد صاحب کہتے ہیں کہ جھوٹا کو جوٹھا لکھنا درست ہے کیونکہ یہ لفظ ہندی تحریر اور بول چال میں مستعمل ہے۔ ہم کیوں لکھیں یا بولیں یا درست تسلیم کرلیں جبکہ ہمارے پاس مستقل لفظ موجود ہے جھوٹا اور اسی معنی میں استعمال بھی ہوتا ہے۔ ہندی میں تو میں نے جھوٹھا سنا اور پڑھا بھی ہے فرہنگ آصفیہ میں جھوٹا کے معنی دروغ گو وغیرہ کے علاوہ جھوٹن، پس خوردہ، جھوٹا کوٹا بھی لکھتے ہیں۔ اردو مصادر نامہ صفحہ ۱۶۷ پر اس کے معنی دروغ گو، فریبی پس خوردہ، سنے ہوئے برتن۔ لکھے ہیں۔ "وہاں پر کی زمین" جیسی ترکیب کو فصاحت قبول نہیں کرسکتی۔ بہرحال عوام کی بول چال اور ادب کی زبان ایک تو نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی بات کہانی کے کردار سے کہلوائی بھی جاتی ہے تو اس کا مفہوم قوسین میں لکھ دیا جاتا ہے۔

یوسف ناظم صاحب سے گزارش ہے کہ دوسری آنکھ کا آپریشن بھی (مناسب وقت پر) ڈاکٹر (آنکھوں کی) جب مناسب سمجھیں کروا ڈالیں جس کے تجربات یقیناً مختلف اور ترقی یافتہ ہوں گے۔ اور ان کا بیان کرنا آپ ہی کا حق ہے۔ یہ ندرت کہیں اور کہاں۔

● حنیف ترین، الجدیدہ، عرعر، سعودی عربیہ

خدا نے اس بار پھر حج بیت اللہ کا شرف بخشا اور حج اکبری پورے خشوع و خضوع کے ساتھ مکمل کیا۔ میدان عرفات میں عصر اور مغرب کے درمیان ۹ ذی الحجہ کو دعائیں قبول ہونے کا وقت اور مقام

ہے، یہاں پر آپ کی صحت و تندرستی اور کامیابیوں کے لیے بھی تمام اردو ادب سے وابستہ لوگوں کے لیے دعائے خاص کی اور خدا کی ذات سے امید بھی ہے کہ اس نے میری یہ تمام دعائیں ضرور ضرور سُنی ہیں اور قبول بھی کی ہوں گی۔ آپ کے لیے بطور خاص دعائیں مانگی ہیں خدا قبول فرمائے (آمین)

ایک بار پھر میں محترمی سید ظفر ہاشمی صاحب کو ان کے مضمون "دیکھو احباب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف" کو آپ کے ذریعے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ انھوں نے اس حقیقت کو لفظ عطا کیا ہے جو تمام اردو ادب سے تعلق رکھنے والے طبقے کے ذہنوں میں موجود تھا اور ہے، حقیقت تلخ ہی ہوتی ہے۔ بہر حال اس قسم کے مضمون چھاپنے پر آپ کو ایک بار پھر مبارکباد ــــ

● سید مرتضیٰ حسین بلگرامی، فاطمہ منزل، ڈگی روڈ علی گڑھ

مجتبیٰ حسین کا قلم ہماری شہ رگ کو اس طرح اپنی تحویل میں رکھتا ہے کہ ہم حقیقتاً اس کا احساس تک نہیں کر سکتے۔ ان کے قلم میں سچ بولنے کی صلاحیت، عزم و حوصلہ اور اپنی انا کو برقرار رکھنے کا بھرپور جذبہ ہے ان کی تحریر میں تحریک، ان کے خیال میں نیا پن اور ان کے فکر میں تفکر پوشیدہ رہتا ہے۔ ان کی تحریر میں نقص زبان و بیان کا ہونا ممکن ہے مگر اسلوب، گہرائی، تہذیب، زبان فہمی کا عنصر بہ درجۂ اتم ملتا ہے، اخلاقی، ادبی طرز فکر کی عکاسی بھی ان کے یہاں ملتی ہے۔ اس روشنی میں اگر ہم "کیا اردو پھر گھروں میں" پڑھیں تو ابتدا میں ہمیں مایوسی کا احساس ہوگا مگر جیسے جیسے ان کی تحریر آگے بڑھے گی ہم میں حقیقت، واقفیت اور تفکر کا احساس نمایاں ہوتا ہوا ملے گا۔ اس تاثراتی تحریر میں وہ صرف مزاح نگار ہی نظر نہیں آتے بلکہ ایک مفکر کی صورت میں بھی اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ اور ان کی تحریر کو ہم محض ایک خواب نہیں ایک زندہ حقیقت کا درجہ دے سکتے ہیں لیکن اس تحریر کے ماحصل میں ضروری ہے کہ ہم مل جل کر اردو کی زندگی، اس کی بقا کے اسباب پر عملی قدم اٹھا کر، دوسرے مقامات پر بھی ایسے ہی عملیہ کو راہ دیں تاکہ اردو کی بقا کا کچھ تو ساماں ہو جائے۔ ویسے بھی دکن نے ہمیشہ اردو کی خدمت کی ہے اب بھی اس فریضہ کی انجام دہی کرے۔ تاکہ ہم اس کی تقلید کر کے بقائے زبان کر سکیں ــــ

● ڈاکٹر انوار الاسلام، محلہ خلدہ باغ، الہ آباد

ماہ مئی ۹۴ء کا شمارہ تاخیر سے ملا، بے حد پسند آیا۔ جناب ڈاکٹر قیصر شمیم (مہمان مدیر) کی تحریر ادب عالیہ کی عظمت و افادیت سے متعلق صاف گوئی آج کے اُدبا و شعرا کے لیے تازیانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت خصوصاً اردو تعلیم کے فقدان کے لیے ایک ہمیز بھی ہے۔

عرصہ بعد "کتاب نما" ہم دست ہو کر بامرہ نواز ہوا ہے۔ بیشتر مشمولات قابل قدر ہیں۔ نثری حصہ خوب تر ہے۔ منظومات میں باقر مہدی، نعیم ضیاء الدین بہت پسند آئے، غزلوں میں خصوصاً نسیم عزیزی، شریف قریشی، علین تابش، شاہد نجیب آبادی۔

اگر ترجمہ کردہ کہانی "اذان" کے لیے قاسم ندیم کی پذیرائی نہ کی تو حق تلفی ہوگی ــــ

● عبداللطیف اعظمی ۹۴۳-ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

ماہ نامہ کتاب نما کے تازہ شمارہ بابت ماہ جولائی میں پروفیسر گیان چند جین صاحب کا "اردو کے بزرگ ترین ادیب" کے عنوان سے ایک معلوماتی نوٹ چھپا ہے، جس میں ہندوپاک کے اسّی سالہ ادیبوں کی فہرست درج کی گئی ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ اس کی اہمیت کو فی الحال محسوس نہ کریں۔ مگر ہے یہ کام بہت مفید۔ لیکن اردو کے موجودہ وسائل کے پیش نظر یہ کام اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ فاضل نوٹ نگار نے پاکستانی ادیبوں کو شامل کر کے اپنی مشکل میں اور اضافہ کر لیا ہے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں: "پاکستانی ادیبوں کے بارے میں میرے پاس معتبر معلومات نہیں ہیں"

مجھے افسوس ہے کہ اس مختصر فہرست میں ہندستان کے بعض اہم مصنفین کے نام رہ گئے ہیں۔ مثلاً میرے علم کے مطابق اس وقت بزرگ ترین مصنف مولانا نجم الدین اصلاحی ہیں، جن کا سال پیدائش ۱۸۹۷ء ہے اگرچہ موصوف کی ایک کتاب: انتخابات رباعیات مولانا روم پر اور چار جلدیں مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے مکاتیب پر ہیں مگر چونکہ بیشتر کتابیں مذہبی موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے عین ممکن ہے کہ ان کا نام اور کام فاضل نوٹ نگار کی نظروں سے اوجھل رہا ہو۔ مگر پروفیسر سید وحید الدین صاحب کے بارے میں کیا عذر کیا جا سکتا ہے۔ جن کی تاریخ پیدائش ۹ ستمبر ۱۹۰۹ء ہے اور جنھوں نے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ دہلی یونی ورسٹی اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، ہمدرد نگر، نئی دہلی کے شعبۂ تقابلی مطالعۂ مذاہب کے پروفیسر اور صدر کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب، تاریخ پیدائش: ۱۴ اگست ۱۹۱۳ء، ہنس راج رہبر صاحب تاریخ پیدائش ۹ مارچ ۱۹۱۳ء اور ڈاکٹر سیفی پریمی صاحب تاریخ پیدائش ۲ جنوری ۱۹۱۳ء کے نام لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے اپنی ذات اور اپنی وقیع کتابوں کے ذریعے تعلیم، تخلیق اور تنقید کی قابل لحاظ خدمات انجام دی ہیں۔ طوالت کا خوف نہ ہوتا تو اس مختصر نوٹ کی اور خامیوں پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جاتی۔

مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی

کے پتے میں تبدیلی

مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کا دفتر اور مختلف شعبے پروفیسرز کالونی سے اب اپنی عمارت میں منتقل ہو گئے ہیں۔ نیز ٹیلی فون نمبر بھی بدل گیا ہے، نیا ٹیلی فون نمبر ۵۵۱۶۹۱ ہے جبکہ پتا درج ذیل ہے۔

مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی
اردو اکیڈمی کا بھون
بان گنگا روڈ۔ بھوپال ۴۶۲۰۰۳

آفاق احمد
(سکریٹری اردو اکیڈمی)

ادبی تہذیبی خبریں

معروف شاعر عبداللہ ساجد کی رہائش گاہ واقع سالمیہ میں ۱۸ اپریل کی شب جناب عبدالرزاق پرکار کے اعزاز میں ایک محفل مشاعرہ منعقد کی گئی جس میں کویت کے تقریباً تمام شعرا نے شرکت کی مشاعرے کی صدارت کویت ٹائمز اردو کے اڈیٹر جناب سعید صفدر نے کی جب کہ مہمان خصوصی جناب عبدالرزاق پرکار تھے جو جنوبی افریقہ سے مختصر قیام کے لیے کویت آئے ہیں اور وہاں فروغ اردو کے فعال کارکنوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

دائیں سے بائیں :- ایوب کرجیکر۔ عبداللہ ساجد، عبدالقادر جوگلیکر، خورشید ضیاء، مہمان خصوصی عبدالرزاق پرکار، صدر مشاعرہ سعید صفدر اور نور پرکار ....

عبدالمجید پروانہ کی غزل سے مشاعرے کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

ٹوٹ گیا جو جڑ نہ سکے گا
دل ہے یہ کوئی جام نہیں ہے

نظامت عنبر فتحپوری کے سپرد تھی لیکن انھیں روایتاً پہلے پڑھنا پڑا۔ انھوں نے خوبصورت غزل کہی:

میں نہ پاگل ہوں نہ دیوانہ ہوں اے دوست
یہ اگر تم نے کہا ہے تو کوئی بات نہیں

ایوب تاسم کرجیکر

دوست ہر موڑ پر اس کو ملنے گئے
مجھ سے کہتا گیا موت سے کھیلنا!

تسلیم اکبر شاہ پنجابی میں کہتے ہیں، دوستوں کی فرمائش پر انھوں نے ایک قطعہ اردو میں بھی پیش کیا۔

افتخار امتیازی

بلا سے بات نہ مانے مگر سُنے تو سہی
وہ مہرباں نہ سہی مہرباں لگے تو سہی

محمد علی وفا

ایک مشت خاک جسم کی اور اس قدر غرور
بکھرے تو دیکھ لینا نظر تک نہ آ سکے گی

اور

ایک ہلکے سے تبسم نے لیا کتنا خراج!
خشک ہو جائے مرا دیدۂ تر تو بولوں

مسرور عابدی

کچھ ہم نے تجھے اے دل، بانٹا نہیں ٹکڑوں میں
املا کا تقاضا ہے ہر حرف جدا لکھنا
کیا میری کمی تم کو محسوس نہیں ہوتی
مکتوب تمنا میں تفصیل ذرا لکھنا

احمد علی عمر خان

انسان ہے اختیار کے دوراہے پر کھڑا
بس جانچ لے بہشت ہے کیا اور کنشت ہے کیا

رشید میواتی :

دیتی ہے داد منزل مقصود بھی جنھیں
تم خود کو ان کی گرد سفر تک ہی لے چلو

خورشید ضیا

ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر افسردہ کیوں ہیں آپ
میرے لہو سے سیجیے گلفام انگلیاں

کمال اظہر

ظلم کے دور میں کس طرح جیا جاتا ہے
میں ہوں فنکار، میں جینے کا ہنر رکھتا ہوں

بدر منیر

کس قدر ہوتی انسانیت کی آبرو
حق جس کو نہ مل سکے گا کربلاؤں کی طرح

نعیم اقبال راہی

ہے وفا کا صلہ بس پہلوار پر اب چڑھا دیجیے
اب اندھیرے ہی راس آگئے روشنی کو بجھا دیجیے

حامد کرتارپوری

اک جنبش قلم سے کئی سر قلم ہوئے
دنیا میں کتنے فیصلے ایسے رقم ہوئے

میزبان شاعر عبداللہ ساجد

وسوسوں کی یورشوں سے گھر گئی کم علم سے
زندگی پاگل ہوئی جب آگہی تک آگئی!

فرید قریشی اکبرآبادی

دل کو جلنے کا فقط مجھ کو گماں ہوتا ہے
اس کا احساس زمانے کو کہاں ہوتا ہے

اور

تیری یادوں کا زہر پینے سے
اشک ابھرے ہیں آبگینے میں

مسرت جبیں زیبا

پیٹ بھرتے بھرتے کیسے کا وہ ڈھانچہ بن گیا
آج کے مزدور کو تو گھر گرہستی کھا گئی

اور

شو بزنس میں نقلی بھی سونے کے کڑے بن جاتے ہیں
اونچی ایڑی پہن کے بھی کچھ لوگ بڑے بن جاتے ہیں

نور پرکار نظم کے نمائندہ شاعر تو ہیں ہی، کویت میں نظم کے اکلوتے شاعر بھی ہیں اس نشست میں نظم صرف انھوں نے ہی پڑھی جو محبت سے سنی گئی اور سلیقے سے داد دی گئی نظم میں معنویت کے ساتھ ساتھ اس کی غنائیت پر توجہ رکھنا کاریگری کی علامت ہے۔ نظم کے ان دونوں پہلوؤں پر نور پرکار کی دسترس ان کی نظم کے ایک بند میں ملاحظہ کیجیے۔

میری بات تم بھی سنو!
کبھی تو دل کو لبیک کہنے دو
کوئی صدا تو سننے دو
تمہارے ہونٹوں کا بے معنی تبسم
بند لبوں کی خاموش غزل ہے
میری نظموں کے بولتے مصرعے
تیری خمدار آبرو کا اثر ہے

صدر مشاعرہ جناب سعید صفدر نے معاشرے میں شاعروں اور ادیبوں کی اہمیت اور لفظ کی حرمت اور حفاظت کے حوالے سے بڑی مفید گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ دور حاضر میں لفظ سے طعنہ زنی کا کام لیا جانے لگا ہے لیکن اہل علم اس کی حرمت و آبرو کی علامت ہیں انھوں نے مشاعرے کے انعقاد پر منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔

آخر میں مہمان خصوصی جناب عبدالرزاق پرکار نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس یادگاری محفل کو فراموش نہ کر سکیں گے۔ انھوں نے جنوبی افریقہ کے شہر کیپ ٹاؤن میں بزم ادب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ ادبی تنظیم سید حسن، عبداللہ پرکار اور ابراہیم دلوی کی قیادت میں تعمیر ادب پر مامور ہے جو مشاعروں کے علاوہ شعرا کی کتب کی اشاعت کا اہتمام بھی کرتی ہے۔ تقریب کے اختتام پر کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ عبداللہ ساجد اس منظم تقریب کے انعقاد پر داد کے مستحق ہیں۔

(رپورٹ) منیر فراز

شعبہ اردو کوئم پو یونی ورسٹی میں عبدالماجد دریابادی پر سمینار

شیموگہ: بروز ہفتہ بتاریخ ۲۵ رجون ۱۹۹۴ء شعبہ اردو کوئم پو یونی ورسٹی کے زیر اہتمام "عبدالماجد دریابادی" کے موضوع پر ایک سمینار منعقد ہوا۔ سمینار کی صدارت جناب ڈاکٹر حنیف سیف ہاشمی صدر شعبہ اردو کوئم پو یونی ورسٹی نے کی۔ سمینار کا آغاز جواں سال شاعر جناب انور خاں انور کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ جناب سید اقبال احمد نائب صدر بزم ادب نے شرکائے مجلس مذاکرہ کا پرجوش استقبال کیا۔ بعد ازاں محترمہ صبیحہ بانو متعلمہ ایم اے سال اول نے "عبدالماجد دریابادی" کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ مقالہ زیربحث کی پیش کش کے بعد مباحثہ کا آغاز ہوا جس میں جمیع شرکاء سمینار اساتذہ اور طلبائے اردو نے اپنے اپنے زاویے سے حصہ لیا۔ جناب شبیر احمد خاں لکچرر نے موضوع زیربحث پر اظہار خیال کیا اور مقالہ نگار طالبہ محترمہ صبیحہ بانو کو اپنی داد و تبریک سے نوازا۔ جناب سید شہاب الدین روشن لکچرر نے مقالہ نگار کو مبارک باد دی اور کہا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کثیرالجہت شخصیت کا نام ہے جنھوں نے ادب کے مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے لیکن اردو کی صنف انشائیہ پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دی ہے اور اس فن کو آگے بڑھایا ہے۔ صدر مجلس مذاکرہ جناب ڈاکٹر حنیف سیف ہاشمی نے عبدالماجد دریابادی کی خدمات ادب پر مکمل کر روشنی ڈالی اور کہا کہ مولانا عبدالماجد کے انشائیے کافی حد تک مقبول ہوتے ہیں اور آج اردو ادب میں ان کا خاص مقام ہے لیکن ہمارے عصر میں اردو انشائیے لکھنے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا نام سر فہرست ہے۔

تبسم فاطمہ (سکریٹری مجلس مذاکرہ)

گورنر اڑیسہ کے ہاتھوں سے اردو اکاڈمی ایوارڈ کی تقسیم

۱۲ رجولائی ۱۹۹۴ء کو اڑیسہ اردو اکادمی کی جانب سے ہر سال کی طرح امسال بھی جشن تقسیم ایوارڈ سوچنا بھون بھونیشور میں انعقاد پذیر ہوا۔ جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے عزت مآب بی ستیہ نرائن ریڈی گورنر اڑیسہ نے شرکت فرمائی۔ اکادمی کے صدر نشین عالی جناب جگنیشور پرساد ماجھی وزیر برائے اعلا تعلیم اور تہذیب و ثقافت نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔ مہمان اعزازی کے طور پر محکمہ تہذیب و ثقافت کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سمیر لیندر مہانتی نے شرکت کی۔

مہمان خصوصی کے دست مبارک سے اڑیسہ کے تین قابل قدر اور معتبر شعرا کو ایوارڈ دینے کی رسم ادا کی گئی۔ جناب ساجد اختر کو ان کے مجموعہ کلام "دو کرنوں کی چادر" پر اور سید شکیل دسنوی کو ان کے مجموعہ کلام "تنہا تنہا" کے لیے نیز مرحوم سید محمد راشد شبنم کو ان کی جملہ شعری اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک ایک شال، سند اعزاز اور نقد دس ہزار روپے سے نوازا گیا۔

سکریٹری اردو اکادمی سید منظور احمد قاسمی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے مہمان خصوصی کا بھرپور تعارف پیش کیا۔ نیز وزیر موصوف اور ڈاکٹر کے مخلصانہ اور بھرپور تعاون کا بھی ذکر کیا ساتھ ہی دونوں سے اکادمی کو مزید فعال بنانے اور معاشی اعتبار سے ترقی دینے کی درخواست بھی کی۔

مہمان اعزازی نے اکادمی کی گزشتہ سات سالہ کارگزاری کا مفصل جائزہ پیش کیا اور انھوں نے اکادمی کے مالی تعاون سے چل رہے آٹھ اردو تعلیمی مراکز کی منفعت بخش کار نمایاں کو قابل فخر بتایا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ اردو کسی

خاص فرقے تک محدود نہیں رہنی چاہیے۔ اسی نظریہ کے تحت ہم نے اردو تعلیمی مراکز قائم کیے ہیں اور ہم اڑیا زبان بولنے والوں تک اردو کو پہنچا رہے ہیں۔ جس کا بہتر نتیجہ آئندہ ضرور برآمد ہوگا۔

مہمان خصوصی فضیلت مآب بی ستیہ نارائن ریڈی جی نے اپنی پُر مغز تقریر دلپذیر میں اردو کو خالص ہندستانی دِلّی لکھنؤ اور حیدرآباد کی گلیوں میں پل کر جوان ہونے والی زبان قرار دیتے ہوئے مزید کہا کہ کچھ متعصب اور معاندین اردو کو ایک فرقے یا مذہب کی جانب منسوب کرتے ہیں جو سراسر زیادتی اور فرقہ پرستی پر مبنی ہے۔ ایسی باتوں سے ہمیں دل برداشتہ یا گمراہ نہیں ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ جنگ آزادی میں جب انھیں قید و بند کی سزا دی گئی تھی تو وہ ایک اردو کا اخبار جیل میں اپنی ادارت میں نکالا کرتے تھے جس کا نام 'پیام نو' تھا۔ انھوں نے مزید یاد دلایا کہ زبان کوئی بھی ہو اس کا تعلق براہ راست کسی مذہب سے نہیں ہوتا اس لیے زیادہ سے زیادہ زبانیں سیکھنی چاہئیں۔ آخر میں تمام ایوارڈ یافتگان کو مبارک باد پیش کی اور اکادمی کو اپنی نیک خواہشات پیش کیں۔

آخر میں اکادمی اور جشن کے صدر نشین عالی جناب جینینہ پرشاد ماتھمی نے اپنے صدارتی خطبے میں اکادمی کی گزشتہ کارگزاری کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے مستقبل کے پروگراموں کا اعلان بھی کیا۔ نیز اکادمی کی عمدہ کارکردگی بڑے پیمانے کا اعلان بھی کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی حکومت اکادمی کو ہر ممکن ترقی دینے کے لیے ہر وقت تیار ہے۔ اس سے قبل ہی اکادمی کے کسی کام میں انھوں نے کبھی پس و پیش نہیں کی ہے اپنی مکمل اعانت کی یقین دہانی کراتے ہوئے انھوں نے اپنی تقریر ختم کی

سکریٹری اردو اکاڈمی کے شکریہ کے ساتھ جشن تقسیم ایوارڈ کا اختتام ہوا اور مشاعرے کے آغاز کا اعلان ہوا۔ اڑیسہ اردو اکادمی نے حسب روایات کل اڑیسہ اردو رائٹرس کانفرنس و مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ کانفرنس کا افتتاح لیڈر کارپوریشن کے چیرمین جناب حسین ربی گاندھی نے کی اور صدارت بھی انھوں نے ہی فرمائی۔ مشاعرے کی صدارت جناب ساجد اثر نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض فرزان سینی نے انجام دیے۔ اڑیسہ کے مایہ ناز ادبا و شعرا نے اپنے مقالوں، نظموں اور غزلوں سے کانفرنس اور مشاعرے کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔

علامہ اقبال ادبی مرکز بھوپال

بھوپال۔ علامہ اقبال ادبی مرکز کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ترقی اردو بورڈ کے وائس چیرمین جناب عزیز قریشی نے کہا کہ دور حاضر میں اقبال کی معنویت اور محاسن کلام پر نئے سرے سے کام ہونا چاہیے۔ آپ نے یہ خوش خبری بھی سنائی کہ انسانی وسائل کے فروغ کے مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ کی منظوری سے اسپین میں منعقد ہونے والے سمینار کے انداز پر ہندستان میں بھی ایک عالمی سمینار اقبال پر ہوگا۔

اس جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اختر سعید خاں نے اس بات پر زور دیا کہ اقبال کے فکر و فلسفہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ان کی تخلیقی انفرادیت اور جمالیاتی تجربوں کو اہمیت دے کر ان پر کام ہونا چاہیے آپ نے بھوپال سے علامہ کی نسبت کا بھی ذکر کیا۔

عاشق اقبال جناب ممنون حسن خاں نے اپنے مقالہ میں اقبال کی معجز بیانی کو یقین محکم اور عمل پیہم کی قوتوں کا مظہر قرار دیتے ہوئے کہا کہ اقبال کے

کلام میں درد کی لازوال کسک، آرزو کے نایاب اور بلا کا خلوص ہے۔ آپ نے کلام اقبال کے مختلف ادوار پر بھی روشنی ڈالی۔

اقبال ادبی مرکز کے سکریٹری پروفیسر آفاق احمد نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اقبال کے ترانہ ہندی کو دس سال بعد ایک صدی ہو جائے گی۔ ہمیں اس کی تقریب مناکر اقبال کو یاد کرنا چاہیے۔

اردو اکیڈمی کے آراستہ ہال میں منعقد اس نشست میں بڑی تعداد میں ادیب شاعر، دانشور اور ممتاز سیاسی و سماجی شخصیات نے شرکت کی۔

شہبازیہ ادبی کونسل کا قیام

صوبائی بہار کی مشہور و معروف قدیم خانقاہ شہبازیہ میں علم و ادب کے فروغ و ارتقا کے اعلا مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے بتاریخ ۲۰ مارچ ۱۹۹۴ء کو "شہبازیہ ادبی کونسل" کا قیام عمل میں آیا۔ اس موقع پر کونسل کے ذریعہ ایک اہم ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت کونسل کے سرپرست اعلیٰحضرت مولانا سید شاہ مصطفی العالم صاحب نے فرمائی۔ جو آستانہ عالیہ شہبازیہ کے سجادہ نشین ہیں۔ کونسل کے چیرمین ڈاکٹر ڈائرکٹر پروفیسر سید محمد رافق صاحب شعبہ طبعیات مارواڑی کالج بھاگلپور اور ڈائرکٹر جناب سید محمد تائق صاحب ہیں۔ مجلس مشاورت کی اہم ہستیاں نواب سید ارشاد حسین زیدی صاحب، ڈائرکٹر پروفیسر لطف الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر مسعود احمد صاحب، ڈاکٹر شاداب رضی صاحب، جناب شبیر احمد بلند اختر، جناب شوکت علی انجم، جناب سید یونس حسین صاحب، جناب سید احمد وارثی صاحب (انجینیر) اور سید دلدار علی ہاشمی (ایڈوکیٹ) وغیرہ ہیں۔

سید کاظم رضا (ایڈوکیٹ)
ڈائرکٹر شعبہ نشر و اشاعت

لسانی اقلیتوں کے تعلیمی مسائل پر مذاکرات

(جی۔ ڈی۔ چندن)

نئی دہلی۔ پریس کانفرنسوں میں عام طور پر کوئی سربراہ یا ممتاز شخص اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اور صحیفہ نگاروں کے سوالات کے جوابات دیتا ہے۔ لیکن ۲۲ جون کو لسانی اقلیتوں کے ڈپٹی کمشنر ڈاکٹر بی۔ آر۔ رضوی نے یہاں اپنی کانفرنس میں ایک مختلف انداز اختیار کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس کانفرنس میں آنے والوں سے لسانی اقلیتوں کے چیدہ چیدہ لسانی مسائل سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مزید کہا کہ وہ دہلی کی مختلف لسانی اقلیتوں کی شکایات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ابتدا میں خود ہی کہا کہ قومی آئین میں ملک کی لسانی اقلیتوں کے لیے جو تحفظات دیے گئے ہیں وہ ان کی حفاظت کے لیے حکومت ہند کو صرف سفارشات کر سکتے ہیں۔ ان کی ادائیگی میں ہونے والی کوتاہیوں اور خلاف ورزیوں کا انسداد نہیں کر سکتے کیوں کہ ان کے ادارے کے پاس کوئی عاملانہ یا تعزیری اختیارات نہیں ہیں۔

کانفرنس میں دہلی کی لسانی اقلیتوں کی ترجمانی پنجابی لینگویجز ٹیچرز ایسوسی ایشن انجمن ترقی اردو، اور اردو اکادمی کے سربراہوں نے کی۔ تینوں انجمنوں کے نمائندوں نے اپنی اپنی زبانوں کے بارے میں تقریباً ایک سی باتیں کہیں اور بتایا کہ اردو اور پنجابی میڈیم اسکولوں کے نتائج حکومت دہلی کے حکام کے غیر معاون رویہ کی وجہ سے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ ان اسکولوں کے طلبا کو درسی کتابیں وقت پر اور پوری طرح میسر نہیں آتیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتابیں یا تو چھپوائی ہی نہیں جاتیں یا اپنی ضرورت کے وقت پر نہیں چھپتیں۔

انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم

نے کہا کہ اردو میڈیم اسکولوں کے مختلف مضامین کے لیے تقریباً ایک سو درسی کتابیں درکار ہیں لیکن ان میں سے صرف ۲۷ میسر آتیں اور ان میں سے بھی دس کتابیں تقریباً بارہ سال پرانی اور فرسودہ تھیں انھوں نے کہا کہ بے توجہی کی اس پالیسی میں جانبداری اور امتیازی روش کارفرما ہے اور اس کا ایک اثر یہ ہو رہا ہے کہ مسلمان اور سکھ طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی مادری زبان کی کتابیں اس لیے میسر نہیں آتیں کیوں کہ وہ ایک خاص مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر انجم نے یہ مطالبہ کیا کہ اردو، پنجابی اور دیگر اقلیتی زبانوں کے میڈیم کے اسکولوں کے مسائل اور بالخصوص ان کے امتحانی نتائج کی گراوٹ کے اسباب معلوم کرنے کے لیے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جانی چاہیے جو ان اسباب کے تدارک کی تدبیریں بھی پیش کرے۔

اردو اکادمی کے جنرل سکریٹری جناب زبیر رضوی نے بتایا کہ حکومت دہلی کے محکمہ تعلیم کے حکام ٹیچروں کی خالی اسامیوں کو پُر کرنے کے لیے اشتہارات میں یہ واضح نہیں کرتے کہ انھیں اپنی مجموعی تعداد میں کتنے اردو ٹیچر درکار ہیں۔ موصوف نے کہا کہ مختلف اداروں نے اردو میڈیم اسکولوں کے لیے ۲۷۷ خالی اسامیوں کی اطلاع دی تھی۔ لیکن حکومت دہلی کے اشتہار میں اردو ٹیچروں کی تعداد کا کوئی ذکر نہ کیا گیا۔ اس باب میں اکثر حکام چند مسلمان ٹیچروں کی بھرتی کو اردو ٹیچروں کی ضرورت کی تکمیل تصور کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ہر مسلمان ٹیچر اردو زبان کا معلم نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ ٹیچروں کی تنخواہوں کے اسکیل بھی اصلاح طلب ہیں۔ واقعات یہ ہیں کہ ایک پوسٹ گریجویٹ ٹیچر کو آٹھ سو روپے ماہانہ ملتے ہیں جب کہ غیر ہنرمند مزدور اور بہشتی کو بھی ۲۹ روپے یومیہ ادا کیے جاتے ہیں۔ موصوف نے کہا کہ آئین اور حکومت کی قراردادوں میں لسانی اقلیتوں کے لیے خاطر خواہ گنجائشیں ہیں لیکن بعض حکام انھیں عملی جامہ پہنانے میں صریحاً کوتاہی اور پہلوتہی کرتے ہیں۔ پنجابی لینگویج ٹیچرز ایسوسی ایشن کے صدر سردار تیرتھ سنگھ اور جنرل سکریٹری سردار گورچرن سنگھ نے بتایا کہ وہ پچھلے تین چار سال سے دہلی ایڈمنسٹریشن کو پنجابی ٹیچروں کی خالی آسامیوں اور دیگر ضرورتوں سے مطلع کر رہے ہیں لیکن ان کے مسائل کو مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے ڈپٹی کمشنر موصوف سے کہا کہ وہ کبھی کبھی لسانی اسکولوں کا دورہ کریں اور حقیقی حالات کو بچشم خود دیکھیں۔

کانفرنس میں حکومت دہلی کے ایک انڈر سکریٹری جناب موہن سنگھ کفادت بھی آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر رضوی نے ان سے کہا کہ وہ اپنی رپورٹ میں اس کانفرنس میں بیان کی گئی شکایتوں اور اعتراضات کو اپنی حکومت کو پیش کریں۔ انھوں نے ڈاکٹر خلیق انجم سے اتفاق کیا کہ اگر لسانی اقلیتوں کے حکام سے انصاف نہ ملا تو متاثرہ طبقوں کو عدالت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

ہنسراج رہبر چل بسے

نئی دہلی ۲۳ جولائی۔ ممتاز ترقی پسند ادیب و مفکر مجاہد آزادی اور شہید بھگت سنگھ کے قریبی ساتھی ہنسراج رہبر کا آج صبح انتقال ہو گیا۔ وہ ۸۱ برس کے تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا اور ۴ بیٹیاں ہیں۔

مارکسزم کے زبردست حامی اور مفسر اور غالب بے نقاب اور گاندھی بے نقاب اور نہرو بے نقاب جیسی متنازعہ کتابوں کے مصنف ہنسراج رہبر عمر کے آخری دنوں میں بھی کافی سرگرم تھے۔ وہ ان دنوں اپنی سوانح عمری تحریر کرنے میں مصروف تھے۔ [illegible]

کے نام سے اس سوانح عمری کے نام سے تین حصے شائع ہو چکے ہیں۔

مسٹر ہنسراج رہبر کی پیدائش ۹ رمارچ ۱۹۱۳ء کو پنجاب کے سنگرور ضلع میں ہوئی تھی۔ وہ افسانہ نگار ناول نگار، سوانح نگار، تنقید نگار کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ ان کے ۱۵ ناول، ۲۰ افسانوں کے مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے کئی تنقیدی اور دیگر مضامین بھی مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے پریم چند کی زندگی اور کارنامہ" اور پرگتی واد کا پیر مولیا نکن (دونوں ہندی میں) ان کی بیش قیمت تخلیقات ہیں۔ (قومی آواز)

مونس رضا کا امریکہ میں انتقال

نئی دہلی ۱۹ رجولائی۔ دہلی یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر، ماہر تعلیم اور عالمی سطح کے جغرافیہ داں پروفیسر مونس رضا کا طویل علالت کے بعد کل امریکہ میں بوسٹن میں انتقال ہوگیا۔ یہ اطلاع آج جہاں ان کے قریبی رشتہ داروں نے دی۔ وہ ۶۹ برس کے تھے۔ پسماندگان میں ان کی اہلیہ، ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہیں۔ مرحوم گزشتہ دو برس سے زیادہ سے بستر علالت پر تھے اور سانس کی مستقل تکلیف میں مبتلا تھے۔ کافی عرصے سے وہ نئی دہلی کے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں داخل رہے۔ جہاں سے وہ علاج کے لیے امریکا گئے امریکہ میں ان کا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ مونس رضا کی اہلیہ مسز شبنہلا اندرا گاندھی اوپن یونی ورسٹی میں ریڈر ہیں۔

چھٹی دہائی کے اواخر میں دہلی یونی ورسٹی کے قیام میں انھوں نے سرگرم حصہ لیا۔ اور یونی ورسٹی کے بانی کہلائے۔ عرصے تک وہ جے۔ این۔ یو کے ریکٹر رہے۔ بعد میں مرحوم دہلی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور ۵ برس کی مدت انتہائی خوش اسلوبی سے پوری کی۔ وہ انڈین کونسل آف سوشل سائنس ریسرچ کے چیرمین اور "نیپا" کے سربراہ رہے۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں آمد سے قبل وہ کشمیر انجینیرنگ کالج کے پرنسپل کے عہدہ پر بھی فائز رہے تھے۔ اس سے پہلے پروفیسر مونس رضا نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ جغرافیہ میں درس و تدریس کا کام انجام دیا۔ مرحوم ہندستانی ماہرین جغرافیہ کی قومی تنظیم کے بھی صدر تھے۔

پروفیسر مونس رضا نے پوری زندگی تعلیمی سرگرمیوں میں گزاری اور ہمیشہ زندہ دل رہے۔ اس کا اندازہ اسی سے لگایا جاتا ہے کہ گزشتہ ۳۰ برس سے زیادہ عرصے سے وہ ایک گردہ پر زندہ رہے اور کبھی بیماری سے مایوس نہیں ہوئے۔ وہ عمر بھر متعدد تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے اور ہر جگہ اپنے رفقا کے درمیان یکساں مقبول رہے۔

پروفیسر رضا ۲ رفروری ۱۹۲۵ء کو اتر پردیش میں غازی پور ضلع کے ایک گانو میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے گانو کے اسکول میں حاصل کی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے گانو کے اسکول میں ٹاٹ پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کی ہے اور اس پر مجھے فخر ہے"۔ ممتاز مصنف اور سرکردہ علمی شخصیت ڈاکٹر معصوم رضا اور پروفیسر مہدی رضا مرحوم کے بھائی تھے۔ معصوم رضا کا حال ہی میں انتقال ہوا۔ ادارہ مکتبہ جامعہ مرحوم کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی

ستمبر ۱۹۹۴ء جلد ۳۴ شمارہ ۹

فی پرچہ	6/=
سالانہ	55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	320/=

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج (خطبہ) ڈاکٹر سید ظہور قاسم ۱۰/-

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم (خطبہ سیرت) پروفیسر اختر الواسع ۶/-

تاریخ نگاری قدیم وجدید رجحانات (تاریخ) ڈاکٹر سید جمال الدین ۱۵/-

معرکۂ دین وسیاست (مذہب) نعیم صدیقی ۲۵/-

رہبر عالم (سیرت) الحاج آفتاب احمد ۲/-

شافع الخلائق (وظائف) مولوی عبدالستار صدیقی ۱۵/-

فتاویٰ رشیدیہ بطرز جدید مولانا رشید احمد گنگوہی ۱۰/-

مٹی موسم رنگ (شعری مجموعہ) مشتاق علی شاہد ۵۰/-

کلیات بیتاب " مرتب آفتاب احمد بدایونی ۵۰/-

کلیات گوپال متل " ترتیب پریم گوپال متل ۱۲۵/-

دہلیز پہ اتری شام " منصور سبزواری ۸۰/-

دیوار و در کے درمیان " مخمور سعیدی ۱۰۰/-

رفیع احمد قدوائی (سوانح) مرتبہ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی ۴۰/-

حسرت موہانی " " ڈاکٹر خلیق انجم ۵۰/-

اردو صحافت ترجمہ وادارت (صحافت) سید ضیاء اللہ ۸۰/-

راج بہادر گوڑ (حیات اور ادبی کارنامے) (شخصیتی مضامین) مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۶۰/-

سدا بہار پھول (افسانے) ویدراج گونیجہ ایم۔اے ۵۰/-

گلوں میں رنگ بھرے " سنت پرکاش سنگر ۷۵/-

مافیا (ناول) ایم۔اے راحت ۳۵

یادش بخیر " آمنہ ابوالحسن ۱۵۰/-

ڈار سے بچھڑے (افسانے) سید محمد اشرف ۱۰۰/-

فائر ایریا (ناول) الیاس احمد گدی ۱۵۰/-

خراشیں (افسانے) شہناز فاطمہ رشید ۶۰/-

سرورق: بیرسٹر جگدیش چندر بترا

مکتبہ جامعہ کی نئی مطبوعات

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج

ڈاکٹر سید ظہور قاسم

یہ ڈاکٹر سید ظہور قاسم کے اُن خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے دہلی یونی ورسٹی کے "نظام اردو خطبات" کے تحت دیے تھے۔ موصوف کا تحقیقی میدان بحریات ہے آپ بحر منجمد کی ملکی مہم کے پہلے میر کارواں ہیں ان خطبات میں اس پُراسرار ارضی حصّے کی دلچسپ داستاں بھی ہے اور سائنس کے مختلف شعبوں میں بہ تدریج ترقیوں کا تجزیہ بھی۔

قیمت۔ دس روپے

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم

پروفیسر اختر الواسع

پروفیسر اختر الواسع نے ۱۰ جون ۱۹۹۱ء کو انجمن اسلام بمبئی کی دعوت پر "معین الدین حارث یادگاری سیرت لیکچر" کے سلسلے میں مندرجہ بالا عنوان کے تحت جو خطبہ پیش کیا تھا۔ اسے اب کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ خطبہ معروضی بھی تھا اور پُر از معلومات بھی۔ اس خطبے کو بمبئی کے اہل علم نے بہت پسند کیا تھا۔

قیمت۔ دس روپے

تاریخ نگاری۔ قدیم وجدید رجحانات

ڈاکٹر سید جمال الدین

اردو میں فن تاریخ نگاری پر بہت کم لکھا گیا ہے زیر نظر کتاب میں اردو کے قاری کو ۹ بلند پایہ مؤرخین اور ان کے فن تاریخ نگاری سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ان میں یونان، عرب، جرمنی برطانیہ اور ہندستان کے مؤرخین شامل ہیں۔

قیمت ۱۵/- روپے

مہمان مدیر
بیرسٹر جگدیش چندر بترہ
اڈیٹر سرائیکی انٹرنیشنل
جیون وہار ۳، پارلیمنٹ اسٹریٹ
نئی دہلی ۱

اشاریہ

سرائیکی اور اردو

دھلی میں ایک ادارہ سرائیکی ساھتیہ سدن ھے پروفیسر گوپی چند نارنگ اس کے صدر ھیں اور سکریٹری جنرل جے، سی، بترا ھیں۔ بترا صاحب سرائیکی انٹرنیشنل کے اڈیٹر بھی ھیں۔ (بدقسمتی سے یہ رسالہ ھم کو آج تک دیکھنے کو نہیں ملا) زیر نظر اداریہ موصوف کی اپنی زبان، سرائیکی سے بے پناہ محبت کا ثبوت ھے ھم اُن کے اس جذبے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ھیں۔ اس اداریے کو ھم نے کئی مرتبہ پڑھا ھر بار ایسا محسوس ھوا ھے کہ اس میں کچھ باتیں ایسی ھیں جن سے اختلاف ھوسکتا ھے لیکن سابقہ اھم اداریوں کی طرح ھم اس اداریے کے لیے بھی اپنی رائے دینا مناسب نہیں سمجھتے۔ ھم حسبِ سابق اسے بھی قارئینِ کتاب نما اور "ماھرانِ لسانیات" کی گرانقدر رائے حاصل کرنے کے لیے پیش کر رھے ھیں۔

(ادارہ)

سرائیکی برِ صغیر کی سب سے پُرانی اور زندہ زبان ہے۔ اردو اسی خطّہ کی سب سے نئی اور جوان زبان ہے۔ یہ دونوں زبانیں عام لوگوں کی زبانیں ہیں اور کسی خاص مذہب فرقہ یا قوم سے وابستہ نہیں ہیں۔ سرائیکی کو اگر اردو کی ماں، اور اردو کو سرائیکی کی بیٹی بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ لیکن جب بیٹی جوان ہو جاتی ہے تو لوگ ماں کی طرف کم اور بیٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں۔

محمود شیرانی کی تحقیقات کے مطابق محمود غزنوی کی آمد پر فارسی زبان کا سرائیکی سے

جو تعلق پیدا ہوا اسی سے اردو کا جنم ہوا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اپنی صرف و نحو میں سرائیکی سے بہت قریب ہے اور اسی طرح سرائیکی اور اردو کا بہت قدیمی اور قریب کا رشتہ ہے دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد، افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں۔ دونوں کا رسم الخط فارسی سے مستعار ہے۔

سرائیکی سنٹرل پاکستان میں ملتان۔ مظفر گڑھ۔ میانوالی۔ جھنگ۔ سرگودھا۔ جہلم۔ ڈیرہ غازی خان۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان۔ بنوں۔ کوہاٹ۔ راجن پور۔ ستیہ۔ کوٹ ادو۔ بہاول پور، رحیم یار خان۔ جیکباد۔ لاڑکانہ وغیرہ ضلعوں کی زبان ہے اور یہاں آباد چار کروڑ لوگوں کی مادری زبان ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے وقت ملک کے کافی لوگوں کو مذہب کی وجہ سے اپنا وطن مالوف چھوڑنا پڑا اور وہ ترک وطن کر کے بھارت آ گئے۔ ان کی تعداد اب تقریباً ایک کروڑ ہے۔ ان کی مادری زبان بھی سرائیکی ہے اور وہ آج بھی اپنے گھروں میں سرائیکی بولتے ہیں۔ یہ لوگ بھارت میں زیادہ تر پنجاب۔ ہریانہ۔ دہلی۔ یو پی۔ راجستھان۔ مدھیہ پردیش۔ بہار، اور گجرات میں آباد ہیں۔

سرائیکی ایک تہذیب ہے مذہب نہیں۔ یہ زبان سنسکرت سے بھی زیادہ پرانی اور ہندستان کی سب سے قدیم زندہ زبان ہے۔ سنسکرت زبان کی گرامر کا اوّلین مؤلف و پانینی، ایک سرائیکی دانشور تھا۔ پاتنجلی، جس نے یوگ شاستر لکھا وہ بھی ملتان کا رہنے والا تھا۔

ڈاکٹر سینتی کمار چیٹرجی کی تحقیقات سے بھی پتا چلتا ہے کہ سرائیکی پرانی بنیادی دراوڑی کے بعد اینڈک زبانوں میں سے زندہ بچنے والی واحد زبان ہے اور ہند آریاؤں کی زبانوں میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔

گریرسن کے سروے کے مطابق سرائیکی یا لنڈھا وادی سندھ کی تہذیب سے وابستہ رہی ہے اور زمانہ قدیم سے سندھ سے لے کر کشمیر تک بولی جاتی تھی۔ اہل عرب بھی اس زبان سے واقف تھے۔ اس کا علمی مرکز ملتان رہا ہے جس کو "مول ستھان" کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ ملتان میں ہی رگ وید کی تخلیق ہوئی۔ ملتان کے قریب ٹیکسلا علم و ادب کا مرکز تھا جہاں پر پانینی، پاتنجلی، چانکیہ جیسے سرائیکی دانشمند ہندستان کی پرانی عمدہ تہذیب، ادب و ثقافت کے بہترین نمونے پیش کرتے تھے۔ کیونکہ ملتان اس وقت ایک خود مختار صوبے کی صورت میں موجود تھا اسی لیے اس زبان کو "ملتانی" بھی کہتے ہیں جب مہاراجا رنجیت سنگھ نے ملتان کو فتح کر کے صوبہ پنجاب سے ملا دیا اور لاہور کو اپنا صدر مقام بنایا تو صوبے کی زبان کا نام ملتانی سے پنجابی پڑ گیا حالانکہ پنجابی زبان سرائیکی کا ایک جز ہے اور یہ زبان صرف دو سو سال پرانی ہے۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ گرو گرنتھ صاحب میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کا مقدس کلام سرائیکی میں موجود ہے اور حضرت بابا کی مادری زبان سرائیکی تھی۔ حضرت امیر خسروؒ نے بھی

تقریباً پانچ سال کا عرصہ ملتان میں رہ کر سرائیکی زبان، علم، ادب و ثقافت سے شناسائی حاصل کی۔
اس وقت یہ زبان صوفیوں، سنتوں، پیروں، فقیروں کی زبان بن چکی تھی۔ اسی زبان میں پنجاب و
سندھ کے پیروں، فقیروں، سنتوں، گوروؤں نے روحانیت اور وحدت کا پیغام پھیلایا۔ ان میں
حضرت سلطان باہو، حضرت سچل سرمست، بلھے شاہ، غلام فرید اور شاہ لطیف شامل
تھے۔ پھر سکھ گوروؤں نے بھی اس سے کام لیا جس سے یہ ایک سیکولر زبان بن گئی۔ ویسے بھی
سرائیکی کبھی کسی خانقاہ، دینی مدرسے یا مذہبی مرکز کی زبان نہ تھی اس اعتبار سے اس کی روح
میں سیکولرزم اور وحدت کا مادہ تھا اور آج بھی انھیں صوفیوں سنتوں کی بدولت اردو زبان
میں بھی یہ خصوصیت موجود ہے۔ سرائیکی زبان ہی نے اردو کو اپنے الفاظ، محاورات، تراکیب
اور ضرب الامثال سے مالا مال کیا اور اس کو اپنے خون سے پالا۔ ابو الفضل نے بھی آئینِ
اکبری میں ملتانی زبان کا ذکر کیا ہے۔

عربی کی طرح سرائیکی بھی ایک صحرائی زبان ہے۔ سرائیکی علاقہ بھی ایک وقت میں
ریگستان تھا اور اسے چولستان یا تھل مارو بھی کہا گیا۔ یہاں کے لوگ نیک، جفاکش، خدمت
خلق کرنے والے، محبت پرور، اور روحانیت اور وحدت پر یقین کرنے والے ہیں۔ ان کی یہ
قدریں ان کی شاعری میں گونجتی ہیں۔ حضرت سلطان باہو ایک جگہ فرماتے ہیں۔

نہ میں عالم نہ میں فاضل نہ مفتی نہ قاضی ہو
نہ دل میرا دوزخ منگے نہ شوق بہشتی راضی ہو
نہ میں تیرہے روزے رکھے نہ میں پاک نمازی ہو
باجھ وصال اللہ دے باہو۔ سبھی دنیا کوڑی بازی ہو

بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب "سب رس" میں بہت سارے
سرائیکی الفاظ موجود ہیں۔ سرائیکی زبان حضرت امیر خسروؒ کے ہندوی کلام میں بھی موجود ہے اور
بعد کے شاعروں یعنی میر تقی میر، درد، نظیر اکبر آبادی اور غالب کے کلام میں بھی اس کے اثرات
ملتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر شوکت مغل، پروفیسر احسن واگھا اور ڈاکٹر کرسٹافر
شیکل کی تحقیقات بھی یہ ثابت کرتی ہیں کہ اردو زبان میں تیس فی صدی سے زیادہ الفاظ سرائیکی کے
ہیں۔ سرائیکی کیونکہ اس خطے کی سب سے پرانی اور زندہ زبان رہی ہے اور اس خطے کی
مادری زبان ہے اس لیے اس نے اس خطے میں اسلام کے ساتھ آنے والی زبانوں یعنی عربی
اور فارسی کو بھی مالا مال کیا ہے۔ اردو زبان کی کئی کلاسیکی کتابوں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ
اس میں سرائیکی الفاظ اور محاورے موجود ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق دکنی اردو میں بیس
فی صد الفاظ سرائیکی ہیں۔ میر کی "مثنوی گھر کا حال" میں سرائیکی الفاظ کی موجودگی اردو اور سرائیکی
زبان کے قدیمی رشتوں کو ثابت کرتی ہے۔ ۱۴۱۴ء میں سید خضر خاں ملتانی نے جب دہلی کے تخت
پر قبضہ کیا تو دہلی کی زبان پر بھی سرائیکی کا اثر ہوا۔

ان سب حقائق سے ظاہر ہے کہ ہندستان کے دارالسلطنت دہلی کے ارد گرد سرائیکی کی جڑیں ایک وسیع خطے میں پیوست تھیں اور یہ نہ صرف اپنی پیدائش کی سرزمین پر سرسبز و شاداب تھی بلکہ اپنی شاخیں اپنے دائیں بائیں پھیلا رہی تھیں۔ یہ اس کی باطنی خوبی اور صلاحیت کا ثبوت تھا لیکن بُرا ہو اہل سیاست کا کہ انھوں نے زبان کی حقیقت اور طاقت کو پہچاننے میں کوتاہی کی اور بے پروائی سے کام لیا۔ ماہرینِ لسانیات کی نظر اور پرکھ میں یہ اردو کی ماں تھی لیکن سیاست والوں نے ان دونوں کو نہ صرف لاتعلق سمجھا بلکہ اردو کو اپنی مذہبی مصلحتوں کی کنیز مان لیا اور اپنی مصلحتوں کی من مانی راہوں کو فرقہ پرستی کی آگ سے روشن کرتے ہوئے معاون برطانوی سامراج کی نگرانی میں ہونے والی ملک کی تقسیم کا استقبال کیا۔

چنانچہ اگست ۱۹۴۷ء میں واقع ہونے والی متحدہ ہندستان کی اس تقسیم نے برصغیر کی مقبول ترین زبانوں یعنی سرائیکی اور اردو پر بڑا گہرا وار کیا۔ اس تقسیم میں مذہب کی سیاست کو جو دخل رہا وہ معقولیت اور صداقت کے مسلّمہ اصولوں کے سراسر خلاف تھا۔

پاکستان کے داعیوں نے زبان کے اصولوں کی پاکیزگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اردو کو اپنی سیاست کا ایک مہرہ بنایا۔ اسے ایک مذہبی جامہ پہنا دیا اور اس کو مسلمانوں کے مبینہ ہوم لینڈ کا لازم قرار دیا۔ مسلم لیگ کے چودہ نکات میں اردو زبان کا تحفظ اور چلن بھی شامل تھا گویا مذہب کی بنا پر کیے جانے والے پاکستان کے مطالبے میں اردو کو خواہ مخواہ مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا گیا حالانکہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اردو جو پورے ہندستان کے تمام لوگوں میں رفاقت بڑھا رہی تھی مسلمانوں کی جاگیر بنا دی گئی۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۷ء میں جب ہندستان کی تقسیم ہوئی تو ایک طرف ہندستان کے کچھ طبقوں نے اردو کو اس تقسیم کا ذمّے دار گردانا اور دوسری طرف حکومتِ پاکستان نے اردو کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان قرار دے دیا۔ اردو کی اس نمائشی تاج پوشی کے بعد یہ زبان درحقیقت بے ملک اور بے زمین ہو گئی۔ اسی موڑ سے اس کی بدنصیبی شروع ہو گئی۔

اس حقیقت کا ابھی تک صحیح مشاہدہ اور اعتراف نہیں کیا گیا اور یہ راقم السطور، جس نے سرائیکی اور اردو کو متحدہ ہندستان کی کوتاہ نظر تقسیم کی بھٹی میں جلتے دیکھا ہے اور دیکھ رہا ہے، ایمانداری سے محسوس کرتا ہے کہ اسے اس بھٹی سے نکالنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ دیانت داری اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے سرائیکی کو اس کا حق ادا کیا جائے اور اردو نے اس کی جو جگہ سیاسی زبردستی سے چھینی ہے وہ اسے واپس کی جائے یعنی سرائیکی کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا جائے۔ پاکستان کے ستّر فی صد لوگوں کی یہ مادری زبان ہے اور اس کے برعکس اردو صرف دو فی صد مہاجروں کی مادری زبان ہے اور پاکستان کے کسی علاقے کی زبان نہیں ہے۔

خاکسار کوئی سیاسی آدمی نہیں ہے گو پاکستان کے کچھ اردو پرست سیاست والوں نے اسے سیاسی کوڑوں سے متہم اور شل کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال خاکسار کی یہ

ایماندارانہ رائے ہے کہ سرائیکی کے حقوق سے چشم پوشی میں اردو کی بدنصیبی جاری ہے۔

پاکستان کے اہلِ اقتدار نے اس امر کو یکسر نظر انداز کیا ہے کہ اردو ان کے کسی بھی صوبے کی مادری زبان نہ تھی اور نہ ہے۔ ہندوستان سے جو مہاجر ۱۹۴۷ء میں پاکستان گئے ان کی تعداد کا تناسب پاکستان کی اپنی آبادی کا دو فی صد تھا۔ ان دو فی صد لوگوں کی زبان کو جو خود دساور کی چیز تھے، پورے پاکستان پر نافذ کر دیا گیا۔ اس نفاذ سے جہاں ایک طرف ایک نوزائیدہ ملک کے گلے میں ایک مصنوعی لسانی نظام منڈھا گیا وہاں دوسری طرف پاکستان کی دو قدیمی زبانوں یعنی سرائیکی، اور بنگلہ کے حقوق کو پاؤں تلے روند دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں اردو کو پاکستان کے مغربی اور مشرقی دونوں حصوں پر زبردستی نافذ کر دیا گیا اور وہاں کے لوگوں کی مادری زبان کے حق کو نظر انداز کیا گیا۔ اردو جو کہ حقیقتاً اور عملاً ہندوستان کی زبان تھی اور ہے زبردستی پاکستان کی زبان بنا دی گئی۔ اگر یہ لیڈر حقیقت پسندی سے کام لیتے اور اپنے نوزائیدہ ملک میں اس کی اپنی زبانوں کا خیال اور احترام کرتے تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ نہ تو بنگلہ دیش کے مطالبے میں زور پیدا ہوتا اور نہ مغربی پاکستان اس انتشار کا شکار ہوتا جس سے یہ آج دوچار ہے اور جہاں پر اب سرائیکستان اور سندھو دیش کے مطالبے ہو رہے ہیں۔

پاکستان کے لیڈروں کے ہاتھوں میں اردو کی حالت اس معصوم دوشیزہ کی ہو گئی ہے جسے سیاست دانوں اور فرقہ پرستوں نے باری باری اس کی معصومیت سے محروم کر دیا۔ دونوں نے اسے ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کی ہی جالو بنا دیا۔ مسلم لیگ کے کوتاہ نظر لیڈروں نے تو اسے مسلمانوں اور مذہب سے جوڑ کر اس معصوم کا حلیہ بھی بگاڑ دیا۔

المیہ یہ ہے کہ پاکستان کے اہلِ اقتدار آج بھی اسے مذہب کا دُم چھلّہ بنانے پر مصر ہیں جس سے ہندوستان کے بعض اہلِ سیاست بھی اسے مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں۔ پاکستان کی غیر دانشمندانہ اور اصولی طور پر غلط لسانی سیاست اور پالیسی کی وجہ سے اس کا مشرقی حصّہ پہلے ہی اس سے الگ ہو کر ایک آزاد بنگلہ دیش بن چکا ہے اور مغربی حصّے میں اس کے تمام صوبے اردو کے خلاف سربکف ہیں، سندھ میں سندھی۔ بلوچستان میں بلوچی۔ صوبہ سرحد میں پشتو اور پنجاب میں پنجابی اور سرائیکی کی تحریکیں چل رہی ہیں پاکستان کی موجودہ تقریباً ۱۱ کروڑ آبادی میں تقریباً چھ کروڑ لوگ پنجاب میں رہتے ہیں ان میں سے چار کروڑ لوگوں کی مادری زبان سرائیکی ہے۔ پاکستان کے باقی پانچ کروڑ لوگوں میں سے تقریباً تمام لوگ اپنے اپنے صوبے کی زبان کے ساتھ ساتھ سرائیکی بھی بولتے ہیں یعنی ذولسانی ہیں۔ لہٰذا موجودہ پاکستان میں اکثریت سرائیکی بولنے والوں کی ہے اور اس ساری آبادی میں دو فی صد مہاجر آبادی کے علاوہ کسی آبادی کی بھی مادری زبان اردو نہیں ہے۔

یہ ٹھوس حقائق ہیں جن کے احترام میں پاکستان کے اہلِ سیاست کو اکثریت کی زبان کے جائز حقوق کو تسلیم کرنا چاہیے۔ اور زبان کو مذہب سے ایک الگ چیز تسلیم کرنا چاہیے۔

پیدا کرنے سے نہ صرف پاکستان اپنے امکانی انتشار کو روک سکتا ہے بلکہ ہندستان میں بھی جہاں کروڑوں لوگوں کی مادری زبان اردو ہے اس کی ترقی کا معاون ہو سکتا ہے۔

پاکستان کے لیے اردو سراسر ایک غیر ملکی زبان ہے۔ پچھلے ۴۷ سال کی تاریخ گواہ ہے کہ پاکستان کی دھرتی میں اس کی کامیاب کاشت نہیں ہو سکی بلکہ اردو وہاں آج تک محض سرکاری گملے کا پھول رہی ہے لیکن گملے کے ایک پھول کی زندگی کتنے دن ہو سکتی ہے؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں درآمد شدہ پھول سے کوئی قومی گلستان نہیں بن سکتا اور درآمد شدہ زبان سے کوئی سرزمین اہل زبان نہیں ہو سکتی۔

حال ہی میں اردو کے مشہور نقاد اور دانشور جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے جناب اطہر فاروقی سے ایک انٹرویو (قومی آواز نئی دہلی ۵ جون ۱۹۹۴ء) میں کہا ہے کہ آزاد ہندستان میں اردو کو تقسیم کی زبان قرار دے کر اسے محرومی کی سزا دی گئی۔ انھوں نے کہا کہ شروع میں تو مسلمان اور بالخصوص یو پی کے مسلمان اس "ناکردہ گناہ" کے الزام سے مرعوب ہے کہ پاکستان کے قیام کی ذمے داری اردو اور مسلمانوں پہ ہے لیکن ۱۹۵۵ء کے آس پاس انھوں نے اس سوال پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا کہ آخر ہندستان میں اردو کے ساتھ زیادتی کیوں ہو رہی ہے انھوں نے محسوس کیا کہ پاکستان کے قیام کی ذمے داری اردو زبان پر ڈال کر ہماری عظیم پانچ سو سالہ مشترکہ تہذیبی وراثت کو تباہ کرنا تنگ خیال ہندوؤں کی سازش ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں یہ احساس ابھرا کہ اب اردو مسلمانوں ہی کی زبان ہے اور اس میں کوئی قابلِ اعتراض یا باعثِ شرم بات نہیں۔ ان جملوں کی شدّت دلچسپ ہے اور مصنف اور اس کے حامیوں کے لیے شاید لطف انگیز بھی۔ لیکن ان کے آخر میں جو اعتراف کیا گیا ہے وہ جذباتی ہے اور حقیقت سے فرار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ہندستان کے تمام باشندوں، پھر کہتا ہوں تمام باشندوں کی (صرف مسلمانوں کی نہیں) پانچ سو سالہ مشترکہ تہذیبی وراثت ہے اور اس کو بہت سے ہندوؤں نے اپنے خونِ جگر سے پالا ہے ان کا اردو سے رشتہ مذہبی نہیں بلکہ ثقافتی اور ذہنی ہے۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان نے یہ اعلان کیا کہ اردو اس کی قومی زبان ہے تو یہ ایک سفید جھوٹ اور افترا تھا۔ پاکستان کے کسی علاقے کی اردو تہذیبی وراثت نہ تھی اور نہ ہے اور اس کو قومی یا سرکاری زبان بنانا بھی ایک ظالمانہ سازش تھی جس پر ہندستان کے لوگوں نے اور بالخصوص مسلمانوں نے کوئی واضح یا منظّم اعتراض نہ کیا۔ اس معاملے کو ہندوؤں کی سازش کہہ کر مطمئن ہو جانا حقیقت سے فرار ہے۔

جناب فاروقی نے مزید کہا کہ "۱۹۷۱ء کا زمانہ بنگلہ دیش کے قیام کا زمانہ تھا یہ مجموعی طور پر اردو پر ایک برا وقت تھا کیونکہ اس کا وجود خود پاکستان میں بہت سے خدشات و خطرات میں گھر گیا تھا۔"

میری رائے میں یہ نظریہ اور یہ بیان ایک جذباتی اندازِ فکر کا مظہر ہے بنگلہ دیش

ے قیام کے بعد تو ہندوستان اور پاکستان کے حکمران اردو کو یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ اردو پاکستان کے لیے بار اور جوکھم کی چیز ہے اور اس معاملے کے اپنے ہی بنیادی اسباب سے اردو کا وجود دو ہاں ہمیشہ خدشات اور خطرات میں گھرا ہی رہے گا۔ لہٰذا اسے جلد از جلد اردو سے دستکش ہو جانا چاہیے۔ پاکستان کو خود بھی یہ محسوس کرنا چاہیے کہ وہ اردو پر مسلسل اصرار سے اپنے ہی وجود کو مخدوش کر رہا ہے۔

پاکستان کے لیے اردو کبھی بھی ایک قومی زبان نہیں ہو سکتی۔ سرکاری نفاذ سے اردو کو قومی زبان بنانے کی بجائے اسے سرائیکی کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف کرنا چاہیے اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد اس صداقت کو حتمی طور پر تسلیم کرنا چاہیے کہ ملک کی بنیاد مذہب سے کہیں زیادہ زبان سے مضبوط ہو سکتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ باقی ماندہ پاکستان کو درآمد شدہ زبان اردو نہیں بچا سکتی بلکہ اس دھرتی کی اپنی اور قدرتی زبان سرائیکی ہی اسے متحد رکھ سکتی ہے۔

پاکستان میں سرائیکی سے بے انصافی کا یہ عالم ہے کہ سرائیکیوں کے حقوق سے مسلسل چشم پوشی کی جا رہی ہے۔ سرکاری ملازمت میں سرائیکی افراد صرف پانچ فی صد ہیں جبکہ ان کی آبادی پچاس فی صد ہے۔ پنجاب میں لاہور، ملتان اور اسلام آباد کی یونیورسٹیوں میں سرائیکی میں بی۔ اے یا ایم۔ اے کے نصابات کا کوئی اہتمام نہیں البتہ اردو، پنجابی اور انگریزی زبانوں کے لیے یہ اہتمام موجود ہے۔ پنجابی اور اردو کی نشریات پر ہر روز آٹھ آٹھ گھنٹے صرف کیے جاتے ہیں اور سرائیکی کے لیے ہفتہ بھر میں صرف تین گھنٹے یعنی مشکل سے آدھ گھنٹہ روزانہ ہے۔

ماضی میں جب میاں نواز شریف وزیر اعظم تھے تو انھوں نے پنجابی کے فروغ کے لیے تو متعدد اقدام کیے لیکن سرائیکی کو نظر انداز کیا۔ چنانچہ پنجاب میں ان کے الیکشن ہارنے کی ایک وجہ ان کی سرائیکی مخالف پالیسی بھی تھی۔ اس کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کے صرف اس موٹے اعلان ہی سے کہ اس کی حکومت علاقائی زبانوں کو ان کی مناسب جگہ دے گی اہل سرائیکی نے اجتماعی طور پر اس کے حق میں ووٹ ڈال کر اسے کامیاب کرایا۔

اہل سیاست کی موجودہ روش کی وجہ سے اہل سرائیکی اردو زبان سے الٹی بڑھانے کے شائق نظر نہیں آتے۔ وہ سرائیکی کو قومی زبان بنانا چاہتے ہیں ان کے پاس ایک وسیع و عریض پریس ہے۔ جس میں تقریباً چودہ روزنامے ہیں۔ سرائیکی کے کلاسیکی اور جدید ادب پر ہر سال سرائیکی زبان میں سیکڑوں کتابیں چھپ رہی ہیں سرائیکی شعرا کے مجموعے نہایت انقلابی خیالات کے مظہر ہیں۔

ان کے علاوہ پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو بولنے والے بھی اردو کو ایک غیر ملکی زبان سمجھتے ہیں۔ اہل سرائیکی کی مختلف انجمنوں، ادیبوں، دانشوروں اور سماجی سنگتوں اور ثقافتی اکابر نے ایک خطہ گیر تحریک چلا رکھی ہے جس کا مقصد سرائیکی کو قومی زبان بنانا ہے۔

یہ پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے۔ راقم السطور یہاں صرف سرائیکی کو اردو کے مسائل اور امکانات کے سیاق میں پیش کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو سرائیکی کے دعوے کی منظوری سے ہندستان کی زبان اردو کے چھینے ہوئے اور دبے ہوئے حقوق بحال ہو سکتے ہیں۔ سرائیکی بولنے والوں کی تعداد ہندستان میں بھی ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔ یہاں پر بھی اس زبان کو ہندستان کے آئین میں جگہ مل جائے پر یہ ایک رابطے کی زبان ہو سکتی ہے جو کہ سیاست اور مذہب سے اوپر اٹھ کر دونوں ملکو کے درمیان میل ملاپ، بھائی چارہ اور امن کو مضبوط کر سکتی ہے اور ایک نئے پل کا نام دے سکتی ہے۔ اس طرح اردو بھی مذہب کی گرفت سے رہائی پا کر اپنی سوتیلی ماں کی قید سے نکل کر اپنی حقیقی ماں ہندستان کی گود میں بیٹھ کر پھل پھول سکتی ہے۔

راقم السطور کے خیال میں کشمیر کے مسئلے سے کہیں زیادہ سرائیکی کا مسئلہ اہم ہے کیونکہ اس سے پاکستان کی وحدت اور برصغیر کی سیاست کا سیدھا تعلق ہے۔ اگر پاکستان اگر اردو کو مذہب کی قید سے رہا کر دے تو یہ پھر سے اپنے پرانے گلی کوچوں میں چہکتی اور چمکتی نظر آئے گی اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان اپنے کروڑوں سرائیکیوں کی ہمنوائی اور رغبت حاصل کرے تو اس سے برصغیر میں مذہب کے استعمال کا رجحان کم ہو جائے گا اور پھر کشمیر کے موثر حل کی راہیں بھی ہموار ہو جائیں گی۔

سرائیکی کو ملنے والا انصاف برصغیر میں اردو کے نئے دور اور نئے رشتوں کا نقیب ہوگا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

ضرت محمدؐ اور قرآن (مذہب) ڈاکٹر رفیق زکریا ۲۶/-
ریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات (تاریخ) ڈاکٹر سید جمال الدین ۵۰/-
رتعلیمیہ میں سماجی انصاف کی تعلیم (خطبہ) پروفیسر اختر الواسع ۱۰/-
نس کی ترقی اور آج کا سماج (خطبہ) ڈاکٹر سید ظہور قاسم ۱۰/-
دو صحافت، صداقت اور آزادیٔ رائے 〃 عشرت علی صدیقی ۱۰/-
یم (مضامین) رشید حسن خاں ۸۰/-
اس و شناخت (تنقید) پروفیسر انور صدیقی ۶۶/-
مشرق سے کچھ مغرب سے (مضامین) ڈاکٹر سید تقی حسین جعفری ۸۰/-
رہ در چہرہ (طنز و مزاح) مجتبیٰ حسین ۵۰/-
البدیہہ (〃) یوسف ناظم ۴۵/-
لیم و تعلّم (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۷۵/-
تید اور روایت کی تجدید۔ پروفیسر مونس رضا (خطبہ) مرتبہ ۱۰/-
تید اور اردو یونیورسٹی۔ پروفیسر مسعود حسین خاں خواجہ محمد شاہد
ربات سے سیاسیات تک غلام ربانی تاباں ۵۰/-
دو شاعری کی گیارہ آوازیں (تنقید) عبدالقوی دسنوی ۷۵/-
شا اور تلفظ (طلبہ کے لیے) (قواعد) رشید حسن خاں ۹/-
ارت کیسے لکھیں 〃 〃 ۱۵/-
دم خور چیتا (شکاریات) ریاض احمد خاں ۴۵/-
دازِ گفتگو کیا ہے (تنقید) شمس الرحمٰن فاروقی ۷۵/-
ستک اس دروازے پر وزیر آغا ۵۰/-
زمائش کی گھڑی (مضامین) سید حامد ۵۰/-
یبی جھینی بینی چدریا (ناول) عبدل بسم اللہ ۷۰/-
حرا نورد کے خطوط (افسانے) میرزا ادیب ۷۵/-
ں سمندر ہوں (شعری مجموعہ) فرحان سالم ۳۰/-
سرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن) شائستہ خاں ۷۵/-
سلمانوں کا تعلیمی نظام (مضامین) ضیاء الحسن فاروقی ۴۵/-
ام جہاں نما اردو صحافت کی ابتدا (صحافت) گربچن چندن ۷۵/-
لانی اور ملی تہذیب و تمدن (تاریخ) مالک رام ۷۵/-

اپنے دل کی حفاظت کیجیے (ایلوپیتھی) ترجمہ نذیر الدین مینائی ۲۶/-
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان (سوانح) تالیف مولانا حکیم محمود احمد برکاتی ۴۵/-
تذکرہ ماہ و سال (تذکرہ) مالک رام ۱۲۵/-
افکارِ اقبال (تنقید) محمد عبدالسلام خاں ۱۲۵/-
تحقیق نامہ (تحقیق) مشفق خواجہ ۵۰/-
تأثر کی تنقید (تنقید) صدیق الرحمٰن قدوائی ۵۰/-
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے (انٹرویوز) طاہر مسعود ۴۶/-
گوشے میں قفس کے (طنز و مزاح) دلیپ سنگھ ۴۵/-
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (ناول) کشمیری لال ذاکر ۴۰/-
سحر کے پہلے اور بعد (جگ بیتی) سعید الظفر چغتائی ۵۰/-
تحریریں (مضامین) اسلم پرویز ۵۷/-
سفر (ناول) رابعہ تبسم ۲۷/-
خواب اور خلش (شعری مجموعہ) آل احمد سرور ۴۶/-
بانگِ درا مکمل علامہ اقبال ۹/-
بالِ جبریل مکمل 〃 ۹/-
ضربِ کلیم (اردو نظمیں) 〃 ۶/-
غبارِ منزل (شعری مجموعہ) غلام ربانی تاباں ۴۵/-
پیامی قواعدِ اردو (قواعد) (ادارہ) ۶/-
〃 〃 (خورد) (〃) ۳/-
فریدؒ و فردِ فریدؒ (سوانح) ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۷/-
پہچان اور پرکھ (تنقید) پروفیسر آل احمد سرور ۵۰/-
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم (مضامین) ڈاکٹر سلامت اللہ ۹۰/-
اقبال کا نظریۂ خودی (تنقید) ڈاکٹر عبدالمغنی ۱۵۰/-
پت جھڑ کی آواز (افسانے) قرۃ العین حیدر ۷۵/-
جدید افسانے اور اس کے مسائل (تنقید) وارث علوی ۳۶/-
قلندر بخش جرأت (خطبہ) جمیل جالبی ۱۰/-
پیامی بیسک انگلش اردو ڈکشنری (ادارہ) ۱۲/-
پیامی ہوم ڈکشنری اردو انگلش 〃 ۱۶/-

کتاب نما کے خصوصی شمارے

منیث الدین فریدی	مرتبہ	ظہیر احمد صدیقی	۴/۵۰
خواجہ حسن نظامی	مرتبہ	نثار احمد فاروقی / ریحان احمد عباسی	۱/۵۰
مولانا عبدالوحید صدیقی	مرتبہ	پروانہ ردولوی	۱/۵۰
غلام ربانی تاباں	//	اجمل اجملی	۷/۵۰
عابد علی خاں	//	مجتبیٰ حسین	۴/۵۰
خواجہ احمد فاروقی	//	ڈاکٹر خلیق انجم	۴/۵۰
علی سردار جعفری	//	ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی	۴/۵۰
اختر سعید خاں	//	ڈاکٹر سید حامد حسین	۱/۵۰
نثار احمد فاروقی	//	ڈاکٹر خلیق انجم	۵/-
پروفیسر مسعود حسین خاں	//	ایم حبیب خاں	۴/۵۰
ڈاکٹر اجمل اجملی	مرتبہ :	علی احمد فاطمی / عذرا حبیب	۴/۵۰
فراق گورکھپوری نمبر	مرتبہ	خلیق انجم	۲۵/-
صالحہ عابد حسین نمبر	//	عزیز قریشی	۴/۵۰
نئی نظم کا سفر	//	خلیل الرحمٰن اعظمی	۴/۵۰
مشرقی علوم و السنہ پر تحقیق		حامد حسین	۳/-
پریم چند نمبر		عبدالقوی دسنوی	۸/۵۰
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر		کرنل بشیر حسین زیدی	۳/-
مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر		ادارہ	۱/۵۰
مرزا سلامت علی دبیر نمبر	مرتبہ	عبدالقوی دسنوی	۴/۵۰
جوش ملسیانی نمبر		ساحر ہوشیارپوری	۵/۵۰
خواتین افسانہ نگار نمبر		ڈاکٹر صغرا مہدی	۴/۵۰
عرش ملسیانی نمبر		مالک رام	۱۲/۵۰
سکندر علی وجد نمبر		یوسف ناظم	۲۵/-
لغت نویسی کے مسائل نمبر		پروفیسر گوپی چند نارنگ	۳۵/-
عبداللطیف اعظمی نمبر		(ادارہ)	۱۸/-
جائزے	مرتبہ	مظفر حنفی	۴/۵۰
جگن ناتھ آزاد نمبر		ایم حبیب خاں	۵/-

معیاری ادب سیریز

موازنۂ انیس و دبیر	مرتبہ	رشید حسن خاں	۲۴/-
نیرنگ خیال	//	مالک رام	۱۵/-
یادگار غالب اردو	مرتبہ	مالک رام	۱۵/-
یادگار غالب فارسی	//	مالک رام	۹/-
انتخاب مضامین سرسید	//	انور صدیقی	۱۶/-
حیات سعدی	//	رشید حسن خاں	۳۶/-
فسانۂ آزاد (تلخیص)	//	ڈاکٹر قمر رئیس	۷۵/-
فردوس بریں	//	عبدالحلیم شرر	۱۶/-
انتخاب مضامین شبلی	//	رشید حسن خاں	۷۵/-
انتخاب ناسخ	//	//	۷۵/-
مثنوی بحرالمحبت	//	عبدالماجد دریابادی	۹/۵۰
شریف زادہ	//	ڈاکٹر قمر رئیس	۲۰/-
امراؤ جان ادا	//	ڈاکٹر محمد حسن	۲۸/-
فسانۂ مبتلا	//	صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۰/-
توبۃ النصوح	//	مالک رام	۳۶/-
باغ و بہار	//	رشید حسن خاں	۲۴/-
ابن الوقت	//	ڈاکٹر خلیق انجم	۴۲/-
مجالس النساء	//	صالحہ عابد حسین	۲۴/-
گذشتہ لکھنؤ	//	رشید حسن خاں	۵/-
قصۂ حاتم طائی	//	اطہر پرویز	۵/-
انتخاب ولی	//	سید ظہیرالدین مدنی	/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی	//	ڈاکٹر محمد حسن	/-
انتخاب مراثی انیس و دبیر	//	رشید حسن خاں	/-
انتخاب نظیر اکبرآبادی	//	//	/-
انتخاب اکبر الٰہ آبادی	//	صدیق الرحمٰن قدوائی	
انتخاب کلام میر	//	ڈاکٹر محمد حسن (زیر طبع)	
دیوان درد	//	رشید حسن خاں	
انتخاب سودا	//	//	
انتخاب قلی قطب شاہ	//	محمد اکبرالدین صدیقی	
انتخاب ذوق	//	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	
مثنوی سحرالبیان	//	رشید حسن خاں	
مثنوی گلزار نسیم	//	//	
افادات سلیم	//	ڈاکٹر خلیق انجم	
مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ	رشید حسن خاں	

قیوم خضر
خلاصی ٹولہ
پٹنہ

فلسفۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود

افہام و تفہیم کے آئینے میں

یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ اسلام سے بہت پہلے ذہن انسانی تصوّف سے آشنا ہو چکا تھا، سو تاریخی اعتبار سے بالکل صحیح اور درست ہے۔ مگر نزولِ قرآن کے بعد تصوّف کی جو صورت ابھر کر سامنے آئی، اس نے پوری کائنات کو متوجہ اور متاثر کیا اور اسلامی تصوّف کا جو ڈھانچا مرتب کیا گیا وہ قطعی اگلی کتابوں کی نقل نہ تھی بلکہ محدودیت کے دائرے سے قطعی مبرّا، نظامِ کائنات کی ایسی مکمل اخلاقی توجیہہ تھی جس میں سارے آفاقی پہلو محیط تھے اور بعض لوگوں کا یہ جو خیال ہے کہ اسلامی تصوّف اہلِ یونان اور اہلِ ہند کے فلسفوں سے سراسر ماخوذ ہے تو یہ مریحاً بے علمی اور بے بصیرتی کی دلیل ہے۔ خاص طور پر فلسفہ "وحدت الوجود" کے بارے میں یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ ویدانت سے ماخوذ ہے، تو داراشکوہ جس نے اُپنشدوں کا ترجمہ فارسی زبان میں "سِرِّ اکبر" کے نام سے کیا ہے، اس کے قول کے مطابق یہ بات اس حد تک کہ "اَدُوَیت واد" (وحدت الوجود یا ہمہ اوست) کا اوّل ترین خاکہ اُپنشدوں کے صفحات میں ملتا ہے "تاریخی شہادتوں کے پیشِ نظر بالکل صحیح ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ تو افلاطونی فلسفہ یا ویدانتی فلسفہ سے کسی چیز کا مشابہ ہونا یا توارد کا ہو جانا الگ بات ہے، اور کسی شئے کو ہُو بہُو، اسی طرح ماخوذ یا قبول کر لینا بالکل الگ بات! اگر کسی موجودہ تحریک کے ڈانڈے ماضی کی کسی تحریک سے میل کھاتے ہیں تو محض اس وجہ سے موجودہ تحریک کو ماضی کی تحریک کا چربہ قرار دینا حماقت ہے، اس لیے کہ موجودہ تحریک کے عوامل و محرکات اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ ماضی کی حیثیت محض سایے کی رہ جاتی ہے۔ البتہ اس کو زیادہ سے زیادہ اتفاقی یا توارد ہی کہہ سکتے ہیں اور ایسے توارد سے تاریخ عالم بھری پڑی ہے، یوں بھی بالخصوص اہلِ ہند کے بنیادی روحانی نظام و فلسفہ کا براہِ راست مستقل اور قابلِ ذکر اثر عربوں پر نہیں پڑا ہے —— یہیں پر چلتے چلتے ایک اہم بات ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ قرآن پاک نے پچھلے ادیان کی غیر تحریف شدہ صداقتوں کی تصدیق کر کے اور گزرے ہوئے داعیانِ مذاہب سے جو خدا کی طرف سے بھیجے گئے تھے، تسلسل کے ساتھ تاریخ اور گذشتہ الہامی کتابوں سے اپنا

رشتہ و ربط جوڑ کر کتاب برحق اور "ذکر العالمین" ہونے کا ثبوت دیا ہے ــــ ان باتوں کے اظہار کا منشا یہ ہے کہ اگر پچھلے ادیان سے مشابہت ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی نقل ہے بلکہ پچھلے مذاہب کے ترتیب وار تاریخی رابطے اور اس کی اصلیت کا پتا چلتا ہے اور جہاں تک "وحدت الوجود" کا مسئلہ ہے تو اس مسئلے کی اصل یعنی "مسئلہ فنا" کو کہیں سے اخذ کرنے کا سوال اس لیے نہیں اٹھتا کہ "فنا فی الحق" کا مسئلہ تو اسلامی تصوّف کی رُوح ہے!

وجود

وجود کے لغوی معنی "ہستی" کے ہیں۔ وجود کی دو قسمیں ہیں، واجبؔ اور ممکنؔ،
"واجب" اسے کہتے ہیں جو اپنی ذات سے قدیم اور ازلی ہو۔ نیز اپنے وجود میں کسی اور کا محتاج نہ ہو، جو کسی طرح معدوم نہ ہوسکے اور نہ کبھی معدوم رہا ہو۔ ایسے وجود کو "واجب الوجود" کہتے ہیں، جس کا اطلاق اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا کسی دوسرے پر نہیں ہوسکتا۔
"ممکن" اسے کہتے ہیں جو اپنی ذات سے حادث ہو یعنی ہمیشہ سے نہ ہو اور نہ ہمیشہ رہے گا اس کے ہونے کا سبب کوئی دوسرا یعنی خالق مطلق ہو۔ ایسے وجود کو "ممکن الوجود" کہتے ہیں۔

وحدت الوجود!

"وحدت الوجود" ذات باری تعالیٰ کے بارے میں تصوّف کی ایک فلسفیانہ اصط اور فلسفیانہ نظریہ ہے۔ علمی دنیا میں اس نظریے نے فلسفیانہ غور و فکر کی اتنی شمعیں جلا کر رکھ دیں کہ ہر در و دیوار پر اس کی چھوٹ پڑنے لگی۔ اس نظریے کو مسلمانوں کے درمیا شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ (و: ۵۶۰ھ مطابق ۱۱۶۵ء - م: ۶۳۸ھ مطابق ۱۲۴۰ء) باضاب اور باقاعدہ طور پر اپنی کتاب "فصوص الحکم" میں پیش کیا، اور اس کے بعد مسلمانوں ک علمی مجلسوں میں اس فلسفیانہ نظریہ کی گونج پہلے کے مقابلے میں زیادہ زوروں ـــــ سے سُنائی دینے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ گونج اتنی بڑھی کہ اسلامی تصوّف کے تمام دوسرے مسائل پر حاوی ہوگئی اور اس کا اثر اتنا گہرا پڑا کہ لوگ اسی کو اصل تصوّف سمجھنے لگ

وحدت الوجودی صوفیوں کے نزدیک "وجود" ہی حق ہے۔ وجود کے لغو معنی تو "ہستی" کے ہوتے ہیں لیکن اہلِ فلاسفہ کے نزدیک اس کے معنی حقیقت بالذّات کے ہیں، اسی معنی میں یہ لفظ ذات حق کے مرادف ہے۔ ذات حق کی کو صورت و شکل نہیں اور نہ کوئی حد ہے یعنی وہ غیر مادّی اور غیر متغیر ہے۔ متاثر ہونا یا ہونا اس کے لیے محال ہے۔ وہ نقائص سے پاک اور جملہ کمالات سے متصف ہے اس کے یہاں حاضر و غائب، وصل و فصل، زمان و مکان، حرکت و سکون، کوئی چیز نہ وہ نہ محدود ہے، نہ عرض ہے، نہ حال ہے، نہ جسم ہے، نہ روح ہے۔ کیونکہ عر جوہر کی، حال کو محل کی، رُوح کو جسم کی، اور جسم کو اجزا کی ضرورت ہوتی ہے اور خد

ان سب سے بے نیاز ہے۔ موجودات کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جو اس وجودِ حقیقی کا غیر ہو، اس کے باوجود مظاہر میں جو فرق نظر آتا ہے وہ ذریعۂ تعلیم یعنی حواس خمسہ کا ایک شگوفہ ہے۔ مطلب یہ کہ مظاہر و مشاہد میں غیر امتیاز اور فرق محض حواسِ انسانی کے دھوکا کھا جانے سے پیدا ہوتا ہے، ورنہ اصل وجود، واحد ہے اور تمام ریاضتیں جو کی جاتی ہیں وہ "مایا" یعنی فریب نظر (ILLUSION) سے بچنے اور ذاتِ واحد سے مل جانے کے واسطے کی جاتی ہیں لیکن تمام ریاضتوں، محنتوں اور مشقتوں کے ذریعہ وصل باللہ کی آخری منزل تک پہنچنا ممکن تو ہے مگر بے حد دشوار ہے۔ اپنے ذہن سے تمام خیالات کو جھٹک کر اور اپنے تصور سے تمام مظاہر کائنات کو الگ کر کے یعنی حواس خمسہ پر مکمل قابو پاکر خدائے مطلق کی طرف سو فیصد یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہو جانے کی منزل کچھ آسان نہیں۔ یہ منزل وہ ہے کہ جہاں اشارات و کنایات کا بھی گزر نہیں۔ اس لیے کہ جس قسم کی بھی ذہنی صورت اختیار کی جائے گی اس میں تشبیہ و تجسیم (Anthropomorphism) سے یکسر چھٹکارا پانا بے حد مشکل ہے۔ تشبیہ کے معنی وہ تمام باتیں ہیں جو اللہ کی مخلوقات سے مشابہ کرتی ہیں، اور تجسیم خدا کی نسبت ایسا تصور قائم کرنے کو کہتے ہیں جو مخلوق کی طرح جسم و صورت رکھتا ہو، اسی لیے وحدت الوجودی حضرات تصورِ الٰہی کے ضمن میں تشبیہ و تجسیم کو رد کرتے ہوئے اپنا عقیدہ "تنزیہہ" پر استوار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی دوسری شئے کو وجودِ مطلق سے متصف کرنا شرک کے مرادف ہے، حتیٰ کہ کسی شئے سے اس کی مثال بھی دینا سراسر غلط سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں "لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ" (اس کی مثل کوئی شئے نہیں) کی قرآنی آیت کو بطور استدلال پیش کرتے ہیں یعنی خدائے مطلق تمام تصوری تشخص سے منزّہ و مبرّا ہے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ تنبیہاً فرمایا گیا لَا تَضْرِبُوا لِلّٰہِ الْاَمْثَال یعنی "اللہ کے لیے مثال نہ دیا کرو"۔ چنانچہ اس آیت کریمہ نے تمثیلوں کے تمام دروازوں کو بند کر دیا۔ یہ حضرات کرام "اصول تخالف" کے تحت اس مسئلے کو دیکھتے ہیں۔ "تخالف" کے معنی "مخالفت کرنے" کے ہیں۔ مطلب یہ کہ انسان کے دماغ میں جس قسم کی بھی تمثیلات آتی ہیں، وہ سب فانی ہیں اس لیے ان کی مخالفت کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ فانی شئے کے ذریعے "باقی بالذات" کا تصور قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ ان کا کہنا ہے کہ تمثیلات دینے کے معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ اس کے مقابلے میں کسی بھی شئے کے وجود کو تسلیم کیا جائے، حالانکہ جو کچھ ہے بس وہی ہے، اس کے سوا کچھ بھی نہیں، تو پھر کس کی تمثیل کس سے دی جائے گی؟ یہ لوگ تو ذاتِ واحد سے صفات کا انسلاک بھی وحدت میں خلل کا باعث سمجھتے ہیں۔

وحدت الوجودیوں کا عقیدہ ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے اور اسی وجہ سے یہ "مسئلہ جبر و قدر" کے سلسلے میں "جبر" کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسانوں کے جملہ افعال و اعمال بھی اللہ کی تخلیق ہیں اور انسان کو اپنی مرضی کے مطابق ان کو بروئے کار

لانے کی کوئی قدرت حاصل نہیں ہے۔ یہ حضرات تو کائنات کی بھی نفی کرتے ہیں اور کسی شئے کو بھی ذاتِ واحد سے الگ نہیں مانتے۔ چنانچہ فلسفہ وحدت الوجود کے مبلغ اعظم شیخ ابن عربی" کے نزدیک " وجود المخلوقات عین وجود الخالق " یعنی خالق و مخلوق دونوں کا ایک ہی جوہر ہے۔ حتیٰ کہ وہ کلمۂ توحید کے پہلے ٹکڑے " لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ " کو بھی اپنے طور پر " لَا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ " پڑھتے ہیں یعنی لا موجود اِلّا ھُوْ، جس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف ذاتِ واحد ہی موجود ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے ان کا نظریہ " ہمہ اُوست " کا ہے اور وہ " ھُوَ الْکُلُّ " کا نعرہ لگاتے ہیں۔ وہ اپنے نظریہ کی دلیل میں قرآن پاک کی آیت " ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ " (وہی شروع سے ہے وہی آخر تک رہے گا وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے) کو پیش کرتے ہیں۔

وحدت الوجودی حضرات، اللہ اور آدمی کا رشتہ عبد و معبود کا نہیں بلکہ حبیبؐ محبوب کا مانتے ہیں اور اس کی مثال قطرہ اور دریا سے دیتے ہیں۔ اسی عقیدہ کے پیشِ نظر وحدت الوجودیوں کا کہنا ہے کہ اگر کوئی قطرہ کسی طرح یا کسی وجہ سے اپنے "کل" یعنی دریا سے تو جدا ہو جانے کی وجہ سے اس کی نوعیت میں فرق کا آجانا ضروری ہے مگر اس کی اصلیت میں فرق نہیں آئے گا۔ نوعیت میں فرق آجانے کے سبب ہی سے جزو اور کل میں ظاہری فرق اور فصل لاحق ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں وہ قطرہ تو اپنی "اصل" کے اعتبار سے اسی دریا کا ایک جزو ہے یعنی " موج عین دریا است و دریا عین موج است " اسی خیال کو عظیم آباد کے فلسفی شاعر جناب مظفر حسین مظفر مرحوم نے یوں ادا کیا ہے ؎

فقط کل سے جدا ہونے سے اصل جزو کیوں بدلے؟
تجھے اے قطرۂ مہجور ہم دریا سمجھتے ہیں!

مطلب یہ کہ وحدت الوجودی حضرات، خدا اور آدمی کا تعلق قطرہ اور دریا کی طرح مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فصل لاحق ہو جانے کی وجہ سے جزو میں دوری و مہجوری کے احساس کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اسی احساس دوری و مہجوری سے چھٹکارا پانے کی غرض سے وہ اصل کل سے واصل ہونے کی تمنا میں حیران و پریشان اور اپنی روحانی ناآسودگی کو آسودگی میں متبدل کرنے کی کوشش میں ہر لمحہ مشغول و معروف نظر آتا ہے، یعنی وحدت الوجودیوں کے نزدیک قطرہ کا دریا سے مل جانا " فنا فی اللہ " یا " وصل باللہ " کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر کو مولانا جلال الدین رومی (و: ۶، ربیع الاوّل المطابق ۲۸، دسمبر ۱۲۰۷ء — م: ۵ جمادی الثانی ۶۷۲ھ المطابق ۱۶، دسمبر ۱۲۷۲ء) نے بنیاد قرار دے کر اپنی مشہور و معروف مثنوی تصنیف فرمائی، اور یہی وہ نظریہ ہے جس کے پیشِ نظر وحدت الوجودی حضرات، خدائے کل کی جدائی میں اپنی زندگی کو بارِ گراں اور وبالِ دوش سمجھتے ہیں اور ہر لمحہ واصل بہ حق ہونے کی تمنا میں اس طرح بے چین رہتے

ہیں جیسے ان کے دل میں دہکتے ہوئے انگارے رکھ دیے گئے ہوں۔ ان کی کیفیت اس پتنگے کی مانند ہوتی ہے جس کا اظہار حضرت علامہ فضل حق آزاد مرحوم نے اپنی نظم کے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے ؎

بے تاب، بے قرار، جگر تفتہ، سر بکف
جویائے وصلِ شمع و جویائے سوختن

وحدت الوجودی اصحاب، پروانے کی طرح شمع وحدت پر فدا ہو جانے کو ہی بقا سمجھتے ہیں۔ اور منتہائے سکونِ دل کا درجہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حقیقت الحقائق یعنی ذاتِ الٰہی کے عشق میں جب طالبِ حق درجہ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو تعینات اور اعتبارات کے سارے پردے اٹھ جاتے ہیں، اور قربِ الٰہی کی وہ منزل آجاتی ہے کہ سالک واصل بالذات الٰہی ہو جاتا ہے۔ عشقِ حقیقی کی یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر جناب منصور ابن حلاج (متوفی ۳۰۹ھ المطابق ۹۲۲ء) نے محبوبِ حقیقی کے عشق میں اپنے وجود کی نفی کرتے ہوئے "انا الحق" کا نعرہ بلند کر دیا تھا۔ اس نعرہ "انا الحق" کے بارے میں مولانا روم رحمۃ نے "فیہ ما فیہ" میں سبھوں سے الگ ہو کر توضیح فرمائی ہے ــــــ نثر میں مولانائے موصوف کی یہ کتاب تنہا یادگار ہے۔ یہ ان کی کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ متفرق خطوط اور ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ ملفوظات تو وہ ہیں جو اثنائے مجالس میں آپ کی زبانِ مبارک سے صادر ہوتے رہتے اور جسے آپ کے صاحبزادے بہاء الدین محمد سلطان ولد رحمۃ نے قلم بند کر رکھے تھے اور خطوط کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ ہیں جس کے اصلی مخاطب معین الدین پروانہ ہیں جو رکن الدین قلیج ارسلان شاہ قونیہ کے حاجب تھے۔ ان کو مولانا سے بے حد عقیدت تھی۔ اس کتاب میں ایسا بھی ہے کہ کہیں کہیں دوسرے عقیدت مند سائلوں کی جانب بھی روئے سخن ہے۔ ان خطوط اور فرمودات کی یہ اہمیت ہے کہ خود مولانائے موصوف اپنی مثنوی (ساڑھے چھبیس ہزار اشعار پر مشتمل اور کلیات پچاس ہزار اشعار پر مشتمل) کو ان کے مقابلے میں ننگ سمجھتے تھے۔ مولانا کے وصال یعنی ۶۷۲ (قمری) برس کے بعد اس کتاب کو اردو میں ترجمہ کر کے مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے ۱۹۲۸ء میں شائع کیا، اور اس طرح انھوں نے اتنی عظیم علمی خدمت انجام دی کہ اگر وہ متوجہ نہیں ہوتے تو کم از کم اردو دنیا، مولانائے روم کے اس نثری شاہکار سے محروم رہ جاتی۔ اس کتاب میں متقدمین صوفیائے کرام کے تذکروں کے علاوہ ان کے اقوال و احوال کی بھی شرح و توضیح کی ہے۔ ان توضیحات میں سب سے قابلِ توجہ توضیح وہ ہے جو جناب منصور ابن حلاج کے مشہور کلمہ "انا الحق" کے بارے میں کی گئی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "آخر ایں انا الحق گفتن، منصور، ہم ازیں معنی است کہ پندارند کہ دعوئی بزرگست "انا العبد" گفتن دعوئی بزرگست، و "انا الحق" عظیم تواضع است، زیرا آنکہ "انا الحق" می گوید خود را عدم کرد بباد"

و می گوید کہ ”انا الحق یعنی من نیستم ہمہ اوست جز خدا را ہستی نیست۔ من بکلی عدم محضم ہیچم، تواضع ددر اینجا بیشتر است، ایں است کہ مردم فہم نمی کنند“ یعنی ”انا الحق“ کو لوگوں نے خود بینی پر بجائے کیوں محمول کر لیا۔ یہ تو انتہائی فروتنی تھی۔ اس کا قائل تو اپنی خودی اور ہستی کی نفی کر رہا ہے اور کہتا کہ میں تو حق میں شامل ہو گیا ہوں۔ انا نیت اگر نکلتی ہے تو ”انا العبد“ سے نکلتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہستی معبود کے علاوہ ”عبد“ خود اپنی ہستی کا بھی اثبات و ادّعا کر رہا ہے ـــــ مولانا رومؒ کی تائید کرتے ہوئے حضرت سید احمد سرہندی مجدّد الف ثانی رحمۃ کے پیر و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ العزیز نے بھی فرمایا ہے کہ ”در معنی عبارت ”انا الحق“ نہ آں ست کہ من حقم بلکہ آں ست کہ من نیستم و وجود حق است سبحانہٗ“!

وحدت الشہود

ہندستان میں وحدت الشّہودی مکتبہ خیال کے امام حضرت سید احمد سرہندی مجدّد الف ثانی رحمۃ (و: ۲۶ رجون ۱۵۶۴ء۔ م: ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ المطابق ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء) کا ارشادِ گرامی ہے کہ ”توحید شہودی“ کے معنیٰ ”صرف ایک کو دیکھنے“ کے ہیں یعنی سالکانِ راہِ حق سوا ایک کے کسی دوسرے کو نہیں دیکھتے، اس لیے وحدت الشّہودی حضرات مرتبۂ ”عین الیقین“ پر فائز ہوتے ہیں اور اس مرتبہ کو پانے کے بعد تمام موجودات میں ان کو صرف جلوۂ حق ہی نظر آنے لگتا ہے۔ اور ”توحید وجودی“ کے معنیٰ تو ایک کو موجود جاننے اور غیر معدوم سمجھنے“ کے ہیں۔ اس لیے وہ حضرات مرتبۂ ”علم الیقین“ کے حامل ہوتے ہیں“ ـــــ وحدت الشّہودی صوفیہ، مسئلہ جبر و قدر کے سلسلے میں جبر و قدر پر قدرت و اختیار کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ انسان کو افعال و اعمال کی ادائیگی میں خود مختار مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شرعی اعتبار سے زندگی گزارنے میں افعال و اعمال بھی اسی کے مطابق رُو نما ہوں گے اور شر کا احتمال جاتا رہے گا۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ بندگی کا تقاضا ہے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر بندہ کوئی کام نہ کرے، اور اسی بنا پر وہ اللہ اور آدمی کا تعلق عبد و معبود کا مانتے ہیں۔ وہ کلمۂ توحید کے پہلے ٹکڑے ”لا إلٰہ الا اللہ“ کے معنی ”لا معبود الا ہُوَ“ کے لیتے ہیں۔ ان کا نظریہ ”ہمہ از اوست“ کا ہے اور وہ ”ھُوَ الھَادِی“ کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اس نظریہ کی دلیل پیش کرتے ہوئے حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ”توحید وجودی میں تو مخلوق کا کوئی وجود ہی باقی نہیں رہتا، حالانکہ قرآن مجید میں جا بجا جنابِ اَحدیّت کی صفت خلق کا ذکر وارد ہوا ہے، جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ مخلوقات ذی وجود ہیں اور اگر مخلوقات کا وجود نہیں تو تمام اوامر و نواہی کے احکام بے معنی قرار پا جائیں گے کیونکہ اعمال میں ان کا لحاظ رکھنا صرف اسی صورت میں کوئی معنی رکھتا ہے کہ وجودِ مخلوقات کو تسلیم کیا جائے ورنہ اعمال دنیا پر عذاب و ثواب کو مبنی قرار دینا اور قیامت پر یقین

رکھنا مہمل ہو جائے گا۔ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "شیخ اکبر ابن عربی" نے نفی کائنات سے وجود وحدات کا جو استدلال کیا ہے وہ مقام فنا ہے اور مقام فنا میں چونکہ غلبہ محبت کی وجہ سے محبوب کے سوا ہر چیز مستور ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس مقامِ محویت و فنائیت پر اگر وہ سوائے محبوب کے اور کسی شے کو نہیں دیکھتے" ــــ حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کی اس بات کا تجربہ و مشاہدہ مجھے ایک شکار کے موقع پر یوں ہوا کہ میں نے اپنے شکاری دوست کو دیکھا، وہ بندوق کا نشانہ کرتے وقت کچھ اس طرح محو ہو گیا کہ اِرد گرد کی تمام اشیا اس کی نظروں سے اوجھل ہو کر صرف وہی مطلوب جانور نظر آنے لگا، جس پر وہ نشانہ لگا رہا تھا، چنانچہ نشانہ بازی کی اس محویت کا یہ نتیجہ نکلا کہ جب اس نے گولی چھوڑی تو جانور گر پڑا۔ اس منظر سے محویت کی یکسوئی کا مفہوم اور اِرد گرد کی تمام اشیاء کے غیر معدوم ہونے کی بات بھی سمجھ میں آگئی۔ اس کے علاوہ دوسری دلیل طلوع صبح سے بھی ملتی ہے کہ آفتاب طلوع ہونے کے سبب تمام ستارے چھپ تو ضرور جاتے ہیں مگر معدوم نہیں ہوتے۔ وحدت الشہود کا صوفیہ، فنا فی اللہ کی مثال یوں دیتے ہیں کہ جیسے کسی جلتی ہوئی شمع کی روشنی، ہزار پاور والے بجلی کے بلب کے قریب آکر گم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مخلوق، خالق کل کے بالکل قریب آکر اپنی ہستی کو گم کر دیتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جو اُن کے نزدیک قُرب الی اللہ یا فنا فی اللہ کا درجہ رکھتا ہے۔

یوں تو وحدت الشہودی حضرات بھی وجود کو حق اور واجب الوجود مانتے ہیں، لیکن ان کا کہنا ہے کہ چونکہ ذاتِ مطلق کی صفات کا اظہار صورتوں اور شکلوں میں ہوتا رہتا ہے، اس لیے تمام موجودات اسی ذات واحد کے صفاتی مظہر و مشہود ہیں۔ مظہر و مشہود ہونے کے اعتبار سے وہ یقیناً الگ الگ ہیں مگر جس کے وہ مظہر ہیں، وہ ذات مطلق اور واحد ہے۔ وہ اس کی مثال آئینہ اور عکس سے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کسی آئینہ خانے کے بیچ میں کوئی شمع روشن کر دی جائے تو اس کی روشنی کا عکس آئینہ خانہ کے ہر پارۂ آئینہ میں نظر آئے گا، مطلب یہ کہ شمع کی وحدت کے باوجود ہزار پارۂ آئینہ میں ہزار شمعیں جلتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ اسی کو وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا جلوہ کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ایک ہی وجود حقیقی۔ مختلف صورتوں میں مشہود ہے یعنی وہ مظہر و مشہود کو ذاتِ واحد کی صفات کا جلوہ مانتے ہیں۔ اس کے برعکس وحدت الوجودی صوفیہ، صفات کو ذات سے الگ نہیں مانتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک ایسا ماننا وحدت کے خلاف ہے۔ وحدت الشہود کے ماننے والے بھی کہتے ہیں کہ صفات کو ذات سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ذاتِ واحد سے اگر صفات کو الگ بھی کر دیا جائے تو بھی اس کی ذات کی اصل میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی توضیح کرتے ہوئے ملاّ نورالدین عبدالرحمٰن جامی رہ (و: ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ

مطابق ۷ نومبر ۱۴۱۴ء م : ۱۸ محرم ۸۹۸ھ المطابق ۹ نومبر ۱۴۹۲ء) جو ابن عربی کے فلسفۂ وحدت الوجود میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود "لوائح" میں لکھتے ہیں کہ "اس کی ذات من حیث ذات تمام اسماء وصفات و اضافات سے معرّیٰ ہے، لیکن اس کی صفات ایک معنیٰ میں غیر ذات بھی ہیں اور ایک معنیٰ میں عین ذات بھی"۔ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "ان کی صفات کا ظہور و شہود میں متصف ہونا ثابت ہے اور جیسے جیسے تجلّیات میں کثرت پیدا ہوتی جاتی ہے یہ اتّصاف بھی بڑھتا جاتا ہے مگر وجود مطلق کی حقیقت بجائے خود بدستور اور غیر متغیّر رہتی ہے، خواہ وہ اپنے ظہور کے لیے جو بھی قالب اور اعتبارات کے جو بھی مظاہر اختیار کرے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ نورِ آفتاب سے پاک و ناپاک دونوں چیزیں منوّر ہوتی ہیں لیکن آفتاب بذاتِ خود پاک و ناپاک کچھ بھی نہیں" ـــــ اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ "اگرچہ حقیقتِ وجود، تمام مظاہر میں مشترک ہے، پھر بھی مراتب شیون متفاوت ہیں اور ہر مرتبہ کے لیے الگ الگ اسماء وصفات و اعتباراتِ مخصوصہ ہیں، یعنی مرتبۂ اُلوہیت و ربوبیت کے اعتبارات اور ہیں، مرتبۂ عبودیت و خلقیت کے اور۔" ان سبھوں کو گڈمڈ کر دینا زندقہ کا باعث ہوگا۔ "لوائح" جو نثر میں مولانا جامیؒ کے ارشادات کا مجموعہ ہے، توحید باری تعالیٰ کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے بہترین کتاب ہے، اسی میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "جو صفات مظاہر کے ذریعہ صادر ہوتے ہیں، ان کے صدور کا انتساب از روئے صورت ان کی مظاہر کی جانب صحیح ہے، لیکن نہ از روئے حقیقت کہ نفس الامر میں سب کا انتساب صرف اسی ذاتِ واحد کی جانب صحیح ہو سکتا ہے جس طرح حقیقتِ ہستی مطلق، جمیع موجودات کی ذوات میں شامل و مندرج ہے، اسی طرح اس کی صفات بھی جمیع صفاتِ موجودات میں جاری و ساری ہے"۔

وحدت الشہودی مکتبۂ خیال کے صوفیوں کا کہنا ہے کہ توحید کے سمجھنے والوں کو بھی دھوکا ہوا، اور ذاتِ واحد کے ساتھ ساتھ اس کے صفاتی مظہر و شہود کی بھی پرستش شروع ہو گئی۔ ذاتِ شئے سے غیریتِ شئے کی نفی کا لازمی نتیجہ اباحت و زندقہ نکلا۔ جس نے مسلمانوں میں اتباعِ شریعت کے خلاف فتنے کی وہ بیج بودی کہ الامان والحفیظ حالانکہ مظاہر و مشاہد تو اسی وجودِ مطلق کے ظِلّ و عکس ہیں جو عدم میں منعکس ہو رہے ہیں، لیکن یہ ظلّ، عین صاحبِ ظِلّ نہیں، بلکہ ایک مثال ہے۔ اسی لیے وحدت الشہود کو توحیدِ ظلّی بھی کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ عالم کے کُل موجودات آئینۂ تمثال ہیں اور تمام آئینہ تمثال میں انسان کامل ترین آئینۂ تمثال ہے جس میں آفتابِ حقیقت کی کامل جلوہ گری نظر آتی ہے، جس طرح ایک بیج میں اجمالی حیثیت سے سارا درخت ہوتا ہے اسی طرح انسان سارے مقامات و درجات کا اجمالی پیکر ہے اور ذاتِ واحد کا مظہر ہے اور اس اجمال و اظہار کے اوّل و آخر اور مکمل ترین مظہر پیغمبر اسلام حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت کے طفیل میں اللہ جلّ شانہٗ

انسانوں کو مراتب و درجات عطا فرماتا چلا آرہا ہے اور قیامت تک فرماتا رہے گا۔

اختتام کلام پر عرض کرتا ہے کہ وحدت الوجودی اور وحدت الشہودی مکتبۂ خیال کے دونوں حکما نے ذات باری تعالیٰ اور مخلوقات وممکنات کے رشتوں کے بارے میں اپنے اپنے طور پر جن فلسفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے، انھیں میں نے مختصراً پیش کرنے کی کوشش کی ہے، خاص طور پر دونوں فلسفوں کے بارے میں زیادہ تر باتیں وہی ہیں جو شیخ اکبر اور شیخ مجدد الف ثانیؒ نے لکھی ہیں۔ ان میں میری اپنی رائے کو کوئی دخل نہیں الّا یہ کہ میں نے ایک جگہ "وحدت الشہود" کی بحث میں اپنے ایک تجربہ ومشاہدہ کا ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ کہیں کہیں پر موضوع کی صراحت کے لیے چند اشعار اور کچھ جملوں کے اضافے کیے گئے ہیں۔ البتہ زبان وبیان کی سراسر ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے —

بہر کیف حقیقت حال یہ ہے کہ دونوں مکتبۂ خیال کے حکما کی وضاحتی دلیلوں اور بحثوں کے باوجود یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے اور بحث ومباحثہ کے دروازے بند نہیں ہوئے ہیں، بلکہ قیامت تک بند ہونے کی کوئی امید بھی نہیں، اس لیے کہ فلسفہ کا تو کام ہی عقل کے ذریعے نئے نئے مسائل کا پیدا کرنا ہے۔ مسائل کا سلجھانا اس کا کام نہیں، عقل وتفوّق کے روز نئے نئے کھلونوں کا بنانا اور اس کو توڑنا اس کا مشغلہ ہے — اور عقل کے گورکھ دھندوں سے پرے یہ مسائل اتنے بلند، اتنے پیچیدہ اور اتنے نازک ہیں، جن کو بیان کرنے میں الفاظ بھی پورے طور پر ساتھ نہیں دیتے اور علم وعقل کے محدود دائرے کی حدیں ٹوٹ کر اس طرح بکھر جاتی ہیں کہ فلسفیوں کو خود ہی ان کا ماتم کرنا پڑتا ہے، چنانچہ امام فخر الدین رازی جیسے فلسفی کو بھی آخر کہنا پڑا کہ "معارضا اور مناقضات سے احتراز کیا جائے، اس لیے کہ عقول انسانی ان عمیق اور خفی مسائل میں بیکار محض ہیں"۔ امام موصوفؒ کا یہ قول اس وصیت نامے میں ہے جسے انھوں نے اپنے شاگرد ابراہیم بن ابی بکر اصفہانی کو لکھوایا تھا۔ اس قول کو امام سبکیؒ نے "طبقات الشافعیہ" میں نقل فرمایا ہے، اور اس کا تذکرہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب "تاریخ مشائخ چشت" میں بھی کیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے اسی کتاب میں امام رازیؒ کا ایک قول اور بھی ملا علی قاری کی "شرح الفقہ الاکبر" کے حوالے سے نقل کیا ہے، جس میں امام رازیؒ نے فلسفہ ومنطق اور اپنی عقلی بے بسی کا اعتراف کھلے لفظوں میں کیا ہے "میں نے علم کلام اور فلسفہ کے تمام طریقوں کو دیکھا بھالا، لیکن بالآخر معلوم ہوا کہ نہ تو ان میں کسی بیمار دل کے لیے شفا ہے اور نہ کسی پیاسے کے لیے سیرابی"

حضرت امام شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ العزیز (و: ۴ شوال ۱۱۱۴ھ المطابق ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء م: ۱۱۷۶ھ المطابق ۱۷۶۳ء) نے مسئلہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنے ایک عقیدت مند اسمعیل آفندی کو عربی میں ایک طویل خط لکھا جس میں انھوں نے شیخ اکبرؒ اور شیخ مجدد الف ثانیؒ کے نظریات

میں تطبیق کرنے کی مخلصانہ کوشش کی۔ یہ خط "خیط" وحدت الوجود والشہود" کے نام سے اردو میں شائع ہوکر کتابی صورت میں منظر عام پر آچکا ہے۔ اس خط کا نچوڑ یہ ہے کہ ان کی نظر میں دونوں نظریات ایک ہی ہیں، صرف لفظوں کا اختلاف ہے۔ اس فیصلے سے حضرت شاہ صاحبؒ کی ہرگز یہ غرض نہ تھی کہ کوئی تیسرا فلسفیانہ طریقہ ایجاد کریں، بلکہ وہ صرف دونوں کے نظریاتی جھگڑوں کو مٹانا چاہتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دونوں مسلکوں کے درمیان تطبیق کرنے کی مخلصانہ کوشش کی تھی۔ یہ بات صحیح ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی تحریر سے حضرت مجدّد الف ثانی کے فلسفہ وحدت الشہود کی طرفداری ضرور جھلکتی ہے چنانچہ بحث ومباحثہ اور اختلافات کے دروازے کھل پڑے، اور موافق ومخالف رسالوں کا ایک دفتر قائم ہوگیا۔ اس سلسلے میں مولوی غلام یحییٰ صاحب نے بھی "کلمات الحق"، کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس کا جواب شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے "دین الیا طل"، لکھ کر دیا تھا۔ مولوی غلام یحییٰ دہلوی نے حضرت شاہ ولی اللہؒ سے جب اختلاف کیا تو اس پر اس کے پیر و مرشد حضرت مرزا مظہر جانجاناں نے تنبیہاً ان کو لکھا تھا کہ "مسئلہ تطبیق سے تعرض کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ توفیق بین المکشوفین، اگر تکلف سے خالی نہیں پھر بھی اس میں ایک عمدہ مصلحت پائی جاتی ہے۔" موجودہ صدی کے مفکر اسلام حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی اس مسئلہ میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ العزیز کی کتابوں سے ملاّ اور صوفی کے جھگڑوں کا، بشرطیکہ انصاف سے کام لیا جائے، خاتمہ ہوجاتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے تصوف کے مسائل کو خالص اسلامی تعبیروں میں پیش کرکے مولویوں کی اس بھڑک کو مٹادیا جو ان بیچاروں میں صوفی اور صوفیت سے متعلق پائی جاتی ہے۔" حضرت شاہ ولی اللہ رح کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رح (و: ۱۱۵۹ھ المطابق ۱۷۴۶ء۔ م: ۱۲۳۹ھ المطابق ۱۸۱۸ء) نے بھی ان دونوں مسئلوں میں تطبیق کی سعی فرمائی، ان کا خیال ہے کہ "وحدت الوجودی حضرات، مرتبۂ ذات میں درست ہیں اور وحدت الشہودی حضرات تعینات کے درجہ میں واجب القبول اور صحیح ہیں لہٰذا دونوں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں، حقیقت حال یہ ہے کہ یہ باتیں وجدان وذوق سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کو عقلی دلائل سے سمجھنا یا سمجھانا آسان بھی نہیں اور درست بھی نہیں!

مسئلہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے علاوہ مسئلہ ذات وصفات، مسئلہ وجود وظہور مخلوقات وممکنات، مسئلہ تنزلات یعنی مراتب وجود خلق، مسئلہ جبر وقدر وغیرہ ایسے دقیق اور نازک مسائل ہیں، جن میں الجھنے کی قرآن واحادیث میں ممانعت آئی ہے۔ نیز تمام بزرگان سلف اور صاحبانِ روشن ضمیر نے بھی متوجہ ہونے کو منع فرمایا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان مسائل کو عقلی دلائل سے سمجھنے کے

ہمارے مسلمانوں کے لیے صراط مستقیم یہی ہے کہ بس اسی پر اکتفا کرنی چاہیئے جہاں تک اللہ اور رسول ؐ کی کتابیں ہدایت اور رہنمائی کرتی ہیں، ورنہ یہ بحثیں وہ ہیں جن میں فائدہ سے زیادہ نقصان کا خدشہ ہے!

میں نے مندرجہ بالا سطور میں فلسفۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بے حد مختصر اور تشنہ ہے خاص طور پر بخوفِ طوالت ان تاریخی تفصیلات سے پہلو تہی برتی ہے کہ وحدت الوجودی فلسفہ کا ماخذ کیا ہے؟ اور یہ فلسفہ کیسے کیسے مسلمانوں میں رائج ہوا اور اس فلسفہ میں اسلامی روح کتنی ہے نیز ویدانتی اور یونانی اثرات کتنے ہیں۔ بات اصل یہ ہے کہ اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ قلم اٹھانا اور تمام گتھیوں کو سلجھانا نیز تمام گرہوں کو کھولنا کوئی آسان کام نہیں، اس کے لیے بے حد گہرا علم اور بے حد روشن دل کی ضرورت ہے، اور ان دونوں چیزوں کا یکجا ہونا محض عطیۂ خداوندی پر منحصر ہے، سو میں کہہ سکتا ہوں کہ جتنا بھر اللہ نے اپنے خزانۂ قدرت سے مجھے علم عطا فرمایا ہے اور دل کو جتنی بھر روشنی بخشی، میں نے مخلوق تک پہنچانے میں کوتاہی نہیں برتی، اور جو بات معلوم ہی نہ ہو سکی یا دل، بعض کوائف سے مکیف ہی نہ ہو سکا ان باتوں کا سمجھنا یا لکھنا تو میرے بس کے باہر کی بات ہے۔ قرآن پاک میں خالق لوح و قلم خود ارشاد فرماتا ہے "وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ" یعنی بندہ اس کے علم میں سے کسی چیز کو بھی اپنے احاطۂ علم میں لا ہی نہیں سکتا، مگر اتنا ہی بھر جتنا اللہ اپنے فضل و کرم سے عطا فرما دے! اللہ بس باقی ہوس!!

سائنسی موضوعات پر
مکتبہ پیام تعلیم کی فخریہ پیش کش
کمپیوٹر
کیا ہے
سائنس کی دنیا
فرید الدین احمد
یہ کیسا بخار ہے؟
گندا پانی
عجائب گھر
آپ
کا
جسم
علی ناصر زیدی
قیمت ۶/-

تاخیر سے ملنے کی وجہ سے یہ مضمون گذشتہ شمارہ خصوصی مطالعہ "خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات" میں شامل نہیں ہو سکا۔ ادارہ اس کے لیے معذرت خواہ ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی
ڈی۔ ۱۵۹ بلاک نمبر ۲
گلشن اقبال
کراچی۔ پاکستان

خواجہ حسن نظامی کی "آپ بیتی"

"میں نے ایک ایسی کاوش کا آغاز کیا ہے جس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ مکمل ہونے کے بعد اس کی تقلید بھی نہ ہو سکے گی۔ میرا مقصد اپنی جنس کے سامنے ایک ایسی انسانی شبیہ پیش کرنا ہے جو بہ ہمہ وجوہ فطرت کے عین مطابق ہو۔ میں جس آدمی کی شبیہ پیش کروں گا وہ خود میں ہوں گا۔

"صرف میں"

اِن الفاظ کے اظہار سے فرانسیسی دانشور روسو نے خود نوشت کو ایک عام انسان کی سطح تک پہنچا دیا۔ روسو سے پہلے خود نوشت کے قدیم مرتبین میں اس کا مقصد عیسائی عقیدے کی پیروی میں "اعترافات گناہ" یا بہتر مستقبل کے حصول کے لیے ماضی کی ناکامیوں کو ذہن کے سامنے لانا۔ اس کی مثال سینٹ آگسٹائن کے اعترافات ہیں۔ خود نوشت کے سلسلے قدیم وجدید کی بحث کرتے ہوئے ایک انگریز نقاد نے بڑا چبھتا ہوا فقرہ لکھا ہے کہ "رومانی اور عصر جدید کی خود نوشتوں میں صرف یہ فرق ہے کہ اول الذکر عیسائی دور عروج کے اعترافات گناہ کی پیرو ہیں اور آخر الذکر سیکولر نقطۂ نظر کی ترجمان۔ اعترافات کا مقصد حصولِ نجات۔ لیکن خود نوشت کا مقصد انفرادیت کا اظہار ہے[1] ان گراں مسائل پر غور کرنے سے پہلے کچھ ابتدائی باتیں۔

ہر انسان کے تجربات و مشاہدات دوسرے انسانوں کے لیے دلچسپی، عبرت اور بصیرت کا سبب بنتے ہیں۔ آدمی چھوٹا ہو یا بڑا اس کے پاس دوسروں کے لیے ایک پیغام ضرور ہوتا ہے۔ مگر اکثر و بیشتر یہ پیغام دوسروں تک پہنچ نہیں پاتا کہ ہر انسان میں بیان اور اظہار کا صحیح سلیقہ نہیں ہوتا۔ نیز اپنی شخصیت کے اچھے اور کمزور دونوں پہلوؤں کو انصاف اور دیانت کے تقاضوں کے ساتھ بے نقاب کرنے کا حوصلہ بھی کم ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قوتِ تحریر سے نوازا ہے ان میں سے بعض نے اپنی اور بعضوں نے دوسروں کے حالاتِ زندگی مشاہدات اور تجربات کو قلم بند نہیں کیا ہے۔ اپنے حالاتِ زندگی رقم کرنے والوں کی راہ خاصی کٹھن اور دشوار گزار ہوتی ہے۔ مغرب کی بے تکلفانہ فضا میں ناگفتنی بھی گفتنی کے ذیل میں

---

1. PETER ABBS - AUTOBIOGRAPHY: QUEST FOR IDENTITY

...بیان ہو جاتی ہے اور رکھنے والے کی شخصیت کے نفسیاتی مطالعے نیز سیرت اور کردار کے جائزے میں معاون ہوتی ہے۔ مشرق کے مزاج کا تکلف ناگفتنی تو کیا گفتنی کو بھی منظر عام پر لانا گوارا نہیں کرتا لیکن مغرب ہو یا مشرق قدر مشترک یہ ہے کہ پوری خود نوشت پڑھ جائیے حقیقی انسان سے ملاقات چند ہی لمحوں کے لیے ہوتی ہے۔ باقی سارا وقت تاریخی معاشرتی سیاسی یا علمی مباحث کی نذر ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے بعض معلم نقادوں نے اپنے عہد کی قابل ذکر خود نوشتوں کو تشخص کی تلاش قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں شکایت کی وجہ یہ کہ پوری زندگی میں ہم اپنے آپ سے بھی چند ہی لمحوں کے لیے ملتے ہیں باقی سارا وقت اپنے آپ کی جستجو یا فہد فروعی باتوں میں ضائع ہو جاتا ہے۔ بہر حال خود نوشت میں حقیقی انسان سے ملاقات ہو یا اس کے عمومی منظر نامے سے۔ یہ ملاقات ہوتی بڑی دلچسپ ہے۔ شاید اسی وجہ سے اردو زبان ہی میں نہیں دنیا کی تمام زبانوں میں خود نوشت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ برصغیر کے حوالے سے بیسویں صدی میں گاندھی جی کی "تلاش حق" اور نہرو کی "آپ بیتی" کو بڑی شہرت ملی۔ عالمی سطح پر ہٹلر کی "مین کیف" اور مسولینی کی خود نوشت ایک زمانے میں بڑی مقبول تھیں۔ ایڈورڈ ہشتم کی "ایک بادشاہ کی کہانی" اور مسز سمپس کی "دل کی منطق سب سے الگ" نیز ادبی خود نوشتوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی گئیں۔ ادبی خود نوشتوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔

خود احتسابی بڑا مشکل عمل ہے۔ انا گزیدہ ادیب اور قلم کار جب اپنے بارے میں قلم اٹھاتا ہے تو غیر شعوری طور پر اپنے گرد ایک رومانی ہالا بھی تعمیر کرتا ہے۔ ادیب اور اہل قلم پر کیا منحصر خود کو نمایاں کرنے کا جذبہ ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ جب ہم کسی ایسے واقعے کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں ہماری ذات بھی شامل ہو تو بالعموم ہیرو کی حیثیت ہمیں کو حاصل ہوتی ہے۔ ہماری خامیاں بھی ہمارے لیے حسن کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم یا تو ان کے بیان سے گریز کرتے ہیں یا ان پر خوبیوں کا ایک دبیز غلاف چڑھا دیتے ہیں۔ اپنی ذات کا معروضی مطالعہ ممکن بھی نہیں۔ انسان دوسرے انسانوں کو اپنی ذاتی پسند۔ ناپسند کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اپنے مطالعے میں یہ انداز برقرار نہیں رہ سکتا۔ معدودے چند خود نوشتوں کے علاوہ کسی خود نوشت کے مطالعے سے صاحب تحریر کے مزاج اور جذبات و تاثرات کا صحیح اندازہ مشکل ہے۔ خیر و شر کا وہ توازن جس سے انسان عبارت ہے خود نوشتوں میں بے احتیاطی کی وجہ سے برقرار نہیں رہتا۔ بہت ممکن ہے کہ خود نوشت مرتب کرنے والے بے احتیاطی اور اظہار انا سے بچنے کے لیے پس منظر اور ماحول کے تفصیل بیان پر اسی وجہ سے زور دیتے ہیں۔ بیشتر خود نوشت مرتب کرنے والے اس صنف کا پورا چیلنج قبول نہیں کرتے۔ صرف خارجی عناصر کو تشکیل دیتے ہیں۔ تمنا یہ ہوتی ہے کہ ایک ایسی عام پسند تصویر مرتب ہو جس سے مصنف اور قاری دونوں کی تسکین نفس ہو تاہم ان تمام باتوں کے باوجود انسانی مزاج اور فکر کا بہترین مطالعہ خود نوشت ہی میں نظر آتا ہے۔ ذات کا طلسم کہیں کھلتا ہے چند ہی لمحوں کے لیے سہی مگر کھلتا تو ہے۔

اردو زبان میں خود نوشتوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تاہم محمد جعفر تھانیسری کی "تواریخ عجیب" اور ظہیر دہلوی کی "داستان غدر" سے ڈاکٹر وزیر آغا کی "شام کی منڈیر" اور قدرت اللہ شہاب کے "شہاب نامے" تک ایک پورا سلسلہ ہے۔ خود نوشت قلم بند کرنے والوں میں خواجہ حسن نظامی سر رضا علی۔ چودھری افضل حق، عبدالمجید سالک، عبدالماجد دریابادی، حکیم احمد شجاع، نقی محمد خاں خورجوی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، کلیم الدین احمد، احسان دانش، جوش ملیح آبادی ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، مرزا ادیب، شہرت بخاری، ڈاکٹر وزیر آغا، قدرت اللہ شہاب، مسعود حسین خاں، آل احمد سرور اور حمید نسیم کے نام بہت معروف ہیں۔ بعض اہل قلم نے اپنی زندگی کے خاص واقعات یا کسی مخصوص دور کے حالات قلم بند کیے ہیں پوری زندگی کا جائزہ پیش نہیں کیا۔ مثلاً مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے واقعات بڑے دلچسپ پیرایے میں تحریر کیے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ کے پس منظر میں "آشفتہ بیانی میری" مرتب کی۔ دیوان سنگھ مفتوں نے اپنی صحافتی زندگی کے اہم واقعات "ناقابل فراموش" میں بیان کیے۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ ساری خود نوشتیں پوری زندگی کی روداد پر محیط ہیں یا محض اہم واقعات کا اظہار، لکھنے والوں نے اپنی شخصیت کے مکمل اور بھرپور اظہار سے پہلو بچایا ہے۔ کہیں کہیں یک رخی تصویر بھی پیش کی ہے۔ اس ضمن میں مرزا فرحت اللہ بیگ کی مختصر خود نوشت کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اسے پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ محنتی اگر تھے تو مرزا فرحت اللہ۔ سوجھ بوجھ اگر رکھتے تھے تو مرزا فرحت اللہ، معاملہ فہم، حاضر دماغ، نڈر، بیباک اور کھرے اگر تھے تو مرزا فرحت اللہ ان کی قد اور شخصیت کے سامنے باقی تمام لوگ محض بونے تھے۔ اگرچہ یہ انداز عام نہیں ہے۔ عام انداز انکساری اور فروتنی کا ہے حالانکہ یہ بھی خود تشہیری کا ایک منفی انداز ہے مگر اس سے بھی شخصیت کا صرف ایک ہی رُخ سامنے آتا ہے۔ خود نوشت میں ہم وہی دیکھتے ہیں جو مصنف ہمیں دکھانا چاہتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ ہماری نگاہ ان گوشوں پر نہ پڑ جائے جو کچھ تاریک ہیں یا جن سے اس کی ذات کی نفی ہوتی ہے۔ سر رضا علی نے اپنی خود نوشت "اعمال نامے" میں حسن و محبت کا ایک پورا باب قائم کیا ہے۔ عنوان سے یہ گمان ہوتا ہے کہ مصنف اس باب میں اپنی داستان محبت بیان کرے گا لیکن عشق و ہوس کی توضیح کے بعد اردو شاعری میں تصور محبوب کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے اور اپنی بابت چند جملوں میں ایسا مبہم بیان ملتا ہے جس سے قاری کی حیرت اور الجھن دونوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ ایک طولانی بیان اور عشق و ہوس کی بحث کے بغیر بھی شادی کے واقعے کو غیر مبہم انداز میں بیان کرنا بہتر اور مناسب ہوتا۔ یہ صورت حال اس وجہ سے پیش آئی کہ قصد اور ارادے کے باوجود مصنف جرأت رندانہ سے کام نہ لے سکا۔ خود نوشت مرتب کرنے والوں کا مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ تحفظاتی اخفا اور معاشرتی اشرافیت کی قوی کمزوری کے حصار کو توڑنے کی ہمت نہیں کرتے۔

اردو خود نوشتوں کے ذخیرے میں ایک خود نوشت ایسی بھی ہے جس کے مصنف نے ابہام اور گریز پائی کے تمام حیلوں سے انحراف کیا ہے اور اپنی شخصیت کے ایسے گوشوں کی نقاب کشائی بھی کی ہے جنھیں عام طور پر واضح نہیں کیا جاتا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عام طور پر خود نوشت مرتب کرنے والے اس وقت اپنے حالات زندگی قلم بند کرتے ہیں جب زندگی گزارنے کا صحیح ادراک برقرار نہیں رہتا۔ عقاید اور اقدار کے ایک مہیب انتشار میں خود نوشت کو تخلیقی احساس اور باطنی تشخص کے جزوی حصول کے لیے فروغ دیا جاتا ہے مگر ہم جس مصنف کا جائزہ لے رہے ہیں وہ اپنی خود نوشت کی ترتیب کے زمانے میں زندگی کے ادراک سے محروم ہونے کے بجائے زندگی گزارنے کے سلیقے سے بتدریج آگاہ ہو رہا تھا۔ یہ مصنف ہیں خواجہ حسن نظامی، خود نوشت کا نام ہے "آپ بیتی"، خواجہ حسن نظامی بیسویں صدی کی عہد ساز شخصیت ہیں۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی دل و دماغ سے نوازا تھا۔ انھیں حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کے آستانہ مبارک میں پرورش پانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ خواجہ صاحب کی زندگی جہدِ مسلسل، حوصلہ مندی، خود اعتمادی، بلند نگاہی، خلوص اور یقینِ محکم کا دل کش، شان دار اور پُر تاثیر مُرقّع ہے۔ ایک بچّہ کہ انتہائی غریب لیکن غیرت مند اور بزرگ نسبت والدین کے یہاں آنکھ کھولتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ والدین دولت علم سے محروم ہیں۔ والد وابستگان درگاہ محبوبی میں ہیں لیکن اپنے دوسرے بھائی بندوں کی طرح زائرین کے سامنے دست سوال دراز کرنے کے بجائے کتابوں کی جلدیں باندھ کر رزق حلال حاصل کر رہے ہیں۔

یہ بچہ پیرزادوں کے عام ماحول میں بچپن گزارتا ہے لیکن ان کی خصلتیں اختیار نہیں کرتا باپ بھائی سے صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ علم کا شوق ہے۔ علم حاصل کرتا ہے۔ روزی کمانے میں محنت کرتا ہے۔ محنت سے شرماتا نہیں۔ کسی محنت کے کام میں عار نہیں۔ آدمی موجود نہیں ہے تو رسالوں کا بھاری بنڈل خود اٹھا کر ڈاک خانے لے جاتا ہے۔ اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ دیکھنے والے کیا کہیں گے۔ اپنی ذہنی قوتوں کو ترقی دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی تحریریں ملک میں مقبول ہوتی ہیں۔ عقیدت مند اس کے گرد جمع ہوتے جاتے ہیں چالیس کے سن تک پہنچتے پہنچتے اسے ایسی روحانی بزرگی حاصل ہو جاتی ہے کہ ہزاروں انسان اس کے حلقہ ارادت میں داخل ہو جاتے ہیں مگر اسے اپنی پیرزادگی، روحانی بزرگی اور قلمی طاقت پر گھمنڈ نہیں۔ وہ اپنی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہے اور اس میں ان کے بیان کی جرأت بھی موجود ہے۔ اس جرأت سے یہ نفسیاتی نکتہ سامنے آتا ہے کہ جب تک انسان کو اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا احساس رہتا ہے اسی وقت تک وہ اپنی صلاحیتوں کو ترقی دیتا رہتا ہے۔ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ جہاں یہ منزل آگئی کہ "ہم کامل و اکمل ہو گئے"، "ہمچو من دیگرے نیست" وہیں ذہنی اور روحانی ترقی کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ خواجہ حسن نظامیؒ زندگی بھر خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہے۔ یہی جستجو ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

خواجہ حسن نظامیؒ نے اپنی خود نوشت اختصار کے ساتھ لکھی ہے۔ اس لیے کہ یہ کتاب صرف ایک سو چالیس صفحات پر محیط ہے اور اُسے بہت قلم روک کے لکھا گیا ہے۔ کتاب میں جا بجا ایسے مباحث بھی آ گئے ہیں جن کا روداد حیات سے راست تعلق نہیں مگر مصنف نے ان کی اہمیت کو محسوس کیا ہے اور خلق خدا کے افادے بالخصوص اپنے مریدوں کی ہدایت کے لیے قلم بند کرنا ضروری سمجھا۔ اگرچہ ان سے خود نوشت کے مجموعی ڈھانچے پر اثر پڑا ہے۔ تاہم مصنف کے نقطۂ نظر کی توسیع کے لیے شاید یہ ناگزیر تھا۔ خواجہ حسن نظامی کا خیال اور ارادہ یہ تھا کہ وہ اس آپ بیتی،، میں گفتنی اور ناگفتنی تمام باتیں لکھیں۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا بھی ہے لیکن ان کے بہت سے تعلیم یافتہ مریدوں نے اس آزادانہ قلم بند ہونے والی تحریر کی مخالفت کی اور یہ خدشہ ظاہر کیا کہ آزادہ روی اور آزاد خیالی سے بندگان خدا کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

خواجہ صاحب کے دو نہایت جاں نثار رفقا ملا واحدی اور بھیا احسان کا خیال تھا کہ سب کچھ لکھا جائے اور کسی بات کو چھپایا نہ جائے ،، خدا کی مخلوق کے سامنے خواجہ صاحبؒ کی وہی صورت پیش ہو جیسی کہ وہ تھی یا جیسی کہ وہ ہے ،، مولانا عبدالماجد دریا آبادی بھی اسی خیال کے حامی تھے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے مریدوں کی مخالفت کے باوجود سارے اچھے برے واقعات لکھ دیے مگر انھوں نے اس سلسلے میں اکبر الہ آبادی سے بھی مشورہ کیا۔ خواجہ صاحب اکبر کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ان کی بزرگی کے بڑے قائل تھے۔ اکبر نے ہر قسم کے واقعات قلم بند کرنے کے خلاف رائے دی۔ اکبر کی اس رائے کے بعد خواجہ صاحب نے ایسے تمام واقعات کتاب سے خارج کر دیے جن سے عام پڑھنے والوں میں غلط فہمی اور بدگمانی پھیل سکتی تھی تاہم بعض ایسے واقعات جنھیں شہرت اور بزرگی کے نصف النہار پر پہنچ جانے والا کوئی انسان بیان کرنا گوارا نہیں کرے گا خواجہ صاحبؒ نے بڑی بے تکلفی سے بیان کر دیے ہیں۔

خواجہ صاحبؒ کی آپ بیتی اس لحاظ سے بڑی اہم اور قابل توجہ ہے کہ اس کی تالیف ہی کے زمانے میں اس کے بارے میں دو مکاتیب فکر وجود میں آ گئے تھے۔ ایک مکتب فکر مشرق کی دیرینہ روایات کا پابند اور ادب آداب کا قائل تھا۔ یہ لوگ بزرگوں کو عام انسانی سطح پر دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے حالانکہ صوفیائے کرام نے اپنی زندگی کے واقعات کو چھپایا نہیں۔ حضرت سلطان المشائخ نے یہ واقعہ خود بیان فرمایا کہ میں نے ایک لمحہ شیخ نجیب الدین متوکل سے گزارش کی تھی ،، حضرت فاتحہ پڑھ دیجیے کہ میں کسی جگہ کا قاضی ہو جاؤں ،، شیخ نے خاموشی اختیار کی۔ حضرت نے جب دوبارہ گزارش کی تو فرمایا ،، قاضی مشو چیزے دیگر بشو ،، یہ ایک طرح کا انتباہ تھا کہ دنیاوی مناصب کے خیال میں مت رہو۔ حضرت نے ایک اور جگہ واضح طور پر فرمایا ہے کہ جب شیخ فریدؒ نے مجھ سے ارشاد کیا کہ دشمنوں کو راضی کرو اور جس کا جو حق ہے ادا کرو تو مجھے یاد آیا کہ دہلی میں ایک ہزار کے بیس جیتل مجھے ادا کرنا ہیں اور ایک

شخص سے ایک کتاب مطالعے کے لیے لی تھی وہ کھو گئی۔ اب دوسری کتاب نقل کرا کے اسے دینا چاہیے۔ حضرت نے یہ واقعات بیان کر دیے۔ ان بیانات میں حضرت کو کوئی سبکی نظر نہیں آئی۔ یہ روحانی نشو و نما کی روداد کا ایک حصہ ہیں۔ خواجہ صاحب کو روکنے اور منع کرنے والوں نے اس نقطۂ نظر سے غور نہیں کیا چنانچہ "آپ بیتی" کے ایک دیباچہ نگار رعنا احسان نے اپنے دیباچے میں برملا لکھا ہے۔

"جو لوگ خواجہ صاحبؒ کے ساتھ عرصے سے دوستانہ یا نیازمندانہ تعلقات رکھتے ہیں وہ بلا تامل یہ کہہ دیں گے کہ حالات مکمل نہیں ہیں اور ان میں کچھ قطع برید بھی ہوئی ہے۔ یہی میرے نزدیک آپ بیتی میں وہ سب سے بڑا نقص ہے جس نے گو اس کی نفع رسانی اور دلچسپی پر شاید زیادہ مضر اثر نہیں ڈالا ہے لیکن اس کے موضوع تالیف یعنی تاریخ کی اہمیت کو یقیناً گھٹا دیا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر خواجہ صاحبؒ آپ بیتی میں سارے واقعات بے کم و کاست قلم بند کر دیتے تو اس کی حیثیت اور اہمیت کچھ اور ہی ہوتی لیکن اپنی موجودہ شکل میں بھی یہ جرات اظہار کا ایسا مرقع ہے جس کی کوئی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ بھلا ایسا ہمت کا دھنی کون ہو سکتا ہے جو اپنے عیوب کو برملا بیان کرے اور ان تمام باتوں کو ہانکے پکارے ظاہر کر دے جس کے نام ہی سے لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے۔

"مجھ پر تو اس یاس کی حالتوں نے ایسا اثر ڈالا کہ اپنے خاندان کے دوسرے بچوں کی طرح میں بھی بھیک مانگنے لگا۔ جو کچھ نذر ہو اس غلے میں ڈال دیجیے اور دو آنے آئے تو ایک آنہ چرا کر ایک آنہ ظاہر کرنے لگا۔"

"میں کبھی کبھی جوتیوں کی رکھوالی کر کے پیسے کماتا تھا۔"

"سفلی اعمال کا کوئی بدتر سے بدتر طریقہ بھی باقی نہیں چھوڑا اور اس غلیظ کوچے کی ہر گلی کو دیکھا۔"

"میں پندرہ سال کا تھا۔ دہلی میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی اور اس کا بہت چرچا تھا یہاں تک کہ سقوں نے اپنی مشکیں اور دھوبیوں نے اپنے بیل فروخت کر کے اس کمپنی کا تماشا دیکھا تھا۔ اس کمپنی کے مالک درگاہ میں آئے تو کچھ مفت کے ٹکٹ دے گئے۔ میں بھی درگاہ والوں کے ساتھ یہ مفت کا تماشا دیکھنے گیا۔۔۔۔"

"پہلا تماشا دیکھ کر میں دیوانہ ہو گیا۔۔۔۔۔"

کھانا پینا، سونا، پڑھنا، سب زہر معلوم ہوتا تھا اور تماشے کے سوا کسی چیز کا خیال نہ آتا مگر میرے پاس روپیا پیسا نہ تھا جو دوبارہ ٹکٹ لے کر تماشا دیکھتا۔"

اس زمانے میں ایک شخص نے درگاہ کی نذر کے مجھ تین روپے دیے جن سے
میں نے بارہ راتیں مسلسل تماشا دیکھا۔ اس زمانے میں ایک عمل پڑھنے کا شوق
تھا اور اس کے سبب رات کو درگاہ میں سوتا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد
کھانا کھا کر میں درگاہ میں آتا اور وہاں سے چپ چاپ چار میل طے کر کے
دہلی پہنچتا۔ چار آنے کا ٹکٹ لے کر تماشا دیکھتا اور پھر رات کو دو بجے جنگل
بیابان اور ڈراؤنے راستے سے گزر کر چار میل کی مکرر مسافت پیدل طے کر
کے درگاہ میں آتا اور سو جاتا۔ عمل پڑھنا روزمرّہ ہو گیا اور تھیٹر کی تکان کے سبب
ہر وقت میری آنکھیں سُرخ اور خمار آلود رہتی تھیں اور لوگ سمجھتے کہ میں عبادت
اور شب بیداری معروف رہتا ہوں اور بھائی سمیت سب گھر والے میرے
بہت معتقد ہو گئے تھے"۔

آخری اقتباس اس قدر طویل ہے مگر اس سے خواجہ صاحبؒ کی سیرت کا ایک اہم پہلو
نمایاں ہوتا ہے۔ بظاہر تو یہ جوانی کے ایک شوق کا بیان ہے۔ جوانی دیوانی یونہی تو مشہور نہیں۔
ایک طوفان ہوتی ہے جو اپنی رو میں سب کچھ بہالے جاتی ہے۔ قابل غور بات خواجہ صاحبؒ
کی شدت پسندی ہے کہ بارہ راتیں مسلسل دیکھتے رہے۔ شدت پسندی ان کے کردار اور شخصیت
کی بڑی اہم خصوصیت ہے مثلاً واحدی صاحب سے ناراض ہوئے اور یہ طے کر لیا کہ سال بھر
ان کے یہاں نہیں جائیں گے تو پورا سال ہی گزار کر ان کے یہاں گئے اور اپنے عہد کو نباہ دیا۔
پھر یہ بھی کہ تھیٹر کے شوق کو بے کم و کاست بیان کر دیا۔ انسان ہر نئی چیز میں کشش محسوس کرتا
ہے اور اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ بعض شدت پسندی سے کام لیتے ہیں۔ بعض اعتدال پر
قائم رہتے ہیں۔ شدت پسندی حوصلہ اور اعتماد چاہتی ہے۔ حوصلے اور اعتماد کے بغیر شدت
پسندی پر قائم رہنا مشکل ہے۔ اعتدال کی راہ نسبتاً آسان ہے۔ مگر یہ عظمت اور بزرگی کی
راہ نہیں۔ محبت اور نفرت دونوں کی بنیاد شدت پسندی پر ہے۔ مومن بھی اپنی محبت
اور نفرت میں شدید ہوتا ہے۔ بقول اقبال "اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق" یہ
"اشدّٓ علی الکفار" اور "رُحماءُ بینھم" کی طرف واضح اشارہ ہے۔

خواجہ صاحبؒ نے ناگفتنی کے ساتھ ساتھ اپنی اچھی بری خصلتیں بھی بیان کی ہیں۔
اچھی خصلتیں تو سبھی بیان کرتے ہیں۔ مزے لے لے کر۔ شان اور تمکنت کے ساتھ۔ بری خصلتیں
کا بیان صرف خواجہ صاحبؒ کے یہاں ملتا ہے۔ اپنی خود پسندی، خوشامد پسندی، رائے کی
بے استقلالی، ضد، ہٹ دھرمی اور سنگ دلی کو خواجہ صاحب نے خصوصیت کے ساتھ
بیان کیا ہے۔ بہت کم انسان ایسے ہوں گے جو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ان کے مرتکب
نہ ہوئے ہوں مگر اعتراف کون کرتا ہے۔ خود پسندی کے مظاہرے شب و روز ہوتے
ہیں۔ ہم انھیں دیکھتے دیکھتے تھکتے نہیں، عادی ہو گئے ہیں۔ موقع محل کی مناسبت سے خود
بھی اس پر عمل کر لیتے ہیں۔ ڈینگ ہانکنے اور شیخی بگھارنے میں لطف بھی بہت آتا ہے حالانکہ

اپنا قدم بڑھانے کا یہ عمل در اصل اپنی کوتاہ قامتی کا اظہار ہے مگر یہ کھیل جاری ہے اور جاری رہے گا۔ کبھی ظاہری انکسار کے پردے میں کبھی نخوت کے پیرائے میں۔ خوشامد کو سر سید نے دل کی مہلک ترین بیماری سے تعبیر کیا ہے مگر نظیر اکبرآبادی بھی ایک سچا شاعر تھا کہہ گیا ہے "جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے"، روزانہ خوشامد، خوشامدی اور خوشامد پسند پر ہزار بار لعنت بھیجنے کے باوجود اس "فن و فن شریف" کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ہم سب کوشاں رہتے ہیں، گاہے سلیقے سے۔ گاہے بھونڈے انداز سے۔ بس اس کا اعتراف نہیں کرتے مگر مجرم ہم سب ضرور ہیں۔ خواجہ صاحبؒ پر آفریں ہے صاف صاف لکھ دیا "خوشامد میرا دل خوش کر دیتی ہے" یہ بڑی بات ہے اور بڑے حوصلے کی بات ہے۔

رائے کی بے استقلالی سے قوت ارادی اور قوت فیصلہ کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ ادھر کسی نے چکنی چپڑی باتیں کیں۔ سبز باغ دکھائے یا دلیلوں کا جال بچھایا اور ادھر کمزور ارادے والے کے یہاں تذبذب اور بے یقینی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ فوراً رائے بدل دی اور صلاح دینے والے کے مشورے پر عمل پیرا ہو گئے۔ خواجہ صاحبؒ نے اپنی اس کمزوری کو بیان کیا ہے مگر قابل غور یہ نکتہ ہے کہ رائے کی بے استقلالی کے ساتھ ساتھ ان میں ضد اور ہٹ کا مادہ بھی بہت زیادہ تھا انھوں نے خود اپنی اس کیفیت مزاج کو بیان کیا ہے مگر یہ سب ان کی شدت پسندی کے مختلف مظاہر ہیں۔ ایک رائے قائم کی۔ کسی نے تردید کی تو اس کے ہم نوا ہو گئے۔ یہ بھی شدت پسندی کی ایک شکل ہے کہ دوسرے کی رائے سے فوری طور پر متاثر ہوئے مگر پھر جو فیصلہ کیا تو ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر فیصلے سے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب رہ گئی سنگ دلی۔ خواجہ صاحبؒ نے جس کیفیت کو اپنی سنگ دلی سے تعبیر کیا ہے وہ در اصل سنگ دلی نہیں ایک ایسی ارفع ذہنی اور روحانی سطح کا اظہار ہے یہاں شادی و غم کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ غالب نے اس کیفیت کو "غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس"، کہا ہے مگر عام آدمی اسے کیا سمجھے۔

یہ ساری خامیاں جو خواجہ صاحبؒ نے اپنی آپ بیتی میں ایک ایک کر کے گنوائی ہیں عام انسانی خامیاں ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی ان سے مبرا نہیں مگر ہماری جھوٹی انا ہمیں ان کے اظہار سے باز رکھتی ہے۔ خواجہ صاحب سچے اور پُر عظمت انسان ہیں۔ انھوں نے اپنی کسی خامی کو چھپایا نہیں۔ الم نشرح کیا تاکہ پڑھنے والے پڑھیں اور خود کو ان سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ خود احتسابی کے بارے میں ابتدا ہی میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ خواجہ صاحب کے یہاں یہ عمل بہت واضح ہے۔ اس عمل کی وجہ سے آپ بیتی کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی ہے یہ ایک سچے آدمی کی سرگزشت ہے جو سچے دل سے خلق خدا کی رہنمائی کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ سب سے پہلے خود اپنی ذات ہی کو معرض بحث میں لاتا ہے اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو بیان کر کے ایک مثال قائم کرتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے کے فن میں بھی اور سیرت و کردار

انسانی کی افہام و تفہیم میں بھی۔

خواجہ صاحبؒ نے یہ آپ بیتی اکتالیس برس کی عمر میں مرتب کی تھی یہ عمر انسانی ذہن و فکر کے عروج کی عمر ہے مگر ایسی عمر بھی ہے جب انسان اپنے خیالات و نظریات کے اظہار میں بیباک نہیں ہوتا۔ مصلحت کے تقاضوں کو مدّ نظر رکھتا ہے کہیں میری حقیقی شخصیت آشکار نہ ہو جائے لوگ میری کمزوریوں سے واقف نہ ہو جائیں۔ میری خامیوں سے آگاہ ہو کر میرا مذاق نہ اڑائیں۔ بڑھاپے میں اس قسم کے خدشے عام طور پر لاحق نہیں ہوتے۔ ایک انگریز دانشور ٹامس مان نے صاف صاف لکھا تھا۔ اب میں عمر کی اس منزل میں ہوں کہ مذہب کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار میں کوئی احتیاط برتنے کی ضرورت نہیں۔ اب مجھے اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا، اکتالیس برس کی عمر میں خواجہ صاحب یقیناً مرحلہ سود و زیاں سے گزر رہے ہوں گے مگر انھوں نے آپ بیتی میں شہرت کو نقصان پہنچانے والے عناصر کے بیان سے پہلو تہی نہیں کی۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خواجہ صاحبؒ نے احتیاط برتنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جو لوگ اپنی شخصیت کے گرداگرد تقدیس۔ پاکبازی یا عظمت کا ایک مصنوعی ہالا تعمیر کر لیتے ہیں وہ ہمیشہ احتیاط سے کام لیتے ہیں تاکہ ان کے بارے میں غلط فہمی کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ خواجہ صاحبؒ نے کاروباری محاور کے مطابق ،، جیسا ہے اور جہاں ہے ،، کو بنیاد بنایا اور اسی سے اپنی عظمت کے تقدس اجاگر کیے انھیں تقدس کے معنوی ہالے کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ بزرگی انھیں ورثے میں ملی تھی مگر خواجہ صاحبؒ نے اسے شہرت کا ذریعہ نہیں بنایا۔

عمر کی آخری منزل میں پہنچ جانے والا انسان زندگی کے سلیقے اور ادراک کا اظہار اس طمانیت سے نہیں کر سکتا جو ایک چالیس سالہ انسان کے بہ آسانی ممکن ہے۔ اکثر خود نوشتوں میں اس کیفیت کا احساس ہوتا ہے جب منہ میں دانت اور پیٹ میں آنت سلامت نہ رہے تو زندگی کی ہر لذت ہیچ اور بے معنی معلوم ہوتی ہے اور بفرض محال یہ نہ بھی ہوتا تو اس عمر میں ماضی کا پچھتاوا بذات خود اتنا شدید ہوتا ہے کہ حال کی صحیح تفہیم سے بے بہرہ کر دیتا ہے۔ خواجہ صاحبؒ کی آپ بیتی میں ماضی کے پچھتاوے کا کوئی شائبہ نہیں۔ حال کی آئینہ بندی ہے اُمنگ اور ولولہ ہے ،، من نہ کردم شما خود بکنید ،، والی انتہاہی کیفیت نہیں۔ زندگی سے بہرہ ور ہونے کی نوید ہے۔ یہ نوید ایک خاص مسلک کے تابع ہے جسے سرفراز رکھنے کا جذبہ خواجہ صاحبؒ کی پوری زندگی پر محیط ہے بوڑھے آدمی کے لیے مستقبل بالعموم خطرے کا پیغام ہوتا ہے۔ راہ عمل مسدود ہوتا ہے عوام میں اعتدال نہیں رہتا۔ قوائے ذہنی و جسمانی مضمحل ہو جاتے ہیں۔ رعنائی خیال مفقود ہو جاتی ہے۔ اس عالم میں خود نوشت مرتب کرنے والے کی ساری توجہ ماضی پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ چھوڑی ہوئی منزلیں آنے والی منزلوں سے زیادہ دلکش اور پُرکشش نظر آتی ہیں ساری گڑبڑ اسی ذہنی کیفیت سے شروع ہوتی ہے مگر یہ ایک فطری نفسیاتی عمل ہے۔ اس سے فرار ممکن نہیں۔ خواجہ صاحبؒ آپ بیتی مرتب کرتے وقت آنے والی منزلوں کے منتظر تھے حساب سے آپ بیتی مرتب کرنے کے سینتیس ۳۷ برس بعد ان کا وصال ہوا۔ انھوں نے آتے

والے دور میں اپنی ذاتی اعمال منزل اور کامرانی کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا۔ اس وجہ سے ان کی آپ بیتی، میں ذہنی آسودگی اور طمانیت کی ایک غیر معمولی لہر ہر جگہ ملتی ہے۔

خواجہ صاحبؒ کی گہری معنویت اور مقصدیت کا احساس (آپ بیتی) میں قدم قدم پر ہوتا ہے مگر ان کے یہاں پُرکاری سادگی میں ہے۔ مثال کے طور پر یقین کی دولت حاصل کرنے کے لیے شک کی منزل سے گزرنا ضروری ہے۔ خواجہ صاحبؒ نے شک کی منزل سے گزر کر یقین کی دولت تک پہنچنے کی روداد بڑے سیدھے اور سچے طریقے سے بیان کی ہے۔ غور کرنے سے یہ روداد بڑی اہم اور معنی خیز معلوم ہوتی ہے کہ خواجہ صاحب نے اسے بڑے سرسری انداز سے پیش کیا ہے جیسے اس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ تحریر فرماتے ہیں ۔

"پیروں اور بزرگوں سے عقیدت کے مسئلے کو میں نے جس قدر سوچا اسی قدر موجودہ پیروں اور بزرگوں سے میرا دل بیزار ہوتا گیا کیونکہ جو واقفیت میں نے سیاحت اسلامی دنیا اور سیر ہندوستان میں گدّی والے اور نامور بزرگوں کے اندرونی حالات سے حاصل کی تھی وہ بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ میں نے اکثر بزرگوں کو دنیادار اور دنیاوی جوڑ توڑ میں مبتلا دیکھا تھا اور دل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تدبیروں اور ظاہری دکھاؤ اور مریدوں کے مشہور کرنے سے یہ لوگ بڑے بنتے ہیں ورنہ درحقیقت یہ کسی عقیدت کے مستحق نہیں ہیں کیونکہ یہ تو دنیا داروں سے بڑھ کر دنیا میں ملوث ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ خیال اتنا بڑھا کہ متقدمین (گذشتہ زمانے کے بزرگوں) کی نسبت بھی شک ہونے لگا کہ ان کو بھی کتابیں لکھنے والوں نے مشہور بنا دیا ہے ورنہ یہ بھی ایسے ہی ہوں گے جیسے یہ اُن کے پیرو اور مقلد ہیں۔

اسی زمانے میں حضرت اکبر الہ آبادی کا ایک شعر دیکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ تو چراغ کو دیکھ اور اس کی روشنی میں راستہ چل۔ چراغ دکھانے والے کو نہ دیکھ کہ وہ اچھا ہے یا بُرا ہے اگر اس کو دیکھے گا تو راستہ نہ چل سکے گا کیونکہ روشنی آگے پڑتی ہے چراغ کے پاس تاریکی رہتی ہے۔

اس شعر نے میرے مشاہدے کے رخ کو بدل دیا اور میں نے بزرگوں کی عقیدت کو ذاتیات سے ہٹا کر اس ارشاد پر متوجہ کر لیا جو ان کی زبان سے ادا ہوتا ہے اور جو اُن کے ظاہری اعمال سے صادر ہوتا ہے کیونکہ اسی ارشاد کی بدولت ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی شیرازہ بندی اور اصلاح ہوتی ہے اور وہ ارشاد ہی عقیدت و اطاعت کا مستحق ہے۔

مشاہدے کا رخ بدلتے ہی مجھ کو ان بڑے بزرگوں کے کمالات اور محاسن زیادہ نظر آنے لگے اور ان کے عیب کا اثر دل سے دور ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ اب میرا مشاہدہ دلی صداقت سے ان بزرگوں کا ادب کرتا ہے اور ان کی دنیاوی کمزوریوں کو لازمہ بشریت سمجھتا ہے جن سے کوئی آدمی جب تک کہ وہ آدمی ہے پاک ہونے کا دعوا نہیں کر سکتا۔

آخر مشاہدے کی اس تبدیلی سے میں نے یہ بات اصولی زندگی کی شان میں کہہ دی کہ کسی کے عیب و ہنر کو دیکھو تو اپنے عیب و ہنر کی عینک لگا لو" مشاہدے کا رخ بدل جانا معمولی بات نہیں

یہی یقین کی منزل ہے۔ ظاہری حالات سے دھوکا کھانا عام بات ہے۔ خواجہ صاحبؒ نے ظاہر سے باطن تک پہنچنے میں جو خون جگر صرف کیا ہوگا قاری کو اس کا احساس نہیں ہو سکتا کہ خواجہ صاحبؒ نے اسے بڑی سادگی اور سہل انداز سے بیان کر دیا ہے۔ یہی ان کی تحریر کا کمال ہے ذہنی انقلاب کو غیر محسوس طریقے سے بیان کرنے کا یہ انداز بڑا انوکھا اور قابل قدر ہے۔

خواجہ صاحبؒ نے "آپ بیتی" میں ہر جگہ اختصار کو مدنظر رکھا ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ تفصیل اور مربوط بیانات کے بجائے یادداشتوں کا ایک مجموعہ پیش کر رہے ہیں۔ یادداشتیں بھی وہی ہیں جن کی اشد ضرورت تھی۔ پڑھنے والے کہیں کہیں تشنگی محسوس کرتا ہے۔ خواجہ صاحبؒ نے بہت بڑا کارنامہ یہ انجام دیا ہے کہ ان کے دور نوجوانی میں برصغیر کی بیشتر درگاہوں میں عرس کے موقع پر ارباب نشاط کے رقص و موسیقی کے جو مظاہرے عام تھے جو بیہودگیاں اور بدعتیں دیکھنے میں آتی تھیں ان کے خلاف پہلی بار موثر طریقے سے آواز بلند کی اس سلسلے میں انھیں اپنے ہی بزرگوں کی مزاحمت اور عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ یہاں تک انھیں درگاہ اور بستی کی سکونت بھی ترک کرنا پڑی مگر حق حق ہے۔ خواجہ صاحبؒ کے احتجاج کی حقانیت کو سب نے محسوس کیا اور آہستہ آہستہ تمام درگاہوں سے اس قسم کی بیہودگیوں کا خاتمہ ہوگیا یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی مگر خواجہ صاحبؒ نے اسے بڑے سرسری انداز سے بیان کیا ہے محض ماضی کی ایک یادداشت کے طور پر۔ خواجہ صاحبؒ نے بالعموم ایسی تفصیل سے گریز کیا ہے جس سے ان کی شخصی عظمت اور کردار کی بڑائی ظاہر ہوتی ہو۔ یہ ان کے سیرت کی خوبی تو ہے مگر اس کی وجہ سے "آپ بیتی" یقیناً متاثر ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کو یہ خیال آیا کہ مریدوں کی صلاح و فلاح کے لیے اپنی زندگی کے واقعات لکھ دیے جائیں۔ چنانچہ کسی کاوش کے بغیر انتہائی اختصار سے واقعات بیان کر دیے مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے خواجہ صاحبؒ کو انشاپردازی کے فطری سلیقے سے نوازا تھا "مصور فطرت" کا خطاب ان کے لیے نہایت موزوں اور برمحل تھا بات سے بات پیدا کرنا معلوم میں نامعلوم کے اسرار پیدا کرنا ان کا فن تھا۔ اختصار ان کا مزاج اور ڈرامائی استعجاب ان کی خصوصیت تھا "آپ بیتی" میں یہ سارے عناصر موجود ہیں۔ خواجہ صاحبؒ کی انشاپردازی باتیں کرنے سے عبارت ہے۔ باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ فضا، ماحول، منظر، پس منظر، نقطہ عروج سب باتوں ہی باتوں میں ظاہر ہوتے ہیں "آپ بیتی" میں باتیں ہیں مگر فضا اور ماحول کی نہیں زیادہ تر کام کی باتیں ہیں۔ انشاپردازی کے فطری سلیقے نے انھیں پرکشش اور راست گفتاری نے انھیں پُرتاثیر بنا دیا ہے۔ یہاں انکشاف ذات بھی ہے اور خود احتسابی کا مظاہرہ بھی۔ سارے نقوش اپنی جگہ دلکش اور بھرپور ہیں مگر نجانے کیوں تصویر مکمل نہیں معلوم ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ کسر رہ گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ خواجہ صاحبؒ نے آپ بیتی کو مکمل بنانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اپنے البیلے انداز میں جستہ جستہ واقعات کو قلم بند کرنا کافی سمجھا "آپ بیتی" ایک واضح مقصد کے تحت قلم بند کی گئی تھی۔ خواجہ صاحبؒ کو اس مقصد کے حصول میں پوری کامیابی ہوئی۔

آپ بیتی ۱۹۱۹ء میں پہلی بار اور ۱۹۲۲ء میں دوسری بار شائع ہوئی۔ ایک اشاعت لاہور سے بھی ہوئی۔ خواجہ صاحبؒ کی سوانح عمری ملا واحدی نے ۱۹۵۰ء میں مرتب کی لیکن آپ بیتی اپنے اختصار کے باوجود واحدی صاحب کی مرتب کردہ سوانح عمری کے مقابلے میں بہت زیادہ دلچسپ اور پُراثر ہے۔ واحدی صاحب دیرینہ رفاقت اور قلبی تعلق کے باوجود خواجہ صاحبؒ کی مذہبی شخصیت کو قلم کی گرفت میں لانے سے قاصر رہے۔ ان کی شخصیت محض ایک وقائع نگار کی سی ہو گئی ہے۔ ان کے یہاں بھی غیر ضروری اختصار نے سوانح کے فن کو نقصان پہنچایا ہے۔ "آپ بیتی" ادھوری سرگزشت ہونے کے باوجود مکمل سرگزشت پر حاوی ہے۔

واحدی صاحب کے سامنے خواجہ صاحبؒ کی پوری زندگی کا مرقع تھا، ۴۸ سے ۵۵ تک کے آٹھ برس کے علاوہ وہ ساری زندگی خواجہ صاحبؒ کے انیس و جلیس رہے کوئی بات ان سے ڈھکی چھپی نہیں تھی مگر نہ جانے کیوں ان کی کتاب میں خواجہ صاحبؒ کی پُرکشش شخصیت واضح نہ ہو سکی۔ بعض واقعات تفصیل کے متقاضی تھے۔ ابتدائی جدوجہد۔ خاندان والوں سے بگاڑ۔ بستی سے ترک سکونت۔ یہ سب ایسے واقعات ہیں جن سے شخصیت کے دور نشو و نما کو سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ خواجہ صاحب نے بذات خود ان کی تفصیل میں جانا پسند نہیں کیا کہ اس میں خود پسندی کا شائبہ تھا۔ وہ بقول خود لاکھ خود پسندی کے دلدادہ سہی مگر کتاب میں اس کا مظاہرہ نامناسب ہوتا۔ واحدی صاحب کے سامنے یہ مجبوری نہیں تھی۔ وہ کھل کر بات کر سکتے تھے۔ بہرحال اختصار کے باوجود واحدی صاحب کی مرتب کردہ سوانح کی اہمیت یہ ہے کہ اس کا مرتب محرم راز دروں تھا۔ اس نے بڑے خلوص اور محبت سے اپنے ممدوح کا تذکرہ لکھا ہے۔

خواجہ صاحبؒ کی "آپ بیتی" سے اُن کی اُپج اور ندرت فکر کا اظہار ہوتا ہے جس زمانے میں "آپ بیتی" لکھنے کا تصور عام نہیں ہوا تھا انھوں نے "آپ بیتی" لکھ کر ایک نئی روایت کو فروغ دیا۔ راست گفتاری، بیباکی، خود احتسابی اس "آپ بیتی" کی منفرد خصوصیات ہیں۔ یہ ایک بہادر باہمت اور دلوں کو مسخر کر لینے والے انسان کی روداد حیات ہے ایک ایسے عالی نسب انسان کی سرگزشت جس نے نسب پر غرور نہیں کیا جس نے پیرزادگی کو پیشہ نہیں بنایا۔ جس میں نکتہ پردازی اور مضمون آفرینی کا فطری سلیقہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو کسی خوف اور جھجک کے بغیر دن کو دن اور رات کو رات کہتا تھا۔ اردو کے سوانحی ادب میں کل بھی یہ کتاب اہم تھی اور کل بھی یہ کتاب اہم ہو گی کیونکہ اس کے ذریعے سے ہم ایک انسان سے ملتے ہیں سچے اور بڑے انسان سے۔ اس انسان سے جو اپنے قاری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر روسو کی طرح کہہ سکتا ہے "یہ میں ہوں۔ صرف میں اور ع:

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

مقصود ایس۔ اے حسنی
اسلام پورہ، قصور
پاکستان

پلکوں پر شام

گداز پلکوں پر شام گزاری
ہر موسم یاد کا نشتر
ہر صبح صحرا کا پتھر
(سورج) بینائی کا منبع
آنکھیں کھو بیٹھا
ہر آشا زخمی زخمی
ہر نغمہ
اسرافیلی عزرائیلی
خون میں بھیگا آنچل
گنگا کا

ہر رستہ
چپ کا قیدی
دریا کنارے
منہ دیکھے ہیں
بے آب ندی میں
گلاب کی قاشیں
پانی پانی
پلکیں
سانپوں سے، گھر
جائیں کدھر
پلکوں کی شام
ہر شام پر بھاری ہے۔

مخمور سعیدی
۱۱۷۔ غالب اپارٹمنٹ
پروانہ روڈ۔ پیتم پورہ، دہلی
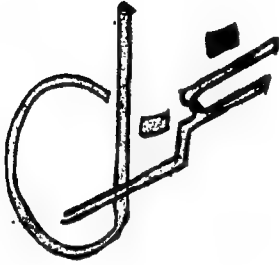
جزا نہیں کچھ سزا نہیں ہے
یہ فیصلہ، فیصلا نہیں ہے
وہ لفظ سب نے سُنا ہو جیسے
جو میں نے اب تک کہا نہیں ہے
نظر کی حد میں ہیں سارے منظر
مگر کوئی دیکھتا نہیں ہے
ابھی ترے عکس سے ہے خالی
ابھی یہ دل آئنا نہیں ہے
یہ کس طرف چل پڑی ہے دنیا
جدھر کوئی راستا نہیں ہے
کہاں ہوں میں اے ہوائے فردا!
یہ میرے گھر کی فضا نہیں ہے
یہاں، سب اک دوسرے کے بندے
کوئی کسی کا خدا نہیں ہے
جو ہم پہ گزری، سو ہم پہ گزری
ہمیں کسی سے گلا نہیں ہے
سُنی نہ مخمور اس نے اب تک
مری صدا کیا صدا نہیں ہے؟

افسر امروہوی

نعت پاک

جشنِ نظارہ مدینے میں چلے جانے کا نام
دیدۂ حسرت وہاں سے لوٹ کر آنے کا نام
یاد ان کی روح میں اک انقلاب آنے کا نام
عشق ان کا بگڑی قسمت کے سنور جانے کا نام
دستِ رحمت ایک اک جھولی کے بھر جانے کا نام
چشمِ رحمت سب گنہ گاروں کو اپنانے کا نام
جنبشِ ابرو کرم کے جوش میں آنے کا نام
جنبشِ لب درگزر کے پھول برسانے کا نام
سرفرازی ان کے قدموں میں چلے آنے کا نام
خسروی ہے خادموں میں نام لکھوانے کا نام
پارسا کوئی کوئی مذنب مگر سرشار سب
یوں ہے اونچا ساقیِ کوثر کے میخانے کا نام
آ رہی ہیں آج دل کی دھڑکنوں کو ہچکیاں
میرے آقاؐ نے لیا کیا اپنے دیوانے کا نام
دیوبند اس کو بتاؤ یا بریلی تم کہو
ہم کو ساقی سے غرض ہے کچھ ہو میخانے کا نام
ان کے منصب کی بلندی سامنے تھی اس لیے
ہم نے بھی رکھا ہے افسرؔ ان کے دیوانے کا نام

خالد رحیم
منی ساہو چوک
بخشی بازار، کٹک، اڑیسہ

مرا ساتھ نہ چھوڑ

(تضمین بر غزل مظہر امام)

غم سے معمور ابھی دل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
ہر قدم سختیِ منزل ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ
یہ زمیں کوچۂ قاتل ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ

"زندگی کاوشِ باطل ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ
تو ہی اک عمر کا حاصل ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ"

پھول شاخوں پہ چٹکتے ہیں، بکھر جاتے ہیں
آشنا چہرے دھندلکوں میں اتر جاتے ہیں
اجنبیت کے حوالے مجھے کر جاتے ہیں

"لوگ ملتے ہیں سرِ راہ گزر جاتے ہیں
تو ہی اک ہم سفرِ دل ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ"

ہر قدم پر تری چاہت کا سہارا ہے مجھے
تو جو مونس ہے تو ہر رنج گوارا ہے مجھے
بارہا تو نے محبت سے پکارا ہے مجھے

تو نے سوچا ہے مجھے تو نے سنوارا ہے مجھے
تو مرا ذہن مرا دل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ

شمس الدین شیخ
۲۲۴۳۹/۱ کوٹھی محلہ لال دروازہ
احمد آباد

جی۔ ایم۔ جاوید
نزد مسجد، لوہسنگھنہ
ہزاری باغ۔ بہار

کہیں صبح ہو گی کہیں رات ہو گی
تری ہر ادا کی الگ بات ہو گی

بچھڑنے کا افسوس کیا رہ گزر سے
کسی موڑ پہ پھر ملاقات ہو گی

ارادوں کی اپنی بلندی سے کیا ہو
عمل کی نہ جب تک شروعات ہو گی

چلو شیخ چلتے ہیں اب مے کدے میں
وہاں دن اُگا ہے یہاں رات ہو گی

میرا آنگن بھی اگر ہو جائے گلشن کی طرح
زندگی میری نہ بھٹکے پھر تو جوگن کی طرح

جس سے ملتا ہوں وہی دیتا ہے اک تازہ فریب
ہر بشر لگتا ہے اب تو مجھ کو دشمن کی طرح

اس زمانے میں کوئی ایسا نہیں جو کہہ سکے
"پاک ہے دامن میرا یوسفؑ کے دامن کی طرح"

ہاں تمھاری قدر بھی جاوید ہو گی ہر جگہ
بولنا سیکھو گے تم جو صاف درپن کی طرح

شرر غازی پوری
ایم۔ ایس۔ پرانا پور
پورٹ بلیر۔ جنوبی انڈمان

شکیل اعظمی
۵۰ ملی کالج، کھوڈیا نگر سوسائٹی
راندیر۔ سورت

ڈھونڈ لو دعوا ہے میرا ڈھونڈتے رہ جاؤ گے
دوستو میں دوست اپنا ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

گر یہی رشتہ ہواؤں کا رہا موسم کے ساتھ
شاخِ گل پہ کوئی پتہ ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

اپنی پرچھائیں سے ٹھوکر دوستو! کھاتے رہو
اب سہارا پیار والا ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

بے رخی بوئے چمن سے مہربانو! روک دو
ورنہ پھر موسم سہانا ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

حادثوں کو ساتھ لے لو، رہنمائی کے لیے
زندگی کا حسن تنہا ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

اپنی راتیں جاگتے کاٹا کرو ورنہ شررؔ
اپنے حصے کا سویرا ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

شکل چھپ جائے، تو آواز پہ رکھا جائے
اک نشانہ اسی انداز پہ رکھا جائے

ہم کو منظور ہے الزامِ روایت شکنی
اک نیا گیت نئے ساز پہ رکھا جائے

کون چھو سکتا ہے افلاک کی اونچائی کو
فیصلہ قوتِ پرواز پہ رکھا جائے

ہم سے تحریکِ محبت تو نہیں رک سکتی
کیوں نہ الزام ہی آغاز پہ رکھا جائے

دل کی بستی سے اجالے کا گزر ہو کہ نہ ہو
اک دیا چہرۂ غماز پہ رکھا جائے

رؤف جاوید

نئی سڑک لشکر گوالیار

(مدھیہ پردیش)

کوئی مثال اگر بن سکو تو اچھا ہے
رہِ عوام سے ہٹ کر چلو تو اچھا ہے

سنی سنائی کہانی تو مت سناؤ اب
گذر رہی ہے جو تم پر کہو تو اچھا ہے

ہمیشہ اپنے لیے جینا مرنا کیا معنی
سبھی کے حق میں دعائیں کرو تو اچھا ہے

خود اپنے آپ میں محصور زندگی کیا ہے
نسیم بن کے ہمیشہ بہو تو اچھا ہے

دیا کی بھیک نہ مانگو نہ ہاتھ پھیلاؤ
خود اپنی آپ ہی عزت کرو تو اچھا ہے

ڈاکٹر خاور خاں سرحدی

سرائے میاں، دہلی گیٹ

علی گڑھ - یوپی

اپنے دل میں تیری یادوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا
ہم فقیروں کے مقدر میں لکھا کچھ بھی نہ تھا

چاروں جانب تھے مہکتے خوشبوؤں کے قافلے
پھول، شبنم، چاندنی، صحرا، ہوا کچھ بھی نہ تھا

لال، پیلے، جمپئی آنسو تھے اس کی آنکھ میں
وہ سراپا اک تمنا کے سوا کچھ بھی نہ تھا

مسکراتی دھوپ میں وہ چاندنی چہرہ چراغ
دوستی اور دشمنی میں فاصلہ کچھ بھی نہ تھا

اس کے آئینے کو خاور کس طرح الزام دوں
اپنا چہرہ تھا لکیروں میں بٹا کچھ بھی نہ تھا

انور تلہری
۵ میونسپل بورڈ تلہر
شاہجہان پور۔ یو پی

یہ کون چاہے گا ناکامیاب گھر جائے
مگر نصیب کا لکھا ہوا کدھر جائے

ہر ایک شخص کے دل کی یہی تمنا ہے
سکوں کے ساتھ مری زندگی گزر جائے

عجیب دردِ محبت میں دل کا عالم ہے
ذرا سی ٹھیس لگے، ٹوٹ کر بکھر جائے

خدا کا نور تو دل ہی میں ہم نے دیکھ لیا
جسے بھی جانا ہو وہ کوہِ طور پر جائے

سبق سکھایا ہے حضرت حسینؓ نے انور
یہ زندگی ہے کہ راہِ خدا میں سر جائے

محمد ظفر اعظمی
سکریٹری ادارہ بزم خیر
ناتھ نگر، بھاگل پور، بہار

شجر جو خشک تھا وہ باثمر تھا
عجب ماں کی دعاؤں میں اثر تھا

مسیحا بن گیا اس دور کا وہ
کہ جس میں جھوٹ کہنے کا ہنر تھا

ہوائیں خوف کی چاروں طرف تھیں
یہ کیسی راہ سے اپنا گزر تھا

وہ جس نے کل کسی کا گھر جلایا
ظفر شعلوں میں اب اس کا ہی گھر تھا

انور شمیم انور فیروز آبادی
۹۴۔ چوک حاجی پورہ
فیروز آباد۔ یوپی

پتھراو پہ پتھراو کہاں تک
اے دوست یہ برتاو کہاں تک

ہر سمت برستا ہو نمک جب
محفوظ رہیں گھاو کہاں تک

وہ شخص منافق ہے کہ مخلص
یہ ذہن کا الجھاو کہاں تک

پانی پہ جمی جاتی ہے کائی
جذبوں میں یہ ٹھہراو کہاں تک

پھیلاتے ہیں یہ دیکھ کے ہم پاؤں
چادر کا ہے پھیلاو کہاں تک

اے آب شناس اتنا بتادے
بھٹکے گی ابھی ناو کہاں تک

ہر شخص پریشاں ہے انور
ہے درد کا پھیلاو کہاں تک

حاجی نعیم القادری زائر
۹/۷۱ ہاتھی خانہ
فتح گڑھ۔ یوپی

غزل

ربط کچھ میرا ابھی اے ساقی ہے میخانے کے ساتھ
کج ادائی کیوں ہے آخر میرے پیمانے کے ساتھ

بے وفاؤں میں ہے جانبازِ وطن کا اب شمار
اللہ اللہ یہ نوازش ایک پروانے کے ساتھ

حکمرانی ساری دنیا پر ہے سوزِ عشق کی
شمع رزک محفل میں جل جاتی ہے پروانے کے ساتھ

منکشف ہو جائیں شاید کچھ رموزِ زندگی
آئیے ہم بھی چلیں کچھ دور دیوانے کے ساتھ

میں سنا سکتا ہوں حال دل ہے یہ اندیشہ مگر
ہو نہ جائے کوئی رسوا میرے افسانے کے ساتھ

عبید اعظم اعظمی
بزم اردو، مہاراشٹر کالج بمبئی

جو درد و غم پہ تھے کبھی وہ اختیار بجھ گئے
نہ جانے آج کتنے دل سرِ بہار بجھ گئے

جدیدیت کی آندھیاں تھیں اتنی تیز ہم نفس
گل و سبو کا ذکر کیا، حصارِ دار بجھ گئے

مرے نگاہ و دل کو اب سکوں ملے تو کیا ملے
وہ اضطراب ڈھل گیا وہ انتظار بجھ گئے

تمھارے بعد زندگی کے مرحلے عجیب ہیں
جو ایک بار جل اٹھے تو لاکھ بار بجھ گئے

ثبوت ہیں قدم قدم، زباں زباں گواہ ہے
جو حق سے بدگماں ہوئے وہ اقتدار بجھ گئے

ہَوا وہ اب کے ہے چلی، عبید اعظم اعظمی
گلوں کی بات در کنار خار خار بجھ گئے

اسلم ثاقب
رائے کوٹ روڈ
مالیر کوٹلہ، پنجاب

میں اپنی یادوں میں لکھوں گا جس کو صدیوں تک
وہ جانے کون سے لمحے مجھے بھلا دے گا

کہیں جو شام کو دیکھے گا ڈھلتے سورج کو
ہر ایک نقش مرے پیار کا مٹا دے گا

میں ایک خواب ہوں ڈھونڈو گے تم کہاں مجھ کو
پلٹ کے کون مجھے جانِ جاں صدا دے گا

وہ کھو گیا ہے مری چاہتوں میں اے ثاقب
قدم، قدم پہ مجھے زخم اب نیا دے گا

ظفر امام
قادری منزل، بتیا
بہار

جیون کی نیّا

دل میرا اک گہرا ساگر
جس میں دکھ کا پانی ہے
پانی میں ہل چل لہروں کی
ہل چل بھی دیوانی ہے
جس جانب نظریں جاتی ہیں
آفت اور حیرانی ہے......

دل میرا اک گہرا ساگر
جس میں دکھ کا پانی ہے

اس ساگر میں چھوٹی سی اک آس کی نیّا
اس نیّا پہ بیٹھا ہے مجھ جیسا کھویّا
ساتھ میں یہ وشواس بھی ہے کہ
ہمت کی پتوار لیے ساگر کا سینا چیرے جاؤں
اپنی اکھڑی سانسوں میں پھر آس جگا کر
جس حالت میں رہوں
جیون کی نیّا
ساگر پار لگاؤں

معراج رعنا
محلہ چوکھنڈی، سہسرام
بہار

غزل

عتابِ ہجرِ مسلسل چراغ بھی ہم بھی
تمام رات جلے کل چراغ بھی ہم بھی

ہوا شکست کا صدمہ اٹھا نہیں پائی
خوشی سے ہو گئے پاگل چراغ بھی ہم بھی

کسی کے لمسِ مقدس سے ہو گئے روشن
سیاہ بستر مخمل چراغ بھی ہم بھی

غرورِ تیرہ شبی پاش پاش کر آئے
گئے تھے ساتھ جو مقتل چراغ بھی ہم بھی

بہا کے اشک مسرت کسی کی آمد پر
ہیں آج شام سے بیکل چراغ بھی ہم بھی

انور میانی
الامین ایجوکیشنل کامپلکس
کولار ۔ کرناٹک

بن گئی آگ جذبات کی چاندنی
مجھ میں اُتری ہے جب رات کی چاندنی

میں سوالات کا اک دہکتا گگن
اور تم ہو جوابات کی چاندنی

زندگی میں مرے ساتھ چلتی رہی
نکھرے نکھرے خیالات کی چاندنی

عکس تیرا ہے روشن نظر میں مری
اب نہ راس آئے گی رات کی چاندنی

فراز بندہ نواز
انڈیکر نزد جامع مسجد
مین بستی روڈ بادامی

کر بھلا ترا بھلا ہوجائے گا
ورنہ تو شاید بُرا ہوجائے گا

ہر خوشی میری تری ہوجائے گی
اور تیرا غم مرا ہوجائے گا

بے زبانی کی زباں کام آئے گی
دل سے دل کا رابطا ہوجائے گا

جس کی قربت میں بھی ہے اک فاصلہ
وہ بھی اب شاید جدا ہوجائے گا

ایک ایسا وقت آئے گا فراز
اپنا سایہ بھی جُدا ہوجائے گا

عبداللطیف اعظمی
۲۴۹-ذاکر نگر، جامعہ نگر
نئی دہلی ۲۵

ہندستان کے بزرگ ادیب وشاعر

ماہنامہ "کتاب نما" کے تازہ شمارہ بابت جولائی میں پروفیسر گیان چند جین کا "اردو کے بزرگ ترین ادیب" کے عنوان سے ایک صفحے کا مضمون چھپا ہے، جس میں ہندوپاک کے اسّی سالہ ادیبوں کے نام شامل ہیں، جن کی کل تعداد ۲۶ ہے۔ تقریباً ڈیڑھ دو ماہ پہلے راقم الحروف نے ایک مضمون مرتب کیا تھا، جس کا عنوان تھا "ہندستان کے وہ ادیب جن کی عمر ۷۵ سال یا اس سے زیادہ ہے" ابھی مضمون کی نظر ثانی اور مبیضہ کا کام باقی تھا کہ مجھے دہلی سے باہر جانا پڑا۔ جولائی کے شروع میں واپس آیا تو پروفیسر جین صاحب کا زیر تذکرہ "مضمونچہ" نظر سے گزرا۔ مجھے اپنے مضمون کے عنوان کی طوالت پسند نہیں تھی اس لیے "مضمونچہ" کے عنوان کی پیروی میں اسے بدل دیا۔

"بزرگ" ایک مبہم اور غیر واضح لفظ ہے۔ ایک شخص کے نزدیک ہر وہ شخص بزرگ ہوسکتا ہے جس سے اس کو عقیدت اور محبّت ہو۔ مگر پیش نظر مضمون میں بزرگ کا مطلب یہ ہے کہ جس کی عمر اس وقت جولائی ۱۹۹۴ء میں کم از کم پچھتر (۷۵) سال یا اس سے زیادہ ہو۔

اردو میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں ہے، جس سے موجودہ ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش معلوم کی جاسکے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے آج سے کم وبیش دس سال پہلے ۱۹۸۵ء میں دہلی اردو اکادمی کی منظوری سے راقم الحروف نے ایک ڈائرکٹری مرتب کی تھی، جس میں اردو کے ادیب وشاعر کا مختصر سوانحی خاکہ شامل ہے۔ اس میں کسی نام کو شامل کرنے کے لیے معیار یہ رکھا تھا کہ کم از کم ایک تصنیف یا تالیف یا ترجمہ یا مجموعۂ کلام یا مجموعۂ افسانہ چھپ چکا ہو۔ اس ڈائرکٹری کی کتابت اسی زمانے میں مکمل ہوگئی تھی۔ اس کی ضخامت فل اسکیپ سائز پر ۷۰۴ صفحات ہے اور کل ۹۷۳ نام شامل ہیں۔ مگر بدقسمتی سے کچھ ایسے اسباب پیش آگئے کہ اب تک شائع نہ ہوسکی اور حالات کچھ ایسے ہیں کہ مجھے امید نہیں کہ شائع ہوسکے گی۔ پیش نظر مضمون راقم الحروف نے اسی کی مدد سے تیار کیا ہے۔ چونکہ متعلقہ حضرات نے جملہ معلومات خود مہیّا کی ہیں، اس لیے ان کی تاریخ پیدائش کے معتبر ہونے میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کسی ادیب وشاعر سے کسی

مجبوری کی وجہ سے، براہ راست ضروری معلومات نہیں مل سکیں تو اتر پردیش اردو اکادمی (لکھنؤ) کے شائع کردہ دستاویز سے یا ساہتیہ اکادمی دہلی کی ہوز ہو آف انڈین رائٹرز سے ضروری معلومات لے کر ڈائرکٹری میں شامل کر لی گئیں۔

آخر میں تین ضروری وضاحت کرنی ہے: پہلی یہ کہ ناموں کی ترتیب تاریخ پیدائش کے لحاظ سے ہے۔ دوم یہ کہ اختصار کی خاطر متعلقہ ناموں کے ساتھ امتیازی الفاظ مثلاً پروفیسر، مولانا اور ڈاکٹر وغیرہ حذف کر دیے گئے ہیں۔ امید کہ کسی صاحب کو شکایت نہیں ہوگی، اگر ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ تیسری یہ کہ نام کے بعد سال پیدائش یا تاریخ پیدائش درج ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے سال پیدائش یا تاریخ پیدائش کا ذکر ضروری نہیں سمجھا گیا، قارئین خود سمجھ جائیں گے۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد اب بزرگ ادیبوں اور شاعروں کی فہرست پیش خدمت ہے۔

۱۔ نجم الدین اصلاحی
۷، ۱۸۹۷ء، راجا پور سکرور، اعظم گڑھ یو، پی

۲۔ آنند نرائن مُلّا
۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۱ء، لکھنؤ

۳۔ محمد یامین خاں شوقؔ
۱۲ر اگست ۱۹۰۳ء، کرت پور کمرادآباد

۴۔ عطا کاکوی (شاہ عطاء الرحمٰن)
۶ر صفر ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء (تاریخی نام: شاہ رضوی)

۵۔ اخلاق دہلوی (سید اخلاق حسین) [1]
۷ر ذی قعدہ ۱۳۲۳ھ/۳ر جنوری ۱۹۰۶ء، دہلی

۶۔ مفتی محمد ابراہیم فریدی
۱۹۰۸ء، سمستی پور، بہار

۷۔ دیوندر ستیارتھی
۲۸ر مئی ۱۹۰۸ء، بھدوڑ (پٹیالہ)

۸۔ آغا جانی کاشمیری (آغا سید واجد حسین رضوی)
۳۱ر جولائی ۱۹۰۸ء، لکھنؤ

۹۔ باقر رضوی (میر محمد باقر رضوی امانت خانی)
۱۹ر مارچ ۱۹۰۹ء، حیدرآباد

۱۰۔ نشاط کشتواڑی (غلام رسول) مئی ۱۹۰۹ء

۱۱۔ سید وحید الدین
۵ر ستمبر ۱۹۰۹ء، حیدرآباد

۱۲۔ وامق جونپوری (احمد مجتبیٰ)
۲۳ر اکتوبر ۱۹۰۹ء، کجگاؤں، جونپور

۱۳۔ محمد حیات اللہ انصاری
یکم مئی ۱۹۱۱ء، فرنگی محل لکھنؤ

۱۴۔ آل احمد سرور
۹ر ستمبر ۱۹۱۱ء، بدایوں

۱۵۔ پرکاش مونس
۷ر ستمبر ۱۹۱۱ء، سیوہارہ، بجنور

۱۶۔ محمد طیب
۱۵ ستمبر ۱۹۱۱ء، کرت پور ضلع بجنور

۱۷۔ معین احسن جذبی
۲۰ر اگست ۱۹۱۲ء، مبارک پور، اعظم گڑھ

۱۸۔ چمن لال آزاد
۲۴ر اگست ۱۹۱۲ء، بٹالہ

۱۹۔ ضیاء علی خاں اشرفی (ملک ہندی / عقیل بدایونی)
۷ر فروری ۱۹۱۳ء، بدایوں

---

[1] یہ مضمون اشاعت کے لیے بھیجا جا چکا تھا کہ اطلاع ملی کہ ۳۱ر جولائی ۱۹۹۴ء کی صبح کو موصوف کا انتقال ہو گیا (ناظم)

۲۰— ساحر ہوشیارپوری (رام پرکاش)
۱۰ فروری ۱۹۱۳ء (سرٹیفکیٹ کے مطابق :
۵ مارچ ۱۹۱۳ء)

۲۱— ہنس راج رہبر سے
۹ مارچ ۱۹۱۳ء، ہریاؤ سنگرور پٹیالہ

۲۲— نورالحسن ہاشمی
یکم جولائی ۱۹۱۳ء (سرٹیفکیٹ کے مطابق)
سندیلہ، ہردوئی

۲۳— شہاب عظیم آبادی (سید شہاب الدین دسنوی)
۷ جولائی ۱۹۱۳ء، دسنہ، نالندہ بہار

۲۴— سلامت اللہ
۱۴ اگست ۱۹۱۳ء سہایلی ضلع اٹاوہ

۲۵— سید ابوالحسن علی ندوی
۱۹۱۴ء، تکیہ کلاں، رائے بریلی

۲۶— بھارت چند (سکندر آباد)
۱۹۱۴ء

۲۷— محمد عبدالسلام خاں
مارچ ۱۹۱۴ء، رام پور

۲۸— حمیدہ سلطان
۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء، دہلی

۲۹— محمد عبداللطیف خاں
۲۶ جنوری ۱۹۱۵ء، حیدرآباد

۳۰— سید محمد رضا نقوی واہی
یکم فروری ۱۹۱۵ء، کھجوا سیوان بہار

۳۱— خلیل الرب
۹ فروری ۱۹۱۵ء، ضلع الہ آباد

۳۲— عبدالوہاب مرتضیٰ پوری
یکم اپریل ۱۹۱۵ء، مرتضیٰ پور (اکولہ)

۳۳— میر مشتاق احمد — ۲۵ اپریل ۱۹۱۵ء، شملہ

۳۴— علی احمد جلیلی
۲۲ جون ۱۹۱۵ء، حیدرآباد

۳۵— ادیب حیدرآبادی
۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء، منڈی میر عالم، حیدرآباد

۳۶— اختر الایمان
۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء بروز جمعہ، بستی قلعہ پتھر گڑھ
نجیب آباد

۳۷— وجاہت علی سندیلوی
یکم مارچ ۱۹۱۶ء، بھوپال

۳۸— علی جواد زیدی (صابر محمد آبادی / ابن اسجاد)
۱۰ مارچ ۱۹۱۶ء، کرہاں ضلع اعظم گڑھ

۳۹— شجاعت علی سندیلوی
یکم ستمبر ۱۹۱۶ء، سندیلہ ضلع ہردوئی

۴۰— جگناداس اختر
۲ نومبر ۱۹۱۶ء، راولپنڈی (پاکستان)

۴۱— مجروح سلطان پوری (اسرار حسن خاں)
۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک کوئی ماہ کوئی دن
نظام آباد، اعظم گڑھ۔

۴۲— صدرالدین اصلاحی
۱۹۱۷ء (قیاساً) سلطان پور، اعظم گڑھ

۴۳— عبداللطیف اعظمی
یکم مارچ ۱۹۱۷ء، بندی کلاں، اعظم گڑھ

۴۴— شمع نیازی (محمد لیسین ابوشمع)
۵ اپریل ۱۹۱۷ء

۴۵— غلام محی الدین خان کیف
۲۷ ستمبر ۱۹۱۷ء، بیدر شریف، کرناٹک

۴۶— رگھوور کاشمیری (عبدالستار)
۱۲ اکتوبر ۱۹۱۷ء

لہ مضمون مکمل ہو گیا تھا کہ یکایک اطلاع ملی کہ موصوف کا ۲۳ جولائی کی صبح سویرے انتقال ہو گیا۔ (اعظمی)

۴۷ — خواجہ احمد فاروقی

۳۰ راکتوبر ۱۹۱۸ء ، بچھرایوں ، مراد آباد

۴۸ — وجدی الحسینی (سید عابد حسین)

۹ راگست ۱۹۱۸ء ، بھوپال

۴۹ — مسز امینہ خاتون

۶ راکتوبر ۱۹۱۸ء

۵۰ — جگن ناتھ آزاد

۵ ردسمبر ۱۹۱۸ء، عیسیٰ خیل (میانوالی - پاکستان)

۵۱ — مسعود حسین خاں

۲۸ رجنوری ۱۹۱۹ء، قائم گنج - فرخ آباد

۵۲ — سلام سندیلوی (عبدالسلام)

۲۵ فروری ۱۹۱۹ء ، سندیلہ ، ہردوئی

۵۳ — قربان (پادری ڈی - اے - ہیرلیس)

۱۲ مارچ ۱۹۱۹ء ، امروہہ - مراد آباد

۵۴ — کشمیری لال ذاکر

۱۷ اپریل ۱۹۱۹ء ، گجرات (پاکستان)

۵۵ — تارا چرن رستوگی

یکم جولائی ۱۹۱۹ء ، بریلی

۵۶ — مدن گوپال

۲۲ راگست ۱۹۱۹ء - ہانسی ، حصار

مانگے کا اُجالا

سخن در سخن

خامہ بگوش

بے نتیجہ زورِ قلم

منظر علی خاں منظر نے عجب ذہن رسا پایا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بینکار ہیں لیکن ایک کھاتہ دنیائے ادب میں بھی کھول رکھا ہے جس میں وہ کتابیں لکھ لکھ کر جمع کراتے ہیں اور اصل سے کئی گنا زیادہ منافع ادبی شہرت کی صورت میں وصول کرتے رہتے ہیں۔ نظم اور نثر دونوں میں ان کے کمالات کا اظہار ہوا ہے۔ نثر لکھتے ہیں تو انیسویں صدی کے "اودھ پنچ" کے اسلوب میں اور شعر کہتے ہیں تو بیسویں صدی کے نوح ناروی کے رنگ میں۔ ان جیسے ادیب کم ہوں گے جو پوری دو صدیوں پر حاوی ہوں۔

منظر علی خاں خود ہی نہیں لکھتے بلکہ انھوں نے بے شمار لوگوں کو بھی لکھنے کے کام پر لگا رکھا ہے۔ خود لکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ اس کے لیے صرف کاغذ، قلم اور ارادے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن دوسروں سے لکھوانا بہت مشکل کام ہے اور یہ مشکل اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب موضوع ٹیڑھا ہو۔ منظر صاحب اپنی نصف درجن تصانیف پر ایک سو سے زیادہ لوگوں سے مقدمے، دیباچے، فلیپ کی آراء اور توصیفی خطوط لکھوا چکے ہیں۔ ان لکھنے والوں میں متعدد ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں منظر صاحب ہی کی وجہ سے زندگی میں پہلی اور آخری بار قلم اور کاغذ کے استعمال کا موقع ملا ہے۔

اسی لکھنے لکھانے کے شغل کی بنا پر منظر صاحب کا ذاتی شعبۂ تعلقاتِ عامہ خاصا وسیع اور فعال ہے۔ غزلیں اور مضامین لکھنے سے جو وقت بچتا ہے، وہ اسے خط و کتابت میں صرف کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ لوگ خط پڑھ کر ضائع کر دیتے ہیں مگر منظر صاحب نے نہ صرف یہ کہ دوسروں کے خط ضائع نہیں کیے بلکہ اپنے خطوط کی نقلیں بھی سنبھال کر رکھیں۔ جب خطوں کا خاصا ڈھیر جمع ہو گیا تو اسے ٹھکانے لگا دیا یعنی کتابی صورت میں شائع کر دیا۔

کتاب کا نام ہے "اگر نامہ بر ملے" سرورق پر نام کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے "مجموعہ خطوط" مشاہیر بنام منظر علی خاں منظر علی خاں بنام مشاہیر"۔ اگرچہ منظر صاحب نے بربنائے انکسار اپنے آپ کو مشاہیر میں شامل نہیں کیا۔ لیکن ازرہ کشادہ دلی جن لوگوں کو مشاہیر کی صف میں بٹھایا ہے

ان میں سے اسّی فی صدوہ ہیں جو "مساکین" میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ منظر صاحب چوں کہ طنز و مزاح نگار ہیں، اس لیے ممکن ہے انھوں نے لفظ "مشاہیر" کو اس کے متضاد معنوں میں استعمال کیا ہو۔ اگر ہمارا خیال درست ہے تو پھر منظر صاحب کو ان کے "حسن خیال" کی داد ملنی چاہیے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ انھیں بھی مشاہیر کی صف میں بٹھا دیا جائے۔

اس کتاب میں چار سو کے قریب خط ہیں۔ ان میں سے تقریباً آدھے منظر صاحب نے اور باقی آدھے دوسروں نے لکھے ہیں۔ یہ دوسرے جن کی تعداد اسّی کے قریب ہے وہ لوگ ہیں جنھیں منظر صاحب نے خط و کتابت کے لائق سمجھا۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب اکیاسی مصنفین کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ استاد لاغر مرادآبادی فرماتے ہیں کہ ایسا بے نتیجہ زور قلم کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے کم از کم منظر صاحب کے خطوں کے بارے میں یہ بات درست نہیں ہوسکتی۔ اپنے اس کمزور موقف پر ہم آگے چل کر زور قلم صرف کریں گے۔

اگر اس مجموعے میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم اختر اور زاہدہ حنا کے خطوط شامل نہ ہوتے تو ہم یہ کہتے کہ دوسروں کے خطوط شائع کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی منظر صاحب صرف اپنے خط شائع کر دیتے تو اچھا تھا۔ آخر غالب کے خطوں کے مجموعوں میں بھی تو صرف انھیں کے خط ہیں۔ کسی دوسرے کا کوئی خط شامل نہیں کیا گیا۔

غالب کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی سن لیجیے کہ کتاب کے مرتب ڈاکٹر منظر علی خاں کو غالب اور منظر علی خاں کی خطوط نویسی میں بہت سی "مشترک اقدار" کی تلاش میں بے حد مصروف رہنے کی وجہ سے وہ کتاب کی ترتیب کی طرف توجہ نہیں کر سکے۔ خطوں کی تاریخی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی جس خط کو جہاں چاہا ٹانک دیا ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ جواب طلب خط سے پہلے اس کا جواب پڑھنے میں آرہا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوں کے درمیان چند غیر متعلق خطوط بھی شامل کر دیے ہیں۔ ایک خط تو ایسا ہے کہ اس سے غلط فہمیوں کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے "آغا صاحب کی ساری فلاسفی دھری کی دھری رہ گئی"۔ یہ خط دراصل بی سی سی آئی کے آغا حسن عابدی کے بارے میں ہے مرتب نے اسے ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوں میں شامل کر دیا، یہ بھی نہ سوچا کہ "آغا صاحب" سے مراد کون سے آغا صاحب ہیں۔ جناب مرتب احمد کی پگڑی محمود کے سر رکھنے کے بھی شائق ہیں۔ منظر صاحب کے ایک خط کو ڈاکٹر انور سدید کا خط بنا دیا ہے۔ موصوف نے اتنی زحمت بھی نہیں کی کہ بعض مکتوب نگاروں کے بارے میں ایک دو تعارفی سطریں ہی لکھ دیتے تاکہ یہ تو معلوم ہو جاتا کہ ان مشاہیر کے غیر معروف رہ جانے کی وجہ کیا ہے۔

خیر یہ سب ضمنی باتیں ہیں، اصل بات یہ ہے کہ منظر علی خاں کے خطوں میں جو ادبی چاشنی ملتی ہے، وہ حاصل کتاب ہے۔ ان کے خطوط سے ایک باغ و بہار شخصیت سامنے آتی ہے وہ بغیر کسی سابقہ تعارف کے پہلے ہی خط میں اپنے مکتوب الیہ سے اتنے بے تکلف

ہو جاتے ہیں جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ موقع و محل کی مناسبت سے طنز و مزاح سے بھی کام لیتے ہیں۔ ان کا مزاح مہذب اور شائستہ ہوتا ہے اور طنز ایسا لطیف، جس کو ہدف بنایا جائے وہ بھی محظوظ ہوتا ہے کہ وار خالی گیا۔

منظر صاحب اپنے خطوں میں ایک خوش اخلاق اور مخیر انسان کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ خوش اخلاق وہ اتنے ہیں کہ ہر عید پر لوگوں کو عید کارڈ بھیجتے ہیں۔ شادیوں پر مبارک باد کے اور اموات پر تعزیت کے خط لکھتے ہیں۔ کسی کو کوئی عہدہ یا اعزاز ملے تو اس پر خوشی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں جیسے یہ عہدہ یا اعزاز خود انھیں ملا ہو۔ کوئی بیمار پڑ جائے تو اس کی مزاج پرسی ایسے خلوص سے کرتے ہیں کہ بیمار کا صحت مند ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ ان کے مخیر ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ ہر خط کے ساتھ اپنی کوئی نہ کوئی تصنیف ضرور بھیجتے ہیں۔ نئے سال کی ڈائریاں تقسیم کرتے ہیں اور بعض خوش قسمت لوگوں کو مٹھائی اور قلم وغیرہ پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وا در یغا کہ منظر صاحب نے ہمیں کبھی اس سلوک کے قابل نہیں سمجھا۔ زیر نظر کتاب کی بجائے اگر وہ کوئی ڈائری بھیج دیتے تو اچھا تھا۔ ہم کالم لکھنے کی مشقت سے بچ جاتے اور ڈائری میں کوئی ڈھنگ کی چیز لکھتے مثلاً ان لوگوں کے حالات زندگی لکھتے جو ادیب نہ ہونے کے باوجود ادب میں نام پیدا کر لیتے ہیں۔

منظر صاحب کے خطوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مزاح ان کی تحریروں ہی کا خاصہ نہیں، عملی زندگی میں بھی وہ اس سے خوب کام لیتے ہیں۔ اس مجموعے میں رسالوں کے اڈیٹروں کے بھی بہت سے خط ہیں جن میں سے اکثر میں یہ لکھا ہے کہ آپ جس بینک میں کام کرتے ہیں، اس کا اشتہار دلوایئے ایسے خطوں کے جواب میں منظر صاحب عموماً اپنا کلام بھیج دیتے ہیں۔ اڈیٹروں کے ساتھ ایسا مذاق کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے اشتہار کی امید میں غزلیں چھاپنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کوئی دل جلا اڈیٹر غزل کو اشتہار سمجھ کر اس کے چھاپنے کا معاوضہ طلب کر سکتا ہے۔ ویسے یہ کوئی معیوب بات بھی نہیں۔ آج کل یورپ، امریکہ اور خلیج کی ریاستوں کے اردو ادیبوں کی نگارشات رسالوں میں اشتہارات کی صورت میں شائع ہوتی ہیں۔

مشاہیر کے جو خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں ان میں سے بیشتر کو اگر خطوط کی بجائے رسائد کہا جائے تو بہتر ہوگا کیوں کہ ان میں ڈائریوں، کتابوں اور عید کارڈوں کی وصولی کی اطلاع دی گئی ہے اور تہہ دل سے شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ رسائد کے علاوہ کتاب میں کچھ ٹیلی گرام بھی شامل ہیں یعنی کچھ خط اتنے مختصر ہیں کہ ان پر ٹیلی گرام کا شبہہ ہوتا ہے مثلاً شان الحق حقی کا ایک مکمل خط یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

محبی تسلیم

پیش لفظ کتابت کے بعد ایک نظر دکھا دیں تو ممنوں ہوں گا۔ مخلص شان الحق حقی

معلوم نہیں منظر صاحب نے شان صاحب کو ممنون کیا یا نہیں، ہم کاتب اور مکتوب الیہ دونوں کے بے حد ممنون ہیں کہ ہمیں ایک ادبی شاہکار سے استفادے کا موقع دیا گیا۔

اس مجموعے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل خطوں سے منظر صاحب اور مشاہیر کے درمیان خلوص و محبت کے گہرے رشتے کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض مشاہیر نے اظہار خلوص کے نئے نئے پیرائے اختیار کیے ہیں۔ مثلاً جوگندر پال لکھتے ہیں "آپ بے ضرر معلوم ہوتے ہیں" زاہدہ حنا لکھتی ہیں "میں اگر آپ کو بانکے بہاری کہتی ہوں تو کیا غلط کہتی ہوں۔ واقعی بانکے بہاری کی طرح معصوم ہیں آپ۔"

اس کتاب میں ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوط خاصی تعداد میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اور بھی بہت سے مطبوعہ خطوط ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ وہ مکتوب نگاری میں ایک خاص انداز رکھتے ہیں۔ ان کے خطوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مکتوب الیہ کے مزاج اور ذہنی سطح کو پیش نظر رکھتے ہوئے خط لکھتے ہیں۔ منظر صاحب کے نام سارے خطوط ہلکے پھلکے موضوعات پر ہیں۔ کہیں کسی علمی مسئلے پر اظہار خیال نہیں کیا گیا۔ کہیں کوئی ادبی بحث نہیں چھیڑی گئی۔ بس ادھر ادھر کی دلچسپ باتیں کی ہیں مثلاً ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

"اگر آپ اپنے مضمون کے نیچے دستخط نہ بھی کریں تو قاری فی الفور پہچان لے گا کہ مضمون منظر علی خاں کا لکھا ہوا ہے۔"

اس پر ہمیں استاد اختر انصاری اکبر آبادی مرحوم کا ایک واقعہ یاد آ گیا ایک مرتبہ ان کی ایک غزل بغیر نام کے رسالہ "ساقی" میں چھپ گئی۔ انھوں نے ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی مرحوم سے شکایت کی۔ انھوں نے کہا "میاں تمھاری غزل تمھارے نام کے بغیر چھپ گئی تو کیا ہوا۔ ہر شخص سمجھ لے گا کہ یہ تمھاری غزل ہے۔ استاد نے اس کا سبب پوچھا تو شاہد صاحب نے کہا" تمھارا ہر تیسرا مصرع بحر سے خارج ہوتا ہے۔ ایسی غزل تمھارے سوا کون لکھ سکتا ہے۔

کالم ختم ہوا اور ہم یہ بتانا بھول گئے کہ کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا ہے۔ یہ دیباچہ بھی ایک خط کی صورت میں ہے۔ اس میں قمر رئیس فرماتے ہیں کہ منظر صاحب کے خطوط پڑھ کر مولانا حالی اور مولانا عبدالحق کی تحریریں یاد آ جاتی ہیں۔ ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے، البتہ قمر رئیس صاحب کی خدمت میں یہ عرض کریں گے کہ مولانا حالی اور مولوی عبدالحق ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، ہماری روایت یہ ہے کہ مرحومین کو ہمیشہ اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے۔

نام کتاب ....
مبصر: یوسف ناظم
ضخامت: ڈیمائی سائز (تقریباً)

مصنف: خامہ بگوش
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی
صفحات: حسب معمول

یہ اس صدی کی اس اہم ترین کتاب پر تبصرہ ہے
جس کا مسودہ ابھی تک طباعت کے لیے پبلشرز
کے پاس نہیں پہنچا۔ (ش، ع، خ)

ہندستان میں چند دنوں سے غیر معمولی کتابیں چھپ رہی ہیں۔ زیر نظر کتاب غیر معمولی نہیں ہے بلکہ اس سے بھی کچھ آگے ہے۔ اس کتاب کو آپ 'مس یونیورس' کہہ سکتے ہیں (ڈیونیورس کے بجائے غلطی سے یونی ورسٹی نہ کہہ دیجیے سارا حسن غارت ہو جائے گا) کتاب کا حسن، سر ورق، ورق، لکھائی اور چھپائی میں نہیں ہوتا تحریر میں ہوتا ہے اور خامہ بگوش کی تحریر کو آنکھوں سے لگاتے دیکھا ہے (میری آنکھیں اسی لیے متاثر ہوئی تھیں)۔ خامہ بگوش شاید انھیں خود خبر نہ ہو کہ وہ کب اور کیسے تحقیق کی طرف چلے گئے۔ تحقیق بھی یوں بُرا کام نہیں ہے اور محققین کو بھی ادبی معاشرے میں اچھا خاصا مقام حاصل ہے لیکن موصوف نجی طور پر، خانگی حیثیت میں اور مزاجاً تخلیقی کام کے لیے پیدا کیے گئے تھے اور اس تخلیق میں وہ بھی شق جسے ظرافت، نگاری کہا جاتا ہے۔ اس طرز تحریر میں وہ اہل قلم جسے اس کے سارے اصول، صنائع بدائع، محاسن، باریکیاں اور حدود معلوم ہوں وہ شخص اپنے قلم کی انی سے کسی کی بھی انا کا قلع قمع کر سکتا ہے (ذبیحہ کہہ لیجیے) خامہ بگوش نے جس کیفیت کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا وہ تصنیف بمعہ مصنف فراز دار پر پہنچ گئی۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں نیند تو سولی پہ بھی آجاتی ہے مصنف کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ خامہ بگوش کے قلم میں تیزابیت کے علاوہ براؤن شوگر بھی ملی ہوئی ہے۔ ہمارے بزرگ مزاح نگاروں کے زمانے میں یہ براؤن شوگر چونکہ دستیاب نہیں ہوتی تھی اس لیے ان کا مزاح ایک آنچ کا طلب گار رہ جاتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خامہ بگوش براؤن شوگر کے سوداگر ہیں۔ اس براؤن شوگر میں زہر بھی ہے اور نشہ بھی لیکن جاں بخش۔ دل نواز۔ اور مسرت انگیز۔ وہ خود اپنی تحریر کا لطف لیتے ہیں یا نہیں لیکن ان کے 'شہیدان قلم' اور 'کشتگان طنز و رمز' اپنے زخموں کے لیے مرہم تلاش نہیں کرتے خود ہی اس پر ٹیبل سالٹ چھڑک لیتے ہیں۔ میں نے ان کے کئی زخمیوں کو دعوت دے کر لوگوں کو بلاتے دیکھا ہے کہ آئیں اور "سیر گل" فرمائیں۔ (اس دعوت میں بہانے کی نہیں بلانے کی شوخی شامل رہتی ہے)

خامہ بگوش اب تحقیق کا رخ نہیں کریں گے۔ زیر نظر کتاب نے انھیں کا "بجولان" کر دیا

ہے۔ اب انھیں ایسی فنکاری میں اپنی انگلیاں فگار کرتی ہے۔ یوں بھی تخلیقی عمل پر مہر انسداد لگانا شرع کے خلاف ہے۔ لیکن بے حد اس کا خیال رکھیں گے۔ میں نے ان کے کسی بھی مضمون کا ایک جملہ تک یہاں نقل نہیں کیا ہے اگر نقل کرتا تو پھر نقل کرتا ہی چلا جاتا۔

شاہد علی خاں جیسے ہمت والے آدمی اس کتاب کی چھپائی پر انھوں نے زیادہ محنت صرف کی ہے۔ کوئی حرج نہیں۔ وہ ایسا نہ کرتے تو شکایت نہیں ہوتی۔ کتاب کی قیمت جو بھی ہے وہ صرف اس خام مال کی ہے جو اس پر صرف ہوا ہے۔ اس زر د مال کی قیمت ہو ہی نہیں سکتی جو اس میں کوٹ کوٹ کر نہیں پیس پیس کر بھرا ہے۔ وہ تمام لوگ قابل مبارک باد ہیں جن کا اس کتاب میں کسی نہ کسی طور ذکر آیا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ یہ ذکر خود ان سے بہتر ہے حالانکہ واقعہ یہی ہے۔

مجتبیٰ حسین
۲۰۰۔ انگور اپارٹمنٹس
پٹ پڑ گنج۔ نئی دہلی

اب آپ
دیو کی نندن پانڈے کے سماچار سُنئیے

یہ پندرہ برس پُرانی بات ہے ہندی کے شہرہ آفاق نیوز ریڈر دیو کی نندن پانڈے اور ہم ایک مشترک دوست کے گھر میں بیٹھے تھے۔ ایک مرحلہ پر ہمارے دوست کی بیوی نے باورچی خانہ سے اپنے نوکر کو پکار کر کہا "راجو ذرا یہ ریڈیو تو بند کر دینا۔ بڑی دیر سے بلا وجہ چل رہا ہے" کچھ دیر بعد باورچی خانہ سے ایک زنّاٹے دار طمانچہ کی آواز آئی اور ہمارے دوست کی بیوی نے اپنے نوکر کو ڈانٹتے ہوئے کہا "تو بڑا کام چور ہو گیا ہے۔ کتنی دیر پہلے میں نے تجھ سے ریڈیو بند کرنے کے لیے کہا تھا مگر یہ اب تک چل رہا ہے" اس پر نوکر نے روتے روتے کہا تھا "میم صاحب میں نے تو ریڈیو صبح میں ہی بند کر دیا تھا ۔ میں خود حیران ہوں کہ یہ اپنے آپ کیسے چل رہا ہے۔ ویسے میں ابھی ڈرائنگ روم میں گیا تھا وہاں جو ایک لمبے تڑنگے صاحب بیٹھے ہیں ان کے اندر سے بار بار ریڈیو کی آواز آ رہی ہے، یقین نہ آئے تو آپ خود چل کر دیکھ لیجیے" نوکر کے اس جواب کو سُن کر ہم سب کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ جب بھی دیو کی نندن پانڈے کچھ بولتے ہیں تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا ریڈیو چل رہا ہے اور وہ اسے بند کرنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو کی ہندی خبروں کے بے مثال نیوز ریڈر دیو کی نندن پانڈے سے کون واقف نہ ہوگا بھلے ہی آل انڈیا ریڈیو کی شدھ ہندی کسی کی سمجھ میں نہ آتی ہو لیکن پانڈے جی کی آواز سب کی سمجھ میں آ جاتی ہے، ابھی کچھ برس پہلے تک اُن کی آواز ریڈیو پر ہمیشہ گونجا کرتی تھی۔ پانڈے جی سے ہماری پندرہ سولہ برس پُرانی یاد اللہ ہے۔ ہمیں وہ اس لیے بھی پسند ہیں کہ ریڈیو پر تو وہ نہایت شُدھ ہندی میں خبریں سناتے رہے ہیں لیکن جب ریڈیو کے مائیکروفون سے ہٹ جاتے ہیں تو لکھنؤ کی خالص اردو بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ دیو کی نندن پانڈے جہاں بات بات پر لطیفے سُنا کر محفل کو زعفران زار بناتے رہتے ہیں وہیں اچانک اردو کا کوئی شعر سُنا کر محفل کو سنجیدہ بھی بنا دیتے ہیں۔ غرض ہمیشہ دھما چوکڑی مچاتے رہتے ہیں۔ اگرچہ پانڈے جی اب پچھتّر برس کے ہو گئے ہیں لیکن اپنے آپ کو سدا جوان رکھنے کا گُر خوب جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ آپ کو ہمیشہ نوجوانوں میں گھِرے ہوئے نظر آئیں گے۔ دس بارہ برس پہلے تک اُن سے ہماری خاصی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں

پھر ملنا جلنا کچھ کم ہو گیا تو ایک دن ہم نے پانڈے جی سے اس کی شکایت کی۔ بولے "یار اب تم بوڑھے ہوتے جارہے ہو اور تم جانتے ہو کہ میں ہمیشہ ہم عمروں کی صحبت میں رہنے کو ترجیح دیتا ہوں حالانکہ پانڈے جی ہم سے عمر میں سولہ برس بڑے ہیں۔ ان کی زندگی کا نصب العین کچھ اس طرح کا ہے کہ آدمی اپنے دل کو مرنے نہ دے چاہے اس کے لیے اس کے جسم کو کتنے ہی عذاب سے کیوں نہ گزرنا پڑ جائے۔ وہ ایک شعر اکثر سناتے ہیں:

واسطے زندگی کے پال لینا کوئی روگ
صرف صحت کے سہارے زندگی چلتی نہیں

پانڈے جی نے اپنے دل کو جوان رکھنے کے لیے کیسے کیسے خوبصورت روگ پال رکھے ہیں اس کا ہمیں اندازہ ہے۔ اتنا ضرور کہیں گے کہ ان کے پچھتر سالہ جسم میں اب بھی ایک ایسا دل ہے جو عموماً سولہ سترہ سال کے ایک نوجوان کے جسم میں پایا جا سکتا ہے پانڈے جی کی پیدائش ۱۵ فروری ۱۹۲۰ء کی ہے۔ ان کی والدہ ان کے والد کی دوسری بیوی تھیں۔ اور بات یہ ہے کہ ان کے والد کی عمر پچاس سال اور ان کی والدہ کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ ان کے والد نے عمروں کے اس تفاوت کو دور کرنے کا آسان نسخہ یہ دریافت کیا کہ دھڑا دھڑ بچے پیدا کرنا شروع کر دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے چودہ بچوں کی قطار لگا دی۔ پانڈے جی ان سب میں بڑے تھے۔ اس غیر منصوبہ بند پیدائش کی وجہ سے کسی بچہ کو یہ پتا ہی نہ چل سکا کہ اس دنیا میں اس کی آمد کا مقصد کیا ہے۔

پانڈے جی نے جیسے تیسے ۱۹۴۰ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کیا اور لکھنؤ سیکریٹریٹ میں اسسٹنٹ کے طور پر ملازم ہو گئے۔ کالج کے زمانہ سے ہی وہ اسٹیج ڈراموں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ لہٰذا لکھنؤ میں سرکاری ملازمت کرنے کے علاوہ وہ ریڈیو ڈراموں میں نہ صرف حصہ لینے لگے بلکہ وقتاً فوقتاً اناؤنسمنٹ کا کام بھی کرنے لگے۔ الٰہ آباد میں فراق گورکھپوری ان کے استاد رہے۔ لکھنؤ آئے تو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن میں ان کی ملاقات ن۔م راشد (جو اُن دنوں لکھنؤ ریڈیو میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے) سے ہو گئی۔ ریڈیو کے ابتدائی دنوں میں ن۔م راشد نے ان کی بڑی ہمت افزائی کی جس کا ذکر وہ بڑی احسان مندی کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہیں ان کی ملاقاتیں کرشن چندر، جوش ملیح آبادی، میرا جی وغیرہ سے ہوئیں۔ مجاز کے وہ حلقہ بگوشوں میں سے تھے۔ چنانچہ مجاز کے بے شمار لطیفے انھیں یاد ہیں۔ مجاز کے لطیفے سنا کر سب کو تو ہنسا دیتے ہیں لیکن اکثر اوقات خود ان کی آنکھیں مجاز کو یاد کر کے بھیگ جاتی ہیں۔ کہتے ہیں "لطیفہ اپنی جگہ اور مجاز کی یاد اپنی جگہ۔ آپ لوگوں نے مجاز کو دیکھا ہی کہاں ہے ورنہ اس کے لطیفوں پر یوں نہ ہنستے"

ہم ہندی کی دو ہی ایسی شخصیتوں سے واقف ہیں جو اُردو رسم الخط بالکل نہیں جانتے لیکن اردو والوں سے کہیں زیادہ اچھی اردو بولتے ہیں ایک تو ہمارے اشوک واجپئی ہیں اور دوسرے ہمارے دیو کی نندن پانڈے۔ ایک دن ہم نے پانڈے جی سے پوچھا "آپ تو اردو

رسم الخط بالکل نہیں جانتے۔ پھر اتنی اچھی، بامحاورہ اور فارسی آمیز اردو کس طرح بول لیتے ہیں۔ بولے ،بے شک میں نے پینتیس برس سے زیادہ عرصہ تک آل انڈیا ریڈیو سے ہندی میں خبریں پڑھی ہیں لیکن لگ بھگ ساٹھ برسوں سے اردو والوں کی صحبت میں زندگی گزارتا رہا ہوں۔ کسی زبان کو سیکھنے کے لیے اس زبان کے اہل علم و ادب کی صحبت اس زبان کے رسم الخط سے کہیں زیادہ موثر وسیلہ ہوتی ہے۔، پانڈے جی جب لکھنؤ ریڈیو میں جزوقتی آرٹسٹ کے طور پر کام کرتے تھے۔ اس زمانہ میں آل حسن اور سعیدہ رضا بھی وہیں کام کرتے تھے۔ آزادی کے بعد جب دہلی کے ریڈیو اسٹیشن کو اناؤنسروں اور نیوز ریڈروں کی ضرورت لاحق ہوئی تو پانڈے جی کی آواز ریکارڈ کر کے دہلی بھیجی گئی۔ ان کی آواز ایسی تھی کہ اس کا انتخاب تو ہونا ہی تھا۔ اس طرح ۲۹ مارچ ۱۹۴۸ء کو پانڈے جی نے پہلا نیوز بلیٹن پڑھا۔ آلِ حسن بھی چیف نیوز ریڈر کے طور پر دہلی اسٹیشن آ گئے تھے۔ لیکن بعد میں بی بی سی میں چلے گئے۔ پانڈے جی کو اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں دہلی اسٹیشن سے اردو کی خبریں صرف حیدرآباد اور کشمیر کے لیے نشر کی جاتی تھیں۔ رات کے بلیٹنوں میں ہندی اور انگریزی خبروں کے بعد دہلی اسٹیشن ساڑھے نو بجے بی بی سی سے خبریں نشر کرتا تھا لیکن حیدرآباد پر پولیس ایکشن کے وقت بی بی سی نے کچھ ایسی خبریں نشر کیں کہ آل انڈیا ریڈیو سے بی بی سی کی خبروں کو نشر کرنے کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ پانڈے جی کی پاٹ دار اور طرحدار آواز لگ بھگ چالیس برسوں تک آل انڈیا ریڈیو پر گونجتی رہی۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ اس عرصہ میں آل انڈیا ریڈیو سے زیادہ تر بُری خبریں میں نے ہی نشر کیں۔ مولانا آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، گوبند بلبھ پنت اور نہ جانے کتنوں کے انتقال کی خبریں نشر کرنے کے لیے انہی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ انھیں ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کا ایک نیوز بلیٹن اب تک یاد ہے اس دن پانڈے جی اپنے دل کو جوان رکھنے کی کوشش میں ایک فوجی افسر کے ساتھ گھومنے چلے گئے۔ فوجی افسران کے منع کرنے کے باوجود ایک میکدہ میں داخل ہو گئے۔ انھیں ریڈیو سے رات کا بلیٹن پڑھنا تھا۔ پانڈے جی جب جھومتے جھامتے ریڈیو اسٹیشن پہنچے تو ہندی خبروں کے صلاح کار ڈاکٹر نگیندر انھیں دیکھ کر کسی قدر پریشان ہو گئے۔ اس شام کچھ دیر پہلے ہی وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خاں کے قتل کی خبر آ گئی تھی۔ خبروں کا وقت آ چکا تھا اور اس وقت کسی متبادل نیوز ریڈر کا بندوبست کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ لہٰذا مجبوراً پانڈے جی کو بلیٹن لے کر اسٹوڈیو میں جانا پڑا۔ پانڈے جی نے جیسے تیسے اپنے آپ کو سنبھالا اور کچھ ایسے اعتماد کے ساتھ لیاقت علی خاں کے انتقال کی خبر نشر کی اور آواز میں کچھ ایسا سوز و گداز پیدا کیا کہ جب یہ خبریں پڑھ کر باہر آئے تو ڈائرکٹر جنرل سے لے کر نیچے تک سب نے ان کے بلیٹن کی بے پناہ تعریف کی۔ یہ اور بات ہے کہ ڈاکٹر نگیندر کے سوائے کسی کو پتا نہیں تھا کہ اس دن ان کی آواز میں ایسا سوز و گداز اور ایسا اعتماد کیوں پیدا ہو گیا تھا۔

پانڈے جی نے ساری زندگی قلندری میں گزاری کبھی اپنی شہرت اور تعلقات کو اپنے فائدہ کے لیے استعمال نہیں کیا۔ وہ زندگی بھر خبریں تو پڑھتے رہے۔ لیکن کبھی خود

"خبر" بننے کی کوشش نہیں کی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی انھوں نے کئی برس کنٹریکٹ پر کام کیا۔ اب کئی ٹی وی سیریلوں میں کام کر رہے ہیں۔ "تمس" میں ان کی اداکاری کو عوام نے بے حد پسند کیا۔ دو تین آرٹ فلموں میں بھی کام کیا۔ پانڈے جی اب بھی کسی نہ کسی طرح معروف رہتے ہیں۔ دل تو ان کا اب بھی جوان ہے۔ لیکن عملی زندگی میں ان کی سرگرمیاں کم ہوتی جارہی ہیں۔ اب وہ ہمارے پڑوس میں دہلی کی "آکاش بھارتی" بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں اپنی رفیق حیات یشودھا پانڈے کے ساتھ رہتے ہیں۔ بچے دہلی سے باہر رہتے ہیں۔ یشودھا پانڈے بھی اب ۶۵ برس کی ہو چکی ہیں اور اس بات سے کافی خوش رہتی ہیں کہ پانڈے جی اب اپنا زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزارتے ہیں جو آواز پہلے سارے برصغیر میں گونجا کرتی تھی اب اس کا دائرہ سمٹ کر آکاش بھارتی کے ایک فلیٹ میں محدود ہوتا جارہا ہے۔ پانڈے جی اپنی زندگی سے خاصے مطمئن ہیں۔ کہتے ہیں "سماج کو جو کچھ میں دے سکتا تھا وہ میں دے چکا ہوں۔ اب دکھ کس بات کا جب غالب خستہ کے بغیر دنیا کے کوئی کام بند نہیں ہوئے تو بھیّا دیوکی نندن پانڈے کیا چیز ہے۔ بجز آواز کے میرے پاس تھا ہی کیا اور ہے بھی کیا؟"

منوہر مالگاؤنکر
ترجمہ: انیس الرحمٰن،
شعبہ انگریزی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

چٹکی بھر نسوار

ماں کے اعلان نے میرا دل دہلا دیا۔ "نانو کاکا آرہے ہیں"۔ انھوں نے کہا تھا۔

"ہے بھگوان!" میرے منہ سے نکلا۔ "کیا ہم انھیں تار نہیں بھیج سکتے کہ ہم خود کہیں جارہے ہیں۔ میرا تبادلہ ہوگیا ہے یا ایسی ہی کوئی بات؟"

"نہیں بھئی" ماں نے کہا "وہ تو اب ٹرین میں ہوں گے۔ اس کے علاوہ انھوں نے وثوق سے اپنی بات بڑھائی"۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہاں دو تین دنوں سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتے۔"

"وہ دلی کس لیے آرہے ہیں ــ ایسی گرمی میں؟"

"کسی منسٹر سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"کیا! اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ یہاں ہفتوں قیام کریں گے۔ منسٹر تو لوگوں سے ہفتوں مہینوں تک نہیں ملتے۔ ہے بھگوان!"

"اگر تمھارے نانو کاکا کو کسی منسٹر سے ملنا ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی صورت نکال لیں گے"۔ ماں نے کہا "دن یا رات، کسی نہ کسی وقت۔"

ماں اپنے خاندان والوں کے لیے ہمیشہ بڑی محبت رکھتی تھیں، اور آخر نانو کاکا تو اُن کے بھائی ٹھہرے۔ ادھر میرے دل میں منسٹروں کے بارے میں کچھ عجیب سے تاثرات ہیں۔ میں پروبیشن پر انڈر سکریٹری ہوں اور مجھے یہ ٹریننگ دی گئی ہے کہ منسٹروں کو خدا سے بھی دو درجے آگے کی مخلوق سمجھوں اور سکریٹری کو خدا سے ایک درجہ آگے۔

جب ٹرین آئی میں پلیٹ فارم پر ان کے انتظار میں کھڑا تھا۔ نانو کاکا دوسرے درجے کے ایک ڈبے کے دروازے پر کھڑے نظر آگئے۔ ان کے بال سفید تھے، مونچھیں بارعب تھیں اور ان کی شخصیت قابلِ توجہ تھی۔ وہ اب بھی پرانی وضع کا گھٹنوں تک لانبا کوٹ پہنتے ہیں۔ سر پر دکنی برہمنوں کی لال ریشمی پگڑی باندھتے ہیں اور اپنے کاندھوں پر سفید انگوچھا اوڑھے رہتے ہیں۔

جب میں آگے بڑھا تو انھوں نے مجھے ایک باسکٹ پکڑا دیا۔ "تم اسے لے کر باہر نکلو جلدی" وہ پھسپھسائے۔ "میں تمھیں اسٹیشن کے باہر ملوں گا۔"

میں نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ باسکٹ کاندھے پر لٹکایا اور مُڑا اور مُڑتے ہی ایک بھاری بھرکم مارواڑی عورت سے ٹکرایا جس نے اپنا چہرہ برقعے میں چھپا رکھا تھا۔ لیکن میری معذرتیں اُن عجیب و غریب آوازوں میں ڈوب گئیں جو اس باسکٹ سے نکل رہی تھیں۔ یہ غصّے میں بھری ہوئی ایک بلّی کے بچے کی احتجاج تھی۔ "سپیٹ... سٹرپ... میاؤں... میاؤں... میوں!"

میں نے پھرتی سے ڈبکی ماری اور بھاگ نکلا۔ بھیڑ میں شامل ہوکر سکڑتا، سمٹتا گیٹ سے باہر پہنچا جہاں کسی سکھ کی بارات جا رہی تھی۔

نانو کاکا بہت دیر کے بعد آئے۔ اسٹیشن کا صحن تقریباً خالی ہو چکا تھا اور اُن کے آنے تک آخری تانگا بھی جا چکا تھا۔ ان کے ساتھ گڑگڑاتا ہوا ایک ٹکٹ انسپکٹر تھا۔

"تھرڈ کلاس میں جگہ ہی نہیں تھی اور سکنڈ کلاس کا ٹکٹ بغیر ریزرویشن کے ملتا نہیں ہے۔" نانو کاکا میری طرف آتے ہوئے یہ سمجھا رہے تھے۔ "تھرڈ کلاس کے ٹکٹ کے بغیر سکنڈ کلاس میں آنا پڑا! خیر یہ سب کچھ آسانی سے حل ہو گیا۔ ٹی، سی بڑا بھلا نوجوان تھا۔ تم نے دیکھا وہ کیسے میرے ساتھ باہر تک آیا تاکہ کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ ہاں اس بلّی نے تو مفت میں سفر کر لیا۔ کیسی ہے یہ؟"

"بہت خاموش ہے،" میں نے جواب دیا۔ "شاید مر چکی ہے۔" میں نے پُرامّید ہوکر سوچا۔

ہم موٹر میں بیٹھ گئے اور اس سے پہلے کہ میں دوسرے گیئر میں گاڑی کو ڈالتا، نانو کاکا نے پوچھا "تم نے میرے ساتھ منسٹر کی ملاقات کب طے کی ہے؟ دو دنوں سے زیادہ میں ٹھہر نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ تین دن۔"

یہ صاف گوئی کا وقت تھا۔ "دیکھیے ماموں" میں نے کہا "میں معمولی انڈر سکریٹری ہوں، وہ بھی پروبیشن پر، اور یہ میرے لیے بہت مشکل ہے کہ میں منسٹر سے ملاقات کا نظم کر سکوں۔"

"اوہ" نانو کاکا نے کہا "مجھے تو اُمید تھی... اچھا خیر چھوڑو۔" انھوں نے ایک چُٹکی نسوار لی، انگلیوں کو اپنے انگوچھے پر نرمی سے پونچھا اور آرام سے بیٹھ گئے۔ اُن کی آنکھیں بند ہو گئیں اور بھوؤں پر شکن پڑ گئے جیسے کسی گہری سوچ میں ہوں۔ انھوں نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے خالص دکنی انداز میں کئی بار زبان بھی چٹخائی۔

ماں دروازے پر منتظر کھڑی تھیں۔ اُن کا چہرہ مسکراہٹ میں یوں ڈوبا ہوا تھا جیسے ان کی باچھیں کھِل گئی ہوں۔ وہ بلّی کے بچّے کو دیکھ کر دیر تک خوشی کا اظہار کرتی رہیں اور نانو کاکا کی آمد کا جشن مناتی رہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ انھوں نے میرے کمرے میں نانو کاکا کو ٹھہرانے کا انتظام کر دیا تھا۔ اس لیے مجھے پچھلے برآمدے میں

اپنے لیے چارپائی بچھانی پڑی۔

ماں کے اصرار پر میں نے دفتر سے دو دنوں کی چھٹی لی تھی اور دوپہر میں نانو کا کا کو گاڑی میں لے کر میں نارتھ بلاک گیا وہ منسٹر سے ملنے اندر چلے گئے اور میں کار پارک میں انتظار کرنے لگا۔ دو گھنٹوں بعد وہ رنگین مراٹھی گالیاں بڑبڑاتے ہوئے واپس آئے مجھے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی کہ کیا ہوا تھا اور میں چپ چاپ گاڑی چلانے لگا۔ وہ تھوڑی دیر بعد ٹھنڈے ہوئے اور کہنے لگے:

"خواہ مخواہ دو گھنٹے برباد ہوئے، ایک چپراسی سے دوسرے چپراسی تک بھیجا گیا، اس کاری ڈور سے اس کاری ڈور تک دندناتا پھرا اور اخیر میں ایک ڈپٹی سکریٹری تک پہنچنے میں کامیاب ہوا جس نے ملاقات کا وقت دیا۔ تین دنوں کے بعد! افسوس کی بات ہے! بے حد افسوس کی بات ہے!" پھر انھوں نے اپنے مراٹھی حسنِ بیان کے جوہر دکھائے لسانی بحران کے لمحوں میں میرے ماموں ہمیشہ اپنی مادری زبان کا سہارا لیتے تھے۔

ایک شوخ پیلے رنگ کی اسپورٹس کار مستقل تیز ہارن بجاتے ہوئے ہمارے برابر سے گزری اور گاڑی چلانے والے نوجوان نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

"کیسا بدتمیز تھا۔ کون تھا وہ؟" نانو کا کا نے پوچھا۔

"رتی رام۔ میری ہی منسٹری میں کام کرتا ہے۔"

"اچھا۔"

"ابھی کچھ ذکر تھا کہ وہ بحیثیت ٹریڈ کمشنر حضرت برکت علی کے پاس جا رہا ہے آپ جانتے ہیں نا وہی برکت علی جو سفیر ہیں، لیکن اب سُنا جا رہا ہے یہ بات ختم ہو گئی ہے۔" میں نے محض کچھ بات کرنے کی غرض سے کہا۔

"تم بھی کسی غیر ملکی تبادلے کی کوشش کر کے کہیں نکل کیوں نہیں جاتے؟" نانو کا کا نے پوچھا۔

"کوئی غیر ملکی تبادلہ کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی منسٹر سے ملاقات کا وقت لینا، ماموں" میں نے کسی قدر بے رُخی سے کہا۔ "اس کے لیے پیروی چاہیے۔ آپ جانتے ہیں رتی رام، سوہن لال رتی رام کا بیٹا ہے جو دہلی کے پارٹی باس ہیں۔"

نانو کا کا ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ بیٹھے "کیا کہا؟ کیا کہا؟ سوہن لال رتی رام کا بیٹا! بہت خوب! واہ، واہ!" وہ اپنی سیٹ میں پھر واپس دھنس گئے اور دیر تک مجھ پر تکتے رہے۔ "اچھا۔ اب دیکھتا ہوں۔ تمھارے پاس بند گلے کا جودھپوری کوٹ تو ہے، ہے نا؟ ٹھیک ہے۔ اور تم پگڑی بھی باندھ سکتے ہو؟ نہیں؟ خیر میں باندھ دوں گا۔ گرچہ میں بھی بہت ماہر نہیں ہوں۔ آج کل یہ ٹائی اور کالر کسی کام کے نہیں ہیں۔ چلو ہم گھر چلتے ہیں۔ جب تم کپڑے بدل لوگے۔ پھر ہم اُن سے ملنے چلیں گے۔"

"کن سے؟"

"لالہ سوہن لال سے۔" اور کس سے!"
"کیا آپ انھیں جانتے بھی ہیں؟"
"بالکل نہیں۔" نانو کا کا نے کہا۔
میں نے اپنا جودھپوری کوٹ پہنا۔ نانو کا کا نے میرے سر پر بڑی سی نارنجی رنگ کی پگڑی باندھی۔ تم اس طرح پیش آنا جیسے ۔۔ جیسے تم کوئی ADC قسم کی چیز ہو۔" انھوں نے مجھے ہدایت دی اور ہم لالہ سوہن لال کے گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔
سفید براق کپڑوں میں ملبوس ایک سکرٹیری نے ہمارا استقبال کیا اور ایک ٹھنڈے سفید کمرے میں ہمیں لے گیا پھر بہت نرمی سے ہمارا مقصد معلوم کیا۔
"بس یوں ہی آگیا۔" نانو کا کا نے غیر سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں زمین داروں کی کنونشن میں شرکت کے لیے دہلی آیا تھا۔ ایک غیر سرکاری جلسہ تھا۔ اب ہم زمیندار تو آج کل بہت ۔۔۔ بہت معروف و مشہور بھی نہیں رہے ۔۔۔ VP نے بھی کیبل بھیج دیا ہے۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے لیکن وہ کل کے بعد ہی واشنگٹن سے آرہا ہے۔ میں نے سوچا۔ میں لالہ جی سے ملتا چلوں اور بتا دوں کہ ہم زمینداروں نے کسانوں کے ووٹ کے سلسلے میں کیا انتظامات کیے ہیں۔"
نانو کا کا جیسے کچھ پیچھے رہ گئے اور میں یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ اس سکرٹیری پر کوئی خاص تاثر قائم نہیں کر پا رہے تھے جو بہت نرمی اور احتیاط کے ساتھ پیش آرہا تھا۔ "مجھے دیکھتا ہوں کہ لالہ جی کے پاس وقت ہے کہ نہیں" سکرٹیری نے جواب دیا "وہ پہلے سے بغیر وقت دیے لوگوں سے شاید ہی کبھی ملتے ہیں۔"
لالہ جی یقیناً فرصت میں رہے ہوں گے کیوں کہ ہم برابر والے کمرے سے حقّے کی گڑ گڑاہٹ سن سکتے تھے جو اطمینان سے پی جارہی تھی۔ ساتھ ہی سکرٹیری کی تیز آواز گفتگو بھی سنائی پڑ رہی تھی جو وہ لالہ جی سے کر رہا تھا۔
"آج کون سا دن ہے؟" نانو کا کا نے مجھ سے پوچھا۔
میں نے محسوس کیا وہ خاص طور پر تیز آواز میں بول رہے تھے۔ "منگل" میں نے جواب دیا۔
"اوہ، بس منگل، تعجب ہے، میں اتوار کو بیروت میں تھا۔ ہے نا؟"
مشکل سے ہی یہ بات میرے حلق کے نیچے اتری۔ "ہاں تعجب ہے!" میں نے اقرار کیا۔
اور اگر میں حضرت کی بات سنتا تو ابھی باہر ہی رہتا۔ بوڑھا HB تو فوراً منسٹر کے پاس میرے ساتھ جانے کے لیے میری جان کے پیچھے ہی پڑا ہوا تھا۔
برابر والے کمرے سے حقّے کی برابر آنے والی آواز یکایک بند ہو گئی۔
"کیا کہا تم نے؟" نانو کا کا نے پوچھا، اگرچہ میں نے تو اپنی زبان تک نہیں کھولی تھی

"میں مر کا کیوں نہیں ؟ جانتے ہو پچھلی بار جب HB جنیوا میں تھا تو کیا ہوا تھا
ں نے کاٹن کے ساتھ مجھے گفتگو میں پھنسا کر ہی رکھ دیا اور یہاں بمبئی سے SK
رے پاس کیبل پر کیبل بھیجتا رہا۔"
یہی وہ لمحہ تھا جب سوہن لال رتی رام لبلغ کی طرح جھومتے ہوئے اندر کمرے سے
کریٹری کو پیچھے پیچھے لیے نکلے اور پھر اس کے بعد سب کچھ جیسے اس گھاگ سیاسی ہم حج
ناک میں دم کر دینے والی شکر ین محبت میں لپٹ کر رہ گئی۔ جیسے ہی تعارف ختم ہوا
کریٹری کو مٹھائی، کافی، پان کا حکم دینے کے لیے دوڑا دیا گیا۔
اصل معاملے کی طرف آنے سے پہلے وہ چند منٹوں کے لیے زمین داروں، وڈیوں
ر موسم کی باتیں احتیاط کے ساتھ کرتے رہے۔" میں نے سنا ہے کہ آپ حضرت برکت علی
و خوب جانتے ہیں؟" سوہن لال نے دل میں گھر کرنے والے انداز میں دانت نکال
ر کہا۔

"اوہ بوڑھا HB آپ کیسے جانتے ہیں کہ میں ان سے واقف ہوں؟ دراصل
ہم لوگ اسکول میں ساتھ تھے اور وہ ہمیں بڑے بھائی کی طرح مانتا تھا۔ بلکہ آج
بھی وہ مجھ سے مشورہ کیے بغیر کوئی بڑا فیصلہ نہیں کرتا۔ جب PM نے اسے سفارت
انے میں جگہ پیش کی، آپ جانتے ہیں AB کو کس نے ذہنی طور پر اس ذمہ داری
و قبول کرنے کے لیے آمادہ کیا۔"
"آپ نے؟"
"ہاں بالکل صحیح، میں نے ہی! بچارا بوڑھا اور بھلا HB"
"ہا، ہا، ہا، ہا" سوہن لال پان کے داغ سے بھرے ہوئے دانت دکھاتے ہوئے
ہنسے۔" اس طرح میں خوش نصیب ہوں کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔
بہت خوش نصیب ہوں کیوں کہ میرا بیٹا، جو یہاں بیلنس منسٹری میں ہے، حضرت
برکت علی صاحب کے پاس بحیثیت ٹریڈ کمشنر جا رہا ہے۔ لیکن آپ تو جانتے ہیں ہی
کہ کتنے چکر پہ چکر ہوتے ہیں ان معاملات میں۔ لگتا ہے کسی نے سفیر کے دماغ میں
میرے بیٹے کے خلاف غلط باتیں بھر دی ہیں۔ متروکہ جائداد سے متعلق لین دین کے
بارے میں۔ حالاں کہ اس میں تو مکمل باضابطگی برتی گئی تھی...؟"
تانو کا کالے مزید کسی تفصیل کو راہ نہ دی۔ "یہ کون سی مشکل ہے؟" انھوں نے
اعلان کیا۔ "میں HB کو لکھوں گا کہ یہ کام کر دے۔ نہیں نہیں، مجھے شکریہ کہنے کی
ضرورت نہیں ہے۔ آخر ہم لوگ، جیسا کہ ہم عوام کی نظروں میں ہیں، ہمیں ایک دوسر
کے کام تو آنا ہی چاہیے۔ ہا، ہا۔ ایک بہتر رویہ دوسرے بہتر رویے کا مستحق ہوتا ہے۔"
تانو کا کالے اپنے چاندی والے نسوار کی ڈبیا کھولی اور ایک چٹکی نسوار لی۔ پھر
انگوٹھا سر گردو تھپتھپاتے ہوئے انھوں نے ولفرڈ منسٹر کا نام لاپروائی سے لیا۔

سوہن لال کے چہرے پر بھی ہوئی بے وقت ہنسی غائب ہو گئی۔ "کیا وہ آپ کا دوست ہے؟" انھوں نے جیسے بیتاب ہو کر پوچھا۔

"ہاں، کوئی خاص نہیں،" نانو کا کا نے اعتراف کیا "کوئی خاص نہیں۔"

"مجھے خوشی ہوئی"۔ سوہن لال نے اطمینان کی سانس لی۔ "بہت خوشی ہوئی۔ وہ شخص تو احسان فراموش! میں نے اسے ٹکٹ دیا تھا، ہر طرح سے اس کی مدد کی تھی اور ہمیں کیا ملا؟"

ایسا لگا کہ وہ منسٹر اور لالہ سوہن لال، جو کبھی بہترین دوست تھے۔ پچھلے سال سے ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو گئے تھے جب سے منسٹر نے لالہ جی کے بیٹے کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کی تجویز پر غور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

"اسے شہزادہ چاہیے"۔ سوہن لال نے نتھنے پھلا کر کہا۔ "آج کل شہزادہ کیا چیز ہے، ہش! ایک راز کی بات بتاتا ہوں کہ اس نے تو اپنی لٹیا ہی ڈبو لی ہے۔ مجھے تعجب ہو گا۔ بے حد تعجب ہو گا اگر اس بار الکشن میں اسے ٹکٹ مل جائے۔ اس نے میرے بیٹے کو رد کر دیا اور اب شہزادے کی تلاش میں ہے! دھت! اور اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ میں نے سنا ہے اب تک انھوں نے ایک دوسرے کی جنم پتری بھی نہیں دیکھی ہے اور دونوں طرف کے جیوتشیوں کی ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے کہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ یہ جوڑی شبھ بھی ہو گی یا نہیں۔"

"شرم کی بات ہے"۔ نانو کا کا نے نتھنے پھلائے۔ "بڑے شرم کی بات ہے! کون سا شہزادہ بتایا آپ نے؟"

"کوئی دو پیسے کی ریاست نثور کا ہے۔"

ہم اس کے بار جلد ہی وہاں سے اٹھ گئے۔ نانو کا کا نے پھر وعدہ کیا کہ وہ "بوڑھے HB" کو اسی دن خط لکھیں گے۔ جب ہم گاڑی میں وہاں سے نکلے تو لالہ جی اور ان کے بڑے سکریٹری ڈیوڑھی پر جھک کر انھیں الوداع کہہ رہے تھے۔

نانو کا کا اس شام اپنے اوپر کچھ عجیب سی خاموشی طاری کیے رہے اور کھانے کے بعد بستر پر چلے گئے لیکن اگلی صبح پھر وہ چہک رہے تھے۔

"ہم آج کی صبح منسٹر کے پاس چلیں گے"۔ انھوں نے اعلان کیا۔

"مجھے چھوڑ دیجیے ماموں، مہربانی کر کے"۔ میں نے اپیل کی۔

بولنے سے پہلے انھوں نے نسوار لی اور اس وقت تک وہ بھول گئے کہ میں نے کیا کہا تھا۔ "تمھاری یہ گاڑی بہت پرانی، بہت چھوٹی ہے۔ ہمیں کوئی زوردار گاڑی چاہیے۔ تم نے دیکھا کہ سکریٹری ہمارے ساتھ کیسی سرد مہری سے پیش آیا۔ اگر ہم کسی بڑی گاڑی میں گئے ہوتے تو وہ ہمارے ساتھ دوسری طرح پیش آتا۔"

"ٹیکسی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"نہیں ٹیکسی نہیں۔ پرائیوٹ کار ہونی چاہیے جسے وردی والا شوفر چلائے، اور جتنی
ی ہو اتنی اچھی ہے۔"

مجھے یاد آیا کہ میرے ایک جاننے والے کچھ مہینوں سے ایک بہت بڑی، پُرشکوہ اور
ملکی گاڑی فروخت کرنے کی فکر میں تھے جو کسی بڑے جلوس میں استعمال کے لیے
ا ہوگی۔ میں نے نانوکاکا کو اس کے بارے میں بتایا۔

"یہ بات ہوئی نا! ہاں اسے آزمانے کے لیے لے آؤ۔" انھوں نے مست ہو کر
شورہ دیا۔

"میرا خیال ہے ایسا ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا "بشرطیکہ واقعی خریدار نظر
ئیں۔ لیکن کیا ہم واقعی ایسے لگتے ہیں۔ موٹر گاڑیوں کے دلال امیروں کو میلوں
در سے ہی سونگھ لیتے ہیں۔"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو۔" نانوکاکا نے کہا۔ "یہ سب تفصیلات میں دیکھ لوں گا۔"

"اور اس وردی والے شوفر کا کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے تم ہوگے وہ۔" نانوکاکا نے پھیکے پن سے کہا۔

انھوں نے اپنا چیک بک نکالا اور ایک ہزار روپے کا چیک لکھا۔ انھوں نے
صفائی سے اسے موڑا اور اپنے پُرانے کوٹ کے اندر والے جیب میں رکھ لیا۔ "اب
پنے دھوبی کو بُلاؤ۔" انھوں نے مجھ سے کہا۔

میں نے دھوبی کو بُلایا اور اسے ماموں کا کوٹ دیا اور اسے باہر لے جا کر اس سے
ات کی۔ پھر ہم سکا آٹو ڈیلرز کے پاس اپنی گاڑی پر پہنچے اور نانوکاکا نے پوچھا
کیا ہم اس گاڑی کو چلا کر دیکھ سکتے ہیں؟"

ہم نے منیجر سے [illegible] بھی بات کرنا شروع ہی کیا تھا کہ دھوبی دوڑا ہوا دکان میں
ایا۔ ایک ہاتھ میں نانوکاکا کا پُرانا کوٹ لیے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں چیک دکھاتے
ہوئے۔ "اوہ، آپ لوگ یہاں ہیں۔" وہ ہانپ رہا تھا "دیکھیے آپ نے کوٹ میں
کیا رکھ چھوڑا تھا!"

نانوکاکا نے چیک سے تھوڑی دوری برتی اور کئی بار اپنی زبان چٹخائی "میں
بھی کیسا لاپروا ہوں!" انھوں نے کہا۔ "میں ہمیشہ ہی ایسا کرتا ہوں۔ بیہودہ چیک
بھی رکھ کر بھول جاتا ہوں، کوئی بھی یہ رقم لے سکتا تھا۔ تم بھلے انسان ہو۔"
انھوں نے دھوبی سے کہا۔ "لو تمھارے لیے یہ انعام ہے۔ ایمان داری سے بڑی
کوئی چیز نہیں۔" اور انھوں نے اسے دو روپے دیے اور اس کی پیٹھ ٹھوکی۔

دولت کے اس مظاہرے کے بعد، کار کا معاملہ نہایت آسان تھا۔ میں نے
گاڑی ڈرائو کی، اپنی سفید جودھپوری کوٹ اور نارنجی پگڑی میں ملبوس اور نانوکاکا
شاہی انداز میں پیچھے بیٹھے رہے بالکل ویسے ہی جیسا انھیں نظر آنا چاہیے تھا۔

کسی ریاست کے خاندانی پنڈت کی طرح۔

ہم منسٹر کے گھر پہنچے۔ نوکر چاکر اور سکریٹری نانو کاکا کے ارد گرد منڈلائے لیکن انھوں نے اپنا مقصد بتانے سے انکار کر دیا۔ صرف وینر ٹیرس بک مانگا۔

"میں صرف ایک رسمی ملاقات کے لیے آیا ہوں۔" انھوں نے اعلان کیا۔ "میں منسٹر صاحب کو پریشان کرنا بالکل نہیں چاہتا۔ یہ محض ایک رسم ہے جس کی ہم اپنی پرانی ریاستوں میں اب بھی قدر کرتے ہیں۔ ہز ہائی نس اس اخلاق کے بہت پابند ہیں۔ وہ وینر ٹیرس بک لے آئے اور میں نانو کاکا کی طرف تعریف سے دیکھتا رہا۔ جب انھوں نے اپنا نام بڑی روانی سے لکھا اور یہ فقرہ جوڑا: "نینور کے مہاراجا کے خاندانی جیوتش۔" اخیر میں انھوں نے اپنا دلی کا پتا لکھا جو میرا پتا تھا۔

کچھ اور کہے بغیر، جیسے وہ بڑی جلدی میں ہوں، وہ گاڑی میں گھسے اور باآواز بلند کہا: "مجھے مہاراجا ستکتا کے محل لے چلو۔ مجھے وہ ساری جنم پتریاں واپس کرنی ہیں جو میرے حوالے تھیں۔" گاڑی جب گیٹ سے باہر نکلی تو میں پیچھے مڑا اور دیکھا کہ ایک کالا اور بھاری بھرکم کھدر دھاری اوپری منزل کی ایک کھڑکی سے ہم پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

ہم نے ابھی ابھی چائے ختم کی تھی اور ہم بلی کے بچے کو گھر کی قید سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جس نے فرش کو گندا کر رکھا تھا کہ ایک سفید ترنگوں والی ایک گاڑی گھر کے سامنے رکی اور نانو کا کا ہاتھ جوڑے ویلفیئر منسٹر کا استقبال کرنے آگے بڑھے جو اُن سے ملنے آیا تھا۔

نانو کا کا کل رخصت ہو گئے۔ اپنے مقصد میں کامیاب۔ میں یہ کبھی سمجھ نہ پایا کہ وہ منسٹر سے آخر کس لیے ملنا چاہتے تھے اور میں سوچتا ہوں کہ منسٹر کو جب یہ معلوم ہو گا کہ میرے ماموں نینور نام کے کسی جگہ کے سیکنڈ [illegible]یل کے دائرے میں کبھی بھٹکے تک نہیں تو کیا ہو گا۔ اگرچہ مجھے اب یقین ہے کہ وہ اپنے انگوچھے کی تہہ کو ذرا بھی زیر و زبر کیے بغیر معاملے کو سلجھا لیں گے۔

میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب کبھی ایسا ہو میں ان کی گرفت سے بہت دور رہوں۔

دون کمار ورما
۱۲۵- گلی انتھن والی - پراگ داس - امرتسر

(کہانی)

ستیہ نارائن کی کتھا

ستی عرف ستین بھائی کی تصویر صوبے کے تقریباً ہر اہم اخبار میں چھپی تھی۔
بھاردواج ہیر کٹنگ سیلون میں اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے میں نے ہندی اخبار میں وہ تصویر دیکھی تھی اور سچ مچ حیران رہ گیا تھا۔ ماسٹر رنگیلا رام نے گاہک کے گالوں پر صابن کا جھاگ بناتے ہوئے کہا تھا۔

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے—"

ستین بھائی — میں نام پڑھ کر زیرِ لب مسکرایا تھا۔ اپنا یار ستی سے ستو استاد دست باز بابو ستیہ نارائن اور پھر ستین بھائی ہو گیا تھا۔ میں نے غور سے تصویر دیکھی — اپنا یار ستی ہی تھا۔ گردن خوب موٹی ہو رہی تھی۔ چوڑا، مضبوط جبڑوں والا چہرہ اور اس کا رعب ڈیل ڈول، اچھی نہیں، بہت اچھی صحت کی کہانی کہہ رہا تھا۔ آنکھوں میں کامیابی کی چمک اور نشہ۔ البتہ اب بال پہلے جیسے گھنے، چمکیلے اور سیاہ نہیں رہ گئے تھے۔ چاندی چڑھ گئی تھی۔ ایسا شاید اس کی تجوری اور بینک بیلنس میں اضافے کے باعث ہوا تھا۔ آدھے سے زیادہ سر گنجا ہو چکا تھا لیکن اس گنجے پن سے وہ خاصا مدبر اور معزز لگ رہا تھا۔ سنہری فریم کی، ہلکے نیلے شیشوں والی عینک اس کے چہرے کو وقار اور سنجیدگی بخش رہی تھی۔ تصویر میں وہ ہاتھ جوڑے، ذرا سا جھک کر مسکرا رہا تھا۔ کیسی پُراعتماد مسکراہٹ تھی۔

"پہچانا نہیں یار کو—" رنگیلا رام ہنسا۔

"خوب پہچان رہا ہوں—" میں نے آدھے صفحے پر پھیلی خبر کی تفصیل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

ستین بھائی امپروومنٹ ٹرسٹ کے چیئرمین بنا دیے گئے تھے۔ سرخ بتی والی بلٹ پروف کار، چار گن مین اور دیگر سہولیات میسّر ہو گئی ہیں۔ اس شان و شوکت کا اسے بچپن ہی سے شوق تھا۔ اس کا باپ اسے سمجھاتا کہ اپنی چادر میں رہو۔ بہت اونچے مت اڑو تو وہ ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا۔ پھر پستول وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ جب پستول رکھنے کی استطاعت نہیں تھی تو رامپوری چاقو جیب میں لیے پھرتا تھا۔

ور موقع بے موقع اس کی نمائش کرنے سے کبھی نہیں چوکتا تھا۔ اس کا باپ اسی غم اور فکر م
ے مر گیا کہ ستی نے اپنے کالے کرتوتوں سے خاندان کی ناک کٹوا دی تھی۔ ستی کہا کرتا تھا
ِن سی ناک، کس خاندان کی ناک جو تین پشتوں سے کرایے کے مکان میں رہتا چلا آ رہا ہے۔
کیٹی کے نل پر نہاتا چلا آ رہا ہے اور بجلی کا ایک پنکھا گھر میں نہیں لگوا سکا۔ یہ بھی سالی
ِی ناک ہوئی۔ باپ کی آخری رسومات ادا کرنے کے بعد ستی نے میرے کان میں کہا تھا۔
"میرا باپ بے وقوف تھا" ـــــ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں دکھ یا پچھتاوا نہیں تھا۔

ستین بھائی نے چیرمین شپ سنبھالتے ہی زوردار بھاشن دیا تھا جس میں نوجوانوں
ِ ملک اور قوم کی ترقی کے لیے ہر قربانی دینے اور راشٹر پتا مہاتما گاندھی کے نقش قدم
ِ چلتے ہوئے، ان کے سپنے کو ساکار کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔

میں نے سوچا، مہاتما گاندھی کا سپنا یہ تو نہیں تھا کہ انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا
ِنے کے بعد پورے ملک کو ملکی اور غیر ملکی سرمایہ داروں کی بھوک کا نوالہ بنا دیا جائے۔
چہ بچہ اس قدر مقروض کر دیا جائے کہ آنے والی کئی نسلیں اس بوجھ سے نجات نہ پا
سکیں۔ قوم کو امریکہ کا اقتصادی غلام بنا دیا جائے۔ ملک اور قوم کا وقار مٹی میں ملا
یا جائے۔ عام آدمی کا زندہ رہنا دشوار کر دیا جائے۔ جنتا کو لوٹ کھسوٹ اسکینڈلز اور
ِسادات کی بھٹی میں جھونک دیا جائے۔ دہشت گردوں کی سرپرستی کر کے ملک کو
ِہشت اور خوف کے سایے میں ڈھکیل دیا جائے۔ زنا، بے ایمانی، رشوت، بھرشٹاچار
ِتل، اغوا کے اندھیروں میں پھینک دیا جائے اور خود عیش کیا جائے۔ تعلیم کے فوائد پر
سمینار منعقد کیے جائیں اور تعلیم اس قدر مہنگی کر دی جائے کہ سرمایہ داروں، سیاست دانوں
اور رشوت خور افسروں کی اولاد کے علاوہ کوئی اور اعلا تعلیم حاصل ہی نہ کر سکے۔ کتنے
منصوبہ بند طریقے سے ملک کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ بس اس کے ٹکڑے کرانا باقی رہ گیا
ہے اور یہ صرف امریکی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے ہو رہا ہے۔ مہاتما جی کو گالیاں
ِی جا رہی ہیں اور اُن کے نام لیوا کان لپیٹے موج منا رہے ہیں۔ اپنی گردنوں سے
چپکے رہنے کے چکر میں ہیں۔ گوڈسے نے تو گاندھی جی کا جسم ختم کیا تھا۔ یہ لوگ تو ان
کی آتما کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ مہاتما جی تو اب صرف تصویروں اور رتنوں
کے لیے رہ گئے ہیں۔ ووٹ کی گندی سیاست نے سچائی اور اہنسا کا گلا گھونٹ
دیا ہے۔''

"ستی باؤ نے تو کمال کر دیا۔ کیا ترقی کی ہے۔ رنگیلا رام نے اُسترا تیز کرتے ہوئے
کہا "اگلے جھٹکے میں منتری بنے گا۔"

میں اپنی سوچوں میں بھٹکتا ہوا بہت پیچھے چلا گیا تھا۔ جب ہم نے دسویں جماعت
کا امتحان دیا تھا۔ میں پاس ہو گیا تھا اور وہ فیل۔ اُسے اپنی ناکامی کا ذرا سا بھی
دکھ یا افسوس نہیں تھا۔ سائکل لے کر سیدھا بڑی نہر پر چلا گیا تھا۔ اس کی ماں

اری پریشان کہ کہیں کچھ ایسا ویسا نہ کر بیٹھے لیکن وہ شام کو ہنستا کھیلتا لوٹ آیا تھا۔
کلیوں میں سگریٹ دبائے جب وہ بھاردواج ہیئر کٹنگ سیلون میں مجھ سے ملا تھا
بہت خوش تھا۔

"شرم نہیں آتی فیل ہو کر خوشیاں منا رہا ہے۔" میں نے اسے شرمندہ کرنا چاہا۔
"یار میں کوئی اکیلا فیل نہیں ہوا ہوں۔" وہ ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔ "اور تو پاس
کر کے گورنر لگ جائے گا کیا۔"

"یہ سگریٹ پینا کب شروع کیا۔"

"بس آج سے۔ کتابیں کاپیاں ردی میں بیچ کر فلم دیکھی اور یہ پیکٹ خریدا۔
پیئے گا۔"

انکار کرتے ہوئے میں نے دکھ سے سوچا تھا کہ وہ تباہی کے راستے پر چل نکلا
ہے۔ اس کی بربادی یقینی ہے۔ سوامی پرکاش آنند جی بھی بڑے مندر میں اپنے
بھاشنوں میں یہی بتاتے ہیں۔ بُرے کاموں کا بُرا انجام ہوتا ہے۔ بھگوان سدا
سداچاری اور سچے پرانی کے ساتھ رہتے ہیں۔ منشیہ کو نیک بننا چاہیے۔ اچھے کرم
کرنے چاہئیں کہ یہی 'پرم آتما' تک پہنچنے کا واحد مارگ ہے۔

میں نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور وہ ستی بھنگ کے پکوڑے اور سینما کی ٹکٹیں بلیک
میں بیچنے لگا تھا۔ اب اس نے شراب پینی شروع کر دی تھی۔ کبھی کبھی چھوٹی موٹی چوری
اور جیب تراشی کے جرم میں حوالات بھی ہو آتا لیکن اسے کبھی سزا نہیں ہوئی۔ کوئی نہ
کوئی اسے بچا لاتا۔ اس پر وہ کبھی شرمندہ بھی نہیں ہوا تھا۔ سینما کی ٹکٹیں بیچ بیچ کر
جب وہ اُکتا گیا اور وہی ڈھاک کے تین پات رہا تو اس نے ناجائز شراب اور سٹے کا
دھندا شروع کر دیا۔ اس دھندے میں اس کی جان پہچان کا دائرہ پھیلتا چلا گیا۔ سپاہی
حوالدار، تھانے دار اور اسمگلر اور کچھ مقامی سیاسی نیتا اس کے دوست اور رکھوالے
بن گئے تھے۔ اب وہ ذرا ذرا سی بات پر دھمکیاں دینے لگا۔ چاقو لہراتا بازار سے گزر
جاتا۔ کوئی اسے ٹوکتا نہیں تھا۔ بے کار نوجوان اسے گھیرے رہتے۔ بہت سے اس
کے کاروبار میں شامل بھی ہو گئے تھے۔ وہ اب ستی استاد ہو گیا تھا۔ وہ بازار سے
یوں سینہ پھلا کر گزرتا جیسے وہاں اسی کا راج ہو۔ اس کا چہرہ اور انداز گفتگو بدلتا جا رہا
تھا جیسے کہیں بہت اونچائی سے بول رہا ہو۔ کبھی کبھی تو مجھے اُس سے ڈر لگنے لگتا۔

وہ سیلون میں آتا تو اپنے سناتے ہوئے گھٹیا جنسی لطیفوں پر خود بھی ہنستا
جرائم پیشہ عورتوں کے ساتھ اپنے جنسی اور تجارتی تجربات مزے لے لے کر بیان کرتا۔

"اب تو اپنا یار لیکچر بازی بھی کر لیتا ہے۔" رنگیا رام نے کہا تھا۔

"تو دیکھتا جا۔" ستی نے خود اعتمادی سے کہا تھا۔

"بہت ہو گیا، اب سیدھی راہ پر آ جا۔" میں دوستی کے ناتے اسے سمجھانا

چاہتا۔ اب بھی وقت ہے، پلٹ آ، قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ کسی دن جیل میں یا پولیس کی گولی کا شکار ہوگا — سو دن چور کے ....

"میں بالکل سیدھی راہ پر چل رہا ہوں۔" وہ ہنسا تھا — یہی ایک راستہ رہ گیا ہے ترقی کا آج کل — غیر قانونی اور بُرا کیا ہے۔ میرے خیال سے میں اور مجھ جیسے لاکھوں یہ بُرے اور ناجائز دھندے اپنے بل بوتے پر کر رہے ہیں۔ اوپر والوں کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا اس دیش میں۔ قانون بنانے، قانون نافذ کرنے اور قانون کی حفاظت کرنے والے کیا یہ نہیں جانتے۔ ہم ان کو نیتا بنائے رکھنے کے لیے اپنی جان لڑا دیتے ہیں اور وہ ہمیں پناہ دیتے ہیں۔ یہ لین دین آج کی سیاست ہے۔ میں اگر سو کماتا ہوں تو پچاس اوپر جاتے ہیں — انھیں سدھار تو ہم بھی سدھر جائیں گے۔

اس کی اس دلیل کا میرے پاس کوئی معقول جواب نہیں تھا۔

ستی اپنی عادتوں اور کرتوتوں سے باز نہیں آیا۔ لیکن اپنے سرپرستوں کی صلاح سے اور علاقہ والوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس نے کچھ ایسے کام کیے کہ ہر طرف واہ واہ ہونے لگی۔ بازار کے موڑ پر مدتوں سے بند پڑا مندر کھلوایا۔ اس کے لیے پرانی مینجنگ کمیٹی سے جھگڑا بھی مول لیا۔ اس کی مرمّت کروائی۔ مورتی استھاپنا دِوس جوش و خروش سے منایا۔ لنگر تقسیم کیا گیا۔ کنویں میں بجلی کی موٹر لگوا کر مستقل چھبیل کا انتظام کر دیا گیا۔ اندھ ودیالہ اور ناری آشرم کی مالی امداد کی۔ ان کاموں نے بہت سی زبانیں جو اس کے خلاف زہر اُگلتی تھیں، بند کر دیں، یہاں تک کہ شری کندن لال کھدر پوش جو بادشاہ گر کہلاتے تھے، نے اسے اپنی امان اور چھتر چھایا میں لے لیا۔ وہ ان کا داہنا ہاتھ سمجھا جانے لگا۔ ان کی صحبت میں رہ کر ستی استاد نے ایک گُر سیکھ لیا کہ خود بھیڑیں چرانے سے بہتر ہے کہ چرواہے رکھ لیے جائیں۔

میں ستین بھائی کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ تصویر اتروانے والوں میں وہی شریف اور معزز شہری جیراف کی طرح گردن بڑھائے کھڑے تھے جو اسے بد چلن، بد قماش اور بد کردار کہا کرتے تھے۔ اور اپنے بچّوں کو اس سے دور رہنے کی ہدایات دیتے رہتے تھے۔ نرولا صاحب کا پورٹیٹر، مہتہ جی یوتھ ونگ کے مہمان، نیتا اور رجو بھیّا جن کے ہاں پولیس اور انکم ٹیکس کے چھاپوں کے دوران غیر ملکی کرنسی، سونے کے بسکٹ، بدیسی شراب، لاکھوں کے زیورات، نقدی اور کروڑوں کی بے نامی جائداد کی دستاویزات برآمد ہوئی تھیں لیکن تمام معاملات شری کندن لعل جی .... بادشاہ گر کی عنایت سے رفع دفع ہو گئے تھے۔ رجو بھیّا کا ڈرائیور اور ایک گھریلو نوکر کچھ دنوں کے لیے جیل گئے تھے لیکن رہے اسپتال میں تھے۔

"بڑی عزّت کمائی ہے اپنے یار نے۔" رنگیلا رام نے ایپرن جھاڑتے ہوئے کہا — "دُھن کا پکّا نکلا۔

چھڑی مار، پلکیا" مٹکا ماسٹر ستی آستاد اسپر ووڈرسٹ کا چیرمین بنادیا گیا تھا۔ یہ کوئی
ری بات نہیں تھی ـــــ میں پھر سوچوں کی انجھی پگڈنڈیوں پر بھٹک گیا تھا۔ بی۔ اے
نے کے بعد مجھے نوکری نہیں ملی تو میں نے بی ایڈ کر لیا۔ نوکری پھر بھی نہیں ملی میرا
ب ایک غریب آدرش وادی شخص تھا جبکہ اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپیا نقد تھا کہ میرا
متقبل خرید سکتا۔ اور نہ ہی سفارش کی وہ سیڑھی جس پر چڑھا کر مجھے اچھی سی کرسی
بٹھا دیتا۔ ایک رات آدرش واد کو سینے سے لگائے بنا علاج کے مرگیا کہ رات کی ڈیوٹی
ڈاکٹر اپنے گھر میں سویا تھا۔ میں نے آخر اس پرائیوٹ اسکول میں نوکری قبول کرلی جہاں
راہ کا چیک تو ہر ماہ تین ہزار کا دیا جاتا تھا لیکن پندرہ سو روپیا نقد وصول کر لیا
تا تھا۔ اس اسکول کے مالک تھے نرولا جی۔ مہتا جی اور رجو بھتیا۔ ستی نے کہا
ما کہ میں نوکری چھوڑ کر اس کی نئی مِل میں آجاؤں۔ لیکن میرے ضمیر نے یہ قبول
ہیں کیا۔ تب اس نے ناراض ہوکر کہا تھا۔

" ابے او ڈرا جا ہریش چندر کی اولاد۔ سپنوں کی جھوٹی دنیا سے نکل کر ٹھوس دھرتی
ر قدم جما کر چلنا سیکھ۔ بھگوان رام کے یُگ میں سیتا اٹھا لی گئی۔ بھگوان کرشن کے
مانے میں دروپدی کا بھرے دربار میں چیر ہرن ہوا تو اِس کل یگ میں تو کیا ستیہ
ادی بنا پھرتا ہے۔ آج کسی کو تیرے گاندھی واد کی ضرورت نہیں، تو میرے بچپن کا
ساتھی ہے اس لیے یہ نوکری تجھے دے رہا ہوں ورنہ ـــــ"

" سیانے کہہ گئے ہیں کہ یار کی نوکری اور نوکر سے یاری ہمیشہ نقصان دہ ثابت
ہوتی ہے ـــ "

" اور کیا کہہ گئے ہیں سیانے ـــ "

میں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس کا ضمیر مرا ہوگا۔ رام چرتر
مانس اور رشی ویاس کی مہابھارت سے کئی مثالیں دی تھیں لیکن وہ مجھے پاگل اور
بے وقوف کہتا رہا۔ میں نے سوامی پرکاش آنند کی نصیحت دہرائی کہ منشیہ کو تیاگ
اور سچائی کی راہ اپنانی چاہیے کہ یہی مُکتی پتھ ہے۔ بھگوان ہمیشہ نیک اور سچے
بندوں کے انگ سنگ رہتا ہے اور کہ وہ اپنا ہیرا، انمول جنم گنوا رہا تھا۔

" دیکھ یار ماسٹر، میں ایک شان دار خوب صورت مکان میں رہتا ہوں جہاں
تمام سہولتیں مہیا ہیں۔ اپنی مرضی سے سوتا جاگتا ہوں۔ مندر بنوایا ہے۔ غریب
لڑکیوں کی شادیاں کرائی ہیں۔ دان کرتا رہتا ہوں ـــ تو کیا کرتا ہے ـــ "

میں نے اس کے حق میں دعا کی۔ پتا نہیں یہ میری دعا کا اثر تھا کہ اس کی دولت
کا چمتکار کہ وہ شہر کی کئی سنستھاؤں اور سبھاؤں کا پردھان بنا دیا گیا۔ اس نے
بڑے شوالے کی توسیع کے لیے ایک لاکھ روپیا دیا۔ اس کا نام اخباروں میں چھپا
مہادانی سیٹھ ستیہ نارائن جی ـــــ اب وہ کسی نہ کسی طرح خبروں میں رہنے لگا

تھا۔ پودا لگا رہا ہے، کسی ڈسپنسری یا لائبریری کا اُدگھاٹن کر رہا ہے۔ دلّی سے
نے والے ایک منتری جی کا سواگت کر رہا ہے۔ یتیم خانے میں سوئیٹر تقسیم کر رہا ہے
نئی رِیل لگا رہا ہے —

جب ایک شام اس کی نئی کار بھاردواج ہیئر کٹنگ سیلون کے سامنے رُکی تو
سب نے اُٹھ کر اسے خوش آمدید کہا۔ سب نے کار کی تعریف کی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر
میرے گھر کی طرف چلا۔ اس کا ڈرائیور کچھ ڈبے اور ٹوکریاں اٹھائے پیچھے پیچھے چل رہا
تھا۔

میرے گھر والے، اس کا ٹھاٹھ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پیور سِلک کا کرتا پاجامہ،
قیمتی گھڑی، ہیرے اور نیلم کی انگوٹھیاں، گردن میں وزنی طلائی چین جس میں ہیرے
کا پنڈل لٹک رہا تھا۔ ماں نے اسے آشیرواد دیا — جگ جگ جیو۔ میری بیوی اور
بچوں نے للچائی نظروں سے ڈبوں اور ٹوکریوں کی طرف دیکھا۔

"ماں جی، یہ ساریاں اور شال آپ کے لیے۔ اور بھابی یہ گھڑی اور سوٹ پیس
وغیرہ آپ کے لیے۔ یہ کپڑے اور کھلونے بچوں کے لیے اور یہ پھل اور یہ مٹھائیاں —"

"لیکن کیوں —" میں نے قدرے تلخی سے پوچھا۔

"میں نے چھبیس لاکھ کی نئی کوٹھی خریدی ہے۔ چار لاکھ کی کار لی ہے۔
کیا یہ خوشی میں تو سب کے ساتھ شیئر (Share) نہیں کر سکتا —"

"ٹھیک تو کہہ رہا ہے —" ماں نے جھٹ سے کہا۔

"لیکن ہم یہ سب نہیں رکھ سکتے —" میں نے کہا۔

میں نے دیکھا کہ سب کے چہرے لٹک گئے تھے۔ نظریں بجھ گئی تھیں اور
سب مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے میں ان کا دشمن ہوں۔ پیسے کا جادو چل گیا تھا۔

"دیکھ ماسٹر، میں تیرا یا تیرے پرکاش آنند کا بھاشن سننے کے موڈ میں نہیں
ہوں، یہ تو سب دے کر ہی جاؤں گا اور ہاں، وہ نوکری والی آفر آج بھی کھلی ہے۔"

گھر میں میری کسی نے نہیں سنی۔ وہ چائے پی کر، کسی فاتح کی طرح چلا گیا۔

اس کی نئی کالاتھ مِل چالو ہو گئی۔ پھر ایک دن شہر میں اس کے نام کے پوسٹر
لگ گئے۔ وہ اسمبلی کا الکشن لڑ رہا تھا۔ تقریریں، جلسے، جلوس، جنتا کے سچے سیوک
آپ کے قیمتی ووٹ کے حق دار، آزادی کی لڑائی کے جانباز سپاہی وہ ہر پوسٹر میں ہاتھ
جوڑے سر جھکائے کھڑا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر اس کی خوبیاں گنوا رہے تھے۔ گن گان کر
رہے تھے۔ شراب پانی کی طرح بہا۔ کرنسی نوٹ سوکھے پتوں کی طرح اُڑے۔ وہ
بہ نفس نفیس کھدر کا کرتا پاجامہ پہن کر ہریجن بستیوں میں گیا۔ الکشن والے دن اس
کے مسلح آدمی ہر بوتھ پر موجود تھے۔

وہ الکشن جیت گیا۔

ستیہ نارائن جی زندہ باد ـــــ
پھر سنا کہ اس نے آپ منتری پد لینے سے انکار کر دیا ہے۔ اسے وزارت تعلیم میں
(ن)ائب منسٹر بنایا جا رہا تھا لیکن شری کندن لال کھدر پوش کے سمجھانے پر اس نے یہ پد نہیں
اور اب اسے امپرو ومنٹ ٹرسٹ کا چیئرمین مقرر کر دیا گیا تھا۔
"اگلی بار منتری بنے گا اپنا یار" رنگیلا رام کہہ رہا تھا۔
میں نے اخبار سے نظریں ہٹا کر دیکھا۔ تمام گاہک جا چکے تھے۔ فرش پر بال
(بکھ)رے تھے۔ شیشے میں صابن کا جھاگ تھا۔ رنگیلا رام نے بیڑی سلگالی تھی۔
"کہاں پہنچا ہے اپنا ستی استاد ــــ" رنگیلا رام نے کہا۔ "بھگوان کی کرپا ہے۔"

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے

مصنف: ڈاکٹر نقی حسین جعفری
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵
سال اشاعت: ۱۹۹۳ء قیمت: ۵۱ روپے
مبصر: ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی

چند علمی اور ادبی مضامین تجزیوں اور تبصروں پر مشتمل یہ کتاب اگرچہ بہت ضخیم نہیں ہے لیکن اس میں شامل تمام مضامین مصنف کی علمی دسترس، وسعت مطالعہ اور استخراج نتائج کے اعتبار سے قابل ستائش ہیں۔ کتاب میں شامل مطالعات سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مصنف کی دلچسپیوں کا دائرہ بیک وقت ادب، تاریخ، تہذیب، مذہب اور دیگر علوم تک پھیلا ہوا ہے، البتہ اس کتاب میں شامل جو مضامین میرے لیے خصوصی دلچسپی کے حامل ہیں وہ زیادہ تر ادبی نوعیت کے ہیں۔

یہاں "اقبال کے تصورِ مردِ مومن" پر بھی ایک مضمون موجود ہے۔ اقبال کے تصورات پر کافی کچھ لکھا گیا ہے، البتہ جو چیز کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال کے شاعرانہ تصورات اور ان کے صریح علمی اور عقلی تصورات کو ایک دوسرے میں اس قدر آمیز کر دیا گیا ہے کہ خلط مبحث کو راہ ملتی ہے۔ میرے خیال میں دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ شاعری میں تصورات کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا تاہم وہ تخلیقی زبان میں اس طرح Dilute ہو جاتے ہیں کہ ان میں منطقی ربط کا وجود تقریباً معدوم ہو جاتا ہے۔ شاعرانہ تصورات کی تفہیم کا ذریعہ بہر نوع شاعرانہ زبان ہے، البتہ ان دونوں کے مابین جس نوع کی گہری داخلی آمیزش ہے اسے ہم ناخن و گوشت کی آمیزش سے تعبیر کر سکتے ہیں کہ انگلیوں کو لہولہان کیے بغیر ہم ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔

اقبال کی شاعرانہ کائنات میں تصورات کا ایسا طلسمی جال ہے جس میں قاری ایک بار الجھ جائے تو نکلنا محال ہوتا ہے۔ غالب کا معاملہ اس سے قدرے مختلف ہے

لیے کہ ان کے ہاں محسوس فکر تو ہے لیکن اس میں تواتر نا پید ہے، جعفری صاحب
اس طلسم کے اسیر ہوئے ہیں۔ انھوں نے بھی اقبال کے شعروں کے حوالے سے "تصور
مومن سمجھنے کی سعی کی ہے بلکہ اس کے ڈانڈے مشرق و مغرب سے بھی ملائے ہیں، کاش
س شاعرانہ بلاغت اور ایجاز کا تجزیہ کرتے جو ایک بے جان تصور کو اس قدر جاندار اور
کش بنا دیتا ہے۔ اس مطالعہ کے دوران جہاں کہیں وہ ذہنی ترغیب سے آزاد ہو سکے
وہاں کچھ پتے کی باتیں بھی کہی ہیں۔ مثلاً جب وہ مردِ مومن کی روحانی بالیدگی کا
سلہ عشق سے ملاتے ہیں جو خود اقبال کی شاعری میں ایک قوی تصور ہے تو ذہن ان کی
ہ اس امر کی طرف جاتی ہے کہ:

"اقبال نے تصورِ عشق کو نئی وسعتیں دیں اسے انھوں نے روایتی تڑپ
اور شوق کے علاوہ احساسِ خودی اور قوت و حیات سے آراستہ کیا
ہے۔"

ں میں شک نہیں کہ عشق مروجہ روایت سے قطع نظر جب اقبال کی فکر میں ڈھلتا ہے
بتدریج اس کے جذباتی حوالے ساقط ہو جاتے ہیں اور وہ منفعل نہ رہ کر زندگی اور کائنات
لیے قوت افزا کشش کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اقبال کا زرخیز رومانی تخیل حال سے ناآسودہ اور برگشتہ ہونے کی
ورت میں بالعموم زندگی کی تمام کارآمد اور قابلِ قدر اقدار کی جستجو میں ماضی کی یادوں
ہمرشتہ کسی نادیدہ و پُراسرار سرزمین میں خیمہ زن ہوتا ہے۔ زندگی کے اس مقام پر
بچ کر شاعر کے لیے تاریخ اور وقت یعنی زمان و مکان کی ملنا ہیں اور کائنات کے بے رنگ
رجی مظاہر اپنا اعتبار کھو دیتے ہیں، یہاں شاعرانہ زبان ایک خاص نوع کی الہامی
ینیت اور لافانیت میں ڈوب جاتی ہے۔ اقبال کی لازوال تابندہ شعری تمثالوں کی محاکات
لاگم کی آفرینش بیشتر انھیں لمحات کی یادگار ہے۔ چنانچہ اقبال کے شاعرانہ تصورات کی
ہیم کے لیے اس تناظر کی معنویت بے حد بڑھ جاتی ہے۔

"فراق اور انگریزی روایت" میں جعفری صاحب نے فراق کی شاعری میں انگریزی شعری
وایت کے اثرات کی نشاندہی کر کے فراق کی شاعری کی ایک نئی جہت دریافت کی
ہے۔ فراق کے شاعرانہ امتیازات کی نشان دہی کرتے ہوئے جعفری صاحب کا یہ انکشاف کہ:

"فراق کے ہاں رات، پچھلا پہر اور قربِ فطرت کے گوناگوں داخلی تجربات
ان کی شعری رُوح میں سرایت کر گئے ہیں۔"

یک ایسی صداقت ہے جس کی طرف کم توجہ کی گئی ہے۔

"خواب سے خواب تک" شہریار کا شعری سفر" التباس پیدا کرتا ہے گویا خواب کی
حیثیت ایک مستقل موضوع کی ہے جس پر شہریار نے اپنے تخلیقی فکر کی بنیاد استوار کر
رکھی ہے، اگر ایسا ہو تو شاید یہ بڑی گمراہ کن صورتِ حال ہو گی۔ خواب کی حیثیت

شہریار کی شعری کائنات میں ایک Commanding Image کی ہے جس کی معنویت تمام تر علامتی ہے۔ خواب کے ماسوا بھی کتنے استعارے ہیں جن سے شاعر انفعا آباد ہے، البتہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ یہاں معنوی توسیع کی کیا نوعیت ہے، اس لیے کہ کسی شاعر کی انفرادیت کی شناخت کا تعلق دراصل شعری لسانیات کی اسی خصوصیت سے ہے۔ جعفری صاحب نے شہریار کے مطالعہ میں تدریجی ارتقا کے جس اصول کو رہنما بنایا ہے اس سے موضوع کے ارتقائی سفر کا سراغ تو ملتا ہے لیکن موضوع کی لسانی تقلیب کس انداز سے ہو رہی ہے اس پر زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔

"دانشوری اور تصور مذہب ذاکر صاحب کی تحریروں کے حوالے سے" غالباً اب تک کے مطالعات پر اضافہ ہے۔ جعفری صاحب کا یہ خیال درست ہے کہ :۔

> "دانشوری مذہب کے ہمہ گیر تصور کے باہر کی چیز نہیں ہے۔ یہ مذہب یہاں نہ صرف یہ کہ شامل بلکہ شاید اس کا ضروری جزو ہے۔ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ اس امتزاج کی روشن مثالیں ہیں۔"

مزید اس مفروضے کی تشریح کرتے ہوئے جعفری صاحب لکھتے ہیں:

> "ان کے ہاں یہ دونوں دھارے متوازی نہیں بلکہ ایک دوسرے میں شامل ہیں۔ ان کا مقصد وحدتِ اقدار، اخلاقی شخصیت کی تعمیر اور مہذب معاشرے کی تشکیل تھا۔"

اس ضمن میں ذاکر صاحب کی کہانیوں کا تمثیلی پہلو" بھی قابل ذکر ہے جس میں پیش کردہ بعض کرداروں کے داخلی اوصاف تک جعفری صاحب کی نظر پہنچی ہے، لکھتے ہیں:۔

> "انھوں نے عقاب کے دل کو بھی ٹٹولا ہے اس کے اندر کی کش مکش اور مشرسے دل لگانے کے تجربہ کو بڑی گہرائی سے بیان کیا ہے جب کہ اقبال کا شاہین صرف قوت اور جلال کی علامت ہے اور کسی حد تک Stock Image بن گئی ہے جب کہ ذاکر صاحب نے عقاب کے اندرون کو بھی دیکھا ہے اور اپنی کمین گاہ پر اس کی مراجعت اپنی کھوئی ہوئی خودی اور عظمت کی بازیافت ہے۔"

میر، سودا اور ناصر کاظمی کی غزلوں کے تجزیے بعض دلچسپ رعایات و نکات کی دریافت کے سبب توجہ طلب ہیں میر کا شعر ہے ؎

حاصل ہے کیا سوائے ترائی کے دہر میں   اُٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں

کے حوالہ سے جعفری صاحب کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

> "ترائی اور شبنم" دونوں لفظوں میں نمی اور خنکی کی کیفیت مشترک کہی جا سکتی ہے اور دونوں مظاہر انسانی تجربے میں خوش گواری اور وقتی راحت کا سامان فراہم کرتے ہیں لیکن جب اس کی کثرت اور شدت سے ناگواری

اور تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔ تنہائی اور محنکی کو زندگی کی گہما گہمی کے
طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔"

۵۔ اس بُت کدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہے یاں

جعفری صاحب اس کا خلاصہ یوں کرتے ہیں:

"اب صورتِ آدم تو بہت نظر آتے ہیں لیکن وہ معنی سے اتنے دور ہیں
جتنے ابنائے آدم، آدم سے بُت کدہ استعارہ ہے جس سے مُراد وہ تمام
پردے اور واسطے لیے جا سکتے ہیں جو حق، خیر اور انسانی مشاہدہ کے
بیچ حائل ہیں۔"

ناصر کاظمی کا شعر ہے

ہر ذرّہ ایک محمل عبرت ہے دشت کا
لیکن کسے دکھاؤں کوئی دیکھتا نہیں

جعفری صاحب تشریح کرتے ہیں:

"ذرّہ اپنے وجود اور کائنات سے اپنے رشتے کے باوصف جس توجہ کا
مستحق ہے وہ سب کو نظر نہیں آتا اس لیے کہ وہ محمل میں چھپا ہوا ہے
وہ پردہ ہٹے تو ذرّہ اور کائنات کا رشتہ نظر آئے دوسرے مصرعے میں
استفہام پر اصرار کیا گیا ہے یعنی یہ کہ ذرّہ اور آنکھ کے درمیان پردے
کے باعث لوگ اس حقیقت سے ناآشنا ہیں اور شاعری اس
حقیقت کو دوسروں کو دکھانے سے قاصر ہے۔ پہلے مصرع میں استفہام
کی سطح غیر واضح اور اشاریت کی حد تک ہے یعنی یہ کہ کیا جانتے ہو کہ ہر
ذرّہ ایک محمل عبرت ہے دشت کا لیکن دوسرے مصرع میں یہ کہہ کر کہ
ع کسے دکھاؤں... استفہام انکاری ظاہر کیا گیا ہے، محمل کو Veil
Mystery کے طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔"

اس کتاب میں شامل تبصرے "دُنیا کی کہانی" (محمد حبیب) "علی گڑھ سے علی گڑھ تک" (اطہر پرویز)
"ذہن انسانی کا حیاتیاتی پس منظر" (شہزاد احمد) "داستانوں کی علامتی کائنات" (سہیل احمد)
جعفری صاحب کے گہرے اور سنجیدہ ادبی شعور کے غماز ہیں جو کتب زیرِ تبصرہ کی قدر و قیمت
پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔

"کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے" بحیثیت مجموعی ہماری ادبی روایت میں ایک کارآمد
اضافہ ہے، زبان و بیان پر مصنف کی گرفت بھرپور ہے۔ جعفری صاحب کے طریقۂ استدلال
پر کہیں کہیں ان کے استاد پروفیسر سلوب احمد انصاری کے اسلوب کا گمان گزرتا ہے اور
کیوں نہ ہو جعفری صاحب نے پروفیسر انصاری سے ایک مدت تک علمی و فکری طور پر کسبِ
فیض کیا ہے۔

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں

مصنف: عبدالقوی دسنوی
ناشر: نئی آواز، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔
قیمت: ۷۵ روپے
مبصر: اقبال مسعود

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا نام کوئی غیر معروف یا نیا نام نہیں ہے۔ تحقیق، تنقید اور اشاریہ سازی کے میدان میں ان کے کارہائے نمایاں سے ایوان ادب گونج رہا ہے۔ ان کی تین درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور متعدد اعزازات و انعامات ان کی کامیابی کی دلیل ہیں۔ وہ تنقید و تحقیق کے میدان میں انتہائی جانفشانی اور محنت کے ساتھ اور تمام ممکنہ حوالہ جات کو ایک جگہ جمع کر کے ان کا تجزیہ کرنے اور ان کے بعد ہمدردانہ انداز کے ساتھ تبصرہ کرنے کے عادی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کی ان ہی خوبیوں سے مزین ہے۔

"اردو شاعری کی گیارہ آوازیں" منفرد اور عہد ساز اردو شعرا پر پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے تحریر کردہ مضامین ہیں جو مختلف اوقات میں ادبی سیمیناروں، جلسوں اور جرائد کے اہم اور خصوصی نمبروں کے لیے تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ غالباً مارچ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۹ء کے دوران تحریر کیے گئے ہیں غالباً اس لیے بعض مضامین پر تاریخ و سنہ درج نہیں ہے۔ اس میں اکبرالٰہ آبادی۔ حالی، چکبست، فراق، سید سلیمان ندوی، پرویز شاہدی، ساحر، جان نثار اختر، فیض، مجروح سلطان پوری اور قتیل شفائی پر مضامین شامل ہیں۔ ان میں سید سلیمان ندوی کو چھوڑ کر باقی تمام شعرا کا شاعری اور تاریخ سخن میں ایک خاص مقام اور اہمیت ہے۔ لیکن یہ عجیب حیرت انگیز اور دلچسپ حقیقت ہے کہ مختلف اوقات میں لکھے جانے کے باوجود مذکورہ کتاب کے تمام گیارہ کے گیارہ شعرا محب وطن ہیں۔ انھوں نے کسی نہ کسی طرح ملک کی جنگ آزادی میں حصّہ لیا ہے۔ ان میں کچھ نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور کچھ کی تعلیم ادھوری رہ گئی تو کچھ کو بے وطنی کے دن گزارنا پڑے۔ لیکن سب میں ایک قدر مشترک موجود ہے وطن عزیز کی آزادی کی۔ بہتر زندگی اور روشن صبح کی۔ اس کے ساتھ ہی ان کی تاریخی بصیرت، ثقافتی ادراک اور قوم و ملت کی تڑپ کو بھی فاضل مصنف نے مختلف انداز اور پہلوؤں سے نمایاں کیا ہے۔ یہ بات خود پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی وطن پرستی اور وطن دوستی کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔

دوسری بات جو ان مضامین میں نمایاں ہے وہ پروفیسر موصوف کے استدلال اور قوت فیصلہ کی مظہر ہے کہ انھوں نے ہر ایک مضامین میں مذکورہ شعرا کے فن و شاعری میں مختلف کیفیات کی وجہ اور فکر کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے اس کی سب سے اچھی مثال علامہ سید سلیمان ندوی "وادی شعر میں" پڑھ کر

ہوتا ہے۔ دوسرا مضمون اکبر الٰہ آبادی کا زمانہ فن اور ان کی غزل گوئی کے اولین دور سے متعلق ہے جس میں انھوں نے بھرپور طریقے سے اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔

تیسری بات یہ کہ اس کتاب کی زبان انتہائی صاف، شگفتہ اور رواں دواں ہے۔ اکثر مضامین کہانی کی طرح دلچسپ ہیں اور قاری کے ذہن پر ذرا بھی بار نہیں ہوتے وہ مسلسل اور آسانی کے ساتھ مکمل مضمون پڑھ کر نہ صرف حظ اٹھاتا ہے بلکہ اس کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور ذہنی سطح بھی بلند ہوتی ہے۔ جیسا کہ سارتر نے ایک جگہ کہا ہے کہ "فن کار کا کام محض اپنی ذہنی سطح بلند کرنا نہیں ہوتا بلکہ قاری کی ذہنی سطح کو بھی بلند کرنا اس کا منصب ہے۔" پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے اردو شاعری کی گیارہ آوازیں میں اپنے اس منصب کو بخوبی پورا کیا ہے جو قابل ستائش ہے۔

واہ حیدرآباد!

مصنف: عابد معز عمر ۳۹ سال
مبصر: یوسف ناظم
ضخامت: ۱۲۸ ڈیمائی صفحے
ناشر: زندہ دلان حیدرآباد　قیمت: ۶۰ روپے

مجھے نہیں معلوم تھا کہ کتاب اتنی مزاحیہ ہوگی۔ اصل میں غلطی مجھ سے ہوئی کتاب کی پشت پر نظر ڈال لیتا تو مصنف کی شبیہ دیکھ کر اندازہ ہو جاتا کہ کتاب کا مزاحیہ ہونا برحق ہے۔ اب یہ بات اور ہے کہ یہ کتاب کتنی مزاحیہ ہے۔ واہ تو میری زبان سے بھی نکلا لیکن آہ بن کر۔ حیدرآباد کی سڑکوں، پانی کے نلوں، چائے خانوں کی باتیں پڑھ کر دل سے آہ نہیں تو کیا واہ نکلے گی لیکن مصنف نے سرتاپا حیدرآبادی ہیں اور عرصہ سے ریاض میں مقیم ہیں۔ واقعی حیدرآباد میں ریاض بہت کیا ہے۔ لوگ ستار، سرود سارنگی جیسے سازوں پر ریاض کرتے ہیں انھوں نے حیدرآباد کی رگ رگ پر ریاض کیا ہے اور آخر کار ان کے ہم وطنوں نے تنگ آکر انھیں ریاض بھیج دیا۔ پیشے سے ڈاکٹر ہیں۔ تغذیہ اور استحالی امراض کے پوسٹ گریجویٹ ہیں۔ تغذیہ کے معنی تو خیر سمجھ میں آئے استحالی امراض کیا ہوتے ہیں اس کا پتا اس لیے نہیں چلا کہ کم سے کم کوئی لغت نویس اس میں مبتلا نہیں ہوا۔ بس اس پوری کتاب میں رہی ایک مشکل لفظ ہے ورنہ عابد معز نہایت خوش گوار اردو لکھتے ہیں اور اس دیدہ زیب تحریر کی سطح یعنی بالائی سطح پر ظرافت کی ہوائیاں سجاتے ہیں (ہوائیاں آپ جانتے ہیں کیا ہوتی ہیں۔ یہ بادام اور پستے کو قلع قمع کر کے چھڑکی جاتی ہیں۔ اگلی صدی میں یہ نظر نہیں آئیں گی) ان کے مزاج کی کیفیت کا فی تسا(؟) ہوتی ہے۔ نہایت شرمیلا لیکن بے حد کارگر مزاح۔ ان استحالی امراض کے ڈاکٹر کا خاص الخاص حربہ ہے۔ یہ سرجری نہیں ہے نشترزنی بھی نہیں ہے۔

لیکن آپ کو مسخر کر لینے کا گُر ان کے پاس ہے۔ ظرافت نئی نویلی دلہن کی طرح شرماتی شرماتی ہے لیکن ایسی دلہن جو بزرگوں کے بوجھ سے نہیں صرف شرم و حیا سے جھکی جارہی ہو۔" نل کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

"بعض وقت نل کے پائپ میں پانی کی بجائے برقی رو بہنے لگتی ہے۔ نل کو دیکھتے ہی کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ نل کے پاس ٹیلی فون کے تار سے ان کی گفتگو جرا کر سامعین کا دل بہلاتے ہیں۔ بعض مرتبہ ریڈیو سیلون اور وودھ بھارتی کے پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں۔ ہم چوبیس گھنٹے نل کھلا رکھتے ہیں، نیچے برتن رکھے، مصلّے بچھائے پانی کی رحمت کے لیے دعا کرتے ہیں۔ ایک شانِ بے نیازی سے نل کھلتا ہے چند قطرے پانی ٹپکاتا اور سیٹی بجاتا ہوا بند ہو جاتا ہے۔ کسی وقت نل دادا جان کے حقّے کی طرح صرف گڑ گڑا کر ہوا اور دھواں خارج کرتا ہے۔ اچھا ہوا کہ انھیں پانی زیادہ مقدار میں نہیں ملا ورنہ یہ ہاتھ دھو کر نلوں کے پیچھے پڑ جاتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حیدرآباد میں پانی کی قلت ہی سے لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ہندستان غریب ملک ہے۔ عابد معز نے اسے اس طرح محسوس کیا۔" پانی کی قلت ہر شعبے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ دعوت ناموں پر درج ہے "براہ کرم اپنا پانی ساتھ لائیں۔ اشتہارات میں لکھا ہوگا۔ پچاس روپے کی خریداری پر ایک گلاس اور سو روپے کی خریدی پر ۲ گلاس پانی مفت پیش کیا جائے گا۔" بسوں کے سفر کا موضوع عام ہے اور اس پر ہر مزاح نگار، خامہ فرسائی کر چکا ہے کیوں کہ وہ صرف خامہ فرسائی کر سکتا ہے بس میں سفر نہیں کر سکتا۔ لیکن عابد معز نے تو اس موضوع پر فیصلہ لکھ کر اسے سزائے موت سُنا دی ہے یعنی اب کوئی اس موضوع کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے (بعض ولادتیں بسوں میں بھی ہوتی ہیں) ایک اقتباس اور پیش کرتا ہوں۔

"چائے خانے میں قدم رکھتے ہی گاہک کا استقبال مکھیاں کرتی ہیں۔ گلے گال اور پیشانی کو چوم کر اور مچھر پیر پر ڈنک مار مار کر کرتے ہیں۔ اندر احتیاط سے قدم بڑھانا ہوتا ہے۔ فرش چکنا ہوتا ہے۔ گاہک کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے بار بار گرتے ہیں۔ میز صاف کرنے کے بعد ایک نئی قسم کی بو آنے لگتی ہے۔ میز پر اخبار کا ایک ٹکڑا ملا۔ اٹھا کر دیکھنے سے پتا چلا کہ وہ تازہ اخبار کا ایک حصّہ ہے ایسے اور چند ٹکڑے لوگوں کے پاس نظر آئے جنھیں بڑے انہماک سے پڑھا جا رہا تھا۔"

یہی حال سڑکوں، دوا خانوں اور فٹ پاتھ کا ہے۔ یہ صحیح معنوں میں حیدرآباد ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ عابد معز حیدرآباد سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور شاید یہ محبت دو طرفہ ہے۔ ہونی ہی چاہیے۔ عابد معز شریف آدمی ہیں جب بھی ریاض سے بمبئی اور بمبئی سے حیدرآباد آتے ہیں۔ مجھے فون پر یہ خوش خبری ضرور سناتے ہیں کہ وہ مجھ سے ملنے نہیں آسکیں گے۔ میں ان کی مزاح نگاری کا نہیں ان کی اس

ملنساری کا بھی قائل ہوں۔ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں اس لیے میں ان کا احترام بھی کرتا ہوں۔ زیر نظر کتاب میں "باہر کا جادو" مضمون ضرور پڑھیے مطلب یہ کہ اکثر پڑھ چکے ہیں تو دوبارہ پڑھیے۔ میرے ذہن میں معلوم نہیں یہ خیال کیسے آیا کہ بمبئی کے ہوٹلوں میں ایک کارندہ ہوتا ہے "باہر والا" جو سبھی جگہ ہوتا ہوگا۔ اب یہ باہر والا ہر وہ شخص ہو گیا ہے جو باہر گیا ہوا ہے۔ عابد معز نے صحیح لکھا ہے کہ "اب سمندر پار سمندر کو باہر جانا کہا جانے لگا ہے" جیسے کوئی گھر سے باہر نکڑ کی دکان سے سگریٹ لینے جا رہا ہو۔

کتاب میں دو مقدمے ہیں۔ ہونے ہی چاہئیں۔ ایک واہ کے لیے اور ایک آہ کے لیے۔ مقالہ نگار حضرات میں ڈاکٹر مصطفےٰ کمال اور ڈاکٹر ستیہ پال آنند۔ ڈاکٹر مصطفےٰ کمال سے میں اس لیے واقف ہوں کہ وہ بہت کم لکھتے ہیں اور ڈاکٹر ستیہ پال آنند سے میری واقفیت غزل گو کی حیثیت سے تھی۔ انھوں نے "شہر میں گھومتا آئینہ" کے نام سے مقدمہ لکھ کر مجھ پر بھی کرم کیا۔ مجھے تبصرہ لکھنے میں آسانی ہوئی۔

کتاب خوب صورت چھپی ہے اور حیدر آبادی تہذیب کی یاد دلاتی ہے۔ عابد معز نے اپنے پیش لفظ میں اپنی بیگم کا بھی شکریہ ادا کیا ہے۔ یہ بھی حیدر آبادی تہذیب ہے۔ ورنہ حیدر آبادی تہذیب کو لوگ صرف بگھارے بینگن سمجھنے لگے ہیں۔

ایک آخری بات۔ عابد معز نے صرف حیدر آباد میں مضامین نہیں لکھے ہیں۔ یہ اتنے بھی محدود اور مقید نہیں ہیں۔ ذرا ٹھہریے ان کی دوسری تصنیف آپ کو دنیا کی سیر کرائے گی۔

کھلے خطوط

مراسلہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ماہنامہ "کتاب نما" نئی دہلی میں مولانا فضل الرحمٰن ندوی کے سانحۂ انتقال کی خبر پڑھ کر بڑا دکھ ہوا، اللہ مرحوم کو، ہر کروٹ اپنی رحمت سے نوازتا رہے۔ آمین۔

مولانا مرحوم سے بہت بچپن میں میرا تعلق قائم ہوا جب ہم دونوں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے طالب علم تھے فرق یہ تھا کہ وہ جونیر تھے اور میں سینیر۔ میرا زمانۂ طالب علمی مدرسۃ الاصلاح میں ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۸ء تک کا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد مرحوم مدرسۃ الاصلاح کو خیرباد کہہ کر ندوہ چلے گئے اور وہاں سے آگے بڑھے تو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں جا کر دم لیا۔

اور میں مدرسۃ الاصلاح سے فارغ ہو کر ۱۹۳۹ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی چلا گیا اور پھر ۱۹۴۳ء میں جامعہ سے بی اے کرنے کے بعد مدرسۃ الاصلاح واپس آگیا۔ ۱۹۴۵ء میں یہاں کا معتمد مال (خازن) منتخب ہوا جس کا سلسلہ آج تک قائم ہے۔

یہاں ہمارے طالب علمی کے زمانہ میں "جمنوٹ" کے ایک استاد بھی ہوا کرتے تھے جو بعد عصر طلبہ کو فن سپہ گری سکھایا کرتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ استاد تو سینیر طلبہ کو ڈنگے کا فن سکھاتے تھے اور ان کے حکم سے سینیر طلبہ جونیر طلبہ کو سیکھا ہوا فن سکھاتے تھے سب تو بھول گئے معروف دو طالب علم[1]

[1] اپریل ۹۴ء

مجھے "جمنوٹ اور بہار" ہے۔ بیٹھ پر مرحوم سے میرا سابقہ پڑتا تھا میں سکھاتا تھا اور وہ سیکھتے تھے۔ مرحوم سے میری آخری ملاقات ستمبر ۹۲ء میں ان کے دولت کدے پر ہوئی۔ جب میں اپنے لڑکے ڈاکٹر جنیر ناصر خاں (شعبۂ جغرافیہ) کے ساتھ علی گڑھ میں مقیم تھا۔ کیا معلوم تھا کہ یہ ہم دونوں کی آخری ملاقات تھی۔ ملنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ اب محسوس ہوتا ہے کہ واقعی وہ آخری تھی۔

"جامعہ ملیہ" سے میرا رابطہ ختم نہیں ہوا ہے میرا ایک بچہ انجینیر انیس الرحمٰن ناصر جامعہ کے شعبۂ انجینیرنگ میں "الکٹرانک لکچرر" ہے۔ اللہ اسے اپنی حفاظت میں رکھے۔ آمین

پرسان حال کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

والسلام۔ طالب دعا

نیاز مند عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی، جامعی اعظم گڑھ

کتاب نما کے مہمان اداریوں میں اردو زبان وادب کے مسئلہ پر جن ادبا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں شمس کنول صاحب اور ابن فرید صاحب کے بعد عشرت علی صدیقی صاحب (شمارہ جولائی ۹۴ء) میں بغیر لاگ لپیٹ کے ایسی باتیں اردو والوں کے سامنے پیش کی ہیں جن پر اردو والوں کو غور و فکر کر کے اردو کی ترقی کے لیے عملی طور پر سرگرم ہو جانا چاہیے۔

عشرت علی صدیقی صاحب کا یہ تجربہ بالکل درست ہے کہ حکومت کی بے اعتنائی سے فائدہ اٹھا کر اردو ٹیچر اپنے فرائض کی انجام دہی میں بے پروائی کرتے ہیں۔ کبھی اسکول کی

وقتی ملازمت کو جز وقتی ملازمت بنا لیا جاتا ہے اور ٹیچر اس ملازمت کے ساتھ دوسرا روزگار بھی کرنے لگتے ہیں۔ یہ بد اطواری پرائمری سطح سے اعلاترین سطح تک پائی جاتی ہیں۔ یونی ورسٹی ٹیچر پابندی سے کلاس نہیں لیتے اور پڑھانے سے زیادہ وقت مشاعرے اور سمینار وغیرہ کرنے کرانے پر صرف کرتے ہیں۔"

جو لوگ اردو کی روٹی کمارہے ہیں انھیں اردو زبان کی تعلیم اور ترویج میں دیانت داری سے سرگرم رہنا چاہیے۔

اگر اردو والے کمر کس لیں تو اردو زبان زندہ رہ سکتی ہے۔ جو افراد اسکولوں میں، کالجوں میں اور یونی ورسٹیوں میں اردو کی تعلیم دے رہے ہیں۔ وہ اگر اردو کا ایک رسالہ یا اخبار خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیں تو یہ اردو کے فروغ کی جانب ایک عملی قدم ہوگا۔"

خلیل تنویر کپور تھر۔ گورنمنٹ میڈیم اردو کے پور

● کافی عرصے سے کتاب نما میں حاضری نہ دے سکا۔ لیکن باقاعدگی سے پڑھتا رہا ہوں۔ فی الوقت جولائی کا شمارہ پیش نظر ہے سراج اجملی کا اداریہ پسند آیا۔ رشید حسن خاں صاحب نے معرکۂ چکبست و شرر کا پس منظر پیش کر کے بہت سارے فکری و جذباتی مسائل کا حل ڈھونڈ نکالا ہے۔ "اگلے کا اُجالا" دوبارہ جاری فرما کر آپ نے قارئین کتاب نما پر بڑا احسان کیا۔ پروفیسر گیان چند صاحب کی کاوش اردو کے بزرگ ترین ادیب بھی خوب ہے۔ موصوف نے رام لعل کی فرمائش پر یہ فہرست مرتب کی ہے۔ یہ رام لعل افسانہ نگار ہیں یا رام لعل نابھوی۔

۱۴ر جولائی کا لکھا ہوا رام لعل نابھوی کا ایک خط اس وقت میرے سامنے ہے موصوف نے مجھے لکھا ہے کہ "ایسے ہندو اردو کے شعرا جو آج سے ۱۰ سال پہلے زندہ تھے، کی لسٹ مرتب کر رہا ہوں۔ ۷۵ تک پہنچ گئی ہے۔ یہ کام کبھی پہلے نہیں ہوا۔" ہو سکتا ہے کہ پروفیسر گیان چند صاحب کو رام لعل نابھوی ہی نے مشورہ دیا ہو۔

سید یحییٰ نشیط۔ کل گاؤں۔ ۴۴۵۲۰۳

● جناب سراج اجملی کا اداریہ اختلاف سے پاک ہے۔ موصوف کے کسی بھی جملے پر اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ویسے ایک طرف جناب مجتبیٰ حسین کی تحریر دل و دماغ کو تازہ کر دیتی ہے تو دوسری طرف جناب معروف چودھری کا انشائیہ مزاج کو ایکدم سنجیدہ کر دیتا ہے۔ لیکن مزہ دونوں میں ہے۔

مختار احمد نثار۔ بیگم پور۔ سمستی پور۔ بہار

● کتاب نما جولائی ۹۴ء کے حوالے سے عرض ہے کہ مہمان مدیر سراج اجملی صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور ماضی کی مجلسوں اور انجمنوں کی جو تصویر کشی کی ہے وہ آج بھی نگاہوں میں پھرتی ہے اور بے شک اب ایسی مجلسیں عنقا ہیں۔ ان کا مضمون بے شک گہرائی سے مطالعہ کیے جانے اور غور و فکر کا مستحق ہے۔ مجتبیٰ حسین کا مضمون "مزاج پرسی" کا ایک انوکھا پہلو منفرد انداز

میں سامنے لاتا ہے اور طنز و مزاح کا ابھار وہ جگاتا ہے۔ "مانگے کا اجالا" تابناک ہے۔ اشعار بیت بازی پسند آئے۔

سید محمد رافق
شہباز یہ ادبی کونسل مولانا چک نگری بھاگلپور

● جولائی کے شمارہ میں جناب مجتبیٰ حسین کا "کیا اردو پھر اپنے گھروں میں واپس آرہی ہے" بہت غور اور دلچسپی سے پڑھا۔ حیدرآباد میں "اردو کی گرمائی کلاس" کے بارے میں پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ مایوسی اور قنوطیت کے اس ماحول میں مستقبل کے بارے میں امید کی ایک جھلک نظر آئی۔

گو میں اپنے اس نظریہ پر اب بھی قائم ہوں کہ بغیر اردو کو روزی روٹی سے جوڑے اسے ہندوستان میں اس کا صحیح مقام دلانا اگر ناممکن نہیں تو نہایت ہی مشکل ضرور ہے جب تک بہار۔ یوپی۔ ہریانہ راجستھان اور آندھرا پردیش وغیرہ میں اسے صحیح معنوں میں ایمانداری سے (صرف سیاست دانوں کے بیانوں اور سرکاری فائلوں میں ہی نہیں) صوبہ کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا جاتا اور سہ لسانی فارمولا میں اسے انگریزی اور ہندی کے ساتھ شامل نہیں کیا جاتا (جیسا کہ یوپی کے وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے اب احکام جاری کیے ہیں) اور اس طرح اسے روزی روٹی سے نہیں جوڑا جاتا۔ اردو کی صحیح ترویج و ترقی اور تحفظ ممکن نہیں ہے۔ اس مطالبہ کو منوانے کے لیے محبان اردو کی اپنی جد و جہد جاری رہنی چاہیے۔ لیکن "اردو کی گرمائی کلاس" کا آئیڈیا ایک متبادل قدم ہے۔ اس مقصد کی طرف اور اس کے لیے حکومت اور سیاسی پارٹیوں کی مدد کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ محبان اردو اپنے بل بوتے پر یہ کام کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے بہت محنت اور پکے ارادے کی ضرورت ہے۔ طلبہ کو راغب کرنے کے لیے کافی جد و جہد کرنی پڑے گی۔ ان کے والدین کو بھی راضی کرنا پڑے گا۔

میری محبان اردو سے درخواست ہے کہ "گرمائی کلاسز" دیا دوسری چھٹیوں کی کلاسز) دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، چنڈی گڑھ، جے پور اور یوپی۔ بہار۔ ہریانہ راجستھان کے دوسرے شہروں میں بھی شروع کرانی چاہئیں۔ اس میں انجمن ترقی اردو کی مقامی شاخیں کافی مدد کر سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں صوبائی اردو اکیڈمیاں نہایت اہم رول ادا کر سکتی ہیں۔ اس طرح اردو اکیڈمیاں اپنے خلاف اس الزام کو بھی دور کر سکتی ہیں کہ وہ صرف سمینار اور مشاعرے کروانے والی سنستھائیں ہو کر رہ گئی ہیں۔

جناب مجتبیٰ حسین کے ان الفاظ کی میں تہ دل سے تائید کرتا ہوں۔ "اردو اب بھی اپنی انا، اس کے بولنے والوں کے بل بوتے اور ان کے عزم و حوصلے سے ہی زندہ رہ سکتی ہے۔۔۔ پانی اور ایک توانا تحریک کو اپنا راستہ ڈھونڈنے کے لیے کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ یہ دونوں اپنا راستہ آپ بنا لیتے ہیں۔"

رام پرکاش کپور
۲۱۸۔ ایم آئی جی پدم نابھ پور درگ
۴۹۱۰۰۱ (مدھیہ پردیش)

● ڈاکٹر قیصر شمیم صاحب کا اشاریہ اور سہ جلیہ مستقبل پسند آیا۔ صفحہ ۵۰ پر ایم اے کاوش صاحب کی غزل پڑھی۔ چوتھا اور پانچواں شعر اپنے مصرع ثانی سے خارج از بحر ہو گیا ہے موصوف نے غزل کی ابتدا بحر رمل مسدس مخدوف میں کی جس کا وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے لیکن شعر نمبر ۴ اور ۵ کے ثانی مصرعے بحر رمل مثمن مقصور میں کہہ ڈالے۔ نہ جانے کیوں شعرا کرام اپنی تخلیقات پر نظر ثانی کرنے کی زحمت نہیں فرماتے۔ اسی غزل میں دوسرا شعر جس کے ثانی مصرعے میں زندگی کے لیے موت کا پیغامبر لکھا ہے غلط ہے مصرع یوں ہونا چاہیے تھا۔ "موت کی پیغامبر ہے زندگی" "کا" کی جگہ لفظ "کی" موزوں تھا۔

والاس موہیتے کی مراٹھی کہانی کا اردو میں ترجمہ قاسم ندیم صاحب نے خوب کیا ہے۔ اذان پسند آئی۔ غضنفر کی بطخ چال بھی ہر لحاظ سے لائق تحسین ہے۔ سیاسی پس منظر میں لکھی گئی یہ کہانی اپنے اسلوب کے لحاظ سے حقائق کی سچی تصویر ہے۔

شریف قریشی

۱۱ بجوسہ منڈی فتح گڑھ فرخ آباد (یوپی)

ادبی تہذیبی خبریں

نرالا سپائی ایوارڈ

رنگ، محبت رفاقت اور بھائی چارے کے صاف اور ستھرے پانی سے دھلی تہذیبی دھنک کے نور سے روشن ہندی اور اردو کے گنگا جمنی ماحول میں دہلی کے فکی جلسہ گاہ میں نوئیڈا کے ہندی اخبار "ورتمان سپائی" کے زیر اہتمام آل انڈیا نرالا سپائی ایوارڈ ملک کے مشہور شاعر جناب کرشن بہاری نور کو ۹ر مئی ۹۴ء کو دیا گیا۔ یہ ایوارڈ سابق نائب وزیر اطلاعات و نشریات محترمہ گرجا ویاس نے شاعر کو پیش کیا۔ محترمہ گرجا ویاس نے نور صاحب کے مجموعہ "سمندر میری تلاش میں ہے" کی رسم اجرا بھی انجام دی۔ شاعر کی ایک اور کتاب "تپسیا" کا اجرا ممتاز ہندی افسانہ نگار و دانش ور کملیشور نے کیا۔

نرالا سپائی ایوارڈ فاؤنڈیشن کے محرک اور روح رواں جناب راجیندر سنگھل نے فرمایا کہ یہ ایوارڈ ہر سال ملک کے ایک شاعر، افسانہ نگار، ادیب یا دانشور کو اردو ادب کی مجموعی خدمات کے لیے دیا جائے گا۔ ایوارڈ کا اعلان ایک انتخابیہ کمیٹی کرے گی۔ جناب راجیندر سنگھل نے مزید فرمایا کہ ہندی کی اس انجمن کا مقصد ہندستانی زبان اردو کو گلے لگانا ہے ادب کی حدیں رنگ، قوم، نسل اور زبانوں پر مشتمل نہیں ہوتیں۔ اس طرح قومی یکجہتی کے لیے ضروری ہے کہ ہندستان کی ہر زبان کے ادیب ایک دوسرے کے سراہیں اور ادب کو فروغ دیں۔ اگلے سال ۱۹۹۵ء کا "نرالا سپائی ایوارڈ" نوئیڈا میں ۲۶ جنوری کو یوم جمہوریہ کے مبارک موقع پر دیا جائے گا۔

(پی۔ پی سریواستو رند کنوینر)

تجدید شدہ آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کا پہلا اجلاس۔ جی۔ ڈی چندن

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کو جو پچھلے تقریباً چھ سال سے بے جان اور لاوارث پڑی تھی اب اس کو نئے وارث مل گئے ہیں۔ اس تجدید شدہ کانفرنس کا پہلا اجلاس ۲۴ر جولائی کو یہاں ایک مذاکرے کی صورت میں ہوا جس کا عنوان "اردو صحافت۔ عصری تناظر" رکھا گیا۔ اس کی صدارت قومی آواز دہلی کے چیف ایڈیٹر جناب موہن چراغی اور نظامت کانفرنس کے نئے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کی۔ شہری ہوا بازی اور سیاحت کے مرکزی وزیر جناب غلام نبی آزاد نے جو اجلاس کے مہمان خصوصی تھے، اپنی تقریر میں کہا کہ اردو ہندستان کی اپنی اور ایک قدیم زبان ہے اور یہ اپنی صلاحیتوں کی بدولت سیکڑوں بلکہ ہزاروں برس تک زندہ رہے گی۔ اس کی بدولت اس کے اخباروں کا ایک اعلا مرتبہ رہا ہے لیکن آج ان کی خبری قدریں محدود ہو گئی تھیں۔ انھیں وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اپنی وزارت کے ۳۰ فیصد اشتہار ملک کی غیر انگریزی زبانوں کے لیے مختص کر دیے ہیں جن میں سے دس فیصد اردو اخباروں کے لیے ہوں گے۔ اس سے قبل اردو اخباروں کے بجٹ کا تناسب صرف نصف فی صد تھا۔ جناب آزاد نے بتایا کہ تجدید شدہ کانفرنس کے نئے صدر جناب م۔ افضل رکن پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) کی صلاحیتوں کی ستائش کی اور اس کے نئے عہدیداروں کو مبارک باد دی۔

جناب ایم افضل نے کہا کہ سرکاری اشتہارات کی تقسیم میں اردو اخبارات کو سب سے زیادہ نظرانداز کیا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی یہ ناپسندیدہ بات ہے کہ ہماری غلامی کی نشانی انگریزی زبان کے اخبارات کو سب سے زیادہ اشتہار دیے جاتے ہیں حالاں کہ ملک میں انگریزی جاننے والوں کی تعداد صرف تین فیصد ہے۔

موصوف نے بتایا کہ ان کی کوششوں سے اب اس صورت کی اصلاح ہونے لگی ہے۔ اس مد کے بجٹ میں انگریزی اخبارات کا جو تناسب ۵۰ فیصد تھا۔ وہ اب ۴۳ فیصد کر دیا گیا ہے ہندی کا ۳۱ فی صد اور باقی زبانوں کا ۲۹ فی صد ہو گیا ہے مزید ۱۹۹۱ء میں اس بجٹ میں اردو اخبارات کا تناسب ڈھائی فیصد تھا لیکن اب یہ ساڑھے چار فی صد ہو گیا ہے۔

انگریزی پریس کی ایک خبر کے حوالے سے جناب افضل نے کہا کہ اشتہارات دینے والے مرکزی ادارے ڈی۔اے۔وی۔پی کو بند نہیں کیا جانا چاہیے۔ بلکہ اس کی ذمہ داری بڑھانی چاہیے اور مرکزی حکومت کی تمام وزارتوں اور محکموں کے اشتہارات اسی ادارے کے ذریعہ تقسیم ہونا چاہئیں۔

جناب افضل نے کہا کہ اردو اخبارات کی طرف مرکزی ترقی اردو بیورو اور ریاستوں کی اردو اکیڈمیوں کا رویہ بھی معاون نہیں۔ انھوں نے کہا کہ جو اکیڈمی یا ادارہ اردو اخبارات کو اشتہار نہ دے اس کی خبروں کا بائیکاٹ کیا جائے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کا قیام ۱۹۷۲ء میں ہوا تھا لیکن یہ اپنے اندرونی اختلافات کی وجہ سے چند برسوں کے بعد بے جان ہو گئی۔ اب نئے عہدیداروں کا انتخاب [illegible] ذریعہ بیلٹ سے کیا گیا ہے جس کے لیے پچھلے دو سال سے کوشاں تھے۔ ہم اردو پریس کے پیشہ ورانہ مسائل کو مرکزی اور ریاستی سطح پر حل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اشتہارات نیوز پرنٹ اور دیگر سہولیات ہمارا حق ہیں۔ ہم کاسۂ گدائی لے کر اس کے لیے بھیک نہیں مانگیں گے۔

صدر جلسہ جناب موہن چراغی نے اردو صحافت کا معیار بلند کرنے پر زور دیا اور کہا کہ اس کی قلت کو دور کرنے کے لیے سائنس، ٹکنالوجی، کمپیوٹر اور کامرس ایسے جدید موضوعات پر اچھا مواد پیش کرنے کی ضرورت ہے اسی تدبیر سے اردو اخبار پڑھنے والوں میں اضافہ ہوگا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کہا کہ ملک کی تقریباً ۱۲ ریاستوں سے اردو کے اخبار چھپتے ہیں۔ ان سب میں اردو مدیروں کو ریاستی کانفرنسیں قائم کی جانی چاہئیں۔ جن کا مرکزی کانفرنس سے باقاعدہ تال میل ہو۔

کانفرنس کے نئے تنظیمی سکریٹری جناب رضوان احمد (اڈیٹر عظیم آباد ایکسپریس پٹنہ) نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

اردو کے مقبول شاعر میدان سیاست میں

نئی دہلی۔ اردو کے مقبول شاعر اور سابق آئی پی ایس افسر حضرت شجاع خاور (شجاع الدین صاحب) پولیس کی ملازمت سے قبل از وقت سبکدوشی حاصل کر کے دہلی پردیش سماجوادی پارٹی کے صدر ہو گئے۔ پولیس کی ملازمت کے باوجود ان کے شعری مزاج میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ قوی امید ہے کہ ملکی سیاست بھی ان کے شعری مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتی اس لیے شجاع خاور کا مزاج لڑکپن سے شاعرانہ ہے۔ البتہ ان کے حلقۂ احباب کا حلقہ سماجوادی پارٹی کا ممبر ضرور بن جائے گا۔

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے

کے اعزازات کا اعلان

اختر سعید خاں اور خلش جعفری کو کل ہند اعزاز

بھوپال۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے برس ۹۴-۹۳ کا تخلیقی ادب کے لیے کل ہند میر تقی میر اعزاز ممتاز شاعر اختر سعید خاں کو دینے کا فیصلہ کیا ہے جب کہ صحافت کے لیے حکیم سید قمرالحسن کل ہند اعزاز سینیر صحافی خلش جعفری (بمبئی) کو دیا گیا ہے۔

مدھیہ پردیش اردو اکادمی ادب کے میدان میں گراں قدر خدمات کے لیے دو کل ہند اور سات صوبائی اعزاز دیتی ہے۔ اعزازات کا فیصلہ ایک مقتدر جیوری کے ذریعہ کیا جاتا ہے جو ملک و صوبہ کے دانشوروں، صحافیوں ادیبوں اور شاعروں سے موصول ہونے والی آراء کو بھی پیش نظر رکھتی ہے۔ کل ہند اعزازات میں گیارہ گیارہ ہزار روپے کی رقم کے علاوہ سند توصیف بھی دی جاتی ہے۔

صوبائی اعزازات کے لیے جیوری نے ڈاکٹر شیخ فرید، برہان پور (نواب صدیق خاں اعزاز) محترمہ وسیم بانو قدوائی، بھوپال (مراج میر خاں سحر اعزاز) جناب سالم ساگری، ساگر (محمد یوسف قیصر اعزاز) جناب شاہد بھوپالی، بھوپال (سہا مجددی اعزاز) کو منتخب کیا ہے ان اعزاز یافتگان کو سند توصیف کے ساتھ سات ہزار روپے کی رقم بھی دی جائے گی۔

ایک اعزاز اردو ڈرامے کے لیے ہے جو جبلپور کی زاہدہ تقدیس فردوس کو دیا گیا ہے جب کہ نوجوان محقق کا اعزاز جبلپور کے ہی ڈاکٹر اشفاق عارف کو دیا گیا ہے۔ ان دونوں کو سند توصیف کے ساتھ پانچ پانچ ہزار روپے کی رقم بھی دی جائے گی۔ نوجوان تخلیق کار کے لیے محمد علی تاج اعزاز گذشتہ برس کی طرح اس سال بھی کسی کو نہیں دیا گیا ہے۔

(پروفیسر آفاق احمد سکریٹری اکادمی)

جوش ملیح آبادی عالمی سمینار

جوش ملیح آبادی کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کے طور پر آج دنیا کے بیشتر ملکوں اور ان ملکوں کے بیشتر شہروں میں جوش اکیڈمیاں قائم ہیں جو گاہے بگاہے جوش شناسی کے مواقع فراہم کرتی رہتی ہیں۔ ان اکیڈمیوں کے علاوہ کئی ادبی تنظیمیں بھی جوش کو خراج عقیدت پیش کرنے میں پیش پیش رہتی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی "اردو رائٹرز فورم کنیڈا" کے زیر اہتمام گذشتہ دنوں منعقد کیا جانے والا ایک عالمی سمینار تھا۔

"اردو رائٹرز فورم" شمالی امریکہ کا فعال ترین ادبی ادارہ ہے اور گذشتہ دس سال سے اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے دنیا بھر میں بخوبی پہچانا جاتا ہے۔ اس ادارہ نے بے شمار ادبی کانفرنسیں اور سمینار منعقد کیے ہیں جن میں بعض اہم موضوعات پر علمی انداز سے گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں فیض سمینار اور علامہ اقبال کی شاعری اور شخصیت پر دس روزہ تقریبات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تقریبات نے فیض اور اقبال شناسی میں نہ صرف مدد دی بلکہ بعض ایسے پہلو بھی سامنے آئے جو عام اہل ذوق کی نگاہوں سے مخفی تھے۔

ان تقریبات میں پاک و ہند اور دنیا بھر کے بے شمار اسکالرز مدعو کیے گئے۔ ان تقریبات

کے علاوہ بعض اکابرین ادب کے اعزاز میں مخصوص نشستیں بھی منعقد کی گئیں جن میں سے صرف چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ علی سردار جعفری۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی۔ اختر الایمان۔ احمد فراز۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ جمیل الدین عالی پروفیسر ممتاز حسین۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ پروفیسر عبادت بریلوی اور فہمیدہ ریاض۔

اس ادارے کی طرف سے ٹورنٹو میں منعقد ہونے والا حالیہ جوش عالمی سمینار ایک یادگار تقریب کے طور پر تادیر یاد رکھا جائے گا۔ یہ تقریب ٹورنٹو ہالی ڈے ان ہوٹل کے ایک خوبصورت ہال میں منعقد کی گئی جس میں مقامی اہل قلم، اردو سے محبت رکھنے والوں اور جوش کے عقیدت مندوں نے بھاری تعداد میں شرکت کی۔ مہمان اہل قلم جو اس تقریب میں شرکت فرمانے کے لیے خاص طور پر یہاں تشریف لائے تھے ان میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر آغا سہیل۔ امراؤ طارق پاکستان سے اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہندستان سے تشریف لائے تھے۔ اس سمینار کو دو ادوار میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلے دور کی صدارت ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے فرمائی جب کہ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر خالد سہیل۔ سید خورشید عالم۔ امراؤ طارق اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ شامل تھے۔ دوسرے دور کی صدارت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے فرمائی اور مقالے جناب اشفاق حسین۔ ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے پیش کیے۔ ان مقالات میں مختلف زاویوں سے جوش ملیح آبادی کی شاعری اور شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالی گئی اور حاضرین نے انھیں بڑے انہماک اور دلچسپی سے سنا۔ سمینار کا آغاز رائٹرز فورم کے صدر اطہر رضوی کی تعارفی تقریر سے ہوا۔ جس میں انھوں نے فورم کی کارگزاریوں اور سمینار کی اہمیت سے حاضرین کو مطلع کیا۔ تمام مقالہ نگاروں نے تقریب کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے مقالوں کو دلچسپ پیرایے میں پیش کیا۔ خاص طور پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مقالوں کے علاوہ اپنی خوبصورت اور فکر انگیز باتوں سے حاضرین کو بے حد محظوظ کیا۔ چنانچہ ان کے خیال افروز علمی مقالے حاضرین کے ذہنوں پر چھائے رہے اور ۳ گھنٹے مسلسل مقالے سننے کے بعد بھی حاضرین ہمہ تن گوش تھے اور ہال بھرا رہا۔ تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے نورجہاں انتظامی صلاحیتوں کی تعریف کی اور اس سمینار کی افادیت کے اعتبار سے پاک و ہند میں منعقد ہونے والے سمیناروں سے الگ قرار دیا۔ اس موقع پر حاضرین میں ارتقا کراچی کے مدیر [illegible] سعید اور کلکتہ کے ممتاز اردو ڈرامہ نگار ظہیر انور بھی موجود تھے۔

رپورٹ: عابد جعفری معتمد عمومی

اردو رائیٹرز فورم۔ کنیڈا

آٹھ صحافیوں اور ادیبوں کو ہارمنی ایوارڈ

نئی دہلی۔ اردو نہ تو مسلمانوں اور نہ فرقہ واریت کی زبان ہے۔ یہ ایک ہندستانی زبان ہے اور ہندستان کی ثقافت میں اضافہ کرتی ہے۔

اس خیال کا اظہار اترپردیش کے وزیر اعلیٰ جناب ملائم سنگھ یادو نے ۱۶ر جولائی کو یہاں شری دلگم جے دیال ہارمنی ایوارڈس کی تقسیم کے جلسے میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اپنی ریاست میں اردو کو روزی روٹی سے جوڑ رہے ہیں اور اس کی مخالفت کرنے والوں سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ موصوف نے کہا کہ اگر ہندستان کو خود مکتفی بنانا ہے تو اسے انگریزی کی بجائے اپنی زبانوں پر انحصار کرنا

ہوگا۔ اپنی زبانیں ملک کے ۹۵ فیصد غریب اور محروم عوام کی زبانیں ہیں۔ اور ملک کی اصلی طاقت ان بقایا پانچ فیصد سے ہے جو اپنے خصوصی اختیارات سے حاصل ہونے والی نعمتوں اور سہولتوں سے سرشار ہیں۔ یہ اقلیتی طبقہ اس انگریزی زبان پر تکیہ کرتا ہے جس سے ۹۵ فیصد کا اکثریتی طبقہ نا آشنا ہے۔

تقریب کا اہتمام غیر سگالی اور بھائی چارے کے ادارے نے کیا تھا۔ ادارے کے صدر جناب سنجے ڈالمیا ممبر پارلیمنٹ نے کہا کہ ہندستان کے عوام کے دلوں کی آواز فرقہ واریت کے خلاف ہے اور ہمارے ادیب اور فنکار اسی آواز کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہمارا ادارہ اسی مسلک اور روایت کو فروغ دے رہا ہے اور اس باب میں امتیازی کام کرنے والوں کو ۱۹۸۲ء سے ایوارڈ دے رہا ہے۔

۱۹۹۴ء کی تقریب اپنے سلسلے کی دسویں تقریب تھی۔ اس میں سال ۱۹۹۴ء کے نو منتخبہ ادیب، صحافی، فنکار اور سوشل ورکر شامل تھے۔ ان کی فہرست حسب ذیل ہے:-

(۱) پربھاش جوشی اڈیٹر جن ستہ (ہندی) (۲) پرفل بدوائی صحافی (انگریزی) (۳) محمد ایوبی ایگزیکٹو اڈیٹر بلٹز (اردو) (۴) گور کشور گھوش، آنند بازار پتریکا (بنگالی) (۵) نندوری رام موہن راؤ اڈیٹر آندھرا جیوتی (تیلگو) (۶) پی لنکیشس اڈیٹر لنکیش پتریکا (کنڑ) (۷) بھرتروہری مہتاب اڈیٹر پرجا تنتر (اڑیہ) (۸) سعید نقوی (الیکٹرانک میڈیا) اور (۹) راجندر جوہر۔ رضا کار ادارہ (فیملی آف ڈس ایبلڈ)

ہر ایک ایوارڈ میں دس ہزار روپے۔ ایک نقرئی طشتری ایک شال اور توصیف نامہ شامل ہوتے ہیں۔ ایک خصوصی ایوارڈ کسی رضاکار ادارے کو اس کی نمایاں خدمات کے صلے میں دیا جاتا ہے اس کی رقم پندرہ ہزار روپے ہے۔

تقریب کی نظامت ادارے کی کوآرڈی نیٹر مسز نفیس خاں نے کی۔ اس کے سابق جنرل سکریٹری جناب شمس الرحمٰن کا مارچ ۱۹۹۴ء میں انتقال ہوگیا تھا۔ تقریب کا آغاز ان کی یاد میں دو منٹ کی دعائیہ خاموشی سے کیا گیا۔

(جی۔ ڈی۔ چندن)

آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی دوسری برسی پر یاد سحر کا اہتمام

حلقہ ارباب ذوق نے آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی دوسری برسی پر مورخہ ۱۸ر جولائی ۱۹۹۴ء کو اردو گھر نئی دہلی میں یاد سحر کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت جناب آئی۔ کے گجرال نے فرمائی۔ سلیم جعفری صاحب جدہ سے خصوصی طور پر تشریف لائے تھے۔ اس محفل کے مہمان خصوصی تھے۔

- کنور مہندر سنگھ بیدی ہندستان، پاکستان بلکہ پورے عالم میں قومی یکجہتی اور آپسی میل ملاپ کے لیے ہر پل کام کرتے تھے۔
- بیدی صاحب ۱۹۴۷ء کے پرآشوب دور میں امن قائم کرنے میں کامیاب رہے۔
- بیدی صاحب تمام عمر اردو ادب اور اردو زبان کی ترقی کے لیے کام کرتے رہے۔
- بیدی صاحب ہندستان اور پاکستان کے تعلقات استوار کرنے کے لیے بھرپور کوشش کرتے رہے۔
- بیدی صاحب کے بعد دہلی کی ادبی اور ثقافتی محفلیں سونی ہوگئی ہیں۔

ان خیالات کا اظہار کرنے والے مقررین میں پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ ڈاکٹر خلیق انجم۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کے علاوہ پاکستان کے سفارت خانہ

کے پریس منسٹر مفتی جمیل الدین بھی شامل تھے۔

دلیپ بادل، روی بھارد واج اور متین امروہوی نے بیدی صاحب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ رفعت سروش صاحب اور دلیپ سنگھ نے پر معلومات مقالے پڑھے۔

شریف الحسن نقوی صاحب نے نظامت کے فرائض سرانجام دیے اور آخر میں حلقے کے جنرل سکریٹری کے ایل نارنگ ساقی نے مقررین و حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

خراب موسم کے باوجود اردو کے جانے پہچانے دانشور پروفیسر قمر رئیس۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی پروفیسر ظہیر احمد صدیقی۔ مجتبیٰ حسین۔ زبیر رضوی ذہین نقوی۔ اظہار اثر۔ کرشن موہن اوتار سنگھ جج۔ مخمور سعیدی۔ گوربچن چندن۔ امیر قزلباش انجم عثمانی۔ ایم حبیب خاں۔ پریم پال اشک ابوالفیض سحر اور بیدی صاحب کی اہلیہ اور بچوں کے علاوہ بہت سے ادیبوں۔ شاعروں اور بیدی صاحب کے مداحوں نے جلسے میں شرکت فرمائی (کے۔ ایل نارنگ ساقی جنرل سکریٹری)

ہم اس غم میں برابر کے شریک ہیں

ڈاکٹر ریحان الحق کا انتقال!

کشمیر یونی ورسٹی کے ریڈر

کان پور، ۳۰ رجولائی الحاج ڈاکٹر ریحان الحق ریڈر شعبہ عربی کشمیر یونی ورسٹی کا گذشتہ منگل کو طویل علالت کے بعد یہاں سعید ویلا گیٹ کان پور میں بعمر تقریباً ۵۲ انتقال ہوگیا۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چھ بھائی اور چار بہنیں چھوڑی ہیں۔ نماز جنازہ جامعۃ العلوم جامع مسجد پٹکا پور اور تدفین تکیہ بساطیان میں اسی روز بعد نماز عشا ہوئی۔

ڈاکٹر ریحان الحق مولوی عبدالمجیب مالک کارخانہ رشید یہ کے بیٹے اور مولانا عبدالغفار امام اول عید گاہ کان پور کے پر پوتے تھے اس کے علاوہ وہ کان پور کے ممتاز صنعت کار حاجی محمد سعید کے داماد تھے۔

اردو کے ممتاز اہل قلم علامہ اخلاق حسین کا انتقال

نئی دہلی ۳۱ رجولائی۔ اردو کے ایک ممتاز اہل قلم اور محقق علامہ سید اخلاق حسین دہلوی کا آج صبح ان کی رہائش گاہ لال محل بستی حضرت نظام الدین میں ۸۸ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً چھ ماہ سے صاحب فراش تھے۔

علامہ صاحب ۱۹۰۶ء میں عرب سرائے کے ایک ممتاز سید گھرانے میں پیدا ہوئے۔ عرب سرائے اجڑنے کے بعد دہلی کے محلہ حویلی رجب بیگم میں آباد ہوگئے۔ وہاں سے قصبہ بڑوت (میرٹھ) چلے گئے جہاں جین کالج میں اردو پڑھاتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں ان کی ذاتی لائبریری اور جملہ املاک لٹ گئیں۔ اور گھر پر شرنارتھیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس سانحہ نے جوان العمری کے باوجود ان کو دنیا اور آرائش دنیا سے بیزار کر دیا اور وہ سادہ زندگی گزارنے لگے اور نظام الدین میں آبسے۔

علامہ صاحب کا بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم سے گہرا قلبی تعلق تھا اور وہ طویل عرصے تک انجمن ترقی اردو اور جمعیتہ علما ہند سے وابستہ رہے اور جمعیتہ کے مقامی صدر رہے۔ ان کا پہلا تحقیقی کتابچہ "دمشق" ۱۹۲۲ء میں اس وقت شائع ہوا جب ان کی عمر صرف ۱۶ برس تھی۔ ان کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں ہیں اور بے شمار مضامین ملک کے وقیع علمی جرائد میں شائع ہوئے۔ ابتدا میں انھوں

نے ادبی موضوعات بھی اسالیب فن شاعری، میزان سخن مضمون نگاری جیسی متعدد کتابیں لکھیں۔ جو مختلف اوقات میں بی اے اور ایم اے تک کے نصاب میں شامل رہیں۔ بعد میں انھوں نے صوفیائے کرام کے کارناموں اور تاریخ کو اپنا موضوع بنایا آئینہ ملفوظات، خواجگان چشت۔ حضرت محبوب الٰہیؒ، تذکرۃ المشائخ، سوانح حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ، سوانح حضرت شیخ کلیمؒ سوانح میر بیدار اور تاریخ لال محل جیسی متعدد بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی ایک کتاب "ویدک دھرم اور اسلام" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ جو انھوں نے اجودھیا تحریک کے دوران منافرت کے سیلاب میں لکھی جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ ہندستان میں بھی متعدد انبیاؑ آئے اور ویدک دھرم میں بھی توحید و رسالت کا تصور ملتا ہے۔

مرحوم کے پسماندگان میں تین بیٹے، دو بیٹیاں اور ایک بھائی قاضی سید محمد حسین شامل ہیں۔ وہ روزنامہ قومی آواز کے شعبۂ ادارت کے ایک کارکن منصور آغا کے حقیقی ماموں تھے۔ تدفین بعد نماز مغرب قبرستان پنچ پیران حضرت نظام الدین میں ہوئی جس میں بڑی تعداد میں سوگواروں اور دہلی کے ممتاز شہریوں نے شرکت کی۔

اردو ادیب کنول ڈبائیوی کا انتقال

نئی دہلی ۵ اگست۔ اردو کے بزرگ ادیب محقق اور شاعر ڈاکٹر شمس الحسن کنول ڈبائیوی کا مختصر علالت کے بعد ۷۵ سال کی عمر میں آج علی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔ انھوں نے ہندستان کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا تھا اور زمانہ طالب علمی میں بھی آزادی کی تحریک میں سرگرمی سے حصہ لینے کی پاداش میں جیل بھی گئے تھے۔ پسماندگان میں چھ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کے ایک بیٹے ڈاکٹر امین کنول دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرار ہیں۔

دیوان تصور کا انتقال

نئی دہلی ۲ راگست۔ سینیر صحافی اور شاعر دیوان شیو شنکر سہائے تصور کا کل رات یہاں مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۷۲ سال تھی پسماندگان میں ان کی اہلیہ ایک بیٹا اور ۳ بیٹیاں شامل ہیں۔ دیوان تصور نے پنجاب کے مشہور اخبار "ویر پرتاپ" جس کے اڈیٹر لوک سبھا کے سابق اسپیکر گردیال سنگھ ڈھلون ہیں، سے اپنے کیریر کا آغاز کیا تھا۔ بعد میں وہ دہلی کے روزنامہ "پرتاپ" سے وابستہ ہوگئے اور طویل عرصہ تک شعبۂ ادارت میں کام کرتے رہے۔

دہلی سے قومی آواز کے اجرا کے بعد وہ اس سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کچھ عرصہ دہلی کے روزنامہ "ملاپ" اور "تیج" میں بھی کام کیا۔ دیوان تصور انجمن فروغ اردو ہریانہ کے بانی صدر تھے۔

ساحر ہوشیارپوری کا انتقال

نئی دہلی ۲ راگست۔ اردو کے ممتاز بزرگ شاعر ساحر ہوشیارپوری کا آج دوپہر فریدآباد میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۸۱ برس کے تھے۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور ۴ بیٹیاں ہیں۔ سیکڑوں پرستاروں دوستوں اور رشتہ داروں کی موجودگی میں آج بعد دوپہران کا انتم سنسکار کر دیا گیا ان کا اصلی نام رام پرکاش اوبہری تھا۔

ساحر ہوشیارپوری کا جنم ہوشیارپور کے ممتاز

تاجر گھرانے میں ۱۱ فروری ۱۹۰۳ء کو ہوا تھا۔ لاہور
سے ایک ادبی رسالہ "چمنستان" جاری کیا۔ دلی سے
بھی ایک ادبی رسالہ "ماہ نو" ۱۹۴۷ء میں جاری کیا۔
اردو زبان پر دل و جان سے فدا مسٹر ساحر
ہوشیارپوری نے تقریباً ۷ دہائیوں تک اردو زبان
و ادب کی خدمت کی۔ عمر کے آخری حصے میں بھی
وہ اردو کے بڑے مشاعروں میں شرکت کرتے رہے
"سحر غزل" "شعر نغمہ" "جل ترنگ" "شعر حرف"
و "سحر خیال" ان کی شعری تخلیقات ہیں۔ اس کے علاوہ
کئی کتابیں بھی انھوں نے ترتیب دیں۔ پنچ تنتر
کی کہانیوں کا انھوں نے ترجمہ بھی کیا۔ ان کی کئی
کتابوں کو انعامات سے نوازا گیا۔ ملک کی مختلف
انجمنوں اور اداروں نے ان کی ادبی خدمات کے
صلے میں ایوارڈ عطا کیے۔ میر اکادمی نے انھیں
۱۹۸۱ء میں میر ایوارڈ عطا کیا۔ ہریانہ اردو اکادمی
کے قیام میں ان کی کوششوں کو کافی دخل ہے۔

ساحر ہوشیارپوری داغ اسکول سے تعلق رکھتے
تھے۔ پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی سے تلمذ حاصل
تھا۔ انھوں نے داغ اسکول کے شعرا پر مشتمل ایک
کتاب بھی ترتیب دی۔ ساحر ہوشیارپوری دلی
کی ادبی انجمن "انجمن عروج ادب" کے صدر تھے۔

ساحر ہوشیارپوری کے انتقال پر انجمن عروج
ادب کی جانب سے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے
کہا گیا کہ ساحر کے انتقال سے اردو زبان ایک بزرگ
شاعر اور بے لوث خادم سے محروم ہو گئی ہے۔ انجمن
کے نائب صدر مسٹر کے ایل نارنگ ساقی نے انتہائی
دکھ کے ساتھ کہا کہ مسٹر ساحر ہوشیارپوری نہایت
نیک نفس انسان تھے۔ انھوں نے نئے لکھنے والوں
کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔

ہریانہ اردو اکادمی کی تقریب میں گورنر ہریانہ نے ۵ اردو قلم کاروں کو اعزازات سے نوازا

پنچکولہ۔ ہریانہ کے گورنر جناب دھنک لال
منڈل اور وزیر اعلیٰ جناب بھجن لال نے اردو زبان
و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے خاص طور پر زور دیتے
ہوئے کہا کہ قومی یکجہتی کو فروغ دینا نہایت
ضروری ہے۔

تقریب میں گورنر ہریانہ نے نیشنل حالی
ایوارڈ جو ۵ ہزار روپے پر مشتمل ہے جناب رشید حسن خاں
کو دیا گیا۔ قومی سطح کا کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ طنز
و مزاح کے لیے حیدرآباد کے جناب نریندر لوتھر کو،
ہریانہ کا سماجی اور ثقافتی ایوارڈ، ڈاکٹر معین
احسن جذبی کو اور "اردو میگزین ایوارڈ" ماہنامہ
"شاعر" کی بہترین ادارت کے لیے جناب افتخار امام
صدیقی کو دیا گیا۔ یہ تینوں ایوارڈ پانچ پانچ ہزار
روپے پر مشتمل ہیں۔ ریاستی سطح کے چھ ایوارڈوں
میں دس ہزار روپے کا "سید مظفر حسین برنی ایوارڈ"
آنجہانی آتش بہاولپوری کی بیوہ محترمہ شانتی دیوی
کو، دس ہزار روپے کا "خواجہ احمد عباس ایوارڈ"
مشترکہ طور پر ڈاکٹر راجندر رونق اور ڈاکٹر جناب علی
پوری کو، دس ہزار روپے کا "ایوارڈ برائے حرف
شناسی" بھارت گیان وگیان سمیتی پانی پت کو
اور "امر اندر کنگر ایوارڈ" (پانچ ہزار روپے) ڈاکٹر
دلیش لال سپرو کو پیش کیا گیا۔ جناب امیر چند
بہار (مرحوم)، جناب بلبیر سنگھ دلبر اور
جناب رام لعل نابھوی (رچیسٹ) کو ان کی کتابوں
پر انعامات بھی پیش کیے گئے۔ جناب رام لعل نابھوی،
جناب بھگوان داس برق اور جناب دیپ راج پریم
کو ان کی زندگی کے ۷۵ برس مکمل ہونے پر سپاس نامے
بھی پیش کیے گئے۔

نظر برنی کو لائنس ایوارڈ

نئی دہلی۔ لائنس انٹرنیشنل کلب دہلی نے نظر برنی صاحب کو ان کی ادبی و علمی خدمات کے اعتراف میں "لائنس ایوارڈ" دیا۔ ہوٹل سمراٹ میں منعقد ایک تقریب میں یہ ایوارڈ دیتے ہوئے دہلی کے وزیر خوراک مسٹر تیمارسی نے نظر برنی کی طنز نگاری اور مزاحیہ شاعری کو معاشرہ کی اصلاح کے لیے ایک موثر وسیلہ قرار دیا۔

لائنس کلب کے صدر جناب اشوک رچھاریہ نے اس موقع پر نظر برنی صاحب کو ایک توصیفی سند بھی عطا کی۔

جامعہ کے ہر دل عزیز کارکن حبیب احمد صدیقی کا انتقال

۲۴ر اگست ۹۴ء کو دن کے ایک اور دو بجے کے درمیان حبیب احمد صدیقی نے داعیِ اجل کو لبیک کہا وہ تقریباً ڈیڑھ ماہ سے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ دہلی میں زیر علاج تھے۔ ان کے گردے خراب ہو گئے تھے۔

حبیب صاحب اپنی باغ و بہار طبیعت اور جذبۂ خدمت کی بنا پر ایک نہایت مقبول شخصیت کے مالک تھے مزید برآں نہایت متواضع اور دین دار واقع ہوئے تھے۔

وہ بدایوں کے رہنے والے تھے اور اس وقت جامعہ کے اکاؤنٹس آفس سے وابستہ تھے۔ ان کی وفات سے جامعہ اپنے ایک نہایت ہر دل عزیز اور مخلص کارکن سے محروم ہو گئی۔

دوسرے روز جامعہ کی انتظامی اسٹاف ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک جلسے میں انھیں بڑے پرخلوص انداز میں یاد کیا گیا جس میں شیخ الجامعہ پروفیسر بشیر الدین احمد صاحب کے علاوہ جامعہ کے بہت سے اساتذہ اور کارکنان نے شرکت فرمائی اور ان کی اہلیہ و بڑے بھائی آفتاب احمد صدیقی صاحب سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

ادارہ مکتبہ جامعہ، کتاب نما اور پیام تعلیم مرحوم کے اعزہ کے غم میں برابر کا شریک ہے اور مرحوم کے لیے دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

ہُوبہ ہُو

پروانہ ردولوی

ان خاکوں کی نمایاں خوبی سادہ، سلیس، نپی تلی اور رواں نثر ہے۔ دوسرا خاص وصف یہ ہے کہ کسی شخص کا جو عکس خاکہ نگار کے ذہن میں ہے اس نے وہ ہُو بہ ہُو پیش کر دیا ہے۔ یہ رشید احمد صدیقی کی طرح کرداروں کو سجا سنوار کر سامنے لایا جاتا ہے نہ منٹو کی طرح دانستہ کسی کے سر مونڈنے کی رسم انجام دی ہے۔ افسانوی عنصر سے بھی پروانہ ردولوی نے دامن بچایا ہے جو ہمارے زمانہ کے ایک نامور خاکہ نگار مجتبیٰ حسین کے خاکوں میں کہیں کہیں حاوی عنصر کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ (محمود سعیدی) مجلد قیمت ۵۰/- روپے

جونک

پروانہ ردولوی

اردو کے بزرگ صحافی، خاکہ نگار، شاعر اور نقاد کے بہترین افسانوں کے اس انتخاب پر یوپی اردو اکادمی نے اسی سال انعام دیا ہے۔ ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد مشہور کالم نگار جعفر عباس کا فیصلہ ہے کہ "جونک کی تمام کہانیاں پڑھنے کے بعد افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں پروانہ ردولوی سب سے منفرد اور سب سے یکتا نظر آتے ہیں۔" قیمت ۳۵/- روپے

بچوں کے لیے مکتبہ پیام تعلیم کی نئی اور اہم کتابیں

مذہب

کتاب		مصنف	قیمت
نقوش سیرتؐ	(اول)	حکیم محمد سعید	۵/:
نقوش سیرتؐ	حصہ دوم	//	۵/:
نقوش سیرتؐ	حصہ سوم	//	۵/:
نقوش سیرتؐ	حصہ چہارم	//	۵/:
نقوش سیرتؐ	حصہ پنجم	//	۵/:
رسالہ دینیات	اوّل	ادارہ	۳/:
//	دوم	//	۴/:
//	سوم	//	۵/:
//	چہارم	//	۵/:
//	پنجم	//	۵/:
حضرت آدم علیہ السلام		منورہ نوری خلیق	۴/:
حضرت یحییٰ علیہ السلام		//	۳/:
بزرگان دین		محمود علی خاں جامعی	۴/:
امت کی مائیں		حسین حسنی	۴/۵۰
اچھی باتیں		سعدالدین انصاری	۴/۵۰
خوب سیرتؐ	حصہ اوّل	حکیم محمد سعید	۶/:
خوب سیرتؐ	حصہ دوم	//	۶/:
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں		فضل قدیر ندوی	۴/۵۰
سلطان جیؒ		اسلم فرخی	۴/۵۰
سیرت پاک مختصر مختصر		احمد خاں خلیل	۳/:

کتاب	مصنف	قیمت
کمسن صحابی	رفیع الزماں زبیری	۶/:
رحمان کا مہمان	//	۶/:
اسلام کے جاں نثار	//	۵/:
نور کے پھول	حکیم محمد سعید	۹/:
سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	//	۴/۵۰
حضرت ابوبکر صدیق رضؓ	مشیر الحق	۶/:
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	//	۳/:
حضرت طلحہؓ	//	۳/:
حضرت ابوذر غفاریؓ	//	۳/:
حضرت سلمان فارسیؓ	//	۳/۵۰
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	//	۳/:
حضرت محبوب الٰہیؒ	//	۴/:
حضرت معین الدین چشتیؒ	//	۳/:
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	//	۳/:
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	//	۳/:
نیک بیٹیاں	//	۳/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	(ادارہ)	۳/:
حضرت حمزہؓ	احتشام علی رحیم آبادی	۳/:
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	//	۳/:
حضرت ابوہریرہؓ	//	۴/:
اللہ کے صفی	خلیل احمد جامعی	۲/۵۰
اللہ کا گھر	//	۴/۵۰
اللہ کے خلیلؑ	//	۳/۵۰
رسول پاک کے اخلاقؐ	//	۴/:
قرآن پاک کیا ہے؟	عبدالواحد سندھی	۵/:
اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل	//	۶/:
// حصہ دوم	//	۶/:

سوانح

کتاب	مصنف	قیمت
اسلام کے مشہور امیر البحر	عبدالصمد [illegible]	۹/:
اسلام کیسے پھیلا حصہ اوّل	//	۷/۵۰
// حصہ دوم	//	۶/:
اسلام کیسے شروع ہوا	//	۷/۵۰
رسول پاکؐ	//	۶/:
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۷/۵۰
سرکار کا دربار	//	۶/۵۰
چار یار	//	۷/۵۰
آں حضرتؐ (اردو)	//	۳/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)		۱/۴۰
ہمارا دین حصہ اول	سید شہاب الدین دسنوی	۸/۵۰
// حصہ دوم	//	۸/۵۰
// حصہ سوم	//	۸/۵۰
تحسین القرآن۔ تالیف خدیجہ سیدنا طاہر سیف الدین (زیر طبع)		
منہاج القرآن	// //	۴/۵۰
ائمہ اربع	مولانا ابو العرفان ندوی	(زیر طبع)
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۵/:
عقائد اسلام	//	۳/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۱۰/۵۰
نبیوں کے قصے	//	۷/۵۰
ہمارے رسولؐ	//	۷/:
پیارے رسولؐ	سلطانہ آصف مجیبی	۴/۵۰
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۶/:
ہمارے نبیؐ (اردو)	سید نواب علی رضوی	۴/:
// (ہندی)	//	(زیر طبع)
سرکار دوعالم	محمد حسین حسان ندوی	۹/:
قاعدہ یسرنا القرآن خورد		۲/:
// // کلاں		۴/۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
چارلی چپلن اور کینتھ اینڈرسن	ریحان احمد عباسی	۹/:
بچوں کے مولانا حسرت موہانی	اسلم فرخی	۴/:
// میر امّن دلی والے	//	۴/۵۰
// محمد حسین آزاد	//	۴/:
// مرزا غالب	//	۴/:
// رنگا رنگ خسروؒ	//	۴/:
// ڈپٹی نذیر احمد	//	۴/:
// سلطان جیؒ	//	۴/۵۰
// مولانا شبلی نعمانی	//	۴/۵۰
// عالم عابد حسین	صغرا مہدی	۴/:
// ڈاکٹر سید عابد حسین	//	۴/:
// بابائے اردو مولوی عبدالحق	ڈاکٹر خلیق انجم	۴/۵۰
// میرزا ادیب	طاہر مسعود	۴/۵۰
// غلام السیدین	ذکیہ ظہیر	۵/:
// مولانا اسمٰعیل میرٹھی	حکیم نعیم الدین زبیری	۲۱/:
بچوں کے ذاکر صاحب	مرتب عبداللہ ولی بخش قادری	۷/:
دادا نہرو	منور لکھنوی	۶/:
اندرا گاندھی کی کہانی	شمیم حنفی	۶/:
محمد شفیع الدین نیّر	اطہر پرویز	۷/۵۰
ہمارے عظیم سائنس داں	حکیم محمد سعید	۹/:
چند مشہور طبیب اور سائنس داں	(ادارہ)	۶/:
مولانا آزاد کی کہانی	ظفر احمد نظامی	۱۴/:
جوہر قابل	مسعود احمد برکاتی	۴/۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
بچوں کے چار بزرگ دوست	صالحہ عابد حسین	۳/۵۰
گاندھی باپو کی کہانی	بیگم قدسیہ زیدی	۱/:
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں	یوسف ناظم	۲/:
میر انیس	محمد حسین حسان	۲/:
امیر خسرو رح	(ادارہ)	۳/۵۰

سائنس، طب اور عام معلومات

کتاب	مصنف	قیمت
چیزوں کی کہانیاں	آصف فرخی	۶/۵۰
یہ کیسا بخار ہے	(ادارہ)	۶/:
آپ کا جسم	علی ناصر زیدی	۶/:
گندا پانی	(ادارہ)	۴/:
کیوں اور کیسے؟	محمد ابراہیم شاہ	۶/:
سائنس کی دنیا	فریدالدین احمد	۸/:
کمپیوٹر کیا ہے	حکیم نعیم الدین زبیری	۸/:
عجائب گھر	قاسم صدیقی	۶/:
ذرے کی کہانی	نیدہ جعفر	۲۱/:
علاج بہرا دشمن	قاسم صدیقی	۶/:
پرواز کی کہانی	علی ناصر زیدی	۴/۵۰
غذا کی کہانی	//	۳/:
رنگوں کی بستی	سہیل انور	۵/:
غذائیں دوائیں	(ادارہ)	۸/:
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں	زہرہ شبیر	۴/۵۰
صحت کے ۹۹ نکتے	مسعود احمد برکاتی	۳/:
صحت کی الف بے	مسعود احمد برکاتی	۵/:
سنہرے اصول	حکیم محمد سعید	۵/:

کتاب	مصنف	قیمت
پرندوں سے جانوروں تک	شاہد علیم	۱/۵۰
دہلی	(مجاہد حسین زیدی)	۲/:
لڑکا عجائب خانہ (۲ حصے)	محمد حسین حسان فی حصہ	۱/۵۰
سماجی زندگی حصہ سوم	(ادارہ)	۴/۹۰
تاریخ ہند کی کہانیاں (دوم، چہارم)		۶/۲۵
ان تھک جان	بیگم قدسیہ زیدی	(زیر طبع)
چھن چھن بانو	//	//
جاں باز سپاہی	//	//
ہمت کے پھل	عبدالواسع عسکری	(زیر طبع)
موم کا محل	پروفیسر محمد انس	//
بڑے دادا کی کہانی	//	//
چٹانوں کی کہانیاں	محمد امین	//

نظمیں

کتاب	مصنف	قیمت
پھلجھڑیاں	سطوت رسول	۶/:
مولانا اسمعیل میرٹھی	حکیم نعیم الدین زبیری	۲۱/:
بتاشے	(نرسری گیت۔ با تصویر)	۶/۵۰
چٹکتی کلیاں	خضر برنی	(زیر طبع)
ٹوٹے کھلونے	سطوت رسول	۵/:
سہانے ترانے	شان الحق حقی	۴/۵۰
بچوں کے افسر	افسر میرٹھی	۶/:
بچوں کے اقبال	مرتبہ: اطہر پرویز	۶/۵۰

غیر ملکی زبانوں کی دلچسپ کہانیاں

کتاب	مصنف	قیمت
جادو کی ہنڈیا	باتصویر کہانیاں	۶/-
چالاک بلی	//	۷/۵۰
دم کٹی لومڑی	//	۷/۵۰
کوّے کا خواب	//	۷/۵۰
گدھے نے بجائی بانسری	کشور ناہید	۷/۵۰

بڑے بچوں کی دلچسپ کہانیاں

کتاب	مصنف	قیمت
پتھر کا خرگوش	آصف فرّخی	۱۰/-
سُرخ موت	//	۲/۵۰
دنیا کی عجیب و غریب کہانیاں	//	۷/۵۰
انمول کہانیاں	ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی	۴/۵۰
پتھر کی گڑیا	ثروت صولت	۷/۵۰
ریل کے نیچے	احمد خان خلیل	۴/-
افریشیا کی کہانیاں	فضل حق قریشی	۷/۵۰
۸۰ دن میں دنیا کا چکّر	علی اسد	۳/-
ہزاروں خواہشیں	مسعود احمد برکاتی	۹/-
مونٹی کرسٹو کا نواب	//	۹/-
گلی ور کے تین حیرت انگیز سفر	احمد خان خلیل	۹/-
گیارہ ہنس اور ایک شہزادی	سید حامد حسین	۴/-
دادی اماں کی کہانیاں	آصف فرّخی	۶/-
سفر کے قصّے	//	۵/-
پہاڑی مہم	ثریا فرخ	۳/۵۰
تین بندوقچی	مسعود احمد برکاتی	۱۰/-
ہم بنے کمانڈو	منیر احمد راشد	۵/-
ایک تھا مرغا ککڑوکوں	قمر علی عباسی	۶/-
پریوں کی کہانیاں	اشرف صبوحی	۶/-
سمندر کا بادشاہ ہار گیا	ڈاکٹر شریف الحسن	۴/۵۰
چوں چوں بیگم	شفیقہ فرحت	۴/-
ماسٹر شامت	اشرف صبوحی	۶/-
تھوڑی تارا ماتھے چاند	//	۴/-
پکڑے گئے	(ادارہ)	۷/۵۰
درویش کا تحفہ	افشاں بیگم	۶/-
موراسے فرار	رفیع الزماں زبیری	۷/۵۰
بکرے کی تعریف میں	یوسف ناظم	۶/-
جھیل کا راز	ثریا فرخ	۶/-
قصرِ صحرا اوّل	مرزا عظیم بیگ چغتائی	۷/-

کہانیاں، ناول، ڈرامے
ننھے منے بچوں کے لیے

کتاب	مصنف	قیمت
بتاشے	(نرسری کے گیت باتصویر)	۹/۵۰
جاں نثار دوست	(باتصویر کہانیاں)	۹/-
شیر اور بکری	//	۷/۵۰
چاند کی بیٹی	//	۹/-
بھیڑیے کا گانا	//	۷/۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
قصر صحرا دوم	مرزا عظیم بیگ چغتائی	۱۰/:
قصر صحرا سوم	" "	۸/:
علتوں کی تباہی	ظفر محمود	۷/۵۰
پیار کا پنچھی	فرخندہ لودھی	۴/:
ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش	(ادارہ)	۷/۵۰
پادری کی روح	(ادارہ)	۲/:
ٹھگ نے ٹھگا ٹھگ کو	ابصار عبدالعلی	۲/۵۰
گدھا کہانی	میرزا ادیب	۹/:
خفیہ سرنگ	ثریا فرخ	۶/:
بڑھیا کی بھینس	(ادارہ)	۲/۵۰
تیس مار خاں	شاہد علی خاں	۲/۵۰
چالاک خرگوش کی واپسی	معراج	۱۵/:
عجیب لکڑہارے کی کہانی	(ادارہ)	۶/:
نردولی کا آدم خور	"	۶/:
ہمت کے کرشمے	"	۶/:
خلائی مسافر	"	۶/:
ابو خاں کی بکری	ڈاکٹر ذاکر حسین	۵/:
ایک فوط خور کی آپ بیتی (کہانیاں)	(ادارہ)	۶/:
نرالے گویے	اشرف صبوحی	۲/۵۰
باتونی کچھوا	"	۲/۵۰
جادو کا چھلا	"	۳/:
جادو کی سارنگی	"	۳/:
بدر شہزادی	"	۶/:
سمندری طوفان اور زمین لڑکے (مختلف کہانیاں)		۶/:
ننھا سیاح	محمد زکریا سائل	۴/:
زیور (مختلف کہانیاں)		۹/:
شہنشاہ نے کہا... (مختلف کہانیاں)		۶/:
سام پر کیا گزری	سید اظفر زیدی	۳/۵۰
جنگو کی بلی	عبدالاحد سندھی	۳/:
چالاک خرگوش کے کارنامے	معراج	۹/:
چور پکڑو	مسعود احمد برکاتی	۲/۵۰
بہادر علی	قمر علی عباسی	۷/۵۰
خالی ہاتھ	ابصار عبدالعلی	۹/:
کھلونا نگر	(ادارہ)	۸/۵۰
حاجی بابا کی ڈائری	ظ۔ انصاری	۷/۵۰
قصہ اژدھا پکڑنے کا	ادارہ	۶/:
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	"	۶/:
ابو علی کا جوتا	"	۶/:
ننھا سراغ رساں	"	۵/:
پُراسرار غار	"	۶/:
ظالم ڈاکو	ریاض احمد خاں	۶/:
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	انور خاں	۷/۵۰
دلی کی شادی	اشرف صبوحی	۴/:
رحمت شہزادہ	"	۴/۵۰
اندھے کا بیٹا	شعیب اعظمی	۳/۵۰
پانچ جاسوس	امۃ الرحمٰن محسنی	۱۰/:
جنگل کی ایک رات	ریحان احمد عباسی	۷/۵۰
اچھی کہانیاں	مرتبہ ہمدرد فاؤنڈیشن	۳/:
ہرن کا دل	اشرف صبوحی	۲/:
دریا کی رانی	"	۳/:
گوہر شہزادی	"	۴/:
شریر شیرا	"	۳/۵۰
پری رانی	صالحہ خاتون	۳/:
خطرناک سفر	ریاض احمد خاں	۳/۵۰
ننھا جمبرد	ریحان احمد عباسی	۳/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں	یوسف ناظم	۴/۵۰
بابا ناصح	رشید الوحیدی	۳/:
سلامہ و صمصامہ	"	۴/۵۰
پہاڑ کی چوٹی پر	میرزا ادیب	۶/:
شرارت	محمد حسین حسان	۶/:
ننھا فرشتہ	فہمیدہ عتیق	۶/:
ایک کھلا راز	مسعود احمد برکاتی	۳/۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
چھپر الہ داس کی بیوی	عبدالواحد سندھی	۳/۵۰
بھوتوں کا جہاز	شمیم حنفی	۴/۵۰
ہار کی تلاش	ریاض احمد خاں	۶/:
خرگوش کی چال	بیگم آصفہ مجیب	۴/:
آؤ ذرا ماکریں	محمد مجیب	۴/:
خرگوش کا سپنا	کرشن چندر	۹/:
نیلا ہیرا	مظفر حنفی	۶/۵۰
ایک کٹوری تیل میں	عبدالواحد سندھی	(زیر طبع)
شیر خان	قرۃ العین حیدر	۲/:
بھیڑیے کے بچے	//	۳/:
لومڑی کے بچے	//	۳/:
میاں ڈھینچو کے بچے	//	۴/:
بہادر	//	۴/۵۰
ہرن کے بچے	//	۳/:
اس نے کیا کر نہ جانا	آصفہ مجیب	۲/۵۰
کٹا ہوا ہاتھ	شمیم حنفی	۴/۵۰
میگھ نگر کا راجا	ریاض احمد خاں	(زیر طبع)
جی دار اور ننھا فرشتہ	//	//
سرکس	ڈین گیسپر	۱/۵۰
بندر اور نائی	عبدالواحد سندھی	۴/۵۰
لومڑی کا گھر	//	۳/۵۰
جادو کا گھر	//	۳/۵۰
بی مینڈکی اور کوا	//	۳/۵۰
تاک دنا دن تاکے سے	//	۲/۵۰
روٹی کس نے پکائی	//	۳/۵۰
پھر میں چکھوں کیا خاک	//	۳/۵۰
پانچ بونے	//	۳/۵۰
چیونٹی رانی	//	۳/۵۰
بچوں کی کہانیاں	//	۳/۵۰
پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	//	۲/۵۰
پکڑو دم کٹے کو	//	۳/۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
مندریا نا پردیس چلے	عبدالواحد سندھی	۲/۵۰
ہپتو چپتو	//	۲/۵۰
سرخ جوتے	بیگم قدسیہ زیدی	۲/۵۰
ریڈیو پنچر	جگن ناتھ آزاد	(زیر طبع)
پلک نہ مارو	یوسف ناظم	۶/:
ایک دیس ایک خون	صالحہ عابد حسین	۲/۵۰
جادو کے کھیل	اطہر پرویز	(زیر طبع)
انعامی مقابلہ	حسین حسان	۲/۲۵
دعوت ملاجی	//	(زیر طبع)
جیت کس کی؟	//	۴/:
چینی کی گڑیا	//	(زیر طبع)
بہادر سپاہی	//	۴/:
چچا غالب مرتبہ:	//	(زیر طبع)
تانبیل خاں	محمد حسین حسان ندوی	۳/:
جن حسن عبدالرحمٰن، ترجمہ قرۃ العین حیدر، حصہ اول		۵/:
چوری کی عادت	عبدالغفار مدھولی	۳/۵۰
غیر ذمہ دار لڑکا	//	(زیر طبع)
جب اور اب	آصفہ مجیب	//
سندر چنار	صالحہ عابد حسین	۱/۵۰
گلابو چوہیا اور غبارے	قدسیہ زیدی	۱/۵۰
ستاروں کی سیر	کرشن چندر	(زیر طبع)
گلابو چوہیا اور پری زاد	قدسیہ زیدی	۲/:
لال مرغی	عبدالواحد سندھی	۴/:
تین اناڑی	عصمت چغتائی	۶/:
خربوزہ شہزادہ کا سر بن گیا	کوثر بانو	(زیر طبع)
چمپاوت کا آدم خور شیر	محمد معین	۱/۵۰
ننھا ٹٹو	خورشید سلطان	۲/:
چنبیلی	محمد حسین حسان	۱/۲۰
شہزادہ اور ٹھگ	ادارہ	(زیر طبع)

تعلیم بالغان کے سلسلے کی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
کفن دفن		۱/:
حیات اللہ انصاری		۱/:
چیچک	مشتاق احمد	۱/:
آستین کا سانپ	محمد حسین حسان	۱/:
چاند	//	۱/:
دیمک	//	۱/:
کتنی زمین	//	۱/:

قواعد، محاورے، کہاوتیں اور لغات

کتاب		قیمت
عبارت کیسے لکھیں		۹/:
انشا اور تلفظ		۱۵/:
پیامی قواعد اردو	طلبہ اڈیشن	۳/:
// //	کلاں	۶/:
پیامی اردو انگریزی ڈکشنری		۱۶/:
پیامی بیسک انگلش اردو ڈکشنری		۱۲/:
ہمارے محاورے	سینی پریمی	۱۲/۵۰
کہاوت اور کہانی	//	۸/:
مختصر اردو لغت		۶۵/:
فرہنگ عامرہ		۴۰/:
فیروز اللغات	درمیانی	۱۵/:

ہندی کی دوسری کتابیں

کتاب	قیمت
موسموں کا کھیل	۱/:
پرم پتا	۱/:
اپنا گھر	۱/:
امریکہ	۱/:
دہلی	۱/:
منوربخن اور کام	۱/:
چاندی کا چمچہ	۱/:

ہماری درسی کتابیں

اردو

کتاب		قیمت
اردو قاعدہ		۴/:
رنگین قاعدہ	حصہ اول	۱/۵۰
//	حصہ دوم	۱/۵۰
اردو کی پہلی کتاب		۶/۵۰
اردو کی دوسری کتاب		۸/:
اردو کی تیسری کتاب		۸/۵۰
اردو کی چوتھی کتاب		۹/:
اردو کی پانچویں کتاب		۱۲/:
اردو کی چھٹی کتاب		۳/:
اردو کی ساتویں کتاب		۱۴/:
اردو کی آٹھویں کتاب		۱۴/:
بچوں کی پہلی		۳/:
اردو کی دوسری برائے دہلی		۱۰/:
// تیسری //		۱۲/:
// چوتھی //		۱۲/:
اردو خوشخطی	حصہ اول	۳/:
// //	حصہ دوم	۳/۵۰
// //	حصہ سوم	۳/۵۰
اردو خوش خطی	چہارم	۳/۵۰

حساب

کتاب		قیمت
حساب	درجہ دوم	۱۸/:
حساب	درجہ سوم	۱۸/:
حساب	درجہ چہارم	۱۸/:
حساب	درجہ پنجم	۱۸/:

طالبات کے لیے

کتاب	قیمت
ہمارا ملک بھارت	۶/:
بھارت اور سنسار	۶/:

نئی مطبوعات

قوام العقائد اردو ترجمہ (حالات وکرامات حضرت نظام الدین)
مترجم پروفیسر نثار احمد فاروقی ۴۰/-

کنواں آدمی اور سمندر (افسانوی مجموعہ) عوض سعید ۵۰/-

کہانی انکل (ناول) غضنفر ۴۰/-

آواز سرگوشیوں کی (افسانے) ویریندر پٹواری ۶۵/-

نگاہوں کے چراغ (ناول) عطیہ پروین ۴۵/-

خوابوں کا سویرا (ناول) عبد الصمد ۲۰۰/-

بیان اپنا (مجموعہ مضامین) سید حسن عباس رضوی مظفر ۴۰/-

تاریخ وفکر وفن (ادب) ڈاکٹر احسن نشاط ۴۴/-

قابوس نامہ (حکایات) ڈاکٹر شفیق اشرفی ۵۰/-

تعمیری ادبی تحریک افکار و مسائل (مقالات و اداریے)
پروفیسر احمد سجاد ۳۵/-

تسکین قریشی کلام اور خطوط کے آئینے میں ادبی جائزہ
مرتبین حکیم سیف الدین، ڈاکٹر حسین ماجد

آب شعری مجموعہ منظور ہاشمی ۴۰/-

دبستان عشق کی مرثیہ گوئی (تحقیقی مقالہ) ڈاکٹر جعفر رضا ۲۰۰/-

رقص صبا (شعری مجموعہ) جیا لعل دتا رفیق ۵۰/-

اسلامی ثقافت کی حفاظت (مذہب) جمال سلطان ۴۰/-

تاریخ تہذیب اسلامی عہد جاہلی، عہد نبوی (مذہب)
پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ۴۵/-

اوٹ پٹانگ (طنزیہ مزاحیہ) مختار ٹونکی ۶۰/-

کرشن چندر شخص اور ادیب (شخصی مضامین)
مرتبہ پروفیسر عبد الستار دلوی ۱۵۰/-

ہیلو ڈاکٹر (طب) ڈاکٹر وقار شیخ ۵۰/-

بنیاد مجلہ سہ ماہی یوسف ناظم نمبر مدیر سلطان علی خاں ۴۰/-

ذہن جدید شمارہ ۱۵ مجلہ ترتیب زبیر رضوی ۲۵/-

سرورق ـــــ رضوان اللہ

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

مولانا عبد الوحید صدیقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ: پروفیسر ردولوی

اردو کے بے باک اور حق شناس صحافی مولانا عبد الوحید صدیقی کی ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں ملک کے بزرگ صحافیوں اور اہل علم کی نگارشات کا مجموعہ۔ قیمت: ۵۱/- روپے

"آدمی نامہ" اور "سو ہے وہ بھی آدمی" کے بعد مجتبیٰ حسین کے شخصی خاکوں کا نیا مجموعہ

چہرہ در چہرہ

مجتبیٰ حسین نے بلاشبہ شخصی خاکہ نگاری کو ایک نیا اسلوب اور نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ اردو کی بیس اہم شخصیتوں کے باغ و بہار خاکے۔

قیمت ۵۷ روپے

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں

عبد القوی دسنوی

اس کتاب میں اردو کے گیارہ شاعر (اکبر، حالی، چکبست، سید سلیمان ندوی، پرویز شاہدی، فراق، ساحر، جاں نثار اختر، فیض اور مجروح) کی شاعری اور فن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

قیمت [illegible] روپے

مہمان مدیر
رضوان اللہ
۱۶۸- ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

اشاریہ

توجّہ طلب

اردو ادب کی مختلف اصناف بالخصوص غزل اور افسانوں پر خاصی تحقیقی اور تنقیدی کاوشیں کی جا چکی ہیں، اس حد تک کہ ادبی نگارشات کی منڈی میں یہ مال کساد بازاری کا شکار ہے۔ یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ مسلسل وسعت پذیر اردو دنیا میں کہاں کہاں کیا کیا کچھ ہو رہا ہے، لیکن اپنے وطن کی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا اصناف پر تحقیق کا میدان سمٹتا سمٹتا ستائش باہمی کے حصار میں آ گیا ہے۔ اس کیفیت کو سنبھالنا سدھارنا جن حضرات کی ذمّے داری ہے وہ جانیں۔ یہاں میرا مقصد اردو دنیا کے ان گوشوں کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے جو ہنوز تحقیقی کاوشوں اور توجہات کے طالب ہیں۔ میری مراد اردو صحافت کے مختلف پہلوؤں سے ہے۔

آزادی کے بعد سے ہندستانی صحافت پر عمومی طور سے اور اردو صحافت پر بالخصوص کچھ کام ضرور ہوئے ہیں لیکن ان کی نوعیت ابتدائی ہے یعنی تاریخ صحافت تک محدود ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس راہ میں اب تک کام کرنے والوں نے تحقیق و تنقید کے لیے خام مال فراہم کر دیا ہے۔ ایک بنیادی کام تو بلا شبہہ پہلے پریس کمیشن کی وہ رپورٹ ہے جو ہندستانی صحافت کی ابتدائی تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں اردو صحافت بھی جگہ پا گئی ہے۔ یہ پورے منظر کی عکاسی تو نہیں کرتی لیکن ایک نشانِ راہ ضرور ہے۔ پاکستان میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اسی تصنیف سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے "صحافت پاکستان و ہند میں" تصنیف کی۔ اسے اردو میں ایک رہنما کام قرار دیا جا سکتا ہے۔

ان بنیادی کاموں کے علاوہ دو خطوط پر کام ہوتے رہے ایک تو ہندستان گیر بلکہ برصغیر کے پیمانے پر جیسے کہ مولانا امداد صابری کی "تاریخ صحافت اردو" جسے ۱۹۴۷ء تک ہندستان میں شائع ہونے والے اخبارات و جرائد کی فہرست مرتب کرنے کی سعیِ بلیغ کہا جا سکتا ہے تاہم مولانا کو خود اعتراف ہے کہ یہ فہرست مکمل نہیں ہے اور اس سلسلے میں اکثر ان کا شکوہ خود ان صحافیوں سے ہے جنھوں نے ان سے تعاون

نہیں کیا۔ دوسرے مقامی یا علاقائی سطح پر کیے جانے والے کام ہیں، جیسے کہ حیدرآباد کی اردو صحافت، کرناٹک کی اردو صحافت یا مہاراشٹر کی اردو صحافت وغیرہ۔ ان دونوں دھاروں کو یکجا اور مرتب کرنے کا ایک بہت بڑا کام ہے۔ دراصل اس کے بعد ہی اصل نقشا سامنے آئے گا۔ جس پر آئندہ ٹھوس تعمیر ہوسکے گی لیکن جیسا کہ عرض کرچکا ہوں یہ محض تاریخی پہلو ہوگا فن اور ارباب فن سے متعلق بڑا اور دشوار گزار حصہ باقی رہے گا۔ اس راہ میں جو کچھ کام ہوا ہے وہ برائے نام اور تذکروں کی حد تک ہے وہ بھی محض معروف شخصیات کے تذکروں کی حد تک۔

ضمناً یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا امداد صابری کا کام مبسوط اور وقیع ضرور ہے لیکن تحقیقی کام کرنے والوں کو دونوں آنکھیں کھول کر قدم بڑھانا ہوگا۔ مثال کے طور پر کلکتہ میں "عصر جدید" کی اشاعت ۱۹۱۹ء میں شروع ہوئی لیکن مولانا نے اس سال آغاز اشاعت والے اخباروں کی جو فہرست مرتب کی ہے اس میں اخبار مذکور کا نام نہیں ہے۔ اسی طرح ۱۹۲۹ء میں کلکتہ ہی سے شائع ہونے والے اخبار "ہند" کا نام اس سال جاری ہونے والے اخباروں کی فہرست میں نہیں ہے۔ آگے چل کر ایک جگہ مولانا نے "عصر جدید" کلکتہ کے تین اڈیٹروں کے نام درج کیے ہیں، لیکن جہاں تک مجھے علم ہے ان میں سے کوئی بھی "عصر جدید" کا کبھی اڈیٹر نہیں رہا۔ ان تینوں ناموں میں سے ایک نام میرا بھی ہے لیکن جس زمانے کا ذکر ہے اس وقت میں "عصر جدید" کا نیوز اڈیٹر تھا نہ کہ اڈیٹر۔ معلوم نہیں مولانا کو ان کی تحریر کردہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں۔ اس طرح کی فرد گزاشتیں اور بھی ہوسکتی ہیں۔

گزشتہ سال دو قابل ذکر کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں۔ ایک تو جناب گربچن چندن کی تحقیقی کاوش "جام جہاں نما" ہے جس کا مقصد اردو کے اس اوّلین اخبار کی ادارتی پالیسی کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ہے۔ موصوف نے دستاویزی حوالوں سے یہ کام انجام دیا ہے۔ ان کی یہ تصنیف نئی جہتوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ دوسری کتاب "اردو ماس میڈیا" ہے۔ جسے پروفیسر فضل الحق، صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی نے ایم۔ اے کے بعد ایک سال کے "ڈپلوما ان ٹرانسلیشن اینڈ ماس میڈیا" کے طلبہ کے استفادہ کے لیے مرتب کیا ہے جو ایک نصابی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو اکادمی کے ایک سیمنار میں پڑھے گئے تھے۔ اردو صحافت کے فنی پہلوؤں پر یہ ایک اچھا لیکن ناکافی کام ہے۔ تاہم اس سمت میں جو اب تک تھوڑے بہت کام ہوئے ہیں ان میں اسے ایک قابل ذکر اضافہ کہا جاسکتا ہے۔

اردو اخبارات کی پالیسیوں پر تحقیقی کام تو سرے سے ہوا ہی نہیں۔ یہ کام ہے بھی بڑا دشوار۔ ادبی تحقیق کے لیے کتابیں لائبریریوں یا ذاتی کتب خانوں میں یا کتب فروشوں کے ہاں بہرحال مل جاتی ہیں لیکن اخبارات کے بنیادی وسائل تک پہنچنا جوئے شیر لانے

سے کم مشکل نہیں۔ اس کے بعد بھی کوئی محقق صرف اسی نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ کسی خاص موضوع پر زیر تحقیق اخبار یا اخبارات کی پالیسی کیا تھی وہ قطعی طور سے ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ متعلقہ اداری تحریر جو پالیسی کی نمایندہ یا مظہر ہوتی ہے اسی شخص کی ہے جس کا نام بحیثیت اڈیٹر چھپ رہا ہے یا جو مالکانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس معاملے میں کسی حد تک قطعی رائے اسی حالت میں قائم کی جا سکتی ہے کہ جب اداریے کے آخر میں لکھنے والے کے دستخط بھی ہوں جس کا عام رواج اردو اخباروں میں نہیں ہے۔ پنجاب اور پنجاب کے زیر اثر اردو اخبارات اس کیفیت سے مستثنیٰ ہیں یعنی ان کے اکثر و بیشتر اداریوں کے آخر میں لکھنے والے کے دستخط ہوتے ہیں۔ قطعی رائے قائم کرنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ جو اڈیٹر بقید حیات ہیں ان سے ذاتی طور پر رجوع کیا جائے اور معلومات حاصل کی جائیں۔ تیسری کم معتبر صورت یہ ہے کہ تحقیق کار نے کسی اداریہ نگار کے اسلوب اور زبان کا اتنا عمیق مطالعہ کیا ہو کہ عبارت کو پڑھ کر لکھنے والے کی شناخت اسی طرح کر لے جس طرح تحریر کے ذریعہ شناخت کی جاتی ہے۔

اس راہ میں ایک دو نہیں بہتیری پریشانیاں ہیں۔ اردو اخباروں میں کچھ تو وسائل کی تنگی کی وجہ سے اور کچھ روایتاً یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اڈیٹر ہمہ داں ہوتا ہے اور ہر موضوع پر قلم برداشتہ لکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح کی تحریریں سطحی اور کالم بھرنے والی ہوتی ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ اب اداریہ پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ آزادی سے پہلے اردو اخباروں کی اشاعت کا دارومدار بڑی حد تک اداریوں پر ہوا کرتا تھا۔ پڑھنے والے مختلف موضوعات پر جو عموماً سیاسی ہوا کرتے تھے، اپنے پسندیدہ اخبار کے اڈیٹر کی رائے معلوم کرنے کے منتظر رہا کرتے تھے۔

اب جملہ موضوعات پر خصوصی مہارتوں کا زمانہ ہے۔ اردو اخبارات پر لازم ہے کہ اردو میں ان موضوعات پر لکھنے والوں کا با معاوضہ تعاون حاصل کریں، اس سے کئی فائدے ہوں گے۔ پڑھنے والوں کو اپنی زبان میں تازہ اور معلومات افزا مواد ملے گا۔ نئے نئے موضوعات پر لکھنے والے سامنے آئیں گے اور اردو اخبارات کی اشاعت پر خوشگوار اثر پڑے گا۔

تحقیق کا ایک دلچسپ موضوع یہ ہو سکتا ہے کہ اردو اخبارات اپنی گنجائش کا کس قدر حصہ کن موضوعات پر صرف کرتے رہے ہیں۔ اس طرح کی کسی تحقیق کے نتائج یقیناً حیرت خیز ہوں گے۔ کیونکہ ان اخباروں کی گنجائش کا بہت بڑا حصہ نسبتاً غیر اہم اور غیر ضروری باسی خبروں اور اقتباسات سے پُر نظر آئے گا۔ خبروں کی ایڈیٹنگ ایسی مفقود ملے گی گویا اخبار نویسی میں اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ پروف کی بے شمار اور کہیں کہیں بہت دلچسپ غلطیاں ملیں گی۔ اردو اخباروں کی ایک خصوصیت یہ بھی نظر آئے گی کہ بین اقوامی حالات و واقعات پر نسبتاً بہت زیادہ جگہ اور توجہ صرف کرتے ہیں اس کی بڑی وجہیں

دو رہی ہیں ایک تو عالم اسلام کے حالات وواقعات سے تاریخی وابستگی اور دلچسپی دوسرے سلطنت برطانیہ کی عالمگیر کارفرمائیاں۔

لیکن کسی تحقیق کا اہم ترین موضوع جنگ آزادی میں اردو صحافت کا رول ہے۔ اس موضوع پر وقتاً فوقتاً جا بجا مضامین آتے رہے ہیں لیکن کوئی مبسوط اور ہمہ گیر کام ہنوز باقی ہے۔ ہمارے حالات اس امر کے متقاضی ہیں کہ یہ کام پوری تن دہی کے ساتھ کیا جائے بلکہ اردو صحافت کے اس رول پر دوسری زبانوں بالخصوص انگریزی اور ہندی میں کام پر حوصلہ افزائی بہت مفید ہوگی۔ تاکہ اردو صحافت کے رول اور اردو صحافیوں کی قربانیوں سے دوسرے بھی آشنا ہوں جن کی آنکھوں پر عدم آگہی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ کام کون کرے اور کیسے کرے۔ ہندستان میں کم سے کم ایک درجن اردو اخبارات ضرور ایسے ہیں جو سال میں ایک یا دو سال میں ایک تحقیق کی سرپرستی اور اعانت کر سکتے ہیں۔ ان کو خود اپنے کاروباری مفاد کی خاطر اس راہ میں قدم بڑھانا چاہیے۔ اپنے علاقے کی یونی ورسٹیوں کے اردو ڈپارٹمنٹ سے رجوع کرنا چاہیے۔ جرنلزم ڈپارٹمنٹ سے بھی رابطہ قائم کرکے اس طرح کی تحقیق کا مشورہ دیا جا سکتا ہے اور مالی تعاون کی پیش کش سے اس کی حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے۔ ایک بار توجہ شرط ہے پھر راہیں تو خود بخود نکلتی جاتی ہیں۔

اردو دنیا میں ایسے دیگر افراد اور اداروں کا بھی قحط نہیں ہے جو مفید تحقیق کی سرپرستی کر سکیں بات صرف انھیں متحرک کرنے کی ہے۔ اس پر کسی ایک مشاعرے سے یقیناً کم خرچ آئے گا۔ تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ اور ان کے اساتذہ تحریک پیدا کرنے کا کام اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔ بس توجہ شرط ہے

شاید کہ اتر جائے "کسی" دل میں مری بات

ڈاکٹر صمد انصاری
غنی لاج ۱۲/۱-ای ۴
ناظم آباد۔کراچی، پاکستان

مرے چراغ میں لَو بھی نہیں دُھواں بھی نہیں
مرے نصیب میں اب سعیٔ رائیگاں بھی نہیں
اُتر گئی ہیں نظر سے بلندیاں ساری
جو تھا ازل سے زمیں پر وہ آسماں بھی نہیں
کہاں سے لائیں ستارے کہاں جلائیں چراغ
وہ طاق شب بھی نہیں بزم کہکشاں بھی نہیں
زمیں بہشت ہوئی جس کی اک تلاوت سے
کسی زبان پہ وہ حرفِ مہرباں بھی نہیں
بدل گیا ہے زمانہ نئے قرینوں میں
جو ناگہاں تھا کبھی اب وہ ناگہاں بھی نہیں
بنائیے مجھے عنوان نہ اب افسانوں کا
میں داستاں بھی نہیں زیب داستاں بھی نہیں
سلامتی کی دعائیں خدا سے مانگے کون
وہ خواجگاں بھی نہیں ختم خواجگاں نہیں
ہے لمحہ لمحہ تکلم کنار خاموشی
اگرچہ شب کے دہن میں کوئی زباں بھی نہیں
سنور تو جائے صمد زخم نوک پیکاں سے
مگر وہ دوش کہ جس دوش پہ کماں بھی نہیں

سیّد بشارت علی
سوریہ پیٹ، ضلع نلگنڈہ
اے پی

کچھ ہے تو سلسلہ ہے

اک ڈور کا تسلسل باندھے ہوئے ہے ہم کو
ان سے بھی جن کی ہستی اب نیستی سے کم ہے
وہ خاک جس نے ہم کو یہ رنگ روپ بخشا
اس کو کہ سے ہی اک دن وہ بھی کبھی آ گئے تھے
مقدور جس قدر تھا قدموں سے روندا ہے
جب تھک کے رہ گئے تو پھر خاک ہی کی صورت
پھر خاک کی تہوں میں اک روز جا سمائے

مٹی کا چاک یونہی گردش لگا رہا ہے
جو صد ہزار صدیاں گزریں گی تب ڈھلیں گی
کتنی ہی نادیدہ شکلیں نہاں پڑی ہیں

موجود ہم ہیں جب تک اک خواب رفتگاں ہیں
آئندگاں بھی سارے وہم و گماں سے کم تر
جن کے لیے ہم اک دن خواب و خیال ہوں گے
کچھ ہے تو سلسلہ ہے وہ اور ہم تو کیا ہیں
لیکن نہ ہم ہوئے تو پھر سلسلہ کہاں ہے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

پتھر کی دیوار سردار جعفری

"پتھر کی دیوار" سردار جعفری کی جیل کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ اس فصل بہار کا ثمر ہے جو اقبال اور جوش کے بعد اردو شاعری کا مزاج بدل رہی تھی۔ (پاکٹ اڈیشن) قیمت ۱۵/- روپے

وسط ایشیا نئی آزادی، نئے چیلنج

آصف جیلانی

سابق سوویت یونین کی نو آزاد مسلم جمہوریاؤں کے سفر کے تجربات و مشاہدات پر مبنی، بی۔ بی۔ سی لندن کی اردو نشریات سے نشر ہونے والے سلسلہ وار پروگراموں پر مشتمل ایک دستاویز۔ قیمت ۵۱/- روپے

معیار اردو مرتبہ: نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

یہ کتاب زبان اردو کے محاورات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے طلبہ اور ریسرچ اسکالر محاورات کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ قیمت ۲۱/- روپے

مغیث الدین فریدی: شخصیت اور ادبی خدمات

مرتبہ: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

یہ کتاب نما کا خصوصی شمارہ ہے اس میں فریدی صاحب کی شخصیت، شاعری، تاریخ گوئی اور تضمین نگاری پر اردو کے نامور ادیبوں نے اپنے بہترین خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قیمت ۴۵/- روپے

تذکیر و تانیث نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

جانشین امیر مینائی حافظ جلیل نے اس قیمتی کتاب کے ذریعے زبان اردو میں تذکیر و تانیث کا ایک قانونی مدون کیا ہے۔ اس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث بتائی گئی ہے اہل اردو کے لیے ایک قیمتی تحفہ۔ قیمت 75/-

اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ

ابراہیم یوسف

اس مجموعے میں اردو ڈرامے کی تنقید کے محرکات اور رجحانات جو ابتدا سے تا حال کارفرما رہے ہیں۔ جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۴۵/- روپے

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج (خطبات)

ڈاکٹر سید ظہور قاسم

ڈاکٹر سید ظہور قاسم کی تحقیق کا میدان بحریات ہے آپ بحر منجمد کی علمی مہم کے پہلے سربراہ رہے ہیں ان خطبات میں اس پر اسرار ارضی خطے کی دلچسپ داستاں بھی ہے اور سائنس کے مختلف شعبوں میں بتدریج ترقیوں کا تجزیہ بھی۔ قیمت ۱۴/- روپے

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم اختر الواسع

پروفیسر اختر الواسع نے ۱۸ جون ۱۹۹۱ کو انجمن اسلام بمبئی کی دعوت پر معین الدین حارث یادگاری سیرت لیکچر کے سلسلے میں مندرجہ بالا عنوان کے تحت جو خطبہ پیش کیا تھا۔ اسے اب کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ قیمت ۱۰/- روپے

تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات

ڈاکٹر سید جمال الدین

زیر نظر کتاب میں اردو کے قاری کو ۹ بلند پایہ مورخین اور ان کے فن تاریخ نگاری سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ان میں یونان، عرب، جرمنی، برطانیہ اور ہندوستان کے مورخین شامل ہیں۔ قیمت ۵۱/- روپے

(پروفیسر) ضیاء الحسن فاروقی
۲۸۹ - ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اسلامک موڈرن ازم

(سرسیّد اور علی گڑھ کے حوالے سے)

پروفیسر کینٹویل اسمتھ نے ۵۵-۱۹۵۴ کے علی گڑھ میگزین کے خاص نمبر میں علی گڑھ سے ایک سوال کیا تھا جو ہمارے نزدیک آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ وہ کل تھا۔ سرسیّد نے جب اپنے کالج کی دینی تعلیم میں عقلیت کو خیرباد کہہ کر روایت سے سمجھوتہ کر لیا اور جدید علوم کی تعلیم کے لیے انگریزی کو اور دینیات کی تعلیم کے لیے اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا، تو سوال یہ ہے کہ کیا اس تفریق سے علی گڑھ تحریک پر ایک ایسا نفسیاتی اثر نہیں مرتب ہوا جس کے نتیجے میں علی گڑھ والوں میں "مذہب سے عقلی نہیں بلکہ محض جذباتی وابستگی پیدا ہوئی؟" کیا اس سے یہ نہیں ہوا کہ دینی تعلیم اور دنیوی تعلیم ایک دوسرے سے بیگانہ رہی اور ہندستانی مسلمان عصرِ حاضر میں ایک نئے علمِ کلام کی تشکیل میں ناکام رہے جس کی کہ انھیں اشد ضرورت تھی؟ آخر میں اس معذرت کے ساتھ کہ یہاں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان سے "کسی طرح یہ اشارہ مقصود نہیں ہے کہ علی گڑھ میں دینیات کی تعلیم بجائے خود ناقص رہی ہے... ہمارے لیے اصل سوال وہ بے رابطگی (یا عدم تعلق) ہے" جو دینیات کی تعلیم اور "دوسرے علوم میں رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس تفریق کے نتائج اچھے رہے ہوں۔ میرا سوال تو یہ ہے کہ وہ کیا نتائج ہیں؟"

پروفیسر اسمتھ سے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ کو اپنے طالب علموں کی دینی تعلیم کا انتظام تو بہرحال کرنا تھا اور اس وقت کے علی گڑھ میں، (اور شاید بعد میں بھی) دینیات کی تعلیم اردو زبان کے علاوہ اور کسی زبان میں دی بھی نہیں جا سکتی تھی، اس لیے کہ دینی تعلیم وہی مستند اور معتبر قرار پاتی جس کی پوری ذمہ داری علما کے ہاتھ میں ہوتی اور علما کے لیے انگریزی زبان میں دینی تعلیم کا انتظام ممکن نہ تھا۔ لیکن، علوم اور ان کی درس و تدریس کے ایک ہی گہوارے میں، یعنی کالج یا یونی ورسٹی کے ایک ہی کیمپس میں دینیات اور جدید علوم کی تعلیم و تحقیق کے مابین کسی قسم کا ربط نہ ہونا، ایک اہم اور غور طلب بات ہے۔ ہماری رائے میں علی گڑھ والوں کو پروفیسر اسمتھ کے اس سوال کا جواب خود دینا ہی چاہیے تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ ابھی تک علی گڑھ میں اس سلسلے میں غور و فکر کا آغاز بھی نہیں ہوا ہے۔

سرسید کا نصب العین قوم کی نشأۃ ثانیہ تھا اور اس کے حصول کا خاص ذریعہ تعلیم تھی، یعنی تعلیم کے وسیلے سے مسلمانوں کی مذہبی اور سماجی اصلاح کا مشکل کام انجام دیا جا سکتا تھا لیکن یہ سوال بہرحال قائم رہتا ہے کہ مغربی طرز کے صرف ایک کالج کے قیام پر قناعت کر لینا کیا ایک ایسی راہ کا انتخاب نہ تھا جس میں کم سے کم ڑکاوٹیں ہوں۔ ایم۔ اے۔ او کالج، علی گڑھ، کے نامور فرزند ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے ہوسٹل صاحب باغ کے کمرے میں بیٹھ کر ایک مضمون لکھا تھا جو علی گڑھ میگزین (مارچ اگست ۱۹۲۶ء) میں چھپا تھا۔ انھوں نے اپنے قارئین سے پوچھا تھا کہ کیا انجام کار سرسید کی قومی نشأۃ ثانیہ کی عظیم کوشش لائق ماتحت منتظمین کے پیدا کرنے کی مشین میں تبدیل ہو کر نہیں رہ گئی تھی؟ اور کیا یہ بات "مضحکہ خیز" اور اس بات کے مترادف نہ تھی کہ "پہاڑوں کی کوکھ سے، بلکہ یوں کہیے کہ ایک قوم کی کوکھ سے جو پہاڑوں سے زیادہ عظیم اور شان دار ہوتی ہے، ایک چوہا جنم لے اور... ستم ظریفی یہ کہ ساتھ ساتھ، موسم بے موسم، سماجی اور مذہبی حیاتِ نو کے اعلا مقاصد کی رٹ بھی لگائی جاتی رہے۔" ذاکر صاحب نے لکھا تھا:

"سرسید اور ان کے بعض رفقا، بلاشبہ اس زمانے کی سماجی برائیوں کے خلاف بڑی بہادری سے لڑے اور مذہب کے بارے میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر بدلنے کی مسلسل کوشش کی۔ اُن کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب رہی اس کا اندازہ وہ لوگ خوب کر سکتے ہیں جن کی نظر اپنے گرد و پیش پر رہتی ہے۔ سماجی اصلاح کا ترجمان یا مشہور اور یادگار رسالہ 'تہذیب الاخلاق' بند ہو گیا اور شاید اس کے ساتھ اس کا کام بھی ختم ہو گیا... (اور پھر) علی گڑھ کے کسی فرزند نے سماجی اصلاح کے اس نہایت اہم کام کے لیے نہ صلاحیت کا اظہار کیا، نہ میلان کا۔

"ایسے لوگ معقول تعداد میں کبھی نہیں رہے جنھوں نے مذہبی افکار میں سرسید کے ساتھ اتفاق کیا ہو۔ طلبائے علی گڑھ کی پچھلی نسلیں شاید اس سے مستثنٰی ہوں لیکن ان کے بارے میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اس مصلح نے ترجمانی مذہب کے معاملے میں جن لبرل خیالات اور مذہبی رواداری سے کام لیا اس کو انھوں نے مذہب سے اپنی بے پروائی کے واسطے ایک سہل جواز کے طور پر تو استعمال نہیں کیا۔ آج کے علی گڑھ کے متعلق اگر کوئی صحیح بات کہی جا سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ اسے اپنے بانی کے خیالات کے مذہبی پہلو سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔[1]

سرسید میں جامعیت تھی، لیکن حالی اور شبلی نے ان کی شخصیت کے اس رنگ کو بہت زیادہ چوکھا کر دیا جو عبارت تھا آثار الصنادید اور عظمت رفتہ کی گرویدگی سے۔ انھوں نے عظمت ماضی کے گیت کچھ اس لے میں گائے کہ مسلمانوں میں ایک طرح کی مذہبی روحانیت

۱۔ ضیاء الحسن فاروقی (مرتب) "ذاکر صاحب اپنے آئینۂ لفظ و معنی میں"، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۸۷ء، ص ۷۷-۷۶

نے جنم لیا جس نے اگر ایک طرف سرسید کی شخصیت کے اصلی رنگ یعنی ان کی عقلیت اور جدید طرزِ استدلال کو مجروح کیا تو دوسری طرف مسلمانوں میں تقلیدی رجحان کو مزید تقویت بخشی اور نتیجتاً سرسید کا ایک نئے علم کلام کا خواب آج تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ علم کلام سے متعلق شبلی کی تحریریں پرانی تیلیوں سے ایک نئی چلمن بنانے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں۔ ادھر بعد میں اقبال نے اپنے لیکچرز میں جو انگریزی میں تھے جن علمی مسائل اور کلامی مباحث کو ابھارا وہ عام طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی دسترس سے باہر تھے، اور علما جدید علوم کی فلسفیانہ اور علمی اصطلاحوں اور طرزِ فکر و استدلال کے ایک اجنبی زبان میں ہونے کے سبب ان لیکچرز سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ مزید برآں اس وقت کے حالات میں مسلمان نہ تو تقلیدی تصورات کے روایتی، تاریخی اور فقہی تلازموں سے اوپر اٹھ کر پورے عالمِ انسانیت کی طرف دیکھ سکتے تھے اور نہ ان میں اپنے آپ کو جانچتے رہنے کا جذبہ ہی تھا۔ ان کے علما اور دانشوروں نے انسان سے متعلق، شاعرِ اقبال کے ذہن تک اپنے آپ کو محدود رکھا اور مفکرِ اقبال کے اجتہادی فکر کے تقلید شکن امکانات سے جو سرسید کی روایت کا ایک عالمانہ تسلسل تھا، فائدہ نہیں اٹھایا۔

قرآن کریم میں ایمان کے ساتھ ہی عمل صالح کا ذکر ملتا ہے اور تکرار و تاکید کے ساتھ ملتا ہے اور عمل صالح نام ہے زہد و تقوا کی نجی زندگی کے دائرہ کو وسیع کر کے سماجی زندگی کو اچھے اور نیک کاموں سے معمور کر دینے کا۔ اس طرزِ فکر سے کہ ہمیں صرف اپنی نجات کی فکر کرنی چاہیے، ہماری زندگی اخلاقی اور روحانی لحاظ سے بنجر بن کر رہ جا سکتی ہے۔ اعلیٰ معیار کی عبادت وہی ہے جو متعدی ہو یعنی جس سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔ سرسید نے عمل صالح یعنی اچھے اور نیک کام کی اہمیت جتا کر اور اس تصور کو ٹھوس شکل دے کر مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں حسن اور معنی پیدا کرنا چاہا تھا۔ قرآن و حدیث کے ایسے مطالعے سے جس سے یہ حقیقت کھلے کہ نیک زندگی کیا ہے اور عالمِ انسانیت کی نجات و فلاح سے اس کا کیا تعلق ہے، ایک اچھے مسلمان کو اپنے تمام بھائی انسانوں کی حالت کو بہتر بنانے کی توفیق اور حوصلہ ملتا ہے۔

سرسید کے مخالفوں کی طرح ان کے حامیوں نے بھی ان کے مذہبی فکر کے اس تہذیبی و اخلاقی پہلو کو نظر انداز کیا، اسی لیے غالباً ذاکر صاحب کی یہ بات بڑی حد تک صحیح تھی کہ "علی گڑھ اتنا مذہبی نہیں جتنا اسے ہونا چاہیے۔" دوسروں کی حالت سدھارنے کے لیے کچھ کر جانے کے مخلصانہ جذبے اور جوش سے کرنے والوں کو اسی وقت فیضان اور حوصلہ ملتا ہے "جب یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہمارا کام عالمِ فطرت اور ابدی قوتوں کے تقاضوں کے مطابق اور ہمارا منصوبہ عالمِ انسانیت کی نجات کے ایک بڑے منصوبے کا حصہ ہے۔"[1] سرسید نے

۱۔ ایضاً، صفحہ ۷۹۔

چاہا تھا کہ وہ مسلمانوں میں کچھ اسی طرح کا سچا مذہبی جذبہ پیدا کریں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں اور بالخصوص علی گڑھ والوں کی مذہبیت نے ایسے کتنے افراد پیدا کیے جن کی آنکھیں، سرسید کی آنکھوں کی طرح، آنسوؤں سے بوجھل اور جن کے دل، سرسید کے دل کی طرح، زخموں سے چور ہوں۔؟

اقبال نے "سرسید کی لوح تربت" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں "معلم دین" "مدبر" اور "صاحب خامۂ معجز رقم" کو سید کی طرف سے کچھ ہدایتیں ہیں۔ اقبال نے اپنے شعر سے سونے والوں کو جگایا اور آزاد نے معلم دین کی حیثیت سے قرآن کریم کے عالم گیر پیغام کی بڑے دلنشیں انداز میں توضیح و تشریح کی۔[1] مولانا آزاد نے سرسید کی طرح قرآن کریم کو عقیدہ و ایمان کی اصل اساس کے طور پر پیش کیا۔ ان کے فکر کی تابانی اسی نور سے مستعار تھی۔ سرسید ہی کی طرح وہ دین کی روایتی تشریحات سے مطمئن نہ تھے، اس لیے دین و مذہب کے معاملات میں وہ آزادی کے ساتھ غور و فکر اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنی راہ خود متعین کر سکتے تھے۔

ترجمان القرآن میں مولانا کا مذہبی فکر اپنے عروج پر ہے۔ یہ فکر وسیع اور جامع ہے۔ انھوں نے زندگی اور کائنات کی حقیقتوں سے بحث کی ہے اور جو نتیجے انھوں نے نکالے ہیں وہ واضح، معقول اور اطمینان بخش محسوس ہوتے ہیں۔ سرسید کی تفسیر قرآن کے برخلاف ترجمان القرآن میں اعتذار کا کوئی رجحان نہیں ملتا اور یہ بھی نہیں کہ قرآن میں جن باتوں کا ذکر نہیں انھیں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ لکھتے وقت ان کا خطاب مغرب یا مشرق کے کسی مخصوص طبقے سے نہ تھا۔ ترجمان ہر قسم کے خارجی ملحوظات و مصالح کی آمیزش سے پاک مولانا کی فراست ایمانی اور گہرے روحانی تجربے کی دین ہے۔

اصل علی گڑھ تحریک وہ نہ تھی جو ہمیں سرسید اور علی گڑھ پارٹی کے سیاسی خیالات کے روپ میں ملتی ہے اور جس سے مولانا آزاد نے مکمل کر اختلاف کیا۔ اصل علی گڑھ تحریک مذہبی اور تہذیبی تھی۔ یہ تحریک یہ چاہتی تھی کہ مسلمان مذہب اور تہذیب کے معاملے میں

۱۔ ایک مدبر کی چشم باطن کے لیے سید کی لوح تربت پر یہ اشعار کندہ تھے:

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا ہے دلیری دست ارباب سیاست کا عصا
عرض مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوت فرمانروا کے سامنے بیباک ہے

مولانا آزاد نے سید کی اس ہدایت پر آخر دم تک عمل کیا، اور اس میدان میں وہ علی گڑھ کے اس "عظیم مرد پیر" سے کہیں آگے نکل گئے۔ لیکن یہاں اس بحث کو چھیڑنا بے محل ہو گا۔

لید کی اندھیاریوں سے نکل کر مجتہدانہ بحث و نظر کی روشنی میں آئیں، اور اس سلسلے میں اُن
متورات سے دامن چھڑا کر جو تہذیب اور مذہبی زندگی میں حرکت کے اصول کے منافی ہیں، اپنے
بادی عقائد میں مضبوط اور مستقیم الاحوال رہتے ہوئے، عصرِ حاضر کے تقاضوں کا سامنا کریں۔
ب نقطۂ نظر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مذہب اور تہذیب دو بالکل الگ چیزیں ہیں، اور ہم مسلمان
ہتے ہوئے کسی اور تہذیب کو اپنا سکتے ہیں۔ لیکن یہ مغالطہ ہے اور یہ جتنی جلدی دور ہو
ائے اچھا ہے۔ ہمارے خیال میں ہر بڑی تہذیب میں، کسی نہ کسی حد تک، عقل کے ساتھ جذبات
ور حسّی تجربوں کے ساتھ باطنی واردات کا بھی عمل دخل ہوتا ہے اور تہذیبِ اسلامی تو اپنی
اخت وار تقا میں ' انفس و آفاق ' دونوں کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کی رہین منت رہی
ہے۔ ' انفس ' کو ہم اقبال کی زبان میں مشاہداتِ باطن اور ' آفاق ' کو عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ
ہہ سکتے ہیں۔ علم کے یہی تین سرچشمے ہیں جن سے تہذیبیں سیراب ہوتی رہی ہیں۔ اتفاق
مانہ سے بعض قدیم تہذیبوں میں علم کے ان سرچشموں کے صاف و شفاف سطح آب پر داہیات
وہام، رسم و رواج اور مظاہر پرستانہ عقائد کی کائی کی موٹی پرتیں جم گئیں، اور جدید مغربی
تہذیب میں ان سرچشموں سے فیض یاب ہونے میں اس توازن سے کام نہیں لیا گیا جو خیر
حسن اور عدل کی علامت ہیں، خاص طور پر یہ کہ اس تہذیب میں مشاہداتِ باطن کو وہ
ہمیت نہیں دی گئی جس کے بغیر تہذیبیں اپنے حقیقی کمال کو نہیں پہنچ سکتیں۔
ہمارے خیال میں علی گڑھ کی کمزوری یہ تھی کہ اس نے جدید تہذیب کو بغیر کسی تنقید
ور جانچ کے اپنا لینا چاہا، اگرچہ اس کے بانی نے تعقل و تفکر کی راہ دکھادی تھی جس پر اگر
ستقامت کے ساتھ غور و فکر کا سلسلہ جاری رہتا تو تعلیم یافتہ مسلمانوں کی علمی زندگی میں
قدیم و جدید کی وہ تفریق پیدا نہ ہوتی جو انجام کار تہذیبِ اسلامی کی حقیقی نشأۃ ثانیہ کی
راہ کا سنگِ گراں بن گئی۔ اقبال نے مسلمانوں کے اس تہذیبی بحران کا راز پا لیا تھا۔
لیکن دیگر اسباب کے علاوہ جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، سیاست کی ہنگامہ
آرائیوں میں اقبال کا مذہبی فکر دب کر رہ گیا اور مولانا آزاد کے مذہبی و تہذیبی فکر کو
جو اصل علی گڑھ تحریک کی توسیع تھی، علی گڑھ نے اس لیے قبول نہیں کیا کہ سیاست میں ان
کا مسلک علی گڑھ والوں سے مختلف تھا۔ ہندستانی مسلمانوں کا یہ بڑا المیہ ہے کہ ان کا تعلیم
یافتہ متوسط طبقہ جس کی سیاسی قیادت کو ایک خاص مرحلہ پر علما اور صوفیہ کی ایک بڑی
تعداد نے تسلیم کر لیا تھا، مذہبی معاملات میں تو قدامت پرست رہا لیکن تعلیم و تہذیب میں
اس نے یہ حوصلہ کیا کہ ترقی پسند کہلائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستانی مسلمانوں کے اس طبقے
کی اجتماعی شخصیت میں جسے قائدانہ کردار ادا کرنا تھا، ایک قسم کا دورُخا پن پیدا ہو گیا
جو آج تک ان کی مذہبی، تہذیبی اور سیاسی، غرض پوری اجتماعی زندگی کا اہم مسئلہ
بنا ہوا ہے۔
علی گڑھ تحریک کے اُس دور سے لے کر جب سرسید کی فکری حوصلہ مندیاں اپنے

نصاب پر تھیں، ۱۹۴۷ء تک برطانوی سامراج کی سیاسی مصلحتوں، جدید تعلیم کے ثقافتی اثرات
ور عیسائی مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیوں کی وجہ سے مذہبی اور تہذیبی سطح پر ہندستانی مسلمان
فاعی پوزیشن میں رہے۔ سرسید نے سامراج سے صلح کرلی تھی، جدید تعلیم و تہذیب کو قبول
کر لینے کی ترغیب دی تھی، مسلمانوں کو ان کی عظمت رفتہ کی یاد دلاکر ان میں خود اعتمادی
پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اور مستشرقین اور عیسائی مشنریوں کی فکری جارحیت کے جواب میں
زبان و قلم سے بہت کچھ لکھا اور کہا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سامراج کے ہر آن بدلتے
مصالح اور ہندو نشأۃ ثانیہ کے ابھرتے اور بسا اوقات جارحانہ عزائم نے بنیادی طور پر مسلمانوں
کو جو اس ملک میں اقلیت میں تھے، دفاعی پوزیشن ہی میں رکھا، اور جیسا کہ قانون فطرت
ہے، مسلسل اس پوزیشن میں رہ کر اکثر ملتوں اور جماعتوں کی اقدامی صلاحیت کو ابھرنے
اور بار آور ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

۱۹۴۷ء کے بعد آزاد ہندستان نے دستوری حکومت، سیکولر جمہوریت اور سوشلسٹ
طرز کی معیشت کے اصولوں پر اپنی حیاتِ نو کی تعمیر کا منصوبہ بنایا۔ امید تھی کہ اب ایسے
آزاد اور جمہوری ماحول میں جہاں اظہار خیال پر نہ اپنوں کی بے جا پابندیاں ہوں گی اور
نہ دوسروں کی موقع بے موقع اور غیر ضروری دخل در معقولات کی کوششیں، ہندستانی
مسلمانوں کو تجدید و اصلاح کا کام کرنے کا موقع ہوگا۔ لیکن جلد ہی اکثریت کی سیاسی
و تہذیبی جارحیت نے مسلمانوں کو ایک ایسی دفاعی پوزیشن میں لا کھڑا کر دیا جہاں انھیں
زندگی کی ہر سطح پر اپنی حفاظت آپ کرنے کا مشکل کام انجام دینا تھا، اور اب تو یہ کام
روز بروز اور مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں، اس صورتِ حال میں
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا رہنا ہے، یا اپنے فکر و عمل سے تجدید و اصلاح کا وہ کام جو رک
گیا ہے، اسے آگے بڑھانا ہے۔ انیسویں صدی کے آخری دہوں میں علی گڑھ نہ صرف مسلم
نشأۃ ثانیہ کا بلکہ ملک میں عمومی حیاتِ نو کا مرکز تھا، سرسید کے بعد رفتہ رفتہ علی گڑھ تحریک
کے مذہبی و تہذیبی عناصر مضمحل ہوتے گئے، اور آج وہ علی گڑھ تحریک تاریخ کا ایک
باب ہے اور بس، لیکن مسلمانوں کو جو علی گڑھ کو اپنا دھڑکتا ہوا دل کہتے ہیں، موجودہ
صورتِ حال میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، یہ تو سوچنا ہی ہوگا کہ آج بیسویں
صدی کے اس آخری دہے میں علی گڑھ کہاں تک فکر و نظر کی دنیا میں، خواہ یہ مذہبی
فکر کی دنیا ہو، خواہ تعلیمی و تہذیبی فکر کی دنیا، مسلمانوں کی رہنمائی کا کام انجام دے
رہا ہے اور کس حد تک وہاں اس اہم اور مہتم بالشان کام کے امکانات ہیں۔

پروفیسر نعیم احمد
شعبۂ اردو، علی گڑھ یونی ورسٹی۔ علی گڑھ

اردو زبان اور قومی زبان کے بارے میں

گاندھی جی کے نظریات

قومی تحریک کی تاریخ میں گاندھی جی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سیاست کو عوام کے مسائل، ان کے جذبات، ان کی مرادوں اور امنگوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے عوامی خدمت میں ایک کیف پیدا کیا۔ عوام دوستی اور عوامی خدمت کو انھوں نے مذہب و ملت کی سطح اور حدوں سے بالاتر قرار دیتے ہوئے اس میں سرشاری پیدا کی جو سود و زیاں اور پسند ناپسند سے بلند ہوتی ہے۔

قومی تحریک کے جوار بھاٹا کے لیے فرقہ پرستی سب سے خطرناک زیر آب چٹان کے روپ میں نمودار ہوئی۔ اس کی علمبردار قوتوں نے جو استحصال شروع کیا، گاندھی جی نے اس کے سیاسی مضمرات کا بخوبی اندازہ لگایا۔ انھوں نے قومی وحدت کی بقا کے لیے صرف اخلاقیات پر زور نہیں دیا۔ اسے انھوں نے اپنے سیاسی ایجنڈے میں شامل کیا۔ گاندھی جی نے اس حقیقت پر زور دیا کہ کسی انسانی گروہ کو کسی بھی بنیاد پر اس کے حقوق یا اقتدار میں اس کے حصّے سے محروم کر کے نہ تو فرقہ پرستی کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی قومی وحدت پروان چڑھائی جا سکتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ عوام کے تمام حصّوں کو اقتدار میں شریک کیا جائے۔

گاندھی نے قومیت، قومی تہذیب اور قومی زبان کی تعریف اور اس کے پرچار کو اس سیاسی ایجنڈے میں سر فہرست رکھا۔ گاندھی جی مذہب کو قومیت کی بنیاد ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ مذہبی عقائد و خیالات و جذبات کی بنا پر تفریق کے قائل نہیں تھے اور ہندو و مسلمان کے مابین ظاہری فرق کو بناوٹی قرار دیتے تھے گاندھی جی کسی نسل کے خالص ہونے کے نظریہ یا اس کے زمانی و امکانی اعتبار سے قدیمی ہونے کی بنا پر کسی امتیازی حق کے مستحق ہونے کے خیالات کے بھی سخت مخالف تھے۔ وہ نسل کی بنا پر تہذیب و ثقافت کے تعین یا تشکیل کے نظریات کو

بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ ہندستان میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جسے آریائی تمدن یا ثقافت کہا جاسکے۔ اسی طرح وہ تہذیبی وثقافتی علاحدگی پسندی کو بھی غلط قرار دیتے تھے۔ گاندھی جی گنگا جمنی تہذیب وثقافت کے علمبردار تھے اور مذہبی، تہذیبی، ثقافتی اور لسانی کثرت کے قومی یک جہتی میں حارج نہ ہونے کے نظریہ کے حامل تھے۔

گاندھی جی کے یہی خیالات ان کے قومی زبان کے نظریہ میں بھی کارفرما ہیں۔ انھوں نے بار بار، دسیوں برس تک اس نکتے پر زور دیا کہ کوئی ایک زبان یا رسم الخط تھوپ کر قومی وحدت اور یک جہتی پیدا نہیں کی جاسکتی۔ وہ صرف ہندی کو قومی زبان، دیوناگری کو واحد رسم الخط بنانے اور اردو زبان اور اس کے رسم الخط کو قومی زبان کے دائرے سے خارج کر دینے کے سخت مخالف تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ ہندی اردو کو قومی زبان ہونا چاہیے۔ گاندھی جی نے ہندی کی تعریف جا بجا ان لفظوں میں کی ہے:

> "میں ہندی اس زبان کو کہتا ہوں جو اُتر کے ہندو اور مسلمان بولتے ہیں، چاہے وہ دیوناگری میں لکھی جائے یا اُردو لکھاوٹ میں۔"

گاندھی جی اُردو کو کسی خاص مذہبی گروہ کی زبان قرار دیے جانے کو حقیقت کے بالکل برخلاف قرار دیتے تھے۔ وہ اردو کی ہمہ گیری اور اس کے کسی خاص مذہب یا علاقے سے بالاتر ہونے پر زور دیتے تھے۔ اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے انھوں نے بڑی قطعیت کے ساتھ اردو کے ہمہ گیر زبان ہونے کی حقیقت تسلیم کرنے کے لیے کہا تھا:

> "ابھی تک صرف اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو کسی ایک صوبے یا فرقہ تک محدود نہیں رہی ہے... اُردو پنجاب، دہلی اور کشمیر میں بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔"

گاندھی جی نے آزادی سے صرف چھے ماہ قبل بھی اس حقیقت پر زور دیا۔ یہ کارنامہ انھوں نے ہندی کے ادیبوں اور شائقین سے خطاب کرتے ہوئے انجام دیا:

> "آپ میں سے کچھ جانتے ہوں گے کہ پنجاب میں سب پڑھے لکھے ہندو اور مسلمان اردو جانتے ہیں۔ وہ ہندی بول نہیں سکتے۔ اسی طرح کشمیر میں بھی اچھی طرح اردو لکھنے والے ہندو ہیں۔"

اردو کو اعلا تعلیم کا ذریعہ بنایا جانا گاندھی جی کے لیے بڑی ہی مسرت کا سامان بنا تھا۔ کیوں کہ وہ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنائے جانے پر زور دیتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد میں سائنس کے مضامین کی تدریس کے لیے نصابی کتابیں اردو میں تیار کرائی گئیں تو گاندھی جی نے ایسے اقدامات کی بڑی تعریف کی۔ انھوں نے اس

کتاب نما

حقیقت کی طرف متوجہ کیا تھا کہ سائنس کے مضامین اردو میں پڑھانے سے تعلیم کو فروغ حاصل ہوگا:

"مجھے جو خبریں ملی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق کی (کی) رہنمائی میں عثمانیہ یونی ورسٹی اردو کے مفاد کی بڑی خدمت کر رہی ہے اس یونی ورسٹی میں اردو کی ایک بڑی فرہنگ موجود ہے۔ سائنس کی کتابیں اردو میں تیار کی گئی ہیں اور تیار کی جارہی ہیں۔ چونکہ تعلیم دیانت داری کے ساتھ اردو میں ہو رہی ہے اس لیے اس کی ترقی یقینی ہے۔"

گاندھی جی نے رسم الخط کے مسئلے پر بھی غور و فکر کیا۔ اس سلسلے میں وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور ثقافتی رنگا رنگی کے تناظر میں فیصلہ کرتے ہیں۔ ادیبوں کے مابین لسانی تنازعہ گاندھی جی کے لیے بہت باعث تکلیف ہے۔ ان ادیبوں کی رائے تعصب اور زبان اور مذہب کے مابین رشتہ جوڑنے کی کوششوں کے خلاف گاندھی جی بڑے ہی سخت الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"میرا بس چلے تو میں ادیبوں کو اس نظریے سے ہٹا دوں کہ زبان کی جس شکل کو اردو کہا جاتا ہے وہ صرف مسلمانوں کی بول چال کی زبان ہے اسی طرح جس طرح کہ میں ہندو ادیبوں کو ہندی کو صرف ہندوؤں کی زبان سمجھنے کے نظریہ سے ہٹا دوں۔"

گاندھی جی زبان کے لسانی ڈھانچہ، اس کے فکری رسم الخط اور اس کی سماجی و تہذیبی معنویت کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ وہ اردو کا رسم الخط بدلنے کے قطعی خلاف تھے۔ پٹنہ میں بہار اردو کمیٹی کے اجلاس کے موقع پر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا تھا (۲۸ اگست ۱۹۳۷)۔ اس بیان میں اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط سرکاری اور تعلیمی کاموں کے لیے بیک وقت استعمال کرنے کا عہد کیا گیا تھا:

"ہم اس بات پر ایک رائے ہیں کہ ہندوستانی، ہندوستان کی زبان مشترکہ ہو اور اردو اور ناگری دونوں حروف میں لکھی جائے اور تمام سرکاری اور تعلیمی کام کاج کے لیے ان دونوں لکھاوٹوں کو تسلیم کیا جائے۔"

گاندھی جی نے اس معاہدہ کی مکمل حمایت کی تھی۔

گاندھی جی نے وقفے وقفے سے بار بار اس بات پر زور دیا کہ اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط برقرار رہنے اور استعمال ہونے چاہئیں۔ وہ رسم الخط کے سلسلے میں زبردستی کو بالکل غلط اور ناقابل عمل قرار دیتے تھے۔ ایسے عمل کو گاندھی جی نے تو تصور سے بھی پرے کہا تھا:

"اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کو دیوناگری میں لکھنے پر اصرار کیا جائے اور یہ بات تو خیال کی حد تک اور بھی پرے ہے کہ ہندوؤں کی بہت بڑی آبادی کو عربی لکھاوٹ اپنانے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔"

گاندھی جی حُب الوطنی اور جمہوریت دونوں کے تناظر میں اردو رسم الخط سیکھنا لازمی قرار دیتے تھے۔ ایک وقت دو رسم الخط سیکھنے کی قباحتیں پیش کرنے والوں سے گاندھی جی نے یہ کہا تھا کہ ہندستانی شہریت اور خدمتِ وطن کی رُوح اس بات کی متقاضی ہے کہ دونوں رسم الخط سیکھے جائیں:

"دو لکھاوٹیں سیکھنے سے ڈرنا نہیں چاہیے۔۔۔ آپ ہندستان میں رہتے ہیں، ہندستانیوں کی سیوا خدمت کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے دو لکھاوٹیں سیکھنے کی محنت سے کیا ڈرنا۔"

اردو کو ہندی کی شیلی قرار دینے، دونوں زبانوں کے نام جُدا ہوتے ہوئے درحقیقت زبان ایک ہی ہونے کے بارے میں آج بھی دلیلیں دی جاتی ہیں۔ گاندھی جی اردو اور ہندی کو دو جُدا گانہ زبانیں قرار دیتے تھے۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق جمہوریت کا یہی تقاضا ہے۔ بصورتِ دیگر جو کچھ ہے، اس کا اظہار گاندھی جی نے ان لفظوں میں کیا ہے:

"ہم میں کئی ایسے ہیں جو ہندی اور اردو کو ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں اس کی کیا ضرورت ہے؟ میں تو سچی ڈیماکریسی (جن تنتر یا جمہوریت) چاہتا ہوں۔ صرف ہاں میں ہاں ملانے سے ڈیماکریسی ہیپوکریسی (دکھاوا) بن جاتی ہے۔"

ہندی کی وکالت کرنے والوں کا ایک گروہ جس طرح اردو کی مخالفت کر رہا تھا، اس طریقۂ کار سے گاندھی جی ذرا بھی متفق ہونے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ کسی زبان کے مٹانے اور صرف اپنی زبان کی بالادستی پر اصرار کو گاندھی جی تشدد (ہنسا) قرار دیتے تھے۔ ان کا اہنسا کا نظریاتی و عملی دائرہ دوسروں کو ثقافتی و لسانی حقوق دینے تک وسیع تھا۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق حُب الوطنی، قومی یکجہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور جمہوریت ہی نہیں اہنسا کا بھی تقاضا یہ ہے کہ اردو کے حقوق تسلیم کیے جائیں:

"ہندی والے چاہتے ہیں کہ میں ہندی ہی کی نوبت بجاتا رہوں، اردو کا نام نہ لوں مگر میں تو اہنسا کو ماننے والا ستیہ گرہی ہوں۔ میں یہ کیسے کر سکتا ہوں۔"

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ گاندھی جی ہندی سے کچھ کم محبت کرتے تھے۔ وہ دونوں زبانوں کو قومی ضرورتوں کو پوری کر سکنے والی زبان بنانے کے خواہش مند

تھے:-

"میں نہیں چاہتا کہ ہندی مٹ جائے یا اردو فنا ہو جائے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ دونوں ہمارے کام کی ہو جائیں۔"

قومی زبان کے گاندھی جی کے تصور میں اردو زبان اور اردو رسم الخط کو شمولیت حاصل تھی۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق اس منظر کے بغیر قومی زبان کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ ہندی پرچار سبھا کی سلور جوبلی کے موقع پر گاندھی جی نے اپنی تقریر میں یہ تک کہا تھا کہ "اردو لکھاوٹ سیکھنا ہمارا دھرم ہے اور اسی پر چلتے ہوئے ہم ہندستان کو اپنا کہنے کا حق حاصل کر سکتے ہیں":

"... میں آپ سے کہوں گا کہ آپ کا یہ دھرم ہے کہ آپ اردو لکھاوٹ بھی سیکھیں... قومی زبان کا پرچار کرتے ہوئے ہم اس طرف چلے جائیں اور ہمارا کام برابر ہوتا رہے تبھی ہمیں یہ کہنے کا حق حاصل ہو گا کہ یہ ہندستان ہمارا ہے۔"

جمہوریت اور اہنسا میں پختہ یقین نے گاندھی کو یہ یقین کامل بھی بخشا تھا کہ ثقافتی ولسانی آمریت بالآخر ناکام ہو جاتی ہے۔ گاندھی جی کے نظریے کے مطابق کسی زبان کو مٹا دینا ہر حال ناممکن ہے۔ ان ہی کے لفظوں میں:-

"میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو محض اردو یا محض ہندی کے باقی رہنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ تصور ایک خواب اور ایک ناپاک خواب ہی بنا رہے گا... تلسی داس اور سورداس کی زبان فنا نہیں ہو سکتی اور اسی طرح وہ زبان بھی فنا نہیں ہو سکتی جس میں شبلی لکھا کرتے تھے۔"

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندستان آزاد ہوا مگر روح فرسا حقیقتوں سے ٹکرا کر گاندھی جی کا آزادی کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ اسی لیے جب آہوں، کراہوں اور سسکیوں کی فضا میں آزادی کے شادیانے بجائے جا رہے تھے تو گاندھی جی نے فرقہ وارانہ منافرت اور قتل و غارت گری کے صدمے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا خواب ٹوٹ جانے کا ماتم کیا۔ وہ فرقہ وارانہ قتل عام کی آگ بجھانے میں منہمک ہونے کے باوجود اردو زبان، اردو رسم الخط اور مظلوموں کے تحفظ کی وکالت کرتے رہے۔

اس ذہنی و جذباتی ہیجان میں بھی گاندھی نے صبر و تحمل اور دیرپا حکمت عملی اختیار کرنے اور ہر قسم کے انتقامی فعل سے گریز پر زور دیا۔ ریحانہ طیب جی نے گاندھی جی کے نام اپنے خط میں یہ کہا کہ "اردو لکھاوٹ کو اس لیے جگہ دی جا رہی تھی تاکہ برطانوی ہند کا بٹوارا نہ ہو۔ اب ہندستان اور پاکستان دو علاحدہ ملک بن گئے۔ اس لیے ناگری کے ساتھ اردو کے گٹھ بندھن کی کیا ضرورت ہے؟"

گاندھی جی نے پاکستان کے وجود میں آنے کے باوجود دو قومی نظریہ قبول کرنے سے انکار کیا۔ پاکستان کے اردو کو اپنی قومی زبان تسلیم کرنے کے باوجود گاندھی جی نے اردو زبان اور اردو رسم الخط کے ساتھ انصاف کیے جانے پر اصرار کیا انھوں نے اس سیاسی و تہذیبی آشوب میں بھی اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان ماننے سے قطعی انکار کیا۔ گاندھی جی نے ریحانہ طیب جی کے خط کے جواب میں ان خیالات کا اظہار کیا:۔

> "ہم دو قومیں (نیشن) نہیں ہیں... دو قومیں ماننے سے ہم ہندستان کو بڑا نقصان پہنچائیں گے... اگر ہم ہندو کو یا مسلمان کو ایک ہی لکھاوٹ میں لکھنے کے لیے مجبور کریں تو ہم اس کے ساتھ غیر انصافی کریں گے اور جب سے غیر انصافی اقلیت کے ساتھ ہو تو اکثریت کا گناہ دوگنا مانا جائے گا... یاد رکھنا چاہیے کہ آج سچ مچ اردو لکھاوٹ یا اردو بھاشا صرف مسلمانوں کی نہیں ہے۔ ایسے اَن گنت ہندو ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور وہ اسے اردو لکھاوٹ میں ہی لکھتے ہیں۔"

گاندھی ردعمل کی تاریخوں کو غلط قرار دیتے تھے۔ وہ کسی بھی صورت میں کسی پر زیادتی کے خلاف تھے۔ غلط کاموں کی کوئی توجیہہ گاندھی جی کو قبول نہیں تھی وہ زیادتی یا ناانصافی کا کوئی جواز ماننے کے لیے تیار نہیں تھے وہ غلطی کے اعتراف اور جو کو جو کہنے سے کبھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ ان کی کشادہ ذہنی، وسیع النظری، اور جرأت مندی کا اندازہ اس اقتباس سے بھی لگایا جاسکتا ہے:

> "ہم نے یونین میں کئی جگہ مسلمانوں پر زیادتیاں کی ہیں۔ ان زیادتیوں کے حق میں ہماری طرف سے یہ جواب نہیں دیا جاسکتا کہ پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں پر زیادتیاں شروع ہوئیں، اس لیے یونین میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر زیادتیاں کیں۔"

اسی لیے آزادی کے بعد جب اُتر پردیش میں ہندی کو واحد سرکاری زبان اور دیوناگری کو اکلوتا سرکاری رسم الخط قرار دیا گیا تو گاندھی جی نے صدائے احتجاج بلند کی اور اردو کو اس کے حقوق دیے جانے کا مطالبہ کیا۔ اس وقت اردو رسم الخط کو مٹانے کا جو عمل شروع ہوا، گاندھی جی اپنی شہادت کے وقت تک اس کے خلاف احتجاج اور ایسے اقدامات کی مذمت کرتے رہے۔ وہ ثقافتی معاملات طیش میں آکر طے نہ کرنے اور دل آزاری سے بچنے کی تلقین کرتے رہے:

> "جو لوگ غصے میں آکر اردو لکھاوٹ کا بائیکاٹ کرتے ہیں، وہ یونین کے مسلمانوں کی خواہ مخواہ توہین کرتے ہیں۔"

اپنی شہادت سے صرف ۵ دن پہلے بھی گاندھی جی نے لسانی تعصب اور دشمنی سے بچنے پر زور دیتے ہوئے ایسے مظاہر کے خلاف اپنی ناپسندیدگی اس طرح دو ٹوک انداز

میں ظاہر کی تھی:

"جب ناگری کے حامی اردو لکھاوٹ کی مخالفت کرتے ہیں تو اس میں مجھے عداوت اور تعصب کی بُو آتی ہے۔"

ملک آج تہذیبی و روحانی بحران سے دوچار ہے اس کا ایک بڑا سبب گنگا جمنی تہذیب اور زبان کو کچل کر رکھ دیے جانے کی کوششیں ہیں۔ گاندھی جی کے اس تناظر میں پیش کیے گئے خیالات سے کسب فیض کرتے ہوئے ہم آج بھی اپنی تہذیب و ثقافت میں رُوح پھونک سکتے ہیں۔

نوٹ: تمام اقتباسات ہریجن کے ۱۹۳۶، ۱۹۳۷، ۱۹۳۸ کے شماروں، ہریجن سیوک کے ۱۹۴۸ء کے شماروں، تعمیری پروگرام (اشاعت ۱۹۴۸) اور دکھنی بھارت ہندی پرچار سبھا کے اجلاس میں گاندھی جی کے دیے گئے خطبہ (۲۵ جنوری ۱۹۴۶) سے ماخوذ ہیں۔

ڈاکٹر سید صفی اللہ
یڈر شعبہ عربی، فارسی، اردو
دراس یونیورسٹی۔ مدراس ۵

تن ہمہ داغ داغ......

بہت پہلے دوستوں کی ایک محفل میں اردو کی حالیہ کس مپرسی اور مستقبل سے مایوسی کا اظہار
ورہا تھا تو جواب میں مَیں نے کسی کا یہ شعر سُنا دیا تھا ؎

ہماری حالت پہ ہنسنے والو ہنسو مگر یہ خیال رکھنا
کبھی ہمارے دن بھی پھریں گے ہمیں بھی راس آئے گا زمانہ

ج اس گھڑی کو یاد کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود فریبی کے سوا کچھ نہ تھا!

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ اردو تہذیب، تہذیبوں کی سرتاج سمجھی جاتی تھی۔ لیکن کیا آج ہم اپنی
ہذیب پر فخر کرسکتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ آج بھی اردو بولنے والوں میں شائستگی موجود
ہے، اردو کے اچھے مدارس موجود ہیں، اچھے رسائل نکل رہے ہیں، اچھی کتابیں آرہی ہیں، اچھے
دارے موجود ہیں جو صحیح سمت میں کام کر رہے ہیں، جامعات میں دیانت داری سے کام ہو رہا ہے
یکن یہ سب کچھ مجموعی حیثیت سے رائے زنی کے برابر ہے۔ اردو کی تصویر بڑی رنگین سہی لیکن
ج سیاہ پوش ہے۔

کہوں تو بد کلامی ہوگی لیکن سُن لیجیے پھر چاہے صلیب پر چڑھا دیجیے کہ آج اردو اقلیت کے
فراد وہ نہیں رہے جو کبھی تھے۔ آج ان میں خدمت کا وہ جوش اور قربانی کا وہ جذبہ باقی
ہیں رہا جو کبھی تھا۔ حاسد اور مفت خوروں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اگر کہیں کسی
ن کار کی عزت نہیں ہوتی، اگر ادب کی اجارہ داری کم پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھ میں ہے، اگر کسی
بان کے نام نہاد شاعروں اور ادیبوں کو سر پر بٹھایا جاتا ہے، اگر کسی ادبی جلسہ کی صدارتی
رسی کسی سرمایہ دار یا عہدے دار کو دے کر حقیقی ادیبوں، شاعروں، محققوں اور ناقدوں
و سامعین کی صف میں بٹھا کر بھاشن سنایا جاتا ہے، اگر کسی ادبی ادارے کے اہم عہدے
معززین شہر یا بارسوخ لوگوں کو دے کر اردو کے خدمت گاروں، پروفیسروں، ادیبوں، شاعروں
ر محققوں کو اُن کے تابع رکھا جاتا ہے تو وہ اور کہیں نہیں صرف اردو دنیا میں ہوتا ہے۔

اور اس پر بھی ہمارا سر اونچا اٹھا ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ میرے یہ جملے جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن جس دکھ
ے ساتھ یہ میرے قلم سے نکلے ہیں اسے میرا دل ہی جانتا ہے۔

اردو والوں کی حالت ہی عجیب ہے۔ جو سکون سے ہیں وہ خواب غفلت کا شکار
اور جو بیدار ہیں وہ بغض و حسد کی آگ میں سُلگ رہے ہیں۔ وہ یا تو کچھ کرنا نہیں چاہتے یا
ف حسد کرنا جانتے ہیں۔ کسی نے دس بیس کتابیں لکھ دیں تو تیوری پر بل آگئے، کسی نے
رہ بیس کتابوں پر مقدمے لکھ دیے تو پیٹ میں درد اُٹھنے لگا۔ کسی نے دس بیس مشاعروں
صدارت کرلی تو دیکھا نہیں جاتا۔ کسی نے کوئی بڑا عہدہ پالیا یا کوئی ادارہ بنالیا تو ہاتھ دھو کر
یچھے پڑ گئے۔

ایسا کون سا شہر ہوگا جس میں اردو کے ہمدرد موجود نہ ہوں گے لیکن برسوں تک
ی کو یہ خیال نہیں آتا کہ شہر میں کوئی ایسا ادارہ ہی بنا ڈالے جو اردو کی صحیح خدمت کرسکے
رکاری مالی امداد کا سہارا لے کر نا خواندہ لوگوں ہی کے لیے تعلیم کا انتظام کرسکے یا ترقی اردو
رڈ کی مالی تائید سے اردو کتابت یا اردو ٹائپ رائٹنگ سکھانے کا بندوبست ہی کردے
سوں گزر جاتے ہیں کچھ نہیں ہوتا۔ آخر جب مخلص لوگ آگے نہیں بڑھ پاتے تو یہ کام غلط
وں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے تب چاروں طرف سے واویلا مچنے لگتی ہے کہ یہ ہو رہا ہے
ہ ہو رہا ہے۔

یہ بھی ایک طرفہ تماشا ہے کہ کچھ لوگ اداروں کو اپنے ذاتی مفاد کے حصول کا وسیلہ
ائے ہوئے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو اداروں کا دامن تھام کر اپنی شخصیت اور زندگی بنانے
ں لگے ہوئے ہیں اور بنا بھی چکے ہیں۔ کتنے ہی ادارے ایسے ہیں جو دکھاوے کی کارروائیوں کا
ندہ ہیں۔ ان کے دفتری کاغذات میں مندرج کارروائیوں اور حقیقی کاموں میں کسی بھی قسم کی
طابقت نہیں ہوتی۔ کاغذ کے یہ شیر اردو کے لیے حقیقی شیروں سے زیادہ نقصان دہ ہیں۔
م کریں بھی کیا؟ ہم تو کیا کوئی بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ ان کی پہنچ بڑے بڑوں تک
دتی ہے اور جو لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں وہ بھی کام کے لوگ نہیں ہوتے۔ وہ نکتہ چینی سے آگے
ھ کرتے ہیں اور نہ کرسکتے ہیں۔

بددیانتی کا یہ زہر یونی ورسٹیوں تک بھی پہنچ چکا ہے۔ یونی ورسٹیوں کے کرتا دھرتا لوگوں
یں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی ہی کر دکھانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ انھیں ہمیشہ منفی عمل یا دوسرے
لفاظ میں کج روی میں مزہ آتا ہے۔ ان کے سامنے اپنے ادبی اسلاف کی یہ مثال نہیں ہوتی کہ
لاں نے فلاں قابل نوجوان کا حوصلہ بڑھایا یا فلاں صاحب حق بات پر اَڑ گئے بلکہ ان کے آگے
ہ مثال رہتی ہے کہ فلاں نے اپنے ایک چہیتے کو فلاں جگہ پر لانا چاہا اور ہزار مخالفت کے
اوجود لے آئے۔ فلاں نے فلاں بات چاہی اور کر دکھایا۔ اور اس عمل کو دوہرا کر وہ خود کو بڑا
اقتور بلکہ بڑا دانشمند سمجھ بیٹھتے ہیں۔

آج کے رسائل بھی وہ رسائل نہ رہے جو کبھی ہوا کرتے تھے۔ آج تقریباً ہر رسالہ حصار بند
ہے، اپنے اپنے عقاید کا علم بردار، گروہ بندی کا شکار رہے۔ وہ وہی چھاپے گا جو اپنے گروہ
ا آدمی لکھے گا یا اپنے نقطہ نظر کے مطابق ہوگا۔

آج وہ مدیر بھی نہ رہے جو کسی زمانے میں ہوا کرتے تھے، جو ہر موصول شدہ تخلیق کو پڑھتے تھے، پرکھتے تھے اور پھر شائع کرتے تھے۔ کوئی نیا لفظ مضمون میں دو مقامات پر دو املا سے لکھا ملتا تو مضمون نگار سے مراسلت اختیار کرتے اور پوچھتے کہ کون سا املا صحیح ہے۔ تضاد بیانی ہوتی تو مضمون نگار سے مراسلت کے ذریعہ اسے دور کرتے۔ کوئی بات غلط ہوتی تو اسے ٹھیک کرواتے لیکن آج حال یہ ہے کہ الم غلم جو بھی ملا جوں کا توں چھاپ دیا۔ آج کے حالات میں اس انتباہ کی ضرورت یوں بھی اس لیے ہے کہ علاقائی تحقیق کے روپ میں بہت کچھ سامنے آرہا ہے جس میں تحقیق کا کچا پن زیادہ اور صحت مند مواد کم ہوتا ہے اور اردو علاقوں کا حال یہ ہے کہ معلومات کے نام پر نعمت سمجھ کر اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے۔

جو رسالے مضامین کا معاوضہ دیتے ہیں وہ اقربا پروری میں اتنے گم ہیں کہ دوسروں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کا بھی ہوش نہیں۔ جو رسالے معیاری مشہور ہیں وہ بڑے ناموں کے گرد ہی گھومتے رہتے ہیں اور ایسے بڑے نام بھی جو تر دگی چکے ہیں، ان کے لیے شیر مال ہیں۔ ان کا ہر اگلا ہوا نوالہ اپنے خوان نعمت پر سجا کر پیش کرنے میں انھیں عار نہیں ہوتا۔ نئے لکھنے والوں کا گویا ان کے پاس کوئی معیار ہی نہیں ہوتا۔

یہ شکایت بھی سنی گئی ہے کہ رسالوں میں اچھے علمی مضامین نہیں ہوتے شکایت اپنی جگہ بجا لیکن آج علمی مضامین پڑھنے کی تمنا کس میں ہے۔ اوّل تو ہمارے لیے پڑھنا ہی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا اس پر علمی مضامین کا مطالعہ کہاں سے برداشت ہوگا۔ بیشتر رسائل نے خود کو افسانوں اور شعری تخلیقات تک محدود کر لیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے جو ایک آدھ علمی رسالہ نکل رہا ہے وہ اپنی زندگی کی گھڑیاں گنتا نظر آتا ہے۔ اس کی امداد کے لیے کوئی تیار نہیں۔

اردو اسکولوں کا مسئلہ آج سر فہرست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج اردو اسکول زوال کی زد میں آچکے ہیں۔ یہاں تعلیم کا معیار ناگفتہ بہ ہے۔ نہ مدرسوں میں کشش ہے نہ کمرے صاف ستھرے، نہ میز کرسیاں صحیح سالم نہ کھیلوں کا انتظام معقول، نہ کبھی لائبریری کے دروازے کھلتے ہیں نہ لیبارٹری پر پڑے ہوئے تالوں سے زنگ ہٹ پاتا ہے۔ اور نہ اساتذہ ہی کو آپسی جھگڑوں سے فرصت ملتی ہے۔ ہیڈ ماسٹر اپنی بالا دستی کا بے جا استعمال کرتے نہیں تھکتے۔ منتظمین کی سیاست الگ اپنا رول ادا کرتی رہتی ہے اور جو تھوڑی سی ساکھ بچ رہی تو وہ بھی امتحانات کے برے نتائج سے ختم ہو گئی۔

یہ سچ ہے کہ دوسری زبانوں کے اسکولوں کا حال بھی کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے لیکن وہاں اس کا اثر اتنا شدید نہیں ہوتا جتنا اردو اسکولوں کے حق میں ہوتا ہے۔ ان اسکولوں میں طلبہ کی گنجائش سے زیادہ ان کی آبادی ہے۔ ان کی معتد بہ تعداد انگریزی اسکولوں کی طرف چلی جانے کے بعد بھی اتنے طلبہ بچ رہتے ہیں کہ انھیں سے تمام مدرسے بھر جاتے ہیں۔

سچ پوچھیے تو باپ کو اپنی اولاد کے مستقبل کی فکر سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

ج کون باپ نہیں چاہتا کہ اپنی اولاد پڑھ لکھ کر اونچے سے اونچے عہدہ پر فائز ہو، ڈاکٹر بنے، انجینئر بنے، وکیل بنے، سائنس داں بنے..... ایسے میں کون اپنے لخت جگر کو ایک ایسے اسکول میں جھونک دینا پسند کرے گا جہاں سے نہ اچھی تعلیم کی توقع ہو سکتی ہے اور نہ ڈسپلن کی اُمید۔ لہ عرصہ بعد خوش قسمتی سے وہ تیسرے درجے میں کامیاب بھی ہو جائے تو آگے کیا ہوگا؟ دراصل یہاں سوال اردو یا انگریزی اسکولوں کا نہیں ہے بلکہ اچھے سے اچھے اسکول کا ہے۔ انگریزی اسکولوں میں بھی لوگ پہلے بہترین اسکول کا دَر کھٹکھٹاتے ہیں۔ وہاں کام بن نہ پایا تب وہ اس سے کم پر آتے ہیں۔

یہ رہی ہمارے مسائل کی ایک ہلکی سی جھلک۔ مسائل کا یہ ناسور اردو کے سینے تک پہنچ چکا ہے اور اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے مگر وہ لاعلاج نہیں ہے۔ اس کا علاج ہے مگر وہ دوا سے پہلے پرہیز چاہتا ہے۔

ہم پہلے اپنی اصلاح کریں، اپنی زبان کی عظمت کو سمجھیں، فن کار کی عزت کرنا سیکھیں۔ اکیڈمیوں اور ادبی اداروں کے بڑے عہدے ایسے ادیبوں اور فن کاروں کو دیں جن کا نام اردو دُنیا کی آبرو سمجھا جاتا ہے۔ جلسوں اور مشاعروں کی صدارت کو کسی ذاتی مقصد کے حصول کے لیے استعمال نہ کریں بلکہ اس کرسی کو کسی برگزیدہ شاعر یا ادیب کی صدارت سے زینت بخشیں۔ نام نہاد ادب دوست حضرات ادب کی اجارہ داری سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔ جو ادارے سرکاری مالی تعاون سے چل رہے ہیں ان کو اپنی کمائی کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ ان کی پائی پائی کو اردو کی امانت سمجھیں۔ مدیران رسائل اردو کے فن کاروں کی مجبوریوں کا غلط یا بے جا فائدہ اٹھانے سے باز آئیں۔ اساتذہ چاہے وہ یونی ورسٹی کے ہوں، کالجوں کے ہوں یا اسکولوں کے۔ اردو کے ناتے آپس کے اختلافات بھول جائیں۔ اردو مدارس کے منتظمین اور ہیڈ ماسٹر حضرات زبان کی خدمت اور انسانیت کے پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں پوری کریں۔ اپنے اسکولوں کے لائبریریوں کو اپنا کام کرنے دیں۔ اس سے طلبہ میں مطالعہ کا شوق بڑھتا ہے۔ تجربہ خانوں تک طلبہ کی رسائی کا سامان کریں۔ تجرباتی آلات جو بند کمروں میں گرد کی چادر اوڑھے سو رہے ہیں انھیں ننھے ننھے ہاتھوں کا لمس محسوس کرنے دیں۔ ڈسپلن اور تعلیم کے معیار کو دھیرے دھیرے اونچا اُٹھائیں۔ اپنے مدرسوں کو بہترین کارکردگی کے مراکز بنائیں۔

دوسری جانب ہم اپنی ذمّے داریوں کو محسوس کریں۔ اپنے اندر اردو کتابوں، اردو رسالوں کو خریدنے کی عادت ڈالیں۔ نہ صرف یہ بلکہ انھیں پڑھنے کے لیے وقت نکالیں۔ اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں۔ گھر کے ماحول میں اردو کو رچا بسا رکھیں۔ اور کتاب یا اردو رسالہ ہاتھ میں لیے سڑک سے گزرنے میں شرم محسوس نہ کریں۔ اردو کے حق میں رائے عامّہ کو ہموار کریں۔ جو صاحب حیثیت لوگ ہیں ان کے دلوں میں اردو سے محبت پیدا کریں، انھیں سمجھائیں کہ اس طرح سوچنا کہ کسی ادارے کا صدر بنائے جانے پر ہی انھیں مدد کرنا چاہیے، غلط ہے۔

یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ کسی جلسہ کا صدر نہ بنایا جانا ان کے لیے کوئی ہتک کی بات ہے۔ اس طرح کے غلط خیالات ان کے دلوں سے دور کرنے کی کوشش کریں۔ بتائیں کہ ان کا رتبہ صدارت سے بہت اونچا ہے۔ وہ سرپرستوں کی صف میں آتے ہیں۔ ہمارے مسائل کا حل دراصل ان کی سرپرستی ہی میں ہے۔

جب تک ہم یہ سب نہیں کر پاتے ہماری آواز صدا بہ صحرا ہی رہے گی۔ کام چیخ و پکار سے نہیں عمل سے بنتا ہے۔

مانگے کا اُجالا

آپ بیتی یا آپ بیتی کی معذرت

بعض کتابیں اگر شائع نہ ہوں تو اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں ضائع نہ ہو جائیں، لیکن بعض ایسی
تابیں بھی ہوتی ہیں جو شائع ہو کر ضائع ہو جاتی ہیں۔ ایسی ہی کتابوں میں نامور نقاد نظیر صدیقی کی
پ بیتی بھی شامل ہے جسے شائع ہوئے خاصے دن ہو چکے ہیں، لیکن مصنف، ناشر اور ہم
یسے دو چار عقیدت مندوں کے سوا شاید ہی کسی کو اس کتاب کی اشاعت کا علم ہو۔ عقیدت
ندوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنھیں یہ کتاب تحفتاً پیش کی گئی ہے

نظیر صدیقی ان ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے ادب کی کئی اصناف کو باثروت بنایا ہے۔
ہ تنقید، شاعری، انشائیہ نگاری، اور شخصی خاکہ نویسی میں اپنے کمالات کا بے مثال مظاہرہ
ر چکے ہیں اور اب "سویہ ہے اپنی زندگی" جیسی کتاب لکھ کر آپ بیتی کے فن کو انھوں نے ایک
ئی جہت عطا کی ہے، لیکن افسوس اُن کے اس ادبی کارنامے سے اہلِ ادب بے خبر ہیں،
بالکل اسی طرح جس طرح خود نظیر صدیقی اِس سے بے خبر ہیں کہ آپ بیتی کسی ایسے شخص کو نہیں
لکھنی چاہیے جسے زندگی ایک بوجھ نظر آتی ہو۔

ممکن ہے ہماری باتوں میں پڑھنے والوں کو تضاد نظر آئے کہ ایک طرف تو ہم یہ کہ رہے ہیں
کہ نظیر صدیقی نے آپ بیتی کے فن کو ایک نئی جہت دی ہے اور دوسری طرف یہ اعلان بھی کر رہے
ہیں کہ انھیں آپ بیتی نہیں لکھنی چاہیئے تھی کیونکہ بقول خود، زندگی اُن کے لیے ایک بوجھ کی
حیثیت رکھتی ہے۔ ہمیں اِن باتوں میں تضاد نظر نہیں آرہا۔ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا
سلیس اردو میں ترجمہ یہ ہے کہ نظیر صدیقی نے اپنی زندگی کا بوجھ اپنے پڑھنے والوں کے سر پر
ڈال کر آپ بیتی کے فن کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ کتاب لکھ کر نظیر صدیقی
کا بوجھ ہلکا ہو گیا، پڑھنے والوں کا بوجھ بڑھ گیا تو کیا ہوا، اردو کتابیں پڑھنے والے بچاروں کی
تو ساری زندگی ہی بوجھ ڈھوتے گزرتی ہے۔

نظیر صدیقی زندگی کو ایک کارِ فضول سمجھتے ہیں۔ انھیں اپنی زندگی ہی نہیں، وہ دنیا بھی
بے کار نظر آتی ہے جس میں وہ ایک عرصے سے لکھنے پڑھنے کا کام کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں
"ایک طویل مدت سے یہ خواہش میرے اندر پرورش پا رہی ہے کہ کاش میں اِس دنیا
میں نہ آیا ہوتا، کاش یہ دنیا وجود میں نہ آئی ہوتی"

دنیا میں نہ آنے کی خواہش برحق، مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ یہ خواہش بھی رکھیں کہ دنیا وجود میں نہ آتی۔ آپ کے لیے تو اتنا ہی کافی تھا کہ دنیا میں نہ آتے، پھر آپ کے لیے دنیا کے وجود میں آنے نہ آنے کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا۔

زندگی کے بارے میں موصوف کا یہ ارشاد بھی ہے: "زندگی میرے لیے ایک ڈراؤنا خواب رہی ہے، نفسیاتی طور پر میں زندگی اور آدمی دونوں سے خوف زدہ رہا ہوں۔" زیرِ نظر کتاب اسی ڈراؤنے خواب کی تعبیر ہے جو خاصی خوشگوار ہے کیونکہ اس میں نظیر صدیقی اتنے خوفزدہ نظر نہیں آتے جتنے وہ لوگ جن کا نظیر صدیقی نے ذکر کیا ہے۔

نظیر صدیقی پر اس قدر قنوطیت کیوں مسلط ہوئی؟ اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں "میں اپنے دور کا نہایت نامقبول انسان اور ادیب ہوں، مجھ میں یقیناً کوئی خامی یا کمی ایسی ہے کہ نہ ذاتی زندگی میں مقبول ہو سکا نہ ادبی زندگی میں۔"

یہ محض انکسار ہے۔ ذاتی زندگی سے قطع نظر جہاں تک دنیائے ادب کا تعلق ہے، نظیر صدیقی خاصے مقبول ادیب ہیں۔ ان کے ادبی کاموں کا برملا اعتراف کیا گیا ہے۔ خود ہم نے ان کے بارے میں درجنوں کالم لکھے ہیں، جنھیں ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ہندستان کی ایک یونی ورسٹی میں ان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا گیا ہے جو ان کی مقبولیت کی ناقابلِ تردید دلیل ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ غالب اور میر پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جاتے تھے، اب یہ اعزاز نظیر صدیقی کو حاصل ہوا ہے۔ انھیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ پی ایچ ڈی کرنے والوں نے انھیں میر اور غالب کی سطح تک پہنچا دیا ہے، میر اور غالب کو بھی خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ اب نظیر صدیقی کی برابری کا دعوا کر سکتے ہیں۔

نظیر صدیقی کو جیسی اور جتنی مقبولیت ملی ہے، اس پر انھیں قناعت کرنا چاہیے کہ ادب میں اس سے زیادہ مقبولیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے زیادہ مقبولیت فلموں ہی کے ذریعے مل سکتی ہے لیکن ادیبوں کو فلمی دنیا کا رُخ نہیں کرنا چاہیے کہ یہاں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے تھوڑی بہت محنت تو بہر حال کرنی پڑتی ہے۔

آپ بیتی لکھنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ لکھنے والے کا حافظہ اچھا ہو، تاکہ وہ اپنے ماضی کو مطابقِ اصل صفحۂ قرطاس پر منتقل کر سکے۔ نظیر صدیقی اس شرط کو ضروری نہیں سمجھتے۔ فرماتے ہیں "میرا حافظہ جو پہلے بھی مضبوط نہ تھا، کمزور ہو چکا ہے۔" اسی بات کو وہ ایک دوسری جگہ یوں لکھتے ہیں "یہ ساری خود نوشت اسی حافظے کے سہارے لکھی ہے جس کے وجود پر مجھے ہمیشہ شبہہ رہا ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ بعض گفتنی واقعات بھی بھول گیا ہوں اور ان کا ذکر نہ کر سکا۔" گویا موصوف کو "ناگفتنی" واقعات یاد رہ گئے اور ان ہی کو قلم بند کر دیا!

ان ناگفتنی واقعات پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ نظیر صدیقی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ کس حد تک حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ فرماتے ہیں "اس خود نوشت میں ہر جگہ جھوٹ سے بچنے اور قارئین کو سچ سے بہلانے کی کوشش کی گئی ہے۔" جھوٹ اور

چ کے سلسلے میں ایسی حکمتِ عملی نظیر صدیقی سے پہلے شاید ہی کسی نے اختیار کی ہو۔ اس کا
طلب یہی ہو سکتا ہے کہ لکھنے والے نے خود تو جھوٹ سے بچنے کی کوشش کی ہے، لیکن قاری
و مجبور نہیں کیا کہ وہ جھوٹ سے بچ کر نکل جائے، بلکہ یہ کوشش کی ہے کہ وہ سچ سے دامن
بچاتے ہوئے کتاب پڑھتا رہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مصنف
ور قاری کے درمیان بڑا نازک تعلق ہے کہ ایک کا سچ دوسرے کا جھوٹ ہے۔

ہماری رائے میں اس عجیب و غریب صورتِ حال کا ذمے دار مصنف ہے، نہ قاری
بلکہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں، جنھوں نے ساختیات کا شوشہ چھوڑ رکھا ہے اور یہ مشہور کیا ہے کہ کسی
تحریر کا مفہوم وہ نہیں ہوتا جو مصنف کے ذہن میں ہوتا ہے بلکہ یہ قاری کی مرضی پر موقوف ہے کہ
وہ جو مطلب چاہے اخذ کرے۔ اس اصول کے مطابق نظیر صدیقی کی یہ کوشش رائیگاں سمجھی جانی چاہیے
کہ وہ کتاب لکھنے کے دوران جھوٹ سے بچنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، ممکن ہے جس چیز کو
وہ جھوٹ سمجھتے ہوں قاری کے نزدیک وہی سچ ہو۔

مصنف نے جہاں بہت سے واقعات کو قلم بند نہ کرنے کی ذمّے داری حافظے پر ڈالی ہے
وہیں بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر بھی لکھنے سے ہاتھ روک لیا ہے۔ فرماتے ہیں: "اب تک زندگی
میں مجھ پر جو کچھ گزری ہے، وہ سب کچھ بیان کرنے کا خیال تو پہلے بھی نہ تھا؛ اسے لکھنے کے دوران
یہ بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ جتنا کچھ بیان کرنا چاہتا تھا، وہ بھی مناسب اور ممکن نہیں ہے
اوّل تو بہت سی باتوں کا بیان خود میرے حق میں ضرر رساں ہے، اور اگر میرے حق میں ضرر رساں
نہیں ہے تو کم از کم دوسروں کے لیے تکلیف دہ ضرور ہے۔"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ گزری ہے وہ سب کچھ بیان کرنے کا ارادہ نہیں تھا
تو آپ بیتی لکھنے کی ضرورت کیا تھی۔ اس صورت میں جو کچھ بھی لکھا جائے گا، وہ آپ بیتی نہیں
آپ بیتی کی معذرت ہوگی۔ ہمیں اس پر بھی حیرت ہے کہ نظیر صدیقی کو اپنے نقصان اور دوسروں
کی تکلیف کا خیال آپ بیتی لکھتے وقت کیوں آیا۔ یہ خیال تو تنقید لکھتے اور شاعری کرتے وقت
بھی آنا چاہیے تھا کہ یہی دونوں نظیر صدیقی کی شناخت ہیں۔ بہر حال ہمیں اس کا افسوس ہے کہ
اس آپ بیتی کے کچھ بہترین حصے حافظے کی وجہ سے ضائع ہوئے اور کچھ مصلحتوں کی وجہ سے نہ لکھے
جا سکے، جو کچھ باقی بچا ہے اسے متروکات سخن میں شمار کرنا چاہیے۔

آپ بیتی کا آغاز مصنف کے خاندانی اور ابتدائی حالات سے ہوتا ہے، پھر تعلیمی تفصیلات
ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب مصنف نے ایم اے تک کی تعلیم کے مراحل نہایت خوش
اسلوبی سے طے کیے، پہلا ایم اے اردو میں ڈھاکہ یونی ورسٹی سے کیا اور فرسٹ کلاس
حاصل کی، دوسرا ایم اے پنجاب یونی ورسٹی سے انگریزی میں کیا اور تھرڈ ڈویزن حاصل کی۔ اس
تھرڈ ڈویزن پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں "پنجاب یونی ورسٹی نے اپنی پوری تاریخ
میں دو شخصیتوں کے ساتھ سخت ناانصافی کی، علامہ اقبال کو فلسفے میں تھرڈ ڈویزن دے کر اور نظیر صدیقی
کو انگریزی میں"۔

خوشی کی بات ہے کہ نظیر صدیقی کم از کم ایک معاملے میں علامہ اقبال کے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ مزید خوشی کی بات یہ ہے کہ نظیر صدیقی نے حسبِ عادت انکسار سے کام لیا ہے ورنہ وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ پنجاب یونی ورسٹی نے دو بڑے شاعروں کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ کئی یونی ورسٹیوں نے علامہ اقبال کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگریاں دے کر اس ناانصافی کا ازالہ کر دیا تھا مگر افسوس کہ تاحال کسی یونی ورسٹی نے نظیر صدیقی کے آنسو پونچھنے کی کوشش نہیں کی سنا ہے جمیل الدین عالی انجمن ترقی اردو کی طرف سے اردو یونی ورسٹی کے قیام کی کوشش کر رہے ہیں، یہ یونی ورسٹی تو خدا جانے کب قائم ہوگی۔ فی الحال یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس کی طرف سے اعزازی ڈگریاں عطا کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ ایل ایل ڈی کی پہلی اعزازی ڈگری جناب نظیر صدیقی کو عطا کی جائے تاکہ پنجاب یونی ورسٹی نے اُن کے ساتھ جو ناانصافی کی ہے، اس کی تلافی ہو سکے۔

تعلیم کے بعد شادی کا مرحلہ آیا تو رشتے کے ایک چچا نے اپنی پوتی کے لیے جناب مصنف کا انتخاب کیا۔ موصوف نے رشتہ طے پا جانے سے قبل چچا جان سے کچھ رقم بطورِ قرض طلب کی۔ چچا جان، پوتی حوالے کر دینے پر تو آمادہ تھے، چھوٹی سی رقم دینے پر آمادہ نہ ہوئے آگے کا قصہ خود مصنف کی زبان سے سُنیے "چچا نے اتنا چھوٹا قرض دینے سے انکار کیا تو میں نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ ایسے خاندان میں ہرگز شادی نہیں کرنی چاہیے۔ میرے اس فیصلے کی بنا پر بالآخر شادی نہ ہو سکی۔ کہا جاتا ہے کہ میرے انکار نے لڑکی کے ذہن پر ناخوشگوار اثرات چھوڑے، پہلے اسے ہسٹریا ہوا، بعد میں وہ ذہنی توازن کھو بیٹھی، نتیجتاً اسے علاج کی غرض سے پاگل خانے میں داخل کیا گیا جہاں وہ ایک افسوس ناک موت مر گئی۔

کاش، چچا جان قرض دینے میں بخل سے کام نہ لیتے تو ایک قیمتی زندگی کا یہ ہولناک انجام نہ ہوتا

(باقی آئندہ)

کیلاش چندر ناز
۸۴۔ نیو راجا پارک
ام گلی نمبر ۶۔ جے پور

جدید مستزاد الزام

زندگی کی بھی تو زندگی ہے
دھڑکنوں میں بسی جو محبت کی تو وہ خوشی ہے
میں کبھی آپ اپنا خدا تھا
تجھ سے نظریں ملیں تو میں خود ہوں نہ میری خودی ہے
کوئی تجھ سا نہیں دو جہاں میں
تیری معصومیت کے مقابل کہاں اُروشی ہے
ایسے تجھ کو سنوارا خدا نے
دلکشی کو بھی ہے رشک جس پر تو وہ دلکشی ہے
تیری آنکھیں ہیں یا میکدے ہیں
میری نظروں میں ہے جو وہی دل میں بھی تشنگی ہے
تو ہے دلکش بہت کہکشاں سے
تو ہی حسنِ ازل کی دلوں میں بسی چاندنی ہے
حسن سے ہے تو چلن عشق کے ہیں
دوستی کو بھی ہے ناز جس پر تو وہ دوستی ہے
دل میں ہے تو نظر میں سماجا
تجھ کو دیکھوں مرے دل میں یہ آس بھی پیاس بھی ہے
چاندنی نے صدائیں یہ دی ہیں
میری باہوں میں آجا کہ یہ موسمِ عاشقی ہے
بن گئیں جلتی برسات آنکھیں
جب جدائی کبھی مجھ کو حالات نے تجھ سے دی ہے
کب طلب تھی مری جامِ آتش
زندگی کو نشہ جو نہ دے تو وہ کیا میکشی ہے
جان بھی اس میں جاتی ہے اکثر
یہ نہ سمجھو کبھی ناز دل کی لگی دل لگی ہے

اشہر ندیمی
گوریگاؤں (ویسٹ) بمبئی ۹۰

غزل

لہجے میں اثر کچھ ایسا ہو گل بن کے تری گفتار گرے
ہر حرف سے ابھرے اپناپن ہر لفظ سے تیرے پیار گرے
کچھ تم سے پودے پودوں کو اشجار بنائے تھے جس نے
اس شخص پہ وحشت طاری تھی امرائی میں جب اشجار گرے
کیا تیری خدائی میں مالک دستورِ عنایت اُلٹا ہے
میں نے تو دعا کی پھولوں کی دامن میں مرے کیوں خار گرے
تہذیب بجا، تعظیم بجا، اتنا ہے جھکانا سر کو خطا
اس بات کا رکھ لے دھیان ذرا سر سے نہ کہیں دستار گرے
گرنے سے اگر گھبرائے گا منزل سے بشر پھر جائے گا
ان زیست کی راہوں میں اشہر کیا شے ہے بشر ہو تار گرے

رمز آفاقی
علی گڑھ

غزل

ذہن ہو جائے معطل جیسے
ہم بغیر اُن کے ہیں پاگل جیسے
واہ رے سلسلۂ قوسِ قزح
حسنِ معصوم کا آنچل جیسے
منظرِ شام اودھ کیا کہنا
دل رُبا آنکھوں میں کاجل جیسے
یاد آئی ہے کسی کی یوں بھی
ٹیس ہو دل میں مسلسل جیسے
ہائے یہ سوزِ دروں کا عالم
جل اُٹھے بانس کا جنگل جیسے
اب وفا ہے اسی انداز کی رمز
لفظ ہو تابع معنی جیسے

...ٹر حمید اختر سردھنوی
...سلام آباد۔ میرٹھ

غزل

...بت کا صلہ کوئی نہیں ہے
...ہاں تو باوفا کوئی نہیں ہے
...ں صورت آشنا ہوں ہر کسی کا
...ر پہچانتا کوئی نہیں ہے
...دائیں دے کے گزرے ہر گلی سے
...ر در کھولتا کوئی نہیں ہے
...ہاں تم آ گئے ہو میکدے میں
...ہاں تو پارسا کوئی نہیں ہے
...ے دل کے سوا بستی میں اختر
...راغ اب تک جلا کوئی نہیں ہے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
...ارواڑی کالج، بھاگل پور

غزل

غمِ دنیا رہ گیا غمِ محشر رہ گیا
ہر اک دل میں درد کا کوئی نشتر رہ گیا
عروجِ شیشہ گری ہے توہینِ زندگی
پرانی قدروں کا کوئی پسِ منظر رہ گیا
نہ وہ دل کے حوصلے، نہ رودادِ عاشقی
خیالوں میں آپ کا رخِ انور رہ گیا
وفاؤں کی داستاں سنانے سے فائدہ
پشیماں ہر درد کا مرے تیور رہ گیا
الجھ کر دل رہ گیا ہجومِ اوہام میں
وجودِ احساس بھی مرے اندر رہ گیا

معراج رعنا
چوکھنڈی، سہسرام
بہار

غزل

ایک نایاب بصد خستہ کلاہ بہ سرے
نور ہی نور لٹاتا ہوا شاہ بہ سرے
سامنے دہر ہوس تیشۂ پُر آب لیے
پاؤں کے نیچے گہر گرد سیاہ بہ سرے
لے گئی خاک سے افلاکِ شرر افشاں تک
ایک معصوم تمنائے گناہ بہ سرے
منتظر آج بھی اس خوشبوئے جاوید کی ہے
ماہ و انجم سے بھری نقرئی راہ بہ سرے
ایک ناکردہ خطا جس کی سزا گام بہ گام
ایک مظلوم سسکتی ہوئی آہ بہ سرے

افشاں علوی
گاڑی خانہ، فتح گڑھ
ضلع فرخ آباد (یوپی)

غزل

گِلہ ہم دھوپ سے کرنے چلے تھے
بدن جھلسا گیا اپنا ہی سایا
تجھے پایا مگر اے زندگانی
کوئی آرام کوئی سکھ نہ پایا
کسی نے پھر مرے زخموں کو چھیڑا
کسی نے پھر مرے دل کو دکھایا
کسی کی دل شکن باتوں نے افشاں
اکیلے میں مجھے بے حد رلایا

جاوید ندیم
نذر لنہ، کپاڑ بازار
پونیل

دوہے

بڑے کرودھی بالما، ڈرتی ہر پل ہائے
لیکن جب پردیس رہیں، یاد بہت ہیں آئے
آؤ سکھی ری ناچو، مل کر میرے ساتھ
چیت ماس میں بھیّا کی پکی ہو گی بات
بھیّا، بھابی لائیں گے، چڑھے گی چولھا، دیگ
گھر بھیتر نہ آنے دوں، لوں گی پہلے نیگ
ذات پات کے بندھن میں، پریم نہ باندھا جائے
اڑتی خوشبو اور پون، ہاتھ کسی کے آئے

صغرا عالم
شاہ بازار، گلبرگہ

غزل

آپ کا شہر کہ پتھر کی کوئی بستی ہے
کون اب آپ سے اُمید کرم رکھے گا
اپنی پرواز میں شامل ہے فلک بھی بھی
کس نشانے پہ ہمیں شہر ستم رکھے گا
تیرے منصف کو بھی اب اپنا بیاں کیا دینا
پھر نیا ایک وہ دستورِ الم رکھے گا
حاکم وقت کی روداد نہ لکھنا صغریٰ
چھین کر ہم سے ہمارا وہ قلم رکھے گا

شاہد اختر
مغل پورہ، سہسرام

غزل

اپنے لہو سے کاسۂ خالی سجا کے دیکھ
یوں بھی تمام عمر تو خود کو گنوا کے دیکھ
اس عہدِ بے یقین میں سب رائگاں نہیں
تصویر اعتبار کی گھر میں لگا کے دیکھ
کچھ تو سبیل کشتیٔ عمرِ رواں سبھی کر
تیور بدل رہے ہیں بہت ناخدا کے دیکھ
سیرابیٔ نظر کو نہ اتنا کھنگال تو
تہذیب، اپنے عہد کی تتّی بجھا کے دیکھ

بدر نظیری
بنیاپوکھر، گیا

غزل

درندگی سے بھرا تھا خزاں کا ہر جھونکا
وگرنہ پہلے کبھی میں تو بے لباس نہ تھا
میں تیرتا رہا جس آگہی کے دریا میں
تھا حرف حرف ہر اک بوند اس کا گدلا سا
میں روسکا کبھی نہ اپنی شکستہ پائی پر
کہ خاک اُڑاتی مری منزلوں نے دے کے پتا
یہ رخشِ عمر بھٹکتا رہا اندھیرے میں
اور اب تو اپنی لگا ہوں کا بجھ رہا ہے دیا
جب اپنا بدر ہی بدظن سا ہو گیا مجھ سے
میں اپنے آپ میں رہنے لگا ہوں سمٹا سا

آشا پربھات
سیتامڑھی - بہار

اکثر ایسا ہوتا ہے

اکثر
ایک پیڑ
عمر میں بدل جاتا ہے
اور
تمھارا چہرہ
دھند میں کھو جاتا ہے
اکثر
میری یادیں
مجبور سی ہو جاتی ہیں
اور
ایک پل
صدی میں بدل جاتا ہے
اکثر
تمھاری یادیں
ایک راستہ بن جاتی ہیں / اور
ایک صدی / پل میں گزر جاتی ہے

نشتر اکبرآبادی
پونہ نمبر۱

غزل

دو گھروں کے درمیاں پہچان روشن کر گئی
قہقہوں کی روشنی دالان روشن کر گئی
فکر کی گہرائی غالب کا مقدر بن گئی
عشق کی لَو میر کا دیوان روشن کر گئی
تشنگی ٹیگور کی لے آئی ساحل پر مجھے
علم کی کم مائیگی ارمان روشن کر گئی

ظہیر الحسن ظہیر
جہانگیرآباد
بھوپال

غزل

زندگی بھر کے لیے اپنی کہانی دے گیا
جاتے جاتے وہ مری آنکھوں کو پانی دے گیا
زخم کھا کر چیخنے کی مجھ کو عادت ہی نہ تھی
کیوں لبِ اظہار کو وہ ترجمانی دے گیا
مرا سینہ تو سپر بنتا رہا لیکن مجھے
اس کا ہر ایک وار نقشِ کامرانی دے گیا
معجزہ اس کو محبت کا کہیں یا سحرِ عشق
اس کو گویائی تو مجھ کو بے زبانی دے گیا
زندگی اب تک تو اک بے ربط سی تحریر تھی
ایک اچٹتی سی نظر سے وہ معانی دے گیا
قصۂ ماضی مرے ہمدم نے کیا چھیڑا ظہیر
ذکر ان کا غم کی موجوں کو روانی دے گیا

ریاض الدین ریاض
کھنڈوپارہ - بھیونڈی

غزل

نہ پڑھ حالات کا نوحہ اٹھا سر
تجھے کرنا ہے خود ہی معرکہ سر
بلا سے ہو رہی ہے سنگ باری
مرے کاندھوں پہ ہے سنگ آشنا سر
یقیناً موم ہو جاتیں چٹانیں
اگر رکھتا جنوں سے رابطہ سر
سلامت ہے ریاض ایمان اپنا
بلا سے ہو گیا تن سے جدا سر

پروفیسر اختر بانو نازؔ
پربھنی

غزل

اپنی آنکھوں کے دریچوں کو کھُلا رکھنا تم
شب کی چوکھٹ پہ کوئی دیپ جلا رکھنا تم

کون سے دیس سے آجائے پجاری کوئی
طاقِ احساس میں اک بُت بھی سجا رکھنا تم

ہجرتوں کے لیے جاتے ہیں پرندے جس سمت
اُنھیں اطراف میں گھر ان کا بسا رکھنا تم

دل میں جو دے نہ سکو مجھ کو اگر کوئی مقام
داستاں ہی میں جگہ میری بنا رکھنا تم

نازؔ، فانوس کو رکھے جو ہمیشہ روشن
دل کی محراب میں وہ سوزِ دعا رکھنا تم

عائشہ پروین
بھوسہ منڈی، فتح گڑھ
فرخ آباد، یوپی

غزل

حصارِ ذات کی قیدوں سے میں نکل نہ سکی
قدم ملا کے ترے ساتھ ساتھ چل نہ سکی

لگی وہ آگ کہ سارا وجود خاک ہوا
ترے خیال کی زنجیر ہی پگھل نہ سکی

ترے فراق میں کس نے اُجالے دیکھے ہیں
سحر کا ذکر ہی کیسا کہ رات ڈھل نہ سکی

تمام عمر تجھے میں نے ٹوٹ کر چاہا
مگر نصیب کا لکھا ہوا بدل نہ سکی

حیات عائشہ وہ اک نرالی کشتی تھی
جو ڈگمگائی تو پھر آج تک سنبھل نہ سکی

اظہار عابدؔ
۴۴۵ عیدگاہ کالونی
گاندھی نگر، اناؤ

غزل

ساحل پہ گونجتا ہوا سناٹا دیکھ کر
سہمے ہیں کشتیوں کے علم دار ہر طرف

ملبوسِ آب و رنگ کا بارش پہ قرض ہے
بے رونقی کے نقش ہیں اشجار ہر طرف

اپنی شکستگی کا نہ احساس کر یہاں
بے رنگ ساعتوں کی ہے بوچھار ہر طرف

نیرنگ خواہشات کے مجلس سے تو نکل
حائل ہے روشنی میں یہ دیوار ہر طرف

بے سود سو چراغ ہیں سورج کے سامنے
عابدؔ اگر ہوں شعلۂ افکار ہر طرف

افضال عاقلؔ
۲۷، مسلمان پاڑا روڈ
گاڑولیا ۷۴۳۱۳۳، اتر ۲۴ پرگنہ

غزل

نہ دل میں خوف و ہراس رکھنا
ہمیشہ قائم حواس رکھنا

امید الفت کی زندگی ہے
ہمیشہ ملنے کی آس رکھنا

حریف کا حوصلہ بڑھے گا
کبھی نہ دل کو نراش رکھنا

پلٹ نہ جانا رہِ وفا سے
تو اپنے وعدے کا پاس رکھنا

بھرم بچانا ہے احتیاطاً
بدن پہ اچھا لباس رکھنا

غریب عاقلؔ تو لُٹ نہ جائے
بچا کے دل کی اساس رکھنا

عطا عابدی

غزل

(ایک فساد زدہ شہر دیکھنے کے بعد)

نہ تھا یارا مجھے پھر بھی مکرّر دیکھ آیا ہوں
لہو روتی ہوئی آنکھوں کا منظر دیکھ آیا ہوں

کسی کے جسم و جاں جھلے کسی کے بال و پر ٹوٹے
جلی شاخوں پہ کچھ لٹکے کبوتر دیکھ آیا ہوں

مکانوں کے لیے روتے مکیں مجھ کو نظر آئے
مکینوں کو کہیں روتا ہوا گھر دیکھ آیا ہوں

محافظ جس کو کہتے ہیں اسی کے نام سے ہمدم
ہر اک دل میں چھپا بیٹھا ہے جو ڈر دیکھ آیا ہوں

بہت مقتول بچوں کے لیے ماں باپ کا رونا
عطاؔ سینہ پہ اپنے رکھ کے پتھر دیکھ آیا ہوں

آمر صدیقی

غزل

صبح ہے دور بہت دور ابھی سچ مانو
روشنی دے گی مگر تیرہ شبی سچ مانو

ان گنت خواب تھے پلکوں پہ سجانے کو مگر
رات ایسی تھی کہ آنکھوں میں کٹی سچ مانو

ہم عداوت میں جڑیں کاٹ رہے ہیں جس کی
اب بھی اس پیڑ کی ہے چھاؤں گھنی سچ مانو

ذہن آمادہ ہے اس کارِ زیاں پر ورنہ
جی کا آزار ہے اب دیدہ وری سچ مانو

شاہراہوں سے گزرنے میں نہیں عار مجھے
اک ضرورت ہے مگر اس کی گلی سچ مانو

زہر کچھ اور ہواؤں میں گھلے گا آمرؔ
طنز آمیز ہے موسم کی ہنسی سچ مانو

آر۔ پی۔ شوخ
شاہ آباد مارکنڈہ
ہریانہ

غزل

یہ حسرتوں کی مری خاک سے نمو کیا ہے
ترے بغیر یہ دنیائے رنگ و بو کیا ہے

تو یوں بھی ساتھ مرے جاں بلب جدائی میں
وگرنہ یہ بھی جانے کی آرزو کیا ہے

تمہاری یاد سے بڑھ کر کریں عبادت کیا
بہے جب آنکھ سے خود ہی تو پھر وضو کیا ہے

سنبھل کے یوں وہ نئے ہمسفر کے ساتھ چلا
کبھی نہ اس کو بتایا کہ جستجو کیا ہے

ہو تو وہ کہ بہے جب تو نقش یار بنے
نہ اپنا رنگ جمائے تو پھر لہو کیا ہے

شکیل اعظمی
رانڈیر سورت

غزل

ذہن میں بیتے ہوئے لمحوں کا خمیازہ نہ تھا
ڈوبنے سے قبل گہرائی کا اندازہ نہ تھا

شکر کر میرے جنوں کا، ورنہ اے عہدِ غزل
خونِ دل میرا ترے رخسار کا غازہ نہ تھا

چور گھس آئے، تو سنگی چوکھٹوں کے دن پھرے
اس سے پہلے میرے گھر میں کوئی دروازہ نہ تھا

لمحہ لمحہ زندگی نے خرچ کر ڈالا ہمیں
وقت جب آیا بکھرنے کا تو شیرازہ نہ تھا

محمد شاہد پٹھان
جونیئر ریسرچ فیلو شعبۂ اردو و فارسی
راجستھان یونی ورسٹی، جے پور

غزل

درد بن کر جگر میں رہنا ہے
اُن کے قلب و نظر میں رہنا ہے

کوئی منزل نہیں مری منزل
عمر بھر اک سفر میں رہنا ہے

کیا قیامت ہے اہلِ دانش کو
کم نظر کی نظر میں رہنا ہے

خدشۂ جان تھا تحفظ میں
اب تو خوف و خطر میں رہنا ہے

چوٹ سینے کا حوصلہ رکھیں
جن کو شیشے کے گھر میں رہنا ہے

اور کب تک مرے خدا مجھ کو
دستِ زیر و زبر میں رہنا ہے

عمر غربت میں کٹ گئی شاہد
مر کے اب اپنے گھر میں رہنا ہے

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی
کٹرہ پردل خاں
اٹاوہ۔ یوپی

غزل

فتنۂ گردشِ حالات الٰہی توبہ
روز ہوتے ہیں فسادات الٰہی توبہ

ذرہ ذرہ سے ابھر آئے مصائب کے پہاڑ
عصرِ حاضر کے طلسمات الٰہی توبہ

ہم کو ڈستا ہے تعصب کے اندھیروں کا عتاب
ناگ بن جاتی ہے ہر رات الٰہی توبہ

اپنے گھر کے در و دیوار سے جی ڈرتا ہے
ذہن و دل میں ہیں وہ خدشات الٰہی توبہ

ناموافق ہے زمانے کی ہواؤں کا مزاج
اُف یہ بڑھتے ہوئے خطرات الٰہی توبہ

زندگی موت کا بازار نظر آتی ہے
اہلِ دنیا کی عنایات الٰہی توبہ

بغض و نفرت کے شراروں کو ہوا دیتے ہیں
تنگ ذہنوں کے خیالات الٰہی توبہ

راز کو رازِ عقائد سے پریشاں ہے سماج
جان لیوا ہیں رسومات الٰہی توبہ

بسمل عارفی
بشنپور، حکیم آباد، سمستی پور۔

نسیم شاہجہاں پوری
تاریخ جلال نگر، شاہجہاں پور، یوپی

لوٹ کر مجھ کو اجنبی کی طرح
وہ چلا جائے گا گمان میں تھا
اس کو دنیا حسین کیوں نہ لگے
جو خیالوں کے سائبان میں تھا
ایک چلتی نہ تھی ہواؤں کی
تیرا آنچل جو بادبان میں تھا
جس طرح لوٹتا ہے وجود مرا
ایسے ٹوٹے گا کب گمان میں تھا

حشر تک جس عمل کی ضو سے تابندہ رہے
آدمی کو چاہیے وہ مر کے بھی زندہ رہے
یوں گزارو زندگی مینا نہ ہر روز میں
کچھ غم ماضی رہے، کچھ فکر آیندہ رہے
مثلِ انجم کی طرح ہم آسمانِ وقت پر
ذرۂ ناچیز ہو کر بھی درخشندہ رہے
کوئی کام ایسا کرو جس سے قیامت تک نسیم
کام بھی جاری رہے اور نام بھی زندہ رہے

دلکش غازی پوری
بی۔ اے، کالج۔ بنارس

شاہد عزیز
محلہ تلائی، اُدے پور۔

چاند لکھا نہ کبھی پھول کا پیکر لکھا
ہاں مگر میں نے ہمیشہ اسے دلبر لکھا
ایک حقیقت تھی جسے میں نے فراموش کیا
اک فسانہ تھا جسے آپ نے اکثر لکھا
صرف اک دل تھا جسے پڑھنے کی توفیق ہوئی
میری آنکھوں نے جدائی کا جو منظر لکھا
غور کر لینا کبھی اس پہ بھی تنہائی میں
اس نے دلکش تمھیں کیوں راہ کا پتھر لکھا

مجھ کو بھی تم بھول گئے
میں تو اب تک زندہ ہوں

عکس مرا مٹ سکتا ہے
لیکن میں پایندہ ہوں

میرا مٹنا مشکل ہے
میں حرفِ آیندہ ہوں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

حضرت محمدؐ اور قرآن (مذہب) ڈاکٹر رفیق زکریا ۲۶/-
تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات (تاریخ) ڈاکٹر سید جمال الدین ۱۰/-
بیسویں صدی میں سماجی انصاف کی تعلیم (خطبہ) پروفیسر اختر الواسع ۱۰/-
سائنس کی ترقی اور آج کا سماج (خطبہ) ڈاکٹر سید ظہور قاسم ۱۰/-
اردو صحافت، صداقت اور آزادیِ رائے 〃 عشرت علی صدیقی ۱۰/-
تفہیم (مضامین) رشید حسن خاں ۱۵/-
شناس و شناخت (تنقید) پروفیسر انور صدیقی ۶۶/-
کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے (مضامین) ڈاکٹر سید نقی حسین جعفری ۵۰/-
چہرہ در چہرہ (طنز و مزاح) مجتبیٰ حسین ۵۱/-
فی البدیہہ (〃) یوسف ناظم ۲۵/-
تعلیم و تعلم (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۷۵/-
سرسید اور روایت کی تجدید۔ پروفیسر مونس رضا (خطبہ) ۱۲/-
سرسید اور اردو یونیورسٹی۔ پروفیسر مسعود حسین خاں (خطبہ) مرتبہ خواجہ محمد شاہد
شعریات سے سیاسیات تک غلام ربانی تاباں ۵۱/-
اردو شاعری کی گیارہ آوازیں (تنقید) عبدالقوی دسنوی ۷۵/-
انشا اور تلفظ (طلبہ کے لیے) (قواعد) رشید حسن خاں ۹/-
عبارت کیسے لکھیں 〃 〃 〃 ۱۵/-
آدم خور چیتا (شکاریات) ریاض احمد خاں ۴۵/-
انداز گفتگو کیا ہے (تنقید) شمس الرحمٰن فاروقی ۷۰/-
دستک اس دروازے پر وزیر آغا ۵۱/-
آزمائش کی گھڑی (مضامین) سید حامد ۵۲/-
جھینی جھینی بینی چدریا (ناول) عبدل بسم اللہ ۷۵/-
صحرانورد کے خطوط (افسانے) میرزا ادیب ۷۵/-
میں سمندر ہوں (شعری مجموعہ) فرحان سالم ۳۰/-
اسرار خودی (فراموش شدہ اڈیشن) شائستہ خاں ۷۵/-
مسلمانوں کا تعلیمی نظام (مضامین) ضیاء الحسن فاروقی ۴۵/-
جام جہاں نما اردو صحافت کی ابتدا (صحافت) گربچن چندن ۷۵/-
عموری اور بابلی تہذیب و تمدن (تاریخ) مالک رام ۷۵/-

اپنے دل کی حفاظت کیجیے (ایلوپیتھی) ترجمہ نذیر الدین مینائی ۲۶/-
شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان (سوانح) تالیف مولانا حکیم محمود احمد برکاتی ۴۰/-
تذکرۂ ماہ و سال (تذکرہ) مالک رام ۱۲۵/-
افکار اقبال (تنقید) محمد عبدالسلام خاں ۱۲۵/-
تحقیق نامہ (تحقیق) مشفق خواجہ ۵۱/-
تاثر نہ کہ تنقید (تنقید) صدیق الرحمٰن قدوائی ۵۰/-
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے (انٹرویوز) طاہر مسعود ۳۶/-
گوشے میں قفس کے (طنز و مزاح) دلیپ سنگھ ۴۵/-
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (ناول) کشمیری لال ذاکر ۴۰/-
سحر کے پہلے اور بعد (جگ بیتی) سید المظفر چغتائی ۵۷/-
تحریریں (مضامین) اسلم پرویز ۵۷/-
سفر (ناول) رابعہ تبسم ۲۶/-
خواب اور خلش (شعری مجموعہ) آل احمد سرور ۴۶/-
بانگ درا مکمل علامہ اقبال ۹/-
بال جبریل مکمل 〃 ۶/-
ضرب کلیم (اردو نظمیں) 〃 ۶/-
غبار منزل (شعری مجموعہ) غلام ربانی تاباں ۴۵/-
پیامی قواعد اردو (قواعد) (ادارہ) ۶/-
〃 〃 (خورد) (〃) ۳/-
فریدؒ و فرد فریدؒ (سوانح) ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۶/-
پہچان اور پرکھ (تنقید) پروفیسر آل احمد سرور ۵۱/-
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم (مضامین) ڈاکٹر سلامت اللہ ۵۱/-
اقبال کا نظریۂ خودی (تنقید) ڈاکٹر عبدالمغنی ۱۵/-
پت جھڑ کی آواز (افسانے) قرۃ العین حیدر ۷۵/-
جدید افسانے اور اس کے مسائل (تنقید) وارث علوی ۳۶/-
قلندر بخش جرأت (خطبہ) جمیل جالبی ۱۰/-
پیامی بیسک انگلش اردو ڈکشنری (ادارہ) ۱۲/-
پیامی ہوم ڈکشنری اردو انگلش 〃 ۱۶/-

کتاب نما کے خصوصی شمارے

مغیث الدین فریدی	مرتبہ	ظہیر احمد صدیقی	۴۵/:
خواجہ حسن نظامی	مرتبہ	نثار احمد فاروقی / ریحان احمد عباسی	۱۵/:
مولانا عبدالوحید صدیقی	مرتبہ	پروانہ ردولوی	۱۵/:
غلام ربانی تاباں	"	اجمل اجملی	۷۵/:
عابد علی خاں	"	مجتبیٰ حسین	۴۵/:
خواجہ احمد فاروقی	"	ڈاکٹر خلیق انجم	۴۵/:
علی سردار جعفری	"	ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی	۴۵/:
اختر سعید خاں	"	ڈاکٹر سید حامد حسین	۱۵/:
نثار احمد فاروقی	"	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵/:
پروفیسر مسعود حسین خاں	"	ایم حبیب خاں	۴۵/:
ڈاکٹر اجمل اجملی	مرتبہ:	علی احمد فاطمی / عذرا مجیب	۴۵/:
فرمان فتح پوری نمبر	مرتبہ	خلیق انجم	۲۵/:
صالحہ عابد حسین نمبر	"	عزیز قریشی	۴۵/:
نئی نظم کا سفر	"	خلیل الرحمٰن اعظمی	۴۵/:
مشرقی علوم والسنہ پر تحقیق		حامد حسین	۳/:
پریم چند نمبر		عبدالقوی دسنوی	۸/۵۰
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر		کرنل بشیر حسین زیدی	۳۱/:
مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر		ادارہ	۱/۵۰
مرزا سلامت علی دبیر نمبر	مرتبہ	عبدالقوی دسنوی	۷/۵۰
جوش ملسیانی نمبر		ساحر ہوشیارپوری	۵/۵۰
خواتین افسانہ نگار نمبر		ڈاکٹر صغرا مہدی	۴/۵۰
عرش ملسیانی نمبر		مالک رام	۱۲/۵۰
سکندر علی وجد نمبر		یوسف ناظم	۲۵/:
نعت نویسی کے مسائل نمبر		پروفیسر گوپی چند نارنگ	۳۵/:
عبداللطیف اعظمی نمبر		(ادارہ)	۱۸/:
جائزے	مرتبہ	مظفر حنفی	۴۵/:
جگن ناتھ آزاد نمبر		ایم حبیب خاں	۱۵/:

معیاری ادب سیریز

موازنۂ انیس و دبیر	مرتبہ	رشید حسن خاں	۲۴/:
نیرنگِ خیال	"	مالک رام	۱۵/:
یادگارِ غالب اردو	مرتبہ	مالک رام	۲۵/:
یادگارِ غالب فارسی	"	مالک رام	۹/:
انتخاب مضامینِ سرسید	"	انور صدیقی	۱۶/:
حیاتِ سعدیؒ	"	رشید حسن خاں	۳۶/:
فسانۂ آزاد (تلخیص)	"	ڈاکٹر قمر رئیس	۷۵/:
فردوسِ بریں	"	عبدالحلیم شرر	۱۶/:
انتخاب مضامین شبلی	"	رشید حسن خاں	۷۵/:
انتخابِ ناسخ	"	"	۷۵/:
مثنوی بحرالمحبت	"	عبدالماجد دریابادی	۹/۵۰
شریف زادہ	"	ڈاکٹر قمر رئیس	۲۰/:
امراؤ جان ادا	"	ڈاکٹر محمد حسن	۲۸/:
فسانۂ مبتلا	"	صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۰/:
توبۃ النصوح	"	مالک رام	۳۶/:
باغ و بہار	"	رشید حسن خاں	۲۴/:
ابن الوقت	"	ڈاکٹر خلیق انجم	۴۲/:
مجالس النساء	"	صالحہ عابد حسین	۲۴/:
گذشتہ لکھنؤ	"	رشید حسن خاں	۷۵/:
قصہ حاتم طائی	"	اطہر پرویز	۷۵/:
انتخابِ ولی	"	سید ظہیر الدین مدنی	۲۶/:
انتخابِ سراج اورنگ آبادی	"	ڈاکٹر محمد حسن	۱۰/:
انتخابِ مراثی انیس و دبیر	"	رشید حسن خاں	۳۶/:
انتخابِ نظیر اکبرآبادی	"	"	۳۶/:
انتخابِ اکبر الٰہ آبادی	"	صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۸/:
انتخابِ کلام میر	"	ڈاکٹر محمد حسن (زیر طبع)	
دیوانِ درد	"	رشید حسن خاں	۳۰/:
انتخابِ سودا	"	"	۷۵/:
انتخابِ قلی قطب شاہ	"	محمد اکبر الدین صدیقی	۲۷/:
انتخابِ ذوق	"	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	۲۴/:
مثنوی سحرالبیان	"	رشید حسن خاں	۲۱/:
مثنوی گلزارِ نسیم	"	"	۱۶/:
افاداتِ سلیم	"	ڈاکٹر خلیق انجم	۲۱/:
مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ	رشید حسن خاں	۲۷/:

م۔م۔ راجندر

ذہین شرارتیں شریر ذہانتیں

شرارت کے لغوی معنی خاصے وسیع ہیں اور بے ضرر ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ اور گڑبڑ سے لے کر دنگے فساد اور جرم تک کا احاطہ کرتے ہیں۔ جب ہم سنجیدہ قسم کی بڑے پیمانے پر ضرر رساں شرارت کا ذکر کرتے ہیں جس سے سماجی سطح پر نقص امن کا اندیشہ ہوتا ہے تو ایسی شرارت کا ارتکاب کرنے والوں کو ہم شرارتی کی بجائے، انگریزی کے زیر اثر شرارت پسند عناصر سے تعبیر کرتے ہیں۔ تاہم اپنے عام مفہوم میں شرارت سے مراد بے ضرر کھلواڑ اور چھیڑ چھاڑ ہے جس کا اثر وقتی اور محدود طور پر ہوتا ہے۔ ایسی شرارتوں کا ارتکاب عموماً بچوں اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی جانب سے ہوتا ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے جذبہ شرارت کمزور ہوتا جاتا ہے، ماسوائے معدودے چند لوگوں کے، جو فطری طور پر مزاح پسند ہوتے ہیں اور ہنسی مذاق جن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

ذہانت یعنی عقل و فہم اور فراست ہر انسان میں ودیعت ہوتی ہے، کم یا زیادہ۔ مگر جب ہم ذہانت یا کسی ذہین آدمی کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ جتانا مقصود ہوتا ہے کہ وہ عام لوگوں سے زیادہ زود فہم ہے۔ اب جو آدمی ذہین ہوگا اس کی ذہانت کا اطلاق اس کے ہر عمل پر ہوگا بشمولیت اس کی شرارتوں کے، اور اس طرح ذہین شرارتیں وجود میں آئیں گی۔ بہ الفاظ دگر جب اسے کوئی شرارت سوجھے گی تو اس کا طریق عمل اور اس کا نتیجہ اس کی ذہانت سے عبارت ہوگا اور اس لیے زیادہ موثر ہوگا۔

اس ضمن میں ایک بات کی تمیز کرنا ضروری ہے کہ جب ذہین شرارتوں کی بات کرتے ہیں تو الفاظ کی اس آمیزش میں شرارتوں کا عنصر غالب ہے۔ ذہین شرارتیں بھی عام مفہوم میں شرارتیں ہی ہوں گی مگر اس فرق کے ساتھ کہ انھیں ذہانت سے سوچا اور پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا ہے۔ اس کے برعکس جب "شریر ذہانتوں" کا ذکر ہوگا تو ہمارا مقصود ذہانتوں پر زور دینا ہوتا ہے۔ ایسی ذہانتیں جو شرارت کے پہلوؤں سے متحرک ہوتی ہیں عمل اور نتیجے کے زاویوں سے "شریر ذہانتیں" پورے سماج کو اتھل پتھل کر سکتی

ہیں۔

مشہور انگریز فلاسفر اور اسکالر سر برٹر ینڈ رسل نے ایک مرتبہ لندن میں طلبہ کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "تم سب اپنے علمی اکتساب اور دوسری حصولیابیوں کی بنا پر دوسرے عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ذہین ہو مگر عمر کی ایک ایسی منزل میں ہو جہاں شرارت کا سوجھنا عین اغلب ہے۔ میں تمھارے لیے یہ دعا کرتا ہوں کہ تم شریر ذہانت کے تابع کبھی نہ ہو۔ ہاں ذہین شرارت خوش باشی کی علامت ہے اور کاش یہ دیر تک تمھارے ساتھ رہے"! جب ایک طالب علم نے کھڑے ہو کر رسل سے درخواست کی کہ "وہ جدید تاریخ میں سے شریر ذہانت کی کچھ مثالیں دیں" تو انھوں نے کہا کہ "میں صرف چند ایسے نام لینے پر اکتفا کروں گا جن کے سیاہ اعمال سے تم سب واقف ہو"! انھوں نے جو نام لیے وہ یہ تھے ہٹلر، مسولینی اور اسٹالن کے!

برٹر ینڈ رسل کے لیے ہوئے ان ناموں کے علاوہ ہمیں "شریر ذہانت" کی اور بھی کئی مناسب مثالیں مل جاتی ہیں۔ ہندو مائتھولوجی میں اور موجودہ اسلامی ممالک کی قدیم تاریخ میں جو نام فی الفور ذہن میں آتے ہیں ان میں راون اور فرعون کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ذہانت بلا شبہ انسان کی ایک بڑی تخلیقی قوت ہے جس سے دوسری مخلوقات محروم ہیں کیوں کہ ان کی سوچنے اور عمل کرنے کی قوت ان کی ضرورتوں تک محدود رہے جن میں ان کے انسانی مالکوں کی خوشنودی بھی شامل ہے۔ انھیں سدھایا بھی جاسکتا ہے۔ جیسا کہ سرکس کے جانور، مگر ذہانت انسان کی ایسی اینٹھی قوت ہے جس میں تعمیری اور تخریبی دونوں کام لیے جاسکتے ہیں۔ اب تک بے جان اشیا جن میں مشینیں بھی شامل ہیں ذہانت سے قطعی مبرّا سمجھی جاتی تھیں مگر سائنس کا کمال دیکھیے کہ کمپیوٹر میں انسانی ذہانت پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جس میں کامیابی بھی ہورہی ہے۔ مشینوں کی اس ذہانت کو آرٹی فیشل انٹیلی جینس یعنی 'مصنوعی ذہانت' کا نام دیا گیا ہے اور امریکہ اس سلسلے کی مزید تحقیق اور تجربوں میں پیش پیش ہے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ مستقبل قریب میں کمپیوٹر اور اس قسم کی دوسری مشینیں انسانوں کی طرح از خود "سوچ" سکیں گی اور اپنا کام انسانوں کی طرح ہی سرانجام دیں گی مگر ساتھ ہی اس اندیشے نے بھی اپنا سر اٹھالیا ہے کہ کہیں انسان اپنی شریر ذہانت کا کوئی عنصر اس میں داخل نہ کردے۔

شریر ذہانت کی ایک اور تازہ مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ حال ہی میں اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ ایک انیس سالہ امریکن نوجوان بیدزنی اور جرمانے کی فوری سزا بھگتنے کے بعد ایک سال کی جیل کی سزا کاٹ رہا ہے کیوں کہ اس نے ایک رات شرارتاً دو درجن سے زائد پارک ہوئی کاروں کو پتھروں اور لوہے کی سلاخ سے بھاری نقصان پہنچایا تھا! جب کورٹ کے حکم سے دماغ کے ڈاکٹروں اور نفسیات کے ماہرین نے اس کا معائنہ کیا

تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مجرم ایک بیحد ذہین آدمی ہے مگر اس کا ذہن شرارت کی طرف مائل ہے۔ اس رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ "شریر ذہانت" اور "دیوانگی" کے درمیان کوئی واضح حدِ فاصل نہیں ہے مگر شریر ذہانت کے مالک کو دیوانہ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اب آپ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ذہین شرارت اور شریر ذہانت کی اصطلاحات دو مختلف بلکہ متضاد کیفیتوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ نطشے نے ایک مرتبہ مزاح کی تعریف کرتے ہوئے اسے ایک ایسی شگفتگی اور فرحت بخش خیال اور عمل بتایا تھا جو عامل اور معمول دونوں کو محظوظ کرتا ہے اور شرارت بمعنی کھلواڑ اس کا ایک اہم جزو ہے۔ شرارت کا ارتکاب عموماً بچے کرتے ہیں جن کے لیے کھیل کود، ہنسنا ہنسانا ایک قدرتی فعل ہے۔ بچے کھیل کود میں ایک دوسرے کو دھکا دے دیتے ہیں۔ مار دیتے ہیں اور دوسروں کا کھیل بگاڑ دیتے ہیں۔ بلکہ ان کی چیزیں تک چھپا دیتے ہیں۔ جب ایسے بچوں کی شکایت کی جاتی ہے تو قدرتی طور پر انھیں شریر سمجھا جاتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جو بچے زیادہ ذہین ہوتے ہیں ان میں عموماً شرارت کا مادّہ عموماً کم ہوتا ہے مگر وہ جب بھی شرارت کریں گے تو اس میں ان کی ذہانت زیادہ کارفرما ہوگی۔ اور اسی نسبت سے ان کی شرارت ضرر رساں یا کم از کم دل آزار نہیں ہوگی۔ ذہین بچے کسی بھی شرارت کو اس کے عام طریقے سے کیے جانے پر راغب نہیں ہوتے اور اسے ایک نیا رنگ اور ڈھنگ عطا کر دیتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا شرارت کا مادّہ بچوں کے علاوہ نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں اور جوان مردوں اور عورتوں میں ہوتا ہے۔ لڑکیاں اور عورتیں، لڑکوں اور مردوں کے مقابلہ میں کم شریر ہوتی ہیں جب کہ غیر شادی شدہ مرد اور عورتیں، شادی شدہ مرد اور عورتوں کے تقابل میں، زیادہ شریر ہوتے ہیں۔ معصوم یا غیر مضر شرارتوں میں ذہین شرارت کی ایک حالیہ مثال یہ ہے کہ رات کے اندھیرے میں کسی راہ گزر پر ایک رسی ایک نظر آنے والے تار سے باندھ کر ڈال دی جائے اور جیسے ہی کوئی راہ گیر اس کے پاس پہنچے، چھپا ہوا شرارتی لڑکا تار کو کھینچ کر رسی کو اس طرح بل دے کر ہلائے کہ راہ گیر کو رسی سانپ لگے اور ڈر کے مارے اس کی چیخ نکل جائے۔

ذہین شرارت کی ایک اور دلچسپ مثال پرانی دلّی کی سماجی تاریخ کے حوالے سے بھی دی جاسکتی ہے۔ دلّی کی گلیوں اور سڑکوں پر ہولی کا تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ آدمی کرتے اور دھوتی کے ساتھ سفید یا سیاہ رنگ کی دوپلی سر پر اوڑھتے تھے۔ ان دنوں باہر ننگے سر پھرنا خلافِ تہذیب سمجھا جاتا تھا اور ہولی جیسے تہوار پر بھی جس میں ہر طرح کی ہڑدنگ مچتی تھی دلّی والے اپنی ٹوپی نہیں چھوڑتے تھے۔ گر جاتی تھی تو زمین سے اُٹھا کر اور ہاتھ یا اپنے کرتے کے پلّے سے جھاڑ کر پھر سر پر رکھ لیتے تھے۔ ہولی کے موقعے پر شرارتی لڑکے چھتوں پر چڑھ جاتے تھے اور پتلی رسّی سے بندھے اپنے کانٹے سے نیچے ہولی کھیلنے والوں کی سر پر اوڑھی دوپلی کو

کمال ہوشیاری سے اوپر اُچک لیتے تھے اور پہننے والوں کو پتا بھی نہیں لگتا تھا۔ یہ ٹوپی اسی وقت واپس کی جاتی تھی جب اس کا مالک لڑکوں کے ہاتھ پر اٹھنی چونّی رکھ دیتا یا حلوائی کی دکان سے مٹھائی کھلواتا۔

القصہ شرارت کرنا بھی ہمارے بڑھنے اور بڑے ہونے کا ایک اہم جزو ہے۔ اگر ذہانت بھی اس میں عمل پیرا ہو جائے تو لطف دونا ہو جائے گا مگر خدا نہ کرے کہ ہماری ذہانتیں ہی شریر ہو جائیں۔ شریر ذہانتیں جیسا کہ آپ نے دیکھا خطرناک نتائج کی حامل ہو سکتی ہیں۔

(آل انڈیا ریڈیو دہلی سے براڈ کاسٹ)

یوسف ناظم
۱۹ الہلال - ۱۳۰ - باندرہ
ریکلیمیشن بمبئی

اکیسویں صدی آرشمیدس کے حوالے سے

ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ سارے جہاں کا درد اِن کے جگر میں کیوں آگیا ہے لیکن میں اپنی حد تک یہ سمجھتا ہوں کہ بیسویں صدی کے ایک سینئر بلکہ کہنہ شہری کی حیثیت سے مجھ پر یہ ذمے داری عاید ہوتی ہے کہ ایک عام غلط فہمی کے ازالے کا کچھ بندوبست کروں۔ یہ غلط فہمی آنے والی صدی کی رونمائی کی تاریخ سے متعلق ہے اور افواہ کی طرح ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں نفسِ مضمون کے بارے میں اظہار خیال کروں۔ یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نہ تو میں آئن اسٹائن کا رشتہ دار ہوں اور نہ ماہر ریاضیات پروفیسر رضی الدین صدیقی کا طالب علم بلکہ میں تو ریاضی کا وہ غیر معمولی طالب علم ہوں کہ میں جب آٹھویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھا تو حساب کے مضمون میں امتیاز یہ تھا کہ مجھے امتحان میں منفی پانچ نمبر عطا کیے گئے تھے اور استاد محترم نے فرمایا تھا کہ یہ نمبر بھی رعایتاً دیے جا رہے ہیں اس سانحے کو گزرے مدت ہو گئی لیکن یہ زخم اب تک ہرا ہے اور میں انتہائی کوشش کے باوجود آج تک یہ حساب نہیں کر سکا کہ یہ منفی پانچ نمبر مجھے کس حساب سے دیے گئے تھے اس واقعے کی روشنی میں سمجھ لیجیے کہ میں حساب کے مضمون میں کتنا ذی علم ہوں (دوسرے مضامین میں بھی شاید یہی حال ہو) لیکن جہاں تک صدی اور سال کے دنوں کے حساب کتاب کا معاملہ ہے آپ اس معاملے میں مجھے نکتہ چیں بھی کہیں تو اس لفظ پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا کیونکہ میں تو وہ نکتہ چیں ہوں جو خود غمِ دل سنانے کے لیے مضطرب ہے۔ ماہ و سال کا حساب کتاب کتنا پیچیدہ ہے آپ جانتے ہیں۔ ان پر غور اور غور کے علاوہ خوض کرتے ہوئے تندرست سے تندرست آدمی لڑکھڑا جاتا ہے اور دیکھنے والے کو شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ شخص کہیں وہ واعظ تو نہیں ہے جسے اس نے کل میکدے سے نکلتے وقت دیکھا تھا یہ پیچیدگی یوں ہے کہ ہفتے کے ۷ دن ہوتے ہیں اور مہینے کے ۴ ہفتے لیکن جب کسی مہینے کے دن جوڑے جاتے ہیں تو یہ ۲۸ نہیں ہوتے۔ کبھی ۳۰ اور کبھی ۳۱۔ (یہ بھی یاد رکھنا پڑتا ہے کہ کون سا مہینہ تیسا ہے اور کون سا اکتیسا)۔ لوگ یہ سمجھ کر دفتر جاتے ہیں آج پہلی تاریخ ہے اور تنخواہ ملے گی لیکن دفتر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ نیا مہینہ طلوع ہی نہیں ہوا ہے۔ مزید پریشانی یہ ہے کہ ایک مہینہ اٹھائیس دن کا بھی مرتب کر دیا گیا ہے (یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شاعر صرف چار شعر کہہ کر سمجھ لیتا ہے کہ اس نے پوری غزل کہہ ڈالی)۔ چلیے یہ بھی مان لیا لیکن اس میں بھی ہر چار سال کے بعد ایک دن کا اضافہ ہو جاتا ہے یعنی مقطع اور پھر حُسنِ مقطع۔ یہ زائد دن کدھر سے نمودار ہوا۔ یہ روزِ ازل ہے یا

روز ہزل۔ جو غریب فروری کی ۲۹ تاریخ کو نمودار ہوتے ہیں چار چار سال تک اپنی سالگرہ نہیں منا سکتے۔ کنفیکشنروں کو الگ گھاٹا۔ خود اس لڑکے کا بھی کتنا نقصان ہوتا ہے۔ اس کی سالگرہ کی دعوت میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو چار تحفے لے کر آجائے۔ اور آگے بڑھیئے تو سال میں باون ہفتے ہوتے ہیں (سال نہ ہوا گنجفہ ہو گیا، تاش کی گڈی) ہفتے کے سات دن کے حساب سے سال کے حبلہ ۳۶۴ دن ہونے چاہییں لیکن نہیں۔ سال میں ۳۶۵ دن ہونے لگے۔ شاعری کا الف زائد یہاں کہاں آگیا۔ میں تو اسے تاش کی گڈی کے حساب سے جوکر دن کہوں گا۔ پتا نہیں یہ جوکر کس شاطر کی آستین میں تھا۔ یہ حساب ہے یا کسی معشوق کی کرشمہ ساز کہ جو چاہے کرے۔ ریاضی کی انہی خوبیوں کی وجہ سے عام طور پر شریف الخاندان طلبہ اس مضمون میں ہمیشہ حسن و خوبی فیل ہوتے اور بعد میں اردو یا فارسی جیسے مضامین لے کر ام۔ اے تک پہنچ جاتے ہیں۔ (جو زیادہ فی ہوتے ہیں وہ تو ایک دو منزلیں اور بھی طے کر لیتے ہیں۔ فی کے لفظ پر بگڑیے مت۔ میرا مطلب ہے ریاضی کے مضمون میں فی)۔ آپ شاید بور ہو رہے ہیں ہونا ہی چاہیے۔ تمہید اتنی لمبی ہو جائے تو کون ہے جو گم کتا نہیں جائے گا لیکن نفس مضمون پر اظہار خیال کرنے سے پہلے آپ کو ریاضی کے اس ضرر رساں پہلو سے واقف کرانا ضروری تھا۔ اور غالب نے دلوں کی تعداد میں اتنی او پنچ نیچ دیکھ کر جب اپنے ممدوح کو درازی عمر کی دعا دی تھی تو اس درازی کو طوالت تک پہنچا دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار۔ غالب ہمیں اسی لیے پسند ہیں۔ ان کے ایک شعر نے سارے ماہرین ریاضیات کو اس شعر کی تخلیق کے بعد سے آج تک "مبتلائے درد۔ کر رکھا ہے اور ان کی آنکھوں سے (یا کم سے کم ایک آنکھ سے) آنسو بہتے رہتے ہیں۔ ریاضی کے مضمون میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ ایک دانش گاہ میں یہ آرٹس کا حصہ ہے تو دوسری دانش گاہ میں سائنس کا، اس لیے ریاضی کے گریجویٹ بی۔ اے بھی ہوتے ہیں اور بی ایس سی بھی اور لوگ تصفیہ نہیں کر پاتے کہ ان دونوں میں اصلی کون ہے اور کس کا چال چلن مشتبہ ہے، ٹھہریے میں اپنے موضوع کی طرف بس آیا ہی چاہتا ہوں۔ موضوع سخن ہے وہ غلط فہمی جو اکیسویں صدی کے یوم ولادت کے تعلق سے پھیلی ہوتی ہے۔ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ جونہی ۲۰۰۰ء کے اعداد "وائٹ پیپر" پر نمودار ہوں گے اکیسویں صدی شروع ہو جائے گی۔ ایسا نہیں ہے عام آدمی تو خیر عام آدمی ہوتا ہے اور سوائے ووٹ دینے کے اسے کسی اور مصرف کا سمجھا نہیں جاتا اس لیے اگر وہ ایسا سوچ تو ملک و قوم کی معیشت یا افراط زر پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن جب یہ غلط فہمی عوام کے حلقہ دام خیال سے نکل کر خواص اور دانشوروں کو اپنی گرفت میں لے لے تو میں دل مسوس کر رہ جاتا ہوں (یہ ایک کیفیت ہوتی ہے جو غلمان وغیرہ قسم کی ہوتی ہے) میری یہ کیفیت اس وقت ہوئی جب میں نے سن رواں کے وسط میں کہیں یہ پڑھا کہ ساڑھے پانچ سال بعد ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو جائیں گے۔ ساڑھے چورانوے میں میں نے ساڑھے پانچ جمع کیے تو حاصل جمع دو ہزار ہوا اور میرے حساب سے ۲۰۰۰ء تو بیسویں صدی کا آخری سال ہوگا اور اکیسویں صدی کو منظر عام پر آنے کے لیے مزید ایک سال تک ٹھہرنا ہوگا۔ صدیاں متحرک ضرور ہوتی ہیں لیکن ایک اکائی

کی طرح جامد بھی ہوتی ہیں۔ ان میں تعجیل یعنی سیزرین ولادتوں کا رواج نہیں ہے۔ جس طرح نواں سال پہلی دہائی کا آخری سال نہیں ہوتا اسی طرح ۱۹۹۹ء بھی اس صدی کا آخری سال نہیں ہو سکتا۔ ہمارے تنقید نگار حضرات بھی گو کہ خاصے پڑھے لکھے لوگ ہیں اور ان میں سے بیشتر تو باہر کے ملکوں کی سیاحت اور اقامت کے باعث اپنے مبلغ علم میں تھوڑا بہت اضافہ بھی کر چکے ہیں، دہائیاں گنتے وقت چوک جاتے ہیں اور افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے منتخر کریم کو آٹھویں دہے کا سب سے بڑا افسانہ نگار قرار دے دیتے ہیں۔ یہ غلطی ان سے اس وجہ سے ہوئی ہے کہ وہ ۸ کے ہندسے پر زور دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ ہندسہ تو دوزخی وابستہ ہوتا ہے مثلاً ۸۰ پر ختم ہونے والی دہائی آٹھویں ہوتی ہے اور ۸۱ سے شروع ہونے والی دہائی نویں ہوتی ہے اور اب جس دہے میں ہم سانس لے رہے ہیں وہ نواں نہیں دسواں دہا ہے۔ یہ ساری گڑبڑ اس لیے ہے کہ پہلے دہے میں ایک کا ہندسہ نہیں ہے۔ ہے تو سہی لیکن صرف دہے کے اختتام پر جیسے کہ رسم شکریہ ہوتی ہے۔ یہی حکمت صدیوں کی شناخت کے سلسلے میں روا رکھی گئی ہے صدی کا اشاریہ ہوگا انیس سو لیکن وہ صدی بیسویں صدی ہوگی۔ ہمیں انھی حالات میں زندگی بسر کرنی ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی تنقید نگار کسی شاعر کو کسی صدی کا سب سے بڑا شاعر کہتا ہے (بغیر پیسے لیے) تو پہلے دیکھ لینا چاہیے کہ اس تنقید نگار سے کم سے کم صدی کی شناخت میں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی ہے۔ شاعر کی شناخت میں تو فاش غلطی یقینی ہے۔ اس قبیل کے نقادوں کی 'شکم پناہی' کے لیے صف دوم کے تنقید نگار اپنی اپنی بساط کے مطابق مضامین لکھتے ہیں۔ محمود اور ایاز، ادب میں بافراط پائے جاتے ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ دونوں ایک ہی صف میں کھڑے نہیں ہوتے۔ ایاز ادباً پیچھے کی صف میں رہتا ہے۔ یہاں اس کی حیثیت 'خدام ادب' کی جمعیت کے ایک رکن کی ہوتی ہے اور وہ 'شور قیامت' کو بھی محمود کے سرہانے پہنچنے سے منع کرتا ہے۔

ریاضی کے جن اہم نکات اور آرام دہ مسائل کی طرف میں نے آپ کی توجہ مبذول کرائی ہے ان کا سہرا، میری دانست میں ماہر ریاضیات (اور شاید ماہر اوزان بھی) آرشمیدس کے سر ہے۔ (اس نام کے صوتی آہنگ پر تو میں کئی دفعہ لوٹ پوٹ ہو چکا ہوں) یہ شخص ملک یونان کا باشندہ تھا۔ یہ بات ہے بہت پرانی یعنی قبل مسیح کی ہے۔ اس وقت شاید تیسری صدی قبل مسیح رہی ہوگی۔ یاد رہے کہ قبل مسیح صدیاں اُلٹے پاؤں چلتی ہیں۔ آرشمیدس کی شہرت کی بنیاد، آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ایک تاج شاہی ہے۔ یونان کے ایک بادشاہ کو ہمیشہ یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ اس کے سر پر جو تاج (دن کے اوقات میں) رکھا جاتا ہے وہ مکمل طور پر سونے کا ہے یا اس میں کوئی دوسری (کم ظرف) معدنیات بھی شامل ہیں لیکن پورے یونان میں کوئی شخص بھی اتنا مدبر نہیں تھا جو اس نازک مسئلے کی تہ تک پہنچ سکتا۔ کہا جاتا ہے اس فکر و تردد کی بنا پر شاہ موصوف کے سر میں درد نے مستقل رہائش اختیار کر لی۔ آرشمیدس کی ایک خوبی یہ بھی تھی جسے وصف کہنا چاہیے کہ وہ نہ صرف محب وطن تھا

بلکہ شاہ پرست بھی تھا اور جب اس نے اپنے محبوب بادشاہ کی تشویش ناک علالت یعنی مستقل دردِ سر کی خبر سُنی تو وہ بے چین ہو گیا۔ دن بھر حیران پریشان رہتا۔ راتوں میں سوتے سے اُٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ تاج شاہی کی اصل ماہیت معلوم کر کے ہی رہے گا دربار میں تو اس کا آنا جانا تھا ہی۔ محل کے اندر بھی اس کی آمد و رفت تھی۔ ایک دن اس نے خالص سونے کا ایک گولہ جو تاج شاہی کے وزن کے برابر تھا۔ پانی سے بھری ایک بالٹی میں ڈالا اور جتنا پانی باہر چھلک آیا اسے تول لیا اور پھر تاج شاہی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا (غور کیجیے تاج شاہی پانی کی ایک بالٹی میں۔ یہ تو ایک تجربہ تھا لیکن حشر کا بھی) جتنا پانی چھلک کر باہر آیا اسے بھی آرشمیدس نے تول لیا اور پھر دیکھا کہ تاج شاہی کے زیر اثر چھلکنے والا پانی سونے کے گولے کے وزن سے چھلکنے والے پانی کے مقابلے میں کم وزن کا ہے۔ وہ خوشی سے ناچ اٹھا اور کہتے ہیں اسی برہنہ حالت میں سڑک پر نکل آیا۔ اس کے بدن سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور وہ (لاؤڈ اسپیکر کے بغیر) شارع عام پر اعلان کر رہا تھا کہ اس نے تاج شاہی کا راز پا لیا۔ بادشاہ کو جب معلوم ہوا کہ اس کے تاج میں، ملاوٹ ہے تو وہ بھی خوش ہوا۔ آرشمیدس کے اس ریاضیاتی کمال کو ادب کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مجھے وہ اوزان و عروض کا بھی ماہر معلوم ہوتا ہے اس نے تاج شاہی کے معائب دریافت کیے۔ اور اسے خارج از بحر قرار دیا۔ شاہ موصوف نے کہا جاتا ہے سونے کا گولہ بطور انعام آرشمیدس کو دے دیا (تاج شاہی تو دے نہیں سکتا تھا)

میں نے نئی صدی کی آمد کی صحیح تاریخ اس لیے بتلا دی ہے کہ ممکن ہے میں عین وقت پر موجود نہ رہوں اور اگر موجود رہوں تو حافظے سے بات باہر نکل جائے۔ میں چاہوں گا کہ پہلی جنوری ۲۰۰۱ء کو ساری مخلوق (خاص طور پر اشرف المخلوقات) صبح سویرے بیدار ہو۔ غسل کرے اور نئے کپڑے پہنے (جو بھی میسّر ہوں کیونکہ اس وقت تک تو غریبی میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔) اور اگر اتفاق سے ۳۱ر دسمبر ۲۰۰۰ء سنیچر کے دن آئے تو اسی شب ایک شاندار ہمہ لسانی مشاعرہ منعقد کیا جائے جس میں ہندستان کی ساری زبانوں کے شعرا کو کلام پڑھنے کا موقع دیا جائے۔ یہ مشاعرہ سال کے باون ہفتوں میں ہر سنیچر کے دن ترتیب دیا جائے تاکہ ہندستان کی ۶۰۰ زبانوں کی نمایندگی ہو سکے۔ اردو کو بھی موقع دیا جائے ورنہ کہا یہ جانے لگا ہے کہ اب اردو ہندستان کے باہر بھی پھیل رہی ہے۔

میرا یہ بھی جی چاہتا ہے کہ آنے والی صدی میں کم سے کم ایک آرشمیدس اور پیدا ہو۔ خواہ وہ یونان میں پیدا ہو یا بھوٹان میں لیکن پیدا ضرور ہو۔

مجتبیٰ حسین
۷۰۰۔ انکور اپارٹمنٹس
پلاٹ نمبر ۷۔ پٹ پڑ گنج
نئی دہلی ۹۲

ستم کا کرم

ہم جب بھی سفر کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی ستم ہم پر ضرور نازل ہوتا ہے۔ مگر ۹ مئی کو جب حیدرآباد جانے کے لیے ہم دہلی اسٹیشن پر آندھرا پردیش ایکسپریس میں سوار ہوئے تو ہم پر جناب ستم اس طرح نازل ہوئے کہ ہم اپنے آپ سے یہ پوچھنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر یہ ستم ہے تو پھر کرم کس کو کہتے ہیں۔ ستم سے یہاں میری مراد پروفیسر کرشن دیال ماتھر ستم سے ہے۔ جو پہلی بار ٹرین میں اتفاق سے ہمارے ہم سفر بن گئے تھے۔ ہم اپنی نشست پر سامان رکھ کر اچھی طرح بیٹھے بھی نہیں تھے کہ جناب ستم نے اچانک ہم سے پوچھا "کیا آپ محبوب حسین جگر کو جانتے ہیں؟" اس غیر متوقع اور اچانک سوال کے جواب میں ہم نے اثبات میں سر ہلایا تو بولے "تو پھر آپ عابد علی خاں صاحب کو بھی جانتے ہوں گے" ہم نے کہا "آپ بھی کمال کرتے ہیں، جگر صاحب کو جو جانتا ہے وہ عابد علی خاں صاحب اور "سیاست" کو بھی جانتا ہے۔ اور جو عابد علی خاں صاحب کو جانتا ہے وہ جگر صاحب اور "سیاست" سے بھی واقف ہوتا ہے اور جو صرف "سیاست" کو جانتا ہے وہ عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب کو جانے بغیر نہیں رہ سکتا" بولے "آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے "سیاست" ایک فرد کی طرح نظر آتا ہے اور یہ دونوں حضرات اپنی ذات سے ادارے بن گئے ہیں۔ جناب ستم کی اس بلیغ بات سے ہم چونک سے گئے اس لیے ڈرتے ڈرتے پوچھا "آپ کی تعریف؟" بولے خاکسار کو پروفیسر کرشن دیال ماتھر کہتے ہیں۔ واشنگٹن یونی ورسٹی میں سیاسیات کا پروفیسر رہ چکا ہوں دہلی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں ایک سال کے لیے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ اب یہ کام ختم کر کے امریکا واپس جا رہا ہوں۔ جانے سے پہلے اپنے وطن حیدرآباد میں کچھ دن گزاروں گا اور پھر امریکا واپس چلا جاؤں گا۔ پچاس برس پہلے جب حیدرآباد میں رہتا تھا تو اردو میں شعر بھی کہتا تھا" ہم نے بات کاٹ کر کہا "سچ بتائیے کیا آپ پچاس برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ ہمیں تو آپ کی عمر پینتالیس برس سے زیادہ کی نہیں لگتی بلکہ آپ تو ہم سے بھی کم عمر لگتے ہیں" بولے آپ بھی حد کرتے ہیں۔ پچاس برس پہلے تو میں باضابطہ شعر کہتا تھا (پھر قدرے شرما کر) ستم تخلص کرتا تھا۔ محبوب حسین جگر، عابد علی خاں، شری کرشن سہنا اور ہاشم علی اختر عثمانیہ یونی ورسٹی میں میرے ہم جماعت اور ہم ہاسٹل تھے مخدوم اور وجد ہم سے سینیر تھے۔ مگر دوستی سب سے تھی۔ میں مجلۂ عثمانیہ کا اڈیٹر بھی رہ چکا ہوں۔"

پروفیسر کرشن دیال ماتھر ستم سے جب مزید بات چیت ہوئی تو پتا چلا کہ موصوف کا تعلق حیدرآباد کے ایک ذی علم کائستھ گھرانے سے ہے۔ ان کے نانا کرپا شنکر حشم کا شمار اردو کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے ماموں رنگیلے موہن بھی شاعر تھے۔ مہاراجا سرکشن پرشاد کے خانوادہ سے ان کے خاندان کے گہرے مراسم رہے ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں کرشن دیال ماتھر تعلقہ چنور میں تحصیل دار بھی رہے۔ پھر نظام حیدرآباد نے وظیفہ دے کر انھیں طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکا روانہ کیا۔ (اس زمانے میں تحصیل داروں کو طب کی تعلیم دلانے اور خود ڈاکٹروں کو تحصیل دار بنانے کا رواج عام تھا)

مشہور ہے کہ ایک صاحب انجینیر تھے تو انھیں وٹرنری ڈاکٹر کے عہدہ پر مامور کر دیا گیا۔ بالآخر جب ان صاحب کو ترقی دے کر ایک زچگی خانہ پر لیڈی ڈاکٹر کی حیثیت سے مامور کیا جانے لگا تو ان صاحب نے اپنی عزت نفس کی حفاظت کی خاطر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ بہرحال جناب ستم نیویارک کی کولمبیا یونی ورسٹی میں داخل ہو گئے لیکن طب کی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ابتدا میں حیاتیات اور طبیعیات وغیرہ کی تعلیم سے اپنا دل بہلاتے رہے۔ پھر "سیاست" کے شعبہ میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں جب وہ حکومت ہی ختم ہو گئی جو انھیں وظیفہ دیا کرتی تھی تو انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے علاوہ ایک امریکی لڑکی سے شادی بھی کر لی (گویا دن رات کا وظیفہ ہاتھ آ گیا) یوں تقریباً پچاس برس سے جناب ستم امریکا میں مقیم ہیں۔ پہلے کولمبیا یونی ورسٹی میں سیاسیات کے استاد رہے۔ پھر واشنگٹن یونی ورسٹی چلے گئے۔ کبھی کبھار ہندستان آ جاتے ہیں۔ اب ان کی بیوی تو اس دنیا میں نہیں رہیں البتہ ان کے دو بیٹے امریکا میں رہتے ہیں۔ جناب ستم کے کرم سے ہمارا سفر خاصا دلچسپ رہا۔ ہمیں ان کی یہ ادا بہت بھا گئی کہ جس حیدرآباد کو وہ ۱۹۴۵ء میں چھوڑ گئے تھے اسے انھوں نے اپنے اندر جیوں کا تیوں رکھ چھوڑا ہے۔ میر عثمان علی خاں کا ذکر "سرکار" کے حوالہ کے بغیر نہیں کرتے۔ ہم نے کہا "ستم صاحب! آپ کا حیدرآباد آپ کے لیے ۱۹۴۵ء میں ختم ہو گیا تھا۔ جب کہ ہمارا حیدرآباد ہمارے لیے ۱۹۵۲ء میں اس وقت شروع ہوا جب ہم گلبرگہ سے حیدرآباد آئے تھے۔ ہمارے آنے تک حیدرآباد کے امرا اور رؤسا ختم ہو چکے تھے۔ اس لیے بہت کم کے بارے میں جانتے ہیں۔ بولے "پھر آپ نے حیدرآباد کو دیکھا ہی کیا ہے" پھر ایک لمبی آہ بھر کر اپنے نانا کا ایک شعر ترنم کے ساتھ سنایا۔ جس میں دنیا کی بے ثباتی کو ثابت کیا گیا تھا۔ جناب ستم نے کچھ شعر فارسی میں بھی ترنم کے ساتھ سنائے۔ ہم نے داد دی تو بولے "آپ تو بہت اچھی فارسی جانتے ہیں" ہم نے حقیقی صورت حال سے انھیں آگاہ کرتے ہوئے کہا "فارسی تو خیر نہیں جانتے، لیکن اسے جاننے کی اداکاری کرنے کے فن سے ضرور واقف ہیں۔ خود اردو شاعری کے معاملہ میں بھی ہمارا یہی رویہ ہے شعر اچھا ہو یا بُرا، اس پر داد ضرور دیتے ہیں تاکہ سننے والا ہمیں جاہل نہ سمجھے"

بولے "آپ اچھا مذاق کر لیتے ہیں" اب ہم انھیں کس طرح سمجھاتے کہ جس حیدرآباد کو وہ پچاس برس پہلے چھوڑ گئے تھے اس میں اب ہمارا شمار اردو کے طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا
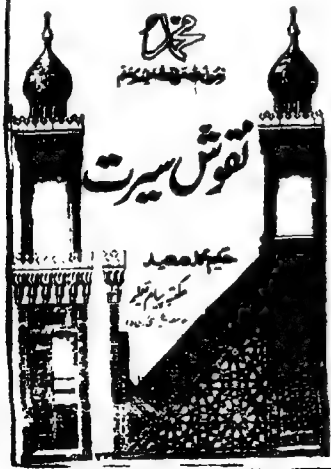
ہے۔ انھیں کچھ سمجھانا اس لیے بھی مشکل تھا کہ ۱۹۴۵ء میں وہ جشن اردو کو اپنے ساتھ لیے امریکا گئے تھے وہ ان کے تھرماس نما وجود میں جیوں کی تیوں محفوظ ہے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی میں جو اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے لیکچروں، حیدرآباد کے اساتذہ کے کلام اور مخدوم اور وجد کی شاعری کے ذریعے ان تک پہنچی تھی اسے انھوں نے جی جان سے اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد جو اردو حیدرآباد میں آئی اس سے وہ ناواقف ہیں (سلمان اریب، شاذ تمکنت، مغنی تبسم اور حتیٰ کہ صلاح الدین نیر کی اردو شاعری سے ان کے کان اب تک ناآشنا ہیں) جناب ستم کی خوبی یہ ہے کہ وہ ترنم کے بغیر کوئی شعر نہیں سنا سکتے (چاہے شعر ان کا اپنا ہو یا کسی اور کا)۔ پھر ترنم بھی ایسا کہ ہر بار اس کا انداز بدل جاتا ہے۔ چنانچہ وجد کے کچھ شعر ترنم کے ساتھ سنائے۔ تو ہم نے کہا "غالباً آپ نزلہ زکام میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ترنم میں آپ اپنے گلے سے کہیں زیادہ ناک کا استعمال فرما رہے ہیں"۔ بولے "ارے! آپ اسے نزلہ زکام سمجھ رہے ہیں۔ یہ تو وجد کا مخصوص ترنم ہے۔ آپ نے غالباً وجد کو ترنم سے کلام سناتے ہوئے نہیں سنا۔ ہائے ہائے کیا ترنم تھا ظالم کا کہ اچھے اچھے ماہرینِ ادب ہاتھ ملتے رہ جاتے تھے"!

بعد میں مخدوم کی غزل سنائی تو وہ نزلہ زکام میں مبتلا نظر نہیں آئے۔ (یوں لگا جیسے سچ مچ مخدوم سامنے بیٹھے ہوں) اپنے نانا کے شعر بھی سنائے (جو ظاہر ہے کہ ان کے نانا کے مخصوص ترنم میں ہی ہوں گے) پھر ہم نے کہا "ستم صاحب! ہمیں اب آپ اپنا ترنم بھی سنائیے"! ہنس کر بولے "اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب آپ میرے شعر سننا چاہتے ہیں بھئی! آپ اچھا خاصا مذاق کر لیتے ہیں۔ اگر آپ نے اب تک طنز و مزاح نہیں لکھا ہے تو ضرور لکھیے۔ آپ میں ایک کامیاب مزاح نگار بننے کی صلاحیت ہے۔ کیا کریں میرے استاد محترم محی الدین قادری زور زندہ نہیں رہے ورنہ میں آپ کو ان کے ہاں لے جاتا"۔ ہم نے پوری کسرِ نفسی کے ساتھ کہا "آپ کہہ رہے ہیں تو کوشش کر کے دیکھتے ہیں"۔ جناب ستم نے اپنی دو چار مرصع غزلیں اپنے اصلی اور ذاتی ترنم میں سنائیں۔ بہت لطف آیا۔ جناب ستم نے راستہ بھر ریلوے کی طرف سے ملنے والے کسی کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اپنے ساتھ کچھ تنوری روٹیاں اور کچھ کباب لیتے آئے تھے۔ وہی کھاتے رہے۔ پانی بھی نہیں پیا۔ صرف کولڈ ڈرنک سے کام چلاتے رہے۔ تب ہمیں ان کی صحت کا راز سمجھ میں آیا۔ ڈبہ میں ان کی برتھ تو خیر ایک ہی تھی مگر چار پانچ اوپر برتھوں کے نیچے ان کے بھاری امریکی سوٹ کیس اور ایر بیگس رکھے ہوئے تھے جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ناملی اسٹیشن پر جب انھوں نے قلیوں کو بلا کر اپنا سامان اٹھانے کو کہا تو ایک قلی نے سوٹ کیسوں کے بھاری وزن کا اندازہ کرنے کے بعد پوچھا "ان میں کیا ہے؟"۔ بولے "ان سب میں میری کتابیں ہیں۔ دہلی سے میرا تبادلہ ہو گیا ہے اس لیے ان کتابوں کو ساتھ لانا پڑا"۔ قلی نے کہا "حضور! جب آپ کو پتا تھا کہ آپ کا تبادلہ ہونے والا ہے تو آپ نے یہ کتابیں وہیں کیوں نہ پڑھ لیں۔ اب یہ عذاب ہمارے سر پر لاد رہے ہیں"! پروفیسر ستم اس بات کو سن کر کچھ پشیمان سے ہو گئے۔ کوئی جواب نہیں دیا۔

چلتے چلتے دو باتیں اور عرض کر دیں۔ جب بلہار شاہ کا اسٹیشن آیا تو پروفیسر ستم نے ایک

سرد آہ بھری اور کہا "ایک زمانہ تھا جب یہ اسٹیشن ہماری ریاست میں تھا۔ کسی نے بتایا کہ اب یہ کسی اور ریاست میں چلا گیا ہے۔ کیا زمانہ آگیا ہے" پھر جب منچریال کا اسٹیشن آیا تو اب کی بار جناب ستم نے اور زیادہ سرد آہ بھری اور کہا "منچریال پہلے تعلقہ چنور میں تھا جس کا پچاس سال پہلے میں تحصیل دار تھا۔ اب کیا حالت ہوگئی ہے اس کی۔ کیسا گھنا جنگل تھا پہلے اس جگہ۔ یہاں کثرت سے شیر پائے جاتے تھے۔ میں نے تو دو ایک بار جنگل سے گزرتے ہوئے شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا۔ ایسا کرنے سے شیر حملہ نہیں کرتا۔ کیا کبھی آپ کو ایسا موقع ملا ہے"۔ ہم نے کہا "یہ کون سی خاص بات ہے۔ ہم نے بھی کئی بار شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ شیر چڑیا گھر کے پنجرے کے اندر تھا اور ہم باہر" ہنستے ہوئے بولے "آپ میری بات مانیے۔ سچ مچ مزاح نگاری شروع کر دیجیے۔ آپ بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اسے کیا کیجیے کہ آپ کو اپنی صلاحیتوں کا اب تک اندازہ نہیں ہو سکا ہے۔ ہم حیدرآبادیوں کے ساتھ مشکل یہی ہے کہ کسر نفسی اور بیجا عجز و انکسار کی وجہ سے خود اپنی صلاحیتوں کو کچل کے رکھ دیتے ہیں"

ہمیں یقین ہے کہ جناب ستم جب اس کالم کو امریکا میں پڑھیں گے تو انھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہم نے حیدرآبادی عجز و انکسار کو چھوڑ کر ان کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے سچ مچ مزاح نگاری شروع کر دی ہے۔

نجم جاوید عثمانی سنبھلی
ریسرچ اسکالر۔ پنجاب یونی ورسٹی، چنڈی گڑھ

اک روشن چراغ تھا نہ رہا
ڈاکٹر سعادت علی صدیقی
شخصیت کے آئینے میں

ہر اچھا ادیب اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن ہر اچھا ادیب اپنے ماحول کو متاثر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ اعزاز و افتخار معدودے چند لوگوں کو ہی حاصل ہوا کرتا ہے کہ اپنے کردار و عمل سے اپنے ماحول کو متاثر کرسکیں یا اپنی سرگرمیوں و کارناموں کے ذریعے مشعلِ راہ کا فریضہ انجام دے سکیں۔ مرحوم ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کا نام بلاشبہ ایسے ہی لوگوں میں شمار کیا جاسکتا ہے جنھوں نے اپنی مختصر مدّت حیات میں اپنی تخلیقات و نگارشات کے توسط سے اُردو ادب میں منفرد مقام تو حاصل کیا ہی، ساتھ ہی اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں اور عملی جدو جہد کے باعث اردو زبان کی بقا و ترقی کے لیے جاری تحریک میں نئی رُوح بھی پھونکی۔ مجھے یہ کہنے میں قطعی تامل نہیں کہ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی تحریروں و کاوشوں سے شمالی ہندستان بالخصوص اُتر پردیش کی نئی نسل کو بڑی تقویت و توانائی ملی۔ اُن کے فیضِ صحبت سے اَن گنت نوجوانوں کی تخلیقی صلاحیتیں اُجاگر ہوئیں اور ان میں لکھنے لکھانے کا ذوق پروان چڑھا۔ اگرچہ بقول خود ان کے "انھوں نے ادبی دنیا میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا" لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مرحوم نے جس ذوق و شوق کے ساتھ اُردو زبان و ادب کی خدمت کی اور جس تلاش و جستجو کا ثبوت دے کر غیر معروف و گمنام ادیبوں و شاعروں کی حیات و خدمات کو اُجاگر کیا، اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔

مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے ریاست کے مغربی اضلاع میں اُردو زبان کے تحفظ و فروغ کے لیے ایسے حالات اور ماحول میں کام شروع کیا، جب اس خطّہ کے محبّانِ اُردو اپنی مادری زبان کو فراموش کر چکے تھے اور زبان کی ترقی و بقا کے لیے کام کرنے کا جذبہ تو بڑی بات، انھیں اپنی مادری زبان پر ہونے والے "ظلم و ستم" کا احساس بھی نہیں تھا۔ ہر طرف مایوسی کا دَور دَورہ تھا۔ اُردو تنظیمیں غفلت کی نیند میں مدہوش

تھیں ان کی سرگرمیاں شعری نشستوں و مشاعروں تک محدود ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی نے نہ صرف یہ کہ اُردو تحریک کو جلا بخشی بلکہ انتھک اور پُر خلوص جد و جہد سے مراد آباد کے کاروانِ اُردو کو اس منزل تک پہنچا دیا، جہاں اسے پوری ریاست کی رہنمائی کا شرف حاصل ہوا اور ان کی فعال قیادت کے زیرِ اثر نوجوانوں کا ایک ایسا قافلہ تیار ہو گیا جو مادری زبان کے تحفظ و ترقی کی خاطر سینہ سپر ہے۔ ایسی فعال شخصیت اور مخلص مجاہدِ اردو کی حیات و خدمات پر پس از مرگ چند سطور لکھنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ملک کے نوجوانوں میں نامساعد حالات اور ناساز گار ماحول میں بھی کام کرنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ بیدار رہے اور وہ بھی مرحوم کی طرح مادری زبان کے فروغ کی خاطر میدانِ عمل میں آئیں۔

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی نے خالص علمی و ادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد ماجد ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی لکھنؤ یونی ورسٹی کے ہر دلعزیز سابق استاد اور اُردو کے معروف و ممتاز ادیب ہیں۔ اپنی پیدائش، ماحول اور ابتدائی تعلیم کے بارے میں ڈاکٹر صدیقی رقم طراز ہیں۔

"۲۵ مارچ ۱۹۴۷ء کی ۱۵ مارچ کو عالم ارواح سے عالم خاکی میں آیا۔ ہوش کی آنکھیں کھلیں تو والد ماجد کو اُلم نصیب اردو کے غم میں مبتلا پایا۔ روٹی اور روزی کی فکر سے زیادہ انھیں اردو کی مظلومیت کا احساس تھا۔ بیوی بچوں کے مستقبل کے بجائے اردو کی عزت و آبرو کا پاس تھا۔ خود بھی ناانصافیوں وحق تلفیوں کا شکار رہے، اہلِ خانہ بھی سزاوار ہیں ستم ہائے روزگار رہے۔ اردو ہی اوڑھنا بچھونا، اردو ہی زندگی کا قرینہ، اردو ہی جد وجہد کا زینہ، اردو ہی مستقبل کا آئینہ۔"

"ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے ممتاز تعلیمی ادارے، ممتاز ہائی اسکول (جو اب ڈگری کالج ہو چکا ہے) اور ثانوی تعلیم اسلامیہ کالج میں پائی۔ دانشگاہ لکھنؤ سے ۱۹۶۳ء میں بی۔اے، ۱۹۶۴ء میں آنرس، ۱۹۶۵ء میں ایم اے (اردو) کی اسناد فرسٹ ڈویژن میں ملیں۔ ۱۹۶۵ء میں ہی لکھنؤ یونی ورسٹی سے سپرٹ گولڈ میڈل عطا ہوا۔ دورانِ تعلیم میرٹ اسکالرشپ سے بھی نوازا گیا۔ ۱۹۶۶ء میں یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کی فیلوشپ پر دہلی یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ وہیں سے ۱۹۶۸ء میں اردو میں ایم لٹ (ریسرچ ڈگری کورس) کی ڈگری فرسٹ ڈویژن میں لی۔ ۱۹۸۲ء میں ۱۹ ویں صدی میں اردو کا زندانی ادب" کے موضوع پر استاد محترم پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ مکمل کیا۔"

(اقتباس "وہ صحب یاد آئے" خاکوں کا مجموعہ مطبوعہ ۱۹۸۲ء)
صفحہ ۸-۹

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کا تعلیمی ریکارڈ بہت شاندار رہا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بے مثال کامیابیاں حاصل کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں بھی جوش و خروش سے حصہ لیتے رہے۔ متعدد انجمنوں کے عہدیدار ہونے کی حیثیت سے انھوں نے بے پناہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا اور علمی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی جاری رکھی۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، انجمن ادب اطفال لکھنؤ، انجمن ترقی اردو اور اردو تعلیمی جائزہ کمیٹی مراد آباد کے پلیٹ فارم سے انھوں نے تخلیقی عمل بھی جاری رکھا اور اردو کاز کے لیے بھی بھرپور جد و جہد کی۔

۱۹۷۱ء میں جب مرحوم سنبھل کے مہاتما گاندھی ڈگری کالج میں اردو معلم کی حیثیت سے آئے تو یہاں گہرا سناٹا طاری تھا۔ انھوں نے اپنے جوش عمل سے اور طلبہ و طالبات میں اردو زبان و ادب کی خدمت کا ذوق بیدار کیا اور شہر میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈال کر اردو تحریک کو از سر نو زندہ کیا۔ مرحوم کی رہنمائی میں سنبھل میں ۱۹۷۴ء میں ایک عظیم الشان محبان اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دو درجن سے زائد مشاہیر نے شرکت کی اور اپنے گرانقدر خیالات سے یہاں اردو تحریک کے لیے ماحول ساز گار بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں سے پورا روہیل کھنڈ کا علاقہ بے پناہ متاثر ہوا۔ مراد آباد اردو سرگرمیوں کا مرکز بنا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری ریاست پر چھا گیا۔ گذشتہ ۱۰۔۱۵ برسوں میں اس خطہ میں تقریباً ایک درجن ریاستی، ضلعی اور علاقائی کانفرنسیں ہوئیں۔ جن میں ملک کے ممتاز محبان اردو نے شرکت فرمائی اور ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی لسانی و ادبی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا۔ مرحوم کی کوششوں کے باعث روہیل کھنڈ میں اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور حق تلفیوں کا ازالہ ہوا۔ متعدد ڈگری کالجوں و تعلیمی اداروں میں اردو تعلیم کا اجراء ہوا۔ سرکاری و نیم سرکاری دفتروں میں اردو مخالف رویے میں کمی آئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس خطے کے محبان اردو میں نیا جوش، نیا ولولہ اور نیا حوصلہ پیدا ہوا اور وہ اپنی مادری زبان کی بقا کے لیے کمر بستہ ہوئے۔

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی اوائل عمر سے ہی لکھنے اور چھپنے لگے تھے۔ بچوں کے لیے کہانیاں لکھ کر انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ یہ سراغ نہیں ملتا کہ انھوں نے تصنیف و تالیف کا آغاز کب کیا؟ خود ان کا کہنا یہ تھا کہ:۔

> "طالب علمی کے زمانے ہی سے لکھنے لکھانے کا خبط سوار ہو گیا تھا۔ پہلی تخلیق کب اور کہاں چھپی، یہ تو یاد نہیں پر روزنامہ قومی آواز اور ممتاز ہائی اسکول کی سالانہ میگزین "روشنی" سے تحریک ملتی رہی۔ زیادہ وقت اردو تحریک سے وابستگی میں صرف ہوا۔ مضامین یا نگارشات یا تو آل انڈیا ریڈیو کی مرہون منت ہیں یا ادبی رسائل کے مدیران کی

اب تک ایک درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(دستاویز۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ مطبوعہ ۱۹۸۳ء صفحہ ۲۰۹)

مشہور و ممتاز خاکہ نگار ڈاکٹر عرفان عباسی کی تحقیق ہے۔

"سعادت صاحب نے اپنی قابل رشک ذہانت و ذکاوت کی بدولت تقریباً ۱۵ سال کی عمر میں قلم سنبھال لیا تھا اور ان کی تخلیقات اخبارات و رسائل کی زینت بننے لگی تھیں۔ وہ کئی ادبی جرائد کے ادارہ تحریر سے بھی وابستہ رہے۔ تصنیفات و تالیفات کے سلسلے میں وہ برق رفتاری کے ساتھ اپنی مطبوعات میں اضافہ کر رہے ہیں۔"

گزشتہ چند سال سے ان کے تخلیقی و تحقیقی مضامین اور تذکرے اخبارات اور رسائل میں شائع ہو رہے ہیں جن کے ذریعہ انھوں نے بہت سے ایسے باصلاحیت اردو شعرا و ادباء کو ادبی دنیا سے روشناس کرایا ہے جن کے علمی و ادبی کارناموں تک ناقدین کی نگاہیں نہ پہنچی تھیں اور نہ کبھی پہنچتیں۔

"دوسرا تمام مصروفیات کے ساتھ سعادت صاحب کا ایک بڑا کام 'تذکرہ شعرائے سنبھل' کی تدوین و تالیف ہے جس کی جلد اوّل وہ مرتب کر چکے ہیں اور جلد دوم زیر تکمیل ہے۔ اب تک انھوں نے جو تحقیقی نمونے پیش کیے ہیں انھیں دیکھ کر یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ اپنے نیک مقصد میں یقیناً کامیاب ہوں گے۔"

(تعارف "ادبی آئینے" مطبوعہ ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۱)

کہتے ہیں کہ کوئی کوشش رایگاں نہیں جاتی اور محنت کا ثمرہ ضرور ملتا ہے۔ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی کوشش و کاوشیں اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے گولڈ میڈل اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے اسکالرشپ بھی حاصل کیا اور اتر پردیش اردو اکادمی سے اپنی دو کتابوں جبیبہ غالب (۱۹۷۱ء) اور ادبی جائزے (۱۹۷۵ء) پر دو انعامات بھی۔ ساتھ ہی دو کتب "ادبی آئینے" (۱۹۸۳ء) 'ادبی تحریریں' (۱۹۹۰ء) پر اتر پردیش اردو اکادمی کے خصوصی انعام بھی ملے۔ انھیں مراد آباد اردو کانفرنس منعقدہ فروری ۸۴ء کے موقع پر توصیفی سند "محسن اردو" سے بھی نوازا گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مشاہیر ادب نے نہ صرف انھیں اس وقت خراج تحسین پیش کیا بلکہ گرانقدر آرا سے بھی نوازا۔

'جبیبہ غالب' پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر اختر بستوی (گورکھپور یونیورسٹی) لکھتے ہیں—

"سعادت علی صدیقی زبردست تحقیقی و تنقیدی صلاحیتیں رکھنے کے ساتھ ساتھ قلم کے بھی دھنی ہیں۔ ان کی کتاب 'جبیبہ غالب' میں جگہ جگہ اتنی

اچھی نثر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں کہ بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے
"اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"
"مختصر یہ کہ 'جبینِ غالب' سعادت صاحب کی ایک انتہائی اہم تالیف تصنیف
ہے جسے بے جھجک ایک ناقابل فراموش کتاب قرار دیا جا سکتا ہے"
(فروغ اردو لکھنؤ جولائی ۱۹۷۱ء صفحہ ۲۸)

ڈاکٹر مرحوم کے پہلے مجموعہ مضامین "ادبی جائزے" کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی تھی۔ اردو ادب کے ممتاز ناقدین نے نہ صرف اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا بلکہ گرانقدر آرا سے بھی نوازا۔ پروفیسر نورالحسن ہاشمی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی مولانا محمد یونس خالدی (مرحوم) اور مسٹر محمد عثمان غنی (قومی آواز لکھنؤ) جیسے مشاہیر نے مرحوم کے طرز نگارش اور شگفتہ نگاری کی توصیف کی۔ طوالت کے خوف سے اقتباسات سے گریز کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کا تیسرا مجموعہ مضامین "ادبی آئینے" بھی جو اترپردیش اردو اکادمی کے تعاون سے ۱۹۸۳ء میں منظر عام پر آیا تھا وہ بھی مشاہیر کی توجہ کا مرکز بنا۔ مسٹر صباح الدین عمر (مرحوم) نے آکاش وانی سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"ڈاکٹر سعادت علی صدیقی ایک نوجوان اردو ادیب ہی نہیں بلکہ اردو کے بڑے مبلغ ہیں۔ اور اپنے ضلع میں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے بڑے سرگرم رہتے ہیں خوشی کی بات ہے کہ اردو میں تدریس اور دوسری مصروفیتوں کے علاوہ وہ لکھنے کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں"

مسٹر شافع قدوائی نے اپنے طویل تبصرے میں "ادبی آئینے" کے ہر مضمون کا تنقید و تجزیہ کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ۔

"چوں کہ اس مجموعے میں زیادہ تر ریڈیائی تقریریں شامل ہیں۔ لہٰذا بعض مضامین میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے مگر معروضی نقطۂ نظر، متوازن اور فکر انگیز تحریریں قاری کو بہرحال متوجہ کرتی ہیں۔"

جبینِ غالب، ادبی جائزے، ادبی آئینے اور ادبی تحریروں کے علاوہ مرحوم کی نو یا دس اور کتابیں ہیں۔ آئینہ نثر اردو (یونی ورسٹیوں کے نصاب میں داخل)، شرح ادب پارے (انٹر میڈیٹ کے لیے)، بچوں کی لوک کہانیاں، وہ جب یاد آئے (خاکوں کا مجموعہ)، حدیث محبت (انتخاب کلام فرخ قادر نگینوی)، چند ممتاز شعرائے سنبھل (حصہ اول)، غالب پر چند تحریریں، اردو کا زندانی ادب (تحقیقی مقالہ)، اور بچوں کی کہانیاں "چاند میں نور گونز" نیز "سنبھل کے چند اکابر علما و مجاہدین آزادی"، منظر عام پر آ چکی ہیں۔ تین اور کتابیں چند ممتاز شعرائے سنبھل (حصہ دوم)، یہ لوگ (شخصیتوں کے خاکے) اور باغ سنبھلی۔ حیات و کلام جلد ہی زیور طباعت سے آراستہ ہو رہی تھیں۔ آج کل مراکز مرحوم "تذکر

و شعرائے سنبھل" (جلد اوّل) "اردو کا سیکولر روپ" (مجموعہ مضامین ہندی) اور علمی و ثقافتی تاریخ سنبھل ترتیب دے رہے تھے کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھین لیا۔

مختصر یہ کہ مرحوم ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی ادبی و لسانی خدمات و کاوشیں نئی نسل کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گی اور یہ سبق دیتی رہیں گی کہ انسان اگر ذوق و شوق، تلاش و جستجو اور محنت و ریاضت سے کام لے تو کامیابی قدم چومتی ہے۔ ایسے باصلاحیت ادیب کم پیدا ہوتے ہیں۔ مشہور مزاح نگار احمد جمال پاشا کے الفاظ میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ "بھئی آدمی ہو تو ایسا ہو ورنہ نہ ہو" ۔ وہ لکھتے ہیں۔

> "سعادت کی شرافت، اخلاص، نیکی، مروّت اور وضعداری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ بے حد محنتی، خاموش طبیعت اور کم آمیز اور بلند آواز کے انسان ہیں۔ جتنے اچھے ادیب ہیں، اتنے ہی اچھے دوست اور عمدہ ساتھی بھی۔ کچھ لوگ ادیب اچھے ہوتے ہیں مگر آدمی دو کوڑی کے نہیں ہوتے۔ مگر صاحب یہ تو ادیب اور آدمی دونوں لاکھ روپے کے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ آدمی اور انسان دونوں ہیں۔ پڑھنے لکھنے ملنے جلنے پر ہر بات میں ان کے ہاں ایک سلیقہ ہونے کی وجہ سے ان کی شخصیت میں دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ ان کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں لکھا یا کہا جا سکتا ہے کہ بھئی آدمی ہو تو ایسا ہو، ورنہ نہ ہو"
>
> (ممتاز ریے۔ ممتاز اسکول سلور جوبلی سوونیئر مطبوعہ ۱۹۷۰)

آج سعادت علی صدیقی صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ لیکن ان کے کارنامے ان کی سرگرمیاں، ان کے مشاغل، ان کی کارگزاریاں ہمیشہ ان کی یاد دلاتی رہیں گی۔

اختر حُسین فیضی
جہانا گنج۔ اعظم گڑھ۔ یوپی

تلمیذ داغ حسن بریلوی کا رنگِ تغزل

مولانا حَسن رضا خاں (۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء) میں بریلی کے ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے ان کے والد ماجد مولانا نقی علی خاں ابن مولانا رضا علی خاں ایک زبردست عالم تھے جن کا شمار روہیل کھنڈ کے بزرگ ترین علما میں ہوتا تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مکرم مولانا نقی علی خاں اور برادر بزرگ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے حلقۂ فیض میں حاصل کی۔ اپنی خاندانی روایات کے مطابق شعر و شاعری کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ اور حَسَن تخلص رکھتے تھے۔ سنِ شعور کو پہنچے تو فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کی شاگردی سے اس ذوق کی تکمیل کی اور زبان و محاورات پر قدرت حاصل کی۔ آپ نے خود بھی داغؔ کی شاگردی پر فخر کیا ہے۔ ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں ؎

کیوں نہ ہو میرے سخن میں لذّتِ سوز و گداز
اے حسَنؔ شاگرد ہوں میں داغؔ سے اُستاذ کا

ایک غزل میں استاذ کے دیوان "گلزارِ داغ" کا حوالہ دیا ہے ؎

یہ گل فشانیاں تو نہ ہوتیں کبھی حسَنؔ
تم نے چُنے ہیں پھول یہ گلزارِ داغ سے

ایک جگہ اپنے استاذ مرزا داغؔ کی تاریخ وفات بھی کہی ہے، فرماتے ہیں ؎

مرگِ استاذ کی حسَنؔ تاریخ!
داغ نواب میرزا لکھیے
۲۲ ۱۳ء

رئیس المتغزلین مولانا حسرتؔ موہانی، حسَنؔ بریلوی کے متعلق لکھتے ہیں:

"شعر و سخن کا شوق حضرت حسَنؔ کو ابتدا ہی سے تھا کچھ روز تک بطور خود مشق کرتے رہے۔ اس کے بعد مرزا داغؔ کو اپنا کلام دکھانا شروع کر دیا اور ایک مدت تک سلسلۂ تلمذ میں رہ کر استاذ کے گلشن سخن سے گلچینی فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ بجائے خود استاذ مستند قرار پائے۔ شاگردانِ مرزا داغؔ میں حسَنؔ مرحوم بریلوی کا پایہ شاعری بہت بلند تھا، انھوں نے اپنے اندازِ سخن کو استاذ کے مشابہ بنانے میں اس قدر کامیابی حاصل

کی ہے کہ اکثر قطعوں میں داغ و حسن کی شاعری میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔
(اردوئے معلیٰ علی گڑھ جون ۱۹۱۲ء)

مشہور ناقد و ادیب نیاز فتح پوری کے سالنامہ "نگار کے داغ دہلوی نمبر" میں حسن بریلوی کا تذکرہ کچھ اس طرح ہے۔

حاجی مولانا حسن رضا خاں بریلوی حضرت شاہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کے چھوٹے بھائی تھے شعر و سخن کا طبعی و فطری ذوق تھا غیر معمولی ذہانت و ذکاوت کے مالک تھے مزاج میں شوخی شگفتگی اور زندہ دلی تھی۔ حضرت داغ کے ارشد تلامذہ میں شمار تھا نعتیہ کلام میں اُن کا دیوان ذوقِ نعت اور عاشقانہ میں "ثمر فصاحت" یادگار ہے۔
(ص۱۳۳ سالنامہ نگار ۱۹۵۳ء داغ دہلوی نمبر)

آپ نے حمد، نعت، غزل، مثنوی، رباعی، تاریخ، قصائد، منقبت غرض ہر صنف شعر میں طبع آزمائی کی ہے، کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ موصوف اپنے وقت کے استاذ فن تھے۔ بریلی کے کئی خوش گفتار شعرا نے آپ کے دامنِ فیض میں تربیت پائی۔ آپ پر دینی رنگ غالب تھا۔ اس لیے کئی دینی اور مذہبی تصنیفات بھی فرمائیں۔ جن میں سے چند مشہور کتابیں درج ذیل ہیں۔
(۱) نگارستان لطافت (۲) آئینہ قیامت (۳) دین حسن (۴) تزک مرتضوی (۵) ذوقِ نعت (۶) صمصام حسن (۷) ساغر پُر کیف (۸) وسائل بخشش وغیرہ۔

۱۳۲۶ھ میں حج بیت اللہ سے مشرف اور اسی سال پچاس برس کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا ۱۳۲۶ھ مغفور تاریخ وفات ہے۔

ثمر فصاحت حسن بریلوی کا دیوان غزلیات ثمر فصاحت، کے تاریخی نام سے ۱۳۱۹ھ میں مطبع اہل سنت و جماعت بریلی سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ صداقت جذبات اور قلبی واردات کا مرقع درد و کرب اور سوز و ساز کا منبع ہونے کے ساتھ رنگینیِ حیات اور حسنِ ادب کا امین و ضامن ہے۔ غزلیات حسن میں رفعتِ فکر، لطافت احساس، سلاست زبان اور ندرتِ بیان جیسی بہت ساری خصوصیات موجود ہیں۔ آپ کے کلام میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو داغ کے کلام کا طرّہ امتیاز ہیں۔ ذیل میں کلام کی خصوصیات پر فرداً فرداً روشنی ڈالی گئی ہے۔

شوخی داغ کے کلام کا بڑا عنصر شوخی اور تیکھا پن ہے۔ معشوق سے آزادانہ چھیڑ چھاڑ ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ حسن بریلوی کے کلام میں بھی اپنے استاذ کی طرح شوخی اور تیزی کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

چڑھاؤ آستیں خنجر نکالو
یہ چپکے چپکے مجھ کو کوسنا کیا

ستاؤ، دل دکھاؤ، مار ڈالو
نہ آئے گا کبھی روزِ جزا کیا

مرزا غالب کا ایک شعر ہے ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حسن بریلوی کہتے ہیں ؎

جی میں شرمندہ ہوا کاٹ کے سر عاشق کا
ہائے جلاد کو کس وقت ندامت آئی

ایک اور جگہ فرماتے ہیں

جلوے کی روک تھام کرے گا حجاب کیا
دریا کے آگے آبِ رواں کا نقاب ہے

عہدِ ماضی میں "آبِ رواں" ایک بہت باریک کپڑا تھا۔ موصوف اور فرماتے ہیں ؎

ہزاروں خواہشیں دل میں چھپا لے کس طرح کوئی
مری جان تم سے اک جوبن کا پردہ ہو نہیں سکتا

بلائیں غیر کو میں جاؤں تو وہ فرمائیں
مری گلی سے، مرے در سے، مرے مکان سے دور

لڑنے بگڑنے کا تو مزا ہے وصال میں
اس روٹھنے کا کون کرے اعتبار آج

استاذ حسن مرزا داغ دہلوی کا ایک شعر ہے ؎

ایک چلو ہی میں بس داغ بہک اٹھتے ہیں
آج سنتے ہیں نکالے گئے میخانے سے

حسن بریلوی فرماتے ہیں ؎

گر یہی ہے شور فریاد و فغاں
تو نکالے جائیں گے محشر سے ہم

سوالِ بوسہ پہ منہ پھیر کر جواب دیا
کہ ایسے ویسے مرے دشمنوں سے پیار کریں

جب کہا ان سے کہ مرتے ہیں مریضانِ فراق
بولے مُنہ پھیر کر ہم کیا کہیں قسمت ان کی

طنز حسنؔ بریلوی کے کلام میں ان کے استاذ مرزا داغؔ کی طرح طنز، لطیف، حاضر جوابی اور محبوب سے شکوہ شکایت کی صدہا مثالیں موجود ہیں۔ طنز کی مثالیں پیش خدمت ہیں ؎

آپ کہتے ہیں کہ جاؤ دیکھ لیا دل تیرا
کہیے تو اپنے سوا دل میں مرے کیا دیکھا

یہ رات کون تھا دشمن کے گھر کہو تو سہی
مجھے تو کہتے ہو بے شرم، بے حیا، گستاخ

سو کی سَو اچھی اگر سو خواہشیں ہوں غیر کی
میری لاکھوں حسرتوں میں ایک بھی اچھی نہیں

لوگ کہتے ہیں عدو سے دوستی اچھی نہیں
کہ یہ عادت آپ کے نزدیک بھی اچھی نہیں

معاملہ بندی کہا جاتا ہے کہ معاملہ بندی کی ابتدا شیخ قلندر بخش جرأت نے کی لیکن مصحفی کے کلام میں صدہا اشعار ایسے ہیں جو معاملہ بندی کے ضمن میں آتے ہیں۔ لیکن داغ اس فن کے بادشاہ ہیں۔ کس انداز سے کہتے ہیں ؎

حیا بولی اُبھرا جو جوبن کسی کا
مٹا دوں گی میں چلبلا پن کسی کا

حسنؔ بریلوی نے بھی اس ضمن میں استاذ کی پوری پوری تقلید کی ہے کہتے ہیں ؎

کہا یہ ضبط نے جوبن جواں کا جوش میں آیا
خبردار اے حیا اب ہم سے پردہ ہو نہیں سکتا

اگر جلوہ دکھایا ہے تو سینے سے بھی مل جاؤ
کہ دل آنکھوں کی ٹھنڈک سے تو ٹھنڈا ہو نہیں سکتا

بُتوں کے نرم و نازک جسم میں کیا گدگدا پن ہے
مگر ان موم کے پُتلوں کے دل پتھر نکلتے ہیں

مرزا داغ نے کہا تھا ؎

اب حکم ہوا ہے کہ تمھیں قتل کریں گے
پر یہ بھی تاکید کہ کہنا نہ کسی سے

حسن بریلوی کہتے ہیں ؎

تم چپکے سے اک بوسہ عارض ہمیں دے دو
کہتے ہیں قسم کھا کے کہیں گے نہ کسی سے

بوسہ بوسہ دراصل معاملہ بندی ہی کا ایک جزو ہے مگر اس کے بعض زیادہ دلفریب پہلو بھی ہیں۔ مرزا غالب نے بہت سوچ سمجھ کر کہا تھا ؎

بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

مگر مرزا داغ کے یہاں تو بات بات پر بوسے کی طلب ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بے گنتی بوسے لیں گے رخ تابدار کے
عاشق پڑھے ہوتے نہیں علم حساب کو

حسن بریلوی نے بھی اس بات میں استاد کی خوب پیروی کی ہے۔ چند مثالیں حاضر ہیں ؎

بولے وہ بوسہ ہائے پیہم پر!
ارے کمبخت کچھ حساب بھی ہے

لیا میں نے بوسہ تو روٹھو نہ مجھ سے
خطا ہو ہی جاتی ہے بندہ بشر ہے

دل کے بدلے میں نہ دو بوسہ رخ بھیک ہی دو
نہیں عاشق نہ سہی جان لو سائل مجھ کو

وصل وصل بھی معاملہ بندی ہی کی ایک کڑی ہے حسن بریلوی بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

وہ دست شوق کی شوخیاں وصال کی شب
وہ ان کا شرم سے کہنا دبی زبان سے دور

منہ پھیر کے بیٹھے ہو شب وصل
شوخی پہ مزاج ہے حیا کا

رو نہ فرمائیے سوال وصال
نام کی بات ہے ثواب ملے گا

عدو کے وصل کا انکار سچا ہی سہی لیکن
مسی چھوٹی ہوئی مسکی ہوئی ان کی قبا کیوں ہے

وصل میں جب ہاتھ گھونگھٹ کو لگایا ہے حسن
شرم بولی منہ چھپا کر یہ ہنسی اچھی نہیں

نازک خیالی اور ندرتِ خیال نازک خیالی اور ندرت خیال کی مثالیں مرزا غالب کے کلام میں بھی ملتی ہیں۔ لیکن غالب میں مشکل پسندی کا زور بھی ہے۔ لوگوں نے اس باب میں مومن کو غالب پر ترجیح دی ہے۔ داغ بھی اس میدان کے ایک اچھے شہسوار ہیں۔ شوخی اور طنز نگاری کے باوجود ان کے کلام میں نازک خیالی اور ندرتِ خیال بھی عروج پر ہے ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

آنکھیں بچھائیں ہم تو عدو کی راہ میں
پر کیا کریں کہ تم ہو ہماری نگاہ میں

حسن بریلوی نے بھی اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کہتے ہیں رنجش بھی ہے تو خاص تیری ذات سے
وہ عداوت بھی جتاتے ہیں محبت کی طرح

پردے نے اُٹھ کے پردہ الفت اُٹھا دیا
ہم بے خبر ہوئے وہ خبردار ہو گئے

جب پیش حسن تنگ ہو وسعت جہاں کی
پھر آئینے کے گھر میں تیرا کیا جواب ہو

وائے تقدیر کہ تم اس کو حنا سمجھے ہو
چٹکیوں میں جو مَلا جائے مرا دل ہے وہی

خیال لکھنوی کا شعر ہے ؎

روز کہتا ہوں اب نہ جاؤں گا اس کوچے میں
روز اس کوچے میں اک کام نکل آتا ہے

حسن بریلوی فرماتے ہیں ؎

ہمیشہ کہہ کر آتے ہیں کہ اب ہرگز نہ آئیں گے
مگر یہ عہد یاد آتا ہے جا کر بزمِ جاناں میں

ایک اور غزل میں کہتے ہیں ؎

وہ تو نظر اُٹھا کے ادھر دیکھتا نہیں
کیوں کر کہوں کہ درد مرا لادوا نہیں
گھل گھل کے جس کے ہجر میں ہم ہو گئے تمام
افسوس وہ کہے کہ میں پہچانتا نہیں

حُسنِ بیان زبان بامحاورہ، الفاظ مناسب اور بندش چست ہو تو شعر میں جان پڑ جاتی ہے اور سامع کا ذہن متاثر ہوتا ہے۔ فصیح و بلیغ کلام کی یہی نشانی ہے حسن کے استاد فصیح الملک تھے، زبان اور محاورات کے بادشاہ تھے حسن بریلوی کا کلام بھی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اعلا درجے کا حامل ہے بلاغت سے شعر میں معنوی خوبیاں موزوں اور مناسب الفاظ سے ظاہری حُسن پیدا ہوتا ہے۔ موصوف کا کلام دونوں پہلوؤں سے دلکش اور لطف انگیز ہے۔ غالب نے کہا تھا ؎

رنج سے خُوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

حسن بریلوی نے کہا ؎

رحم آ ہی جائے گا ان کو دلِ بیمار پر
درد بڑھتے بڑھتے آخر کو دوا ہو جائے گا

آپ نے نقشِ پا کا مضمون کئی اشعار میں باندھا ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

ہو گیا خاک نقشِ پا کی طرح
ان کے قدموں سے میں جُدا ہو کر

آپ کے نقشِ قدم کو خاک سے کیوں ربط ہے
دل کا ٹکڑا کیوں نہ آنکھوں کا تارا کیوں نہ ہو

گو ترے اغیار کے رستے سے میں کب واقف تھا
رہبری آپ کے نقشِ کفِ پا کرتے ہیں

مندرجہ ذیل اشعار میں حسنِ بیان کا لطف دیکھیے ؎

چمکتے گال ترے ان میں لطفِ رنگینی
یہ آئینے کے ہیں آئینے اور پھول کے پھول
ہمارا نخلِ تمنا بھی بید مجنوں ہے
کہ پھل تو پھل نہ کبھی آئے اس میں بھول کے پھول

چشم بد دور عجب آنکھ ہے ماشاءاللہ
سجدے جھک جھک کے غزالانِ حرم کرتے ہیں

صنعت تواتر یا تقسیم | بعض فنی صنعتوں سے شاعر کے حسنِ بیان میں زیادہ دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سب الفاظ ہی کے مناسب اور موزوں استعمال کا کرشمہ ہے۔ حسنؔ بریلوی نے صنعت تواتر یا صنعت تقسیم کا بہت استعمال کیا ہے۔ اس طرح ان کے اشعار میں زیادہ زور اور لطف پیدا ہو گیا ہے چند اشعار حاضر ہیں ؎

تبسم لب پہ ڈھیلا ہاتھ خنجر کُند مُنہ پھیرے
بڑی بے دردیوں سے کاٹتے ہو میری گردن کو

کیوں ہوں یہ رسوائیاں گر آپ ہرجائی نہ ہوں
خاک بر سر، آہ بلب، دربدر کوئی نہ ہو

ابھی تو جاں بہ لب ہوں مردہ دل ہوں نیم بسمل ہوں
ترے کشتوں میں شامل ہوں تو میں زندوں میں داخل ہوں

آئینہ طوطیوں میں چکوروں میں ماہتاب
گلشن میں پھول بزم میں ہے کر رُوئے یار شمع

محاورات | مناسب اور موزوں الفاظ سے اور محاورات کے برمحل استعمال سے زبان میں حسن، زور اور مٹھاس پیدا ہوتی ہے اور شعر دلآویز ہو جاتا ہے۔ استاذ ذوقؔ کے بعد مرزا داغؔ کی زبان محاورے کی جان ہے۔ حسنؔ بریلوی نے بھی محاورات کا برمحل استعمال کر کے اپنے اشعار کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ چند مثالیں حاضر خدمت ہیں، بعض اشعار میں دو دو تین تین محاورات ہیں ؎

جگر کا درد، وہ کچھ بے قراری دل کی ایسی کچھ
اگر اب بھی نہ پوچھا کس مرض کی پھر دوا تم ہو

ہو کر غبار ان کی گلی میں اُڑا کروں
مٹی میں مل کے کیوں مری مٹی خراب ہو

آہیں لب پر آرزوئیں دل میں یوں اس در پہ ہم
بیٹھے ہیں دھونی رمائی چھاؤنی چھائے ہوئے

لیا بوسہ لڑ بھڑ کر گلا سے جان دی دل نے
ہم اس کام آنے کو کام آجانا سمجھتے ہیں

ہزاروں باتیں سننے پر نہ نکلی آدھی بات اس سے
لب خاموش کو ہم بات کا پورا سمجھتے ہیں

رعایت لفظی

استاذ ذوقؔ کے بعد لفظی رعایت میں مرزا داغؔ کا پایہ بہت بلند ہے۔ ایسی رعایت لفظی شعر کے لیے مناسب نہیں جسے ضلع جگت کہتے ہیں۔ بعض لکھنوی شعرا نے عمر بھر ضلع جگت، کے سوا کچھ نہ لکھا، ان میں اماناتؔ لکھنوی پیش پیش ہیں۔ لفظی رعایتیں ایسی ہونی چاہئیں جن سے شعر میں لطف پیدا ہو۔ ایسی رعایات کو اہلِ فن صنعت مراعات النظیر کہتے ہیں، ذوقؔ کے بعد داغؔ کے کلام میں یہ صنعت عام طور سے پائی جاتی ہے، داغؔ کہتے ہیں۔

میری وحشت سے جو اُن کا دل جلن اُلٹا
بخیہ گر سینے لگا چاک گریباں اُلٹا

دل کے ساتھ سینے کی رعایت اور وحشت کے ساتھ چاک گریباں اور بخیہ گر کی رعایت قابلِ داد ہے۔ لفظی رعایت سے حسنؔ بریلوی نے بھی بیشتر اشعار میں بلا کی دلکشی پیدا کی ہے چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

لکھا ہے روزِ عید درِ قتل گاہ پر
قرب اس کے واسطے ہے جو قربان ہو گیا

جینے نہ دے گی زلف کی الفت کسی طرح
ٹل جائے میرے سر سے یہ آفت کسی طرح

لفظی تقدّم اور تاخّر

حسنؔ بریلوی نے بعض اشعار میں لفظوں کے ہیر پھیر یا تقدم و تاخر سے دلکشی پیدا کی ہے ؎

وہ اگر یاد کریں ہم کو تو بھولیں کس کو
ہم اگر ان کو بھلائیں تو کسے یاد کریں

ہنسی ہنسی میں کبھی وہ مجھے رُلاتے ہیں
رُلا کے ہنستے ہیں ہنس ہنس کے گدگداتے ہیں

تکرار الفاظ

حسنؔ بریلوی کو الفاظ کے تکرار سے مضمون پیدا کرنے میں کمال حاصل ہے اور بعض کو تکرار الفاظ سے تیز و نشتر بنا دیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

دل لگانے کی سزا ہم نے جو پائی، پائی
پیار کرنے کا مزا دل نے جو دیکھا، دیکھا

جان جانے پر نہ جائیں گے تمھارے کوچے سے
جان جاتی ہے تمھارے کوچے سے جاتے ہوئے

تضاد الفاظ

حسن بریلوی کو زبان پر پورا پورا قابو تھا۔ الفاظ و محاورات کے مناسب اور برمحل استعمال کی بہت مہارت تھی اس لیے انھوں نے بعض جگہ متضاد الفاظ سے مضمون پیدا کیا ہے اور بعض جگہ تضاد مضمون سے نیا مضمون اخذ کیا ہے۔ تضاد الفاظ کی مثالیں دیکھیے ؂

بزم جلوت میں کبھی یار کو تنہا پایا
کنج خلوت میں کبھی انجمن آرا دیکھا

وقت جلوہ شرم و شوخی کی کشاکش کیا کہوں
پردہ رُد ے صنم اُٹھ کر گرا، گر کر اُٹھا

بے قراری کل بھی تھی کل سے زیادہ آج ہے
صبر کا یارا دل بیتاب کو کل تھا نہ آج

تضاد مضمون سے نیا مضمون اخذ کرتے ہیں ؂

اس قدر قتل کرو کہ تم مسیحا ہو جاؤ
جاں ستانی نہیں یہ مشق مسیحائی ہے

بے حجابی سے حشر برپا کر
مُنہ چھپانا تیرا قیامت ہے

اے دردِ دل اُٹھ کے مداوائے دل کریں
پرہیز کرتے کرتے تو بیمار ہو گئے!

جان اور بے وفائی

حسن بریلوی نے اس مضمون کو بار بار مختلف انداز سے باندھا ہے۔ فرماتے ہیں ؂

جب اپنی جان آپ کو سارا جہاں کہے
کہیے پھر آپ کا ہمیں کیا اعتبار ہو

جان ان کو کیا کہا جینے کے لالے پڑ گئے
ہائے وہ رکھنے لگے اب بے وفائی سے غرض

انھیں ہم جان سمجھیں ان کو اپنی زندگی جانیں
خدا جانے پھر ایسوں سے تمنائے وفا کیوں ہے

لفظ گم کا استعمال اساتذہ نے گم ہو جائیں تو باندھا ہے گم جائیں۔ کسی استاذ کے کلام میں کبھی نظر نہیں آیا۔ حسن بریلوی نے جا بجا لفظ گم کا استعمال لفظ "ہو" کے بغیر ہی کیا ہے بلکہ گم کر دیا کے بجائے "گما دیا بھی" کہا ہے فرماتے ہیں ؎

زاہد کو کہو اس کو تنفر ہے خودی سے
گم جائیں دو عالم سے پھر اس یار کو ڈھونڈیں

اپنی ہستی سر راہِ وصلِ جاناں ہے حسن
ہم اگر گم جائیں تو پھر اس سے ملنا کیوں نہ ہو

اگر ڈھونڈلوں ان کو تو دل کو گما بیٹھوں
مری مشکل کو آسانی میں بھی اک سخت مشکل ہے

تیغ کو گلے لگانا آپ نے تیغ کو گلے لگانے کا مفہوم کبھی بار بار ادا کیا ہے ؎

باہیں ڈالے گی تری تیغ مری گردن میں
آج مقتل میں بڑے لطف کی صحبت ہوگی

جان کا خوف کریں کیوں نہ تڑپ کر بسمل
تیغِ جلاد گلے مل کے جدا ہوتی ہے

خرام اور قیامت خرام اور قیامت کا مضمون بڑے ہی حسین انداز میں پیش فرماتے ہیں ؎

اُف قیامت خرامیاں ان کی
محشرستاں ہماری تربت ہے

آیا نہ حشر بھیس میں گر اس خرام کے
ہم تو کسی طرح نہ اٹھیں گے مزار سے

کوئی قیامت آئے کہ دل پائمال ہو
کچھ ہو بلا سے یار، دکھا دے خرام آج

جلوہ اور دُنیا کی تباہی حسنؔ بریلوی نے جلوہ محبوب سے تباہی اور قیامت کے آنے کا مضمون بڑے سلیقے سے باندھا ہے۔ کہتے ہیں

اگر وہ بے پردہ ہو جائیں تو ہو عالم تباہ
اس گلی میں ہو زمانہ اپنے گھر کوئی نہ ہو

گر یہی جلوے ہیں تو عالم ہو ویراں تمام
دیکھ لینا اس کے کوچے میں ہزاروں گھر بنے

زاہد، واعظ اور ناصح مرزا داغؔ نے زاہد، واعظ، ناصح اور محتسب سے بھی بہت چھیڑ چھاڑ کی ہے اور بعض جگہ تو حد سے بڑھ گئے ہیں۔ حسنؔ بریلوی نے بھی زاہد، واعظ اور ناصح کو بار بار چھیڑا ہے مگر حد اخلاق یا حد ادب سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ متانت اور سنجیدگی سے بات کی ہے، فرماتے ہیں ؎

یہ فصل گل، یہ ابر، درِ میکدہ قریب!
ایسے میں آپ حضرت زاہد کہاں چلے

ناصحو! سچ ہے، قیامت ہے محبت کا عذاب
اس کو تم کیا کہتے ہو ہم سے، ہمیں کہنے کو تھے

قابل تعزیر میکش ہیں جناب محتسب
دُور کی تقصیر کیا ہے دُور چلنے دیجیے

تقابل حسنؔ بریلوی نے ایسی زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں جن میں اساتذہ نے بظاہر کوئی مضمون باقی نہ چھوڑا تھا۔ اور دوسرے شعرا کو ان زمینوں میں قلم اُٹھانا بہت دشوار تھا مثلاً ذوقؔ کا ایک شعر ہے ؎

مٹنے بلا کر ساقیا سامری فن آب میں
کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں

اسی زمین اور اسی قافیہ میں حسنؔ بریلوی کے اشعار دیکھیے ؎

اس گھٹا میں کیوں گھٹاتے ہو مزا لطف وصال
ابر گھٹنے کے لیے ڈالو نہ روغن آب میں

غیر سے بے حس بھی یوں شیر و شکر ہوتے نہیں
دیکھ لو تم ڈال کر تھوڑا سا روغن آب میں

ستاذ ذوق نے مُسکن قافیہ نہیں باندھا ہے۔ حسؔن بریلوی نے یہ قافیہ یوں باندھا ہے ؎

بار گل سے جھک چلیں شاخیں لب جو کیا عجب
بلبلیں ہوں ڈال پر بلبل کا مسکن آب میں

ستاذ مرزا داغؔ دہلوی کا شعر ہے ؎

دیکھا دل ان کا غیر نے سینے پہ رکھ کر ہاتھ
وہ کاش دیکھتے نہ مجھے اضطراب میں
دل دے کے مفت مول لیا پھر ہزار بار۔
اپنے دُھوئیں بکھر گئے عہد شباب میں

ساتذہ کی کاوش فکر کے بعد اس زمین میں قلم اُٹھانا آسان بات نہیں لیکن حسؔن ریلوی نے اس زمین میں بھی اچھے اشعار نکالے ہیں ؎

ہم جاں بلب ہوں حیف ابھی رہیں وہ حجاب میں
اے برق آہ آگ لگا دے نقاب میں
تدبیر وصل یہ ہے عدو کو بُرا لکھوں
جھنجلا کے آپ آئیں گے خط کے جواب میں

ماخوذ:۔
(۱) شعر حسنؔ، از نظیر لدھیانوی، رضا پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۸ء
(۲) سیرت اعلیٰ حضرت، از مولانا حسنین رضا، سنی رضوی اکیڈمی ماریشس افریقہ ۱۹۸۳ء
(۳) امام احمد رضا نمبر ماہنامہ قاری دہلی ۱۹۸۹ء
(۴) ماہنامہ "حجاز جدید" دہلی۔ جنوری، فروری ۱۹۹۱ء

منظر مظفرپوری (کہانی)
پیغمبر پور، کاہوا، مظفرپور، بہار ۸۴۲۰۰۳

ریلیف کیمپ

اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ گھر کو لٹتے، لخت جگر کو خون میں نہاتے، جوان ہوچلی بیٹی عصمت کو درندوں سے انسانیت کی بھیک مانگتے، اس کے بعد.... اور پھر اس کے بعد کنویں میں چھلانگ لگاتے، اتنا ہی نہیں، پٹرول میں نہائی مدینہ کو بے تحاشا بھاگتے اور شرپسندوں کو اس کا تعاقب کرتے پھر اس کے بعد اپنی شریک حیات کے بدن سے آگ کے اٹھتے ہوئے شعلوں کو بھی اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو یا تو وہ اپنی دونوں آنکھیں پھوڑ لیتا یا ان لوگوں کے ہاتھ قطع کر ڈالتا جنھوں نے چشم زدن میں اس کا سبز و شاداب کنبہ تاراج کر ڈالا — اسے کیا خبر تھی کہ دہشت گرد اس کی دُنیا ہی ویران کر کے رکھ دیں گے۔ اسے جاں بلب کر کے درخت سے اُلٹا لٹکا دیں گے اور پھر شروع کر دیں گے جان و مال کی تباہی کا ہولناک سلسلہ۔

ہوش میں آنے کے بعد خود کو اس نے ریلیف کیمپ کے ایک بستر پر لیٹا پایا۔"

"میں کہاں ہوں؟" وہ بڑے زور سے چلایا۔

"ریلیف کیمپ میں، گھبراؤ نہیں اب تمھیں کچھ نہیں ہوگا، کیوں کہ یہاں تم ہر طرح سے محفوظ ہو۔" ایک سپاہی اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

"محفوظ تو اسے رکھا جاتا ہے جس کے پاس کچھ ہوتا ہے مگر میرے پاس اب کیا رہا۔؟"

"تمھاری زندگی۔"

"اب ایسی زندگی کا کیا لینا جس کے جینے کی تمام آرزوئیں بیوی بچوں کے ہمراہ ختم ہوگئیں۔ لو مجھے بھی مار ڈالو، میں نہیں جی سکوں گا اپنے بیوی بچوں کے بغیر۔" شدت غم سے دل برداشتہ ہو کر وہ رو پڑا۔

اس روز وہ چھپے چوری ریلیف کیمپ سے باہر نکل آیا اور سیدھے اپنے گاؤں پہنچا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا۔ ممکن ہے عصمت کو کسی انسان نے اس کے جیتے جی کنویں سے باہر نکال لیا ہو اور سنبل سا گیسو، چاند سا مُنہ، پھول سا بدن والے چھ سالہ یوسف

کو کسی صاحبِ اولاد نے آبِ حیات سے سبز و شاداب کر کے مرجھانے سے بچا لیا ہو۔ اور مدینہ کے جلتے ہوئے جسم کو کسی اہلِ دل نے بجھا کر مرنے سے بچا لیا ہو۔ آمین ثم آمین۔" اتنا بول کر وہ گھر کو جانے والی ایک پگڈنڈی پر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ جب گھر اور اس کے درمیان چند قدموں کے فاصلے رہ گئے تب اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ یوسف، عصمت، اور مدینہ کی گلابی صورتیں پے در پے تصور میں گردش کرنے لگیں..... جب وہ گھر کے اندر داخل ہوگا تو سب سے پہلے یوسف اس کا خیر مقدم کرے گا۔ یعنی دوڑ کر اس کے قریب آ جائے گا اور دامن سے لپٹ کر اپنی توتلی زبان سے "بابا آگئے بابا آگئے" کی رٹ لگانا شروع کرے گا پھر وہ اسے گود میں اٹھا لے گا، اس کا دلار کرے گا اور چاکلیٹ دے گا۔ اسی درمیان عصمت گرما گرم چائے کی ایک پیالی اور نمکین لیے اس کے عین مقابل آ کر ادب سے کھڑی ہو جائے گی — چائے وائے پی لینے کے بعد وہ یوسف کو عصمت کی گود میں ڈال کر سیدھے باورچی خانے میں گھسے گا اور کھانا بنانے میں مصروف مدینہ کے نزدیک پہنچ کر سب سے پہلے اس کی آنکھیں موند لے گا۔ پھر اس کا ہاتھ بٹانا چاہے گا مگر یہ کہتے ہوئے مدینہ اسے منع کرے گی کہ آپ زحمت نہ کریں۔ میں کس دن کے لیے زندہ ہوں۔ یہ ساری باتیں سوچ سوچ کر وہ دل ہی دل میں محظوظ ہونے لگا مگر جیسے ہی اس کی نظر ایک جلے ہوئے بوسیدہ مکان کے عین متابل واقع ایک کنویں پر پڑی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ دل سے بغیر کوئی اجازت طلب کیے لمبے لمبے ڈگ بھرتا کنویں کے قریب پہنچا اور چاہا کہ اس کے اندر جھانکے۔ مگر یہ خیال آتے ہی کہ اس کنویں میں چھلانگ لگاتے وقت عصمت برہنہ جسم تھی۔ اس کے ارادے جیسے منجمد ہو گئے۔ اس کے علاوہ اسی کنویں سے کسی سڑی گلی لاش کی اٹھنے والی بدبو اس کی ناک میں سمانا شروع ہوئی تب اس کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہا کہ عصمت جو اس کی بیٹی تھی جس کے ہاتھ وہ آئندہ سال پیلے کرنے والا تھا اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ" اتنا بولنے کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر اس طرح رونے لگا جیسے کوئی ضعیف باپ اپنی لاڈلی کو رخصت کرنے کے بعد روتا ہے۔

اب اسے یوسف اور مدینہ کے بارے میں جاننے کی بے کلی تھی کہ وہ کیا ہوئے اور کہاں گئے۔ لہٰذا اس نے سرسری نگاہ سے گرد و پیش کا جائزہ لینا شروع کیا۔ پوری بستی کسی کوکھ جلی ماں کی اجڑی ہوئی گود کی طرح سونی نظر آ رہی تھی۔

"میرا یوسف!" وہ اچانک چیخنے لگا۔ "تو کہاں چھپا ہے میرا لال؟... دیکھ میں آ گیا ہوں... اور عصمت کی ماں! تم جہاں کہیں بھی ہو جلدی سے چلی آؤ۔ تمھاری بیٹی کی لاش کنویں میں سڑ رہی ہے اور تم ہو کہ ڈر کے مارے چھپی ہوئی ہو؟"

آخر کیسی ماں ہو؟" چیخ چیخ کر اس نے گلے کی آواز بٹھالی مگر لاحاصل! تب آخر میں تھک ہار کر وہ اپنے جلے ہوئے بوسیدہ مکان کے صدر دروازے تک پہنچا۔ کواڑ پہلے سے کھلا پڑا تھا۔ اس وجہ سے وہ بے دھڑک گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ ورنہ ممکن ہے کہ حسبِ عادت اس گھڑی بھی اس کی زبان سے بیساختہ نکل پڑتا کہ "عصمت کی ماں دروازہ کھولو۔"

پورے کمرے میں سامان بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے، جنھیں وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر جن سامانوں کو دیکھ کر اس کا سر چکرانے لگا تھا وہ تھے یوسف کے ننھے ننھے کپڑے اور جوتے، اس کے علاوہ اسکول بکس اور وہ کتابیں جن کی تحریروں کو بطور سبق صبح و شام وہ اپنی توتلی زبان سے اس طرح رٹا کرتا تھا "ہم چھب ایک ہیں [ہم سب ایک ہیں]، بھالت ہمالی ماتا ہے۔ [بھارت ہماری ماتا ہے۔]

چھالے جہاں چھے اچھا ہند دچتاں ہمالا
ہم بلبلیں ہیں اچھکی یہ گلچھتاں ہمالا

{ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا } وغیرہ۔

"یوسف!" ایک دلخراش چیخ کے ساتھ اس نے بڑی بے دردی سے خود کو زمین پر گرا لیا۔ اور ایک بار پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پھر نہ جانے اچانک اسے کیا خیال آیا کہ بلا تاخیر اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا اور باری باری سے یوسف اور مدینہ کو آواز دیتے ہوئے پوری بستی کا گشت لگانا شروع کیا۔ اسی دوران ایک جیپ اس کا تعاقب کرتی ہوئی اس کے پاس آکر رک گئی اور اس کے اندر بیٹھے چند خاکی وردی والے باہر آگئے۔ پھر ہوا یہ کہ انھوں نے اسے دبوچ لیا نیز جبراً جیپ میں بٹھانے کی سعی کرنے لگے ــ "مجھے چھوڑ دو! دیکھتے نہیں میں اپنے بیوی بچے کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ کیا تم نے انھیں کہیں دیکھا ہے؟"

"نہیں! وہ مارے گئے۔ چلو ہمارے ساتھ" ایک سپاہی رُوکھا سا جواب دیتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اسے پھر سے جیپ کے اندر بٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"لیکن کہاں؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"ریلیف کیمپ! جہاں سے تم بھاگ کر آئے ہو، چلو جلدی بیٹھو جیپ میں، یہاں تمھیں خطرہ ہے، جب کہ وہاں ہر طرح سے محفوظ رہو گے۔"

"لیکن اب مجھے کس بات کا خطرہ؟؟؟"

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سیرتِ طیبہؐ میں سماجی انصاف کی تعلیم

مصنف: اختر الواسع
قیمت: ۱۰ روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
مبصر: محمد اسحاق

زیرِ نظر کتاب دراصل معین الدین حارث یادگاری خطبۂ سیرت ہے جو سیرتِ طیبہؐ میں سماجی انصاف کی تعلیم، کے موضوع پر پروفیسر اختر الواسع صاحب نے ۱۸ر جون ۱۹۹۱ء کو انجمن اسلام بمبئی کے زیرِ اہتمام دیا تھا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃٌ حسنۃٌ یعنی اللہ کے رسول کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ سیرتِ طیبہ کا موضوع لا متناہی ہے۔ اس کا سنجیدہ اور علمی مطالعہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

سیرتِ طیبہؐ میں سماجی انصاف کی تعلیم کا موضوع اپنے اندر بڑی وسعت اور ہمہ گیری رکھتا ہے۔ سیرتِ پاکؐ کا مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہو گا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس ماحول میں پیدا ہوئے وہاں ظلمت و تاریکی کا تسلط تھا، اخلاق، تہذیب اور شائستگی کے جو خیالات ان میں موجود تھے وہ نہایت خام اور ادنا درجہ کے تھے، ان کے طور طریقے وحشیانہ اور ان کی زندگی نہایت گندی تھی۔ قتل، زنا، جوا، شراب، چوری اور رہزنی ان میں عام تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بچپن ہی میں اپنے والدین اور دادا کی سرپرستی سے محروم ہو گئے تھے لیکن بچپن ہی سے آپ کی زندگی کلیتاً سب سے منفرد تھی، آپ کا معاشرہ میں اٹھنا بیٹھنا، ملنا جلنا اور معاملات کرنا سب کچھ مختلف تھا، آپ کبھی جھوٹ نہیں بولے۔ آپؐ کی امانت داری اور سچائی کی گواہی ساری قوم دیتی تھی۔ آپؐ کے کسی بدترین دشمن نے بھی آپؐ پر جھوٹ بولنے کا الزام کبھی عائد نہیں کیا۔ آپؐ نے کبھی کسی سے بدکلامی نہیں کی، کسی نے آپؐ کی زبان سے کوئی فحش بات نہیں سنی، آپؐ کے معاملات میں شروع سے انصاف کا تصور نمایاں رہا۔ کسی کی

کبھی حق تلفی نہیں کی، تجارت شروع کی تو انصاف اور ایمان داری کو ہمیشہ آگے رکھا، بے حیائی کے ماحول میں آپؐ حیا کے پیکر اور بداخلاقیوں کے درمیان پاکیزہ اخلاق والے تھے۔ آپؐ اس زمانے کی نہ صرف یہ کہ تمام سماجی برائیوں سے کوسوں دور رہے بلکہ ان برائیوں اور خباثتوں سے ہمیشہ نفرت کی۔ شروع سے یتیموں، بیواؤں، محتاجوں، ضرورت مندوں اور مسافروں کی مدد کرنا آپ کا شیوہ رہا۔ اسی لیے جب آپ پر وحی کا سلسلہ شروع ہوا اور آپؐ غار حرا سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تو آپؐ کی پریشانی اور گھبراہٹ کو دیکھ کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا۔

"خدا کی قسم آپ کو خدا کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتے داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں (ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ امانتیں ادا کرتے ہیں) بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی ہر زمانہ کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک روشن چراغ ہے جس سے دل ودماغ اور روح روشنی پاتے ہیں، خلوت میں بھی سکون نصیب ہوتا ہے سماجی جھمیلوں میں بھی رہنمائی ملتی ہے، خانقاہوں کی بھی تربیت ہوتی ہے اور دانش گاہیں بھی فیض پاتی ہیں۔

حبشہ کی طرف جب حضرت جعفر طیارؓ کی سربراہی میں مسلمانوں نے ہجرت کی تو نجاشی کے دربار میں مشرکین مکہ نے اپنا سفیر بھیجا تاکہ مسلمانوں کو وہاں پناہ نہ ملے۔ اس واقعہ کی تفصیلات سیرت ابن ہشام میں ملتی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں یہ پورا واقعہ تفصیل سے موجود ہے۔ اس موقع پر نجاشی کے بھرے دربار میں حضرت جعفر طیار نے فرمایا:

"اے بادشاہ! ہم جاہلیت میں مبتلا تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ مردار کھاتے اور بدکاریاں کرتے تھے، خونی رشتوں کا پاس ولحاظ نہ کرنا اور پڑوسی کے حق سے غافل رہنا ہمارا شعار تھا۔ ہم میں سے جو طاقت ور ہوتا وہ کمزوروں کا خون چوستا تھا۔ ہم اس حال میں تھے کہ اللہ نے ہم ہی میں سے ایک کو ہماری جانب پیغمبر بنا کر بھیجا۔ ہم اس کے حسب و نسب، اس کی صداقت شعاری، امانت داری اور پاکبازی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا اسے ایک جاننے اور اسی کی عبادت کرنے کی تلقین کی۔ اس نے ہم سے کہا کہ ہم ان پتھروں اور بتوں کی پوجا ترک کر دیں جن کو ہم اور ہمارے آباء اللہ کے سوا پوجتے آرہے ہیں۔ اس نے سچ بولنے، امانت داری، صلہ رحمی اور پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی اور خونریزی اور بے حرمتی سے باز رہنے کی تلقین کی۔ اس نے فحش، دروغ گوئی، یتیم کا مال کھانے اور شریف عورتوں پر تہمت طرازی سے منع کیا۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور روزے رکھیں....."

خطبۂ حجۃ الوداع رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا نچوڑ ہے جس میں پروفیسر اختر الواسع کے لفظوں میں "وحدت الٰہ اور وحدت آدم کا ایسا آفاقی اعلان نامہ ہے جسے انسانی تہذیب کے روحانی، دانش ورانہ اور تخلیقی سفر کی منزل مراد کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر انسانی تہذیب کے انتہائے کمال کو زبان میسر آجائے تو اس سے بالکل وہی الفاظ جاری ہوں گے جو اس خطبہ میں نبی آخر الزماں کی زبان سے ادا ہوئے۔ یہ اعلان اس ازلی و ابدی انسانی موقف کی حتمی دستاویز ہے کہ تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں ان کا خالق ایک ہے۔ مورث اعلا ایک ہے۔ اور سب انسانوں کی تخلیقی ساخت ایک ہے یعنی مٹی۔ یہ اعلان ایک ایسی تلوار ہے جس نے انسانوں کے دل و دماغ اور نفس کے گرد لپٹی رنگ و نسل، ذات برادری، خاندان اور طبقوں کی زنجیریں کاٹ کر رکھ دیں اور انسانی روح کو اس کے بے پناہ تخلیقی امکانات سے آشنا کیا اور اس کی فطری صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا ایسا وسیع میدان عطا کیا جہاں ہر چیز کا معیار صرف انسانی عمل ہے۔ ایسا انسانی عمل جو تقوا اور پرہیز گاری سے عبارت ہو۔"

اس کتاب کے آخر میں قارئین کی افادیت کے لیے خطبہ حجۃ الوداع کا اردو ترجمہ شامل کر دیا گیا ہے۔ نیز اقوام متحدہ کا منشور حقوق انسانی کی تیس دفعات بھی پیش کی گئی ہیں تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل حقوق انسانی کے جس وسیع تصور کی تعلیم دی گئی تھی وہ آج کے ترقی یافتہ دور کے مقابلے میں کس قدر جامع، مبنی بر انصاف اور اعلا اقدار پر مشتمل ہے۔

پروفیسر اختر الواسع کے اس خطبہ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس موضوع پر عصری معنویت کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہایت مؤثر انداز میں سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔ سیرت نگار شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے پروفیسر ہیں جن کا خاص موضوع مسلم تہذیب و ثقافت ہے۔ آپ ایک مشہور انشا پرداز، محقق اور صاحب نظر مصنف ہیں۔ انجمن اسلام، بمبئی نے اس خطبہ کی اشاعت کا اہتمام کر کے ایک بڑا اہم دینی کام انجام دیا ہے۔ مکتبہ جامعہ اس کی بہترین کتابت اور طباعت کے لیے بجا طور پر مبارک باد کا مستحق ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس سے ضرور استفادہ فرمائیں گے۔

کشت فیض

(مضامین کا مجموعہ)

مصنف: ڈاکٹر سید واصف احمد
مبصر: ڈاکٹر خالد محمود
ملنے کا پتا: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

فیض احمد فیض اردو کے ان معتدد شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے ہمارے ادب کو عالمی ادب کے روبرو سر بلند کیا ہے۔ ہر چند کہ وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر اور وابستہ تھے مگر انھوں نے اپنے شعری رویے کو دو بڑی حد تک اس تحریک کی نام نہاد

ادبی شرائط سے حیرت انگیز طور پر ناوابستہ رکھا۔ اس وابستگی نے ان کی شاعری کی وہ قوت اور شعور عطا کر دی کہ وہ منقسم ہندستان کے غیر منقسم شاعر کی حیثیت سے دونوں ملکوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ فن شعر میں انھوں نے یہ کمال دکھایا کہ کلاسیکی شاعری کے لفظوں میں تازہ روح پھونک دی پرانی تشبیہوں اور استعاروں کو نئی معنویت کا ادراک ہوا اور قدیم غنائی شاعری اپنی ساری غنائیت کے ساتھ عصری مسائل پر بے محابہ گفتگو کرنے لگی۔

فیض اس اعتبار سے بھی خوش نصیب ہیں کہ عوام نے زندگی بھر ان کی پذیرائی کی اور بعد از مرگ بھی انھیں یاد رکھنے والوں کی تعداد میں کمی نہیں آئی۔ انھیں پڑھنا، سننا اور بہ زبان قلم یاد رکھنا ادب سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والوں کا آج بھی پسندیدہ عمل ہے۔ "کشت فیض" اسی عمل مسلسل کی ایک کڑی ہے۔

زیر نظر کتاب ڈاکٹر سید واصف احمد صاحب کے آٹھ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر سید واصف احمد نے اپنے مضامین کے وسیلے سے فیض کی شاعری کو مختلف زاویے سے پرکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کتاب کو مفید اور سودمند بنایا ہے جیسا کہ اپنے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

"زیر مطالعہ کتاب میں فیض کی شاعری اور نظریہ پر چند مفید اور سودمند مضامین شامل ہیں... حسب توفیق ہر موضوع پر میں نے بصیرت افروز نگاہ ڈالی ہے۔ فیض کی ذہنی ساخت، افتاد مزاج اور میلان طبیعت کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے.... فیض کے نظریہ فن پر اختصاص سے عمیق و بسیط و بصیرت افروز روشنی ڈال کر اس کی داخلیت، خارجیت، افادیت، ہئیت اور اہمیت کو حق النقد در اور دیانت داری سے رقم کرنے کی سعی کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ مطالعہ فیض کے سلسلے میں قارئین کی شدید ضرورت کو پورا کرے گا۔"

ماہنامہ "آج کل" (جذبی نمبر)

مدیر اعلیٰ: محبوب الرحمٰن فاروقی
مبصر: ڈاکٹر خالد محمود

"آج کل" کے مدیر اعلا محبوب الرحمٰن فاروقی نے جب سے دوبارہ ادارت سنبھالی ہے اس پرچے کا مزاج ہی بدل گیا ہے۔ عام سے عام شمارہ بھی کچھ ایسی تخلیقات لے کر آتا ہے کہ خوش ذوق قاری کی تسکین کا سامان ہو جاتا ہے۔ اب قاری اس پرچے کا انتظار کرنے لگا ہے۔ یہ عام شمارے کی بات ہے۔ خصوصی شمارے بہر زاویہ خصوصی ہوتے ہیں۔ ان کے ظاہر کی جاذبیت ضخامت، باطن کی معنویت اور نفاست، ترتیب کی خوش سلیقگی اور توازن اور مضامین کے انتخاب کی معروضیت اور غیر جانب داری اپنا تعارف آپ ہیں۔

شخصی نمبروں میں اخترالایمان کے بعد اگست ۹۴ء کا خصوصی شمارہ "جذبی نمبر" ہے

شدت جذبات کے شاعر جذبی؟ اس نمبر کی جان ہے۔ اس انٹرویو میں مختصر مگر جامع انداز اختیار کرتے ہوئے صرف وہی سوالات پوچھے گئے ہیں جن سے شاعر کے فکر و فن اور نظریہ فکر و فن پر روشنی پڑتی ہے۔ کہیں کہیں زندگی کے نشیب و فراز پر بھی بات چیت کی گئی ہے۔ سوانحی اشارے اور شخصیت سے متعلق باتیں معلومات شمس کنول صاحب بلاواسطہ فراہم کرتے ہیں۔ اکثر انٹرویو لینے والے اپنے سوالات کی تمہید میں غیر ضروری اور غیر متعلق باتوں کو اتنا طول دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اور کا نہیں خود اپنا تعارف کرانا چاہتے ہیں۔ سوالات کی زبان بھی لچھے دار پر تکلف اور رنگین ہوتی ہے۔ شمس کنول صاحب نے اس روایت سے انحراف کیا ہے مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں صاحب کا خیال ہے۔ اردو ادب میں ایسے منفرد انٹرویو بہت کم پڑھنے میں آتے ہیں۔

مذکورہ بالا تحریریں اور اس خوب صورت انٹرویو کے علاوہ خلیل الرحمٰن اعظمی اور شوکت تھانوی کے تنقیدی اور تاثراتی اقتباسات اور مسعود علی بیگ صاحب کا منتخب کردہ کلامِ جذبی بس یہی چیزیں اس نمبر کو باوقار بنانے کے لیے کافی تھیں مگر مدیر آج کل نے صرف انہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کئی اور لاجواب مضامین شامل کر کے جذبی نمبر کو ایک وقیع دستاویز بنا دیا ہے۔ ہر مکتبہ فکر کے نئے اور پرانے مگر نمائندہ لکھنے والوں کے رشحاتِ قلم نے اس نمبر کے معیار و اعتبار میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے موضوعات اور اسمائے گرامی اس طرح ہیں۔

جذبی۔ شخص اور شاعر (ڈاکٹر قمر رئیس) جذبی۔ چند تاثرات (زبیر رضوی) دیکھو تو وہ حریف شب تار کیا ہوئے (پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی) ایک کم سخن، کم گو کم آمیز شاعر (پروفیسر شارب ردولوی) جذبی کی فن کاری (فضیل جعفری) جذبی کا شعری سفر (پروفیسر عبدالقوی دسنوی) جذبی اپنے فکر و فن کی دنیا میں (ڈاکٹر سید عبدالباری) جذبی کا ذہنی پس منظر (ابن فرید) جذبی کی شاعری (سراج اجملی) جذبی ایک ناقد ایک محقق (ڈاکٹر مظہر حسین)

امید ہے کہ "آج کل" کا یہ جذبی نمبر بھی اخترالایمان نمبر کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور جی چاہتا ہے کہ نمبروں کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔

برج پریمی ایک مطالعہ

مرتبہ: پریم رومانی
پبلشر: دیپ پبلی کیشنز پریس موڑ، باغ باہو جموں (توی)
قیمت: ۵۰/- روپے
مبصر: اقبال مسعود

زیر تبصرہ کتاب ایک ادیب کا اپنے محقق اور افسانہ نگار والد کی خدمت میں نذرانہ خلوص ہے جو ان کا روایت کی پاسداری اور صالح اقدار پر عمل کرنے کی ایک نمایاں مثال ہے۔ "برج پریمی ایک مطالعہ" ذہانت سے ترتیب دیا گیا ہے اور خوبصورت طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں برج پریمی کے فن و شخصیت پر ۵۵ حضرات نے کچھ نہ کچھ تحریر کیا ہے

ان میں معروف اہل قلم بھی ہیں اور ادب کی بستی کے نو واردان سخن بھی۔ سبھی نے اپنے اپنے انداز سے برج پریمی کی شخصیت، فن، ان کی تصانیف، افسانہ نگاری اور تحقیق پر اور ان کے بے وقت سانحہ انتقال پر جذباتی اور تجزیاتی انداز سے تحریر کیا ہے۔

مذکورہ کتاب میں پروفیسر عنوان چشتی۔ کشمیری لال ذاکر۔ محمد اسد اللہ وانی اور پریم رومانی کے مضامین بھرپور ہیں۔ اور ان حضرات نے اپنے موضوعات سے بھرپور انصاف کیا ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی کی دس کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوکر داد تحسین حاصل کرچکی ہیں ان جیسے مخلص اور اردو۔ کشمیر اور منٹو کے عاشق پر ابھی بہت کام کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں مذکورہ کتاب کو اس سفر کی ابتدا سمجھنا چاہیے۔ اس سب کے باوجود پریم رومانی قابل تعریف ہیں کہ انھوں نے اپنے والد کی میراث کو آگے بڑھانے کا بیڑا اٹھایا ہے اور خدا کرے کہ وہ اپنے عزائم میں کامیاب ہوں۔

نقوش تابندہ

مصنف:۔ پروفیسر سید محمد اجتبا ندوی
مبصر:۔ اسیر اوروی
صفحات: ۳۱۹ قیمت: ۷۰/روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار۔ دہلی ۶۔

یہ کتاب مصنف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو آپ نے مختلف اخبارات ورسائل میں لکھے ہیں، اور بعض ریڈیائی تقریریں ہیں۔ ان متفرق مضامین کو اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ ایک مربوط کتاب بن گئی ہے۔ یہ حسن ترتیب کی کرشمہ سازی ہے، مصنف نے اسلامی تاریخ کے حیرت ناک مگر سچے اور موثر واقعات وحقائق کو صاف ستھری زبان میں پیش کردیا ہے ابتدا عہد اسلام سے لے کر ہندستان کے دور اخیر تک کے واقعات ہیں لیکن ان کے انتخاب میں اس پہلو کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں قومی وملی شعور بیدار ہو اور مسلمانوں میں خود اعتمادی کا جوہر از سر نو پیدا ہو۔ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ جس عنوان کو شروع کردیجیے تو بغیر ختم کیے کتاب ہاتھ سے رکھی نہیں جاسکتی۔ بیان واقعہ میں سلیس زبان استعمال کی گئی ہے۔ عبارت آرائی بوجھل تراکیب اور خوب صورت الفاظ کے استعمال کرنے کی شعوری کوشش نہیں کی گئی ہے۔ تاریخی حقائق اور واقعات میں بھی ایک ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے۔ مثلاً اسلامی قاضیوں کی دانش مندی ونکتہ رسی کے واقعات ایک جگہ ہیں۔ خلفاء اسلام کے عدل وانصاف کے واقعات کو ایک ساتھ رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر مجھے کتاب الاذکیاء کی یاد آجاتی ہے جو اسی موضوع پر عربی زبان میں ہے اور اب اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کردیا گیا ہے۔

کتاب میں کہیں کہیں سہو قلم سے بعض ایسے الفاظ آگئے ہیں جو نہ ہوتے تو بہتر ہوتا

اً:-

امانت رکھانے کا تجربہ ہو (امانت رکھنے کا تجربہ ہو)
رکھا دینا چاہتا تھا (رکھوا دینا چاہتا تھا)
پوری رات جگتار رہا ہوں (پوری رات جاگتا رہا ہوں)
امن وامان اور استقرار قائم کر دیا (اردو میں مستعمل نہیں)
تم نے میرے پاس کچھ نہیں رکھایا ہے (تم نے میرے پاس کچھ نہیں رکھوایا ہے)

ں صفحات الٹ پلٹ گئے ہیں، کچھ صفحات غائب ہیں اور کچھ مکرر ہیں۔ یہ بک بائنڈر ستم ظریفی ہوگی (کتابت جلی اور روشن ہے۔ ٹائیٹل کارڈ بورڈ کا یک رنگا اور اچھا ہے اب دلچسپ اور مفید ہے اس کے مطالعہ کی سفارش کی جا سکتی ہے۔

کھلے خطوط

مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جولائی اور اگست کے شمارے ملے ان میں چھپے بعض خطوط کو پڑھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ مجھے اداریہ لکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ مضمون یا مقالہ لکھنے کی نہیں۔ اداریہ میں بات ہمیشہ اجمال میں کی جاتی ہے، تفصیل کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی ہے۔ اس لیے اداریہ نویس سے تفصیل کا مطالبہ کرنا نامناسب ہے۔

میری ناچیز رائے میں ادب عالیہ کو صارف سماج، اس سماج میں میڈیا کے کردار اور خود زبان وادب کی تدریس کے طریقہ کار — ہر طرف سے خطرات لاحق ہیں۔ میں نے کوشش کی کہ اداریہ میں ان تمام جہات کا احاطہ کروں۔ مجھے حیرت ہے کہ بعض لوگوں نے اسے محض زبان وادب کی تدریس کا مسئلہ کیسے سمجھ لیا۔ تدریس کا مسئلہ اس کا محض ایک پہلو ہے وہ اس طرح کہ بھولے بھٹکے جو ذہین طلبہ ادب کی طرف مائل ہوتے ہیں ان کو بھی اگر زبان کی باریکیاں نہیں سکھائی جائیں گی اور ان کے ادبی ذوق کی آبیاری نہیں کی جائے گی تو اچھے ادب کے قاری کہاں سے آئیں گے؟ اسی لیے میں نے آخر میں عرض کیا تھا کہ بھولے بھٹکے جو ذہین طلبہ ہمارے ہاتھ آتے بھی ہیں، ہم ان میں بھی ادبی ذوق پیدا کرنے میں اکثر ناکام ہیں۔ لیکن ذہین طلبہ بھولے بھٹکے ہی ادب کی تعلیم کی طرف کیوں مائل ہوتے ہیں؟ یہی وہ کلیدی نکتہ ہے جس پر اداریہ کی ابتدا میں پورا ایک صفحہ صرف کیا گیا تھا اور جسے فاضل مکتوب نگاروں نے نظر انداز کر دیا ہے۔

اس وقت ساری دنیا میں ہیومنٹیز (Humanities) جس بحران کا شکار ہے وہ ایک سماجی معاشی عمل سے عبارت ہے عالمی سطح پر جس صارف سماج کی تخلیق ہو رہی ہے اس میں بنیادی قدر فوری منافع اور حصول زر ہے۔ یعنی ادب اور دیگر فنون بھی تب ہی اہم ہوں گے جب وہ حصول زر کا ذریعہ بنیں۔ کلاسیکی موسیقی مصوری فلسفہ یا اعلا ادب اس کام میں زیادہ معاون نہیں ہوتے۔ یا اُن لوگوں کی اصطلاح میں اس میدان میں، "لاگت" زیادہ اور منافع کم ہے۔ اس لیے ان کی طرف سے بے توجہی برتی جاتی ہے — ان حالات میں جس نظام اقدار کی تخلیق ہو رہی ہے اس میں تاجرانہ ذہنیت کا برملا اظہار اب کوئی بڑی بات نہیں سمجھی جاتی ہے۔ ظاہری چمک دمک سے بھرپور زندگی کو مقصود حیات سمجھا جانے لگا ہے — مکتوب نگاروں میں سے بعض لوگ ہر بات کی تفصیل کے متقاضی ہیں۔ اس لیے ایک مثال سے اس بات کی وضاحت کی جاتی ہے:

ابھی بہت دن نہیں ہوئے جب باورچی خانہ، بیٹھک یا نشست گاہ سے دور ہوا کرتا تھا اور گھر کے برتنوں کو مہمانوں کی نظر سے پوشیدہ رکھا جاتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے باورچی خانہ بیٹھک سے متصل

ہوگیا اور برتنوں کو شوکیس میں سجا کر
نشست گاہ میں رکھا جانے لگا ہے۔ اسی
طرح شوکیس کی تجارتی ضرورت نے طرز زندگی
کی شکل اختیار کرلی ہے۔ دراصل اشیائے
صرف کا شعور پیدا کرنے کے لیے اشتہاراتی
نظام اور میڈیا نے جو نفسیاتی طریقہ کار
اختیار کیا ہے اس نے تجارتی اقدار کو طرز
زندگی کی شکل دے دی ہے اسے اب
زندگی کی طرف ایک نئے نقطۂ نظر کا خوب صورت نام
دیا جارہا ہے۔ میڈیا جو اسی عمل کا ایک حصہ ہے۔ ان
اقدار کی خوب خوب تبلیغ کر رہا ہے اسی طرح ایک ایسی
نسل وجود میں آرہی ہے جس کے ذہن و مزاج کی تربیت میں
ادب اور دیگر فنون لطیفہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ان لوگوں
کے پاس زبان کو اس نفاستوں اور نزاکتوں کے ساتھ
سیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فلسفہ کو
بیکار کی الجھن گردانتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے لوگ
اس صارف سماج کے لیے نہایت موزوں ہیں
اس لیے میڈیا کے بیشتر پروگرام ایسے ہی
لوگوں کو ذہن میں رکھ کر تیار کیے جاتے
ہیں۔ اس طرح یہ سارا سماجی معاشی عمل ادب
اور دیگر فنون لطیفہ کے لیے ناسازگار حالات
پیدا کر رہا ہے۔ اس کا پائیدار حل تو اس
نظام کے بدلنے میں مضمر ہے لیکن فوری
طور پر، زبان و ادب کی تدریس کو بہتر بنا کر
بھی زبان و ادب کی حفاظت کا کام کسی
حد تک انجام دیا جاسکتا ہے۔ یہ اس نو
تشکیل پذیر صارف سماج کے خلاف مزاحمت بھی ہوگی

ان خطوط کو پڑھ کر مجھے شبہہ ہونے
لگا ہے کہ ممکن ہے زبان و ادب کی تدریس
کے بارے میں جو باتیں اجمالی طور پر کہی گئی
گئی ہیں ان کا بھی کوئی نیا مفہوم نکل آئے
اس لیے کہ جب بات اجمالی طور پر کہی جاتی ہے
تو محض مجموعی صورت حال بیان کی
جاتی ہے۔ مستثنیات کا ذکر نہیں ہوتا ہے
مثلاً ایسا بھی نہیں کہ درسگاہوں سے اچھے
اور ایمان دار اساتذہ بالکل ہی ناپید
ہوگئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی تعداد
بہت کم ہوگئی ہے اور روز بروز گھٹتی جا
رہی ہے۔ اسی طرح آزادی کے بعد بننے
والے پرائمر سے گزشتہ کاموں پر کوئی اضافہ
تو نہیں ہوا ہے۔ لیکن ایک دو ایسے پرائمر
موجود ہیں۔ جن کو اس موضوع پر ہونے
والی کسی بھی گفتگو میں نظر انداز نہیں کیا
جاسکتا ہے۔ یہ الگ سے کسی مقالہ یا
تجزیاتی مطالعے کا موضوع ہوسکتا ہے۔ اگر اب تک
بننے والے پرائمر کا جائزہ لیا جائے تو اس
سے بعض مفید مطلب نتائج برآمد ہوسکتے
ہیں اور آئندہ کے لیے راہ متعین کرنے
میں مدد مل سکتی ہے۔ یہ اس لیے بھی
ضروری ہے کہ زبان کی تعلیم سرے سے
ختم ہوگئی ہے۔ اسے غیر ضروری سمجھ کر
پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ ہمارے اچھے
خاصے پڑھے لکھے لوگ الفاظ شماری،
حروف میں پنہاں الفاظ سازی کی صلاحیت کے
مطالعے اور ایسے ہی دوسرے کاموں کو غیر ادبی
اور غیر علمی فعل گردانتے ہیں۔ یہ بالکل
اس طرح ہے جس طرح ہمارے بعض دانشور
ادب کو سماجی عمل سے الگ خلا میں جنم لینے
والی کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ کبھی یہ تسلیم
نہیں کریں گے کہ ادب بھی اس تہذیبی عمل کا
ایک حصہ ہے جو اسی صارف سماج میں عمل
پذیر ہے اور تمام تہذیبی مظاہر کی طرح

ادب بھی صاف سماج کی معاشی سرگرمیوں سے متاثر ہو رہا ہے۔

امید ہے اتنی وضاحت کافی ہوگی

قیصر شمیم
۱۶۵۔ حوض رانی۔ مالویہ نگر۔ نئی دہلی ۱۷

اگست ۹۴ء کے شمارے میں مہمان مدیر جناب طارق شمیم صاحب کا مضمون "تخلیقی ادب کی موجودہ صورتِ حال" پڑھا۔ مضمون فکر انگیز ہے۔ ادب میں گروہ بندی کی مضرت رسانیوں کے ساتھ جدید ادب کے کمزور پہلوؤں کی جانب جو اشارے کیے گئے ہیں وہ درست ہیں۔ جدید ادب میں ژولیدہ بیانی، بے ربطگی اور پیچیدگی در آئی ہے۔ دور از کار استعاروں، غیر مانوس علائم اور دوسری زبانوں کی نامانوس اصطلاحوں کے بے دریغ استعمال نے وہ گرد اڑائی کہ اہل قلم اور قاری کے درمیان افہام وتفہیم کا شفاف رشتہ قائم نہیں رہ سکا ہے۔ اصل چیز فہم وادراک کا متاثر ہونا ہے جہاں اس کی کوئی سبیل نہیں وہاں سوائے لایعنی ذہنی ورزش کے اور کیا رہ جاتا ہے۔ نتیجتاً قاری کے ذوق کی تسکین نہیں ہو پاتی۔ ادب صرف اہل ادب ہی کے لیے ہی نہیں ہوتا وہ تو قاری کے لیے ہوتا ہے۔ اہلِ قلم قاری کے بغیر ایسا ہی ہے جیسے مچھلی سمندر کے بغیر۔ عام قاری متقدمین، متوسطین اور متاخرین کو اپنے فہم وادراک کی گرفت میں لے کر نہ صرف ذہن وشعور کے لیے غذا پاتا تھا بلکہ روحانی تسکین یعنی وجدان بھی حاصل کرتا تھا۔ جدید شاعری میں اِس کا فقدان نہ سہی کمیابی ضرور ہے جب تک اس بات کو تسلیم نہیں کیا جاتا کہ "تنوع اور گہرائی زندگی کی خصوصیت ہے اور حسنِ بیان شعر وادب کی" تب تک گوش ولب کے مابین ایک والہانہ رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ جدیدیت سے پہلے اسلاف نے فکر وفن کے حسنِ تکمیل کی خاطر جن اصول وضوابط کو لازمی قرار دیا تھا ان سے انحراف کرنے والے شاعر کو بڑا شاعر تسلیم کیا جانے لگا ہے "زندگی کے تئیں نظریے اور رویے میں تبدیلی کے ساتھ اچھے اور تیکھے کی تعریفیں بدلتی رہتی ہیں"۔ وقت کے ساتھ قدروں کی تبدیلیاں ناگزیر ہیں مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ مرمت کے نام پر آثارِ قدیمہ کا پورا ڈھانچا ہی مسمار کر دیا جائے۔ آج "شعور انسانی کے مسائل تک پہنچانے والی تمام شعوری لاشعوری کوششیں شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہیں"۔ اس طرزِ فکر کو کوئی باشعور انسان قبول نہیں کر سکتا۔ جن اربابِ قلم نے اسلاف کی روش کو پوری طرح ترک نہیں کیا ان کے یہاں صحت مند معنویت کی جھلکیاں ضرور پائی جاتی ہیں۔ ان میں کچھ اچھا اور کچھ اچھے سے اچھا بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ بکھری ہوئی اکائیاں ہیں اور ہمیں ایک بھرپور کل کا انتظار ہے۔

(رزاق حمید جرگ وارڈ ۲۵۱۳۰۔ ناسک)

اگست کا "کتاب نما" نظر نواز ہوا۔ شکریہ مہمان مدیر کی حیثیت سے شمیم طارق کو شامل کرکے آپ نے بہت اچھا کیا۔ شمیم طارق نئی نسل کے تازہ کار اور اہم نام ہیں۔ انھوں نے مختصر سی تحریر میں ساری باتیں سمیٹ دی

ہیں۔ ان کی اس بات سے میں اتفاق کرتی ہوں کہ "اردو میں تخلیقی ادب کی صورت حال دن بہ دن سنگین ہوتی جارہی ہے تو شاید اس لیے کہ تخلیق میں لاایعنیت کی طرف بہاؤ اور تنقید میں نامانوس مغربی اصطلاحات و اقوال کی تجارت کی طرف جھکاؤ کے سبب شعر و ادب کا عام قاری سے رشتہ ٹوٹتا ہے دراصل لمحاتی تجربے یا تاثر کے ذریعے شہرت حاصل کرنے کی ہوس میں ہمارے تجربہ کار شاعر و ادیب ایسا کرتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ رسالوں کے مدیر بار بار انھیں شائع کرکے ان کا قد اونچا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خامہ بگوش کو داد دینی بے حد ضروری ہے۔ تحریر میں جو کاٹ ہے اور نثر میں جو روانی ہے وہ قاری کو ایک لمحے کے لیے بھی غافل ہونے نہیں دیتی ہے۔ ستیہ پال آنند کی نظم اور شجاع خاور کے دونوں مطلعے نہ صرف اچھے لگے بلکہ ذہن میں نقش بھی ہوگئے۔ اور مجتبیٰ حسین کی تعریف کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ تبصرے بھی 'کتاب نما' کی جان ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی توصیفی تبصرے کھلنے لگتے ہیں

شگفتہ طلعت سیما، رپن اسٹریٹ

شبلی ہاؤس، کلکتہ ۷۰۰۰۱۶

مئی کا کتاب نما ملا۔ کالم نگاری یا کوچہ رسوائی پسند آیا۔ اس کالم کو جاری رکھیے۔ جناب مجتبیٰ حسین کا کالم 'نثار احمد فاروقی کے بارے میں' بھی بہت اچھا لگا۔ جدید مراٹھی ادب سے لی ہوئی کہانی 'اذان' بہت اچھی ہے۔ مراٹھی میں اونچے معیار کا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی ہندستان کی دوسری زبانوں کے چیدہ افسانوں میں سے کچھ کے ترجمے شائع کرنے کی کوشش کیجیے۔ اس طرح قارئین کو دوسری قومی زبانوں کے معیاری ادب کے بارے میں جانکاری حاصل ہوگی۔ ایک دو افسانے ہر شمارے میں شائع کرنے کی کوشش کیجیے اپریل کے شمارے میں افسانہ کوئی بھی نہیں تھا۔

(رام پرکاش کپور، ۴۹۸۷ ایم آئی جی۔ پدم نابھ پور درگ ۴۹۱۰۰۱ (مدھیہ پردیش)

کتاب نما اگست میں نفیس نقی، شجاع خاور حامدی کاشمیری اور منیر سیفی پسند آئے۔ منیر سیفی کا تپادر بھنگہ نہیں '۹، سرکلر روڈ پٹنہ' ہے۔

قسیم سہسرامی، پرنسپل، سر اقبال اکیڈمی نزد تالاب، پیرو، بھوجپور، (بہار)

مہمان مدیر جناب شمیم طارق کی تحریر "تخلیقی ادب کی موجودہ صورت حال" پڑھنے کو ملی۔ بے شک آج نئی نسل میں اپنی مخفی قوتوں کو پانے کی تڑپ نہیں رہ گئی ہے۔ یقیناً شمیم طارق صاحب نے اپنی اس تحریر میں ادب کی موجودہ صورت حال پر انتہائی صاف گوئی سے روشنی ڈالتے ہوئے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے وہ تخلیقی ادب کی سنگینی کی جس روش کو اجاگر کرتے ہیں یقیناً وہ سچ ہے۔ شعر و ادب کا عام قاری سے رشتہ ٹوٹنے کی وجہ نامانوس مغربی اصطلاحات کا استعمال ٹھونسنے کی روش بھی ہے۔

(ایم سیف الدین، الہ آباد، یوپی)

اپنی روایات کو قائم رکھتے ہوئے کتاب نما نہایت عمدہ مضامین سے مزین ہے۔ تاہم شعری حصہ حسب سابق کمزور نظر آیا۔ حالانکہ اس میں احمد ندیم قاسمی اور جناب ضمیر جعفری کی نگارشات بھی تھیں۔ جعفری صاحب کے اشعار پر غزل کا عنوان کچھ عجیب سا لگا۔ کم از کم میں سے سورج ملگجے ہے کرنیں۔ چھت لٹکی چمگادڑ سے، جیسے اشعار کو غزل کے شعر نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ہمارے ایک بزرگ شاعر ہیں لیکن مجھے ان کا مطلع عجیب محسوس ہوا اور دونوں مصرعے ایک دوسرے سے مربوط نہیں لگے سے گردن کٹ گئی کالر سے۔ ٹینگ ڈھلے ہیں ڈالر سے

میری دونوں غزلیں اوپر تلے چھاپی گئی ہیں اور پہلی غزل کا شعر دوسری غزل میں گھسا ہوا ہے۔ بہر حال آپ نے پروف ریڈنگ کے غیر ہونے کا جواز بھی شائع کیا ہے لہٰذا اس پر کچھ لکھنا بے کار ہے۔

خامہ بگوش کے مضامین کا "ری پروڈکشن" خوب ہے۔ میں انھیں یہاں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ کیا خوب لکھتے ہیں۔ ساقی فاروقی اور وامق جونپوری پر ان کے مضامین پڑھ کر دیر تک لطف آتا رہا۔ ایسے جملے بس وہی لکھ سکتے ہیں۔

سراج اجملی صاحب کا اداریہ قابل توجہ ہے لیکن آج کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے مجھے شک ہے کہ آنے والے زمانے میں "فن شناس" ہوں گے بھی یا نہیں۔

احمد صغیر صدیقی

Residence :
B - 8, Crystal
Bungalows,
Model Colony,
Karachi. 75100
(PAKISTAN)

دہلی تہذیبی خبریں

اودھی بھاشا اور ہندستانی تہذیب کے موضوع پر ایک یادگار سیمنار

نئی دہلی۔ ہندستان کی ہر زبان کو سرسبز و شاداب رہنا چاہیئے، کسی ایک زبان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا، اس ملک کا خسارہ ہے۔ اس خیال کا اظہار ڈاکٹر کرن سنگھ نے یہاں "اودھی بھاشا اور ہندستانی کلچر" کے موضوع پر منعقدہ ایک سیمنار کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ اس سیمنار کا اہتمام عبدالرحیم خانخاناں میموریل سوسائٹی کے تحت کیا گیا تھا۔ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر اور ہندی اکادمی کے تعاون سے آراستہ کیے گئے اس سیمینار میں ممتاز دانشوروں، ادیبوں اور اسکالرس نے شرکت کی۔

ڈاکٹر کرن سنگھ نے کہا کہ شمالی ہند میں سہ لسانی فارمولے کے ساتھ فراڈ کیا جارہا ہے وہاں تین زبانوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے اکثر ریاستوں میں تو سرکار کی جانب سے صرف ایک ہی زبان پڑھائی جارہی ہے۔ اس کے مقابلے میں جنوبی ہند میں صورتِ حال بہت بہتر ہے اگر کچھ دن یہی صورت رہی تو شمالی ہند کے لوگ جنوبی ہند سے پیچھے رہ جائیں گے۔ موصوف نے زور دے کر کہا کہ اردو کو سہ لسانی فارمولے میں شامل ہونا چاہیئے۔ انھوں نے کہا کہ مغل عہد میں صوفی سنتوں اور دانشوروں نے برج، اودھی اور سنسکرت کو بھی فروغ دیا۔ ہمارے تمدن کے قدیم معماروں نے یہ تصور دیا کہ اس ملک میں ایک زبان نہیں ساتھ ساتھ کئی زبانیں پنپ سکتی ہیں ہر زبان علم کی دیوی سرسوتی کی واہنی ہے۔ زبانوں کے فروغ سے ہی ملک ترقی کرتا ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اودھی کی وراثت کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے کہا اودھی بھاشا مغل عہد کی ثقافت کی عظیم دین ہے۔ ہم مسلمان بادشاہوں اور جنگوں کو ہی اس عہد کی ساری تاریخ سمجھ لیتے ہیں۔

ڈاکٹر نامور سنگھ نے بھی اس موقع پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ ملا داؤد سے بھی پہلے بارھویں صدی میں اودھی و برج میں لوگ شاعری کر رہے تھے تاہم اودھی کے مقابلے میں برج کا بول بالا تھا۔

پروفیسر ستیش چندرا نے اس سیمنار کے کنوینر اور کارکنوں کی بھی بہت تعریف کی اور کہا کہ اس سیمنار سے ادیبوں و شاعروں کے لیے ایک راہ کھلی ہے یہ سیمنار مارگ درشک ہے۔

سیمنار کا تعارف کراتے ہوئے عبدالرحیم خانخاناں سوسائٹی کے سکریٹری اور پروگرام کے کنوینر جناب شیخ سلیم احمد نے کہا کہ اس سیمنار کا مقصد تاریخ کی ان تعمیری قوتوں کو اجاگر کرنا ہے جنھوں نے ہندستانی تہذیب کے خاکے میں رنگ بھرے ہیں۔ اودھی اگرچہ ہندی کی شیلی و بولی ہے اور اس کا علاقہ بھی زیادہ وسیع نہیں ہے پھر بھی اس نے ہندستانی تہذیب و زبان و ادب کو مالا مال کیا۔ اودھی میں لکھنے والے سبھی مسلمان صوفی شعرا پیش پیش تھے۔

سیمنار کا دوسرا اجلاس اردو کے نامور محقق و ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت

میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس بھی بھرپور رہا۔ اس میں اہم اسکالرس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔
(جی۔ ڈی۔ چندن کی رپورٹ)

رتن سنگھ کے اعزاز میں اردو رائٹرز گلڈ

بھوپال کی ادبی تقریب

معروف افسانہ نگار رتن سنگھ کی بھوپال آمد پر ان کے اعزاز میں ایک ادبی تقریب آراستہ کی جس کی صدارت پروفیسر کوثر جہاں نے انجام دی۔ اس موقع پر ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے "رتن سنگھ اور ان کا فن" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا اور پروفیسر کوثر جہاں نے اپنا افسانہ "خوف" سنایا جبکہ ممتاز شاعر وحید پرواز نے اپنا منتخب کلام پیش کیا۔

رتن سنگھ نے اپنے فن اور شخصیت پر ڈاکٹر نعمان کے مقالے کو کافی پسند کیا اور اپنے تاثرات میں کہا کہ ڈاکٹر نعمان نے نہایت باریک بینی اور گہرے مطالعے کے ساتھ جو تجزیہ پیش کیا وہ لائق تحسین ہے آپ نے کہا کہ افسانہ نگاری پر حقیقی معنی میں ابھی کام ہی نہیں ہوا ہے اور اسی وجہ سے ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں کے مقام اور مرتبہ تعین نہیں ہو سکا انھوں نے آخر میں اپنا ایک افسانہ "کھلونا" بھی سنایا جسے سبھی لوگوں نے سراہا۔

افسانہ نگاری پر بحث میں عشرت قادری، پروفیسر حامد جعفری، اقبال مسعود، پروفیسر کوثر جہاں، رہبر جونپوری، بدر واسطی اور سید مصطفی تاج نے حصہ لیا۔ اقبال مسعود نے اس یادگار ادبی تقریب کی نظامت کے فرائض انجام دیے اور عشرت قادری نے اردو رائٹرز گلڈ کی جانب سے رتن سنگھ اور عام قلم کاروں کا شکریہ ادا کیا۔ (محمد خالد عابدی)

افسانوی مجموعہ "خراشیں" کی رسم رونمائی

"آج خواتین میں بیداری کی بے حد ضرورت ہے اور مکمل طور پر تعلیم حاصل کرنے کی بھی" یہ ہیں وہ الفاظ جو صدر جمہوریۂ ہند جناب ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے گذشتہ ۲۰ ستمبر کو راشٹرپتی بھون کی ایک سادہ سی ادبی تقریب میں فرمائے۔

اس موقع پر راجستھان ٹونک کی نوجوان خاتون افسانہ نگار شہناز فاطمہ نے اپنا اوّلین افسانوی مجموعہ "خراشیں" کی ایک جلد صدر جمہوریۂ ہند کی خدمت میں پیش کی۔ صدر محترم نے کتاب کی اشاعت پر مبارک باد دی، ان کے افسانوی مجموعے کو سراہا اور دعاؤں سے نوازا۔

حاجی انیس دہلوی نے صدر جمہوریہ سے شرکاء کا تعارف کرایا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر عنوان چشتی اور ترقی اردو بورڈ کے ڈپٹی ڈائرکٹر جناب ابوالفیض سحر نے "خراشیں" کی مصنفہ شہناز فاطمہ کی شخصیت و فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (رپورٹ۔ ناصر دہلوی)

جشن عید میلاد النبیؐ پر کتاب کا رسم اجرا

کوٹہ ۔ ۴ ستمبر ۹۴ کو انجمن اسلامیہ سیکنڈری اسکول گھنٹہ گھر، کوٹہ راجستھان میں بڑے پیمانے پر جشن عید میلاد النبیؐ منایا گیا۔ جشن کی صدارت حاجی خلیل احمد صاحب نے فرمائی۔ اور سرپرستی قاضی شہر کوٹہ عالی جناب انوار احمد صاحب نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض شعبۂ اردو کے استاد نعیم الدین رضوی نے انجام دیے۔ اسکول کے بچوں نے قرأت، حمد، نعت اور تقریر پیش کر کے سامعین کے قلوب کو موہ لیا تھا۔ اس موقع پر نعیم الدین رضوی کی کتاب

"انجمن اسلامیہ سیکنڈری اسکول کوٹہ ۹۴-۱۹۹۳ کے آئینے میں"، کی رسم اجرا ڈاکٹر فاروقی بخشی صاحب لیکچرار شعبۂ اردو گورنمنٹ آٹونومس کالج کوٹہ کے دستِ مبارک سے ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ یہ کتاب ہاڑوتی کے علاقے میں اپنے موضوع پر لکھی ہوئی پہلی کتاب ہے جس کے مطالعہ سے اسکول ہذا کی تعلیمی خدمات سامنے آجاتی ہیں۔ اس جشن میں بحیثیت مہمانِ خصوصی جناب کلویر سنگھ سیٹھی، رضا محمد صاحب، حاجی محمد ابراہیم قریشی، عبدالسلام ہاشمی، شوکت علی انصاری صاحب اور شوکت بھائی بیڑی والے بھی شامل ہوئے۔ شہر کوٹہ کے عوام و خواص نے اس جشن پر مبارکباد پیش کی۔ اس جشن کے اختتام پر پرنسپل عبدالجبار صاحب نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

اس موقع پر اسکول کے اسٹاف میں نعیم الدین رضوی، عبدالقیوم خاں، نصرت قریشی، فرخ ندیم، عبدالستار اور وسیم فاطمہ صاحبہ کو پرنسپل عبدالجبار صاحب نے بہتر خدمات کرنے کے صلے میں سندِ توصیفی پیش کی۔"

ذاکرہ غوث صاحبہ کو پی، ایچ، ڈی ڈگری

"محترمہ ذاکرہ غوث صاحبہ کو مدراس یونی ورسٹی کی طرف سے ان کے مقالے "خواتین خانوادۂ قاضی بدرالدولہ کی علمی و ادبی خدمات" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ انھوں نے یہ مقالہ شعبۂ اردو، مدراس یونی ورسٹی کے استاد ڈاکٹر سید سجاد حسین صاحب کی نگرانی میں سپردِ قلم کیا تھا۔ اس سے قبل ڈاکٹر ذاکرہ غوث صاحبہ نے شعبۂ اردو سے "باقر آگاہ حیات اور اردو خدمات" کے موضوع پر ایم لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

بسلسلہ جشنِ آزادی بھیل بھوپال میں کل ہند مشاعرہ

بتاریخ ۱۵ اگست ۱۹۹۴ء بوقت ۸ بجے شب بسلسلہ جشن یوم آزادی بھیل بھوپال کے کلچرل ہال میں ایک عظیم الشان کل ہند مشاعرہ زیر صدارت حضرت خمار بارہ بنکوی، بھارت ہیوی الیکٹریکلس نیشنل اینڈ انٹگریشن سمیتی کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا۔ مشاعرے کے مہمان خصوصی اور جنرل منیجر جناب ہری اننت گھانیکر نے شمع محفل روشن کی اور شعراء و شاعرات کا ہار اور گلدستے سے استقبال کیا۔ اس موقع پر انجمن ترقی اردو شاخ بھیل بھوپال کے سکریٹری جناب رہبر جونپوری نے مہمان خصوصی سے شعرا و شاعرات کا تعارف کرایا۔ مشاعرے کا آغاز جنرل منیجر اور بھیکنس کے چیرمین جناب کے رندیو کی تقریر سے ہوا جس کا مقصد ملک میں امن و امان اور بھائی چارے کی فضا کو خوشگوار بنانا تھا۔

مشاعرے کی نظامت پروفیسر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے فرمائی۔ بھیل ٹاؤن شپ اور شہر غزل بھوپال کے باذوق سامعین سے ہال پُر تھا۔ ابتدا میں محترمہ شانتی صبا نے قومی ترانے سے مشاعرے کا آغاز کیا۔ اس کے بعد محترمہ ارچنا انجم اور منظر بھوپالی نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ بی ایچ ای ایل کے معروف شاعر جناب رہبر جونپوری نے قومی اور معیاری "نظم کشور ہند" پیش کی جو کافی پسند کی گئی۔

اس مشاعرے میں بیشتر اہم شرکا کے اسمائے گرامی ہیں حضرت خمار بارہ بنکوی، پدم

کے علاوہ منظور احمد، جناب زبیر رضوی، ڈاکٹر بشیر بدر، ان کے علاوہ شریک مشاعرہ تھے جناب شاہد بھوپالی۔ جناب آنند موہن اعجاز، جناب جمیل خیرآبادی، جناب سنیل کمار تنگ جنہوں نے اپنی بہترین تخلیقات پیش کر کے سامعین سے داد حاصل کی۔ جناب اشوک گپتا، جناب مشتاق حسین صدیقی، جناب عبدالستار اور نصیر احمد وغیرہ نے اس مشاعرے کو کامیاب بنانے میں اپنا بھرپور تعاون دیا۔

عرب اور مصر میں اردو زبان و ادب سے دلچسپی

دہلی۔ امریکا اور یورپ کی یونی ورسٹیوں کی طرح عالم عرب اور ایران میں اردو زبان و ادب سے بھی دلچسپی پائی جاتی ہے، شکاگو، وسکانسن ہارورڈ اور دیگر متعدد امریکی یونی ورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے، انقرہ، استنبول طہران میں بھی اردو کی تدریس ہوتی ہے۔ عرب ممالک میں بھی کئی ملکوں میں اردو زبان کی تدریس اور تحقیق کا انتظام ہے۔ قاہرہ یونی ورسٹی اور جامعہ ازہر بھی ہندستانی ثقافت کے اس ورثہ سے دلچسپی لیتے رہے ہیں جہاں اردو زبان و ادب کی تدریس ہوتی ہے۔ قاہرہ کی مشہور عین شمس یونی ورسٹی میں اردو زبان و ادب کی تدریس کے لیے حکومت مصر نے بمبئی یونی ورسٹی کے صدر شعبہ اردو اور ماہر لسانیات و محقق پروفیسر عبدالستار دلوی کی خدمات حاصل کی ہیں اور وہ عنقریب قاہرہ روانہ ہونے والے ہیں۔ حکومت ہند کی طرف سے پروفیسر دلوی کی عین شمس یونی ورسٹی میں نامزدگی بمبئی یونی ورسٹی کے لیے اور خود پروفیسر دلوی کے لیے ایک اعزاز ہے۔ ہم پروفیسر عبدالستار دلوی کو اس اعزاز کے لیے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ پروفیسر دلوی زبان و ادب دونوں سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور اعلا انتظامی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف اور مرتب ہیں۔ اردو زبان یقیناً ہندستان اور مشرق وسطیٰ میں ایک رابطہ کی زبان کا کام کرتی ہے، اردو زبان کی اس لسانی اہمیت کے پیش نظر بھی پروفیسر دلوی کے تقرر کو اہمیت حاصل ہے۔

خالد محمود کا نیا پتا

ڈاکٹر خالد محمود جامعہ کے نئے مکان میں منتقل ہو گئے ہیں۔ ان کا نیا پتا ہے۔

۱۰۲۔ لال کوارٹرس، جامعہ انکلیو، جامعہ نگر
نئی دہلی ۲۵

جشن یوم آزادی پر مشاعرہ

جدیدہ عرعر۔ (سعودی عرب) میں "بزم احباب سخن عرعر" نے ۱۵ اگست یوم آزادی کے حسین اور پر مسرت موقع پر جدیدہ عرعر جو سعودی عرب اور عراق کے بوڈر پر واقع ہے، ایک عظیم الشان آل سعودیہ ہند و پاک مشاعرہ کا انعقاد کیا جس میں سعودی عرب میں مقیم اردو ادب کے مشہور و معروف شاعروں نے حصہ لیا اور شمالی منطقہ سعودیہ کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کی سب سے بڑی تقریب تھی اس کا پورا انتظام جناب ڈاکٹر حنیف ترین صاحب جو "بزم احباب سخن کے صدر بھی ہیں" نے اپنے رفقا کے ساتھ کیا تھا۔ شہر عرعر کی مشہور و معروف شخصیت جناب اشرف علی صاحب نے صدارت کے فرائض انجام دیے

جبکہ نظامت کے فرائض ہمیشہ کی طرح جناب ڈاکٹر حنیف ترین نے کچھ اس انداز سے سنبھالے کہ اول شام سے صبح صادق تک، سخت گرمی کے باوجود حاضرین ہمہ تن گوش داد تحسین دیتے رہے جبکہ چند مقامی شعرا وقت کی تنگی کی وجہ سے اپنا کلام نہ پیش کرسکے۔

جناب ظل الرحمٰن صاحب قاسمی (نائب صدر) جناب ڈاکٹر خالد رسول صاحب (جنرل سکریٹری) جناب غلام نبی شاکر صاحب (سکریٹری) جناب خالد پرویز صاحب اور شمشاد احمد (آرگنائزر) جناب عبدالرزاق صاحب (جوائنٹ سکریٹری) جناب خالد سیف اللہ شاہین (جوائنٹ جنرل سکریٹری) اور جناب رئیس احمد صاحب لکھنوی نے مشاعرے سے متعلق تمام امور میں بہت سرگرمی اور دلچسپی سے حصہ لیا۔

جن شعرا کے کلام نے محفل سے بڑھ چڑھ کر داد تحسین لی وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) جناب شبنم مناروی (ریاض) (۲) جناب نسیم سحر صاحب (جدہ) (۳) یونس اعجاز (الخوبر) (۴) جناب ذکاء اللہ صدیقی صاحب (دمام) (۵) سید قمر حیدر قمر (ریاض) (۶) جناب طارق بٹ (دمام) (۷) جناب وسیم احمد صاحب (سکاکا الجوف) (۸) جناب طاہر نسیم صاحب (طریف) (۹) جناب ڈاکٹر حنیف ترین (۱۰) جناب ڈاکٹر دی ۔ کے کانکر (عرعر) (۱۱) رئیس لکھنوی (۱۲) اقتدار علی (۱۳) ظل الرحمٰن قاسمی (۱۴) عبدالرزاق عبوی (۱۴) اعجاز احمد (۱۵) محمد احمد (۱۶) خالد سیف اللہ شاہین (۱۸) غلام نبی شاکر۔

بزم احباب سخن خاص طور سے جناب ستیہ پال آنند صاحب کی ممنون و مشکور ہے کہ انھوں نے اپنی امریکا روانگی سے پہلے اپنا قیمتی وقت نہیں دیا۔ اس کے علاوہ مہدی حسن جھور، بدرالزماں بابر، ریاض اللہ کمالی، امتیاز اعظمی اور صاحب رام نے بھی اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا اور خاطر خواہ داد تحسین حاصل کی۔

ممتاز صحافی عشرت علی صدیقی کو ایوارڈ

لکھنؤ۔ ۱۷ اگست ۱۹۹۴ء، اردو کے ممتاز صحافی (سابق اڈیٹر "قومی آواز" لکھنؤ) کو اترپردیش اردو اکیڈمی کی جانب سے صحافت کا پہلا "عبدالوحید صدیقی ایوارڈ" پیش کیا گیا۔ ایوارڈ دس ہزار روپے کا تھا۔ ادارہ کتاب نما عشرت علی صدیقی کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

انتقال

مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۹۴ کو مالیگاؤں شہر کے مشہور و معروف شاعر زین العابدین آتش کا انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

المعلن :- ادارہ مسلم نیشنل اتحاد مالیگاؤں
عبداللہ ہلال، زاہد قریشی، عرفان اکیلا وغیرہ۔

پروفیسر فضل الحق کا انتقال

نئی دہلی۔ دہلی یونی ورسٹی شعبہ اردو کے پروفیسر فضل الحق کا جمعہ اور سنیچر کی درمیانی رات میں ماڈل ٹاؤن میں ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا ابھی وہ اپنے عہدہ سے سبکدوش نہیں ہوئے تھے لیکن گذشتہ کافی دنوں سے شدید بیمار تھے جس کی وجہ سے انھوں نے اپنی سرگرمیاں کافی محدود کرلی تھیں وہ لاولد تھے اور ان کی اہلیہ کا انتقال پہلے ہی ہوچکا تھا۔ پروفیسر فضل الحق کو یونی ورسٹی کے اساتذہ، دہلی یونی ورسٹی

پریس ایسوسی ایشن کے نمائندوں، ریسرچ اسکالرز
اور احباب و رشتہ داروں کی موجودگی میں بعد نماز عصر
دہلی گیٹ قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ ادارہ
کتاب نما مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

سید انیس الرحمٰن مرحوم کی اہلیہ کا انتقال

مشہور و معروف صحافی، مجاہد آزادی اور بہار
لیجس لیٹو کونسل کے رکن سید انیس الرحمٰن
مرحوم کی اہلیہ کا ۲۳ اگست کو نئی دہلی میں انتقال
ہوگیا۔ انیس الرحمٰن مرحوم کا شمار قوم پرست
مسلمانوں کی پرانی نسل میں ہوتا تھا۔ مرحوم نے
حیدرآباد سے روزنامہ "شعیب"، الٰہ آباد سے
ہفت روزہ "زندگی" اور دہلی سے ہفت روزہ
"پرچم ہند" اور روزنامہ "ملک و ملت" جاری
کیے۔ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد سے ان کی
بیوہ مرحومہ اپنے دونوں بیٹوں شاہد انیس،
اور عابد انیس (اڈیٹر اخبار نوجوان) کے ساتھ
دہلی میں قیام پذیر تھیں۔ مرحومہ کے پسماندگان
میں ایک بیٹی بھی ہے مرحومہ نے نہایت صبر و
شکر کے ساتھ زندگی گزاری اور دینی امور کی
انجام دہی میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ادارہ
کتاب نما، انیس خاندان کے غم میں برابر کا شریک
ہے اور مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

کلکتہ دوردرشن سے اردو خبروں کا بلیٹن

اب دس منٹ کا

نئی دہلی۔ کلکتہ دور درشن پر اردو خبروں کا بلیٹن
اس سال ۱۵ اگست سے دس منٹ کا کردیا
جائے گا۔ باقی دیگر پانچ مراکز پر بھی مستقبل قریب
میں اردو خبروں کے بلیٹن کے وقت میں اضافہ
کردیا جائے گا۔

آل انڈیا اڈیٹرس کانفرنس کے ایک بیان
کے مطابق وزیر اطلاعات ونشریات کے، پی
سنگھ دیو نے یہاں کانفرنس کے ایک وفد سے
ملاقات کے دوران یہ یقین دہانی کرائی۔ وفد
نے کانفرنس کے صدر م۔ افضل کی قیادت
میں یہاں وزیر سے ملاقات کی تھی۔

الحاج عبدالعزیز عرفان کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری

شعبۂ تعلیم سے منسلک ضلع پریشد اردو جونیر
کالج آکوٹ (مہاراشٹر) کے معلم جناب الحاج
عبدالعزیز عرفان کو ان کے تحقیقی مقالے "اردو
کا حیاتی ادب" پر ناگپور یونیورسٹی نے پی ایچ
ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ یہ مقالہ ڈاکٹر منشاء الرحمٰن
خاں منشاء کی نگرانی میں پیش کیا گیا تھا۔

مجروح اکیڈمی بمبئی کا آغاز سفر

اودھ کلچرل اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر
اہتمام ۲۰ اگست ۸۴ء کی سہانی شام میں مجروح
اکیڈمی بمبئی کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا گیا۔
اس ادبی مجلس میں مجروح سلطان پوری، ڈاکٹر
ملک زادہ منظور احمد صدر فخرالدین علی احمد
میموریل ٹرسٹ، مہاراشٹر کے وزیر تعلیم سلیم زکریا
صاحب، صدر انجمن اسلام ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا
اور ڈاکٹر سید احمد۔ ایم ایل اے شریک ہوئے۔
مجروح اکیڈمی کے صدر ڈاکٹر آدم شیخ نے جلسے
کی ابتدا میں یہ بتایا کہ کن حالات اور تقاضوں کے
پیش نظر اکیڈمی کے قائم کرنے کا خیال ان کے
ذہن میں آیا۔ ایک تو یہ کہ دنیا کے اردو کے سب
سے بڑے شاعر ہونے کے باوجود مجروح کا

کلام دستیاب نہیں۔ دوسرے یہ کہ مجروح پر کوئی
ایسی کتاب موجود نہیں جس میں شاعر کی شخصیت
اور فکر و فن کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہو۔ اکیڈمی
کے ذمے داروں نے تاسیس سے قبل ہی مجروح
کے مجموعہ کلام "مشعلِ جاں" اور ڈاکٹر آدم شیخ کی
کتاب "مجروح سلطانپوری: شخص و شاعر" شائع
کر کے ضرورت مند طلبہ اور صاحب ذوق حضرات
کے تقاضوں کو پورا کیا۔

یوم تاسیس پر مہمان خصوصی وزیر تعلیم
سلیم زکریا صاحب اور ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد
اور اودھ کلچرل اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی کے
سرپرست ڈاکٹر سید احمد نے اکیڈمی کے قیام
پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ مجروح
سلطانپوری فکر و فن کا اعتراف کرنے کے لیے
اکاڈمی کی سخت ضرورت تھی۔ وزیر تعلیم سلیم
زکریا نے مجروح سلطانپوری کی شاندار ادبی
خدمات اور شاعرانہ عظمتوں کا اعتراف کیا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ پنجابی، جنرل سکریٹری اکیڈمی
نے اس سال کے پروگراموں کی جانکاری دیتے
ہوئے بتایا کہ سال میں اکیڈمی کے زیر اہتمام کم از کم
پانچ کتابیں شائع ہوں گی۔ اس کے علاوہ
ایک شاندار مشاعرہ اور سیمینار کا انعقاد بھی
اکیڈمی کے پروگرام میں شامل ہے۔ اکیڈمی
کے چیرمین پروفیسر شاکر گایا نے اپنی انتظامی
صلاحیتوں کی بنا پر خوبصورت جلسے میں زندگی
پیدا کی۔

اقبال ادبی مرکز بھوپال کا جلسہ

بھوپال۔ علامہ اقبال مرکز کے زیر اہتمام ایک
جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ترقی اردو بورڈ کے
وائس چیرمین جناب عزیز قریشی صاحب نے کہا کہ
دورِ حاضر میں اقبال کی معنویت اور محاسن کلام
پر نئے سرے سے کام ہونا چاہیئے۔ آپ نے
یہ خوشخبری بھی سنائی کہ انسانی وسائل کے
فروغ کے مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ کی منظوری
سے اسپین میں منعقد ہونے والے سیمینار کے
انداز پر ہندوستان میں بھی ایک عالمی سیمینار اقبال
پر ہوگا۔

اس جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے ممتاز
شاعر اختر سعید خاں نے اس بات پر زور دیا
کہ اقبال کے فکر و فلسفہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا
ہے ان کی تخلیقی انفرادیت اور جمالیاتی تحریروں
کو اہمیت دے کر ان پر کام ہونا چاہیئے۔
عاشق اقبال جناب صفوۃ حسن خاں نے اپنے
مقالہ میں اقبال کی معجز بیانی کو یقین محکم اور عمل
پیہم کی قوتوں کا مظہر قرار دیتے ہوئے کہا کہ
اقبال کے کلام میں درد کی لازوال کسک، آرزوئے
نایاب اور بلا کا خلوص ہے۔ آپ نے کلام
اقبال کے مختلف ادوار پر بھی روشنی ڈالی۔
اقبال ادبی مرکز کے سکریٹری پروفیسر آفاق
احمد نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اقبال کے
ترانہ ہندی کو دس سال بعد ایک صدی ہو جائے گی
ہمیں اس کی تقریب منا کر اقبال کو یاد کرنا چاہیئے
اردو اکادمی کے آراستہ ہال میں بڑی تعداد میں
ادیب، شاعر، دانشور اور ممتاز سیاسی و سماجی
شخصیات نے شرکت کی۔

ڈاکٹر خورشید عالم کو ہندی تراجم پر مرکزی ایوارڈ

نئی دہلی ۱۷ جولائی۔ سنٹرل ہندی
ڈائرکٹوریٹ حکومت ہند کے اعلانیہ کے مطابق

مختلف علاقائی زبانوں سے ہندی میں تراجم کرنے اور ہندی ادب کو دوسری زبانوں کے ادب سے مالا مال کرنے کے لیے ایسے پندرہ سرکردہ غیر ہندی ادیبوں کو ایوارڈ دیے گئے ہیں جن کی مادری زبان اگرچہ ہندی نہیں ہے لیکن جنھوں نے اپنی مادری زبانوں سے ہندی میں تراجم کرکے وقیع ادبی اضافے کیے ہیں۔ اردو ادب سے ہندی زبان میں بہترین تراجم کرنے کے لیے حکومت ہند کا یہ اہم ایوارڈ ڈاکٹر خورشید عالم (دہلی یونی ورسٹی) کو دیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ۱۵ ہزار روپے نقد توصیفی سند اور شال پر مشتمل ہے۔

سیما فاروقی کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

گورکھپور یونی ورسٹی نے سیما فاروقی کو ان کے تحقیقی مقالے "پریم چند کے ناولوں میں خواتین کے مسائل" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے جسے انھوں نے ڈاکٹر اختر بستوی صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونی ورسٹی کی نگرانی میں لکھا ہے۔

ملکاپور میں سوغاتِ منظر کی رونمائی

منظر کی شاعری ان کی اپنی شاعری ہے

(ڈاکٹر محبوب راہی)

ملکاپور ۱۹ر مئی ۹۴ء۔ بزمِ احبابِ ادب ملکاپور کے زیرِ اہتمام سوغاتِ منظر کی رونمائی کی تقریب منعقد کی گئی۔ اس پُر وقار تقریب کی صدارت صدر بلدیہ ملکاپور جناب طیب دلیش مکھ نے انجام دی اور کتاب کی رسم رونمائی ڈاکٹر محبوب راہی کے مبارک ہاتھوں سے انجام پائی۔

پروگرام کی نظامت اصغر حسین قریشی۔ (مدیر تکمیل بھیونڈی) نے انجام دی۔

(سکریٹری غضنفر حسین قریشی۔ بزمِ احبابِ ادب ملکاپور)

اقبال اکیڈمی محبوب نگر اور عابد علی خاں میموریل اکیڈمی

محبوب نگر ۲۰ر جولائی۔ اقبال اکیڈمی محبوب نگر اور عابد علی خاں میموریل اکیڈمی کے زیرِ اہتمام ۹ر جولائی ۱۹۹۴ء ۸ بجے ممتاز صحافی عابد علی خاں صاحب مرحوم کی یاد میں منعقدہ ادبی اجلاس اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ جناب ابوالفیض سحر صاحب پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ترقی اردو بیورو نئی دہلی نے فرمایا جو شخصیتیں ایک مقصد اور نصب العین کے تحت زندگی گزارتی ہیں وہ یادگار بن جاتی ہیں۔ عابد علی خاں مرحوم ایڈیٹر "سیاست" ایسی ہی ایک ناقابلِ فراموش شخصیت کا نام ہے اس اجلاس کو ڈاکٹر علی احمد جلیلی، ڈاکٹر کریم رضا، جناب ابوبکر افسر، جناب اسلم فرشوری، مولانا حافظ سید شاہ غفور الحق صاحب نے مخاطب فرمایا اور مرحوم عابد علی خاں صاحب کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ادبی اجلاس کے بعد ڈاکٹر علی احمد جلیلی کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ حیدرآباد کے ممتاز شعرا علی احمد جلیلی صلاح الدین نیر، رئیس اختر، عزیز بھارتی، صادق نوید، مومن خاں شوق نے اپنا تازہ کلام پیش کیا۔ محبوب نگر کے ممتاز شاعر سلیم عابدی کے شکریہ کے بعد یہ مشاعرہ اختتام کو پہنچا۔

بچوں کے لیے مکتبہ پیام تعلیم کی نئی اور اہم کتابیں

مذہب

کتاب	مصنف	قیمت
نقوش سیرتؐ (اول)	حکیم محمد سعید	۵/:
نقوش سیرتؐ حصہ دوم	"	۵/:
نقوش سیرتؐ حصہ سوم	"	۵/:
نقوش سیرتؐ حصہ چہارم	"	۵/:
نقوش سیرتؐ حصہ پنجم	"	۵/:
رسالہ دینیات اول	ادارہ	۳/:
" " دوم	"	۴/:
" " سوم	"	۵/:
" " چہارم	"	۵/:
" " پنجم	"	۵/:
حضرت آدم علیہ السلام	منورہ نوری خلیق	۶/:
حضرت یحییٰ علیہ السلام	"	۳/:
بزرگانِ دین	محمود علی خاں جامعی	۴/:
امت کی مائیں	حسین حسنی	۴/۵۰
اچھی باتیں	سعد الدین انصاری	۴/۵۰
خوب سیرتؐ حصہ اول	حکیم محمد سعید	۶/:
خوب سیرتؐ حصہ دوم	"	۶/:
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں	فضل قدیر ندوی	۴/۵۰
سلطان جیؒ	اسلم فرخی	۴/۵۰
سیرت پاک مختصر مختصر	احمد خاں خلیل	۳/:

کتاب	مصنف	قیمت
کمسن صحابی	رفیع الزماں زبیری	۶/:
رحمان کا جہان	"	۶/:
اسلام کے جاں نثار	"	۵/:
نور کے پھول	حکیم محمد سعید	۹/:
سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	"	۴/۵۰
حضرت ابوبکر صدیق رضؓ	مشیر الحق	۶/:
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	"	۳/:
حضرت طلحہؓ	"	۳/:
حضرت ابوذر غفاریؓ	"	۳/:
حضرت سلمان فارسیؓ	"	۳/۵۰
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	"	۳/:
حضرت محبوب الٰہیؒ	"	۳/:
حضرت معین الدین چشتیؒ	"	۳/:
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	"	۳/:
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	"	۳/:
نیک بیٹیاں	"	۳/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	(ادارہ)	۳/:
حضرت حمزہؓ	احتشام علی رحیم آبادی	۳/:
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	"	۳/:
حضرت ابوہریرہؓ	"	۴/:
اللہ کے صفی	خلیل احمد جامعی	۲/۵۰
اللہ کا گھر	"	۴/۵۰
اللہ کے خلیلؑ	"	۳/۵۰
رسول پاک کے اخلاقؐ	"	۴/:
قرآن پاک کیا ہے؟	عبدالواحد سندھی	۵/:
اسلام کے مشہور سپہ سالار اول	"	۶/:
" حصہ دوم	"	۶/:

غیر ملکی زبانوں کی دلچسپ کہانیاں

پتھر کا خرگوش	آصف فرخی	۱۰/:
سُرخ موت	//	۴/۵۰
دنیا کی عجیب و غریب کہانیاں	//	۷/۵۰
انمول کہانیاں	ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی	۴/۵۰
پتھر کی گویا	ثروت صولت	۷/۵۰
ریل کے بچے	احمد خاں خلیل	۴/:
افریقہ کی کہانیاں	فضل حق قریشی	۷/۵۰
۸۰ دن میں دنیا کا چکّر	علی اسد	۳/:
ہزاروں خواہشیں	مسعود احمد برکاتی	۹/:
مونٹی کرسٹو کا نواب	//	۹/:
گلیور کے تین حیرت انگیز سفر	احمد خاں خلیل	۶/:

کہانیاں، ناول، ڈرامے
ننھے منے بچوں کے لیے

بتاشے (نرسری کے گیت باتصویر)		۶/۵۰
جاں نثار دوست (باتصویر کہانیاں)		۶/:
شیر اور بکری	//	۷/۵۰
چاند کی بیٹی	//	۶/:
بھیڑیے کا گانا	//	۷/۵۰
جادو کی ہنڈیا	باتصویر کہانیاں	۶/
چالاک بلی	//	۷/۵۰
دم کٹی لومڑی	//	۷/۵۰
کوّے کا خواب	//	۷/۵۰
گدھے نے بجائی بانسری	کشور ناہید	۷/۵۰

بڑے بچوں کی دلچسپ کہانیاں

گیارہ ہنس اور ایک شہزادی	سید حامد حسین	۴/:
دادی اماں کی کہانیاں	آصف فرخی	۶/:
سفر کے قصّے	//	۵/:
پہاڑی مہم	ثریا فرخ	۳/۵۰
تین بندوقچی	مسعود احمد برکاتی	۱۰/:
ہم بنے کمانڈو	منیر احمد راشد	۵/:
ایک تھا مرغا ککڑوکوں	قمر علی عباسی	۶/:
پریوں کی کہانیاں	اشرف صبوحی	۶/:
سمندر کا بادشاہ ہار گیا	ڈاکٹر شریف الحسن	۴/۵۰
چوں چوں بیگم	شفیقہ فرحت	۴/:
ماسٹر شامت	اشرف صبوحی	۶/:
تھوڑی تارا ما تھے چاند	//	۴/:
پکڑے گئے	(ادارہ)	۷/۵۰
درویش کا تحفہ	افشاں بیگم	۶/:
مورا سے فرار	رفیع الزماں زبیری	۷/۵۰
بکرے کی تعریف میں	یوسف ناظم	۶/:
جھیل کا راز	ثریا فرخ	۶/:
قصر صحرا اوّل	مرزا عظیم بیگ چغتائی	۷/:

کتاب	مصنف	قیمت
قصر صحرا دوم	مرزا عظیم بیگ چغتائی	۱۲/:
قصر صحرا سوم	" "	۸/:
عموں کی تباہی	ظفر محمود	۷/۵۰
پیار کا پنچھی	فرخندہ لودھی	۶/:
ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش	(ادارہ)	۷/۵۰
پادری کی روح	(ادارہ)	۲/:
ٹھگ نے ٹھگا ٹھگ کو	ابصار عبد العلی	۲/۵۰
گدھا کہانی	میرزا ادیب	۹/:
خفیہ سرنگ	ثریا فرخ	۶/:
بڑھیا کی بھینس	(ادارہ)	۲/۵۰
تیس مار خاں	شاہد علی خاں	۲/۵۰
چالاک خرگوش کی واپسی	معراج	۱۵/:
غریب لکڑہارے کی کہانی	(ادارہ)	۶/:
نردوبی کا آدم خور	"	۶/:
ہمت کے کرشمے	"	۶/:
خلائی مسافر	"	۶/:
ابو خاں کی بکری	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱۵/:
ایک فوٹو خور کی آپ بیتی (کہانیاں)	ادارہ	۶/:
نرالے گویے	اشرف صبوحی	۲/۵۰
باتونی کچھوا	"	۲/۵۰
جادو کا چھلا	"	۳/:
جادو کی سارنگی	"	۳/:
بدر شہزادی	"	۶/:
سمندری طوفان اور تین لڑکے (مختلف کہانیاں)		۶/:
ننھا سیاح	محمد زکریا سائل	۴/:
زیور (مختلف کہانیاں)		۹/:
شہنشاہ نے کہا... (مختلف کہانیاں)		۶/:
سام پر کیا گزری	سید اظفر مہدی	۲/۵۰
جنگو کی بلی	عبد الاحد سندھی	۳/:
چالاک خرگوش کے کارنامے	معراج	۹/:
چور پکڑو	مسعود احمد برکاتی	۲/۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
بہادر علی	قمر عباسی	۴/۵۰
خالی ہاتھ	ابصار عبد العلی	۹/:
کھلونا نگر	(ادارہ)	۸/۵۰
حاجی بابا کی ڈائری	ظ۔ انصاری	۷/۵۰
قصہ اژدھا پکڑنے کا	ادارہ	۶/:
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	"	۶/:
ابو علی کا جوتا	"	۶/:
ننھا سراغ رساں	"	۸/:
پُراسرار غار	"	۶/:
ظالم ڈاکو	ریاض احمد خاں	۶/:
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	انور خاں	۷/۵۰
دلی کی شادی	اشرف صبوحی	۴/:
رحمت شہزادہ	"	۴/۵۰
اندھے کا بیٹا	شعیب اعظمی	۳/۵۰
پانچ جاسوس	امۃ الرحمن محسنی	۱۰/:
جنگل کی ایک رات	ریحان احمد عباسی	۴/۵۰
اچھی کہانیاں	مرتبہ ہمدرد فاؤنڈیشن	۳/:
ہرن کا دل	اشرف صبوحی	۲/:
دریا کی رانی	"	۳/:
گوہر شہزادی	"	۴/:
شریر شیرا	"	۳/۵۰
پری رانی	عالمہ خاتون	۳/:
خطرناک سفر	ریاض احمد خاں	۳/۵۰
ننھا جھبرو	ریحان احمد عباسی	۳/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں	یوسف ناظم	۴/۵۰
بابا ناصح	رشید الوحیدی	۳/:
سلامہ و صلصلہ	"	۴/۵۰
پہاڑ کی چوٹی پر	میرزا ادیب	۶/:
شرارت	محمد حسین حسان	۶/:
ننھا فرشتہ	فہمیدہ عتیق	۶/:
ایک کھلا راز	مسعود احمد برکاتی	۳/۵۰

تعلیم بالغان کے سلسلے کی کتابیں

کفن دفن		۱/-
حیات حضرت عائشہ		۱/-
چیچک	مشتاق احمد	۱/-
آستین کا سانپ	محسن حسان	۱/-
چاند	〃	۱/-
دیمک	〃	۱/-
کتنی زمین	〃	۱/-

قواعد، محاورے، کہاوتیں اور لغات

عبارت کیسے لکھیں		۱/-
انشا اور تلفظ		۶/-
پیامی قواعد اردو	طلبہ ایڈیشن	۲/-
〃 〃	کلاں	۹/-
پیامی اردو انگریزی ڈکشنری		۹/-
پیامی بیسک انگلش اردو ڈکشنری		۷/-
پہلے محاورے	[illegible]	۱۳/۵۰
کہاوت اور کہانی	〃	۲/-
مختصر اردو لغت		۱۲/-
فرہنگ عامرہ		۲۰/-
فیروز اللغات	درمیانی	۱۴/-

ہندی کی دوسری کتابیں

موسموں کا کھیل	۱/-
پریم چند	۱/-
نیا گھر	۱/-
امریکہ	۱/-
دہلی	۱/-
[illegible]	۱/-
[illegible]	۱/-

پیارا پھول		۱/-

ہماری درسی کتابیں

اردو

اردو قاعدہ		۶/-
رنگین قاعدہ	حصہ اول	۱/۲۵
〃	حصہ دوم	۱/۲۵
اردو کی پہلی کتاب		۲/۲۵
اردو کی دوسری کتاب		۴/-
اردو کی تیسری کتاب		۴/۵۰
اردو کی چوتھی کتاب		۹/-
اردو کی پانچویں کتاب		۱۰/-
اردو کی چھٹی کتاب		۷/-
اردو کی ساتویں کتاب		۱۲/-
اردو کی آٹھویں کتاب		۱۴/-
بچوں کی پہیلی		۳/-
اردو کی دوسری بال [illegible]		۱/-
〃 تیسری	〃	۳/-
〃 چوتھی	〃	۳/-
اردو خوش خطی	حصہ اول	۳/-
〃 〃	حصہ دوم	۳/۵۰
〃 〃	حصہ سوم	۳/۵۰
اردو خوش خطی	چہارم	۳/۵۰

حساب

حساب	درجہ دوم	۱۲/-
حساب	درجہ سوم	۱۲/-
حساب	درجہ چہارم	۱۲/-
حساب	درجہ پنجم	۱۴/-

طالبات کے لیے

ہمارا ملک بھارت	۶/-
بھارت اور [illegible]	۶/-

ہماری دلی سوم کلاس کے لیے 14/
ماحول کے ذریعہ تعلیم سوم 14/
" " چہارم 14/
" " پنجم
کالج کے طلبہ کے لیے درسی کتب
شعور ادب (ادارہ) 21/
نیا اردو نصاب اوّل تیمر زیدی/احمد ذاکر 10/
آئینہ ادب ڈاکٹر محی رضا/ڈاکٹر آدم شیخ 21/
افکار ادب پروفیسر فصیح الدین/ڈاکٹر عابد حسین حسینی 50/.
کم سن صحابی
قیمت 9/
رفیع الزّماں زُبیری
اس کتاب میں جن عظیم کم سن صحابیوں کا ذکر ہے۔
ان کے مبارک نام یہ ہیں۔
حضرت علی کرم اللہ وجہٗ
حضرت جعفر طیار رض
حضرت عبداللہ بن مسعود رض
حضرت اُسامہ بن زید رض
حضرت زُبیر ابن العوام رض
حضرت عبداللہ بن عباس رض
حضرت انس بن مالک رض
حضرت عبداللہ بن عمر رض
حضرت معاذ بن جبل رض
حضرت سعد بن ابی وقاص رض
حضرت طلحہ رض
حضرت مصعب بن عمیر رض
حضرت عبادہ رض بن صامت
حضرت حسن رض، حضرت حسین رض
عظیم کامیڈین
عجوبۂ روزگار
چارلی چیپلن
اور
کینتھ اینڈرسن
ایک عظیم شکاری
ریحان احمد عباسی
عظیم کامیڈین اور بہادر شکاری
کے حالات زندگی پر مختصر مگر جامع کتاب۔
قیمت 9/ روپے
قاعدہ
یَسَّرْنَا الْقُرْآن
یہ قاعدہ مکتبہ جامعہ نے تعلیمی اصولوں کے پیش نظر نئی ترتیب کے ساتھ نئے سرے سے مرتب کیا ہے۔ غیر ضروری چیزیں کم کی گئی ہیں سبقوں اور مشقوں میں مفید اضافے کیے گئے ہیں۔
ہر سبق کے شروع میں پڑھانے والوں کے لیے آسان اور مختصر ہدایتیں دی گئی ہیں جن کی مدد سے معمولی اردو جاننے والے والدین بھی اپنے بچوں کو آسانی کے ساتھ بہت کم مدت میں قرآن مجید پڑھا سکتے ہیں۔
ان خوبیوں کی وجہ سے اس قاعدے کی افادیت بازار میں بکنے والے عام قاعدوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔
سفید گلیز کاغذ .... آفسٹ کی چھپائی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی
امّت کی مائیں
حسین حسنی
حضور کی ازواج مطہرات کی زندگی صبر و رضا، ایثار اور ثابت قدمی کا نمونہ ہے اس سے مسلمان بچیاں اپنے فرائض کو بخوبی سمجھ سکتی ہیں اور بہت کچھ سیکھ سکتی ہیں۔

نئی مطبوعات

انشائے غالب (قلمی نسخہ غیر مطبوعہ) مرتبہ: رشید حسن خاں ۴۴/-
اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ ابراہیم یوسف ۴۵/-
شمس الرحمن فاروقی۔ شخصیت اور ادبی خدمات
(کتاب نما کا خصوصی شمارہ) مرتبہ: احمد محفوظ ۱۲۵/-
اردو افسانہ بمبئی میں ۷۰ء کے بعد (کتاب نما کا خصوصی شمارہ)
مرتبہ: الیاس شوقی ۵۱/-
فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ (تاریخ) ڈاکٹر مسعود مومن ۴۵/-
حضرت عمر فاروقؓ (سوانح بچوں کے لیے) افضال الرحمن ۶/-
پتھر کا خرگوش (بچوں کے لیے) آصف فرخی ۱۰/-
جادوئی چقماق کی ڈبیہ (بچوں کے لیے) ڈاکٹر سید حامد حسین ۱۵/-
حیات و تعرفات صاحب گلشن چشت اختر جہاں قریشی ۲۵/-
بھوپال ادب کے آئینے میں (مضامین) ڈاکٹر محمد نعمان ۵۸/-
دفتر جنوں (تبصروں کا مجموعہ) ڈاکٹر ہارون ایوب ۵۰/-
اوراق جاوداں (خطوط مشاہیر) مرتبین: راہی فدائی /
نظام الحق عابد ۵۰/-
فکر و نظر (شعری مجموعہ) پیارے لال رتن ۴۶/-
بہار کی پسماندہ مسلم آبادیاں (رپورٹ) جابر حسین ۲۰/-
عوامی روایات اور اردو ڈراما ڈاکٹر محمد شاہد حسین ۱۲۵/-
شعلۂ احساس (شعری مجموعہ) ساغر انصاری ۴۰/-
مولانا باقر آگاہ ویلوری (انتخاب کلام) علیم صبا نویدی ۵۰/-
دلاور فگار فن و شخصیت مرتب: خان نعیم بدایونی ۴۰/-
سہانے سلونے لمحے، بدایوں (رام لعل نمبر) مرتب: نہال رضوی ۱۰۰/-
تذکرہ شعرائے طنز و مزاح (تذکرہ) مرتب خان نعیم بدایونی ۴۰/-
خان بہادر حافظ ولایت اللہ حافظ (حیات و خدمات)
محمد اظہر حیات ۴۰/-
دشت فریاد (شعری مجموعہ) شاذ تمکنت ۳۶/-
سیپیاں " فصیح اللہ نقیب ۵۰/-

سرورق ابراہیم یوسف

لفظوں سے آگے (تنقیدی مضامین) مغنی تبسم ۹۶/-
تحقیق نما ڈاکٹر صابر سنبھلی ۳۶/-
مخدوم محی الدین ترجمہ: محمد اسامہ فاروقی ۱۰۰/-
آخری درویش (ناول) عشرت ظفر ۵۰/-
سائنس اردو ماہنامہ (بچوں کے لیے) مدیر: اسلم پرویز فی شمارہ ۸/-
ماہنامہ لوح تسخیر حیدرآباد۔ مدیر: ایس ظفر انصاری فی شمارہ ۱۰/-
بزم فکر و فن (رسالہ سہ ماہی) مدیر عقیل راجستھانی فی شمارہ ۱۰/-

مطبوعات خدا بخش لائبریری پٹنہ

ہندومت حصہ اول (۱) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب ۵۰/-
ہندومت حصہ دوم (۲) " " " ۶۰/-
ہندومت حصہ سوم (۳) " " " ۸۰/-
بدھ / جین / سکھ اور رادھا سوامی (۴) " " ۴۰/-
ہندو مسلم مسئلہ (۵) " " ۴۰/-
اسلامیان ہند (۶) " " ۴۰/-
تاریخ ہند (۷) " " ۶۰/-
پریم چند افسانے (۸) " " ۵۰/-
پریم چند: مزید افسانے (۹) " " ۴۰/-
پریم چند: ادبیات (۱۰) " " ۴۰/-
چند اہم اخبارات و رسائل قاضی عبدالودود ۳۰/-
جین دھرم کے مقدس مقامات بابو نیمی داس ۴۰/-
تہذیب، زبان، ادبیات (خطبات جلد دوم) ۷۵/-
ہندو مذہب۔ پنڈت منوہر لال زتشی ۱۰/-
شری کرشن، گوتم بدھ اور دوسرے رہنما نارائن پرشاد ۵۰/-
پیر علی (ناول) شاد عظیم آبادی ۲۵/-
کچھ ہندومت کے بارے میں (ادارہ) ۴۰/-
کبیر صاحب پنڈت منوہر لال زتشی ۲۵/-
اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں (ادارہ) ۱۰۰/-

ملنے کا پتا

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

اب نما
ان مُدیر
براہیم یوسف
م روڈ۔ امامی گیٹ
ھوپال (ایم پی)

اشاریہ

اُردو ڈرامے کی شناخت کا مسئلہ

اب وہ زمانہ تو رہا نہیں جب ڈرامے کو ایک معتوب صنف قرار دے کر اس کے فن شریف ہونے سے انکار کیا جاتا تھا اور نہ اس مفروضہ کی کوئی اہمیت رہی کہ اردو میں ڈراما ہے ہی نہیں اور کچھ ہے تو وہ معیاری نہیں۔ اب ڈراما فن شریف بھی ہے اور اردو میں ڈراما بھی ہے معیاری بھی اور غیر معیاری بھی۔ اچھا بھی اور بُرا بھی جس طرح دوسری اصنافِ ادب میں اچھا اور بُرا، اور معیاری اور غیر معیاری ادب موجود ہے۔ اب حالات کچھ ایسے ہیں کہ ڈرامے کے سامنے اپنی شناخت کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے بالخصوص اس علاقے میں جو ہندی بیلٹ کہلاتا ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ اردو اور ہندی زبانوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے پھر اردو اور ہندی ڈرامے میں فرق کس طرح کیا جائے گا۔ کیا اردو ڈراما وہ ہوگا جو اردو رسم خط میں لکھا گیا ہے یا اردو ڈرامے کی شناخت اس کی لفظیات سے ہوگی خواہ وہ ناگری لیپی میں لکھا گیا ہو یا کسی اور لیپی میں۔ کسی زبان کی شناخت کے لیے رسم خط اور الفاظ بہت اہم ہوتے ہیں لیکن ڈرامے کا معاملہ ذرا جُدا ہوتا ہے کہ اس کی کوئی مخصوص زبان نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ ہوتی ہے جو ڈرامے میں کردار اپنے مخصوص لہجے، اپنے علاقائی اور سماجی پس منظر میں بولتا ہے اور ایک ڈرامے میں مختلف لہجوں، مختلف علاقوں اور مختلف سماجی پس منظر کے کردار جمع ہو سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ کرداروں کو ان کا پارٹ اسی رسم خط میں مہیا کیا جاتا ہے جسے وہ جانتے ہیں اس لیے شناخت کا مسئلہ اور اہم ہو جاتا ہے۔ اگر ہم آغا حشر کے دَور کو دیکھیں تو اردو اور ہندی ڈرامے کا فرق ایک صورت میں ہمیں نظر آتا ہے۔ آغا حشر نے اردو میں بھی ڈرامے لکھے اور ہندی میں بھی۔ وہ تمام ڈرامے جو ہندوؤں کے اساطیری قصوں اور ہندوؤں کے نیم تاریخی واقعات سے اخذ کر کے لکھے گئے ہندی ڈرامے کہلائے اور باقی اردو ڈرامے۔ یہی تقسیم نرائن پرشاد بیتاب کے ڈراموں کی بھی کی گئی۔ اگر آغا حشر کے ہندی ڈرامے کسی ہندی کے پنڈت کو پیش کیے جائیں تو وہ شاید ہی انھیں ہندی کے ڈرامے تسلیم کرے کیونکہ اس میں ہندی کے الفاظ تو ضرور استعمال کیے گئے ہیں مگر عبارت کا اسلوب اردو کا ہے مگر وہ اس لحاظ سے انھیں ہندی ڈرامے تسلیم کر لے گا کہ ان کا ماحول

اور ثقافت ہندی ہے۔ آغا حشر کے زمانہ سے لے کر آزادی ملنے تک اردو اور ہندی ڈراموں کا یہ فرق برقرار رہا۔

آزادی ملنے کے بعد پرانی روایات اور مشترکہ تہذیب کو ختم کرنے کا جہاد ایک خاص نقطۂ نظر کی تبلیغ کے لیے شروع ہوا تو بچاری معصوم اردو دار پر چڑھا دی گئی۔ اردو کی دوسری اصناف اس سے کس قدر متاثر ہوئیں اس سے قطع نظر اردو ڈرامے کا وجود ہی معدوم تسلیم کر لیا گیا۔ کسی فلم کو اردو کا سرٹیفکیٹ نہیں دیا گیا۔ ٹی وی سیریل میں بھی شاید ہی کسی کو اردو سیریل کہا گیا ہو۔ اسٹیج ڈراموں کا دوسری جگہوں کا تو مجھے علم نہیں مگر بھوپال کے معروف بھارت بھون جو اعلا ثقافتی مرکز ہے کبھی کوئی ڈراما اردو کے نام سے نہیں کھیلا گیا۔ ایک ڈراما شاید اندھا یگ تھا جس کی زبان ناقابل فہم حد تک سنسکرت آمیز ہندی تھی۔ ہندی ڈراما تھا ایک دوسرا ڈراما دو کشتیوں کا سوار تھا جس کی زبان خالص اردو تھی، کردار مسلمان تھے، اسٹیج پر جو تختیاں آویزاں کی گئی تھیں جیسے سرائے سکندری، پان شاپ وغیرہ وہ اردو رسم خط میں تھیں لیکن پبلسٹی میں اسے بھی ہندی ڈراما کہا گیا تھا۔ اس نے یہ سوالیہ نشان چھوڑا کہ اردو ڈراما پھر کون سا ہے اور اس کی شناخت کیا ہے۔ گویا اردو ڈراما کھٹائی میں ہے۔

دہلی اردو اکیڈمی نے این۔ ایس۔ ڈی کے تعاون سے دسمبر ۹۳ء میں اردو تھیٹر پر سیمنار کیا جس میں تھیٹر سے وابستہ بڑے ناموں نے شرکت کی۔ پوری رپورٹ پڑھنے کے بعد مقررین کا عام رجحان یہ نظر آیا کہ اردو تھیٹر نہ تھا اور نہ ہے۔ ریوتی سرن شرما نے جو ایک صاف ذہن کے انسان ہیں اس بات کو تسلیم کیا کہ ماضی میں پارسی تھیٹر نام کا تھیٹر موجود تھا جو تھیٹر کی تمام ضروریات کو پوری کرتا تھا لیکن سیمنار کے عام رجحان کو دیکھ کر وہ مصلحت پسندی کا شکار ہو گئے اور اسے اردو تھیٹر نہ کہہ کر اردو ہندی کا تھیٹر کہا جبکہ بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ خالص اردو تھیٹر تھا جس میں کبھی کبھی ہندی کے دھارمک Plays بھی کھیل لیے جاتے تھے۔ اس طرح شرما صاحب نے اردو تھیٹر کی ایک طویل روایت میں بھی ڈنڈی مار دی۔ بقول محمد حسن یہ گالی کہ اردو میں نہ ڈراما ہے نہ تھیٹر، ہم چالیس سال سے سنتے آ رہے ہیں۔ اس سیمنار میں چلیے ایک مرتبہ اور سہی لیکن اردو والوں کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اس کے علاوہ اور بھی دلچسپ باتیں کہی گئیں مثلاً یہ کہا گیا کہ جو مسلمان لڑکے اور لڑکیاں تھیٹر کرنے آتے ہیں وہ اردو نہیں جانتے، حالانکہ سچائی یہ ہے کہ وہ رسم خط نہیں جانتے، اردو جانتے ہیں اردو رسم خط نہ جاننا کوئی بڑا جرم نہیں ہے۔ پارسیوں کے اردو تھیٹر کے اداکار بھی اردو رسم خط نہیں جانتے تھے، انھیں اسکرپٹ گجراتی رسم خط میں مہیا کیے جاتے تھے اور وہ بھی اردو ڈرامے کھیلتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اردو والوں کو اپنا تھیٹر جامع مسجد کے آس پاس کرنا چاہیے یعنی صرف اردو والوں کے لیے بالفاظ دیگر غیر اردو والوں کو آپ کے اردو تھیٹر سے کوئی دلچسپی

نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال اس سیمنار سے سوائے اس کے کہ اردو ڈراما اور تھیئٹر ایک مرتبہ پھر شکوک کے دائرہ میں آگیا۔ کوئی مثبت اور تعمیری نتیجہ نہیں نکلا۔ مجھے معاف کریں اگر میں یہ کہوں کہ رپورٹ پڑھنے کے بعد جو تاثر میرے ذہن پر مرتب ہوا وہ سیاست کے بازیگروں کے ان بیانات سے مختلف نہیں تھا جو کبھی اردو کو زبان ماننے سے انکار کرتے ہیں تو کبھی اسے ہندی کی ایک شیلی قرار دیتے ہیں اور کبھی اسے ایک فرقہ یعنی مسلمانوں کی زبان کا سرٹیفکیٹ عطا فرماتے ہیں اور یہی تینوں رویّے اس سیمنار کی گفتگو میں واضح طور پر موجود رہے۔

جبکہ صاف ذہن اور غیر متعصب فنکاروں کے ذہن میں اردو کے بارے میں اُلجھاد ہے تو اردو ڈرامے کے لیے یہ ایک لمحہ فکر ہے کہ وہ اپنی شناخت کس طرح قائم کرے۔ چلیے ہم سیاست کے بازیگروں کے اس فرمان کو قبول کر لیتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اگر اردو مسلمانوں کی زبان ہے تو مسلمانوں کی اپنی تہذیب ہے اپنا کلچر ہے اپنا ورثہ ہے اپنے مسائل ہیں اور یہ مسائل بے حد گمبھیر ہیں۔ مسلمانوں کی کچھ تمنائیں اور خواہشیں ہیں ان کے کچھ دُکھ درد ہیں اور خوشیاں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جس ڈرامے میں مسلمانوں کے مسائل ان کے دُکھ درد، ان کی تمناؤں اور خواہشوں کو مسلمانوں کے کلچر اور تہذیب کے پس منظر میں پیش کیا جائے گا وہ اردو ڈراما ہوگا اور ان لڑکے اور لڑکیوں کا بھی ڈراما ہوگا جو اردو نہیں جانتے کیونکہ بہرحال وہ اس تہذیب اور کلچر کے حصہ دار ہیں اور ان مسائل سے دوچار ہیں۔ یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کے مسائل کلچر اور تہذیب سے غیر مسلموں کو کیا دلچسپی ہوگی اور وہ اس ڈرامے کو دیکھنے کیوں آئیں گے اور مسلمان اپنی کھیلو میں گڑ پھوڑتے رہیں گے۔ لیکن بات ایسی ہے نہیں۔ مسلمانوں کی تہذیب کلچر اور سماجی زندگی کے کچھ ایسے گوشے ہیں جو ابھی تک غیر مسلموں کے سامنے آئے ہی نہیں ہیں جب وہ ڈرامے کے ذریعہ پیش کیے جاتے ہیں وہ ان میں دلچسپی لیتے ہیں۔ کچھ سال پہلے مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے اردو ڈرامے پیش کرنے کا پروگرام بنایا اور ایک سال تین ڈرامے پیش کیے ایک جرم و سزا جس کا ماحول روسی تھا دوسرا اُنتھی بھر دھول جو کسی یونانی کہانی سے ماخوذ تھا اور تیسرا راقم الحروف کا وقت کے کراہتے رنگ۔ میں نے کوشش کی تھی کہ اس میں مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی زندگی اور ان کے مسائل کو خالص مسلم کلچر کے پس منظر میں پیش کروں۔ ڈرامے کی ابتدا میں شادی کے چند ماہ بعد ہی لڑکا ایک حادثہ میں ہلاک ہو جاتا ہے اور بیس بائیس سال کی عمر میں لڑکی بیوہ ہو جاتی ہے اس کے ساس، سسر یہ کہہ کر کہ ہم اسے بہو بنا کر اپنے گھر لائے تھے اب بیٹی بنا کر اسے گھر سے رخصت کریں گے اپنے طور پر اس کی دوسری شادی کرا دیتے ہیں۔ اس کے بعد دیگر واقعات پیش آتے ہیں۔ بغیر تعلّی کے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ڈراما غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ مسلمانوں کو اس میں اپنی زندگی نظر آئی تو غیر مسلم ایک

ایسے کلچر سے واقف ہوئے جس سے وہ ابھی تک ناآشنا تھے کیونکہ اب تک فلموں میں مسلم کلچر کے نام پر ان زمینداروں کا کلچر دیکھتے رہے تھے جو مغل شہنشاہوں کی ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہیں یا پھر غنڈوں، قاتلوں اور اسمگلروں کو۔ اس طرح فلموں میں مسلمان یا تو ٹھاٹ باٹ سے رہنے والے زمیندار ہوتے ہیں یا پھر غنڈے بدمعاش بالکل اسی طرح جیسے کبھی ہندستان میں یا تو راجے مہاراجے رہتے تھے یا سپیرے۔ اور اب تو ہندستان میں زمیندار ختم ہو چکے ہیں اس لیے فلموں میں غنڈے، اسمگلر اور قاتل مسلمان ہی رہ گئے ہیں۔ ہندو بھائیوں کی فرمائش پر اس کے کئی شو اور بھی ہوئے۔ میرے اکثر ہندو احباب نے لڑکی کی دوسری شادی پر تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ کیا یہ مسئلہ اس قدر آسانی سے حل ہو جاتا ہے جس کا جواب یہی دیا گیا کہ یہ ایک انسانیت کا مسئلہ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ اس سے بہت متاثر ہوئے کیونکہ وہ اس مسئلہ کے اس قدر آسان حل کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اپنے ہی ڈرامے کے بارے میں اس قدر لکھنا بے جا تعلّی نہیں۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے کلچر، تہذیب اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا جائے تو غیر مسلم بھی ان میں دلچسپی لیں گے اور تماشائیوں کی کمی نہ ہوگی۔ اردو ڈرامے کی شناخت مسلمانوں کے مسائل اور کلچر کو پیش کرنے سے ہوگی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ڈراما ایک مخصوص کلچر کی نمائندگی میں محدود ہو کر رہ جائے گا مگر اس کا کیا علاج ہے کہ جب مشترکہ تہذیب کو پیش کیا جاتا ہے خواہ اس کی زبان خالص اردو ہو اس پر ہندی کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ وہ فلمیں ہوں، ٹی وی سیریل یا پھر اسٹیج ڈراما۔

دوسرا سوال فارم کا ہے کہ اردو ڈرامے کا فارم کیا ہو جس سے اس کی شناخت ہو سکے۔ ہندستان ایک بہت بڑا ملک ہے جس کے ہر علاقہ کے ڈرامے کا اپنا اپنا فارم ہے کہیں ناچا ہے تو کہیں جاترا اور تھرڈ تھیٹر، کہیں راس لیلا، رام لیلا اور نوٹنکی اور کہیں تماشا وغیرہ۔ اور ان پر وہاں کی مقامی بولیاں اور زبانیں اپنا دعوا کرتی ہیں۔ ایبسرڈ ڈراما ایپک تھیٹر کے تجربات کیے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو ڈرامے کا اپنا کوئی فارم اور پیش کش کا کوئی انداز ہے اس کا جواب ہے کہ ہے۔ اور وہ فارم وہ روایتی فارم ہے جو اسے اِندر سبھاؤں اور پارسیوں کے اردو تھیٹر سے وراثت میں ملا ہے اور مقبول ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اردو ڈرامے میں تجربات نہ کیے گئے ہوں۔ زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، ڈاکٹر محمد حسن، شمیم حنفی، ظہیر انور اور کمال احمد وغیرہ نے تجربات کیے ہیں مگر اردو ڈرامے میں روایتی فارم کی جڑیں کچھ اس قدر گہری ہیں کہ یہ تجربات اجنبی لگتے ہیں اور اردو ڈرامے کا ناظر و قاری انھیں آسانی سے ہضم نہیں کر پاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہی تجربات دوسری زبانوں میں بھی ہو رہے ہیں ان سب کی بھیڑ میں اردو ڈرامے کو اپنی شناخت برقرار رکھنا مشکل ہے۔ میں تجربات کی مخالفت نہیں

کر رہا ہوں، میرا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ اردو ڈرامے کے روایتی فارم کو برقرار رکھتے ہوئے پیش کش میں ایسے تجربات کیے جائیں جو عام ناظر کی دلچسپی کا سبب بن سکیں تاکہ اردو ڈرامے کی شناخت باقی رہے۔ کسی غیر مانوس فارم میں اردو رسم خط اور اردو کے الفاظ استعمال کر لینے سے اردو ڈرامے کی شناخت قائم نہیں ہو سکتی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اردو افسانہ اور ناول کے بارے میں یہ سوال نہیں اٹھایا گیا کہ اردو افسانے اور ناول کی شناخت کیا ہے صرف اردو ڈرامے کو ہی اپنی شناخت قائم کرنے کی جدوجہد کرنا پڑ رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو افسانے اور ناول صرف وہی لوگ پڑھتے ہیں جو اردو رسم خط سے واقف ہوتے ہیں لیکن ڈراما ایک عملی فن ہے یہ اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے اور اس کے دیکھنے والے کسی مخصوص زبان کو جاننے والے نہیں ہوتے بلکہ سب ہوتے ہیں اردو ڈرامے کے اسٹیج پر کامیاب ہو جانے پر اسے ہتھیانے کے لیے چھاپے مارے جانے لگتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح ایک زمانے میں یہ تحریک چلی تھی نہ قطب مینار قطب الدین نے بنوایا ہے اور نہ تاج محل شاہجہاں نے۔

جب یہ صورت حال ہے تو اردو ڈرامے کو اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے اردو جس فرقہ کی زبان قرار دی جاتی ہے اس فرقہ کی وراثت، کلچر اور تہذیب کے پس منظر میں اسی فرقہ کے دکھ درد، مسائل، خواہشات اور تمناؤں وغیرہ کو اپنے روایتی فارم میں پیش کرنا ہوگا تاکہ اچھا بُرا جو کچھ ہو اردو کا ہی کہلائے اور اس میں چھاپے نہ مارے جا سکیں اور اردو ڈراما اپنی شناخت قائم کر سکے۔

تم سلامت رہو ہزار برس

مجروح سلطانپوری

تحریر: علی سردار جعفری
ترجمہ (انگریزی سے) از یوسف ناظم

رزم اور بزم کا ساتھی

پابلو نرودا جب ہندستان آئے اور مجھ سے ملے تو یوں مخاطب ہوئے، "شعر و سخن اور جدوجہد کے میدان میں میرے چھوٹے بھائی"۔ میں مجروح کو ان ہی الفاظ میں مخاطب کر کے اپنی محبت بھری عقیدت کا اظہار کرتا ہوں۔

مجروح اس انقلابی برادری کے ہم سفر اور ہم صفیر ہیں جس نے اس خطۂ ارض کے ہر گوشے میں انسانی عظمت کے لیے جدوجہد کی اور اس کے ترانے گائے۔ اس قبیلے کے ہر فرد نے اپنی عمر عزیز کے کتنے سال جیل کی سلاخوں کی نذر کردیے اور دار و رسن کے سائے میں محبت کے گیت لکھے۔ ترکی میں ناظم حکمت، چلی میں پابلو نرودا، اسپین میں لورکا، انگلستان میں کالڈویل اور رالف فاکس جنھوں نے ہسپانوی خانہ جنگی میں اپنی جانیں گنوائیں۔ فرانس میں لوئی اراگان اور پال ایلوا، فلسطین میں محمود درویش اور دوسرے عرب شاعر اور افریقہ کے سیاہ فام شاعر۔ اس کہکشاں کے چند درخشاں ستارے ہیں۔ یہ سب کے سب عہد جدید کے انسان کا ضمیر ہیں جو جغرافیائی حدود کی بنا پر کسی مخصوص علاقے کے باشندے ہیں لیکن ہیں سب کے سب ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے موتی۔

اردو میں مجروح کے ہمعصروں میں فیض، مجاز، مخدوم، جذبی، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی ساحر لدھیانوی، حمایت علی شاعر، نیاز حیدر، حبیب جالب اور احمد فراز کے نام ان شاعروں میں سے چند نام ہیں جنھیں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہ لوگ نہ صرف جدید ترقی پسند شاعری کے علمبردار ہیں بلکہ آپس میں ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے رفیق بھی ہیں اور رقیب بھی جو شعر و سخن کی لڑائی لڑتے ہیں وہ لڑائی نہیں لڑتے جس میں جابروں اور ستم گروں کی منفعت کے لیے معصوموں کا خون بہایا جاتا ہے۔

مجروح اس وقت غزل کے سب سے زیادہ شائستہ، تربیت یافتہ اور مقبول شاعر ہیں۔ اردو غزل نے صنف شعر کی حیثیت سے اہل ذوق کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور ساتھ ہی دوسری ہندستانی زبانوں پر اثر انداز ہوئی ہے۔ مجروح نے کوئی ۵۰ غزلیں کہی ہیں اور ان کے علاوہ ۲ نظمیں لتا منگیشکر اور قلم کی تعریف میں۔ اور دونوں نظمیں ان کی غزلوں ہی کی طرح خوب صورت اور اثر انگیز

ہیں۔ وہ لتا کی فن کارانہ شخصیت کا اظہار ان چار مصرعوں میں کرتے ہیں۔

جس گھڑی ڈوب کے آہنگ میں تو گاتی ہے آیتیں پڑھتی ہیں سازوں کی صدا تیرے لیے
دم بہ دم خیر مناتے ہیں تری۔ چنگ و رباب سینۂ نے سے نکلتی ہے دعا تیرے لیے

اس کے علاوہ مجروحؔ نے ہندستانی فلموں کے لیے کوئی دو ہزار گانے بھی لکھے ہیں اور دادا صاحب پھالکے ایوارڈ پانے کا افتخار انھیں حاصل ہوا ہے۔ فلموں سے متعلق ہمارے (۱۱) معاشرے کے منفی اور غیر صحت مندانہ رویے نے مجروحؔ کو اس شک میں مبتلا کر دیا کہ انھوں نے کسب معاش کے لیے اپنی فنکارانہ صلاحیتیں فلم میں ضائع کر دیں۔ اس دوغلی صورت حال کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو فلم کو ایک نچلی سطح کا فن اور نمائش کا کاروبار سمجھتے ہیں اور طرفہ یہ کہ خود یہی فلمی ستاروں کے پیچھے دوڑتے اور فلمی گانوں کو اپنی ذہنی آسایش کا سامان مانتے ہیں۔

ہمارے ذرائع ابلاغ اور صحافت کا رویّہ بھی خاصا دلچسپ ہے۔ ادب کے اعلا ترین ایوارڈ یعنی گیان پیٹھ کو اتنی شہرت نہیں ملتی جتنی کسی فلمی ایوارڈ کے نصیب میں ہوتی ہے۔ موجودہ عہد کے اس اعلاترین فن کی تخلیق کرنے والے کسی طرح بھی کمتر درجے کی صلاحیتوں کے لوگ نہیں ہوتے۔ خود مجروحؔ کے معاملے میں ان کی فلمی نغمہ نگاری ان کی شاعرانہ مہارت اور خلاقی کا حصہ ہے۔ یہ گیت نگاری مجروحؔ کی فن کارانہ شخصیت کا دوسرا رُوپ ہے اور اس کا ان کی غزلیہ شاعری سے موازنہ نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ اپنی غیر معمولی شعری صلاحیتوں کو رُو بہ عمل لائے بغیر مجروحؔ ایسے خوب صورت نغمے فلم کو نہیں دے سکتے تھے اور وہ بھی پچاس سال کی لمبی مدّت تک خالص تاجرانہ ذہنیت کی صنعت میں نصف صدی تک اس "فراز" پر جس پر مجروحؔ رہے ہیں قدم جمائے رکھنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ مجروحؔ کے فلمی گیتوں میں سے ایسے کئی مصرعے چُنے جا سکتے ہیں جو مجروحؔ کی دلکش شاعری کا نمونہ کہلا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر "دُکھ سب کا ساتھی ہے" یا "

دل کی تمنا تھی مستی میں منزل سے بھی دور نکلتے اپنا بھی کوئی ساتھی ہوتا ہم بھی بہکتے چلتے چلتے

مجروحؔ کی فلمی گیت نگاری اور ان سنجیدہ غزل گوئی میں ایک عجیب طرح کا ربط ہے۔ مجروحؔ نے ایک مرتبہ اس مطلع کے ساتھ غزل کہی۔ "ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح : اُٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح۔" تو اس غزل میں غالباً وہ فلمی نغمہ نگار کی قسمت کا شکوہ کر رہے تھے۔ لیکن دراصل اس شعر کی معنویت میں شاعر کا گہرا دکھ دکھائی دیتا ہے۔ کلکتہ کے میرے ایک دوست نے مجھے خط میں لکھا کہ مجروحؔ نے ان دو مصرعوں میں اتنا کچھ کہہ دیا ہے جو مارکسیت کے اسکالر بیسیوں سطروں میں بیان کرتے ہیں۔ اس کے کئی سال بعد میں نے ارنسٹ فشر (Ernest Fischer) کی کتاب "مارکس خود اپنے آئینے میں" پڑھی جس میں اس نے ایک جگہ لکھا ہے

"ناقابل تقسیم انسانی حقوق کے بارے میں جو اعلانیہ جاری ہوا ہے وہ ایک ایسی

دنیا کی نشان دہی کرتا ہے جس میں ہر چیز کی ملکیت ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کی جا سکتی ہے۔ کم از کم انسانی حقوق کو اس رکیک ذہنیت سے محفوظ رہنے دیا جائے۔ ہر چیز ایک جنس بن کر رہ گئی ہے۔ گوشت کے بازار سے ملحق دکانوں میں فن کی تجارت ہوتی ہے۔ موٹر کار کے بازار سے لگے ہوئے کتابوں کے بازار میں، لیبر مارکٹ کے قریب جسم کے کاروبار کی دکانیں ہیں۔ اطلاعات اور مخبری کی کاروباری دکانوں کے ساتھ رائے عامہ کی تجارت اور ان سب پر مستزاد خود انسان کی حیثیت ایک جنس کی ہو گئی ہے۔"

ایک دوسری جگہ مجروح نے لکھا ہے کہ فن اور محنت کا کاروباری رشتہ زیادہ دن قائم نہیں رہے گا۔ ان کا شعر ہے ؎

دستِ منعم مری محنت کا خریدار سہی کوئی دن اور میں رسوا سرِ بازار سہی

نئی غزل کو مجروح کا یہ تحفہ ان کی دوسری غزلوں میں سبک و نرم گفتاری کے ساتھ ہی تیور لیے ہوئے ہے لیکن روایت سے مربوط اور منسلک۔ اس کے نقوش بلکہ جڑیں میر تقی میر (اٹھارویں صدی) کے یہاں ملتی ہے جیسا کہ انھوں نے کہا ہے ؎

نہ بیٹھا اب امیروں کی صحبت میں میرؔ ہوئے ہیں فقیر اُن کی دولت سے ہم

میر کے یہاں قرونِ وسطیٰ کے احتجاج کا لہجہ ہے۔ مجروح کا شعور دورِ جدید کے طبقاتی شعور سے ہم آہنگ ہے۔

مجروح ۱۹۴۵ء میں اپنے استاد جگرؔ مرادآبادی کے ہمراہ ایک مشاعرے میں حصہ لینے بمبئی آئے اور آتے ہی پورے شہر پر چھا گئے۔ خوش شکل اور نوجوان شاعر نے سامعین کو اپنا لیا۔ اس کے سحر انگیز ترنم اور پُر کشش شاعری نے لوگوں کو مسحور کر لیا۔ اردو شاعری کی بزرگ شخصیت مولانا حسرت موہانی نے مجروح کی دل کھول کر ستائش کی اور مشہور فلم پروڈیوسر اے۔ آر۔ کاردار نے مجروح کو اپنی آنے والی فلم "شاہجہاں" کے گانے لکھنے کے لیے میوزک ڈائرکٹر نوشاد کے ساتھ منتخب کر لیا۔

فلمی دنیا میں مجروح کی آمد بڑے شاندار طریقے سے ہوئی اور وہ ایک کامیاب نغمہ نگار کی حیثیت سے سربلند ہوئے۔ مجروح کی اس زمانے کی شاعری کسی حد تک مجاز کی مترنم اور رسیلی شاعری سے ہم آہنگ تھی۔ مجروح کی شاعری ان تمام محاوروں علامتوں اور محاسن شعری سے آراستہ تھی جو کلاسیکی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں اسی زمانے میں وہ ہمارے ساتھ حیدرآباد اور اورنگ آباد کے مشاعروں میں شرکت کے لیے گئے اور حیدرآباد دکن میں بھی ان کی کامیابی اتنی ہی شاندار تھی جتنی کہ بمبئی میں تھی اور مخدوم محی الدین نے مجروح کو ان الفاظ میں داد دی تھی کہ جب کوئی شاعر اچھا شعر کہتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ شعر میرا ہے اور مجروح اس طرح ترقی پسند شاعروں کے گروہ کے ایک اہم رکن بن گئے اورنگ آباد میں اپنے قیام کے دوران ہم نے ایلورا اور اجنتا کے غار دیکھے اور اجنتا کے ایک غار میں بیٹھ کر سکندر علی وجدؔ نے اپنی نظم "اجنتا" ہمیں سنائی۔ وہی نظم جس نے

وجدؔ کو بے مثال امتیاز اور شہرت سے ہمکنار کر دیا۔ اس لاجواب نظم کے چند بند دیکھیے۔

(۱) جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں — جہاں گھٹتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں — جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں
جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے — دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے
(۲) تجلی اور عرفاں شاہ کارِ ابن آدم ہے — سرِ فطرت عمل کی بارگاہ حسن میں خم ہے
تمدن منعکس ہو جس میں ایسا ساغرِ جم ہے — جمالِ زندگی رہینِ جلالِ عزم محکم ہے
امید جانِ تازہ پھر دلِ بسمل میں آئی ہے — تلاشِ امن میں تہذیب اس منزل میں آئی ہے
(۳) جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقشِ لاثانی — تعدق جن کے ہر خط پر تحیر خامۂ مانی
مُشکل ہے شباب و حسن میں تخیلِ انسانی — تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی
حسینانِ اجنتا کا جنوں سرتاج ہے گویا — یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

اس نظم نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ یہ اجنتا کے حسن و جمال کی گہرائی کو اس انداز سے پیش کرتی ہے جو کسی گائڈ کی زبان سے ممکن نہیں ہے۔ ان غاروں کے لب بستہ مجسموں کی آواز ہم نے سن لی (اس نظم کا انگریزی ترجمہ پروفیسر رشید الدین خاں نے کیا ہے) بمبئی واپس آنے کے بعد مجروحؔ نے مجھ سے کہا کہ کوئی بڑا فن کسی سماجی شعور کے بغیر تخلیق نہیں کیا جا سکتا اجنتا کی گپھائیں فن کارانہ صناعی کا شاہکار ہیں اور لاثانی۔ کیوں کہ ان میں اپنے وقت کی روح سمائی ہوئی ہے۔ مجروحؔ کے اس مشاہدے نے ان کی غزلیہ شاعری کو جو روایتی شعر و حسن سے مالا مال تھی ایک انقلابی موڑ سے روشناس کیا۔

آنند کمار سوامی نے اپنی کتاب میں فن، خوبصورتی اور افادیت کی یکجائی اور ایکے کے موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ حالیؔ، شبلیؔ اقبالؔ اور جوشؔ بھی اسی نظریے کے حامی تھے۔ مجروحؔ نے اپنی غزل میں اس روش کی ترویج کی اور ان کی غزل نئے ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے آراستہ ہو گئی۔

بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات نے اور خاص طور پر آزادی کی جد و جہد نے نئے خیالات کی پرورش و پرداخت کی اور اقبالؔ اور جوشؔ کے علاوہ دوسرے کلاسیکی مزاج کے شاعروں کو بھی متاثر کیا اور نئی علامتوں کا بے دریغ استعمال رواج پا گیا۔ ترقی پسند شاعر مزید تبدیلیاں لائے جن میں مجروحؔ کی دین بھی شامل ہے۔ مثال کے طور پر محبت کا تصور۔ عاشق اور معشوق کی دوئی ہماری کلاسیکی غزل میں نمایاں ہے۔ یہ دوئی حسن و عشق کے اتحاد میں تبدیل ہو گئی۔ مجروحؔ نے اپنے ایک نو شگفتہ اور خوب صورت شعر میں کہا:

"مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے — ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے"

معشوق صرف محبت اور پرستش کا مرکز نہیں بلکہ زندگی کی کشمکش میں اس کی حیثیت ایک دوست اور ساتھی کی ہو گئی۔ یہی مجازؔ کی تمنا تھی جس نے ۱۹۳۲ء میں اس کا اظہار یوں کیا تھا۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

یا یہ کہ: آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

دوسری علامت دار و رسن کی ہے۔ کلاسیکی شاعری میں یہ صوفیانہ صداقت کی علامت تھی اور منصور حلاج سے منسوب تھی۔ آج کے عہد میں یہ انقلابی صداقت کی علامت ہے مجروح اور فیض نے اس علامت کا استعمال بہت ہی پُر اثر اور کشش انگیز طور پر کیا ہے۔ یہ علامت ان کی شاعری میں اس وقت رُونما ہوئی جب مجروح بمبئی کی بائیکلہ جیل میں تھے (۱۹۵۰ء) اور فیض راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں پاکستانی جیل میں تھے۔ چوں کہ راولپنڈی سازش کیس کے اسیروں کی رہائی کے لیے عالمی سطح پر کوششیں کی جا رہی تھیں اس لیے مجروح کے مقابلے میں فیض کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی اور دار، دار و رسن اور ان سے نسبت رکھنے والی دوسری علامتیں جیسے کہ مقتل، شمشیر، تیغ تلوار صرف فیض کی شاعری کے ساتھ وابستہ کر دی گئیں۔ اس لحاظ سے مجروح کے ساتھ ادبی ناانصافی ہوئی۔ کسی فرد کی طرف سے نہیں بلکہ تاریخی صورتِ حال کی بنا پہ۔ تاہم مجروح کی منفرد شعر گوئی کو تسلیم کیا گیا۔ دار و رسن کی ترکیب کا استعمال ان کے یہاں پہلی مرتبہ شاید اس شعر میں ہوا۔

شبِ ظلم نرغۂ رہزناں سے پکارتا ہے کوئی مجھے میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

ابھی کچھ سال پہلے مجروح نے ایک نیا شعری پیکر غزل کو دیا۔

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

یہ ولولہ انگیز شعر جب جیل کی سلاخوں کے باہر آیا تو جی خوش ہو گیا۔ مجروح نے کلاسیکی پیکر تراشی کو ایک نیا مزاج دیا ہے جس کے توسط سے وہ اپنے دور کے سیاسی اور سماجی مسائل کو شعری قالب میں ڈھالتے ہیں۔ ان کا ہنر یہ ہے کہ طرزِ کہن کی نفاست کو اور نزاکت کو مجروح کیے بغیر وہ نئے اسلوب میں استقامت اور دلیری کے ساتھ اپنی غزلیں کہتے ہیں۔

مجروح کی توانا اور حوصلہ مند شاعری دل میں اتر جانے والی شاعری ہے لیکن ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ میر تقی میر کو اردو کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں جنھیں ہمیشہ "خدائے سخن" کہا گیا ہے لیکن جہاں تک ان کے اپنے تخلیقی عمل کا تعلق ہے وہ غالب کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کا صرف ایک مجموعہ ہے جو تقریباً ۱۰ صفحوں پر مشتمل ہے اور اس کے کئی اڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ہر بار چند اضافوں کے ساتھ۔ لیکن مجروح نے اردو ادب کی تاریخ میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل اور یادگار بن گئے ہیں۔ ان اشعار میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا یہ شعر ہے

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

نوٹ:۔ یہ مضمون سنڈے ٹیلی گراف کلکتہ کی تازہ اشاعت میں چھپا۔ میں نے جعفری صاحب سے ترجمے کی اجازت مانگی۔ اس لیے کہ مضمون نگار اور ممدوح دونوں اردو کے باغ سے ہیں۔ انھوں نے میرے استدلال کو [illegible]

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

پتھر کی دیوار سردار جعفری

"پتھر کی دیوار" سردار جعفری کی جیل کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ اس فصل بہار کا ثمر ہے جو اقبال اور جوش کے بعد اردو شاعری کا مزاج بدل رہی تھی۔ (پاکٹ اڈیشن) قیمت /۱۵ روپے

وسط ایشیا۔ نئی آزادی، نئے چیلنج

آصف جیلانی

سابق سوویت یونین کی نوآزاد مسلم جمہوریاؤں کے سفر کے تجربات و مشاہدات پر مبنی۔ بی۔ بی۔ سی لندن کی اردو نشریات سے نشر ہونے والے سلسلہ وار پروگراموں پر مشتمل ایک دستاویز۔
قیمت /۵۱ روپے

معیار اردو مرتبہ: نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

یہ کتاب زبان اردو کے محاورات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے طلبہ اور ریسرچ اسکالر محاورات کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ قیمت /۲۱ روپے

مغیث الدین فریدی: شخصیت اور ادبی خدمات

مرتبہ: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

یہ کتاب نما کا خصوصی شمارہ ہے اس میں فریدی صاحب کی شخصیت، شاعری، تاریخ گوئی اور تضمین نگاری پر اردو کے نامور ادیبوں نے اپنے بہترین خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قیمت /۴۵ روپے

تذکیر و تانیث نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

جانشین امیر مینائی حافظ جلیل نے اس قیمتی کتاب کے ذریعے زبان اردو میں تذکیر و تانیث کا یک قانونی مدون کیا ہے۔ اس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث بتائی گئی ہے اہل اردو کے لیے ایک قیمتی تحفہ۔ قیمت /75

اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ

ابراہیم یوسف

اس مجموعے میں اردو ڈرامے کی تنقید کے محرکات اور رجحانات جو ابتدا سے تاحال کارفرما رہے ہیں۔ جمع کر دیے گئے ہیں۔
قیمت /۴۴ روپے

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج (خطبات)

ڈاکٹر سید ظہور قاسم

ڈاکٹر سید ظہور قاسم کی تحقیق کا میدان بحریات ہے آپ بحر منجمد کی علمی مہم کے پہلے سربراہ رہ چکے ہیں ان خطبات میں اس پُر اسرار ارضی حصے کی دلچسپ داستان بھی ہے اور سائنس کے مختلف شعبوں میں بتدریج ترقیوں کا تجزیہ بھی۔ قیمت /۱۰ روپے

سیرت طیبہؐ میں سماجی انصاف کی تعلیم اختر الواسع

پروفیسر اختر الواسع نے ۱۰ جون ۱۹۹۱ء کو انجمن اسلام بمبئی کی دعوت پر معین الدین حارث یادگاری سیرت لکچر کے سلسلے میں مندرجہ بالا عنوان کے تحت جو خطبہ پیش کیا تھا۔ اسے اب کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ قیمت /۱۰ روپے

تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات

ڈاکٹر سید جمال الدین

زیر نظر کتاب میں اردو کے قاری کو ۹ بلند پایہ مورخین اور ان کے فن تاریخ نگاری سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ان میں یونان، عرب، جرمنی، برطانیہ اور ہندوستان کے مورخین شامل ہیں۔ قیمت /۱۵ روپے

احمد صغیر صدیقی
بی۔ ۸۔ کریسنٹ بنگلہ
ماڈل کالونی۔ کراچی

ربط اپنا نہ زمیں سے ہے نہ افلاک سے ہے
کشتِ جاں سبز، مرے دیدۂ نمناک سے ہے

ندرتِ فکر، حریفوں کو میسّر ہے تو کیا
معجزہ میرے سخن کا دلِ صد چاک سے ہے

ہے مرا جسم، مرے اپنے لہو سے گلنار
میری توقیر ہے جتنی اِسی پوشاک سے ہے

قحط یوں ہی تو نہیں تازہ ہوا کا گھر میں
کہ مجھے اُنس بلا کا خس و خاشاک سے ہے

منفرد بھی ہوں، رہینِ غمِ آفاق بھی ہوں
میری غربت کا تعلق مری اِملاک سے ہے

عتیق اللہ
۲۲۱۔ غالب اپارٹمنٹس
پیتم پورہ۔ دہلی ۳۴

پہاڑوں جیسی راتیں دن کڑے ہیں
ٹھہر جاؤں تو کتنے فاصلے ہیں
تجھے جو بارہا رَد کر چکے تھے
ترے بارے میں اکثر سوچتے ہیں
کبوتر! اس کو یہ پیغام دینا
وہ سارے لوگ واپس جا چکے ہیں
مرے باطن میں کیسی روشنی ہے
کئی دروازے کھلتے جا رہے ہیں
مکان و لامکاں خالی پڑے تھے
ہم اپنی آخری حد تک گئے ہیں
پہاڑوں پر جنھیں دیکھا گیا تھا
وہ لشکر بستیوں میں آ گئے ہیں
بہت مشکل تھا زندہ بچ نکلنا
مگر کچھ لوگ مرنا جانتے ہیں
یہ فاقہ کش ہیں، لیکن اِن کے بازو
پہاڑوں کو گرانا جانتے ہیں

محسن احسان
شعبہ انگریزی اسلامیہ کالج
پشاور یونیورسٹی۔ پاکستان

یہ عروج رُت ہے زوال کی یہ زوال دن ہیں کمال کے
سبھی پر کسی نے کتر دیے مرے طائرانِ خیال کے

کوئی آفتاب بدست ہے مگر آنسوؤں کی جلو میں ہے
کوئی تیرگی میں اُتر گیا کئی سورجوں کو اچھال کے

مرے ہمنشیں مرے سامنے مری بزدلی نے اُجاڑ دیں
وہ جو بستیاں تھیں جمال کی، وہ جو راستے تھے وصال کے

مری ہر شکن میں چھپی ہوئی ہیں کہانیاں کئی کرب کی
مری جھرّیوں میں سجے ہوئے ہیں سب آئینے مہ و سال کے

مرے ذوقِ حسن و جمال نے تری خوشبوؤں کو چلن دیا
ترے خد و خال ہیں کھل اٹھے کئی پھول شوقِ وصال کے

کوئی مرثیہ غمِ ہجر کا کوئی نوحہ دردِ فراق کا
سرِ برگِ گل ہیں لکھے ہوئے کئی پیش لفظ ملال کے

نعیمہ ضیاء الدین
جرمنی

یہ آرزو کے دیے ہیں دل و نظر کے لیے
جلائے وقت نے ہر ایک دیدہ ور کے لیے

ہر ایک دور میں منصور بھی ہوں عیسیٰ بھی
سجے ہیں دار و رسن بھی ہر ایسے سَر کے لیے

چراغِ درد کو خوں بھی ہمیں نے نذر کیا
ہے تیرگی بھی مقدر ہمارے گھر کے لیے

متاعِ آگہی، پندار کے صنم خانے
زیاں کا دشت ہے مقسوم ایسے زر کے لیے

ادائے صبر و رضا تم بھی سیکھ لو جاناں
کہ آندھیاں ہیں چٹانوں سے ہر شجر کے لیے

عاصی کاشمیری

708- WOODBOROUGH ROAD,
NOTTINGHAM.
ENGLAND

ترکِ وطن بھی کر کے روایات میں رہے
ہم عمر بھر قدیم رسومات میں رہے

سوچا نہیں کسی نے قبیلے کے واسطے
سب لوگ اپنے ذاتی مفادات میں رہے

انسان کی خرد کی ترقی کے باوجود
پوشیدہ راز ارض وسماوات میں رہے

پھیلائے پانو اُتنے ہی چادر تھی جس قدر
ہم مفلس و غریب تھے اوقات میں رہے

آزاد کب تھے سوچتے کچھ اپنے واسطے
عاصی اسیر گردشِ حالات میں رہے

اختر ضیائی

13E HOE STREET,
LONDON E17 4SD,
(U.K)
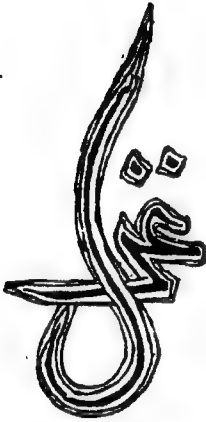
بے منزل بے ذوق مسافر ڈر جاتے ہیں
صبح کے بھولے شام کو اکثر گھر جاتے ہیں

یار کو ملنے کی دُھن میں پاگل پروانے
آگ کے دریا کے اُس پار اُتر جاتے ہیں

آس کی ڈوری کو مت ہاتھ سے جانے دینا
غم کے موسم تو ہر بار گزر جاتے ہیں

خوشیوں کے سو رنگ لیے پھولوں کے سپنے
کبھی کبھی کانٹوں سے دامن بھر جاتے ہیں

جانے کیا جادو ہے اس کوچے میں اختؔر
توبہ کرتے ہیں ہر بار، مگر جاتے ہیں

ظفر گورکھپوری
۳۰۲-اے، فلوریڈا شاستری نگر
اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۵۳

غزل

سلسلے کے بعد کوئی سلسلہ روشن کریں
اک دیا جب ساتھ چھوڑے، دوسرا روشن کریں

اس طرح تو اور بھی کچھ بوجھ ہو جائے گی رات
کچھ کہیں، کوئی چراغِ واقعہ روشن کریں

جانے والے ساتھ اپنے لے گئے اپنے چراغ
آنے والے لوگ اپنا راستہ روشن کریں

جلتی بجھتی روشنی کا کھیل بچوں کو دکھائیں
شمع رکھیں ہاتھ میں، گھر میں ہوا روشن کریں

آگہی، دانش، دعا، جذبہ، عقیدہ، فلسفہ
اتنی قبریں! — ہائے کس کس پر دیا روشن کریں

شام لائی ہے بہا کر یاد کی نہریں ظفر
آج خوشبو کے وضو سے دستِ و پا روشن کریں

نسیم سحر
پوسٹ بکس ۵۹۲۵
جدّہ ۲۱۴۳۲

آنکھیں

میں نے دیکھا
مُردہ مچھلی کی آنکھیں تو زندہ لگتی ہیں!
لیکن
یہ بھی
میں نے دیکھا
کتنے آدمی زندہ
پھر بھی
ان کی آنکھیں
ساکت سی ہیں
مُردہ لگتی ہیں!

ف۔س۔ اعجاز
۶۔۱ اے سنائی سیل اسٹریٹ
کلکتہ ۲۳

معروف چودھری
۴۲۔ ذاکر باغ ۔ جامعہ نگر
نئی دہلی ۲۵

دھند کی پار کے وسیلے سے
یاد ہیں تیرے لب رسیلے سے
دھوپ بارش کے بعد کھل آئی
تن پہ کپڑے ابھی ہیں گیلے سے
ایک مانوس گونج وادی میں
کس نے آواز دی ہے ٹیلے سے
پشت پر ہم نے آدمیت کے
داغ دیکھے ہیں کتنے نیلے سے
ان دنوں خون کی کمی کیا ہے
لوگ کیوں لگ رہے ہیں پیلے سے
لکڑیاں جل کے راکھ ہو بیٹھیں
ہم چتا پر پڑے ہیں سیلے سے
آبرو گھر کی لوٹ کر بھاگے
فوج کے آدمی نشیلے سے
اب مرے گا وہ آپ اپنی موت
ٹھن گئی ہے مرے قبیلے سے
اب ضروری ہے پھوٹ کر رونا
ہم کو چھیڑو کسی بھی حیلے سے
صرف ترسا کے راستہ لوگے
تم وہ بادل نہیں ہو گیلے سے

شبستانِ الم میں کرمکِ شب تاب ہو جاؤ
میرے دل کی منڈیروں پر کبھی مہتاب ہو جاؤ

مجھے شبنم کے قطروں سے بھلا تسکین کیا ہوگی
سلگتی ہے مرے دل کی زمیں سیلاب ہو جاؤ

خبر ہے سب کو تم ہو تیز رو چڑھتا ہوا دریا
لگا دو پار مجھ کو بھی کبھی پایاب ہو جاؤ

گزر کر کتنے صحراؤں سے خوشبو میری چاہت کی
تمھارے در پہ پہنچی ہے اٹھو شاداب ہو جاؤ

بہ شکل مشک بس جاؤ میری سانسوں کے پردہ میں
بہت کمیاب پہلے سے ہو اب نایاب ہو جاؤ

میں شاید کچھ نہ پاؤں گا دگر نہ تم تو ایسے ہو
کہ میری جاگتی آنکھوں کا دلکش خواب ہو جاؤ

پی۔ پی سریواستو رندساغری
آر۔ ۱۲۔ سیکٹر۔ X1
نوئیڈا نمبر ۲۰۱۳۰۱

خالد عبادی
سب اڈیٹر سنگم
سبزی باغ پٹنہ ۴

گم شدہ لمحات کی زنجیر لے کر آئی ہے
غم کی پروائی عجب تاثیر لے کر آئی ہے

دھوپ لفظوں کی سنہرے تیر لے کر آئی ہے
زنگ آلودہ سہی شمشیر لے کر آئی ہے

مدتوں کے بعد اب ٹوٹی ہوئی دہلیز تک
پھر وہی خوشبو وہی تحریر لے کر آئی ہے

موسموں کی زد میں کچھ الفاظ گیلے تھے مگر
اب کے بارش اک نئی تدبیر لے کر آئی ہے

پھر نئی تخیل، ریتیلے شبستانوں کے بیچ
اک شکستہ خواب کی تعبیر لے کر آئی ہے

خواہش فکر تمنا، پتھروں کے شہر میں
ایک بے آواز سی زنجیر لے کر آئی ہے

رند میری ذات تو بے ربط منظر تھی مگر
زندگی اپنی الگ تصویر لے کر آئی ہے

از سحر تا شام آوارہ پھرے
ہم ترے بد نام آوارہ پھرے

کوئی آزادی میں بھی ثابت قدم
کوئی زیرِ دام آوارہ پھرے

بستیوں میں کیا جلے کوئی چراغ
جب لہو آشام آوارہ پھرے

وحشتِ دل تھی کہ اس کی آرزو
صاحبِ اصنام آوارہ پھرے

عالمِ شہر میں بھی وہی
درد بے آرام آوارہ پھرے

کارواں سے کشاں گم ہوگیا
ساقئ پُر جام آوارہ پھرے

جان جائے گی عبادی جان لو
گر جگر کو تھام آوارہ پھرے

سن زیدی
۱۸/۵۱ اندر نگر
لکھنؤ

لے کے پیغامِ جُنوں زلفِ گرہ گیر بڑھی
دلِ وحشی کی طرف پھر وہی زنجیر بڑھی

میں نے سب دیکھا لیا سعیِ طلب کا انجام
اِن لکیروں سے نہ آگے مری تقدیر بڑھی

میں نہ پہچان سکا خود کو تو میری جانب
گردِ ماضی سے اُبھر کر مری تصویر بڑھی

یہ جو اِک بے در و دیوار کا گھر ہے اپنا
اِس سے باہر نہ کبھی حسرتِ تعمیر بڑھی

ہو گیا شعلۂ خاشاک بھی شامل جب سے
آتشِ گل میں جلا دینے کی تاثیر بڑھی

میرؔ تو تاجورِ ملکِ سخن تھے محسنؔ
لکھنؤ آ کے نہ کچھ میرؔ کی توقیر بڑھی

احمد کمال پروازی
۲۸/۴ - مالوا اسٹریٹ فیکٹری
توپ خانہ روڈ - اجین

دلّی دربار بکھرنے کے لیے ہوتا ہے
شاہ مسند سے اُترنے کے لیے ہوتا ہے

سورما ہو تو مقابل سے جھجکنا کیسا
آئینہ سامنا کرنے کے لیے ہوتا ہے

فن کسی شخص کو چھوٹا نہیں رہنے دیتا
رقص بھی حد سے گزرنے کے لیے ہوتا ہے

اس میں جینے کی تمنّا ہی عجب لگتی ہے
ڈوب کے پیار اُبھرنے کے لیے ہوتا ہے

قاسم ندیم
لوٹس کالونی ۹/۵۰۵ گونڈی
بمبئی ۴۳

آؤ تلاش کریں

آؤ تلاش کریں
ان بھٹکے ہوئے جگنوؤں کو
جو اندھیاری راتوں میں بھی
جینے کا اشارہ کریں
بجھتے ہوئے الاؤ میں
پیدا کوئی شرارہ کریں
ان چنگاریوں کو
ضائع ہونے سے بچائیں
جو ایک اک کر کے
فضا میں گم ہوجاتی ہیں
تھوڑی سی دیر تک
ہوا میں اڑتی ہیں
اور پھر کھو جاتی ہیں
ایسے نارسا حالات میں
اک اک جگنو
ہر اک چنگاری
کام آئے گی
اپنی تہذیب کے
بجھتے ہوئے دیئے کی
لو تو جلائے گی

آشا پربھات
سیتامڑھی۔ بہار

ننّھی چڑیا

میرے اندر
کہیں چپ سی پڑی ہے
ایک ننھی چڑیا
وہ اب نہیں پھدکتی
نہیں چہکتی
نہ ہی بارش میں
اپنے پر بھگوتی ہے
ڈر کر بجلی سے
کسی وسیع سینے میں
سمٹنا نہیں چاہتی
بس آئینے پر
اپنی چونچ پٹکتی ہے
جانے کیا کہنا چاہتی ہے
میرے اندر کی
ننھی چڑیا.....!

امان اللہ خاں شیروانی
گلمرگ کالونی
لال ڈگی۔ علی گڑھ

حسرت شیروانی

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں حسرت شیروانی اپنے زمانے کے ایک جیّد عالم دین، بلند پایہ ادیب، ماہر علوم مشرقیہ اور وسیع الخیال مورخ تھے۔ آپ کی ذات اپنے فضائل و کمالات، محاسن اخلاق اور سیرت و کردار کی گوناگوں خصوصیات کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھی۔ موصوف کی شہرت دو باتوں سے اور بھی زیادہ ہوئی۔ اوّل ادبی حلقہ میں ان کو مولانا آزاد کے 'صدیق مکرم' کی حیثیت سے اور دوسرے نظام حیدرآباد کی نظر انتخاب سے جس نے انھیں ریاست حیدرآباد میں صدر امور شریعت، صدر صدور کے عہدۂ جلیلہ پر مقرر فرمایا۔ احمد نگر جیل سے مولانا آزاد نے جو علمی اور ادبی خطوط لکھے تھے اور جو 'غبار خاطر' اور 'کاروان خیال' کی شکلوں میں شائع ہوتے ہیں۔ ان سب خطوط کے مخاطب 'صدیق مکرم' نواب صدر یار جنگ ہی تھے۔ حیدرآباد میں نواب صاحب قبلہ نے شرعی اور مذہبی احکامات کی روشنی میں کتنی ہی دور رس اور اہم اصلاحات کی تھیں۔ ایک باکیزہ اور علمی شخصیت کے ساتھ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی ایک بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔ علما سلف، نابینا علما، سیرۃ الصدیق اور تذکرہ بابر کو ممتاز درجات حاصل ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے مقالات اور مضامین کا ایک مجموعہ بھی 'مقالاتِ شیروانی' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں بڑے پُر مغز مقالے اور مضامین شامل ہیں۔ ان تصنیفات کے ساتھ مختلف اوقات میں آپ کے تصنیف کردہ چھوٹے چھوٹے مگر بڑے اہم رسالے بھی شائع ہوتے ہیں۔ ذکر جمیل، ذکر حبیب، سیرۃ النبیؐ پر دو مشہور رسالے ہیں۔ امیر خسرو کی مشہور مثنوی 'لیلیٰ مجنوں' کو ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ امیر حسن کا تذکرہ شعرائے اردو، استاذ العلما حضرت مفتی محمد لطف اللہ کی سوانح عمری اور فارسی کے مشہور شاعر علی حزیں کے کلام کا انتخاب مع مقدمہ بھی آپ کی ... تصنیفات اور تالیفات میں شامل ہیں۔ یہ تصنیفات مولانا کے کثرت مطالعہ کے ساتھ ان کی وسعت نظری، پختگی خیالات اور اصابت رائے کی بھی مظہر ہیں۔

مولانا کی ان خصوصیات کے ساتھ ایک اور خصوصیت جس کی طرف بہت کم توجہ

دی گئی ان کی فارسی اور اردو شاعری رہے۔ وہ ایک پختہ گو اور خوش گو شاعر بھی تھے۔ حالاں کہ ان کی شاعری بھی اسی انحطاطی دور کی پیداوار ہے جس دور میں لوگ قنوطیت اور مایوسی کے ساتھ ذہنی عیاشی میں مصروف رہتے تھے۔ "دُنیا و مافیہا سے بے خبر گل و بلبل، پیمانہ و محمل اور ناقہ و لیلیٰ کی قافیہ پیمائی میں وقت گزار رہے تھے۔" ان دنوں زیادہ تر شعرا کے سامنے بھی یہ ہی موضوع سخن تھے۔ بقول مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی "ان کے سامنے شاعری کے دو مقاصد تھے۔ حالی کی طرح قوم کی بے بسی اور بد اعمالی کا رونا روتے رہیں یا پھر بادہ ساغر، "شمع و پروانہ، گل و بلبل" اور قیس و لیلیٰ کی حکایتیں بیان کرتے رہیں۔" شیخ و واعظ کی پگڑی اچھالنا اور رند و مشرب کی مدح سرائی بھی ان کی شاعری کا دلچسپ موضوع تھا۔ حسرت شیروانی کی شاعری بھی ان ہی تمام باتوں کی تشریح ہے لیکن اس شاعرانہ ماحول اور اس فرسودہ خیالی میں ندرت پیش کرنا اور اس رسمی اور روایتی طرز ادا میں دلکشی اور حُسن پیدا کرنا بھی شاعرانہ جدت سمجھی جا سکتی ہے۔ حسرت نے اپنے مختصر کلام میں یہ ہی سب کچھ کہا ہے اس لیے وہ قابل توجہ ہے۔

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی حسرت کا تعلق علی گڑھ کے مشہور و معروف شیروانی خاندان سے تھا۔ یہ خاندان نسبی طور پر سپاہیانہ تھا لیکن تموّل اور حکمرانی کی گود میں پرورش پا رہا تھا اور اسی حکمرانی اور تموّلی کے دور میں حسرت کی ولادت ۱۸۶۶ء میں بھیکم پور کے اس خاندان کے آبائی قلعہ میں ہوئی تھی۔ اس وقت ۱۸۵۷ء کے انقلاب کو صرف چند ہی سال گزرے تھے اور عام طور پر اس کے اثرات جمود اور مایوسی کی شکل میں موجود تھے۔ حسرت کی پرورش اور تربیت اپنے والد ماجد محمد تقی خاں اور عم محترم عبدالشکور خاں صاحب کے زیر سایہ ہوئی۔ یہ حضرات اپنے دور کے اعلا منتظم اور صاحب فن بزرگ تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی اور اس دور کے نامی گرامی اساتذہ نے آپ کو تعلیم دی۔ ان اساتذہ میں میر فرزند علی مارہروی، حکیم سلیم اللہ، مولوی غلام محمد پنجابی اور مولوی عبدالغنی خاں قابل ذکر ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ پہنچ کر وہاں کے مشہور عالم اور بزرگ مفتی مولوی لطف اللہ صاحب کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ انگریزی زبان کی تعلیم ماسٹر عبدالرشید اور دو انگریز اساتذہ مسٹر ورنن اور مسٹر کالی سے حاصل کی۔

حسرت کے والد ماجد محمد تقی خاں کو اردو ادب سے بڑا ذوق تھا۔ اس ذوق کو اپنے فرزند میں پیدا کرنے کے لیے انھوں نے حسرت کو غالب کی انشاء اردوے معلّا پڑھنے کو دی اور اس کے مطالعہ سے ہی ان کے ادبی ذوق کی نشو و نما ہوئی۔ حسرت کے والد محمد تقی خاں صاحب نے اردو کے اساتذہ کے اشعار کا ایک مجموعہ بھی ترتیب دیا تھا۔ اس تالیف کا نام "سراپاے معشوق" رکھا اور اس میں سر سے پا تک محبوب کے تمام اعضا کے متعلق اساتذہ کے اشعار جمع کیے تھے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ حبیب گنج میں موجود تھا جو اب مولانا آزاد لائبریری مسلم یونی ورسٹی میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ والد صاحب کے

عطا کردہ نسخہ اردوے معلا نے حسرت میں نہ صرف ادبی ذوق بلکہ شوق مطالعہ بھی پیدا کر دیا اور اسی شوق نے انھیں عربی، فارسی اور اردو کی ہزاروں نادر کتابوں کا ذخیرہ جمع کر والیا جو کتب خانہ حبیب گنج کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کتب خانہ میں تقریباً دو ہزار قلمی نسخے تھے جن میں بعض تو نادر الوجود اور عدیم المثال ہیں: مونس الاحرار، شعراے فارسی کے تذکرہ کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ اس کا دوسرا نسخہ دُنیا بھر میں نہیں ہے۔

شاعری کا شغل حسرت نے شوقیہ طور پر اختیار کیا تھا۔ اس شوق کی تکمیل امیر مینائی نے کی۔ حضرت جلیل اور علامہ شبلی نعمانی کی داد سخن نے اسے جلا بخشی۔ ابتدا میں وامق تخلص فرماتے تھے لیکن بعد میں حسرت لکھنے لگے۔ حسرت فارسی اور اردو زبانوں میں شعر کہتے تھے اور دونوں زبانوں کے مجموعہ کلام 'دبستان حسرت' فارسی میں اور 'کاروان حسرت' اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کا کلام مختصر ضرور ہے لیکن قابل توجہ ہے۔ دراصل انھیں اپنی زمینداری کے انتظام اور ملک کے علمی ادارت کے کاموں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ شاعری کی طرف پوری توجہ اور عنایت کرتے۔ یہ ضرور ہے کہ اگر وہ پوری توجہ اور شوق سے اس طرف متوجہ ہوتے تو یقیناً چوٹی کے شعرا میں ان کا بھی شمار ہوتا۔ بہرحال اس مختصر کلام میں زیادہ تر انھوں نے غزلیات پر توجہ دی ہے۔

غزل اپنی خصوصیات سے ایک ایسی صنف ہے جو اردو اور فارسی کے علاوہ کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتی۔ اس کے متعلق خود حسرت شیروانی نے اپنے ایک مقالہ میں یوں لکھا ہے:-

"غزل نظم کا ایک ضروری جزو ہے اور جو لطف اپنی نوعیت خاص سے دل کو بخشتی ہے وہ قطعہ، مثنوی یا قصیدے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ غزل کو ایک ایسی کیاری تصور کیجیے جس میں رنگ رنگ کے خوشنما پھول کھلے ہوتے ہیں۔ اور ہر پھول کی دلفریبی دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہو۔ جو لطفِ خاص ان کیاریوں کے دیکھنے سے حاصل ہوگا وہ ان کیاریوں کے نظارے سے حاصل نہیں ہوگا جن میں ایک ہی طرح کے پھول ہوں۔ تفنن انسان کی زندگی کو گوارا رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ میز پر ایک قسم کا کھانا مہمانوں کے سامنے لایا جاتا ہے۔ کیسا ہی مزیدار کھانا ہو دو وقت متواتر کھلا کر مہمانوں کے چہرے دیکھیے کہ میز پر وہ شگفتگی و رغبت سے آتے ہیں یا بددلی اور افسردگی کے ساتھ ....."

"غزل میں چار چیزیں ہو سکتی ہیں۔ مضمون، خیال، زبان، طرزِ ادا۔ اردو غزل میں مضامین تقریباً فارسی غزل کے ہیں۔ خط و خال، زلف و کمر، ناز و کرشمہ۔ وحشت و افسردگی شگفتگی و خستگی، شمع و پروانہ، بلبل و گل، قیس و لیلیٰ اور فرہاد و شیریں۔ یہ تمام مضامین فارسی غزل کے ہیں۔ اور اردو غزل کی بساط بھی اتنی ہی ہے۔ خیال کی ترقی اور وسعت

قوتِ دماغ کے تابع ہے جو ممارستِ علوم سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ ممارستِ علوم اردو شعرا کے حصہ میں نہیں آئی۔ لہٰذا قوتِ خیال کے کرشمے اردو غزل میں بہت کم ہیں۔ اب صرف دو چیزیں رہ گئیں۔ ایک زبان، دوسرے طرزِ ادا۔ بس انھیں دو میدانوں میں اردو کے جوہر کھلتے ہیں اور حق یہ ہے کہ ان کی آب و تاب دیکھ کر جوہری حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ میرؔ و مرزاؔ سے لے کر ذوقؔ و امیرؔ تک بلکہ داغؔ و امیرؔ تک نظر ڈالو وہی خیال و مضمون پاؤ گے۔ فرق ہے تو زبان اور طرزِ ادا کا۔ ایک ہی خیال و مضمون پر سوسائٹی کے تغیر سے جو اثر پڑا ہے وہ البتہ مختلف طبقوں میں محسوس ہوتا ہے مثلاً مصحفیؔ اور جراتؔ کے یہاں مستی و عشقبازی پاؤ گے متاخرین کے یہاں نہیں ہے۔"

غزل کے بارے میں مشہور اہل قلم ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم کی رائے لکھنا بھی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> "گزشتہ دو برس میں میر صاحب کے زمانے سے لے کر حسرتؔ و جگرؔ کے موجودہ دور تک اردو غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ اس سے صاف طور پر پتا چلتا ہے کہ یہ صنفِ سخن اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے جو اس کے جاندار ہونے کی دلیل ہے۔"

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حسرتؔ نے شاعری میں اپنے قلم کی جولانی کے لیے غزل کا میدان ہی کیوں پسند کیا؟ اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو بقول مولانا ضیاء احمد بدایونی "موصوف خود مردانہ حسن کا ایک ممتاز نمونہ ہونے کے ساتھ حسن سے طبعی مناسبت اور جمالیات کا فطری ذوق بھی رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ لطافت نفاست اور تجمل و تنعم کے ماحول میں شروع سے انھوں نے پرورش پائی تھی جس سے طبیعت میں غزل کی طرف رجحان پیدا ہوا۔" دوسری ایک وجہ اور بھی قرین قیاس ہے کہ موصوف کی زندگی کے کسی بھی موڑ پر عشق مجازی کا بھی جادو چلا ہوگا۔ کیوں کہ ان کے اشعار میں جذبات کی سچائی اور بیان کی لطافت اس طرف کھل کر اشارہ کرتی ہے۔ فارسی میں ان کا ایک شعر ہے ؎

رہ روانِ شوق از ما سالہا آرند یاد　　نقش ہا انگیخت در راہِ محبت گامِ ما

ایک اور فارسی کا شعر ہے جس کو مرزا غالبؔ کے شاگرد عزیزؔ لکھنوی نے بہت پسند کیا تھا ؎

زچشمِ سرخوشی ساقی اشارہ کافی است　　دلم بہانہ جوید شکستِ پیمانہ را

حسرتؔ کی اردو غزلوں میں فارسی غزلوں کی خصوصیات ایک حد تک جلوہ نما ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو غزل کی تخلیق اپنے طور پر نہیں ہوئی بلکہ فارسی غزل کو ہی اردو نے اس کی تمام روایات کے ساتھ قبول کیا ہے۔ اس لیے اس دور کے تمام نامور شعرا کی تخلیقات

میں غزل کے مضامین زیادہ تر فارسی روایات کے ساتھ ہی ملتے ہیں مثلاً زلف و رخسار، سینہ و کمر، ہجر و وصال، نامہ و پیام، تیغ و قاتل، گور و کفن اور اسی قسم کے فارسی غزل کے مضامین اس دور کی اردو غزل کے پسندیدہ مضامین سمجھے جاتے تھے۔ لکھنؤ کے شعرا نے تو ان مضامین کے بیانات میں اور بھی جدت پیدا کی کہ اس میں ابتذال و رکاکت کا رنگ بھر دیا تھا اور اسی کو "لکھنؤ اسکول" کا نام دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ناسخ اس طرز کے بانی تھے اور بعد میں لکھنؤ کے زیادہ تر شعرا نے اس طرز کو اپنایا۔ اس زمانہ میں یہ طرز ادا اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ اس نے کم و بیش تمام شعرائے اردو کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ مفتی، مولوی، عالم فاضل اور اہل شریعت تک اس رو میں بہہ گئے۔ دہلی کے شعرا میں داغ کا کلام بھی اس لکھنوی رنگ سے ایک حد تک متاثر رہے۔ حسرت شیروانی کی غزل گوئی کی ابتدا اور نشو و نما غزل کے اسی ماحول میں ہوئی تھی۔ ناسخ و آتش کے رنگ کے ساتھ داغ کی شوخیانہ شاعری کا رواج بھی ہو چکا تھا۔ ان کا یہ شوخیانہ رنگ بھی اردو غزل پر چھانے لگا تھا۔ حسرت شیروانی کی زیادہ تر غزلیں امیر و داغ کی طرز پر اور انھیں کی زمینوں میں کہی گئی ہیں یا ان کی غزلوں کے جواب میں ہیں۔ اسلوب اور لہجے کے معاملے میں بھی وہ زیادہ تر ان ہی شعرا کے مقلد معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ غزلیں آتش، ناسخ اور مومن کی زمینوں میں بھی ہیں۔ حسرت شیروانی کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہے لیکن تقلید میں حسرت نے مضامین تو وہی تلاش کیے ہیں جو ان شعرا نے اپنی غزلوں میں استعمال کیے ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ انھوں نے رعایت لفظی، معنی آفرینی، مضمون کی بندش، معاملہ بندی اور صنعت گری میں زیادہ تر ان شعرا کی پیروی کی ہے لیکن حسرت کی پاکیزہ شخصیت، علم و دانش اور ان کے اخلاق و کردار کی پختگی نے ان کی شاعری میں ایک قسم کی پاکیزگی پیدا کر دی ہے اور اس پاکیزگی نے ان کے بعض اشعار کو اردو ادب اور اردو غزل کے معیاری اور لاثانی اشعار میں شامل کر لیا ہے۔ یوں تو ان اشعار میں کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی۔ ان کے زمانہ میں جتنے طرز موجود تھے۔ حسرت نے تقریباً ان سب پر طبع آزمائی کی ہے اور جن جن اصناف کا رواج تھا حسرت نے انھیں اپنے اظہار و خیال کا وسیلہ بنایا ہے لیکن ان کی غزلوں کی شعری حیثیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بعض اشعار تو اتنے جاندار اور پُر زور ہیں کہ انھیں تاریخ ادب میں ممتاز جگہ ملنی چاہیے۔ ان اشعار میں حسن و عشق کا پاکیزہ تخیل، طرز ادا کی سادگی، ترکیبوں کا حسن، تخیل کی بلند پروازی، زبان کی سلاست و روانی، بیان کی صفائی اور جذبات کی گیرائی و گہرائی غرضیکہ سب کچھ پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وادیِ عشق تیرے خار پہ ہوں گل قرباں
اُس سے بڑھ کے مزہ دیتی ہے وحشت تیری

شرابِ ناب کے جلوے نگاہ ناز پر صدقے
ابھی سوتے سے آنکھ اس فتنہ دوراں نے کھولی ہے
متاعِ صبر کا نام و نشاں باقی نہیں چھوڑا
یہ دزدیدہ نگاہوں نے گرہ دل کی ٹٹولی ہے

آئینہ پیکرِ تصویر نگاہِ مشتاق جسے دیکھا تری محفل میں حیراں نکلا

دل سے رخصت ہوئیں سب تمنائیں وہ سراپا حجاب یاد آیا!

شرم کے مارے جو نہیں لڑتیں انھیں آنکھوں نے مجھ کو مارا ہے

حیا، ناز، پندار، رعب و تغافل تمھارے بھی ہیں پاسباں کیسے کیسے

حسرتؔ کی شاعری پر سب سے زیادہ رنگ داغؔ اور امیرؔ کا ہے۔ ان دونوں شعرا کی زمینوں یا ان کے جواب میں حسرتؔ نے بھی چند غزلیں کہی ہیں اور ان پر ان دونوں اساتذہ کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ اس رنگ میں شوخی، محبوب سے چھیڑ چھاڑ، ہجر میں تڑپنا، وصل کی خواہش، محبوب کے حسن و جمال کی ستایش، فراق میں بے چینی سے انتظار اور وعدہ وفا نہ کرنے پر طنز و ملامت جیسے مضامین حسرتؔ نے اپنی غزلوں میں بالکل اسی لب و لہجہ میں اور طرز و آہنگ سے بیان کیے ہیں جو ان اساتذہ کا طرۂ امتیاز تھا۔ شوخی، لاگ، ڈانٹ، طعن و تشنیع اور چھیڑ چھاڑ سب کچھ اسی انداز میں ہیں۔ مثال کے لیے ان کی یہ دو غزلیں پیش کی جاسکتی ہیں سہ

نئی ہر روز آفت ہے محبت میں مری جاں کو
دل آیا تو وہ کہتے ہیں نکالو دل سے ارماں کو
ضیا بخشی رخِ پُر نور نے صبحِ بہاراں کو
دل آرا کر دیا زلفِ معنبر نے شبستاں کو
خلش بھر دی کچھ ایسی لذت افزا تیری چٹکی نے
کیا دل نے تصور نوکِ مژگاں نوکِ پیکاں کو
قدم تیرا تو دم میرا یہ ہی آباد رکھتے ہیں
شبستاں کو بیاباں کو چمن کو بیتِ احزاں کو
جنوں کی نکتہ سنجی نا تھی لیلیٰ کو رغبت تھی
بنایا مہمل سرمہ قیس نے خارِ مغیلاں کو

کبھی وہ زلفِ عنبر یوں نشاطِ خوابِ راحت تھی
ترستی ہیں یہ آنکھیں اب تو اک خوابِ پریشاں کو
نمک ریزی سے راحت ہے دلِ مجروح کو حسرتؔ
بنایا محرمِ رازِ نہاں ہم نے نمک داں کو

بس کے ساری ہے رگ و پے میں محبت تیری
بار پاتی ہی نہیں دل میں شکایت تیری
جان جائے کہ رہے یاد تری دل میں رہے
دمِ آخر بھی لبوں پر ہو حکایت تیری
تابِ نظارہ تو جب ہو کہ رہیں ہوش بجا
پھر کہاں ہوش جو ہو سامنے صورت تیری
وادیٔ عشق ترے خار پہ ہوں گل قرباں
اُنس سے بڑھ کے مزہ دیتی ہے وحشت تیری
رُوسیاہوں کے گناہوں کی حقیقت کیا ہے
بڑھ کے کونین سے وسعت میں ہے رحمت تیری
دلِ بیتاب نے بدلے ہیں ہزاروں پہلو
نہ نکلنی تھی نہ نکلی کبھی حسرت تیری
ہے جھلک حُسنِ خود آرا کی تری حیرت میں
رشکِ صد آئینہ حسرتؔ ہے یہ صورت تیری

کہیں کہیں حسرتؔ کی غزلوں پر غالبؔ اور مومنؔ کا رنگ بھی نظر آتا ہے گرچہ مومنؔ کی غزلوں میں آتشؔ و ناسخؔ اور داغؔ و امیرؔ کی طرح عاشقانہ خیالات کی بہتات ہے لیکن اُن کا لہجہ پاکیزہ اور شائستہ ہے۔ ان کے اشعار میں سوز و گداز اور حسرت و یاس کے جذبات بھی ملتے ہیں اور دل کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ نازک خیالی اور بلند پروازی بھی پائی جاتی ہے۔ حسرتؔ کے کچھ اشعار بھی ان ہی خصوصیات کے حامل ہیں مثلاً :-
تابشِ حُسن سے خیرہ ہے نگاہِ مشتاق وہ عیاں ہیں مگر اسرار ہوئے جاتے ہیں

کس کی صورت نظر نہیں آتی لون غم میں ڈُبا گیا مجھ کو

غضب ہے تیری نسیمِ بازِ آنکھ ظالم ہزاروں کیے نیم جاں کیسے کیسے

رخِ جاناں گلاب کی پتّی ہے ہر اک ایک گُل کھلائے ہوئے

حُسنِ روز افزوں کے جلوے ہیں غضب کے دلرُبا
کس طرح ہر روز حسرتؔ دل نیا پیدا کروں

یاس پر کچھ تو عمر گذری ہے کٹ رہے گی اُمید پر باقی

حسرتؔ کی غزلوں میں حسن و عشق کے معاملات کے ساتھ کہیں کہیں تصوف، معرفتِ الٰہی اور سلوک و رموز کے حقائق بھی ملتے ہیں۔ حسرتؔ کی صاف ستھری زندگی، مذہبیت و شریعت'' احکام کی پابندی اور اخلاقی پاکیزگی نے ان کے کچھ اشعار سے مادّیت کے پردے سرکا دیے ہیں اور ایسے اشعار کے ذریعہ حسرتؔ معرفتِ الٰہی میں جو اُن کا محبوب مشغلہ تھا ڈوبے نظر آتے ہیں ؎

اب ابد تک سرکشی زیبا نہیں انسان کو
جب ازل میں بندگی کا عہد و پیماں ہو گیا

یہ محو ہے سرِ شوریدہ سجدہ ریزی میں
جبیں کدھر ہے کہاں آستاں نہیں معلوم

ایک ہی کا حُسن ہے جلوہ نما کونین میں
دوسرا تو جب کہوں جب دوسرا پیدا کروں

نور وحدت کا دل میں جلوہ ہے میرا سینہ بھی طُورِ سینا ہے

رُو سیاہوں کے گناہوں کی حقیقت کیا ہے
بڑھ کے کونین سے وسعت میں ہے رحمت تیری

ان کے علاوہ غزل کے پرانے ڈھرے سے ہٹ کر حالیؔ اور اقبالؔ کے رنگ میں بھی دو ایک شعر نظر آ جاتے ہیں ؎

ہے آج تم کو فرصت کچھ کام کر دکھاؤ
اوروں کے ہاتھ میں کل یہ ماہ و سال ہوگا

سر میں انسان کے منصوبے بھرے تھے کیا کیا
سارے سر موت نے سب کر دیے درہم برہم

زندگی گرد سے خدا، عالم نیا پیدا کروں
روز ہو کر فنا رنگِ بقا پیدا کروں!

غزلوں کے علاوہ حسرت شیروانی کے دیوان "کاروانِ حسرت" میں کچھ نظمیں اور ایک یا دو نعتیں بھی ہیں۔ نظموں میں "حسرت نامہ" اور "چاندنی رات" اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ زندگی کے کسی موڑ پر حسرت نے عشقِ مجازی کا بھی کچھ مزہ چکھا ہے "برسات" اور "تصاویرِ عبرت" میں انھوں نے اس دور کی "جدید شاعری" کی تقلید کی ہے۔

حسرت کا کلام یقیناً حجم میں بہت مختصر ہے۔ اس کی وجہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ ان کی علمی اور انتظامی مصروفیات رہی ہوں گی اور چوں کہ وہ نثر میں بھی تخلیق کا کام کرتے تھے اس لیے اپنے جذبات اور خیالات کی ترجمانی اکثر نثر کے ذریعہ کر لیتے ہوں گے۔ بہر حال کلام کے مختصر ہونے کے باوجود ان کی شاعری میں اردو ادب کا ایک ایسا بیش بہا سرمایہ پوشیدہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

- حضرت محمدؐ اور قرآن (مذہب) ڈاکٹر رفیق زکریا ۲۶/-
- تاریخ نگاری۔ قدیم وجدید رجحانات (تاریخ) ڈاکٹر سید جمال الدین ۲/۵۰
- سر سید جیسی سماجی مصلحین کی تعلیم (خطبہ) پروفیسر اختر الواسع ۱/-
- سائنس کی ترقی اور آج کا سماج (خطبہ) ڈاکٹر سید ظہور قاسم ۱/-
- اردو صحافت، صداقت اور آزادی رائے ٫٫ عشرت علی صدیقی ۱/-
- تعلیم (مضامین) رشید حسن خاں ۱۸/-
- شناسا و شناخت (تنقید) پروفیسر انور صدیقی ۴۴/-
- کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے (مضامین) ڈاکٹر سید تقی حسین جعفری [illegible]
- چہرہ در چہرہ (طنز و مزاح) مجتبیٰ حسین ۲۵/-
- فی البدیہہ (٫٫) یوسف ناظم ۲۵/-
- تعلیم و تعلم (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۷/۵۰
- سر سید اور روایت کی تجدید۔ پروفیسر یونس نگرامی / سر سید اور اردو یونیورسٹی۔ پروفیسر مسعود حسین خاں (خطبہ) مرتبہ خواجہ محمد شاہد ۱/-
- شعریات سے سیاسیات تک غلام ربانی تاباں ۴۵/-
- اردو شاعری کی گیارہ آوازیں (تنقید) عبدالقوی دسنوی ۷/۵۰
- انشا اور تلفظ (طلبہ کے لیے) (قواعد) رشید حسن خاں ۹/-
- عبارت کیسے لکھیں ٫٫ ٫٫ ٫٫ ۱۵/-
- آدم خور چیتا (شکاریات) ریاض احمد خاں ۲۵/-
- انداز گفتگو کیا ہے (تنقید) شمس الرحمٰن فاروقی ۷/۵۰
- دستک اس دروازے پر وزیر آغا ۵۱/-
- آزمائش کی گھڑی (مضامین) سید حامد ۵۲/-
- جھینی جھینی بینی چدریا (ناول) عبدالبسم اللہ ۴۵/-
- صحرا نورد کے خطوط (افسانے) میرزا ادیب ۷/۵۰
- میں سمندر ہوں (شعری مجموعہ) فرحان سالم ۳۰/-
- اسرار خودی (فراموش شدہ اڈیشن) شائستہ خاں ۷/۵۰
- مسلمانوں کا تعلیمی نظام (مضامین) ضیاء الحسن فاروقی ۲۵/-
- جام جہاں نما اردو صحافت کی ابتدا (صحافت) گربچن چندن ۷/۵۰
- مصری اور بابلی تہذیب و تمدن (تاریخ) مالک رام ۷/۵۰
- اپنے دل کی حفاظت کیجیے (ایلوپیتھی) ترجمہ نذیر الدین مینائی ۲۵/-
- شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان (سوانح) تالیف مولانا حکیم محمود احمد برکاتی ۲۵/-
- تذکرۂ ماہ و سال (تذکرہ) مالک رام ۱۲۵/-
- افکار اقبال (تنقید) محمد عبدالسلام خاں ۱۲۵/-
- تحقیق نامہ (تحقیق) مشفق خواجہ ۵۱/-
- تاثر ذکر تنقید (تنقید) صدیق الرحمٰن قدوائی ۵۱/-
- یہ صورت گر کچھ خوابوں کے (انٹرویوز) طاہر مسعود ۶۶/-
- گوشے میں قفس کے (طنز و مزاح) دلیپ سنگھ ۲۵/-
- ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (ناول) کشمیری لال ذاکر ۲۰/-
- سحر کے پہلے اور بعد (جگ بیتی) سعید الظفر چغتائی ۵۱/-
- تحریریں (مضامین) اسلم پرویز ۵۷/-
- سفر (ناول) رابعہ تبسم ۲۷/-
- خواب اور خلش (شعری مجموعہ) آل احمد سرور ۶۶/-
- بانگ درا مکمل علامہ اقبال ۹/-
- بال جبریل مکمل ٫٫ ۶/-
- ضرب کلیم (اردو نظمیں) ٫٫ ۶/-
- غبار منزل (شعری مجموعہ) غلام ربانی تاباں ۲۵/-
- پیامی قواعد اردو (قواعد) (ادارہ) ۶/-
- ٫٫ ٫٫ (خورد) (٫٫) ۳/-
- فریدؒ و فرد فرید (سوانح) ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۷/-
- پہچان اور پرکھ (تنقید) پروفیسر آل احمد سرور ۵۱/-
- ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم (مضامین) ڈاکٹر سلامت اللہ ۵۱/-
- اقبال کا نظریۂ خودی (تنقید) ڈاکٹر عبدالمغنی ۱۵۰/-
- پت جھڑ کی آواز (افسانے) قرۃ العین حیدر ۷۵/-
- جدید افسانے اور اس کے مسائل (تنقید) وارث علوی ۳۶/-
- قلندر بخش جرأت (خطبہ) جمیل جالبی ۱۰/-
- پیامی بیسک انگلش اردو ڈکشنری (ادارہ) ۱۲/-
- پیامی جیبی ڈکشنری اردو انگلش ٫٫ ۱۶/-

پروفیسر عبدالستار دلوی
صدر شعبۂ اردو، بمبئی یونی ورسٹی، بمبئی۔

اردو یونی ورسٹی: کیوں اور کیسے؟

حکومت ہند کا اردو یونی ورسٹی کے قیام کا منصوبہ اردو والوں کے حق میں مفید مثبت اور خوش گوار اعلان ہے۔ آزادیِ وطن کے بعد اردو پر جو کچھ بیتی وہ ہماری لسانی اور تہذیبی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے، جس کی وجہ سے لاکھوں بچوں کی زبانیں اردو کے تعلق سے گنگ اور ان کے والدین کے ذہن ماؤف کر دیے گئے۔ زبانیں صرف ابلاغ و ترسیل کا ذریعہ ہی نہیں ہوتیں بلکہ وہ کسی بھی زبان کے بولنے والوں کی قسمت کا حصہ ہوتی ہیں۔ جب زبانیں ان سے چھین لی جاتی ہیں تو ان کی اپنی شخصیتیں لہولہان ہو جاتی ہیں اور ان کی حیثیت اپاہجوں کی سی ہو جاتی ہے۔ وہ چلتے پھرتے ہیں، کما اور کھا بھی لیتے ہیں لیکن ان کی اپنی کوئی شناخت باقی نہیں رہ جاتی اور جب شناخت باقی نہیں رہ جاتی تو وہ ہر طرح کے اعتماد سے عاری ہو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان کی ذہنی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ گذشتہ پچاس سال کے عرصہ میں اردو بولنے والوں کے ساتھ یہی ظلم روا رکھا گیا۔ اور وہ ایسے اندوہ ناک حالات اور ذہنی کرب سے گذرے جو کسی بھی ملک کی تاریخ کے لیے شرمناک سانحہ سے کم نہیں۔ سیاسی تاریخ اس طرح کے حالات کو شاید نظر انداز کر دے، مگر تہذیبی تاریخ اور قومی اخلاقیات میں یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے جسے مستقبل کا مورخ نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ آزادی کے بعد یوپی، بہار اور مدھیہ پردیش سے تقریباً اردو کو دیس نکالا مل گیا اگرچہ بول چال کی حد تک اپنی اندرونی طاقت کی وجہ سے یہ ہر خاص و عام کی زبان بنی رہی، تاہم نظام تعلیم سے اسے یکسر ختم کر دیا گیا۔ اردو زبان اور اس کی تعلیم کے ساتھ یہ ظلم اس زمانے میں ہوا جب ملک کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو تھے، جن کی اپنی مادری زبان بھی اردو تھی۔ یہ اس دور کی سیاسی مجبوری تھی کہ پنڈت نہرو بھی اس زبان کو سسکتا دیکھنے پر مجبور تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد جو آزاد ہندستان کے وزیر تعلیم تھے، اس زبان کے لیے کسی طرح کی آواز حق بلند نہ کر سکے۔ ہمارے دستور نے بھی تعلیم کی ذمہ داری مرکز کی بجائے ریاستوں کو دے رکھی ہے، اس کا بھی جنوبی ریاستوں کو چھوڑ کر نتیجہ اردو کی تعلیم کے خلاف نکلا کہ شمالی ہندستان کی فرقہ وارانہ مسموم ذہنیت اردو کی تعلیم کے خلاف

تھی ــــ مہاراشٹر، آندھرا، اور کرناٹک کی ریاستیں البتہ شمال کے مقابلے میں اقلیتوں کی لسانی، تہذیبی اور تعلیمی زندگی سے ہمدردانہ رویتہ رکھتی تھیں جو آج بھی قائم و دائم ہے۔ ۱۹۷۵ء میں اردو کے تعلق سے غیر منصفانہ رویتہ اردو والوں کے ووٹوں کی ضرورت کے پیش نظر احساس ندامت میں بدل گیا۔ نسدید تاریخ کی جواب طلبی کا بھی احساس رہا ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکز میں اردو کی ہمہ جہت تعلیمی ترقی کے پیش نظر "ترقی اردو بورڈ" کا قیام عمل میں آیا۔ اور پھر علاقائی سطح پر اردو کے فروغ اور ترقی کے پیش نظر اردو اکیڈمیاں وجود میں آئیں ــــ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اب اردو کے تعلق سے تعصبات میں کمی آنی شروع ہوئی ــــ کچھ نہ ہونے سے "کچھ ہونا" شروع ہوا، اگرچہ اردو کے تعلق سے اردو والے شکایتیں کرتے رہے تاہم ۷۵ء سے ۹۵ء کے درمیان جو ماحول اردو کے تعلق سے بنا تھا اس میں خوش گوار تبدیلی پیدا ہوئی۔

اردو اکیڈمیاں ہوں یا اردو ترقی بورڈ، ان کا دائرہ کار محدود رہا، پھر اردو اکیڈمیاں اردو کے تعلق سے علمی یا اکیڈمک ہونے کی بجائے سیاست کی اسیر ہو گئیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم کی شکست و ریخت سے جو تہذیبی و تعلیمی قدریں مٹ گئی تھیں انھیں زندہ کرنا ضروری تھا، اردو کے نظام تعلیم کو پھیلانا اور اسے مستحکم بنیاد پر دینا ضروری تھا۔ یہ بنیادی کام ہمارے یہ ادارے انجام نہ دے سکے، یو پی، بہار اور مدھیہ پردیش میں بالخصوص اردو پر جو دور آیا وہ المناک تھا، تعلیمی زندگی سے اردو کا رشتہ کٹ چکا تھا، کچھ کوششیں ہوئیں تو بہار نے اردو کے تعلق سے کروٹ لی، وہ بھی زیادہ تر کالج کی سطح پر اردو کی تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں، بنیاد اب بھی کمزور ہے۔

جنوب میں مہاراشٹر نے اردو کے فروغ میں سب سے زیادہ مثبت رول ادا کیا ہے یہاں کے نجی اداروں نے اردو کے اسکول قائم کیے اور بنیادی اور ثانوی سطح پر اردو کے نظام تعلیم کی آبیاری کی، چنانچہ آج اردو نظام تعلیم کی حد تک مہاراشٹر سب سے آگے ہے یہاں اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد ہے اور اردو کے ایسے بہی خواہ بھی ہیں جنھوں نے اردو کو اپنی تہذیبی اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے اپنا کر گذشتہ دو صدیوں سے اس کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے، اس جذبۂ محبت کا جس میں جذبۂ ایثار بھی شامل ہے یہ نتیجہ نکلا کہ آج سارے مہاراشٹر میں تقریباً ساڑھے چار سو (۴۵۰) اردو ذریعہ تعلیم کے ہائی اسکول قائم ہیں۔ کوکن اور اضلاع کوکن میں تقریباً ستر (۷۰) اردو میڈیم ہائی اسکول ہیں، شہر بمبئی میں تقریباً (۹۰) اردو میڈیم ہائی اسکول اردو کے نظام تعلیم کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ودربھ، مراٹھواڑہ وغیرہ بھی اس سلسلے میں اردو کی خدمت گذاری میں پیش پیش ہیں۔ پرائمری کی سطح پر ضلع پریشد کے اردو میڈیم اسکولوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ بمبئی شہر میں صرف بمبئی میونسپل کارپوریشن کے دو سو پچیس (۲۲۵) پرائمری اسکول ہیں جن میں تقریباً دو لاکھ طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور تقریباً دو ہزار اساتذہ اردو کی تعلیم میں مصروف کار ہیں۔ مہاراشٹر میں متعدد

کالجوں میں اور جونیئر کالجوں میں بہت بڑی تعداد اردو ذریعہ تعلیم سے بارہویں جماعت تک اردو ذریعہ تعلیم سے آرٹس، سائنس اور کامرس کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ مہاراشٹر اردو کے نظام تعلیم میں اپنے پرائمری مدارس، ہائی اسکولوں اور جونیئر کالجوں میں نیز سینیر کالجوں میں اردو تعلیم کے لحاظ سے سرفہرست ہے۔ کرناٹک اور آندھرا میں بھی پرائمری اور ثانوی تعلیم کی صورت حال شمال کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔ شمالی ہندستان میں یوپی اور بہار میں اردو دینی مکاتب سیکولر اسکولوں کی تعلیم کے مقابلے میں پیچھے رہیں، تاہم اردو کی اعلا تعلیم کے فروغ میں کسی حد تک ان کا بھی کردار ہو سکتا ہے۔

تعلیمی نظام میں زبانوں کے استعمال سے انھیں وقار حاصل ہوتا ہے، شعر و ادب میں زبانوں کا استعمال انھیں تخلیقی سطح پر حسن و جمال سے آراستہ کرتا ہے۔ نزاکت خیال اور جذبہ حسن ادبی سطح پر اس کی ادبی قدر کو متعین کرتے ہیں۔ تاہم زبانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ علمی اور تعلیمی سطح پر بھی اپنی اہمیت کو منوائیں اور زندگی کی تمام تر ضروریات کے لیے کارآمد بنیں۔ ادبی حسن کے ساتھ ان کا علمی وقار ان زبانوں کے تعلیمی نظام میں استعمال ہونے سے قائم رہتا ہے۔ اسی طرح اعلا تعلیم میں اس کے استعمال سے، زبان کے بولنے والوں کی تعلیمی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے اور اسے وسیع تر سیاق میں وقار حاصل ہوتا ہے اور اس کی علمی اہمیت — Practical utility بڑھ جاتی ہے۔ مرحوم دلی کالج (۱۸۳۲ء) ہی سے اردو علمی زبان کی حیثیت سے ایک آزمودہ زبان رہی ہے۔ سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی نے اسے علمی سطح پر رائج کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ مختلف سماجی اور سائنسی علوم کے لیے اصطلاحات وضع کی گئیں اور اسے اس قابل بنایا گیا کہ انگریزی ذریعہ تعلیم کے ساتھ اردو تعلیمی لحاظ سے انگریزی کی ہمسر ہو سکے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی کے قیام سے اردو کی کامیاب علمی، سائنسی اور تعلیمی حیثیت ثابت ہو گئی۔ عثمانیہ یونی ورسٹی نے اردو کو اعلا تعلیم میں کامیابی کے ساتھ ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے برتا۔ نہ صرف سماجی علوم بلکہ سائنسی علوم کیمیا، فزکس، نباتیات، انجینیرنگ اور ڈاکٹری (طب) میں بھی اسے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ عثمانیہ یونی ورسٹی کے اردو ذریعہ تعلیم سے فارغ التحصیل انجینیر، ڈاکٹر، ماہرین معاشیات اس کی مثال پیش کرتے ہیں۔ یونیسکو کی ایک رپورٹ کے مطابق عثمانیہ یونی ورسٹی سے اردو ذریعہ تعلیم سے کامیاب ڈاکٹر اور انجینیر کسی بھی انگریزی ذریعہ تعلیم کے فارغ التحصیل ڈاکٹروں اور انجینیروں سے قابلیت میں کم نہیں تھے۔ ہمارے وزیر داخلہ جناب ایس بی چوان عثمانیہ کے تعلیم یافتہ ماہر قانون ہیں۔ بمبئی کے جسلوک اسپتال کے ایک ماہر ڈاکٹر آر۔ ڈی لیلے بھی عثمانیہ یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر لیلے نیوکلیر میڈیسن کے ماہر ہیں۔

آزادی ہند کے بعد ہندستان کا لسانی منظرنامہ لسانی تعصب اور فرقہ واریت کی نذر ہو گیا۔ ۱۹۵۶ء میں ریاستوں کی لسانی تشکیل کے بعد وہ زبانیں جن کی محدود تعلیمی حیثیت

بھی علاقائی حدود میں اہمیت اختیار کر گئیں۔ شمالی ہندوستان میں ہندو تہذیب کی علامت کے رشتے سے ہندی کو بالادستی حاصل ہو گئی۔ ۱۹۵۶ء کے بعد علاقائی زبانوں کو جو فروغ و ترقی کے مواقع ہوئے، اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ علاقائی زبانیں اب تک تعلیمی و انتظامی اہمیت حاصل نہیں کر سکیں اور بھرپور سرکاری پشت پناہی اور وافر وسائل کے باوجود یہ زبانیں تعلیمی زبان نہیں بن سکیں۔ آج ہندی، گجراتی، مراٹھی اور دیگر ہندوستانی زبانیں تعلیمی زبان بننے کی خواہش مند ہونے کے باوجود اپنی منزل سے بہت دور ہیں اس کی واحد وجہ ان زبانوں کی محدود صلاحیت ہے۔ اس کے برعکس المیہ یہ ہے کہ جو زبان تعلیمی و انتظامی لحاظ سے آزمودہ زبان تھی اسے ختم کر دیا گیا اور عثمانیہ یونی ورسٹی جو کسی بھی ہندوستانی زبان کے مقابلے میں اردو ذریعہ تعلیم اور اردو یونی ورسٹی کے لحاظ سے کامیاب تعلیمی تجربہ تھا اسے ختم کیا گیا۔ یہ ملک کی ملی جلی تہذیب کے خلاف ایک سیاسی سازش کے تحت کیا گیا۔

اس لسانی اور سیاسی پس منظر میں موجودہ حکومت کا اردو یونی ورسٹی کے قیام کا منصوبہ اردو کے تعلق سے ایک ایسا مثبت منصوبہ ہے کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو ہماری گذشتہ پنجاہ سالہ تاریخ میں خوب صورت تہذیبی، تعلیمی اور لسانی موڑ کہلائے گا جسے اردو والے خوش آمدید کہیں گے۔ ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کرنے سے بہتر یہی ہو گا کہ اس منصوبہ میں خود اردو والے مثبت رول ادا کریں۔ زبانیں اور تہذیبیں صرف حکومت کے سہارے زندہ نہیں رہتیں بلکہ ان کے اپنے پاسبان ہوتے ہیں۔ حکومت نے اگر تاخیر سے سہی اس سمت قدم بڑھانے کا ارادہ کیا ہے تو اس کی پاسبانی اردو والوں کو اس طرح کرنی ہو گی کہ اس کے تعلق سے جو خدشات اور مسائل درپیش ہو سکتے ہیں۔ انھیں خلوص نیت سے اور سیاست سے بلند ہو کر علمی نقطۂ نظر سے حل کیا جائے۔ انھیں اپنے علم کو نئی دریافت شدہ معلومات کی روشنی میں اپنے حاصل شدہ حقائق سے مطابقت پیدا کرنا بھی ہے۔ ان میں رہنمایانہ صلاحیتیں پیدا کرنا ہیں تا کہ زندگی کے مختلف اعمال میں، وہ اپنی صلاحیتوں کو روبہ کار لا سکیں۔ ان کا مقصد فکری زندگی کی بلندیوں کے ساتھ عملی زندگی کو ہم آہنگ کرنا ہے۔ خوش گوار دوستانہ تعلقات پیدا کرنا، آپسی بھائی چارہ کو فروغ دینا اور احترام آدمیت کا جذبہ پیدا کرنا بھی یونی ورسٹیوں کا مقصد ہے۔

مجوزہ اردو یونی ورسٹی کو جس کے لیے کوششیں جاری ہیں، یونی ورسٹی کے قیام اور لائحہ عمل کے مذکورہ مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے نصابات کی تدوین کرنی ہو گی اردو یونی ورسٹی کا مقصد اردو ذریعہ تعلیم کے ذریعہ اردو ادب کی تدریس نہیں بلکہ اردو زبان کے ذریعہ مختلف سائنسی علوم مثلاً طبیعیات، کیمیا، دھاگہ گیری (؟)، کمپیوٹر، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، نفسیات، فلسفہ، طب، انجینیرنگ، صحافت، رابطہ عامہ Mass Communication

زراعت اور سارے علوم جن کا ہندوستانی روزی سے گہرا تعلق ہے ان کی تدریس کا انتظام کرنا ہے۔ مذکورہ علوم کے نصابات تیار کرنے ہوں گے۔ ان نصابات کی کامیاب تکمیل کے لیے نصاب کی روشنی میں درسی کتابوں اور مددگار حوالہ جاتی کتابوں کی ترتیب و تدوین کا کام بھی کرنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں بہتر طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف سائنسی موضوعات اور سماجی علوم کے لیے ماہرین کی اعلا سطح کی کمیٹیاں قائم کی جائیں اور وہ مختلف یونی ورسٹیوں کے نصاب تعلیم کا مطالعہ کر کے اپنے نصابات وضع کریں اور ان نصابات کی روشنی میں کتابوں کی تصنیف و تدوین کا کام ہو۔

تصنیف و تدوین کے لیے ماہرین کے پینل بنائے جائیں، جن میں مضمون کے ماہرین کے علاوہ اردوداں ماہرین مضمون بھی ہوں اور اصطلاح سازی کی ضرورت کے پیش نظر لسانی صلاح کار بھی ہوں جو حسب ضرورت لسانی اعتبار سے وضع اصطلاح کے لیے مشورہ دے سکیں۔ اس سلسلہ میں ترقی اردو بورڈ (حکومت ہند) کی وضع کردہ اصطلاحوں سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے تاہم اصطلاحوں کے فارسی/عربی آمیز ترجموں سے حتی الامکان گریز کرتے ہوئے انگریزی اصطلاحات کا اگر وہ ہماری قواعدی ساخت سے مطابقت رکھتی ہوں زیادہ سے زیادہ استعمال ہونا چاہیے اس لیے ان کے معنیاتی افق میں جو وسعت ہوتی ہے وہ ترجمہ شدہ اصطلاحوں میں نہیں آپاتی۔

اردو یونی ورسٹی کا قیام اگر عمل میں آتا ہے تو اسے ایک مرکزی یونی ورسٹی کا درجہ حاصل ہونا چاہیے تاکہ یہ علاقائی عمل اور محدود لسانی دائرہ کار سے بالاتر ہو کر مرکز کی نگرانی میں آزادانہ کام کر سکے، اس مجوزہ یونی ورسٹی میں جہاں مختلف علوم کے شعبے ہوں وہیں سارے ملک میں پھیلے ہوئے دارالعلوم، پالی ٹکنک، میڈیکل کالج، یونانی میڈیکل کالج کے الحاق کا بھی حق ہو اور سارے ڈپلوما ٹکنیکل بورڈ کی بجائے اردو یونی ورسٹی سے دیے جائیں، اردو یونی ورسٹی کو ڈگری اور پوسٹ گریجویٹ سطح اور ڈپلوما کی سطح پر اپنے نصابات اور دائرہ کار کو وسیع رکھنا چاہیے۔ ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے، لہٰذا ڈگری کی سطح پر زراعت کے اور ہارٹی کلچر Horticulture وغیرہ نصابات کی بھی گنجایش ہونی چاہیے ظاہر ہے کہ یہ سارے نصابات ایک ساتھ شروع نہیں کیے جا سکتے بلکہ بتدریج ان مضامین کو نصاب میں شامل کرنا چاہیے۔

ہمارے ملک میں دینی مدارس ایک مخصوص ضرورت کے تحت تعلیم اور اشاعت علم میں مصروف ہیں۔ ایسے دینی مدارس کی اسناد کو بھی اردو یونی ورسٹی کا جزو بننا چاہیے اور ان کے نصابات کی تدوین اور ترتیب میں قاہرہ، مدینہ یا مکہ کی یونی ورسٹی کے نصابات کی مدد سے مرتب کرنا چاہیے تاکہ انھیں معیار کے اعتبار سے تعلیم میں ایک اہم مقام حاصل ہو۔ دینی مدارس کے تعلق سے ایسے نصابات موجود یونی ورسٹیوں میں رائج اسلامیات اور عربی ادب سے متعلق نصابات کے مقابلہ میں کہیں اعلا معیار کے حامل ہوں گے جس

سے فی الوقت ہماری یونی ورسٹیاں محروم ہیں ۔ اس سلسلے میں دینی مدارس کے نصابات میں انگریزی اور ہندی کے علاوہ کوئی ایک علاقائی زبان دطالب علم کی دلچسپی اور کسی علاقے سے وابستگی کے پیش نظر) لازمی قرار دینی چاہیے تاکہ اردو یونی ورسٹی سے فارغ التحصیل طلبا مختلف لسانی علاقوں میں کارآمد ہو سکیں ۔

انگریزی اور علاقائی زبانیں

ہندستان جیسے کثیر لسانی ملک میں علاقائی زبانوں کی تعلیم ضروری ہے۔ اردو سے محبت، علاقائی زبانوں کو سیکھنے کے مانع نہیں آتی ۔ چنانچہ مختلف علاقوں میں کارآمد ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے اپنے علاقوں سے طلبہ کے لیے، علاقائی زبانوں میں قابلیت پیدا کرنے کے لیے مناسب نصاب ترتیب دیے جائیں ۔ تاکہ ملازمتوں کے پیش نظر طلبہ اپنے اندر احساس کمتری کا شکار نہ ہوں اور علاقائی زبانوں کے مقابلے میں ٹھہر سکیں اسی طرح انگریزی جو دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک ہے اور جس میں علوم کے خزانے محفوظ ہیں، اس میں بھی مہارت پیدا کی جائے۔ مجوزہ اردو یونی ورسٹی کے لیے ضروری ہو گا کہ بین الاقوامی اور بین صوبہ جاتی ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے زبانوں کے شعبے بھی اس کا حصہ ہوں ۔ جہاں صرف زبان کی تدریس ہو اور اس طرح اردو انگریزی اور علاقائی زبانوں کے تعلق سے فعال ذولسانیت Active Bilingualism کو فروغ دیا جا سکے ۔

دارالترجمہ کا قیام

سائنس اور ٹکنیکل تعلیم میں مغربی ممالک کی رفتار بہت تیز ہے ۔ مغربی ممالک میں سائنسی علوم کے روزانہ نت نئے تجربے ہو رہے ہیں ۔ سائنسی علوم کی رفتار کے لحاظ سے ہی ان مضامین کی کتابوں کا آئے دن اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ خود ان ترقیات سے ہندستانی زبانوں میں کسی حد تک ہندی بھی جو ہماری سرکاری زبان ہے اور U.N.O کی زبان بننے کی آرزومند ہے ۔ اپنے اندر دو افر سائنسی نصابی ادب یکجا کرنے کا جذبہ رکھتی ہے ۔ گزشتہ تقریباً ۳۵ برسوں سے اسے دیگر زبانوں کے مقابلے میں سہولتیں اور مالی وسائل بھی حاصل ہیں ۔ چنانچہ اردو یونی ورسٹی کے لیے اپنے معیار تعلیم کو قائم و دائم رکھنے کے لیے اور نصابی کتابوں کو مہیا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا ایک مستقل دارالترجمہ ہو جو ماہرین کی مدد سے کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرے اور حسب ضرورت کتابیں تصنیف بھی کرے تاکہ وقت کے لحاظ سے اور Knowledge explosion کے ساتھ وہ وقت کی تعلیمی و تدریسی ضروریات کو پورا کر سکے ۔ ترجمہ کا کام انگریزی کتابوں کے علاوہ جو زیادہ مستند کتابیں ہوں گی، ہندی کتابوں کے تراجم کی مدد سے بھی کیا جا

عثمانیہ یونی ورسٹی جیسے ماضی میں ملک کی اردو یونی ورسٹی رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس نے عرصہ تک مختلف سائنسی اور سماجی علوم کو اعلا تعلیم کے لیے اردو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اپنایا۔ دارالترجمہ اس مقصد کے حصول میں دست راست کی حیثیت رکھتا تھا۔ لہٰذا اپنے مقصد کے حصول کے لیے اردو یونی ورسٹی کے لیے دارالترجمہ کا قیام ازبس ضروری ہے تاکہ وقت اور زمانہ کی ضروریات کے ساتھ اردو ذریعہ تعلیم نصابی ضروریات پوری کر سکے۔

تعلیم نسواں اور اردو یونی ورسٹی

اردو ہندستان کی مشترک تہذیب کی علامت ہے اس کے بنانے اور سنوارنے میں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں نے برابر کا حصّہ لیا ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد پرانی نسل کے ادیبوں اور شاعروں کو چھوڑ کر یہ زبان اب مسلمانوں سے مخصوص ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ مسلمان نہیں بلکہ وہ غیر مسلم ہیں جنھوں نے اسے لکھنا اور پڑھنا ترک کر دیا ہے اور مادری زبان کی حیثیت سے اردو کی جگہ ہندی کو اپنا لیا۔ ان حالات میں اردو کے لکھنے اور پڑھنے والے شاید ۹۹ فی صد لڑکے اور لڑکیاں مسلمان گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ خدا کرے کہ اس سیکولر زبان کو غیر مسلم بھی اپنا لیں اور اپنے اس تہذیبی ورثہ کو جسے وہ گذشتہ تقریباً پچاس سال سے ترک کر چکے ہیں سیکھنا شروع کر دیں اور اسے اپنے لیے لسانی اور تہذیبی شناخت بنا لیں تاہم فی الوقت حالات اس سے مختلف ہیں۔ چنانچہ خواتین میں صرف مسلمان لڑکیاں ہی اردو پڑھتی ہیں اور مسلمان گھرانوں میں قدامت پرستی اور مختلف طرح کی پابندیوں کی وجہ سے وہ اعلا تعلیم میں پچھڑی ہوئی ہیں۔ ان پابندیوں کی وجہ سے اردو گھرانے کی لڑکیاں ملے جلے کالجوں میں تعلیم حاصل نہیں کر تیں۔ لہٰذا اس اہم بنیادی ضرورت کے پیش نظر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اردو یونی ورسٹی اردو خواتین کی تعلیم کو اپنے مقاصد میں خصوصی جگہ دے، تاکہ یہ لڑکیاں اردو یونی ورسٹی کے ذریعہ اعلا تعلیم حاصل کر سکیں۔ عام نصاب تعلیم کے ساتھ بہتر ہو گا کہ اردو داں خواتین کی تعلیم کے لیے ان کی ضروریات اور دلچسپیوں کے پیش نظر نئے نصابات مرتب کیے جائیں۔

زبانوں و ادب کے مطالعے، سائنسی اور ٹکنیکل تعلیم کے لیے مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے بہت سی خواتین درس و تدریس، تحقیق اور اسی طرح کے دیگر مقاصد کے تحت اعلا تعلیم حاصل کرنا چاہیں۔ لہٰذا ان کی تمام تر دلچسپیوں اور مستقبل میں ترقی کے مواقع کے پیش نظر نصاب تیار کرنے ضروری ہیں۔ اسی طرح اعلا تعلیم کے لیے ان میں رغبت دلانے (Incentive) کی بھی ضرورت ہے تاکہ اردو داں خواتین اس یونی ورسٹی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا کر سماجی اور تعلیمی اعتبار سے سرخرو ہو سکیں اور ان میں زندگی بسر کرنے کے لیے اعتماد پیدا ہو سکے،

کتاب نما کے خصوصی شمارے

- مغیث الدین فریدی — مرتبہ ظہیر احمد صدیقی — ۴/۵۰
- خواجہ حسن نظامی — مرتبہ نثار احمد فاروقی / ریحان احمد عباسی — ۵/۰۰
- مولانا عبدالوحید صدیقی — مرتبہ پروانہ ردولوی — ۵/۰۰
- غلام ربانی تاباں — 〃 اجمل اجملی — ۵/۰۰
- عابد علی خاں — 〃 مجتبیٰ حسین — ۴/۵۰
- خواجہ احمد فاروقی — 〃 ڈاکٹر خلیق انجم — ۴/۵۰
- علی سردار جعفری — 〃 ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی — ۴/۵۰
- اختر سعید خاں — 〃 ڈاکٹر سید حامد حسین — ۵/۰۰
- نثار احمد فاروقی — 〃 ڈاکٹر خلیق انجم — ۵/۰۰
- پروفیسر مسعود حسین خاں — 〃 ایم حبیب خاں — ۴/۵۰
- ڈاکٹر اجمل اجملی — مرتبہ: علی احمد فاطمی / عذرا مجیب — ۴/۵۰
- فرمان فتح پوری نمبر — مرتبہ خلیق انجم — ۲۵/۰۰
- صالحہ عابد حسین نمبر — 〃 عزیز قریشی — ۴/۵۰
- نئی نظم کا سفر — 〃 خلیل الرحمٰن اعظمی — ۴/۵۰
- مشرقی علوم و السنہ پر تحقیق — حامد حسین — ۳/۰۰
- پریم چند نمبر — عبدالقوی دسنوی — ۸/۰۰
- ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر — کرنل بشیر حسین زیدی — ۲۰/۰۰
- مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر — ادارہ — ۱/۵۰
- مرزا سلامت علی دبیر نمبر — مرتبہ عبدالقوی دسنوی — ۷/۵۰
- جوش ملسیانی نمبر — ساحر ہوشیار پوری — ۵/۵۰
- خواتین افسانہ نگار نمبر — ڈاکٹر صغرا مہدی — ۴/۵۰
- عرش ملسیانی نمبر — مالک رام — ۱۲/۵۰
- سکندر علی وجد نمبر — یوسف ناظم — ۲۵/۰۰
- لغت نویسی کے مسائل نمبر — پروفیسر گوپی چند نارنگ — ۳۵/۰۰
- عبداللطیف اعظمی نمبر — (ادارہ) — ۱۸/۰۰
- جائزے — مرتبہ مظفر حنفی — ۴/۵۰
- جگن ناتھ آزاد نمبر — ایم حبیب خاں — ۵/۰۰

معیاری ادب سیریز

- موازنۂ انیس و دبیر — مرتبہ رشید حسن خاں — ۲۴/۰۰
- نیرنگِ خیال — 〃 مالک رام — ۱۵/۰۰
- یادگارِ غالب اردو — مرتبہ مالک رام — ۳۰/۰۰
- یادگارِ غالب فارسی — 〃 مالک رام — ۹/۰۰
- انتخاب مضامینِ سرسید — 〃 انور صدیقی — ۱۶/۰۰
- حیاتِ سعدیؒ — 〃 رشید حسن خاں — ۳۴/۰۰
- فسانۂ آزاد (تلخیص) — 〃 ڈاکٹر قمر رئیس — ۷۵/۰۰
- فردوسِ بریں — 〃 عبدالحلیم شرر — ۱۶/۰۰
- انتخاب مضامین شبلی — 〃 رشید حسن خاں — ۷/۵۰
- انتخابِ ناسخ — 〃 〃 — ۷۵/۰۰
- مثنوی بحر المحبت — 〃 عبدالماجد دریابادی — ۹/۵۰
- شریف زادہ — 〃 ڈاکٹر قمر رئیس — ۲۰/۰۰
- امراؤ جان ادا — 〃 ڈاکٹر محمد حسن — ۲۸/۰۰
- فسانۂ مبتلا — 〃 صدیق الرحمٰن قدوائی — ۱۰/۰۰
- توبۃ النصوح — 〃 مالک رام — ۳۶/۰۰
- باغ و بہار — 〃 رشید حسن خاں — ۲۴/۰۰
- ابن الوقت — 〃 ڈاکٹر خلیق انجم — ۲۴/۰۰
- مجالس النساء — 〃 صالحہ عابد حسین — ۲۲/۰۰
- گزشتہ لکھنؤ — 〃 رشید حسن خاں — ۷/۵۰
- قصۂ حاتم طائی — 〃 اطہر پرویز — ۷/۵۰
- انتخابِ ولی — 〃 سید ظہیر الدین مدنی — ۲۰/۰۰
- انتخابِ سراج اورنگ آبادی — 〃 ڈاکٹر محمد حسن — ۱۰/۰۰
- انتخابِ مراثی انیس و دبیر — 〃 رشید حسن خاں — ۲۶/۰۰
- انتخابِ نظیر اکبر آبادی — 〃 〃 — ۳۶/۰۰
- انتخابِ اکبر الہ آبادی — 〃 صدیق الرحمٰن قدوائی — ۱۸/۰۰
- انتخابِ کلام میر — 〃 ڈاکٹر محمد حسن (زیرِ طبع)
- دیوانِ درد — 〃 رشید حسن خاں — ۳۰/۰۰
- انتخابِ سودا — 〃 〃 — ۷۵/۰۰
- انتخابِ قلی قطب شاہ — 〃 محمد اکبر الدین صدیقی — ۲۷/۰۰
- انتخابِ ذوق — 〃 ڈاکٹر تنویر احمد علوی — ۲۴/۰۰
- مثنوی سحر البیان — 〃 رشید حسن خاں — ۲۱/۰۰
- مثنوی گلزارِ نسیم — 〃 〃 — ۱۶/۰۰
- افاداتِ سلیم — 〃 ڈاکٹر خلیق انجم — ۲۱/۰۰
- مقدمۂ شعر و شاعری — مرتبہ رشید حسن خاں — ۲۷/۰۰

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
صدر شعبۂ اردو مہاراشٹر کالج
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

"اِدھر بھی دیکھ تماشا ہے میری کم سخنی"

(مجروح اپنی غزل کے آئینے میں)

(یہ مضمون انجمن ترقی اردو بمبئی کی جانب سے منعقدہ مجروح سلطانپوری کے اعزازی جلسے میں، ان کے "اقبال سمان" پانے کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔ البتہ اس کی اشاعت میں تاخیر ہوگئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ ر، ش، ع)

مجروح نے ایوانِ شاعری میں اس وقت قدم رکھا جب شاخِ غزل پر ضربِ موسم کی دست کاریاں نمایاں ہونا شروع ہوگئی تھیں اور وہ کافر صنف جو ایک مدت سے حاصلِ فکروفن اور متاعِ سخن خیال کی جاتی تھی، داغ داغ پیرہن اور زخم زخم بدن لیے مقتلِ نقدونظر میں سرنگوں اپنی شہادت کا محضر نامہ سننے کی منتظر کھڑی تھی۔ فردِ جرم یہ تھی کہ اس کے دامن میں سوائے حسن وعشق، گل وبلبل، نامہ وپیام اور بادہ وجام کے، اور کچھ نہیں۔ نیز اس کی کوتاہ دامنی، قافیوں کی فصیل میں قید پھڑپھڑاتا ہوا طائرِ خیال اور کربِ انفاس کی شکار فکرِ جمیل۔ سب اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ وہ ایک ایسا مقتل ہے جہاں معانی ومفاہیم کا لہو ایک مدت سے بہایا جا رہا ہے۔ صدیوں پرانے بازاری ہرجائی وآوارہ محبوب اور اس سے بھی صدیوں پرانے بے غیرت، بے ضمیر، بے حوصلہ عاشق کا احوالِ دل ــــ غرض اس نیم وحشی صنفِ سخن کو گردن زدنی قرار دینا علمی دہشت گردی کی دلیل خیال کیا گیا نہ ادبی بے رحمی وسفاکی کی مثال۔ فیصلہ صاف اور قطعی تھا۔ یعنی غزل کو بہرحال قتل ہونا تھا۔ سو تیغ تنقید کی آب داری ضروری تھی اور اس کو حالی پہلے ہی جلا دے چکے تھے۔ ان کی تنقیدی عدالت میں تو "مقدمۂ شعروشاعری" پہلے ہی چل چکا تھا۔ البتہ اس شمشیر کو میان سے باہر نکالنے کا کام کیا۔ ترقی پسند تحریک کے نظریات اور تبلیغی ڈھانچے نے، انقلاب کی نعرہ زنی نے، انگریزی ادب کے زیر اثر نظم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے اور سب سے بڑھ کر ہندستان کی معاشرت اور معیشت نے جو غزل کو شاہی دربار سے سربازار لے آئی۔ ایسے میں سرمایہ دار اور صنعت کار "مائی باپ" کے روپ میں "منعم دریا دست" ٹھہرے۔ اور کسان اور

مزدور کاسہ گدائی لیے، اپنے اپنے حصے کی بھیک کے منتظر۔ بقیہ عوام محض تماشائی، دُور کے جلوے اور مُفت کے حلوے کے طلب گار و تمنائی۔ حسرت نے جو یہ صورتِ حال دیکھی تو غزل کو دلکش بنانے کے شوق میں داغ اور امیر کا جوٹھا پیمانہ حلقوم تک چڑھا گئے۔ بدمستی لازمی تھی۔ رند، ثاقب اور صفی نے صفائے غزل کا علم اٹھانا چاہا تو زبان کے عزا خانوں کے ماتم کناں بن بیٹھے نتیجے میں غزل نوحہ و سلام بن گئی۔ ایسے میں اقبال نے جرأتِ رندانہ اور جوش قلندرانہ سے کام لیا اور اسے ایک نئی ڈگر پر لا کھڑا کیا۔ جس کے ایک طرف انقلابِ فکر و احساس تھا تو دوسری طرف پان اسلام ازم۔ غزل کا منظر نامہ بدلا۔ تیور نکھے اور رنگ گہرے۔ مگر ترقی پسندوں کے ایک طاقتور گروہ یعنی اشتراکی شعراء کو یہ بات پسند نہ آئی کیونکہ ان کے "قبلہ و کعبہ" کے خطبات تو اپنی انشراح و ابلاغ کے لیے نظم کا پیکر چاہتے تھے۔ لہٰذا ایک بار پھر "مارو مارو" کی صدا بلند ہوئی، اور اب کے پتھر اُن کے ہاتھوں میں تھے جو غزل کی سنگ ساری کی سند حاصل کرنے کے لیے اپنی معصومیت کا کوئی ثبوت عیسیٔ معنی کے سامنے فراہم نہیں کر سکتے تھے یوں غزل پر پیمبری وقت آ چکا تھا اور مسیحائی ضروری تھی۔ فیض چارہ گر ضرور بنے مگر انھیں یہ خوف بھی رہا کہ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، پھر ناحق ٹکڑے چُن چُن کر سجانے کا فائدہ؟ مجاز کا دل اس "شہناز لالہ رُخ" پر آیا ضرور مگر بہت جلد وہ آوارگی کا شکار ہو گئے۔ مخدوم رات بھر دیدۂ نم ناک میں اس عکس کو چھپائے رہے مگر صبح ہوتے ہوتے وہ بھی اشتراکی چمن کے منڈوے تلے جا بیٹھے پھر جذبی ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کیا کرتے۔ البتہ سردار جعفری نے غزل کی شاہزادی کے زخموں پر گاہے بگاہے مرہم ضرور رکھا مگر مکمل طور پر جاں نثاری و خود سپردگی کا اظہار وہ بھی نہ کر سکے کہ دل تو سلطانۂ نظم کی اداؤں کا اسیر تھا۔ ہاں اگر کوئی مسیحا بن کے اٹھا اور غزل کی جراحتوں کو گلہائے تزئین تبدیل کر گیا۔ تو وہ تھے مجروح سلطان پوری۔ جنھوں نے اپنے قدموں تلے پھیلی ہوئی روایت کی زمین کو چھوڑا اور نہ صرف نظریات کی ہوا میں معلق رہے۔ بلکہ سر اٹھا کر آسمان کو چھوتی، پھیلتی اور بڑھتی ہوئی غزل کی اُن شاخوں کی طرف بھی نظر کی جنھیں جدید فکر نے ہرا بھرا کر دیا تھا

ضربِ موسم تو پڑی، بندِ بہاراں تو کھلا

سچ ہے۔

راس آئے تو ہے چھاؤں بہت برگ و شجر کی
ہاتھ آئے تو ہر شاخ ثمر ریز بہت ہے

قصہ مختصر۔ مجروح کا یہ دعوا صحیح ثابت ہوا کہ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

غزل گویوں کا وہ قافلہ جو ترقی پسندوں کی راہوں سے ہوتا ہوا جدیدیت تک پہنچا ہے، اس میں مجروح کی غزل ایک سنگ میل ہی نہیں بلکہ نشانِ راہ بھی ہے لیکن یہ ہمارے منافقانہ تنقیدی رویے کا المیہ ہے کہ مجروح کو وہ پذیرائی نہیں مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ تبلیغ کی دُنیا میں، ایڈورٹائزنگ اور کمرشلائزنگ کے اس دور میں قبولیت کی اونچی نشستوں میں تمکن پانے کے لیے کسی پی۔آر۔ او کا ساتھ رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا غالب کے لیے نوحہ گر کا رکھنا ضروری تھا مگر ہر شخص کا یہ مقدور کہاں۔ اس نارسائی کا اعتراف تو خود مجروح نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"یہ تو درست ہے کہ میری پشت پر کوئی دستِ شفقت کبھی نہیں رہا۔ مجھے زندہ رکھا تو میرے غیر جانب دار سُننے اور پڑھنے والوں نے اور احباب کے منفی رویّے کے باوجود مجھے سُننے اور پڑھنے والوں نے خواہ وہ کسی طبقے سے ہوں، میری غزل کو کسی صنف سخن سے کم تر نہیں جانا۔ میرے کتنے ہی اشعار آج اردو دنیا والوں کی تحریروں میں دیکھے اور اُن کی زبانوں میں سُنے جا سکتے ہیں۔ البتہ وقت کی یہ ستم ظریفی ضرور رہی ہے کہ ان میں سے کئی اشعار دوسروں کے نام سے جانے جاتے ہیں"

("گفتنی، ناگفتنی"۔ پیش لفظ "مشعلِ جاں"، مطبوعہ ۱۹۹۱ء)

اپنے کلام کی مقبولیت کے تعلق سے مجروح سلطانپوری کے اس بیان کو "خودستائی" یا اپنی "صفائی"، پر اس لیے محمول نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی صداقت کا ثبوت سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" ہے اور سردار جعفری کے ہاں حرفِ صداقت کی بڑی اہمیت ہے۔ بقول اُن کے "صداقت ایک دانہ ہے جو زمین میں دفن ہونے کے بعد پھر اُگتا ہے اور ہزار دانوں میں تبدیل ہو جاتا ہے"

(حرفِ اوّل "پیراہنِ شرر")

مجروح کی غزل کا حُسن اور اس کی مقبولیت بھی ایک ایسی ہی صداقت ہے جس کا عدم اعتراف کی زمین میں دفن ہونے کے بعد پھر اُگنا لابدی تھا اور پھر ہزار دانوں میں تبدیل ہو جانا لازمی۔ صداقت کے ان دونوں میں سے ایک دانہ فربہ ملاحظہ ہو۔ سردار جعفری لکھتے ہیں۔

"میں نے ہندستان کے مختلف شہروں میں سیکڑوں مشاعروں میں نظمیں پڑھی ہیں اور تقریریں کی ہیں لیکن وہ ذوق وشوق اور وہ اثر نہیں دیکھا جو مزدوروں کے مجمع میں نظر آیا، مجروح سلطان پوری نے جب مزدوروں کے سامنے ایک غزل پڑھی...... تو وہ آپس میں باتیں کرنے لگے "مجروح بھی ہمارے شاعر ہیں"! جیسے مزدور اپنا شاعر کہہ دیں اس کی ذمّہ داریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے"

سردار جعفری کے اس بیان سے تین حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ شعر کے "خواص پسند" ہونے کے لیے، شاعر پر یہ ذمّہ داری عائد ہوتی ہے کہ

"گفتگو عوام سے ہو۔" شاید اسی لیے جعفری نے جہاں اپنے ہم عصروں میں سے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو رد کیا ہے یا ان کی تحریروں پر اعتراض کیا ہے وہیں مجروح کا اعتراف بلکہ تعریف کی ہے۔ دوسرے یہ کہ جب سردار جعفری مشاعروں میں پڑھی جانے والی نظموں کی بات کرتے ہیں تو یقیناً ان کا اشارہ ترقی پسندوں کی ان نظموں کی طرف ہے جو مزدوروں کا دل موہ لیتی تھیں۔ مگر ان کے مقابلے پر مجروح کی غزل کا عوام کو متاثر کرنا صرف غزل کی مقبولیت کا ضامن ہے بلکہ خود مجروح کی غزل گوئی کی کامیابی کا ثبوت بھی۔ سب سے بڑھ کر یہ نکتہ کہ مجروح کی غزل سن کر مزدوروں کا یہ فیصلہ کہ مجروح بھی ہمارے شاعر ہیں اس بات کی طرف اشارہ کناں ہے کہ مجروح نے یقیناً اپنی غزل میں ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار کیا ہوگا جو انھیں "اپنے" جذبات کی عکاسی محسوس ہوئی ہوگی۔ گویا مجروح نے یہ کر دکھایا کہ غزل کے فنی لوازمات کو برتتے ہوئے بھی نظریات و عقائد کی کامیاب اور عمدہ تبلیغ و ترسیل کی جا سکتی ہے بشرطیکہ شاعر کو الفاظ و اظہار پر گرفت و قدرت حاصل ہو۔ یہ بات کہنے کی جرأت اس لیے بھی ہوئی کہ جو غزل اس مشاعرے میں پڑھی گئی تھی اس کا یہ شعر خاص طور پر مزدوروں کی توجہ کا مرکز بنا۔

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

کسی مزدور نے "آبلہ پایانِ شوق" کے معنی سگریٹ کیس یا ماچس کی ڈبیا پر لکھ کر پوچھ لیے تھے۔ واقعی مجروح وہ آبلہ پائے دشتِ غزل ہیں جنھوں نے خار سے گل اور گل سے گلستاں بنانے کی ذمہ داری قبول کی اور اس میں کامیاب ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے نقادوں نے دانستہ ان کی غزل سے چشم پوشی کی اور ان کی کم سخنی کو فنی کم مائیگی پر محمول کیا جبکہ پاکستان میں فیض کے تعلق سے اس کے بالکل برعکس رویہ اپنایا گیا اور یوں ترقی پسند غزل کا سہرا فیض کے سر بندھ گیا، حالانکہ اس عروسِ سخن کے حقیقی نوشہ مجروح تھے۔ اور مزا تو یہ ہے کہ ہم نے بھی اس فیصلے کو خوشی خوشی قبول کر لیا کیونکہ ہم تو ہمیشہ ہی سے "گھر کی مرغی دال برابر" اور "باہر کی دال مرغی برابر" سمجھتے رہے ہیں۔ ہمارے یہاں تو جب کبھی کوئی بڑا شاعر پیدا ہوا ہے ہم نے اس کا تقابل باہر والوں سے کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ غالب کو نطشے کے مقابل، اقبال کو گوئٹے ملٹن اور دانتے کو شیکسپیئر کے مقابل رکھ کر ہم بڑے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اپنے ان شعراء کا مرتبہ متعین کر دیا اور حق ادا ہو گیا۔ مگر یہاں تو فیض کا معاملہ تھا جو نہ باہر کے تھے اور نہ "دال برابر"۔ اس لیے یہ کام آسانی سے ہو گیا۔

مجھے فیض کی غزل گوئی اور ان کے اس صدی کے بڑے شاعر ہونے سے قطعی انکار نہیں۔ میں ان کی زبردست معترف ہوں، اور اقبال اور جوش کے بعد

انھیں اپنے دور کا ایک بڑا شاعر تسلیم کرتی ہوں لیکن میرا دل چپکے چپکے اس بات کا بھی اقرار کرتا ہے کہ مجروحؔ کی غزل (نظموں سے قطع نظر) فیضؔ کی غزل سے کچھ آگے بڑھ گئی ہے حالانکہ دونوں شاعر ایک عہد کے، ایک تحریک سے منسلک، ایک سرزمین یعنی برّصغیر سے وابستہ، نظریاتی طور پر ایک ہی عقیدے سے منسوب ہیں۔ دونوں ہی کی شاعری غلام ہندستان سے شروع ہوکر آزادی اور مابعد اثرات کی نشان دہ۔ دونوں کے ہاں افسانۂ وطن اور قصۂ رنج و محن۔ اور اس افسانۂ وطن کا سفر دونوں کے ہاں تین پڑاؤ، تین مرحلوں یا تین ابعاد میں پھیلا ہوا، بٹا ہوا نظر آتا ہے اور وہ تین ابعاد ہیں۔ حدیثِ رخسار و دہن، داستانِ قفس و چمن اور حکایت دار و رسن۔ اس کے اظہار کے لیے دونوں کے ہاں ایک سی لفظیات، ایک سی تراکیب، ایک سے استعارے اور ایک سی علامات۔ مگر اس کے باوجود مجروحؔ کے ہاں شروع سے لے کر آج تک کہیں بھی غزل میں ایسے روایتی اشعار نہیں ملیں گے۔ جو فیضؔ کے ہاں موجود ہیں اور جنھیں فیضؔ اگر پہلے اڈیشن میں نہیں تو بعد میں حذف کر سکتے تھے۔ "نقشِ فریادی" کی دو غزلیں پیش ہیں۔ آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ یہ فیضؔ کے اشعار لگتے ہیں یا کسی مبتدی یا روایتی غزل گو کے؟

رازِ الفت چھپا کے دیکھ لیا   دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا
اور کیا دیکھنے کو باقی ہے   آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا
وہ مرے ہوکے بھی مرے نہ ہوئے   اُن کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

یا

پھر حریفِ بہار ہو بیٹھے   جانے کس کس کو آج رو بیٹھے
تیرے در تک پہنچ کے لوٹ آئے   عقل کی آبرو ڈبو بیٹھے
نہ گئی تیری بے رُخی نہ گئی   ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے

فیضؔ کے پہلے مجموعے "نقشِ فریادی" میں جہاں "رقیب سے" "تنہائی" "موضوعِ سخن" "چند روز اور مری جان" اور "کتے" جیسی نظمیں موجود ہیں، یہ کمزور غزلیں ایسی ہی گئی ہیں جیسی "غزل" اور "مشعلِ جاں" میں "قلم" کو چھوڑ کر مجروحؔ کی باقی نظمیں۔ جبکہ مجروحؔ کی ۴۵-۱۹۴۴ء کی یعنی ابتدائی دور کی غزلیں دیکھیے اور فیضؔ کی مندرجہ بالا غزلوں سے تقابل کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ فیضؔ نظم کے جتنے بڑے شاعر ہیں، اتنے غزل کے نہیں۔ جبکہ مجروحؔ مزاجاً نظم کے شاعر ہیں ہی نہیں، مگر غزل میں فیضؔ سے ضرور آگے بڑھ گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

مسرتوں کو یہ اہلِ ہوس نہ کھو دیتے   جو ہر خوشی میں ترے غم کو بھی سمو دیتے
بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لیے   ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے
بچا لیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ   کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

یا ـــ

ختم شورِ طوفاں تھا دُور تھی سیاہی بھی — دم کے دم میں افسانہ تھی مِری تباہی بھی
التفات سمجھوں یا بے رُخی کہوں اس کو — رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی
یاد کرو وہ دن جس دن تیری سخت گیری پر — اشک بھر کے اٹھی تھی میری بے گناہی بھی

اس میں شک نہیں کہ اُن کے شعری مجموعے کا نام "غزل" ہے۔ ایسی غزل جو بعد میں "مشعلِ جاں" بن جاتی ہے مگر وہ غزل جسے "سخن از زبانِ گفتن" کا نام دیا گیا ہے بہت کم نظر آتی ہے۔ مجروحؔ کے ہاں "حدیثِ رخسار و دہن" ضرور ہے، گیسوئے تاب دار کی بات بھی ہے، زلفِ گرہ گیر کی شام بھی موجود ہے اور گلعذار عارض کی صبح بھی۔ چشمِ مے گوں بھی ہے، تابشِ بدن بھی اور شعلۂ حنا بھی۔ کفر و ایماں کے جھگڑوں سے دُور پائے جاناں پر سجدہ کر آنے کی ہمت بھی۔ مگر وہ غزل کہیں نظر نہیں آتی جو بھری دوپہر میں کوٹھے پر ننگے پاؤں چلتی ہے۔ بالوں کو سکھانے کے بہانے بام پر آجاتی ہے یا زلفوں کو "سانپ" کہہ کر ڈراتی ہے اور نیم پردگی کے عالم میں چلمن سے لگ کر بیٹھ جاتی ہے۔ حالانکہ ان کی غزل میں صنفِ غزل کے تمام موضوعات، لفظیات اور استعارات و تشبیہات موجود ہیں۔ اس میں دشنہ و خنجر بھی ہے۔ بادہ و ساغر بھی اور شیشہ و پتھر بھی۔ ساقی بھی راہبر بھی، نغمہ و ساز بھی اور ایک محبوب دل نواز بھی۔ مگر یہ محبوب دل نواز سوائے ایک غزل کے کہیں بھی غزل کا روایتی محبوب بن کر نہیں آتا۔ ان کے پورے مجموعے میں صرف ایک غزل ایسی نظر آتی ہے جہاں کوئی نابالغ کم سن، کافر ادا، رہزنِ ہوش، پیکرِ حیا محبوب روایتی رومانی انداز میں شاعر کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر اسے تغزل کی وادی اور حسن و عشق کے نظاروں کی سیر کراتا دکھائی دیتا ہے مگر یہاں بھی مجروحؔ محبوب کا وہ رُوپ پیش کرتے ہیں جو ہم سفر یا شریکِ زندگی کا ہوتا ہے جس کے سہارے ازدواجی زندگی کا سفر آسان ہو جاتا ہے ؎

ترا ہاتھ، ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے
مجھے سہل ہوگئیں منزلیں، وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے
وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اُڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے
وہی بات جو وہ نہ کہہ سکے، مرے شعر و نغمہ میں آگئی
وہی لب نہ میں جنھیں چھو سکا، قدحِ شراب میں ڈھل گئے

ایسا لگتا ہے یہ غزل کسی مخصوص موقع اور کسی خاص جذباتی کیفیت میں کہی گئی ہے اور اس کے جملہ حقوق بحق شخصیتِ خاص محفوظ ہیں۔ یوں مجروحؔ کا سارا کلام اٹھا لیجیے، اِدھر اُدھر، کہیں بھولے بھٹکے، روایتی حسن و عشق کے قصے مل جائیں تو مل جائیں ورنہ ؎

آرزو ہی رہ گئی مجروحؔ ہم کہتے کبھی
اک غزل ایسی جسے تصویرِ جاناں نہ کہیں

مگر اس کے باوجود غزل مجروح کا مزاج ہے۔ اِن کا فن ہے اور انھیں اس کا اعتراف ہے۔

ادائے طولِ سخن کیا وہ اختیار کرے
جو عرضِ حال بطرزِ نگاہِ یار کرے

مجروح کی کم سخنی نے اپنے عہد کے سیاسی و انقلابی احساس کے اظہار کے لیے جو پیمانہ منتخب کیا وہ یہی "طرز نگاہ یار" والا پیمانہ تھا یعنی صنفِ غزل "طرز نگاہِ یار" اور "غزل" میں قدر مشترک ہے۔ مثلاً اختصار، اشاریت، رمزیت تاثر، تیزی اور گہرائی۔ مجروح نے اپنے عہد کے سیاسی تقاضوں کو رمزیت و اشاریت میں سمو کر انھیں استعاروں کی زبان دے دی ہے

وہ ایک بات ہے کہیے طلوعِ صبحِ نشاط
کہ تابشِ بدن و شعلۂ حنا کہیے۔
وہ ایک حرف ہے کہیے اسے حکایتِ زلف
کہ شکوۂ رسن و بندشِ بلا کہیے
پکار ہے کفِ قاتل کو اب معالجِ دل
بڑھے جو ناخنِ خنجر گرہ کشا کہیے
پڑے جو سنگ تو کہیے اسے نوالۂ رز
لگے جو زخم بدن پر اسے قبا کہیے
یہ کوئے یار، یہ زنداں، یہ فرشِ مے خانہ
انھیں ہم اہلِ تمنا کے نقشِ پا کہیے

یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ فیض نے ایک مدت تک محبوب کے چشم و زلف و رخسار کو موضوعِ سخن جانا اور پھر حقائقِ زندگی سے گھبرا کر محبوب سے یہ کہہ کر دامن چھڑا لیا کہ

ع مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

کیونکہ ع اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

اور اس طرح رومان سے انقلاب کی طرف بڑھ گئے۔ مجروح کے یہاں "اور بھی غم" کا برداشت کرنا اس لیے آسان ہو جاتا ہے کہ وہ اُسے غم جاناں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

اب کارگہِ دہر میں لگتا ہے بہت دل
اے دوست کہیں یہ بھی ترا غم تو نہیں ہے

وہ رومان کو انقلاب کی نذر نہیں کرتے بلکہ انقلاب کو رومان میں ڈبو کر زندگی کو حسین بنانے کی دعوت دیتے ہیں۔

اہلِ طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں موج کو گیسو، بھنور کو چشمِ جانانہ کہیں

دار پر چڑھ کر لگائیں نعرۂ زلفِ صنم — سب ہمیں باہوش سمجھیں چاہے دیوانہ کہیں
یارِ نکتہ داں کدھر ہے پھر چلیں اس کے حضور — زندگی کو دل کہیں اور دل کو نذرانہ کہیں
تھامیں اس بت کی کلائی اور کہیں اس کو جنوں — چوم لیں منہ اور اسے اندازِ رندانہ کہیں

یہی وہ اندازِ رندانہ ہے جو مجروح کی غزل کو سطحی بننے نہیں دیتا۔ ان کی غزل میں شروع سے لے کر آج تک سطحی عشق، سطحی حسن یا سطحی عاشق کہیں نظر نہیں آتا بلکہ عشق انھیں وہ بانکپن اور تمکنت عطا کرتا ہے جسے "کج کلاہی" کا نام دیا جا سکتا ہے اور جس کی مثالیں مجروح کے ہاں جا بجا بکھری ہوئی ہیں ؎

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ — اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ
ہجومِ دہر میں بدلی نہ ہم سے وضعِ خرام — گری کلاہ، ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

یوں مجروح کی غزل "حدیثِ رخسار و دہن" کے باوجود محض رخسار و دہن تک محدود نہیں بلکہ داستانِ قفس و چمن بھی سناتی ہے۔ وہ چمنستان کے مختلف استعاروں مثلاً قفس، اسیری، صیاد، فصلِ گل، صبا، شبنم، خار، نسیم، غنچہ وغیرہ کو نئے مفاہیم میں استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر "چمن" کا استعارہ ان کے ہاں مختلف معنوں میں آیا ہے مثلاً ؎

چمن ہے مقتلِ نغمہ اب اور کیا کہیے — بس ایک سکوت کا عالم جسے نوا کہیے
کہاں صحنِ چمن میں بات کوئے سرفروشاں کی — اِدھر سے سادہ رُو نکلے، اُدھر سے لالہ رنگ آئے
تو اے بہارِ گریزاں کسی چمن میں رہے — مرے جنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے
جو ٹھہری تو ذرا چلتے صبا کے ہمراہ — یوں بھی ہم روز کہاں سوئے چمن جاتے ہیں
اشکوں میں رنگ و بوئے چمن دور تک ملے — جس دم اسیر ہو کے چلے گلستاں سے ہم

حدیثِ رخسار و دہن اور داستانِ قفس و چمن سے ان کا شعری سفر کچھ اور آگے بڑھ جاتا ہے ؎

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن — دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

پھر مجروح کی فکر کا سب سے دلکش پڑاؤ آتا ہے جس کی طرف وہ یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اِک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

یہی وہ منزل ہے جسے مجروح کی غزل کا دل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ دار و رسن کا استعارہ بقول سردار جعفری "ترقی پسندوں کی خاص میراث ہے۔ ترقی پسند قبیلے میں سب سے پہلے وامق جونپوری نے اس علامت کو ایک نظم میں استعمال کیا"

؏ سوئے دار اور ابھی، اور ابھی، اور ابھی

فیض کی نظموں میں اس کی بہت خوب صورت مثالیں ملتی ہیں۔ ویسے ترقی پسندوں نے اپنے موقف کے اظہار کے لیے جو مخصوص استعارے وضع کیے یا

استعمال کیے ان میں مخدوم نے تیشہ، مجاز نے شمشیر و تیغ، سردار جعفری نے لہو اور مقتل فیض نے صلیب و دار اور مجروح نے دار و رسن اور زنجیر و زنداں کو اپنایا۔ نظموں سے قطع نظر، دار و رسن کا استعارہ فیض کی غزلوں میں بھی کہیں کہیں موجود ہے۔ مثلاً

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوتی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے
مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے
نہ رہا جنونِ رخِ وفا، یہ رسن یہ دار کروگے کیا
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہگار چلے گئے

مگر اس استعارے کو مجروح نے جس حسن و خوبی سے استعمال کیا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی ہے بلکہ اہل دار و رسن کے حوصلے بھی بلند ہوگئے ہیں۔ وہ فیض کی طرح اس سلسلے کو اپنی ذات پر ختم نہیں کرتے... بلکہ وآمق کی "سوئے دار اور ابھی، اور ابھی، اور ابھی" کی بصری تصویر کو غزل کے شعری پیکر میں سموتے ہوئے آنے والی نسل کو بھی ظلم کے خلاف سروں کا نذرانہ دینے کی تلقین فرماتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

شاعر کا کام بھی یہی ہے کہ وہ ماضی کا پیغامبر ہوتا ہے، حال کا نقیب اور مستقبل کا پیشین گو۔ مجروح نے دار و رسن کو ماضی، حال اور مستقبل کے خانوں میں یوں محفوظ کر لیا ہے۔

شبِ ظلم نرغۂ راہ زن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو
رخِ تیغ سے جو نہ ہو کبھی سحر ایسی کوئی نہیں مری
نہیں ایسی ایک بھی شام جو تہِ زلفِ دار بسر نہ ہو
لٹ گیا قافلۂ اہل جنوں بھی شاید
لوگ ہاتھوں میں لیے تارِ رسن جلتے ہیں
مصلوب ہوا کوئی سرِ راہِ تمنا
آوازِ جرس پچھلے پہر تیز بہت ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک جن مقاصد کو لے کے چلی تھی ان کی تبلیغ و تشہیر کے لیے خطیبانہ لب و لہجہ درکار تھا۔ غزل کی لطافت و نزاکت اور رمزیت و ایمائیت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی مگر مجروح کے مزاج کی کم سخنی نے غزل کو بھی ترقی پسند بنا دیا اور ایسی مسلسل غزلیں کہیں جو غزل کے دائرے میں رہ کر از مطلع تا مقطع ترقی پسند رجحانات کی حامل بلکہ مزدور کا ترانہ محسوس ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۹ء میں آرتھر روڈ جیل میں کہی ہوئی غزل جس کا مطلع ہے

آ نکل کے میداں میں دو رُخی کے خانے سے
کام چل نہیں سکتا اب کسی بہانے سے

عہد انقلاب آیا، دورِ آفتاب آیا — منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے
اب زمیں گائے گی ہل کے ساز پر نغمے — وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے
اہل دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم — اب گہر سبک ہوگا جو کے ایک دانے سے
منچلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن — اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانوں سے
میں کہ ایک محنت کش، میں کہ تیرگی دشمن — صبحِ نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے

یا ۱۹۵۰ء کی یہ غزل۔

اب اہل درد یہ جینے کا اہتمام کریں — اُسے بھلا کے غمِ زندگی کا نام کریں

پھر یہ اشعار دیکھیے کہ کہیں بھی مزدور یا کسان کا نام نہیں آتا مگر یہ کیا ان کے متعلق نہیں کہے گئے؟ لہجے کی غنائیت ملاحظہ ہو۔

دستِ منعم مری محنت کا طلب گار سہی — کوئی دن اور میں رُسوا سرِ بازار سہی
وہ جس کے گدازِ محنت سے پُر نور شبستاں ہے ترا — اے شوخ! اسی بازو پہ تری زلفوں کو پریشاں ہونا تھا
جو مٹی کو مزاجِ گل عطا کردیں وہ اے واعظ — زمیں سے دور فکرِ جنتِ آدم تو کیا کرتے
کہاں بچ کر چلی اے فصلِ گل مجھ آبلہ پا سے — مرے قدموں کی گل کاری بیاباں سے چمن تک ہے
مرے ہاتھ ہیں تو بنوں گا خود میں اب اپنا ساقیِ میکدہ — خُمِ غیر سے تو خدا کرے لبِ جام بھی مرا تر نہ ہو

مجروحؔ کی غزل کی یہی خوبی تو ہے کہ عصری تقاضوں کے بھرپور اظہار کے باوصف ان کے ہاں کلاسیکی رچاؤ اور روایت کا احترام موجود ہے۔ لسانی اعتبار سے وہ اس دبستان میں شمار کیے جاسکتے ہیں جس میں حافظؔ، غالبؔ، یگانہؔ، اقبالؔ اور فیضؔ شامل ہیں۔ انھوں نے فیضؔ کی طرح فارسی تراکیب میں نہ صرف ندرت سے کام لیا ہے بلکہ انھیں وسعت بھی عطا کی ہے۔ دونوں کی لفظیات اتنی ملتی جلتی ہیں کہ لہجہ الگ نہ ہو تو پہچاننا مشکل ہوجاتا کہ یہ شعر فیضؔ کا ہے یا مجروحؔ کا۔ اگر مجروحؔ کے بہت سے اشعار فیضؔ کے نام موسوم ہوگئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ہم عصر شعراء کے مشترکہ موضوعات اور یکساں لفظیات اکثر الحاق کا باعث بنتی ہیں۔ متقدمین کے ساتھ بھی ہوا ہے کہ میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے اشعار میں الحاق ہوگیا ہے۔

جمع کے صیغہ کے ساتھ دوہری تہری اضافی تراکیب فیضؔ کے ہاں بھی ملتی ہیں اور مجروحؔ کے ہاں بھی۔ مثلاً نازِ حریفاں، فکرِ نگاراں، منزلتِ سلسلہ داراں، بزمِ گہ لالہ عذاراں، ہنرِ زخم شعاراں، کفِ دستِ نگاراں، بے چارگیِ سینہ نگاراں، توقیرِ غمِ دامنِ نگہ ساراں، اس کے علاوہ ہنرِ ناخنِ جنوں، پئے شغلِ گریباں، قافلۂ ہم سفراں، غمِ لالہ رُخاں، رہبرِ کوتاہ خرام وغیرہ جیسی تراکیب بھی موجود ہیں۔ پھر مختصر مگر جدت سے بھرپور اضافی تراکیب بھی مثلاً ضربِ موسم، سیلِ رنگ، غیرتِ سنگ، دورِ زلیخائی وغیرہ۔ یا پھر حروفِ عطف سے بننے والی تراکیب مثلاً آتشِ و سبو، شعلہ بجام، جنّت بہ نگاہ، تسنیم بہ لب، فردوس بہ دُر وغیرہ۔ اس کے علاوہ تکِ اضافت کے ساتھ بننے والی تراکیب

مثلاً داغ پیرہنی، شعلہ نوائی، کم سخنی وغیرہ۔ یہ تمام تراکیب جو ترقی پسند غزل کا سرمایہ ہیں۔ یقیناً مجروح اور فیض ہی کی دین ہیں۔ ان میں بھی مجروح کا حصہ زیادہ ہے۔

مخصوص نظریات کے باوجود موضوع اور فن کا جو خوبصورت امتزاج مجروح کی غزلوں میں ملتا ہے، اس نے آنے والے غزل گویوں کے لیے اظہار خیال اور طرز ادا کی کئی پگڈنڈیاں روشن کردی ہیں۔ زیب غوری، مخمور سعیدی، نشتر خانقاہی، اسعد بدایونی، اور نوجوان شاعر عبدالاحد ساز انھیں پگڈنڈیوں کے راہرو کہے جاسکتے ہیں۔ مجروح نے صحیح کہا ہے کہ:

مری نوا کو ملی ہے وہ داغ پیرہنی — بہت ہی کم ہے تو خالِ رخِ بہاراں سے
ادھر بھی دیکھو تماشا ہے میری کم سخنی — ملے جو وقت نوا سنجیٔ ہزاراں سے

مانگے کا اُجالا

عمرِ عزیز یا عمرِ رائیگاں

نظیر صدیقی کی آپ بیتی کے وہ حصّے جو ان کی ادبی زندگی سے متعلق ہیں 'قدرے غنیمت ہیں کہ ان سے کم از کم یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ادیب بننے کے لیے آدمی کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ نظیر صدیقی کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ انھوں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ قدرت نے انھیں موزوں طبع نہیں بنایا تھا' اس لیے وہ شعر کہتے وقت عروض کا نہیں 'لفظوں کی تعداد کا خیال رکھا کرتے تھے۔ اگر شعر کے پہلے مصرعے میں دس لفظ ہوتے تھے تو دوسرے مصرعے میں بھی وہ گن کر دس لفظ لکھ دیتے تھے۔ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے کئی غزلیں لکھ ڈالیں۔ والد صاحب قبلہ کو جب معلوم ہوا کہ صاحب زادے شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں تو انھوں نے کسی استاد سے اصلاح لینے کا مشورہ دیا۔ معلوم ہوا کہ ایک پان فروش پان لگانے اور شعر کہنے میں استادانہ مہارت رکھتا ہے۔ نظیر صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی غزلیں دکھائیں۔ پان فروش شاعر نے کہا "آپ تو ایک مصرع بھی موزوں کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ آپ کی ساری غزلیں خارج از بحر ہیں۔ شاعری آپ کے بس کی بات نہیں کیوں کہ جو شخص پان لگانا نہ جانتا ہو وہ شعر نہیں کہہ سکتا۔"

یہ سن کر نظیر صاحب اپنے شاعرانہ مستقبل سے تو مایوس ہو گئے لیکن ہمت نہ ہاری اور چپکے چپکے غزل نویسی کا کام جاری رکھا اور بالآخر ایک مجموعہ بھی چھپوا دیا جس کا نام "حسرت اظہار" ہے جو ہر اعتبار سے اسم بامسمیٰ ہے کیونکہ اس میں "شاعری" شعر بننے کی حسرت لیے ہوئے نظر آتی ہے۔ نظیر صاحب کی جگہ اگر ہم ہوتے تو پان فروش کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے شاعری سے بعض آجاتے اور پان لگانے کے فن میں شاگردی اختیار کر لیتے۔ تاکہ زندگی تو آسودگی سے گذرتی۔

مذکورہ بالا حوصلہ شکن حالات کے باوجود نظیر صدیقی اپنی شاعری سے خاصے پر امید ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "کبھی میری شاعری کے ساتھ انصاف ہو سکا تو میرے کچھ اشعار بھی مجھے زندہ رہنے میں مدد

دیں گے" ممکن ہے اس پر بعض لوگ یہ کہیں کہ جب آپ نے خود اپنی شاعری سے انصاف نہیں کیا تو دوسروں سے اس کی توقع کیوں رکھتے ہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ نظیر صاحب کی شاعری سے اگر انصاف نہیں کیا جا سکتا تو کم از کم ان کی حوصلہ افزائی ضرور ہونی چاہیے۔ مگر ایسی حوصلہ افزائی کی بھی ضرورت نہیں جیسی بزرگ ادیب حمید نسیم نے کی تھی۔ پچھلے دنوں جب نظیر صدیقی نے اپنے مجموعہ کلام رائے کے لیے موصوف کو پیش کیا تو انھوں نے ورق گردانی کے بعد کہا "یہ تو آپ کی مشق ہے' جب آپ باقاعدہ شاعری کریں گے تو میں کوئی رائے دوں گا"

پان فروش کی تنبیہہ کے بعد نظیر صاحب نے کچھ عرصے افسانہ نگاری سے بھی شوق فرمایا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مشہور افسانہ نگار غیاث احمد گدی سے ان کی دوستی ہو گئی۔ غیاث گوالوں کے خاندان سے تھے اور دودھ کا کاروبار کرتے تھے۔ شام کے وقت وہ دونوں ہاتھوں میں دودھ کی بالٹیاں لے کر نکلتے تو اسی وقت نظیر بھی وہاں پہنچ جاتے۔ غیاث بالٹی انھیں پکڑا دیتے اور دونوں مل کر دودھ تقسیم کرتے۔ اس دوران میں ادب پر بھی کچھ گفتگو ہو جاتی۔ غیاث نے انھیں افسانے لکھنے کا مشورہ دیا اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ خود نظیر صاحب کی زبان سے سنیے۔ "دو ایک افسانے لکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ افسانہ نگاری میرے بس کی بات نہیں' قدرت نے کہانی کہنے کے سلیقے سے مجھے نہیں نوازا۔"

نظیر صدیقی نے یہ تو بتا دیا کہ انھوں نے افسانہ نگاری کیوں ترک کی۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ دودھ کی تقسیم کا کام کیوں چھوڑا۔ حالانکہ یہ خاصا منافع بخش کام پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔

شاعری اور افسانہ نگاری میں ناکامی کا الزام نظیر صاحب نے اپنے سر نہیں لیا اس کا ذمہ دار قدرت کو ٹھہرایا ہے' قدرت ہی نے انھیں موضوع طبع نہیں بنایا تھا اور قدرت ہی نے کہانی کہنے کے سلیقے سے محروم رکھا تھا۔ مگر خوشی کی بات ہے کہ موصوف قدرت کے اقدامات سے مایوس نہیں ہوئے اور انھوں نے تنقید نگاری کی طرف توجہ کرکے اس میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ گویا یہ ثابت کر دکھایا کہ جب بگڑا شاعر مرثیہ گو بن سکتا ہے تو شاعری اور افسانہ نگاری میں خستہ حال رہنے والا بھی تنقید نگار بن سکتا ہے۔

آپ بیتی پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر کی ادبی زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔ انھیں انتہائی صبر آزما حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ جس سے بھی ادب کے سلسلے میں رہنمائی کی درخواست کرتے وہ انھیں "ترک ادب" کا مشورہ دیتا۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "ایک صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ مجھے کچھ ادبی ذوق ہے تو فرمانے لگے آپ ادب میں کیا بننا چاہتے ہیں میں نے کہا یہ تو مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں' لیکن مجھے کچھ مضمون نگاری اور تنقید نگاری سے دلچسپی ہے۔ فرمایا مجنوں گورکھپوری کے ہوتے ہوئے تنقید نگاری [illegible]

کریں۔ ادب کی ہر صنف میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی گرد تک آپ نہیں پہنچ سکتے۔ اس طرح کی باتیں سن کر میرے سارے خواب بکھرنے لگتے اور جدوجہد کا حوصلہ پست ہو جاتا۔ لیکن میں یہ سوچ کر اپنی جدوجہد جاری رکھتا کہ آخر مجنوں گورکھپوری سے پہلے بھی تو شعروادب میں دیو پیکر ہستیاں موجود تھیں جب ان کے ہوتے ہوئے مجنوں صاحب ادیب اور نقاد بننے سے باز نہ آئے تو میں کیوں باز آؤں؟"

نظیر صدیقی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے صحیح فیصلہ کیا یہی وجہ ہے کہ ہم آج کہہ سکتے ہیں کہ مجنوں گورکھپوری کے بعد بھی ہمارے ادب میں کم از کم ایک دیو پیکر ہستی موجود ہے۔

نظیر صدیقی کی زندگی میں دو ایسے واقعات بھی گذرے ہیں جو انتہائی دردناک ہیں ان واقعات کو انھوں نے ایسے کربناک انداز میں بیان کیا ہے کہ سنگ دل سے سنگ دل قاری کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

پہلا واقعہ قرۃ العین حیدر سے متعلق ہے۔ ۱۹۸۶ء میں نظیر صدیقی ایک سیمینار میں شرکت کے لیے دہلی گئے۔ سیمینار کی کارروائی کے دوران کسی نے انھیں بتایا کہ ان کے قریب جو خاتون بیٹھی ہیں وہ قرۃ العین حیدر ہیں۔ اس کے بعد کا قصہ نظیر صاحب کی زبان حقیقت ترجمان سے سنیے۔ "میں نے ان سے سرگوشیوں میں اپنا تعارف کرایا اور ہال سے باہر چل کر گفتگو کی دعوت دی۔ انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اب سیمینار میں آگئی ہوں تو یہاں کی گفتگو سن ہی لوں۔ میں نے ان کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ انھوں نے اجلاس کے خاتمہ کے بعد مجھ سے گفتگو کو اپنا اخلاقی فریضہ نہ جانا۔"

ہمیں بھی قرۃ العین حیدر سے ایسے اخلاق جلالی کی توقع نہیں تھی۔ دہلی میں سیمینار تو آئے دن ہوتے رہتے ہیں نظیر صدیقی تو روز روز نہیں آتے۔ اگر وہ ہال سے اٹھ کر باہر چلی جاتیں اور نظیر صدیقی سے کچھ دیر ادبی موضوعات پر گفتگو کر لیتیں یا ان کی ایک آدھ غزل سن لیتیں تو اس میں ان کا کیا نقصان تھا؟ ہال سے باہر جانا ممکن نہیں تھا تو اجلاس کے دوران سرگوشیوں ہی میں پاک و ہند میں تنقید کے زوال پر گفتگو کر سکتی تھیں اور اگر یہ بھی ممکن نہیں تھا تو اجلاس کے خاتمے کے بعد تو وہ نظیر صاحب سے خوش خلاقی سے پیش آسکتی تھیں۔ افسوس ہندستان کی ایک بڑی ادیبہ نے ہمارے ایک بڑے ادیب سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ ہندستان والوں کی ایسی ہی باتوں کی وجہ سے پاک و ہند تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ دہلی کے سفر ہی کے دوران ایک فوٹو گرافر نے راجندر سنگھ بیدی سمیت کئی اہم ادیبوں کے ساتھ نظیر صدیقی کی تصویریں کھینچیں۔ ان تصویروں کا ایک

البم بنادیا اور اس البم کی قیمت طلب کی۔ نظیر صاحب مسافر تھے سفر کے دوران اس "عیاشی" کی گنجائش
کہاں نکل سکتی تھی۔ انھوں نے ادھار کھاتہ کھولنا چاہا مگر فوٹوگرافر سمجھدار تھا انھوں نے انکار کردیا نتیجہ
یہ نکلا کہ ایسی یادگار تصویریں فوٹوگرافر ہی کے پاس رہ گئیں۔ اس اندوہناک واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے
نظیر صاحب لکھتے ہیں "یہ سوچ کر نہایت افسوس بلکہ تکلیف ہوتی ہے کہ فوٹوگرافر کی ہٹ دھرمی کے
باعث میں اپنا ایک سرمایہ افتخار کھو بیٹھا۔" ہم تو سمجھتے تھے کہ نظیر صاحب نے اب تک جو ادبی کام کیا ہے
وہی سرمایہ افتخار ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ اصل سرمایہ افتخار تو وہ تصویریں تھیں جو راجندر سنگھ بیدی
وغیرہ کے ساتھ کھینچی گئیں۔

ہندستان کے سفر کا ایک اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ علی گڑھ میں نظیر صدیقی کی ملاقات مشہور ادیب
قاضی عبدالستار سے ہوئی۔ قاضی صاحب نہایت خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ نظیر صدیقی اس پر تبصرہ
کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میں نے آج تک قاضی عبدالستار پر دو جملے بھی نہیں لکھے لیکن اس کے
باوجود وہ مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوئے" گویا نظیر صدیقی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی ادیب کسی نقاد سے
مل کر خوش ہوتا ہے تو اس کا سبب لازماً یہ ہوتا ہے کہ نقاد نے اس کی تعریف میں کچھ نہ کچھ لکھا ہوتا ہے۔
اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تنقید دوسروں کو خوش کرنے کا ذریعہ ہے۔ نظیر صدیقی اگر قاضی
عبدالستار کے مزاج سے واقف ہوتے تو ایسا نہ لکھتے۔ قاضی صاحب کا خیال یہ ہے کہ جب کوئی نقاد کسی
موضوع پر ایک مرتبہ لکھ دیتا ہے تو وہ موضوع ہمیشہ کے لیے پامال ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے قاضی
صاحب ان نقادوں سے خوش رہتے ہیں جنھوں نے ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔

نظیر صدیقی کی آپ بیتی کے بارے میں ابھی اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے ایک
عمر چاہیے ہم نہیں چاہتے کہ ہماری عمر عزیز عمر رائیگاں میں بدل جائے۔ واضح رہے کہ نظیر صدیقی کی
آپ بیتی کا نام "عمر رائیگاں" نہیں کچھ اور ہے۔

(کتاب نما میں خامہ بگوش کا ایک کالم یا اس کی ایک قسط شائع کی جاتی ہے لیکن
محترم مظہر امام صاحب کی زبردست خواہش اور محبوب الرحمٰن فاروقی مدیر "آجکل" کی
سفارش پر "دشت ادب کی سیاحی" کو اسی ماہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

دشت ادب کی سیاحی

مظہر امام ہندستان کے ان چند گرامی ادیبوں میں سے ہیں جو بیک وقت شاعر اور نقاد ہونے کے

باوجود خاصے پڑھے لکھے ہیں۔ لیکن منکسرالمزاج اتنے ہیں کہ ادبی تحریروں سے اپنا علم کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھیں معلوم ہے کہ یہ زمانہ علم کی قدر کا نہیں لہٰذا بے بصارت لوگوں کے درمیان لعل و گوہر کی نمائش کا کوئی فائدہ نہیں۔ نمود و نمائش کو ویسے بھی وہ پسند نہیں کرتے یہاں تک کہ اپنی غزلوں کے مقطعوں میں تخلص کے استعمال سے بھی اجتناب کرتے ہیں اور اگر تخلص استعمال کرنا ہی پڑے تو "امام" کو لغوی معنوں میں باندھتے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک مقطع ہے۔

جہاں امام کے اعزاز میں ہے جلسہ عام
وہاں سے کوئے ملامت بھی کوئی دور نہیں

یہاں لفظ "امام" سے مراد کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے لیکن مظہر امام نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کے اعزاز میں کبھی کوئی جلسہ عام نہیں ہوا۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف جلسہ عام کے ذریعے ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کے لیے تو باقاعدہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ہندستان کی تین یونی ورسٹیوں (رانچی، بہار اور متھلا) میں ان پر تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں اور کئی یونی ورسٹیوں میں لکھے جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اتنی بہت سی یونی ورسٹیوں میں ایک ہی موضوع پر تحقیق سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہندستان میں موضوعات تحقیق کا قحط ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مظہر امام اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر محققوں میں بے حد مقبول ہیں اور ہر اعتبار سے اس لائق ہیں کہ ان پر تحقیق کی جائے اور بار بار کی جائے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندستان میں زندہ لوگوں پر تحقیق ہوتی ہے جو آداب تحقیق کے منافی ہے۔ تحقیق صرف ان پر ہونی چاہیے جو ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں، مرحومین پر تحقیق کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ کوئی مرحوم ادیب کسی محقق کو اپنے بارے میں معلومات فراہم نہیں کر سکتا جب کہ زندہ ادیب ہر ممکن مدد کر سکتا ہے، یہاں تک کہ محقق کی نااہلی کو دیکھتے ہوئے تحقیقی مقالہ خود لکھ کر دے سکتا ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تحقیق مرحومین پر ہونی چاہیے نہ زندہ ادیبوں پر بلکہ صرف زندہ جاوید ادیبوں پر تحقیق کو تحقیق کا موضوع بنانا چاہیے۔ ہمیں اس سے بھی اتفاق نہیں کیونکہ اس اصول پر عمل کے نتیجے میں ہر زندہ ادیب اپنے آپ کو زندہ جاوید سمجھنے لگا۔ ادب کی گردن پر زندہ ادیبوں ہی کا بوجھ ناقابل برداشت ہے، اگر زندہ جاوید ادیبوں نے بھی اسی شاخ نازک پر آشیانہ بنالیا تو صورت حال خاصی تشویشناک ہو جائے گی۔

معاف کیجیے بات ہو رہی تھی مظہر امام کی اور بیچ میں آگئے زندہ جاوید ادیب، حالانکہ مظہر امام کا اس قماش کے ادیبوں سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ ادب میں گروہ بندی کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے

نزدیک ادیب صرف ادیب ہوتا ہے زندہ جاوید یا مردہ بدست زندہ نہیں ہوتا۔

مظہر امام نے مختلف جہتوں میں ادب کی خدمت کی ہے، لیکن ان کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ وہ ایک نئی صنف ادب "آزاد غزل" کے بانی ہیں، صنف نازک کی طرح اس صنف میں بھی بڑی لچک پائی جاتی ہے۔ اس کے ہر شعر کا پہلا مصرع دوسرے مصرعے سے لمبائی میں کم یا زیادہ ہوتا ہے، دونوں مصرعے برابر اس لیے نہیں ہوتے کہ کہیں شعر بامعنی نہ ہو جائے۔

ہم نے مظہر امام کا مفصل تعارف اس لیے کرا دیا ہے کہ وہ ہندستان میں تو ظہوری ہیں، لیکن پاکستان میں بڑی حد تک خفائی ہیں۔ وہ ان ہندستانی ادیبوں میں سے نہیں ہیں جو مشاعروں اور انجمن سادات امروہہ کے سالانہ جلسوں کی رونق بڑھانے کے لیے آتے ہیں اور جن کے ناموں سے پاکستان کا بچہ بچہ واقف ہے اور بالآخر بچے ہی واقف رہ جائیں گے جہاں تک ہمیں معلوم ہے مظہر امام صرف ایک ہی دفعہ پاکستان آئے ہیں، چند برس پہلے وہ کراچی تشریف لائے تھے تو اس وقت ہنگاموں کی وجہ سے یہاں کرفیو نافذ تھا۔ ان کے اعزاز میں کوئی تقریب نہ ہو سکی، وہ چپکے سے آئے اور چپکے سے چلے گئے۔ اگر دو چار جلسے ہو جاتے تو ہمیں یہ تعارفی سطور نہ لکھنی پڑتیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مظہر امام کی کراچی میں آمد کے موقع پر کرفیو نافذ ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ ان کے اعزاز میں کوئی جلسہ نہ ہو سکے۔ واللہ اعلم بالصواب ــــــ

آمدم بر سر مطلب ــــــ چند روز ہوئے مظہر امام کی تازہ تصنیف "اکثر یاد آتے ہیں" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں جگر مراد آبادی، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، کرشن چندر، خلیل الرحمٰن اعظمی جیسے مشہور اور رشک امرتسری اور اختر قادری جیسے نسبتاً کم معروف ادیبوں کا تذکرہ ہے۔ جمیل مظہری، پرویز شاہدی اور اختر قادری کو مصنف نے قریب سے دیکھا ہے اس لیے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسے خاکہ نویسی کا بہت اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے مگر باقی مضامین طرح پر کہی گئی غیر طرحی غزلوں کا درجہ رکھتے ہیں یعنی عنوان تو بتایا ہے کسی شخصیت کو مگر جو کچھ لکھا ہے اس کا اس شخصیت سے کوئی تعلق نہیں، ادھر ادھر کی دلچسپ باتوں کے ساتھ عنوان کے حوالے سے بھی دو چار باتیں لکھ دی گئی ہیں۔ بعض مضامین کو پڑھ کر کسی ایسے مکان کا خیال آتا ہے جس کے دروازے پر تختی تو کسی اور کے نام کی ہو لیکن رہتا کوئی اور ہو۔ دوسروں کے ناموں کی تختیوں والے مکانوں میں ایک ہی مکین نظر آتا ہے اور وہ خود اس کتاب کا مصنف ہے۔

مظہر امام نے اس کتاب میں جتنا کچھ اپنے بارے میں لکھا ہے اتنا ان کے بارے میں نہیں لکھا جو انھیں اکثر یاد آتے ہیں۔ اگر اس کتاب میں شامل تمام مضامین کو شخصی خاکے تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مظہر امام نے آٹھ ادیبوں پر نہیں لکھا بلکہ ان آٹھ ادیبوں نے مظہر امام پر

مضامین لکھے ہیں۔ جگر مرادآبادی اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی وغیرہ بہت اچھے خاکہ نویس تھے۔ انھوں نے مظہرامام کی زندگی کے بہت سے ایسے واقعات بیان کیے ہیں جو کسی دوسرے کو معلوم نہیں تھے۔

جو لوگ اس کتاب کو شخصی خاکوں کا مجموعہ سمجھ کر پڑھیں گے ممکن ہے انھیں قدرے مایوسی ہو' لیکن مظہرامام کی آپ بیتی سمجھ کر پڑھنے والوں کے لیے اس کتاب میں دلچسپی کا خاصا سامان موجود ہے۔ دیباچہ نگار ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بقول مظہرامام نے اپنی پوری زندگی ادبی دشت کی سیاحی میں گذاری ہے' ممکن ہے ڈاکٹر نارنگ کے ذہن میں یہ بات ہو کہ مظہرامام نے بڑے سلیقے سے اپنی زندگی ضائع کی ہے' مگر ہمارا خیال یہ ہے کہ انھوں نے بہار اور کلکتے کی ادبی زندگی اور وہاں کے ادیبوں کے بارے میں اپنی یادداشتیں قلم بند کر کے ادیب مورخ کے لیے خام مواد فراہم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ لفظ "خام" کے استعمال سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے' اس لفظ کے ایک معنی خالص اور کھرے کے بھی ہیں اور ہم نے یہ لفظ انھی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

مظہرامام نے اس کتاب میں اپنے بارے میں نادر معلومات پیش کی ہیں' انھوں نے بتایا ہے کہ ان کی شاعری کا آغاز اس طرح ہوا کہ ایک رسالے میں یگانہ اور عزیز لکھنوی کی ہم طرح غزلیں چھپی تھیں' ان میں سے بہترین اشعار لے کر انھوں نے ایک غزل "بنائی" اور اپنے نام سے چھپوادی۔ ادبی ذوق کی آبیاری کی صورت یہ پیدا ہوئی کہ ان کے ماموں محکمہ ڈاک میں ملازم تھے' دوسروں کے نام جو ادبی رسالے آتے تھے وہ پڑھنے کے لیے بھانجے کو مل جاتے تھے ادبی خود اعتمادی اس طرح پیدا ہوئی کہ ایک رسالے میں ان کی اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظمیں آگے پیچھے چھپی تھیں جس شخص کی ادبی نشستوں میں یگانہ' عزیز لکھنوی' خلیل الرحمٰن اعظمی اور محکمہ ڈاک نے حصہ لیا ہو اس کے ادبی مستقبل کے روشن ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

کلکتے کی ادبی زندگی میں مظہرامام کو بقول خود پبلک ریلیشن آفیسر کی حیثیت حاصل تھی۔ انھیں شاعروں' ادیبوں سے ملنے' انھیں آپس میں ملانے اور مشاعروں میں شرکت کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ زیر نظر کتاب میں بے شمار مشاعروں کا تذکرہ ہے جن میں مظہرامام صاحب نے شرکت کی' جگر مرادآبادی کے بارے میں سنا ہے کہ وہ مشاعروں میں شرکت کے لیے مہینوں سفر میں رہتے تھے۔ مظہرامام ہر وقت حالت سفر میں نظر آتے ہیں' وہ ایسے موقعوں پر بھی مشاعروں کے انعقاد کی گنجائش پیدا کر لیتے تھے' جہاں عموماً غیر سنجیدہ اعمال سے اجتناب کیا جاتا ہے' مثلاً پرویز شاہدی کی شادی ہوئی تو مظہرامام نے براتیوں کے اجتماع کو مشاعرے میں تبدیل کر دیا' کئی شاعروں نے تہنیتی نظمیں پڑھیں' خود مظہرامام نے جو نظم پڑھی' اسے کاغذی رومال پر چھپوا کر تقسیم بھی کیا گیا۔ علامہ جمیل مظہری کا بیان

ہے کہ نظم خود دو لھا میاں نے مظہرامام کو لکھ کر دی تھی' موصوف نے اگرچہ اس بیان کی تردید کی ہے' لیکن ہمارا خیال ہے کہ جو شخص یگانہ اور عزیز لکھنوی سے غزل لکھوا سکتا ہے' اس کے لیے پرویز شاہدی سے نظم لکھوا لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

شادی کا ذکر چلا ہے تو یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ مظہرامام نے خود اپنی شادی پر بہت سے شاعروں سے تہنیتی نظمیں لکھوائیں اور ان کا مجموعہ "شاخ حنا" کے نام سے شائع کیا "برات عاشقاں برشاخ آہو" تو سنا تھا لیکن "شاخ حنا" کی ترکیب پہلی مرتبہ سننے میں آئی۔ شادی کی رعایت سے بہت عمدہ ترکیب ہے' اگر ہمیں اس کتاب کی اشاعت کا علم ہوتا تو ہم بھی تہنیتی نظم لکھ بھیجتے' اب تو اس کتاب کے دوسرے اڈیشن ہی میں ہماری نظم شامل ہو سکتی ہے۔

زیر نظر کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مظہرامام ادیبوں کے بے مثال خدمت گذار ہیں' جوش کلکتے آئے تو پرویز شاہدی نے ان کے اعزاز میں جام و مینا کی محفل سجائی مظہرامام نے اس میں ساقی گری کے فرائض انجام دیے' پرویز شاہدی ان سے نامہ بری کا کام لیتے تھے' اپنی محبوبہ کو انھی کے ہاتھ خط بھجواتے تھے' مگر جب ایک مرتبہ محبوبہ نے مظہرامام کی خوددمنی کی تعریف کی تو پرویز شاہدی نے احتیاطاً انھیں نامہ بری کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ کرشن چندر کلکتہ آکر بیمار پڑ گئے تو موصوف نے ساری رات جاگ کر ان کی تیمارداری کی' کبھی سر دبایا' کبھی پاؤں اور کبھی کمر' خلیل الرحمٰن اعظمی بیماری کے دوران تبدیلی آب و ہوا کے لیے کشمیر گئے تو وہاں ہمارے ہیرو نے کچھ خوش جمالوں سے ان کا تعارف کرایا تاکہ بیمار کا احساس جمال تازہ دم رہے' اور وہ جلد صحت یاب ہو جائے' ان سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مظہرامام زبان و بیان ہی کی صحت کا نہیں' اپنے ہم عصروں کی صحت کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔

مظہرامام دل کے بہت اچھے ہیں' کتاب میں جتنے لوگوں کا تذکرہ آیا ہے ان میں سے بیشتر کو اچھے لفظوں میں یاد کیا ہے' یہاں تک کہ خود اپنے آپ کو بھی بڑی محبت کی نظر سے دیکھا ہے۔ ہاں یہ احتیاط کی ہے کہ اپنے قلم کو براہ راست آلودہ مدح نہیں کیا' دوسروں نے جو تعریف کی ہے اسے نقل کفر کفر نہ باشد کے مصداق نقل کر دیا ہے اس سلسلے میں اخباری کالموں اور رپورٹوں کے وہ اقتباسات بطور خاص توجہ کے مستحق ہیں جن میں مظہرامام کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ اس قسم کے اقتباسات کتاب میں شامل کر لیے گئے ورنہ شائقین کو اصل اخبارات تلاش کرنے میں خاصی دقت ہوتی۔

مجتبیٰ حسین

غالب نے خود اپنے دیوان کا سرورق بنایا

جناب عبدالحمید صاحب کی عظیم خدمات

غالب اکیڈمی کے سکریٹری ذہین نقوی نے پچھلے ہفتہ ہمیں ایک پیکٹ دیتے ہوئے کہا "قبلہ حکیم عبدالحمید صاحب" چانسلر ہمدرد یونی ورسٹی و بانی غالب اکیڈمی نے آپ کے لیے یہ تحفہ بھجوایا ہے۔ ہم نے پیکٹ کو ہاتھ میں لے کر اسے کھولے بغیر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس میں ہے کیا۔ شربت روح افزا ہے یا سنکارا، طمینہ ہے یا جوشینا، سُعالین ہے یا دماغین، پچنول یا صافی۔ مگر پیکٹ کی بناوٹ کچھ ایسی تھی کہ اس میں ان اشیا کے موجود ہونے کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔

ہمارے کچھ دوست بھی وہاں موجود تھے ان میں سے ایک نے پیکٹ کو ہاتھ میں لے کر کہا "ہوسکتا ہے اس میں معجون شباب آور ہو" ہم نے ہنس کر کہا "حکیم صاحب طبیب حاذق ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہمیں معجون شباب آور کی حاجت نہیں ہے کیونکہ ہم نے ساری زندگی ایک خاتون حجاب آور کے ساتھ گزاری ہے۔

جب جستجو بڑھی تو ہم نے پیکٹ کو کھولا اور اس میں سے طب یونانی کا کوئی نسخہ برآمد نہیں ہوا بلکہ دیوانِ غالب کا وہ نسخہ برآمد ہوا جسے حکیم عبدالحمید صاحب نے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے ادارہ "غالب اکیڈمی" کی جانب سے شائع کیا ہے۔ غالب اردو کا غالباً اکیلا شاعر ہے جس کے دیوان کے سیکڑوں اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اکثر اہلِ علم ادب کی رسائی اس کے کئی شعروں کے معنی و مفہوم تک نہ ہوسکی۔ غالب زندگی بھر اپنے فارسی کلام پر ناز کرتا رہا لیکن اس کی بے پناہ مقبولیت کا سبب اس کا اردو دیوان ہی ٹھہرا۔ خود ہمارے پاس "دیوان غالب" کے چھے مختلف اڈیشن موجود ہیں۔ غرض "دیوان غالب" اردو کی ایک ایسی کتاب ہے جو کسی گھر میں موجود نہ ہو تو گھر یوں نامکمل لگتا ہے جیسے اس گھر کی کوئی بنیاد ہی نہ ہو یا اس کے کوئی در و دیوار ہی نہ ہوں۔

اور باتوں سے قطع نظر "غالب اکیڈمی" کے دیوان غالب والے اڈیشن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ترتیب و تزئین میں زیادہ تر "مرحومین" نے ہاتھ بٹایا ہے۔ ایک مرحوم تو خود مرزا غالب ہیں۔ جنھوں نے بہ نفس نفیس دیوان غالب کے اس اڈیشن کا سرورق بنایا ہے۔ حکیم صاحب کو کہیں سے غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر "دیوان غالب اردو" مل گئی۔ جسے انھوں نے سرورق پر چھاپ دیا ہے اور اس کے ساتھ شاہ کا [illegible]

"اسد اللہ خاں غالب" بھی چھپا ہے۔ یوں غالب
کو اپنے مرنے کے پورے سوا سو برس بعد خود
اپنے دیوان کا سرورق بنانے کا اعزاز حاصل
ہوا ہے۔ دوسرے مرحوم ماہر غالبیات جناب
مالک رام ہیں۔ جنھوں نے اپنی عمر کے آخری حصہ
میں اس اڈیشن کی تالیف اور ترتیب کے سارے
مرحلے طے کیے اور تیسرے مرحوم مشہور زمانہ
خطاط خلیق ٹونکی ہیں جنھوں نے اپنے خونِ جگر
سے اس اڈیشن کی کتابت کی اور اسے مکمل کرنے
کے بعد ہی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ گویا یہ
اڈیشن ہمیشہ کے لیے ان مرحومین کی یاد دلاتا
رہے گا۔ دیوانِ غالب کا ایسا دیدہ زیب اور
ایسا خوبصورت اڈیشن شائع کرنا حکیم عبدالحمید
صاحب کا عظیم کارنامہ ہے۔ غالب اس اعتبار
سے اردو کے خوش بخت شاعر ہیں جنھیں حکیم
عبدالحمید صاحب جیسا معتقد اور مداح نصیب
ہوا۔ حکیم صاحب ہمارے بھی کرم فرما ہیں ماشاءاللہ
۸۶ برس کے ہو چکے ہیں۔ لیکن ان ۸۶ برسوں میں
انھوں نے جو کام کیا ہے اور جن نامساعد حالات
میں کام کیا ہے اسے پورا کرنے کے لیے
اگر کسی کو چھے سو برس کی عمر بھی عطا ہو جائے تو
وہ شاید نہ کر پائے۔ حکیم صاحب کو ہم نے جب
بھی دیکھا مصروف ہی دیکھا۔ جس پھرتی اور
توانائی کے ساتھ وہ آج بھی کام کرتے ہیں
اسے دیکھ کر ہم جلیسوں کی عقل دنگ رہ جاتی
ہے۔ ان کے کام کا دائرہ بھی نہایت وسیع ہے
ہمدرد دواخانہ کی مصروفیات تو ہیں ہی۔ تغلق آباد
میں ایک وسیع قطعہ اراضی پر انڈین انسٹی ٹیوٹ
آف اسلامک اسٹڈیز ان کی رہنمائی میں کام
کر رہا ہے۔ ہمدرد یونی ورسٹی بھی یہیں کام
کر رہی ہے۔ جس کے چانسلر خود حکیم صاحب ہیں
ان کی زیرِ نگرانی کئی اسکول کام کر رہے ہیں
آئی اے ایس کے لیے مسلم امیدواروں کو تیار
کرنے کی غرض سے کوچنگ سینٹر بھی کام کر رہا
ہے۔ جناب ایک وسیع اراضی پر "تعلیم آباد" بھی بن
چکا ہے۔ بستی حضرت نظام الدین میں غالب کے
مزار کے برابر "غالب اکیڈمی" بھی کام کر رہی
ہے۔ جس کے وہ بانی ہیں اور جس کا افتتاح
اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین
نے ۲۲ فروری ۱۹۶۹ء کو کیا تھا۔ یہ ادارہ دلی کی
علمی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔

حکیم عبدالحمید صاحب نے کبھی مسلمانوں کا
لیڈر ہونے کا دعوا نہیں کیا۔ وہ نہایت خاموشی
کے ساتھ کام کرنے کے عادی ہیں۔ ان کا
شمار ان سیاسی رہنماؤں میں نہیں کیا جا سکتا جو
مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے آگے
بڑھتے ہیں تو قوم کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے کو نکل
جاتے ہیں۔ ایسے رہنما مسائل کو حل نہیں کرتے
بلکہ نئے مسائل پیدا کرتے ہیں۔ حکیم صاحب
نے بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی بساط کے مطابق
(جو اتفاق سے کافی وسیع ہے) مسلمانوں کی تعلیمی
پسماندگی کو دور کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ پیشے
کے اعتبار سے وہ طبیب ہیں اور قوم کی نبض کو
دیکھ کر انھوں نے جو علاج اور نسخہ تجویز کیا
ہے وہ تیر بہدف ہے۔ ہماری دانست میں
ان کی حیرت ناک صحت کا راز یہ ہے کہ انھوں
نے غالباً کبھی اپنے ہی ہمدرد دواخانہ کی بنائی
ہوئی کوئی دوا استعمال نہ کی ہوگی۔ ہم نے کبھی
حکیم صاحب کو پانی پیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ صبح
میں ایک بار پانی پیتے ہیں تو پھر شام میں ہی اس
کا استعمال کرتے ہیں۔ کھانا بھی وہ صرف رات
کو کھاتے ہیں۔ صبح میں ہلکے سے ناشتے سے کام

چلاتے ہیں۔ کیسی ہی پُر تکلف دعوت کیوں نہ ہو حکیم صاحب کا ہاتھ کسی مرغن غذا کی جانب کبھی نہیں بڑھتا۔ مرغن غذاؤں کے سامنے وہ اکثر چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں۔ حکیم صاحب کی حسِ مزاح بھی بہت تیز ہے۔ دس بارہ برس پہلے ہم نے خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب کے کہنے پر اپنے دوست ذہین نقوی کا ایک خاکہ غالب کے خط کی پیروڈی کے طور پر لکھا تھا۔ اس میں دو چار جگہوں پر حکیم صاحب کا بھی ذکر آگیا تھا۔ سوچا کہ کہیں وہ اس ذکر سے ناراض نہ ہوجائیں۔ مگر اس ذکر پر وہ سب سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہوئے پائے گئے۔ اس محفل کی صدارت ماہرِ غالبیات مالک رام مرحوم کر رہے تھے۔ ہم نے اس خاکہ میں غالب کی طرف سے یہ جملہ بھی لکھا تھا کہ "کبھی کبھی تمھاری زمین پر دوبارہ پیدا ہونے کو جی چاہتا ہے۔ بارے کبھی دوبارہ جنم ہوا تو غالب ہرگز نہیں بنوں گا۔ ماہرِ غالبیات بننا چاہوں گا کیونکہ اس میں بڑے فائدے ہیں۔ تم اس پر ہنسو گے۔ غالب ہوتے تو ہرگز نہ ہنستے" اور ان جملوں کی سب سے زیادہ داد مالک رام صاحب نے ہی دی تھی۔ بلکہ اسے بار بار پڑھوایا تھا۔ البتہ حکیم صاحب خیالِ خاطرِ احباب کے باعث ان جملوں پر خاموش رہے۔ حکیم صاحب سے ہمیں جو عقیدت ہے اس کے پیشِ نظر ہم نے دو ایک بار کچھ فرضی بیماریوں کا بہانہ بنا کر ان سے اپنا طبی معائنہ بھی کروایا ہے۔ ہماری نبض کو پکڑ کر ہنستے ہوئے کہا تھا "آپ جس بیماری کا ذکر کر رہے ہیں اس کا ذکر آپ کی نبض نہیں کر رہی ہے۔ آپ میں اور خود آپ کی نبض میں خاصا اختلافِ رائے موجود ہے۔" اب ہم انھیں کیا بتاتے کہ ہمدرد دواخانہ کی لذیذ اور ذائقہ دار دوائیں مفت کھانے کی چاٹ میں ہم ان فرضی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

بہرحال حکیم صاحب نے اب "دیوانِ غالب" کا نسخہ ہمارے لیے تجویز کر کے ہماری ساری بیماریوں کا علاج کر دیا ہے۔ "دیوانِ غالب" کے اس اڈیشن کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں چغتائی اور صادقین کی بنائی ہوئی دو تصویریں بھی شامل ہیں۔ برجندر سیال نے ہندستان بھر سے وضع وضع کے پتھروں کے ٹکڑے جمع کیے ہیں جن سے غالب کے اشعار کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان میں سے دو کے فوٹو بھی اس دیوان میں شامل ہیں۔ اکیڈمی کے موجودہ نسخہ کی بنیاد اس دیوانِ غالب پر رکھی گئی ہے جو جون ۱۸۶۲ء میں مطبعِ نظامی کانپور سے چھپا تھا۔ یہ غالب کا اپنا مصدقہ متن ہے۔ اس میں ہمیں غالب کے بعض اشعار میں تبدیلیاں بھی نظر آئیں۔ آپ بھی نوٹ فرمالیں اور ہوسکے تو تصحیح فرمالیں۔

دوست غم خواری میں میری سعی فرماویں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آویں گے کیا

اس شعر کو عام طور پر اس طرح پڑھا جاتا ہے۔

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

ایک اور شعر ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مصرع ثانی کو عام طور پر یوں پڑھا جاتا ہے

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

جبکہ عام طور پر اس شعر کا مصرع ثانی اس طرح پڑھا جاتا ہے۔

تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہوگئیں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

جبکہ عام طور پر مصرع ثانی کو اس طرح پڑھا جاتا ہے۔

آنے کا وعدہ کر کے آئے جو خواب میں

حکیم صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے دیوان غالب کی اشاعت کے ذریعہ اردو دنیا کو ایک بیش قیمت تحفہ دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس تحفہ کی قیمت ۱۵۰/ روپیا ہے اور اسے غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی ۱۳ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

عبدالقوی دسنوی
نعمت پورہ ۴۳-پرنس کالونی عیدگاہ ہلز بھوپال-۱

دیدہ وشنیدہ

(ایک دیدہ ور کی خودنوشت)

"دیدہ و شنیدہ" "ایک ایسے باعمل انسان، فرض شناس معلم، قدردان علم و ادب، خدمت گزار ملک و ملت، ماہر تعلیم، صاحب قلب و نظر کی آپ بیتی ہے جسے لوگ اسے اپنے نام شہاب الدین سے کم اور دسنوی کے نام سے زیادہ جانتے ہیں۔ سید شہاب الدین دسنوی کی پیدائش آج سے ۸۰-۸۱ سال قبل صوبہ بہار کے تاریخی مقام نالندہ سے قریب ایک مردم خیز گاؤں دسنہ میں ۶ر جولائی ۱۹۱۳ء میں ہوئی تھی۔

اس گاؤں کے حصے میں شہرت اس لیے نہیں آئی کہ اس کا تعلق دولتمندوں سے تھا یا یہ سیاست دانوں کا گڑھ تھا یا تجارت کے میدان میں اہمیت رکھتا تھا بلکہ اس کی شہرت یہاں کی تعلیم یافتہ آبادی اور علمی، ادبی، تعلیمی خدمات کی وجہ سے تھی، اس چھوٹی سی بستی نے جہاں بے شمار ڈاکٹر، انجینئر پیدا کیے وہاں اس نے مدارس، اسکولوں اور کالجوں کے لیے اچھے اور درد مند اساتذہ دیے۔ علامہ سید سلیمان ندوی جیسے عالم دین، ماہر اسلامیات، مورخ، محقق، مصنف کی جائے پیدائش یہی بستی ہے۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی جیسے صاحب قلم، پروفیسر سید سعید رضا جیسے مخلص اور فرض شناس استاد، پروفیسر سید ابو ظفر ندوی جیسے عالم و مورخ، بشیر الحق دسنوی جیسے اقبال کے قدرداں، سید صباح الدین عبدالرحمن جیسے مورخ، محقق، مصنف کا تعلق اسی گاؤں سے تھا، ان سے الگ اردو کی ایک چھوٹی لیکن نہایت قیمتی لائبریری اس کی آغوش میں پروان چڑھ کے کتب خانہ الاصلاح دسنہ بنی تھی، جس نے ڈاکٹر راجندر پرشاد، مولانا شوکت علی، مولوی عبدالحق، حبیب الرحمن خاں شروانی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا عبدالماجد دریابادی جیسی اہم شخصیتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ یہاں ایک اسٹوڈنٹس کانفرنس وجود میں آئی تھی جس نے یہاں کے طلبہ میں لکھنے پڑھنے اور کچھ کرنے کا جذبہ بیدار

کرنے کی کوشش کی' مختلف انداز سے ان کی ذہنی تربیت بھی کی اور تنظیمی صلاحیت بھی پیدا کی اور اسپورٹس سے بھی رغبت دلائی۔

بزرگوں کی انجمن الاصلاح نے بستی میں اتحاد و اتفاق' بچوں کی تعلیم و تربیت' معاشی اور معاشرتی میدان میں ایک دوسرے کا معاون اور مصائب و مشکلات میں ایک دوسرے کے لیے مددگار اور رنج و غم میں ایک دوسرے کا غم گسار بنانے کی کوشش کی۔

سید شہاب الدین دسنوی نے اسی بستی کے خوشگوار' ساز گار اور صحت مند ماحول میں آنکھیں کھولیں ان کا بچپن یہیں گزرا' ذہنی اور فکری تربیت یہیں شروع ہوئی۔ تعلیم کی بارگاہ میں پہلا قدم یہیں رکھا۔ اسکول کی تعلیم مونگیر میں پائی' کالج کی تعلیم پہلے پٹنہ پھر کلکتہ میں ہوئی۔ بی ایس سی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تو پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے انھیں بمبئی بلالیا' جہاں انجمن اسلام ہائی اسکول میں بحیثیت استاد عملی زندگی کی ابتدا کرنے کا موقع ملا' ۱۹۴۰ء میں اپنی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے پرنسپل بنادیے گئے۔ پھر مئی ۱۹۴۴ء میں صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کی ذمہ داری بحیثیت پرنسپل انھیں سونپ دی گئی۔ جسے نہایت ہوشمندی اور دلچسپی کے ساتھ خوب سے خوب تر بنانے میں مصروف ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کامیابیاں اور نیک نامیاں ان کے قدم چومتی رہیں۔

دسنوی صاحب اپنی ملازمت کے دوران میں انجمن اسلام کے سکریٹری بنائے گئے۔ صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کو پالی ٹکنک بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ بمبئی کارپوریشن کے انتخاب میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے شاندار کامیابی حاصل کی۔ امریکہ کا سفر کیا۔ لندن اور استنبول گئے۔ حج کیا۔ ترکی اور پاکستان بھی دیکھا۔ ۳۰ر جون ۱۹۷۳ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں انجمن اسلام سے علاحدگی اختیار کی اور پٹنہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

دسنوی صاحب نے اپنی پوری زندگی نہایت عزت اور وقار کے ساتھ گزاری۔ بمبئی نے انھیں بڑی نیک نامی' عزت' مقبولیت اور شہرت عطا کی۔ وہ اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں کے ساتھ بمبئی شہر کی علمی' ادبی' تعلیمی اور سماجی زندگی سے گہرا تعلق رکھتے تھے اور ہر محفل میں نہایت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ بمبئی میں یہ ان کی مقبولیت اور محبوبیت ہی تھی کہ ایک مثالی استاد ہونے اور سیاست سے دور کا بھی تعلق نہ رکھنے کے باوجود بمبئی کارپوریشن کے انتخاب میں کانگریس اور دوسری طاقتور سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے شاندار کامیابی حاصل کی۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ دسنوی صاحب کو اس انتخاب کے کڑے مقابلہ میں اپنی جیب سے کُل چھتیس روپے خرچ کرنے پڑے تھے۔ جب کہ دوسروں نے ہزاروں ہزار کی بازی لگادی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دسنوی صاحب کے ساتھ مخلصوں اور قدردانوں کا جمگھٹا تھا' جنھوں نے جی جان سے ان کی کامیابی کی کوشش کی

تھی۔

انتخاب میں ایسی نمایاں کامیابی کے بعد سیاسی جماعتوں میں سے بعض نے خواہش کی تھی کہ دسنوی صاحب ان کی سیاسی جماعت میں شامل ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے کیا کیا وعدے کیے گئے ہوں گے اور کن کن مراعات سے فیضیاب ہونے کی امیدیں بندھائی گئی ہوں گی۔ لیکن یہ ان کی فکر کی بلندی، مزاج کی سادگی، کردار کی پختگی، تعلیم سے دلچسپی اور فرائض منصبی سے رغبت تھی کہ نہایت حقارت کے ساتھ انھوں نے ان نعمتوں سے منھ موڑ لیا جن کی طرف دنیا دوڑتی ہے اور جنھیں حاصل کر کے اتراتی پھرتی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ مشہور رہنمایان قوم سے ان کے بہت اچھے تعلقات رہے۔ علمی ادبی دنیا میں بھی بمبئی اور اس کے باہر کے بے شمار ادیبوں شاعروں عالموں اور ماہرین تعلیم سے نہ صرف ان کے نہایت خوشگوار تعلقات رہے بلکہ وہ ان کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں اور اکثر معاملات میں ان سے تعاون بھی چاہتے رہے ہیں۔

دسنوی صاحب کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ تحریر و تقریر میں دونوں زبانوں کے استعمال میں انھیں ملکہ ہے اس لیے دونوں زبانوں میں ان کی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔

کانجی دوارکاداس نے ہندستان کی آزادی کی داستان دو جلدوں میں قلمبند کی تھی۔ دسنوی صاحب نے اس کتاب میں جہاں جہاں محمد علی جناح کا ذکر تھا انھیں یکجا کر کے انھیں اردو کے قالب میں ڈھالا اور نہایت مربوط شکل میں "محمد علی جناح" کے نام سے کتاب شائع کرائی جو مقبول ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور دسنوی صاحب کی فکری عظمت، ذہنی پاکیزگی اور کردار کی پختگی کی پہچان بن گئی۔

بہت کم لوگ واقف ہیں کہ ایام جوانی میں دسنوی کو افسانہ لکھنے سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ ان کے کئی افسانے رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ یہ افسانے "پہلو بہ پہلو" کے نام سے کتابی صورت میں مکتبہ جامعہ دہلی سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئے ہیں۔ اس میں مصنف کا نام سید شہاب الدین کے بجائے "شہاب عظیم آبادی" ہے اس لیے کہ یہ افسانے اسی نام سے شائع ہوئے تھے۔

بچوں کی تعلیم سے دسنوی صاحب کو ہمیشہ قلبی لگاؤ رہا ہے اس لیے "بچوں کی پہلی کتاب" کے علاوہ اسلامی عقائد اور بنیادی اسلامی معلومات کی روشنی میں "ہمارا دین" نام سے ایک اہم کتاب شائع کی تاکہ مسلمان بچوں کی ذہنی تربیت ابتدا ہی سے اچھی ہو۔

دسنوی صاحب چونکہ سائنس کے طالب علم رہے ہیں اور اس سے دلچسپی بھی لیتے رہے ہیں اس لیے انھوں نے "کیمیائی کہانی" اور "آئنسٹائن کی کہانی" لکھ کر سائنس سے لگاؤ رکھنے والوں کے لیے مفید اور دلچسپ کتابوں کا اردو میں اضافہ کیا ہے اور سائنس کا قرض ادا کیا۔

انجمن اسلام کے صد سالہ جشن کے موقع پر ۱۹۸۶ء میں دسنوی صاحب کی کتاب "انجمن

اسلام کے متوسل" آئی جوان کی انجمن اسلام سے گہری وابستگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔
" ایک نہایت مفید کتاب "شبلی۔ معاندانہ تنقید کی روشنی میں" ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی ہے جس نے شیخ محمد اکرام، محمد امین زبیری اور ڈاکٹر وحید قریشی کی علامہ شبلی کی شخصیت کو نقصان پہنچانے کی سازش کو ناکام بنانے میں بڑی مدد کی۔ اس کتاب کو شبلیات میں ایک اہم اضافہ سمجھا جاتا ہے۔
۱۹۸۸ء میں دسنوی صاحب نے انجمن اسلام کی خواہش سے سیرت پر انگریزی میں PROPHET MUHAMMAD-BLESSING TO MANKIND کے موضوع پر خطبہ دیا جو اس تقریب میں چھاپ کر تقسیم کیا گیا تھا۔
دسنوی صاحب کی علمی، ادبی، تعلیمی اور سماجی خدمات کا تقاضا تو یہ تھا کہ کوئی ادارہ ان سے متعلق نمبر نکالتا، کوئی ان پر کتاب شائع کرتا، عام چلن کے مطابق کسی یونیورسٹی سے ان پر تحقیقی کام ہوتا، لیکن دسنوی صاحب کے مزاج کی سنجیدگی اور سادگی نے انھیں ان سے دور رکھا۔ اپنی طبیعت کے اسی رجحان کی وجہ سے نہ کبھی وہ سستی شہرت کی طرف دوڑے، نہ کسی گروہ سے متعلق ہوئے، نہ انھوں نے سیاستدانوں کو منہ لگایا بلکہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے مزاج کے مطابق سنجیدہ علمی، ادبی، تعلیمی اور سماجی کاموں میں مصروف رہے اور جب ذرا فراغت پائی تو اپنے حالات زندگی نہایت سادگی، عاجزی اور انکساری کے ساتھ قلمبند کردی اور نہایت خاموشی کے ساتھ شائع کردی۔ جس میں کہیں بھی سطحی خودنمائی نہیں ہے نہ داستانوں کی سرحدوں میں داخل ہونے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ سیدھی سادی زندگی کے سچے واقعات بڑائی جتانے کے لیے نہیں بلکہ حقائق سے آگاہ کرنے کے لیے پیش کردیے گئے ہیں۔
یہ کتاب ایک معلم کی زندگی کی کہانی ہے جس میں ایک مفکر کے شب و روز ہیں، ایک ماہر تعلیم کے افکار و خیالات ہیں ایک سچے خدمت گذار کے جذبات و احساسات ہیں، زبان سادہ، خیالات پاکیزہ، انداز عالمانہ ہے لیکن کتاب مختصر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دسنوی صاحب نے تفصیل میں جانے سے دانستہ گریز کیا ہے، ورنہ اس میں بہت سے ادیبوں کے حالات، واقعات، شاعروں کے قصے اساتذہ کے انداز فکر، سیاست دانوں کے اعمال، رہنماؤں کے احوال، انجمنوں کی بے راہ رویاں بھی آجاتی ہیں، اور بہت سی زندگیوں کی کشمکش اور جدوجہد کے حالات اور کیفیات بھی محفوظ ہوجاتیں اور ادیبوں و شاعروں کی عملی زندگی سے بھی آگاہ ہوجاتی، اور خود دسنوی صاحب کی شخصیت کچھ اور ابھر کر سامنے آجاتی، پھر بھی ان میں بعض واقعات ایسے آگئے ہیں جن کے مطالعہ سے دسنوی صاحب کو شخصیت سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انھوں نے ایک انقلابی سے ملاقات کا ذکر اس طرح کیا ہے :
"کالج میں کرسمس کی چھٹیاں ہوئیں تو ایک دوست کے ساتھ وطن کے لیے روانہ ہوگیا۔

رات کی گاڑی تھی۔ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں دو چار ہی مسافر ہوں گے۔ وہ ایک ایک کر کے اتر گئے پھر ہم نے دیکھا کہ کوئی شخص کمبل میں لپٹا ہوا آہستہ آہستہ ہماری طرف کھسکتا آرہا ہے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگا "اجی آپ لوگ غزل وزل سنایئے" ہم اس معاملہ میں بدذوق تھے تب اس نے اپنے چہرے سے کمبل ہٹایا اور بولا "اچھا تو میں ہی سناتا ہوں" "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" بسمل عظیم آبادی کی یہ غزل اس نے ایسے ولولے کے ساتھ اور ایسی آواز میں سنائی کہ ہمارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ انقلابی جماعت کا سرگرم ممبر تھا۔ غزل سنانے کے بعد ایک مزے کی بات کہی، وہ بھی عرض کردوں۔ ذکر اردو زبان کا تھا وہ کہنے لگا "اردو میری مادری زبان نہیں لیکن اگر میرا بس چلے تو سارے عالم میں صرف دو زبانیں جاری کردوں۔ اردو مردوں کے لیے اور بنگلہ عورتوں کے لیے

————(دیدہ و شنیدہ۔ص ٢٧)

کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی اقتدا میں ہونے والی نماز اور ان کے خطبہ کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

"مولانا آزاد کی اقتدا میں ہونے والی نماز میں رکوع اور سجود کا شاندار منظر دیکھتا اور اس کے بعد مولانا آزاد کا خطبہ سنتا، ان دنوں وہ بیت المال کے قیام پر زور دے رہے تھے اس مسئلہ پر جو انھوں نے تقریر فرمائی اس کا یہ ٹکڑا آج بھی یاد ہے فرمایا:

"مسلمانو، میں اس منبر کی اہمیت پوری طرح سمجھتے ہوئے تمھارے سامنے اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ تمھاری زکاتیں، صدقات اور خیرات ضائع جارہی ہیں کیونکہ تم نے بیت المال کے ذریعے ان کا انفاق میں کیا۔ یاد رکھو جس دن تم نے بیت المال قائم کرلیا، چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر تمھاری حالت زمین سے آسمان تک بلند ہو جائے گی۔"

مجمع مولانا کی ہدایت سنتا رہا، سر دھنتا رہا، عمل کی توفیق نہیں ہوئی۔

(دیدہ و شنیدہ۔ص ٢٨)

اپنے ایک سابق طالب علم کا واقعہ سناتے ہیں تو اچھے شاگرد کی پہچان ابھر کر سامنے آجاتی ہے:

"میری کلاس کے مانیٹر کا نام روشن علی تھا، اسکول سے نکلنے کے بعد برسوں تک اس سے پھر ملاقات نہیں ہوئی، ایک دن اپنے دوست کی عیادت کے لیے حبیب ہسپتال گیا جہاں وہ زیر علاج تھا۔ ان کے پلنگ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھتا جارہا تھا کہ یکایک، ایک مریض کی آواز آئی "دسنوی صاحب ارے دسنوی صاحب" میں نے آواز کی طرف دیکھا تو روشن علی تھا۔ بہت بیمار ہو کر وہاں آیا تھا۔ وہ نہ صرف چلایا بلکہ پلنگ پر اچانک اس طرح اٹھ بیٹھا کہ نرس دوڑی آئی اور پکڑ کر اسے لٹانے لگی۔ روشنی

علی کے منہ سے "دسنوی صاحب ٗ نرس میرے ٹیچر" نکلتا رہا۔ یہ ملاقات ۱۵۔۲۰ سال بعد ہوئی تھی۔ اس کی اس درجہ عقیدت کے اظہار کا مجھ پر بڑا اثر ہوا اور میں سوچنے لگا کہ استاد اور شاگرد کے ایسے ہی تعلقات کی بنا پر ٹیچنگ کو "نوبل پروفیشن" کہا گیا ہے۔ (دیدہ و شنیدہ ص ۳۱)

لیکن یہ تو ماضی کی بات ہے حال کو عام طور سے نہ تو ایسے شاگرد میسر ہیں نہ ہی استاد ' بس ایک کاروبار ہے جو کسی طرح چل رہا ہے۔

دارالمصنفین' اعظم گڑھ کے متعلق لکھتے ہیں تو سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے اس ادارہ سے والہانہ عشق اور مخلصانہ خدمات کے صلے میں ان کی ناقدری پر افسوس کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔ تحریر کرتے ہیں جسے پڑھ کر رنج و غم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سر شرم سے جھک جاتا ہے:

افسوس اس کا ہے کہ صباح الدین کی دوڑ دھوپ' مخلصانہ محنت' علمی وقار اور شخصیت کی مقامی حلقوں میں کچھ لوگوں نے قدر نہ کی اور ان کے خلاف محاذ قائم کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا جب کہ کالجوں میں پروفیسر صاحبان تین اور ساڑھے تین ہزار پا رہے تھے صباح الدین کو دارالمصنفین سے آٹھ نو سو روپے مل رہے تھے۔ مینجنگ کمیٹی ان کی تنخواہ میں اضافہ کرنا چاہتی تو وہ منت سماجت کرتے کہ اضافہ نہ کیا جائے' یہی حال مولانا شاہ معین الدین کا تھا ان دونوں بزرگوں کی مخلصانہ خدمات اور قربانی بھلائی نہیں جاسکتی۔ (دیدہ و شنیدہ ص ۶۳)

آج عام طور سے ہمارے اداروں اور افراد کا یہی رنگ ہے جو پختہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ حال جب یہ ہے تو مستقبل کیا ہوگا یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ سچ ہے۔

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

یقین ہے کہ دسنوی صاحب کی یہ کتاب ہر طرح سے "اردو خودنوشت" کے خزانے میں اضافہ سمجھی جائے گی اور اہل علم و ادب کے مطالعہ میں رہے گی اور دلوں کو متاثر کرتی رہے گی۔

کہانی

انور ندیم
۳۶۱- پانچویں گلی۔ نشاط گنج۔ لکھنؤ۔

خودکُشی

سُنا تھا کوئی تھی، جو چلی گئی۔

بھیا دن بھر کام کاج میں لگے رہتے اور شام کو اس سے پہلے کہ یادوں کا زہر ان کی رُوح میں گھل جائے، خود کو شراب کی تلخی میں ڈبو دیتے۔ پچھلے نو برس میں بھیا کی شامیں شراب خانوں میں گزری تھیں۔ رات گئے اس کمرے میں داخل ہوتے، جس کی چاروں دیواریں بالکل ننگی تھیں۔ الماری کے اوپری سرے پر ایک بڑا خوب صورت فوٹو فریم، پیلے رنگ کے سادہ کاغذ کو جکڑے، اپنی منحوس نظروں سے بھیا کو دیکھتا رہتا۔ میں بھیا کے کمرے میں بہ ضرورت بہت کم جاتی ہوں۔ پھر بھی میں نے کبھی کبھار انھیں عجیب حالتوں میں دیکھا ہے۔ وہ اکثر اس پیلے فریم کو بڑی خطرناک جذباتی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ریڈیو برسوں سے خاموش ہے۔ اخبار کبھی نہیں لیتے۔ کتابیں الماریوں میں گرد کی کملی اوڑھے، کیڑوں کی غذا بن رہی ہیں۔ بھیا میرے سوا کسی سے نہیں ملتے۔ نیچے ایک ہوٹل ہے کھانا وہیں سے آتا ہے۔ وہ خود بھی ہوٹل میں کھاتے ہیں۔

مگر آج رات کے دس بج رہے ہیں۔

بھیا باہر نہیں گئے۔ دفتر سے آتے ہی کمرے کی پُرانی، خستہ زندگی کو بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں انھیں دُور سے دیکھتی رہی ہوں۔ کئی نازک جام اور چھوٹی بڑی بوتلیں نیچے گٹر میں پھینک چکے ہیں۔ سگریٹ کا اچھا خاصا اسٹاک ٹوکری میں ڈال دیا ہے۔ پیلا کاغذ ایک گولے کی شکل میں وہیں پڑا ہے۔ فوٹو فریم نے ایک خوب صورت تصویر، نقش اپنی باہوں میں جکڑ لیا ہے۔ میں نے کسی طرح تصویر دیکھ لی ہے۔ معصومیت، پیکر میں ڈھل گئی ہے۔ سوچتی ہوں معصوم لوگوں کی یاد کتنی زہرناک ہوتی ہے۔ آج ہی بھیا کی کسی پسند کا احساس ہوا ہے۔ الماری سے اپنی پسند کی چند کتابیں نکال کر، میز پر سلیقے سے رکھ دی ہیں۔ شاید پڑھنے کا ارادہ ہے۔ پچھلے نو برس سے بھیا کی لڑکھڑاتی زندگی، سگریٹ کے دھوئیں میں منتقل ہو رہی تھی۔ آج پہلی بار انھوں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ زندگی کو بدلنے کا فیصلہ۔ اور اس نئے ڈھنگ سے جینے کا خوب صورت ارادہ، میں پھر بھی پریشان ہوں۔ جانتی ہوں اس تبدیلی کے پیچھے

ایک تلخی کا کام کر رہی ہے اور اس کا کارن میں ہوں، رات کو بھیا نے مجھے نیچے دیکھ لیا تھا —!

یہ عمارت کی چوتھی اور آخری منزل ہے۔

نیچے لوہے کا ایک بڑا سا گیٹ ہے اور قریب ہی ایک خاموش کارنر، اور وہیں کل رات بھی ہم لوگ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ بالکل خاموش مگر کانوں میں کہی اَن کہی باتیں گونج رہی تھیں۔ یکایک بھیا آ گئے اور میں تیر کی طرح اپنے کمرے میں آ گئی —!

یہ کیا، بارہ ایک سے پہلے بھیا کبھی نہیں لوٹے مگر ابھی تو گیارہ دس ہوتے تھے۔ میں نے ٹھیک دس منٹ پہلے اسے اپنی گلی میں آتے ہوئے دیکھا تھا۔ آج وہ آخری بار آ رہا تھا۔ میں نیچے گیٹ کے کارنر میں اس کے پہلے، آخری اور ضروری سوال کا جواب دینے چلی گئی تھی — سوال، جس نے جسم کو چھونے کی کوشش کی تھی، جواب مجبور روح کے لمسوں کا پیام تھا —!

پچھلے دنوں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو کالج میں دیکھا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے دل میں اپنی جگہ ڈھونڈ لی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ایک راجپوت کے تیور دیکھ لیے تھے۔ میں اس احساس سے لرز گئی تھی کہ وہ مجھے چھین لے گا اور بھیا اپنی آبرو کے لیے سب کچھ پھونک دیں گے —!

میں ڈر گئی اور ایک ہفتے سے کالج نہیں گئی۔ وہ یہاں تک آ گیا اور اپنی روشن آنکھوں سے میری روح کو جھنجھوڑنے لگا۔ اسے میری مرضی کی ضرورت ہے اور مجھے بھیا کی اجازت کی۔ بھیا اجازت نہیں دے سکتے۔ اور میری مرضی کوئی معنی نہیں رکھتی —، جانتی ہوں بھیا انقلابی جذبوں سے مرعوب نہیں ہوتے۔ مجھے ان کی اس نظر سے کوئی شکایت نہیں، جو خاندانی بزرگی کو اختلافی رنگ میں دیکھتی ہے لیکن میں اسے بھی دھوکا نہیں دے سکتی —!

مجھے یقین ہے وہ آج بھی آئے گا۔ ٹھیک گیارہ بجے۔ میرے جواب کی خاطر — لیکن آج میں نہیں جا سکتی، اب کبھی نہیں جا سکتی، بھیا نے میری خاطر خود کو بدل دیا ہے۔ ساری شام وہ یہیں گذاریں گے۔ اپنے کمرے میں شراب اور سگریٹ سے بے نیاز۔

مگر وہ آج بھی آئے گا۔ اس کی آشا ٹوٹ گئی تو زندگی برباد ہو جائے گی۔ اس کا سوال، روح کی آواز ہے، یہ آواز میرے جواب کے لیے بھٹکتی رہے گی —!

گیارہ بج گئے۔

ہو سکتا ہے وہ آ گیا ہو — ہاں وہ آ رہا ہے، اپنی سادھنا کا "پرنیک"، کالی گلی میں روشنی کی لکیر بن کر۔ وہ گیٹ کے خاموش کارنر کی طرف بڑھ رہا ہے، کسی خاموش سایے کی تلاش میں۔ اس نے گیٹ میں قدم رکھ دیا ہے، وہ مجھے ڈھونڈ رہا ہے — اس

سے پہلے کہ وہ گیٹ سے نکل کر، نامراد گلی بھی پار کر جائے اور رُوح کی آواز خاموش کارنر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گونجتی رہ جائے، مجھے اس کے سوال کا جواب دینا ہے۔ ہمیشہ کی طرح کھلی مگر خاموش آنکھوں کے ساتھ۔۔!

کیسا مزہ آئے گا۔ بھیا دوڑ کے نیچے آجائیں گے، اندھی کھڑکیاں روشنی میں چیخ پڑیں گی، بھیا اور دوسرے لوگوں کے دیکھنے کے بعد بھی، میں اپنے کمرے میں واپس نہیں لوٹوں گی۔ کھلی خاموش آنکھوں سے اس کے چھوٹے سے سوال کا اتنا لمبا جواب دوں گی کہ سارے لوگ اُکتا کے لوٹ جائیں گے، بس وہی میری بات سُنتا رہے گا۔!

وہ گیٹ کے باہر گلی میں کھڑا ہے۔

اس نے اوپر بھی کچھ دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

میں بالکل تیار ہوں۔ تیز ہوا میں کھڑکی کے پٹ میری پیٹھ تھپتھپا رہے ہیں۔ میں جانے کیا سوچ بیٹھی میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔!

وہ گلی سے گزر رہا ہے۔

مجھے اس کے قدموں میں اپنی بات کہنی ہے۔

ارے کھڑکی نے میرا آنچل تھام لیا ہے۔

ٹھیک ہے باقی پردے بھی تار تار ہو گئے۔۔!

یاد رکھیے

اگر آپ کی خریداری نمبر کے سامنے سُرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہو گئی۔ براہ کرم اپنا سالانہ چندہ مبلغ ۵۵/ روپے فوراً بھیجیے۔

(مینجر)

فخرالدین عارفی
محمد پور شاہ گنج۔ پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

منزل کی تلاش میں

ادھر کچھ دنوں سے اپنے اندر میں چند غیر معمولی تبدیلیوں کا احساس کر رہا ہوں۔ ایک عجیب سی کیفیت سے ہر لمحہ دوچار رہتا ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے وجود کو کہیں گم کر چکا ہوں۔ کبھی کبھی تو زندگی کی تلخ و کڑوی حقیقتیں بھی خواب معلوم ہوتی ہیں۔ میں اپنے ہی ہاتھوں کو انگلیوں سے اپنے سراپا کو بار بار ٹٹول کر اپنے ہونے کا دل کو ثبوت فراہم کرتا ہوں، تاہم یہ احساس جان نہیں چھوڑتا ہے کہ میں ختم ہو چکا ہوں۔ میری موت واقع ہو چکی ہے۔ اکثر تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں گورستان میں جا کر گھنٹوں اپنی قبر خود تلاش کرتا ہوں۔ لیکن میں، اپنی قبر کی تلاش و جستجو میں شاید کامیاب نہیں ہو پاتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے گورستان کی ایک ایک قبر دیکھ کر اپنی ہی قبر کا گمان ہوتا ہے۔ ساری قبریں ایک جیسی جو ہوتی ہیں۔

موت کے بعد تمام انسان بالکل ایک جیسے ہو جاتے ہیں، ان کے درمیان کوئی تفاوت اور امتیاز باقی نہیں رہتا ہے۔ یہ کتنی اچھی بات ہے۔

لیکن یہی انسان جب دنیا میں ہوتے ہیں، زندہ ہوتے ہیں تو آپس میں کوئی مماثلت اور مطابقت ان کے لیے جائز نہیں ہوتی ہے۔ کتنا فرق ہوتا ہے آدمی اور آدمی میں

کوئی بھکاری ہوتا ہے تو کوئی راجا۔

کوئی ظالم ہوتا ہے تو کوئی مظلوم۔

کوئی کچھ تو کوئی کچھ.... ہر شخص ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ لیکن سانسوں کا کھیل ختم ہوتے ہی یکسانیت کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اور پھر سب کچھ یکساں ہو جاتا ہے۔

لیکن آخر میں یہ سب باتیں کیوں سوچ رہا ہوں۔ میں تو اپنی قبر کی تلاش میں ہنوز ناکام رہا ہوں اور شاید کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ اس لیے کہ ابھی میرے عزیزوں رشتہ داروں، دوستوں اور ملنے جلنے والوں نے کاندھے دے کر دفن نہیں کیا ہے ہاں یہی سچ ہے کہ میں اپنے مکمل وجود کے ساتھ بالکل ثابت و سالم ہوں جس کا سب سے بڑا ثبوت میرے پاس یہ ہے کہ میں اس وقت بھی اپنی زندگی کے سب

سے بڑے شوق اور اپنے سب سے محبوب مشغلے میں منہمک ہوں۔ یعنی کاغذ کے سفید اوراق کو سیاہ کر رہا ہوں۔ ہاں کہانی کی تخلیق اور افسانوں کو جنم دینا میری زندگی کا ایک جزو بن چکا ہے۔ اور شاید جب تک زندگی وفا کرے گی میں افسانوں کو جنم دیتا رہوں گا۔ کہانیاں لکھتا اور کہتا رہوں گا۔ کہانیاں جو میری زندگی ہیں اور زندگی جو بذات خود سراپا کہانی ہے۔ ان دونوں میں ازل سے ہی دوستی چلی آرہی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ دونوں کے رشتے استوار اور مستحکم ہو رہے ہیں۔ آج زندگی کی حقیقت کیا کہانی سے زیادہ ہے۔

شاید نہیں...

کہانی اور زندگی...

زندگی اور ایک خوب صورت یا بدصورت سی کہانی...

ہماری زندگی کا حاصل یہی ہیں...

میں جب بہت چھوٹا سا تھا اور ماں کی چھاتی سے دودھ چوستا تھا، تو میری ماں کی چھاتیوں میں کہانیوں کے جراثیم بھرے رہتے تھے جو دودھ کے ساتھ ساتھ میرے وجود میں شامل ہو گئے تھے۔ میری رگ رگ میں سرایت کر گئے...

پھر میں افسانہ نگاری بھلا کیسے بھول سکتا ہوں؟ افسانہ لکھنے کا فن تو مجھے اپنی ماں سے وردان میں ملا ہے۔ اور میں اپنی ماں کی طرف سے اس عطا کردہ تحفے کو زندگی کے بوجھ کے ساتھ ساتھ مسلسل ڈھو رہا ہوں۔ ماں کی چھاتی سے حاصل شدہ دودھ اور کہانی کے جراثیم بھی میری رگوں میں خون بن کر دوڑ رہے ہیں....

میری زندگی اور میرے وجود کے ساتھ کہانی کا ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہو چکا ہے لیکن پھر بھی جانے کیوں کبھی کبھی مجھے اپنی زندگی کا یہ حصہ خود سے جدا ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہے؟ مجھے یہ کیوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ لکھنا دنیا کا خراب ترین فعل ہے۔ میں اپنے ذہن و دل پر لاکھ زور دیتا ہوں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا ہے۔

شاید ایسا اس لیے ہے کہ اس وقت میرے ساتھ دوسرا کوئی شخص بھی کہانی نہیں لکھ رہا ہے۔ سب کے سب جانے کیا لکھ رہے ہیں۔

بکواس بالکل بکواس...

ایسا لگتا ہے جیسے کہانی لکھنے کا فن میرے وجود کے حصار میں قید ہو کر رہ گیا ہے...

"بھئی کہانی لکھو... یہ تم لوگ کیا لکھ رہے ہو؟" میں اپنے تمام ادیب دوستوں سے بار بار اصرار کرتا ہوں۔ لیکن کوئی بھی کہانی نہیں لکھتا ہے۔ سب کے سب جیسے گونگے ہو گئے ہیں، کہانی کی زبان بھول چکے ہیں۔

میں تنہا کب تک کہانیاں لکھتا رہوں گا۔ جب کہانیاں لکھی نہیں جا رہی ہیں تو کچھ دنوں کے بعد کہانی کی زبان کون سمجھے گا؟ کون کہانیاں پڑھے گا......؟؟

آج ہی شام کی تو بات ہے کہ جب میں اپنے روزانہ کے پروگرام کے مطابق طے شدہ مقام یعنی گورستان میں پہنچا جہاں روزانہ ہم لوگوں کی معمول کی ملاقاتیں ہوتی ہیں تو وہاں قبل ہی سے میرے کئی ادیب اور افسانہ نگار دوست موجود تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر یا ان سے ملاقات کر کے مجھے ہمیشہ خوشی ہوا کرتی تھی۔ ان سے مختلف ادبی موضوعات پر گفتگو کر کے میں اپنی رُوح کی غذا حاصل کرتا تھا۔ لیکن ادھر چند دنوں سے مجھے اپنے ان ہی افسانہ نگار اور شاعر دوستوں سے مل کر ایک عجیب سی کوفت کا احساس ہوتا ہے۔ اپنے دل میں ان لوگوں کے لیے اب میں وہ خلوص نہیں محسوس کرتا ہوں جو چند روز قبل تک تھا ــــ بلکہ ان کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت اور حسد کا جذبہ دیکھتا ہوں۔ وہ سب کے سب مجھ سے حسد کرتے ہیں اور مجھ سے ہی کیا یہ لکھنے پڑھنے والوں کی دُنیا ایک ایسی دُنیا ہے جہاں کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا ہے۔ سب ایک دوسرے سے نفرت ہی کرتے ہیں۔ خلوص، پیار اور دوستی یہ سب ان کے ہتھیار ہوتے ہیں جن سے وہ ایک دوسرے کا شکار کیا کرتے ہیں۔

میں اس مسئلے پر ہمیشہ گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں کہ وہ لکھنے پڑھنے والوں کی برادری کیسی برادری ہے؟ جس میں ہر شخص ایک دوسرے کا دشمن ہوتا ہے سب ایک دوسرے کا خون چُوس لینا چاہتے ہیں۔ میں تو پہلے کسی سے نفرت نہیں کرتا تھا اپنے دل میں کسی کے لیے بُرے ارادے نہیں رکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی سب کے سب مجھ سے نفرت کرتے تھے، آج بھی کرتے ہیں۔ لیکن اب میں خود بھی ان ہی کے قبیلے کا ایک فرد ہو چکا ہوں۔ میں نے اپنے اندر اتنی صلاحیتیں پیدا کر لی ہیں کہ لوگوں کی نفرت کا جواب نفرت سے دے سکوں ــــ لیکن ایسا کر کے میں خوش ہرگز نہیں ہوں میں اب خود اپنی ذات سے بھی نفرت کرنے لگا ہوں۔ نفرت کی ایک آگ ہے جو میرے چاروں طرف سُلگ رہی ہے اور میرا سارا وجود آگ کی زد میں ہے۔ میں اپنے وجود کو ہر لمحہ موم کی مانند پگھلتے اور جلتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں۔ اور شاید رفتہ رفتہ میرا سارا وجود پگھل کر کسی سیّال مادّے میں تبدیل ہو جائے گا اور پھر یہ مادّے سیلاب اور سمندر کی شکل اختیار کر کے ایک روز ساری دنیا کو نیست و نابود کر دیں گے۔

لیکن میں ایسا نہیں چاہتا ہوں۔ میں اپنی طبیعت پر جبر کر کے ایسا کروں گا ــــ اس لیے کہ نفرت کی آگ کو سرد ہونا چاہیے۔ ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل کی آگ پر قابو پا جائے۔ میں بذات خود تو ایسا ہی کرنا چاہتا ہوں۔ اب میں ارادتاً خود کو متوازن کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس جدوجہد میں مجھے کئی بار اپنے ہی ہاتھوں سے مرنا اور جینا ہوتا ہے۔ مرنے اور جینے کے عمل سے متعدد بار گزرنے

کے بعد میں اپنے اندر ایک کمزوری کا احساس کرتا ہوں، پھر کتنی کمزوریاں میرا دامن پکڑ لیتی ہیں۔ میں خود کو بہت ہی کمزور اور ناتواں محسوس کرتا ہوں، میری نگاہوں کے سامنے دُور دور تک گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا ہے... اب میرے چاروں طرف اندھیرے کی دیواریں ہیں اور میں ان دیواروں کے حصار میں خود کو مقیّد محسوس کر رہا ہوں تاہم مجھے ایک خاص قسم کے سکون و اطمینان کا احساس ہو رہا ہے اور میں اپنے لیے اندھیروں کے درمیان بھی روشنی اور نور کا ایک نیا جہاں تلاش کر لیتا ہوں، مجھے نئی آنکھیں مل جاتی ہیں۔ نیا دل میسّر آتا ہے اور جب میں اپنے چاروں طرف لاشوں اور انسانی ہڈیوں کی سڑاند محسوس کرتا ہوں، آنکھیں کھولتا ہوں تو واقعی اپنے چاروں طرف لاشوں اور ہڈیوں کا انبار دیکھتا ہوں۔
عورتوں کی لاشیں.....

مردوں کے مردہ جسم بچوں کا سر سے جدا تن...
خون میں لت پت تلواریں اور نیزے...

اُف میرے خدا، میں یہ سب کیا دیکھ رہا ہوں؟ میرے مُنہ سے ایک چیخ نکل پڑتی ہے اور فرطِ خوف سے میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں جب مجھے حکم ملتا ہے کہ کہانیاں لکھوں، افسانوں کو جنم دوں، اپنے فن کا جوہر دکھاؤں...

حکم کے بعد اگر مجھ سے لمحہ بھر کے لیے بھی تامل ہوتا ہے تو مجھے اس کی سزا ملتی ہے۔ میرے جسم پر کوڑے برسائے جاتے ہیں — میں کر بھی کیا سکتا ہوں میری بساط ہی کیا ہے؟ میں پوری طرح اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور میرا قلم چلنے لگتا ہے ..... میں کہانیاں لکھتا ہوں.... کہانیاں اور ڈھیر ساری کہانیاں.... لیکن اب میرا دل بہت اُچاٹ ہو چکا ہے، میں بہت ٹوٹ چکا ہوں، اپنے وجود کی کرچیوں کو اپنے احساس کی انگلیوں سے چُننا چاہتا ہوں۔ تو وہ اور بھی بکھر بکھر جاتی ہیں میرا من اور بھی بیکل ہوا اُٹھتا ہے۔ میں اپنے وجود کے حصار سے باہر اپنے بکھرے ہوئے وجود کے ساتھ مختلف سمتوں میں پھیل جاتا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ کوئی سمت تو میری تلاش کو منزل کا پتا دے گی۔

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

تلاشِ سحر

مصنف :- جمال بھارتی
مبصر :- قمر سنبھلی
قیمت :- ۲۵ روپے
ملنے کا پتا :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
علی گڑھ ، بمبئی ۳

زیرِ تبصرہ کتاب "تلاشِ سحر" جناب جمال بھارتی کے قطعات اور موضوعاتی نظموں کا مجموعہ ہے جو ان کی وطن دوستی اور قومی یکجہتی کے جذبوں کا غماز ہے جمال بھارتی کا نام ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں وہ ایک فعال اور متحرک شخصیت کے حامل اہلِ قلم ہیں۔ کسی نام ونمود کی خواہش یا صلے کی پروا کیے بغیر حب الوطنی کے نغمے برافروختہ مسلسل گا رہے ہیں (جس کا ثبوت اُن کی کئی تصنیفات و تالیفات ہیں) ہرچند کہ موضوعاتی اور صحافتی شاعری کو لوگ ادبِ عالیہ میں شمار نہیں کرتے مگر اس کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ۔ اور ایسے پاکیزہ جذبات وخیالات اپنا ایک الگ اثر رکھتے ہیں ۔ بقول مخمور سعیدی "جمال بھارتی . . . ایک حقیقی محبِ وطن شاعر ہیں اُن کی شاعری انھیں موضوعات کی حامل ہے جو ملک وقوم کی فلاح سے تعلق رکھتے ہیں . . . . . جمال صاحب کی زبان نہایت سادہ اور آسان ہے وہ بوجھل تراکیب کا استعمال نہیں کرتے بقول شورش کاشمیری" وہ سادہ اور عام فہم طرزِ اظہار میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے پر قادر ہیں" . . . . . جناب رئیس امروہوی" کا خیال ہے کہ وہ " حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے زندگی کا جائزہ لیتے ہیں اور ایک جذبۂ بے اختیار کے ساتھ اسے بیان کر دیتے ہیں ان کی طبیعت کی ساخت اور افتادیہ ہے کہ

سخت دشواریوں پہ چھائیں گے
پاؤں ہرگز نہ ڈگمگائیں گے
ہم کو تقدیر ہی سے لڑنا ہے
اب نہ پیچھے قدم ہٹائیں گے

فنی اعتبار سے کہیں کہیں نظر آتی ہے مثلاً مندرجہ مصرعے دیکھیے

ع۔ یقیں ہے عام کرانسانیت بنیاد ہستی ہے
ع۔ وہ ہوانسانیت تہذیب ہو یاکہ سیاست ہو
ع۔ پنہاں محنت میں ہر خوشی سمجھیں
ع کیے پر اپنے نادم ہیں اے خدا معاف اب کردے

پہلے دونوں مصرعوں میں کاف بیانیہ ایک سبب (دو حرف) کے طور پر استعمال ہوا ہے جو کہ غلط ہے۔ تیسرے مصرعے میں لفظ "پنہاں" کا وزن "فعلن" ہے جبکہ اسے "فعل" کے وزن میں استعمال کیا گیا ہے۔ چوتھا مصرع بالکل بے وزن ہے۔ اگر تھوڑی توجہ اس طرف بھی دی جاتی تو مجموعہ کے وقار میں اضافہ ہوتا۔

غرض جذبہ حب الوطنی پر مبنی ان کے قطعات اور نظموں کا یہ مجموعہ "تلاش سحر" امید ہے وطن دوست حلقوں میں پذیرائی حاصل کرے گا اور اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ آج کل شاعری کی کتابوں کی مارکیٹ نہیں ہے خصوصاً اس طرح کی مقصدی شاعری کی۔ پہلے حکومت کے کچھ ادارے کتابیں خرید کر لائبریری کو بھیج دیتے تھے اس طرح مصنف اور شاعر کی حوصلہ افزائی بھی ہو جاتی تھی۔ کاش حکومت پھر اس طرف توجہ کرسکے۔

شرارِ سخن
(مجموعۂ رباعیات)

شاعر: ناوک حمزہ پوری
ناشر: اعجاز احمد، حمزہ پور، شیر گھاٹی، گیا (بہار)
ضخامت: ۱۱۲ صفحات ۔ سائز ڈیمائی
قیمت: ۲۵ روپے
مبصر: ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

جناب ناوک حمزہ پوری اردو کے ایک مشہور شاعر اور نامور مصنف ہیں جن کی اب تک تقریباً دو درجن شعری و نثری یادگاریں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ وہ ایک ہشت پہلو صاحب قلم ہیں جن کی نگارشات کا دائرہ شاعری، افسانہ، ناول، انشائیہ، طنز و مزاح، ادبی تحقیق، ادب اطفال اور مذہبیات تک محیط ہے۔ ان کا تخلیقی و تصنیفی سفر ۱۹۴۵ء سے آغاز پذیر ہوا اور ہنوز پوری سلاست روی اور سنجیدہ رفتاری کے ساتھ جاری ہے۔

ناوک صاحب کے اب تک سات شعری مجموعے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں اور یہ ان کا آٹھواں شعری تحفہ ہے جو "شرار سخن" کے نام سے دنیائے ادب کی نذر کیا گیا ہے۔

"شرار سخن" ناوک صاحب کی رباعیات کا مجموعہ ہے جو چار سو چوبیس (۴۲۴) رباعیات پر مشتمل ہے۔

رباعی فارسی اور اردو ادب کی ایک اہم بالشان صنف سخن ہے جس کی شرطوں اور تقاضوں سے معدودے چند سخنور ہی کما ینبغی عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔ ناوک صاحب

مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کے اشہبِ قلم نے یہ راہ بھی نہایت سہولت اور صیانت کے ساتھ طے کی ہے۔

شرارِ سخن میں شامل تقریباً تمام رباعیات کو فنی اعتبار سے کسی اعتراض کی زد میں نہیں لایا جاسکتا۔ موضوعی اعتبار سے ان رباعیات کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ اردو میں رباعیات کے اب تک جتنے بھی مجموعے شائع ہوئے ہیں کوئی اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ اور رجانِ کلام یہ ہے کہ نادک صاحب کے مزاج و مذاق کے عین مطابق شرار سخن کی رباعیات معیاری و پاکیزہ مطالب و معانی کا ایک گنجینہ ہیں، جس کے اندر مذہب و معاشرہ اور ملک و ملت کے ان مسائل کو موضوع سخن قرار دیا گیا ہے جن سے ہماری آج کی بے زمام شاعری اور ادب کا دامن خالی بالعموم نظر آتا ہے لیکن جن کو نظر انداز کر کے انسانیت اور ہمارا ملک اور ہماری قوم صلاح و فلاح سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔

نمونے کے طور پر ایک دو رباعی پیش کرنے کی بجائے میں ادب و شاعری اور انسانیت و شرافت کو عزیز رکھنے والوں سے اس پورے مجموعے کے مطالعے کی سفارش کرتا ہوں۔

تجلّیات
(مجموعہ کلام)

مصنف: ڈاکٹر کے مدّنا منظر
قیمت: ۶۰ روپے صفحات ۲۲۴
ناشر: شری پربھو پرکاشن I.۶۵۶ اسٹیج اندرا نگر بنگلور۔ ۳۸
مبصّر: مظفر حسین غزالی

مدّنا منظر اردو والوں کے لیے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ گنگا جمنی تہذیب کے علم بردار اور نمایندہ شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے پیشے کی طرح اپنے کلام کو بھی عوامی بنا دیا ہے۔ چھوٹی بحروں اور آسان لفظوں میں بڑے سے بڑے مضمون کو پیش کر دیا ہے۔ تصوّف کے پیچیدہ مسائل کے لیے بھی انھوں نے یہی اسلوب اختیار کیا ہے وہ اپنی اس خوبی کی وجہ سے مشاعروں میں خوب داد پاتے ہیں اور مشاعرے کی جان کہلاتے ہیں۔

زیر تبصرہ مجموعۂ تجلّیات اردو میں ان کا چھٹا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے پانچ مجموعہ کلام بالترتیب عرفانِ سکون، آئندِ عرفان، منظرِ عرفان، حسنِ عرفان اور منظر بہ منظر شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اقبال، غالب، عبدالقادر ادیب اور حمید الماس کے کلام کا کنڑی میں ترجمہ کیا اور نام کمایا انھوں نے انگریزی میں بھی شاعری کی ہے اور ایک مجموعہ "بلو وائز" کے نام سے چھپوایا ہے۔ ہندی

میں "رس گنگا اور نیل کمل" انھیں کے مجموعے ہیں۔ گنٹری ان کی اپنی زبان ہے اور انھوں نے اس زبان کو بھی محروم نہیں کیا ہے بلکہ اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ گنٹر میں ان کی شاعری کے چھے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

منظر صاحب کے تازہ مجموعے کی ابتداء حمد سے ہوئی ہے۔ اس کے بعد ایک شد نہ دو شد پوری تیرہ نعتیں ہیں اور ہر نعت کو دوسری پر فوقیت حاصل ہے۔ کیوں کہ انھوں نے ہر نعت میں حضورؐ کی زندگی کے کسی ایک گوشے کو پیش کیا ہے اور مضامین کو اس طرح باندھا ہے کہ اہل ایمان بھی سبحان اللہ کہے بغیر نہیں رہ پاتے۔ منظر کی نعتوں میں حضورؐ سے ان کی عقیدت اور محبت کی عکاسی ہوتی ہے۔ اسی محبت اور عقیدت نے ان نعتوں کو پُرسوز بنا دیا ہے۔ دو تین شعر بطور نمونہ پیش ہیں۔

فرق کو دور کیا شاہ و گدا کے جس نے
وہ مساوات وہ محبت کی ضیاء آتی ہے

تمھارے عشق میں جینا، تمھارے عشق میں مرنا
اسے ہم دین کہتے ہیں، اسے ایمان سمجھتے ہیں

پابند مقدر ہو کر بھی ہر چیز پہ قادر ہے انسان
مجبور کا جب یہ عالم ہے مختار کا عالم کیا ہوگا

منظر کے وہ اشعار جو تصوف کا رنگ لیے ہوئے ہیں، نظم "انتظار" میں دیکھیے۔

وجود بے پناہ ہے	نمود گاہ گاہ ہے
کسی بھی حال میں سہی	کسی بھی چال میں سہی
تو آ تو کوئی بات رہے	یہ فکر ستر ذات ہے
دکھا بھی دے کوئی جھلک	کہ کب سے انتظار ہے

وہ تصوف کے اس گلشن کے خوشہ چیں ہیں جہاں رام رحیم ایک ہستی کے دو نام ہیں وہ تصوف میں ترک دنیا کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ ان کا تصور یہ ہے کہ خدا کی پرستش خدا کے بندوں کی بہتری اور خدمت میں مضمر ہے۔ انھوں نے اپنی نظم زندگی میں اس نقطہ کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے مخدوم کی مشہور غزل "آخری شب" کی زمین میں بھی غزل کہی ہے، اس کا ایک شعر دیکھیے۔

ٹوٹ کر ایک پھول گرا آخر شب دوسرا پھول سر شاخ گرا آخر شب

الغرض منظر کی نعتیں ہوں یا غزلیں، نظمیں ہوں یا گیت ان سب میں اگر ان کا انداز صوفیانہ ہے تو ان کی نظر شاعرانہ ہے اور فکر فلسفیانہ ہے۔ انھیں کا وشوں کا نام ہے "تجلیات"۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ اپنی معنوی خوبیوں اور انفرادیت مضامین کی وجہ سے قارئین کو پسند آئے گا اور اردو ادب میں گنگا جمنی تہذیب کی روایت کو جاری رکھے گا۔ البتہ اس میں بعض اشعار ایسے ہیں جو کمزور ہیں۔

ویسے مجموعی طور پر مولانا منظر کی یہ کوشش ستائش ہے
کتابت و طباعت پر بھی انھوں نے خصوصی دھیان دیا ہے۔

کاغذ کی دیوار

مصنف: محافظ حیدر
ناشر: تخلیق کار پبلشرز ۱۷۷۱ کوچہ دکھنی رائے دریا گنج نئی دہلی۔
قیمت: ۵۰ روپے
مبصر: اقبال مسعود

کاغذ کی دیوار، محافظ حیدر کے ۱۲ افسانوں کا مجموعہ ہے اس میں شامل افسانے ایسے نہیں جنھیں سرسری دیکھ کر گزرا جائے یہ قاری کا دامن باربار تھام لیتے ہیں اور ذہن و دماغ کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

محافظ حیدر کے افسانوں کا وژن کافی وسیع ہے اور نظریں باریک بیں ہیں۔ وہ انتہائی معمولی سے معمولی واقعہ اور تصویر کو زندہ کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے ایوان میں اعلا درجہ کی عدالتیں ہیں۔ دلّال ہیں۔ لٹے پٹے مگر غیرت دار نواب اور جاگیردار ہیں۔ ان کی خودسر بیگمات اور بے راہ بچے ہیں۔ بے قصور پھانسی کی سزا پانے والے ملزم ہیں۔ جدید عہد کے مرد و عورت، ان کے تعلقات جنسی و ذہنی کشمکش غرض کہ اس ایوان میں ایک سے ایک خوبصورت نقش موجود ہے۔ ان کی کہانیاں صرف انسانوں سے ہی متعلق نہیں ہیں۔ دیواریں بھی افسانہ بن سکتی ہیں یہ کوئی محافظ حیدر سے سیکھے۔ کاغذ کی دیوار، اس کی ایسی شاندار زندہ اور چلتی ہوئی مثال ہے کہ جسے ہندستان کی کسی بھی زبان کے بہترین انتخاب میں شامل کیا جانا چاہیے۔

"کاغذ کی دیوار" میں دو قسم کے افسانے ہیں تمثیلی اور بیانیہ اور دونوں ہی خوب ہیں۔ دونوں میں محافظ حیدر نے اپنے فن کا لوہا منوایا ہے اور اس معاملے میں ان کا وسیع مطالعہ ان کا رفیق و معاون ہے۔ اگرچہ ان کے زیادہ تر افسانے نوشتہ کا فشکار ہیں اور موت ایک اٹل حقیقت کی طرح روپ بدل بدل کر ان میں سے جھانکتی ہے۔ اس کے علاوہ تذکیر و تانیث میں بھی وہ غلطیاں کرتے ہیں تاہم کہانی کہنے پر محافظ حیدر کو جو قابو ہے وہ اس قسم کی معمولی باتوں کو صرف نظر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ادب کا کوئی بھی قاری ان کہانیوں کو پڑھے بغیر ہم عصر اردو افسانے کی صحیح شناخت نہیں کر سکتا۔

کھلے خطوط

مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● رام پرکاش کپور ۱۰/۱۰، ایم آئی جی پدم نابھ پور درگ ۴۹۱۰۰۱ (مدھیہ پردیش)

کتاب نما کے ستمبر ۱۹۹۴ کے شمارہ میں جناب جگدیش چندر بترہ کا اشاریہ میں نے نہایت دلچسپی اور غور سے پڑھا۔ میں "ماہر لسانیات" نہیں ہوں۔ بلکہ یوں کہہ سکتا ہوں کہ لسانیات کے بارے میں میرا علم نہیں کے برابر ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ میں کسی بھی زبان کا اسکالر یا عالم ہونے کا دعوا نہیں کرتا۔ اردو اور انگریزی ادب پڑھنے کا مجھے شوق ہے لیکن میرا ان زبانوں کا علم بھی کافی محدود ہے۔ اس لیے میری یہ رائے ایک نہایت معمولی عام قاری کی رائے ہی سمجھی جانے۔ اور اس کے اظہار میں اگر لسانیات کے بارے میں میری لاعلمی یا ناسمجھی کا اظہار ہوتا ہو تو میں اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔ یہ میری مجبوری ہے

آپ نے رسالہ "سرائیکی انٹرنیشنل" کے بارے میں لکھا ہے "بدقسمتی سے یہ رسالہ ہم کو آج تک دیکھنے کو نہیں ملا"۔ اب ہماری بدقسمتی کا اندازہ لگائیے کہ یہ اشاریہ پڑھنے کے بعد ہی ہم پر اتنا بڑا انکشاف ہوا اور ہمیں پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ "سرائیکی" کسی قدیم زبان کا نام ہے۔ اور یہ کہ یہ زبان "سنٹرل پاکستان ملتان۔ مظفر گڑھ، میانوالی، جھنگ، سرگودھا، جہلم، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان، بنوں، کوہاٹ، راجن پور، ستیہ کوٹ ادو، بہاولپور، رحیم یار خان، لڑکانہ وغیرہ ضلعوں کی زبان ہے"۔ ہم کو ان میں سے زیادہ تر اضلاع کی زبان کو پنجابی یا اس کی کوئی شاخ سمجھتے تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ بنوں، کوہاٹ اور ڈیرہ اسماعیل خاں (یہ تینوں ضلعے صوبہ سرحد میں ہیں) کی اکثریت کی زبان پشتو ہے۔ دیہات میں تو پشتو کے سوا دوسری کوئی زبان نہیں بولی جاتی۔ ہاں شہروں میں پشتو کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی پنجابی (یا جسے بترہ صاحب سرائیکی کہتے ہیں) بولی جاتی ہے۔

میرا بچپن صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ کی تحصیل ایبٹ آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں "شیروان" میں گزرا۔ ہمارے ضلع کی زبان کو "ہندکو" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ پنجابی سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے بلکہ اسے پنجابی کی ہی شاخ dialect کہا جا سکتا ہے۔ اس زبان میں بھی دیہات میں بولی جانے والی اور شہروں و قصبوں میں بولی جانے والی زبان میں فرق تھا۔ لیکن ایک دوسرے کی زبان سمجھنے میں کوئی خاص دقت نہیں پیش آتی تھی۔ میں جب گورنمنٹ ہائی اسکول ایبٹ آباد میں پڑھتا تھا تو میرے ساتھ، ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازی خان کے کئی لڑکے جن کے والدین سروس یا بیوپار کے سلسلے میں وہاں آ گئے تھے اور ان کی مادری زبان بھی میری مادری زبان سے ملتی جلتی تھی جسے پنجابی ہی کہا جاتا تھا۔ جب میں راولپنڈی میں کالج میں داخل ہوا۔ تو وہاں میانوالی۔ جھنگ۔ سرگودھا بنوں، کوہاٹ، جہلم، ڈیرہ اسماعیل خان۔ ڈیرہ غازی خان (جن کی مادری زبان کو بترہ صاحب سرائیکی کہتے ہیں) کے علاوہ مردان پشاور اور ہزارہ وغیرہ اضلاع کے لڑکے میرے ساتھ ہوسٹل میں رہتے تھے اور تقریباً سب طالب علم ایک ہی زبان پنجابی بولتے تھے۔ سوائے پشتونوں کے جو آپس میں پشتو اور دوسروں کے ساتھ اردو

میں گفتگو کرتے تھے۔ (ویسے راولپنڈی ضلع کی مقامی پنجابی زبان ایک خاص قسم کی تھی جسے پوٹھوہاری کہا جاتا تھا۔ اس پر ڈوگری زبان کا کافی اثر تھا) ان تمام اضلاع کے لوگ جو زبان بولتے تھے اسے پنجابی ہی کہا جاتا تھا اور ان کی مادری زبانیں پنجابی زبان کی ہی شاخیں تھیں۔ ہم نے سرائیکی نام اس وقت سنا ہی نہیں تھا۔ ضلع ہزارہ اور ضلع راولپنڈی کے علاوہ مجھے میانوالی جہلم، سرگودھا وغیرہ اضلاع (جن کی زبان بترہ صاحب کے مطابق سرائیکی ہے) میں بھی جانے اور قیام کرنے کا موقع ملا ہے۔ میرے خیال میں وہاں کے لوگوں کی مادری زبان پنجابی ہے۔ گو ان کے بولنے کا لہجہ ہزارہ اور راولپنڈی کے لوگوں سے مختلف ہے)

صوفی فقیروں کے کلام کی زبان کے بارے میں بھی بترہ صاحب نے لکھا ہے کہ وہ سرائیکی ہے۔ بابا فرید گنج شکر کا جو کلام گورو گرنتھ صاحب میں شامل ہے۔ اس کی زبان میرے خیال میں پنجابی ہے اور جو حضرت سلطان باہو کا کلام بترہ صاحب نے اپنے اشاریہ میں شامل کیا ہے مجھے تو وہ بھی پنجابی ہی لگتا ہے۔ بلھے شاہ کی "کافیوں" کی زبان بھی پنجابی ہے۔

جناب بترہ صاحب کے مضمون میں کئی جگہ تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں۔ "گریرسن کے سروے کے مطابق سرائیکی پالنڈھا وادی سندھ کی تہذیب سے وابستہ رہی ہے۔ اور زمانۂ قدیم سے سندھ سے لے کر کشمیر تک بولی جاتی تھی۔ اہل عرب بھی اس زبان سے واقف تھے۔ اس کا علمی مرکز ملتان رہا ہے جس کو "مول ستھان" کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ ملتان میں ہی رگ وید کی تحقیق ہوئی۔ ملتان کے قریب ٹیکسلا (ٹیکسلا ملتان سے زیادہ راولپنڈی کے قریب ہے "راقم") علم و ادب کا مرکز تھا۔ جہاں پر پانینی پاتنجلی، چانکیہ جیسے سرائیکی دانشمند ہندستان کی پرانی عمدہ تہذیب۔ ادب و ثقافت کے بہترین نمونے پیش کرتے تھے۔ کیونکہ ملتان اس وقت ایک خود مختار صوبے کی صورت میں تھا۔ اس لیے اس زبان کو "ملتانی" بھی کہتے ہیں۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ملتان کو فتح کر کے صوبہ پنجاب میں ملا دیا اور لاہور کو اپنا صدر مقام بنایا تو صوبے کی زبان کا نام ملتانی سے پنجابی پڑ گیا۔"

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرائیکی زبان کا ہی نام "ملتانی" اور بعد میں پنجابی پڑ گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی بترہ صاحب لکھتے ہیں... "حالانکہ پنجابی سرائیکی کا ایک جزو ہے اور یہ زبان صرف دو سو سال پرانی ہے"، ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں سرائیکی کا نام پنجابی پڑ گیا۔ یعنی سرائیکی زبان ہی پنجابی کہلائی لیکن ساتھ ہی بغیر کوئی دلیل دیے کہتے ہیں۔ کہ پنجابی زبان سرائیکی کا ایک جزو ہے اور اس کے صرف دو سو سال پرانے ہونے کے بارے میں بھی کوئی ثبوت نہیں دیا۔ دراصل انبالہ سے لے کر کشمیر اور صوبہ سندھ کی سرحدوں تک جو زبان بولی جاتی ہے وہ پنجابی ہے۔ کچھ حصّوں میں بول چال کے کچھ الفاظ اور بولنے کی لہجہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور یہ ہر کافی بڑے حصّے میں بولی جانے والی زبان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے اسے آپ سرائیکی کہیں یا پنجابی، کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بترہ صاحب کی اس تحریر سے حقیقت یہ ہے کہ اردو ہندستان کے تمام باشندوں، پھر کہتا ہوں تمام باشندوں کی (صرف مسلمانوں کی نہیں)

پانچ سو سالہ مشترکہ تہذیبی وراثت ہے اور اس کو بہت سے ہندوؤں نے اپنے خون جگر سے پالا ہے۔ ان کا اردو سے رشتہ مذہبی نہیں بلکہ ثقافتی اور ذہنی ہے۔" مجھے پورا اتفاق ہے۔ لیکن ان کا یہ بیان کہ "پاکستان کو، اس دھرتی کی قدرتی زبان سرائیکی ہی متحد کر سکتی ہے" بحث طلب ہے۔ جس طرح سندھی بلوچی اور پشتو بولنے والے اردو کو ایک غیر ملکی زبان سمجھتے ہیں، اسی طرح سرائیکی (یا پنجابی؟) کو بھی وہ تمام پاکستان کی قومی زبان نہیں قبول کریں گے۔ ہاں یہ تمام پاکستان کی رابطے کی زبان بن سکتی ہے جس طرح ہندستان میں چودہ زبان کو قومی زبانوں کا درجہ حاصل ہے اسی طرح پاکستان میں بھی اردو پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو ان سب زبانوں کو قومی زبانوں کا درجہ دیا جانا چاہیے۔ اور اردو اور پنجابی (سرائیکی؟) کو رابطے کی زبانیں ماننا چاہیے۔ جس طرح ہندی اور انگلش ہندستان میں رابطے کی زبانیں ہیں۔

● ریاض الرحمن شیروانی۔

کتاب نما کے ستمبر ۱۹۹۴ء کے شمارے میں جہاں مدیر جگدیش چندر بترہ صاحب کا اشاریہ حق اور ناحق کا عجیب و غریب امتزاج پیش کرتا ہے۔ اشاریے کے شروع میں اپنے نوٹ میں آپ نے بجا فرمایا ہے کہ "زیر نظر اداریہ موصوف کی اپنی زبان سرائیکی سے بے پناہ محبت کا ثبوت ہے۔" اور اپنی زبان، اپنے ملک، اپنی ثقافت، اپنے مذہب سے محبت بلاشبہ بہت قابل قدر جذبہ ہے۔ تاہم کسی کی بھی محبت میں حد سے تجاوز محمود نہیں ہے۔ جہاں تک سرائیکی کے ساتھ پاکستان کے عوام اور حکومت کے رویے کا تعلق ہے یہ ان کا اندرونی معاملہ ہے اور اس میں نہ ہمارا کوئی دخل ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ ہندستانی مسلمانوں سے مختلف معاملات مثلاً کشمیر کی صورت حال یا پاکستان میں کسی زبان کے ساتھ مفروضہ یا حقیقی زیادتی کے سلسلے میں یہ مطالبہ یا خواہش کرنا کہ وہ اس میں نمایاں کردار ادا کریں، ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ ان کے اپنے اتنے مسائل ہیں کہ انہیں ان ہی کے حل سے نجات نہیں ہے، وہ کسی دوسرے کی طرف منہ اٹھا کر کیا دیکھ سکتے ہیں؟ جہاں تک سرائیکی کو ہندستان کی قومی زبانوں کی فہرست میں شامل کرنے کا سوال ہے، کسی اردو والے کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جب ہمارا آئین وضع کیا گیا تھا، اس وقت اس میں چودہ زبانوں کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا تھا، بعد میں بعض اور زبانیں بھی اس فہرست میں شامل ہوتی رہی ہیں۔ اگر حکومت ہند کو مطمئن کیا جا سکے کہ واقعی ہندستان میں سرائیکی بولنے والوں کی تعداد اتنی ہے جتنی بترہ صاحب نے بتائی ہے اور واقعی یہ زبان علمی اور ادبی اعتبار سے اس کی مستحق ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندستان کی قومی زبانوں کی فہرست میں اس کا اضافہ نہ کر لیا جائے۔

اردو کے بارے میں بترہ صاحب کی یہ رائے قطعاً درست ہے کہ اردو بلاشبہ ہندستان کی قومی اور مشترک زبان ہے، نہ صرف اپنے دستوری حق کے لحاظ سے بلکہ عملی اعتبار سے بھی۔ چاہے کوئی کچھ بھی کیوں نہ کہے، اردو تنہا مسلمانوں کی زبان ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ آج بھی اس ملک کی مشترک زبان ہے اور اس میں اظہار خیال کرنے والے غیر مسلم آج بھی اتنی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور اردو علم و ادب میں ان کا مقام اتنا بلند ہے کہ اردو کو تنہا مسلمانوں کی زبان قرار دینا حق و صداقت کے سارے اصولوں سے روگردانی کے مترادف

ہوگا۔ یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ وہ غیر مسلم حضرات بھی جو اردو کے جانے مانے ادیب یا شاعر ہیں اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھا رہے ہیں۔ اس کی تکذیب یا تردید اصلاً ہمارے ان غیر مسلم بزرگوں اور دوستوں کی ذمّے داری ہے۔ میں ایک مرتبہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ "این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند" یعنی مسلمانوں میں بھی ایسے حضرات کی کمی نہیں ہے جن کی اولاد اردو کی تعلیم سے محروم ہے۔ اس میں فرق کمیّت کا ہو سکتا ہے کیفیت کا نہیں ہے۔

دراصل جو مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اردو اب خالص مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے اُن کا معاملہ کچھ ایسا ہے جیسے کوئی شخص آپ سے مسلسل یہ کہتا رہے کہ تم فلاں مکان یا فلاں دکان کی اصلاح و مرمّت کے تنہا ذمّہ دار ہو، حالانکہ واقعہ یہ نہ ہو، لیکن آپ چڑ کر یہ کہیں کہ اچھا ایسا ہی سہی، میں اس مکان یا دکان کی مرمت کرا کے دکھا دوں گا۔ اسی طرح ہمارے غیر مسلم بھائیوں کے ایک طبقے نے حصول آزادی کے بعد سے مسلسل یہ کہنا شروع کیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور اب بہت سے مسلمان چڑ کر یہ کہنے لگ گئے ہیں کہ اچھا یہی سہی، اس میں ہرج کیا ہے مسلمان اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ اگر اردو ان ہی کی زبان ہے تب بھی اسے ہندستان میں رہنے اور ترقی کرنے کے پورے ذرائع حاصل ہونے چاہئیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ شکست خوردہ ذہنیت کا مظاہرہ اور حقیقت سے غیر ضروری انکار کے مترادف ہے جب اردو واقعی ہمارا قومی ورثہ اور ہمارے مشترک تمدن کی سب سے نمایاں علامت ہے تو ہم کسی سے چڑ کر اس کی اس حیثیت سے کیوں دست بردار ہو جائیں۔

دراصل ہوا یہ کہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحق جیسے بزرگوں نے پاکستان جا کر کہنا شروع کیا کہ اردو نے پاکستان بنوایا ہے۔ اس لیے اردو کو پاکستان کی قومی اور رابطے کی زبان ہونا چاہیے۔ ادھر ہندستان میں شری پرشوتم داس ٹنڈن اور ان کے حامیوں نے کہنا شروع کیا کہ اردو نے پاکستان بنوایا ہے۔ لہٰذا اردو کو ہندستان بدر کر دینا چاہیے گویا اس بات پر تو ایک طرف مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحق اور دوسری طرف راج رشی شری ٹنڈن اور ان کے حامی متفق تھے کہ اردو نے پاکستان بنوایا ہے لیکن اس سے نتیجہ دونوں علاحدہ علاحدہ نکالتے تھے۔ اس سے پاکستان میں اردو کو جو بھی فائدہ پہنچا ہو، ہندستان میں یقیناً نقصان پہنچ گیا اور پہنچ رہا ہے۔ گویا اس نقصان کی ذمّے داری تنہا ٹنڈن جی اور ان کے قبیل کے بزرگوں پر نہیں ہے بلکہ سرحد پار کے بھی ان کی ذہنیت کے حامل لوگوں پر ہے۔

● ڈاکٹر بیتاب علی پوری۔ ۵ کنارا اپارٹمنٹ، سیکٹر روہنی۔ نئی دہلی۔۸۵

"سرائیکی" سے متعلق "پرتاپ" (۱۳ ستمبر) میں "کتاب نما" کے حوالے سے ایک خبر شائع ہوئی جس میں "سرائیکی" زبان سے متعلق لکھا گیا ہے کہ "سرائیکی" صدیوں پرانی زبان ہے۔ درحقیقت اس زبان کو "ملتانی" کہا جاتا ہے ملتان ڈویژن اور گرد و نواح میں بولی جانے والی یہ زبان جس کا رسم الخط "کڑوکی" یا "لنڈے" ہوا کرتا تھا لکھی اور بولی جاتی تھی۔ علاقہ کے لوگ اردو رسم الخط میں بھی لکھتے تھے۔ محمود عز نو

کی ہندستان میں آمد پر فارسی کا اثر بھی ہوا جس سے اردو کا جنم بتایا جاتا ہے۔ ریاست بہاولپور میں بھی یہی بولی بولی جاتی تھی۔ عزت مآب گرو نانک دیو۔ بابا فریدؒ، بلھے شاہ کی بھی یہی زبان تھی جسے سب اپنی "ماں بولی" کہتے تھے۔ لیکن ۱۹۴۷ تک تو اس کا نام ملتانی ہی رہا بلکہ بعد کی کئی دہائیوں تک بھی یہ زبان ملتانی ہی کہلائی۔ چونکہ پاکستان میں سیاست دانوں کو کچھ تو چاہیے تھا، انھوں نے ملتان ڈویژن اور گرد و نواح کے علاقہ کو زبان کے لحاظ سے تقسیم کرنے اور ایک صوبہ بنانے کا اعلان کرتے ہوئے علاقہ کی زبان کو "سرائیکی" کا نام دیا۔ آج بھی مذکور علاقے میں "سرائیکستان" کا مطالبہ بڑھتا جا رہا ہے چونکہ زبان کا طریقہ استعمال مشترک ہے۔ تذکیر و تانیث کے قواعد۔ افعال مرکبہ و توابع میں یکساں ہیں رسم الخط صرف اردو ہی ہے جو فارسی سے مستعار ہے اور اس پر طرہ یہ کہ تقریباً چار کروڑ لوگوں کی زبان ہے اور پھر پاکستان کے وجود میں آنے پر جو لوگ اس علاقے کو چھوڑ کر ہجرت کر کے ہندستان میں آ گئے ہیں ان کی تعداد بھی تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہی ہے جو راجستھان مدھیہ پردیش، بہار، گجرات میں آباد ہوئے لیکن ان کی تعداد پنجاب اور ہریانہ میں بہت ہی زیادہ ہے۔ اسے سنسکرت سے بھی زیادہ عرصہ کی زبان بتانے والے یہ نہیں سوچتے کہ کہاں "سنسکرت" اور کہاں "سرائیکی"؟ جس کا کوئی رسم الخط اپنا نہیں۔ اور پھر "کرڑکی" یا "لنڈے بھاشا" سوائے بوڑھے لوگوں کے کوئی نہیں جانتا۔ اردو کا بھی یہی حال ہے کہ اب یہ زبان بھی دم توڑتی نظر آتی ہے کیونکہ اس کو بھی سیاست دانوں نے نہ گھر کا رکھا نہ گھاٹ کا۔ اسے مسلمانوں کی زبان کہنے والوں نے غیر مسلم لوگوں کو اس سے دور کر دیا اور مسلمانوں نے بھی اس سے کنارا کشی اختیار کر لی۔ ان کے بچے تک اس زبان سے نابلد ہیں۔ بُرا نہ مانیں یہ ایک حقیقت ہے کہ اس میٹھی زبان کا اب کوئی پُرسان حال نہیں۔ البتہ دال مانڈے کے متلاشی لوگ اس سے ضرور فیض یاب ہو رہے ہیں۔

بتاتے ہیں کہ سنسکرت کی گرامر کے اولین مؤلف اپانتی ایک ملتانی دانشور تھے۔ یوگ شاستر کا مصنف پاتنجلی ملتان کا رہنے والا تھا۔ گرنتھ صاحب میں بابا فرید کا مقدس کلام "ملتانی" میں ہے جسے آج "سرائیکی" کہا جا رہا ہے ان کی مادری زبان بھی یہی تھی۔ حضرت امیر خسرو نے بھی پانچ سال کا عرصہ ملتان میں گزارا اور انھیں اس زبان اور ادب، کلچر پر فخر تھا۔ یہی زبان علاقہ میں فرقہ وارانہ میل ملاپ کی نمائندہ تھی جس کا اثر اردو پر ہوا۔ اور یہ تمام خوبیاں اس میں شامل ہو گئیں ابو الفضل نے "آئین اکبری" میں ملتانی زبان کی خوبیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

اردو نثر کی پہلی کتاب "سب رس" میں بھی ملتانی کے بہت سے الفاظ موجود ہیں۔ غالب میر، درد۔ نظیر وغیرہ کے کلام میں بھی اس زبان کا کچھ اثر ملتا ہے۔ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر کرسٹافر سیک کے مطابق اردو میں ۳۰۰ سے زائد ملتانی الفاظ ہیں۔ محاورے اور استعارات بھی بکثرت ملتے ہیں لیکن تقسیم وطن کے بعد بھارت میں ہجرت کر کے آنے والے تقریباً ڈیڑھ کروڑ لوگوں کو نہ تو پنجابیوں نے گلے لگایا اور نہ ہی ہریانہ والوں نے۔ بلکہ ان کی زبان کا

بھی کوئی پرسان حال نہ رہا۔ آہستہ آہستہ یہ زبان اردو اور ہندی رسم الخط میں لکھی جانے لگی یتیم، ہمت، غالب ثانی ملتانی زبان تیجالال موجی، دیوان بیلا رام دیوان۔ ہرشچندر ناز، ڈاکٹر خوشدل کی یہ زبان جس میں آہستہ آہستہ شامل ہوئے۔ جناب جیمنی سرشار (راجکوی ہریانہ) شہید علی پوری، آتش بہاول پوری، ڈاکٹر بیتاب علی پوری، اور پھر آج اس ملتانی زبان کے شعرا میں جناب ہیرا نند سوز، طالب، چاند، نشتر، بیدار سرس، رانا گنوری، دلبر، نارنگ، پنکج دیگر، سبھاش ملتانی، آتم دیو نارنگ، پرتاپ آریہ آزاد، کیف، ناز لائل پوری، کرشن مدان، بودھراج ظفر، شباب للت آنند، درد، پریتم اعجاز وغیرہ کے علاوہ کئی نکھاری میدان میں اور بھی آرہے ہیں "ہائیکو" کے مقابلہ میں "سرائیکو" لکھنے والے سوز، اور ملتانی (سرائیکی) میں ٹکریاں۔ آزاد نظمیں، تضمینات کے مشہور لکھنے والے ڈاکٹر بیتاب علی پوری نے بھی اپنا مقام بنایا ہے۔ پاکستان کا دورہ کرکے آنے والوں میں جناب راجیندر جی آنند، جگدیش چندر بترہ وغیرہ نے "ملتانی کو" "سرائیکی" کے نام سے زندہ کیا ان کا مشن "سرائیکی" کی ترقی کے لیے چلا لیکن اس "سرائیکی" علاقہ کے دلّی وزیر اعلا شری مدن لال کھورانہ نے یہ کہہ کر کہ "آپ کا میمورنڈم انگریزی میں ہے، دستخط تقریباً انگریزی میں ہیں۔ اپنی زبان میں آپ کا مطالبہ نہیں" اس لیے "سرائیکی اکادمی" نہیں بن سکتی، آپ کا مطالبہ ٹھکرا دیا۔ ان کی کھری کھری سے ہو سکتا ہے کہ "سرائیکی" کے شیدائیوں کے دل ٹوٹ جائیں لیکن انھیں ہمت کرنا ہے۔ رسم الخط اردو۔ ہندی سے فیضیاب ہو کر "سرائیکی" (ملتانی) کے لیے کوشاں رہنا ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح اسے بھی ایک زبان گرداننا ضروری ہے۔

● محمد فاروق اعظم سکریٹری ادارہ تحقیق و ترقی اردو بھاگل پور، بہار۔

کتاب نما (ستمبر ۱۹۹۴) نظر نواز ہوا۔ مشمولات پر سرسری نگاہ ہی ڈال سکا ہوں۔ البتہ بیرسٹر جگدیش چندر بترہ کے اشاریہ "سرائیکی اور اردو" کا مطالعہ میں نے بار بار کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ موصوف کو سرائیکی اور اردو دونوں زبانوں سے بیک وقت والہانہ محبت ہے اور وہ ایک سچے عاشق کی طرح دونوں کے لیے جان دینے کو تیار ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ بیک وقت دو کے ساتھ عشق لڑانے کا جو انجام عام طور سے ہوا کرتا ہے وہی اس تحریر میں بیرسٹر موصوف کے ساتھ بھی ہوگیا ہے وہ سرائیکی کو اردو زبان کی ماں بتاتے ہیں جو بوڑھی ضرور ہو چکی ہے مگر زندہ ہے اور اردو؟ ایک نئی اور جوان زبان ہے۔ وہ عام انسانی کمزوری کو پس پشت ڈال کر جوان بیٹی (یعنی اردو) پر نظر التفات نہ ڈال کر بوڑھی ماں (سرائیکی) کو توجہ کا مرکز ٹھہراتے ہیں اور وجہ اس کی وہ یہ بتاتے ہیں کہ اگر حقیقت پسندی سے کام لے کر پاکستان سرائیکی کے دعوے کے مطابق اسے اپنی قومی زبان تسلیم کرلے تو اس طرح ہندستان کی زبان اردو کے چھینے ہوئے اور دبے ہوئے حقوق بحال ہوسکتے ہیں چہ معنی دارد؟

موصوف اردو کے پاکستان کی قومی زبان ہونے پر بھی معترض ہیں حالانکہ جب وہ سرائیکی کو اردو کی ماں بتاتے ہوئے پاکستان میں اسے جائز حق دلانا چاہتے ہیں تو پھر وہ اردو

کو سرائیکی کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے پاکستان سے نکالا دلوانے پر مصر کیوں ہیں؟ حالانکہ وہ اپنے گرانقدر مقالے کے آغاز ہی میں فرماتے ہیں کہ "سرائیکی برصغیر کی سب سے پرانی اور زندہ زبان ہے اور اردو اسی خطہ کی سب سے نئی اور جوان زبان ہے اور پھر وہ آگے چل کر زبان کو ملک اور علاقے کی بنیاد پر تقسیم کرنے کی بات چھیڑ دیتے ہیں اور اس کے باوجود وہ خود کو کوئی سیاسی آدمی کہلانا پسند نہیں کرتے۔

یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں تاہم چند ضروری باتوں کی جانب توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ تاریخ کو توڑنے مروڑنے کا ایک سلسلہ سا چل پڑا ہے۔ زبان کی تاریخ پر بھی اس کا اثر پڑ رہا ہے۔ اس سے بڑا نقصان ہونے کا اندیشہ ہے لہٰذا اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ اردو اب اپنے آپ میں ایک مکمل زبان ہے اور کسی دوسری زبان کا سہارا لیے بغیر بھی آگے ترقی اور فروغ حاصل کر سکتی ہے اور کر رہی ہے۔

۳۔ زبان کے سلسلے میں حد بندی جائز نہیں ہاں اگر کوئی چاہے کہ ہم کسی خاص زبان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کریں تو وہ خوشی سے کر سکتا ہے مگر اسے یہ کام بلا شرط کرنا چاہیے۔

● شمس فرخ آبادی، سحر منزل، گولہ گنج۔ لکھنؤ،

زیر نظر مضمون میں اٹھا ہوا ہر سوال محترم بیرسٹر بترہ صاحب کے ضمیر کا آئینہ دار ہے سرائیکی زبان اردو کی ماں ہے یا نہیں ہے یہ تو اردو کے اور سرائیکی کے محققین جانیں۔ افسوس ہے کہ بیرسٹر صاحب نے جوش میں آکر ہوش کا دامن چھوڑ کر کوسنا کاٹنا بھی شروع کر دیا صاحب، اس بدنصیب اردو پر وقت ہی وہ پڑا ہے کہ اب جو چاہے اسے "مذہبی مصلحتوں کی کنیز" کہے! جو چاہے سرائیکی کے یا کسی زبان کے مقابلے میں اسے معصوم دوشیزہ یا بالفاظ دیگر نوچی کہے یا بی جمالو کہے۔

بندہ نواز یہ تو "نا تھو رام گوڈسے" کو پوچھنے والوں کا کہنا ہے کہ پاکستان اردو بولنے والوں نے بنوایا۔ جبکہ اگر پلٹ کر پھر انھیں سے سوال کیا جائے کہ حضور والا آپ انقلاب یا زندہ باد، مردہ باد کہہ کر اپنی زبان کیوں خراب کر رہے ہیں۔ سارے جہاں سے اچھا بھی تو اردو ہی کی دین ہے۔ اب اس کو کیا کریں کہ زبانوں کی "نوچی" "یا بی جمالو" کو پاکستان نے اپنی قومی زبان بنا لیا۔ اور یہاں وہ اس لیے عتاب کا نشانہ بن گئی (بقول موصوف محترم کے) کہ وہ پاکستان کی زبان کیوں بنی۔ ورنہ وہ تو ہمارے دیش کی زبان تھی اور ہے۔

یعنی یہاں تو دیس نکالا مل ہی چکا، وہاں سے بھی راندے درگاہ ہو۔ حق سرائیکی کا ہے بڑی مشکل تو جب پڑتی ہے جب کوئی دانشور، یا پڑھا لکھا ایسی بات کرے جس کو سن کر یا پڑھ کر خون کے سے گھونٹ پینا پڑیں۔

مجھ اجہل، ہیچمداں نے تو اب تک سنا یہ تھا کہ دو لکیروں میں سے جس کو بڑا کرنا ہے ان میں سے کسی ایک کو مٹا کے چھوٹا کرنے کے بجائے مقابل کی لکیر کو بڑھا دو۔ سرائیکی کی اہمیت افادیت سر آنکھوں پر آپ یا سرائیکی کے دوسرے چاہنے والے اس کو بھی اتنی شیریں بامحاورہ بنائیں، پھر کوئی میر، غالب، اقبال

فراق، منٹو، کرشن چندر پیدا کریں، میں محترم کو یقین دلاتا ہوں مظلوم اردو خود بہ خود اللہ کو پیاری ہو جائے گی۔

اگر موصوف محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے جملے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے جلے پھپولے پھوڑ رہے ہیں تو میں ادب سے گزارش کروں گا کہ وہ ایک بار پھر ان قبلہ فاروقی صاحب کے بیان پر نظر ڈال لیں۔ تو انھیں عبارت کی گہرائی اور گیرائی ناپنے کا بھی ہنر آجائے گا۔

● علی عباس از ل ۸/ ۶۔ اسٹار نیشن۔ مرزا غالب روڈ۔ بمبئی ۸

یہ ایک نیک فال ہے کہ آپ "سرائیکی اور اردو" جیسے اشاریے شائع فرما رہے ہیں امید ہے کہ جلد ہی اس طرح کے مقالات عالیہ کی بدولت کتاب نما کاپی نما بن جائے گا۔

بیرسٹر صاحب نے اچھا کیا جو مضمون کورٹ کی لائبریری میں بیٹھ کے لکھا جہاں مقدمات کی نظیریں اور لغات کی کتابیں تو ہوتی ہیں مگر تاریخ و لسانیات جیسے فضول علوم نہیں دستیاب ہوتے۔ اسی لیے مضمون ان سے ملوث نہیں ہو سکا اور حقائق و اصداق سے ایک مقدمے ہی کی طرح دامن بچا گیا۔

بیرسٹر صاحب کی سرائیکی سرپرستی تو خیر تعجب کی بات نہیں کہ ہر بڑا آدمی کسی نہ کسی شے کی سرپرستی ضرور کرتا ہے خواہ وہ اکھاڑا ہو، فٹ بال کی ٹیم ہو، ناٹک کمپنی ہو، زبان کی انجمن ہو لیکن اردو کے تعلق سے موصوف نے جس علمیت اور رعیت کا اظہار فرمایا ہے وہ اردو والوں کے لیے مقام فکر ہے کیونکہ انھوں نے جو مسلمانوں کو ملک کی تقسیم کا ذمے دار ٹھہرایا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ تاریخ اور شمس الرحمٰن فاروقی تو خواہ مخواہ ہندوؤں کو اس فعل بد میں شریک کیے لے رہے ہیں۔ یہ فاروقی جی کا تعصب ہے جس نے انھیں ایسا سوچنے پر مجبور کیا۔

ہم نے جو ہندی کو قومی زبان بنایا وہ اس لیے کہ ایسا کرنے کے لیے ہمارے پاس جواز ہی جواز تھے مثلاً کشمیر، پنجاب، گجرات، مہاراشٹر، گوا، کرناٹک، کیرالا، تامل ناڈو، پانڈیچری، آندھرا پردیش، اڑیسہ، بنگال، تریپورہ، منی پور، ناگالینڈ، آسام، سکم وغیرہ میں ہندی ہی وہاں کے لوگوں کی مادری زبان تھی۔ علاقائی زبانیں تو کونے کھدرے میں سنائی دے جاتی تھیں لیکن پاکستان والوں نے جو اردو کو قومی زبان بنایا وہ تو سرائیکی کے ساتھ کھلی ہوئی ناانصافی ہے۔ بے ایمانی ہے۔

ایک تو جب ہم نے اردو کو دیس نکالا دے دیا تو پاکستان کو اسے قومی زبان بنانے کا کیا حق تھا۔ دوسرے شمال مغربی سرحدی علاقہ پنجاب، بلوچستان اور سندھ میں تقسیم سے پہلے ہندو اور سکھ کیا خود مسلمان نہیں جانتے تھے کہ اردو کس چڑیا کا نام ہے بس ہر طرف سرائیکی ہی سرائیکی چہچہا رہی تھی۔ سیکڑوں ہندو، سکھ، مسلمان، عیسائی ادیب و شاعر ہی تھے محض لاعلمی و جہالت کی وجہ سے اردو زبان کا سمجھ لیا گیا۔ اب سرائیکی کے سر اٹھانے کا وقت آگیا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہندستان کی اس قدیم ترین زبان (ایک روایت کے مطابق ہندستان اور سرائیکی دونوں ایک ساتھ کرہ ارض پر نمودار ہوئے تھے) کو ماہرین لسانیات اور اس کے بولنے والے لنڈھا یا ملتانی کہتے ہیں۔ سرائیکی کے نام سے تو صرف بیرسٹر صاحب ہی واقف ہیں اس لیے پہلے لنڈھائیوں کو سمجھا!

پڑے گا کہ ہم نے اس کا ایک اچھا سا نام رکھ دیا ہے۔ خیر نام سے کیا ہوتا ہے، ہمیں لنڈھائی کو پاکستان کی قومی زبان بنوانے میں بیرسٹر صاحب کا دامے، درمے، قدمے سخنے، قلمے، اور بندوقے ساتھ دینا چاہیے۔

● پروفیسر اُدے بھانو ہنس، ہنس وہار، ۲۰۲ لاجپت نگر، حصار، ہریانہ۔

کتاب نما کا شمارہ ۹۰ نظر سے گزرا۔ جہاں مدیر بیرسٹر جگدیش چندر بترہ کا اشاریہ پڑھا۔ نہایت دلچسپ اور بے باک انداز میں انھوں نے سرائیکی اور اردو زبان کے متعلق جن خیالات کا اظہار انھوں نے کیا ہے وہ نہ صرف قابل غور ہیں بلکہ قابل تعریف بھی۔ سرائیکی میری مادری زبان ہے۔ اردو۔ فارسی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور کالج میں ہندی سنسکرت پڑھاتا رہا ہوں۔ فارسی کو چھوڑ کر ان سبھی زبانوں میں کچھ ادبی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ لہٰذا میں کہہ سکتا ہوں کہ بیرسٹر بترہ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے پہلی بار کچھ اہم سوالات اٹھائے ہیں کہ اردو اور سرائیکی کو ہندستان اور پاکستان میں واجب مقام دینے اور ان کے ساتھ منصفانہ سلوک کرنے میں کوتاہی برتی گئی ہے۔ لسانی اعتبار سے کہیں کہیں بترہ صاحب کی رائے سے اختلاف کی گنجائش ہے کیونکہ سرائیکی زبان کے ساتھ ان کی بے انتہا محبت نے انھیں کچھ جذباتی بھی بنا دیا ہے لیکن اردو اور سرائیکی کے کیس کو عوام کی عدالت میں انھوں نے ایک تجربہ کار اور قابل بیرسٹر کی طرح مدلل طریقے سے پیش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مثال کے طور پر زبان کو کسی مذہب۔ فرقہ یا قوم سے وابستہ کرنا غلط ہے۔ اردو بنیادی طور پر ہندستان کی زبان ہے اور ہندستانی مشترکہ تہذیب کی ترجمان بھی۔ وہ واقعی پاکستان کے کسی صوبہ کی مادری زبان نہیں۔ بھلے ہی پنجاب میں وہ کافی عرصہ سے ادبی زبان رہی ہے۔ اسی طرح تقسیم وطن کے بعد سرائیکی زبان میں ادبی تخلیق (ہر صنف میں) جس تیزی کے ساتھ ہوئی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔" بیرسٹر جگدیش بترہ کے مضمون میں یہ ایسے حقائق ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک پاکستان میں (یا پنجاب میں) قومی زبان کون سی ہو۔ اس کا فیصلہ کرنا پاکستانی سرکار اور عوام کا کام ہے۔ مگر وہاں سرائیکی زبان کے ساتھ ہو رہی بے انصافی قابل مذمت ہے۔ اسی طرح آزادی کے بعد بھارت میں اردو زبان کی اہمیت کو صرف ادبی اور ثقافتی اعتبار سے نہیں بلکہ قومی ایکتا کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی تسلیم کرنا لازمی ہے۔

● ڈاکٹر گیان چند۔ لکھنؤ

ستمبر ۹۴ء کے کتاب نما میں عبداللطیف اعظمی صاحب کا بیش بہا مضمون ہندستان کے بزرگ ادیب و شاعر نظر سے گزرا۔ ان میں چار بزرگوں کی تاریخوں کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے بارے میں مجھے شخصی طور پر معلوم ہے۔

۱۔ حیات اللہ انصاری صاحب کی تاریخ ولادت یکم مئی ۱۹۱۱ء لکھی ہے۔ انھوں نے مجھے خود یکم مئی ۱۹۰۸ء بتائی۔

۲۔ نورالحسن ہاشمی کی تاریخ یکم جولائی ۱۹۱۳ لکھی ہے۔ صحیح ۲۱ اگست ۱۹۱۱ء ہے جو ان کے مجموعہ کلام اندرونظم، لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۱۵۷ پر درج ہے۔

۳۔ مجروح سلطانپوری کی تاریخ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک لکھی ہے میرے کہنے پر چند ماہ پیشتر

کالی داس گپتا رضا صاحب نے مجروح سے دریافت کر کے مجھے ۱۷ جنوری ۱۹۲۰ء جمعہ صبح چار بجے بتائی۔

۴۔ تارا چرن رستوگی کی تاریخ یکم جولائی ۱۹۱۹ء لکھی ہے۔ خود انھوں نے مجھے صحیح تاریخ ۱۹ جون ۱۹۱۰ء لکھی ہے۔

(حضرت وامق جونپوری کی تاریخ بھی غلط لکھی ہے اس کو وامق صاحب کے خط کے مطابق ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۹ء ہونا چاہیے۔ (ادارہ کتاب نما)

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نہیں رہے

محترم امیر الدین، ش، حکیم صاحب کے تار اور خط کے مطابق اردو کے ممتاز محقق، دانشور اور ہر دلعزیز استاد ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کا ۳۰ ستمبر ۱۹۹۴ء کو صبح پانچ بجے سورت میں انتقال ہوگیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ تدفین دوسرے دن خواجہ مدنی صاحب کی درگاہ میں عمل میں آئی۔ موصوف بمبئی کے اسماعیل یوسف کالج میں شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ مکتبہ جامعہ سے موصوف کو گہرا لگاؤ تھا۔ علمی، ادبی، تاریخی موضوعات پر موصوف نے بہت لکھا ہے جس کو علمی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مطبوعہ کتابوں میں اردو اسیر، ولی گجراتی، گجری مثنویاں، گجرات کے اردو شعرا بہت اہم کتابیں ہیں۔ ادارہ کتاب نما مدنی صاحب کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور متعلقین کو صبر کی تلقین فرمائے۔ آمین ثم آمین

اظہار تعزیت

اردو کے نامور محقق ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ۳۰ ستمبر ۹۴ء کی صبح اپنے آبائی وطن سورت میں رحلت فرما گئے۔ ان کی عمر ۸۷ سال تھی۔ آخری دنوں میں بہت نحیف ہو گئے تھے۔ "ولی گجراتی"، "شعرائے گجرات"، "رسالہ نور المعرفت" اور "میاں داد خاں سیاح" کے علاوہ "مضامین مدنی" اور "گجری مثنویاں" ان کی اہم تحقیقی تصانیف ہیں۔ مرحوم اسماعیل یوسف کالج بمبئی میں اردو کے پروفیسر رہے اور انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے طور پر بھی طویل عرصہ تک کام کیا۔ ان کی ادارت میں نکلنے والا انسٹی ٹیوٹ کا تحقیقی رسالہ "نوائے ادب" اس زمانے کا ایک اہم علمی جریدہ تھا جس میں اکابرین ادب کے بیش بہا تحقیقی مضامین اشاعت پذیر ہوئے۔ مرحوم کی "شعرائے گجرات" اس لحاظ سے ایک اہم کتاب ہے کہ اس میں نہ صرف گجرات کے شاعروں کا بلکہ گجرات کے اہم خاندانوں کا ایسا جزرس بیان ہے کہ ایک پورے عہد کی ثقافتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان اور ان کا شگفتہ اسلوب ان کی تحقیقی کاوشوں کو بھی ادبی مسرت کا سرچشمہ بناتا ہے۔ قاضی اختر جوناگڑھی اور مدنی صاحب دونوں گجرات میں اردو تحقیقات کی مایۂ ناز ہستیاں تھیں۔ ان کے کام کو آگے بڑھائے، ایسا کوئی شخص اب نظر نہیں آتا۔ (وارث علوی)

عرض ہے

چند مجبوریوں کی وجہ سے اس مرتبہ ادبی خبریں شائع نہیں کی جا رہی ہیں۔ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔

(ادارہ کتاب نما)

واموق جونپوری کا خط اڈیٹر کتاب نما کے نام

خامہ بگوش کے ایک خط کا اقتباس
"......یہ عجیب بات ہے کہ میری آدھی عمر کالم لکھنے میں ضائع ہوئی اور آدھی معذرتیں پیش کرنے میں۔ اب تو میں سراپا "معذرت" ہو گیا ہوں"

...... وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

قاری یا نقاد کو پورا اختیار ہے کہ وہ کسی تحریر یا تخلیق کو پسند کرے یا نہ کرے اس کو یہ بھی حق ہے کہ وہ زبان و بیان و اسلوب پر کھل کے نکتہ چینی کرے یا کسی مسلم الثبوت غلطی کو نشانہ ملامت بنا کے اس کی اصلاح پیش کرے مگر علم و ادب کے بڑے سے بڑے سربراہ کو بھی حق نہیں کہ وہ کسی کی نیت پر محاکمہ کرے اور یا فطری عالمی یا علمی حقائق اور کلیات پر اپنا نظریہ تھوپنے کی سعی کرے جب تک کہ ناقابل تردید ثبوت موجود نہ ہو۔ ان ناقابل تردید کلیات کی روشنی میں راقم الحروف کو ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی کے شمارہ جولائی ۱۹۹۴ء میں صفحات ۴۴ تا ۴۸ پر شائع شدہ خامہ بگوش کی تنقید اور ان کے انداز فکر و تحریر کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

غرض دیکھیے اب یہ پانی چلا

۱۔ کتاب نما کے صفحہ ۴۶ پر سردار جعفری کا ضمیر کس کی ملامت کر رہا تھا؟ قاری کو مغالطہ میں ڈالنا بڑا جرم ہے، خامہ بگوش کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ضمیر جس کا ہوتا ہے اسی کی ملامت کرتا ہے۔ اور بہرکیف میرا آخری جملہ مکمل تھا۔ خامہ بگوش کی تحریر میں زبان و بیان کی بھی غلطی ہے۔ ضمیر کسی "کو" ملامت نہیں کرتا۔ اس کو ہونا چاہیے تھا سردار کا ضمیر سردار "کی" ملامت کر رہا ہوگا۔

۲۔ خود نوشت "گفتنی ناگفتنی" کے صفحات ۳۲۹ تا ۳۳۴ میں میرے جشن الماسی کا تذکرہ ہے۔ اس جشن کا ذکر اگر میں نے قدرے تفصیل سے کیا ہے تو کون سا اخلاقی یا ادبی جرم کیا سوچنے کا مقام ہے کہ یہ دن کتنوں کو نصیب ہوتا ہے اور جن کو ہوتا بھی ہے تو ان میں کون اور کتنے لوگ اس کو اتنے بڑے پیمانہ پر منانے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ میرے کتنے احباب اور پرستاروں نے اس جشن پر (میری مرضی کے خلاف) ہزاروں روپے خرچ کر دیے۔ وہاں میں نے اگر دسترخوان پر کسی exotic پکوان کی تعریف کر دی تو کون سا جرم کیا۔ ڈاکٹر جانسن انگریزی زبان کا عالم اپنے پرستاروں کے درمیان اشیاء خورد و نوش پر گھنٹوں گفتگو کیا کرتا تھا (بالخصوص آلو پر) اور بوسول جانسن کی زیر تدوین سوانح عمری کے لیے اس کو لکھ لیا کرتا تھا۔ خود نوشت کے ان صفحات میں بحثوں اور تقریروں کا اجمالی ذکر بھی ہے اور اس ضمن میں خود میری گفتگو بھی قابل توجہ ہے۔ خود نوشت کے وہ پچھے

صفحات اردو ادب کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس رپورتاژ کو پڑھنے پر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندی کے پرگتی شیل نقیبوں کو میری شاعری سے کتنی دلچسپی ہے۔ اور میری نظم "سفر ناتمام" کو تو وہ لوگ مشعل راہ تصور کرتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو .B.H.U کے ہندی ادب کے پروفیسر ڈاکٹر اودھیش پردھان یا الہ آباد کے پروفیسر ڈاکٹر علی احمد فاطمی سے دریافت کر لیجیے۔

۳۔ اب ملاحظہ ہو خود نوشت "گفتنی ناگفتنی" کے صفحہ ۱۰۰ کا آخری پیراگراف مجھ کو پاکستان کی اندرونی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ اس امر سے کہ بقول خامہ بگوش اُن دنوں صدر پاکستان صہبا لکھنوی مدیر افکار سے بہت خوش تھے۔ اس کی بھی مجھ کو کوئی اطلاع نہ تھی۔ مدتوں سے میں نے افکار کبھی نہیں پڑھا تھا۔ مجھ کو تو صہبا کی ذات سے دلچسپی تھی۔ وہ میرا پرانا دوست ساتھی اور ترقی پسند ادیب تھا اور ہے اور قرۃ العین حیدر عرف عینی بھی ایک بلند پایہ ترقی پسند شخصیت، سجاد حیدر یلدرم کی دختر نیک اختر اور میرے مرحوم دوست جرار حیدر کی چچا زاد بہن۔ جب ہم لوگ صہبا سے صاحب سلامت کر چکے تو صہبا نے احتیاطاً میرے اور عینی کے مفاد کے مدنظر ہم دونوں کا وہاں سے جلد از جلد چلا جانا مناسب جانا نہ یہ کہ بقول خامہ بگوش کے ہم دونوں کو چاء نہ پلانی پڑے۔ اس لیے "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"، یہ انداز فکر ہی کس قدر گھٹیا اور شرمناک ہے۔ مزید براں بزدل اتنے کہ از ابتدا تا انتہا سہواً بھی عینی کا نام حضرت خامہ بگوش کی زبان قلم پر نہ آنے پایا کہ مبادہ محترمہ ان سے ناراض ہو جائیں۔ میں خوش ہوں کہ ایک ہستی ہے تو جس سے خامہ بگوش خوف زدہ رہتے ہیں۔ معلوم نہیں دل سے عینی کا احترام بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ البتہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ فرد جس سے خوف زدہ رہتا ہے اس کا دل سے احترام نہیں کرتا۔

۴۔ اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی یعنی ملاحظہ ہو میرے چھے اقساط والے مسلسل خواب کا پوسٹ مارٹم۔ خامہ بگوش فرماتے ہیں "اس خواب میں بیسیوں افراد آتے ہیں اور واثق صاحب کو نہ صرف ان افراد سے ہونے والی طویل گفتگو پوری طرح یاد رہی بلکہ یہ بھی حافظہ میں محفوظ رہا کہ کس نے کیسے اور کس رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہی نہیں واثق صاحب نے خواب کی چھٹی قسط کے شروع میں یہ بھی بتا دیا کہ نیند کا پوری طرح غلبہ ہو جانے کے ایک گھنٹہ بعد یہ خواب شروع ہوا۔ ممکن ہے بعض لوگ پوچھیں کہ واثق صاحب کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ سونے کے کتنی دیر بعد خواب شروع ہوا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ واثق صاحب وقت کی پابندی کے عادی ہیں۔ انھوں نے خواب کے شروع اور ختم ہونے کے اوقات مقرر کر رکھے تھے" اب آپ "گفتنی ناگفتنی" کے صفحات ۳۱۷ تا ۳۲۰ سامنے رکھ لیجیے۔ اس خواب کے ضمن میں بھی مفت خامہ بگوش مغالطہ آئی اور سراسر غلط بیانی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ صفحہ ۳۱۷ پر میں نے تحریر کر دیا تھا کہ "پہلے یہ خواب تفصیل سے یاد تھا بوقت تحریر کتنا یاد رہ سکا کہا نہیں جا سکتا" البتہ نفس واقعہ میں کوئی فرق نہ ہوگا "اب یہاں

[illegible]

ں امر کے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ خواب تحریر کرنے کا وہ کون سا رُخ ہے جو خامہ بگوش کو پسند نہیں آیا کہ موصوف نے اس کا مذاق اڑایا ہے اور ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ خواب کا ذکر فرضی ہے سوچنے اور سمجھنے کا مقام ہے کہ اس من گھڑت بات کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اس کو تحریر کرنے سے بہت پہلے دہلی سے واپسی پر یہ خواب میں نے اپنے جملہ احباب اور عزیزوں کو سُنایا تھا اور جتنا ضبط تحریر میں بعدہٗ آیا ہے اس سے بہت زیادہ تفصیل سے سُنایا تھا کہ حافظہ میں تازہ تھا (یعنی دسمبر ۸۳ اور جنوری ۸۴ء کے فوراً بعد فروری ۸۴ء میں) اس وقت خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ آئندہ اس کو کبھی ضبط تحریر میں لانا پڑے گا۔ (یعنی دوران ۸۵-۸۶ء خود نوشت میں اس کی شمولیت) خامہ بگوش کے نزدیک ممکن نہیں کہ بیسیوں افراد کی گفتگو اور ان کے کپڑوں کے رنگ تک کا ذکر کیا جاسکے جبکہ بقول ان کے خواب میں رنگ نہیں دیکھا جاسکتا۔ پوری خود نوشت میں جب صدہا افراد کا تفصیل سے ذکر کیا جاسکتا ہے تو خواب میں دس بیس افراد کا ذکر کیوں ممکن نہیں۔ ایک قسط میں میرے بڑبڑانے پر میری بیگم کا بھی ذکر آتا ہے تو کیا اس خواب کے سلسلہ میں خدانہ کردہ میرے اور مرحومہ کے درمیان کوئی سازش تھی! صفحہ ۳۲۲ پر خواب میں گرے فلالین۔ ابلق گھوڑے اُجلے کپڑے اور مکان کے باہر گھوڑوں کا ٹاپوں سے زمین پر سبزہ کھود ڈالنے کے اذکار آئے ہیں۔ البتہ اقساط خواب کے اوقات مقرر ہونے کا میری تحریر میں کوئی ذکر نہیں جس پر خامہ بگوش نے اپنی تحریر کی بنیاد رکھی ہے اور اگر ایسا ہوتا بھی تو کیا مضائقہ تھا۔ غرض کہ اس خواب کی حقیقت پر خامہ بگوش نے جتنے اعتراضات کیے ہیں اور صداقت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ سب لاعلمی کے نتائج ہیں۔ ان کی دانست میں ممکن نہیں کہ کوئی خواب اقساط میں رونما ہو یا اس میں رنگ نظر آئے۔ حسن اتفاق سے ابھی چند ماہ ہوئے فلسفۂ خواب اور Dream Theories پر مجھ کو ایک معتبر تالیف Dream World: by Stuart Holroyd, published by Robert B. Clarke. دستیاب ہوئی ہے جس میں پندرھویں صدی سے آج تک خوابوں کی ماہیت۔ ہیئات اور خصوصیات جن تصورات سے گزری ہیں ان کا ذکر ہے اور آج جدید علوم اور آلات کی مدد سے خواب کی تجربہ گاہوں میں عملی تجزیوں کے بعد جو نتیجے برآمد ہوئے ہیں ان کی تفصیل اور حقائق کے معتبر اذکار درج ہیں۔ خواب کے محققین مثلاً :- (1) Dr. William Dement (2) Ceila Elizabeth Green (3) Dr. Christopher Evans

- - - - - - - - وغیرہ نے جو فیصلے کیے ہیں اور جن نتائج پر وہ پہنچے ہیں ان کا نچوڑ سامنے آتا ہے۔ ان ماہرین خواب کے چند فیصلے قابل توجہ ہیں۔ مثلاً...... خواب دیکھنے والے کو دوران خواب یہ محسوس ہو سکتا ہے کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے ... خواب میں مختلف رنگوں کا مشاہدہ ہو سکتا ہے اور اب تک جن رنگوں کی تصویر کھینچی جا چکی ہے وہ ہیں سیاہ۔ سفید۔ سبز۔ بالوں کے مختلف رنگوں جیسے بھورا رنگ۔ ہلکا کتھئی

رنگ .... خوابوں میں ہزاروں میل پر آئندہ ظہور پذیر ہونے والے واقعات اور مناظر اور ماضی میں جو ہو چکے ہیں ان کا مشاہدہ ممکن ہے .... خواب سیریل میں سلسلہ وار بھی دیکھا گیا ہے ...... سونے والا سونے کی حالت میں محسوس کر سکتا ہے کہ وہ کتنا سویا ...... ایک دوسرے سے بہت دور ہوتے ہوئے بھی مختلف اقوام اور اجنبی زبان کے دو اشخاص نے ایک وقت میں مماثل خواب دیکھے ہیں ..... یہ بھی ہوا ہے کہ ایک خواب کا ایک حصہ ایک فرد نے دیکھا اور اور اس سے بہت دور دوسرے شخص نے باقی Episode خواب میں دیکھا ...... اور یہ بھی ہوا ہے کہ ایک ہی شخص نے ایک ہی شب میں کئی مختلف خواب دیکھے ...... تو کیا یہ ممکن نہیں کہ میں نے کئی قسطوں میں ایک مسلسل خواب دیکھا ہو — مجھ کو حق الیقین ہے کہ میں نے ۷ قسطوں میں ایک مسلسل خواب دیکھا تھا۔ اخلاقیات کا متفق الرائے مقولہ ہے کہ جو جیسا ہوتا ہے ویسا ہی وہ دوسروں کو سمجھتا ہے۔ تو اگر خامہ بگوش نے مجھ کو دروغ گو کہا تو یہ کون سا محل استعجاب ہے۔

(ادارہ کتاب نما اس خط کو شائع کر کے خامہ بگوش کو اپنے کالم کے لیے مزید مواد فراہم کرنا نہیں چاہتا تھا کہ ان کے پاس مواد کی کمی نہیں لیکن محترم واثق صاحب کی خواہش کا احترام بھی لازمی تھا اس لیے یہ خط شائع کیا جا رہا ہے۔)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا خط اڈیٹر کتاب نما کے نام

ستمبر ۹۴ء کے کتاب نما میں جناب جگدیش چند ربترہ کا بیان "ادارہ سرائیکی اور اردو" نظر سے گزرا۔ اس کے شروع میں "ادارہ" کی جانب سے ایک نوٹ درج کیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "دہلی میں ایک ادارہ سرائیکی ساہتیہ سدن ہے، پروفیسر گوپی چند نارنگ اس کے صدر رہے ہیں" عرض ہے کہ یہ اطلاع جس نے بھی آپ کو دی ہے غلط ہے، اور میں کسی سدن کا صدر نہیں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ سرائیکی میری مادری زبان ہے اور میں ہر مادری زبان کی طرح اس کی بھی عزت کرتا ہوں لیکن میں سرائیکی روانی سے بول نہیں سکتا۔ مزید یہ کہ میری اردو کی مصروفیات اور ذمے داریاں اس درجہ ہیں کہ میں کسی ادارے کو وقت نہیں دے سکتا۔ بترہ صاحب نے مجھے صدر نامزد کیا تھا جس کے لیے میں ممنون ہوں، لیکن ۲۰ نومبر ۱۹۹۳ء کو میں نے اپنا استعفیٰ تحریری طور پر ان کی خدمت میں بھجوا دیا۔ چنانچہ موجودہ لیٹر ہیڈ پر بحیثیت صدر بیرسٹر جگدیش چندر بترہ ہی کا نام نامی ہے۔ نائب صدر جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی کے پروفیسر ستیہ بھوشن ورما ہیں اور سکریٹری ڈاکٹر سرتیش ڈھینگرہ ہیں۔ میں عزت افزائی کے لیے شکرگزار رہوں لیکن بترہ صاحب سے (یا جس نے بھی آپ کو غلط اطلاع دی ہے) میری درخواست ہے کہ اپنی تنظیم میں خاکسار کا نام کسی بھی حیثیت سے شامل نہ فرمائیں۔ آپ کے نوٹ سے چونکہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، براہ کرم کتاب نما میں میری تردید شائع فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

اڈیٹر کتاب نما کا جواب

اڈیٹر کتاب نما سے کسی نے کہا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ سرائیکی ساہتیہ سدن کے صدر ہیں۔ جہاں ادارہ جس لیٹر پیڈ پر موصول ہوا تھا اس کے ہر صفحے پر پروفیسر نارنگ کا نام نامی بحیثیت صدر چھپا ہوا تھا ذیل میں اس کا عکس پیش ہے۔

SIRAIKI SAHITYA SANGAM

President : **Prof. Gopi Chand Narang** — *Patron-in-Chief* : **Narendra Kumar**

Secretary-General : **J.C. Batra**

Post Box No. 168, New Delhi - 110 001

یہی نہیں رسالہ شائع ہونے کے بعد بیرسٹر بترہ جب مزید کاپیاں لینے کے لیے دفتر میں تشریف لائے تب بھی انھوں نے تردید نہیں کی۔ ممکن ہے کہ انھیں یاد نہ رہا ہو۔ اسی وقت انھوں نے سرائیکی انٹرنیشنل کی دوسری جلد پیش کی تو اس میں بھی ایڈیٹوریل بورڈ میں پہلا نام پروفیسر نارنگ کا ہی ہے اس کا بھی عکس پیش خدمت ہے۔ اس کے بعد ہمارے لیے کسی غلط فہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پروفیسر صاحب کی تحریر کے مطابق قارئین کتاب نما نوٹ کرلیں کہ انھوں نے اس ادارے سے ۲۷ رنومبر ۱۹۹۳ء کو استعفیٰ دے دیا تھا۔ بیرسٹر صاحب سے درخواست ہے کہ وہ پرانا لیٹر پیڈ تلف کر دیں اور نیا لیٹر پیڈ اگر نہ چھپوایا ہو تو چھپوالیں تاکہ عوام نہ تو خوش فہمی میں مبتلا ہوں اور نہ غلط فہمی میں۔

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی

دسمبر ۱۹۹۴ء — جلد ۳۴ — شمارہ ۱۲

فی پرچہ	6/=
سالانہ	55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	320/=

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

ٹیلی فون:۔ ۶۳۰۱۹۱

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین وبیانات نقد وتبصرہ کے ذمے دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی ۲ میں جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

غزلیں / نظمیں

مانگے کا اُجالا

طنز ومزاح

جائزے، کھلے خطوط اور ادبی تہذیبی خبریں

نئی مطبوعات

اردو شاعری کا فنی ارتقا۔ ادب ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۲۵۰/-

رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ (ادب) خواجہ محمد اکرام الدین ۴۰/-

اردو زبان کی تاریخ (لٹریچر) ڈاکٹر خلیل بیگ ۲۰/-

فکر روشن (مضامین) آل احمد سرور ۱۵۰/-

اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ (ادب) سنبل نگار ۷۵/-

شہر دریا (مضامین) رضا علی عابدی ۱۵۰/-

فن تنقید اور تنقید نگاری (دوسرا ایڈیشن) تنقید۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی ۱۲۵/-

ڈرامے کا فن اور انارکلی (تنقید) ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ ۸۰/-

اردو شاعری میں انسان دوستی (ادبی مضامین) ڈاکٹر فاطمہ تنویر ۱۲۰/-

اقبال کی شعری زبان ایک مطالعہ (اقبالیات) ڈاکٹر سید صادق علی ۵۰/-

فصاحت جنگ جلیل مانکپوری (سوانح) علی احمد جلیلی ۱۱۰/-

لَو (شاعری) تسنیم فاروقی ۱۰۰/-

ایک ہی پیالہ (مراٹھی ڈراما) ترجمہ خلیل مظفر ۳۰/-

پہلی بارش (شعری مجموعہ) ناصر کاظمی ۴۰/-

احساس کی فصل (//) رئیس بلوی ۳۵/-

مشعل جاں (دوسرا ایڈیشن، شعری مجموعہ) مجروح سلطانپوری ۵۰/-

دفتر ابلیس (تاریخی کہانیاں) محمد شبیر علی ۶۰/-

ریزہ ریزہ چاندنی (اصلاحی افسانے) محمد انیس فاروقی ۵۰/-

تاریخ میو چھتری نیا ایڈیشن (تاریخ) مولانا حکیم عبدالشکور ۱۰۰/-

حیات و تصرفات صاحب گلشن چشت (تصوف) اختر جمال قریشی ۲۵/-

ایک اور نروان یاترا (افسانے) مہدی ٹونکی ۷۵/-

مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ (تنقید) پروفیسر سید محمد سلیم ۴۰/-

میخانہ خلیل حافظ خلیل حسن ۶۰/-

لغات ابجد شماری جلد اول (لغت) سید احمد ۸۵/-

دفتر جنوں (مضامین) ڈاکٹر ہارون ایوب ۵۰/-

ڈراما اور روایت (ڈراما نگاری) ڈاکٹر محمد شاہد حسین ۱۲۰/-

شعر شور انگیز جلد چہارم (میریات) شمس الرحمٰن فاروقی ۷۸/-

سرورق ——— ڈاکٹر مظہر مہدی

نیو میڈیکل انگلش اردو ڈکشنری (طبی لغت) علامہ مسعود حفیظ زماں ۷۵/-

صحت حفظان تعلیمات نبوی کی روشنی میں (طب) " ۱۵/-

سیرت النبیؐ بعد از وصال نبیؐ (سیرت پاکؐ) عبدالمجید صدیقی ۷۵/-

---

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

شمس الرحمٰن فاروقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ : احمد محفوظ

اردو کے معتبر ادیب، نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی کی اعلا ادبی خدمات کے اعتراف میں اردو کے ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا اہم مجموعہ: قیمت: ۸۰/- روپے

اردو افسانہ بمبئی میں

۱۹۷۰ء کے بعد

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

مرتبہ الیاس شوقی

انور خاں | انور قمر | ساجد رشید

سلام بن رزاق | عبدالعزیز خاں | علی امام نقوی

مختار رشید | مقدر حمید | نور پرکار

51/-

فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ

ڈاکٹر مومن محی الدین

ڈاکٹر مومن محی الدین کا شمار جدید فارسی ادب کے اسکالرز میں ہوتا ہے موصوف نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ فارسی داستان نویسی کی تاریخ مرتب کی ہے جو مختصر بھی ہے اور جامع بھی۔

قیمت 45/-

جہان مدیر
ڈاکٹر مظہر مہدی
سنٹر آف انڈین لینگویجز
اسکول آف لینگویجز
جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی ۶۷

اسارمیہ

اسکالر کی موت

ریسرچ کی صورت حال پر ایک تاثراتی نوٹ

ریسرچ دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ اس کی بنیادی شرط کمٹ منٹ ہے۔ وہ جاں فشانی، عرق ریزی، دیدہ ریزی، تنظیم، صبر و تحمل اور قربانی کا مطالبہ کرتی ہے۔ لیکن آج ہر اس شخص کو جس کا ریسرچ اور درس و تدریس کے پیشے سے ذرا سا بھی واسطہ ہے اس بات کا احساس ہے کہ ریسرچ دنیا کا آسان ترین کام خیال کیا جا رہا ہے، اردو کے اسکالر ریسرچ کے لیے ضروری تمام خوبیوں سے عاری ہیں اور تعلیمی اداروں میں اردو ریسرچ کی حالت انتہائی خراب ہے۔ نہ ریسرچ کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھا جاتا ہے اور نہ پی ایچ ڈی کی اہمیت اور وقعت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ پی ایچ ڈی کے مقالے، تین ماہ میں، ترتیب، دیے جا رہے ہیں (اس کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔) یہ کس طرح ترتیب دیے جا رہے ہیں اور ان کا کیا معیار ہوگا اس کا اندازہ لگانا بہت آسان ہے۔ بے حسی یا فراخ دلی کا عالم یہ ہے کہ دنیا کی اعلا ترین ڈگری ہر ایرے غیرے کو یوں ہی دے دی جاتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اردو ریسرچ اس صورت حال کو پہنچ گئی ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟

۱۔ طلبہ

اردو پڑھنے والوں میں اکثریت کا تعلق معاشرے کے اس طبقے سے ہے جو معاشی، تعلیمی اور ذہنی اعتبار سے پسماندہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایسے طالب علم اپنے اندر کوئی دوسرا سبجکٹ اختیار کرنے کی صلاحیت نہیں پاتے۔ اس کے باوجود اگر وہ دوسرے جاذب، دلکش اور منفعت بخش مضامین کی طرف لپکتے بھی ہیں تو وہ مضامین اپنا دامن جھٹک دیتے ہیں کیوں کہ وہ ان کو اپنا اہل نہیں سمجھتے۔ اس طرح وہ ہر طرف سے REJECT کر دیے جانے کے بعد ہی کوچۂ اردو کی طرف رخ کرتے ہیں کیوں کہ اردو ہی کا دروازہ ان کو کھلا نظر آتا ہے۔ افسوس ہے کہ اردو اپنی طرف اچھے طلبہ کو متوجہ کرنے میں ناکام ہے۔

۲۔ روایت

دوسرا بہت ہی اہم مسئلہ جسے ناقابلِ اعتنا خیال کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ اردو کے اکثر

ایمن اور کتابیں حواشی، حوالے اور کتابیات سے مبرا ہوتی ہیں۔ اگر کسی میں یہ چیزیں ہوتی بھی ہیں تو اس
۔لیے کسی بھی ایک تسلیم شدہ اسٹائل کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس سلسلے میں بہ صد احترام عرض
ہے کہ اردو کے اکثر نامی گرامی اساتذہ کی کتابیں اور مضامین بھی اس زمرے میں شامل ہیں (یہاں
، مقامین کی بات نہیں کی جارہی ہے) جن میں نہ ایسی چیزوں کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ ضرورت سمجھی
دو کے بڑے چھوٹے ناشرین نے بھی اس روایت کو آگے بڑھانے میں تاریخی رول ادا کیا ہے
ن کا بھی نہ اپنا کوئی اسٹائل ہے اور نہ وہ ان باتوں کی مصنف کو تاکید کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اردو
ے نوآموز مقالہ نگار ایسی ہی کتابوں سے ریسرچ کی تکنیک سیکھتے ہیں اور وہی کتابیں ان کی ترتیب
ذریعہ بھی ہیں ــ شاید اسی وجہ سے اردو کے اکثر اسکالروں کو اس بات کی بھی شُدبُد نہیں
تی کہ حواشی کس طرح لکھے جاتے ہیں، حوالے کیسے دیے جاتے ہیں اور کتابیات تیار کرنے کا
ریقہ کیا ہے؟ ریسرچ کے لیے ضروری دیگر چیزوں کی تو بات کرنی ہی بے کار ہے۔ ایسی بات نہیں کہ
دو میں معیاری کام کی مثال نہیں لیکن اس کی تعداد کم ہے۔ شرم ناک اور افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ
دو کے اسکالر ریسرچ کی تکنیک اور ریسرچ کے طریقۂ کار کے موضوع پر کوئی کتاب بھی نہیں پڑھتے۔ حالانکہ
ہ سماجی علوم کی معیاری کتابوں اور مضامین سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے اندر ذوق جستجو
ور انگریزی زبان کی شُدبُد ہو۔ لیکن انگریزی زبان سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیش بہا
لمی خزانے تک رسائی حاصل کرنے سے بھی معذور ہیں۔

۲۔ شعبہ

ایسی صورت حال میں شعبے کی ذمے داری بڑھ جاتی ہے۔ یہ اس کا کام ہے کہ طالب علموں
نے اب تک روایت سے جو سیکھا ہے اس کے اچھے اور برے پہلوؤں سے ان کو باخبر کرے اور
ن کے اذہان کو سائنٹفک ریسرچ کے لیے تیار کرے۔ شعبے کی یہ بھی ذمے داری ہونی چاہیئے کہ وہ
ریسرچ کے طریقۂ کار سے متعلق انگریزی زبان کی معیاری کتابوں کے تراجم فراہم کرے یا اساتذہ معیاری
کتب کی مدد سے اسکالروں کو نہ صرف ریسرچ کے طریقۂ کار بلکہ یہ بھی بتائیں کہ مخصوص متن اور مخصوص
صنف پر ریسرچ کے کون سے طریقۂ کار کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ اسکالر کی ذہنی تربیت کرنا اور
ریسرچ کے لیے سازگار فضا فراہم کرنا شعبے کا فریضہ ہے۔ لیکن سنجیدہ ریسرچ کے لیے جس قسم کی
سازگار فضا اور علمی و ذہنی تربیت کی ضرورت ہے وہ اردو کے اکثر شعبوں سے ناپید ہے۔ شعبوں
میں تعلیمی اور ذہنی تربیت کے انتظام کا حال یہ ہے کہ ریسرچ کے موضوعات کے انتخاب کے بعد
اس سوال پر غور تک نہیں کیا جاتا کہ اس کے لیے ریسرچ کا کون سا طریقۂ کار اختیار کرکے اس سے
عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے۔ اردو کے شعبوں میں ریسرچ کے طریقۂ کار کی اہمیت بالکل نظر انداز
کر دی جاتی ہے اور یہ فراموش کر دیا جاتا ہے کہ خاص قسم کے نتائج اخذ کرنے میں کسی مخصوص طریقۂ کار
کو کتنا دخل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ طریقۂ کار پر ہی اس کا انحصار ہوتا ہے کہ کوئی اسکالر کس قسم کے نتائج
اخذ کرنا چاہتا ہے۔ ریسرچ کے طریقۂ کار سے اسکالروں کو واقف کرانا اور اس کے اطلاق سے

متعلق ان کی تربیت کرنا شعبے کی ذمّے داری ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اردو کے اکثر شعبوں میں ان باتوں کی پروا نہیں کی جاتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک خاص طریقۂ کار اور ایک خاص اصول کا استعمال کر کے ایک خاص زاویے سے کام کرنے کے لیے جس قسم کی تربیت درکار ہے اس کا اردو اسکالرشپ میں فقدان ہے۔

۴۔ نگراں

یہ SPECIALISATION کا زمانہ ہے۔ دنیا کی اکثر یونی ورسٹیوں میں نگراں انھی میدانوں میں طالب علموں کی رہنمائی کے لیے تیار ہوتے ہیں جن کے وہ ماہر ہوتے ہیں یا جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ ان موضوعات پر کام کرانے کے اہل ہیں وہ ایسے موضوعات پر جن سے ان کو مس نہیں ہوتا کام کرانے کی شاذ ہی ہامی بھرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایسے موضوع پر بھی کام کرانے کے خواہاں ہوتے ہیں جو ان کے لیے قدرے نیا ہوتا ہے لیکن وہ اس میں اپنی دلچسپی رکھتے ہیں اور اس موضوع پر خاطر خواہ مطالعہ کرتے ہیں تاکہ وہ اسکالر کی رہنمائی کر سکیں۔ جس موضوع میں ان کا دخل نہیں ہوتا اس پر کام کرانے کی ذمے داری نہ ان کو سونپی جاتی ہے اور نہ وہ اس کے لیے راضی ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں وہ چند باتوں کے علاوہ اصل معاملے میں اسکالر کی رہنمائی نہیں کر سکتے، ریسرچ کے عمل میں اس کو پیش آنے والی دشواریوں کا حل نہیں نکال سکتے اور سب سے بڑھ کر یہ خدشہ رہتا ہے کہ اسکالر نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ مشتبہ بھی ہو سکتے ہیں۔ بیرون ممالک کی یونی ورسٹیوں میں تو یہ بھی ہوتا ہے کہ وہاں مخصوص شعبوں میں چند مخصوص موضوعات پر ہی کام کرائے جاتے ہیں اور وہ یونی ورسٹیاں انھی کے لیے مشہور ہوتی ہیں۔ اگر کوئی طالب علم اپنے DISCIPLINE کی کسی خاص شاخ میں دلچسپی رکھتا ہے تو وہ اسی یونی ورسٹی میں داخلہ لینے کی کوشش کرتا ہے جہاں اس میں SPECIALISATION ہے۔ بہرحال اس قسم کا SPECIALISATION نہ اردو میں ہے اور نہ اس کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن اس سلسلے میں چند باتوں کا خیال ضرور رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اردو کے اکثر نگراں تمام موضوعات پر کام کراتے ہیں جبکہ اس دور میں کسی بھی ایک شخص کا ایک DISCIPLINE کی تمام شاخوں میں ماہر ہونا تقریباً محال ہے۔ اکثر صورتوں میں نگرانوں کی مجبوری بھی ہوتی ہے لیکن وہ ایسے موضوعات پر کام کرانے سے انکار کر سکتے ہیں جن میں ان کی دلچسپی نہیں ہے یا جو ان کا میدان نہیں ہے۔ لیکن ان میں سے کسی بات کا شاذ ہی خیال رکھا جاتا ہے اس لیے مقالے کا معیار بری طرح متاثر ہوتا ہے۔

۵۔ ممتحنین

ہونا تو یہ چاہیے کہ مقالے کی جانچ کرنے کے لیے ان افراد کو ممتحنین مقرر کیا جائے جن کا شمار اس موضوع کے ماہرین میں ہوتا ہو یا جن کا تعلق اس موضوع کے متعلقہ میدان سے ہو تاکہ مخصوص مقالے میں اگر کسی قسم کی کوئی خامی یا کمزوری رہ گئی ہو تو اس کی نشان دہی ہو سکے۔ یہ ایک آئیڈیل معاملہ ہے اور مقالہ نگار کے حق میں بھی بہتر ہے۔ کیوں کہ مقالے میں اکثر کوئی نہ کوئی چیز

مقالہ نگار یا اس کے نگراں کی نظروں سے پوشیدہ رہ جاتی ہے یا ان دونوں کا ذہن اس طرف نہیں جاتا۔ یا یہ بات ان کے علم میں نہیں ہوتی۔ مقالے میں ہمیشہ اس کا امکان ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر ممتحنین کی نظر اس مخصوص موضوع کے تمام پہلوؤں پر ہے تو وہ اس کی نشان دہی کر دیتے ہیں۔ لیکن جہاں یہ بات سچ ہے کہ وہ ممتحنین بھی بلائے جاتے ہیں جو مقالے کے موضوع کے ماہرین ہوتے ہیں یا جن کا تعلق اس میدان سے کسی نہ کسی طرح ہوتا ہے وہیں یہ بھی ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ ممتحنین اکثر وہ افراد مقرر کیے جاتے ہیں جو نگراں کے دوست ہوتے ہیں اور اکثر صورتوں میں ان کا وہ موضوع بھی نہیں ہوتا جس موضوع پر مقالہ جانچنے کی ذمّے داری ان کو سونپی جاتی ہے اس لیے وہ دیانت داری سے اپنے فرائض ادا کیے بغیر اپنے دوستانہ تعلقات اور کبھی کبھی مقالہ نگار کے مستقبل کا لحاظ کرتے ہوئے یونی ورسٹی سے مقالہ نگار کو پی ایچ ڈی کی اعلاترین ڈگری دینے کی سفارش کر دیتے ہیں۔ شاید انھیں اپنے دوستانہ تعلقات کے خراب ہونے اور دوبارہ ممتحنین کی حیثیت سے نہ بلائے جانے کا بھی خیال ہوتا ہے۔ لیکن ان باتوں کا پاس کیے بغیر اپنی پیشہ ورانہ دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اگر وہ سخت رویہ اختیار کریں تو مقالہ نگار اپنے مقالے کے REFER BACK یا مسترد کر دیے جانے کے خوف سے بہتر مقالہ لکھنے، ریسرچ کے طریقۂ کار، اصول اور تکنیک کو برتنے اور موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کریں گے افسوس کہ اکثر ممتحنین سخت رویہ نہیں اختیار کرتے۔ متعدد ایسے زبانی (VIVA VOICE) امتحانات کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جہاں ممتحنین نے صرف اس بنیاد پر یونی ورسٹی سے مقالہ نگاروں کو پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دینے کی سفارش کی کہ انھوں نے فلاں فلاں صاحبان کے ساتھ کام کیا تھا (ممتحنین نے مقالہ نگاروں پر یہ بات بالکل واضح کر دی)۔ متعدد معاملوں میں ممتحنین نے ان کو کسی بھی صورت میں مقالہ نہ شائع کرنے کی سخت ہدایت کی بلکہ ایک صاحب کو تو لائبریری میں مقالہ رکھنے تک کی سخت ممانعت کر دی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کے مقالوں پر پی ایچ ڈی کی اعلاترین ڈگری کی سفارش کی جانی چاہیے؟ بہر حال تعلیمی اداروں میں اردو تحقیق کی آج جو صورت حال ہے اس کا ذمّے دار جہاں اسکالروں کا مجموعی بیک گراونڈ، ان کی غیر سنجیدگی، تن آسانی، بے پروائی اور چند دیگر اسباب ہیں وہیں ان کے نگراں اور ممتحنین بھی بری الذمّہ نہیں خیال کیے جا سکتے۔

۶۔ اسکالر

ریسرچ کے طالب علموں کو جن خوبیوں کا حامل ہونا چاہیے وہ اکثر اسکالروں میں مفقود ہیں اس لیے ریسرچ کے مطالبات کو پورا کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ محنت، مشقت اور ریاضت کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ ان کے اندر صبر و تحمّل کے مادے کا سرے سے فقدان ہے۔ البتہ ان میں سے اکثر لوگ کمٹڈ (COMMITTED) ضرور ہیں لیکن ان کا یہ کمٹ منٹ ریسرچ یا درس و تدریس کے پیشے سے نہیں بلکہ "لکچرار" کے عہدے سے ہے جس کو حاصل کرنا ان کا نصب العین ہے۔ اس کی خاطر وہ قسم قسم کی ترکیبیں اور طرح طرح کے ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں جس کی ایک شکل

یہ ہے کہ وہ اسکالر کا روپ دھار کے راتوں رات مضامین لکھنے، دن رات کتابیں ترتیب دینے اور فرضی ناشرین کے نام سے ان کو چھاپنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اس معاملے میں کم از کم اتنی ایمان داری ضرور برتتے ہیں کہ وہ کسی پبلشر کا فرضی نام دیے بغیر اپنی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر سست رفتار لوگوں کے اندر زمانے کے تیز رفتار ہونے کا واقعی احساس پیدا ہوتا ہے لیکن ریسرچ میں یہ تیز رفتاری کسی طرح بھی مستحسن نہیں خواہ کسی دوسرے پیشے میں اسے اچھا خیال کیا جاتا ہو۔ اس طرح ایسے جعلی اسکالر کو ڈاکٹریٹ میں اضافہ کر کے پہلے سے آلودہ علمی ماحول کو مزید آلودہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ درس و تدریس کو دنیا کا آسان ترین پیشہ خیال کرتے ہیں کیوں کہ اس میں داخل ہونے کے بعد ان کو کسی کا جواب دہ نہیں ہونا پڑتا۔ وہ اس شریفانہ اور قابل احترام پیشے کو اس لیے بھی اختیار کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنا پیشہ ورانہ کام کیے بغیر ہر قسم کے توڑ جوڑ، رنگ بدلتی ہوئی سیاست (پارٹی اور آئیڈیولوجی کی کوئی قید نہیں، مفاد کی تکمیل شرط ہے) اور تمام گندگیوں میں ملوث ہو سکیں۔ ان کو اس طرف سے بھی اطمینان ہوتا ہے کہ ایک بار اس پیشے میں داخل ہونے کے بعد وہ پروفیسر بن کر ہی نکلیں گے۔

کچھ اسکالر ایسے بھی ہیں جو کمٹ منٹ، صبر و تحمل اور نظم و ضبط کے ساتھ ریسرچ کے کام میں مصروف رہتے ہیں اور اس عمل میں وہ ہر قسم کی قربانی تو دیتے ہی ہیں، اپنے احباب، رشتے داروں اور والدین سے اپنے تعلقات بھی کشیدہ کر لیتے ہیں کیوں کہ ان کے بھی کچھ مطالبات ہیں جنھیں وہ پورا نہیں کر سکتے۔ لیکن وہ جس ماحول میں ریسرچ کر رہے ہیں وہ بالکل ناسازگار، غیر یقینی اور غیر محفوظ ہے۔ اس طرح سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایسے ماحول میں وہ کب تک ریسرچ جاری رکھ سکتے ہیں؟ اس سے ہر دیانت دار شخص اتفاق کرے گا کہ ایسی ناسازگار فضا میں معیاری ریسرچ نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے لیے ماحول کو سازگار بنایا جائے۔ لیکن جب ایسا موقع آتا ہے تو ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔ وہاں جعلی اسکالر اور چاپلوس امیدوار بازی لے جاتے ہیں اور اصلی اسکالر منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا دیانت دار اسکالروں سے یہ امید کرنا کہ وہ اسی ماحول میں ریسرچ جاری رکھیں اور غیر دیانت دار لوگ قسم قسم کی چالیں چل کر اور طرح طرح کا روپ بھر کر ملازمتیں حاصل کریں اور مالی اعتبار سے محفوظ زندگی کی لذتوں سے محظوظ ہوں علمی اور اخلاقی بددیانتی ہے۔

اس موقع پر مجھے مہابھارت کا ایک منظر یاد آتا ہے۔ پانڈوں اور کوروؤں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ میدان کارزار میں کرن اور ارجن ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ جب جب کرن تیر چلاتا ہے، اس کے زور سے ارجن کا رتھ ہلنے لگتا ہے۔ اس پر کرشن ارجن کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تمھیں کرن کے زور بازو اور تیر اندازی کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ تمھیں اس کا اندازہ نہیں کہ اگر میں تمھارے رتھ پر سوار نہ ہوتا تو اب تک تم کہاں ہوتے اور تمھارا رتھ کہاں ہوتا۔ اس کے باوجود کرن جیسا سورما جنگ میں کام آ جاتا ہے کیوں کہ کرشن جو بھگوان ہے ارجن کے ساتھ ہے اور اس کے رتھ پر سوار ہے۔ جب بھگوان ہی

جنگی اخلاقیات کو نظر انداز کردے تو کوئی، کسی اور سے کیا توقع کرسکتا ہے۔

اس طرح اصلی، ذہین اور مستحق اسکالر نا امیدی، محرومی اور افسردگی کے شکار ہوجاتے ہیں۔ وہ "کیسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں"؟ وہ قوت لایموت اور مالی تحفظ کی خاطر کوئی دوسرا غیر علمی پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ انجام کاران کے اندر کے اسکالر کی موت ہوجاتی ہے۔ کون ہے اس موت کا ذمّے دار؟

پروفیسر محمد اجتباء ندوی
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

دورِ جدید کا پیش رو عربی شاعر

محمود سامی بارودی

۱۸۳۸ء ـــ ۱۹۰۴ء

دورِ جدید نے جہاں فکر و تمدن کو ازسرِ نو روشناس کرایا وہاں شعر و ادب میں بھی نئی جان ڈال دی، عہدِ جدید کا سورج طلوع ہوا اس کی حیات بخش کرنوں کی حرارت اور اجالے میں امتِ عرب ازسرِ نو تہذیب و تمدن کے رشتوں سے جڑ گئی، سیاست، سماج اور علم و فن کے میدان میں نشأۃِ ثانیہ کا ظہور ہوا۔ سب سے بڑا سبب اس کا ایک طرف جدید مغربی ثقافت کے سرچشمہ سے فیض حاصل کرنا اور دوسری جانب قدیم عرب تہذیب و ثقافت کے سوتوں سے پھر سے جاری کر کے سیراب ہونا تھا، چنانچہ عربی شاعری بھی دوسرے علوم و فنون کی طرح متحرک و فعال بن گئی اور اس کا قافلہ دوبارہ رواں دواں ہوگیا اور اس نے اپنی زندگی کی ایک بڑی منزل طے کرلی۔ اس نے اپنے سفر کا آغاز محمود سامی بارودی کے زمانہ سے گذشتہ صدی کے وسط میں کیا تھا اور بیسویں صدی کے وسط تک آزاد شاعری کے دور میں داخل ہوکر کامیاب مقاصد کی جانب تیز گام ہے(۱)

جدید عربی شاعری کی داغ بیل محمود سامی بارودی نے ڈالی لیکن امیر الشعراء احمد شوقی کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ ان دونوں نے اپنے ہمنواؤں کے ساتھ قدیم عرب شاعری ہی کو اپنا مثالی نمونہ بنایا، ان کی شاعری میں وہی زبان، وہی طرز و اسلوب، وہی روح اور وہی آہنگ و نغمہ کارفرما رہا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر شاعری کو کسی اور طرز و نمونہ اور اسلوب پر فروغ دیا گیا تو قدیم قومی اثاثہ ضائع ہوجائے گا اسی وجہ سے انھیں قدامت پسند (محافظ) کہا گیا

محمود سامی بارودی کلاسیکی یا قدامت پسند اسکول کا بانی تھا قاہرہ (مصر) میں ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والد جرکسی غلام خاندان سے تعلق رکھتے تھے، عمر سات برس کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ گھرانہ جرکسی فرد نے ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری لی ملٹری

(۱) دراسات ادبیہ: ڈاکٹر احمد ہیکل ص ۴۳

کالج سے فوجی ٹریننگ حاصل کی۔ بچپن ہی سے شعر و ادب کے مطالعہ کا شوق تھا، شعراء کے دیوان پڑھے اور ادبی مجلسوں میں اٹھنے بیٹھنے اور شریک ہونے کی وجہ سے شعر سے مناسبت پیدا ہوگئی، بیس سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا، فوجی مشن پر ترکی کا سفر کیا۔ وہاں ترکی اور فارسی زبانیں سیکھیں۔ وہاں ہی خدیو اسماعیل (حاکم مصر) سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے ساتھ مصر لے آئے اور تھوڑے عرصہ بعد انھیں فرانس و برطانیہ مزید فوجی ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا، واپس آکر ترکی فوج میں شامل ہوگئے اور جنگ بلقان میں شریک ہوئے اس کے بعد ترقی کرکے بڑے فوجی عہدوں پر فائز ہوئے۔ وطن دوستی اور سامراج دشمنی کے جذبات دل میں موجزن تھے۔ احمد عرابی پاشا کی انقلابی فوجی جدوجہد میں کلیدی کردار ادا کیا، ناکامی کے بعد سری لنکا جلاوطن کردیے گئے۔ ۱۷ برس کی جلاوطنی کے بعد مصر واپس آنے کی اجازت ملی اس کے بعد صرف پانچ برس زندہ رہے، یہ وقت مطالعہ اور شعر گوئی میں صرف کیا، ۱۹۰۴ء میں خالق حقیقی سے جا ملے، ایک دیوان اور شعروں کا انتخاب " مختارات البارودی " اور نثر کا ایک انتخاب " قید الاوابد " ان کی یادگار ہے۔

بارودی نے قدیم اصناف شعر پر طبع آزمائی کی، کھنڈرات پر ٹھہر کے محبوب کی یاد، نجد اس کے ٹیلوں، جانوروں، بادل، بارش، اور بجلی کی چمک کی تصویر و وصف، عورت کو ہرنیوں اور نیل گایوں سے تشبیہ دینا اور عرب روایات کی ترجمانی ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:-

محا البين ما أبقت عيون المها مني	(چشم غزالاں نے جسم میں جو کچھ باقی چھوڑ دیا تھا اسے فرقت نے تمام کردیا۔ بڑھاپا آگیا اور میں زندگی کی حاجتوں کو پوری کبھی نہ کرسکا، مشقت، مایوسی، پردیس اور بے تابی، کیا ہی زبردست خسارہ سے عمر بھر دوچار ہوا ہوں)
فشبت ولما اقض اللبانة من سني	
عناء ويأس واشتياق وغربة	
ألا شد ما ألقاه في الدهر من غبن	

ایک شعر اور ملاحظہ ہو:-

فان أك فارقت الديار فلي بها	(پس اگرچہ میں وطن سے جدا ہوگیا ہوں مگر میرا دل وہاں ہی ہے جسے چشم غزالاں نے مجھ سے چھپا دیا ہے)
فؤاد أضلته عيون المها مني	

محمود سامی بارودی نے جلاوطنی میں ۱۷ سال گزارے۔ ان کی جوانی اور اس کی رعنائیاں وطن سے دور مایوسیوں، عزیزوں کی یاد، دوست، احباب اور رفقاء کار کی جدائی کی تلخی نے بے مزا بنا دیا، ایام جوانی اور اس کی لطف اندوزیوں کو یاد کرکے پوچھتے ہیں وہ دن کہاں ہوا ہوگئے، جب میں وطن میں خوشی و مسرت کے سایہ میں خوش گوار وقت گزار رہا تھا اور وطن کو غارت گروں سے بچانے کی تدبیر کر رہا تھا، عمر رفتہ کو سبھی نے آواز دی ہے۔ محمود بارودی کی آواز بھی سنیے:-

"میری جوانی اور لطف کے دن کہاں گئے؟ کیا وہ دن جانے کے بعد لوٹتے ہیں؟ وہی عہد رفتہ ہے، اور محال بات ہے کہ زمانہ عشق و سرمستی کا دور لوٹا دے۔ لاؤ کم از کم اس کی یاد ہی کے جوت جگا دیں۔ جب سے اس سے دوری ہوتی ہے بڑی تکلیف میں ہوں۔ عقل والا ہر چیز سے دل کو سمجھا لیتا ہے مگر عہد جوانی کی خوش فعلیاں اور لطف اندوزیاں نہیں بھلائی جا سکتی ہیں۔

ہائے میں "چمن"[1] منیل کو کب دیکھ سکوں گا جہاں انگوروں کی بیلیں اور کھجور کے خوشے ہیں، جہاں کشتیاں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس صاف شفاف دریا کے پانی پر جو چاندی کے مانند ہے۔"

شاعر دریائے نیل کے کنارے تعمیر شدہ شاندار محل، پارک، کورنیش، خوش گوار ہوا، احباب اور ان کے ساتھ تفریح کرنے والے ساتھیوں کو یاد کر کے تڑپ سے بے چینی اور شوق دید و ملاقات کا اظہار کرتا ہے۔ پھر سری لنکا میں جیل کے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے:-

"سرندیپ کے اے میرے دونوں ہم نشینو! میری ملاقات اور عتاب سے باز آجاؤ، اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو،
میں جوانی پر نوحہ گری کیسے نہ کروں۔ میرا حال دیکھو میں پردیس، جلاوطنی اور ابتلا و آزمائش میں بوڑھا ہو گیا ہوں،
بڑھاپے نے میری تازگی اور رعنائی پر گندی، پھٹی پرانی چادر ڈال دی ہے۔"

محمود سامی بارودی بڑے دردناک الفاظ میں اپنی پریشان حالی، وطن سے دوری اور بڑھاپے کی ستم رانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے آخری شعر میں کہتا ہے:

"آدمی تو گوشت پوست کا ایک ڈھانچہ ہے جو بوسیدہ ہو جائے گا۔ آبادی کی انتہا ویرانی و بربادی کا آغاز ہوتی ہے۔"[2]

بارودی نے سماج اور معاشرہ کے مسائل و مشکلات پر طبع آزمائی کی ہے۔ طرز و اسلوب روایتی ہے۔ گرد و پیش سے پریشان ہو کر کہتا ہے:

"بارگاہ ایزدی ہی میں درازی شب اور پڑوسن کی ہنگامہ خیزی کے لیے شکوہ سنج ہوں، جو پوری رات شور و غوغے اور چیخ و پکار میں گذار دیتی ہے اس کے بد نصیب اور بد صورت بچے (اللہ انھیں پروان نہ چڑھائے) کسی حال میں چین نہیں لینے دیتے،
جب چیخنا چلانا شروع کرتے ہیں تو دن چڑھے ہی جا کر دم لیتے ہیں جس

---

(۱) دریائے نیل کے کنارے چمنستان، (۲) دیوان بارودی

گھر میں "شر" ہو وہاں "خیر" کی آرزو کیوں کر کی جاسکتی ہے"؟
پوری تفصیل بیان کرنے کے بعد اس کے علاج و مداوا کی تصویر پیش کرتے ہیں:۔

(اس ہنگامہ خیز کیفیت) کو دیکھ کر اور سن کر محلہ کے لوگوں نے خیال کیا کہ جیسے اسلحوں سے لیس زبردست لشکر حملہ آور ہوگیا ہے (اس سے مقابلہ) کے لیے کسی نے نیزہ اٹھایا، کسی نے ڈنڈا تھاما، اور کچھ لوگ خوف زدہ ہوکر زور زور سے کتاب الہی کی تلاوت کرنے لگے۔

اور بہت سے بچے، بچیاں، عورتیں خوف سے دروازہ کی چوکھٹ پکڑ کر سرکار کو آواز دینے لگیں۔

اے بارالہا! میں جس مصیبت و کرب میں ہوں اس پر اپنے خاص فضل سے صبر و استقامت عطا فرما اوران غوغائیوں پر بھونچال لے آیا"۔

محمود بارودی کی ایک نظم "قیدی" ہے اس میں جیل، جیلر، جیل کے ساتھیوں، تنہا پردیس، بے چارگی، پریشان حالی اور جیل کی کوٹھری کی تاریکی، تنگی اور تکلیف تصویر کشی بڑے مؤثر اور دلدوز الفاظ میں کی ہے آخر کے دو شعروں کا ترجمہ ملاء

"اے نفس، صبر سے کام لے، کامیابی قدم چومے گی، بلا شبہہ صبر، ظفر و کامرانی کی دلیل ہے"۔

یہ چند سانسیں ہیں جو ساتھ چھوڑنے ہی والی ہیں، نوجوان جہاں بھی ہوتا ہے تقدیر کا اسیر ہوتا ہے"؟

بارودی نے حکمت و دانائی سے متعلق بھی اشعار کہے ہیں اور نئے اسلوب و رنگ میں:۔

"جس شخص کا حوصلہ دولولہ، بلند و برتر ہوگا تو اس راہ میں جو بھی دشواری پیش آئے گی، پسندیدہ و محبوب ہوگی،

اگر آدمی کی کارکردگی خراب ہوگی تو زندگی اجیرن بن جائے گی پھر وہ گردش زمانہ کو کیوں بُرا بھلا کہتا اور صلواتیں سناتا ہے"؟"

محمود بارودی نے بوصیری کے قصیدہ کو پیش نظر رکھ کر اسی قافیہ اور وزن پر، ۴۴۷ اشعار پر مشتمل نعت بھی کہی، جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات، معجزات اور صحابہؓ کرام کی شجاعت کا تذکرہ بڑے مؤثر انداز میں کیا ہے۔

لن ناتھ آزاد
۷۔ ۲۵ گورنمنٹ کوارٹرز
اندھی نگر۔ جموں توی

نظامِ دہر کا بے ربط سا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی حادثہ لگے ہے مجھے

نھاری یاد کا عالم میں اب کہوں بھی تو کیا
ہر ایک زخمِ تمنّا ہرا لگے ہے مجھے

سافری میں تری یاد جب بھی آئی تو یوں
کہ جیسے دھوپ میں ٹھنڈی ہوا لگے ہے مجھے

یہ کیسے لوگ ہیں کیسا یہ شہر ہے کہ جہاں
ہر ایک بندۂ خاکی خدا لگے ہے مجھے

یہاں کچھ اور کہے اور وہاں کچھ اور کہے
وہ آدمی تو بہت ہی بُرا لگے ہے مجھے

مرا وہ دل ہے کہ ہیں پھول یا ستارے ہیں
ہر ایک ان میں ترا نقشِ پا لگے ہے مجھے

وقارِ قوم و وطن کیا اسی نے بیچا ہے
یہ آدمی تو بڑا پارسا لگے ہے مجھے

دلوں کی بات کا کیا علم یوں تو دیکھنے میں
ہر ایک شخص یہاں آشنا لگے ہے مجھے

یہ بات چیت میں اتنا تپاک کا عالم
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

غزل میں، میں تری کس کس ادا کا ذکر کروں
کہ دل نواز تری ہر ادا لگے ہے مجھے

بہت حسیں ہے غزل جاں نثار کی آزاد
"یہ زندگی تو کوئی بددعا لگے ہے مجھے"

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو
پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور -۵۴۰۰۰

اردو سوانح نگاری پر
چند خیالات' چند نکات

ایک ایسی قوم کے ادب میں' جو ایک پر شکوہ اور با عظمت ماضی کے احساس سے سرشار اور اسماء الرجال جیسے فن کی موجد و ماہر ہو' سوانحی ذخیرے کی کمی کا شکوہ نہیں کیا جا سکتا ہے' دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں اردو میں سوانح عمری کی عمر کچھ زیادہ نہیں' مگر اس مختصر مدت میں بھی وہ ایک لمبی مسافت کی دھوپ چھاؤں سے گزری ہے' چنانچہ اردو کے نثری ادب میں سوانح کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ملتا ہے' جس میں ہر نوع' کم و کیف اور عیار و اعتبار کی سوانح عمریاں ملتی ہیں ---- یہ ذخیرہ مقدار ا بھی اہم ہے' اور اپنے تنوع اور استناد و معیار کے لحاظ سے بھی بہرحال لائق اعتنا ہے۔

اردو سوانح عمری کا مبسوط جائزہ تو ایک سیر حاصل مضمون بلکہ پوری ایک کتاب کا متقاضی ہے' ایک مضمون میں تنقیدی جائزہ تو کجا' شاید سب سوانح عمریوں کے نام گنوانا بھی مشکل ہے ---- بہرحال اس باب میں' اہل نقد و نظر کے غور و فکر کے لیے فی الوقت ہم چند متفرق خیالات' چند نکات پیش کر رہے ہیں۔

ایک اچھی سوانح عمری کی کوئی تعریف (Definition) متعین نہیں کی جا سکتی' مگر یہ ضرور ہے کہ وہ' صاحب سوانح کی حیات و شخصیت اور خدمات اور کارناموں کے بارے میں ہماری معلومات میں اس طور اضافہ کرتی ہے کہ ہمارے ذہن مسرت و بصیرت سے اور قلب نور و حرارت سے روشن ہوتے ہیں۔ اردو سوانح عمری کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ سوانح عمری کسی مخصوص ڈھب' ایک لائن یا متعین نمونے پر نہیں لکھی گئی۔ زمانے اور ماحول کے متقضیات' سوانح نگار کی ذہنی افتاد اور ممدوح سے اس کے تعلق کی نوعیت سے سوانح عمری کی نہج تبدیل ہوتی رہی ہے۔ پھر تجارتی ضرورتیں' حاکمانہ

فرمائشیں، تبلیغی فرائض اور ممدوحین سے عقیدت مندی بھی سوانح نگاری کا محرک رہے ہیں ــــــ
سو برس پہلے حالی نے بزرگوں کے کمالات اور عمدہ کارناموں کا رشتہ بیوگرافی سے جوڑتے ہوئے کہا تھا کہ "بیوگرافی سے اکثر نیکی کے کرنے اور بدی سے بچنے کی تحریک دل میں پیدا ہوتی ہے" پھر انگلستان کے ایک مصنف کا قول نقل کیا تھا کہ "بیوگرافی چلا چلا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غل مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو۔" اور آج ایک صدی بعد بھی ہم یہی سمجھتے ہیں کہ اکابر کی زندگیوں کے قابل قدر اور مثالی نمونے، سربلندی اور ترقی کا راستہ دکھا کر، قوم کی تقدیر پلٹ سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہر سوانح کا مقصد رشد و ہدایت، پند و موعظت اور حکمت و دانش کی تعلیم ہے۔ دراصل سبق آموزی و عبرت انگیزی ہماری سائیکی کا حصہ ہے۔ بیشتر اردو سوانح عمریوں کا یہی محرک بھی ہے اور مقصود بھی یہ چیز ہم مسلمانوں تو کیا پورے مشرق کے خمیر میں شامل ہے۔

یہ نکتہ آج (ایک صدی بعد) بھی ہمارے ذہنوں میں تازہ ہے۔ "شہید جستجو" بالکل تازہ بتازہ (Latest) سوانح عمری ہے۔ اس سے مولف ضیاء الحسن فاروقی اس سوال پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے یہ بایوگرافی کیوں لکھی؟ ــــ اپنے اس احساس کا ذکر کرتے ہیں کہ اس طرح "نئی نسل کو، خاص طور پر مسلمانوں کی نئی نسل کو، ان اعلا اخلاقی و روحانی قدروں سے روشناس" کرانے کا موقع پیدا ہوگا۔ مزید یہ کہ: "میں نے سوچا کہ خلوص و خدمت اور علم و عمل کے اس پیکر مجسم کی زندگانی سے شاید نئی نسل کو "نئی نگاہ" مل جائے کہ اس کی آج کے حالات کے اندھیروں میں سخت ضرورت ہے۔" سوانح عمری کا یہ وہی افادی تصور ہے جو سو سال پہلے حالی نے پیش کیا تھا ــــ انھوں نے کہا تھا کہ "ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بایوگرافی کریٹی کل طریقے سے لکھا جائے۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں، اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی دکھائی جائیں۔"

یہ بات بڑی حد تک، آج بھی ویسے ہی صحیح ہے، جیسے سو برس پہلے تھی ــــ کریٹی کل بایوگرافی لکھنے کا وقت اب بھی نہیں آیا۔ (اور شاید کبھی نہیں آئے گا) ہم مسلمان کی کوتاہی کا ذکر غیبت کے مترادف سمجھتے ہیں اور خذ ما صفیٰ و دع ما کدر کے قائل ہیں ــــ مشرق میں سوانح نگار کسی شخصیت پر قلم اٹھاتا ہے تو بالعموم اسے ہیرو سمجھ کر ــــ اور ہیرو، ہمارے ہاں قصہ و داستان کی روایت میں دیکھیے تو دنیا جہاں کی خوبیوں کا مجموعہ ہے۔

ہمارے نقاد سوانح نگاروں سے معروضیت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ مطالبہ بجا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ معروضیت یا غیر جانبداری کیا ہے؟ اور کیا کسی سوانح نگار کے لیے پوری طرح معروضی ہونا ممکن ہے؟ ــــ ہمارے ہاں معروضیت کا شاخسانہ زیادہ تر مغربی اثرات کے تحت پیدا ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل مشرق، روایت پرست، وضع دار اور ایک دوسرے کا لحاظ کرنے والے لوگ ہیں۔ ان سے

مغربیوں کی سی بے نیازی، بدلحاظی اور بے مروتی اختیار کرنا ممکن نہیں "لہٰذا ان سے معروضیت کا مطالبہ کچھ بے جا سا ہے" اور اس کے پورا ہونے کے امکانات کم سے کم تر ـــــ ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ "حیات جاوید" کو "کتاب المناقب" اور "مدلل مداحی" کہنے والے شبلی کیا اپنی تصانیف میں معروضیت برقرار نہیں رکھ سکے؟ اس ضمن میں شبلی کے ایک مداح مہدی افادی کی رائے دیکھیے۔ وہ لکھتے ہیں "بلحاظ فن حالی کے جس اقتصاد کی طرف نیک نیتی سے شبلی کا ذہن منتقل ہوا ہے، خود ان کی تصنیفات میں یہ رعایت کہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے، یعنی المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق اور الغزالی میں انسانی کمزوریاں کس حد تک ابھار کر دکھائی گئی ہیں؟ اس کا جواب، مجھے خوف ہے، امید افزا ہوگا" ـــــ اس ضمن میں کچھ مثالیں دیکھتے ہوئے، وہ مزید لکھتے ہیں "الکلام میں سرسید کا نام تک نہیں، حالانکہ سرسید پہلے شخص ہیں، جنھوں نے دور جدید میں مذہب کو معقولات عصریہ سے تطبیق دینے کی کوشش کی، اور یہ امر بلا اختلاف ان کی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے۔" (افادات مہدی)

مہدی کا یہ شکوہ بجا ہے، لیکن بات یہ ہے کہ ہر شخص ایک مخصوص مزاج اور ذہنی تربیت کے ساتھ مسائل و معاملات کو دیکھتا ہے، خاص نہج پر سوچتا ہے۔ اس کے اعمال و افعال بڑی حد تک اس کے شخصی زاویہ نظر اور ذاتی پسند و ناپسند سے مربوط ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک لکھنے والے کی تحریر میں غیر شعوری طور پر نسلی، قومی اور علاقائی اثرات کار فرما ہوتے ہیں ـــــ مشرق میں عموماً اور مسلمانوں کے ہاں خاص طور پر، زندگی میں عقیدے کی کارفرمائی مسلم ہے ـــــ تصورات توحید، رسالت اور آخرت اس کے ماننے والوں کا ذہن ہی تبدیل نہیں کرتے، پوری طرح اس کی کایا پلٹ دیتے ہیں ـــــ معروضیت کی بحث میں کیا ان چیزوں سے ماورا ہونا ممکن ہے؟ ـــــ لیکن میں اس بات کا بھی قائل نہیں کہ ہم معروضیت کی شرط کو بالکل اڑا دیں ـــــ دراصل سوانح نگار سے غیر جانبداری یا معروضیت کے بجائے اعتدال و توازن اور انصاف پسندی کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ اگر لکھنے والا صدق و راستی اور حق و انصاف کا علمبردار بن جائے تو اس کی تحریر از خود معروضی ہو جائے گی خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں محض اپنے قیاسات و مزعومات کی بنا پر حق و باطل میں تلبیس کی جاتی ہے۔ کسی ممدوح یا ہیرو کی خامی یا کمی کوتاہی، اس کی شخصیت یا فطرت کا حصہ اور اس لیے ایک برحق، صداقت، حقیقت یا سچائی ہے۔ اسے معرض تحریر میں لانا، اس کا اظہار کرنا ایک طرح سے اس کی گواہی یا شہادت ہے اور ہمیں تو لا تکتموا الشہادۃ کی تلقین کی گئی ہے اور کتمان حق سے منع کیا گیا ہے ـــــ مگر یہ خیال رہے کہ سوانح نگاری کا ایک بنیادی وصف ہمدردی و احترام کا جذبہ ہے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور "سوانح نگاری میں سب سے زیادہ ضروری چیز وہ ہمدردی ہے، جس کے بغیر سوانح نگار، ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔" فی الحقیقت ہمدردی و احترام، تقاضائے انسانیت و آدمیت ہے، اس لیے اس

کے بغیر انصاف ممکن نہیں ——— بہر صورت سوانح نگار ہمدردی و احترام کے ساتھ ممدوح کی خامیوں کا ذکر کرے گا تاکہ اصل حقیقت جو اس کی شخصیت کو نمایاں کرے گی۔

معروضیت کے مسئلے سے قطع نظر کیجیے ——— تب کیا اردو سوانح عمری کا معیار اطمینان بخش ہے؟ میرے خیال میں ہرگز نہیں ——— علمی، ادبی اور فنی اعتبار سے معیاری سوانح عمریوں کی تعداد بہت کم ہے "اردو کے سوانح نگاری" کے مصنف ڈاکٹر سید شاہ علی نے لکھا ہے "بلاخوف تردید کی تنقید کے ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو کیا چیز ہے، جو اردو سوانح نگاری میں موجود نہیں ہے" (ص ۳۶) پھر انھوں نے اردو میں سوانحی سلسلوں اور کتابوں کے نام گنوانے کے بعد قرار دیا ہے کہ یہ سب کچھ "اردو سوانح نگاری کی سربلندی کے لیے کافی" ہے مگر ہمیں فاضل محقق کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اسی طرح اس موضوع کی ایک اور محقق ڈاکٹر فاخرہ لکھتی ہیں "اس (قدیم دور) کے برعکس آج (۱۹۴۷ء کے بعد سے تا حال دور) کا سوانح نگار، ہیرو کی ضروری و غیر ضروری تفصیلات پیش کرنے کے بجائے شخصیت کو فن کارانہ انداز سے مرتب کرتا ہے۔ وہ اساتذہ کی طرح واقعات کو حوالوں، دلائل اور طویل طویل اقتباسات اور ان سے نتائج اخذ نہیں کرتا، بلکہ اپنے موضوع کے متعلق مستند واقعات کو اس طرح منظم اور مرتب کرتا ہے کہ موضوع کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ تصویر مکمل بھی ہوتی ہے اور جاذب نظر بھی۔" ——— اگر معاصر سوانح عمریوں پر نظر ڈالی جائے تو (الا ماشاء اللہ) کیا واقعی ایسا ہے؟ "اس کا جواب (ہمیں) خوف ہے غیر امید افزا ہوگا۔" (سوانح نگاری)

بیشتر سوانح عمریوں میں اس صنف کے فنی و تکنیکی تقاضوں سے غفلت برتی گئی ہے۔ ہمارے سوانح نگاروں کو ابھی یہ سیکھنا باقی ہے کہ لوازمے کی چھان پھٹک کیسے کی جائے۔ کھرے کو کھوٹے سے الگ کیسے کیا جائے اور اہم کو غیر اہم سے انتخاب کرکے اسے حسن و سلیقے سے کیسے مرتب کیا جائے۔ معمار کے لیے یہ دیکھنا ناگزیر ہوتا ہے کہ کون سی اینٹ کہاں اور کس زاویے سے لگائی جائے گی ——— سوانح نگاری میں حالی کی خامیاں بجا، مگر یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ "انھوں نے مواد سمیٹنے اور مرتب کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی" (آل احمد سرور) آج اتنی قابلیت بھی ہمیں کتنے سوانح نگاروں کے ہاں نظر آتی ہے۔ بیشتر سوانح عمریاں غیر متعلق مواد اور طویل اقتباسات کے بے جا حشو و زوائد پر مشتمل ہیں ——— ہمارے خیال میں اردو سوانح عمری کو سربلندی و عروج تک پہنچنے کے لیے ابھی بہت سی منازل طے کرنی ہیں۔

سوانح نگاری تا حال ایک مستحکم اور جاندار علمی روایت نہیں بن سکی۔ اس کی ایک وجہ تو محنت و جانکاہی کی کمی ہے، دوسرے ہمارے یہاں مواد و لوازمے کی دستیابی میں مشکلات حائل ہیں۔ جرمنی کے بعض کتب خانوں اور اداروں کو دیکھ بھال کر آنے والے ایک دوست نے بتایا کہ وہاں کسی بھی شعبہ

حیات میں کوئی اہم شخص فوت ہو جاتا ہے تو اس کے پس ماندگان گھر میں موجود اس کے تمام کاغذات، ڈائریاں، مسودے اور یادداشتیں وغیرہ از خود جمع کر کے کسی قومی کتب خانے کو دے دیتے ہیں ــــ کتب خانے میں ان کی چھان پھٹک کے بعد انھیں رجسٹروں اور فائلوں میں ترتیب دے کر فہرست بنا کر محفوظ کر لیا جاتا ہے ــــ اور یہ وہاں کی دیرینہ اور مستقل روایت ہے۔

فی الحقیقت علمی تحقیق میں بھی ہمیں مغرب سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہم اپنا مزاج تو نہیں بدل سکتے اور اپنی شناخت تو نہیں کھو سکتے، مگر کسی فن میں ان کے سالہاسال کے تجربات اور ان سے حاصل ہونے والے شعور اور مہارت سے فائدہ نہ اٹھانا یقیناً پرلے درجے کی حماقت ہوگی۔

نقدِ بجنوری — صدیقہ بیگم

اس تحقیقی مقالے میں بجنوری کے ناقدانہ شعور کی شناخت، علمی، ادبی کاوشوں کا ذکر اور سوانحی تفصیلات درج ہیں۔ اس مقالے پر موصوفہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ 25/-

نظرے خوش گزرے — بیگم انیس قدوائی

دلچسپ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ۔ اس میں شاعروں پر بھی مضامین ہیں اور ادیبوں پر بھی۔ تاریخی حقائق اور نئی تہذیب کا مکسچر جو کھٹا کیلا ہے، مگر ہے فرحت بخش
12/=

فکر و ریاض — علی جواد زیدی

ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا انتخاب جو مختلف اوقات میں لکھے گئے لیکن ان کی اہمیت و افادیت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی پہلے تھی۔ 12/=

جستہ جستہ — خورشید الاسلام

ڈاکٹر خورشید الاسلام کا شمار اردو کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ "جستہ جستہ" آپ کی نثری نظموں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ 10/=

ماہنامہ کتاب نما کا خصوصی شمارہ
جائزے — مہمان اڈیٹر مظفر حنفی

ایک خصوصی شمارہ۔ عصری ادب کا رفتار پیا۔ اچھی کتاب، پڑھنے والے کے اعلا ذوق کی نمایندگی کرتی ہے اور تبصرے اچھی کتاب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات کی اس اشاعتِ خاص میں کم و بیش سوا دو سو اہم مطبوعات پر باتحقیقِ نظر مبصرین کے تبصرے شامل ہیں۔ 45/=

علامتوں کا زوال — انتظار حسین

اردو کے ممتاز افسانہ نگار انتظار حسین کے ادبی مقالات کا اہم مجموعہ۔ یہ مقالات ادیبوں کے بارے میں، تہذیب کے بارے میں اور ادب کے بارے میں سوالات کا ردِعمل ہیں۔ ایک قابلِ مطالعہ کتاب۔ 36/=

معاصر ادب کے پیش رو (تنقید) — ڈاکٹر محمد حسن

اس کتاب میں ان ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو رومانویت کی ہلکی پھلکی لطافت کو عمرانی معنویت سے ہم کنار کر کے نیا جمالیاتی پیکر عطا کرنے کی مہم میں پیش پیش تھے۔ 30/=

مختار ٹونکی
کالی پلٹن روڈ، ٹیلی محمد خاں، ٹونک (راجستھان)

صائب: ایک جامع العلوم اور کامل الفنون شاعر

ڈاکٹر محمد صدیق خاں صائبؔ سرزمین راجستھان کے مایۂ ناز اور ارض ٹونک کے مسلّم الثبوت شعرا میں ایک کلیدی حیثیت رکھتے تھے۔ بلاشک وشبہ وہ ایک قادر الکلام اور پختہ کار شاعر تھے۔ ان کی شاعرانہ عظمت اور استادانہ شخصیت اسی بات سے ثابت ہوتی ہے کہ نواب ٹونک نے انھیں نبّاض العصر، مفکّر دوراں اور فہیم الشعرا کے ارفع و اعلا خطابات سے نوازا تھا اور راجستھان کے اطراف و اکناف میں وہ استاذ الشعرا بن کر چھائے ہوئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ شہرہ آفاق محقّق پروفیسر محمود شیرانی بھی ان کی ذکاوتِ علمی اور ذہانت شعری کے معترف تھے۔ ان کے کلام بلاغت نظام کا اگر بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ جامع الصّفات اور مجموعۂ فنون و کمالات تھے اور ان کی شاعرانہ کلاسیکی ادبیات کا ایک بے نظیر مرقع ہے۔

قصیدے کے شہنشاہ مرزا محمد رفیع سوداؔ کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اردو شعر و سخن کی تاریخ میں ایسے یکہ و تنہا شاعر ہیں جنھوں نے ہر صنف سخن میں اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں اور ہر جہت سے اہل علم سے اپنی فنی کمال کی سند پائی ہے صائبؔ کے لیے بھی یہی بات بلا تردید کہی جا سکتی ہے۔ انھوں نے بھی ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی اور دانشوروں سے جھولیاں بھر بھر کے داد پائی۔ بہتر ین غزلوں کے ساتھ کامیاب نظمیں لکھیں۔ مرثیوں، قصیدوں اور مثنویوں پر قلم اٹھایا تو قطعات و رباعیات اور خمسہ جات کو بھی موضوعِ سخن بنایا، مسدّس، مستزاد اور چہار بیت وغیرہ اصناف بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں رہیں۔ اس طرح وہ ہر صنف میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

عام طور پر شعرا کو تلامیذ الرحمٰن کہا جاتا ہے اور شاعری کو وجدان سے موسوم کردیا گیا ہے۔ فنون لطیفہ میں جب صورت گری، سنگ تراشی اور رقص و موسیقی مشق و ریاض کے محتاج ہیں تو پھر شاعری کو الہام و القا سمجھنا لایعنی ہے۔ صائبؔ کے نزدیک شاعری ایک اکتسابی فن ہے اور معراج فن کے لیے یہ ضروری ہے کہ ریاضت و مہارت کا سلسلہ چلتا رہے۔ اسی ضمن میں انھوں نے کہا تھا:

مشقِ سخن کے واسطے چاہیے عرصۂ دراز
"فکرِ عمیق" اور ہے "پختہ کلام" اور ہے

فکرِ عمیق اور وجدانِ طبع اپنی جگہ لیکن ؂

نکاتِ شعر بغیر شعور لا ینحل ‌ ‌ ‌ نکاتِ شعر سے پہلے شعور پیدا کر

مشہور فارسی شاعر صائب کو تو یہ شکایت تھی:

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را ‌ ‌ ‌ تحسین ناشناس، سکوتِ ہنر شناس

صدیق صائب کے معترضین کہتے ہیں کہ ان کی شاعری دل کی شاعری نہیں بلکہ دماغ کی شاعری ہے۔ اگر کسی حد تک اس طرزِ فکر کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو غالب کی مشکل پسندی اور دقت طلبی اسی اتہام سے متہم ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر ان کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت اور ہے جو انھیں دوسرے شعرا سے منفرد و ممتاز کرتی ہے انھوں نے مختلف علوم و فنون کو اپنی شاعری کی اساس بنایا ہے اور بڑی صناعی سے انھیں اپنے کلام میں برتا ہے۔ چناں چہ

یہی وہ حضرت صدیق ہیں، یہی صائب
یہ ڈاکٹر بھی ہیں، رمّال بھی ہیں، ماہرِ طب!
یہی تو ہیں جنھیں استاد لوگ کہتے ہیں،
ابو الفنون بھی، عامل بھی، منشی و کاتب

ٹونک کے استاد صائب عربی فارسی اور اردو زبانوں کے علاوہ علم رمل، جفر، طب، ریاضی، عروض اور نجوم کے منتہی تھے۔ ان کی شاعری کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان تمام علوم کے خشک اور دقیق موضوعات کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے اور معنویت و نکتہ سنجی کے پیکر تراشے ہیں۔ ان علوم سے نابلد اشخاص یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ شعوری طور پر حضرت صائب نے کچھ اصطلاحیں منظوم کر دی ہوں گی اور چند مخصوص تراکیب کو اشعار کا جامہ پہنا دیا ہو گا مگر ع

قدرِ گوہر شاہ داند کہ بداند جوہری

کے مصداق صرف ہنر شناس ہی اس قسم کی شاعری سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور وہی معیار و میزان کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ صائب کی "علمیہ شاعری" کا اگر فرداً فرداً جائزہ لیا جائے تو نہ صرف مذکور الصدر علوم و فنون کے بعض اہم گوشے بے نقاب ہوں گے بلکہ حضرت صائب کی نادر الکلامی، تخیل آفرینی، ژرف نگاہی اور نکتہ سنجی کی لا محالہ داد دینی پڑے گی۔ انھوں نے خود کہا ہے ؂

لفظ ناراض ہیں یوں، کہ ہم نے
گنجِ معانی کے اسرار کھولے

(الف) علم الافلاک

نظامِ شمس و قمر کے سوا کچھ اور نہیں
فلک فریبِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ علمِ سیارگان کو شعرا نے موضوعِ سخن نہ بنایا ہو لیکن یہ بھی ایک بین حقیقت ہے کہ اردو شاعری میں اس کا ذکر خال خال ملتا ہے۔ علم الافلاک پر جو کچھ کلام دستیاب ہوتا ہے وہ زیادہ تر فارسی زبان میں ہے۔ چناں چہ ایران کے باکمال شاعر حضرت نظامی گنجوی ایک زبردست منجم بھی تھے۔ موصوف نے "مخزن الاسرار" میں ایک نعت صفتِ معراج میں رقم کی ہے جس میں بروجِ آسمان کے متعلق ان کا بیان قطعی طور پر منجمانہ ہے۔ امیر خسرو کی معرکتہ الآرا مثنوی "نہ سپہر" کا ڈھانچہ علمِ سیارگان اور علم النجوم کے "نہ افلاک" پر قائم کیا گیا ہے اور تاریخی واقعات کو نجوم کی مخفی اصطلاحوں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح "بوستانِ خیال" اور "جاوید نامہ" بھی اسی قبیل کی مثنویاں ہیں۔ جن میں نکات علم الافلاک کھل کر سامنے آتے ہیں۔ اردو میں اگرچہ حکیم مومن خاں مومن دہلوی علم النجوم سے کما حقہ واقفیت رکھتے تھے مگر وہ صرف یہ کہہ کر رہ گئے ؎

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس　　آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

ایک بے مثال قصیدہ منیر شکوہ آبادی کا بھی ملتا ہے جو انھوں نے زمانۂ جلاوطنی، جزائر انڈمان میں کہا تھا۔ اگرچہ یہ اپنی قسم کا پہلا اور آخری قصیدہ ہے جس میں فلکیات کو موضوعِ شاعری بنایا ہے تاہم اس میں انھوں نے "مصطلحاتِ عجم اور کنایاتِ فردوس" کی طرز میں صرف اصطلاحات وضع کی ہیں مثلاً وہ ــــ
خوردہ کافور اور اشکِ زلیخا کو نجوم و کواکب ٹھہراتے ہیں۔
لوحِ زمرد اور صوفیٔ ازرق لباس آسمان کو کہتے ہیں۔ شاہدِ بابل وطن،
زہرہ کو ٹھہرایا ہے اور نوحۂ آب گیر کی اصطلاح کہکشاں کو بخشی ہے۔
ملا وجہی کی "قطب مشتری" بھی بس نام کی قطب مشتری ہے کیونکہ انھوں نے اپنی اس مثنوی میں صرف کرداروں کے نام "فلکیات" سے جوڑ دیے ہیں۔ البتہ پروفیسر عبد الغفور شہباز کا قصیدہ "قران السعدین" کسی حد تک سیاحتِ علوی کراتا ہے لیکن آخری شعر

سعدِ اصغر ہے یہیں ہمدم سعد اکبر　　لارڈ کرزن کے قریں جیسے کہ لیڈی کرزن

پڑھ کر "قران السعدین" کا سب تار و پود بکھر جاتا ہے۔ ایسی صورت میں صائب کی شاعری اہلِ اردو کے لیے مغتنم و محترم ٹھہرتی ہے کیوں کہ انھوں نے موضوعاتی التزام کا حق ادا کیا ہے اور اپنی منجمانہ استعداد کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔
واضح ہو کہ بالائے سر جو گنبدِ نیل گوں دکھائی دیتا ہے اس کو حکمائے قدیم "آسمان" اور زعمائے جدید "فضائے بسیط" کہتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے نظری دائرہ ہے جس میں سب

سیارے ایک شاہراہ پر بنا دائیں بائیں گھومے سیر کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ عربی میں لفظ "سیر" سے مراد شب کا سفر ہے کیوں کہ سیارے آفتاب کی روشنی میں نظر نہیں آتے اور رات کو ہی دکھائی دیتے ہیں۔ سیارے تعداد میں سات ہیں: زحل، مشتری، مریخ، شمس، زہرہ، عطارد، قمر۔ ان میں زحل، مشتری و مریخ علوی اور زہرہ، عطارد و قمر سفلی سیارے کہلاتے ہیں۔ شمس یعنی آفتاب درمیان واقع ہونے کی وجہ سے علوی و سفلی ہر دو کے اثرات پر حاوی ہے۔ منجموں نے سیاروں کی شاہراہ اور گردش کو بارہ منزلوں پر تقسیم کر کے "دوازدہ بروج" کا نام دیا ہے اور ان کے دائرۂ آسمانی کو "منطقۃ البروج" ٹھہرایا ہے:

برج ہا دیدم کہ از مشرق برآوردند سر	جملہ در تسبیح و در تہلیل حی لا یموت !
چوں حمل، چوں ثور، چوں جوزا و سرطان و اسد	سنبلہ میزان و عقرب، قوس و جدی و دلو و حوت

اسی طرح دائرہ افلاک میں ستاروں کی شناخت سے رفتہ رفتہ ثوابت و سیارگان میں امتیاز قائم ہوا اور علم النجوم میں صفحۂ گردوں کے لیے یہی بے معنی نقوط اٹل حقیقت بنتے گئے۔ علم النجوم میں کواکب و بروج کے عروج و زوال اور طلوع و غروب پر مبنی تاثیرات سے بحث کی جاتی ہے۔ اسے دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اول "علم ہیئت" ہے جس میں رفتار فلکیہ کے ذریعے سیارہ جات و ثوابت کی رفتار و مقام کو دریافت کیا جاتا ہے اور دوسرا "علم الآثار" ہے جس میں سیاروں کی رفتار سے تاثیرات پر وقوف و نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ مختصراً "علم ہیئت" سے اوّل سیر آفتاب معلوم کی جاتی ہے۔ تاکہ طلوع و غروب کے اوقات معلوم ہو سکیں۔ ماہ و سن میں تمیز کی جا سکے اور موسم و فصل کا علم و اندازہ اور تعین کیا جا سکے۔ مابعد رفتار قمر کو معلوم کیا جاتا ہے۔ تاکہ چاند اور سورج کے ہونے والے گرہن کا صحیح طور پر پتا لگ سکے۔ سیر قمر سے موسموں کا مزاج، مخلوقات عالم کی نشو و نما، حیوانات و نباتات کی بالیدگی، دریاؤں کی روانی، سمندروں کا مد و جزر، بارش، گرمی و سردی اور ہواؤں کا وقوع بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔

علم النجوم حضرت ادریس علیہ السلام کے معجزات میں سے ہے اور "بحار الانوار" میں مرقوم ہے کہ فرمایا جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلموا من النجوم ما تھتدون بہ فی ظلمات البر والبحر (سیکھو علم النجوم کو اس قدر کہ راہ دکھا دے تم کو بحر و بر کی ظلمات میں) اور شاہِ یمن مع ذی یزو قوم و قبیلہ قبل از وجود مسعود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بسبب علم النجوم کے مومن و مسلمان ہوا تھا۔

اس تمہید کی روشنی میں صائبؔ کے اشعار کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ علم النجوم کے دقیق، عمیق اور عتیق موضوعات پر انھوں نے کیا شاعرانہ موشگافیاں کی ہیں۔ سب سے پہلے اس علم کے بارے میں اشارتاً ان کی حتمی رائے دیکھیے:

نیک و بد کے سب فسانے تجھ سے ہیں | زائچے کے بارہ خانے تجھ سے ہیں
جان لے تو ہے یہی علم نجوم | ہے مبارک تیری قسمت یا کہ شوم
اور ہر خانے میں پوشیدہ ہے جواب | تو کہیں عاجز کہیں ہے کامیاب

علم النجوم کا زائچہ بارہ خانے کا ہوتا ہے اور سائل کے ہر سوال کا جواب ستارہ کی خاصیت کے مطابق دیا جاتا ہے۔ دنیا بھر کی معلومات بھی اسی کے ذریعے حاصل کی جاتی ہیں۔

سبعہ سیارگان کا شمار کس طرح کیا جاتا ہے۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

سنیچر سے مسلسل جمعہ تک یوں ہے شمار انکا
زحل، شمس و قمر، مریخ عطارد، مشتری، زہرہ

یعنی

زحل ۔ شمس ۔ قمر ۔ مریخ ۔ عطارد ۔ مشتری ۔ زہرہ

سنیچر اتوار پیر منگل بدھ جمعرات جمعہ

سنیچر کے دن طلوعِ آفتاب سے زحل کی ساعت شروع ہوتی ہے جو ایک گھنٹہ یا کچھ یا زائد شمار کی جاتی ہے۔ اتوار کے دن شمس کی اور بروز پیر قمر کی... علیٰ ہذا القیاس غزلوں کے مختلف اشعار میں یہ منجم شاعر اپنی ندرتِ فکر اور جدّت طرازی کے اس طرح جوہر دکھاتا ہے ؎

بنا ذوقِ یقیں سے پہلے اپنے آپ کو مومن
پھر اپنی پستیوں میں اوجِ الدّبران پیدا کر

توضیح :۔ الدّبران چاند کی منزلوں میں سے چوتھی منزل ہے اور ایک سُرخ رنگ، سعد خاصیت روشن ستارے کا نام ہے۔ مومن اگر ذوقِ یقین پیدا کر لے تو الدّبران کی بلندیاں چھو سکتا ہے۔

ہر ایک ذرہ نظر آیا غیرتِ انجم
جو دیکھی دیدۂ عیوق سے زمیں میں نے

توضیح :۔ دیدۂ عیوق سے مراد چشم ثور (بیل کی آنکھ) ہے کہتے ہیں جو کوئی بوقت طلوع اس ستارے کو دیکھ لے اس کی بینائی جاتی رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم آسمان سے زمین کو دیکھیں تو وہ اس طرح تابناک دکھائی دے گی جس طرح کہ ہمیں کرہ ارض سے ماہ منوّر نظر آتا ہے۔

محویت سی محویت تھی رقص میں ناہید خود
بر بطِ برجیس پر تھی نغمہ خواں کل رات کو

توضیح :۔ "ناہید" کو عربی میں زہرہ اور برجیس کو مشتری کہتے ہیں۔ اصطلاحِ نجوم میں

دو مبارک سیاروں کا ایک برج میں جمع ہونا "قران السعدین" کہلاتا ہے۔ زہرہ و مشتری کا قران ظاہر ہے کہ مبارک و مسعود ہوگا۔

چرخ پیمائے فلک روز و شب آہستہ خرام
کوکب و شمس و قمر راہ گزار اور سفر

توضیح:۔ دورانِ گردش سیارے ایک معینہ وقت میں "دوازدہ بروج" میں سے ہو کر گزرتے ہیں۔ ہر ایک کی شاہراہ مقرر ہے اور کوئی دائیں بائیں نہیں بھٹکتا۔ قمر ایک ماہ میں ۲۸ منزلیں طے کر کے سفر پورا کرتا ہے جبکہ آفتاب یہ مسافت ایک سال میں پوری کرتا ہے۔

بحیثیت فن اور سائنس علم النجوم پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن شعر و ادب میں اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ صاحبؔ فوکلی نے بہرحال اس میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ سات بندوں پر مشتمل ایک "مناجات" کہی تھی جس میں سبعہ سیارگان کے سعد و نحس اثرات کے لیے اوراد و وظائف منظوم کیے تھے اور ایک مثنوی بھی دشحاتِ فکر کا نتیجہ ہے جس میں اختر شناسی کی مکمل معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ذیل میں نسبتاً چند آسان اشعار درج کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی غزلوں کو کس طرح علم سیارگان سے مستفید و مستغنی کیا ہے:

فضائے دہر میں تحلیل ہو کر چلا میں آوارہ نہیں ہوں اختر گردوں، مگر فطرت ہے سیارہ

رہی زمین کی پستی ہی پر نظر میری اگرچہ اوجِ ثریا مرا ٹھکانہ تھا

ہزار میں سہی اک ذرۂ زمیں لیکن کبھی کبھی تو ستارے تلاش کرتے ہیں

مری بابت خیال آرائیاں ہیں آسمانوں میں یہ شب بیدار انجم آشنا معلوم ہوتا ہے

گردش کو میری گردشِ گردوں نہ پائے گی کہہ دو نہ اقتدا مری شمس و قمر کریں

اُڑا کر چرخ سے رفتارِ خورشید و قمر میں نے زمانے کی طرح پلٹے لیے شام و سحر میں نے

مری عالی ہمتی کو ذرا یہ نہیں گوارا کسی آسماں پہ کیوں ہو مرے بخت کا ستارا

ستارے اس کی کج بینی پہ پھر دکیوں نہ ہوں بیم کہ جو گردش کو اپنی آسماں بر آسماں سمجھے

اب مجھے گردشِ دوراں کی شکایت نہ رہی ”یعنی منت کشِ انجم مری قسمت نہ رہی“

علم النجوم کی دوسری شاخ ”علم الآثار“ ہے اور یہ ”نقوش“ کے لیے مختص کر دی گئی ہے۔ علم النقوش کی مثالیں بھی ملاحظہ ہوں:

(۱)
ہے پچھے مجب اچھی ساعت مشتری نقشِ اُلفت کی پہن انگشتری
اس طرح محبوب ہو جائے گا رام اور ہو جائیں گے خوشتر صبح و شام

یعنی ”محبت“ کے واسطے نیک ساعت مشتری سیارے کی ہے جو چھٹے آسمان پر واقع ہے چوں کہ یہ مذکر اور سعد اکبر ہے اس لیے شاعر کہتا ہے کہ اس ساعت میں نقش لکھ کر اور انگوٹھی پہ کندہ کرا کے پہن لو تو محبوب مطیع ہو جائے گا۔

اس طرح نیچا دکھا اغیار کو نقشِ نفرت میں، جو سمجھو تو خار کو
دفن کر پھر جا کے قبرستان میں غیر سے جھٹکا را پا، اک آن میں

نقش کے لیے ساعت نیک و بد سیارگان کے شمار کے مطابق ہوتی ہے جیسا کہ اوپر مذکور کیا گیا ہے۔ سنیچر کے دن طلوعِ آفتاب سے زحل کی ساعت ہوتی ہے۔ مالکِ فلکِ ہفتم زحل نحسِ اکبر ہے اس لیے اگر اس ساعت میں نقشِ نفرت تیار کیا جائے اور قبرستان میں دفن کر دیا جائے تو محبوب اور غیر کے درمیان نفاق ہو جائے گا۔

(ب) **علمِ رَمل** عربی زبان میں رمل کے لغوی معنی ”ریگ“ کے ہیں لیکن شری علوم کی اصطلاح میں اس علم کا نام رمل ہے جس کے ذریعے تینوں... زمانوں کے خفدنی اور غیبی حالات معلوم کیے جائیں۔ قدیم روایات کے مطابق پہلے رمّال حضرت دانیال علیہ السلام ہیں۔ کتابوں میں مذکور ہے کہ ایک بار حضرت دانیالؑ ایک بیابان میں سفر کرتے ہوئے راہ بھٹک گئے جب واماندگی حد سے بڑھی تو حیران و پریشان ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئے اور اپنے ہاتھ کو زمین سے ٹیک دیا۔ انگلیوں سے ریت پر کچھ اس طرح کے نشانات بن گئے۔ آپ کی رہبری کے لیے حضرت جبرئیل علیہ السلام زمین پر تشریف لائے اور اپنا دستِ مبارک حضرت دانیالؑ کے مقابل رکھا تو ریگِ زمین پر نشانات کی یہ صورت ⁝⁝ پیدا ہو گئی۔ ان ہر دو نشانات میں صورتِ اوّل کو طریق اور صورتِ دوم کو جماعت کہتے ہیں۔ چناں چہ حضرت دانیالؑ نے نشاناتِ مذکورۃ الصدر سے اور چودہ اشکال وضع کیں اور طریق و جماعت سے اصولِ ریاضی کے تحت کل سولہ ۱۶ اشکال ترتیب دے کر اور انھیں اربعہ عناصر پر تقسیم کر کے ”دائرہ ابدح“ بنایا اور تمام اشکال کو ستیارگان و بروج سے منسوب کر کے علمِ رمل کی بنیاد رکھی۔

صائب کے اشعار سے بھی اس کی توضیح و تشریح ہو سکتی ہے۔ مثنوی میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

جاننا چاہے اگر تو دل میں سائل ہے کیا
زائچہ کی شکلِ اوّل سے چلے گا یہ پتا

علمِ رمل کے زائچہ میں جو سولہ[۱۶] شکلیں ہوتی ہیں اسی بنیاد پر سولہ[۱۶] خانے شمار کیے جاتے ہیں۔ سائل جو سوال اپنے دل میں سوچتا ہے اس کو پہلی شکل سے معلوم کرکے سائل کی غرض بتائی جاتی ہے ؎

گو کہ ہر رمال کو ہوتی ہے سب کچھ آگہی
ہاں مگر علمِ رمل میں کار مشکل ہے، خبی

سائل کوئی چیز اپنے ہاتھ کی مٹھی میں چھپا لیتا ہے اور اس کے بارے میں دریافت کرتا ہے۔ رمال زائچہ کی مدد سے مخفی چیز کا پتا لگاتا ہے لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں۔
غزل کا شعر ملاحظہ ہو ؎

حسن، کیا عشق کرے، مائل اوتاد نہیں
آب آتش میں نہیں، خاک میں کچھ باد نہیں

توضیح:۔ شعر مشکل پسندی اور فکر آفرینی کا نمونہ ہے۔ علم رمل کی مبادیات کے سمجھے بغیر مفہوم تک رسائی ناممکن ہے۔ "مائل اوتاد" اور "زائل اوتاد" علم رمل کی اصطلاحیں ہیں۔ زائچہ کے ۱۶ خانوں میں چار آتشی (۱۔۵۔۹۔۱۳)، چار بادی (۲۔۶۔۱۰۔۱۴) چار آبی (۳۔۷۔۱۱۔۱۵) اور چار خاکی (۴۔۸۔۱۲۔۱۶) ہوتے ہیں۔ رمل کا دارومدار ابجد ارکانِ عناصر سے منسوب ہے اور مبداء اس علم کا نقطہ ہے۔ شعری تجزیہ کے لیے یہ نقشہ ضروری ہے:

ارکان / اوتاد	آتش	باد	آب	خاک
حروف وتد	ا۔ف۔م	ب۔ص۔ن	ج۔ق۔س	د۔ ر۔ع
حروف مائل وتد	ہ۔ش	و۔ت	ز۔ث	ح۔ خ
حروف زائل وتد	ط۔ ذ	ی۔ض	ک۔ظ	ل۔غ

شعری تجزیہ:۔ لفظ "حُسن" میں تین حروف ہیں جس میں "ح" (مائل وتد) متعلق خاک، "س" (وتد) متعلق آب اور "ن" (وتد) متعلق باد ہے۔
"عشق" بھی تین حرفی لفظ ہے جس میں "ع" (وتد) متعلق خاک، "ش" (مائل وتد) متعلق آتش اور "ق" (وتد) متعلق آب ہے۔
اس سے یہ واضح ہوا کہ حُسن میں عنصر "باد" کا موجود ہے جو بقیہ عناصر کو تقویت پہنچاتا اور ان پر غالب رہتا ہے (ہوا آگ کو بھڑکاتی ہے، پانی کو دھکیلتی ہے اور مٹی کو خشک کرتی ہے) مگر عنصر "آتش" حسن کے حروف میں نہیں۔ "عشق" میں عنصر "آتش" موجود ہے جس کو عنصر "باد" کا بھڑکاتا ہے یعنی "حسن" میں عنصر باد ہے جو عشق میں نہیں جب کہ عشق میں آتش عنصر پایا جاتا ہے جو حسن میں موجود نہیں۔ دونوں میں تضاد ہے۔
مفہوم شعر:۔ حسن فطرتاً عشق سے بے نیاز ہے اور عشق کے پاس کوئی چارہ کار نہیں۔ جس طرح آگ میں پانی کا وجود نہیں ہوتا اور خاک میں ہوا نہیں ہوتی

حسن اور عشق کا اتحاد بھی ممکن نہیں۔
ایک قطعہ اور دیکھیے جس کی بنیاد بھی رمل پر ہے اور جو صنعت اظہار مضمر میں کہا گیا ہے:

قطعہ

۱ ← شک اور غم و خوف کل اُس پر وارا
۲ ← رزّاق ہوا قادر و سلطاں جس کا
۴ ← ہو شوق، تو کچھ کم نہ کرو عرضِ شوق
۸ ← ہاں یاد خدا نام تو ہے اَن داتا!

متعلقہ مصرع:۔ غزل عشق کے خدا تم ہو۔
سائل سے کہو کہ دیے گئے مصرع میں سے کوئی بھی "حرف" اپنے دل میں سوچ لے۔ اس کے بعد یہ قطعہ پڑھا جائے گا۔ قطعہ کے چاروں مصرعے یکے بعد دیگرے پڑھیں اور سائل سے پوچھتے رہیں کہ آیا اس کا سوچا ہوا حرف مصرع میں موجود ہے یا نہیں جس جس مصرع میں سائل اپنا حرف ہونا بتائے ان کے اعداد جمع کرو "حاصل جمع" سوچے ہوئے حرف کا نمبر ہوگا جو سائل کو بتایا جا سکتا ہے۔

تجزیہ:۔ (i) غزل عشق کے خدا تم ہو، کے مصرعے میں کُل پندرہ حروف ہیں یعنی زائچۂ رمل کے سولہ خانوں میں سے پندرہ خانے اس میں سے جو جواب حاصل ہوتا ہے وہی سولھواں خانہ بن جاتا ہے۔ اس طرح زائچہ مکمل ہو جاتا ہے۔
(ii) صائب صاحب نے قطعہ کے مصرعوں کو جو نمبر دیے ہیں وہ غور طلب ہیں کیوں کہ یہ رمل کے "دائرہ ابدح" کے مطابق ہیں مثلاً

عدد ـــــ	۱	۲	۴	۸
عنصر ـــــ	آتش	باد	آب	خاک
حرف ـــــ	ا +	ب +	د +	ح

مثال:۔ فرض کیا کہ سائل نے متعلقہ مصرعے میں سے حرف "خ" سوچا۔ دیے گئے قطعہ میں یہ حرف پہلے اور چوتھے مصرع میں واقع ہے۔ پہلے اور چوتھے مصرعے کے اعداد علی الترتیب ۱۔ ۸ ہیں، دونوں کا حاصل جمع ہوا "نو" اس کا مطلب ہے کہ سائل نے "غزل عشق کے خدا تم ہو" کا نواں حرف "خ" سوچا ہے۔

رملا جفر سے نہ حرفوں کا مدعا صائب
فضول کوششِ بست و کشود ہے یارو

(ج) علم جفر

علم جفر کا تعلق بھی قدیم پُر اسرار علوم سے ہے۔ حضرت ادریس علیہ السّلام کے شاگرد افلاطون سے اس کی ابتدا باقاعدہ طور پر عمل میں آئی۔ ارسطو اور افلاطون کے علاوہ دیگر حکمائے قدیم بھی اس کے ماہر و ہنر شناس گزرے ہیں۔ مذہب اسلام میں

حضرت علیؓ سے علمِ جفر کا چشمۂ فیض جاری ہونا قدمائے اسلام سے ثابت ہے۔ علم جفر دو حصّوں میں منقسم ہے۔ (i) علم الآثار (ii) علم الاخبار

جیسا کہ صائبؔ نے کہا ہے ؎

جو سمجھتا ہے یہ راز جفّار ہے | علم الاخبار ہے، علم الآثار ہے
علم الآثار ہے نقش کے واسطے | اور خبر کے لیے علم الاخبار ہے
(اشعار مثنوی)

"آثار" میں حروف و اعداد کے ذریعے نقش تیار کیے جاتے ہیں جس کا ذکر علم النجوم کے تحت کیا جا چکا ہے۔ "اخبار" میں تکاسیر کے ذریعے عناصر کی ترتیب کو کام میں لا کر مغیب اشیا سے سوالات کا جواب معلوم کرتے ہیں۔ مشائخین و صالحین سلف میں بعض کو یہ قدرت حاصل تھی کہ وہ اس علم کی مدد سے مخلوق خدا کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کرتے تھے۔ کیوں کہ قرآن شریف کے الفاظ و اسما اور آیتیں، سورتیں جب اس میں داخل ہو گئیں تو تاثیرات دو چند ہو گئیں۔

صائبؔ کو جفر میں بھی دخل تھا اور انھوں نے اسے بھی شاعری میں برتا ہے۔ چنانچہ مثنوی کے اشعار میں ایک جگہ کہا ہے ؎

اُس پہ ہوتا ہے آسان ہر مرحلہ
جس کو آتا ہے قسمت سے مستحصلہ

مستحصلہ میں "خبر" ہوتی ہے۔ جفّار حضرات بجز اپنے فرزند یا شاگرد رشید کے اسے کسی کو بھی نہیں بتاتے اور عاقل ترین شخص بھی اس کو کتابی علم سے حاصل نہیں کر سکتا۔ دوسرے علوم کی طرح علم جفر بھی ایک بحر نا پیدا کنار ہے اس لیے "علم الاخبار" کے تحت کچھ اشعار بطور مثال پیش ہیں ؎

ہوں محمدؐ اور علیؓ کے درمیاں | ہو گی یوں معلوم شخصیت میری
حرفِ اعدادِ محمدؐ لوٹ کر | با کو کر دو گنا کہ مقصد ہے یہی
پھر محمدؐ لکھ کے ان حرفوں سے قبل | کر اضافہ حرفِ اعدادِ علیؓ

توضیح:۔ اس میں حضرت صائبؔ اپنے نام کی "خبر" دے رہے ہیں "محمدؐ" کے اعداد ۹۲ ہیں جس سے حروف ۲+۹۰ بنتے ہیں۔ پلٹنے پر ۲ اور "ب" کو دو گنا کرنے پر ص + د (ب کا دو گنا) ہوا۔ علیؓ کے ۱۱۰ اعداد سے حرف ی + ق بنے اس طرح ص + د + ی + ق =) صدیق نکلا اور اس کے پہلے محمدؐ لکھا تو محمد صدیق ظاہر ہوتا ہے جو صائبؔ کا اصل نام ہے۔

(د) علمِ ریاضی

ازل سے عشق ودیعت ہوا ہے صائبؔ کو
یہ اور بات کہ وہ ماہر حساب ہوا

حضرت صائبؔ علم الحساب و ہندسہ میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ریاضی کا علم انھیں اپنے خاندان سے وراثت میں ملا تھا۔ وہ ایک عظیم حساب داں تھے اس

لیے دورانِ ملازمت ٹریژری میں کیپا ئیلیشن کا مشکل کام انجام دیتے تھے۔ ریاضی میں ان کی کاوشیں بے شمار ہیں۔ غزل کا ایک شعر ہے ؎

ظہورِ زاویہ قائمہ سے ثابت ہے
یہ کائنات ہے علم الحساب کی زد میں

زاویہ قائمہ کی شکل یہ ل قائمہ ہے۔ اس طرح وہ ثابت کرتے ہیں کہ کائنات حدودِ حساب سے باہر نہیں ہے۔ ایک اور شعر میں خدا سے مخاطب ہو کر کہا ہے

نگاہِ ثانی ضروری ہے فردِ عصیاں پر مرے کریم تجھے بھی حساب آتا ہے

بے شک وہ حساب کتاب میں ماہر تھے اس لیے اُن کے کلام میں حسابی کرشمہ کاری بھی ملتی ہے۔ کبیرؔ داس کی ایک چوپائی ہے:

عدد نکالو ہر چیز سے، چوگن کرلو وائے
دُو ملا کے پچگن کرلو، بیس کا بھاگ لگائے
باقی بچے کو نوگن کر لو، دُو اس میں دو اور ملائے
کہت کبیر سنو بھئی سادھو نام محمدؐ آئے

جس میں بتایا گیا ہے کہ ضرب و تقسیم کے مذکورہ طریقے پر دنیا جہاں کی ہر چیز سے اسم پاک محمدؐ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ ناشناسانِ علم ہندسہ نے اسے کبیرؔ کا "ارمغان اعلیٰ" سمجھ کر بہت اہمیت دی ہے اور نعت کے مجموعوں میں اسے اکثر متبرک سمجھ کر خصوصی طور پر شامل کیا ہے حالاں کہ یہ کوئی غیر معمولی کارنامہ نہیں۔ صائبؔ نے اس طرح کے بہت سے حسابی طریقے منظوم کیے ہیں:

(۱) معلوم کردن اسمِ محمدؐ از ہر شے

رقم، ہر حرف کو کرلے تو یک جا ۔۔۔ گُنا کر تین سے دُو کر اضافہ
پھر اس کے بعد اس کو پنچ گُنا کر ۔۔۔ تو کر تقسیم پندرہ سے برابر
بچے باقی جو، اس کو نو گُنا کر ۔۔۔ بڑھا تا نون کے پھر دُو مکرر
ہر اک شے سے محمدؐ ہو گا پیدا ۔۔۔ یہ ہے استاد صائبؔ کا طریقہ

توضیح:۔ دنیا کی بے شمار چیزوں میں سے فرض کر لو کہ ہم نے لفظ "کتاب" لیا جس کے اعداد ابجدی ۴۲۳ ہوئے۔ انھیں تین سے ضرب دینے پر حاصل ضرب ۱۲۶۹ آتا ہے۔ دُو اور جمع کیے ۱۲۷۱ بنے۔ پانچ سے پھر ضرب دینے پر ۶۳۵۵ ہوئے ان اعداد کو پندرہ سے تقسیم کرنے پر خارج قسمت ۴۲۳ ہوتا ہے اور باقی ۱۰ بچتے ہیں۔ بقیہ دس کو نو سے ضرب دینے پر ۹۰ ہوئے اور دُو جوڑنے پر ۹۲ بنتے ہیں جو اسم محمدؐ کے اعداد ہیں۔ اسم محمدؐ برآمد ہونے کے ساتھ خارج قسمت کے ذریعے اصل اعداد بھی معلوم ہوتے ہیں۔

(ii) معلوم کردن اسم احد از ہر شے

اعداد لے ہر شے کے بقید ابجد
پھر آٹھ گنا کر کے گھٹا ایک عدد
پھر چو گنے پر اس کے عدد ایک بڑھا (رباعی)
کر سولہ سے تقسیم رہے باقی احد

توضیح:۔ مثلاً ہم نے لفظ "گلاب" لیا جس کے اعداد ۵۳ ہوتے انھیں آٹھ سے گنا کرنے پر ۴۲۴ حاصل ضرب آتا ہے۔ ایک باقی نکالنے پر ۴۲۳ رہتے ہیں۔ انھیں چار سے ضرب دینے پر ۱۶۹۲ اور پھر ایک کا اضافہ کرنے پر ۱۶۹۳ کے اعداد ہوئے۔ اب ۱۶ سے تقسیم کیا تو حاصل قسمت ۱۰۵ آتا ہے اور باقی ۱۳ بچتے ہیں جو لفظ "احد" کے اعداد ہیں۔

(iii) دریافت کردن شب قدر

کاف بدھ کا، پیر کج، شنبہ و سہ شنبہ ہے کد
کہ جمعرات و جمعہ کز، کیط کی جان، اتوار حد

صائب کے اس طریقے کے مطابق اگر رمضان شریف کی یکم تاریخ بروز بدھ ہوتی ہے تو لفظ "کا" کے اعداد ۲۱ کے مطابق اکیس^{۲۱} تاریخ کو شب قدر ہوگی۔ اسی طرح پیر کی پہلی ہونے پر "کج" کے مطابق ۲۳ کو اور منگل و بدھ سے رمضان المبارک شروع ہوتے ہیں تو "کد" کے حساب سے ۲۴ کو شب قدر ظہور پذیر ہوگی۔ جمعرات کی صورت میں "کہ" کے اعداد ۲۵ اور جمعہ رمضان کی اوّل تاریخ کو آتا ہے تو "کز" کے مطابق ۲۷ کو شب قدر کا نزول ہوگا۔ اتوار سے رمضان کے روزے اپنی ابتدا کریں تو پھر "کیط" یعنی ۲۹ تاریخ کی شب قدر مانی جائے گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ شب قدر کے صحیح تعین کے بارے میں مختلف احادیث سے مختلف باتیں اور تاریخیں معلوم ہوتی ہیں۔ پتا نہیں صائب نے اس کلیہ کا ماخذ کیا ہے۔ بہرحال ان کا تعین قرین قیاس ہے۔

اس طرح کے بہت سے حسابی فارمولے بہ صورت اشعار ملتے ہیں۔ انھوں نے تو "اسم صائب" کی برآمدگی بھی دنیا کی ہر چیز سے ثابت کی ہے۔

(iv) برآمدگی اسم صائب از ہر شے

صائب کا یہ اعجاز ہے اللہ کی قدرت — ہر شے سے عیاں ہوتی ہے صائب کی حقیقت
ہر چیز کے اعداد پہ کر دو کا اضافہ — اور اس کے چوگنے پہ دو کر اور زیادہ
پھر پانچ گنا کر کے تو کر بیس سے تقسیم — ہشیار کہ اس طور سے ہے بعد کی تعلیم

باقی جو بچے اس کو نو پھر نو سے گنا کر پھر چار بڑھا اس میں تو صائب ہو برابر
صائب کی ہے اک ذات دوئی کچھ بھی نہیں ہے
کونین میں صائب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

مثلاً لفظ- مختار = اعداد ۱۳۴۱

عمل- ۱۳۴۱ + ۲ = ۱۳۴۳ × ۴ = ۱۹۷۲ + ۲ = ۱۹۷۴ × ۵
۹۸۷۰ ÷ ۲۰ باقی ۱۰ × ۹ = ۹۰ + ۴ = ۹۴

توضیح:- حساب ابجد میں ہمزہ کا نصف عدد شمار ہوتا ہے لیکن سن برآمد کرنے پر کامل عدد آتا ہے اس لیے صائب کے ہمزہ کا عدد بردے حرف ابجدی الف کی طرح ایک مانا گیا ہے۔

(۵) علم طب

بتلائیں اطبا کہ میری فکر بقا میں
جو خون سے بیزار ہے وہ کون سی نس ہے؟

صائب کا یہ سوال آج کل کے نام نہاد اطبا حضرات سے ہے جو حکمت وطب کو ایک پیشہ سمجھ کر اختیار کیے ہوتے ہیں اور علم طب کے مبادیات وجزئیات سے ناواقف ہیں۔ ہر چند کہ فی زمانہ بھی طب کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے مگر دیگر علوم کی عدم واقفیت کی بنا پر طب یونانی زوال پذیر ہے۔ حکیم لوگ بھولتے جا رہے ہیں کہ طب یونانی کی اصل بنیاد علم النجوم پر واقع ہوئی ہے۔ صائب ایک تجربہ کار اور علم شناس طبیب تھے۔ دواخانہ "سراپا" کے ساتھ ساتھ انھوں نے شاعری میں بھی طبی اصولوں کو استعمال کیا ہے اور اس طرح اپنے کلام کو نئے صحت مند عناصر سے مالا مال کیا ہے جیسے

رہنے دو مجھے گیسوئے مشکیں کی ہوا میں
افعی زدہ لیتا ہے بخار پر طاؤس

شاعروں نے عام طور پر محبوب کی 'زلف خم شدہ' کو سانپ سے تشبیہ دی ہے مگر صائب اس شعر میں ایک حکمت کے نسخہ کے ساتھ گیسوے مشکیں کی ہوا میں جینے کے لیے بھی توجیہہ بیان کر رہے ہیں۔ مار و طاؤس کی ازلی دشمنی ہے لہٰذا جب کسی کو سانپ کاٹ لیتا ہے تو "مار گزیدہ" کے فوری علاج کے لیے حقہ کی چلم میں مور کے پر جلا کر اسے حقہ پلایا جاتا ہے۔ جوں جوں دھواں مریض کے جسم میں داخل ہوتا ہے توں توں وہ روبصحت ہوتا جاتا ہے۔

خار چبھ چبھ کر لہو بہتا رہا دشت میں مکڑی کا جالا بھی نہ تھا

اس شعر میں پامال مضمون کو جدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مکڑی کا جالا زخم لگنے پر خون بند کرنے اور اسے بہنے سے روکنے کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صحرا میں مکڑی کا جالا کہاں دستیاب ہو سکتا ہے۔

تشخیص کے دوران رکھیں یاد اطباء غلبہ ہو رطب کا تو ہے یابس کی ضرورت

پھر اطبا کو ہدایت کرتے ہیں کہ تشخیص کے دوران اس بات کا خصوصی طور پر دھیان رکھا جائے کہ مرض و مریض پر رطب (وہ چیز جو اپنی رطوبتِ اصلی سے تر ہو) کا غلبہ نہ ہو۔ اگر ایسی شکایات لاحق ہو جائے تو یابس (خشک کرنے والا) کی ضرورت ہوگی۔ اگر مریض نزلے میں مبتلا ہے تو پہلے اس رطب کا تدارک ضروری ہے۔ رطب و یابس طبی اصطلاحیں ہیں۔

ایک غزل کے بیشتر اشعار میں حالتِ حاضرہ کی عکاسی طبی الفاظ و اصطلاحات کی روشنی میں کی ہے مگر شاعرانہ فکر و فن کو ملحوظ رکھا ہے۔ طبی و شعری اشتراک و امتزاج ملاحظہ ہو —

ذہن کو نہیں کی کیفیت بحران نہ پوچھ　　　تپ کی تبخیر سے تنظیم طبیعت نہ رہی
اف یہ لقوہ زدہ تنظیم یہ مفلوج فضا　　　روئے عالم پہ وہ رونق وہ صباحت نہ رہی
دہر پر دورۂ ضیق النفسی ہے طاری　　　پُر سکوں، ہائے زمانے کی وہ حالت نہ رہی
نزلۂ حار سے مختل ہے دماغِ عالم　　　ذہنِ آفاق میں بہبودی کی صورت نہ رہی
ذہن و دل کا وہی عالم ہے وہی خفقان　　　کون کہتا ہے کہ اس دور میں وحشت نہ رہی

خط کشیدہ سبھی الفاظ طب سے متعلق ہیں۔ پہلے شعر میں فرماتے ہیں کہ جس طرح بخار کی شدت میں طبیعت پُر سکون نہیں رہتی اسی طرح دنیا کے طول و عرض میں بحرانی کیفیت طاری ہے۔ آگے کہا ہے کہ جب انسانی جسم کے اعضاء لقوہ زدہ اور مفلوج ہوں تو چہرے کا رنگ و رونق جاتی رہتی ہے۔ نظمِ دو عالم کی لقوہ زدگی نے اس جہان رنگ و بو کا چہرہ بگاڑ دیا ہے۔ تیسرے شعر میں حالات کی بے سکونی کو دورۂ ضیق النفسی (دمہ) سے مثال دی ہے۔ جب یہ دورہ پڑتا ہے تو مریض پر تشنجی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ آگے کہتے ہیں کہ بہبودیِ عالم کے امکانات ختم ہو گئے ہیں کیوں کہ عمومی نزلے کا علاج تو ہو سکتا ہے لیکن نزلۂ حار (ایک طرح کا گرم نزلہ جو صرف دماغ میں ہوتا ہے اور اسے منتشر و ماؤف کر دیتا ہے) سے نجات مشکل ہے۔ آخر میں نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان لاکھ مہذب بن گیا ہو مگر اس کے ذہن و دل میں بربریت اور درندگی کا خفقان موجود ہے۔

ایسی باتیں کوئی حکیم حاذق اور ماہر طب شاعر ہی کر سکتا ہے۔

(و) علمِ کیمیا

صائب صاحب کے کلام میں ایسے اشعار بھی مل جائیں گے جن کا انحصار علمِ کیمیا پر ہے۔ بجا طور پر وہ اس علم میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

دو مثالوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچے گی —

تری خاطر قمر ہو کر تیری امید بن جاتا　　　مگر تبدیلیِ قسمت سے خود مجبور ہے پارا

کیمیا گروں کی اصطلاح میں "قمر" چاندی کو کہتے ہیں۔ کیفیت میں پارہ اضطرابی ہے اور چاندی منجمد۔ کہتے ہیں کہ پارہ متحرک سے منجمد ہو جائے تو وہ چاندی بن جاتا ہے لیکن پارے کو اتنی قدرت کہاں کہ وہ اپنی ہیئت تبدیل کر سکے۔ اسی خیال کو لے کر صائب نے ایک نیا مضمون پیدا کیا ہے۔

بنالے سیم و زر تدبیر سے تو یہ تو ممکن ہے مگر قسمت کا تانبہ مجھ سے اکل ہو نہیں سکتا

اکل مختف ہے لاینفل ہو کا۔ کیمیا گر اکل اس تانبہ کو کہتے ہیں جو کالونچ اور پیڑی نہ دے۔ یہ اس کے اچھے ہونے کی دلیل ہے۔ تانبہ اکل ہو جانے پر سونے جیسا معلوم ہوتا ہے۔ انسان کوشش و تدبیر کرلے مگر نوشتۂ تقدیر کو کیسے مٹا سکتا ہے شاعرانہ پیرایہ میں یہ بات صاحب ہی کہہ سکتے تھے۔

(ز) **فنِ تاریخ گوئی** غالب فن تاریخ گوئی میں طاق نہیں تھے اور انھوں نے جو کچھ تاریخیں نکالی ہیں وہ بھی تعمیہ و تخرجہ سے خالی نہیں اس بارے میں ایک لطیفہ مشہور ہے کہ کسی نے لفظ "تاریخ" سے تاریخی مادّہ نکالا۔ غالب کو ایک سال بعد تاریخ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جب فکر کرنے پر بھی کامیاب نہ ہوئے تو جھنجھلا کر بولے ؂

ہاتفِ غیب سُن کے یہ چیخا ان کی تاریخ میرا "تاریخا"

اسی ضمن میں صاحب کا ایک دلچسپ واقعہ دیکھیے۔ مولانا عبدالحی فائز نے جے پور سے ایک رسالہ "ہدایت" کا اجرا کیا۔ جب یہ رسالہ صاحب کے سامنے آیا تو اُن کے "تاریخی ذہن" میں "ہدایت" کے اعداد اُبھر آئے اور فوراً مندرجہ ذیل قطعہ کہہ ڈالا:

یہ اہلِ ولایت بھی تو ہیں چار سو بیس راوی روایت بھی تو ہیں چار سو بیس
ہو کس کی ہدایت پہ یقیں اے صاحب اعداد "ہدایت" بھی تو ہیں چار سو بیس

ان کے بہت سے تاریخی قطعات اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ فنِ تاریخ گوئی میں بھی اُن کو درک حاصل تھا۔ بطور مثال دو قطعے درج ذیل ہیں جو انھوں نے ساحر لدھیانوی کی وفات سے متاثر ہو کر کہے تھے ؂

۱۔ ساحر کی یہ موت بعد مرگ ماہر اشعار میں دیکھو اب حیاتِ شاعر
تاریخ کے باب میں ہوا یہ مصرع بے وقت ہے ہائے انتقالِ ساحر (معنوی)
۱۴۰۰ ہجری

۲۔ ناگہاں موت کی خبر سُن کے میں ہوں غمگیں بہ رشتۂ شاعر (صوری)
یک ہزار و چہار صد ہجری آخری سن ہے تیرا اے ساحر

(ح) **فنِ چیستان گوئی** ان کی بہت سی پہیلیاں اور چیستان بھی کلام میں پائے جاتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ انھوں نے اس میدان میں بھی حق ادا کیا ہے۔ "تسبیح" کے امام کی ایک پہیلی اس طرح ہے ؂

اونچا ہے یہاں مقام میرا کرتے ہیں سب احترام میرا
تسبیح میں بے شمار ہوں میں ہے سب کی زباں پہ نام میرا

اپنے نام "صدیق" کی وضاحت خفیہ طریقے سے اس طرح کرتے ہیں:

نام من وا باشد ۱+۵ حالِ زبوں
برصدی کُن حرف یک [illegible] افزوں
صدی + قِ = صدیق

یا

نام مرا بے خال ہے ناطق
خالص، خالد، خالی، خالق

دوسرے مصرعے کے چاروں الفاظ میں سے اگر لفظ "خال" نکال دیا جائے تو "صدیق" رہ جاتا ہے۔ المختصر حضرت صائب کو "نباض العصر" اور "مفکرِ دوراں" کا خطاب کچھ یوں ہی نہیں مل گیا تھا۔ وہ حقیقت میں "فہیم الشعرا" تھے۔ ان کے کلام میں وہ تمام شاعرانہ خصوصیات اور استادانہ کمالات ملتے ہیں جو انہیں دیگر شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اُن کا یہ کہنا کچھ بیجا نہیں تھا۔

لے آکے سبق مجھ سے زمانہ کہ مرے بعد
الفاظ و معانی کا پیمبر نہ ملے گا

ڈاکٹر اشفاق محمد خاں
سنٹر آف لینگوئجز۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی
نئی دہلی ۶۷

رشید حسن خاں صاحب۔

۱۹۶۴ء کا واقعہ ہے کہ ایک دن مجھے ڈاکٹر عبد العلیم[1] (مرحوم) نے بلا کر دریافت کیا کہ "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" کی کتنی جلدیں فروخت ہو چکی ہیں؟ میں نے موصوف کو فوراً تعداد (غالباً دس یا بارہ) بتا دی۔ علیم صاحب نے فرمایا کہ اب اس کتاب کی فروخت بند کر دیجیے۔ میں حیران ہوا کہ آخر ماجرا کیا ہے کہ اس قدر اہم تاریخ کی کتاب پر پابندی لگا دی گئی۔

میں نے دوسرے دن آفس جا کر علیم صاحب سے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا کہ اس کتاب کی فروخت پر پابندی لگانے جانے کی آخر وجہ؟

(علیم صاحب کو جن حضرات نے قریب سے دیکھا ہے، شاید وہ میری درج ذیل گفتگو کی تصویر کشی سے محظوظ ہو سکیں۔)

میرے اس سوال پر محترم کے سرخ چہرے کی سرخی دگنی ہو گئی اور حسب عادت غصے والی کیفیت کے ساتھ ایک لمحے کے لیے سر اٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور فوراً سر جھکاتے ہوئے بولے۔ "آپ کو نہیں معلوم"۔

میں۔ جی نہیں۔

علیم صاحب۔ وہ بے شمار اغلاط کا مجموعہ ہے۔

میں۔ کس طرح کی اغلاط ہیں صاحب؟

علیم صاحب۔ (جھنجھلا کر) یہ سرور صاحب سے جا کر پوچھیے۔

بس اتنا سن کر میں کرسی پر سے اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف دو قدم ہی چلا تھا کہ

---

[1] علیم صاحب اس زمانے میں صدر شعبہ عربی ڈائرکٹر اسلامک اسٹڈیز، ڈائرکٹر یونی ورسٹی پبلیکیشنز تھے اور میں پبلیکیشنز کا آفس انچارج تھا

(حسب معمول)

علیم صاحب۔ ذرا سنیے۔

میں۔ جی ارشاد۔

علیم صاحب۔ ابھی اس بات کا کسی سے ذکر نہ کیجیے گا۔

میں۔ بہتر ہے۔

(جیسے ہی مڑا تھا کہ پھر حسب عادت)

علیم صاحب۔ اور ہاں سنیے۔

میں۔ جی فرمائیے۔

علیم صاحب۔ ایک جلد اس تاریخ کی کل چپراسی کے ہاتھ میرے گھر بھجوا دیجیے۔

میں۔ کیا آپ نے ابھی تک اس کو نہیں دیکھا ہے؟

علیم صاحب۔ جی نہیں، اس پر جو تبصرہ رسالہ "تحریک" میں رشید حسن خاں کا شائع ہوا ہے بس وہ پڑھا ہے آپ بھی پڑھ لیجیے۔

راقم الحروف کا رشید حسن صاحب سے غائبانہ تعارف پہلی بار علیم صاحب کے مزید اس جملے سے ہوا۔ "ارے بھئی رشید حسن خاں کے تبصرے نے اس تاریخ کی فروخت پر پابندی لگوا دی"... تیسرے دن علیم صاحب نے چپراسی کی زبانی مجھے یہ کہلا بھیجا کہ جن جن بک سیلرز کے پاس یہ کتاب پہنچ چکی ہے اگر ممکن ہو تو واپس منگا لیجیے۔

مختصر یہ کہ رشید حسن خاں کے تبصرے نے یونی ورسٹی اور یونی ورسٹی کے باہر اردو کی باقی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ "صدق جدید" لکھنؤ کی ۸۔ نومبر۔ ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں درج ذیل عنوان سے ایک بیان شائع ہوا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

نئی مسلم آزاری

(ایک ذمہ دار تبصرہ نگار رشید حسن خاں صاحب (دہلی یونی ورسٹی) کے قلم سے ماہنامہ تحریک (دہلی) میں)

"کتاب کا سب سے زیادہ قابل اعتراض حصہ اس کا پہلا باب ہے۔ جس کا عنوان ہے "سیاسی اور تمدنی پس منظر" اس باب کی تین خصوصیتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجموعی طور پر کتاب سے اس کا کم سے کم تعلق ہے۔ بیشتر غیر متعلق باتوں پر مشتمل ہے ...... دوسری یہ کہ مقالہ نگار نے جگہ جگہ ویسا انداز بیان اختیار کیا ہے جو بہت سے لوگوں کی دل آزاری کا سبب

بن گیا ہے۔۔۔مقالہ نگار کو اس کا حق ہے کہ وہ عظیم المرتبہ صوفیہ کو خیرات خوار سمجھیں اورنگ زیب کو دنیا کا بد ترین حکمراں مانیں اکبر کے دین الٰہی کو منشور انسانیت قرار دیں۔ان کو یہ بھی حق ہے کہ وہ مسلمان بادشاہوں کے خاص حکومتی اقدامات کو "مسلم آئین" حکمرانی کے مسلمہ اصول قرار دے کر طنز و تعریض کے تیروں سے اپنا ترکش خالی کریں اور اسی طرح اپنی وسیع الخیالی یا قوم پرستی کی صفت میں کچھ اور اضافہ کر لیں۔ لیکن ان کو اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ تاریخ ادب کی کسی ایسی کتاب میں جو محض ان کے انداز فکر کی ترجمانی کے لیے مرتب نہیں کی گئی ہے ان مفروضات کو پیش کرنے کی نارسیدہ طلبہ کو اپنے مخصوص خیالات کی تلقین کا نشانہ بنائیں۔ تاریخ ادب کی کتابیں اس لیے مرتب نہیں کی جاتیں ان سے کوئی شخص اپنے ذاتی خیالات کی نشر و اشاعت کا کام لے جب کہ ایک قابل ذکر گروہ ان کو غلط سمجھتا ہو۔"

ذکر علی گڑھ کی تاریخ ادب اردو" کا ہے جس کی تیاری کا غلغلہ مدت سے بلند تھا اور جس کی تحریر و ترتیب کے لیے شہرہ یہ تھا کہ یہ جدید مغربی اصول پر ہوگی۔ بہترین اہل قلم، اہل تحقیق کی اس میں شرکت ہوگی اور اس کے اڈیٹر سرور صاحب ہوں گے ۔۔۔۔۔ کتاب میں علمی و تاریخی" تحقیقی حیثیتوں سے جو عیب بکثرت موجود ہیں ان کی افسوس ناک تفصیل تو رشید حسن خاں صاحب کے اصل مقالے میں ملے گی۔یہاں ذکر صرف اس کے مذہبی و ملی پہلو کا ہے کون فرض کر سکتا تھا کہ مسلم آرہی کا یہ ریکارڈ ایک مسلم ادارہ (یعنی مسلم یونی ورسٹی کا ایک شعبہ) قائم کرے گا۔۔۔۔۔ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی ہجو تو بہتوں کا شعار رہ چکا ہے۔ مسلم آئین حکومت کی بد گوئی کرنے والے بھی دنیا میں کم نہیں ہیں۔ صوفیائے کرام کی تحقیر و توہین سے بھی آلودہ بہت سے قلم رہ چکے ہیں۔ لیکن یہ خیال نہ تھا کہ ان مباحث عالیہ کے لیے جگہ تاریخ ادب اردو کے سے بے ضرر موضوع میں بھی نکال لی جائے گی اور تاریخ ادب اردو کے ذہین و طباع اڈیٹر صاحب ان ہی لوگوں کے سُر میں سُر ملانا قرین مصلحت تصور فرمائیں گے۔"

مولانا عبدالماجد صاحب کی اس تحریر کا کتنا زبردست اثر پڑا ہوگا اس سے اہل نظر بے خبر نہیں ہوں گے۔ جب یہ کتاب باضابطہ واپس لے لی گئی اس وقت مولانا نے پھر "صدق جدید" کی اشاعت ۱۵۔ فروری۔ ۱۹۶۳ء میں اس طرح اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

"اردو ادب اور علی گڑھ یونی ورسٹی کے بہی خواہوں کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی فروخت روک دی گئی ہے۔ تحریک میں اس کتاب پر جو تبصرے شائع ہوئے ان کی اردو کے مشہور ترین اخباروں، جریدوں اور ارباب ادب نے تائید کی تھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ ارباب اقتدار نے رائے عامہ کا احترام کیا اور اس کتاب کی فروخت کو بند کر دیا جو ایک ایسے تعلیمی ادارے کی پیشانی پر داغ تھی جو درخشاں روایات کا حامل ہے۔ اس سے (فلاں اور فلاں صاحب) کی رسوائی میں تو ضرور اضافہ ہوگا۔ لیکن مسلم یونی ورسٹی کی پیشانی سے داغ رسوائی دھل جائے گا۔ ہم اس صحیح فیصلے کے لیے ارباب بست و کشاد کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔

بے شک یہ فیصلہ قابل مبارک باد ہے اور ملت کا صحیح احتجاج کامیاب رہا۔ لیکن اس کی اصلی داد رشید حسن خاں صاحب کو ملنا چاہیئے۔ جن کا تبصرہ واقعی بصیرت افروز تھا۔ کیا اچھا ہو کہ اب کتاب نظر ثانی و ترمیم کے لیے جن صاحبوں کے سپرد کی جائے اس جماعت کے ایک رکن خود رشید حسن خاں صاحب ضرور ہوں۔"

اس کے بعد ہوا یہ کہ لوگ اس تاریخ کا نام تو بھول گئے مگر اس کے حوالے سے رشید حسن صاحب کے نام، ان کی ادبی، تحقیقی کارناموں اور تنقیدی صلاحیتوں کی جستجو میں لگ گئے۔ خاں صاحب اس وقت دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے منسلک ہو چکے تھے اور میں ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے چکر میں علی گڑھ یونی ورسٹی میں بھلے برے دن گذار رہا تھا۔ فارغ التحصیل ہو کر جب روزگار کی تلاش میں دہلی پہنچا تو وہاں پرانے احباب پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی اور ڈاکٹر اسلم پرویز سے جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی میں ملاقات ہوئی اور اتفاق سے مجھے بھی یہاں روزگار نصیب ہو گیا۔ ان دونوں احباب کی وساطت سے ایک ایسی مبارک گھڑی بھی آئی کہ میری رشید حسن خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ چند ملاقاتوں میں ہی خاں صاحب کی دل کش، دلچسپ اور عالمانہ شخصیت نے مجھے ان سے بہت قریب کر دیا۔ اور کچھ ایسا محسوس ہوا گویا مجھے کوئی کھوئی ہوئی قیمتی شئے مل گئی ہو۔۔ بہرحال اس قربت سے فائدہ اٹھا کر رفتہ رفتہ میں نے اپنے ایم فل کے

طلبہ کے تحقیق و تدوین سے متعلق کورس کی تیاری کے سلسلے میں خاں صاحب کو لکچر دینے کے
لیے زحمت دینا شروع کردی خاں صاحب نے ہمیشہ میری دعوت قبول کی اور جواہر لعل نہرو
یونی ورسٹی میں تشریف لائے ۔ راقم الحروف بھی ان کے بیش قیمت لکچرز سے مستفید ہوا ۔ یہ سلسلہ
اب تک جاری ہے اور جب تک خاں صاحب اور خاکسار دہلی میں مقیم ہیں یہ رشتہ اور سلسلہ جاری
رہے گا۔

مخدومی رشید حسن خاں میرے بزرگ ہیں ۔ میں ذاتی طور پر "بزرگی بعقل است نہ بسال" کا
قائل ہونے کی بنا پر خاں صاحب کی بزرگی اور برتری کا قائل ہوں ۔ میرے نزدیک کسی شخص
کی بزرگی اور برتری اور اس کی شخصیت جن عناصر سے تعمیر و تشکیل پاتی ہے ان عناصر میں اول
اس کی عقل و دانش والی صفت ہے ، دوم اس کا مرتبہ علم و فضل اور کمال فن ہے اور سوم جسے عام
طور پر عظمت کردار کہتے ہیں ۔ ان تین عناصر سے مرکب شخصیت کو بزرگ اور برتر ہونے کا اہل
قرار دیا جا سکتا ہے ۔ سردست میں اس طرح کی بزرگ و برتر شخصیت کا نام رشید حسن خاں تجویز
کروں تو بے جا نہ ہوگا ۔ ان کی شخصیت میرے تئیں سر تاپا آدمیت سے عبارت ہے ۔

رشید حسن خاں صاحب جن کے اسلاف اگر تلوار کے دھنی تھے تو خود رشید حسن خاں کے
حصے میں ایک ایسا قلم آیا ہے جو تلوار کی دھار سے بھی زیادہ دھار دار ہے ۔ فیض احمد فیض کی
شاعری پر قلم اٹھانے کی جراءت خاں صاحب سے پہلے کسی کو نہیں ہوئی ۔ انھوں نے روایتی
تنقید نگاری سے ہٹ کر اپنے منفرد اسلوب اور منفرد تنقیدی نقطۂ نظر سے "فیض کی شاعری کے
چند پہلو" پر جس حکیمانہ انداز سے تبصرہ فرمایا ہے یہ ان ہی کا حصہ ہے اور سچ یہ ہے کہ خاں صاحب
سے میری دل چسپی اور قربت و یگانگت کا دوسرا پہلو یہ مضمون بھی ہے ۔ چنانچہ میں نے اپنے
طبیعت کے مطابق خاں صاحب کے تمام مضامین (مشمولہ تلاش و تعبیر) ایک ہی نشست میں پڑھ
ڈالے ۔ عرصہ دراز کے بعد کسی کتاب کے پڑھنے میں بڑا ہی مزہ آیا ۔ خاں صاحب کا شائستہ لہجہ ۔ شگفتہ
زبان اور رواں دواں اسلوب میں حقائق کا بے باکانہ بیان دماغ کی بند کھڑکیوں کو دھڑا دھڑ کھولتا
چلا جاتا ہے ۔ درج ذیل بیان آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ۔

> فیض کی اکثر غزلیں سپاٹ اور سرسری اشعار کا مجموعہ ہیں ۔ اس کے علاوہ
> زبان و بیان کے ایسے معائب ان میں موجود ہیں کہ خوش مذاقی آنکھیں بند
> کر لیتی ہے ۔ کہیں بندشیں سست ہیں ۔ کہیں تعبیرات ناقص ہیں اور
> کہیں یہ صورت ہے کہ ایک مصرع ترشا ہوا ہے اور دوسرا مصرع اس کے
> برابر کا نہیں ۔ ردیفیں جگہ جگہ اکھڑی اکھڑی سی ہیں اور بہت سے قافیوں کو

جن معلومات سے اٹھایا گیا ہے وہ زبان حال سے فریاد کناں ہیں۔ بہت سے
اشعار میں مفرد لفظوں اور ترکیبوں کے استعمال میں بے طرح بے پروائی
سے کام لیا ہے۔ جس کی وجہ سے زبان کے بڑے عیب اور بیان کے واضح
اسقام نمایاں ہو گئے ہیں۔۔۔۔" (تلاش و تعبیر، صفحہ ۹۰)

یہ تبصرہ پڑھ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ شاید اس لیے کہ اس سے قبل فیض کی شاعری پر اس طرح کے بے باکانہ تبصرے یا تنقید میری نظر سے نہیں گزرے تھے۔۔۔ ہم سب ترقی پسند فیض کی ذات اور تخلیقات سے اندھی عقیدت رکھتے تھے اور ان کو نہایت منکسر مزاج، علم دوست بے نیاز اور بے غرض انسان سمجھتے تھے۔ مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ ایسا کچھ نہ تھا اور غالباً رشید حسن خاں صاحب کی اس طرح کی کلام فیض پر تنقید کا نتیجہ ہی یہ ہوا کہ لندن کے فیض سیمینار میں شرکت کرنے والے مندوبین اور مقالہ نگاروں کی فہرست جب آخری منظوری کے لیے فیض صاحب کے سامنے پیش کی گئی تو اس فہرست میں سے کئی نام فیض صاحب نے نکال دیے۔ ان نکالے گئے ناموں میں سے ایک نام رشید حسن خاں صاحب کا بھی تھا۔ (ایک معتبر راوی سے)

میں رشید حسن خاں صاحب کو گروہ بندیا نظریہ ساز قسم کے ناقدین سے بالاتر ادب کا ایک منفرد، معتبر اور غیر جانب دار ناقد تسلیم کرتا ہوں اور ان کی ذات میں وہ تمام اعلا، عالمانہ، ناقدانہ اور مردم شناسی کے اوصاف پاتا ہوں جن کی بنا پر غالب نے کہا تھا۔

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد

بلاشبہ ایسی نکتہ سنج، پاکیزہ، اخلاق پسندیدہ اور روح بالیدہ صفات کے حامل انسانوں کو شاید ہمیشہ زندگی کے بے پناہ تلخ و ترش حقائق کا ذائقہ شناس ہونا پڑتا ہے اور طرح طرح کے نشیب و فراز سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ خاں صاحب نے بھی بڑی ریاضت، مشقت، شرافت و دیانت اور نفاست کے ساتھ زندگی کے حقائق کا مطالعہ اور مردانہ وار مقابلہ کیا ہے۔ دریوزہ گری اور بے جا انانیت ان کا مزاج نہیں وہ خود داری، اعلا ظرفی اور کچھ کچھ قلندری جیسی صفات و اقدار کا ایک حسین گلدستہ ہیں جن کے پاس گھنٹوں بیٹھیے، کچھ سنیے، کچھ سنائیے، کچھ سیکھیے اور خوش خوش اٹھیے۔

علاوہ ازیں، رشید حسن خاں صاحب کی عالمانہ صلاحیتوں کا دوسرا اہم پہلو (جن کی طرف اشارتاً کچھ کہا جا چکا ہے) موصوف کی بے پناہ مخلصانہ اور بے باکانہ تحقیقی مشق و مہارت ہے۔ علمی اور ادبی تحقیق کے سلسلے میں ہمارے علمائے کرام نے اپنے اپنے طور پر بہت کچھ لکھا ہے اور

طرح طرح کی تعریفات اور اصطلاحات سے لفظ "تحقیق" کے معنی اور مطالب پر روشنی ڈالی ہے۔
میرا اپنا خیال یہ ہے کہ تحقیق کا کام تنقید سے زیادہ جان لیوا ہے اور اس کا صحیح حق وہی محقق ادا کرسکتا ہے جس کی فطرت میں تلاش و جستجو کا مادہ ہو اور وہ اشیاء کو دو دو چار کے حساب سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ نیز خود محقق کی شخصیت اور کردار حق گوئی اور بے باکی کی صفات سے بھی مزین ہوں۔ بصورت دیگر کوئی بھی محقق کسی طرح کی علمی اور ادبی کارناموں کے تحقیقی اور تنقیدی رشتوں، موضوع اور ہیئت کی نسبتوں، زبان و بیان کی لطافتوں اور کثافتوں، نزاکتوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے اور سمجھانے سے قاصر رہے گا اور اس کی تحقیق و تنقید کی طرح لفظوں کی کھیل سے زیادہ قدر و قیمت کی حامل نہیں ہوسکے گی۔ ہمارے بعض صاحب بصیرت و بصارت نقاد اس راز کو دانستہ طور پر نہ صرف نظر انداز کرتے ہیں بلکہ اپنی کمزوریوں اور ناقص فکر اور اقدار حیات کی پردہ پوشی کی خاطر طرح طرح کی اصطلاحیں گڑھتے رہتے ہیں۔ مثلاً مثبت تحقیق اور منفی تحقیق کی اصطلاحیں، جو راقم الحروف کی سمجھ سے کم از کم بالاتر ہیں۔ تحقیق کا معاملہ حق و صداقت سے مشتق ہے اس لیے تحقیق صرف تحقیق ہے نہ کہ مثبت اور منفی۔

بلاشبہ رشید حسن خاں صاحب کے تحقیقی کارناموں اور مشاغل کو ہم حق و صداقت کی اعلا معیار پر پرکھ سکتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ عصر حاضر میں ان کی تحقیقی سرگرمیاں اردو زبان و ادب کے سرمایے میں ایک بیش و بہا اور مثالی اضافہ ثابت ہوں گی۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

پتھر کی دیوار — سردار جعفری

"پتھر کی دیوار" سردار جعفری کی جیل کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ اس فصل بہار کا ثمر ہے جو اقبال اور جوش کے بعد اردو شاعری کا مزاج بدل رہی تھی۔ (پاکٹ اڈیشن) قیمت ۱۵/- روپے

وسط ایشیا نئی آزادی، نئے چیلنج

آصف جیلانی

سابق سوویت یونین کی نو آزاد مسلم جمہوریاؤں کے سفر کے تجربات و مشاہدات پر مبنی، بی۔ بی۔ سی لندن کی اردو نشریات سے نشر ہونے والے سلسلہ وار پروگراموں پر مشتمل ایک دستاویز۔ قیمت ۵۱/- روپے

معیار اردو — مرتبہ: نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

یہ کتاب زبان اردو کے محاورات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے طلبہ اور ریسرچ اسکالر محاورات کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ قیمت ۳۱/- روپے

مغیث الدین فریدی: شخصیت اور ادبی خدمات

مرتبہ: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

یہ کتاب نما کا خصوصی شمارہ ہے اس میں فریدی صاحب کی شخصیت، شاعری، تاریخ گوئی اور تضمین نگاری پر اردو کے نامور ادیبوں نے اپنے بہترین خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قیمت ۴۵/- روپے

تذکیر و تانیث — نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

جانشین امیر مینائی حافظ جلیل نے اس قیمتی کتاب کے ذریعے زبان اردو میں تذکیر و تانیث کا ایک قانون مدون کیا ہے۔ اس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث بتائی گئی ہے۔ اہل اردو کے لیے ایک قیمتی تحفہ۔ قیمت 75/-

اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ

ابراہیم یوسف

اس مجموعے میں اردو ڈرامے کی تنقید کے محرکات اور رجحانات جو ابتدا سے تاحال کارفرما رہے ہیں۔ جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۴۴/- روپے

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج (خطبات)

ڈاکٹر سید ظہور قاسم

ڈاکٹر سید ظہور قاسم کی تحقیق کا میدان بحریات ہے آپ بحر منجمد کی مہم کے پہلے میر کارواں ہیں ان خطبات میں اس پُر اسرار ارضی خطے کی دلچسپ داستان بھی ہے اور سائنس کے مختلف شعبوں میں ہندوستان کی ترقیوں کا تجزیہ بھی۔ قیمت ۱۴/- روپے

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم — اختر الواسع

پروفیسر اختر الواسع نے ۱۸ جون ۱۹۹۱ء کو انجمن اسلام بمبئی کی دعوت پر معین الدین حارث یادگاری سیرت لیکچر کے سلسلے میں مندرجہ بالا عنوان کے تحت جو خطبہ پیش کیا تھا۔ اسے اب کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ قیمت ۱۰/- روپے

تاریخ نگاری: قدیم و جدید رجحانات

ڈاکٹر سید جمال الدین

زیر نظر کتاب میں اردو کے قاری کو ۹ بلند پایہ مورخین اور ان کے فن تاریخ نگاری سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ان میں یونان، عرب، جرمنی، برطانیہ اور ہندوستان کے مورخین شامل ہیں۔ قیمت ۵۰/- روپے

اقبال شانہ
پوسٹ باکس نمبر ۱۰۲۔ حقل اسپتال
حقل۔ براہ تبوک
(سعودی عرب)

ڈھل گیا پتلون میں جو تھا پتا
ہو گیا اُن کا پتا بھی لا پتا

ذہن میں ہیں فلم والوں کے پتے
بھول بیٹھے اپنے ڈیڈی کا پتا

بے سبب دل کے مچلنے کا سبب
یہ یقیناً آپ کو ہوگا پتا

کر رہا ہوں تیرے خط کا انتظار
ڈاک خانہ کب کھلے گا کیا پتا

ماں کو خط لکھا تو بیوی کو ملا
یاد ہی رہتا نہیں ماں کا پتا

موت کا ستانہ فرشتہ آگیا
زندگانی دم دبا کر لاپتا

فضا ابن فیضی
جمال پورہ
مئو ناتھ بھنجن، یو۔پی۔

ہر اک سفر سے ہے دشوار، ذات کا یہ سفر
مجھی پہ ختم ہوا کائنات کا یہ سفر

نفس سے تا بہ نفس ہے، جراحتوں کا غبار
یہ زندگی کے قدم، حادثات کا یہ سفر

ہمارے پاؤں سے اُلجھا ہوا ہے چاند کوئی
چلا ہے لے کے کدھر ہم کو، رات کا یہ سفر

کسے خبر کہ کھلیں کیسے موڑ پر، آنکھیں
ہے خواب خواب ابھی تو، حیات کا یہ سفر

نہ جانے کون سی منزل کا استعارہ ہے
تغیرات کی جانب، ثبات کا یہ سفر

میں ایک دشت محالات ہوں، مجھے طے کر
کہاں تو، اور کہاں ممکنات کا یہ سفر

اقبال متین

تو میرے درد کو دنیا نئی نئی دینا
مرے خدا مجھے کچھ اور آگہی دینا

وہ حسرتیں جو مری زندگی کا حاصل ہیں
ان حسرتوں کے اندھیروں کو زندگی دینا

جو تو نے اپنے کرم سے دیا ہے اپنوں کو
مری مژہ کو ان اشکوں کی بھی نمی دینا

یہ غم کدہ تو سنورتا رہا ہے برسوں سے
اسے جو راس نہ آئے وہی خوشی دینا

میں تجھ سے کچھ بھی نہیں مانگتا مرے مالک
مرے قلم کو مرے خوں کی چاشنی دینا

جہاں سے دل کو بچا کر میں تجھ تلک لاؤں
وہیں پہ سینے میں نیزے کی اک انی دینا

متین تیرا نہیں ہے تو اور کس کا ہے
بہشت دینا تو دوزخ کی آگ بھی دینا

ضیا علیگ
961 AUGER AVE
SUDBURY ON P3A 4A7
CANADA

یہ قلب پناں داغ جگر کس کے لیے ہے
اے دیدہ ورو زخم ہنر کس کے لیے ہے
یہ کس کے لیے آج در و بام سجے ہیں
یہ روپ محل، چاند نگر کس کے لیے ہے
وہ دور تلک دھوپ میں جلتے ہوئے پیکر
یہ دور تلک سایۂ در کس کے لیے ہے
ہر روز بناتا ہوں نیا ایک گھروندا
ہر روز یہی غم کہ یہ گھر کس کے لیے ہے
یہ کون خلاؤں کی طرف آج بڑھا ہے
یہ راہگذر۔ گرد سفر کس کے لیے ہے
کل تک تو ان آنکھوں میں نہ شبنم تھی نہ خون تھا
اب آج یہ باران گہر کس کے لیے ہے
اس دیس کی دھرتی تو اگلتی ہے زر و سیم
اس دیس میں سب کچھ ہے مگر کس کے لیے ہے
جب دیکھو نیا روپ، نئی چھب، نئی رنگت
ہر آن یہ انداز دگر کس کے لیے ہے
کس کس کا اب لوں نام جو اس دل میں بسے تھے
اب جانے یہ گمنام کھنڈر کس کے لیے ہے
ہم جام میں ڈوبے تو ضیا پھر نہیں ابھرے
یہ موج۔ یہ دریا، یہ بھنور کس کے لیے ہے

بیادِ جوش ملیح آبادی۔ طرحی مشاعرے کی غزل

حنیف ترین
مستوصف الجدیدہ عرعر
شمال۔ سعودی عربیہ

ایٹامک جنگ

کمپیوٹر کی سبز بتی جل گئی
اپنے ٹھکانے سے
چلی پھر موت اپنے جبڑے کھولے
میزائلوں
بمبار طیاروں میں ایٹم بم اٹھائے
دندناتی، گرجتی گرجاتی
فاصلے برسوں کے، منٹوں اور سکنڈوں میں طے کرتی
خوف برساتی
گری، مخصوص۔ باغی۔ منحرف ٹھکانوں پر
جہاں، حکم سے انکار چھپا تھا
خطرہ یلغار لپٹا تھا
.... اچانک ....
گھنی آبادیاں صحرا
زمیں پر جھومتے جنگل
امنگیں، پیار، خوشیاں، زندگی کے ولولے
سسک کر خاموش ہوگئے ہیں
ابدی نیند سو گئے ہیں
ایٹامک گرد ہر سو اڑ رہی ہے
بھیانک چھتریوں میں ڈھل رہی ہے
سمندر بھاپ بن کر اڑ رہے ہیں
پہاڑوں کے بدن تک جل رہے ہیں
فضا میں تابکاری کا دھواں ہے
اور رقص موت ہر سو
ہدف سے حملہ آور تک رواں ہے۔

عبید اعظم اعظمی
بزم اردو، مہاراشٹر کالج
بمبئی ۸

غزل

نہیں سوال ستایش، نفی نفی کہیے
ہمارے بارے میں کچھ تو کبھی کبھی کہیے

شریر کہیے کہ آوارہ صدی کہیے
مگر یہ شرط ہے جو کہیے آپ ہی کہیے

ہزار بہروں میں مقصد کی آبجو ہے رواں
یہ جبر و قہر ہے جسے دور تشنگی کہیے

مزاج بدلا نہیں سبقتوں کے موسم میں
جو کل تلک تھا کہا ہم کو آج بھی کہیے

زباں سے دل کی کوئی بات مت کسی سے کہو
بنی ہے یوں بھی کوئی بات آپ ہی کہیے

کسی کے ہونٹ کو جنبش کی یہ سزا کب تک
کچھ آپ بھی تو عبید اعظم اعظمی کہیے

عبدالاحد ساز
زکریا مینشن - چوتھی منزل
۱۴۹ جبرعلی روڈ - بمبئی ۲

اے شہِ شیریں سُخناں

(فیض احمد فیض کی دسویں برسی پر)

دس برس سے ادب و فن کے چمن زار میں فیض
یہ صبا مجھ کو لیے پھرتی ہے اس وادی میں

روز ہمراہ صبا ہے تری یادوں کا لرز
ترے شعروں میں جہاں ہے مرے خوابوں کا سفر

ترے نغموں سے عبارت ہے نہ جانے کتنی
کتنی مانوس ہے الفاظ کے چہرے سے ترے

مری صبحوں کی لطافت، مری شاموں کی مہک
دل کے دُکھنے کی ادا، رات کے ڈھلنے کی کسک

میرے احوال و کوائف کی فضا کاری میں
یوں ہے، جیسے مرے احساس کی سرگوشی سے

تیری نظموں، تری غزلوں کے کئی رنگ رہے
تیرے گیتوں کے خم و پیچ ہم آہنگ رہے

ہے خود اک تربیتِ ذوقِ طلب تیرا سخن
فکرِ فردا، غمِ ایام، شعورِ ہستی

عارض و لب کے فسانے، قد و گیسو کے فسوں
دار سے کوچۂ دلدار تلک شرحِ جنوں

حرف اور صوت کی بندش میں ابھرتے پیکر
پھول سے نرم و سبک لہجے میں خوشبو سا کلام

ایسے مضموں کہ جنھیں دیکھ سکیں، چھو بھی سکیں
زندگی بھر جسے دُہراتے رہیں اور نہ تھکیں

تو کہ خاموش ہے آج اے شہِ شیریں سُخناں
کتنے پیرایوں میں ہے "طرزِ تکلم"، تیرا

کتنے ہونٹوں پہ ہے غلطاں تری آواز کا رنگ
حرفِ سادہ کو عنایت کیے اعجاز کا رنگ

نئی راہیں، نئی سمتیں، نئی جہتیں ہیں مگر
تو نے جو طرزِ فغاں کی تھی قفس میں ایجاد

آج بھی تیری صدا سنگِ نشاں ٹھہری ہے
فیض! گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

واجد قریشی
۹/۲ حویلی میر صاحب
اجین۔ ۴۵۶۰۰۶

کہاں ہیں اور کہاں ہیں خواب میرے
بکھرنے کو ہیں سب اسباب میرے

سرِ مقتل بصد تمکیں کھڑا ہوں
بدلتے ہیں کہیں آداب میرے

بڑی آسانیاں ہیں دشمنوں کو!
مگر مشکل میں ہیں احباب میرے

اُفق تا بہ اُفق پھیلا ہوا ہوں
کہاں لے جائیں گے سیلاب میرے

مجھے منزل پہ منزل لے تو آئے
ڈبوتے تیرتے گرداب میرے

عمران ابن عرشی
عرشی ہاؤس ۱۶ جولا پاڑہ
مسجد لین، ہوڑہ

زرد موسم ہوا زیادہ ہے
عزم بھی کچھ مرا زیادہ ہے

کیسے شہنائی گونجے کانوں میں
دل دکھوں کی صدا زیادہ ہے

بے بسی، درد، غم و پریشانی
یہ کرم آپ کا زیادہ ہے

اب کہاں سایۂ شجر عمرانؔ
دھوپ کا سلسلہ زیادہ ہے

جاوید اکرم
۳/۲۵ جے، کے کالونی
کانپور، یوپی

سلامت ہے دستار اب تک میری
میں شیشوں پہ پتھر نہیں مارتا

سنبھلنے کا موقع بھی دیتا ہوں میں
پسِ پشت خنجر نہیں مارتا

تکبّر کہیں کا نہ رکھتا مجھے
جو شب خون انا پر نہیں مارتا

تو کیا ذائقہ کھو چکے ہیں ثمر؟
کوئی شخص پتھر نہیں مارتا

بہت خوش ہوں جاوید جیسا بھی ہوں
میں روزی پہ ٹھوکر نہیں مارتا

اظہر عنایتی
پھرمشنج، رام پور
یوپی

یہ مگر فکر کا انداز نہ تھا
یہ مسائل بھی کہاں تھے پہلے

ہاتھ میں ہاتھ ہواؤں کا لیے
ہم بھی کیا ابر رواں تھے پہلے

آج شہروں میں ہیں جتنے خطرے
جنگلوں میں بھی کہاں تھے پہلے

لوگ یوں کہتے ہیں اپنے قصے
جیسے وہ شاہ جہاں تھے پہلے

شہر اُجڑتے تھے مگر پل میں نہیں
یہ دھماکے بھی کہاں تھے پہلے

ساحر افغانی
۴۹۔ چھیپہ پورہ جاورہ
ایم ۔ پی

لمحے

جب
کبھی
وقت مہرباں ہو کر
چند لمحے
سکون کے دیتا ہے
بیش قیمت
وہ
دلنشیں لمحے
بے رحم
لوگ چھین لیتے ہیں

عمر

صبح ہوتی ہے
شام ہوتی ہے
جانے
کتنے پرند آوارہ
پنکھ
اپنے ہواؤں میں پھیلائے
اپنی چونچوں میں
داب کر سیکنڈ
ہر منٹ کی
چلکتی شاخوں پر
اپنی روزی
تلاش کرتے ہیں
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

مہدی پرتاپ گڑھی
۲۸۔ اسکول وارڈ
پرتاپ گڑھ ۔ یو پی

بشارت

جیون کی بنجر دھرتی پر
کچھ لمحے ایسے آتے ہیں
شہد آگیں ساون کے قطرے
نیا سندیسہ دے جاتے ہیں
آشاؤں کی نازک کونپل
دل کے نہاں خانے سے نکل کر
ساری خلا کو بھر دیتی ہے
مایوسی کی تیرہ فضا میں
جگنو اپنے پر پھیلا کر
روح کو روشن کر دیتے ہیں
جینے کی انجانی خواہش
کرتی ہے سرشار دل و جاں
تازہ کرتی ہے ایماں
موسم گل کی دے کر بشارت
مہکا دیتی ہے گھر آنگن
مدھر سے ہو جاتا ہے جیون

گوہر شیخ پوروی
۳۳/۳۴ تیلیا باغ
بنارس، یوپی

محسن فیروز آبادی
صدر بازار، مین پوری گیٹ
فیروز آباد۔ یوپی

دیوانے آپ خود ہیں کہ صحرا نورد کو
پہنا رہے ہیں آہنی زنجیر بار بار

تقصیر ہے حمایتِ بے چارگاں اگر
ہوتی رہے گی مجھ سے یہ تقصیر بار بار

ہر آدمی کو کام، تحفّظ ہر ایک کا
میں کب سے سُن رہا ہوں یہ تقریر بار بار

گوہرؔ جو حالِ زار ترا دیکھتے ہیں ہم
آتے ہیں یاد میر تقی میرؔ بار بار

کس قدر سفاک تھا وہ دوستوں کا طنز بھی
میں تڑپتا رہ گیا زخمی پرندے کی طرح

آج اپنی سنگ باری پر پشیماں ہیں بہت
کل سمجھتے تھے جو ہم کو صرف شیشے کی طرح

دیکھنا اے دوستو کتنی حسیں ہے زندگی
بے وفا محبوب کے رنگیں وعدے کی طرح

لے کے نکلے ہو شرافت دورِ حاضر میں میاں
دورِ حاضر میں یہ سکّہ ہے کھوٹے سکّے کی طرح

کیا مری بستی میں محسنؔ آدمی کوئی نہیں
جو بھی ملتا ہے وہ ملتا ہے فرشتے کی طرح

شگفتہ طلعت سیما
۸۹/۵ رپن اسٹریٹ
شبلی ہاؤس - کلکتہ ۱۶
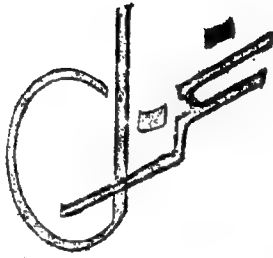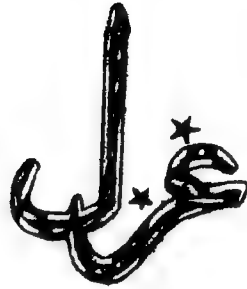
آنکھوں میں ہریالی ہے
پھر بھی من کیوں خالی ہے

سوچ کر ان سے باتیں کر
ان کا رتبہ عالی ہے

کیسے سایہ دے تم کو
پیڑ نہیں وہ ڈالی ہے

مل کر ان سے بھول گئی
کیا اپنی بدحالی ہے

بزمِ سخن میں اے سیما
تیرا نام مثالی ہے

حنا انجم
۸۱ - بلوہا
بلرام پور - یوپی

سرمایۂ فن لے کے میں بازار میں آئی
لیکن نہ کسی چشمِ خریدار میں آئی

شاداب شجر کتنے بلاتے رہے پیہم
آئی تو اسی سایۂ دیوار میں آئی

جس روز سے گم ہوں میں خیالوں میں کسی کے
اس روز سے ہی سرخیٔ اخبار میں آئی

ہر بات ہوئی کھل کے، مگر ترکِ وفا پر
گرمی سی مرے لہجۂ گفتار میں آئی

اپنوں سے تو ایسی کوئی اَن بَن بھی نہیں تھی
اک ضد تھی حنا جو صفِ اغیار میں آئی

اسلم طارق
دلاور گنج، شاہجہانپور
یوپی۔
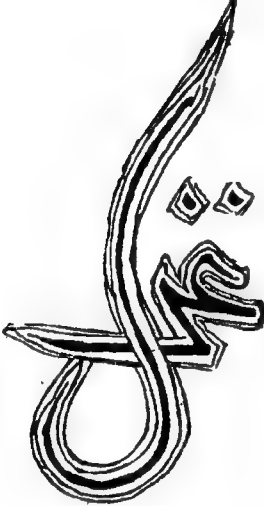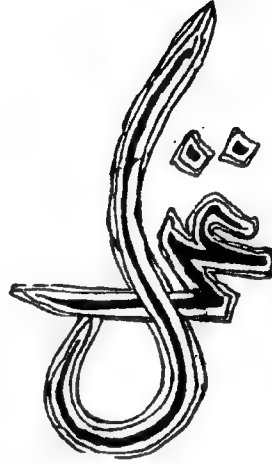
کارہائے الفت وہ رائیگاں سمجھتا ہے
عشق کی حقیقت کو داستاں سمجھتا ہے

منزلِ محبّت کو وہ کبھی نہ پائے گا
جو غبارِ جادہ کو کارواں سمجھتا ہے

حادثوں کے موسم کی تیز دھوپ میں بھی دل
زلفِ حسنِ خود بیں کو سایباں سمجھتا ہے

وقت کی اسیری نے ذہن ہی بدل ڈالا
اب تو وہ قفس کو ہی آشیاں سمجھتا ہے

جانے کیا ہوا اس کو کچھ دنوں سے وہ طارق
رہگزارِ صحرا کو گلستاں سمجھتا ہے

رئیس الدین رئیس
۱۰/۱۶۲۰ دہلی گیٹ
علی گڑھ یوپی

ہر اک فقرہ ترا پرکھا ہوا ہے
سماعت کو کہیں دھوکا ہوا ہے

چلا ہوں مدّتوں کچی زمیں پر
نمایاں اب کہیں رستہ ہوا ہے

ادا کرنا قصاص آساں ہے تم کو
مگر سودا بہت مہنگا ہوا ہے

رئیس آساں نہیں خود قتل ہونا
یہ منصوبہ بہت سوچا ہوا ہے

پروین صدیقی
۹۲۔ اقبال باغ گرلس کالج روڈ
علی گڑھ ۲

غزل

تجلّی میں تغیّر آرہا ہے
یہ آثارِ سحر دکھلا رہا ہے

ستم ہے سانس جتنے آرہے ہیں
نظامِ عمر گھٹتا جا رہا ہے

محبّت کیا ہے گویا اک تماشا
اسی مرکز پہ عالم آرہا ہے

عیاں ہے شامِ غم کی آمد آمد
ہر اک شے پر دھندلکا چھا رہا ہے

تو شب کو جل کے ہی نازاں ہے شمع
یہ دل تو رات دن جلتا رہا ہے

عجب دنیا کہیں سوز اور کہیں ساز
کوئی روتا ہے کوئی گا رہا ہے

ہے کوئی فکرِ مستقبل میں پروین
کسی کو یادِ ماضی آرہا ہے

محمد ظفر اعظمی
سکریٹری بزمِ خیر ناتھ نگر
بھاگل پور

غزل

یہ خوف کیسا ذہن کے اندر اُتر گیا
میں چلتے چلتے اپنے ہی سایے سے ڈر گیا

مغرور تھا پرند جو اونچی اُڑان پر
وہ ریزہ ریزہ ہو کے ہوا میں بکھر گیا

اونچی حویلیوں کے مکیں صاف بچ گئے
الزامِ قتل سارا غریبوں کے سر گیا

اے دوست تو نے چشمِ کرم جس پہ ڈال دی
اس شخص کا جہاں میں مقدّر سنور گیا

اس نے صداقتوں کا بھرم رکھ لیا ظفر
جو کل صلیب و دار کی حد سے گزر گیا

ظہیر رحمتی
۱۴۴ پریار ہاسٹل
جے۔ این۔ یو، نئی دہلی ۶۷

نظم

تمھیں کیا پڑی تھی
کہ رستے کے سارے مناظر
نگاہوں میں اپنی سما کر
گلی کے پرندوں کے پر
باندھنے کو
ہوا کو بُلاتے
تمھیں کیا پڑی تھی
برہنہ دیوں کے اجالے
کترنے کو
قینچی منگاتے
تمھیں تو ہر اک شام ان منظروں میں
برہنہ دیوں اور ان پنچھیوں کی
عبادت ریاضت فقط دیکھنا تھی
نکل کر گلی میں نظر سینکنا تھی
تمھیں کیا پڑی تھی
کہ ربِّ دو عالم کو ناراض کرتے

ابوبکر حیات
اے۔ ۵۹۵ امر پوری
نبی کریم، نئی دہلی ۵۵

تجھ میں کیسا خمار ہے ساقی
دل مرا بے قرار ہے ساقی

تو نے بھی بے وفا کہا مجھ کو
تیر یہ دل کے پار ہے ساقی

جس نے بخشے تھے زخم اس کا ہی
آج تک انتظار ہے ساقی

تیری زلفوں کا ان گھٹاؤں میں
رنگ آگیں خمار ہے ساقی

بھیگی پلکوں سے پوچھتا ہے حیات
کون اب غمگسار ہے ساقی

خالد بن سہیل
شعبہ فنون لطیفہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵۔

آرٹ کا تصور

آرٹ یا فن دراصل صبار فتار زندگی کی تہلکہ خیزیوں اور شور و غوغا کے دوران اک ذرا رک کر فکر کرنے اور اس فکر کے نتائج کو بے کم و کاست خوبصورت شکل و ہیکر دے کر کسی ایسے فارم میں منتقل کر دینے سے عبارت ہے جو انسان کے لیے حظ کا باعث ہو۔ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ انسان اپنے تفکرات کی منزل سے جب نکلتا ہے تو وہ کچھ ایسی چیزیں ضرور نکال لاتا ہے جو زندگی کا ارفع انداز پیش کرتی ہیں۔ اس فکر کے نتائج کبھی سائنس کی ایجادات کی شکل میں تو کبھی فنون لطیفہ، موسیقی، رقص، شاعری اور رنگ و روغن کی مدد سے کاغذ پر اتری ہوئی تصویروں کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔

ذہن انسانی کو قدرت نے تخلیقی صلاحیتوں سے اس قدر لبریز کر دیا ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ چونکہ تخلیق کار ازل کی ودیعت کردہ اس صلاحیت سے واقفیت اور اس راز کے افشا ہونے میں خاصا عرصہ لگتا ہے یا پھر بہت سارے افراد آخر آخر تک اپنی ان صلاحیتوں سے واقف نہیں ہو پاتے۔ اسی لیے انسانوں کے اس ہجوم میں تخلیق کاروں کا تناسب نسبتاً کم ہے۔ پھر بھی جو لوگ اس حقیقت کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں ان کے نام اور کام کو خوشبو کی طرح پھیلنے میں بہت کم وقت لگتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ اپنی مخفی صلاحیتوں سے واقف ہو جائیں۔

آرٹ یا فن نزاکتِ خیال و احساس اور فکرِ انسانی کے نتائج کی وہ جیت ہے جسے اس سلسلے کی ارفع ترین چیز کہا جا سکتا ہے۔ ہر دور میں ہمیں اس کے مظاہرے نظر آتے ہیں۔ انسانی معاشرہ جس قدر ترقی یافتہ ہوتا جاتا ہے فنون لطیفہ کا معیار اسی تناسب سے بڑھتا چلا جاتا ہے فن کے اس مظہر میں اس معاشرے کے معتقدات، تصورات اس کی مختلف کیفیات اور زندگی کے تعلق سے تلخ و شیریں تجربات منعکس ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کوئی بھی چیز اپنے قیام کے لیے ایک سطح ضرور چاہتی ہے۔ فن پارہ ہو یا کوئی خیال وہ نہ ہوا میں معلق ہوتا ہے اور نہ ہی بغیر کسی بنیاد کے ہوتا ہے۔ لہٰذا فن پارے کی بنیاد کا کام بھی مذکورہ چیزیں انجام دیتی ہیں۔

نشاۃ الثانیہ سے قبل یورپ میں فنِ تعمیر، نقاشی، بُت تراشی، اور دوسرے تمام فنون پیشوں کی کوئی درجہ بندی نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی ان میں فکری ہمہ جہتی کا کوئی احساس پروان چڑھ پاتا تھا۔ یہ احساس پروان چڑھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ زندگی اور علاقی زندگی پر مذہب کی حکمرانی تھی اور وہ مذہب بھی ایک خاص فکری مرکز یعنی کلیسا کے زیر اثر تھا۔

وسطی دور میں guilds کا رواج تھا یعنی پیشہ وروں کی انجمن جس میں سنگ تراش، معمار، کمہار اور مصور سبھی شامل ہوتے تھے۔ یہ انجمنیں جنگی ساز و سامان اور کلیساؤں کی تعمیر کا کام کرتی تھیں۔ ہر پیشے سے متعلق انجمن تھی جس کا ایک صدر ہوتا تھا اور ممبروں سے انجمن کا سالانہ چندہ وصول کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی طالب علم کسی فن کو سیکھنا چاہتا تھا تو وہ اس فن کے ماہر کے پاس جاتا۔ وہی استاد (ماہر فن) اس کی رہائش اور کھانے پینے کا انتظام کرتا اور جیب خرچ کے بطور کچھ رقم بھی دیتا تھا۔ یہ اس صورت میں ہوتا جب وہ ماہر فن بہت زیادہ شہرت اور ناموری کا حامل نہ ہوتا۔ معاملہ اگر اس کے بر خلاف ہوتا اور وہ ماہر فن اپنے میدان میں شہرت رکھنے والا ہوتا تو طالب علم کے والدین اس کی خدمت کرتے۔

نشاۃ الثانیہ میں جب آرٹ کو دست کاری سے الگ ایک آزاد اہمیت اور حیثیت حاصل ہوئی اسے ایک فن کے طور پر تسلیم کیا گیا تب اس کے سکھانے کا طریقہ بدل گیا اور یورپ میں آرٹ اکادمیاں قائم کی گئیں یہ تصور افلاطون کے تعلیمی فلسفے پر مبنی تھا اور اس میں بحث و مباحثہ کے ذریعہ آرٹ کے تعلق سے تبادلۂ خیال ہوتا۔ آرٹ کی سب سے پہلی اکادمی اٹلی میں قائم ہوئی جس کا مرکزی دفتر فلورنس شہر میں تھا۔ اس شہر کے رئیس خاندانوں کے افراد کو جو عام پیشہ وروں کی انجمنوں میں فنون کی تربیت حاصل کرنا اپنے منصب کے منافی سمجھتے تھے، ان اکادمیوں کے ذریعہ تعلیم دی گئی۔ اٹلی کے سب سے زیادہ بااثر اور متمول خاندان میڈیچی خاندان کی سرپرستی میں سنگ تراشی اور آرٹ کا سب سے پہلا اسکول قائم کیا گیا۔ دھیرے دھیرے یورپ میں اکادمیوں کا قائم ہونا ایک عام بات ہو گئی۔ اس کا نقصان پیشہ وروں کی انجمنوں کو یوں ہوا کہ وہ سرمایہ داروں کے زیر سرپرستی قائم کی گئی اکادمیوں کے آگے پنپ نہ سکیں۔

آرٹ اور سنگ تراشی کی تعلیم کے لیے ان اکادمیوں میں کچھ اصول اور ضابطے طے تھے جنکا تمام دنیا کے آرٹ پر اچھا خاصا اثر ہوا نشاۃ الثانیہ میں ان ضابطوں کو ترقی دینے میں لیونارڈ ڈاونچی اور البرشت ڈیورر نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان اصولوں کی بنیاد جن تصورات پر تھی وہ ان میں روشنی کا سائنسی تصور، جسمانی ساخت کا مطالعہ اور تناظر اہمیت کے حامل ہیں۔

روشنی کے سائنسی تصور کے تحت فن کے ذریعہ پیش کی گئی کسی شئے کو بہ مطابق

اصل پیش کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کے روشن اور تاریک حصوں کو پیش کریں۔ چونکہ دنیا میں وقت کے مطابق روشنی تبدیل ہو جاتی ہے اور اس سے اشیاء کی ظاہری ہیئت متاثر ہوتی ہے اس لیے مصور کے لیے ضروری تھا کہ وہ روشنی اور سایے کی شکل میں خاص اوقات ریکارڈ کرے۔ تصویر میں شیڈ دینے سے کینوس میں جسامت اور گہرائی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے آرٹ میں اس طریقۂ تعلیم کا پہلا اصول شے کا بغور مطالعہ اور روشنی اور سایے کی کمی اور زیادتی کو ریکارڈ کرنا قرار پایا۔

جسمانی ساخت کا مطالعہ اس طریقۂ تدریس کا ایک اور اصول تھا۔ چونکہ انسانی جسم کی ایک خاص ہیئت ہوتی ہے اور جسے جسم کی داخلی ساخت متعین کرتی ہے۔ ڈھانچہ اور پٹھے انسانی جسم کے نشیب و فراز کو ظاہر کرتے ہیں اور ان کی حالت بدلنے سے اعضاء کی حرکت تبدیل ہوتی ہے اسی لیے لیونارڈ ڈاونچی اور البرشت ڈیورر جیسے مصور جسم کے اندرونی نظام کو جاننے کے لیے سرجری سے مدد لیتے تھے بعد میں دوسرے مصوروں نے بھی اس طریقے کو رائج رکھا۔

تناظر کی بنیاد بصری احساس کے سائنسی تصور پر ہے۔ آرٹ کے مکتبی طریقۂ تدریس نے گہرائی کے تصور کو صحیح طریقے سے پیش کرنے کے لیے تناظر کے اصول کو اپنایا جس کی بنیاد جیومیٹری پر تھی۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی شروعات میں آرٹ سے متعلق رجحانات میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا اثر آرٹ کی تعلیم و تدریس پر بہت پڑا۔ ذرائع ابلاغ نے ان خیالات کو ساری دنیا میں پھیلایا اور آرٹ کی نئی تحریکوں نے بین الاقوامی اسلوب کو فروغ دیا۔ ان تمام تحریکوں کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ آرٹ حقیقت نگاری سے دور ہوتا گیا۔ اس کی ایک وجہ کیمرے کی ایجاد بھی تھی۔ یہ بات محسوس کی گئی کہ اصل کی نقل اب فنکاری کا کمال نہیں کیونکہ اشیاء کی ہو بہو عکاسی کیمرے سے بہت جلد اور زیادہ بہتر طریقے سے ہو سکتی ہے۔ نفسیاتی تحقیقات نے شعور، لاشعور، تحت الشعور اور تعبیر خواب کی بدولت سرریلزم کی تحریک کو جنم دیا۔ اکسپریشنزم اور ایبسٹریکٹ اکسپریشنزم کی تحریکوں نے مصوری کے برجستہ عمل ہونے کے تصور کو فروغ دیا۔ جدید آرٹ کی وجہ سے موضوع کی اہمیت کم ہو گئی اور قدرتی اشیاء کے حوالے کے بغیر تصویر کو ہیئت، رنگ اور خطوط کی بنیاد پر بنانے کے امکانات وسیع ہوئے۔

سلام بن رزاق
۹/۱۱-ایل-آئی-جی کالونی
کرلا (ویسٹ) بمبئی ۷۰

دیواروں کے بیچ - ایک جائزہ

اردو میں ناول کی ابتدا سو سوا سو برس پہلے ہوئی تھی۔ مگر آج بھی اردو کے ناقدین اور قارئین کو یہ شکایت ہے کہ اردو میں ناول کی کوئی ٹھوس روایت نہیں ہے۔ یا بقول قرۃ العین حیدر "چھکے چھڑا دینے والے ناول اردو میں آج تک نہیں لکھے گئے۔" اگرچہ کہ ادھر چند برسوں میں پاکستان اور ہندوستان میں چند اچھے ناول لکھے گئے ہیں مگر ان کی تعداد بس انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔

دیگر زبانوں میں ناولوں کے علاوہ سوانحی ناولوں کی بھی ایک خاص روایت ہے۔ اردو میں اس کا کوئی چلن نہیں ہے البتہ اردو میں خود نوشتیں ضرور لکھی گئیں مگر 'یادوں کی برات'، "شہاب نامہ" اور اختر رائے پوری کی "گرد راہ" کے علاوہ بہت کم کتابوں کو مقبولیت نصیب ہوسکی۔ قرۃ العین حیدر کی 'کارِ جہاں دراز ہے'، کو سوانحی ناولوں کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ مگر بعض نقادوں کو اسے ناولوں کی حیثیت سے قبول کرنے میں اس لیے تامل ہے کہ اس میں مصنفہ نے خود کو وقائع نویس سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ادھر ممتاز شاعر اختر الایمان بھی اپنی خود نوشت لکھ رہے ہیں جو سوغات میں قسط وار چھپ رہی ہے اور خاصی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ ندا فاضلی کی تصنیف "دیواروں کے بیچ" کو اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھا جاسکتا ہے۔ دیواروں کے بیچ کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے ماہنامہ شاعر میں قسط وار چھپ کر اہلِ نظر سے داد پا چکی ہے۔

ندا فاضلی کا شمار ہمارے عہد کے نامور شاعروں میں ہوتا ہے۔ مگر اپنے ہم عصر شاعروں میں ان کا نام اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ وہ نہ صرف ایک خوش فکر شاعر ہیں بلکہ ایک صاحب طرز نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی کتاب 'ملاقاتیں'، اپنے منفرد اسلوب اور بے باک لب و لہجے کے سبب اردو نثر کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

ندا فاضل کی تازہ تصنیف، دیواروں کے بیچ، نثر میں ان کی دوسری کتاب ہے۔ ناقدین اور قارئین میں اس بات پر اختلاف رائے ہوسکتا ہے کہ یہ خود نوشت ہے، سوانحی ناول ہے یا ناول ہے مگر اس بات پر سب متفق ہوں گے کہ یہ ایک فکر انگیز اور دلچسپ تصنیف ہے۔ جس میں مصنف نے اپنے بیباک قلم سے نہ صرف اپنی زندگی

کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ سماج کے بعض نازک گوشوں سے بھی پردے اٹھائے ہیں - ہر چند کہ اردو میں لکھی گئی سابقہ خود نوشتوں کے مقابلے میں ' دیواروں کے بیچ کا قلم زیادہ بیباک اور دھار دار ہے مگر جب ہم دوسری زبانوں بالخصوص مراٹھی زبان میں لکھی گئی دلتوں کی خود نوشتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اردو ادیب میں صداقتوں کو برہنہ کر دینے کی جرأت ابھی پوری طرح پیدا نہیں ہوئی ہے یا بالفاظ دیگر ہماری نثر غزل کے اثر سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئی ہے ، اور آج بھی ہم عریاں حقیقتوں کو رمز و کنائے کے پردے میں بیان کرنے کے عادی ہیں - یعنی ، سو

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

" دیواروں کے بیچ " کا مصنف بھی ہزار چاک پیرہنی کے باوجود بعض مقامات سے دامن بچا کر گزرتا نظر آتا ہے -

مثال کے طور پر ندا اور عشرت ، کے رشتے میں کچھ ایسی گرہیں پڑی ہوئی نظر آتی ہیں جنھیں قاری کوشش کے باوجود کھول نہیں پاتا - ندا کے تئیں عشرت کا رویہ عجیب معمّا تی سا ہے - دونوں ذہنی طور پر قریب ہیں - جسمانی طور پر بھی قریب آجاتے ہیں - مگر ان دونوں کے درمیان وہ کون سی گرہ تھی جو آخر تک کھل نہیں پائی - مصنف اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا - اسی لیے عشرت کا کردار ایک جیتا جاگتا کردار بننے کی بجائے صرف پرچھائیں بن کر رہ گیا ہے - خود ندا کا رویہ بھی عشرت کے تئیں واضح نہیں ہے - عشرت اور ندا گھر سے فرار ہونے کا منصوبہ بناتے ہیں مگر عین وقت پر ندا مقررہ جگہ پر نہیں پہنچتا - کیوں نہیں پہنچتا اس کی کوئی صراحت نہیں ہے - اس کے باوجود کتاب میں کچھ کردار ایسے ہیں جو قاری کو یاد رہ جاتے ہیں - ان میں ندا کی والدہ جمیل فاطمہ کا کردار پوری کتاب میں برگد کی چھاؤں کی طرح چھایا ہوا ہے جس کے ٹھنڈے سایے میں دوسرے کردار کچھ دیر سستاتے اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں -

جمیل فاطمہ کے کردار میں ممتا کا تقدس ' نسوانی پاکیزگی اور ایک خاتون خانہ کی ذمہ داریوں کا کچھ ایسا امتزاج ہے کہ وہ ایک مکمل اور آئیڈیل مشرقی عورت کے روپ ذہن پہ ایک گہرا نقش چھوڑ جاتی ہیں - اس کے برعکس مرتضیٰ حسن اپنی شخصیت کی بوقلمونی کے باوجود کوئی یادگار کردار نہیں بن پاتے جبکہ مصنف یا ندا کی ذہنی وابستگی جمیل فاطمہ سے زیادہ مرتضیٰ حسن ہی سے ہے اسی لیے تو ندا ان کی موت پر ایک تاثر انگیز نظم کہتا ہے - کراچی سے ماں کی موت کی خبر ملنے پر ہندستان میں اپنے باپ کی داشتہ نعبن کی قبر پر جاکر فاتحہ پڑھنا اس بات کا اشارہ ہے کہ ندا کو نعبن میں اپنی ماں کی محبت کی جھلک نظر آتی تھی - یہ واقعہ رشتوں کے ایموشن پر بھی روشنی ڈالتا ہے -

مرتضیٰ حسن شاعر ہیں - عورتوں سے آشنائیاں کرنے میں طاق ہیں اس پہ شادی

کی اخلاقی پابندیوں کے باوجود زندگی کو پوری آزادی سے جینے کے قائل ہیں۔ لہٰذا شادی کے بعد بھی ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جمیل فاطمہ ایک سگھڑ گھریلو خاتون ہیں اور صبر و رضا کی پتلی ہیں۔ وہ ازدواجی رشتے کو آسمان پر طے ہونے والا رشتہ سمجھتی ہیں اس لیے اپنے شوہر کی ساری بے اعتدالیوں کو ایک شریف اور صابر بیوی کی طرح برداشت کر لیتی ہیں۔ ندا کا آئیڈیل چونکہ مرتضیٰ حسن ہیں اس لیے وہ بھی ایک بوہیمین (BOHEMIAN) زندگی کی ڈگر پر چل پڑتا ہے۔ اور اس راہ میں پیش آنے والے سارے تلخ و ترش واقعات کو ایک محتاط سچائی کے ساتھ بیان کرتا جاتا ہے۔ جمیل فاطمہ، مرتضیٰ حسن اور ندا اس کتاب کے اہم کردار ہیں۔ ان کے علاوہ کتاب میں زیبن اور شیلا کے کردار ہیں۔ ان میں زیبن مرتضیٰ حسن کی داشتہ اور شیلا بیر کمار کی محبوبہ ہے۔ زیبن کو ندا سے خاص لگاؤ ہے غالباً اس لیے اسے ندا کے لااُبالی پن میں مرتضیٰ حسن کی شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ مرتضیٰ حسن پاکستان جانے کے بعد وہاں کے معاشرے میں ڈھل کر، اسلامی، ہو جاتے ہیں مگر یہاں زیبن ع اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے، کی منہ بولتی تصویر بن جاتی ہے۔ زیبن کا انجام قاری کو تھوڑی دیر کے لیے مضطرب کر دیتا ہے اور اس جاگیردانہ سماج کی یاد دلاتا ہے جس میں مرد کا اپنی منکوحہ عورت کے علاوہ دوسری عورتوں بالخصوص طوائفوں کو اپنی داشتہ بنانا ایک عام رواج تھا۔ عام طور پر ایسی عورت یا طوائف تریا چلتر سے بخوبی واقف ہوتی اور مرد کو اپنے حُسن و جوانی کے دام میں اس طرح پھانس لیتی کہ وہ اس پر جان و مال دونوں نچھاور کر دیتا۔ رات دیگر عورت میں ذرا بھی وفا کی خو آ جاتی تو وہ خود اپنی ہی آگ میں جل کر بھسم ہو جاتی۔ زیبن بھی ایک ایسا ہی کردار ہے جو مرتضیٰ حسن سے وفاداری اس طرح نبھاتی ہے جیسے وہ ان کی داشتہ نہ ہو کر محبوبہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ وہ مصیبت کے وقت ان کی دست گیری بھی کرتی ہے مگر مرتضیٰ حسن کے پاکستان چلے جانے کے بعد اس کے حصے میں ایک جانسوز تنہائی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اور وہ آخری لمحے تک مرتضیٰ حسن کی یادوں کو سینے سے لگائے وقت کے تھپیڑے کھاتی، گھلتی گھلتی ایک دن ماضی و حال کی کش مکش سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاتی ہے۔ اس کتاب میں بیر کمار اور شیلا کے کردار کو بھی قاری آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا۔ بیر کمار کے جیل جاتے جاتے ندا کے لیے کالج کی فیس کا انتظام کر جانا منٹو کے کرداروں کی یاد دلاتا ہے جو گردن گردن گناہ آلود دلدل میں دھنسے ہونے کے باوجود اپنی کسی نہ کسی 'ادا' سے اپنے 'انسان' ہونے کا ثبوت فراہم کر دیتے ہیں۔ شیلا جو بیر کمار کی محبوبہ ہے اس کے مرنے کے بعد طوائف بن جاتی ہے اور ایک دن خود ندا جب اس سے ٹکراتا ہے تو دونوں بیر کمار کی یادیں جسمانی دوریوں کو عبور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعہ جذباتی اور نفسیاتی اعتبار سے ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ یہاں نفسانی خواہش سے زیادہ انسانی رشتوں کی کشاکش یا جذبات کے تصادم کو پوری

شدت سے بیان کرنے کا موقع تھا مگر مصنف اس واقعہ سے سرسری سا گزر جاتا ہے
جس سے قاری کی تشفی نہیں ہوتی۔ ندا جب شیلاؔ کو فیس دینا چاہتا ہے تو وہ سنجیدگی سے کہتی ہے۔

"تم میرے مرد کے دوست ہو، وہ تمھیں بہت چاہتا تھا۔ میرے تمھارے بیچ کا ہلکا کیسے ہوگی۔ گھر کے لوگوں سے بھی کوئی لین دین کرتا ہے۔"

شیلا کے یہ الفاظ دراصل ایک طوائف کے الفاظ ہیں مگر ان الفاظ کے پیچھے جو اخلاقی قدر یا جو جذباتی نکتہ ہے وہ شیلا کے کردار کو کوٹھے سے اٹھا کر مندر کی دیوی پر بیٹھا دیتا ہے۔

مصنف نے اپنے اطراف کے ماحول اور کرداروں کے اندر بار بار جھانکنے اور انھیں برت برت کھولنے کی کوشش کی ہے مگر اوّل تو، دیواروں کے بیچ، میں کوئی ایسا بڑا کردار نہیں ہے جو اردو فکشن میں ایک یادگار کردار کی حیثیت سے زندہ رہ جاتے دوسرے نہ کسی کردار میں ایسی پیچیدگی ہے جس کی گرہ کشائی میں مصنف کو اپنے قلم کا انتہائی جوہر صرف کرنا پڑا ہو، ندا، جمیل فاطمہ اور مرتضیٰ حسن کو چھوڑ کر تمام ہی کردار ریل کے مسافروں کی طرح مختلف اسٹیشنوں پر چڑھتے اترتے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ مگر مجموعی اعتبار سے یہی چھوٹے چھوٹے کردار کتاب کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں اور قصّے کے تسلسل کو قائم رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔

جیسے اجنبی عورت کی بکھری جوانی کو سر نہ کر پانے کی صورت میں آنسو بہاتا خیرالدین عرف خیرو بھائی کا بڑھاپا۔

کالج میں ندا کی کلاس فیلو مس ٹنڈن جس کا مہکتا چہکتا بدن اور سنجیدہ رکھ رکھاؤ ندا کے ذہن میں نئی شعری زبان کا تجسّس جگا دیتا ہے۔

سونالی جو مروّجہ نظام کے جبر اور ناانصافی کے خلاف لڑنے اور احتجاج کرنے والے گروہ کی ایک فرد ہے۔ مصنف نے سونالی اور اس کے ساتھیوں کا ذکر اس قدر سرسری سا کیا ہے کہ ان کی کوئی بھی تصویر واضح نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ سونالی اور ندا کا رشتہ بھی اس قدر مبہم ہے کہ قاری آخر تک اس رشتے کو کوئی نام نہیں دے پاتا۔ آخر میں ٹرین چھوٹنے سے پہلے سونالی کا ندا کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنا آرٹ فلم کے ایک دہرائے ہوئے منظر کی طرح یاد رہ جاتا ہے۔ چند سطروں میں رفقی صاحب کا خاکہ ہیجڑوں کے گرو حاجی صاحب کا کردار اور کسی نیپالی کو ہیجڑا برادری میں شامل کی جانے والی رسم کا تذکرہ اور اسے مسلمان بنانے کی رسم دلچسپ ہے۔ اس بات پر ہندو مسلم فساد برپا ہو جاتا ہے۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کے پیچھے کیسی کیسی بوالعجبیاں کارفرما ہیں۔ سلیم کا کردار بھی ایک خلش چھوڑ جاتا ہے۔ سلیم مرتضیٰ حسن کے کسی بازاری عشق کا ثمرہ ہے۔ مگر اسے اپنی ماں سے نفرت ہے اس لیے

وہ ندا اور اس کے گھر والوں کے ساتھ رہنے پر اصرار کرتا ہے ۔ ان کی خدمت کرتا ہے ۔ اور بیمار ہو کر انھیں کے درمیان اپنی زندگی کی آخری سانس لیتا ہے ۔

سلیم کا کردار قاری کے ذہن میں کسی جگنو کی طرح چمک کر بجھ جاتا ہے ۔ سلیم کی موت زمرف ندا کی ماں کے دل کا داغ بن جاتی ہے بلکہ قاری کے دل پر بھی چوٹ کر جاتی ہے ۔ کتاب میں سلام مچھلی شہری کا کیریکٹر خوب ہے ۔ پورا خاکہ کفایت لفظی کا عمدہ نمونہ ہے ۔

ندا اس ناول نما سوانح یا سوانح نما ناول کا مرکزی کردار ہے جو ایک خاموش تماشائی کی طرح دنیا اور معاملاتِ دنیا کو دیکھ یا بھوگ رہا ہے ۔ مگر اس کی شخصیت خود اپنی داخلیت کے بوجھ سے اس قدر گراں بار ہے کہ قاری کے اندر کوئی حوصلہ کوئی امنگ یا کوئی جذبہ پیدا نہیں کر پاتی ۔ ندا کے کردار کو کچھ اس احتیاط سے تراشا گیا ہے کہ کتاب کے دوسرے کردار اس کے گرد حرکت کرنے یا اس سے متصادم ہونے کی بجائے اس کا طواف کرتے نظر آتے ہیں ۔

کتاب میں پجاری کا مورتی سے پھول اٹھا کر ندا کے ہاتھ میں رکھنا، اور ندا کے بیمار پڑنے پر عیادت کے لیے اس کے گھر جانا دھرم اور مذہب سے ہٹ کر انسانی رشتے کی عظمت کا اشاریہ ہے ۔ تقسیم ملک کے ہنگاموں کے بعد تنے پجاری کا ندا کو پہچاننے سے انکار کر دینا ظاہر کرتا ہے کہ تقسیم ملک سے پہلے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان انسانیت ایک قدرِ مشترک تھی مگر تقسیم کے بعد سیاست کی ایک موہوم لکیر نے زمین کے ساتھ انسانی قدروں کو بھی تقسیم کر دیا ۔ انسانی رشتے کی پاکیزگی اور تاریخ کی اس جبریت کو مصنف نے گلاب اور زخم کے استعارے سے ظاہر کیا ہے ۔

تقسیم کے بعد بھوپال میں پناہ گزینوں کے کیمپ کا جو نقشا کھینچا گیا ہے وہ اس زمانے میں برصغیر کے مختلف پناہ گزین کیمپوں کا ایک عبرت خیز نمونہ ہے ۔ دیواروں کے بیچ "اسکیچ" پلے کی تکنیک میں لکھی گئی ہے ۔ اس میں ہمیں کوئی پلاٹ نہیں ملتا ۔ مگر مصنف نے ندا، کے بچپن سے کر جوانی تک کے بکھرے واقعات کو جمالیاتی رنگ آمیزی کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کی ہے ۔ جس سے پیرایۂ بیان میں قصہ گوئی کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ شان بھی پیدا ہو گئی ہے ۔ زبان و بیان پر مصنف کی گرفت بہت مضبوط ہے وہ معمولی سی بات کو بھی غیر معمولی طور پر پیش کرنے کے ہنر سے واقف ہے ۔ مثال کے طور پر ایک جگہ ایک معمولی سے چھوٹے بچے کی تگ و دو کی جزئیات کو ایسی فنکارانہ چابک دستی سے پیش کیا گیا ہے کہ مصنف کی قوتِ مشاہدہ کی بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے ۔ تین صفحات پر مشتمل ایک غیر اہم واقعہ کو مصنف نے اپنے بیان کے جادو سے غیر معمولی بنا دیا ہے، اس واقعہ کو پڑھتے ہوئے ہمنگ وے کا مشہور ناول OLD MAN AND THE SEA یاد آ جاتا ہے مصنف نے چھوٹے بچے کے پردے میں انسانی جدوجہد اور قدرتی آفات سے اس کی مبارزت اور تصادم کو تمثیلی پیرایے میں بیان کیا ہے ۔ یہاں زندگی اور موت کے انذا

رشتے کے ساتھ ساتھ جبر و اختیار کی نکتہ آفرینی کا کمال بھی موجود ہے۔ اس واقعہ کی حد تک اسکرین پلے کی تکنیک بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ مگر پوری کتاب اس کی متحمل نظر نہیں آتی۔ زمانۂ حال کے صیغے میں ایک آدھ افسانہ تو لکھا جا سکتا ہے مگر اس صیغے میں پوری کتاب کا مطالعہ قاری کو تھکا دیتا ہے۔ اس سے واقعات کی روانی بھی متاثر ہوتی ہے۔ بعض جگہ خود کلامی کا سا گمان ہوتا ہے۔ دراصل تکنیک کے اعتبار سے مصنف تذبذب کا شکار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پاس زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کا انبار ہے مگر انھیں 'ناول' کے فارم میں ڈھالنے کے لیے جو معروضی نقطۂ نگاہ کی ضرورت ہے وہ مفقود ہے۔

کتاب میں کرداروں کا ہجوم ہے مگر چونکہ یہ سارے کردار حقیقی ہیں، مصنف انھیں حقیقت کی آنکھ سے دیکھ اور پرکھ رہا ہے۔ حقیقت کے رنگ میں جب تک 'خیال' کے عنصر شامل نہیں ہوتا، 'فکشن' وجود میں نہیں آسکتا۔

کتاب کے آخری پچاس صفحات میں بمبئی کا تذکرہ ملتا ہے۔ مصنف نے بمبئی میں اپنی عمر کا تقریباً نصف حصہ گزارا ہے۔ حالات کے سرد گرم بھی سہے ہیں۔ اور تلخ و ترش تجربات سے بھی گزرا ہے۔ مگر بمبئی کی ادبی سرگرمیوں، ادبی شخصیتوں اور بمبئی میں اپنے شب و روز کا ذکر کچھ اس قدر پھیکا پھیکا سا ہے کہ کتاب کا یہ حصہ محض ڈائری معلوم ہوتا ہے۔

پچھلے پچاس برس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ادبی جلسوں سے لے کر دیگر چھوٹی موٹی انجمنوں اور اردو اکیڈمی کے پروگراموں، سیمناروں اور مشاعروں تک جو ادبی معرکے ہوتے ہیں وہ خود ایک ضخیم کتاب کا تقاضا کرتے ہیں۔ پچھلے تیس برسوں سے مصنف بھی ان ادبی جلسوں کا صرف چشم دید گواہ ہی نہیں اُن کا ایک حصہ بھی رہا ہے۔ مگر کتاب میں ان کا تذکرہ اس قدر غیر دلچسپ طریقے سے بیان کیا گیا ہے کہ قاری کسی حیرت خیز تجربے سے دوچار نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے جیسے یہ ساری شخصیتیں بمبئی میں ندا کی پذیرائی اور دل بستگی پر مامور کی گئی ہوں۔

مصنف یہاں اپنے اطراف کے ماحول کی گہرائی میں غوطہ لگانے کی بجائے صرف سطح پر تیرتا نظر آتا ہے۔ اس لیے کتاب کا یہ حصہ قاری کو متاثر نہیں کرتا۔

اس کے باوجود اگر ایک طرف زبان کی دلکشی کتاب کو دلچسپ بناتی ہے تو دوسری طرف مصنف کی نکتہ سنجی اور فقروں کی بلاغت قاری کو دعوتِ فکر بھی دیتی ہے۔

مثلاً "دوسرے کے غم کو بہانہ بنا کر ہم اکثر اپنے ہی کسی غم کو روتے ہیں۔"

"خدا آسمان سے اتر کر موت کی خوشبو کی طرح مسجد کے آنگن میں پھیل جاتا ہے۔"

"چہروں اور ناموں کے امتیازات زندگی کے دلاسے ہیں۔ حقیقت صرف مٹی ہے۔"

جس کا ہر جگہ ایک نام، ایک چہرہ اور ایک رنگ ہے۔"
ایسے بلیغ فقرے کتاب میں ورق ورق بکھرے ہوئے ہیں۔
تمثیلی اظہار کی ایک مثال دیکھیے۔

"ندا کا اُن دنوں کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں ہے۔ کمرے کا کرایہ چڑھ چکا ہے کالج کی پڑھائی کام کاج کی تلاش کی نذر ہو چکی ہے۔ روٹیاں چاند کی مانند حسین ہو کر دور سے لبھانے لگی ہیں۔ دن بھر ادھر اُدھر بھٹکنے کے باوجود کبھی صبح کا ناشتا دوپہر کے کھانے سے ناراض رہتا ہے، کبھی رات کا کھانا اُن دونوں سے اپنی خفگی کا اظہار کرتا ہے۔ نچلے متوسط طبقے کے معاشرے کی پرورش نے ضرورتوں کو گونگا کر دیا ہے۔ نہ ہونٹ پریشانی کے لفظ ادا کر پاتے ہیں۔ نہ ہاتھ مجبوری بن کر پھیلتے ہیں۔"

یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ "ملاقاتیں" کے بعد دیواروں کے بیچ لکھ کر مصنف نے ایک بار پھر اپنی نثر کا لوہا منوالیا ہے۔ دیواروں کے بیچ ممکن ہے مقبولیت میں 'ملاقاتیں' کی ہمسری نہ کر سکے۔ تاہم اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ اردو کی خود نوشتوں یا سوانحی ناولوں میں 'دیواروں کے بیچ' اپنے اسلوب کی انفرادیت اور بیباکیِ اظہار کے سبب عرصے تک یاد رکھی جائے گی۔

ادبی لے پالک

بعض لوگ محض اس لیے اہمیت اختیار کر لیتے ہیں کہ ان کا نام کسی بڑے ادیب کے نام کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ جیسے میرن صاحب جو بذاتِ خود کچھ نہیں تھے مگر غالب سے تعلق کی وجہ سے اتنی شہرت پا گئے کہ ہر غالب شناس ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ یہی معاملہ علی بخش کا ہے۔ وہ علامہ اقبال کے ذاتی ملازم تھے۔ گھر کا سودا سلف لاتے تھے، حقہ تازہ کرتے تھے، جاوید اقبال کو کھیل کود میں مصروف رکھتے تھے کہ کہیں یہ بچہ علامہ کے کمرے میں جا کر ان کے فکری انہماک میں خلل انداز نہ ہو۔ کسے خبر تھی کہ علی بخش ماہرینِ اقبالیات کی دلچسپی کا مستقل موضوع بن جائیں گے۔ اور کیا تعجب کہ کسی دن یہ خبر بھی سننے میں آ جائے کہ ڈاکٹر یونس حسنی، صدر شعبۂ اردو کراچی یونی ورسٹی کی نگرانی میں علی بخش کی حیات اور فکری کارناموں پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جا رہا ہے۔ کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کی تحقیقی ناکاردگی کا ازالہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔

بڑے ادیبوں کے خطوط بھی گمناموں کو نامور بنانے کا وسیلہ بنتے ہیں۔ غالب اور اقبال کے خطوط ایسے کئی لوگوں کے نام موجود ہیں جن کے بارے میں اب تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون تھے اور کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے سوائے اس کے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا کہ غالب اور اقبال سے اپنے نام خط لکھوا لیے۔ جب تک غالب اور اقبال کے نام باقی ہیں، ان کے مکتوب الیہان کے نام بھی روشن رہیں گے۔

کسی بڑے ادیب کا مکتوب الیہ ہونا فخر کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض منچلوں نے مشاہیر کی طرف سے اپنے نام خود ہی خط لکھ کر چھپوائے۔ اس سلسلے میں عباس علی خاں لمعہ نامی ایک شاعر خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے نام اقبال کے کئی جعلی خط شائع ہو چکے ہیں۔ یہی نہیں بڑے ادیب کے کسی مکتوب الیہ کی اولاد میں سے ہونا بھی باعثِ فخر سمجھا جاتا ہے اس صدی کی تیسری دہائی میں گیا (بہار) کے ایک شاعر رسا ہمدانی نے "نادر خطوطِ غالب" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں ان کے دادا کے نام غالب کے خط تھے۔ یہ سارے خط جعلی تھے۔ خیریت گزری کہ دادا اصلی تھے۔ ان کو جعل سازی سے دادا نہیں بنایا گیا تھا۔

کسی بڑے ادیب کا مکتوب الیہ بن کر شہرت حاصل کرنے کی تازہ ترین مثال محمد رضا کاظمی کی ہے جن کے نام پروفیسر آلِ احمد سرور کا ایک خط

کراچی کے ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنا ہوا ہے اور اسی خط پر مزید بحث کے لیے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں لیکن پہلے محمد رضا کاظمی کا تعارف کرا دیا جائے تو بہتر ہوگا تاکہ ان کی شہرت کے اسباب میں ایک بڑے ادیب کے خط کے ساتھ ایک معمولی لکھنے والے کی تحریر کو بھی شامل کیا جاسکے۔

محمد رضا کاظمی کراچی کے ایک کالج میں استاد ہیں اور اس شہر کی مجلسی زندگی میں اس حد تک دخیل ہیں کہ کوئی ادبی تقریب اور کوئی مجلس عزا ان کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی۔

[illegible]

ان کی پہلی تنقیدی کتاب "جدید اردو مرثیہ" تھی جو مرثیوں کی طرح پڑھنے کی نہیں، سننے کی چیز ہے کیونکہ اس میں مرثیوں کے اقتباسات نثر سے زیادہ ہیں۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں فیض احمد فیض کو ایک جدید مرثیہ نگار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں فیض نے ایک "دوست" کی فرمائش پر گیارہ بندوں پر مشتمل ایک مرثیۂ امام لکھا تھا جس کی کوئی ادبی اہمیت نہیں۔ یہ مرثیہ فیض کی پنجابی شاعری کی طرح ہر اعتبار سے ناقابل اعتنا ہے۔ اس کے باوجود محمد رضا کاظمی نے طویل بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ یہ مرثیہ فیض کی ادبی زندگی کے ایک اہم موڑ کی نشاندہی کرتا ہے۔

محمد رضا کاظمی نے پچھلے پندرہ برسوں میں متعدد تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ حال ہی میں یہ مضامین "تاب سخن" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ کتاب کے نام سے دھوکا کھا جائیں اور اسے شعری مجموعہ سمجھ کر نہ خریدیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا جو لوگ اسے تنقیدی مجموعہ سمجھ کر خریدیں گے، وہ بھی دھوکا ہی کھائیں گے کیونکہ کتاب کے بیشتر مضامین میں تنقید کے نام پر شاعری ہی کی گئی ہے لیکن وہ مضامین جو اختر حسین رائے پوری، کلیم الدین احمد، اور پروفیسر ممتاز حسین کے بارے میں ہیں۔ بلاشبہ نہایت عمدہ تنقیدی مطالعے ہیں، اور ان سے یہ امید بندھتی ہے کہ اگر محمد رضا کاظمی اس قسم کے مضامین لکھتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ان کا شمار اردو کے اہم نقادوں میں ہوگا۔ ہم نے آج ہی سے اس دن کے انتظار میں دن گننا شروع کر دیے ہیں۔

"تاب سخن" کے بارے میں تفصیلی بحث تو پھر کبھی ہوگی، فی الحال اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ ایک اہم کتاب ہے کیونکہ اسی کے ذریعے آل احمد سرور کا وہ خط منظر عام پر آیا ہے جس کا کراچی کے ادبی حلقوں میں آج کل بڑا چرچا ہے یہ خط ڈاکٹر محمد حسن کی شان میں قصیدے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا پس منظر یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل ڈاکٹر صاحب نے کراچی کے ایک رسالے میں سرور صاحب کے بارے میں ایک نہایت عجیب و غریب قسم کا مضمون لکھا تھا جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ سرور صاحب پر رشید احمد صدیقی کے بے شمار احسانات تھے، وہ رشید صاحب کے شاگرد ہی نہیں "لے پالک" بھی تھے۔ انھیں یکے بعد دیگرے کئی ملازمتیں دلوائیں اور پھر انھیں حالی و شبلی کا ہم مرتبہ قرار دیا۔ مختصر یہ کہ بقول ڈاکٹر محمد حسن، سرور صاحب نے رشید صاحب کے اسلوب اور شخصیت سے جو کچھ حاصل کیا وہ ان کی فطری صلاحیتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ سرور صاحب سے اسلوب چھین

پھیں تو وہ کچھ بھی نہیں رہتے" یہ اسلوب بڑی حد تک رشید صاحب کی دین ہے" لیکن سرور صاحب نے رشید صاحب کے احسانات کا بدلہ اس طرح چکایا کہ رشید صاحب کی ریٹائرمنٹ کے وقت ان کی ملازمت میں توسیع کی مخالفت کی اور خود ان کی جگہ صدر شعبہ ہو گئے۔

ڈاکٹر محمد حسن کی دیگر دلچسپ باتوں سے قطع نظر یہ بات بڑی مزے کی ہے کہ اگر سرور صاحب سے اسلوب چھین لیا جائے تو وہ کچھ بھی نہیں رہتے شاید موصوف یہ سمجھتے ہیں کہ اسلوب جیب میں رکھے ہوئے بٹوے جیسی کوئی چیز ہے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ آنکھ بچا کر یہ بٹوا سرور صاحب کی جیب سے نکال لینا چاہیے۔ رشید صاحب کی یہ یادگار ڈاکٹر محمد حسن کو اپنے پاس رکھنی چاہیے کہ اس وقت وہی رشید صاحب کے سب سے بڑے طرف دار اور ہمدرد ہیں۔

سرور صاحب اپنے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی اداروں سے بھی کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے ان بے مثال خدمات کو بھی اپنی مخصوص نظر سے دیکھا ہے۔ فرماتے ہیں "سرور صاحب کی اس دور کی زندگی ان کے ماضی سے اتنی مختلف تھی کہ ان کے پرانے جاننے والے ان کے اس کردار کو پہچان بھی نہیں سکتے۔ دراصل ان کے ہاں ایک عجیب خلش تھی۔ باقاعدہ پروفیسر اور صدر شعبہ نہ ہونے کی خلش ..... یہ خلش انھیں بہت ستاتی تھی اور اسی خلش کو دور کرنے کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف اور زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا۔ ملک کی سب سے بڑی ادبی جماعت ساہتیہ اکیڈمی کی اردو کمیٹی کے کنوینر بنے، انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری بنے۔ یونی ورسٹی میں سرسید ہال کے پرووسٹ بنے۔ ایک زمانے میں یونی ورسٹی لائبریری کے آنریری لائبریرین بھی مقرر ہوئے"۔

اس اقتباس سے واضح ہے کہ ڈاکٹر محمد حسن کے نزدیک علمی و ادبی کاموں میں سرور صاحب کا اپنے آپ کو معروف رکھنا محض اس لیے تھا کہ وہ پروفیسر اور صدر نہ ہونے کی خلش کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ گویا جو بات ڈاکٹر محمد حسن نے تحقیراً لکھی ہے، اسی سے سرور صاحب کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ سرور صاحب چونکہ علمی و ادبی مذاق رکھتے ہیں، اس لیے انھوں نے اپنے مذاق سے مطابقت رکھنے والے اداروں سے تعلق پیدا کیا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنے مذاق اور اہلیت کے برعکس کوئی مصروفیت پیدا کر لیتے ہیں اگر وہ میر و سودا سے پہلے کی زبان کو نہ سمجھنے کے باوجود "دیوان آبرو" مرتب کرتے یا ہندی ادب کا مطالعہ نہ ہونے کے باوجود ہندی ادب کی تاریخ لکھ دیتے تو پھر یہ کہا جا سکتا تھا کہ سرور صاحب نے اپنی خلش مٹانے کے لیے غلط کام کیے۔

کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے مضمون میں سرور صاحب کے خلاف بلا سبب زہر اگلا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ سب کچھ بلا سبب نہیں ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی کے ایک مضمون سے سبب معلوم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے سرور صاحب کے بارے میں جو کتاب مرتب کی ہے، اس میں ڈاکٹر نقوی کا یہ مضمون شامل ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ لیکچرار کی ایک جگہ کے لیے رضیہ سجاد ظہیر اور ڈاکٹر محمد حسن امیدوار تھے سجاد ظہیر نے سرور صاحب کو کئی خط لکھے کہ وہ رضیہ کی سفارش کر دیں لیکن سرور صاحب نے

ان خطوں کا اثر نہ لیا اور ڈاکٹر محمد حسن کی سفارش کر دی کیونکہ ان کے نزدیک وہ اس جگہ کے لیے رضیہ سجاد ظہیر سے زیادہ اہل تھے۔ سرور صاحب کی اسی اصول پسندی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ڈاکٹر محمد حسن نے مذکورہ مضمون لکھا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن کے مضمون کا جواب محمد رضا کاظمی نے لکھا جو کسی وجہ سے متعلقہ رسالے میں شائع نہ ہو سکا۔ کاظمی صاحب نے اپنا مضمون سرور صاحب کو بھیج دیا۔ موصوف نے اس کی رسید میں جو خط لکھا، وہ اور کاظمی صاحب کا مضمون دونوں "تاب سخن" میں شامل ہیں۔

سرور صاحب خط کے آغاز میں لکھتے ہیں۔

"مجھے (ڈاکٹر محمد حسن کا) مضمون دروغ کی پوٹ معلوم ہوا۔ مضمون نگار کا خبث باطن بھی معلوم ہوتا ہے۔ میں نے جواب کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اب خیال ہوتا ہے کہ جواب دے ہی دینا چاہیے تھا۔ اڈیٹر کو اس قسم کا مضمون چھاپنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ رشید صاحب ۱۹۵۸ء میں سبک دوش ہوئے۔ آخر ۳۲ برس بعد اس مسئلے کو کریدنے کی کیا ضرورت پیش آئی"

سرور صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے، اس پر اعتراض کرنے کی ہم جسارت نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ "خبث باطن" کی ترکیب درست نہیں ہے۔ جو چیز ظاہر ہو گئی اسے باطن سے منسلک کرنا حقیقت کے خلاف ہے۔ رسالے کے اڈیٹر کے متعلق سرور صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ بھی درست نہیں۔ کسی بھی اردو رسالے کے اڈیٹر کے فرائض میں یہ شامل نہیں ہے کہ مضامین کی اشاعت سے پہلے تو کیا بعد میں بھی سوچا جائے اور یہاں تو مضمون نگار نے بھی لکھنے سے پہلے سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی بیچارا اڈیٹر کیوں اپنی عاقبت خراب کرتا۔

سرور صاحب نے تمام جھوٹے الزامات کو مدلل انداز میں رد کیا ہے۔ یہ خط خاصا طویل ہے، افسوس کہ اس مختصر کالم میں اسے نقل نہیں کیا جا سکتا۔ پورے خط کو نقل کرنا اس لیے بھی مناسب نہیں ہے کہ اسی کی وجہ سے محمد رضا کاظمی کی کتاب مقبول ہو رہی ہے۔ اگر یہ خط یہاں نقل کر دیا گیا تو کتاب کون خریدے گا۔ تاہم رشید احمد صدیقی کے ایک خط کا اقتباس جو سرور صاحب نے اپنے خط میں درج کیا ہے یہاں تبرکاً نقل کیا جاتا ہے کہ یہ انشائے رشید کا ایک نادر نمونہ ہے۔ "ڈاکٹر محمد حسن سے پہلے بھی بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی رہی ہے کہ رشید صاحب اور سرور صاحب میں استادی شاگردی کا تعلق ہے۔ رشید صاحب نے بڑی عمدگی سے اس "افواہ" کی تردید کی ہے وہ لکھتے ہیں "آج کل ادھر ادھر یہ غلط خبر ذرا زیادہ پھیلنے لگ گئی ہے کہ آپ میرے شاگرد ہیں اور لطف یہ ہے کہ جب آپ کو برا بتانا ہوتا ہے تو میری شاگردی کا واسطہ دیتے ہیں اور جب آپ کی تعریف کرتے ہیں تو مجھے بھول جاتے ہیں۔ اپنی بے غیرتی کو کیا کہوں کہ چپکا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے۔ چپکا میں چ کو زیر بھی دے سکتے ہیں۔

یوسف ناظم
۱۹، الہلال - ۱۳- باندرہ ریکلیمیشن
باندرہ بمبئی

پھسلنا ایک مزاح نگار کا

میرے دوست دلیپ سنگھ (جی) اچھے خاصے ثابت قدم آدمی ہیں۔ یہ "جی" جو میں نے اُن کے نام کے ساتھ لگایا ہے اُن کی سیاسی یا سماجی شناخت کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ وہ مشہور و معروف جی ہے جو ہندستان میں صنفِ نازک اور صنفِ غیر نازک کے ساتھ بلا امتیاز سن و شکل بلا تکلف استعمال ہوتا ہے اور اس کے استعمال سے ممدوح کی شخصیت پُروقار ہو جاتی ہے۔ ویسے دلیپ سنگھ کو ایسی مصنوعات اور فروعات درکار نہیں ہیں وہ بجائے خود ایک مکمل نسخہ ہیں اور انھیں کسی بدرقے کے بغیر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ثابت قدم میں نے انھیں اس لیے لکھا کہ جس طرح وہ کاغذ پر دیکھ سمجھ کر اپنا قلم رکھتے ہیں اسی طرح پھونک پھونک کر قدم بھی رکھتے ہیں۔ پہلے شاید کبھی لڑکھڑائے ہوں تو لڑکھڑائے ہوں لیکن معلوم نہیں ۲۱ر دسمبر ۹۳ء کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ دلّی میں کہیں راستہ چلتے چلتے وہ پھسل پڑے۔ پانو میں موچ آ گئی۔ اب یہ جان کر آپ کیا کریں گے کہ موچ داہنے پانو میں آئی یا بائیں پانو میں۔ آدمی کے دونوں پانو ہمسر ہوتے ہیں۔ البتہ ہاتھ کی بات اور ہوتی ہے اور دلیپ سنگھ دائیں پانو کے ساتھ بھی اتنا ہی نرم برتاؤ کرتے تھے جتنا کہ بائیں پانو کے ساتھ۔ انھوں نے کبھی اپنے کسی ایک پانو کو دوسرے درجہ کا شہری نہیں سمجھا۔ وہ سرکاری ملازم ضرور تھے لیکن سرکاری عادتوں سے انھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو دور رکھا۔ اس موچ یافتہ پانو نے انھیں ستایا بہت۔ دسمبر کے مہینے میں اور وہ بھی دلّی جیسے مقام پر جہاں وہ موسم کے ساتھ سرد جنگ میں مشغول تھے اس پانو نے انھیں بہت تکلیف پہنچائی۔ دلیپ سنگھ نے دوسرے ہی دن مجھے بڑا ہی دردناک خط لکھا اور بتایا کہ پانو اس قدر سوج گیا تھا کہ انھیں اپنا پانو معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ دلیپ سنگھ معتدل ہوتے ہوئے شکّی مزاج کے آدمی ہیں۔ اب جو شخص اپنے ہی پانو کو اپنا پانو نہ سمجھا اس کے شکّی مزاج ہونے میں کیا شبہہ ہو سکتا ہے۔ بعض وقت تو وہ اپنے ہی لکھے ہوئے مضمون کو اپنا مضمون نہیں سمجھتے جب تک یہ مضمون ان کے نام سے کسی رسالے میں چھپ نہیں جاتا وہ اس کے بارے میں شک و شبہہ میں مبتلا رہتے ہیں۔ کسی محفل میں سناتے ہیں اور

اس پر انھیں خوب داد مل جاتی ہے تو انھیں یقین آتا ہے کہ ہاں یہ مضمون اُن ہی سے سرزد ہوا تھا۔ آپ اسے رشک پر محمول کرنا نہیں چاہتے تو ٹھیک ہے اسے ان کی معصومیت کہہ لیجیے۔ آپ کی بھی تشفی ہو جائے گی اور دلیپ سنگھ بھی خوش ہو جائیں گے۔ لیکن ہیں وہ تہذیب پسند آدمی۔ کبھی نچلے نہیں بیٹھیں گے۔ سر پر پگڑی سجی سنوری حالت میں مستحکم رہے گی لیکن یہ اسے دونوں ہاتھوں سے بار بار سنبھالتے رہیں گے (دیکھتے ہوں گے کہ اتر تو نہیں گئی ہے) خیر پگڑی کے ساتھ تو یہ سلوک روا ہے۔ آدمی کو یاد نہیں رہتا کہ وہ اسے پہنے ہوئے ہے یا نہیں لیکن دلیپ سنگھ کا تو اپنی داڑھی کے ساتھ بھی یہی رویہ ہے جو اپنی پگڑی کے ساتھ ہے۔ یہ صاف دکھائی دیتی ہے لیکن یہ جب تک اپنے ہاتھوں کی مدد سے اسے محسوس نہیں کر لیتے ان کا اطمینان نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر ایسا محتاط اور اپنی چیزوں کے بارے میں اتنا چوکنا رہنے والا شخص اگر آپ کو یہ لکھے کہ اسے اپنا پاؤں اپنا نہیں محسوس ہو رہا ہے تو ظاہر ہے موچ کی وجہ سے اس پاؤں کی نوعیت کتنی نہیں بدل گئی ہوگی۔ خبر سن کر تو میرا دل بھر آیا۔ اچھا ہوا میں دلی سے بہت دور بمبئی میں تھا ورنہ مجھ سے ان کی تکلیف دیکھی نہیں جا سکتی تھی۔ جب بھی کسی کے پاؤں کے تعلق سے میں ایسی ویسی خبر سنتا ہوں تو بہت رقیق القلب ہو جاتا ہوں اور یہ تو دلیپ سنگھ کے پاؤں کا معاملہ تھا۔ انھوں نے مجھے یہ بھی لکھا تھا کہ انھیں باتھ روم بھی جانے کے لیے بیساکھی استعمال کرنا پڑ رہی ہے (گھر میں بیساکھی کا میلہ میں نے پہلی مرتبہ سنا) اس خبر سے مجھے واقعی بہت افسوس ہوا۔ سوچتا ہوں تو کلیجے پر گویا سانپ لوٹ جاتا ہے۔ معلوم نہیں جن دنوں سوجن کی وجہ سے ان کا پاؤں بھاری تھا وہ کتنی ہی مرتبہ باتھ روم پر حسرت سے نظر ڈال کر اپنی ضرورت ٹال جاتے ہوں گے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ باتھ روم جانے کے شوقین لوگوں میں سے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب بھی وہ بمبئی آتے تھے کسی اونچے ہوٹل میں ٹھہرتے تھے۔ باہر بھی گھومنے کم ہی جاتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت باتھ روم ہی آنے جانے میں صرف ہو جاتا تھا۔ کہتے تھے اس طرح چہل قدمی بھی ہو جاتی ہے۔ چہل قدمی کا اتنا آسان نسخہ ہمارے کسی مزاح نگار کے ذہن میں نہیں آیا۔ دلیپ سنگھ کی یہ چہل قدمی صرف چہل قدمی نہیں تھی اپنی غرض و غایت کے حساب سے اچھی خاصی چہل قدمی تھی جس کی وہ تنہا ر دلی تھے۔ ایک مرتبہ بمبئی میں وہ باندرہ بینڈ اسٹینڈ پر سی راک ہوٹل میں ٹھہرے۔ مجھ سے فون پر بولے یہیں آ جائیے باتیں کریں گے۔ میں مقررہ وقت پر پہنچا تو صدر دروازے ہی پر مسکراتے کھڑے تھے آگے بڑھے اور بولے ذرا تیز چلیے۔ میں نے کہا خیر تو ہے۔ بولے باتھ روم جاؤں گا۔ میں نے پوچھا کہیں باہر سے آ رہے ہیں۔ فرمایا نہیں باتھ روم ہی سے آ رہا ہوں لیکن دس منٹ ہو گئے۔

دلیپ سنگھ بنیادی طور پر خوش مزاج آدمی ہیں۔ اپنی خوش مزاجی کو اپنی حد

تک محدود نہیں رکھتے۔ خوب باتیں کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا مخاطب انھیں دل لگا کر سن رہا ہے۔ یہ ان کی خوش فہمی نہیں خوش دلی کی بات ہے۔ ایک مرتبہ تو مجھے حیدرآباد میں ان کے ساتھ ہی ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ دلیپ سنگھ جب حیدرآباد میں ہوتے ہیں تو ان کی دعوتیں خوب ہوتی ہیں جنھیں وہ راز میں رکھتے ہیں لیکن اس دن شاید وہ کہیں مدعو نہیں تھے۔ میرے ساتھ ہی گھومتے رہے۔ جلسہ گاہ میں بھی جانا تھا تو پیدل ہی گھومتے چلے۔ راستہ میں بتا رہا تھا لیکن انھیں میری رہنمائی قبول نہیں تھی۔ آدمی سے دلی کی بو باس جاتی نہیں ہے اور یہ تو دلیپ سنگھ تھے۔ حیدرآباد سے اپنی واقفیت کا کچھ اس طرح اظہار کر رہے تھے جیسے یہ شہر بسایا ہی انھوں نے تھا۔ یہی انداز مزاح ان کی مزاح نگاری کا طرۂ امتیاز ہے (طرّے کا لفظ میں نے خاص طور پر استعمال کیا ہے پگڑی کے ساتھ زیب دیتا ہے) ایسے خوش مزاج آدمی کو اپنے پاؤں کے سلسلے میں اتنا دلگیر نہیں ہونا چاہیے۔ ایک پاؤں کی بات ہی کیا ہے اور یہ موچ تو ایک عارضی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن یہ ان کی محبت تھی بلکہ محبت کی فراوانی تھی کہ انھوں نے مجھے اپنے دکھ میں (غائبانہ) شریک ہونے کا موقع دیا۔ وہ ہنسی بھی اسی طرح بانٹتے ہیں۔ ان کے یہاں پھلجھڑیوں کی دکان ہے۔ ان پھلجھڑیوں سے صرف زرد پیلے تارے نہیں نمودار ہوتے کم سے کم تیخ نگی ضرور ہوتے ہیں۔ وہ اپنی مزاح نگاری کی زنبیل سے انار بھی نکال کر چھوڑتے ہیں اور ان کے ہر انار کے صد بیمار ہوتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ان کے چھوڑے ہوئے اناروں کی روشنی ذرا زیادہ اونچائی تک جاتی ہے۔ آتشبازی کے اناروں میں ہارس پاور نہیں ہوتا لیکن ان کے اناروں میں ہوتا ہے لیکن میں ان کی مزاح نگاری کا ذکر تو یوں ہی برسبیل تذکرہ کر رہا ہوں۔ اصل موضوع ان کے داہنے یا بائیں پاؤں کی موچ ہے جس سے ان کا پاؤں پھول گیا۔ تنہا ایک پاؤں کا پھولنا کوئی اچھی علامت نہیں۔ پاؤں تو غالب کے بھی پھولے تھے لیکن صرف پاؤں نہیں ہاتھ پاؤں پھولے تھے اور اس کی وجہ بھی معقول تھی بلکہ رشک انگیز تھی ان کے معاملے میں اشک انگیز بات ہو گئی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ دلیپ سنگھ راستہ چلتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ اب انھیں کیا دیکھنا ہے۔ وہ دنیا دیکھے ہوئے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ دلی دن بہ دن اردو دشمن ہوتی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے ایک واقعہ میں خلیق انجم کے پاؤں کے ساتھ دلی نے اس سے بھی زیادہ سخت سلوک کیا تھا اور وہ قصہ کئی دن تک چلتا رہا۔ اردو کے ادیبوں کو اپنے پاؤں کی زیادہ سے زیادہ حفاظت کرنی چاہیے۔ اردو والوں کو یوں بھی اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کے کم ہی مواقع حاصل ہیں۔ اس پر اگر وہ اپنے پاؤں کی طرف سے غافل ہو جائیں تو پھر چل چکی یہ کاغذ کی ناؤ

دلیپ سنگھ جانتے ہیں کہ مزاح نگاروں کی سوچ کا پاؤں کی موچ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہر منفی بات کا ایک مثبت پہلو بھی ہوتا ہے۔ وہ گھر بیٹھے رہے تو ظاہر ہے لکھتے پڑھتے ہی رہے۔ انھوں نے کیا پڑھا اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ ہاں جو کچھ لکھا

ہے اسے منظر عام پر لائیں اور یہ سمجھ کر لائیں کہ یہ انھی کا لکھا ہوا ہے۔ درد جتنا شدید ہوگا۔ طنز بھی اتنا ہی تند و تیز ہوگا۔

ایک بات جو تقریباً راز کی ہے میں انھیں بتا دوں۔ ان کے خط کے آنے کے دو دن بعد ہی ان کے ایک دبظاہر) دوست نے مجھے لکھا کہ دلیپ سنگھ راستہ چلتے ہوئے گرے تو چوٹ سر پر لگنے والی تھی لیکن انھوں نے کمال ہوشیاری سے عین وقت پر متبادل انتظام کر دیا۔ شاید خط لکھ کر خوش بھی ہوں گے کہ میں نے ان کی بات کا یقین کر لیا۔ دلی میں کتنی غلط فہمیاں پھیلی ہوتی ہیں۔

دلیپ سنگھ دوسروں کی تکلیف سن کر خوش ہونے والوں لوگوں میں نہیں ہیں ورنہ میں انھیں لکھتا کہ میں بھی پاؤں کی اس صورت حال سے دوچار ہو چکا ہوں اور ہفتے اپنے داہنے یا بائیں پاؤں کو پلاسٹر میں ملفوف رکھنا پڑا۔ نوبت گھٹنوں چلنے کی آگئی تھی۔ میں نے یہ چھے ہفتے ایڑی پر چل کر گزارے۔ بمبئی میں راستہ چلتے ہوئے کوئی گرتا نہیں کیونکہ گرنے کی جگہ ہی نہیں ہوتی۔ یہاں لوگ ریلوے پلیٹ فارم پر اس وقت گرتے ہیں جب وہ جھک کر یہ دیکھتے ہوتے ہیں کہ ٹرین آ رہی ہے یا نہیں۔ اسی جھکنے میں سر بسجود ہو گیا تھا ریل کی پٹری پر۔ ٹرین بھی اسی وقت آئی لیکن مجھے اٹھا لیا گیا دلیپ سنگھ جی اب تو خوش ہو جائیے اس بات پر کہ مجھے ایک وقت اٹھایا جا چکا ہے مجھے ان کی ٹانگ کی اس لیے بھی فکر ہے کہ ایک مزاح نگار کی ٹانگ ہمیشہ اونچی رہنی چاہیے

مجتبیٰ حسین

زبان سیکھنا ایک مسلسل عمل ہے

بعض اوقات بڑے عجیب و غریب واقعات ہو جاتے ہیں۔ جس دن اخبار میں یہ خبر چھپی کہ بنگلور میں دور درشن پر اردو خبروں کا بلیٹن شروع کرنے کے خلاف احتجاج کے دوران چھبیس افراد ہلاک ہو گئے عین اسی دن دہلی کے اردو سکھانے کے ایک مرکز میں ۲۶ افراد نے داخلہ لیا۔ گویا اس ملک میں ۲۶ افراد اس زبان کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مارے گئے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ۲۶ افراد ایسے بھی نکل آئے جنھوں نے اس زبان کو اپنے سینے سے لگانے کے لیے اردو دانی کی کلاسوں میں داخلہ لے لیا۔ اس پر ایک صاحب نے کہا چلو حساب بے باق ہو گیا لیکن ہمیں اس طرز فکر پر بھی اعتراض ہے کیونکہ زبان کا معاملہ دل سے ہوتا ہے بہی کھاتے سے نہیں سیاست دانوں نے ایک مظلوم اور معصوم زبان کے خلاف خواہ مخواہ لوگوں کو اکسا کر ۲۶ افراد کی جانیں لے لیں۔ مرنے والوں سے ہمیں ہمدردی تو ہے ہی لیکن اس کے شانہ بشانہ ہمیں اردو زبان سے بھی ہمدردی ہے کہ یہ ایک عجیب و غریب زبان ہے جسے سیاست داں زندہ نہیں رکھنا چاہتے لیکن عوام اسے مرنے نہیں دینا چاہتے۔ خیر اس وقت ہم سیاست دانوں کے بارے میں کوئی اظہار خیال نہیں کرنا چاہتے۔ ہم تو آج ان لوگوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں جو اپنے بل بوتے پر زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اردو زبان کو بھی اپنے ساتھ زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اصل میں ہم اردو دانی کی ان کلاسوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں جو ان دنوں رضا کارانہ طور پر ملک کے مختلف علاقوں میں شروع ہو گئی ہیں۔ اور ان کلاسوں کو ایک تحریک کی شکل دینے کا سہرہ عابد علی خاں ایجو کیشنل ٹرسٹ کے سر ہے جس نے گرمی کی چھٹیوں میں اردو دانی کی ان کلاسوں کو شروع کیا تھا تب سے ان کلاسوں کا نام "اردو کی گرمائی کلاسز" پڑ گیا تھا۔ لیکن اب جب کہ سردی کا موسم آگیا ہے بعض لوگ اب بھی ان کلاسوں کو "اردو کی گرمائی کلاسز" کہہ رہے ہیں (ایسے لوگوں میں خود ہم بھی شامل ہیں)۔

ہمارے ایک دوست نے اس تضاد کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتے ہوئے پوچھا"

آپ ان کلاسوں کو اردو کی گرمائی کلاسز کیوں کہتے ہیں؟ ہمارے دوست کی بات معقول تھی۔ہم نے کہا "تاتا کہ سردی کا موسم آگیا ہے لیکن کوئی نام جب مقبول ہو جاتا ہے تو زبان پر کچھ ایسے چڑھ جاتا ہے کہ اترنے کا نام نہیں لیتا۔" ہمارے ایک دوست نوجوانی میں "چھوٹے میاں" کہلاتے تھے۔اب ساٹھ برس کے ہوگئے ہیں لیکن ماشاءاللہ اب بھی چھوٹے میاں ہی کہلاتے ہیں" ہمارے اس استدلال کو سن کر ہمارے دوست نے کہا "اردو کی ان کلاسوں پر اب شباب آگیا ہے کیونکہ یہ گرمی کے موسم سے نکل کر سردی کے موسم میں داخل ہو گئی ہیں۔اس لیے ان کلاسوں کو "اردو کی گرمائی کلاسز" کہنے کے بجائے "اردو کی گرمائی ہوئی کلاسیں" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔" سچ تو یہ ہے کہ زبان کو سیکھنے کا عمل ایک مسلسل عمل ہے۔یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آدمی گرمیوں میں اردو سیکھے اور سردیوں میں صرف ٹھٹھرتا رہ جائے۔ ممتاز بزرگ افسانہ نگار اور ہمارے کرم فرما جناب حیات اللہ انصاری نے بہت عرصہ پہلے اردو کا ایک قاعدہ مرتب کیا تھا جس کا نام تھا "دس دن میں اردو"۔(یہ قاعدہ اب بھی مقبول ہے) ہمیں اس قاعدہ کا نام نہایت مضحکہ خیز لگتا تھا۔ایک دن ہم نے حیات اللہ انصاری صاحب سے کہا حضور آپ نے "دس دن میں اردو" کے نام سے جو قاعدہ مرتب کیا ہے اس کا نام بدل کر "ساڑھے دس دن میں اردو" کر دیجیے کیونکہ میرے ایک دوست نے اس قاعدہ کی مدد سے اردو سیکھنے کی کوشش کی تھی اور اسے اردو کو سیکھنے میں دس دن کے بجائے پورے ساڑھے دس دن لگے تھے۔ حیات اللہ انصاری صاحب ہمارے استدلال کو سنکر ہنس کر خاموش ہوگئے مگر قاعدہ کا نام نہیں بدلا۔یوں بھی زبان سیکھنے کے عمل کو کسی خاص مدت یا عرصہ میں محدود کرنا مناسب نہیں لگتا تاکہ ایک آدمی دس دن میں اردو سیکھ لیتا ہے اور اس کے دس دن بعد اسے بھلا دیتا ہے تو ایسی اردو دانی کا کیا فائدہ۔ بہرحال اردو دانی کی کلاسیں اب خاصی مقبول ہوتی جارہی ہیں اور اس معاملہ میں دہلی کی اردو اکیڈمی شمالی ہند میں سب سے پیش پیش نظر آتی ہے۔اردو اکیڈمی دہلی اب اس بات کا انتظار نہیں کرتی کہ اردو سیکھنے کے خواہش مند حضرات اردو اکیڈمی تک چل کر آئیں بلکہ اردو اکیڈمی اپنی اردو کو ساتھ لے کر دہلی کے مختلف علاقوں میں جارہی ہے اور اردو سیکھنے کے مراکز قائم کر رہی ہے۔

اردو اکیڈمی کے سکریٹری اور ہمارے دوست زبیر رضوی کا حال اس خوانچہ والے کا سا ہو گیا ہے جو صبح صبح سبزیاں اور کھانے پینے کی اشیاء خوانچہ میں رکھ کر گلی گلی آوازیں لگاتا پھرتا ہے۔اب زبیر رضوی بھی اپنے خوانچہ میں اردو زبان کو رکھ کر دہلی کی ان گلیوں میں جہاں کبھی اردو کے سوائے کوئی اور زبان نہیں سنائی دیتی تھی آوازیں لگاتے پھر رہے ہیں کہ "بھیا اردو سیکھ لو۔گلابی اردو، کرخنداری اردو، لکھنؤ کی اردو، حیدرآباد کی اردو، ہر طرح کی اردو ہم سے سیکھ لو۔

بصورت کہا کہ ہمیں خبر نہ ہوئی" چنانچہ زیر کے اس رویہ کا یہ اثر ہوا ہے کہ دہلی کے مختلف علاقوں میں اردو سکھانے کے کئی مراکز کھولے جا چکے ہیں۔ جن میں لوگ جوق در جوق شرکت کر رہے ہیں۔ دہلی کے انگریزی اور ہندی اخبارات میں بھی ان کلاسوں کا چرچا ہو رہا ہے۔ دہلی کے علاقہ مسجد موٹھ میں جب اردو دانی کی کلاس کھولی گئی تو اس کلاس میں داخلہ کے لیے سب سے پہلے جو صاحب تشریف لے آئے وہ مشہور کرکٹ کھلاڑی اور ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان بشن سنگھ بیدی تھے۔ بشن سنگھ بیدی کھلاڑی کی حیثیت سے سیکڑوں ٹرافیاں اور اعزازات حاصل کر چکے ہیں لیکن اب اردو دانی کا ایک سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے ادنیٰ طالب علم بنے ہاتھ میں کتابوں کا بستہ لیے ان کلاسوں میں پابندی سے موجود ہوتے ہیں بشن سنگھ بیدی اگرچہ اب تک اردو رسم الخط سے بھی واقف نہ تھے، لیکن اس کے باوجود وہ اردو شاعری کے بے پناہ مداح ہیں۔ دہلی کے نیشنل اسپورٹس کلب کی محفلوں میں وہ جب بھی ملے اردو شعر سناتے ہوئے اور ان شعروں پر اپنے سر کو پگڑی سمیت "اسپن" کرتے ہوئے یعنی سر کو دھنتے ہوئے ملے۔ہم نے سوچا تھا کہ بشن سنگھ بیدی کرکٹ کے میدان میں چونکہ گیند باز کی حیثیت سے عالمی شہرت رکھتے ہیں اس لیے چند دنوں میں اردو کی دکنیں گرا کر گھر چلے جائیں گے۔ مگر جس پابندی سے وہ ان کلاسوں میں شرکت کر رہے ہیں اس سے لگتا ہے کہ اردو دانی کی کلاسوں میں وہ بلے باز کی حیثیت سے داخل ہوئے ہیں اور وہ اس وقت تک آؤٹ نہیں ہونگے جب تک کہ اردو سیکھ نہ لیں۔

اردو دانی کی ان کلاسوں میں لوگ بعض دلچسپ وجوہات کی بنا پر بھی شرکت کر رہے ہیں۔مثال کے طور پر دہلی کے مشہور و معروف ماہر امراض چشم ڈاکٹر کملیش نے ان کلاسوں میں اس لیے داخلہ لیا ہے کہ جب سے وہ گرونانک اسپتال میں تعینات ہوئے ہیں وہاں زیادہ تر ایسے مریض آتے ہیں جو اپنے مرض کی کیفیت اردو کے سوائے کسی اور زبان میں بیان نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ڈاکٹر کملیش جب اس اسپتال میں نئے نئے آئے تو پہلے ہی مریض نے ان سے کہا "حضور، میری بصارت خراب ہو گئی ہے"۔ ڈاکٹر کملیش نے کہا "ہم آپ کی بصارت کو ٹھیک کر دیں گے مگر پہلے یہ بتائیے کہ آپ کی یہ بصارت ہوتی کہاں ہے؟ سینہ میں، سر میں یا پیٹ میں؟"

مریض نے کہا "صاحب آپ بھی عجیب ڈاکٹر ہیں۔ بصارت تو آدمی کی آنکھوں میں ہوتی ہے اور کہاں ہو گی"۔تب ڈاکٹر کملیش کو پتا چلا کہ بصارت کا سیدھا سا تعلق دیکھنے سے ہے۔ اس کے بعد جو مریض آیا تو اس نے کہا "صاحب۔ذرا میری بینائی کا تو معائنہ کیجیے"۔

ڈاکٹر کملیش نے کہا "ہے کہاں آپ کی بینائی۔ کیا آپ کے ساتھ آئی ہے؟ ذرا اسے بلائیے تو"

اس پر مریض نے کہا "ڈاکٹر صاحب مجھے تو خود آپ کی بینائی خراب لگ رہی ہے۔ کیا آپ کو کچھ میری بینائی نہیں دکھائی دے رہی ہے۔" تب ڈاکٹر کملیش کو پتا چلا کہ بینائی کا آسان مطلب دیکھنا ہے۔ ان کے اکثر مریض "آشوب چشم" کی شکایت کرتے ہوئے آتے ہیں اور ڈاکٹر کملیش کو ایک "پر آشوب کیفیت" سے گزرنا پڑتا ہے۔ کوئی کہتا ہے میں اپنی عینک کا عدسہ بدلنا چاہتا ہوں۔ کوئی "دیدہ بینا" کی بات کرتا ہے۔ پھر اردو میں "ذوق نظر" "حد نظر" "چشم التفات" "چشم براہ" "چشم گنہ گار" "نظر بد" "نگاہ شوق" "دزدیدہ نگاہ" اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر کملیش نے سوچا کہ کیوں نہ ان الفاظ کے معنی معلوم کرنے کے لیے اردو کلاسوں میں داخلہ لے لیا جائے۔ ان کلاسوں میں ہمارے ایک بنگالی دوست آشو توش مکرجی بھی اردو سیکھنے کے لیے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص نے انھیں "خبیث" کہا تھا۔ اردو نہ جاننے کی وجہ سے انھوں نے سمجھا کہ وہ ان کی تعریف کر رہا ہے اس لیے شکریہ ادا کر کے آ گئے۔ بعد میں ہم سے "خبیث" کا مطلب معلوم کیا تو کوفت میں مبتلا ہو گئے۔ برسوں کی بات ہے وہ ہم سے "خنزیر" کے معنی بھی پوچھ رہے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اپنے آپ کو جاننے کے لیے اردو زبان کو جاننا نہایت ضروری ہے۔ کچھ بھی ہو لوگ اب اچانک اردو سیکھنے کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو۔ اور ہم تو آم کھانے کے عادی ہیں، پیڑ گننے کے شوقین نہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی	مرتبہ	احمد محفوظ	۸۰/-
اردو افسانہ بمبئی میں	مرتبہ	الیاس شوقی	۵۱/-
مغیث الدین فریدی	مرتبہ	ظہیر احمد صدیقی	۴۵/-
خواجہ حسن نظامی	مرتبہ، نثار احمد فاروقی / ریحان احمد عباسی		۱۵/-
مولانا عبدالوحید صدیقی	مرتبہ	پروانہ ردولوی	۵۱/-
غلام ربانی تاباں	″	اجمل اجملی	۷۵/-
عابد علی خاں	″	مجتبیٰ حسین	۴۵/-
خواجہ احمد فاروقی	″	ڈاکٹر خلیق انجم	۴۵/-
علی سردار جعفری	″	ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی	۴۵/-
اختر سعید خاں	″	ڈاکٹر سید حامد حسین	۵۱/-
نثار احمد فاروقی	″	ڈاکٹر خلیق انجم	۵۱/-
پروفیسر مسعود حسین خاں	″	ایم حبیب خاں	۴۵/-
ڈاکٹر اجمل اجملی	مرتبہ: علی احمد فاطمی / عذرا حبیب		۴۵/-
فرمان فتح پوری نمبر	مرتبہ	خلیق انجم	۲۵/-
صالحہ عابد حسین نمبر	″	عزیز قریشی	۴۵/-
نئی نظم کا سفر	″	خلیل الرحمٰن اعظمی	۴۵/-
مشرقی علوم و السنہ پر تحقیق		حامد حسین	۳/-
پریم چند نمبر		عبدالقوی دسنوی	۸/۵۰
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر		کرنل بشیر حسین زیدی	۳۱/-
مولانا ماہر محمد خاں شہاب نمبر		ادارہ	۱/۵۰
مرزا سلامت علی دبیر نمبر	مرتبہ	عبدالقوی دسنوی	۴/۵۰
جوش ملسیانی نمبر		ساحر ہوشیارپوری	۵/۵۰
خواتین افسانہ نگار نمبر		ڈاکٹر صغرا مہدی	۴/۵۰
عرش ملسیانی نمبر		مالک رام	۱۲/۵۰
سکندر علی وجد نمبر		یوسف ناظم	۲۵/-
نعت نویسی کے مسائل نمبر		پروفیسر گوپی چند نارنگ	۳۵/-
عبداللطیف اعظمی نمبر		(ادارہ)	۱۸/-
جائزے	مرتبہ	مظفر حنفی	۴۵/-
جگن ناتھ آزاد نمبر		ایم حبیب خاں	۵۱/-

معیاری ادب سیریز

موازنۂ انیس و دبیر	مرتبہ	رشید حسن خاں	۲۴/-
نیرنگ خیال	″	مالک رام	۱۵/-
یادگار غالب اردو	مرتبہ	مالک رام	۳۰/-
یادگار غالب فارسی	″	مالک رام	۹/-
انتخاب مضامین سرسید	″	انور صدیقی	۱۴/-
حیات سعدیؒ	″	رشید حسن خاں	۳۶/-
فسانۂ آزاد (تلخیص)	″	ڈاکٹر قمر رئیس	۶۵/-
فردوس بریں	″	عبدالحلیم شرر	۱۶/-
انتخاب مضامین شبلی	″	رشید حسن خاں	۶۵/-
انتخاب ناسخ	″	″	۶۵/-
مثنوی بحر المحبت	″	عبدالماجد دریابادی	۵/۵۰
شریف زادہ	″	ڈاکٹر قمر رئیس	۲۰/-
امراؤ جان ادا	″	ڈاکٹر محمد حسن	۲۹/-
فسانۂ مبتلا	″	صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۰/-
توبۃ النصوح	″	مالک رام	۳۶/-
باغ و بہار	″	رشید حسن خاں	۲۴/-
ابن الوقت	″	ڈاکٹر خلیق انجم	۲۴/-
مجالس النساء	″	صالحہ عابد حسین	۲۴/-
گزشتہ لکھنؤ	″	رشید حسن خاں	۶۵/-
قصہ حاتم طائی	″	اطہر پرویز	۶۵/-
انتخاب ولی	″	سید ظہیر الدین مدنی	۲۶/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی	″	ڈاکٹر محمد حسن	۱۰/-
انتخاب مراثی انیس و دبیر	″	رشید حسن خاں	۲۶/-
انتخاب نظیر اکبرآبادی	″	″	۳۰/-
انتخاب اکبر الٰہ آبادی	″	صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۸/-
انتخاب کلام میر	″	ڈاکٹر محمد حسن (زیر طبع)	
دیوان درد	″	رشید حسن خاں	۳۰/-
انتخاب سودا	″	″	۶۵/-
انتخاب قلی قطب شاہ	″	محمد اکبر الدین صدیقی	۲۷/-
انتخاب ذوق	″	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	۲۴/-
مثنوی سحر البیان	″	رشید حسن خاں	۲۱/-
مثنوی گلزار نسیم	″	″	۱۶/-
افادات سلیم	″	ڈاکٹر خلیق انجم	۲۱/-
مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ	رشید حسن خاں	۲۷/-

رفعت سروش

قسط نمبر ۳

پتّہ پتّہ بوٹا بوٹا......

(خود نوشت)

موانہ (ضلع میرٹھ) پہنچ کر میں یہ یک وقت کئی خوش گوار اور ناخوش گوار تبدیلیوں سے دوچار ہوا جن کے لیے میرا ذہن تیار نہ تھا۔ نگینہ کا گھر کچا پکا تھا یعنی پیچھے کا کوٹھا پکا اور آگے اُسارا۔ یعنی چھپر کا دالان پیچھے اور صحن میں بیری کا پیڑ۔ اس گھر کے ایک ایک کونے کی مہک میرے ذہن میں بسی ہوئی تھی۔ چپّے چپّے سے آٹھ دس سال کی یادیں وابستہ تھیں۔ موانہ میں لالہ مرلی دھر کا دوہرے کوٹھے دالان اور بغلی کوٹھریوں اور دیواری، کا پختہ مکان مگر اس گھر میں وہ آزادی کہاں جو نگینہ میں تھی اور پھر وہ نگاہیں ــ محبت بھری نگاہیں جو ایک آدھ بار بھی اگر میری طرف اٹھتی تھیں تو محسوس ہوتا تھا کہ رس کی بوچھار ہو رہی ہے اب میں ان مشفق ہاتھوں سے دور تھا جن کی مار میں بھی ایک اپنائیت کی لذت ہوتی تھی۔ یہاں آکر سب سے پہلا احساس یہ ہوا کہ میں بوبو (مرحوم) کے حکم کا بندہ بنا کر لایا گیا ہوں۔ اور پہلے ہی دن سے میرے دل میں ان کے لیے ناپسندیدگی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ پھر یہاں بھائی اشتیاق پہلے سے رہ رہے تھے بھائی میاں کے ساتھ۔ وہ مجھ سے اپنے کام کے لیے کوڑیا پھیرا کراتے تھے۔ اور انھوں نے جتنی ماریں اپنے استادوں یا ساتھیوں سے کھائی ہوں گی سب مجھ "بے زبان جانور" پر اتار رہے تھے۔ ذرا سی بات ہوئی اور انھوں نے میری گُدّی پر ایک مکّا جڑ دیا۔ بھابی بلقیس تو بیمار تھیں۔ انھوں نے تو پلنگ پکڑ لیا تھا۔ وہ کھانستے کھانستے اور بلغم تھوکتے تھوکتے اور بخار کی آنچ میں تپتے تپتے چھ ماہ بعد جون ۴۳ء میں دنیا سے سدھار گئیں۔ اور ایک یتیم بچہ اپنی نشانی چھوڑ گئیں۔ طاہر۔ جو اس وقت تین چار سال کا ہوگا۔ بھابی بلقیس کبھی کبھی مجھے اپنے پاس بلاتیں۔ دھیمی دھیمی آواز میں میٹھی میٹھی باتیں کرتیں بہت اچھا لگتا تھا ان کا یہ رویّہ ــ جیسے دھوپ میں ساون کا چھینٹا ــ ایک بھائی میاں تھے جن کے الفاظ میں نہیں، نگاہوں میں ہمدردی اور بے حد خلوص

تو عام مدرسوں کی طرح مشکل الفاظ کے معانی بتانے پر ہی اکتفا نہ کرتے بلکہ تاریخ، ردائت اور بدر کی جنگ، کے بارے میں اتنی تفصیلات بتاتے کہ ذہن روشن ہوجاتا۔ اس کے علاوہ ان کا حکم تھا کہ مطالعہ کر کے آؤ۔ اور سبق پڑھنے سے قبل مطالعہ کرنے سے جو بہت سے سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ان کا بھی وہ تسلی بخش جواب دیتے اور خوش ہوتے کہ میرے طالب علم نے مطالعہ کا حق ادا کیا۔ زبان کی سلاست اور محاورہ پر ان کا بہت زور تھا اگر سبق میں ایک محاورہ آگیا ہے۔ آنکھ آنا۔ تو وہ صرف آنکھ آنے ہی معنی نہ بتاتے بلکہ آنکھ سے متعلق بہت سے محاورے لکھا دیتے۔ آنکھ آنا، آنکھ جانا۔ آنکھ لگنا۔ آنکھ لگانا وغیرہ وغیرہ۔ مضمون نویسی کے گر سمجھاتے کہ تمہید کیا ہوتی ہے کس طرح مضمون کی ترتیب کرنی چاہیے تاکہ مضمون تمام چیزوں کا احاطہ کرلے "مضمون نویسی" کی کاپی خود جانچتے، اور سرخ روشنائی سے زبان کی اصلاح کرتے ایک ڈیڑھ سال بھائی میاں سے اردو پڑھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ درجہ چار میں ہی ایسا قلم پکڑنا آگیا کہ پھر کسی نے حرف گیری نہیں کی۔ میں اپنے مضمون میں زور پیدا کرنے کے لیے طبع زاد قطعے مثال کے طور پر لکھ دیا کرتا تھا۔ بجائے ڈانٹنے کے انھوں نے اس کی داد دی تو میری ہمت اور بڑھی۔ وہ سب لڑکوں سے بلند آواز میں سبق پڑھوایا کرتے تھے۔ غلط تلفظ سے انھیں بے حد چڑ تھی اور عبارت کو کس طرح پڑھنا چاہیے کہ اس کے معنی واضح ہوجائیں۔ یہ بھی بھائی میاں نے کلاس میں سکھایا۔ درجہ چار کا امتحان ہوا۔ میں اوّل آیا۔ پھر ضلع بھر کے منتخب لڑکوں کا وظیفہ کا امتحان ہوا۔ اس میں بھی نمایاں کامیابی نصیب ہوئی اور ڈسٹرکٹ بورڈ سے دو روپیہ مہینہ وظیفہ ملنے لگا مڈل پاس کرنے کے لیے۔

مکتب تائید الاسلام (موانہ) میں بھائی میاں بحیثیت صدر مدرس کام کر رہے تھے۔ دراصل بھائی میاں کی ذات ہم سب بھائیوں کے لیے ایک مشعلِ نور تھی۔ ان کی وجہ سے ہمارے گھر میں علم کا چرچا ہوا۔ اور کتابی علم سے زیادہ زندگی کرنے کا جو فن بھائی میاں نے اپنی مسلسل جدو جہد سے حاصل کیا تھا اس کا فیض ہم سب لوگوں تک پہنچا۔ بھائی میاں ایک معمولی مدرس نہیں تھے۔ وقت کی ضروریات نے انھیں ایک چھوٹے سے قصبہ میں لاکر محدود کر دیا تھا ورنہ وہ علم کا دریا تھے۔ ان کی جگہ کوئی بڑا دارالعلوم تھی یا کوئی ایسا مقام جہاں سے وہ ملک و قوم کی خدمت کر سکتے۔ بڑی صلاحیت تھی ان میں۔ آج سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ بھائی میاں کی زندگی اور اُن کی عظمت ہمارے گرد ہالہ کیے ہوئے تھی۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد انھوں نے کس جدو جہد سے درس نظامی پورا کیا اور اس کے بعد دیوبند پہنچے۔ دارالعلوم دیوبند میں ان کی طبع رسا اور لیڈرانہ صلاحیت کے جوہر کھلے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دارالعلوم میں وہ لوگ زیر تعلیم تھے جو آگے چل کر اس ملک کے آفتاب و ماہتاب

چھلکتا تھا۔ اور ریاست! وہ تو میرا دوست تھا اور اگر یہ کہوں تو شاید غلط نہیں
کہ میرے بچپن کا ایک وہی دوست تھا جس سے جم کر لڑائی بھی ہوتی اور "کنویں میں
چکی۔ تیری میری یاری پکی" والا معاملہ بھی تھا۔ اب یہ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں اپنی
اماں کے ہاتھ کی پکائی ہوئی روٹیاں جم کر کھاتا تھا۔ خوب موٹا تازہ تھا۔ مگر یہاں رگن کر
روٹیاں ملتیں۔ وہ بھی اس ترکیب سے کہ دو روٹیاں تازی اور ان کے بیچ میں ایک
روٹی باسی۔ ایک تو الگ بیٹھ کر فقیروں کی طرح کھانا۔ اور وہ بھی آدھا پیٹ۔ ایسا نہیں
تھا کہ میں نے باسی روٹی نہیں کھائی تھی۔ میں نے تو باسی روٹی نمک کے پانی سے لگا کر
بھی کھائی تھی جانے کتنی بار۔ مگر یہ کھلانے کا انداز میرے لیے سوہانِ روح تھا۔
گھر میں دو بچے۔ ایک پر محبتوں کی بارش اور دوسرے پر پھٹکار۔ بہت سی
چھوٹی چھوٹی باتیں اب تک یاد آتی ہیں۔ مگر اب اس "دفترِ بے نیازی" کو کھولنا
لاحاصل ہے۔ خاص طور سے اس وقت جب بوبو کا انتقال ہو چکا ہے اور اب
یہ بھی سوچتا ہوں کہ ان کی بھی نفسیاتی مجبوری تھی۔ وہ خود بیوگی کی زندگی گزار رہی
تھیں اور ایک مجبوری ہی تو تھی جو انھیں اپنے گھر سے بیمار بھاوج کی تیمارداری کے
لیے سیکڑوں کوس دور لے آئی تھی۔ اور نزلہ عضوِ ضعیف پر ہی گرتا ہے۔ اس
اعتبار سے میں ہی اس کا "حق دار" تھا۔

ممکن تھا کہ میں اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتا۔ مگر گھر میں اس برتاؤ کے برعکس
مدرسے میں مجھے شاباشی ہی شاباشی ملتی تھی۔ سب لڑکے مجھ سے کسی نہ کسی
مدد کے طالب رہتے اور میں سب کی مدد کرتا۔ ہوا یوں کہ بھائی میاں نے تھانہ
پہنچنے کے بعد میرا اور ریاست کا باقاعدہ امتحان لیا۔ ہم دونوں نگینہ سے درجہ
تین میں پڑھتے ہوئے آئے تھے۔ مجھے تو انھوں نے درجہ چار میں داخل کر لیا اور
ریاست کو درجہ ایک میں۔ اسے کچھ آتا ہی نہ تھا۔ نہ لکھنا، نہ پڑھنا، نہ حساب او
مجھے اب کیا عرض کروں پروردگار نے وہ ذہن عطا کیا کہ آج تک کوئی چیز مشکل
ہی نظر نہ آئی — بھائی میاں مجھ سے بہت خوش ہوئے۔ وہ صدر مدرس تھے
اور چوتھی کلاس کو خود پڑھاتے تھے۔ چونکہ اسلامیہ مکتب تھا اس لیے فارسی
بھی تھی کورس میں۔ اور پھر اردو کی کتاب بھی، نگینہ کے اسکول کے مقابلہ میں زیادہ
معیاری تھی۔

بھائی میاں زبان اس طرح پڑھاتے تھے کہ نہ صرف کورس کی چیزیں بلکہ
ان کے دائرہ درس میں ان مضامین کے تمام متعلقات آجاتے جو کچھ وہ پڑھا رہے
ہوتے مثلاً شبلی کی وہ نظم پڑھائی

اہلِ تاریخ سے ہے ایک روایت مشہور
بدر کی جنگ میں اسلام ہوا جب منصور

علم و سیاست بنے۔ دیوبند کے ان کے ہم سبق طلباء میں جن لوگوں سے مجھے بعد میں
شرف ملاقات حاصل ہوا اور جو ان کی نسبت سے مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی
طرح عزیز رکھتے تھے ان میں مولانا حامد انصاری غازی، مولانا سمیع اللہ قاسمی،
مولانا عبدالوحید صدیقی، مولانا انظر صابری، مولانا قاضی سجاد حسین، مولانا زین العابدین
سجاد اور مولانا اشفاق علی وغیرہ تھے۔ خدا ان سب بندگانِ دین پر تا ابد اپنی رحمت کی
بارش کرتا رہے۔ ان کے کارنامے سے علمی و مذہبی حلقے واقف ہیں۔ غالباً ۱۹۲۸ء
یا ۱۹۲۹ء تھا، علمائے دیوبند باہمی اختلافی مسائل کے بھنور میں آ گئے۔ مولانا حسین احمد
مدنیؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانی رہ کے حامیوں کے دو گروہ بن گئے۔ یہاں تک ہوا
کہ دونوں فریقوں نے اپنے اپنے اخبار نکالے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے حامیوں
کے لیڈر تھے بھائی میاں۔ مولوی سید ممتاز علی۔ وہ "الانصار" اخبار کے اڈیٹر تھے
اور دوسرے فریق کے رہنما تھے مولانا حامد الانصاری غازی۔ دارالعلوم میں اسٹرائک
ہوئی اور انجام کار دوسرے فریق والوں نے ڈابھیل (گجرات) میں مولوی شبیر احمد
عثمانی کی قیادت میں نئے دارالعلوم کی بنیاد ڈالی۔

جب بھائی میاں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر نکلے تو ایک اور اہم تبلیغ
کالج، ان کا منتظر تھا۔ غلام بھیک نیرنگ نے کرنال میں ایک ایسے تبلیغ کالج کی بنیاد
ڈالی جس میں علماء دین کی ایک ایسی جماعت کو تیار کرنے کا منصوبہ تھا جو صرف اردو
بلکہ انگریزی اور عربی فارسی سب زبانوں میں تبلیغ کا کام کر سکے۔ اور دین کے کارواں
کو آگے بڑھائے۔ اس کالج میں کل پچیس طلبہ کو داخلہ ملا۔ سات آٹھ ایسے حضرات
تھے جو انگریزی کا سے زیادہ واقف تھے۔ انکو عربی پڑھانے کا پروگرام تیار کیا گیا
اور باقی وہ تھے جو مختلف عربی مدارس سے فارغ التحصیل تھے۔ بھائی میاں
کہا کرتے تھے کہ میں نے جو تعلیم حاصل کی اس میں تبلیغ کالج کا بڑا حصہ ہے
وہاں ان سب عربی خواں لوگوں کو اتنی انگریزی سکھا دی گئی کہ بے تکلف مضمون لکھ
لیتے تھے اور فنِ تقریر سے بھی ان مبلغین اسلام کو آراستہ کیا گیا۔ اپنے استاد مولوی
میرکشا کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے بھائی میاں۔ یہ تین سال کا کورس تھا۔ ہر طالب علم
کو پچیس روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا جو اس زمانے میں ایک بڑی رقم تھی۔ ظاہر ہے
ان کا پروگرام تھا صرف تبلیغی کام کرنے کا۔ مولانا عزیز دہلوی جو ان کے بہت
عزیز دوست تھے نہایت خوش گفتار مقرر۔ خود بھائی میاں بہت اچھے مقرر
تھے۔ نہایت معلومات آفریں، فروعات سے عاری طور رواں دواں تقریر کرتے
تھے۔ چاہے دینی امور پر ہو یا سیاسی پلیٹ فارم پر۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ سے
نسبت کی وجہ سے وہ جمعیت العلماء کے سرگرم رکن تھے۔

اپنے گھریلو حالات کے باعث بھائی میاں تبلیغی مشن پر جاپان وغیرہ نہ جا سکے

اور ضلع میرٹھ کے ایک قصبہ مانہ کے ایک مکتب میں ملازمت اختیار کرلی۔ طالب علمی کے زمانے میں جتنا وظیفہ ملتا تھا اتنی ہی رقم مکتب سے تنخواہ ملے ہوئی۔ یہ جگہ ان کی قابلیت کے اعتبار سے بہت کمتر تھی۔ مگر ہیرے کو جہاں ڈال دیجیے وہ وہیں چمکنے لگتا ہے ــــ مکتب کے مدرس کو قصبہ کی سیاست سے کیا واسطہ۔ مگر وہ محض مدرس نہیں تھے۔ مولانا سید ممتاز علی تھے انھوں نے دیکھا قصبے میں دو چار آدمیوں کو چھوڑ کر مسلمان دینی مسائل اور ملی معاملات سے کوئی رغبت نہیں رکھتے۔ وہاں کے قابل ذکر ہستیوں میں مکتب تائید الاسلام کے منیجر تھے بابو طفیل احمد قریشی۔ مگر انھوں نے ایک عرصہ سے میرٹھ سکونت اختیار کرلی تھی اور وکالت کرتے تھے۔ ویسے ان کا مکان وہیں تھا اور ہم اسی میں کرایہ پر رہتے تھے مدرسہ کا انتظام عملی طور پر بھائی میاں ہی کے سر پڑ گیا۔ ایک تھے منشی محمد اسماعیل ویسے تو بڑھئی تھے مگر انھوں نے اپنا آبائی پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر تھے۔ بہت صاف ستھرے لباس میں رہتے تھے۔ ان کا دستور تھا کہ اگر کسی کا کوئی کام کرانے میرٹھ جانا ہے تو اس سے آمد و رفت کا ایک روپیہ لیتے اور جب دس بیس ایسے آدمی مل جاتے جن کا کام ڈسٹرکٹ بورڈ میں ہوتا تو وہ ایک پھیرا میرٹھ کا لگا آتے۔ اس زمانے میں میرٹھ آنے جانے کے ۱۲ آنے لگتے تھے۔ منشی اسماعیل بہت نیک طبع انسان تھے۔ ۴۷ء میں وہ گڑھ مکتیشر کے فساد میں مارے گئے تھے۔

مانہ میں کئی حکیم تھے۔ ایک حکیم محمد اسحاق، جن کا تعلق اصلاح گیسو برادری سے تھا مگر انھوں نے دہلی طبیہ کالج سے سند حاصل کی تھی۔ اُن کا مطب خاصا چلتا تھا اور ان کے بھائی اخلاق صاحب جرّاح تھے ان دونوں بھائیوں کے بیٹے جمیل اور خلیل میرے ہم عمر اور دوست تھے۔ حکیم عبدالکریم کپڑا بیچتے تھے اور صبح کو مطب بھی کرتے تھے۔ اس علاقہ کے لوگ ان سے ہی علاج کراتے ــ حکیم لطف اللہ خاں شاہجہانپور کشمور کے رہنے والے تھے مگر انھوں نے مانہ میں مطب کرلیا تھا۔ سرخ و سپید، دراز قد، چھوٹی سی داڑھی۔ ناک سے بولتے تھے۔ وہ نباض بہت اچھے تھے۔ بھابی بلقیس کا علاج ان سب حکیموں نے باری باری کیا، مگر کسی کی دوا کارگر نہیں ہوئی۔ قصبہ کے مشہور لوگوں میں تھے منشی عبدل۔ وہ قصاب تھے مگر گوشت فروشی کو چھوڑ کر اور ان کے بہت سے کام تھے۔ ان کا بڑا لڑکا آٹا پیسنے کی چکی پر کام کرتا تھا۔ چھوٹا تھا لیس۔ ان لوگوں کے یہاں بیلوں کا کاروبار تھا۔ اس کاروبار کی تفصیل دلچسپ ہے۔ جن دنوں کسان کو کھیت جوتنے کے لیے بیلوں کی ضرورت ہوتی تھی وہ بغیر کوئی پیسا لیے اسے بیل دے دیتے تھے اور جب کسان کی فصل تیار ہوئی تو پہنچ گئے اپنے بیلوں کے دام وصول کرنے اور

جس نے اونا پونا روپیہ دیا وہاں سے بیل بھی کھول لائے۔ اس زمانے میں یہ کاروبار بہت منافع کا تھا۔

حلوائیوں میں ایک اسلام الدین صاحب تھے ان کی کھنڈسی تھی (یعنی گنے سے گڑ بنانا۔ گڑ سے لال شکر اور اس سے سفید بورا) یہ کاروبار بھی زراعتی قصبوں میں عام تھا۔ ان کا لڑکا بانو میرا یار تھا۔ بنکروں میں نوّی مالدار اسامی تھے ان کا بنایا ہوا کھڈی کا کھدّر دور دور تک جاتا تھا۔ پٹھانوں کے ایک مشہور گانو سٹھلا کے ایک حافظ محمد اسماعیل تھے وہ جلدساز تھے۔ گاڑھوں یعنی گدّی برادری میں ایک حاجی ابراہیم اور دوسرے منیر پدھان برادری کے بڑے لوگوں میں تھے۔ ان سب بکھرے ہوئے عناصر کو بھائی میاں نے اپنی حکمت عملی سے ایک مرکز پر لانے کی کوشش کی، اور چونکہ اس میں ان کی ذاتی غرض شامل نہ تھی اس لیے ان کی بات میں وزن تھا اور صحیح معنوں میں ملّت اسلامیہ کی خدمت کا جذبہ۔ وہ چاہتے تھے کہ قصبہ کے مسلمان مالدار غیر مسلموں کے مقابلے میں اپنے آپ کو کمتر نہ سمجھیں بلکہ انسانی برادری کے ناتے پورے قصبہ میں اتفاق و اتحاد کی فضا پیدا ہو۔ وہ چونکہ جمیعتہ العلماء کے سرگرم رکن تھے اور قوم پرست کانگریسی۔ اس لیے انھوں نے قصبہ کے مسلمانوں میں یہ رُوح پھونکی کہ اس دور میں سیاست سے الگ رہ کر اور ملک کے تقاضوں سے بے نیاز ہوکر جینا زندگی نہیں۔ انھوں نے وہاں کانگریس کی جڑیں مضبوط کیں۔ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے برابر لاکھڑا کیا۔ یہاں تک کہ قصبہ کی کانگریس کے صدر اور سیکریٹری دونوں مسلمان ہوگئے۔ شیعی طبقہ البتّہ اس تحریک سے الگ رہا۔ وہاں مسلم لیگ کا زور تھا۔
بھائی میاں کی قوت ان کی سچائی اور دینداری تھی، باعمل زندگی تھی۔ اور قصبہ کے لوگ اگر ضرورت پڑے تو اپنے مولوی صاحب کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ سرکاری افسران کی وہ کچھ خاص پروا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ افسران ہی ان سے رجوع کرتے۔ خاص طور پر تیر تیوہار کے موقع پر جب قصبہ میں تناؤ کا ماحول پیدا ہونے کا خدشہ تھا بھائی میاں کی قدر و منزلت بلا تفریق مذہب و ملت تھی قصبہ کے چیرمین (شیل چند جین) ان کے معتقدین میں تھے۔ ڈاکٹر رگھو نندن سرن ان کے مدّاح تھے۔ ایک نوجوان کانگریس لیڈر رام گوپال ان کو اپنا بڑا بھائی مانتے تھے۔ غرض خدا نے ان کو وہ عزّت دی تھی جو شاید آج لوگوں کو ممبران پارلیمنٹ بن کر بھی نصیب نہ ہو۔

ع : ایں سعادت بزورِ بازو نیست

۔ اگر انھیں اس وقت موانہ کے سنی مسلمانوں کا بے تاج بادشاہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ قصبہ کے پاس پڑوس میں کون ہوگا جو مولوی صاحب کو نہ جانتا ہو۔ قاضی شہر بھی وہی تھے۔ جن دنوں میں موانہ پہنچا جنوری ۴۲ء میں تو

بھائی میاں کی مقبولیت کا یہ عالم دیکھا کہ قصبہ کے دو چار معزز لوگوں میں ان کا شمار تھا نہایت سادہ اور پُروقار لباس پہنتے تھے۔ ڈوری کی ململ کا کُرتا۔ اور چو لیے کے لٹھے کا پائجامہ گرگابی، سلک یا سرج کی شیروانی۔ جس پر ایک شکن نہیں ہوتی تھی۔ ململ کی دو پلی ٹوپی یہ تھا ان کا لباس۔ ایسے شخص کا چھوٹا بھائی کہلانا۔ میرے لیے عزت کی بات تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے میں مجھے بہت لطف آتا تھا اور ان کی صحبت سے میں نے بہت فیض پایا۔ انداز نشست و برخاست اور بزرگوں سے ملنے کے آداب۔ معترضین کو ان کی دل شکنی کیے بغیر قائل کر دینے کا رویّہ۔ یہ سب میں نے غیر محسوس طور پر ان سے سیکھا، اور اپنی زندگی میں مقدور بھر ان سے غائبانہ رہبری حاصل کی۔ موانہ کی زندگی نے مجھ میں وطن پرستی کا جذبہ بیدار کر دیا۔ کانگریس کے جلسے ہوتے تھے بھائی میاں لیڈر نہیں لیڈر گر تھے۔ وہ خود تو کانگریس کے چونی کے ممبر بھی نہیں تھے مگر تمام معاملات کے پیچھے ان کا مزاج ہوتا تھا۔ میرے بڑے بھائی اور ان سے بہت چھوٹے۔ بھائی اشتیاق نہ صرف کانگریس کے ممبر تھے بلکہ جنرل سکریٹری تھے اور صدر تھے ایک کسان میر پدھان۔ موانہ میں ہندو، مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ففٹی ففٹی ہوگا۔ اور سنّی مسلمانوں میں زیادہ تر کسان تھے یا اہل حرفہ ۔ بھائی میاں نے گاڑھوں، تیلیوں، قصابوں اور کپڑا بننے والوں وغیرہ میں سے بڑے بڑے کام لیے۔ ایک انجمن بنا دی۔ "انجمن شبّان المسلمین،، اس انجمن کے ہفتہ وار جلسے ہوتے تھے اور نوجوان تقریریں کرنے کی مشق بہم پہنچاتے تھے۔ ۳۵ء کا الیکشن آیا اس زمانے میں مخلوط انتخاب نہیں تھا۔ ہندوؤں کی سیٹیں الگ ہوتی تھیں اور مسلمانوں کی الگ۔ اس الیکشن کی گہما گہمی مجھے یاد ہے۔ اسمبلی کی ممبری کے لیے کانٹے کا مقابلہ ہوا۔ بھائی میاں کی آواز پر سب مسلمان ایک ہو گئے اور مسلم لیگ اور جمعیتہ العلماء کا مشترکہ نمایندہ جیتا۔ اس الیکشن میں جمعیتہ العلماء نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا۔ مجھے بھائی میاں کی تقریریں سننے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ میں ان کی اکثر تقریروں میں موجود رہتا تھا اس کے علاوہ وہ ہر جمعہ کو جامع مسجد میں تقریر کیا کرتے تھے۔ ان کی جمعہ والی تقریریں معرکتہ الآرا ہوتی تھیں۔ ان دنوں مذہبی عقائد پر مناظرے بھی ہوتے تھے۔ قادیانیوں اور سنّی و شیعہ مسلمانوں کے درمیان مناظرہ ہوا۔ بھائی میاں تربیت یافتہ مبلغ اور پُر اثر مقرر ــــ قادیانی مولوی ایسے ہارے کہ اگلے دن نظر ہی نہ آئے۔ انھیں دنوں موانہ میں میرٹھ سے مولانا شوکت علی سبزواری بھی تشریف لائے تھے۔ نہایت خوبصورت آدمی سرخ و سپید رنگ۔ اس پر ترکی ٹوپی انھوں نے تقسیم ملک کے بعد پاکستان جاکر بڑی شہرت پائی۔

وہ مکتب تائید الاسلام کے طلبہ کے علاوہ منشی، اعلا قابلیت، اور منشی کامل کے طلبہ کو بھی گھر پر پڑھایا کرتے تھے۔ میں ظاہر ہے ان درجات کا طالب علم نہیں تھا

مگر بھائی میاں جس انداز سے پڑھاتے تھے اور جس طرح تاریخ ادب اور مشاہیر شعرا کے کلام کے نکات سمجھاتے تھے وہ ایسے دل پذیر اسباق ہوسکتے تھے کہ سننے میں لطف آتا تھا۔ آئندہ تمام چیزیں میرے ذہن کا حصہ ہیں اور شعر فہمی میں میری معاون ثابت ہوتی ہیں۔

موانہ ہی میں مجھے شعر و شاعری کا چسکہ پڑ گیا تھا۔ اور وہ تھا بھائی سید اشتیاق علی شوق کی قربت کا اثر۔ ان کے دوست نخشب جارچوی تھے وہ زیادہ تر میرٹھ رہتے تھے مگر جب موانہ آتے تو ہماری بیٹھک میں ہی ان کی نشست رہتی۔ دونوں ایک دوسرے کو تازہ بہ تازہ کلام سنایا کرتے تھے۔ نخشب کا نام تھا اختر عباس۔ ان کے والد حیدر عباس نہایت خوش خط عرائض نویس تھے۔ نخشب پہلے اختر تخلص کیا کرتے تھے۔ شعر و شاعری کے علاوہ نخشب کا شوق تھا کیرم۔ ہماری بیٹھک میں کیرم جمتا تھا اور مجھے کیرم کھیلنے کا شوق وہیں سے ہوا۔

(باقی آئندہ)

کچھ خطوط

● عمر یوسفی، جہانا آباد، کٹرا اسں گنج، ضلع دھنباد، بہار

کتاب نما، بابت ستمبر ۹۵ء میں جناب جگدیش چندر بترہ کا جہاں اداریہ "سرائیکی اور اردو" مدلّل سے زیادہ جذبات پر مبنی ہے۔ پورے اداریے کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا خاصا مشکل ہے کہ آخر کس طرح سرائیکی زبان کو پاکستان کی قومی زبان قرار دینے اور ہندستان کے دستور کی آٹھویں شیڈول میں شامل کرنے سے اردو کی قسمت سنور جائے گی۔ فاضل مضمون نگار نے سرائیکی کی موجودہ حالت کے لیے اردو کو ذمے دار ٹھہرایا ہے مگر اسے ثابت کرنے میں بُری طرح ناکام رہے۔ پاکستان میں اسے قومی زبان قرار نہ دینا تو وہاں کا معاملہ ہے مگر خود ہندستان میں سرائیکی کے، بقول مضمون نگار ایک کروڑ سے زائد متوالے اسے جائز مقام دلانے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ جہاں تک اردو کو مذہب سے جوڑنے اور اسے مسلمانوں کی زبان قرار دینے کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ ایسا ہندی کو آزادی کے قبل سے ہی آزاد ہند کی قومی زبان قرار دینے کی تحریک کے ردّعمل کے طور پر ہوا ہے۔ بنگلہ دیش کے وجود میں آنا اور خود مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں میں انتشار کی وجہ اردو زبان نہیں ہے بلکہ بہت سارے دوسرے محرکات ہیں جنھیں مضمون نگار کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اردو تو پورے برصغیر کی رابطے کی زبان تھی اور کسی رابطے کی زبان کو کسی مخصوص علاقے تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔ انگریزی اس کی اچھی مثال ہے۔ دنیا کے کئی ممالک میں فرانسیسی لاطینی اور انگریزی بطور قومی زبان رائج ہیں پھر اردو تو اسی ملک کی پیداوار تھی۔ اس حیثیت سے اسے پاکستان اور ہندستان میں رابطے کی زبان بنانا کچھ غلط بھی نہیں۔ اگر کسی صوبے کی زبان کو قومی زبان بنایا جانا ضروری ہوتا تو ہندستان کے ہر صوبے کی زبان کو اس کا حق پہنچتا اور پورے درجن بھر زبانیں قومی زبان کے شمار میں آتیں مگر صرف ہندی کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا اردو اور ہندی کا علاقہ ایک ہی ہے۔ اس کے باوجود ہندستان اور پاکستان دونوں میں آج تک انگریزی زبان کا طوطی بولتا ہے۔ دراصل کسی زبان کا سرمایہ اس کے پرستار رکھا کرتے ہیں۔

بقول مضمون نگار سرائیکی، ہندستان کی قدیم زبان ہے اور اس کے بولنے والے کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ راقم الحروف یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ آخر آزادی سے قبل ہندستان میں اس کا حق کس نے چھینا اور یہ زبان اپنی عظمت سے کیوں محروم رہی۔ برصغیر کی تقسیم، اردو کا پاکستان کی قومی زبان قرار دیا جانا اور ہندستان میں اس کی جڑیں کھودنا تو صرف نصف صدی کا قصہ ہے۔ آخر میں عرض کرنا چاہوں گا کہ پورا مضمون متضاد خیالات اور جانبدارانہ رویے کا حامل ہے۔ ہر زبان کے اپنے مسائل ہیں اور اس کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

● ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی، اردو بازار، دہلی ۶

ستمبر ۹۵ء کے شمارے کا لسانی، تہذیبی اور سیاسی اداریہ "سرائیکی اور اردو"، دلچسپی سے پڑھا۔ اگرچہ اداریے کی ہر سطر سے وطن مالوف چھوڑنے کا درد جھلک رہا ہے لیکن اپنے ہی وطن میں بے گھر ہو جانے کا کرب اردو اور اردو

والوں سے کوئی پوچھے۔ اداریے کے کئی فقرے میری ناقص سمجھ میں نہیں آئے۔ مثلاً "اردو جو پورے ہندستان کے تمام لوگوں میں رفاقت بڑھا رہی تھی مسلمانوں کی جاگیر بنا دی گئی"۔ یا "سرکاری حقوق سے چشم پوشی میں اردو کی بدنصیبی جاری ہے" یہ جاگیر کیسی ہے؟ جاگیر کیا ہوتی ہے؟ کیا زبان کو کوئی اپنی یا کسی کی جاگیر سمجھ یا بنا سکتا ہے؟

یہاں مدیر بے سی بترا صاحب نے بہت سے "ٹھوس حقائق" پیش کیے ہیں۔ مثلاً اردو ایک معصوم دوشیزہ کی طرح ہے۔ پاکستان کی سیاست اور فرقہ پرستی نے اس کو اس کی معصومیت سے محروم کر دیا وغیرہ لیکن ایک حقیقت یہ بھی تو ہے کہ اس زبان سخت جان کے حسن سے متاثر ہو کر اسی سے وطن مالوف ہندستان میں رشتہ تو سب جوڑنا چاہتے ہیں لیکن عملاً اس کو اپنانا کون چاہتا ہے؟ اب تو لوگ جن کی مادری زبان آزادی سے پہلے اردو تھی اس کو مادری زبان لکھنے میں تامل کرتے ہیں۔ ہم یہاں پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ اردو کو آسان یعنی عربی فارسی الفاظ سے پاک کر دو کہ غیر اردو افراد (عوام الناس) اس کو اپنا سکیں۔ اگر کوئی ملک اردو کو اپنی سرکاری زبان بنا لیتا ہے تو ہم آتش زیر پا کیوں ہیں؟ اداریے سے ایک تاثر یہ ملتا ہے کہ ہندستان میں اردو کی حق تلفی کا سبب پاکستان کا اسے اپنی قومی زبان بنا لینا ہے۔ کسی کو کیونکر کوئی زبان اپنانے سے باز رکھا جا سکتا ہے؟

بترہ صاحب نے محترم نقاد اور دانشور جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے ایک اہم انٹرویو کا اقتباس نقل کیا ہے کہ "آزاد ہندستان میں اردو کو تقسیم کی زبان قرار دے کر اسے محرومی کی سزا دی گئی۔ شروع میں تو مسلمان اور بالخصوص یو پی کے مسلمان اس "ناکردہ گناہ" کے الزام سے مرعوب رہے کہ پاکستان کے قیام کی ذمے داری اردو اور مسلمانوں پر ہے لیکن ۵۵ء کے آس پاس انھوں نے اس سوال پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا کہ آخر ہندستان میں اردو کے ساتھ زیادتی کیوں ہو رہی ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ پاکستان کے قیام کی ذمے داری اردو زبان پر ڈال کر ہماری عظیم پانچ سو سالہ مشترکہ تہذیبی وراثت کو تباہ کر تا تنگ خیال ہندوؤں کی سازش ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں یہ احساس ابھرا کہ اب اردو مسلمانوں ہی کی زبان ہے اور اس میں کوئی قابل اعتراض یا باعث شرم بات نہیں" اور اس پر تبصرہ کیا ہے کہ "ان جملوں کی شدت دلچسپ ہے اور مصنف اور اس کے حامیوں کے لیے شاید لطف انگیز بھی، لیکن اس کے آخر میں جو اعتراف کیا گیا ہے وہ جذباتی ہے"۔ یہ تبصرہ جناب فاروقی کے بیان پر کتنا چسپاں ہوتا ہے قارئین اندازہ لگا لیں۔ مگر درحقیقت پورا اداریہ اسی دلچسپی اور "لطف انگیزی" سے بھرا پڑا ہے۔ اگر یہ بیان جذباتی ہے تو اردو کو سیاست یا تجارت سے نہیں بلکہ محبت اور بے لوث محبت سے چاہنے والا کون ہے اور محبت ایک جذبہ ہی ہے۔ اردو کو اپنی مادری زبان (علی العموم) کون لکھتا اور سمجھتا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہر مذہب کے لوگوں نے اردو کو خون جگر دے کر پالا لیکن اردو دشمن تحریکوں سے حفاظت میں اپنی شہ رگ کا خون دے دے کر کس نے اسے زندہ رکھا ہے۔

نہ اردو مذہب میں قید ہے نہ کوئی مذہب اردو کا پابند ہے بلکہ یہ تو اپنے رسم الخط کے سبب

فرقہ پرستی کا نشانہ بن گئی ہے۔ اداریے میں ایک جگہ ذولسانیں یعنی دو زبانیں بولنے والا کے بجائے ذولسانی لکھا ہے۔

قیوم خضر صاحب نے بڑے مختصر اور جامع انداز میں "فلسفۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود" کی سہل اسلوب میں وضاحت کر دی ہے۔ اچھا مضمون لکھا ہے۔ محمود سعیدی کی غزل پسند آئی۔

● ہیرانند سوز، ۱۷ اے/۲۰۱ فرید آباد۔ ہریانہ

"کتاب نما" کا ماہ ستمبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ مسٹر جگدیش چندر بترھ نے "سرائیکی اور اردو زبان" کے ادبی اور ثقافتی مقام کا جو تقابلی جائزہ پیش کیا ہے وہ منطقی اعتبار سے مدلل بھی ہے اور برحق بھی۔ سرائیکی بھارت میں بھلے ہی ایک مہاجر زبان سہی مگر پاکستان میں یہ اس ملک کے ایک بہت بڑے حصے کی عوامی بولی ہے۔ یہ علاقہ سندھ کے جنوب مشرقی حصے سے لے کر صوبہ سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔

اردو تو مسلمان حکمرانوں کے ہندستان میں داخلے کے بعد رابطے کی زبان کے طور پر معرض وجود میں آئی۔ اور ضرورت کے تحت تیزی سے ارتقائی منزلیں طے کرتی رہی مگر اس کے بنیادی مراکز دکن۔ دہلی اور لکھنؤ رہے ہیں یہ ملک کی علاقائی بولیوں کے شانہ بہ شانہ چلی ہے اور حسب ضرورت ان کے الفاظ اپنے میں ضم کرتی رہی ہے لیکن اس بات میں دو رائے نہیں کہ اس زبان کی جڑیں ملک کے اس حصے میں اتنی گہری نہیں تھیں جو اب پاکستان بن گیا ہے۔ وہاں آج بھی علاقائی بولیوں کو برتری حاصل ہے۔ اردو کو سرکاری درجہ حاصل ہو جانے سے اور اس کے روزی روٹی کے ساتھ جڑ جانے سے اس کا وجود مستحکم ضرور ہوا ہے۔ مگر عوام میں اسے آج بھی وہاں مستحسن نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور سب سے زیادہ سرائیکی اردو کے مقابلے میں پاکستان کی زیادہ مقبول زبانیں ہیں۔ عوام کی نظروں میں اردو آج بھی وہاں ایک مہاجر زبان ہے جیسے یہاں سرائیکی۔ اسے عوامی مقبولیت حاصل ہونے میں ابھی بہت وقت لگے گا۔ سرائیکی نے فراخدلی سے نہ صرف فارسی رسم الخط قبول کیا ہے بلکہ اردو گرامر اور صرف نحو کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ گورو گرنتھ صاحب میں سرائیکی الفاظ کی کثرت ہے۔ سلطان باہو۔ سچل سرمست بلھے شاہ، بابا غلام فرید اور شاہ لطیف نے بلاشبہہ اس زبان کو علم و ادب کا بیش بہا خزانہ دیا ہے اور ثقافتی اعتبار سے اس زبان کو بام عروج تک پہنچایا ہے اس لحاظ سے سرائیکی کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ برصغیر میں اگر پنجابی اور دیگر علاقائی زبانوں کو سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر تسلیم کر لیا گیا ہے تو سرائیکی کو نظر انداز کرنے کا کیا جواز ہے۔ موجودہ بھارت کے لیے یہ مہاجر زبان سہی مگر آج بھی شمال جنوبی ہندستان کے لاکھوں گھرانوں میں یہ زبان بولی جاتی ہے اور ان گھروں میں نئی نسل بھی اس زبان سے آشنا ہے۔ اس لیے میں کہوں گا کہ دونوں مملکتوں میں اسے زندہ زبان تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں یہ دونوں ملکوں کے رشتے مضبوط کرنے میں کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔

عبداللطیف اعظمی کے نام ایک بالکل کھلا

"ہماری زبان" کے ۱۵ ستمبر کے شمارے

میں آپ کا مراسلہ پڑھ کر میری آنکھیں (گو کہ اب ان میں آنسو رہے نہیں ہیں) کم سے کم تین چوتھائی حد تک ڈبڈبا آئیں۔ آپ نے بات ہی ایسی دردناک چھیڑ دی ہے۔ آپ ذہنی طور پر کتنی الجھن میں ہیں اس کا تھوڑا بہت اندازہ مجھے ہے کیونکہ یہ مراسلہ آپ کے دل سے نکلا ہے اور بے پناہ اثر رکھتا ہے۔ آپ نے اس عمر میں کتنے عظیم کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اردو کے جواں مرگ شاعروں اور ادیبوں کا رجسٹر آپ تیار کر رہے ہیں۔ یہ جان جوکھم کا کام ہے اور اصولاً کسی بڑے ادارے کو یہ کام اپنے ذمے لے لینا چاہیے تھا ایک تو اردو ادب میں اس سے پہلے یہ کام ہوا نہیں ہے تو معلوم نہیں آپ اس فہرست میں ہمارے متقدمین کو بھی شرکت کا موقع دے رہے ہیں یا نہیں۔ ان میں بھی یقیناً کچھ ایسے لوگ مل جائیں گے جو اپنی عمر طبیعی کو نہیں پہنچ سکے اور صبح کاذب ہونے سے پہلے ہی ان کی عمر کی شمع بجھ گئی۔ اگر آپ نے متقدمین پر بھی نظر کرم ڈالی تو آپ کا کام اور بھی کٹھن ہو جائے گا۔ مجھے ٹھیک سے یاد تو نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے مرزا مظہر جانجاناں نے کم عمری ہی میں وفات پائی تھی اور ان کے علاوہ وہ نوعمر شاعر جس نے کسی مشاعرے میں اپنا یہ شعر پڑھا تھا کہ ؎

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

زیادہ دن جا ہی نہیں لیکن اب آپ تاریخ ادب اردو کو کھنگالنے سے رہے۔ دوسرے یہ کہ اس کتاب کا ابتدائیہ (جسے شاید اختتامیہ بھی کہتے ہیں) بھی تیار کرنا کافی کٹھن کام ہے۔ کیونکہ آپ کو یہ طے کرنا ہے کہ "جواں مرگ" کہا کسے جائے۔ بہت سے ادیب شاعر بے وقت مرے ہیں لیکن بدقسمتی سے وہ جواں مرگ نہیں ہیں۔ (مشیت ایزدی میں کسے دخل ہے)۔

ہندوستانی ادیبوں شاعروں کی خصوصیت رہی ہے کہ ان کی تاریخ ولادت ہمیشہ پردۂ خفا میں رہی۔ ہمارے یہاں اپنے بچوں کی تاریخ ولادت لکھنا ممنوع تو نہیں لیکن معیوب رہا ہے۔ جہاں تک ماؤں کا تعلق ہے وہ اپنے بچوں کی تاریخ پیدائش یاد رکھنے کے لیے دنیا کے کسی عظیم واقعے کو حوالے کے طور پر پیش کرتی رہی ہیں مثلاً اپنے پہلے فرزند کی تاریخ پیدائش کو وہ دوسری جنگ عظیم کے حوالے سے یاد کرتی ہیں اور فرماتی ہیں یہ لڑائی ابھی چل ہی رہی تھی کہ میری پہلی بیٹی چھنو پیدا ہوئی۔ کسی بچّے کی پیدائش کو کسی ندی کے سیلاب کے توسط سے یاد کرتی ہیں۔ مائیں تو خیر قابل معافی ہیں والد صاحبان بھی اس معاملے میں غافل ہو رہے ہیں انھیں کیا معلوم کہ جو چاند سا بیٹا ان کے یہاں پیدا ہوا ہے وہ پیدائشی ادیب ہے وہ اسے یونہی عام بچّہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور اپنی ڈائری میں جس میں دنیا بھر کی خرافات اور فضولیات درج ہوتی ہیں۔ اس ہونہار برو کی ایک ذرا سی تاریخ پیدائش نہیں لکھ سکتے کم سے کم نومولود کے چکنے چکنے پات ہی دیکھ لیتے تو انھیں اندازہ ہو جاتا کہ یہ بچہ اپنی آیندہ زندگی میں اپنے ان چکنے پاتوں کی بدولت قدم قدم پر کتنا پھسلے گا۔ (ہمارے یہاں ایک الگ مصیبت یہ ہے کہ بچّوں کے ہونہار ہونے کی اطلاع ہمیں ان کے پاتوں کے ذریعے ملتی ہے ان کا سر کبھی زیر غور نہیں لایا جاتا۔ اعظمی صاحب یہ حال تو ہمارے ادیبوں کی تاریخ ولادت کا ہے خود ادیب اور شاعر بھی اپنی

صحیح نہیں بتاتے تو تاریخ ولادت
تاریخ ولادت
بتاتے ہیں۔ ہر انٹرویو میں یہ متغیر ہو جاتی ہے
اور تاریخ وفات کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے
غالب نے تو اس سلسلے میں غلط فہمی پھیلانے
کی کوشش کی تھی اگر لوگ ان کی کہی ہوئی تاریخ
وفات کے مطالعے کے بعد مطالعہ ہی ترک
کر دیتے تو وہ یہی سمجھتے کہ غالب کا انتقال
ہو چکا ہے ہمارے یہاں کئی محقق ایسے ہیں
جنھوں نے برسوں ہوئے مطالعہ کرنا ترک
کر دیا ہے (کیا کریں سفر بہت کرنا پڑتا ہے)
ایسے نامساعد حالات میں اعظمی صاحب
یقین مانیے یہ آپ ہی کا دل گردہ ہے کہ آپ
نے اردو کے ادیبوں شاعروں کی جواں مرگی
جیسے سخت موضوع پر تحقیقی مضمون لکھنے کو
اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ یہ کام اس لحاظ
سے بھی اچھا ہے کہ زیر بحث مرحومین کو بھی
علم ہو جائے گا کہ یہ ان کے مرنے کے دن
نہیں تھے اور ان کے پرستاروں کے دل میں
بھی ان کی یاد تازہ اور قلق زندہ ہو جائے گا
(اس کا اجر ظاہر ہے آپ ہی کو ملے گا)
مجھے یہاں یاد آیا کہ ہمارے جن ادیبوں
شاعروں کو انگریزی لٹریچر سے دلچسپی رہی
ہے انھیں کیٹس اور شیلے کی جواں مرگی کا کتنا
صدمہ پہنچا تھا ان میں سے تو اب بھی کئی حضرات
اس صدمے سے نڈھال ہیں گو کہ یہ لوگ
آج بھی انگریزی شاعری پڑھ لیتے ہیں لیکن
صرف اس لیے کہ پنڈت نہرو کے ٹیبل پر
فاسٹر کا کلام رکھا ہوا تھا یا مسز تھیچر نے
کسی شاعر کے دو یا تین شعر کسی محفل میں سنائے
تھے ورنہ سچ پوچھیے تو کیٹس اور شیلے کی جواں
عمری میں وفات کے بعد ان کا دل انگریزی

شاعری سے اوب گیا ہے۔ بیچارے۔ جواں مرگی
موضوع ہی ایسا ہے کہ ہر شریف آدمی کا دل
بھر آتا ہے خدا کے لیے فہرست تیار کرتے
وقت اپنے دل کو قابو میں رکھیے اور دل پر ذرا
پارمت ڈالیے۔ آپ اس ڈاکٹر کو ہمیشہ پیش
نظر رکھیں جو کسی سرکاری اسپتال میں کام کرتا
اور روزانہ دس بیس 'وفاتوں' سے دوچار
ہوتا ہے اس کی پیشانی پر شکن تک نہیں پڑتی
یہی ہونا بھی چاہیے۔ یہ ڈاکٹر اگر ہر وفات پر
متاسف ہوتا رہا تو اس کی ساری زندگی تاسف
کرنے ہی میں گزر جائے گی۔ اس ڈاکٹر کی مثال
کو پیش نظر رکھنے کے علاوہ اگر آپ خمیرہ مروارید
ابریشم حکیم ارشد والا بھی پابندی سے استعمال
کرتے رہیں تو یہ کام کرنے میں آپ کو بڑی تقویت
ملے گی (یہ خمیرہ نہار منہ کھانا چاہیے) اگر مکمل
کے بعد آپ مرحومین پر کام کریں تو آپ کے دل
پر بار نہیں پڑے گا۔ کام آپ واقعی معرکے
کا کر رہے ہیں۔ رام بابو سکسینہ زندہ ہوتے
تو آپ کو اس کام کی صحیح داد انہی سے ملتی۔
محمد حسین آزاد تو عش عش کر اٹھتے اور ان کا
ساتھ دینے اور لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوتے۔
اچھی خاصی ایک صف بن جاتی جو صفِ ماتم
بھی ہوتی اور صفِ تحسین بھی۔
رہا یہ سوال کہ "جواں مرگی" کی عمر کیا مقرر
کی جائے یہ بڑا اہم سوال ہے اور آپ کی
پریشانی واجب ہے۔ (واجبی نہیں ہے) ہمارے
یہاں یہ الگ دستور ہے کہ نوجوان شاعر، ابھرتا
ادیب، قسم کے القاب بہت عام ہیں۔ جب کسی
شاعر کو ابھرتا شاعر کہہ کر مائک پر بلایا جاتا ہے
تو اسے دیکھ کر سامعین اسے اپنی نظر کا دھوکا
سمجھتے ہیں مگر بعض وقت تو دہشت زدہ ہو جاتے

ہیں۔ میری گزارش ہے کہ آپ "جواں مرگ" ہونے کا اعزاز ہر کسی کو نہ دیں۔ (یہ کوئی ایوارڈ نہیں ہے کہ جسے چاہے دے دیا جائے)۔ احترام اور اصول کو الگ الگ رکھیے اور مجھے یقین ہے آپ جیسا محتاط اور منصف مزاج شخص اپنی ذمّے داری کا پوری طرح نبھائے گا اور آیندہ نسلوں کو گمراہ نہیں کرے گا۔ آپ کو اس سلسلے میں بڑی تحقیق اور جستجو سے کام لینا ہوگا۔ صرف ادب کے دکتور صاحبان ہی سے نہیں، میدانِ طب کے ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کرنا ہوگا کہ وہ کس عمر کے لوگوں کو جواں سمجھتے ہیں اور کس عمر کے بعد کے لوگوں کو (سوائے شعر و ادب کے) کسی کام کا اہل نہیں سمجھتے۔ میں تو اس معاملے میں کچھ دوسری ہی قسم کی رائے رکھتا ہوں اور ادیب کی عمر کی بجائے اس کے ادب کی مدت کو لائقِ اعتنا سمجھتا ہوں۔ مطلب یہ کہ اگر کسی ذی علم شخص نے ۴۰ سال کی عمر میں ادب کی طرف توجہ کی اور دس پندرہ سال کی تخلیقات کے بعد اس کا پیمانۂ حیات چھلک گیا تو میں اسے ایک جواں مرگ ادیب کی موت کہوں گا لیکن یہ فلسفہ آپ کے کام کا نہیں ہے آپ ادیب ہی کی عمر کو پیشِ نظر رکھیں ورنہ مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ آپ کی طرح میں نے بھی یہاں اپنے احباب سے جواں مرگ ہونے کی عمر کے بارے میں تبادلہ خیال کیا لیکن سوائے اختلافِ رائے کے اور کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ میں سمجھتا ہوں اس معاملے میں طبّی رائے ہی مفید رہے گی کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور آپ کے اس کام سے ایک اہم مسئلے کا حل نکل آئے گا یعنی جس طرح رضاعت اور بلوغ وغیرہ کی عمر مقرر ہے اسی طرح جواں مرگی کی عمر کا بھی تعین ہو جائے گا جواب تک اردو کیا دنیا کی کسی بھی زبان میں نہیں ہوا ہے۔ اس سہرے کی پیشگی مبارکباد۔

آپ کی صحت اور درازیٔ عمر کی دعا پر اپنا یہ خط ختم کرتا ہوں۔ جی چاہے تو جواب لکھ دیجیے گا لیکن میں نہیں سمجھتا آپ کو اس کی فرصت مل سکے گی اور میں بھی نہیں چاہتا کہ آپ کی توجہ اور دل جمعی میں حارج ہوں۔

● **محمد یعقوب الرحمٰن۔ ایوت محل۔ مہاراشٹر**

جگدیش چندر ودھاون صاحب سرائیکی زبان کی ترقی کی خواہش یا ارادے رکھتے ہیں انھیں یہ حق حاصل ہے جس کا احترام کرنا ہم پر لازم ہے موصوف نے سرائیکی زبان کو "اردو" کی ماں کہا ہے اس رشتہ کی بنا پر وہ اردو والوں سے واپسی کے سفر کی توقع رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ "اردو" آج صرف زبان کی حیثیت سے نہیں جانی جاتی بلکہ وہ ایک مکمل تہذیب کا درجہ اختیار کر چکی ہے جس کے چاہنے والے لاکھ سست و کاہل سہی لیکن اس کے دیوانے ضرور ہیں۔

"ڈاکٹر نارنگ نے استعفا دینے یا اس کی تشہیر میں دیر کر دی" "سرائیکی" کو اپنے بیٹے سے یہ امید نہ ہوگی۔ ڈاکٹر نارنگ کی مادری زبان سرائیکی ہے تو انھیں ایسے وقت میں استعفا دینے کی بجائے سرائیکی کے اعلا فن پاروں کو اردو میں پیش کرنے کے لیے وقت نکالنا چاہیے۔ اردو ادب میں ان کی پوزیشن خاصی مضبوط ہے اور پھر ہم اردو والے تو اس شخص کو بھی اپنا کہتے ہیں جو اردو میں صرف دستخط کرنے کی قابلیت رکھتا ہو۔

ابراہیم یوسف صاحب نے اختصار کے ساتھ اردو ڈرامے کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے

اس سے ان کے موضوع پر مکمل گرفت کا احساس ہوتا ہے۔ واقعی اردو ڈراموں میں اردو آبادی کے مسائل کو پیش کیا جائے تو اردو ڈرامے کی شناخت قائم ہونے میں مدد ملے گی۔

مجتبیٰ حسین صاحب فل فارم میں ہیں۔ ہر ماہ ان کا مضمون پڑھنے کو مل رہا ہے۔ یہ سلسلہ قائم رکھیے۔

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

بھوپال ادب کے آئینے میں

مصنف ۔ ڈاکٹر محمد نعمان خاں
قیمت ۔ ۱۰۰ روپے
مبصر ۔ اقبال مسعود
ملنے کا پتا ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
بھوپال بک ہاؤس، بھوپال، ایم، پی

ڈاکٹر محمد نعمان خاں اردو کے ان تازہ کار ناقدوں میں سے ایک ہیں جو اپنے موضوع کے لیے جانفشانی اور دیدہ وری کے ساتھ تلاش تحقیق اور جستجو کرتے ہیں اور معروضی انداز اور تجزیاتی طریقہ کار کے ساتھ شائستہ لب ولہجہ میں تنقید کرتے ہیں۔ وہ فیصلے کرنے میں جلد بازی نہیں کرتے تاہم حق وانصاف کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "بھوپال ادب کے آئینے میں" ان کے اسی انداز اور طریق کار کا مظہر ہے اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ مضامین کا تعلق بھوپال سے ہے اس موضوع سے ان کو طبعی مناسبت بھی ہے جیسا کہ کتاب مذکور کے پیش لفظ میں وہ رقمطراز ہیں "بھوپال میرا وطن ہی نہیں پسندیدہ موضوع بھی ہے اس کی ادبی تاریخ کو درخشاں بنانے والے بیشتر معمار اور فنکار پردۂ گمنامی میں روپوش ہیں۔ یہ ہی وہ احساس تھا جس نے مجھے بھوپال کے ادبی موضوعات پر کام کرنے کی ترغیب دی" اس کتاب میں پیش لفظ سمیت گیارہ مضامین ہیں جو ڈیڑھ سو صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں یہ گذشتہ پندرہ سالوں کے دوران مختلف اوقات میں ضبط تحریر لائے گئے ہیں۔ اس میں پیش لفظ بعنوان "اپنی بات" کا مطالعہ کیے بغیر تمام تحریروں میں جاری وساری روح، جذبہ اور فکر کو بہتر طریقے سے نہیں سمجھا جا سکتا۔

"بھوپال ادب کے آئینے میں" کے مضامین کی فہرست پر ایک نظر ڈالتے ہی احساس ہو جاتا ہے کہ مصنف نے دبستان بھوپال کی بنیادی ادبی حیثیت کی طرف توجہ دی ہے اور مختلف مضامین کے ذریعہ اس کے ادبی قد وقامت، اولیت اور اہمیت کو پیش کرنے کی سعی

ہے مثلاً اس میں "بھوپال کا پہلا صاحب دیوان فرماں روا نواب جہانگیر محمد خان" "بھوپال
پہلا اردو تذکرہ فرح بخش" "بھوپال کا پہلا اردو اخبار۔ عمدۃ الاخبار" "بھوپال کا ایک اہم
منفرد تذکرہ شبستان عالمگیر" "مدھیہ پردیش میں اردو صحافت ایک جائزہ" "بھوپال میں اردو
فسانہ ایک مختصر جائزہ" "بھوپال میں اردو نظم آزادی کے بعد" "دیوان غالب کی ایک نادر شرح
مطالب الغالب اور سہا مجددی" "مکاتیب رشید احمد صدیقی بنام تخلص بھوپالی" اور "بھوپال
ایک تصویر دو رخ" شامل ہیں۔

ڈاکٹر محمد نعمان خان نے مذکورہ مضامین تحریر کرتے وقت بنیادی ماخذات کو مدنظر رکھا ہے اور ان کی روشنی میں نتائج اخذ کیے ہیں۔ کتاب میں شامل مضامین بھوپال ایک تصویر دو رخ۔ مکاتیب رشید احمد صدیقی بنام تخلص بھوپالی اور مدھیہ پردیش میں اردو صحافت ایک جائزہ، اہم اور توجہ طلب مضامین ہیں خصوصیت سے بھوپال ایک تصویر دو رخ کو تو اردو کی چند بہترین اور منتخب تنقیدی تحریروں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس میں ادبی اظہار لہجے اور بیان کے امتزاج سے دار الاقبال بھوپال کی کئی سطحیں ابھرتی ہیں۔

"بھوپال ادب کے آئینے میں" اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے ایک بنیادی اہمیت کی حامل کتاب ثابت ہوگی۔ مجموعہ میں شامل بعض تحریریں اس سلسلہ میں لکھے گئے تنقیدی سرمایہ میں قابل لحاظ اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن کو ہمیشہ حوالے کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ اور یاد رکھا جائے گا۔

صدق جائسی

مؤلف: (نواب) محمد نور الدین خان
مبصر: رؤف خیر
سنہ اشاعت: جنوری ۱۹۹۱ء۔ قیمت: ۵۰ روپے
ملنے کا پتا: حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

خاک حیدرآباد نے ہمیشہ بانہیں پھیلا کر ارباب دانش کا استقبال کیا ہے۔ ہر فن کار کی سچی قدر یہاں ہوتی رہی ہے۔ جنوب ہمیشہ شمال کی بالادستی قبول کرتا رہا ہے۔ ہر سطح پر مرعوب ذہنیت نے شمالیوں کے لیے راہ ہموار کی۔ نظام دکن نے ہر چند کہ ملکی و غیر ملکی کی اختلاف کم کر دی گئی تھی مگر وہ برائے نام تھی کہ فرمان خاص سے مستثنیٰ بھی کر دیا جاتا تھا چنانچہ ملکیوں پر غیر ملکیوں کا تسلط برقرار رہا۔ فانی بدایونی نے جب دور دراز علاقے کی منصفی پر شہر کی صدر مدرسی کو فوقیت دی تو نظام دکن نے فرمایا تھا کہ چھوٹی چھوٹی آسامیوں پر کم از کم ملکیوں کا تقرر کیا جانا چاہیے مگر آخر کار فانی کا غیر ملکی ہونا ان کی ملازمت کی راہ میں کوئی رکاوٹ کا سبب نہ بن سکا۔ انھیں بھی فرمان خاص سے اجازت مرحمت ہو ہی گئی۔ ایک فانی ہی پہ کیا موقوف سبھی نظام کے دربار سے فیض اٹھاتے رہے۔ ایسا بھی نہیں کہ دکن میں صلاحیتوں TALENTS کا فقدان تھا۔ دراصل انھیں اپنے آپ کو منوانے کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔ چنانچہ شمالیوں کی بن آئی تھی۔ جس علاقے کا بادشاہ خود مرعوب ذہنیت کا مالک ہو وہاں

استعمال تو ہوگا ہی۔ یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا بلکہ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی کہیں نہ کہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ اس سے بھی انکار بہر حال نہیں کیا جاسکتا کہ دکن نے ان شمالیوں کے کمال سے پورا پورا استفادہ بھی کیا اور منہ مانگی قیمت بھی چکائی۔ خاک دکن کی فراخ دلی کا یہ عالم ہے کہ اس نے شمالیوں کے طعنے سنے پھر بھی انھیں دیس نکالا نہ دیا بلکہ کئی مشاہیر کو اپنی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جذب کرلیا۔ فانی، داغ، امیر مینائی، جلیل وغیرہ یہیں آسودۂ خاک ہیں۔

صدق جائسی بھی اک ایسا ہی شاعر تھا جو جائس سے دکن آیا۔ یہاں امرا کی نگاہِ لطف سے فیض اٹھاتا رہا اور جہاں اس لطف میں کمی آئی وہیں ان کی ہجو ملیح بھی لکھتا رہا۔ جیسے مہاراجا کشن پرشاد، نواب مہدی یار جنگ اور سر اکبر حیدری کی اہاجی۔ حیدرآباد کو "شہر ناپرساں" بھی کہتا رہا اور اس شہر سے جاتے ہوئے دل گرفتہ بھی تھا۔ بقول صدق:

> "۱۹۲۳ء کے موسم بہار کی ایک سہانی صبح کو میں براہِ منماڑ اول بار نظام ریلوے کی ایک سست رفتار ٹرین سے کاچی گوڑہ ریلوے اسٹیشن پر اترا"
>
> (دربار دُربار)

صدق جائسی جہاں ہوش بلگرامی کے حوالے سے اس شہر حیدرآباد کو ایسا شہر بھی کہتے ہیں جہاں اہل ادب کا کوئی "پرسانِ حال نہیں"، وہیں وہ خود اپنے وطنِ مالوف کے بارے میں بھی کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں:

> "نواب کاظم جنگ اگر اپنا وعدہ پورا کرتے تو شاید حیدرآباد مجھ سے جیتے جی نہ چھوٹتا مگر مشیت کو تو کتاب "دربار دُربار" لکھوانی منظور تھی۔ اس نے آخر عمر میں ایک بار پھر مجھے جائس پہنچا دیا جہاں اب علم و حکمت کے چرچوں کے بجائے بے مُردی اور جہالت کا دور دورہ تھا"
>
> (مقدمہ — دربار دُربار)

"فلاں فلاں شخص، حیات اور کارنامے" جیسے تھیسس THESIS لکھ کر کئی ریسرچ اسکالر راتوں رات پی ایچ ڈی ہو گئے مگر نواب محمد نورالدین خاں صاحب اک ایسی شخصیت ہیں جنھیں تحقیق کا چسکا ہے۔ یہ اک ایسا نشہ ہے جس کے آگے ہر نشہ سبک ٹھہرتا ہے خاں صاحب نے بڑی محنت اور جستجو کے ساتھ صدق جائسی کے حالات اور تخلیقات جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں صدق کے شاگردوں سے بھی مدد لی اور جس قدر مواد انھیں دستیاب ہوسکا وہ اس کتاب "صدق جائسی" میں پیش کردیا۔ ایسا لگتا ہے صدق کو ادبی دنیا نے کھلے دل سے قبول نہیں کیا اس میں ادبی دنیا کا کوئی قصور نظر نہیں آتا۔ جو تخلیقات "صدق جائسی" میں دی گئی ہیں وہ نہایت ہلکی پھلکی اور "درباری" قسم کی ہی لگیں۔ بیشتر تخلیقات شخصی ردعمل پر مبنی لمحاتی اور ہوتی نوعیت کی ہیں البتہ ان سے اتنا تو پتا چلتا ہے کہ صدق کو شعر کہنا بھی آتا تھا اس کا صحیح اندازہ تو تب ہوگا جب ان کی قابل ذکر تخلیقات کا قابل ذکر CON-SIDERABLE حصہ دریافت ہو۔ موجودہ منظوم تخلیقات کی بہ نسبت "دربار دُربار" کی

ہزار درجہ زیادہ بہتر لگتی ہے۔

اس کتاب میں محمد نورالدین خاں صاحب نے صدق جائسی کے چہرے مہرے، یں، یاد داشت، غزلیں، نظمیں، مخمس، ہجویں وغیرہ جمع کر کے ریسرچ کرنے والوں کو للکارا ہے اس طرح دکنی روایات اور فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔ بہت ممکن ہے مطبوعات و مخطوطات کوہ سے کاہ کے علاوہ بھی کچھ نکل ہی آئے۔ بس کوہ کنی کی ضرورت ہے۔ اس "شہر ناپرساں" صدق جائسی کا ایک پرسانِ حال تو نکل آیا۔ اور ع

وہ قرض اتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے۔

"نقوش میوات" لاہور

مدیر: شبیر احمد خاں میواتی
۱۷/اے، گلی روشن دین، محلہ حکیماں، سانده خرد
لاہور، پاکستان
تبصرہ نگار: مولانا حبیب الرحمٰن

یہ ایک سہ ماہی رسالہ ہے اور پاکستان میں مقیم میو قوم کا قومی و ملی ترجمان۔ کتابت و طباعت، ترتیب و تدوین اور محتویات و مندرجات تقریباً ہر جہت سے خوب ہے رسالے کا ٹائٹل اور سرنامہ خوب سے خوب تر۔

مضامین و مقالات کا انتخاب و تنوع سبحان اللہ۔ جمال ظاہری کے ساتھ ساتھ کمالِ باطنی سے بھی آراستہ، صفحہ صفحہ لطافتِ ذوق کا شاہد، ورق ورق سے رعنائی خیال آشکار۔

دنیا سیپ محمدؐ موتی صلی اللہ علیہ وسلم
اس بن دنیا کیسی ہوتی صلی اللہ علیہ وسلم

میوات اور اہل میوات کے بارے میں اچھا خاصا مواد جمع کیا گیا ہے۔ جنگ آزادی ہند کے ہراول دستے کی نشان دہی بالکل نئی دریافت ہے۔ مجنوں شاہ مستانہ کو ہمارے یہاں کون جانتا ہے۔ گو یہاں مشہور و معروف مجاہدین آزادی بھی اپنا صحیح مقام نہ پا سکے۔ مداری فقیروں کو عموماً گداگروں کی صف میں شمار کیا جاتا ہے۔ آزادی کی جنگ کے حوالے سے تو ان کے متعلق گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ مولانا حالی کا سفر الور اور شادی خانہ آبادی، بھی تقریباً دریافت ہی کے زمرہ میں ہیں اور اچھی چیزیں ہیں۔

اردو زبان کی صورت گری میں "میواتی" زبان کا بھی تذکرہ آتا ہے، چار نمبر اس پرچہ کے آچکے مگر اس طرف ابھی تک کوئی اشارہ نہ ہو پایا ہے اس کے شعری اور نثری نمونے آنے چاہئیں۔ حضرت شاہ نفیس صاحب جیسے مسیحا نفس کی سرپرستی اور جناب سرور میواتی جیسے دیدہ ور و جہاں دیدہ سخن شناس و سخنور کی نگرانی اور شبیر احمد خاں میواتی حوصلہ مند و سلیقہ شعار مدیر کی ادارت میں شائع ہونے والے اس مجلہ میں کیا کچھ نہ ہوگا۔

کیوں شکوۂ غم اے دل ناشاد کرے ہے
اک غم ہی تو ہے جو تجھے آباد کرے ہے

ہمارا آشیاں تھا اروڑی پربت کے دامن میں
طمانیت کی پریاں ناچتی پھرتی تھیں دامن میں

ابھی تک اس کے چار شمارے آئے ہیں مگر ہر نیا پرچہ اپنے پیش رو سے کسی نہ کسی حیثیت میں ممتاز ہے، اگر اسی طرح اس کی یہ رفتار رہی تو بلا شبہہ یہ پاکستان کے بلند اور معیاری رسائل میں اپنا مقام بنا لے گا۔

یہ علمی، ادبی اور تاریخی رسالہ ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ادب کے جدید رجحانات، علم و فن کے تنوعات اور تاریخ کے قدیم اور نئے میلانات نظر سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔ میو فاؤنڈیشن جیسے اب سے بہت پہلے وجود پذیر ہونا تھا۔ اس کے ارباب حل وعقد تاریخ قدیم کی روایات میں حال و مستقبل کو فراموش نہ کر بیٹھیں مدیر کو اپنی ژرف نگاہی کے حوالے سے اس پر نظر رکھنی ہوگی۔ پرانے واقعات سے نئی نسل کو روشناس کرنے کے لیے واقعات کو متانت و سنجیدگی سے ترتیب دیا جانا ضروری ہے۔ پرانے لوگوں سے پرانی باتیں، ان کے پرکھوں کے سوانح، مذہبی کیفیت، سماجی کوائف اور ان کے زمانے میں رائج قومی شاعری، مشہور شعراء، ان کے دلچسپ اور کارآمد اشعار یہ ساری چیزیں منضبط کر کے ریکارڈ میں رکھنے کی ہیں۔

مضمون نگار کی شخصیت سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ مدیر کا فرض ہے کہ وہ مقالات و مضامین دھیان سے مطالعہ کر کے شریک رسالہ کرے۔ نواب شمس الدین خاں آف فیروز پور جھرکا مہرولی میں نہیں قدم شریف نبی کریم پہاڑ گنج دہلی میں مدفون ہیں

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

یہ شعر شاکر مرحوم کا نہیں اصغر گونڈوی کا ہے، گو اصغر گونڈوی میو قوم سے تعلق رکھتے تھے۔

راجا سورانی کہے تو دِلّی کو جا یو
ہوں لے آئیں خاں ولکے پاؤں پڑ جایو

اور پھر آخری پیرا جو اس دوسرے کے بعد شروع ہوا۔ بڑا گنجلک ہے۔ ایک اور ضروری بات: اردو کے فارسی رسم الخط کی خوبی یہ ہے کہ گٹھا ہوا ہو، زیادہ کشادگی سے اس کا حسن غارت ہو جاتا ہے قاری پر بھی، بشرط احساس، یہ وسعت و پھیلاؤ گراں ہوگا۔ اور ابھی سہ ماہی رہنے دیں، جب مواد وافر مقدار میں مہیا ہو جائے تو ماہانہ کی فکر کریں۔ آخر میں ہم اس آدمی سے جس کی دسترس میں ہو اور اسے حاصل کر سکے اس کے مطالعے کی پر زور سفارش کرتے ہیں پیسے اور وقت کا بہترین مصرف ہوگا اور اس کے لیے دوام و استمرار کی دعا۔

ادبی و تہذیبی خبریں

علی سردار جعفری ثابت کریں کہ وہ ہندستانی شہری ہیں

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بہاراشٹر کی پولیس نے جعفری صاحب سے ہندستانی شہری ہونے کا ثبوت مانگا ہے۔ سردار جعفری اردو کے ممتاز شاعر، نقاد، مجاہد آزادی ہی نہیں، پدم شری بھی ہیں پدم شری کا اعزاز کسی اردو والے نے نہیں، حکومت ہند نے دیا ہے۔ ایک عالمی شہرت یافتہ شخصیت کے نام سے بمبئی پولیس کا واقف نہ ہونا حیرت ناک بھی ہے اور افسوس ناک بھی "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا"

دہلی اردو اکیڈمی کا کارنامہ
دہلی میں اردو سکھانے کے مراکز کا افتتاح

نئی دہلی۔ یہاں اردو سکھانے کے بیک وقت سات مراکز شروع کیے گئے۔ دہلی اردو اکادمی نے اس اسکیم کے تحت پٹودی ہاؤس، چندر نگر، نظام الدین گرین پارک، مسجد موٹھ اور ویسٹ پٹیل نگر میں شمع روشن کرکے اردو کے ان تربیتی مراکز کا افتتاح کیا۔

اس موقع پر اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری مسٹر زبیر رضوی نے کہا کہ ایک ایسے وقت میں جبکہ ملک کے ایک حصے میں اردو کو لے کر تشدد کے واقعات ہو رہے ہیں اردو کے نام پر اتنے لوگوں کا جمع ہونا، جن میں ۹۹ فیصد غیر مسلم ہیں اس بات کا ثبوت ہے کہ لوگ زبان کو مذہب اور سیاست سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔

مسٹر رضوی نے بتایا کہ تربیتی مراکز میں داخلہ لینے والوں میں پولیس (جن میں آئی پی ایس افسر بھی ہیں) اسپورٹس مین، وکلاء، ڈاکٹر، فنکار، طالب علم اور خانہ دار خواتین شامل ہیں۔ ان میں ۲۲ سے ۵۵ برس تک کے لوگ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ تاثر قطعی طور پر غلط ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے کیونکہ اس میں نہ صرف عربی، فارسی بلکہ سنسکرت، ہندی، انگریزی اطالوی، اسپینی اور دیگر زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔

مسٹر رضوی نے کہا کہ اردو دلوں کو جوڑنے والی مختلف فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے والی ہماری اس گنگا جمنی تہذیب کی زبان ہے جس پر ہندستان کو ناز ہے۔

اعلا خدمات کے لیے "وجے رتن" ایوارڈ

نئی دہلی۔ گذشتہ روز اشوکا ہوٹل نئی دہلی میں ہوئی تقریب کے دوران انٹرنیشنل فرینڈ شپ سوسائٹی آف انڈیا کی جانب سے ہندستان ترقی میں نمایاں رول ادا کرنے کے لیے چند اہم شخصیتوں کو وجے رتن ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ اڑیسہ کے گورنر بی ستیہ نارائن ریڈی نے پیش کیے۔ ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں ممتاز سائنس داں و ممبر پلاننگ کمیشن سید ظہور قاسم شامل ہیں۔

محترمہ مسرت فردوس کو پی ایچ ڈی کی ڈگری

بی آر امبیڈکر مراٹھواڑہ یونی ورسٹی اورنگ آباد

نے محترمہ پروفیسر مسرت فردوس بنت ڈاکٹر محمد سالک بالاپوری ریٹائرڈ سول سرجن کو ان کے تحقیقی مقالہ "بابائے اردو مولوی عبدالحق کے قیام اردو کی ادبی خدمات" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ انھوں نے یہ مقالہ پروفیسر عبدالمجید استاد شعبۂ اردو مولانا آزاد کالج اورنگ آباد کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔

(ذکی نقشبندی)

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی اعزازی تقریب

بھوپال۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی تقریب اعزاز میں تقریر کرتے ہوئے گورنر جناب شفیع قریشی نے اردو کی ولولہ انگیز خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آزادی سے قبل قوم میں سرفروشی کی تمنا جگانے اور انقلاب کا صور پھونکنے میں اردو زبان نے جو کردار ادا کیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے لیکن آزادی کے بعد اردو والے فریاد ہی کرتے رہے جو صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ مگر آج حالات اردو کے لیے قدرے ساز گار ہیں۔

اس تقریب اعزاز میں شاعر اختر سعید خاں کو کل ہند میر تقی میر اعزاز اور صحافی غلش جعفری کو کل ہند حکیم سید قمر الحسن اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ جبکہ دوسرے اعزاز یافتگان میں ڈاکٹر شیخ زبیدہ وسیم بانو قدوائی، سلام ساگری، شاہد بھوپالی ڈاکٹر اشفاق عارف اور زاہدہ تقدیس فردوسی شامل تھے۔

اس موقع پر وزیر لوکل سیلف جناب تونت سنگھ کیر نے جو کہ اردو اکادمی کے بھی وزیر ہیں اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مدھیہ پردیش سرکار اردو کو ریاست کے سبھی علاقوں تک پہنچانے اور اس کی ترقی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔ اردو زبان کو دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے سکریٹری اردو اکادمی پروفیسر آفاق احمد نے اکادمی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اس کے بنیادی مقاصد میں ادب کے ساتھ زبان کی ترقی بھی شامل ہونا چاہیے۔ اس تقریب میں جو اردو اکادمی کے آراستہ ہال میں منعقد ہوئی بڑی تعداد میں ادیبوں شاعروں، صحافیوں اور ادب دوستوں نے شرکت کی۔

انجمن ادب کی ماہانہ نشست

انجمن ادب کی ماہانہ نشست ۱۰ ستمبر ۱۹۹۴ء کو انجمن کے صدر دفتر ۱۹۔۳ سیکٹر ۸ فریدآباد میں منعقد کی گئی۔ جس میں مقامی ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ یمنا نگر سے جناب صابر ابوہری، چنڈی گڑھ سے جناب دل کاشمیری اور دہلی سے جناب شہباز ندیم ضیائی، جناب سیماب سلطان پوری، جناب بھگوان داس اعجاز، جناب کاوش پرتاپ گڑھی جناب منوّر سرحدی اور جناب ناشاد دہلوی نے شرکت فرمائی۔ جناب ناشاد اورنگ آبادی بھی شریکِ محفل ہوئے۔ محترمہ نرگس خموش نے اپنا افسانہ 'سورج مکھی' پڑھ کر سنایا اور داد حاصل کی۔ شعرا حضرات نے بھی اپنے مرصّع کلام سے سامعین کو نوازا۔ بہار کی گلوکارہ محترمہ لکشمی ناگ نے جناب سیماب سلطان پوری کا کلام گا کر سنایا۔

انجمن ادب فریدآباد اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے عنقریب ایک جامع پروگرام کا اعلان کرے گی۔

اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر سولن میں ۶ روزہ ورکشاپ

مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے ذیلی ادارے اردو تدریسی و تحقیقی مرکز سولن میں اردو نصاب کی تدوین کے سلسلے میں

ایک چھے روزہ ورک شاپ کا انعقاد کیا گیا۔ یہ نصاب
دراصل ان غیر اہل زبان اساتذہ کے لیے تیار کیا گیا
ہے جو اردو کو بحیثیت ثانوی زبان سیکھنا چاہتے
ہیں۔ مذکورہ ورکشاپ میں مختلف جامعات سے
آئے ہوئے ماہرین لسانیات اور مشاہیر ادب
نے شرکت فرمائی، ان میں پروفیسر عقیل رضوی، پروفیسر
ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر علی احمد فاطمی،
ڈاکٹر عارف حسن خاں، ڈاکٹر معراج الحسن، ڈاکٹر
غضنفر علی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ورکشاپ کے
دوران ڈاکٹر جمال محمد پرنسپل اردو سنٹر سولن اور
ڈاکٹر ضیاء الرحمان صدیقی لیکچرر اردو سنٹر سولن نے
علمی مباحث میں حصہ لیا۔ ڈاکٹر خطیب سید
مصطفیٰ لیکچرر سولن اس ورکشاپ کے کوآرڈی نیٹر
تھے۔

ڈاکٹر اخلاق اثر کا نیا پتا

ڈاکٹر اخلاق اثر
فیلڈ ایڈوائزر این سی ای آر ٹی برائے ہماچل پردیش
آفس آف فیلڈ ایڈوائزر کیلفی، شملہ ۱۷۱۰۰۲
ٹیلی فون رہائش گاہ اور دفتر ۴۸ ۵ ۴

"ڈار سے بچھڑے" کی تقریب رونمائی

۲۸ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو غالب اکیڈمی اور قلم زاد
کے زیر اہتمام اردو کے جواں سال افسانہ نگار
جناب سید محمد اشرف کے اولین افسانوی مجموعے
"ڈار سے بچھڑے" کی رسم اجرا ہوئی۔ علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب
سید حامد نے رونمائی کی۔ اس تقریب کی
صدارت جناب جوگندر پال نے انجام دی جبکہ
مہمانانِ خصوصی میں پروفیسر قاضی عبدالستار،
پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر
علی اشرف جیسی برگزیدہ شخصیات تھیں۔ ان
حضرات کے علاوہ سید محمد اشرف کے معاصرین
میں ڈاکٹر حسین الحق، جناب قمر احسن، جناب
شمس الحق عثمانی، جناب ابن کنول، جناب فرحت
احساس وغیرہ نے ان کے افسانوں پر تجزیاتی
گفتگو کی۔ آخر میں قلم زاد کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر
ارتضیٰ کریم نے ان کا بھرپور تعارف کرایا۔

انیس امروہوی
سکریٹری نشر و اشاعت قلم زاد۔ نئی دہلی

ایک شام رشید حسن خاں کے نام

عالمی شہرت یافتہ ناقد، محقق اور دانشور
عالی جناب رشید حسن خاں کے اعزاز میں ایک
شعری نشست بتاریخ ۱۱ ستمبر ۹۴ء بروز اتوار،
بوقت ۷ بجے شام، برمکان شاہد رضا منعقد
ہوئی۔ نشست کی صدارت رشید حسن خاں نے
فرمائی۔ موصوف نے اپنے صدارتی خطبے میں
شاعری کی موجودہ صورت پر اظہار خیال کرتے ہوئے
فرمایا کہ نئی نسل کا شاعر فکر کی توانائی اور بیان
میں ندرت کی خواہش سے محروم نہیں ہے بلکہ
اس کا المیہ یہ ہے کہ وہ چند مجبوریوں کے
تحت خیال کو فوراً نظم کر دیتا ہے جس کے سبب
اس کی فکر اس کے جذبہ سے ہم آہنگ نہیں
ہونے پاتی۔

پروگرام کے آغاز میں حضرت خالد علوی اور
سید احمد سحر نے مہمان خصوصی (رشید حسن خاں)
کی گلپوشی فرما کر ان کا استقبال کیا۔ نظامت کے
فرائض مشہور شاعر اختر شاہجہاں پوری نے انجام
دیے۔ موصوف کے علاوہ جن شعراء نے اپنا
کلام پیش کیا ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں۔
جناب خالد علوی، جناب ساغر وارثی، جناب سید

احمد سحر، جناب شاغل و مهداتی، جناب حسرت کمالی
جناب رونق مصوّر، جناب ملک اسمٰعیل، جناب
محمود خان بوزر، جناب حامد مینائی اور شاہد رضا۔
مندرجہ بالا حضرات کے علاوہ شہر کی دیگر
معزز و محترم شخصیات نے بڑی تعداد میں شرکت
فرماکر نشست کو وقار عطا کیا۔ رپورٹ، انتخاب عالم

ہم غم میں برابر کے شریک ہیں۔!

بزرگ صحافی حسن واصف عثمانی نہیں رہے

لکھنؤ۔ ۱۹ نومبر قومی آواز کے سابق چیف
سب اڈیٹر اور بزرگ صحافی حسن واصف عثمانی نے
آج سہ پہر تقریباً ۳/۱/۲ بجے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور
اردو دنیا اپنے ایک نہایت محترم، مخلص صحافی
سے محروم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں کہ مرحوم
کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

امیر حسن نورانی کا انتقال

لکھنؤ۔ علمی اور ادبی و صحافتی حلقوں کو ۲۴ گھنٹوں
کے اندر دوسرا شدید جھٹکا اس وقت لگا جب
ایک بزرگ اور مشفق استاد، مصنف، محقق،
ماہر تعلیم اور علم کا سرچشمہ ڈاکٹر سید امیر حسن نورانی
نے آج علی الصبح دل کا شدید دورہ پڑنے کے
بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس سے قبل کل دین ہم
کے وقت ممتاز صحافی حسن واصف عثمانی صاحب
کا انتقال ہو گیا تھا۔

سید امیر حسن نورانی جو اپنے برادر نسبتی ڈاکٹر
انوار الحسن کی چند ہفتے قبل موت کے بعد سے
بالکل ٹوٹ گئے تھے اپنے اندر بہر حال اتنی
ہمت پیدا کیے ہوئے تھے کہ ان کے وہ علمی کام
بند نہ ہونے پائیں جو انھوں نے مختلف پروجکٹوں

کی شکل میں اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے لیکن
موت کے آگے کس کی چلتی ہے۔

معروف افسانہ نگار وحید انور نہیں رہے

اردو کے معروف افسانہ نگار اور خواجہ
احمد عباس مرحوم کے ساتھی وحید انور طویل
بیماری کے بعد ۲۴ اکتوبر کو حیدر آباد میں انتقال
کر گئے۔ خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

شہاب سرمدی چل بسے

اردو کے نامور ادیب اور صاحب طرز بزرگ
جناب شہاب سرمدی کا ۲۲ اکتوبر ۹۴ء کی سہ پہر
علی گڑھ میں انتقال ہو گیا۔ تدفین الہ آباد میں
ہوئی۔ آپ بہترین تحت لفظ پڑھنے والوں میں
شمار کیے جاتے تھے۔ صاف، شستہ زبان
کے مالک، مشرقی آداب کے پاسدار، کئی تصانیف
کے مالک۔ خدا مغفرت کرے۔

قیوم اثر نہیں رہے

جناب ایم اے کریمی خبر رساں ہیں کہ قیوم
اثر صاحب کا ۳ نومبر ۹۴ء کو حرکت قلب بند
ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ موصوف ۷۲ سال
کے تھے۔ ان کی اوّل تا آخر تصنیف "پیامِ دوست"
گذشتہ ہفتہ منظر عام پر آئی تھی۔

سرکردہ شاعر محشر بدایونی کا کراچی میں انتقال

نئی دہلی۔ دبئی سے سلیم جعفری نے یہ افسوسناک
اطلاع دی ہے کہ عالمی شہرت یافتہ شاعر حضرت محشر
بدایونی حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے
اپنے وطن کراچی میں ۹ نومبر ۹۴ء کو وفات پاگئے۔
۱۹۲۲ء میں یو پی کے مردم خیز شہر بدایوں

ں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد انھوں نے کراچی
و اپنا وطن بنا لیا، جہاں ریڈیو پاکستان کے رسالہ
آہنگ، کے نائب مدیر اور پھر مدیر بنائے گئے
۱۹۸۱ء میں چار سال قبل ہی ریٹائرمنٹ لے لیا۔
ان کی تصنیفات میں شہر نوا، غزل دریا،
گردش کوزہ، حرف شاد (مجموعۂ نعت) چراغ
برے ہمنوا، فصل فردا، اور بچوں کے لیے
ین باجے، شاعر نامہ، سائنس نامہ، جگ مگ
ارے، ہیں۔

محمد محبوب علی نصرت فاروقی چل بسے

محبوب نگر (اے پی) جناب محمد محبوب علی
نصرت فاروقی، معتمد انجمن ترقی اردو محبوب نگر
اے پی) مورخہ ۲ نومبر ۱۹۹۴ء منگل کی شب
قلب پر حملے کے باعث انتقال کر گئے۔ آپ
نے ستر برس سے زیادہ عمر پائی تھی۔ آپ پچاس
برس سے انجمن ترقی اردو کے معتمد چلے آرہے تھے
آپ نے اس طویل عرصے میں حکومت سے نمائندگی
کر کے اردو مدارس کے قیام، اساتذہ کے تقررات
در اردو زبان و ادب کے فروغ میں آخری سانس
تک خدمت کرتے رہے۔ اردو والے آپ
کی ان خدمات کے عوض "بابائے اردو" کے
نام سے مخاطب ہوتے تھے۔ آپ پیشہ کے
اعتبار سے "وکیل" تھے، شاعری بھی کرتے تھے۔
نصرت تخلص فرماتے تھے۔

انتقال

اعلیٰ حضرت مولانا ابو النصر قطب الدین سید
شاہ محمد باقر قادری سجادہ نشین خانقاہ حضرت
قطب ویلور ۱۲ نومبر بروز ہفتہ صبح کے وقت
دار فانی سے کوچ فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

اسی روز بعد نماز عصر گنبد اقطاب ویلور میں
حضرت قربیؒ اور حضرت ذوقیؒ کے درمیان
تدفین ہوئی۔

رشید الظفر کے انتقال پر جامعہ ہمدرد میں تعزیتی جلسہ

نئی دہلی۔ جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر
پروفیسر رشید الظفر کے انتقال پر آج صبح یہاں
جامعہ ہمدرد کنونشن ہال کے لان میں ایک تعزیتی
جلسہ ہوا جس میں ادارہ کے لیے ان کی بے لوث
خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے انتقال
کو ادارہ، ملک اور ملت کے لیے ناقابل تلافی
نقصان بتایا گیا۔ رجسٹرار مسٹر حمید اللہ بٹ نے
کہا کہ ویسے تو مرحوم ۲۰ ماہ تک وائس چانسلر
رہے مگر صرف گیارہ ماہ وہ یونی ورسٹی میں موجود
رہے اور اتنے کم وقت میں انھوں نے اپنی
اہلیت اور صلاحیت سے ادارہ کو جس بلندی
پر پہنچایا وہ ناقابل فراموش ہے اور صحیح بات
تو یہ ہے کہ اب جامعہ ہمدرد ملک کے تعلیمی نقشے
میں ابھر گیا تھا۔ اس موقع پر مرحوم کی یاد میں
دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ تعزیتی جلسہ
میں جامعہ ہمدرد کے چانسلر حکیم عبد الحمید علی گڑھ
مسلم یونی ورسٹی کے چانسلر پروفیسر علی محمد خسرو
مسلم یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر مسٹر سید حامد۔
جامعہ ہمدرد کے ڈین حکیم جمیل احمد کے علاوہ
ادارہ کے اساتذہ، طلبہ، متعدد یونی ورسٹیوں
کے ممتاز اساتذہ، ماہرین تعلیم و تدریسی عملہ اور
متعدد علمی، ادبی اور سماجی شخصیتیں موجود تھیں۔

عطا عابدی کو صدمہ

ماہنامہ افکار ملی دہلی کے سب اڈیٹر جناب

عطا عابدی کے بڑے بھائی الطاف حسین کا ۲۰ نومبر ۹۴ء کی شب کو بر ہولیا دربھنگہ میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی عمر ۴۸ سال تھی۔

اہل ادب و صحافی [illegible] پس ماندگان کے [illegible] شریک ہیں۔ خدا ان لوگوں کو صبر جمیل عطا کرے۔

شریک غم۔ انظہر نیر، برہولیا

پروفیسر سید ظہیر الدین مدنی کی رحلت پر تعزیتی جلسہ

بمبئی ــ گذشتہ دنوں شعبۂ اردو بمبئی یونی ورسٹی کے زیر اہتمام پروفیسر سید ظہیر الدین مدنی کے انتقال پر بجے پی نانک بھون ودیا نگری میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی نے فرمائی۔ اس سوگوار جلسہ میں شعبۂ اردو کے کارگزار صدر ڈاکٹر یونس اگاسکر نے مدنی صاحب کے انتقال پر اظہار رنج کرتے ہوئے کہا کہ مدنی صاحب مرحوم کے قلم کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔ وہ ایک اچھے محقق نقاد، اور اڈیٹر تھے۔

شعبۂ فارسی بمبئی یونی ورسٹی کے استاد پروفیسر احمد انصاری نے کہا کہ مرحوم نے اسماعیل یوسف کالج اور اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تحقیق و تدریس میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔

پروفیسر عبدالستار دلوی نے کہا کہ مدنی صاحب ایک بلند پایہ محقق تھے۔ ان کی متعدد یادگار کتابیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مدنی صاحب تحقیق میں ایک معیار چاہتے تھے۔ وہ ریسرچ اسکالروں کی بھیڑ لگانے کے بجائے صرف چند اچھے طلبہ کی رہنمائی پر اکتفا کرتے تھے

انھوں نے دکنی اور گجری ادب پر جو کام نمایاں انجام دیے، وہ اردو ادب کی بڑی خدمت کہی جاسکتی ہے۔

[illegible] محمود سروش نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سوگوار ماحول میں تقریر کرنا مشکل ہے کیونکہ ایسے جلسوں میں آنسوؤں سے رونا پڑتا ہے۔ درحقیقت مدنی مرحوم ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی شخصیت ایسی تھی جو کبھی مر نہیں سکتی۔

ڈاکٹر دیسائی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ گجری و دکنی ادب سے متعلق سید ظہیر الدین مدنی کی علمی خدمات ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔

صدر جلسہ کی تقریر کے بعد شعبۂ اردو کے پروفیسر اور افسانہ نگار معین الدین جینابڑے نے ایک تعزیتی قرار داد پیش کی۔ اور دو منٹ کی خاموشی پر یہ جلسہ اختتام کو پہنچا۔

انجمن ترقی اردو کی باقاعدہ تنظیم

یو پی شاخ کے سلسلے میں ۲۰ نومبر ۱۹۹۴ء کو اردو گھر میں ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس میں درج ذیل حضرات نے شرکت کی:۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی پروفیسر شمیم حنفی۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، جناب رشید حسن خاں، ڈاکٹر اسلم پرویز۔

یو۔پی کی شاخ کے تنظیمی معاملات پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد طے پایا کہ یو۔پی شاخ کی تنظیم بہت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ایک اڈہاک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کے کنوینر شوق امروہوی صاحب کو مقرر کیا گیا۔

یہ کمیٹی یو۔پی میں باقاعدہ اردو تحریک کا کام اور وہاں انجمن کی شاخیں قائم کرے گی۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

ان الصدق
مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع
نے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل، اس کا مقدمہ
سیر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ۔ ۷۵/=

ام رنگ
ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ
ادبی خاکہ — یہ اُس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے
رکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا
ہوکر انسانیت کو وقار بخشا۔ ۱۵/=

شہیدِ جستجو
(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) پروفیسر ضیاالحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مردِ درویش تھے جن کا انداز
خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مردِ مومن
تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگرِ لالہ میں
ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں
کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب
کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۷۵/=

پُرانی بات ہے
(سلسلہ وار نظمیں) زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و
واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اُٹھایا ہے وہ
ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں، بس سچائیوں
کے روپ بدل گئے ہیں۔ ۳۰/=

غزل نما
تصحیح و ترتیب
(طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے) ادا جعفری

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد
خاں سیاح تک کلام کا جامع انتخاب اور تعارف جس کو
ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے
بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ
قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۴۸۰ ۷۵/=

سازِ سخن
ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتونِ اوّل محترمہ ادا جعفری
کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے اندازِ بیان
سے ایک ایسی قوتِ ارادی مترشح ہے جس کے بغیر جدید
ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہو سکتا۔ ۴۵/=

ترجمۂ قرآن
پروفیسر مشیر الحق

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش)
پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۷ء
کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب
میں پیش کیا گیا۔ ۸/=

نذرِ مختار
مالک رام

مجموعۂ مضامین جو ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر
مختار الدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما، نائب صدر
جمہوریۂ ہند کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا جس میں اُردو
کے ممتاز چھبیس ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ ۱۰۱/=

Regd. with R.N.I. at No 4967/60 December. 1994
Regd. No. DL 16016/94
Licence No. U[SE]-22 to Post without pre-payment of postag

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025